

مکتبہ جامعہ دہلی

ہندوستانی کھیل

مصنفہ الطاف علی صاحب۔ نگرانِ تربیت جسمانی جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو اُن بچوں میں ملتی ہے جنہیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ۱ سے لے کر ۲ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کرسکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک و ملت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس پر اعتماد کیا جاسکے گا۔ مصنف نے انہیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریبًا ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں درج کئے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی۳

چند اچھی کتابیں

حیاتِ وارث | از مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب شیدا وارثی۔ اس میں حضرت حاجی حافظ سید وارث علی شاہ کے ممتاز حالات، مقدس واقعات اور مفید ہدایات و ارشادات درج ہیں۔ حجم ۵۰۰ صفحات قیمت مجلد ؎

زوالِ غازی | مصنفہ عزیز ہندی۔ اس میں انقلاب افغانستان کے شروع سے محمد نادر خاں کے کابل پر قبضہ کرنے تک کے تمام حالات مفصل بیان کئے گئے ہیں اس میں غازی امان اللہ خاں یا غازی محمد نادر شاہ کسی کی طرفداری نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ واقعات سے جو نتائج اور اثرات مرتب ہوئے ہیں بالتشریح بیان کئے گئے ہیں، ضخامت ۴۵۰ صفحے۔ بڑی تقطیع۔ قیمت ؎

تاریخ جمالیات | از مجنوں گورکھپوری۔ اس میں اہل مغرب کے فلسفۂ حسن پر ایک مختصر تاریخی نبذ ہے۔ کتاب آرٹ کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت ۸/

داستانِ غدر | حضرت ظہیر دہلوی شاگرد رشید حضرت ذوقؔ نے چشم دید حالات غدر دہلی کے لکھے ہیں۔ آج وہ قصے اور کہانیاں ہیں مگر کچھ ایسے دردناک ہیں کہ دل ہل جاتے ہیں، انسان لرز اٹھتے ہیں۔ یہ افسانے دردخیز اور غم آلود ہیں مگر درس عبرت کا موقع ہیں۔ حجم ۲۵۶ صفحات۔ قیمت عہ/

اسلام کے سات ستون | از ظاہر قریشی صاحب بی اے بی ٹی۔ اس میں حضرت عمر فاروقؓ حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت امام حسینؑ۔ حضرت خالد بن ولیدؓ حضرت امام ابو حنیفہؒ۔ خلیفہ مامون الرشید اور خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے حالاتِ زندگی بچوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ضخامت ۱۴۰ صفحے۔ قیمت ۶/

کالی داس | مصنفہ چودھری جے کرشن۔ ایم اے۔ ایل ایل بی۔ اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے ملاحظہ ہو۔

" میں نے آپ کا یہ رسالہ مختلف مقامات سے دیکھا۔ آپ نے ایک ضروری موضوع پر قلم فرسائی کی ہے جو امید ہے کہ عام طور پر مقبول ہوگی۔ اردو میں جو کچھ اب تک لکھا گیا ہے وہ بہت مختصر اور محدود ہے۔ ضرورت تھی کہ اس طرف اہل قلم متوجہ ہوں" قیمت مجلد ۱۲ؔ

بی بی عائشہؓ | مرتبہ مولوی مقبول احمد صاحب۔ اس میں مسلمان بچوں کے لئے حضرت عائشہؓ کی زندگی کے خاص خاص حالات بیان کئے گئے ہیں جو عفت و پاک دامنی خوف خدا، بہادری وغیرہ سے متعلق ہیں۔ حجم ۷۶ صفحات۔ قیمت ۴ؔ

نیپولین بونا پارٹ | یہ کتاب نوجوانوں اور طالب علموں کے بہت کام کی ہے۔ اس سے آپ کو نیپولین کی قابلیت، محنت اور اعلیٰ معراج کا پتہ چلے گا اور انھی خصوصیات نے نیپولین کو سورج بن کر چمکنے کا موقع دیا۔ نیپولین کی زندگی کے ہر ہر صفحے پر صاف صاف لکھا نظر آتا ہے کہ جو بادشاہ رعایا کی سچی خدمت کرتا ہے رعایا بھی اسے جی جان سے عزیز رکھتی ہے اور جہاں اس کا پسینہ بہتا ہے وہاں وہ اپنا خون بہانے کے لئے تیار رہتی ہے۔ حجم ۲۶۰ صفحات۔ قیمت ۱۴ؔ

قائداعظم | اس کتاب میں محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ کی سوانح حیات مختصراً لکھی گئی ہے۔ زبان سلیس اور با محاورہ ہے۔ بچے نہایت آسانی سے پڑھ سکتے ہیں۔ قیمت ۴ؔ

حیات اجمل | یہ مجدد طب حاذق الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات ہے جس میں مرحوم کے اخلاق و عادات، علمی و طبی حالات مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں حجم ۲۰۰ صفحات۔ درمیانی تقطیع۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ۔ قرولباغ نئی دہلی

جامعہ

زیر ادارت :۔ نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

جلد ۳۴ نمبر (۱)	بابتہ ماہ جنوری سنہ ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ ۵ صر فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع دہلی

اُردو کی لائبریری

آپ بھی اپنی تیار کر سکتے ہیں طریقہ بہت آسان ہے

صرف اُردو اکادمی کے ممبر ہو جائیے دو چار سال میں

آپکی بہترین اُردو کی کتابوں کی لائبریری تیار ہو جائے گی

اکادمی کے قواعد و ضوابط ذیل کے پتہ سے طلب کیجئے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

اسلامی ہندی تمدن

(گذشتہ سے پیوستہ)

اسلامی ہندی تمدن کے خط و خال واضح کرنے کے لئے آخر میں ہم اس کا مقابلہ صرف ایک اور تمدنی تحریک سے کرنا چاہتے ہیں اور وہ ہمارے اہلِ وطن ہندوؤں کی قومی تمدنی تحریک ہے اس وقت ہم ہندوؤں کی تمام تحریکات کی طرف اشارہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ صرف ایک دو ان تحریکات کی طرف اشارہ کریں گے۔ جنھوں نے ہندو قوم کے ذہن کو واقعتاً بہت متاثر کیا ہے۔ ایک تو وہ تحریک ہے جو آج سے ہزارہا برس کے ہندو مذہب اور تمدن کا بعینہٖ احیا کرنا چاہتی ہے۔ اس کی حامل ہندو مہاسبھا، آریہ سماج جیسی جماعتیں ہیں ہندو جماعت کی تشکیل ذات پات پر ہوئی ہے۔ جو جمہوریت کے سخت خلاف ہے ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی یہ تحریکیں ہندوؤں کو ایک ایسے زمانہ کی طرف لیجانا چاہتی ہیں جن کا بڑھتے ہوئے جمہوریت کے زمانہ میں کوئی مستقبل نہیں ہوسکتا اگر ان تحریکات کا ہندوؤں پر واقعتاً اثر ہوا ہے تو ہندو بحیثیت قوم و ملک اور انسانیت کی راہ میں صرف ایک سنگ راہ ثابت ہوں گے اس قسم کی تحریکات سے اسلامی ہندی تمدن کا میل تو کجا کسی قسم کا تعاون بھی نہیں ہوسکتا بلکہ ان تحریکات میں باہم تصادم ہونا ایک لازمی امر ہے۔

ان دقیانوسی تحریکات کے بالکل خلاف ہندوؤں میں اشتراکیت کی تحریک ہے جس کے سب سے مشہور رہنما پنڈت جواہر لال نہرو ہیں۔ اشتراکیین ہندوؤں کی نہ صرف ذات پات کو ختم کر دینا ہیں بلکہ ان کے رسم و رواج اور ان کی ہر قسم کی تاریخی روایات کو بھی ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت کا فروغ ہندو تمدن کی قطعی موت کے مترادف ہے۔ ہندو قوم کا مذہبی محدود تصور، نہ ان کا سماجی ڈھانچہ۔ اور نہ ان کی تاریخی روایات اس بات کی کفیل ہوسکتی ہیں کہ وہ ایک اجتماعی، معاشی انقلاب کی حامل ہوسکیں اشتراکیت کی ترقی کے ساتھ ہندو تمدن چاہے نام میں باقی رہے لیکن وہ عملاً ختم ہوجائے گا۔ اسلامی تمدن کی ماہیت نہ سمجھنے کے باعث اشتراکیین اسلام کی بھی اسی طرح مخالفت شروع کر دیتے ہیں جس طرح ان کی تعلیمات کے بڑھانے کیلئے

انھیں ہندومت کی مخالفت کرنا پڑتی ہے جس کا تمام نظام سرمایہ داری اور ذات پات کے بندھنوں پر استوار ہے۔ اس قسم کی سطحیت سے وہ مسلم عوام کو بھڑکا دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنے معاشی انقلاب کے کام میں مشکلات پیدا کرتے ہیں اس قسم کے اشتراکیین کے ساتھ معاشی انقلاب پیدا کرنے کے لئے تعاون کی راہ میں اسلامی تمدن حائل نہیں ہوتا لیکن ہمیں ہمیشہ محتاط رہنا چاہیئے کہ معاشی مسائل کے ساتھ ساتھ کہیں وہ الحاد و دہریت کا زہر بھی مسلمانوں میں سرایت کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مسلمانوں کو یہاں اپنے تمدن کی بقا کی پوری کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ اشتراکیت صرف ایک معاشی حل ہی نہیں ہے بلکہ ایک مکمل تصور زندگی ہے جو مادیت و الحاد پر مبنی ہے اور جس کو جبر سے رائج کرنا اشتراکیین کے نزدیک بالکل جائز ہے

عہد جدید میں ہندوؤں کی سب سے زبردست قومی و تمدنی تحریک وہ ہے جس کی رہنمائی مہاتما گاندھی کر رہے ہیں یہ ہندومت کی ایک زبردست اصلاحی تحریک ہے۔ روحانیت اور اخلاق پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اسلامی ہندی تمدن سے یہ تحریک جہاں تک اس پہلو کا تعلق ہے بہت قریب ہے مسلمانوں کی بھی کوئی تحریک جب تک کہ وہ روحانی اور اخلاقی نہ ہو تحریک اسلامی نہیں کہی جا سکتی ملک کی آزادی بغیر تفریق قوم و ملت ایک مشترکہ حکومت کا قیام اس کا مقصد ہے جس میں تمام اہل ہند کے ساتھ انصاف و رواداری برتی جائے۔ مسلمان ان امور میں بھی اس تحریک کے حاملین کے ساتھ پورا پورا اتحاد عمل کر سکتے ہیں اور کر بھی رہے ہیں۔ اس تحریک میں مہاتما گاندھی دیہاتوں کے سدھار پر بہت زور دے رہے ہیں۔ مسلمانوں کو اس سے بھی مکمل اتفاق کرنا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ عوام الناس کی خدمت ہے اس لیے ان کی عین روایات کے مطابق ہے۔ سادگی ضبط نفس اور ایثار پر اس تحریک کی بنیادیں استوار کی گئی ہیں رسول اللہ صلعم کا اسوۂ حسنہ اور خلفاء راشدین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کون مسلمان ان اخلاقی خوبیوں کے پیدا کرنے پر زور نہ دے گا۔

بہت سے امور میں اتفاق کرتے ہوئے بھی اس تحریک کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جو اسلامی ہندی تمدن کے منافی ہیں مثلاً یہ تحریک ہندوؤں کی قدیم ہزاروں برس کی پرانی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتی ہے

گو کہ اس میں بعض اصلاحات بھی کرنا چاہتی ہے اس قسم کی رجعت پسندی نہ مفید ہے نہ ممکن۔ تہذیب و تمدن اپنی بہترین بنیادوں پر آگے بڑھنے کا نام ہے پیچھے ہٹنے کا نہیں۔ باوجود ادعیٰ کے یہ تحریک اس قدر جمہوری نہیں ہے جس قدر کہ حالات کا تقاضا ہے کیونکہ یہ ہندو سماج کی بنیادوں کو بدستور باقی رکھنا چاہتی ہے جو ذات پات کے تصور پر مبنی ہے۔ عملاً یہ ہریجنوں کو ہندوؤں میں ملانے کی کوشش کر رہی ہے اور انھیں حقوق بھی دے رہی ہے لیکن یہ کوششیں کس حد تک بارآور ہوں گی یا ہوں گی بھی یا نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔ کروڑوں انسانوں کو ذلت و نکبت سے صرف ایک زبردست انقلاب کے ذریعہ آزاد کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی اصلاحات سے شاید ہی کوئی دیرپا نتیجہ مرتب ہو۔ اسلام اس کے مقابلہ میں اس مسئلہ... کے لئے ایک زبردست انقلابی پروگرام پیش کرتا ہے جو جمہوریت اور مساوات کی روح کا حامل ہے۔ گاندھی جی کو ہندوستان کی غربت کا بڑا احساس ہے اور انھوں نے اپنی زندگی اور جدوجہد سے اس سلسلہ میں جو کچھ کیا ہے وہ کسی بھی ہندوستانی نے سینکڑوں برس میں نہیں کیا ہے لیکن وہ اس مسئلہ کا حل صرف ایک نفسی انقلاب کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔ بے شک ہر انقلاب کے لئے نفس انسانی میں تبدیلی کی ضرورت ہے لیکن خارجی طور پر انقلاب اس وقت تک موثر اور مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایک قانونی اجتماعی شکل اختیار نہ کرلے۔ گاندھی جی کے پاس اس قسم کا کوئی منظم معاشی پروگرام نہیں ہے جس کی بنیاد پر ایک اجتماعی قانونی نظام کے ذریعہ استوار کی جا سکیں۔ اسلامی تمدنی روح کا تقاضا ہے نہ صرف نفوس انسانی میں غریبوں کے لئے احساس پیدا کر دیا جائے بلکہ ایک اس قسم کا اجتماعی قانونی نظام بھی بنا دیا جائے کہ اس میں سرمایہ داری کے لئے گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ وہ صاف صاف دولت کے سرچشموں کو عوام الناس کے قبضہ میں حکومت کے ذریعہ دیدینا چاہتا ہے۔ اگر یہ انقلاب پرامن ذرائع سے ہو سکتا ہے۔ تو بہت اچھا ورنہ وہ کم از کم طاقت کے استعمال کو اس کے حصول کے لئے گناہ نہیں سمجھتا بلکہ اخلاقی طور پر جب کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہے اسے مستحسن قرار دیتا ہے۔

اہنسا گاندھی جی کی تعلیمات کی جان ہے وہ کسی صورت اور کسی حالت میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ کام کیلئے طاقت کے استعمال کو جائز نہیں سمجھتے ان کے نزدیک طاقت کا استعمال ہر حالت میں جبر ہے اور

جبر لازماً جبر کو پیدا کرتا ہے اور اس طرح جبر کا کبھی خاتمہ ہی نہیں ہونے پاتا۔ اسلامی تصور اس میں ان سے کلیتاً متفق نہیں ہے۔ تشدد اور طاقت کو اسلام بھی برا سمجھتا ہے۔ ایک ایسا نظام جماعت جس میں ظلم و جبر جدل نہ ہو اسلام کا نصب العین ہے۔ لیکن وہ فطرت انسانی سے جو ملکوتی انسانی ہونے کے علاوہ حیوانی بھی ہے چشم پوشی نہیں کرنا چاہتا اور اجتماعی برائی کو دور کرنے کے لئے کم از کم طاقت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ اسے ڈر ہے کہ کلیتاً طاقت کے استعمال کو ناجائز قرار دے دیا جائے گا تو پھر انسان کی فطرت حیوانی اس قدر عود کر آئے گی کہ جماعت کو یہ موقع بھی نہ مل سکے گا کہ وہ اپنے انسانی اور ملکوتی عناصر کی نشوونما کر سکے۔ بہرصورت اس نصب العین کی طرف اسلام ضرور رہنمائی کرتا ہے اور وہ بدی کا بدلہ نیکی سے دینے کو اچھا سمجھتا ہے اور اسے احسان سے تعبیر کرتا ہے۔ انفرادی اعمال میں تو وہ یقیناً عفو و احسان کو انتقام اور سزا پر ترجیح دیتا ہے لیکن وہ ایک قانونی حکومت کا قیام طاقت ہی کی بنیاد پر کرنا چاہتا ہے تاکہ ہیئت اجتماعیہ کسی قسم کے خطرہ میں مبتلا نہ ہو جائے۔

اسلامی ہندی تمدن کے عناصر کا تجزیہ کرنے کے بعد ہم نے اس کا دنیا کے چند مشہور ترین تمدنی تصورات سے اس لیے مقابلہ کیا ہے کہ اس کے خط و خال اس تقابل کے باعث کلیتاً واضح ہو جائیں۔ ہم اب اس تصور کا ایک صحیح تصور اپنے پیش نظر رکھ سکتے ہیں اس سلسلہ میں بھی صرف اس کی ماہیت کا ہی جاننا کافی نہیں ہے بلکہ ان عظیم الشان تاریخی اثرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس تمدن نے ہندوستان کی زندگی پر مرتب کیے ہیں۔ اس کی بنیادی توحید کی تعلیم نے ہندوؤں میں توحید کی ایک زبردست تحریک شروع کر دی جس نے کہیں تو بھگتی تحریک کا رنگ اختیار کیا، کہیں وہ آریہ سماج، سکھ پنت اور برہمو سماج کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ پھر جہاں علیحدہ تحریکیں شروع نہ ہوئیں وہاں خود ہندو ذہن توحید کے قریب آنے لگا۔ توحید کی تعلیمات شنکراچاریہ کے فلسفہ میں شروع ہی سے موجود تھی مگر وہ بہت کچھ ایک ذہنی چیز تھی عملی زندگی کو اس سے زیادہ تعلق نہ تھا۔ اب وہ عملاً بھی ایک زبردست قوت بننے لگی اور اس نے اجتماعی عدل کی روح ہندو سماج میں پھونکنا شروع کی جس کے باعث ذات پات کے بندھنوں کے خلاف ہندو ذہن نے بغاوت شروع کر دی جس کا اظہار شروع شروع میں شاعری کے ذریعہ ہونے لگا۔ لیکن بعد میں اس نے ایک عملی شکل بھی اختیار کر لی

مذہبی شعبہ میں اسلامی تمدن نے بالواسطہ اثرات مرتب کئے لیکن تمدن کے بعض دیگر شعبوں میں تو اہل ملک کے ساتھ مسلمانوں نے اشتراک عمل کیا اور ایک مشترکہ ہندی تمدن کی بنیاد ڈالی گئی۔ سیاست اور معیشت میں دونوں اقوام نے ساتھ کام کیا ازمنہ متوسطہ کے فنون لطیفہ مثلاً فن تعمیر، موسیقی، شاعری، نقاشی وغیرہ میں تو اسلامی ہندی تمدن میں ہندوؤں کا بھی مساوی حصہ تھا اس عہد کی ایک زریں یادگار زبان اردو ہے۔ جس کی طرف ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں۔

اس تمدن کا مستقبل اب کیا ہے یہ ایک ایسا مشکل سوال ہے جس کے جواب کا انحصار چند عناصر کی موجودگی پر ہے جہاں تک اس تمدن کی افادیت کا تعلق ہے اس پر اب شک نہیں کیا جا سکتا یہ انسانیت کے بہترین اخلاقی اور روحانی نصب العین کا حامل ہے۔ اس میں مختلف سرچشموں سے جمالی، سیاسی اور تنظیمی عناصر آکر سمو گئے ہیں۔ اپنے اجتماعی حس، اخلاقی مقصد اور مساوات اور جمہوریت کی تاریخی روایات کی بنا پر یہ آج کل کے سیاسی اور معاشی مسائل کا ایک بہترین حل پیش کر سکتا ہے یہ ایک جامد چیز نہیں ہے جس میں کسی قسم کا تغیر ہی نہ ہو سکے بلکہ ایک نامی اور حرکی چیز ہے جو اپنی بنیادی روح کو قائم رکھتے ہوئے بھی روح عصری کا حامل ہو سکتا ہے۔ عہد جدید کے سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل کو حل کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ کلیسا اور ہندومت کی طرح اس کا بھی خاتمہ کر دیا جائے بلکہ صرف اس کی ضرورت ہے کہ تمدن اسلامیہ کی از سر نو تشکیل قرآن، اسوۂ رسول، خلفائے راشدین کے عمل اور اسلامی تاریخ کی بہترین روایات کی روشنی میں کی جائے۔ اس طرح نہ صرف انسانیت کی گذشتہ تاریخ کا بہترین روحانی اور اخلاقی سرمایہ محفوظ ہو جاتا ہے بلکہ عہد جدید کے مشکل ترین مسائل کا بھی حل مل جاتا ہے۔ ماضی کی شاندار بنیادوں پر حال کے ذریعہ مستقبل کا ایک فلک بوس تمدنی قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے۔ ہم خواہ مخواہ ماضی کی ہر چیز کو قائم رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ اگر انسانی ترقی کے لئے ضرورت ہو تو خس و خاشاک کی طرح اسے بہہ جانا چاہئے۔ لیکن ہم اس کے بھی قائل نہیں ہیں کہ ماضی کا وہ سرمایہ جو انسانیت کی ترقی کے لئے مفید ہے۔ اسے خواہ مخواہ تباہ و برباد کر دیا جائے۔ ہر مستقبل کے لئے بہر صورت ایک حال کی ضرورت ہے اور ہر حال کے لیے ایک ماضی کی۔ جب ماضی کی ضرورت بھی ہے تو ہم اس ماضی کو کیونکر نہ باقی رکھیں۔

جو انسانیت کی ترقی کے لئے بے انتہا مفید ہونے کے علاوہ ہماری قومی نفسی زندگی کے رگ و ریشہ میں گذشتہ چودہ سو برس سے سرایت کیا ہوا ہے۔ مارکس، لینن، ہٹلر، مسولینی، گاندھی اور جواہر لال کے ناموں پر سر دھننے کے بجائے ہم کیوں نہ محمد صلعم عربی کے سامنے نذر عقیدت پیش کریں جن سے بہتر اخوت انسانیہ کا سبق آج تک کوئی دوسرا نہ دے سکا اور نہ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس سے بہتر کوئی دوسرا اجتماعی قانونی نظام بنا سکا

عہد جدید میں انسانیت کے مسائل کا حل پیش کرنے کی ذمہ داری امت اسلامیہ کے سر پر ہے اور ہندوستان میں مسلمانان ہند پر، کیونکہ یہی امت امتِ وسطی ہے اور ایسی امت کی تعلیمات میں روح اور مادہ اخلاق و سیاست، قومیت اور بین الاقوامیت، سرمایہ اور محنت کا ایک خوشگوار امتزاج پایا جاتا ہے۔ کاش کہ مسلمان اس اہم فریضہ کو سمجھیں اور اس عظیم الشان ذمہ داری کو اٹھانے کیلئے تیار ہو جائیں۔ وما توفیقی الا باللہ

اس اہم انسانی اسلامی فریضہ کی ادائگی کے لئے مندرجہ ذیل امور لازمی ہیں۔

۱۔ اولاً اسلامی تعلیمات، اسلامی تمدنی روح، اور عہد جدید کے تمدنی مسائل کا علم۔

۲۔ دوم ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ایک جمعیتہ اسلامی کا قیام جو اِن تعلیمات کی حامل اور اسلامی تمدنی روح سے لبریز ہو۔

ہندوستان کی بیشتر مسلم آبادی کو اسلامی تعلیمات کا بہت ہی ناکافی علم ہے۔ جدید انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ تو تقریباً محض لاعلم ہے، عربی مدارس کے فارغ التحصیل اسلامی تعلیمات سے واقف تو ہوتے ہیں لیکن وہ اسے چند مسائل میں ہی محدود سمجھتے ہیں اور ان کی نظر اس قدر کوتاہ ہوتی ہے کہ وہ اسلام کی ہمہ گیر روح کا مکمل احساس نہیں کر سکتے۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اسلام کا مقصد عبادت کے علاوہ عدل پر مبنی ایک اجتماعی نظام کی تشکیل بھی ہے اور یہ فریضہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ بعض حضرات جو روح اسلامی کی ہمہ گیریت سے واقف ہوتے ہیں وہ موجودہ تمدنی مسائل اور ان کی پیچیدگیوں کی لاعلمی کے باعث ان تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کا خاطر خواہ حل نہیں پیش کر سکتے۔ اسلام کا تصور ان کے ذہن میں بہت کچھ ایک جامد نظام کا ہے حالانکہ اسلام ایک حرکی اور نامی تصور زندگی ہے۔ برسوں کے بعد اسلام نے

نامی اور حرکی پہلو کو ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب The Reconstruction of Religious Thought in Islam
"اسلام میں مذہبی تصور کی نئی تشکیل" میں پیش کیا ہے۔ بہر حال اسلامی ہندی تمدن کے احیا کے لئے ازبس
ضروری ہے کہ ہمارے عوام تعلیم اسلامی سے اور ہمارے جدید تعلیم یافتہ اور علما اسلامی روح کی ہمہ گیریت
اور جدید تمدنی مسائل سے واقف ہوں۔ بغیر وحدت فکری کے وحدت عمل ایک ناممکن چیز ہے۔ اس وقت
اسلامی فکر میں جو انتشار پایا جاتا ہے۔ اس نے ایک جمعیتہ اسلامیہ کا قیام محال کر دیا ہے۔
ذہنی اعتبار سے لیکن اسلامی تعلیمات کا احساس اسلامی تمدن کی زندگی اور نشوونما کے لئے کافی نہیں
ہے۔ اسے مسلمانوں کی زندگی کا جزو ہو جانا چاہیئے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ان تعلیمات کے ساتھ مسلمانوں کے عمیق ترین جذبات کو وابستہ ہونا چاہیئے۔ جذبات کے ساتھ لیکن عملی
میدان میں قدم اٹھانے اور کامیاب ہونے کے لئے ایک مستقل ارادہ کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مستقل ارادہ
مسلمانوں میں استقلال اور تکالیف برداشت کرنے کی طاقت پیدا کر دے گا جس کے بغیر کسی مقصد میں بھی
کامیابی محال ہے۔

والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر
مندرجہ بالا خصائص کی حامل جو جماعت ہو گی وہ در اصل جمعیتہ اسلامیہ ہو گی جو موجودہ اسلامی ہندی
تمدن میں ایک نئی روح پھونک سکے گی اور اسے اس قابل بنا سکے گی کہ نہ صرف وہ مسلمانوں کے لئے
بلکہ ہندوستان اور تمام عالم کے ایک رحمت ثابت ہو۔ ایسی اسلامی جمعیتیں جنھوں نے نام تو اسلامی رکھ چھوڑا
ہے لیکن جو نہ اسلامی تعلیمات سے واقف ہیں نہ ہی اسلامی روح کی حامل، نہ اسلام کا مفاد اُن کے
پیش نظر ہے، در اصل اسلامی جماعتیں نہیں ہیں بلکہ منافقانہ جماعتیں ہیں جو اسلام کو نقصان پہونچا رہی ہیں
کیا ہمیں اسلامی مقاصد کے لئے ایک نئی جمعیتہ کی تشکیل کرنی چاہیئے یا موجودہ جمعیتوں ہی کو اس مقصد
کے لئے استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمیں موجودہ اسلامی ہندی سیاست کے قریب
لے آتا ہے۔ اس سوال کا جواب جو کچھ بھی ہو لیکن جو بھی جمعیتہ اسلامیہ ہونے کا دعویٰ کرے اسے

مندرجہ ذیل شرائط ضرور پوری کرنی چاہیئے ورنہ وہ قطعی اسلامیہ نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کی قیادت کا دعویٰ تو وہ قطعی نہیں کر سکتی جمعیۃ اسلامیہ کے اراکین کے لئے ضروری ہے کہ

۱۔ وہ صحیح عقائد اسلامی رکھتے ہوں۔

۲۔ وہ شعائر اسلامی یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ کو ادا کرتے ہوں۔

۳۔ وہ ملکی آزادی کے لئے جو ایک فریضۂ اسلامی ہے بیش از بیش قربانیاں دیں۔

۴۔ وہ ایک ایسے نظام معاشی کی تشکیل کی کوشش کریں جو عدل و مساوات پر مبنی ہو اور جس کے ذریعہ غربت و فلاکت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

۵۔ وہ اپنے دیگر تمام اعمال میں روح اسلامی سے سرشار ہوں اور زندگی کے دیگر تمام شعبوں میں اس روح کو عملی جامہ پہنانے کی عملی جدوجہد کریں۔

اس جماعت کا امیر کن خوبیوں کا انسان ہوگا اس کے متعلق ہمیں یہاں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات ہمارے ان خیالات کو رجعت پسندی پر محمول کریں گے لیکن بڑا تعجب ہے کہ اشتراکیین کی جماعت میں شریک ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان اشتراکی تعلیمات پر یقین رکھے، کسی مکمل قومی تحریک میں شرکت کے لئے اُن عقائد پر یقین رکھنا ضروری ہے جو اس جماعت کے ہیں لیکن اسلامی جمعیۃ کی رکنیت کے لئے اسلامی عقائد پر یقین رکھنے اور اسلامی اعمال کے مطابق زندگی بنانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہے روشن خیالی کی انتہا جس کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ جو لوگ جمعیۃ اسلامیہ کے قیام پر یقین نہیں رکھتے وہ نہ تو دراصل اسلامی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اسلامی تمدن کے قائل ہیں۔ ان حضرات کو حق ہے کہ ان خیالات کو رکھیں لیکن انھیں کم از کم یہ حق تو نہیں پہونچتا کہ وہ خود کو مسلمان کہیں۔ انھیں زیادہ اخلاقی جرأت کا ثبوت دینا چاہیئے اور صاف صاف جمعیۃ اسلامیہ سے علیٰحدہ ہو جانا چاہیئے کیونکہ اس طرح ان کے اخلاق کو سخت ضرب لگتی ہے اور ہماری صفوں میں کمزوری پیدا ہوتی ہے۔

اسلامی ہندی تمدن کے مستقبل کا تعلق آج کل ایک نئی تحریک سے وابستہ کر دیا گیا ہے جسے پاکستان کہتے ہیں۔ کیا واقعتاً ہندوستان کی تقسیم اسلامی ہندی تمدن کی بقا اور نشو و نما کے لئے از بس

ضروری ہے؛ تحریک پاکستان کا مکمل خاکہ ابھی تک پیش نہیں کیا گیا ہے اس لئے ابھی تک اس کا تصور بہت دھندلا سا ہے۔ لیکن ایک چیز اس میں صاف ہے وہ یہ کہ وہ ہندوستان کے ان حصوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ مثلاً پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو شمال مغرب میں اور بنگال و آسام کو شمال و مشرق میں ہندوستان سے آزاد کر دینا چاہتی ہے۔ اس راہ میں جو سیاسی اور معاشی مشکلات حائل ہیں وہ تو واضح ہیں مثلاً یہ کہ اس ملک میں جب تک انگریزی تسلط ہے یہ اسکیم کبھی بھی ایک عملی جامہ نہیں پہن سکتی۔ دوم یہ کہ ہندوستان کی دفاع کی تمام ذمہ داری شمالی مغربی صوبوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے لئے پچاس کروڑ روپئے سے بھی زیادہ سالانہ اخراجات ہوتے ہیں اور ان تمام صوبوں کی مشترکہ آمدنی پچیس کروڑ روپئے سے زائد نہیں ہے پچیس کروڑ روپیوں میں ان صوبوں کی حکومتوں کو چلانا اور قومی تعمیری کاموں کو انجام دینا ہی مشکل ہے کجا کہ دفاع کے لئے ایک کثیر رقم خرچ کی جائے۔ شمالی صوبوں کی مدافعت پھر ان صوبوں کی مدافعت نہیں ہے بلکہ تمام ملک کی مدافعت ہے۔ پھر اس کا تمام بار کیوں صرف ان صوبوں پر ڈالدیا جائے بنگال کی حالت تو اس بھی بدتر ہے کیونکہ وہاں تو ایسے لوگ بھی موجود نہیں ہیں جو فوجی ذمہ داریاں اٹھا سکیں

جو شخص بھی واقعتاً اسلامی ہندی تمدن کا احیا چاہتا ہے، اسے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ برطانیہ کی آغوش شفقت میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہندوستان کی مکمل آزادی شرط اولین ہے اور یہ تحریک ہندوستان میں افتراق پیدا کر کے ملک کی فضا کو کس قدر مکدر کر دیتی ہے کہ ملکی آزادی کے لئے ایک متحدہ محاذ کا قیام جس کے بغیر آزادی ایک خواب سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی محال ہو جاتا ہے۔ یہ تحریک دراصل مسلمانوں کو ایک خوشگوار طلسم میں مبتلا کر کے انھیں برطانوی شہنشاہیت کا آلہ کار بنا دیتی ہے۔ وہ ان کی سیاست کو حقائق کی دنیا سے علیحدہ کر کے تخیلات کے عالم میں پہونچا دیتی ہے جس سے قوم کے قوائے عملی کو شل کر دینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا فائدہ مرتب نہیں ہوتا ہمیں اس چیز کو فراموش نہ کرنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک وحدت ہیں، اُن کا مذہب، ان کی تاریخ اور ان کی موجودہ مشترکہ ضروریات انھیں باہم مربوط کئے ہوئے ہیں اور کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کر سکتی اور جو بھی اس کی کوشش کرتا ہے وہ دراصل ایک جسم کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں کاٹ ڈالنا چاہتا ہے جس کو دھوکہ میں مسلمان چاہیں قبول کر لیں لیکن علاوہ اس کیلئے

کبھی بھی رضامند نہیں ہو سکتے۔

پھر بفرض محال یہ صوبے انگریز اور ان صوبوں کی ہندو اقلیت کی مخالفت کے باوجود ہندوستان سے علیحدہ بھی ہو جائیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ واقعتاً اسلامی ریاستیں قائم ہو جائیں گی۔ ان صوبوں میں ہندو بھی کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں۔ اُن کا حکومت پر اثر انداز ہونا لازمی ہے وہ ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کے بعد بھی تقریباً ایک مشترکہ ہی حکومت ہو گی کیونکہ تمام انسانوں کے ساتھ انصاف اور رواداری نہ برتنا یقیناً اسلامی تعلیم کے خلاف ہے جب ہندوستان سے علیحدگی کے بعد بھی صرف صوبوں میں مشترکہ ہی حکومتیں قائم ہو سکیں گی تو ہم کیوں ملک کی وحدت کو ختم کر کے اسے اس قدر کمزور کر دیں کہ وہ شہنشاہیت کا ہمیشہ غلام بنا رہے۔ ہندوستان میں اٹھارویں صدی میں تقریباً ایسی ہی کیفیت تھی جیسے ہمارے پاکستانی حضرات چاہتے ہیں یعنی ہندوستان کے مختلف صوبے پنجاب، اودھ، بنگال، دکن وغیرہ آزاد ہو گئے تھے۔ اور ان میں مرہٹوں، نظام، سکھوں اور مسلم صوبہ داروں کی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ ملک کے اس انتشار کا جو انجام ہوا وہ ظاہر ہے جلد ہی ملک مغربی اقوام کا شکارگاہ بن گیا اور ایک قوم تو اس قدر مسلط ہو گئی کہ اب تک نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوستان کے مغرب اور مشرق میں جو ہولناک جنگ اسوقت جاری ہے اس کے باعث تو یہ خطرہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔ کیا یہ حضرات ملک کے موجودہ شہنشاہی اقتدار کے بقا کی کوشش فرماتے ہیں یا ہندوستان کو دوسری خارجی طاقتوں کی شکارگاہ بنانا چاہتے ہیں؟

ہمیں دراصل مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت کے تصور کے فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے۔ بعض مسلمانوں کی حکومت جابر و ظالم بھی ہو سکتی ہے جس طرح بعض مرتبہ تاریخ میں ہوا ہے۔ وہ حکومت ممکن ہے مطلق بھی اسلامی نہ ہو بلکہ اس کا تمام دارومدار ذاتی اغراض پر ہو اور ملک کو آزادی کی بجائے غلامی میں مبتلا کر دے اور عوام الناس کی خدمت کے بجائے خوب تباہ حال کرے۔ اس قسم کی حکومت چاہے اس کے حکمرانوں کے نام اسلامی کیوں نہ ہوں اسلامی نہیں کہی جا سکتی۔ اسلامی حکومت تو صرف وہی ہو سکتی ہے جو قومی آزادی برقرار رکھے، عوام الناس کی غربت دور کرے۔ اور ان کی اخلاقی و روحانی نشوونما کے لئے امکانات پیدا کرے۔ اس کے لئے ہندوستان سے علیحدہ ہو جانے کی اور ان صوبوں

یں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ان کو خطرہ میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم اس تصور کو اپنی زندگی کا جزو بنالیں اور ملکی تحریکات پر اپنی حرکی نفسی، قومی شخصیت کا اثر ڈالیں بیشک جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں اس تحریک کو زیادہ اثر انداز ہونا چاہئیے۔ کیونکہ وہاں کے صوبوں کی حکومتیں بھی مسلمانوں ہی کے زیر اثر ہوں گی لیکن اُن صوبوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہ کم اثر انداز نہیں ہو سکتے بشرطیکہ ان میں ضروری روح اور طاقت عمل موجود ہو۔ انقلابات میں اکثریت اور اقلیت کا سوال نہیں ہوتا بلکہ اس کا انحصار اس معنوی طاقت پر ہوتا ہے جو کسی قوم میں موجود ہوتی ہے۔ مسلمان ہندوستان کی سیاسی اور معاشی تحریکات کو ترقی پر ور بنانے میں بے انتہا مفید ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے اصل فریضہ سے واقف ہو جائیں۔

یہ خطرہ بے شک ہے کہ مرکزی حکومت میں ہندو اکثریت کہیں ان صوبوں کی آزادی بھی ختم نہ کر دے جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ اس کا تدارک اس طرح کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک وحدانی حکومت نہ قائم کی جائے۔ بلکہ ایک وفاقی حکومت ہو۔ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائے۔ صوبے اپنی خاص تمدنی روایات کے مطابق جس طرح چاہیں نشو و نما کریں۔ اس طرح ان صوبوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اسلامی تمدن کے خط و خال زیادہ واضح ہو سکیں گے اور ان صوبوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہ اپنی معنوی طاقت کے باعث ملک کی حکومت اور اس کے ذریعہ ملکی تمدن میں اسلامی رنگ غالب کر سکیں گے۔ مرکزی حکومت کو آپس کے معاہدہ کے ذریعہ کم سے کم اختیارات دے جائیں۔ صرف وہ اختیارات جو ہندوستان کے تحفظ اور بقا کے لئے ضروری ہیں مثلاً دفاع کے لئے فوجی انتظام، امور خارجیہ وغیرہ یا وہ جو ملک کی عام مرفہ الحالی کے لئے ضروری ہیں مثلاً ریلوے، جنگی، پوست ایک عام معاشی پروگرام کی تشکیل وغیرہ۔

اسلامی تہذیب و تمدن کی بقا اور نشو و نما کے لئے جو بھی امور ضروری ہوں وہ آئین میں بنیادی حقوق کی حیثیت سے شامل کر لئے جائیں اور یہ آئین اس وقت تک تبدیل نہ کیا جائے جب تک خود مسلمانوں کی عظیم الشان اکثریت اس کی تائید میں نہ ہو یہ ڈر کہ مسلمان اقلیت میں ہیں اور ہندوستان کی آزادی

کے بعد ہندو اس آئین کو ختم کر دیں گے اور اس طرح مسلمان دوبارہ خطرہ میں آ جائیں گے اس قدر لغو ہے کہ اس کا ذکر بھی بیکار معلوم ہوتا ہے۔ آٹھ کروڑ مسلمان اگر کسی چیز کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت اسے فنا نہیں کر سکتی۔ جو رہنمایان قوم یہ احساس کمزوری مسلمانوں میں پیدا کر رہے ہیں وہ دراصل مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ وہ مسلمانوں کو مفلوج کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ مسلمانوں سے اُن کی تاریخی روایات کو فراموش کروا دینا چاہتے ہیں۔ اقلیت اور اکثریت کے ذریعہ قومی مسائل طے نہیں ہوا کرتے بلکہ اس میں اصل معیار معنوی طاقت ہے وہ معنوی طاقت جو قوموں کو اپنے مقاصد کے لئے اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لینا سکھا دیتی ہے، خون کو پانی کی طرح ارزاں کر دیتی ہے

اسلامی ہندی تمدن کی بقا اور نشو و نما غرضیکہ اس معنوی طاقت پر منحصر ہے جو مسلمانان ہند اپنے آپ میں پیدا کریں گے۔ دوسری اسلامی اقوام مثلاً ترک، ایرانی وغیرہ شاہراہ آزادی پر گامزن ہو چکی ہیں۔ ان میں ایک نئی زندگی کا خون دوڑ چکا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ اقوام مغرب سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ ان ممالک میں جدید تعلیم یافتہ اکثر مذہب سے ناواقف تھے اور علما حد سے زیادہ رجعت پسند اور جدید تمدنی مسائل سے لاعلم۔ ان دونوں طبقوں میں کش مکش لازمی امر تھی۔ اس کش مکش میں علما کی شکست ہوئی جس کے باعث مذہبی سررشتہ سے وہاں کی تمدنی زندگی آزاد ہو گئی۔ اس طرح یہاں مادی اور تمدنی ترقی میں وہ صحیح امتزاج نہ پیدا ہو سکا جو تمدن اسلامیہ کے لئے ضروری ہے۔ خوش قسمتی سے اب ان اقوام میں دوبارہ رد عمل شروع ہو گیا ہے اور امید ہے کہ جلد ہی ایک صالح اسلامی تمدن پیدا ہو سکے گا لیکن اس سلسلہ میں رہنمائی ہندی مسلمانوں کی قسمت میں لکھی گئی ہے۔

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

ہندوستان کے علما جدید تمدنی مسائل سے بالکل غافل نہیں ہیں۔ ملک کی آزادی کی جد و جہد میں انھوں نے رہنمائی کی ہے۔ ایثار و قربانی اور استقامت راہ کی انھوں نے وہ شاندار روایات قائم کی ہیں جو ملت اسلامیہ کے لئے باعث فخر ہیں۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی یہاں مذہب سے وہ سرکشی دکھائی نہیں دیتی جو دوسرے ممالک میں ہے۔ اگر یہ دونوں طبقے متحدہ کوشش کریں تو ایک ایسے تمدن کی تشکیل

کر سکتے ہیں جس کی بنیاد انسانیت کی حقیقت اصلی یعنی روح کلی پر استوار ہو گی۔ جو ماضی کی تمام شاندار اور مفید روایات کا حامل ہو گا۔ جو حال کے تمام تمدنی یعنی مذہبی، اخلاقی، قومی، بین الاقوامی، سیاسی اور معاشی مسائل کا حل پیش کرے گا۔ اور اس طرح انسانیت کی ایک شاندار مستقبل کی طرف رہنمائی کر سکے گا۔ یہ اسلامی ہندی تمدن ایک طرف تو ہندوستان کی تمدنی تحریکات پر اثر انداز ہو گا اور اسے رجعت پسندی سے نکالکر ترقی کی راہ پر چلائے گا، دوسری طرف وہ ممالک اسلامیہ پر اثر ڈالے گا اور انھیں مغرب کے بڑھتے ہوئے سیلاب الحاد و دہریت، سرمایہ داری اور شہنشاہیت سے بچائے گا۔ یہ مشرق کی بیدار روح کا ایک مظہر ہوگا جو مغرب پر پھر اپنی روحانی، معنوی طاقت کے ذریعہ اسی طرح اثر انداز ہو گا جس طرح مشرق متعدد بار تاریخ میں ہو چکا ہے۔ یہ جارحانہ قومیت کے بجائے انسانیت، جنگ و جدل کی بجائے محبت و احترام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کرے گا۔ اس طرح دنیا کی آزادی، عدل، امن اور نشو و نما کے لئے ایک نئے باب کا افتتاح کر سکے گا۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب بی۔ اے (جامعہ)
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (برلن)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

(گذشتہ سے پیوستہ)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری کے محاسن اور معائب | مولانا کی تنقیدیں اپنے محاسن کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں اور خوبیوں کے اعتبار سے دنیا کی بہتر سے بہتر تنقیدوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں۔ ان میں خامیاں بہت ہی شاذ و نادر اور خوبیاں بکثرت ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کا ذکر مثالوں کی روشنی میں حسب ذیل ہے۔

(۱) **زبان اور علم و ادب پر عبور**:۔ مولانا عبدالحق زبان اور ادب کے معاملات میں اس دور کے قابل اور مستند اہل رائے میں سے ہیں۔ الفاظ، محاورے اور ضرب الامثال کے معانی و مطالب اور ان کے موقع و محل استعمال کے متعلق آپ کی رائے وقیع ہوتی ہے ان مسائل پر آپ کی توضیح و تشریح اکثر آخری فیصلہ ہوتی ہے۔ آپ نے اگر ایک طرف ہمیشہ دلی کی ٹکسالی زبان کے ماحول میں پرورش پائی ہے تو دوسری طرف اپنی عمر کا کافی حصہ زبان دانی کے مسائل کی تحقیق و جستجو میں صرف کیا ہے فارسی، عربی، ہندی اور دکنی الفاظ جن سے کہ اردو کے زیادہ تر الفاظ ماخوذ ہیں ان پر آپ کو کافی عبور حاصل ہے۔ الفاظ کے مادوں اور ان کے معانی کا آپ نے بغور مطالعہ کیا ہے جس کا کچھ اندازہ آپ کی اس تنقید سے کیا جا سکتا ہے جو "سرگذشت الفاظ" پر کی ہے۔ چنانچہ "جلاب" اور "رضائی" کے متعلق مصنف کتاب کا خیال پیش کرنے کے بعد اس پر تنقید کی ہے۔

"جلاب انگریزی میں جیلپ، میکسیکو کے ایک شہر جلاپا کے نام سے ہے" قابل مؤلف نے یہ نئی بات لکھی ہے جو درست نہیں معلوم ہوتی۔ ہماری تحقیق میں یہ لفظ گلاب کا معرب ہے کڑواہٹ سے بچنے کے لئے مسہل کے استعمال ہونے لگا ہے۔ "رضائی محمد رضا موجد کے نام پر ہے" جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ لفظ دراصل "رزائی" ہے۔ چونکہ عموماً یہ رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے اس لئے یہ نام پڑ گیا۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳)

اسی طرح "متوالا" کی تشریح کرتے ہیں۔

"وہ (یعنی مصنف کتاب) اسے مت (سمجھ، عقل) اور والا سے مرکب سمجھے ہیں حالانکہ یہ لفظ "مد" اور "والا" سے مرکب ہے۔ مد کے معنی ہندی اور سنسکرت میں شراب اور مستی کے ہیں۔ کثرت استعمال سے "د" "ت" سے بدل گئی ہے۔ ان دو حرفوں کا بدل باہم ہوتا ہے۔" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳)

"بھانا" اور "پسند آنا" کا فرق اس طرح بیان کیا ہے۔

"بھانا بھی متروک ہے حالانکہ اس کی بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں ہے۔ "پسند آنا" اور "پسند کرنا" میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور "بھانا" وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ و اختیار کے دل کو خود بخود اچھی معلوم ہوتی ہے۔

"پرے" اور "ادھر" کا فرق بھی خوب بیان کیا ہے۔

"کہتے ہیں کہ "پرے" کا لفظ بھی متروک ہے لیکن جب یہ عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ "ادھر" مگر "پرے" اور "ادھر" میں بہت فرق ہے۔ "ادھر" سمت کو بتاتا ہے اور "پرے" بُعد کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا کی زبان دانی کی ایک اور مثال "فیضان شوق" کے تبصرہ کے حوالے سے نقل کرتے ہیں جس میں آپ نے حضرت شوق قدوائی جیسے مستند زبان داں اور استاد محاورہ کی غلطی نکالی ہے۔ شوق نے ایک شعر میں "آہیں کھینچ دینا" استعمال کیا ہے اس پر آپ لکھتے ہیں۔

"آہیں کھینچ دینا یا کھینچ لینا، دونوں ٹھیک نہیں "آہیں کھینچیں" ہی فصیح معلوم ہوتا ہے۔

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۴۲)

قواعد زبان پر بھی مولانا عبدالحق مستند سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ

"قواعد اردو" اور "صرف و نحو اردو" آپ کی مستند اور معرکۃ الآرا تصانیف ہیں

زبان کے مسائل پر عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ مولانا اردو ادب کے ہر شعبے پر حاوی ہیں خصوصاً تاریخ ادب اردو پر آپ کی رائے بلا چون و چرا تسلیم کی جاتی ہے اور آپ کا ہر قول سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے دکنی زبان کے متعلق آپ نے جو تحقیقیں کی ہیں وہ اپنی نوعیت اور اہمیت کے اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہیں گی

اس سلسلہ میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، نصرتی، سب رس، قدیم اردو یعنی دکن کا ایک شاعر خاندان اور ان کے دوسرے فاضلانہ مقدمے معرکۃ آلارا اور تاریخی اہمیت کے مالک تحقیقی کارنامے ہیں۔ علاوہ ازیں مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر، اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، مرحوم دہلی کالج اور فورٹ ولیم کالج کے متعلق جو معلومات پیش کی ہیں وہ ہماری تاریخ ادب میں بیش بہا اضافے ہیں۔ یہ عظیم الشان تحقیقیں نہایت ہی صبر اور محنت سے انجام دی ہیں۔ ان کے لئے انھوں نے جہاں سینکڑوں قدیم کتابیں حاصل کیں ان کا اور اس دور کی کتابوں کا گہرا مطالعہ کیا وہاں خود عملی کوششیں بھی کیں۔ چنانچہ بیجاپور میں نصرتی کی قبر تلاش کرنے کے لئے نہ معلوم کتنی زحمتیں برداشت کیں۔ غرضکہ مولانا نے تاریخ ادب کے متعلق بہت ہی محنت اور کاوش سے تحقیقیں کی ہیں جو کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی ادبی تحقیقاتوں سے کسی حیثیت سے کم درجہ کی نہیں۔

مولانا کے تحقیقی کارناموں کو گنانے کے بعد اردو ادب کے متعلق ان کی معلومات کی مثالیں پیش کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن پھر بھی بعض تنقیدوں میں وہ جس طرح اپنی ادبی معلومات کا اظہار کرتے ہیں وہ ان کے کمال کی بہترین دلیلیں ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر گراہم بیلی کی کتاب "اردو لٹریچر" پر تبصرہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"قصہ ابوشحمہ کا مصنف محمد امین نہیں ہے۔ میرے پاس اس کے متعدد نسخے ہیں کسی میں امین یا محمد امین نہیں آیا بلکہ ہر نسخہ کے آخر میں اس کا نام "اولیا" لکھا ہوا ہے"

"سودا کے متعلق لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا حالانکہ دہلی میں ۱۱۶۵ھ سے قبل دربار دہلی سے یہ خطاب مل چکا تھا میر نے بھی اس کا ذکر کیا ہے"

"ملک خوشنود کی ایک تصنیف "یوسف زلیخا" بتائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ امیر خسرو کی یوسف زلیخا کی پیروی میں لکھی گئی ہے۔ خوشنود نے یوسف زلیخا نہیں لکھی اور نہ امیر خسرو کی تصنیف سے کوئی مثنوی یوسف زلیخا ہے" (چند تنقیدات عبدالحق)

الفاظ، محاوروں اور تاریخ ادب کے علاوہ مولانا سخن فہمی میں بھی ملکہ رکھتے ہیں۔ نصرتی کے کلام کی جو خوبیاں بیان کی اور مقدمہ انتخاب کلام میر میں جن اشعار کا انتخاب کیا ہے اور انھیں جس خوبی سے سمجھایا ہے

جن باریکیوں اور نکات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ سخن فہمی اور ذوقِ سلیم کی دلیل ہے لیکن ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ شاعری پر آپ کی نگاہ اس قدر گہری نہیں پڑتی۔ اسی لئے آپ کی وہ تنقیدیں جو شاعری پر ہیں تشنۂ تکمیل ہیں۔

مولانا جہاں شاعری کی خوبیاں اور نکات سمجھا سکتے ہیں وہ شاعری کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ شوق جیسے مستند شاعر کے کلام پر خوب تنقید کی ہے ؎

کچھ شباب آتے ہی آج اس پر توکل اسیر تم　　　اک ذرا سا حسن کیا پایا کہ تو اترا گیا

"اس میں زبان کا جو لطف ہے وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں لیکن پہلے مصرعے میں، کچھ، کچھ یونہی سا ہے اور دوسرے میں ذرا سا حسن، معشوق کے لئے کتنا صحیح ذوقِ محبت کے منافی ہے۔

سچ یہ ہے کہ حضرت شوق کی شاعری محبت کی شاعری نہیں بلکہ رسمی غزل گوئی تلازمہ و محاورہ بندی ہے" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۴۱)

(۲) وسعتِ علم:- مولانا عبدالحق نے اردو ادب میں نئی جان ڈالی ہے۔ آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ ادب کی روح علم اور تحقیق ہے محض الفاظ کے داؤں پیچ اور ترکیبوں کے ہیر پھیر سے اثر نہیں پیدا ہوتا بلکہ وہ ادیب کا علم اور اس کے خیالات ہیں جو اس کے الفاظ میں جان ڈالتے ہیں اس لحاظ سے آپ کی تنقیدیں وسعت تحقیق کی سرمایہ دار ہوتی ہیں۔ جن کا ہر ہر جملہ مطالب اور معانی سے پُر، اچھوتے خیالات اور نئی تحقیقات کا حامل ہوتا ہے

مولانا عبدالحق کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انگریزی زبان اور ادب پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ اسی لئے جدید خیالات اور یورپین زبانوں کے ادب سے بھی انھیں واقفیت ہے۔ اگر سرسید، حالی اور شبلی نے مغربی زبانوں کو جانے بغیر صرف ان کے اثر سے ہمارے ادب میں اس قدر اہم تبدیلیاں کیں، ادب کی نئی اصناف کو، افسانہ نویسی اور تنقید نگاری کو جاری کیا، عبارت آرائی اور لفاظی کو چھوڑ کر زبان میں سادگی اور معانی آفرینی پیدا کی تو مولانا عبدالحق جنھوں نے اس زبان کے مختلف طرز تحریروں کا گہرا مطالعہ کیا ہے جنھوں نے انگریزی کی مدد سے فرانسیسی ادب کی اکثر بلند پایہ تصانیف اور اصنافِ سخن کو سمجھا ہے جو جدید خیالات اور زندگی کے

مقاصد سے بہتر طور پر واقف ہیں انھوں اپنے پیشروؤں کی ابتدائی کوششوں کو تکمیل تک پہونچایا ہے۔ خصوصاً تنقید نگاری کو جس کی بنیاد حالی اور شبلی نے رکھی تھی جہاں ان کی تحریروں میں انگریزی کی سادگی پائی جاتی ہے وہاں ان کے مقدمے اور تنقیدات میں رینان (M. Renan) اور سینٹ بیو (M. Sainte Beuve) کی جھلک بھی ہے اور ان کے خیالات مغربی ادب اور علوم سے متاثر نظر آتے ہیں جس کی مثالیں ان کی تنقیدات میں اکثر ملتی ہیں۔ اور کبھی کبھی مغربی خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں جس سے کہ ہماری زبان کی استعداد میں اضافہ اور خیالات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔

بی۔ اے میں مولانا کے مضامین تاریخ اور فلسفہ تھے چنانچہ تاریخ کا نمایاں اثر آپ کی تحقیقات اور معلومات ادب کے سلسلہ میں دیکھ چکے ہیں اسی طرح فلسفہ کا اثر بھی آپ کی تنقیدوں میں بہت نمایاں ہے۔ آپ کے ہاں اعلیٰ علمی مباحث اور اُن پر منطقی غور و فکر اور مدلل طرز تنقید نہایت ہی قابل قدر چیزیں ہیں۔ اگر مولانا کی قابلیت اور فلسفیانہ طرز تنقید کا مشاہدہ کرنا ہو تو مقدمۂ معرکۂ مذہب و سائنس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ چنانچہ اسی میں ایک جگہ جذبات کے متعلق لکھتے ہیں۔

"جذبات درحقیقت عقلی اور دماغی حرکت کا سرچشمہ ہیں اور ان کی نشو و نما انسان کی بہبودی اور ترقی کے لئے ایسی ہی ضروری ہے جیسی قوائے عقل کی نشو و نما۔ خیالات اور جذبات کا تعلق ایسا گہرا ہے کہ وہ عموماً ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کام کرتے ہیں لیکن بعض اوقات ان میں ان بن ہو جاتی ہے مثلاً خواہش کا رجحان، ایک خاص طرف ہے مگر عقل کہتی ہے کہ یہ ٹھیک نہیں اور یہ بھی بنائے مخاصمت ہوتی ہے"

(مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۶۲)

اسی مقدمے میں ایک جگہ سائنس دانوں کے ایک اعتراض کا جواب خوب دیا ہے۔

"یہ کہنا کہ انسانوں کو خود سے یہ خیال پیدا ہوا اور خدا کا خیال بھوت، پریت سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ دیگر مظاہر قدرت کی پرستش سے ایک خدا تک پہونچا۔ لہذا خدا کا خیال بے بنیاد ہے، صحیح نہیں۔ کیونکہ مختلف مرحلے طے کر کے کسی شے تک پہونچنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ شے بے اصل ہے۔ دنیا کے تمام اعلیٰ خیال، فلسفہ اور سائنس کے تمام اصول۔ تمام ایجادات اور

تمام اختراعات کو اگر بہ نظر غور دیکھا جائے اور ان کی تحقیق کی جائے تو ان کی اصل انھیں وحشیوں تک پہونچے گی جہاں سے کہ ہم نے خدا کے خیال کا سراغ لگایا ہے یہ چیزیں وارثاً ملی ہیں اور اسی طرح ایک دوسرے تک پہونچتی رہیں گی۔ (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۹)

اس قسم کے علمی اور فلسفیانہ مسائل مولانا کی تنقیدوں میں اکثر پائے جاتے ہیں جس سے ان کی علمیت اور وسعت معلومات کا اندازہ ہوتا ہے یہی مولانا کی امتیازی چیز ہو جو انھیں ان کے پیشروؤں اور اکثر ہمعصروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے جیسی عالمانہ سنجیدگی، حقیقت نگاری، مدلل طرز تنقید، جدید خیالات اور علوم کے متعلق معلومات کسی دوسرے اُردو نقاد کے ہاں کمتر پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریریں خود ادبی نکات اور معلومات کا مخزن ہوتی ہیں اور یہی نقاد کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ وہ تخلیق ادب کے لیے صحیح اور سچے خیالات کی فضا پیدا کر سکے اور ادیبوں کے لیے نئی نئی جولانگاہیں تلاش کرے تاکہ لوگ ایک ہی میدان کو اپنی تخلیقی قوت سے پامال نہ کریں۔

(۳) قوت فیصلہ:- مولانا عبدالحق بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے غیر معمولی طور پر بہت اچھی قوت فیصلہ رکھتے ہیں۔ خیالات کی گہرائی اور وسعت تحقیق کی وجہ سے آپ ادبی معاملات میں خود اپنا نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ایک مفکر، محقق اور عالم کی حیثیت سے مولانا دوسروں کے خیالات کو بھی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور اپنے نقطہ نظر سے مقابلہ کر کے دلائل و براہین کے ساتھ کسی ایک نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں۔ اسی کا نام قوت فیصلہ ہے اور اس کی مثالیں بدرجہ اتم مولوی صاحب کی تنقیدوں میں ملتی ہیں۔ مولانا کے جس قدر بھی مقدمات اور تبصرے ہیں ان میں صحیح معنوں میں ریسرچ تحقیق کی شان پائی جاتی ہے۔ جس میں وہ اپنے نقطہ نظر کو دوسروں کی رایوں کے مقابلے میں صحیح طور پر پرکھتے اور جانچتے ہیں۔ وہ تخیلات کی بلند پروازی سے بچتے ہیں اور منطقی طور پر بال کی کھال نکالتے ہیں اور جب تک روایت کو دلائل کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ نہیں لیتے اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتے اسی لئے ان کی رائیں بہت ہی صائب اور مدلل ہوتی ہیں۔

(۴) انصاف:- تنقید کی جان انصاف اور بے لوثی ہے کوئی شخص کتنا ہی بڑا ادیب اور کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو۔ اس کے فیصلے اور تنقیدیں اس وقت تک تسلیم نہیں کی جا سکتیں اور نہ مقبول ہو سکتی ہیں جب تک کہ

وہ خلوص، صداقت اور اصلیت پر مبنی نہ ہوں۔ مولانا عبدالحق کے مقدمے اور تنقیدیں ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے پاک ہوتی ہیں۔ وہ صوبہ وارانہ اور شخصی فرقہ بندیوں سے کہیں بلند ہیں۔ ان کے ہاں علم سے بحث علم کی خاطر ہوتی ہے بمخصوص نقطہ نظر اور خیالات پیش کرنے کے لئے نہیں۔ وہ تنقید چیزوں کو ان کی ذاتی اور اصلی روشنی میں دیکھ کر کرتے ہیں۔ ذاتی عقائد اور معتقدات کے دھندلکے میں نہیں۔ چنانچہ حیات النذیر کے مقدمے میں جہاں "امہات الامہ" کے جلائے جانے کا ذکر کرتے ہیں وہاں مولویوں کے طرز عمل پر بلا کم وکاست کتنی اچھی اور صحیح رائے دی ہے

"اس رات کو گویا مولویوں نے شب برات منائی اور اس آگ سے اپنے نفوس مطمئنہ کو ٹھنڈا کیا اور اپنے اعمال ناموں میں ایک ایسی بڑی نیکی کا اضافہ کیا جو غالباً ان کی نجات اخروی کا باعث ہوگی۔ یہ ان بزرگوں کا کام ہے جنھوں نے چشم بد دور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کا بیڑا اٹھایا تھا" (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۲۰۴)

مولانا تنقید لکھتے وقت سوائے حق اور ادب کے مطالبات کے اور تمام چیزوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور خوبیوں اور نقائص پر غیر جانبداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں حتیٰ کہ ایک حساس دل اور قوم و ملک کی آزادی اور ترقی کا صحیح جذبہ رکھنے کے باوجود قومیت کو بھی تنگ نظری سمجھتے ہوئے اسے اپنی تنقیدات میں کبھی داخل نہیں ہونے دیتے۔ جس کی بے نظیر مثال یہ ہے کہ آپ نے فورٹ ولیم کالج اور ڈاکٹر گلکرسٹ کی ادبی خدمات کی داد دینے میں جس قدر غیر جانبداری سے کام لیا ہے وہ ایک سچا نقاد ہی کر سکتا ہے اسی طرح آپ دہلی کالج کے متعلق اردو لٹریچر کے تبصرے میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر صاحب نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے مترجمین کا ذکر تو تفصیل سے کیا ہے لیکن دہلی کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی، اور اس کے مترجمین کا مطلق ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ ان کا کام فورٹ ولیم کالج کے مترجمین سے کہیں زیادہ اور قابل قدر اور اہم تھا۔ فورٹ ولیم کالج کا کام زیادہ تر صرف افسانوں اور قصہ کہانیوں تک رہا مگر دہلی کالج کے مترجمین نے حقیقی علمی کام کیا۔ اس کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں نہایت ضروری تھا" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۶۰)

مولانا عبدالحق اپنے لب ولہجہ میں اعتدال کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ بڑی بڑی خامیوں کی طرف اشارہ نہایت ہی پرلطف انداز میں کر جاتے ہیں چنانچہ تذکرہ اعجاز سخن، جسے شاعروں کی ایک ڈائرکٹری سمجھنا زیادہ بہتر ہوگا اور جس میں مصنف نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو پنجاب سے نکلی ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ پنجاب کی پیداوار گیہوں ہے اور گیہوں مقوی دماغ ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اردو پنجاب میں پیدا نہ ہوئی ہو۔ اس کے متعلق مولانا لکھتے ہیں۔

"غرض کہاں تک لکھوں کتاب کیا ہے ایک سمندر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قابل مؤلف کی نظر بہت وسیع ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ذوق سلیم ہزارہا دفتر پڑھنے کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ اس تذکرے میں اعلیٰ سے اعلیٰ رایوں کے ساتھ ادنیٰ سے ادنیٰ مضحکہ خیز خیالات اس طرح ملا کر رکھدئے گئے ہیں کہ ذوق صحیح پر گراں گذرتا ہے۔"

مولانا کی تنقیدوں کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے لب ولہجہ میں سختی اور ان کی تنقید نگاری میں محتسب کی شان پائی جاتی ہے اور اس کی مثال میں وہ "اصلاح سخن" اور "اردو لٹریچر" کے تبصروں کو پیش کرتے ہیں لیکن ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ مولانا کی تنقید کا نہ یہ عام رنگ ہے اور نہ انھوں نے ان تبصروں میں سختی سے کام لیا ہے۔ ان کی تنقیدوں میں علمیت، تحقیق اور صائب رائے کے ساتھ ساتھ نرمی کا اثر ضرور پایا جاتا ہے مگر یہ ان کی عمر، وسعت تجربہ، گہرا مطالعہ اور ذوق سلیم کے شایان شان ہے۔ اس قدر مسلم الثبوت اور مستند نقاد ہونے کی حیثیت سے ان کی تنقیدوں کو ایسا ہونا بھی چاہئے ورنہ ان لوگوں کو جو بے راہروی کی طرف مائل ہوں روکنا مشکل ہوگا۔

مولانا اکثر مصنفین کی خامیوں کی طرف اشارہ کرنے کا بہت اچھا انداز رکھتے ہیں لیکن بعض تنقیدوں میں کبھی کبھی ایسے طرز بھی نظر آتے ہیں جس سے کہ مصنف کی خامیاں بہت ہی نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اردو لٹریچر کے تبصرے میں غلطیوں کی ایک طویل فہرست دی گئی ہے جس سے تصنیف کے متعلق بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ مگر مولانا کیا کر سکتے تھے جب غلطیاں ہی اس قدر کثرت سے ہوں۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدوں میں ہمت شکن جملے بھی شاذ و نادر مل جاتے ہیں جن سے آپ کی انصاف

پسندی پر تو کوئی حرف نہیں آتا مگر مصنف کے لئے بہت ہی ہمت شکن ہوتے ہیں مثلاً
"اس کتاب میں بھی وہی خامی پائی جاتی ہے جو مصنف کی ہر کتاب میں نظر آتی ہے"
(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۷)

ایک جگہ اور ہے۔
"ڈاکٹر صاحب کی حیثیت ایک ناقل کی سی ہے اور مشہور ہے کہ نقل میں عقل کو بہت کم دخل ہوتا ہے۔ اس لئے ان سے جگہ جگہ لغزشیں سرزد ہوتی ہیں" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۵۹)

مولانا کے انصاف کا کمال یہ ہے کہ ان کی ادبی عدالت میں مسلمہ شہرت کے مالک اور نوآموز اور غیر معروف مصنف کا ایک ہی درجہ ہے۔ وہ نہ اس سے مرعوب ہوتے ہیں اور نہ اس سے بدظن چنانچہ مکاتیب امیر مینائی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"ہمیں حضرت امیر مرحوم کے خطوط پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ تقریباً تمام خطوط بے لطف، بے مزہ اور روکھے پھیکے ہیں۔ نہ کہیں ادبی نکات فرمائے ہیں اور نہ کہیں شعر و سخن پر ایسا خیال ظاہر فرمایا ہے کہ پڑھنے والے کو بصیرت ہو" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۷)

اسی طرح پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کی کتاب "زبان اردو پر سرسری نظر" پر تنقید کرتے ہوئے ان کے اس قول پر کہ "غالب کی شاعری ایک حد تک صرف ہائے وہو اور ناؤنوش کی ترجمان ہے" اس طرح تنقید کرتے ہیں۔ یہ ان کے طرز تنقید کا صحیح نمونہ ہے۔

"یہ رائے ایک ایسے شخص کے قلم سے نکلی ہے جس نے اردو ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے خود بھی ادیب ہے اور یونیورسٹی میں اردو کا لکچرار بھی اور اس لئے نہایت حیرت انگیز ہے۔ ناپسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مرزا کی شاعری میں کوئی "پیغام" نہیں ملتا۔ کیا شکسپیر کی شاعری میں جو سرتاج شعرائے عالم ہے کوئی پیغام ملتا ہے۔ ایک نہیں کئی کئی یہی حال مرزا کی شاعری کا ہے۔ کیا یہ کچھ کم ہے کہ مرزا غالب نے اردو شاعری کو پستی سے نکال کر کہیں کا کہیں پہونچا دیا۔ غزل میں عام روش اور تقلید سے آزاد ہو کر نیا رنگ

پیدا کیا (لیکن شاید صدیقی صاحب غزل میں کسی اصلاح کے قائل نہیں) خیالات کی جدت تخیل کی بلندی اور بیان کا جو لطف مرزا کے ہاں پایا جاتا ہے وہ اردو کے کسی شاعر میں نظر نہیں آتا میں ایسے کئی صاحبوں کو جانتا ہوں جنھیں مرزا کے مختصر دیوان میں وہ پیغام ملے ہیں جو کسی دوسرے پیغام میں کیا مذہب و اخلاق کی کتابوں میں بھی نہیں ہیں۔ اور ان پر مرزا کے کلام کا خاص اثر ہوا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اگر مرزا غالب نہ ہوتے تو حالی اور اقبال بھی نہ ہوتے۔ مرزا غالب کا اثر اردو شاعری پر عجیب و غریب ہوا ہے اور رہے۔ کیا بغیر کسی پیغام کے یہ ممکن ہے" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱)

مولانا کی تنقید نگاری کا بڑا کمال یہ ہے کہ تنقید کا اعلیٰ اور پاکیزہ معیار بھی قائم رکھتے ہیں اور مبتدیوں اور نومشقوں کی ہمت افزائی میں بھی دریغ نہیں کرتے چنانچہ پروفیسر محمود شیرانی کے متعلق اپنے ایک خطبہ میں لکھا ہے۔

"اس وقت بھی ہم میں ایسے قابل نقاد موجود ہیں جیسے پروفیسر شیرانی یا اور لوگ جنھیں ابھی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ یا جو فی الحال اپنے کام میں مشغول ہیں جو حال کے ادب میں اپنی قابل قدر یادگار چھوڑ جائیں گے" (خطبات عبدالحق صفحہ ۱۴)

"اکبر الہ آبادی" مؤلفہ طالب الہ آبادی پر تنقید کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"طالب صاحب نے جس تحقیق و محنت و تلاش سے اکبر کے حالات لکھے ہیں۔ اور ان کے کلام کی خوبیوں کو دکھایا ہے وہ اب تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اکبر کے جو حالات محنت اور تحقیق سے جمع کئے ہیں ان کی صحت میں کلام نہیں ہو سکتا اور اس سے زیادہ امید نہیں کہ کوئی دوسرا جمع کر سکے" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۳۲)

مکاتیب امیر مینائی پر تبصرہ کرتے ہوئے مرتب کتاب مولوی احسن اللہ خاں ثاقب کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اسی دیباچہ میں انھوں نے امیر کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جو بلاشبہ منصفانہ اور ایک حد تک بے لاگ ہے جس کی توقع ان کے کسی شاگرد سے نہیں ہو سکتی" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۴)

مولانا کی تنقیدیں اُردو ادب میں غیر جانبداری۔ انصاف اور سچائی کا بہترین نمونہ ہیں۔ جس میں خلوص اور بے نفسی کی بو آتی ہے۔ اور اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تنقید نگاری ذاتی اغراض و مقاصد سے بلند ہو کر صرف زبان و ادب کی ترقی کی خاطر کر رہے ہیں اور یہی صحیح تنقید ہے جو کہ آپ کی تنقیدوں اور تحریروں کے ہر ہر جملے سے نمایاں ہے لیکن انسان خالی از خطا نہیں۔ چنانچہ مولانا عبدالحق اپنی تمام خوبیوں کے باوجود مولانا شبلی کے معاملہ میں اپنی غیر جانبداری کے اعلیٰ معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔ حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک کی وجہ سے آپ کی تنقیدوں میں ایک کی حمایت اور دوسرے کی مخالفت کی جھلک آ ہی گئی ہے چنانچہ مقدمۂ حیات النذیر، میں "ہماری قوم کے ایک علامہ کے قول" کو پیش نظر رکھ کر تاریخی شخصیتوں کے حالات زندگی اور اپنے زمانے کی شخصیتوں کے حالات زندگی لکھنے کی مشکلات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> علامہ موصوف کو کسی ہمعصر نامور شخص کی (بشرطیکہ وہ کسی ہمعصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ انھیں اس سے زیادہ دشواری پیش آئی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر "سوانح عمری" لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انھوں نے اب تک انہیں قدمائے کرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے جنھیں لوگ ایک زمانہ سے پوجتے آئے ہیں اور جن کی تنقید و نکتہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے۔ تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اُس "پر فریب طریقہ" سے پاک و صاف ہیں۔" (مقدمات عبدالحق حصہ اول صفحہ ۱۹۴)

مولانا نے عطیہ بیگم کے نام کے مولانا شبلی کے خطوط شائع کر کے بڑی زیادتی کی۔ آپ کو یہ معلوم تھا کہ جیسا کہ خطوط اور مقدمے میں خود واضح ہے کہ مولانا شبلی اپنے ان تعلقات کو بالکل پرائیویٹ سمجھتے تھے اور انھیں پردہ عام پر لانا نہیں چاہتے تھے لیکن پھر بھی مولانا عبدالحق صاحب نے ان خطوط کو شائع کر دیا اور اپنے اوپر ان الفاظ کا اطلاق کر لیا جن کو شوق سندیلوی کے متعلق "اصلاح سخن" پر تبصرے کے دوران میں خود لکھا تھا

> "ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بغیر اجازت کے شائع کرتے۔"
>
> (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۱۰)

علاوہ ازیں مقدمہ خطوط عطیہ بیگم" میں جہاں مولانا شبلی کی بعض کمزوریوں کو نمایاں کرنے میں غلطی کی گئی ہے

وہاں مندرجہ ذیل ریمارک بھی مولانا کی تنقید نگاری کے شایان شان نہیں۔

"مولانا شبلی جیسے اکل کھرے تنگ مزاج یہ لکھیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے اخلاص و محبت کی نوبت کہاں تک پہونچ گئی تھی۔" (مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۱۳)

ایک جگہ اور لکھتے ہیں۔

آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں کوئی نہیں بچ سکتا وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتب خانوں میں نظر آئیں گی۔" (مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۱۵)

مولانا عبدالحق کی شبلی کے ساتھ زیادتی کا احساس مولانا حالی کو بھی تھا جس کا اندازہ ان کے مندرجہ ذیل خط سے ہوگا۔ جو کہ انھوں نے مولوی صاحب کو لکھا تھا۔

"جن لوگوں کو آپ نے اس غرض سے انتخاب کیا ہے کہ ان پر کرٹکل اسے (Critical essay) لکھے جائیں ان میں سے ایک شخص کا نام ہونے سے اور ایک شخص کا نہ ہونے سے تعجب ہوا۔ مولوی سید احمد میرے نہایت دوست ہیں ...... مگر ماڈرن اردو لٹریچر کا ہیرو میں ان کو نہیں کہہ سکتا اور اس سے بھی زیادہ تعجب شمس العلما مولانا شبلی نعمانی کا نام چھوڑنے پر ہے۔ اس فرد گذاشت کو سوائے اس کے کہ آپ کو انتخاب کرتے وقت ان کا خیال نہ آیا ہو میں اور کسی بات پر محمول نہیں کر سکتا۔" (مکتوبات حالی صفحہ ۳۴)

مولانا شبلی کے معاملہ کو چھوڑ کر مولانا عبدالحق کی تنقیدات کے متعلق نہایت ہی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر قسم کی جانبداری اور تنگ نظری سے بالکل مبرا ہیں۔ ان کی تنقیدوں میں عقل سلیم اور ذوق صحیح بہت ہی نمایاں ہوتا ہے جس پر بے جا طرفداری اور تعصب کبھی فتح نہیں پا سکے۔ وہ خوبیوں اور نقائص پر غیر جانبداری کے ساتھ نظر ڈالتے ہیں۔ لب ولہجہ میں بھی اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ممکن ہے کہ کسی کو کسی خاص معاملہ میں ان کی رائے سے اصولی اختلاف ہو جیسا کہ اکثر ہوتا ہے لیکن وہ آپ کی تنقیدوں

کو اس یقین کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں کہ آپ اظہار رائے میں پوری احتیاط اور انصاف سے کام لیتے ہیں اور اصول تنقید کا پورا پورا احترام کرتے ہیں۔

۵) قوت تحریر:۔ نقاد کے لئے جو صفات لازمی ہیں، ان میں سے ایک قدرت بیان اور تحریر کی دل نشینی ہے۔ کیونکہ اس قوت کے بغیر نہ خیالات کی پوری قوت کارفرما ہوسکتی ہے اور نہ تحریر کو قبول عام کا درجہ نصیب ہو سکتا ہے۔ مولانا عبدالحق کو زبان اور قلم پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اسی لئے ان کا ہر قول اور ہر تحریر جو ان کی زبان اور ان کے قلم سے نکلتی ہے سننے والے اور پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ یہ بھی ان کی تنقیدوں کی مقبولیت کا ایک بڑا سبب ہے۔

مولانا عبدالحق صحیح معنوں میں حالی کے پیرو اور ان کے جانشین ہیں۔ انھوں نے جہاں تنقید نگاری کو جس کی بنیاد مولانا حالی نے رکھی تھی پایہ تکمیل تک پہونچایا وہاں ان کی سادگی زبان کو کمال عروج تک پہونچانے اور اسے مقبول عام بنانے کا پورا پورا حق بھی آپ ہی نے ادا کیا۔ آپ کی عبارت نہایت ہی صاف ستھری اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے۔ وہ انتہائی پیچیدہ مسائل کو بھی عام فہم اور پاکیزہ انداز میں صحت و صفائی کے ساتھ لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ضبط اور اعتدال غضب کا ہے۔ جو ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتا۔ واقعات کی تفصیل اور خیالات کا ہجوم ان کے قلم پر کبھی غالب نہیں آتا بلکہ وہ اس پر قابو پا کر ضبط تحریر میں لاتے ہیں ان کے خیالات بہت ہی سلجھے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے انھیں نہ نثری شاعری کی ضرورت پڑتی ہے اور نہ فقروں کے روپے پر روپے چڑھاتے ہیں۔ ان کی تحریر کے الفاظ نہایت ہی سادہ اور آسان ہوتے ہیں۔ اس لئے پڑھنے والا کبھی الفاظ کے پھندوں میں نہیں الجھتا بلکہ جو لفظ ان کے قلم سے نکلتا ہے وہ دماغ میں جگہ کرتا ہے اور معانی و مطالب فوراً دل میں اتر جاتے ہیں۔ اکثر اچھے اچھے انشا پرداز جذبات سے مغلوب ہو کر بھٹک جاتے ہیں لیکن مولانا اس وقت تک کچھ نہیں کہتے جب تک کہ انھیں کسی بات کے کہنے یا خیال کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

مولانا عبدالحق کا اسلوب بیان علمی تحقیق اور تنقیدی مضامین کے لئے بہت ہی موزوں ہے۔ جو کہ خیالات سے کبھی مغلوب نہیں ہوتا۔ وہ واقعات اور حقائق کو نہایت ہی سادہ زبان میں شگفتگی اور روانی

کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں اس لئے انھیں تشبیہ و استعاروں تلمیح اور تمثیلوں کی بہت کم ضرورت ہوتی ہے اور نہ وہ دلفریب تحریروں میں پھنس کر مبالغہ آمیزی، شاعرانہ صناعی اور لفظ طرازیوں سے کام لیتے ہیں۔ ان کا طرز تحریر علمی اور تنقیدی ہے۔ ان کی نثر میں پختگی، متانت اور حقیقت نگاری کی قوت ہے۔ جو ہر ادیب کو میسر نہیں ہوتی اور یہی ان کا خاص جوہر ہے۔ جس کی مثال مولانا کی علمیت کے سلسلے میں پیش کی جا چکی ہے۔ یہاں ان کی انشاپردازی، زور بیان اور ادبیت کا ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو سادگی، زور بیان، طرز تحریر اور ادائے مطالب کے لحاظ سے آپ اپنی مثال ہے۔

"عقل اور عشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے۔ مہابھارت اور جنگ جرمن سے کہیں زیادہ ہولناک، یہ ایک عالمگیر جنگ ہے جو ہر آن اور ہر ساعت اور ہر مقام پر برپا ہے۔ اور ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے اور نہ جذبات ہی جذبات۔ اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا۔ اور اگر صرف جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنون ہوتا۔ کاش وہ کچھ ہوتا ایک ہوتا لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں فتنے موجود ہیں عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف اور دونوں کے رستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں عقل اسے بے راہ روی سے روکتی ہے اور اعتدال کے حدود میں رکھنا چاہتی ہے۔ عشق جو ہر حد سے آزاد ہے اور جس کے ہاں اعتدال ایک بے معنی لفظ ہے اسے اس تنگنائے سے نکال کر محبت و جنون کے وسیع اقلیم میں لے جانا چاہتا ہے عقل اسے دنیاداری سکھاتی ہے اور دنیا میں سلیقے اور ہوشمندی سے رہنا چاہتی ہے عشق دنیا اور دنیاداری کو ٹھکراتا ہے اور اسے ایک ایسے عالم میں پہونچانا چاہتا ہے جہاں نہ تن بدن کی خبر ہے نہ ہوش حواس کا خیال، نہ اپنے کی فکر ہے نہ پرائے کی۔ انسان اس دوراہے میں آکر حیران و ششدر رہ جاتا ہے اور ایک عجیب کش مکش میں پڑ جاتا ہے بعض اوقات اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا

کے ساتھ خود رائی اور بیان وارفتگی و شگفتگی" (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۷۹)

مولوی صاحب کے زور بیان اور فصاحت و بلاغت کے مولانا حالی بھی قائل تھے چنانچہ ایک خط میں مولانا حالی عبدالحق صاحب کو لکھتے ہیں۔

"آپ کا آرٹکل جو علی گڈھ کالج کی شورش کے روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں نکلا ہے میں نے کئی دفعہ پڑھا۔ اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔

(مکتوبات حالی حصہ اول صفحہ ۱)

عموماً مولانا کا طرز تحریر سنجیدہ اور متین ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں مولانا نے اپنی شائستہ ظرافت کے جوہر بھی دکھائے ہیں جس سے کہ آپ کی تحریروں کی دلپذیری بڑھ جاتی ہے۔

چنانچہ شوق سندیلوی مصنف "اصلاح سخن" کی ادبی شوخی کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے استادوں کے خانگی خطوط شائع کئے اور ساتھ ہی اس فعل کی معافی بھی مانگی۔

طبع کے بعد معافی مانگنا یہ اور بھی ستم ہے۔ ہمارے خیال میں ان کو یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ خانگی خطوط بلا اجازت کے شائع کرتے۔ مگر شاگرد بھی تو بیٹے کے برابر ہوتا ہے اس لئے اس سے اجازت کی کیا ضرورت ہے" (چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۳)

اس تبصرے کے سلسلے میں شوق کے استادوں کی ان فرمائشوں کا ذکر کرتے ہوئے جو انھوں نے اپنے خطوط میں شاگرد سے کی تھیں۔ ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا شاگرد رشید یہ بھانڈا چوراہے پر پھوڑے گا"

مصنف "سرگذشت الفاظ" نے اپنی یہ تحقیق پیش کی تھی کہ "باورچی اردو میں آکر باورچی خانے میں برتن صاف کرنے کی صنعت کے لئے مخصوص ہوگیا" اس پر مولانا عرض کرتے ہیں۔

"ابھی تک تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا ممکن ہے آئندہ یہی ہو جائے۔"

مولانا صحیح الفاظ کے باموقع اور برمحل استعمال کے گر سے خوب واقف ہیں۔ اس جگہ سے اس لفظ کو ہٹا کر دوسرا لفظ رکھنا ممکن نہیں۔ بعض وقت وہ ہندی کا کوئی پرانا یا غریب لفظ اس طرح استعمال کر جاتے

ہیں اور وہ ایسا برمحل ہوتا ہے کہ کلام میں جان پڑ جاتی ہے۔ اس کی مثالیں جا بجا ملتی ہیں۔

"ان دونوں کی ضد میں یہ بے چارہ منفت میں پس جاتا ہے" (سب رس صفحہ ۳۵)

"منفت" جیسے غریب لفظ نے اس جملے میں جان ڈالدی ہے۔

مندرجہ ذیل جملے میں "ڈول ڈالنے" کا استعمال کس قدر برمحل ہے۔

"ہمت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول ڈال کر لڑاکوؤں کو سمجھانا بجھانا شروع کرتی ہے" (سب رس صفحہ ۳۵)

دیکھئے اس جملے میں "ٹل" کے برمحل استعمال سے کتنی خوبی پیدا ہو گئی ہے۔

"استادی کا شوق بھی بُرا ہوتا ہے ٹل میں آگئے اور برابر اصلاحیں دیتے رہے"

(چند تنقیدات عبدالحق صفحہ ۲۱)

ذرا اس ٹکڑے کو پڑھئے اور دیکھئے کہ سادہ اور غریب الفاظ کس طرح اس عبارت کی جان بن گئے۔

"اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے لگا نہیں کھاتی۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے اِس وقت اور اُس وقت کی زبان میں بہت بڑا بل ہے تاہم باغ و بہار ویسی ہی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلے تھی"

(مقدمات عبدالحق حصہ دوم صفحہ ۱۳۱)

غرضکہ مولانا عبدالحق کی تمام تنقیدیں بہت ہی موثر ہوتی ہیں۔ آسان، سلیس اور شستہ زبان، نہایت ہی صاف واضح اور سلجھا ہوا طرز تحریر ان کی تنقید نگاری کی جان ہے۔ ان کی نثر کی پختگی، متانت اور حقیقت نگاری علمیت، تحقیق اور تنقید کے لئے بہت موزوں ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی تحریروں میں سادگی، زور بیان، سنجیدگی اور کبھی کبھی ظرافت اس قدر دلآویزی بخشتی ہے کہ ان کی تنقیدیں اکثر کتاب سے زیادہ پرلطف ہو جاتی ہیں اور دلچسپ افسانوں کی طرح مزہ لے کر پڑھی جاتی ہیں

(باقی آئندہ)

اخلاق الرحمن صاحب قدوائی بی۔اے جامعہ

تعلیم میں سیر کی اہمیت

سیر بھی تعلیم کا ایک جزو ہے. بچوں کو چیزوں کے دیکھنے اور اس کے سمجھنے میں ایک گونہ آزادی ہوتی ہے. ہر چیز پر ان کی نظر آزادی سے پڑتی ہے۔ اس وقت وہ اپنی معلومات میں اس طرح اضافہ کرتے ہیں کہ جماعتی ڈسپلن کا دباؤ ان کی طبیعتوں پر نہیں ہوتا۔ ادر صحیح طریقے پر بیٹھو، ٹیک نہ لگاؤ، کیوں باتیں کر رہے ہو سنو اور قلم سے کیوں نہیں لکھتے وغیرہ احکامات کی بندش سے وہ اس وقت بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ اور آپس کے سوالات اور جوابات سے ایک دوسرے کی تشفی کرنا چاہتے ہیں. بس یوں سمجھئے کہ پوچھتے ہی چلے جاتے ہیں اور اگر جوابات تشفی بخش نہیں ہوتے تو استاد سے سوالات کرنے لگتے ہیں اور چیزوں کے متعلق سمجھتے ہیں سیر میں تعلیم بامقصد ہو جاتی ہے۔

بچے مشاہدے اور سیروں کے درمیان جس قدر باتیں جذب کرتے ہیں اتنی کتابی تعلیم سے جذب نہیں کرتے. سیر میں بچے زیادہ سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ اور کسی بات کے سمجھنے میں ان کی توجہ زیادہ عرصہ تک قائم رہتی ہے. سیر کا نام ہی سن کر وہ دل ہی دل میں سینکڑوں منصوبے باندھ لیتے ہیں۔ اور اگر استاد انھیں ترتیب دینا چاہے تو ہر طالب علم اپنی سوچی ہوئی تجویزیں اور منصوبے دہرانے اور لکھوانے کے لئے بڑے جوش سے تیار نظر آتا ہے اور یہی تیاری اور آمادگی تعلیم دینے کے لئے نقطہ آغاز بن سکتی ہے. اور بن جاتی ہے۔

تھوڑی سی تحریک سے بورڈ پر ایک لمبی فہرست تیار ہو جاتی ہے بچے جو کچھ دیکھنا معلوم کرنا اور سمجھنا چاہتے ہیں اسے بورڈ پر لکھوا دیتے ہیں۔ اب یہ استاد پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ان باتوں میں ان کی تشفی کر سکتا ہے. کہاں تک اپنی معلومات کو ان کی تسلی کے کافی سمجھتا ہے وہ خود کہاں تک تیار ہے اپنے ہنر اور ترکیبوں سے ان کی اس تیاری کو کہاں تک برقرار رکھتا ہے اور جستہ جستہ مجوزہ باتیں انھیں بتلا دیتا ہے۔ اگر استاد اچھی طرح تیاری کرے تو وہ بچوں کی آمادگی اور تیاری سے بہت زیادہ فائدہ

اٹھا سکتا ہے۔ وہ باتوں باتوں میں بچوں کو نہ صرف وہ باتیں سمجھا سکتا ہے جو وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں بلکہ سیر او رمشاہدے کے بعد ان کے لئے مضموں نگاری کا اچھا موقع بھی فراہم کرسکتا ہے مدرسوں میں عموماً بچوں سے خشک عنوانات پر مضامین لکھوائے جاتے ہیں جنھیں بچے شوق سے نہیں لکھتے ہیں وہ صرف استاد کا حکم بجالانے کے لئے لکھتے ہیں۔ لیکن سیر کی دلچسپیاں قلمبند کرانے سے بچے بغیر کسی بار اور کسی بیرونی مجبوری کے مضامین لکھتے ہیں۔ اس لئے کہ انھیں ایسی بات کی روئیداد لکھنی ہے جس میں وہ خود شریک ہیں۔ جس میں وہ، ان کے ساتھی اور ان کا استاد مل کر دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ انھیں ایک بامقصد کام کی رپورٹ لکھنی ہے۔ گویا جہاں آپ سیر کے ذریعہ بچوں کو ان کی مجوزہ باتوں کے متعلق بتلاتے اور سکھاتے ہیں وہاں آپ ان میں مضامین لکھنے کا شوق بھی پیدا کر دیتے ہیں۔

سیر او رمشاہدوں کی تحریک اکثر بچوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ اکثر موسم کی مناسبت سے تحریک پیدا ہوتی ہے کبھی کبھی سبقوں کے پڑھانے کے دوران میں خود بخود ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بچے سبقوں میں بیان کی ہوئی چیزوں کے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتے ہیں۔ ویسے بھی سبقوں کو جاندار اور دلچسپ بنانے کے لئے مشاہدے اور سیروں کا موقع نکالتے رہنا چاہئے۔ اس لئے کہ سیر او رمشاہدے کے ذریعہ نہ صرف آپ اپنے سبقوں کو بامعنی اور جاندار بنا دیتے ہیں بلکہ بچوں کی فطرت کو تسلی حاصل کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ ان میں جو نت نئی باتوں کے دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے اس کیلئے موقع فراہم کر دیتے ہیں گویا آپ بچوں کی نفسیات اور تعلیم میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کر دیتے ہیں۔ سیر او رمشاہدہ کے ذریعہ آپ بچوں میں وسعت نظر پیدا کر دیتے ہیں چیزوں کو خاص ترتیب اور خاص ڈھنگ سے دیکھنے کی عادت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ صرف وقتی طور پر فائدہ ہوتا ہے یعنی نہ صرف مجوزہ سبق میں جان پیدا ہو جاتی ہے بلکہ دوسرے سبقوں کے لئے میدان تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے سمجھنے میں بچوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔ اور گذشتہ سیروں کی کڑیاں جب آنے والے سبقوں میں کہیں کہیں ملتی ہیں تو بڑی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ بچے بیداری اور غور سے تمام باتوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سبقوں کی تکمیل اور ان کو دلچسپی سے شروع کرنے کے علاوہ عملی کاموں کے کرانے کے دوران میں بھی سیر او رمشاہدہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ابری بنانا، کاغذ بنانا، کارڈ بورڈ سے چیزیں بنانا، سوت کاتنا یا باغیچہ کا کام کرنا

جو کام بھی بچے کرتے ہوں ان کے سمجھنے اور بہتر طریقے پر انجام دینے کے لئے ایسی جگہوں پر بچوں کو لیجانا چاہئے جہاں یہ کام ہو رہے ہوں ایسا کرنے سے کبھی کبھی بچوں میں اپنے کام کے متعلق نئی قسم کی تحریک اور سوجھ بوجھ پیدا ہونے لگتی ہے بچے نئے نئے ڈھنگ اور دوسرے کے تجربے کی روشنی میں اپنا کام کرنے لگتے ہیں۔ ان کا رجحان نئی چیزیں بنانے کی طرف ہونے لگتا ہے۔ ان کی طبیعتیں ایجاد کی طرف مائل ہونے لگتی ہیں۔

تربیت اور عادات کے سنوارنے کے اعتبار سے بھی سیریں بہت مفید ہوتی ہیں۔ ایسے مدرسوں میں جہاں بچے بورڈنگ میں نہیں رہتے بلکہ آس پاس سے آتے ہیں تربیت اور عادات کے سنوارنے کا پہلو رہ جاتا ہے۔ اس لئے کہ پڑھائی لکھائی کے کاموں سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ اسکی طرف بھی توجہ کیجائے گو ہوشیار استاد اس کا خیال رکھتے ہیں لیکن اس خیال سے کسی بڑے نتیجہ کی امید نہیں کیجا سکتی لیکن اگر ایسے مدرسوں میں دستکاری اور حرفوں کی تعلیم کے انتظامات کے ساتھ ساتھ بچوں کو وقتاً فوقتاً مشاہدے اور سیریں بھی کرائی جائیں تو عادات کے بننے اور سنورنے پر بھی خاطر خواہ اثر پڑتا ہے بچے عملی کاموں سے دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کے بعد بھی اسکول آتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور اس طرح مدرس اور بچوں کا ساتھ مدرسہ کے اوقات کے بعد قائم رہتا ہے اور سیروں میں تو راتوں کو بھی مل بیٹھنے کا موقع نکل آتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے ان تعلقات کے بعد مدرسہ میں بھی بچوں کی عادات و اطوار پر استاد کی نظر پڑتی رہتی ہے اور استاد کے ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے سے ان میں اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ بچوں کی کتنی ہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن پر جماعت کی روزمرہ پڑھائی میں نظر نہیں پڑتی لیکن سیروں اور مشاہدوں کے دوران میں جب بچوں کو آزادی ملتی ہے تو وہ بیباکانہ طور پر کھیلتے ہیں پھر استاد کو بھی معلوم ہونے لگتا ہے کہ بچے کی کونسی عادتیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سیر میں بچوں کو بہت سے ذمہ داری کے کام سپرد کئے جاتے ہیں وہ نہ صرف اپنی چیزوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں بلکہ دوسری مشترکہ چیزوں کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ ذمہ داری کے کام کرانے سے ان میں ذمہ داری پیدا ہوتی ہے جب بچوں کو کوئی کام سپرد کیا جاتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ انہیں اس کام کے لائق سمجھا گیا۔ ورنہ عام طور پر بچوں سے ذمہ داری کے کام نہ لیکر ہم ان میں یہ خیال پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتے یا یہ کہ دوسرے کام کرنے کیلئے ہیں اور وہ صرف دیکھنے اور برتنے کے لئے ہیں کسی لمبی سیر میں آپ دیکھیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے کس طرح مریض کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور دوسروں کے بستر قرینے سے رکھنے اور بازار سے چیزیں لا کر کھانا پکانے کے کاموں میں کتنی مستعدی اور انہماک کا اظہار کرتے ہیں اگر آپ انہیں کسی کام کی ذمہ داری سپرد نہیں کرتے تو وہ بہت رنجیدہ ہوتے ہیں بچے جہاں سیر کی دلچسپیوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں وہاں وہ ذمہ داری کے کاموں میں بھی اتنے ہی مستعد نظر آتے ہیں۔

سید احمد علی آزاد

کسان

[کسان "اور" مزدور" ان دو الفاظ کے پیچھے موجودہ زمانے کی چند اہم تحریکات جھلکتی ہیں۔ کسان ایک مظلوم انسان ہے جس کی محنت اور جاں فشانی پر دنیا والوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ لیکن زمانہ اس محسن کی قدر نہیں کرتا اس کی ذمہ داری حکومت اور رعایا دونوں کے کندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ میں نے ڈرامے میں انسانیت کے اس سچے لیکن مجبور خدمت گذار کی تصویر دکھانے کی کوشش کی ہے یہ کوشش قصہ کہانی نہیں۔ دکن میں مرہٹواڑی علاقے کے کسان کی زندگی کا تجربہ ہے۔ اصلی اور سیدھا سادہ۔ واقعات عام ہیں۔ پتہ نام ونشان فرضی] (باقی)

پہلا منظر

"سودا"

ایک چھوٹا سا گاؤں پیپل کے درختوں کی چھاؤں میں فتح چند مہاجن کا مکان، اینٹوں اور چونے سے بنا ہوا جس پر استرکاری نہیں ہوئی ہے۔ گاؤں والیاں سامنے پنگھٹ پر پانی بھر رہی ہیں مکان کے سامنے والے کمرے میں گدے پر مہاجن بیٹھا ہوا ہے قریب ہی اس کا منشی شیش راؤ کھاتہ لکھ رہا ہے۔ فتح چند سکھا رام کسان سے

فتح چند۔ ہوگئی ختم اب ٹھٹی[1] پترک — دیکھنا وقت پر ادا ہو اناج

سکھا رام (ہاتھ جوڑ کے) { مجھ کو سب کچھ دیا ہے آپ ہی نے — سر پہ قائم رہے حضور کا راج
اس کی کر پائی سے سب ادا ہوگا — ہاتھ ہے ایشور کے میری لاج

فتح چند۔ ایشور تو ہے لیکن اے مورکھ — ہم بھروسے پہ رہ نہیں سکتے
ہم کو دیدہ بچیو وقت پر بیسہ — ہم مصیبت کو سہہ نہیں سکتے

(منشی شیش راؤ دشواش پر[2] آمیسری آگے بڑھاتے ہوئے)

---

[1] ٹھٹی پترک۔ رہن رکھوانے کا دستاویز۔ [2] دشواش پر امیسری۔

شیش راؤ۔ اک اور نشاں اپنے انگوٹھے کا لگا دے　　یہ نقش جو پترک پہ ہے کچھ ٹھیک نہیں ہے

سکھا رام۔ کیوں اور انگوٹھا مرا لیتے ہو جی سرکار　　کیوں لوٹتے ہو ایک پریشان کو بیکار

شیش راؤ۔ گھبرا نہیں یہ ایک ہی کاغذ[1] تو ہے تیرا　　ہم تجھ کو کسی حال میں دھوکا نہیں دیں گے

(سکھا رام شک کرتے ہوئے ایک اور نشان لگا دیتا ہے۔ پھر سلام کرکے کپاس کے بیجوں کی پوٹلی جو ایک پلہ ہے بیل پر لادتا اور واپس ہوتا ہے۔ راستہ میں اس کا ایک کسان دوست راما ملتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے)

راما۔ بھاؤ[2] کہنا، تو فتح چند سے کتنی ٹھہری؟

سکھا رام۔ دو پلے ادائی۔

راما۔ میں کہوں اتنی ادائی تری مہنگی ٹھہری

سکھا رام۔ سچ کہتے ہو بھائی

راما۔ اب کے بارش کا بھی اندازہ کیا ہے تونے؟

سکھا رام۔ ہے یہ بھگوان کے ہاتھ۔

راما۔ اور تحصیل کا باقی بھی دیا ہے تونے؟

سکھا رام۔ یہ تو جیون کے ہے ساتھ

راما۔ آج اک بیل کی جوڑی مرے گھر آئی ہے　　بات دو سو پہ بہت سوچ کے ٹھہرائی ہے

دونوں پیٹھے[3] ہوئے ہر طرح نظر آتے ہیں　　کھلی دو وقت کی وہ چین سے کھاتے ہیں

آٹھ گھنٹے بھی بڑے آرام سے جوتیں گے زمیں　　دونوں کے سینگ سنگوٹی[4] ہیں کوئی عیب نہیں

اب کے بھنتی مرے کھیتوں میں ہوئی ہے پیدا　　جانے کیا بات ہے بکھر[5] بھی بہت سخت چلا

کھلا[6] چھ پلے مرے کھیت سے بھر لائے گی　　میں سمجھتا ہوں یہ جوڑی مرے کام آئے گی

سکھا رام۔ قیمت بھی ٹھیک بیل بھی اچھے، مگر بتا　　دو سو چکانے کا بھی کوئی بندوبست ہے؟

---

۱ کاغذ۔ دستاویز۔ ۲ بھاؤ۔ بھائی۔ مہاجن کسان کو کھیت رہن رکھ کر یا اقرارنامے کے ذریعے اناج، بیج اور روپیہ قرض دیتا ہے اس کی ادائی میں وہی اناج، بیج وغیرہ لکھا لیتا ہے۔ ۳ پیٹھے ہوئے۔ سدھائے ہوئے۔ ۴ کسانوں کا محاورہ۔
۵ بکھر۔ ایک آلہ۔ کپاس کے کھیت میں بارش ہونے کے بعد موگڑے چلا کر ڈھیلے پھوڑتے جاتے ہیں پھر بکھر چلا کر بیج بکھیرے جاتے ہیں۔ ۶ کھلا۔ یعنی اناج، فصل۔

راما۔ دو نمبر رکھانے کا وعدہ کیا ہے — کل ہی راج ہنس جی سے سودا کیا ہے

سکھارام۔ بہت ظالم ہے وہ بے رحم سا ہو — ارے ناداں کبھی ایسا نہ کرنا
اسی سے پیٹ لے غنیمت ہی فتح چند — مگر اس بات کا چرچا نہ کرنا

پیچھے سے ایک تعلیم یافتہ لڑکا جس نے دیہات سدھار کا کام اپنے ذمے لیا ہے اور گاؤں والے اسے "جانگلا[1] بابو" کہہ کر پکارتے ہیں، جواب دیتا ہے۔

لڑکا۔ کرتا ہے اس یقین سے دو ظالموں میں فرق — بدخو، ترا فریب بھی کتنا عجیب ہے!
پہلو میں زندگی کے چھپاتا ہے موت کو — بیشک بشر جہاں میں بڑا خوش نصیب ہے!
افلاس میں تمیز کی شکتی بھی مٹ گئی — کیوں اس کو یہ سزا نہ ملے یہ غریب ہے!

سکھارام۔ اسے دیکھو ہمارے سامنے بھی — پڑھے لکھوں کی باتیں کر رہا ہے!

لڑکا۔ سچ کہتا ہوں اور سچ میں ہی طوفان سکھارام — جو زور میں آجائے تو ہر چیز بہا دے
ہاں دل کے سمندر سے اُبلتا ہو وہ سیلاب — جو عقل کی تعمیر کو اک پل میں مٹا دے
اک بلبلا پانی کا نظر آتا ہے ہاں علم — اور سچ کی روانی اسے پل میں اڑا دے
میں کہتا ہوں سچ سے نہیں دنیا میں تباہی — طوفان کو ترا ور پگھلنے کی دعا دے

(یہ لوگ سکھارام کی کٹیا کے قریب پہنچتے ہیں جو گاؤں کے کنارے ایک نالے پر واقع ہے۔ چاروں طرف مٹی کے مکان اور جھونپڑیاں زمین اونچی نیچی ایک طرف کھیتوں کا سلسلہ سکھارام کی بیوی بھاگی اپنے روتے ہوئے بچے کو جس کی عمر چھ ماہ کی ہے لئے آتی ہے۔ سکھارام اسے گود میں لیکر بہلاتا ہے۔ بھاگی بیلوں کے ساتھ چلی جاتی ہے)

سکھارام۔ ہے یہ بھی مرے گھر کا طوفان راما — اسے گود میں اپنی بہلا رہا ہوں

راما۔ شکر کر بھگوان کا اپنے ادا — پہلا رکھوالی ہے تیرے کھیت کا

سکھارام۔ رام ہی پہچانتے ہیں ان کٹھن اوقات کو — میرا رکھوالی ہے یا اس کا رکھوالی ہوں میں

راما۔ کیا فکر ہے ماں دودھ پلاتی تو ہے اس کو

سکھارام۔ ہاں اسکی ماں چھاتی سے اسکو دودھ دیتی ہے تو میں — خون اپنا سینچتا ہوں بال بچوں کے لئے

(کٹیا کے اندر چلا جاتا ہے)

---

[1] جانگلا یعنی اچھا۔

دوسرا منظر

"پریم"

(گاؤں میں آدھی رات، ہلکی ہلکی چاندنی چراغ ٹمٹماتے ہوئے۔ لوگوں کے کھانسنے، بچوں کے رونے اور ماؤں کی لوریوں کی آوازیں۔ جنگل میں کووں کا شور، کھیتوں میں کتوں کا بھونکنا۔ سکھا رام کی کٹیا میں ایک جوان لڑکا صاف ستھرے لباس میں ایک ٹوٹی پھوٹی چوکی پر بیٹھا ہوا ہے۔ سکھا رام کی بیوی بھاگی اس کے قریب بیٹھی اس کے پاؤں دھو رہی ہے۔ بھاگی کی عمر بیس بائیس سال کی ہوگی چہرے پر ملاحت، سانولا رنگ، میلی کچیلی ساڑی۔ لڑکا بھی اسی عمر کا ہے۔ چندر نام۔ چندر گنگناتا ہے)

چندر۔ سانولی رانی تیرے مکھ پر چندرماں بلہار

میلے بادل اُجلا چاند	جس کے آگے تارے ماند
آنچل سرکا ہوا اُجالا	جھلکی مونگے کی اک مالا
بالیاں پہنی سندر کان	دل میں بیٹھا بانکا جوان
سونی منزل بھری جوانی	چھوٹی کٹیا میں اک رانی

سانولی رانی تیرے مکھ پر چندرماں بلہار

بھاگی۔ ہم غریبوں پہ کوئی رحم دکھانے آیا	یا بھرے گاؤں میں اک آگ لگانے آیا
یاں خوشی ہے نہ جوانی نہ ہے زیور نہ سنگھار	کون اُجڑے ہوئے کرموں[1] کو بنانے آیا
ہاتھ ہر وقت جو مٹی میں بھرے رہتے ہیں	ایک بلوان انھیں سینے سے لگانے آیا
ان لبوں پر جو ہیں سوکھے ہوئے پتوں کی طرح	مسکراہٹ کا نیا رنگ جمانے آیا
ایسے کانوں کو جو رونا ہی سنا کرتے ہیں	آس امید کا اک گیت سنانے آیا
چکیاں پیس کے ہو جاتے ہیں شانے بیکار	ایسی دکھیاری کو محنت سے بچانے آیا
چندر۔ بھاگی مری خواہش ہو کہ جس وقت میں آؤں	اس طرح مرے سامنے آہیں نہ بھرا کر
بھاگی۔ یہ آہیں نہیں شوق کے ہیں ترانے	یہ جیون ہنسی ہے یہ دل کے ہیں گانے

---

[1] کرموں۔ قسمت۔

ان آہوں کے اندر ہی اندر سما کر کوئی آرہا ہے محبت جتانے
چلی آرہی ہے گھٹا ٹوپ آندھی ہے اک گھانس کی جھونپڑی سر چھپانے
اڑے جیسے جنگل میں کھلے کا بھوسا لگیں دل کی خاموشیاں تلملانے
چلے جیسے تھاروں[1] سے تیز پانی لگی آنکھ ہر وقت آنسو بہانے
خدایا تجھے واسطہ کھیتیوں کا نہ آئیں نکل عشق میں شاخسانے

(اتنے میں بچہ روتا ہے۔ بھاگی اسے تھپک کر سلا دیتی ہے)

چندر۔ جاں سخت کشاکش میں گنواتی ہے شب و روز بھاگی تجھے اس گاؤں میں تکلیف نہیں ہے
بھاگی۔ ملتا ہے مجھے آپ کی الفت کا سہارا کرپا کرو مجھ پر تو ہے مرنا بھی گوارا
چندر۔ کیوں سہا کرتی ہے رنج زندگی تو اس قدر اس سے بچ جانے کی شاید ایک بھی صورت نہیں!
بھاگی۔ مرد، اولاد، زمین، گاؤں، مویشی، محنت اس سے چھٹکارا کسی طرح بھی قسمت میں نہیں

(ایسے میں دوسری کٹیا سے بھیکا جو سکھا رام کا نوکر ہے بھاگی کے بچے کا مزاج پوچھتا ہے۔ بچے کو بخار آرہا ہے۔ پھر چلم پینے کے لئے آگ مانگتا ہے۔ بھاگی اُپلوں کی آگ میں سے ایک چنگاری دیدیتی ہے۔ چندر پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا جاتا ہے۔)

تیسرا منظر

صبح کی کاشت

(گاؤں کی سہانی صبح۔ شفق پھولی ہوئی پرندے چہچہاتے ہوئے۔ ٹھنڈی اور صاف ہوائیں چل رہی ہیں۔ افق اور پہاڑیوں پر کہر۔ جنگل کے پھول کھلے ہوئے کسان بیلوں کی جوڑی لئے کندھے پر لٹھ رکھے افق کی طرف اونچے ٹیلے سے نیچے اتر رہا ہے)

شفق۔ قدم اٹھا کہ زمیں کو ہے انتظار ترا بشر کی زیست پہ چھایا ہے اختیار ترا
خوشا نگاہ، تجلی ہے تیری عالم پر زہے نصیب ہے فطرت کو اعتبار ترا
کلی کلی میں جہاں کی چھپی ہے روح تری ہے ذرہ ذرہ زمانے کا غمگسار ترا

---

[1] تھارولا۔ گاؤں کی باؤلی پر وہ حوض جس میں موٹ کا پانی جمع ہوتا اور کھیتوں تک پہونچایا جاتا ہے۔

تجھے خبر نہیں کیا چیز ہے تری ہستی — جہاں کا سارا تماشہ ہے رازدار ترا

تازہ ہوا۔

آیا مالی پھولا گلشن[1] — دیکھو پھیلا میرا دامن

اُٹھا حاصل جاگا خرمن — اب کے آیا کیسا ساون

سَن سَن، سَن سَن — سَن سَن، سَن سَن

غنچے ہم سے خوش ہوتے ہیں — ہم پتوں کا منہ دھوتے ہیں

دنیا والے سب سوتے ہیں — نقد ہستی سب کھوتے ہیں

سَن سَن سَن سَن — سَن سَن سَن سَن

دہقاں میرے ساتھ چلا ہے — ذرہ ذرہ جاگ رہا ہے

جینے کا ساماں ہوا ہے — رحمت کا طوفان اُٹھا ہے

سَن سَن سَن سَن — سَن سَن سَن سَن

پہلی کرن۔

زمینوں کا پروردگار آرہا ہے — وہ اک رحمتِ کردگار آرہا ہے!

زمیں اس کے قدموں تلے ہنس رہی ہے — وہ آشفتہ مرغزار آرہا ہے

امیروں کی ٹھکرائی دولت کو لیکر — غریبوں کے دل کی پکار آرہا ہے

اٹھو بہرِ تعظیم اے خاک والو — زمانے کا اک دیندار آرہا ہے

اُگتی ہوئی کونپلیں۔

اوگے[2] قدرت سے — جاگے قسمت سے

پھوٹے محنت سے — اُٹھے الفت سے

دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

دل میں پہنائی — رخ پر رعنائی

سن اے سودائی — ہم نے بھر پائی

دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک مشہور اور اہم تال "ترتالہ" کے وزن پر قائم کی گئی ہے جس کے طبلے کے بول ہیں
نادھن دھن نا نادھن دھن نا ناتن تن نا نادھن دھن نا اور عروض میں تقطیع ہوگی فِعلن فِعلن فعلن فعلن

[2] یہ بحر دوسری تال "جھپ تالہ" کے وزن پر ہے جس کے بول ہیں۔ دِھن نا۔ دِھن دِھن نا تِن نا دِھن دِھن نا
اور تقطیع ہوگی فعلن مفعولن فعلن مفعولن۔

ہم ہیں بچپن میں رنگیں دامن میں
جاں ہے گلشن میں گھر ہے آنگن میں
دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

ٹھنڈی خاموشی رنگیں مدہوشی
شیریں سے نوشی دہیمی سرگوشی
دہقاں اپنا ہے دہقاں اپنا ہے

بہتا ہوا دریا۔

میں جینے کے اسرار سمجھا رہا ہوں — بہا جا رہا ہوں، بہا جا رہا ہوں
کنارے کھڑا ہے مرے ایک دہقاں — محبت کی تصویر دکھلا رہا ہوں
مبارک ہے یہ منظر غم گساری — نگاہوں پہ امید برسا رہا ہوں
ذرا غور سے دیکھ اسے زندگانی — میں قدرت کے دامن کو پھیلا رہا ہوں
مرا منتظر ہے دل افگار کوئی — زمیں بوس ہوتا ہوا جا رہا ہوں

جنگل کے! ہنستے ہوئے پھول

یہ ہنسی ہم ترے قدموں پہ فدا کرتے ہیں — کامیابی تری فطرت کو عطا کرتے ہیں
بے طلب ہستی رنگیں سے گلے مل مل کر — ہم تری زیست کی خاموش دعا کرتے ہیں
دل میں گو رکھتے ہیں فطرت کے سریلے نغمے — گیت ہم تیری زباں ہی سے سنا کرتے ہیں
دیکھتے رہتے ہیں ہر وقت لگائے ہوئے آنکھ — تیرے انسان ترے واسطے کیا کرتے ہیں

نغمۂ زمین

عطا کرنا سکھایا ہے کسی کی مہربانی نے — مجھے سینہ شگافی پھر گوارا ہوتی جاتی ہے
مرے پہلو میں سینچا جا رہا ہے خون آزادی — تڑپتی زندگانی آشکارا ہوتی جاتی ہے
لٹاتا ہے خزانہ کوئی اپنے دست و بازو کا — مری دولت زمانہ کا سہارا ہوتی جاتی ہے
بہت شاداب ہیں زیر فلک بیتابیاں میری — مری ہستی محبت کا اشارا ہوتی جاتی ہے
مجھے بخشا ہے درد زندگی خود زندگانی نے — مری فطرت ہی فطرت کا نظارا ہوتی جاتی ہے
خوشا اے آبیارِ تخم غم، ہر اک گرہ دل کی — تری رحمت کی گرمی سے دوبارا ہوتی جاتی ہے

(سکھا رام ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو کر آسمان پر نظر ڈالتا ہے بادلوں کو غور سے دیکھتا اور ایک آہ کھینچ کر اپنے آپ سے کہتا ہے)

سکھا رام۔ رات بھیگا کہہ رہا تھا موٹ[1] گہری ہو گئی

موگرا[2] چلتا نہیں ہے اور بکھر[3] بھی ہے سخت

بچے سب بھوکے ہیں میرے سیر ہے سارا جہاں

(بیلوں سے) چل مرے روما لیا[5]، کستوریا، چل کھیت کو

وقت مسکرا کر کہتا ہے:

مرتے ہیں شب و روز کساں فاقہ کشی سے

دنیا میں کبھی وقت پہ بادل نہیں آتے

چھائی ہے سیاہی غم ہستی کی زمیں پر

اک وقت معین پہ ہو خورشید روانہ

ہو چاند کی گردش میں نہ اک لمحہ کی تاخیر

آدم کے لئے ہو نہ مگر وقت مقرر

بیتابی ارمان کو تسکین ہے ان سے

(بیل موگرا کھینچتے ہوئے ایک دوسرے سے)

رومالیا۔ احساس ہے پستی کا نہ محنت پہ نظر ہے

کستوریا۔ کیا جانئے کس حال میں رہتا ہے بہر حال

رومالیا۔ چار چھ پیسے ہیں اس خدمت گذاری کا صلہ

کستوریا۔ آج سارے گاؤں والوں کی بھی ایسی ہی چال

ایسی بستی میں بھلا ہم کو ہو آزادی نصیب

کیا یہ بادل آج بھی پانی نہیں برسائینگے

بیج کیا گودے[4] کے میرے سوکھے ہی جائینگے؟

کب تلک بھگوان مجھکو اس طرح ترسائینگے؟

آج دن بھر کام کر کے رات گھر لوٹ آئینگے

ہاں کیوں نہ ہو جاں بخش ہیں فطرت کی عطائیں

ہر روز نئی شان سے چلتی ہیں ہوائیں

رنگیں ہیں مگر چرخ منور کی فضائیں

ہر رات کو افلاک پہ انجم نظر آئیں

مریخ و زحل آہنی تنظیم دکھائیں

احکام کی تعمیل ہو جس وقت وہ آئیں

آدم کو مبارک ہوں زمانے کی ادائیں

دنیا میں فقط کام کا دیوانہ ہے دہقان

ہمدردیٔ انسان کا پیمانہ ہے دہقان

ہم جہاں ہیں ہیں فقط زور آزمانے کیلئے

یہ بھی ہیں حاکم کا بار غم اٹھانے کیلئے

جس جگہ انساں ہوا اپنا سر جھکانے کیلئے

(سکھا رام انہیں ایک کوڑا لگاتا ہے۔ دونوں گردن ہلا کر تیز چلنے لگتے ہیں)

چوتھا منظر

نمائش اور پولا

گاؤں کے ایک کشادہ حصے میں درختوں کے نیچے چند نئی جھونپڑیاں کسان اور زمیندار بیلوں کی جوڑیاں

---

[1] یعنی باؤلی میں پانی نیچے اتر گیا [2] موگرا [3] بکھر یہ دونوں آلے ہیں [4] گودا یا تیفن۔ ایک سہ کونی لکڑی کا آلہ ہوتا ہے جس کے اوپر کے حصہ میں بیج بھر کے زمین پر اسے چلایا جاتا ہے اور بیج زمین پر بکھرتے جاتے ہیں [5] کسان بیلوں کے اسی طرح نام رکھتے ہیں۔

طرح طرح سے سجا کر لا رہے ہیں۔ ایک طرف پانچ چھ ہنڈیاں کھلی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف ترکاریاں، پان اناج، انیاری سامان اور سستے میووں کا بازار لگا ہے۔ خرید و فروخت میں لوگ مصروف ہیں۔ سیر کرنے والے آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ ایک طرف دنگل میں کشتی کے کرتب دکھائے جا رہے ہیں۔ ادھر چند لوگ پینے پلانے میں مصروف ہیں اور گا بجا رہے ہیں سکھارام کا دوست راما اپنے بیلوں کی جوڑی نمائش میں لے آیا ہے چلتے چلتے سکھارام پر اس کی نظر پڑتی ہے جو ایک درخت کے نیچے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھا ہے]

راما۔ اے سکھارام ترے بیلوں کی جوڑی ہے کہاں؟

(سکھارام سر اٹھا کر دیکھتا ہے اور پھر زانو پر رکھ لیتا ہے)

راما۔ خیر ہے آج کا دن، اور ترا چہرہ ہے اداس!

(سکھارام ہاتھ سے راما کو جانے کا اشارہ کرتا ہے)

راما۔ چل اٹھ، میرے بیلوں کی جوڑی سنبھال

سکھارام۔ نہیں راما میں اس سے بیزار ہوں۔

راما۔ (بیلوں کے پگھے دیتے ہوئے) یہ لے اور غم اپنے دل سے نکال

سکھارام۔ (اٹھلاتے ہوئے اُٹھ کر) چلو خیر اس پر بھی تیار ہوں۔

(اُٹھتا ہے اور بیلوں کو ہانکتا ہے)

راما۔ کیا بات ہے، کیوں بیل ترے ساتھ نہیں ہیں؟

سکھارام۔ معلوم نہیں؟ بچوں کو تے دست ہوئے ہیں

راما۔ تو پھر اس نمائش میں آیا ہی کیوں؟

سکھارام۔ سمجھتا تھا شاید بہل جائے دل

(ایک کسان دوڑتا ہوا آتا ہے اور کہتا ہے نمائش میں اس کی جوڑی بہت پسند کی جا رہی ہے۔ شاید انعام مل جائے۔ بازو سے لوگ گاتے ہوئے گزرتے ہیں

لوگ

پانی برسا، کھیتی پھولی، خوش ہو ڈھونڈے رام

اب کے روئی خوب بکے گی، گھر میں ہانڈی بھر کے پکیگی

گھر کی عورت، بچے بوڑھے پائیں گے آرام، خوش ہو ڈھونڈے رام

(سامنے پولا[1] ہو رہا ہے جانوروں کو سیندھی شراب پلائی جا رہی ہے۔ دہیڑوں کے ساتھ لوگ نشے میں
اُدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں بعض لوگ ناچتے ہیں۔ ناچتے ناچتے ایک شخص نے تان لگائی)

رِم[2] جھم رِم جھم بوندیں برسیں ۔۔۔ گھڑ گھڑ گھڑ گھڑ بادل بولے
ندی نالے جل تھل جل تھل ۔۔۔ پنکھ پکھیرو بازو کھولے

لٹیا ہماری سب سے اچھی ۔۔۔ بیل ہمارا سب پر بھاری
آئیں ناچیں کود یں مل کر ۔۔۔ گوپی سنگ اب گردھاری

ہُو شو ہُو شو اچھونا چھونا ۔۔۔ ہُو شو ہُو شو اچھونا چھونا

(ایک منچلے نے سکھا رام کے ایک دھول لگائی)

شکھو بھاؤ گاؤ ناچو، دیکھو کیسا نظارہ ہے ۔۔۔ منہ اُلو کا اپنا بنا کر بغلوں میں منڈی کو جھکا کر
کر کر کیوں کرتے ہو سبھا کو؟ یہ بھی کیا ہو جا رہا ہے

(سکھا رام غصہ میں آ کر اس شخص کو زمین پر دے مارتا اور گلا دباتا ہے بعض لوگ اس حرکت کو دیکھ کر ہنستے
ہیں بعض لوگ اسے چھڑاتے ہیں سکھا رام شملہ باندھتے ہوئے راما سے کہتا ہے)

سکھا رام۔ نہ جانے چڑھائی ہے کتنے کی اسے ۔۔۔ کہ جامے سے باہر ہوا جا رہا ہے
وہاں اس شرابی کو ہنسنے کی سوجھی ۔۔۔ یہاں دم ہمارا گھٹا جا رہا ہے

راما۔ ارے بُدھو، یہ پی کر ناچتا ہے ۔۔۔ تری بیوٹ سے کیوں ناراضگی ہو

سکھا رام۔ یہاں دل میں لگی ہے آگ ساری ۔۔۔ اور اس کو ہم سے سوجھی دل لگی ہے

راما۔ ہمارا جیون ہے کھیل سارا اسے زمانہ کھلا رہا ہے ۔۔۔ کوئی دکھاتا ہے رنج اپنا کوئی غم اپنا بھلا رہا ہے

(گنگناتا ہے) سکھی اگر ہے جہاں میں جینا تو ہنسنے والوں کا ساتھ دینا ۔۔۔ یہاں اسی کا ہے راج سارا جو زندگی کو نبھا رہا ہے
کرینگے کن حسرتوں کا ماتم بھرا ہی کلفت سے سارا عالم ۔۔۔ دھواں غمِ زندگی کا بیہم ہر ایک بستی پہ چھا رہا ہے
ہنسی میں آفت کو ٹال دینا خوشی سے انعام زیست لینا ۔۔۔ قدم قدم پر نیا زمانہ سبق یہ ہم کو سکھا رہا ہے

(گاؤں کے دو چار آوارہ آدمی سکھا رام اور راما کو پینے پلانے کے لئے گھسیٹ لے جاتے ہیں۔ سکھا رام
پیتا ہے۔ اور راما پھر وہی گیت گاتا ہے۔ "ہمارا جیون ہے کھیل سارا" سکھا رام کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے

---

[1] پولا۔ بیلوں کو شراب پلانا۔ [2] یہ گیت کہروا تال میں ہے بول ہیں: "دھاگے تا تن۔ نا کے گھی نا" اور تقطیع ہے "فعلن فعلن فعلن فعلن"

ہیں۔ لوگ اطراف سے جمع ہو جاتے ہیں۔ بچے ہنستے ہیں۔ عورتیں روتی ہیں۔ مرد ناک پونچھتے ہیں۔ اتنے میں بھاگی دوڑتی ہوئی آتی ہے اور چلاتی ہے)

بھاگی۔ میرا بچہ مرگیا اے لوگو! میرا بچہ مرگیا۔ سُندرا کا دم گلے میں آرہا ہے ہائے ہائے!

(سارے کسان اس کے قریب آجاتے ہیں۔ سکھا رام گھر کی طرف بھاگتا ہے)

ایک کسان۔ دوا کو بھی بچے کے پیسے نہیں تھے۔

دوسرا ۔ جو پیسے بھی ہوں تو دوا کون دیوے؟

تیسرا ۔ چلو سندرا کی خبر لے تو لیں ہم۔

چوتھا ۔ چلو اپنی بھاگی کو گھر لے چلیں ہم

(بھاگی روتی ہوئی کسانوں کے ساتھ گھر کی طرف جاتی ہے دو چار آدمی گاؤں کے وید کے پاس دوڑتے ہیں۔ لوگ آنے کے بعد سکھا رام کو دیکھتے ہیں وہ بچے کی لاش کو اٹھا کر باہر لا رہا ہے

پانچواں منظر

ترغیب

(مغرب ابابیل شفق آلود فضا میں تیر رہی ہیں درختوں پر کوؤں اور میناؤں کا شور مچا ہوا ہے۔ بھاگی کھیت سے واپس آکر جھونپڑی کے سامنے برتن مانجھ رہی ہے اس کی اکلوتی لڑکی سندرا جو پانچ سال کی ہے اُپلوں سے کھیل رہی ہے۔ ایک بڑھیا سامنے بیٹھی ہوئی چپکے چپکے باتیں کر رہی ہے)

بڑھیا۔ اچھی بھاگی! بھاگ تیرے جاگ جائینگے ضرور
میں سمجھتی ہوں کہ تیرا بھاگ جانا ٹھیک ہے

بھاگی۔ چاچی مرا دل آپ کو معلوم نہیں ہے
مجھ پہ جو گذرتی ہے وہ بھگوان ہی جانے

جو اچھے ہیں کچھ ان کو خبر ہو نہیں سکتی
تکلیف غم اک غمزدہ انسان ہی جانے

چاہت کی مصیبت بھی بڑی ہوتی ہے نازک
عورت کو اک عورت کا نگہبان ہی جانے

بڑھیا۔ اسی تکلیف سے تجھ کو بچانا چاہتے ہیں وہ
گنہگاروں کے محلوں سے تو ٹوٹی جھونپڑی اچھی

بھاگی۔ یہاں پھر بھی مری معصوم بچی ساتھ رہتی ہے
یہ ٹھوکر کی امیری سے غریبی زندگی اچھی

کہاں جاؤں گی اپنے گاؤں سے منہ موڑ کر چاچی

خدانے ہر کسی کو ایک حالت میں نہیں رکھا　　کسی کی رہتیں اچھی کسی کی بے کسی اچھی

بڑھیا۔ تو پھر کہہ دوں کہ تو گھر چھوڑ کر واں آ نہیں سکتی؟

بھاگی۔ (رکتی ہوئی) میرا مطلب ہے چندر سے کہنا۔ کہ میں ....

(بڑھیا اُٹھ کر چلی جاتی ہے۔ بھاگی زمیندار کے لڑکے کی ناراضی سے کچھ خوف کرنے لگتی ہے بڑھیا سیدھی چندر کے کمرے میں پہنچتی ہے۔ چندر کے قریب اس کا ایک راز دار دوست سُدھار بھی بیٹھا ہوا ہے۔ بڑھیا کی زبان سے بھاگی کا مبہم جواب سن کر۔

چندر۔ (ہنستے ہوئے) ڈر رہی ہے راہ پر آجائے گی

سدھار۔ راہ پر آئے گی لیکن یہ جتا دیتا ہوں　　ایک ہنگامہ مچا دیں گے یہ دہقاں سارے

سر پہ بھاگی کے زمانے کی مصیبت ہوگی　　ہوں گے رسوائے جہاں آپ کے ارماں سارے

چندر۔ ہم سے منہ آئیں گے یہ ٹکڑوں کے محتاج کساں؟

سدھار۔ شوخیٔ رنگ زمانہ پہ نظر ہے کہ نہیں؛　　آپ کو اپنے زمانے کی خبر ہے کہ نہیں؛

چندر (آہستہ سی) کیا کریگا اپنی بیوی اور بچے چھوڑ کر　　جانتے ہیں آپ سکھو مفلس و نادار ہے

اس میں تاب زیست تک مشکل سے باقی ہو سدھا　　ایک ہل ہے ایک بیوی اک نفس کا تار ہے

وہ حرامی آنکھ تک مجھ سے ملا سکتا نہیں　　اور اگر ایسا ہوا بندہ بھی یاں تیار ہے

سدھار۔ روشنی دن کی غنیمت ہے اسے چھوڑ کے آج　　بے تحاشا تم اندھیرے میں چلے جاتے ہو

دل میں اس وقت تمہارے ہیں چھپے تین گناہ　　جس کو اک دوست سے کہتے ہوئے شرماتے ہو

ایک بھاگی سے ہے آزاد تعیش کا خیال　　چند دن کے لئے بے چاری کو پھسلاتے ہو

دوسرے تم کو سکھا رام پہ کچھ رحم نہیں　　ایک مظلوم کو بے رحمی سے ٹھکراتے ہو

تیسرے تم میں نہیں حوصلہ اسراف کا بھی　　نام سنتے ہو جو پیسے کا تو مرجاتے ہو!

چندر۔ (کسی قدر تیز ہو کر) سچ کہا آپ نے۔ خواہش ہے مرے دل کی یہی

سدھار۔ آہ پامال ہیں مختار کے مجبور غریب　　رات دن رہتے ہیں ماحول کے محصور غریب

حادثے ان کو تو ناشاد کئے دیتے ہیں　　اہل زر اور بھی برباد کئے دیتے ہیں

مکر و ترغیب کے پھندوں میں گرفتار ہیں وہ　　ذمہ داری ہے ہمیں پر، کہ گنہ گار ہیں وہ!

چھٹا منظر

دہوپ

(بادل ہٹنے سے دہوپ تیز ہوگئی ہے۔ چاروں طرف حبس۔ لوگ پسینے میں نہا رہے ہیں۔ ہرن درختوں کی چھاؤں میں کھڑے ہوئے ہانپ رہے ہیں۔ عورتیں بیچ کھیت میں کپاس کو نندوائی[1] دے رہی ہیں۔ سکھائم اور بھیکا وغیرہ کو پسے[2] اور ڈورے چلا رہے ہیں)

دہوپ۔ (کسان کو ننگے جسم کے ساتھ کام کرتا ہوا دیکھ کر)

مرے جلال سے اس شخص کو حجاب نہیں جلا کے خاک نہ کردوں تو آفتاب نہیں!

روحِ عاطفت۔ ترے فروغ سے بڑھ کر ہے احتشام مرا جلانا کام ترا ہے بچانا کام مرا

دہوپ۔ میں کارخانۂ قدرت کی روح مضطر ہوں تڑپ رہے ہیں مرے دل میں برق زا شعلے

روحِ عاطفت۔ میں تیری آگ کو دامن میں کھینچ لیتی ہوں مرے کمال سے ہوتے ہیں دلربا شعلے

گرمی۔ جلس رہی ہے زمیں میری آہ سوزاں سے مگر کسان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔

وہ بے نوا ہے کہ پہلو میں اضطراب نہیں وہ سخت جاں ہے کہ دردِ جگر نہیں ہوتا

میں پوچھتی ہوں ہزاروں کی طرح اک دن بھی یہ اپنے فرض سے کیوں بیخبر نہیں ہوتا؟

صدائے تقدیر۔ فراموشی کا مجرم ہے نہ غفلت ہے خطا اس کی مری مجبوریاں بن جاتی ہیں زنجیر پا اس کی

لگا رکھا ہے میں نے خلق کی خدمتگذاری میں ابھر سکتی ہے کیسے بے نیازی کی ادا اس کی

صدائے انقلاب۔ سردیاں بھولے ہوئے انسان کی آگ بن جائیں گی اک دن دیکھنا

اس سکوں میں درد کی مجبوریاں زلزلے لائیں گی اک دن دیکھنا

روحِ صداقت۔ بننے سے سوا بات بگڑتی ہے جہاں میں تخریب کے پہلو میں ہے تعمیر کی دنیا

جو ساز ہے وہ سوز ہے جو نور ہے وہ نار ہم دیکھتے ہیں اصل میں تعبیر کی دنیا

دونوں میں ہے اک کشمکشِ قوتِ بیداد تقدیر کی دنیا ہو کہ تدبیر کی دنیا

یاں علت و معلول کے ہیں طوق و سلاسل آزاد کہاں ہوتی ہے زنجیر کی دنیا؟

---

[1] نندوائی دینا یعنی پودوں کے درمیان سے ہریالی نکالنا وغیرہ۔ [2] کو پسے اور ڈورے چلانا یہ بھی اسی قسم کا ایک عمل ہے۔

ریشم سی روئی کی انگیا بنائی، گھٹن[1] بھی سلائی ساری بھی لائی
رانی کے جوبن پہ آئی بہار
بیلوں کی جوڑی کو کھلّی کھلا کر، روٹی پکا کر، بچے سلا کر
جاتی ہوں اٹھلا کے نگری کے پار
کھیتوں میں پھولی ہے اچھی کپاس، ہنیں ہیں نراس، دنیا ہے راس
نوروں پہ روئی کا آیا بچار

(بھاگی ایک کونے میں بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی ہے)

آٹھواں منظر

لگان

(رکھنی[2] اور سونگھنی کے بعد مال بہنا[3] شروع ہوا ہے۔ بنڈیاں آرہی ہیں۔ روئی کے تھیلے بھرے جا رہے ہیں۔ چاروں طرف سفید روئیں بکھرے ہوئے ہیں۔ دو تین بنڈیاں تیار ہیں۔ سکھا رام کی جھونپڑی کے سامنے درخت کے نیچے سن کی چارپائی پر گاؤں کے پٹیل پٹواری جو پورے مال کی نکاسی سے پہلے ہی آگئے ہیں بیٹھے ہوئے ہیں۔ تحصیل کا چپراسی قریب کھڑا ہوا بیڑی پی رہا ہے۔ سکھا رام ایک طرف چلم کا دم مار رہا ہے۔ بھاگی دوسری طرف سندرا کو گود میں لئے کھڑی ہے۔)

سکھا رام۔ ہاں تو سرکار کو کتنے ادا کرنا ہے؟

پٹیل۔ تجھ کو معلوم نہیں؟

سکھا رام۔ اب کے اجرت بھی نکلنی مری دشوار ہوئی۔

پٹواری۔ سچ ہے مانی بھی تو سرکار نے بڑھائی ہے۔

تحصیل کا چپراسی۔ بھاگ اچھے ہیں سکھا رام ترے۔

پٹیل۔ چلو چار آنے سے نپٹا کریں گے۔

چپراسی۔ ہمارا تو اس میں شامل نہیں ہے؟

---

[1] گھٹن۔ ایک قسم کا معمولی دیہاتی کپڑا۔ [2] رکھنی اور سونگھنی۔ مال کی حفاظت اور کٹائی [3] مال بہنا یعنی فروخت کے لئے کھیت سے بازار تک جانا۔

پٹواری۔ دو آنے کا دستور باقی ہے اب تک۔
سکھارام ۔ بارہ آنے سے کھیت جوتا ہے دیکھئے کیا حساب ہوتا ہے
پٹیل۔ کہدیا نا کہ ہے پچاس روپے
سکھارام۔ میرے پاس اتنے روپے اب تو نہیں ہیں سرکار
پٹیل۔ یہ تو ہر وقت کسانوں سے سنا کرتے ہیں۔
بھاگی۔ میرے دو بچوں کو تھے دست ہوئے تھے مالک
چپراسی۔ اس کا سرکار نے مانی ہی میں رکھا ہے لحاظ۔
سکھارام۔ ابھی مال کی کچھ نکاسی ہے باقی
پٹیل۔ اسی واسطے دیر سے مانگتے ہیں
سکھارام۔ میں اس وقت پچیس گذرانتا ہوں

(کمر میں بندھے ہوئے دھوتی کے کپڑے سے روپے نکالتا ہے)

پٹیل۔ (عینک سے جھانکتے ہوئے) یہ سرکار ہے کوئی ساہو نہیں ہے
سکھارام۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) میں سمجھتا ہوں کہ سرکار ہیں ماں باپ مرے
چپراسی۔ (پٹیل سے) اس کو قانون سمجھ میں کبھی آتا ہی نہیں
پٹیل۔ کھیت ہراج اگر ہو تو مزا آئے گا۔

(اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

بھاگی۔ پٹیل تم سے یہ امید ہو نہیں سکتی۔

(تحصیل کے چپراسی کو دو مرغیاں اور کچھ انڈے دیتی ہے)

پٹیل۔ بھاگی اپنے سگھو کو ذرا سمجھا تو۔

(بھاگی اپنے پاس سے پانچ روپے اور گلے کی ہنسلیاں اتار کر دیتی ہے۔ سکھارام سر جھکا لیتا ہے)

نواں منظر

شام

(فصل ربیع۔ جوار تیار ہے۔ بعض کھیتوں میں ابھی چیک نہیں بھری ہے۔ ایک آدھ ہفتے کی دیر ہے۔ شام کا وقت سورج ڈوب رہا ہے۔ سکھا رام موٹ مار رہا ہے یہ قبل از وقت ضعیف و ناتواں نظر آ رہا ہے۔ سر کے بال سفید ہو چلے ہیں۔ پشت اور شانوں کے پاس خم آ گیا ہے۔ بیلوں کو سہراتے[1] ہوئے۔ ایک کان میں انگلی ہے دوسرا ہاتھ اس رسی پر دبا ہوا ہے)

(سکھا رام بھرائی ہوئی آواز میں گاتا ہے)

ڈرے[2] چال بیلا ہے   دھاؤ[3] صاف، تھارو نے میں پانی نین

مول[4] کا جوڑا۔ بالی[5] آئی، اوسی[6] میں ہے چیک[7]   ساہو کھوتی مال[8] کرے، کسان مانگے بھیک

یہ کیا واویلا ہے   (کھانستا ہے)

بڑھنا[9] سرنا بیلوں کا ہے جیسے میری آس   روپے ان کے کیسے ہیں اور کوڑی میرے پاس

ڈرے چال بیلا ہے   (پھر کھانستا ہے)

(پرندوں کا ایک غول اُڑتا ہوا آتا ہے اور کھیت پر منڈلاتا ہے۔ پرندے نغمے سناتے ہیں)

ایک چڑیا۔

زمیں کو پہنا کے سبز جوڑا   بہار نے معجزہ دکھایا

سیاہ مٹی کی خشکیوں پر   ہری جوانی کا روپ آیا

وہ ننھے ننھے حسین پتے   ہوا کے جھولے میں جھولتے ہیں

وہ پیارے پیارے مکائی دانے   خوشی کی بارش سے پھولتے ہیں

اگر فلک پر ہیں ماہ و انجم   زمین پر بھی ہیں چاند تارے

یہ کس کنواری نے ڈالے ان کو   ہنسی ہنسی میں یہ پھول سارے

دوسری چڑیا۔ حسین فطرت کا سبز جلوہ   دل و نظر میں بسا ہوا ہے

---

[1] سہراتے ہوئے موٹ پر بیلوں کو ہانکتے ہوئے۔ [2] یہ مصرع کسان کے اصل گیت کا ہے [3] دھاؤ۔ موٹ پر بیل چلنے کی جگہ جو ہوتا [4] جوڑا یعنی پتے۔ بیلے۔ [5] بالی یعنی گیہوں کے دانے جو ابھی تنے میں ہیں۔ [6] اوسی یعنی گیہوں کی بالی۔ [7] چیک۔ [8] وہ جو مکائی میں آتا ہے۔ [8] مال کھوتی کرنا۔ رہن رکھنے سے قبل مال کا اندازہ کرنا۔ [9] بڑھنا سرنا یعنی موٹ کے بیلوں کا آگے پیچھے چلنا

ہماری آپا کا پیٹ شاید — بہت دنوں سے بھرا ہوا ہے

پہلی چڑیا۔ آنکھ ہر وقت غذا ہی پہ جمی رہتی ہے — تجھ کو بس پیٹ ہی کی فکر لگی رہتی ہے

دوسری " رات دن نور ازل پیتی نہیں — چاند تارے کھا کے بھی جیتی نہیں!

تیسری " بہار کے پر لگے ہیں ہم کو — ہمارے بازو میں ہے جوانی

ہوا میں گانے ہمارے ناچیں — دکھائیں ہم رقص زندگانی

زمیں کے سب خوشنما پرندے — خوشی کی بنسی بجا رہے ہیں

فضائے سیال کی نمی ہیں — ستاروں کی طرح چھا رہے ہیں

دوسری "۔ لو اور سنو، پیٹ بھروں کی یہ ترنگیں — کیا شان بڑھاتی ہیں زمانے کی ہوا کا!

جب چھاؤں نظر آنے لگی زاغ و زغن کی — سب لوگ سمجھنے لگے سایہ ہے ہما کا

بے فکریٔ ہستی بھی عجب چیز ہے ہمدم — ہر گھاس کی پتی میں گلستاں نظر آئے

جب دل میں غم و رنج کا طوفاں بپا ہو — پھولوں بھرا گلزار بیاباں نظر آئے

چوتھی "۔ خدا کی بستی میں کم نگاہو — نظر کی بربادیاں نہ رکھو

ازل کے آزاد گلشنوں میں — ہوس کی صیادیاں نہ رکھو

ملی ہے فطرت کو شادمانی — دلوں میں ناشادیاں نہ رکھو

نظام قدرت کی بندشوں میں — اسیر آزادیاں نہ رکھو

دوسری "۔ وقت ضائع نہ کرو اور زمیں پر اترو — کتنی رنگین غذاؤں سے بھری ہے دنیا

نعمتیں فصل بہاراں کی اڑاتے جاؤ — اور کہتے رہو اک سبز پری ہے دنیا

دیکھو انسان نے بھی ہم پہ عنایت کی ہے — سارے میدان کو شاداب بنا رکھا ہے

لطف اٹھاؤ کہ بہت کم ہے شباب ہستی — خشک مداحیٔ آفاق میں کیا رکھا ہے

(کسان مچان پر کھڑا ہوا گوپھن ہلا رہا ہے۔ روح صداقت مسکراتی ہوئی آواز دیتی ہے)

روح صداقت۔ کس شان سے کھڑا ہے محافظ بنا ہوا — اس بادشاہ کشور ہستی کو بھی تو دیکھ

طعنہ زن کشاکش ہستی ہے کس قدر — موسم زدہ شباب کے لب پر ہنسی تو دیکھ

کتنے پیام ایک اچٹتی نظر میں ہیں — پروردگار زیست کی یہ خامشی تو دیکھ

سرسبز کھیتیوں سے گلے مل کے رو دئی ہو
عالم نواز کی نظر بیکسی تو دیکھ

صحن زمیں پہ ڈھونڈتا ہے زیست کا صلہ
مدہوش انتظار کی یہ بےہشی تو دیکھ

پانچویں چڑیل۔ حاصل محنت دہقاں کی ثنا خواں بنکر
کشت ہستی کی نگہبان بنی جاتی ہے

دل میں اک درد طلب لب پہ صدائے احسان
میری آیا تو اک انسان بنی جاتی ہے

دوسری۔ ہاں بہن لوٹ کے ہم دولت دنیا کی بہار
شکر خون۔ یزئی دہقان ادا کرتے ہیں

غیر کے خرمن امید کے مالک بن کر
ہم بھی اک سنت انسان ادا کرتے ہیں.

روح عاطفت (پرندوں کو اترتا ہوا دیکھ کر)

کیوں چلے آتے ہیں کھیتوں میں پرندے یا رب
روح تخریب میں بھی قوت پرواز ہے کیا؟

گونجنے رہے ہیں خرمن پہ قضا کے نغمے
تیری دنیائے تظلم بھی خوش آواز ہے کیا؟

آتے ہیں اُڑتے ہوئے لوٹنے والے اس کے
رنگ بو گلشن دہقان کی غماز ہے کیا؟

تیری بستی میں کہیں اور نہیں اس کو جگہ
ایک کٹیا ہی میں تکلیف کا در باز ہے کیا؟

سکھا رام۔ اُڑتے ہوئے، مچلتے ہوئے، چیختے ہوئے
پھر آرہے ہیں مجھ کو ستانے کے واسطے

کیوں لوٹتے ہو خون پسینے کی محنتیں
تم تو بنے ہو گیت سنانے کے واسطے

بھگوان میرے، تیرے پرندے بھی آتے ہیں
درد شکم کا شور مچانے کے واسطے

میں تو زندگی کو تھام رہا ہوں کسی طرح
اور زندگی ہے مجھ کو مٹانے کے واسطے

(ایک درخت کے پیچھے سے کوئی دوشیزہ خاتون جو بیدا آرائشوں کا مجسمہ نظر آتی ہے زرق برق لباس میں سامنے آتی ہے ہاتھ میں کیمرہ ہے۔ سکھا رام دوشیزہ کو سلام کرتا ہے اس کے ساتھ جانگلا بابو، بھی ہے)

جانگلا بابو۔ کیوں، جی نہ لگا شہر کی پُرشور فضا میں
تفریح کو اس دشت میں پھرا ہے سرکار

دوشیزہ۔ ہاں صورت انسان سے بھر دور ہوئی ہیں
جنگل میں نظر آتا ہے اللہ کا دربار

(کسان کی تصویر لینے کے لئے کیمرہ اٹھاتی ہے)

جانگلا بابو۔ یہ سوچتا ہوں دیکھ کے اس جسم حزیں کو
شاید یہ غریب آپ کا انسان نہیں ہے

دوشیزہ۔ اک جسم کے ڈھانچے کو نہیں کہتے ہیں انسان
فطرت کی عطا بے سروسامان نہیں ہے

(پیچھے سے اس کی ایک سہیلی درخت کی آڑ سے ہاتھ میں منڈولین لئے ہوئے آتی ہے اور گاتی ہے)

سیملی۔ نگہ پرستارِ رنگ مستی خیال مسحورِ کیف و مستی
غریب انساں کی نعمتوں پر رہیگی ان کی نظر کہاں تک

حیات اک شان بے نیازی عمل میں ارماں کی سرفرازی
کسی تڑپ میں فروغ کتنا کسی فغاں میں اثر کہاں تک

جہاں میں تہذیب کی شعاعیں دل و جگر میں اتر رہی ہیں
کسی کی محرومیوں کی یارب رہیگی ان کو خبر کہاں تک

کبھی ہے فطرت کا جور اس پر کبھی ہے دنیا نفور اس سے
الٰہی یہ سختیاں فلک کی سہیگا تیرا بشر کہاں تک؛

دسواں منظر

"منگنی"

(سکھارام جھونپڑی میں جوار کی روٹی پیاز ہری مرچ اور چٹنیا کھارہا ہے چھاچھ کا ایک پیالہ سامنے۔ اس کی لڑکی سندرا گردن پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ بھاگی ایک طرف جھاڑو دے رہی ہے)

بھاگی۔ چلو جلدی کھاؤ کہ لوگ آرہے ہیں۔

سکھارام۔ یہ مطلب ہے روٹی میں ثابت نگل جاؤں؟

بھاگی۔ ادھو مزاج تیز ہوا جارہا ہے روز:۔

سکھارام۔ میرا مزاج تیز کہ تیرا مزاج تیز؟

بھاگی۔ بہلانے لاٹ صاحب کا دل پوچھنے مزاج   بنگوائی اک خرید کے لاؤں گی گاؤں سے

سکھارام۔ (بھاگی کی بے وفائی کا خیال کرکے) اچھا ہے تیرے جھولنے کے کام آئے گی

بھاگی۔ کیں زمیندار نہیں کوئی کہ جھولا جھولوں۔

سکھارام۔ جانتا ہوں تو زمیندار بنے گی اک دن

بھاگی۔ کون اس طرح زمیندار بنائے گا مجھے؟

سکھارام۔ کیا خبر کون ہے وہ؟

(روٹی ختم کرکے سیاہ مٹی کے بدھنے سے ہاتھ دھوتا ہے اتنے میں دو مرد اور دو عورتیں آتی ہیں سندرا بلی کے ساتھ کھیلتی ہوئی دوسری جھونپڑی میں ہے)

سکھارام۔ آؤ بیٹھو کہ بہت دیر سے تکتا ہوں راہ

ایک مرد۔ سکھو، تجھے ایک کھیت[1] ہم کو دینا پڑے گا۔

بھاگی۔ وہ[2] دو سو کے بارے میں سوچا ہے تم نے؟

---

[1] جہیز کے طور پر کھیت طلب کیا جارہا ہے [2] مرہٹواری کا قاعدہ ہے کہ لڑکی والے لڑکے والوں سے رقم مانگتے ہیں

عورت۔ نہیں بھاگی، اتنا تو ہم سے نہ ہوگا

بھاگی۔ تو لڑکی کو چھوٹا سا نمبر ہی لکھ دے۔

مرد۔ ہم بھی کسان تو بھی وہی۔ دیکھتی نہیں۔

سکھارام۔ تمہارے دو سو نہ کھیت میرا چلو یونہی سندرا کو لے لو۔

مرد۔ لے دے کے آس مجھ کو فقط کھیت ہی سے ہے!

عورت۔ (سکھارام سے) فتح چند سے کتنے بیگھے بچائے؟

سکھارام۔ میرے پاس اس وقت دو کھیت ہیں۔

بھاگی۔ جو پانی نہ پڑنے سے سوکھے ہوئے ہیں۔

دوسری عورت۔ چلو جی یہاں کام کیسے بنے گا۔

بھاگی۔ یہ لڑکی کا سودا ہے یا اس زمیں کا؟

پہلی عورت۔ جانتی ہو گاؤں میں لڑکوں کی ہے کتنی کمی؟

سکھارام۔ چلو خیر اک کھیت میرا ہی لے جاؤ
مجھے آس جینے کی باقی نہیں ہے
میں جیتا رہوں گا تو مانگوں گا تم سے
تمہاری بہو میری بیٹی نہیں ہے؟

بھاگی۔ اور کم از کم سو کا کر لو بندوبست

عورت۔ ذرا سندرا کو بھی آواز دینا۔

سکھارام اپنی پانچ سالہ لڑکی کو گود میں لئے ہوئے آتا ہے۔ لڑکے کے ماں باپ اپنے ساتھیوں کو دکھاتے ہیں اور کچھ سوچ بچار ہوتا ہے۔ پھر بات پکی ہو جاتی ہے اور سب لوگ اٹھکر چلے جاتے ہیں۔ ایک عورت واپس آکر)

عورت۔ گائے تو اپنے ہی گھر آئے گی نا؟

(سکھارام ہاں کا خاموش جواب دیتا ہے)

گیارہواں منظر

طوفان

رات کا وقت۔ زور کی آندھی چلتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں اور آن کی آن میں دھواں دھار بارش شروع

ہو جاتی۔ ہر طرف اکھاڑوں جل تھل ہو جاتا ہے جھونپڑیاں اڑ جاتی ہیں دو ایک درخت ٹوٹ کر گرتے ہیں)

طوفان کی آواز۔ کون کہتا ہے کہ ناگاہ ہے آنا میرا | منتظر پہلے سے رہتا ہے زمانہ میرا
چشم ظاہر یہ گراں ہے مری بیراہ روی | اہل دل خوب سمجھتے ہیں فسانہ میرا
زندگی دولت غم نذر کیا کرتی ہے | ڈھونڈتا ہے دل غمگین بہانہ میرا
پتے پتے سے عیاں ہو مری بیتابیٔ دل | ذرے ذرے کے لبوں پر ہے ترانہ میرا
رقص کرتے ہوئے ہر چیز کو لے لیتا ہوں | قافلہ جوش سے ہوتا ہے روانہ میرا
طبع نازک پہ ہو یا کوہ کی سنگینی پر | کبھی خالی نہیں جاتا ہے نشانہ میرا
زندگی میرے لئے جیتی چلاتی ہے | موت کے ہاتھ سے بھرتا ہے خزانہ میرا

سکھارام طوفان دیکھ کر اپنے کھیتوں کا خیال کرتا ہے۔

وقت کی آواز گاؤں کو، کھیتوں کو، اور دہقان کو | لوٹ لے اے زندگانی لوٹ لے
آتی ہے) برق و باراں کو جگا اے چرخ پیر | بے نواؤں کی جوانی لوٹ لے
تا نہ رہ جائے کہیں تسمہ لگا | اے بلائے آسمانی لوٹ لے
غمزدوں کو اور بھی غمگیں بنا | بیکسوں کی شادمانی لوٹ لے

(طوفان کا اور زور ہوتا ہے۔ ہوا اور پانی کے سیلاب آنے لگتے ہیں)

طوفان کی دوسری آواز) سرد دیکھی جو کبھی محفل بیتابیٔ دل | بجلیاں کوند گئیں میرے شبستانوں میں
برق بن جاتا ہے جب میری فضاؤں کا جلال | چاک پڑ جاتے ہیں بادل کے گریبانوں میں
سانس جب زور سے چلتی ہے شکیبائی کی | زندگی جھومنے لگتی ہے بیابانوں میں
وقت آتا ہے تو دنیا کی نظر سے بچ کر | آگ بھر دیتا ہوں میں زیست کے پیمانوں میں
کھٹکھٹاتا ہوں میں دروازہ اسیروں کا اگر | شور زنجیر کا ہو جاتا ہے زندانوں میں
مجھ کو افسوس ہے ہوتی ہے کبھی بربادی | شور مچ جاتا ہے دنیا کے پریشانوں میں
اس پہ بھی دہر کو ہر وقت طلب ہے میری | یاد رہتی ہے مری زیست کے ایوانوں میں

(باہر سے بیلوں کے پکارنے کی آواز آتی ہے سکھارام طوفان سے لڑتا ہوا چھپر تک جاتا ہے چھپر اڑ جانے سے بیل بھیگ رہے ہیں وہ بیل کھول کر اپنی جھونپڑی میں لے آتا ہے اور ان کا جسم خشک کرتا ہے۔ رات بھر میاں بیوی کھڑے کھڑے گذار دیتے ہیں)

بارہواں منظر

میلہ

گاؤں کے باہر چھوٹا سا میلہ مختلف قسم کے جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ بچے جوان، بوڑھے سب ہی جھول رہے ہیں چاروں طرف دوکانیں، ہنڈیاں، میوہ، ترکاری، منیاری سامان، کپڑوں اور کھلونوں کا بازار۔ بچے سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ ایک طرف مداری کے کرتب، دوسری طرف ریچھ اور بندروں کا ناچ۔ میدان کی طرف بہت سے لوگ جمع ہیں۔ کسان، چمار، مزدور، زمیندار، پٹیل، پٹواری، سیٹھ، ساہو، اکثر جمع ہیں کھادی کے ایک کپڑے پر کسان کے بیچوں بیچ، کسان سدھار لکھا ہوا ہے دوسری طرف زراعتی آلے اور تخت بیج وغیرہ کی نمائش کا موٹر کھڑا ہوا ہے۔ ایک شخص تخت پر کھڑا ہوا لکچر دے رہا ہے۔ سکھا رام بھی بھاگی کو لئے ہوئے ایک کونے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور تقریر کا یہ حصہ سنتا ہے)

ضرورت ہے کہ تم اس وقت اپنے خواب سے جاگو — ذرا اچھی زراعت کے لئے پیدا کرو ساماں
نئے آلات لاؤ اور دکھا دو سیکھو نئی باتیں — کہ لہرانے لگیں فصلوں سے سارے کھیت اور میداں
نئے جتنے طریقے ہیں انھیں تم آزماؤ تو — ترقی کے چھپاؤ گے کہاں تک دل میں تم ارماں

(سکھا رام وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ راستے میں اس کا دوست راما ملتا ہے)

راما۔ ارے چل کتھا سنیں گے کہ چلے ہیں سب ادھر ہی۔

سکھا رام۔ اسے سن چکا ابھی ہیں۔

راما۔ کام کی باتیں ہیں وہ

سکھا رام۔ سب لوٹ کی گھاتیں ہیں وہ

راما۔ خبر ہے ولایت کا یہ پرچار ہے

سکھا رام۔ یہ سب کچھ صحیح ہے پہ بیکار ہے۔

اتنے میں دو دولتمند دوشیزہ کیمرہ لئے ہوئے آتی ہے پیچھے اس کی سہیلی ہے۔ سکھا رام کو ساتھ چلنے کا حکم دیتی ہے۔ سکھا رام کھانستا ہے اور تھوڑی دیر پیٹ پکڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔ سدھار اسے اٹھاتا ہے۔ دونوں مل کر دوشیزہ کے ساتھ ایک پنڈال میں جاتے ہیں جس پر "امداد باہمی" کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ دوشیزہ

وہاں کے سکریٹری سے)

دوشیزہ۔ تارزدہ ہے مری کچھ قرض اسے بھی مل جائے

سکریٹری۔ کتنا قرضہ اس کو ملنا چاہیئے؟

(دوشیزہ سکھارام کی طرف دیکھتی ہے)

سکھارام ہے میرا جیون ہی قرض سارا حساب کی یاں خبر کسے ہے؟

دوشیزہ۔ میں سمجھتی ہوں اسے دو چار سو ہی چاہئیں

سکھارام۔ ہے کرپا تمہاری، اگر چار سو میں، مرا ایک نمبر بھی ساہو نہ دے گا

سکریٹری۔ (دوشیزہ سے) معاف فرمائیے اس وقت مرے کھاتے میں، آپ کے واسطے دو سو کی رقم باقی ہے۔

(سکھارام چکر کھا کر گر جاتا ہے)

تیرہواں منظر

موت

(تاریک رات۔ ندی کا کنارہ۔ سکھارام کی لاش چتا میں جل رہی ہے سناٹا اور ہوا کے ہلکے ہلکے سر جھونکے۔ چتا کی لکڑی چٹختی ہے۔ اوپر سایہ کیا ہوا درخت)

درخت۔ ختم ہو جلد تری آخری تکلیف حیات — میرے پتے ترے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں

مدتوں روتی ہے دنیا کی فضائیں اس پر — لوگ مظلوم کو مدفن میں سلا دیتے ہیں!

آ رہی ہے عدم آباد سے آواز سنو — آ تجھے اپنے مکانوں میں چھپا دیتے ہیں

خدمت دہر نے تو چھین لی ہستی تری — آسماں والے تجھے دیکھئے کیا دیتے ہیں؟

(بھاگی چتا کے قریب بال کھولے ہوئے آنسو بہا رہی ہے۔ شعلوں کی سرخیاں اس کے چہرے پر چمکتی ہیں۔ درختوں کے نیچے چندر ایک ہاتھ پیڑ سے لگائے بھاگی کو دیکھ رہا ہے)

محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی

لکچرار ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ

امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر

اندر سبھا کے مصنف اور اُردو ڈرامے کے باوا آدم کی حیثیت سے امانت کا نام غیر معروف نہیں، شاعری میں لکھنویت کے ایک خاص عنصر یعنی رعایت لفظی کی ایجاد و رواج کا سہرا بھی انھیں کے سر ہے، واسوخت گوئی میں وہ اپنے فن کے امام ہیں۔ ان کے ابتدائی عمر کے سلام اور بعد کے مرثیے بھی بے مزہ نہیں لیکن ان سب نے مل جل کر ان کے جوہر اصلی اور کمال حقیقی یعنی غزل گوئی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ اس وادی میں بھی وہ معاصرین سے کسی طرح پیچھے نہیں لیکن موجودہ شاعری کے رنگ سے ان کے کلام کا مقابلہ کرنا یا ان کے کمالات کو اپنے زمانے کے اصول تنقید پر پرکھنا انصاف سے بعید ہے

نام آغا حسن تھا اور امانت تخلص میاں دلگیر نے تجویز کیا تھا جن کی مرثیہ گوئی کا آوازہ انیس و دبیر کے ظہور سے پہلے لکھنؤ میں گونج رہا تھا، اندر سبھا میں بعض اوقات انھوں نے اپنا تخلص استاد لکھا ہے۔ اس کے متعلق ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصّہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور نثر اور ٹھمریاں اور ہولیاں اور بسنت اور ساون اور دادرے اور چھند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں۔ بسبب اصرار ہر دوست و یار چار و ناچار ۱۲۶۵ھ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبھا اس کا نام رکھا کہ آج تک خاص و عام کی زبان پر جاری ہے اور صدہا مرتبہ چھپنے کی نوبت آئی مگر چونکہ اندر سبھا کا تصنیف کرنا خلاف شان و تہذیب جناب مغفور تھا اس لئے اس کتاب میں سے اپنا تخلص نکال لیا اور جا بجا بجائے تخلص لفظ استاد رکھدیا مگر عاشقانہ غزلوں میں جو تخلص امانت تھا وہی باقی رکھا"[1]

---

[1] بیش لفظ از سید حسن لطافت ابن آغا حسن امانت بر دیوان امانت مسمی بہ خزائن الفصاحت مطبوعہ ۱۲۸۰ھ مطبع خاص منشی درگا پرشاد لکھنوی محلہ نواز گنج۔

مگر نورالٰہی محمد عمر صاحبان اس سے متفق نہیں ان کا بیان ہے:-

"اندر سبھا امانت میں امانت اور استاد دو تخلص استعمال کئے گئے ہیں ہمیں شک ہوا تھا کہ یہ ڈراما بھی کسی اشتراک عمل کا نتیجہ ہے مگر ذیل کے شعر نے شک دور کر دیا ۔

کبھی کہتا ہے امانت کبھی استاد مجھے　　ہیں قیامت بت بے شرم و حیا کی باتیں[1]

دو تخلص کیوں استعمال کئے گئے اس بارے میں یقینی طور پر ہم کچھ کہہ نہیں سکتے، ہاں تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعموم غزلوں میں امانت اور اس نظم میں جو ڈرامے سے تعلق رکھتی ہے استاد تخلص کرتے تھے۔ یہ خیال کہ وہ ڈرامے کو اپنے سے منسوب ہونا پسند نہیں کرتے تھے صریحاً غلط ہے کیونکہ اس میں استاد اور امانت کی ایک ہی ہستی ہونے کا اعلان ہے۔ ہمارے نزدیک بات یہ ہے کہ ریختہ کے شعرا جب فارسی میں یا ریختہ میں کچھ کہتے تھے تو کوئی اور تخلص کیا کرتے تھے، جیسے نیر و رخشاں تخلص ہیں نواب ضیاالدین دہلوی کے......... اسی طرح امانت نے اس صنف جدید کے لئے یہ نیا تخلص اختیار کیا"[2]

ناٹک ساگر کے مصنفین نے جو شعر پیش کیا ہے وہ اندر سبھا میں نہیں بلکہ دیوان خزائن الفصاحت میں موجود ہے۔ دوسرے سید حسن لطافت کے بیان سے اختلاف کرنے کی کوئی معقول دلیل ان مصنفین نے پیش نہیں کی ہے۔ یہاں تک دونوں متفق ہیں کہ غزلوں میں ان کا تخلص امانت ہی ہے۔ البتہ اندر سبھا میں "جابجا بجائے تخلص کے لفظ استاد رکھدیا"

اکثر شعرائے ریختہ و فارسی نے دو زبانوں کے لئے دو مختلف تخلص بھی استعمال کئے ہیں لیکن یہ بھی اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اساتذہ وقت اگر نئی اور عام پسند چیزوں کی طرف کبھی توجہ کرتے بھی تھے تو پہلے خواص سے معذرت کر لیتے تھے کہ اگر وہ ان کے اصلی کمالات کو دیکھنا چاہیں تو مروجہ اصناف پر نظر ڈالیں۔ عرصہ تک ریختہ گو فارسی شاعر اپنی اردو شاعری کو "محض تفنن طبع" کے لئے کہتے تھے اور اس پر فخر کرنا نازیبا سمجھتے تھے

---

[1] خزائن الفصاحت مطبوعہ ۱۲۷۰ھ میں دوسرا مصرعہ یوں ہے "کبھی کہتا ہے امانت مجھے استاد کبھی۔
[2] ناٹک ساگر کے دو باب از نورالٰہی محمد عمر صاحبان صفحہ ۶۶-۶۷ ۔

یہ دوسری بات ہے کہ جس چیز کو وہ اپنے لئے باعث عار سمجھتے تھے وہی ان کی شہرت کا اکثر ذریعہ بنی غالب اپنی اردو شاعری کو "مجموعہ بے رنگ" کہکر گذر گئے ہیں حالانکہ ان کے اشعار اردو شعر و شاعری میں بے مثل ہیں۔ یہی حال امانت کا ہوا ہوگا۔ اندر سبھا عوام اور احباب کی فرمائش سے لکھی گئی اور عوام نے ہی اس میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ اس زمانہ میں کیا آج بھی ثقہ لوگ اسے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے اس لئے کچھ بعید نہیں جو امانت نے اپنا دامن بچانے کے لئے معذرت کے طور پر اپنا تخلص جگہ جگہ سے نکال کر استاد کا لفظ رکھدیا ہو۔

جیسا کہ مذکور ہوا اندر سبھا کی شہرت نے ان کی غزل کی خوبیوں پر پردہ ڈالدیا۔ علاوہ بریں ابتدا ہی سے ان کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہوگئی کہ ان کا کلام صرف رعایت لفظی اور ضلع جگت تک محدود ہے یہی وجہ ہوئی کہ غزل گو شعراء کے تذکروں میں ان کے حالات بہت کم ملتے ہیں ڈراموں کی تاریخ میں اندر سبھا کے مصنف کی حیثیت سے ان کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ ان کے دیوان خزائن الفصاحت کے اس دیباچہ سے ماخوذ ہے جو ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت نے لکھا تھا۔ یہ دیوان جو ۱۲۷۸ھ میں خود شاعر کے صاحبزادے نے مرتب کیا یہی اس کا قدیم ترین اور مستند نسخہ ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ یہ متعدد بار شائع ہوا۔ (مثلاً نول کشور پریس میں) لیکن کوئی نسخہ اس کی صحت کو نہیں پہونچتا۔

اس دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آغا حسن امانت کا سلسلۂ نسب میر آغا ابن سید علی ابن سید محمد تقی ابن سید علی مشہدی سے ملتا ہے۔ سید علی مشہدی جو ان کے مورث اعلیٰ تھے مشہد مقدس میں جناب امام علی ابن موسی الرضاؑ کے روضۂ مقدسہ کے کلید دار تھے۔ لکھنؤ میں ان کی اولاد کو شاید وہ کشش کھینچ کر لائی ہوگی جو نواب سعادت خان برہان الملک نے مذہب اثنا عشریہ کی سرپرستی سے پیدا کر دی تھی۔ یہیں لکھنؤ میں آغا حسن پیدا ہوئے اور بیس برس کے سن تک علوم مروجہ کی تحصیل کرتے رہے۔ شاعری کی بزم یہاں نئی نئی قائم ہوئی تھی یہ بھی شعر گوئی کی طرف متوجہ ہوئے یہ زمانہ لکھنؤ میں مرثیہ کی اٹھان کا تھا چنانچہ انھوں نے بھی ابتدا میں چند سلام موزوں کئے۔

اس وقت لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا میں میاں دلگیر کا بول بالا تھا چنانچہ آغا حسن کے والد اس نوخیز

شاعر کو ساتھ لے کر کہنہ مشق استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے آغا حسن نے اپنے سلام سنائے جن کو سن کر دلگیر بہت خوش ہوئے اور مستقبل کے متعلق امید افزا خیالات کا اظہار کیا اور امانت تخلص تجویز کیا

عرصے تک سلام گوئی کی مشق جاری رہی اور اس فن میں کچھ نام بھی پیدا کیا لیکن یکایک طبیعت غزل کی طرف متوجہ ہوئی اور چند غزلیں کہہ کر استاد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اصلاح چاہی چونکہ میاں دلگیر کو غزل سے لگاؤ نہ تھا اس لئے خلوص کے ساتھ معذوری ظاہر کی البتہ وعدہ کیا کہ وہ ان کا تعارف اپنے بعض دوستوں سے کرا دیں گے جو اس فن میں کامل تھے۔ امانت نے قبول نہ کیا اور اس دن سے اپنی فکر کی رہبری پر بھروسہ کر کے غزل گوئی شروع کی اس وقت ان کی عمر تقریباً بیس سال کی تھی۔

اس عمر میں کسی بیماری سے ان کی زبان بند ہو گئی اور یکایک گویائی سے محروم ہو گئے، مجبوراً بذریعہ تحریر کلام کرنا اختیار کیا، اس بیکاری اور خاموشی میں مشق سخن کا زیادہ موقع اور محنت سے شاعری کو کمال کے درجہ تک پہونچا دیا اکثر لوگ ان کے شاگرد ہوئے جن میں صاحب عالم ہمایوں بخت بہادر بھی تھے۔ انھوں نے ہی پہلا دیوان بہ تلاش و محنت جمع اور مرتب کیا لیکن وہ دیوان کسی حادثہ میں تلف ہو گیا اور ساری محنت رائگاں گئی پھر ایک سو دس بند کا ایک عاشقانہ واسوخت نظم کیا وہ ایک دوست نے مستعار مانگا اور پھر باوجود اصرار و تقاضے کے واپس نہیں کیا۔ چنانچہ پہلے دیوان کی طرح پہلا واسوخت بھی دریا برد ہوا۔ یہ کلام اگر موجود ہوتا تو معلوم ہوتا کہ جوانی میں کلام میں کیا زور اور رنگ تھا۔ اب جو سرمایہ موجود ہے وہ اس کے بعد کا ہے۔

۱۲۵۹ھ میں اپنا وہ مشہور واسوخت نظم کیا جس میں تین سو سات بند ہیں اور باوجود اس کے کہ رعایت لفظی اور معاملہ بندی کے مضامین اس میں بہت ہیں یہ عرصہ تک بہت مقبول رہا۔

واسوخت کی تکمیل سے پہلے عتبات عالیات کی زیارت کا شوق پیدا ہوا اور گویائی سے محروم ہونے کے باوجود کمر ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ۱۲۶۰ھ میں زیارت روضۂ جناب امام حسین علیہ السلام سے مشرف ہو کر لوٹے وہ زبان جو دس برس سے بند تھی کھل گئی۔ ناٹک ساگر کے مصنفین کا بیان ہے کہ کسی علاج نے یہ مرض دور کیا سید حسن لطافت لکھتے ہیں کہ بغیر کسی علاج کے صرف زیارت کی برکت

سے یہ بیماری دور ہوگئی البتہ کچھ لکنت باقی رہ گئی جو مرتے دم تک ساتھ رہی۔

لکھنؤ واپس پہونچ کر واسوخت کو مکمل کیا اور ۱۲۶۳ھ میں ایک محفل منعقد کی اور تمام امراء و روساء اور عمائدین شہر کو جمع کر کے بر سرِ محفل یہ واسوخت پڑھا اور داد کمال حاصل کی اب اس واسوخت کو پڑھئے تو ثقاہت کا خون ہوتا نظر آتا ہے لیکن اس محفل میں واسوخت کے سننے سنانے سے اس عہد کی معاشرت اور لوگوں کے مذاق کا کیسا صاف پتہ چلتا ہے۔

۱۲۶۶ھ میں عوام کی فرمائش سے اندر سبھا کا قصہ نظم کیا اس اندر سبھا کے لئے لکھنؤ میں فضا پہلے سے تیار تھی۔ اختر نگر کے عیش خانے اندر کی سبھا کے مکمل نمونے تھے۔ امانت نے اندر سبھا لکھی تو گویا ماحول سے متاثر ہو کر اس کی ترجمانی کی۔ ناٹک ساگر کے مصنفین اس کی تاریخ تصنیف ۱۲۷۰ھ بتاتے ہیں اور اس کے ثبوت میں یہ شعر پیش کرتے ہیں۔

خلائق میں ہے دھوم اندر سبھا کی ز روئے وعد بول اٹھے پریزاد

اس شعر میں دوسرے مصرعہ سے پورے عدد حاصل نہیں ہوتے بلکہ 'وعد' کے 'و' یعنی و کے تعمیہ کے بعد ۱۲۷۰ھ برآمد ہوتے ہیں لیکن خزائن الفصاحت کے دیباچہ میں صاف ۱۲۶۵ھ تحریر ہے اس سلسلہ کی عبارت یہ ہے:

"بعد اس کے احباب نے فرمائش کی کہ قصہ راجہ اندر اس طرح نظم کیجئے کہ جس میں غزلیں اور مثنوی اور ٹھمریاں اور دھیے لیالی اور بسنت اور ساون اور دادرے اور چھند ہوں تاکہ اس زبان میں بھی طبیعت کی جودت اور ذہن کی رسائی دیکھیں بسبب اصرار ہر دوست دیار چار و ناچار ۱۲۶۵ھ میں یہ قصہ تصنیف کیا اور اندر سبھا اس کا نام رکھا۔"

ممکن ہے ۱۲۷۰ھ قصہ کا سنہ اشاعت یا طباعت ہو جسے ناٹک ساگر کے مصنفین نے غلطی سے سنہ تصنیف سمجھ لیا۔ سید حسن لطافت کی حیثیت شاہد عینی کی ہے۔ ان کے اس بیان سے اختلاف کے لئے ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ اندر سبھا اگرچہ تاریخی اعتبار سے ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن اس کی تفصیل اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

۱۲۶۷ھ میں چند غزلیں مسدس مخمس ترجیع بند ایک جا جمع کئے اور مجموعہ کا نام گلدستہ امانت رکھا۔ یہ مجموعہ

بھی متعدد بار شائع ہو چکا ہے۔ زیارت عتبات عالیات کے بعد پھر سلام گوئی اور مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ جسے بیس برس کے سن میں ترک کر چکے تھے۔ ہند کے حال کا ایک مرثیہ رزمیہ لکھا۔ اس صنف کے وہی موجد تھے۔ علاوہ اس کے اور مرثیے بھی بکثرت تصنیف کئے۔ آخر عمر میں جب طبیعت رعایت لفظی سے سیر ہو گئی تو چیستان معمہ اور پہیلی گوئی اختیار کی اور اس فن میں بھی داد کمال دی۔

۱۲۷۵ھ میں جمادی الاول کی اٹھائیسویں تاریخ کو بہ عارضۂ استسقا انتقال کیا۔ آغا باقر کے امام باڑے کے قریب مسافر خانے میں دفن ہوئے۔

ان کے مرنے کے بعد باقی ماندہ کلام کا مجموعہ ان کے صاحبزادے سید حسن لطافت نے خزائن الفصاحت کے نام سے مرتب کر کے شائع کرا دیا۔

غزل گوئی پر تبصرہ | تبصرہ سے پہلے ان کی ایک مکمل غزل دیکھئے جس سے ان کے عام انداز کا پتہ چلتا ہے۔

کان کی لو کا جو شعلہ پرتو افگن ہو گیا — اک بازو کا شب گیسو میں روشن ہو گیا
خنجر قاتل گیا جس دم ہمارے سر میں بیر — فرق کا کاسہ حباب آب آہن ہو گیا
عکس مژگان پڑ گیا جب ہمرہ تار نگاہ — یار کی شالی قبا پر کار سوزن ہو گیا
وسعت باغ جناں کا جب کیا ہم نے خیال — آسمان نیلگوں اک برگ سوسن ہو گیا
عمر بھر کانٹوں میں لوٹا گلرخوں کی یاد میں — جامۂ ہستی مجھے صحرا کا دامن ہو گیا
قتل پر عشاق کے قاتل نے جو باندھی کمر — تن وبال جان مجھے سربار گردن ہو گیا
بتکدوں میں ہے ہمارے نالۂ دل کا جو اوج — اے صنم کوڑی کا ناقوس برہمن ہو گیا
اے فلک محتاج ہم سکش نہیں برسات کے — لگ گئی جس دم جھڑی اشکوں کی ساون ہو گیا
ہو گیا جس رات میرا نالۂ سوزاں بلند — آسمان کا قمقمہ دنیا میں روشن ہو گیا
منس دل کو کر دیا زلف عرق افشاں نے خاک — ابر رحمت میرے حق میں برق خرمن ہو گیا
سرمگیں مژگاں کی الفت نے گھلایا کس قدر — جسم لاغر اپنا میل چشم سوزن ہو گیا
چٹکیوں نے تیری اے رشک چمن کیا گل کھلائے — جو پڑا نیل اپنے تن پر برگ سوسن ہو گیا

ہوں وہ زار و ناتواں لکھا جو منھ اس زلف پہ — حلقۂ زنجیر گیسو طوق گردن ہوگیا
اس کے جاتے ہی اڑا کیا رات کو محفل کا نور — شمع کا شعلہ چراغ زیر دامن ہوگیا
رخنہ ہر شئے میں پڑا تیر نگاہ یار سے — پردہ دنیا کا نظر بازی سے چلمن ہوگیا
باغ کے در پر کیا اس گل کا یاں تک انتظار — جسم خاکی پشتہ دیوار گلشن ہوگیا
کردیا تن کو ہمارے کیا قبا نے بے فروغ — داغ سینہ کا چراغ زیر دامن ہوگیا
ہٹ گئے ساقین جاناں سے جو شب کو پائنچے — اک دو شاخہ نور کا محفل میں روشن ہوگیا
نشۂ مے سے ہوا روشن چراغ حسن یار — ساقیا پانی سے شب کو کار روغن ہوگیا
کردیا حسن صنم نے سرخرو پیش ہنود — دیکھی جب زلف سیاہ کالی کا دشمن ہوگیا

تلکڑوں میں ہر کے بندھ جائے گی اپنی ہوا
گر امانت رام وہ طفل برہمن ہوگیا

اس غزل میں بعض خصوصیات ایسی ملتی ہیں جن میں لکھنؤ کے دبستان شاعری سے تعلق رکھنے والے سب کے سب شریک ہیں[1] مثلاً غزل کی طوالت، بھرتی کے مضامین، لکھنؤ کی نسائیت، فارسی کی دلآویز تراکیب کی کمی، خارجی مضامین کی زیادتی۔ داخلی اور روحانی مضامین کا فقدان تصوف کا فقدان، رعایت لفظی کا شوق، معاملہ بندی، ابتذال اور رکاکت، بیہودہ اور مبتذل تشبیہات و استعارات کا استعمال لیکن ان میں سے بعض اور ان کے علاوہ چند دیگر خصوصیات ایسی ہیں جو امانت کا خاص حصہ ہیں مثلاً رعایت لفظی و معنوی جو ضلع جگت کی حد سے جا ملی ہیں۔ محاورہ بندی، محاکات مختلف علمی و مذہبی اصطلاحات کا استعمال، ہندی الفاظ و محاورات، زبان کی بندش اور خوبی اور کہیں کہیں طرز ادا کی جدت۔ اب ان کی تفصیل سنیئے:-

<u>غزل کی طوالت</u>:- اردو کے دور قدیم میں طویل غزلیں بالعموم ناپید ہیں اور شاید اسی وجہ سے متقدمین شعرائے دہلی بھی مختصر غزلیں کہتے تھے۔ یوں تو غزل کے اشعار کی تعداد معین و مقرر نہیں تھی لیکن شاذ و نادر

[1] شعر الہند حصہ اول۔

ہی گیارہ اشعار سے زیادہ کی غزلیں لکھی جاتی تھیں۔ ان اشعار میں بالعموم بہترین قافئے صرف ہو جاتے تھے۔ شعرائے لکھنؤ جو ہمیشہ مضمون کے مقابلہ میں زبان پر جان دیتے تھے۔ اسے گناہ عظیم سمجھتے تھے کہ قافیوں کی ممکن فہرست میں سے کوئی قافیہ نظم ہونے سے رہ جائے چنانچہ اسی شوق میں طویل غزلیں لکھی جاتی تھیں اور جب ایک غزل سے سیری نہیں ہوتی تھی تو دوغزلہ اور سہ غزلہ تک نوبت پہونچتی تھی اور ان میں اکثر رکیک اور مبتذل قافئے بھی نظم کرنا پڑتے تھے۔ آتش کی ایک بہت مشہور غزل ہے۔ اس کے دو شعر ہیں۔

بوسہ بازی سے مری ہوتی ہے ایذا ان کو — منھ چھپاتے ہیں جو ہوتے ہیں مہاسے پیدا

لب شیریں سے ترے چاشنی ممکن نہ ہوئی — رس سے شکر ہوئی شکر سے بتاسے پیدا

چنانچہ امانت کی مذکورالصدر غزل میں بھی جسے ہم نے بطور نمونہ پیش کیا ہے یہ عیب موجود ہے ایک قافیہ سوزن ہے جس کے لئے شاعر کو ایک عجیب خیال اور مضمون پیدا کرنا پڑا۔

سرمگیں مژگاں کی الفت نے گھلایا اس قدر — جسم لاغر اپنا میل چشم سوزن ہو گیا

اس قسم کی بعض اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک غزل ہے۔

دکھلائے خدا اس ستم ایجاد کی صورت — استادہ ہیں ہم باغ میں شمشاد کی صورت

اس میں ۲۱ اشعار ہیں، قافئے ایجاد، شمشاد، بیداد، صیاد، جلاد، فرہاد، آباد، سیاد، بہزاد، فولاد، اولاد، آزاد وغیرہ بخوبی نظم ہوئے ہیں لیکن دو قافئے حداد اور فصاد رہ گئے تھے۔ ان کو شاعر یوں نظم کرتا ہے:۔

وہ وحشی لاغر ہوں کہ ہر جج ہوا نے — زنجیر پہنائی مجھے حداد کی صورت

پھولوں کے بچھونے پہ نزاکت سے وہ بیٹے — ہے ہر رگ گل نشتر فصاد کی صورت

دوسرا شعر تو کسی حد تک درگذر کے قابل ہے لیکن پہلے شعر کی آورد کبھی معاف نہیں کی جاسکتی۔ ایک اور غزل ہے

دیکھی جو نہیں زلف سیاہ فام کی صورت — دن تیرہ مری آنکھوں میں ہے شام کی صورت

اس کا ایک شعر ہے۔

اغیار سدا پستے رہے باغ جہاں میں — تو ام میں رہا یار سے بادام کی صورت

بادام کی وجہ سے توام اور پستے کا مضمون نکالنا پڑا جس میں رعایت لفظی کے علاوہ ابتذال بھی پیدا ہو گیا۔

ایک اور غزل ہے چشمِ تر کی طرح، نظر کی طرح، گھر کی طرح۔ اسی میں ایک شعر ہے۔

نبات کی لبِ شیریں سے یار نے اک دن　　پڑی گرہ پہ گرہ دل میں نےشکر کی طرح

لبِ شیریں کی رعایت سے نبات اور نیشکر کا مضمون صرف نیشکر کا قافیہ نظم کرنے کی غرض سے نکالنا پڑا
اماؔنت کے یہاں یہ عیب ہے لیکن کمتر، لکھنؤ کے معاصرین شعرا کے یہاں یہ اور بھی نمایاں ہے۔ کیونکہ
انھوں نے طویل غزلوں پر اکتفا نہ کرکے دو غزلے، سہ غزلے اور چہار غزلے تک لکھے ہیں اس روش کا اثر اماؔنتؔ
کے کلام پر دیکھئے ایک ردیف ہے غش کیا۔ اس میں مسلسل نو غزلیں لکھی ہیں۔

نسائیت:- لکھنویت کا اہم ترین عنصر ہے، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں فیض آباد اور لکھنو نے مہ جبینوں
کا مسکن بن کر یہاں کی تہذیب اور معاشرت میں نسائیت کا عنصر غالب بنا دیا۔ شاعری اور زندگی کو ایک
دوسرے سے جدا کرکے دیکھنا بہت مشکل ہے چنانچہ شعرائے لکھنو کے ہاں بالعموم نسائیت کا رنگ غالب
ہے اور یہ ماحول کی ترجمانی کرتا ہے اس قسم کے مضامین اماؔنت کے ہاں بھی موجود ہیں۔

ڈوپٹہ اوڑھ کر آبِ رواں کا سرخ انگیہ پر　　رولایا باغ میں اس گلبدن نے خوب شبنم کو

ڈوپٹہ، آبِ رواں، انگیہ، گلبدن اور شبنم کے مضامین خارجی تو ہیں ہی ان میں نسائیت بھی پائی جاتی
ہے۔ ایک قطعہ میں فرماتے ہیں۔

حنا سے پاؤں گلنار اس گلِ رعنا کے یکسر ہیں　　بندھا ہے کاسنی ریشم کا گیندا بوٹ دھانی ہے
سیہ موباف پاجامہ گلابی جیب پُر نیف،　　ڈوپٹہ سرخ، انگیہ سبز، کرتی زعفرانی ہے

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ ان کے ہاں صرف نسائیت ہے۔ شعرائے متقدمین کی امرد پرستی کا رنگ بھی موجود ہے۔

دمِ رفتار اگر رکھے سے شکم ہے صاف کھل جاتا　　کمر باندھا کر چھوڑو میاں باتیں لڑکپن کی

خارجی مضامین:- یہی خصوصیت دہلوی اور لکھنوی شاعری کا امتیاز دکھانے کے لئے بالعموم پیش کی جاتی
ہے۔ اس کا یہ مطلب نکالنا غلط ہے کہ شعرائے دہلی کے یہاں صرف داخلی اور جذباتی یا روحانی
مضامین ہیں اور لکھنؤ والے صرف خارجی واقعات یا متعلقاتِ حسن تک محدود رہ گئے ہیں۔ یہ البتہ صحیح
ہے کہ دہلی میں جذبات زیادہ تر اور متعلقات کمتر موضوعِ شعر بنائے گئے ہیں۔ لکھنؤ میں اس کے برخلاف

متعلقات زیادہ تر اور داخلی جذبات کمتر نظم ہوئے ہیں۔

پسینہ اس کے رخ آتشیں سے ہے جاری — عجب تماشا ہے آتش سے آب نکلا ہے

بعض اوقات نہایت مضحکہ انگیز مضمون پیدا ہو گیا ہے

ہے حسن کے دریا میں حبابوں کا یہ جھرمٹ — چیچک کے ترے گال پہ ابھرے نہیں دانے

اسی غزل کا مطلع ہے۔

بخشی ہے نزاکت یہ مرے بت کو خدا نے — کنگھی کبھی کی سر میں تو شل ہو گئے شانے

تارکشی دوپٹہ تو اوڑھے جو کرن ٹانک کے — ہو شب مہتاب میں کیا ہی صنم جھلاجھلی

مہ و انجم کو تو نے سب کی نظروں سے اتارا ہے — قیامت کا مدانی کا دوپٹہ چاند تارا ہے

روشن یہ ہے کہ سبز کنول میں ہے سبز شمع — دھانی لباس پہنے جو وہ سبزہ رنگ ہے

اے بحر حسن باندھے جوڑا اٹھا کے بال — بالے کی مچھلی ڈرتی ہے زلفوں کے جال سے

کھلتی ہے مرے شوخ پہ ہر رنگ کی پوشاک — اودی، اگری، چنپئی، گلنار، بسنتی

افشاں روپہلی یار نے بالوں پہ ہے چنی — چھٹکی ہے چاندنی شب زلف سیاہ میں

دم رفتار الجھتے زلف میں موتی کے جھالے ہیں — تمہارے گیسوؤں کے سانپ اب تو کوڑیالے ہیں

لیکن ان نمونوں کے باوجود امانت کا دامن خارجی مضامین کے سلسلے میں اس قدر آلودہ نہیں جتنا لکھنؤ کے بعض اور سرآمد شعرا کا مثلاً

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا — چنپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا (ناسخ)

کسی کے محرم آب رواں کی یاد آئی — حباب کے جو کنارے کبھی حباب آیا (آتش)

کہاں یہ بال بیڑ دیر سمجھ چوٹی کی پرچھائیں — کہ ہے پشت شکم آئینہ شفاف کا جوڑا (انشا)

بام پر ننگے نہ آؤ تم شب مہتاب میں — چاندنی پڑ جائے گی میلا بدن ہو جائیگا (ناسخ)

حسرت اسکے ساتھ سونے کی ہے کیا طاقت گداز — ان دنوں میں شل تصویر یہ لاغر ہو گیا (")

پہنے کرتی اگر وہ جالی کی — کرے ہر حلقہ کو ستارا بیٹ (")

وصل کی شب دے کے دم عریاں کرینگے اسکو زند ایک دن وا عقدۂ ناف و کمر ہو جائے گا

دانہ ہے اس پری کے شکم پر جو خال ہے عالم ہاں اس کی جالی کی کرتی پہ جال کا

معاملہ بندی:۔ معاملہ بندی یا وقوعہ نگاری لکھنؤ سے مخصوص نہیں اس کی ابتدا اور انتہا فارسی میں بہت پہلے ہو چکی تھی۔ دہلی کے شعرائے متقدمین کے یہاں کمتر اور شعرائے متاخرین کے ہاں اکثر وقوعہ نگاری کے اشعار موجود ہیں لکھنؤ میں اس فن کے امام میاں جرأت تھے جن کے انداز بیان نے معاملہ بندی کے اشعار کو اور بھی مبتذل بنا دیا ہے چند مثالیں اس کے اندازے کے لئے کافی ہیں:۔

کل واقف راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

انشا فرماتے ہیں:۔

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت

ناسخ کا ایک شعر ہے:۔

رات کو چوری چھپے بھو نچا جو میں غل مچایا اس نے دوڑ و چور رہے

تجر نے لکھا ہے:۔

دوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

خلیل کا ایک شعر ہے:۔

منہ گال پہ رکھنے سے خفا ہوتے ہو ناحق مس کرنے سے قرآں کی فضیلت نہیں جاتی

یہ مثالیں اس حرافات کی پوری کیفیت پیش کرنے سے قاصر ہیں جو معاملہ بندی کے پردے میں لکھنوی شعرا کی یادگار ہے۔ اس حمام میں آکر سب کے سب برہنہ ہو گئے۔ بلکہ ان میں سے بعض اس حد سے بھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ اس منزل کی مثالیں بھی ذوق پر بار گزریں گی۔ اس صنف میں امانت کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے بھاگا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا

اسی سلسلہ کی چند کڑیاں اور دیکھیے۔

وہ رشک آفتاب اگر جو لیٹا اپنے پہلو میں — شعاع مہر کا عالم ہوا ہر تار بستر پر

عاشق کے کام آتی ہے اکثر یہ وصل میں — غیروں کے منہ میں دے کے نہ کیجئے زباں خراب

ہو کر برہنہ غسل کریں آپ گھاٹ پر — دریا میں ہوگی محرم آب رواں خراب

اکیلے گھر میں جو میں اس سے دوڑ کر لپٹا — کہا کہ ہٹ در و دیوار و بام دیکھتے ہیں

شرم آتی ہو اگر تم کو نہاتے میرے ساتھ — چھوڑ لوں آنکھوں پہ میں مژگاں کی چلمن آب میں

تلخ بادام کا مرے منہ میں آتا ہے مزہ — چشم کا بوسہ جو وہ ہو کے خفا دیتا ہے

معاملہ بندی کی داد امانت نے اپنے واسوخت میں دل کھول کر دی ہے پوری واسوخت معاملہ بندی کے مضامین سے بھری ہوئی ہے لیکن اس عہد میں بہت مقبول تھا۔ ایسی صورت میں امانت کا یہ عیب جو صرف ماحول کا ترجمان تھا معاصرین سے مقدار میں کم اور رنگ میں ہلکا ہے کچھ زیادہ قابل گرفت نہیں رہتا۔

ابتذال:۔ اردو شاعری کے کسی دور میں بھی مبتذل خیالات اور مبتذل بیان کی ایسی مثالیں نہیں ملینگی جیسی لکھنؤ کے شعرائے متقدمین کے کلام میں موجود ہیں بعض خاص اصناف مثلاً ہزل گوئی اور ریختی تو ان خیالات کے لیے مخصوص تھیں غزل میں بھی بالعموم ان مضامین کو شامل کر لیا گیا تھا۔ جو گندگی اس عہد کی معاشرت میں راہ پا گئی تھی وہی اس دور کے کلام میں جھلکتی ہے۔ اس میں ہر شاعر شریک ہے۔ البتہ بعض کے یہاں یہ رنگ بہت گہرا اور بعض کے یہاں نسبتاً ہلکا ہے۔ امانت کے یہاں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

شب وصال ہے دل کھول کر گلے لپٹو — کہاں کی شرم کہاں کا حجاب نکلا ہے

خون اس کے مہاسے سے جو عارض پہ ہو نکلا — یاقوت کی چنی مہ کامل پہ جڑی ہے

ہاتھ آگئے میرے شب کو جو وہ اک بات نہ میں نے انکی سنی — کیا کیا تڑپے کیا کیا مچلے منت سے چھٹے قسم سے چھٹے

کیا انگیا کو چست اس نے تو شب کو ہو گئے روشن — کٹوری کے کنول میں شمع انگشت حنائی کے

(باقی آئندہ)

محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم اے (علیگ)

نقل

صبح کا وقت تھا۔ آفتاب کا لال لال چہرہ دیکھ کر بتیوں، پھولوں کے منہ پر دھواں سا اڑنے لگا تھا سبزے کا نم آنچل سوکھ چلا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بھی گرما گئی تھی۔ چڑیاں چہچہانا اور لڑنا چھوڑ کر چارہ چگنے کی فکر میں لگ گئی تھیں ملوں کی سیٹیاں ہو چکی تھیں۔ مزدوروں کا ریوڑ سڑک سے گاتا، گنگناتا، لپکتا، ہانپتا، کھانستا، گالیاں بکتا جا چکا تھا۔ مہتر مہترانیاں سڑکوں پر جھاڑو دے کر کوڑوں کا انبار جگہ جگہ لگا چکے تھے۔ گنگا گھاٹ پر تڑکے اشنان کیلئے جانے والے اپنے کو پاک وصاف کر کے پلٹ رہے تھے جھنڈ کے جھنڈ، غول کے غول۔ ٹیکا لگائے مالا جپتے بھجن گاتے۔ کوئی بھگوان کے دھیان میں۔ کوئی جل پری کی یاد میں، کوئی دو دبیاج کی فکر میں، کوئی اپنی ٹھکرانی کے پیچھے حفاظت کرتا ہوا، آدمی آنچہ تاہر نوجوان عورت کو گھورتا ہوا۔ یکے تانگے بھی اکا دکا چلنے لگے تھے۔ یکہ بانوں کی ٹخ ٹخ، موٹر لاریوں کی پوں پوں، سنائی دینے لگی تھی۔ اور بسوں اور لاریوں کے انجن گرمائے جانے لگے تھے۔ گویا رات کے سکوت کی چادر کو دن کا شور آہستہ آہستہ چاک کرتا جا رہا تھا مگر سکوت میں جو جمود ہوتا ہے وہ اب تک باقی تھا۔ شہر کی ہر شے گویا ابھی تک خواب آلود انگڑائی میں تھی۔

سدھوا بھنگی رات رہے سے جھاڑو دینے نکلا تھا۔ وہ اپنی ایک دردالی کوٹھری میں بیٹھکر ایک چلم نریل پی چکا تھا۔ اب کوڑا گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا اس کی بھنگن بھی میونسپلٹی کی ملازم تھی وہ میاں سے پہلے ہی تھوڑا سا کام کر کے چھوٹے بچوں کا خیال کر کے اپنی کالی کوٹھری میں واپس آگئی تھی۔ چار برس کا ڈلوا اب کا رات کی باوجی کی دی ہوئی دال اور بھاجی سوکھی روٹیوں کے ساتھ اڑا چکا تھا ڈیڑھ برس کی بسنتی البتہ اب تک۔ ماں کی چھاتی پکڑ کیڑے کی طرح لپٹی تھی۔ ادھر اس کا چار انگل کا پیٹ کسی طرح نہ بھر چکتا ادھر بھنگن کو کوڑا گھر جانے کی جلدی درا: وہ دا چھڑایا اور، وہ لگی ٹیں ٹیں کر کے چیخنے۔

سدھوا نے کہا۔ یہ چھوکری جان کا روگ۔ ہے، ایک نہ ایک دن تم کو بکلوا کے چھوڑے گی۔

میلیا بولی کیا کروں، آج اس نگوڑی کا کسی طرح پیٹ ہی نہیں بھر چکتا۔

"پیٹ کیسے بھرے دودھ بھی تو ہوتا!"

"دودھ کیا خاک ہوگا جب پیٹ بھر کھانے ہی کو نہیں ملتا"

"تو اسے روٹی و وٹی چٹانا شروع کر دو"

"اس وقت تو وہ بھی نہیں، یہ ڈلوا پاجی سب چٹ کر گیا"

"تو تم جانو اپنا کام میں تو چلا نہیں تو وہ سالا جمیدار کھا ہی جائے گا"

وہ اپنی کوٹھری سے نکلا۔ سامنے لوہے کا ٹھیلا میلا ڈھونے والا کھڑا تھا۔ وہ ادھر بڑھا۔ ننگا ڈلوا ایک پھٹی قمیص پہنے دوڑا۔

"دادا ہم بھی تلیں گے، دادا ہم بھی تلیں گے!"

سدھوا نے ڈانٹا۔ "ارے تو کہاں جائے گا پاجی! تیری ماں کو بھی جانا ہے، تو بہن کو تاکنا، ہم دونوں ابھی پلٹ کر آتے ہیں"

بچہ مچلا، "نہیں ہم تلیں گے" بھنگن بھی باپ بیٹے کی جنگ دیکھنے دروازے پر آکر کھڑی ہو گئی۔

اتنے میں سامنے سے ایک جوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک ہندوستانی صاحب اور ان کی میم۔ صورت شکل میں کچھ ان غریبوں سے اچھے نہ تھے۔ ہاں مگر کپڑے ستھرے تھے۔ صاحب صبح کے گرم سوٹ میں منھ میں پائپ دبائے تھا۔ میم ریشمی ساڑی پر ایک لال بیر بہوٹی کے رنگ کی سوئٹر کوٹ ڈالے تھی۔ ان کا ننھا بچہ ایک پریمبولیٹر میں تھا۔ دونوں اسے ٹہلتے چلے آرہے تھے۔ انھوں نے پاس آکر بھنگی، بھنگن اور ان کے بچوں پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ گویا نظر بھر کر دیکھنے میں آنکھوں کے گندہ ہو جانے کا ڈر تھا۔ میم صاحبہ نے کہا۔ "اوہ، یہ لوگ کتنا میلا ہے۔" اور ایک ہلکی تحقیر آمیز ہنسی کے ساتھ ایک جھوٹے سے سفید رومال سے ناک چھپالی۔

ڈلوا نے تالی بجا کر کہا۔ "دادا ہم بھی گاڑی میں تلیں گے، ہم بھی گاڑی پہ تلیں گے۔"

سدھوا نے مسکرا کے میکیا کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک چمک پیدا ہوئی اور وہ کوٹھری کی کنڈی چڑھا کے آکر برابر کھڑی ہوگئی۔ سدھوا نے ڈلوا کو اٹھا کر میلے والے ٹھیلے میں بٹھا دیا۔ میکیا نے بسنتی کو

اس بچے کی گود میں دے دیا۔ پھر دونوں قدم سے قدم ملاتے ہوئے ٹھیلے کو ٹھیلتے بالکل صاحب لوگوں کی طرح کوڑا گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔

پاچی دُلوار استہ بھر اس طرح ٹخ ٹخ کرکے یکوں تانگوں کی اور پوں پوں کرکے موٹر لاریوں کی نقل کرتا کہ دونوں کی خوشی سے باچھیں کھل جاتی تھیں اور انھیں ایسا جان پڑتا جیسے وہ میلے کے ٹھیلے کو نہیں لئے جا رہے ہیں۔ بلکہ پنڈتوں پر وہتوں کا بنایا ہوا، پھولوں سے لدا آسمانی رتھ ہنکا رہے ہیں۔

(علی عباس صاحب حسینی)

غزل

تلاش مرگ میں کب تک فراق جاں کھپائیں
جو ہو سکے تو اسی زندگی کو موت بنائیں

غم فراق میں اس کی جفائیں کیوں یاد آئیں
ہمیں بھی چاہیے اسوقت جی میں کچھ شرمائیں

یہ بوجھ لے کے اگر گر پڑیں تو بیڑا پار
اُٹھے نہ بار محبت تو کھیت ہی ہو جائیں

غرض کہ ہوش میں آنا پڑا محبت کو
ہمیں کو دیکھ لیں دیوانے تیرے دور نہ جائیں

وصال و ہجر کا ایسوں کے بھی ٹھکانا کیا
کہ جا کے بھی جو نہ جائیں اور آکے بھی جو نہ آئیں

مغائرت کو چھپانا ہے دلدہی کیلئے
کہاں تک اس نگہ لطف کے بھی دھوکے کھائیں

یہ کیا کہا کہ نہ ہو عشق پھر بھی ملتے رہیں
اب ایسی باتوں میں کیا ہے کہو تو منھ نہ دکھائیں

بہار میں نہ کھِلے دل خزاں ہے دور ابھی
نہ کھل سکا کہ یہ غنچے ابھی سے کیوں مرجھائیں

زمانہ بدلا ہے اک آدھ کروٹوں سی کہیں
ابھی عناصر عالم کچھ اور پلٹے کھائیں

کچھ آدمی کو بھی مجبوریاں ہیں دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی تو کیا مرجائیں!

قیامتیں نہ اٹھانا بھی اک قیامت ہے
یہ کیا ضرور کہ مست خرام حشر اٹھائیں

جہاں میں ترک تعلق نہیں ہے ترک رسوم
وہ دیکھتے ہیں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چرائیں

یہ حال زار تو کچھ احترام حسن نہیں
تری قسم تجھے اس یاد سے تو بھول ہی جائیں

ازل سے رونق بزم جہاں ہیں قلب تپاں
یہ انجمن بھی ہوا ہو جو یہ کنول بجھ جائیں

یہ تیری انجمن ناز بزم غیر نہیں
ہمارا کام نہیں کچھ یہاں تو کیا اُٹھ جائیں؟

دلوں کو بیٹھے بٹھائے یہ آج کیا سوجھی
کہ بن کے مست گھٹا کائنات پر چھا جائیں

فروغِ انجمن دہر مہر و ماہ بھی ہیں
جو آگ دل میں دبی ہو اسی کو کیوں اکسائیں

کریں تو کس سے کریں راہِ عشق کا شکوہ
رکیں تو پاؤں نہ مانیں چلیں تو منہ کی کھائیں

لئے رہیں وہ زمانے میں اپنی بے فکری
جو غم شناس نہیں وہ خوشی کو منہ نہ چڑھائیں

"نگاہ[۱] اہلِ محبت تمام سوگند ست"
سکوتِ شوق کو بس دیکھ لے تو قسم کیا کھائیں

نثارِ جذبِ نہاں کیا یہ ہو نہیں سکتا
جنھیں نظر سے گرائیں وہی دلوں میں سمائیں

وہ بے نیازیاں موت و زندگی یکساں
دعا بجا مگر ایسے میں کس کی خیر منائیں

سمے کا پھیر کہیں یا سمے کی بلہاری
نگاہیں اپنی جگہ ہوں اور اس طرح پھر جائیں

ارے یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کیا کہہ جائے
نگاہِ شوق ہے بیباک اس کو منہ نہ لگائیں

معاملہ تو سلجھتا نظر نہیں آتا
بنائیں عشق سے باتیں کہ حسن کو سمجھائیں

سوالِ غم کا بھی نکلا سوالِ منزلِ غم
کہ حسرتیں تو وہی ہیں جو خاک میں مل جائیں

خرامِ حسن کی کچھ آہٹیں تو ملتی ہیں
وہ آ رہے گا کسی روز ادھر بھی کیوں گھبرائیں

جو با فراغ ہیں کچھ پائیں زندگی کا مزہ
رکے نہ سانس گراں کے دم بھی گھٹتے جائیں

فضائے یاس بھی پہچانتی ہے یہ آواز
دلِ خراب کو یہ کون دے رہا ہے صدائیں

فراقؔ بعد کو ممکن ہے یہ بھی ہو نہ سکے
ابھی تو رو بھی لے کچھ ہنس بھی لے وہ آئیں نہ آئیں

ہوائے سرد چلی داستانِ غم ہوئی ختم
فراقؔ رہ گئی ہے تھوڑی رات اب سو جائیں

(فراقؔ گورکھپوری)

۱؎ یہ مصرعہ حضرت امیر خسروؒ کا ہے۔

مسلمان اور تجارت

مسلمانوں کے تنزل کے اسباب وعلل پر اس قدر سیر حاصل بحث ہو چکی ہے اور مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے ان کا اس قدر تفصیلی تجزیہ کیا جا چکا ہے کہ بلا مبالغہ ایک انسائیکلو پیڈیا بن سکتی ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ "اسباب زوال ملت" کی اس لمبی فہرست میں بھی "فقدان تجارت" کی مد کہیں نظر نہیں آتی۔ تجارت سے نفرت مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے زوال کی ایک معقول وجہ کو کم از کم تسلیم ہی کر لیں۔

تجارت سے اتنی بے رخی ممکن ہے کسی زمانہ میں ان کو زیب دیتی ہو مگر موجودہ سرمایہ دارانہ دور میں اس کو کسی صورت سے بھی جائز نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ مسلمان دیکھ چکے ہیں کہ مغربی تعلیم کے متعلق ان کی ابتدائی نفرت اور بے رخی نے ان کو ہندؤوں کے مقابلہ میں پچاس برس پیچھے کر دیا اور باوجود سخت کوشش کے بھی ابھی تک وہ اس کمی کو پورا نہیں کر سکے ہیں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ زندگی کے اس دوسرے اہم شعبے میں بھی وہ اسی طرح پیچھے رہیں؛ تجارتی لحاظ سے اب بھی وہ برادران وطن سے بہت پیچھے ہیں۔ اور اگر غفلت اور لاپرواہی کی یہی رفتار رہی تو تھوڑے ہی عرصے میں ان کی پوزیشن صفر کے برابر ہو جائے گی۔

معاشی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تجارت ہمیشہ سے انسان کا ایک اہم وسیلہ معاش رہا ہے اور آبادی کے ایک معتد بہ حصہ نے اسی ذریعہ سے روزی کمائی ہے۔ روزی کے علاوہ جو دوسرے فوائد تجارت کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اسی وجہ سے ترقی یافتہ قوموں نے ہمیشہ تجارت کو دوسرے وسائل معاش پر ترجیح دی ہے اور اس سلسلہ میں حوصلہ مند لوگوں نے دور دراز کے سفر بھی کئے ہیں۔ عرب تجارت ہی کی وجہ سے جزائر شرق الہند اور چین تک پہونچ گئے تھے۔ یورپی اقوام بھی آج اسی وجہ سے تمام دنیا پر چھائی ہوئی ہیں۔

مشینوں کی ایجاد اور پیداوار پیمانہ کبیر نے تجارت اور صنعت وحرفت کی اہمیت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ اب دولت آفرینی مکمل طور پر تجارتی اور صنعتی آدمیوں کے قبضہ میں چلی گئی ہے۔ اور دوسرے لوگ ان کے

دست نگر ہو گئے ہیں۔ صنعت و تجارت کی اہمیت کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ اب وہ سیاست پر بھی حاوی ہو چکی ہے۔ حکومت کی تمام مشنری پر صنعتی اور تجارتی آدمیوں کا قبضہ ہے۔ ہر ملک کی سیاست کا محور اب یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ تجارتی و صنعتی فوائد حاصل کئے جائیں۔ خود غرض قومیں اس غرض کے لئے کمزور ممالک کو ہضم کرنے سے بھی نہیں چوکتیں۔ وہ کچے مال کے گودام اور تیار شدہ مال کی منڈیاں تلاش کرنے میں ہر جائز اور ناجائز ذریعہ استعمال کرتی ہیں پھر کمزور ممالک کی تقسیم ہی پر آپس میں جھگڑے اور لڑائیاں ہوتی ہیں۔ موجودہ جنگ بھی اسی وجہ سے برپا ہوئی ہے مگر لطف تو یہ ہے کہ جنگ بھی آج کل صنعت و تجارت کے زیر اثر ہے۔
موجودہ جنگ میں فوج سے زیادہ کارخانوں کی اور بہادری سے زیادہ صنعتی استعداد اور تنظیم کی ضرورت ہے۔ میدان جنگ میں لڑنے والی فوج کے کام سے زیادہ اہم کام سامان جنگ تیار کرنے والے کارخانوں کا ہے۔ در اصل جنگ کارخانوں میں لڑی جاتی ہے اور جو فریق اپنی صنعتی اور تجارتی استعداد کا زیادہ ثبوت دیگا وہی کامیاب ہوگا۔ غرض سیاست اور ملکی دفاع جیسے اہم قومی شعبوں پر بھی تجارت اور صنعت کا قبضہ ہے

تجارت اور صنعت کی اس اہمیت کے جتلانے کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کو یہ بتلایا جائے کہ اقتصادی، سیاسی اور دفاعی ترقی کے واسطے تجارت اور صنعت کی ترقی کس قدر ضروری ہے۔ یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ انگریز اپنی عظیم الشان تجارت اور صنعت کو برقرار رکھنے کے واسطے ہندوستان کو سیاسی طور پر غلام بنائے ہوئے ہے۔ اس لئے تمام حریت پسند اور آزادی خواہ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ استعمار اور شہنشاہیت کی اس جڑ پر ضرب کاری لگائیں۔ شاخیں خود بخود گر پڑیں گی۔ اگر پیداوار دولت کے ان وسائل پر جنہیں برطانیہ ناجائز طور پر اپنے قبضہ میں کئے ہوئے ہے۔ ہندوستان قابض ہو جائے اور اپنی تجارت و صنعت کے تمام ذریعے اس کے ہاتھ میں آجائیں تو سیاسی غلامی کا بڑی آسانی سے خاتمہ ہو سکتا ہے ہندوؤں نے اس گر کو سمجھ لیا ہے اور پچھلی جنگ عظیم سے وہ برابر استقلال کے ساتھ اپنی تجارتی اور صنعتی تنظیم کر رہے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں سلسلہ آمد و رفت (در آمد و بر آمد) ایک حد تک بند ہو گیا تھا۔ اس موقعہ سے انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ نئی نئی صنعتیں قائم کیں۔ کپڑا، فولاد، سیمنٹ اور سن وغیرہ کے کارخانے قائم کئے پھر بعد میں باقاعدہ اور مسلسل ایجیٹیشن کے ذریعے نہ صرف ان صنعتوں کو برقرار رکھا بلکہ اور

ترقی دی۔ حکومت کی مالی پالیسی میں ترمیم کرائی اور اس سے بھی پورا پورا فائدہ حاصل کیا۔ صنعت شکر سازی پر پورا قبضہ کرلیا۔ موجودہ جنگ نے صنعتی ترقی کا ایک اور موقعہ بہم پہونچایا ہے اور برادران وطن اس سے بھی کما حقہٗ فائدہ حاصل کر رہے ہیں اور عجب نہیں کہ جنگ کے خاتمہ تک وہ ہندوستان کی صنعت و تجارت اور وسائل دولت پر مکمل طریقے سے قابض ہو جائیں۔

دل میں خود بخود یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس عظیم الشان صنعتی ترقی میں جو اس وقت ہندوستان میں ہو رہی ہے مسلمانوں کا کتنا حصہ ہے؟ جواب میں یقیناً مایوسی ہوتی ہے۔ سیاسی طور پر پچاس فیصدی حق مانگنے والی قوم صنعتی میدان میں پانچ فیصدی حصے پر بھی قابض نہیں ہے۔ درانحالیکہ صنعت و تجارت کی اہمیت سیاست سے بہت زیادہ ہے۔

اگر ہندوستان میں مسلمانوں کو ایک آزاد قوم کی حیثیت سے رہنا ہے تو انھیں اس اہم شعبۂ زندگی کی طرف ضرور توجہ دینی ہوگی دولت آفرینی کے ان وسائل میں جو اس وقت انگریز سے ہندو کی طرف منتقل ہو رہے ہیں۔ انھیں بھی اپنے واجبی حصہ پر قابض ہونا چاہئے ورنہ جس طرح آج وہ انگریز کے غلام ہیں کل ہندو کے غلام ہو جائیں گے۔ سیاسی تحفظات کی کوئی اسکیم انھیں اقتصادی غلامی سے نہیں بچا سکے گی۔ اقتصادی غلامی سے بچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ وسائل دولت میں برابر کا شریک ہوا جائے جاگیرداری اور تعلقہ داری کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اب وسائل دولت سمٹ کر تجارت اور صنعت میں آگئے ہیں مسلمانوں کو بھی اس میں پورا پورا حصہ لینا چاہئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ پیداوار دولت ان کے قبضہ میں آجائے گی اور وہ اقتصادی طور پر کسی کے پابند نہیں ہوں گے بلکہ سیاست اور ملکی دفاع میں بھی ان کی پوزیشن مضبوط ہو جائیگی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی تمامتر کوشش صرف نشستوں کی تعین اور سرکاری ملازمتوں کے تناسب پر لگی ہوئی ہے اور صنعتی اور تجارتی ترقی کے واسطے کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی جا رہی ہے ضرورت ہے کہ اس طرف بھی کما حقہٗ توجہ صرف کی جائے۔ تاکہ صنعتی ترقی کی اس دوڑ میں مسلمان اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ ساتھ چل سکیں۔ ورنہ بعد میں وہ بہت پیچھے رہ جائیں گے اور پھر کسی طریقے سے بھی برابر نہیں ہو سکیں گے ترقی کی کوئی اسکیم اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ تنزل کے اسباب دریافت نہ کرئے

جائیں اور پھر ان کا علاج نہ تشخیص کر لیا جائے۔ صنعتی اور تجارتی ترقی سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ مسلمانوں نے اب تک اس میدان میں کیوں ترقی نہ کی تاکہ ان خرابیوں کو جو اس وقت تک اس ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں دور کیا جا سکے۔

صنعتی اور تجارتی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ا مانوں کی تجارت سے طبعی بے رغبی اور نفرت ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس کا تاریخی پس منظر پیش کرنا ازحد ضروری ہے

مسلمان اس ملک میں حکمران کی حیثیت سے آئے۔ حاکمانہ اقتدار کی وجہ سے انھوں نے فوجی اور سرکاری ملازمتوں ہی کو اپنا پیشہ بنایا۔ فوجی خدمت کے صلے میں بڑی بڑی جاگیریں اور زمینداریاں حاصل کیں اور اس طرح معاش کی طرف سے بالکل بے فکر ہو گئے صدیوں تک تجارت سے بے تعلقی نے ان کا مزاج بھی غیر تجارتی بنا دیا اور وہ تجارت سے نفرت تک کرنے لگے۔ حکومت چھن جانے کے باوجود ان کا غیر تجارتی مزاج بدستور قائم ہے اور وہ معمولی سی معمولی سرکاری ملازمت کو تجارت اور صنعت وحرفت پر ترجیح دیتے ہیں لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جمہوری طرز حکومت میں حاکمانہ اقتدار سرکاری اور فوجی ملازمتوں میں نہیں بلکہ تجارت اور صنعت وحرفت میں ہے۔ خود انگریزوں نے یہ اقتدار تجارت ہی کی بدولت حاصل کیا ہے اس لئے اگر مسلمان بھی اقتدار اور اختیار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لینی چاہتے ہیں تو انھیں بجائے نوکر بننے کے آقا بننے کی کوشش کرنی چاہئے۔

موجودہ تعلیم نے بھی ان کے اس غلط خیال کی اصلاح نہ کی بلکہ ان کے غیر تجارتی مزاج کو اور بھی مستحکم کر دیا نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر پڑھا لکھا مسلمان سرکاری ملازمت کے لئے سرگرداں ہے۔ اور تیس تیس روپے کی نوکری کے واسطے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے لیکن اس اصلی کیمیا کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا۔ دیگر برادران وطن نے تعلیم کے اس نقص کو بھی بہت جلد محسوس کر لیا اور اپنے نوجوانوں کو تجارتی تعلیم دلانی شروع کی۔ تاکہ وہ تجارت وصنعت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں اور پھر اسی طرز پر اپنے کاروبار شروع کریں۔ تجارتی تعلیم ہی نے ان کو تجارتی تنظیم بھی سکھا دی ہے اور انھوں نے بڑے بڑے ایوانہائے تجارت بنا کر اپنے مفید مطلب مراعات حاصل کی ہیں۔ مسلمانوں میں نہ تجارتی تعلیم ہی کا کوئی

خاطرخواہ انتظام ہے اور نہ تجارتی تنظیم ہی ہے۔

تجارتی پسماندگی کی ایک اور وجہ مسلمانوں کا افلاس ہے۔ تجارت روپے سے چلتی ہے اور مسلمانوں کے پاس اسی چیز کی کمی ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں کو تجارتی ترقی کرنی ہے تو اس کمی کو دور کرنے کی بھی کوئی نہ کوئی تدبیر سوچنی پڑے گی۔ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے افلاس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی آمدنی اور خرچ میں صحیح توازن نہیں رکھتے اور ہمیشہ خالی ہاتھ یا قرض دار رہتے ہیں پس اندازی کی عادت ان میں سرے سے نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی تجارت کو کامیاب طریقے سے نہیں چلا سکتے۔ خرچ کے زیادہ ہونے کی بڑی بڑی وجوہات ان کی لاپرواہی فضول خرچی اور فضول رسم و رواج ہیں ضرورت ہے کہ کسی باقاعدہ کوشش کے ذریعہ مسلمانوں سے اسی بری عادت کو چھڑایا جائے۔ ان کو پس اندازی کی عادت ڈلوائی جائے۔ ان رسم و رواج میں ترمیم کی جائے۔ جن پر ان کا روپیہ بالکل بیکار خرچ ہوتا ہے۔ اس طرح ان کے پاس کچھ نہ کچھ روپیہ بچ سکتا ہے جس سے وہ اپنی تجارت خواہ چھوٹے پیمانہ پر ہی کیوں نہ ہو شروع کر سکتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ تجارتی لحاظ سے مسلمانوں کو اگر اپنا واجبی حصہ لینا ہے تو انھیں مندرجہ ذیل تدابیر اختیار کرنی پڑیں گی۔

۱۔ غیر تجارتی مزاج کو بدل کر تجارتی مزاج پیدا کیا جائے، تجارت کی اہمیت جتلا کر اس سے رغبت دلائی جائے اور ایک اہم شعبہ زندگی کی طرف سے جو نفرت اور بے رخی ہے وہ دور کی جائے۔ اس مقصد کے واسطے پند و نصائح کافی نہ ہوں گے۔ بلکہ عملی مثالیں دینی ہوں گی تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی شوق پیدا ہو۔

۲۔ تجارتی تعلیم کا تسلی بخش انتظام کیا جائے۔ تجارتی کالج کھولے جائیں وظیفوں اور دوسرے ذرائع سے غریب طلبا کی امداد اور ہمت افزائی کی جائے۔ تاکہ مسلمان نوجوان تجارت وصنعت کے جدید ترین طریقوں سے واقف ہو جائیں اور پھر قوم ان کی قابلیت سے فائدہ اٹھا سکے۔

۳۔ اردو میں تجارتی اور صنعتی مضامین کو منتقل کیا جائے تاکہ وہ تجارتی لوگ بھی جو انگریزی نہیں جانتے

ملک کی ضروریات و وسائل اور دوسری تجارتی معلومات سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۴۔ تجارتی تنظیم کی جائے مسلمانوں کے ایوانہائے تجارت قائم کئے جائیں مختلف کمیٹیوں اسمبلیوں اور کونسلوں میں اپنے نمائندے بھیجے جائیں تاکہ وہ مسلمانوں کے حقوق کو فائدہ پہونچا سکیں۔

۵۔ مسلمانوں کے افلاس دور کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ وہ تجارت میں حصہ لے سکیں ان میں پس اندازی کی عادت ڈلوائی جائے۔ فضول رسم و رواج میں ترمیم کی جائے وغیرہ وغیرہ

ان تدابیر پر عمل کرنے کے لئے باقاعدہ اور مسلسل کوشش کی ضرورت ہے صرف وقتی اور ہنگامی جوش کافی نہیں کاش جتنی توجہ ملازمتوں کے تناسب پر صرف کی جا رہی ہے اگر اتنی توجہ تجارتی ترقی پر بھی صرف دی جائے تو مسلمانوں کا مستقبل شاندار ہو سکتا ہے۔

اس تمام تگ و دو میں ہمیں ایک بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے وہ یہ کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور ایک علیحدہ نظام زندگی اور ضابطہ حیات رکھتے ہیں۔ ہمارا ایک نظام معیشت بھی ہے جو ہمارے عقیدے کے مطابق بہترین نظام ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہماری تمام تجارتی و صنعتی ترقی اس اسلامی نظام معیشت کے ماتحت ہو۔ امیر، غریب اور سرمایہ و محنت کے درمیان جو ناقابل عبور خلیج یورپ کے معاشی نظام نے پیدا کر دی ہے اس سے ہمیں بچنا چاہیئے ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم میں طبقہ وارانہ احساس پیدا نہ ہو۔ ہمارے امیروں میں سرمایہ دارانہ اور غریبوں میں شکست خوردہ ذہنیت پیدا نہ ہو۔ ہماری تمام تجارتی ترقی کا مقصد یہی ہو کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو۔ نہ یہ کہ دولت اور وسائل دولت صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں سمٹ کر آ جائے۔ ہمیں اس عمل اور رد عمل سے بچنا چاہیئے۔ جس نے پہلے سرمایہ دارانہ نظام اور پھر اشتراکیت کی صورت اختیار کر لی ہے ہمارا راستہ دونوں کے بین بین ہے۔

محمد منصور صاحب بی کام (فائنل)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سُریلے بول :- مجموعہ کلام عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم ۲۲۸ صفحے قیمت ہا/ کتابت و طباعت و دیدہ زیب

ملنے کا پتہ :- محمد رشید اللہ خاں برکت بنگلہ ٹھگی جیل قدیم حیدرآباد دکن

شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ جو بازار میں مانگ دیکھکر دوکان سجاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو گاہکوں کے بیخبر ہونے کی پرواہ نہیں کرتے اپنے مال کی نایابی پر نگاہ رکھتے ہیں پہلے قسم کے شاعروں کو زیادہ محنت نہیں اٹھانی پڑتی وہ جانے پہچانے خیالات کو جانے پہچانے انداز میں نظم کر دیتے ہیں ان کے لئے خیالات کے پیکر۔ الفاظ کے سانچے سب ڈھلے ڈھلائے ہوتے ہیں۔ انھیں میں ادل بدل کر کے وہ داد حاصل کر لیتے ہیں۔ دوسرے قسم کے شاعر اس داد سے اکثر محروم رہتے ہیں ان کا ایک قدم اپنے زمانے میں اور ایک آنے والے زمانے میں ہوتا ہے۔ اس لئے وہ بنے بنائے سانچوں کے بجائے خود بنانا بگاڑنا چاہتے ہیں۔ نئے بت بنانے والے کو پرانے بت توڑنے بھی پڑتے ہیں۔ مگر کتنے ہی لوگ یہ کبھی سمجھ نہیں سکتے کہ پرانے بتوں کو توڑنے کی ضرورت پیش ہی کیوں آتی ہے آخر اپنے پرانے گھسے پسے جانے بوجھے خیالات میں کونسی خرابی ہے کہ نئی چیز کی طرف توجہ کی جائے جب راستہ صاف اور کشادہ معلوم ہوتا ہے تو اِدھر اُدھر دیکھنے سے کیا فائدہ۔

مگر جب لوگ اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور شاہراہ عام سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں تو انھیں اس کی سزا بھی ملتی ہے۔ نظیر نے عجمی خیالات اور عجمی اصناف کو چھوڑ کر مقامی رنگ اور دیسی موضوعات کی طرف توجہ کی۔ غالب نے پرانے خیالات کو نئی بندشوں میں پیش کرنے کے بجائے زبان اور خیال کی نئی دنیا بسائی۔ حالی نے رنگینی بلند آہنگی، آرائش اور صنعت کے بجائے سادگی، سنجیدگی، ملائمیت اور پاکیزگی پر زور دیا۔ عظمت اللہ خاں نے قافیہ، ردیف، غزل اور عربی فارسی عروض کی پابندی سے آزاد ہونا چاہا۔ یہ سب باغی تھے اور اس بغاوت کی انھیں سزا بھی ملی۔ اپنے زمانے میں لوگ جانتے ہوئے بھی ان سے انجان رہے۔ ان کی آواز ہمیشہ سنی ان سنی

کردی۔ ان کے شاعر ہونے سے انکار کیا، کرونن (A.J. Cronin) کے ہیرو ڈاکٹر کے ساتھ جو سلوک اس کی برادری نے کیا تھا۔ ہمارے ان شاعروں کی برادری اس سے بھی زیادہ سختی سے پیش آتی رہی، جو اپنے وقت سے آگے دیکھتے ہیں ان کا یہی حشر ہوتا ہے۔

عظمت اللہ مرحوم بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے یہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن اپنی بیشتر عمر حیدرآباد میں گذاری۔ اُردو، فارسی، ہندی کے علاوہ انھیں انگریزی سے ذوق تھا۔ انھوں نے صرف انگریزی مصنفین کا مطالعہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ ان کے طرز سے متاثر بھی ہوئے تھے۔ اور ان کے چراغ سے چراغ روشن کرنے کی کوشش بھی کرتے رہتے تھے۔ انھوں نے نہ تو شاعری بیکاری کے مشغلہ کے طور پر شروع کی، نہ مشاعروں میں داد پانے کے خیال سے۔ وہ ہمارے تمام ادبی سرمایہ کو بہت بے بضاعت سمجھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں خود سوچنے کی قوت اور خود محسوس کرنے کی صلاحیت تھی۔ اس لئے وہ تمام طبائع سے علیحدہ نتائج پر پہونچتے تھے "سریلے بول" میں جو مضمون شاعری پر شامل ہے وہ بہت اہم ہے اور اس سے ان کے ادبی نقطہ نظر کی بہت کامیاب ترجمانی ہوتی ہے عظمت اللہ خاں ان شاعروں میں سے تو تھے نہیں جو یہ نہیں جانتے کہ شعر کیوں کہتے ہیں اور اگر جانتے ہیں تو بتا نہیں سکتے۔ ان کی شاعری محض ایک شیریں دیوانگی نہیں تھی وہ شاعری کا اپنا ایک نصب العین رکھتے تھے۔ انھوں نے شاعری کی جو تعریف کی ہے وہ بہت وسیع ہے اور اس میں اچھی نثر اچھی طنز، اچھا ڈراما سب کچھ آسکتے ہیں۔ مگر ان سب سے زیادہ یہ شاعری پر صادق آتی ہے "شاعری تخئیلی پیکروں کے پیدا کرنے کا نام ہے" اور یہ تخئیلی پیکر کسی تشبیہ کی مدد سے وجود میں آتے ہیں۔ اپنی اس تعریف کو واضح کرنے کے لئے انھوں نے میر حسن، نظیر، میر اور غالب کے اشعار سے مثالیں دی ہیں اور پھر اس کے ماتحت اردو شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔

انھیں اس سرمایہ میں "انمٹ ادب بہت کم ملتا ہے اور وہ ایک مفکر کی حیثیت سے اس کمی کے اسباب پر بھی غور کرتے ہیں۔ ایک عام نظام تعلیم کے نہ ہونے سے افراد کمزور اور سست ارادے کے ہوتے تھے اور طبیعت کی بے مرکزی انھیں کسی طرف پوری طرح جمنے نہ دیتی تھی عظمت اللہ خاں کا خیال ہے کہ اُردو کی نشو و نما کے زمانے میں دماغی، سیاسی اور معاشی پستی کی انتہا ہو چکی تھی۔ اس آب و ہوا اور ایسے

کمزور کیرکٹر کی آغوش میں اردو شاعری پلنے اور تربیت پانے لگی۔ بے کس و ناکس شاعری پر پل پڑا۔ اس لئے اور علوم کی کڑی جھیلنے کی نہ ہمت تھی نہ دماغ۔" درحقیقت یہ رائے ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اردو شاعری جمہور کی شاعری نہ تھی، صرف ایک ایسے طبقے کی شاعری تھی جو متوسط اور بالائی دنیا کے بین بین تھا۔ اس کا ایک سرا خانقاہ سے اور دوسرا دربار سے ملا ہوا تھا۔ خانقاہ نے اسے اتنا نقصان نہیں پہونچایا جتنا دربار نے۔ دربار کی فضا عیش و عشرت کی تھی یہاں وہی رنگ مقبول تھا جو فارغ البال نہ تھے وہ بھی جھونپڑے میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتے تھے۔ ان خوابوں میں اپنے آپ کو بھلانے کی خواہش ساری قدیم شاعری میں ملتی ہے۔

غزل کا انتخاب ہی ہمارے قدیم شعرا کی نفسیات پر روشنی ڈالتا ہے عظمت اللہ خاں لکھتے ہیں کہ "غزل ریزۂ خیالی اور پریشان گوئی کا ایک ویسا ہی ڈراؤنا خواب ہے جیسا ہمارے شعرا کے لئے ان کی سماجی زندگی بن گئی تھی" غزل کے خلاف یہ بغاوت نئی نہیں ہے۔ سب سے پہلے حالؔی نے اسے شروع کیا مگر حالؔی نفس غزل کے خلاف نہ تھے۔ شاعری کے معنی غزل کے معنی لینے کے خلاف تھے۔ حالؔی نے غزل کی تعریف بھی کی ہے۔ اس کے انتشار، عدم تسلسل اور بے ربطی کا جواز بھی بتایا ہے۔ عظمت اللہ خاں حالؔی سے بہت آگے ہیں وہ بے تکلف اور بے محابا غزل کی گردن مار دینا چاہتے ہیں لیکن اصلاح کے جوش میں انھوں نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ غزل بعض صورتوں میں فطری اور حقیقی بھی ہو سکتی ہے اور ہوئی ہے اور کبھی کبھی جذبات کے سیلاب میں غزل کی آسان، ہلکی پھلکی اور لطیف صنف بھی کام دے سکتی ہے۔ نیز جب قافیے اور ردیف کی پابندی اس قدر سخت نہ ہو تو اس کے فارم میں اتنا لوچ اور لچک موجود ہے کہ جذبات محبت کی حقیقی و حسن کارانہ مصوری ہو سکے۔ بات یہ ہے کہ غزل میں بے ربطی اور انتشار اس قدر عام رہے ہیں کہ اب غزل کے معنی ہی بے ربطی کے سمجھ لئے گئے ہیں۔ حالانکہ غزل سے بہت سے بلند پایہ شعرا نے مسلسل خیال کے مختلف پہلوؤں کے ادا کرنے کا کام لیا ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور دوسرے شعرا کے یہاں علاوہ قطعات کے بہت سی غزلوں میں ایک خیال کے مختلف پہلو ملتے ہیں۔ پھر اس میں صرف محبت (اور وہ بھی فرضی) نہیں ہر قسم کے مطالب کے اظہار کی صلاحیت موجود ہے۔

عظمت اللہ خاں کا سب سے بڑا اعتراض اُردو کے شعرا پر یہ ہے کہ وہ "کائناتی مطالعہ" سے کورے

ہیں اور دراصل یہی ہماری شاعری کے تقلیدی اور مصنوعی ہونے کی وجہ ہے۔ تخیل کے زندہ اور نئے پیکر دیکھنے بھالنے اور برتنے سے ہاتھ آتے ہیں لیکن چونکہ ہمارے یہاں ذاتی تجربے ضروری نہیں بلکہ ہر تجربے کا عنوان مقرر ہے اس لئے اس میں تقلیدی رنگ کو اور ترقی ہوتی ہے عظمت اللہ خاں اس سلسلے میں انگریزی شاعری کی مثالوں کو اپنے سامنے رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ شاعری اس طرز پر کی جائے اور اس کے لئے عروض بھی نئی بنائی جائے۔

ان کے مضمون کا تیسرا حصہ ایک نئے عروض کی طرف توجہ دلاتا ہے وہ اردو کو عربی اور فارسی عروض کے پنجے سے رہائی دلانا چاہتے ہیں کیونکہ ان میں موسیقی اور ترنم کے نت نئے امکانات کا بالکل لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ اُردو عروض کی بنیاد ہندی پنگل پر رکھنا چاہتے ہیں مگر ہندی عروض کو بجنسہ لینا انھیں پسند نہیں وہ اسے سائنٹیفک بنانا چاہتے ہیں۔ وہ عربی بحروں کو سرے سے ترک کرنے کی تلقین نہیں کرتے بلکہ ان میں سے مناسب اور موزوں بحروں کو اردو میں رہنے دینا چاہتے ہیں تیسرے وہ چاہتے ہیں کہ انگریزی عروض کے ایسے اصول جو آزادی کی جان ہیں اور اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ہر زبان کے لئے کام دے سکیں ان پر اس نئی عروض کی آزادی کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔

عظمت اللہ خاں اس رمز سے واقف ہیں کہ نثر اور نظم میں فرق جنس کا نہیں، آہنگ یا انگریزی کے مشہور نقاد واٹس ڈنٹن مرے کے الفاظ میں (TEMPO) کا ہے۔ وہ عروض کا ماترک طریقہ رائج کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعہ ترنم کی تمام وسعتیں شاعر کے احاطہ میں آسکتی ہیں۔ وہ قافیہ کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر مصرعے یا شعر کے ساتھ اس کا نباہنا ضروری نہیں سمجھتے۔ وہ بے قافیہ نظم کے بھی مؤید ہیں۔ مگر ان پر اعتراض کرنے والے شاید ان کے اس قول کو بھول جاتے ہیں کہ "سوائے ڈرامے کے اور صورتوں میں بے قافیہ نظم مستحسن نہیں"۔ وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اردو میں غنائی (Lyric) شاعری کی کمی ہے۔ یوں تو غزل خود اس قبیل کی چیز ہے مگر روایات نے اُس سے ذاتی جذبہ چھین کر اسے وہ رسوائے عالم کر دیا۔ ان کی ساری شاعری اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش ہے۔

عظمت اللہ خاں کی نثر میں بھی ان کی نظم کی طرح انگریزی کا اثر بہت نمایاں ہے ان کے الفاظ

ان کے اپنے ہیں۔ یہ ان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں ایک نئی تازگی اور گرمی ہے مگر یہ تازگی اور گرمی ابھی مصنف کا مزاج نہیں بن پائی۔ اگر مرحوم کو زیادہ عمر ملی جاتی تو ان کے طرز میں جو اکھڑی اکھڑی کیفیت ہے۔ جو بھونڈا پن ہے جو اسلوب کی ناہمواری ہے وہ دور ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزی میں سوچنے لگتے ہیں اور پھر ان کی اردو ترکیبیں انگریزی الفاظ کا ترجمہ یا انگریزی ترکیبوں کا چربہ معلوم ہوتی ہیں یہ چیز ان کی نظموں میں بھی ہے مگر وہاں بدنما حد تک نہیں۔ نثر میں بدنما ہو جاتی ہے اس مضمون میں اس قسم کے الفاظ اور فقرے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہ غلط نہیں بھونڈے ہیں۔ ان کی ساخت ان کی اصل کا پردہ فاش کئے دیتی ہے۔

جہاں گیر لافنا خیالات، آب حیات پئے پلائے خیالات، شکر لپیٹے اور تخیل کو بھڑکاتے اسلوب، حکمت بسے، اصلیت لپٹے، کم منظم اور بن منجھی ترکیبیں، گاڑنے کے لئے بیتاب ابھی مستقبل کے پردے میں ہے، شاعر چن چن اور تول تول کر گاتا ہے، گردو پیش پر سوا ہو جانے کی بلند حوصلگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان کی نظمیں بہت آسانی سے دو قسموں میں رکھی جا سکتی ہیں۔ کچھ ترجمے ہیں اور کچھ طبع زاد یہ ترجمے انگریزی کے مشہور شعرا ورڈس ورتھ بائرن، براؤننگ شیکسپیر اور ہارڈی کے ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حیثیت ایک قسم کی ذہنی مشق کی ہے اگرچہ شاعر ان نظموں کی لطافت خیال کو اردو میں منتقل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ ورڈس ورتھ کی مشہور نظم "کوئل" کو لیجئے جس میں بقول مولوی عبدالحق صاحب "جملہ خیال کے ساتھ ساتھ ہے اور قافیہ پر آب رواں کی طرح بہکر دوسرے مصرعہ اور پھر بعد کے شعروں میں گھل مل گیا ہے۔ یہاں عظمت اللہ خاں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اصل سے جو خیالی تصویر ذہن میں آتی ہے انھیں اپنے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے "ہم سات ہیں" یہ بھی اسی شاعر کا کامیاب ترجمہ ہے اور اصل نظم کی سادگی و پرکاری اور اس کے الفاظ کی رہ رہ کر دل میں کھب جانے والی خصوصیت یہاں بھی موجود ہے۔ ایک بند دیکھئے ؎

نہیں ہوتی مردوں کی زندوں میں گنتی　　یہ سب بھولے پن کے خیالات ہیں

عقیدے کی اپنے وہ تھی ایک پکی   کہا پھر نہیں واہ! ہم سات ہیں

مگر ان کے بعض ترجموں میں اصل کی روح تو ہے مگر اصل کی پختگی نہیں ہے۔ جو چیز انگریزی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اسے اردو میں ادا کرتے وقت وہ موزونیت پیدا نہیں ہوتی۔ میرڈتھ کی ایک نظم کے پہلے دو مصرعے یہ ہیں:

On my darling's bosom

Has dropped a living rose bud

اس کا ترجمہ عظمت اللہ خاں یوں کرتے ہیں ؎

میرے گھر کی دیوی کے بالائے سینہ   کھلا ہے محبت کا تازہ کنول

یہاں بالائے سینہ کی ترکیب بالکل بالائے قلعہ معلوم ہوتی ہے اور اس سے مصرعے کی لطافت زائل ہو جاتی ہے

براؤننگ کی مشہور نظم (Pippa Passes) کے ایک ٹکڑے کا ترجمہ بالکل بے جان ہے

اٹھانا پڑا دکھ کسی کو زیادہ؟   بڑی یا چھوٹی نظر میں خدا کی

سب یکساں ہے خدمت اگر حسب لائق   ہے عرش معلی پہ حق جلوہ فرما

مگر اسی کی دوسری نظم زیادہ کامیاب ہے (A pretty Woman) کا ایک بند اس طرح پیش کیا گیا ہے ؎

کہیں اک اشارے پہ تم مہرباں ہو

مزیدار تقریر بھائی کہیں   چمکدار شمشیر بھائی کہیں

غرض ڈھل گئیں جیسا موقع جہاں ہو

بحیثیت مجموعی عظمت اللہ خاں مرحوم نے نظموں کا جو ترجمہ کیا ہے وہ باوجود کہیں کہیں دلکش ہونے کے بہت کامیاب نہیں یہ کام آسان نہیں ہے خصوصاً گیتوں کا ترجمہ جس میں صرف لفظوں کو بدلنا یا انگریزی لفظ کی بجائے اردو لفظ رکھنا ہی نہیں ہوتا بلکہ ایک لطافت کو دوسری لطافت کا قالب دینا ہوتا ہے۔ مگر طبعزاد نظموں کا معیار بہت زیادہ بلند ہے۔

ان نظموں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شاعر اپنے گرد و پیش کے مناظر پیش کرتا ہے۔ جو چیزیں آئے

متاثر کرتی ہیں وہ اس کی دیکھی اور جانی پہچانی ہیں اور انھیں وہ اس طرح پیش کرتا ہے کہ ان میں ایک خاص بات پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر شاعر کسی منظر کی تعریف میں بڑے خوبصورت الفاظ جمع کرے، مگر اس کی تصویر سے کہیں حسن نہ ٹپکتا ہو تو یہ عجز فن کی دلیل ہوئی لیکن کم سے کم الفاظ میں اگر اثر پذیری کا دریا بند کر دیا جائے تو دل میں رہ رہ کر لہریں سی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرے وہ جن مناظر کو لیتا ہے ان میں سے بعض اچھوتے ہیں انھیں ان سے پہلے کسی اردو شاعر نے منہ نہیں لگایا، حقہ پیپل کا درخت، تتری کیڑا، جغرافیہ۔ ان بے رنگ اور سپاٹ عنوانوں میں شاعر نے اپنی رنگین شخصیت سے قوس قزح کی سی دھاریاں پیدا کر دی ہیں پیپل کا ایک رنگ یہ ہے۔

کونپلیں تازی سویوں جیسی رنگ وہ دھانی ہلکا سا اس میں جھلک وہ پیازی پیازی
ٹہنی ٹہنی پیلیاں ہیں جڑے ہوئے نگ ہیں گویا جان کی ہے اک شعبدہ بازی

حقّہ کی کیفیت یہ ہے ؎

نیلا امبر بکھرے تارے حسن فطرت موجیں مارے اک دیدۂ حیران ہے حقّہ
سنسان ساں بھید کے سارے جھلمل جھلمل کرتے اشارے گویا صاحب عرفان ہے حقّہ

اچھوتے مضامین میں سے ایک "بالی بیوی" ہے۔ ہندوستان میں یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ مگر تعجب ہے کہ اسکے متعلق ہمیں شاعروں میں کوئی بھی اشارہ نہیں ملتا عظمت اللہ خاں کی یہ نظم ہندوستانی جذبات کا بڑا دلکش مرقع ہے بالی بیوی کے خدوخال کے متعلق جو اشارے ہیں بڑے بلیغ ہیں۔ ہندی بحر اور ہندی کے الفاظ نے ایک رسیلی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ دو اشارے ملاحظہ ہوں ؎

ترے ہونٹ یہ لال ہیں نہیں سانس میں گرمیاں
ترے پھول سے گال ہیں نہیں باس میں مستیاں
ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دبی سی ہے

ترے مکھ نے بتا دیا ترے اُٹھتے سبھاؤ کا
ابھی کچھ نہ پتا ملا ترے من کے لگاؤ کا
ابھی آنکھ ڈری سی ہے ابھی آگ دبی سی ہے

عورت کی مظلومیت کا بھی عظمت اللہ خاں کو بڑا احساس تھا۔ ان کی نظموں میں سے کئی اس موضوع سے متعلق ہیں۔ "مرے حسن کے لئے کیوں مرے"، "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے"، "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا"، "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو" یہ سب ان کی بہترین نظموں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ ان سب میں عورت کی زبان سے مرد کی غفلت شعاری اس کی بے وفائی، عورت کی آرزوں کو مجروح کر انھیں پامال کرنے کا رونا رویا گیا ہے۔ ان کا لہجہ نرم اور شیریں ہے شکایت کہیں نالہ و شیون کی حد تک نہیں پہونچی، ان کی بحریں روان اور مترنم ہیں اور ہندی الفاظ کے مناسب اور موزوں استعمال نے انھیں ہندی افادی کے الفاظ میں "نغمے کی چیز" بنا دیا ہے۔ "مرے حسن کے لئے کیوں مرے" اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت تلخ لہجہ اختیار کرسکتی تھی مگر اس کے آخری بند میں ہندوستانی عورت کی فطرت کا کتنا صحیح نقشہ پیش کیا ہے ؎

وہ ہوا جو ملتے تھے یہ تھا لکھا مرے دل سے آئیگی یہ صدا	مرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا تمھیں دے سکوں کوئی بددعا

مرے حسن کے لئے کیوں مرے، نہیں لینے تھے تمھیں یوں مرے

"مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" مرحوم شاعر کی بہترین نظم قرار دی جاسکتی ہے اس میں نظم کے قافیے انگریزی طرز کے ہیں، بحر ہندی ہے مگر اس کے پڑھنے میں ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ خود شاعر نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کے مطابق ایک مکمل تصویر خیال کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ موضوع نیا نہیں ہے۔ مگر ایک عورت کی زبان سے بیان کر کے عظمت اللہ خاں نے اس میں درد وا ثر کوٹ کوٹ بھر دیا ہے۔ ہر بند دوسرے بند سے وصل ہوتا جاتا ہے اور خیال ٹھوکریں کھانے کے بجائے خوش اسلوبی سے بڑھتا اور پھیلتا ہے عورت کا تعارف ایک بند میں ہو جاتا ہے ؎

میں تھی ننھی سی جان غریب بڑی	کبھی بھول کے دکھ نہ کسی کو دیا
نہ تو روٹھی کبھی نہ کسی سے لڑی	مری باتوں نے گھر کو ہی موہ لیا

اس کی محبت اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

مرے سر میں تمہارا ہی دھیان بسا	میری چاہ کے راج دلائے بنے
تمھیں دیوتا مان کے من میں رکھا	میری بھولی سی آنکھ کے تارے بنے

مگر جب پڑھ لکھکر مرد نے دوسری جگہ شادی کی ٹھیرائی تو عورت کا دل ٹوٹ گیا اور وہ بستر مرگ پر پڑ گئی۔ اس وقت بھی لہجہ کتنا نرم ہے ؎

مرا آخری وقت ہے آن لگا　　　کوئی اور تمہاری ہے پیاری دلہن
مجھے اب بھی تمہارا ہی دھیان لگا　　　نہ بنی یہ رہی ہوں تمہاری دلہن

ایک دوسری نظم "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے" دراصل ایک طوائف کی داستان ہے۔ اس نظم کو محض جذباتیت غارت کر سکتی تھی مگر شاعر نے توازن قائم رکھا ہے ؎

مری زندگی بڑا سبق ہے کہ یہاں کی خوب سیر کی ہے　　　ہے مزے کی چیز پر یہ دنیا نہ تو شر کی ہے نہ خیر کی ہے
وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے، وہ ہوں آج جس کی کل نہیں ہے

عظمت اللہ خاں کے گیتوں میں ترنم بھی ہے اور تصویریں بھی۔ انھوں نے شباب کے مختلف مناظر بڑی خوبی سے پیش کئے ہیں۔ ان میں ممکن ہے بعض لوگوں کو عریانی نظر آئے ہماری غزلوں میں خیال اس سے زیادہ عریاں ہے اسے خوشنما الفاظ کا لباس پہنا دیا گیا ہے عظمت اللہ خاں بھی مہدی کی طرح حسن کے پجاری ہیں اور جہاں کہیں حسن ہے انھیں عزیز ہے۔ چند نقوش ملاحظہ ہوں ؎

چال نشیلی جھومتا یا دل　　　یا کوئی ندی لہراتی
چڑھ جوانی میں اٹھلاتی
ڈرتی ڈرتی بچتی بچاتی　　　رُکتی رکاتی شرماتی
دل کو مسلتی دل تڑپاتی
سینہ مستی کا جوالا مکھ　　　کمر لچکتی بل کھاتی
ہوش ربا اُتار چڑھاؤ

حُسن نسوانی ہی نہیں فطرت کا ہر حسن ان کے پیش نظر ہے برکھا رت کے پہلے مینہ میں بجلی کی تصویر کیسی سچی ہے ؎

بجلی چمکی انگارہ سی آگ کی ناگن لہرائی　　　لہریا کا ڈھابیل بنائی
بھاپ کے دریا میں قدرت نے نور کی مچھلی تیرائی　　　اِدھر اُدھر تڑپی تڑپائی

مرے بال کالے لانبے لانبے کہ اٹھا ہو جیسے ابر کالا　　مرا سینہ بھی امڈتا بادل بھری بجلیوں سے تھر تھراتا

الفاظ کی آواز سے مفہوم ادا کرنے کی کوشش دیکھئے۔

باد ل گرجے وہ گھڑ گھڑاہٹ آئی لڑھکتی لڑھکاتی　　کڑوڑہا گھوڑے دوڑاتی

باڑھوں پہ باڑھیں داغتی آئی اور کڑکتی کڑکاتی　　پہاڑ لڑھکاتی ٹکراتی

صبح کے سماں کی کیسی پیاری تصویر ہے ؎

بھور بھئی ہے صبح کی دلہن　　نے سیج پہ لی انگڑائی

بگڑی بکھری رات کی بن ٹھن　　وہ سہر کی تاروں کی دلائی

رات کے کالے بالوں میں سے　　چاند کی صورت وہ مسکرائی

اس قسم کی بہت سی مثالیں اس مجموعے سے دی جا سکتی ہیں عظمت اللہ خاں کے خاص خاص موضوع فطرت کے مناظر، معاشرت کے مختلف پہلو، عورت کی مظلومیت، گھریلو زندگی کی دلچسپیاں، وطن کی محبت ہیں ان میں زبان موضوع کے مطابق ہے۔ تصویریں سیدھی سادی اور واقعیت لئے ہوئے ہیں۔ بحریں نئی ہیں اور مترنم۔ شاعر نے اپنے مضمون میں جو دعویٰ کیا ہے اس کا کافی ثبوت ان نظموں سے مل جاتا ہے۔ شاعری میں سیدھی سادی بات بشرطیکہ وہ ذاتی طور پر محسوس کی گئی ہو اور احساس کی انفرادیت ظاہر ہو جائے۔ بڑی چیز ہے عظمت اللہ خاں اس راز سے آگاہ تھے انھوں نے کئی تجربے کئے بعض میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ مونچھ اور چوٹی میں شعریت پیدا ہونے نہیں پائی۔ "تتری کیڑے" میں اچھی تشبیہوں کے باوجود شاعری کی دیوی کا نزول نہیں ہونے پایا مگر وہ اردو شاعری کو عجمی نقطۂ نظر سے آزاد کرانے میں ضرور کامیاب ہوئے۔ اگر ان کی نظمیں اس پایہ کی نہ ہوتیں تو بھی ایک نئے دور کے علمبرداروں میں ان کا نام ضرور ادب سے لیا جاتا مگر انھوں نے اس سے زیادہ بھی کچھ کیا۔ وہ ہمارے لئے کئی اچھی، قابل قدر اور بلند پایہ نظمیں چھوڑ گئے ہیں۔ زمانے نے انھیں زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اس لئے ان کے انداز میں ابھی پختگی نہیں آنے پائی تھی۔ شاعر ابھی تجربے ہی کر رہا تھا۔ مگر یہ تجربے اس قدر وقیع تھے کہ آج ان کا نقطۂ نظر، صوری اعتبار سے اس دور کی شاعری پر کار فرما ہے"　　(آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے)

افتتاح الاندلس: مترجمہ محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم۔اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن مقدمہ اور حواشی ملا کر ۲۱۶ صفحے، کتاب ٹائپ میں چھپی ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے اور کتابستان الٰہ آباد سے مل سکتی ہے۔

یوں تو اردو زبان میں اندلس کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں مگر بیشتر یورپی زبانوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ بیش نظر کتاب اندلس کے ایک مشہور مسلمان عالم اور ثقہ مورخ ابن القوطیہ کے ایک رسالہ "تاریخ افتتاح الاندلس" کا ترجمہ ہے اور مترجم نے شروع میں نہایت تحقیق سے مقدمہ لکھا ہے اور کتاب کے آخر میں مفید حواشی کا اضافہ کیا ہے۔ ابن القوطیہ کا زمانہ ۳۶۷ھ ہے۔ ماں کی طرف سے آپ کا شجرہ اندلس کے عیسائی بادشاہوں سے ملتا ہے اور آپ کے دادا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مرید تھے۔ موصوف بڑے پایہ کے بزرگ تھے اور عربی زبان اور لغت کے علاوہ حدیث و فقہ میں اپنے زمانے میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔

تاریخ افتتاح الاندلس کے ترجمے یورپ کی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ تاریخ اندلس کی ایک مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ موجودہ زمانے کا کوئی مورخ بھی جس نے اندلس پر کچھ لکھا ہے اس کتاب کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ پروفیسر جمیل الرحمٰن صاحب نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کر کے بہت بڑا کام کیا ہے اور خاص طور پر مقدمہ اور حواشی کی ترتیب میں انھوں نے بڑی محنت کی ہے۔ جس کے لئے اسلامی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اُن کے بے حد شکر گذار ہونگے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلامی تاریخ کا بہت چرچا ہے۔ اور اس موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں بھی نکلتی ہیں لیکن ان کتابوں کی حیثیت بیشتر یا تو یہ ہوتی ہے کہ انگریزی کتابوں کا ترجمہ ہوتا ہے یا محض روایتی قصیدہ خوانی۔ ضرورت ہے کہ تاریخ اسلام کے اصل مصادر تک ہماری رسائی ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں فتح اندلس پر اس کتاب کا شائع ہونا بہت مفید ثابت ہوگا۔ ترجمہ کی زبان بہت صاف ہے۔ مقدمہ میں مترجم نے نہایت سلجھے ہوئے انداز میں فتح اندلس کے متعلق اپنی تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ امید ہے کہ مترجم کی یہ کوشش علمی حلقوں میں ضرور سراہی جائے گی۔

(م۔س)

طلسمِ عمل؛ مترجمہ سید مجتبےٰ احسن صاحب، مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ، ملنے کا پتہ درج نہیں، تقطیع ۲۰×۲۶/۸ حجم ۲۵۸ صفحے، قیمت ۸/، لکھائی چھپائی، کاغذ اوسط درجہ۔

شیخ سعدی کی گلستاں کو اتنی مقبولیت اس وجہ سے حاصل ہوئی کہ انھوں نے اخلاق کے مجرد اصول کو عمل مصالح کے ساتھ سموکر اپنے ہمعصروں کے لئے کامیاب زندگی کا ایک چلتا ہوا نسخہ تیار کردیا۔ڈیل کارنیگی کی کتاب جس کا ترجمہ جناب سید مجتبےٰ احسن صاحب نے اردو میں "طلسمِ عمل" کے نام سے کیا ہے اسی قسم کا نسخہ ہے موجودہ زمانے کے لئے۔ ترجمہ ایسا بے تکلف اور رواں ہے کہ اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔امید ہے کہ یہ کتاب اس کسادبازاری کے زمانہ میں بھی بہت مقبول ہوگی۔اور سید مجتبےٰ احسن صاحب اور بہت سی مفید اور دلچسپ کتابوں کا ترجمہ کرکے اردو کو مالا مال کردیں گے۔ (ع۔ح)

سیرت شہید کربلا؛ جلد دوم۔ مترجمہ محمد ایوب عثمانی۔ صفحات ۳۲۳، سائز ۲۰×۲۶/۸ مکتبہ معارف القرآن اورنگ آباد ضلع گیا، قیمت ۲/۸، کتابت وطباعت اور کاغذ بہت عمدہ۔

یہ علی جلال حسینی مصری کی تالیف الحسین جلد دوم کا ترجمہ ہے۔ پہلی جلد کا ترجمہ اس سے پیشتر عثمانی صاحب کرچکے ہیں۔ یہ ترجمہ بھی پہلی جلد کی طرح آسان رواں اور بے تکلف ہے۔ اردو میں واقعی ایسی مبسوط اور مفصل کتاب حضرت امام حسینؑ کی سیرت پر اب تک شائع نہیں ہوئی۔معرکہ کربلا کے بعد کے تمام واقعات تفصیل سے اس جلد میں دے گئے ہیں نیز ان تمام ضعیف روایتوں اور من گھڑت قصوں کو بھی تنقید کی کسوٹی پر جانچا گیا ہے جو امام حسین کی شہادت کے بعد پیدا ہوگئے تھے آخر میں مختلف فرقوں اور اس زمانہ کے معروف عقائد نیز علمائے کبار اور دیگر بزرگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مختصر یہ کہ حتی الامکان کوئی بات چھوڑی نہیں گئی ہے۔ امید ہے کہ لوگ اس سے ضرور مستفید ہوں گے۔

کتب موصولہ جن پر آئندہ مہینہ تبصرہ ہوگا

۱۔ اقبال اور قرآن ۲۔ رحمت عالم ۳۔ حیات محمد عبدہٗ

رفتار عالم

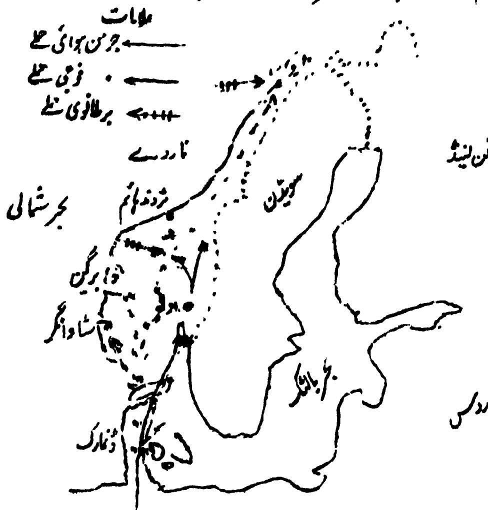
سنہ ۱۹۴۰ء

نیا سال شروع ہوا تو یورپ کی جنگ عظیم کو جاری ہوئے چار مہینے ہو چکے تھے، جرمنی اور روس نے پولینڈ کو آپس میں بانٹ لیا تھا، لتھوئینیا، استھونیا اور لٹیویہ نے روس کی سرپرستی منظور کر لی تھی، فن لینڈ اسی سے بچنے کے لئے لڑ رہا تھا۔ مگر فن لینڈ کا مسئلہ ایسا نہ تھا جس کے طے ہو جانے سے یورپی سیاست کے معمے حل ہوتے، اور جنوری سنہ ۱۹۴۰ء میں اناڑیوں اور شاید اکثر ماہروں کو پتہ نہ تھا کہ جنگ آگے کہاں ہوگی، کیسے ہوگی اور کس خاص مقصد کے لئے ہوگی۔ برطانیہ نے جرمنی کی بحری تجارت بند کر دی تھی اور یہ معلوم تھا کہ جرمن بیڑا انگریزی بیڑے کا مقابلہ نہ کر سکے گا، فرانسیسی فوج ماژی نو لائن مورچوں میں محفوظ بیٹھی تھی اور یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جرمن فوجیں ان مورچوں سے ٹکرا کر اپنے سر کیوں پھوڑیں گی ہالینڈ کی سرحد پر ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۳۹ء کو جرمن فوجیں جمع ہوئی تھیں مگر پھر وہ ہٹا لی گئیں اور خیال یہ ہوا کہ جنگ کے فریقین غیر جانب داروں کو نہ چھیڑیں گے اخباروں میں غیر جانب داروں کی حیثیت، ان کے جہازوں کی تلاشی لینے یا ان کے تاجروں کے ذریعے مال منگانے کے مسائل پر جو بحثیں ہو رہی تھیں ان کا ایسی وسیع پیمانے کی لڑائی کے وقت چھڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن جنگ کا دوسرا دور اسی غیر جانب داری کے معاملے میں شروع ہوا۔

غیر جانب دار

ناروے، ہالینڈ اور بلجیم ایسے ملک ہیں جن کا گزر خارجی تجارت پر ہوتا ہے

وہ لڑائی کی وجہ سے اس تجارت کو بند نہیں کر سکتے تھے مگر اس کو جاری رکھنے کے معنی یہ تھے کہ وہ جنگ کے دونوں فریقوں سے اُلجھ جائیں۔ جرمنی کا اصرار تھا کہ وہ اس سے لین دین کرتے رہیں اور جہاں تک ہو سکے امریکہ سے بھی اسے مال منگوا کر دیتے رہیں۔ اسی کے ساتھ جرمن آبدوزان کے جہازوں کو برطانیہ کے آس پاس پاتے تو ڈبو دیتے۔ برطانیہ کا اصرار تھا کہ غیر جانب دار اپنے تمام جہازوں کی تلاشی لینے دیں۔ اور اگر اس کا ذرا بھی شبہ ہو تا کہ جہازوں پر جو مال ہے وہ جرمنی کے کام آسکتا ہے تو وہ اسے روک لیتے۔ یہ کشمکش اس قدر بڑھی کہ جرمنی نے اپنی طرف سے طے کر لیا کہ غیر جانب داری کی بحث کو ختم کر دینا چاہیئے اور برطانیہ نے اپنی طرف اس کا ارادہ کر لیا کہ جرمنی کو غیر جانب دار ملکوں پر قبضہ نہ کرنے دیگا۔ ۱۸ ر اپریل کو برطانیہ کے جنگی جہازوں نے ناروے کے ساحل سے لگا کر بحری بم بچھا دئے اور ایسی ناکہ بندی کر لی کہ اس تین میل کی حد کے اندر بھی جو ملک میں شامل سمجھی جاتی ہے اور جہاں امن کے زمانے میں بھی کسی غیر قوم کے جنگی جہاز کو بغیر اجازت نہ آنا چاہیئے، کوئی تجارتی جہاز بغیر تلاشی دئے



نہیں گذر سکتا تھا۔ اسی کے ایک دو دن کے اندر جرمنی نے ناروے کی غیر جانب داری کو محفوظ رکھنے کا دوسرا انتظام کیا۔ ۱۰ اپریل کو خبر آئی کہ ناروک سے لے کر ناروے کے جنوبی سرے تک جرمنی نے ہوائی جہازوں کے ذریعے فوج اُتار کر تمام بندر گاہوں اور ہوائی اور فوجی مرکزوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ اس کی ایک اور فوج ڈنمارک فتح کرتی ہوئی ناروے کے دارالسلطنت اوسلو کے قریب پہنچ گئی ہے اور ناروے کی حکومت نے دارالسلطنت کو چھوڑ دیا ہے۔

کمزور کو زبردست سے بچانا ایک اخلاقی فرض ہے اور برطانیہ نے ناروے کو جرمنی کے پنجے سے چھڑانے کا ارادہ کیا۔ اصل میں مسٹر چیمبرلین کو پہلے ہی خیال ہوا تھا کہ ناروے کو مدد پہنچانے کی ضرورت ہوگی اور اُنھوں نے آخر مارچ میں ایک چھوٹی مگر بہت ہی آزمودہ کار فوج ناروے بھیجنے کے لئے تیار کی تھی لیکن اس وقت وہ بھیجی نہ جا سکی۔ اور ۱۵ اپریل کو جب وہ ناروک اور ٹرونڈ ہائم کے شمال اور جنوب میں اتاری گئی تو جرمن ناروے میں اپنے قدم بہت مضبوط جما چکے تھے۔ برطانوی فوج کے پاس مقابلے کے لئے ہوائی جہاز اور ٹینک بھی کافی نہ تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر اپریل میں اس فوج کو واپس بلانا پڑا۔ ناروک کے محاصرہ البتہ جاری رکھا گیا اور یہ شہر فتح بھی ہو گیا۔ مگر اس وقت تک ناروے کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا، ناروے میں نہیں بلکہ فرانس میں۔

ڈنمارک اور ناروے کی مہم سے فارغ ہو کر جرمن فوجیں ہالینڈ اور بلجیم پر لوٹ پڑیں۔ فن جنگ کے نئے اصولوں کا مظاہرہ جرمنی نے پولینڈ اور ناروے میں بھی کیا تھا لیکن پولینڈ بہت دور تھا اور ناروے میں جو مقابلہ ہوا اس کی حیثیت مقامی سی رہی۔ لیکن اگر اتحادی یہ بھانپ بھی لیتے کہ جرمنی کس ڈھنگ سے لڑے گا تب بھی اس کی چال کا مناسب جواب دینا ممکن نہ تھا، اس لئے کہ انھیں مہلت بہت کم ملی۔ ۱۰ مئی کو جرمنی نے ہالینڈ پر حملہ کیا، کسی ایک جگہ پر نہیں بلکہ سارے ملک پر۔ جہاں جہاں ہالینڈ کے ہوائی

مرکز تھے، جرمن ہوائی جہازوں نے آکر پہلے بمباری کی اور پھر مسلح سپاہی اتار دئے جنھوں نے مرکز پر قبضہ کر لیا۔ ہالینڈ کی فوج نے اکثر مرکزوں پر ان مسلح سپاہیوں کا صفایا کر دیا، مگر دشمنوں کے ہر جگہ اچانک نمودار ہونے سے ایسی کھلبلی مچ گئی اور انتظام میں ایسی گڑبڑ ہو گئی کہ ملک کو دشمن سے بچانا ناممکن ہو گیا۔ تین دن میں جزیرۂ زے لانڈ کے سوا باقی ملک پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا اور ۱۴ مئی کو ہالینڈ کے سپہ سالار نے صلح کی درخواست کر دی۔ اس کے بعد بلجیم کی باری آئی۔ یہاں جرمنی کا کام اتنا آسان نہ تھا، اس لئے کہ برطانیہ اور فرانس کی بڑی بڑی فوجیں بلجیم میں مغرب کی طرف سے داخل ہو کر تیزی کے ساتھ مقابلے کے لئے آ رہی تھیں۔ انھوں نے جرمن حملہ کو روک بھی لیا، مگر یہاں بھی ان کے پاس ہوائی جہاز اور ٹینک اس افراط سے نہ تھے کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دے سکیں اور جرمنی نے اس وقت ایسی چال بھی چلی جس نے جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا۔

فرانس کی شکست

فرانسیسیوں نے شمالی سوئٹزرلینڈ سے لے کر بلجیم تک زمیں دوز مورچوں کا ایک سلسلہ بنا لیا تھا، جو ماژی نو لائن کہلاتا ہے اور جسے سامنے سے حملہ کر کے فتح کرنا امکان سے باہر ہے۔ بلجیم اور فرانس کے درمیان ایسی کوئی روک نہیں۔ فرانسیسی ماژی نو لائن کے سے مورچے یہاں بھی بنا سکتے تھے، لیکن اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکالا جاتا کہ فرانس نے اپنی فکر کر لی ہے۔ بلجیم کی اسے فکر نہیں، مگر جرمن فوجوں نے سرحدی قلعوں کو پہلے ہی ہلے میں فتح کر لیا اور اتحادی فوجوں سے ان کی مڈبھیڑ وسط بلجیم میں ہوئی۔ تب خیال ہوا کہ جنگ کی صورت آخر کار وہی ہو جائے گی جو ۱۹۱۴ء کی جنگ میں تھی دونوں فریق خندقیں کھود کر بیٹھ جائیں گے، اور خالی گولہ بارود کے زور پر آگے بڑھ سکیں گے لیکن اس خیال کو جرمنی نے چند دن کے اندر ہی غلط ثابت کر دیا۔ ۱۳ مئی

کو ایک جرمن فوج نے ماژی نولائن کے آخری شمالی قلعے کے قریب شہر سیدان کے سامنے فرانسیسی سرحد کو پار کیا، یہاں پر جو فرانسیسی فوج تھی وہ اس کے شدید حملے کو برداشت نہ کر سکی اور جرمن فوج ملک کے اندر گھستی چلی گئی۔

اصل حالات کا جب پتہ چلا تو معلوم ہوا کہ فرانسیسی اس وقت جنگ کے لئے تیار ہی نہ تھے، فوج کا انتظام خراب تھا، سپہ سالار اتنے بوڑھے تھے کہ بس لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے تھے اور لڑائی کے نئے طریقے نے ان کو بالکل عاجز کر دیا۔ سیدان کے قریب جرمن حملے کی شدت سے فرانسیسی فوج ایسی گھبرائی کہ پسپا ہوتے وقت پلوں کو توڑنا بھی بھول گئی اور جرمن فوج کا کام بہت آسان کر دیا۔ پھر فرانسیسیوں کے پاس سامان کی بھی بڑی کمی تھی۔ جرمنی نے خشکی پر حملہ کرنے سے پہلے ہی فرانس کے ہوائی مرکزوں پر ایسی بمباری کی تھی کہ فرانس کے بیشتر ہوائی جہاز ضائع ہو گئے اور فوج کا یہ بازو ٹوٹ گیا۔ جرمنی کے پاس تیز رفتار ٹینک، مسلح موٹر اور ہوائی جہاز

اتنے تھے کہ وہ ہر مہم میں جتنے چاہتا کھپا سکتا تھا ۔ فرانسیسی اپنے سامان کو بچا بچا کر ہی صرف کر سکتے تھے اور اس لئے مقابلے میں کامیابی کی شرط یہ تھی کہ جنگ کے وقت اور موقع اور صورت کا انتخاب وہ کریں۔ لیکن جرمنی نے انھیں سوچنے کی مہلت نہیں دی ، اور اس طرح فرانسیسی سپہ سالاروں کی جو تھوڑی بہت عقل تھی وہ بھی کام نہ آئی ۔

جرمنی نے جنگ کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بھی نرالا تھا ۔ ہر محاذ پر پہلے سینکڑوں ہوائی جہاز لگاتار حملے کرتے ، صرف دشمن کی فوج ہی پر نہیں بلکہ اس کے پیچھے بہت دور تک ۔ ان حملوں میں بہت سے ہوائی جہاز ضائع جاتے ، مگر اس سے بھی حملوں کے تسلسل اور شدت میں فرق نہ آتا ۔ جب ہوائی جہاز اپنا کام کر چکتے تو ٹینک اور مسلح موٹر آگے بڑھتے اور ان کی بھی تعداد اتنی ہوتی کہ فرانسیسی مقابلہ کرتے کرتے عاجز آجاتے اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوتے لیکن کسی ایک جگہ پر ان کے قدم اکھڑتے تو انھیں پھر دوسرا محاذ قائم کرنے کا موقع نہ دیا جاتا ۔ جرمن ہوائی جہازوں ، ٹینکوں اور مسلح موٹروں کے حملے کبھی رُکتے ہی نہیں تھے اور جہاں کہیں فرانسیسی محاذ ٹوٹتا اور بیچ میں جگہ خالی ملی تو چھوٹے تیز رفتار ٹینک ، مسلح موٹر اور موٹر سائکلیں گھس کر فرانسیسی فوج کے پیچھے پہنچ گئیں ۔ ان کا مقصد فوج کو گھبرانا نہیں بلکہ اس کے پیچھے جس قدر دور تک ممکن تھا عام آبادی کو خوف زدہ کرنا اور رسد کے انتظامات کو درہم برہم کرنا تھا ۔ ان کی مدد کو فوج نہیں پہنچ سکتی تھی ، اس لئے انھیں اس طرح دشمن کے ملک میں دوڑا دینا اصول جنگ کے بالکل خلاف تھا ۔ اگر جرمن فوج دو تین ہفتے تک بھی پورے محاذ پر روک لی جاتی تو ان ٹینکوں ، موٹروں اور موٹر سائکلوں میں سے ایک بھی باقی نہ بچتی ۔ لیکن پوری جرمن فوج کہیں روکی نہ جا سکی ، اور اس لئے یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی ۔

ماژی نولائن کے شمال میں فرانسیسی محاذ جگہ جگہ پر توڑا جا چکا تھا اور فرانسیسی فوجیں اتنی دور تک ہٹ گئی تھیں کہ اتحادی فوج کا شمالی حصہ جو بلجیم کی مدد کو گیا تھا ویسے بھی خطرے میں تھا جب بلجیم نے ہتھیار ڈال دئے (۲۸ مئی)۔ اب اتحادی فوج کے لئے پس پا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انگریزی فوجیں ڈنکرک کی طرف واپس ہوئیں فرانسیسیوں نے سین اور آئن دریاؤں پر اپنا محاذ قائم کیا اور شمال مشرقی فرانس، جس میں جرمن ٹینک، مسلح موٹر اور موٹر سائکلیں آوارہ پھر رہی تھیں بالکل خالی کر دیا گیا۔ ۶ جون کو جرمنوں نے فرانسیسیوں کے نئے محاذ پر حملے شروع کئے اور آٹھ دن میں فرانسیسیوں نے ہاری مان لی۔ ۱۸ جون کو فرانسیسیوں نے دشمن سے لڑائی بند کرنے کی درخواست کی، جو منظور کر لی گئی، لیکن اس دوران میں جرمن فوجوں نے ماژی نولائن کو پیچھے سے گھیر لیا اور اس میں جو فرانسیسی فوج تھی وہ بغیر لڑے ہوئے منتشر ہو گئی۔ یہ تھا انجام اس مورچہ بندی کا جس پر فرانسیسی اتنا بھروسا کرتے تھے۔

برطانیہ اور فرانس

اتحادی فوجوں کی بلجیم سے پس پائی کا سب سے افسوس ناک نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس اور انگلستان کا ساتھ چھوٹ گیا۔ برطانیہ کے مقابلے پر فرانس کا جو ساحل ہے اس پر جرمنی کا قبضہ ہو گیا تھا، برطانیہ اور فرانس کے الگ الگ محاذ بن گئے تھے اور ہر ایک کو اپنی ساری قوت اپنی حفاظت کے لیے سمیٹ کر رکھنا تھا۔ برطانوی فوج کو بلجیم سے واپسی کے وقت خاصا نقصان ہوا تھا اور اس کے بعد امکان تھا کہ جرمنی فرانس میں جنگ کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر کے انگلستان پر حملہ کر دے۔ اس کے باوجود برطانیہ کے نئے وزیر اعظم مسٹر چرچل نے ایک فوج تیار کر کے فرانس کی مدد کو بھیجی۔ فرانس کی حالت نازک ہو گئی تو مسٹر چرچل نے تجویز کیا کہ فرانس اور برطانیہ ایک مشترک حکومت

قائم کریں۔ فرانسیسی اس تجویز کو منظور کر لیتے تو ان کی حیثیت پسپائی کی سی ہو جاتی، وہ جنگ جاری رکھ سکتے اور ہر ہٹلر کامیابی کا سہرا پہن نہ پاتے۔ لیکن فرانس کے رہبروں میں سوائے جنرل ڈی گول کے کوئی ایسا نہ تھا جس میں جنگ کو جاری رکھنے کی ہمت تھی، مسٹر چرچل کی تجویز پر جیسا کہ چاہئے تھا غور نہیں کیا گیا اور جرمنی سے یہ درخواست کرکے کہ لڑائی بند کر دی جائے فرانس نے برطانیہ سے اپنا پرانا تعلق توڑ دیا۔

برطانیہ

جمہوریت میں بڑی خوبیاں ہیں، لیکن فن جنگ کے نقطۂ نظر سے خامی بھی ہے کہ حملہ اور مدافعت کی پہلے سے تیاری نہیں کی جا سکتی، جرمنی نے جنگ کے لئے اس وقت سے انتظام کرنا شروع کر دیا جب سے کہ نازی پارٹی برسر اقتدار ہوئی، انگلستان میں اس طرف توجہ چار سال بعد کی گئی جب یہ یقین ہو گیا کہ جرمنی سے لڑائی ضرور ہوگی۔ لڑائی کے لئے اس نیت سے تیاری کرنا جو کہ جرمنی کی تھی آدمیت اور تہذیب کے بالکل خلاف ہے اور آدمیت اور تہذیب کی قربانی چند فوجی افسروں کی خوشنودی یا تماشائیوں کی واہ وا کے لئے نہیں کی جا سکتی۔ جب واقعی ضرورت پیش آئی تو برطانیہ کی جمہوریت نے بھی اپنے جوہر دکھائے۔ ناروے کی مہم ناکامیاب ہوئی تو مسٹر چیمبرلین نے وزارت سے استعفا دے دیا۔ مسٹر چرچل وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ۱۰ مئی کو بغیر بحث مباحثے کے چند گھنٹوں کے اندر اشخاص اور ملکیت کے بارے میں پارلیمنٹ نے ایک قانون منظور کر لیا جس سے برطانیہ کی حکومت کو شہریوں اور ان کی ملکیت پر اتنا ہی اختیار ہو گیا جتنا کہ نازی پارٹی نے برسوں کی گالی گلوج اور غنڈے پن اور خونریزی اور خفیہ پولیس کی بے شمار زیادتیوں کے بعد حاصل کیا تھا۔ نئی حکومت کی خود اعتمادی اور جمہوری سیاست کا استقلال اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ شروع جون میں مسٹر چرچل نے بلجیم اور شمالی فرانس سے پسپائی کے سارے حالات

صحیح صحیح بیان کر دئے ، قوم کو نقصان پورا کر کے اپنے زبردست دشمن کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی اور یہ دعوت بڑے جوش سے قبول کی گئی ۔

فرانس کی شکست اور اس کے ہتھیار ڈال دینے کے معنی یہ تھے کہ فرانس کی شمالی بندرگاہیں اور کیلے کے پاس کا ساحل ، جہاں سے برطانیہ صرف چوبیس میل ہے ، جرمنی کے قبضے میں ہوگا اور انگلستان پر حملہ کرنے کے لئے وہاں انتظام کیا جا سکے گا ۔ جرمن ہوائی جہازوں کے لئے بڑی آسانی ہوگئی کہ وہ فرانس سے اُڑ کر برطانیہ کے جس حصے پر چاہتے بم باری کر آتے ۔ جولائی میں تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جرمنی واقعی برطانیہ پر لشکرکشی کرنا چاہتا ہے ، لیکن اگر جرمنی نے حملہ کا ارادہ بھی کیا تھا تو برطانیہ کے بیڑے اور ہوائی جہازوں نے اس کی نوبت نہیں آنے دی ۔ اگست سے برطانیہ پر ہوائی حملے ہونے لگے ، جن کی شدت گھٹتی بڑھتی رہی اور جو اب تک جاری ہیں ۔ لیکن جون جولائی اور اگست ہی میں برطانیہ نے اپنی حفاظت کا پورا انتظام کر لیا اور جرمنی نے ہوائی حملے کر کے بہت سخت نقصان اٹھایا ۔ ان حملوں کے جواب میں برطانیہ نے بھی جرمنی پر بمباری شروع کر دی اور چونکہ جرمنی میں مدافعت کا انتظام اتنا اچھا نہیں ہے جتنا کہ انگلستان میں اور جرمن ہوابازوں کو فرداً فرداً لڑنے کی خاص مشق نہیں ہے ، جنگ کی موجودہ شکل میں جرمنی بہت گھاٹے میں رہتا ہے ۔

فرانس اور جرمنی کے درمیان لڑائی بند کرنے کی شرطیں طے ہوتے ہی برطانیہ نے فرانسیسی بیڑے کے ان تمام جہازوں پر جو بحر روم کے باہر تھے یا تو قبضہ کر لیا یا انھیں بیکار کر دیا ۔ چند جہاز ایسے بھی تھے جنھیں ان کے کپتانوں نے اپنی خوشی سے برطانیہ کے بیڑے میں شامل کر لیا ۔ برطانیہ کے لئے یہ کارروائی لازمی تھی ، اس لئے کہ فرانسیسی حکومت پر جرمنی دباؤ ڈال کر فرانس کا پورا بیڑا حاصل کر لیتا تو جرمنی کی بحری قوت بہت بڑھ جاتی اور مفت کے جہازوں سے جرمنی وہ کام لے سکتا تھا جو وہ اپنے جہازوں

سے لیتے ہوئے گھبراتا ہے۔ برطانیہ نے بڑی ہوشیاری سے اس خطرے کی پیش بندی کرلی۔

اٹلی

۱۰ جون کو، جب اس کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ فرانس جرمنی کا مقابلہ ایک ہفتے سے زیادہ نہ کرسکے گا، اٹلی نے برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ ۱۹۳۶ء سے جرمنی اور اٹلی کی سیاست کا ایک ہی مسلک رہا ہے اور ہر معاملے وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہے ہیں۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں لڑائی چھڑی تو اٹلی غیر جانب دار رہا، لیکن یہ بھی واضح کرتا رہا کہ اسے جرمنی سے ہمدردی ہے اور اس کی غیر جانب داری محض اصطلاحی ہے، بحر روم کی حکومت کو وہ اپنا حق سمجھتا ہے اور اپنے حق کو وہ حاصل ضرور کرے گا۔ یہ سب کہنے کی باتیں تھیں اٹلی جنگ کے لئے تیار نہیں تھا، ورنہ اس کے لئے ہر لحاظ سے بہتر تھا کہ فوراً لڑائی شروع کردے۔ اس نے ۱۹۳۹ء کے آخر میں مصر اور یونان پر حملہ کردیا ہوتا تو برطانیہ کو اس کے مقابلہ کرنے میں بڑی دشواریاں پیش آتیں۔ اور اپریل سے جون ۱۹۴۰ء تک جرمنی کو جو کامیابیاں ہوئیں وہ فاشست سیاست کے لئے بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ ظاہر میں کچھ معلوم ہوتا ہو، اٹلی کے لڑائی ملتوی رکھنے کے معنی یہ تھے کہ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دونوں فریقوں میں سے کامیابی کس کو ہوتی ہے۔ جون میں فرانس کے خلاف اعلان جنگ کرنے کا منشا جرمنی کو مدد کرنا نہیں تھا، اس لئے کہ جرمنی کو اس وقت مدد کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ اٹلی چاہتا تھا کہ فرانس کی شکست سے فائدہ اٹھائے اور بغیر لڑے ہوئے نیس، کورسکا اور فرانس کی افریقی نوآبادیاں حاصل کرلے۔ یہ سب مل جاتا تو بحر روم پر حکومت کرنے کا حق بھی آگے چل کر ثابت کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ایسے خود غرض اور گیدڑ صفت دوست کی جیسا کہ اٹلی ہے، کوئی قدر نہیں کرتا۔ فرانس سے وقتی صلح کی شرائط پر گفتگو کرنے میں اٹلی کے نمائندے تھے بلکہ بہت پیش پیش تھے، مگر اٹلی کو ملا کچھ نہیں، اس لئے کہ فرانسیسی اٹلی کے مطالبے

منظور کرنے پر تیار نہیں تھے اور جرمنی کی مصلحت کے بالکل خلاف تھا کہ اٹلی کے مطالبے
منظور کرانے کی خاطر وہ فرانس سے لڑائی جاری رکھے۔ بالآخر فرانس سے جو شرطیں منوائی
گئیں وہ جرمن سیاست کی خونخواری کو دیکھتے ہوئے بہت ہلکی تھیں، فرانس کے دارالسلطنت
اور شمالی و مشرقی حصہ دوران جنگ کے لئے جرمنی کے قبضہ میں رہنا طے پایا، الساس
لورین کے دونوں ضلعوں میں سے لورین جرمنی نے لے لیا اور الساس فرانس کے
پاس رہنے دیا گیا، فرانسیسیوں کو ملک کے ایک تہائی حصے میں، جو آزاد چھوڑا گیا تھا،
حکومت کرنے کا پورا اختیار دے دیا گیا، لیکن ظاہر ہے یہ حکومت جرمنی کے مفاد کے
خلاف کچھ کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ اس وقت تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ضلع سیووئی اور
ساحل ایلپ کے وہ حصے جن کی آبادی زیادہ تر اطالوی ہے اٹلی کو دے دئے
گئے ہیں لیکن اس کی تصدیق کسی مستند ذریعے سے نہیں ہوئی کہ اٹلی کا واقعی ان پر
قبضہ بھی ہو گیا ہے۔

اس ناکامیابی کے بعد اٹلی افریقہ کی طرف متوجہ ہوا پہلے اس نے برطانوی
سومالی لینڈ پر حملہ کیا، شاید اس وجہ سے کہ اسے معلوم تھا کہ برطانیہ یہاں پر مقابلہ
نہ کرے گا۔ برطانیہ نے مقابلہ کیا بھی نہیں، اس لئے کہ یہاں لڑنے کی بہ نسبت نہ لڑنے
میں زیادہ مصلحت تھی اور یہاں کی فوج اور سامان کو مصر بھیج دیا، جو اصل محاذ ہے
اٹلی مصر پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا، اور طرابلس میں ضروری فوج اور سامان
جمع کر کے اس کی فوجیں سڑک بناتی اور ریگستان میں جگہ جگہ پٹرول اور دوسرے
سامان کے ڈپو قائم کرتی اور پانی کا انتظام کرتی ہوئی سیدی برانی تک بڑھ آئیں۔
جو مصر کی سرحد کے اندر ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ رک گئیں، اس لئے کہ اب بھی اٹلی کا
مقصد لڑنا نہیں تھا بلکہ لڑائی کے اتفاقات سے فائدہ اٹھانا۔ مصر کی طرف بڑھنے کے
ساتھ ہی اٹلی نے جنوبی البانیہ پر حملہ کرنے کی تیاری کی، کہ یہاں بھی بغیر لڑے ہوئے

جو کچھ ملے اسے مار لی جائے ۔

جرمنی کے مقاصد

جرمنی کا جنگ سے پہلے یہ اصرار تھا اور اب بھی اس کا مقصد یہ ہے کہ یورپ کی نئی تنظیم کی جائے ۔ نئی تنظیم کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے ، کیونکہ یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کے کسی براعظم اور کسی ملک کی حالت کبھی ایسی نہیں ہوئی ہے کہ نئی تنظیم سے اسے بہتر نہ بنایا جا سکتا ۔ لیکن نئی تنظیم سے جرمنی کا مطلب یہ تھا اور اب بھی ہے کہ یورپ کی سیاست اور تجارت بالکل اس کے اختیار میں دیدی جائے ۔ یورپ کے ان علاقوں کو جہاں جرمن آباد ہیں جرمنی اپنے اندر شامل کر لینا اپنا حق سمجھتا ہے اور آسٹریا ، چیکوسلواکیہ اور آدھے پولینڈ پر اسی حق کی بنا پر قبضہ کیا گیا ۔ یہ قبضہ نئی تنظیم کے مسئلے سے بالکل الگ ہے ۔ نئی تنظیم کے سلسلے میں ڈنمارک ، ناروے ، ہالینڈ اور بلجیم پر لشکر کشی کی گئی اور رومانیہ پر تسلط حاصل کیا گیا ۔ اب جرمنی کا مقصد یہ ہے کہ اپنے تسلط کو قائم رکھے اور اسے بڑھاتا اور مضبوط کرتا رہے ۔

(۱) فرانس کے شکست کھاتے ہی جرمنی اور اٹلی کے تعلقات بدل گئے ۔ جرمنی مغربی یورپ میں اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتا اگر فرانس اس کا ساتھ نہ دے ۔ اس مقصد کے لئے فرانس کے مقابلے میں اٹلی کی دوستی نسبتاً بیکار رہے اور دقتی صلح کی گفتگو چھڑتے ہی جرمنی اور اٹلی کے تعلقات نے پلٹا کھایا ۔ جرمنی نے ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، اٹلی کے مطالبوں کو منظور کرانے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی اور اپنا رویہ ایسا رکھا کہ فوجی انتظامات میں کوئی رکاوٹ نہ ہو مگر فرانسیسی کوئی خاص شکایت بھی نہ کر سکیں ۔ اسی کے ساتھ جرمنی فرانس کی زندگی کو خاص نازی اصولوں کے مطابق اپنی معاشی تنظیم کے تحت میں لے آیا ، کارخانوں کو کام دیا ، کارخانہ داروں کی سرپرستی کی ، مگر سارا نقد روپیہ اپنے قبضے میں کر لیا اور جتنا مال خریدا یا بنوایا اس کے معاوضے

میں قرض کے پروانے دئے جن کا نقد میں منتقل ہونا جرمن سیاست کے فروغ پر منحصر ہے
مارشل پے ٹین اور فرانسیسی حکومت کو راضی کرنے کے لئے ہٹلر نے موسیولوال کے
ذریعے سیاسی گفتگو شروع کی اور اسی سلسلے میں اس کی مارشل پے ٹین سے ملاقات
ہوئی ۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ فرانسیسی حکومت اتحاد عمل پر رضامند ہوگئی لیکن
یہ نہیں معلوم ہے کہ یہ اتحاد عمل کن شرطوں پر ہوگا اور کس حد تک ۔ خیال یہ ہوتا ہے
کہ فرانسیسی حکومت جرمنی سے اتحاد عمل کرنے پر راضی ہوگئی ہے ۔ اس میں اسے
کوئی چارہ بھی نہیں ۔ مگر برطانیہ کے خلاف کوئی ایسی کارروائی کرنے پر تیار نہیں
جس سے ظاہر ہو کہ برطانیہ سے اس کی لڑائی ہو گئی ہے ۔

فرانس کو اتحاد عمل کی عادت ہوجائے اور اس کی زندگی راہ پر آجائے تو جرمنی
کا خیال ہے کہ بلجیم ، ہالینڈ اور ناروے بھی اپنی شکست اور جرمنی کے تسلط کو تسلیم کرلیں گے
اور یورپ کی نئی تنظیم کا ایک اور مرحلہ بھی طے ہوجائے گا ۔ بلجیم کے بادشاہ لیوپولڈ سے
ہٹلر نے معاملے کی گفتگو شروع کر دی ہے ۔ لیکن اس کا ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے ۔

(۲) مغربی یورپ کی سیاست یورپ کی نئی تنظیم کا ایک پہلو ہے ۔ اس کا دوسرا
پہلو جرمنی کا ہنگری ، رومانیہ اور بلقان پر تسلط ہے ۔ ہنگری سے اس کو غلہ ، رومانیہ
سے پٹرول اور غلہ ، بلقان سے غلہ اور بھاری صنعت کے لئے کچھ اور ضروری خام
اشیا مل سکتی ہیں ۔ دریائے ڈینیوب جنوب مشرقی یورپ کی سب سے بڑی تجارتی
شاہ راہ ہے اور اس کو کھلا رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ جن ملکوں سے وہ گذرتا ہے
وہ جرمنی کے کہے میں ہوں ۔ جرمنی نے پہلے تو رومانیہ کے دو شمال مشرقی ضلعے جن
پر روس کا دعوےٰ تھا روس کو دلوا دئے اور جنوب مشرق میں ضلع دوبروجا بلغاریہ
کو ، پھر ہنگری کو ٹرین سلوینیا کا بیشتر حصہ دلوا کر اسے خوش کر دیا اور آخر میں جو کچھ
بچ رہا تھا اس پر خود قبضہ کر لیا ۔ اس کے بعد بلغاریہ اور یوگوسلادیہ کی سمجھ میں بھی آگیا

کہ جرمنی کی خوشامد کئے بغیر چارہ نہیں اور وہ بھی جرمنی کی معاشی تنظیم کے ماتحت ہو گئے۔ اس طرح جنوب مشرقی یورپ میں جرمنی نے ایک مورچہ بنا لیا جو فی الحال خاصا مضبوط معلوم ہوتا ہے۔ اس مورچے کی تعمیر میں روس بھی شریک ہوا تھا اور اسے قائم رکھنے میں بھی شریک رہے گا جب تک کہ اس میں جرمنی سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔

(۳) جرمنی کے مغربی اور مشرقی دونوں مورچے ٹوٹ سکتے ہیں اگر برطانیہ جنگ جاری رکھ سکا۔ جرمنی کی دولت اور اس کے جمع کئے ہوئے مختلف قسم کے ذخیروں کا لڑائی سے پہلے جو اندازہ کیا جاتا تھا وہ بالکل غلط نکلا ہے۔ لیکن جنگ جاری رہی برطانیہ اسی طرح جرمنی کے کارخانوں پر حملے کرتا رہا اور امریکہ سے اس کو ضرورت کے مناسب مدد پہنچتی رہی تو جرمنی کے معاشی کرتب کام نہ آئیں گے، اور یورپ کی جو قومیں اس وقت مجبور اور عاجز ہیں سب اس کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوں گی۔ اسی وجہ سے جرمنی نے سمجھ لیا ہے کہ اس کی اصل لڑائی برطانیہ سے ہے۔ اس نے ہوائی حملوں کا سلسلہ برابر جاری رکھا ہے، نومبر سے اس نے برطانیہ کے تجارتی جہازوں کو ڈبونے کے لئے بہت سے آبدوز اور ہوائی جہاز الگ کر دئے ہیں جو دور سمندر میں جا کر اپنا کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب پرانی ترکیبیں ہیں جو بس شروع میں کسی قدر کامیاب ہوتی ہیں۔ خود جرمنی کو بھی ان کے کارگر ہونے پر بھروسا نہیں۔ سنتے ہیں اسی وجہ سے جرمنی نے فرانس کے شمالی ساحل پر ماژی نو لائن اور زیگفریڈ لائن کے سے مورچے بنائے ہیں، کہ فرانس اور بلجیم اور ہالینڈ کے ساحل پر کہیں برطانوی فوجیں اُتاری نہ جا سکیں، لیکن انسانی آزادی کی لہروں کو ایسے مورچے بھی کبھی روک نہیں سکتے۔ بس لہروں کے اُٹھنے کی دیر ہے۔

جنگ کی موجودہ صورت

جیسے ہی فرانسیسی حکومت نے جرمنی سے اتحادِ عمل کا وعدہ کیا، ویسے ہی

اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا (۱۰ نومبر) اس حملہ کا شاید اور کوئی مقصد تھا بھی نہیں سوا اس کے کہ ایک کمزور ملک کو شکست دے کر اٹلی اپنی سیاست کی آبرو بچائے لیکن یہ مقصد پورا نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس اٹلی نے مُنہ کی کھائی۔ یہ ان فوجوں کی خبر لینے کا بہت اچھا موقع تھا جو اٹلی نے سیدی برانی میں جمع کی تھیں۔ مصر کی برطانوی فوج نے ان پر حملہ کر دیا اور وہ ایسی بودی نکلیں کہ کہیں پر مقابلہ بھی نہ کیا، بس جان کو غنیمت سمجھ کر بھاگتی ہی رہیں۔ ثابت قدمی اور جواں مردی کے اس مظاہرے نے اٹلی اور اس کی سیاست کو بالکل بے آبرو کر دیا ہے اور اب اٹلی دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا اگر جرمنی نے اس کی مدد نہ کی۔ لیکن جرمنی اس کی مدد کیوں کرے؟ اٹلی کے سبب سے اس کو فرانس سے سمجھوتا کرنے میں دشواری تھی، اٹلی کے سبب سے یوگوسلاویہ اور ترکی دونوں جرمن سیاست سے بہت بدظن تھے اور اب اس کی شکست سے جرمنی کے بہت سے کام آسان ہو جائیں گے۔ پھر اٹلی کی مدد کرنا بھی کچھ آسان نہیں۔ اٹلی کا بیڑا اس کی فوج سے کچھ کم جاں باز نہیں، جب سے جنگ چھڑی ہے وہ برطانوی جہازوں سے پٹتا یا مُنہ چھپا کر بھاگتا رہا ہے۔ اگر جرمنی اپنی فوجیں اٹلی کو مدد پہنچانے کے لئے افریقہ بھیجے تو ان کی سلامتی کا دارومدار اٹلی کے بیڑے پر ہوگا۔ رومانیہ میں جو جرمن فوجیں جمع ہیں انھیں یونان بھیجنے کے لئے بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کی رضامندی درکار ہے، کیوں کہ فوجوں کو انھیں ملکوں میں سے گذرنا ہوگا اور یہ دونوں ریاستیں جرمنی کو رستہ دینے پر رضامند نہیں ہوں گی، اس لئے کہ ان کا ملک پھر میدان جنگ بن جائے گا۔ یونان میں بھی اٹلی کو اپنی گیدڑ بھبکیوں کی سزا اکیلے بھگتنا ہوگا۔

اٹلی کی سیاست ایک زمانے میں اہمیت رکھتی تھی، اب وہ زمانہ ختم ہو گیا ہے غالبًا جرمنی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر فرانس اور ہسپانیہ سے تعلقات بڑھائے گا

فرانس سے اس کو اتحاد عمل کی جو خواہش ہے اس کے اسباب بتائے جا چکے ہیں، ہسپانیہ سے تعلق بڑھانے کا مقصد یہ ہوگا کہ بحر روم برطانیہ کے لئے بالکل خطرے سے خالی نہ ہو جائے، اور ہسپانیہ جبل الطارق کا مطالبہ کر کے برطانوی جہازوں کی آمدورفت میں خلل ڈالتا رہے۔ لیکن اس کی بھی خبریں آتی رہی ہیں کہ اٹلی میں جرمن فوجیں پہنچا دی گئی ہیں۔ جو ممکن ہے افریقہ بھیجی جائیں اور ممکن ہے یونان۔ جرمنی کے رویے کا صحیح اندازہ ان خبروں کی تصدیق کے بعد ہی کیا جا سکے گا۔

امریکہ اور برطانیہ

امریکہ کی متحدہ ریاستوں کی غیر جانب داری ویسی ہی اصطلاحی ہے جیسے کہ ایک زمانے میں اٹلی کی تھی، یعنی انھیں برطانیہ سے ہمدردی ہے مگر وہ جنگ میں شریک نہیں ہیں، اپنے غیر جانب داری کے قانون سے وہ مجبور ہیں کہ برطانیہ کے ہاتھ جو کچھ بیچیں اس کے دام نقد وصول کریں۔ اب تک تو برطانیہ نقد دام دیتا رہا ہے، یا ایسا سودا کیا ہے جیسے کہ دو سو جنگی جہازوں کے بدلے بحر اٹلانٹک میں چند فوجی مرکز امریکہ کو دے دینا۔ لیکن اب نہ تو نقد دام دئے جا سکتے ہیں نہ کوئی سودا کیا جا سکتا ہے، اور امریکہ کو یا تو اپنا غیر جانبداری کا قانون بدلنا ہوگا یا کوئی اور ترکیب کرنا۔ امریکہ کے مدبر اس کے لئے بھی آمادہ ہیں، اس لئے کہ برطانیہ اس وقت جمہوری اصول زندگی، قومی خود مختاری اور انفرادی آزادی کا مجاہد بنا ہوا ہے اور اس کی مدد کرنا ہر جمہوری ریاست کا فرض ہے۔ امریکہ مدد پہنچانے کا جو طریقہ بھی اختیار کرے، دنیا کی ان دو بڑی جمہوری ریاستوں کا تعلق بڑھتا ہوا ہی نظر آتا ہے۔ ممکن ہے لڑائی کے بعد پھر دونوں الگ ہو جائیں، ممکن ہے ان کی سیاست اور تجارت انھیں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ کر دے کہ پھر وہ علیحدہ نہ ہو سکیں اور ان کے رشتے کی مضبوطی دنیا میں جمہوریت کا سہارا بن جائے۔

جدید اردو کا دوسرا سالنامہ

فروری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوگا

جو

بلند پایہ مضامین، دقیق مقالوں، دلکش افسانوں اور فکری شاہکاروں کا ایک معیاری گلدستہ ہوگا۔ ارباب ذوق اس کی بلند معیاری سے بہت خوش ہوں گے۔ ملک کے مستند شاہیر کی توجہ ہمت افزائی کررہی ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ سالنامہ بنگال کی اردو پرستی کا بھی ایک روشن ثبوت پیش کرے گا۔

اس کے علاوہ

ایسی تصویریں بھی ہوں گی جن میں ارباب نظر کو بنگالی مصوری کے روائتی کمال کا اصلی رنگ نظر آئے گا۔

مدعیان محبت اردو کے لئے یہ ایک بہترین موقع ہے کہ اپنی اردو نوازی کا عملی ثبوت دے کر اہل بنگال کے حوصلے بڑھائیں۔

ایک نادر موقعہ

جو حضرات سالنامہ مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنا سالانا چندہ جنوری ۱۹۴۱ء کی ۱۵ تاریخ تک دفتر جدید اردو میں بھیج کر خریدار ہوجائیں۔

ایجنٹ حضرات کو چاہیئے کہ وہ قبل سے اپنی اپنی فرمائش دفتر جدید اردو میں بھیج دیں، ورنہ ممکن ہے وقت پر حکم کی تعمیل نہ ہوسکے۔

منیجر جدید اردو نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ، کلکتہ

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی، اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چار مینار حیدر آباد (دکن) سے دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صرف فی پرچہ ۸/

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کی خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوئی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ صغر علی محمد علی تاجران عطر خنا بلڈنگ، لکھنو

مختصر تاریخ ادب اُردو

مصنفہ سیّد اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لیکچرار شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی

اردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔ کوئی کتاب امیرؔ و داغؔ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھی بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا شعرا کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی. اور شاید ایسی تو اس وقت کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کسی مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو۔

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اردو کے قدیم و جدید شعرا و نثر نگاروں کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں. تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

کتابت و طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے. حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات مجلد معہ گرد پوش. قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ/۲)

ملنے کا پتہ

منیجر (بکڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

اردو میں بالکل نئی چیز

جنگ آلودہ دنیا

معہ اہم نقشے و چارٹ

مرتبہ۔ پنڈت دینکشن نرائن تیواری

موجودہ جنگ کب اور کیسے شروع ہوئی؛ کس طرح یہ بڑھی اور پھیل گئی؟ کون کون سے ملک اس جنگ میں کس صورت سے حصہ لے رہے ہیں؟ کس ملک کے پاس کتنی بحری، بری، اور ہوائی طاقت ہے اور دنیا کے تمام ممالک مالی تعلیمی، جغرافیائی حالات کے متعلق اگر آپ صحیح معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں جنگ کے متعلق اہم واقعات درج ہیں دوسرے حصے میں نقشوں اور چارٹوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ممالک کا ذکر ہے جس کے تعلق سے بین الاقوامی سیاسی صورت حال بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ تیسرے حصے میں مختلف ممالک کی فوجی قوت، رقبہ اور آبادی درآمد و برآمد، کپاس، سونا، پیٹرول کی پیداوار اور سکوں وغیرہ کے متعلق مفید باتیں درج ہیں۔ جنگ کے زمانے میں جن جن باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ وہ سب اس میں بتادی گئی ہیں ہر شخص کے لئے خواہ وہ متعلم ہو یا معلم۔ اخبار بیں ہو یا اخبار نویس، اس کتاب کی ایک جلد اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو میں آج تک ایسی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ کتابت، طباعت اعلیٰ۔ سرورق دیدہ زیب۔

باوجود ان سب خوبیوں کے قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

آج ہی پتہ ذیل سے طلب فرمائیے

منیجر (بکڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

مقدمہ "زندگانی محمدؐ"

عہد حاضر کی ایک بے مثال کتاب

زندگانی محمدؐ علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہو گئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئیں پھر ایران میں اسکا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے زندگانی محمدؐ کے مقدمہ کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہل مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دیئے گئے ہیں اس کے متعلق مشاہیر جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ زندگانی محمدؐ ایک قابل قدر تالیف ہے (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ زندگانی محمدؐ کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے لبریز ہے میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے۔ مصنف کی کوششیں مستحق اجر و قابل داد ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریا بادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانی محمدؐ) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے (طلوع اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے۔ (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہل مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے (حمایت اسلام)

۱۰۔ ہندوستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے جو اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ (پیام نسواں)

لکھائی، چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا، ضخامت ۱۲۸ صفحے ۱۳ ٹکٹوں کی صورت میں یا بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر (پنجاب)

سہ روزہ

اخبار کائنات قنوج

اخبار کائنات قنوج سید اظہر حسین ہاشمی کی ادارت میں ہر تیسرے روز شائع ہوتا ہے۔ حجم ۲۹×۲۲ ضخامت چھ صفحہ۔ صفحہ اول و دوم پر سہ روزہ سیاسی واقعات وحوادث پر بحث و معلومات، تین و چار پر ہندوستان اور بیرون ہند کی مفصل اور ضروری تازہ ترین خبریں خبروں میں ترتیب اور سہ روزہ واقعات کا تسلسل مدنظر رکھا جاتا ہے۔ صفحہ پانچ یا چھ پر ادبی، سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، تمدن اور مزاحیہ مضامین اور شعراء کے تازہ کلام غرض ہر قسم کے مضامین جو مفید عام ہوتے ہیں، درج کئے جاتے ہیں۔ اخبار کی پالیسی عام پسند اور مقبول عام ہے۔ یعنی نہایت دیانت اور انصاف کے ساتھ ساتھ متانت اور سنجیدگی سے تاریک اور روشن دونوں رخوں کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ طرز تحریر نہایت شستہ، اور پاکیزہ، رطب و یابس، غلط واقعات، بیہودہ خبروں، بیجا حملوں اور رکیک باتوں سے اس کا دامن پاک رہتا ہے۔ کتابت طباعت نہایت صاف اور دیدہ زیب ہوتی ہے۔ اخبار کا اجراء فروری ۱۹۳۶ء میں ہوا تھا۔ اور ۱۵ نومبر ۱۹۴۰ء سے سہ روزہ شائع ہو رہا ہے۔ اخبار اپنی مقبولیت، شہرت اور عام پسندی ہی کی وجہ سے اتنے قلیل عرصہ میں ہفتہ وار سے سہ روزہ ہو گیا۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود بیرونجات کے لئے سالانہ قیمت صرف دعہ، اور ششماہی دعہ، روپیہ ہے فی پرچہ دو پیسہ۔ مقامی سالانہ قیمت صرف دعہ، روپیہ اور فی پرچہ ایک پیسہ ہے۔

مینیجر سہ روزہ اخبار کائنات قنوج

قابلِ دید کتابیں

تاریخ المجوس۔ اس میں ابتدائے آفرینش عالم سے آغاز اسلام تک تمام مذاہب کے تذکرے کہ کس نے کونسا مذہب جاری کیا اور اسکے کون کون لوگ پیرو ہوئے۔ اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوا قابلدید ہے۔ قیمت (عہ)

الملوک۔ اس میں تمام تاریخ یونان و مصر و یونان قدیم ہندوستان کے سلسلہ وار حالات مفصل درج ہیں۔ قیمت عہ

تاریخ فخر البلاد۔ یعنی تاریخ بغداد جس میں اس مشہور شہر کا تمام و کمال جغرافیہ اور مشہور مقالات کی حقیقت اور بنیاد کا زمانہ اور بنانیوالے کے حالات بہ تفصیل درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۶ر

تحفہ عدن۔ عدن اور ملحق اسلامی علاقوں اور وہاں کے باشندوں کے حالات اور رسم و رواج کی سچی کیفیت کو ایک دلچسپ ناول کے سلسلہ میں درج کیا گیا ہے۔ قیمت عہ

آثار الکرام۔ دکن کے متعلق یہ مختصر دلچسپ تاریخی کتاب ہے جس میں مسلمان شاہانِ دکن کے ابتدا سے اب تک مختصر حالات ان کی علم پروری اور اہل فضل و کمال کی قدردانی کے مفصل حالات ان کے درباروں کے نامور شعرا کے کلام کے نمونے، کتاب ہر نوعیت سے قابلدید ہے۔ قیمت ۶ر

فیضی شاعری۔ سنثار الملک شیخ محمد علی صاحب میر احدی اجمیری کے دلچسپ و قابل دید کلام کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر

شرح رُباعیات حافظ۔ خواجہ حافظ شیرازیؒ کی مقبول عام رباعیات کی اردو شرح قابل دید ہے۔ قیمت ۶ر

وجدانی نشتر۔ وجد و حال اور سوز و گداز کا دلفریب مجموعہ اپنی طرز کی لاثانی کتاب ہے۔ ڈاکٹر اقبال اور خواجہ حسن نظامی نے اس کی بے حد تعریف کی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

ملنے کا پتہ: **منیجر رہنما بک ایجنسی محلہ مفتی ٹولہ مراد آباد**

ادارۂ ادبیات اُردو کی نئی کتابیں

نمود زندگی۔ جناب سید علی منظور صاحب حیدر آبادی کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ جو نہایت سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۷۱) غزلیں اور (۵) رباعیاں ہیں سید علی منظور صاحب حیدر آباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدر دان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اور اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں ہے جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالہ سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ صفحات (۲۱۲) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

انوار۔ جناب علی اختر صاحب کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پُرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ ان کے کلام ہندوستان کے بلند پایہ معیاری رسالوں مثلاً نگار، ہمایوں، ادبی دنیا اور شاہکار وغیرہ میں شائع ہو کر کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اس مجموعہ کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ قیمت (عہ)

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدرآباد دکن

طالب بنارسی کی نظموں اور خطوط کی ضرورت

محترمی۔ اسلام علیکم۔ میں منشی نانک پرشاد صاحب طالب بناری کی نظموں کا ایک مجموعہ برائے اشاعت تیار کر رہی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اس میں ان کے خطوط بھی شامل ہوں۔ مرحوم ایک بہت بلند پایہ شاعر تھے، ان کا کلام بہت نایاب ہے اور اس کے جمع کرنے میں مجھے بہت دقتیں پیش آرہی ہیں۔ جن حضرات کے پاس اردو کے پرانے رسالوں کے فائل موجود ہیں، وہ طالب بنارسی کی نظمیں ان سے نقل کروا کر یا اس کے علاوہ ان کی کوئی نظمیں، یا ان کے خطوط کے اصل یا نقلیں مجھے مندرجہ ذیل پتہ پر بھجوا سکیں، میں ان کی بےحد ممنون احسان ہوں گی، میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ مرحوم کے ایسے عزیزوں کے پتے مجھے مل جاویں جن سے طالب کا کلام یا ان کے خطوط مل سکنے کا امکان ہو۔ جو حضرات ایسے پتے بھیج سکتے ہوں، وہ بھی مجھے بہت مشکور فرمائیں گے

سلیمہ بیگم، بنت ملک محمد اسلم خاں صاحب ایم اے (کیمبرج)، بیرسٹرایٹ لا
کوٹھی "الفیض" ۶۔ ایٹن روڈ، لاہور

مومن گزٹ کانپور

آل انڈیا مومن کانفرنس کا واحد آرگن

چار کروڑ انصاریان ہند (مسلم پارچہ باف برادری) کا واحد ترجمان ہے آٹھ کروڑ کی تعداد رکھنے والی (مسلم پیشہ ور برادریوں) کے سیاسی، معاشی اور تعلیمی حقوق کا سچا محافظ اور حامی ہے۔

"نسبی نسلی رذالت اور شرافت" کی اسلامیت کش ذہنیت مٹانیوالا اور حقیقی مساوات اسلام کی تعلیم دینے والا ہے۔

مومن گزٹ میں "مومن تحریک" اور مسلم پیشہ ور برادریوں کی جماعتی تنظیم کی مکمل کاروائیاں ہوتی ہیں، علمی اور ادبی مضامین کی چاشنی اور ہفتہ بھر کی خبروں کا بہترین خلاصہ اور اس پر مفید نوٹ ہوتے ہیں۔

سالانہ قیمت تین روپئے۔ نمونہ مفت ذیل کے پتہ سے منگائیے

مینیجر مومن گزٹ ہفتہ وار کانپور

اگر آنکھیں کمزور ہیں

آنکھیں تھوڑی دیر کے بعد تھک جاتی ہوں، ان کے سامنے اندھیرا آجاتا ہو، حروف دھندلے نظر آتے ہوں، پانی بہتا ہو، سر میں خفیف درد کی شکایت ہو۔ ابتدائے نزول الماء یا موتیا ہو تو مدنی دواخانہ کا خصوصیت کے ساتھ تیار کردہ کحل الجواہر مشکی فوراً استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ دو چار دن کے بعد ہی آپ کو اس سرمہ کی خصوصیات کا اندازہ ہو جائے گا۔ قیمت فی تولہ چھ روپے علاوہ محصول ڈاک

دانتوں کی بیماریوں سے بچئے

اگر مسوڑھے متورم ہو جاتے ہیں — اگر مسوڑھوں سے پیپ نکلتی ہے

اگر دانتوں سے خون نکلتا ہے — اگر منہ سے بدبو آتی ہے

اگر منہ سے بدمزہ رطوبت جاری رہتی ہے۔ — اگر دانتوں پر سردی اور ترشی کا اثر ہوتا ہے۔

اگر دانت گندے اور میلے رہتے ہیں تو

فوراً پایوری استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ ورنہ معدہ خراب ہو کر تندرستی بالکل خراب ہو جائے گی۔ قیمت شیشی ایک روپیہ، علاوہ محصول ڈاک پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا

شربت اطفال

شربت اطفال لطیف اور خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بیحد مفید ہے۔ نمونیہ یعنی ڈبا یا پسلی چل جانا۔ موتی جھرہ، خسرہ، چیچک، قبض، دستوں کا آنا، آنکھیں دکھنا۔ دانتوں کے نکلنے میں تکلیف ہونا ان سب امراض کے لئے شربت اطفال اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ہوگا۔

ملنے کا پتہ: مینیجر مدنی دواخانہ۔ مدینہ منزل بجنور

حلوائے مغزی

ضعف دماغ ایسا مرض ہے جو ابتدا میں تو مریض کو کسی خاص تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا لیکن رفتہ رفتہ اس کے اثرات زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ یہ مرض بالعموم تعلیم یافتہ طبقہ کو اور بالخصوص دماغی محنت کرنے والے لوگوں کو لاحق ہوتا ہے رفتہ رفتہ اعضا میں کمزوری اور بینائی میں کمی ہو جاتی ہے زیادہ دیر تک لکھنے، پڑھنے، سوچنے سمجھنے اور دھوپ میں رہنے سے دماغ چکرانے لگتا ہے۔ اگر اس مرض کے مریض خواہ وہ ابتدائی اسٹیج پر ہوں یا مذکورہ بالا تمام خرابیوں کا شکار ہو چکے ہوں "مغزی" کا استعمال کریں گے تو اس سلسلہ کی ہر شکایت دور ہو جائیگی۔ مغزی دماغ کے لئے ایک ایسا ٹانک ہے جو ہر حال میں بے انتہا مفید ثابت ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے اعضاء رئیسہ کو بھی کافی تقویت پہنچاتی ہے۔ قیمت فی سیر ۵ روپئے۔ علاوہ محصول ڈاک۔ خوراک ایک تولہ

اکسیر معدہ

فی زمانہ پچانوے فیصدی اشخاص ریاحی امراض میں مبتلا ہیں خصوصاً وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جو دماغی کام بھی کرتا ہو اور مرغنیات زیادہ استعمال کرتا ہو ان لوگوں پر یہ اکسیر پچانوے فیصدی کامیاب ثابت ہوئی ہے چنانچہ درد معدہ ریاحی۔ درد گردہ ریاحی۔ بواسیر ریاحی خندیوم کے استعمال سے زائل ہو جاتی ہے۔ قیمت فی شیشی ۴۸ قرص آٹھ آنے (۸) علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ روانہ ہوگا۔

آب شفا

یہ آب شفا بے شمار امراض کے لئے نہایت زود اثر اور قابل اعتماد دوا ہے۔ اس کی ایک شیشی ہر انسان کو سفر و حضر میں اپنے پاس رکھنا گویا ایک طبیب یا ڈاکٹر کو ساتھ رکھنا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸) علاوہ محصول ڈاک۔ ایک درجن کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ روانہ ہوگا۔

ملنے کا پتہ: منیجر مدنی دواخانہ۔ مدینہ منزل۔ بجنور

ندوۃ المصنفین کی نئی کتابیں

غلامانِ اسلام۔ تالیف مولانا سعید احمد صاحب ایم اے مدیر "برہان"۔ اس کتاب میں ان بزرگان اسلام کے سوانح حیات جمع کئے گئے ہیں جنھوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں ہیں اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی، اصلاحی اور سیاسی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی نام نہاد غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق حاصل ہے، اور جن کو اسلامی سوسائٹی میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا ہے۔

حالات کے جمع کرنے میں پوری تحقیق و کاوش سے کام لیا گیا ہے، اور یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی محققانہ، مفید دلچسپ اور معلومات سے لبریز کتاب اس موضوع پر آپ کی زبان میں شائع نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے صفحات ۵۵۲ تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت مجلد سنہری صہ غیر مجلد للعہ رعایتی غیر مجلد للعہ

اخلاق اور فلسفہ اخلاق تالیف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی علم اخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب، جس میں تمام قدیم و جدید نظریوں کی روشنی میں اصول اخلاق اور فلسفہ اخلاق اور انواع اخلاق پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس کے لئے ایک مخصوص اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے، اس کے ساتھ اسلام کے نظام، اخلاق کی تفصیلات کو ایسے دلپذیر انداز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ جس سے اسلامی اخلاقیات کی برتری دنیا کے تمام اخلاقی نظاموں کے مقابلہ میں روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے ہماری زبان میں اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں تھی، جس میں ایک طرف علمی اعتبار سے اخلاق کے تمام گوشوں پر مکمل بحث ہو اور دوسری طرف اسلام کے ابواب اخلاق کی تشریح علمی نقطۂ نظر سے اس طرح کی گئی ہو کہ اسلام کے ضابطۂ اخلاق کی فضیلت تمام ملتوں کے ضابطہائے اخلاق پر ثابت ہو جائے۔ اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی ہے۔ اور اس موضوع پر ایک بلند پایہ کتاب سامنے آ گئی ہے۔ صفحات ۵۰۰ قیمت مجلد سنہری صہ غیر مجلد للعہ۔ رعایتی غیر مجلد للعہ

ملنے کا پتہ

ندوۃ المصنفین، قرولباغ نئی دہلی

مطبوعات جامعہ

خطوط محمد علی:- مولانا محمد علی کی زندہ جاوید اور عظیم الشان شخصیت کا ایک صفحہ تو آپ مضامین محمد علی میں ملاحظہ فرما چکے ہیں قوم کی شخصیت کا دوسرا صفحہ خطوط محمد علی میں دیکھئے۔

بزرگوں کا وفادار اور نیاز مند، دوستوں کا جان نثار اور عاشق زار، بے باک اور بے ریا، ظاہر و باطن میں کھرا، حق کی خاطر اپنوں اور بیگانوں دونوں کی پروا نہ کرنے والا، اور مرتے دم تک اپنے اصولوں پر راسخ القدم محمد علی ——— یہ خطوط اسی محمد علی کی تصویر ہیں قیمت مجلد ۶؎

ناموران سیاست:- موجودہ جنگ کی وجہ سے ہر شخص کو سیاسی معاملات سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ ہٹلر، مسولینی، روزولٹ، اسٹالن، چرچل اور عصمت انونو ہر شخص کی زبان پر بستے ہیں ان کے حالات سے ناواقفیت کی بنا پر معاملات صحیح طور پر سمجھنے میں کبھی کبھی دشواری پیدا ہوتی ہے اس کتاب میں ایشیا اور یورپ کے انھی مسلمہ سیاسی رہنماؤں کے حالات درج ہیں۔ اس میں بہت سے ایسے لوگوں کے حالات بھی ملیں گے جو غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن اپنی ہمت کی رہنمائی سے آج بڑی بڑی سلطنتوں کے مالک ہیں اور چھوٹی سلطنتوں کی آزادی ان کے رحم و کرم پر موقوف ہے قیمت حصہ اول ۶ر۔ حصہ دوم "مشاہیر عالم" زیر ترتیب ہے۔

ٹروٹسکی:- مترجمہ ایم ایم جوہر۔ ٹروٹسکی کو کون نہیں جانتا۔ موجودہ روسی حکومت نے اسے باغی قرار دے دیا تھا اس کے جو ساتھی اب تک روس میں موجود تھے ۱۹۳۶ء میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ان مجرموں نے اپنے جرم کی ذمہ داری ٹروٹسکی پر ڈال دی۔ ٹروٹسکی کی صفائی اور غداری کی خاطر امریکہ میں ایک کمیشن بٹھایا گیا جس نے ٹروٹسکی کے بیانات لئے۔ یہ کتاب انھی بیانات کا خلاصہ ہے۔ اس میں ان تمام کارناموں کا کچا چٹھا ہے جو روس میں اشتراکیت کے پردے میں کئے جا رہے ہیں۔ شروع میں روسی انقلاب کی مختصر سی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ زبان اتنی صاف اور سہل ہے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی اچھی طرح ذہن نشین کر سکتا ہے۔ قیمت ۱۰ر

ہندوستانی کھیل:۔ مصنفہ الطاف علی صاحب نگران ورزش جسمانی، جامعہ۔ ان کھیلوں کو ترتیب دیتے وقت مصنف کے پیش نظر وہ ہندوستانی بچے ہیں جن کی عمر سات اور چودہ سال کے درمیان ہے اور جو نئی تعلیمی اسکیم کے ماتحت تعلیم پا رہے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کھیل ایسے ہیں جن کے لئے کسی خاص سازو سامان کی ضرورت نہیں ہے اور جو بہت معمولی سامان کے ساتھ کسی جگہ بھی کھیلے جاسکتے ہیں۔ یہ کھیل بچوں کے لئے جسمانی اور ذہنی ہر لحاظ سے بہت مفید ہیں۔ قیمت ۸؍

بنیادی دستکاریاں:۔ اوٹنا۔ دھننا۔ یہ کتاب دفتر نئی تعلیم دہلی سے شائع کی گئی ہے مصنف نے اختصار کے ساتھ اوٹنے اور دھننے کے بارے میں بہت مفید اور کام کی باتیں بتائی ہیں، کتائی کرنے والوں کے لئے ان کا جاننا ضروری ہے۔ قیمت ۶؍

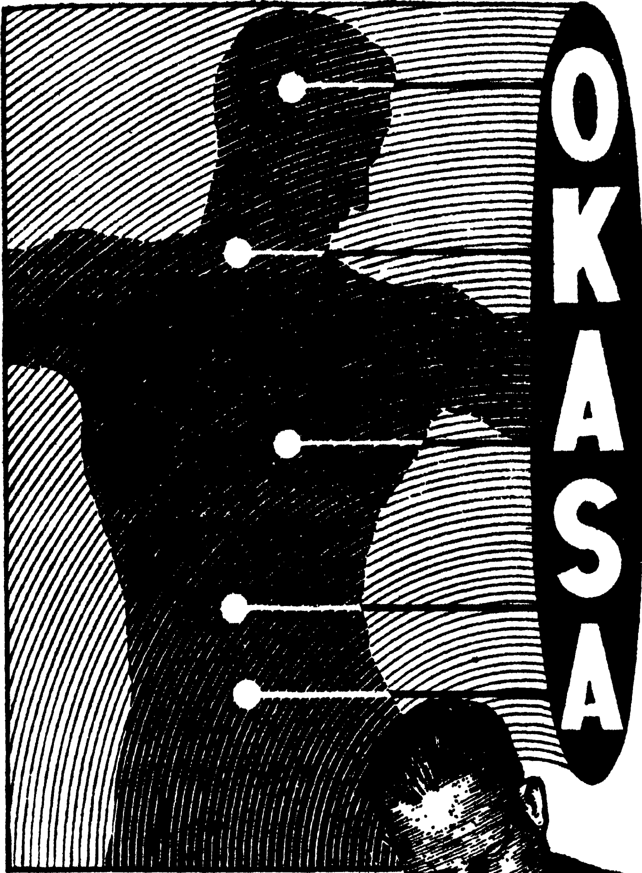
بت تراش:۔ از پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ اس ڈرامے میں مصنف نے ایک بت تراش کی نفسی کیفیات کی تصویر گری کی ہے اور اسی سلسلے میں حسن و عشق اور دنیا کی تخلیق میں رنج و مسرت کے وجود پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی ہے۔ انداز تحریر اس قدر دل کش ہے کہ پڑھنے والا مصنف کی نظر سے دیکھتا اور اسی کے دماغ سے سوچتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قیمت ۴؍

بچوں کی کتابیں

مزے دار پہیلیاں:۔ از محمود علی خاں صاحب جامعی۔ ہندوستان میں رات کے وقت کہانیاں کہنے اور پہیلیاں بوجھنے کا رواج شاید ہمیشہ سے ہے ان پہیلیوں کی بدولت بچوں اور بڑوں کو چیزوں کی حقیقت جاننے کا شوق اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اس کتاب میں پہیلیاں اور اس ضمن کی تمام چیزیں مکرنیاں دوسخنے، نسبتیں، انمل ڈھکوسلے وغیرہ جمع کر دئے گئے ہیں پہیلیوں کی بوجھ آخر میں ہے مشکل لفظوں کے معنے بھی آخر میں ہیں قیمت ۱۲؍

بچوں کا البم:۔ از محمود علی خاں صاحب جامعی تصویریں جمع کرنا بچوں کو سب سے زیادہ مرغوب ہے۔ اور اس کا تعلیمی فائدہ بھی سب سے زیادہ ہے۔ اس خیال سے یہ البم شائع کیا جا رہا ہے اس کے ذریعے سے ہندوستان کی تمام ضروری اور خاص خاص چیزوں سے بچوں کو روشناس کر دیا ہے قیمت ۸؍

مکتبہ جامعہ قرولباغ دہلی


OKASA

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم سے اُردو دُنیا اچھی طرح واقف ہے ان کا پہلا کارنامہ دیوان غالب (نسخۂ حمیدیہ) کا دیباچہ ہے۔ اسی کی بدولت اُنھوں نے اُردو داں طبقے میں مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اپنی علمی قابلیت اور زبان آوری کی بدولت ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، طرزِ تحریر میں اُنھوں نے اپنی ایک الگ اور مجتہدانہ راہ نکالی تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور علمی مباحث میں بھی شگفتگیٔ زبان ہاتھ سے نہ جانے پاتی تھی۔ یہ جواہر ریزے جو ایک طرح سے ان کے علمی و ادبی تبرکات ہیں، صرف ادب و زبان کی حیثیت سے قابلِ قدر نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض اہم علمی و معاشرتی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے مکتبہ جامعہ نے اس کی ظاہری نمود پر بھی بہت توجہ صرف کی ہے پوری کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، جلد اور گرد پوش نہایت دیدہ زیب۔ قیمت دو روپئے آٹھ آنے (۸؍۲)

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

خطوطِ محمدؐ علی

مولانا محمد علی کی زندۂ جاوید اور عظیم الشان شخصیت کا ایک صفحہ تو آپ مضامین محمد علی میں ملاحظہ فرما چکے، مرحوم کی شخصیت کا دوسرا صفحہ "خطوط محمد علی" میں دیکھئے۔

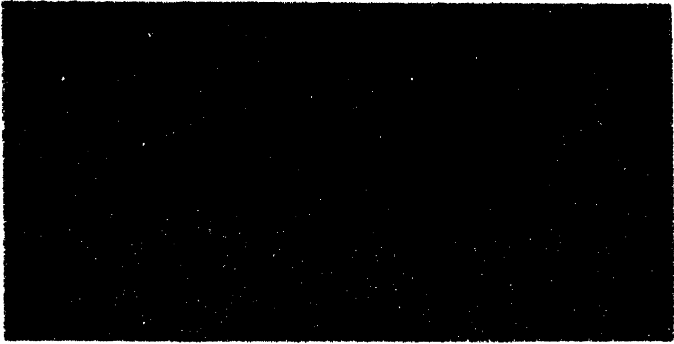
مضامین مرحوم کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا مرقعہ ہے اور خطوط آپ کی شخصی اور باطنی زندگی کے آئینہ دار۔ محمد علی کی یہ زندگی بیحد تابناک اور بلند تھی، اس لئے خطوط کا یہ مجموعہ مرحوم کی بہترین متاع ہے۔ بزرگوں کا وفادار اور نیازمند، دوستوں کا جانثار اور عاشق زار بیباک اور بے ریا، ظاہر و باطن میں کھرا۔ حق کی خاطر اپنوں اور بیگانوں دونوں کی پروا نہ کرنے والا۔ اور مرتے دم تک اپنے اصولوں پر راسخ القدم محمد علی —— یہ خطوط اسی محمد علی کی تصویر ہیں۔

قیمت دو روپے

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی



مکتبہ جامعہ دہلی

ہندوستانی کھیل

مصنفہ الطاف علی صاحب نگراں تربیت جسمانی ، جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کم زور ہوتے ہیں اور ان کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو ان بچوں میں ملتی ہے جنھیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ۴ سے ۷ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کر سکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک وملت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب وفراز میں اس پر اعتماد کیا جاسکے گا۔ مصنف نے انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں درج کئے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۴ نمبر ۲ | بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

براہِ کرم

اس صفحہ کی پشت پر رسالہ سے متعلق ایک
ضروری نوٹ ملاحظہ فرمائیے۔ "مینجر"

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

ضروری اطلاع

رسالہ جامعہ کی روانگی کے متعلق چند اہم گذارشیں درج ذیل ہیں :۔

۱۔ رسالہ جامعہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے جو تمام خریداروں کو ۷ تاریخ تک ضرور پہنچ جاتا ہے۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ براہ کرم ۱۵ تک خط لکھ کر دفتر سے دوبارہ منگالیں ۱۵ تاریخ کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جائے گا۔

۲۔ اس ماہ سے تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہوگئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری ہر رسالہ پر پتے کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ براہ کرم اسے کسی یادداشت میں نوٹ فرمالیجیے۔

۳۔ آیندہ ماہ تمام خریداروں کے پتے مع نمبر خریداری چھپ جائیں گے جو صاحب پتوں میں کچھ تبدیلی کرانا چاہیں زحمت فرماکر ۱۵ فروری تک دفتر کو اطلاع دے دیں خط میں نئے نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیا جائے ورنہ پتے میں ردّ و بدل کرنے میں ہمیں غیر معمولی دشواری ہوگی۔

۴۔ خطوط اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا نمبر خریداری ہمیشہ تحریر فرمائیے۔ جو خط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے ان کی تعمیل سے دفتر قطعاً معذور ہوگا جس سے غالباً آپ کو بھی شکایت ہوگی اور ہمیں بھی رنج ہوگا۔

مینجر رسالہ جامعہ، دہلی

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی۔ مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے تحت درج کی گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

سائنس[1] اور مذہب

آج ہم تاریخ کے بڑے ہیجانی دور میں سانس لے رہے ہیں صحیح معنوں میں اس کو انقلابی زمانہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ہم اپنی روحانی اور مادی تہذیب کے ہر شعبہ میں ایک نازک نقطہ پر پہونچ گئے ہیں اور اس ڈرامہ میں جو اپنے عروج کے قریب پہونچ چکا ہے ہم بیک وقت اداکار بھی ہیں اور تماشائی بھی۔ اس تماشاگاہ عالم کی سحر آفریں رنگینیوں میں شاید خاص اداکار سائنس ہے جو ہمارے متمدن عہد کے تمام کارناموں کے پیچھے سب سے بڑا محرکیاتی عنصر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے عظیم الشان ایجادات اور انکشافات، اس کے زندگی کے نئے رجحانات۔ اس کے اخلاقی اور روحانی توقعات نے انسان میں ایک نئی جان ڈال دی ہے موجودہ زمانے میں خیالات اور نظریے کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اور فرسودہ معتقدات اور مروجات کا گرد و غبار جو ہماری زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھا اس کی تابناک روشنی میں چھٹتا نظر آتا ہے۔

سائنس ایک نئے مذہب، نئی سماج اور نئے ادب کی تخلیق کر رہی ہے اور سچ تو یہ ہے اس کی کوشش ایک نئے انسان کا عالم وجود میں لانا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنس کا یہ تفاعل انسانی تصورات اور نظریوں پر کیونکر اثر انداز ہوا۔ کس طرح سماج، مذہب اور تمدن اپنے موجودہ درجوں تک پہونچے ہیں اور پھر سائنس کس انداز میں ان کی صورت گری کر رہی ہے؟ سائنس ہمیشہ ایک ناقدانہ اور غیر متعصبانہ طرز عمل کی سفارش کرتی آئی ہے جس کی بے لاگ خارجیت کسی سے خواہ مخواہ مرعوب نہیں ہوتی۔ دنیا کے وسیع علوم کے خزانہ میں غالباً یہ اسی کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

ہر جاندار شے پر دو قسم کے ماحولی اثرات کا عکس پڑتا ہے۔ ایک خارجی یا جسمانی اور دوسرا داخلی یا روحانی ہم انھیں دو ماحولوں کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ اسی خارجی عنصر کے ذریعہ ہم بیرونی دنیا سے وابستہ رہتے ہیں

---

[1] اس مقالہ میں تمام مذہبی اعتقادات اور روایات سے قطع نظر کر کے خالص عقلی اور استدلالی پہلو سے گفتگو کی گئی ہے

مگر ہم اپنی اس اندرونی حکومت میں "شدید انفرادی" حیثیت رکھتے ہیں جہاں ہم اپنے وجود کے الگ الگ مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ان دونوں کے سناروں میں ان کے اپنے قوانین اور ضروریات کی حکومت ہے سائنس طبیعاتی نظام میں ربط پیدا کرتی ہے اور فطرت کو تسخیر کر کے ہماری جسمانی آسائش کی جانب متوجہ ہوتی ہے۔ اور مذہب ہماری داخلی دنیا پر حاوی ہونے کے باعث ہماری اخلاقی فلاح کا ذمہ دار بنتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ یہ دونوں نظام جو ہماری زندگی کی دو مختلف طریقوں سے رہنمائی کرتے ہیں۔ جیسے ایک سوت دو الگ الگ راستوں سے بہہ کر ایک ہی خطہ زمین کو سرسبز و شاداب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے میں ہم آہنگی نہ پیدا کریں اور انسان کی ہمہ گیر ترقی میں اضافہ نہ کریں۔

یوں اپنی عمومی حیثیت میں سائنس اور مذہب میں کسی طرح کا تصادم رونما نہیں ہوتا۔ مگر سائنس اس مذہب سے ضرور دست و گریباں نظر آتی ہے جو رواجی معتقدات کے خوفناک ڈھانچہ کے سوا اور کچھ نہیں سائنس بذات خود صداقت اور سچائی کے اصول کی ترویج کرتی ہے جو تمام سچے مذاہب کے بنیادی اصول ہیں۔ مذہب کے اس اخلاقی پہلو پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ سائنس ہمیشہ مذہب سے جھگڑا مول لیتی ہے درست نہیں۔ سائنس کبھی یہ تبلیغ نہیں کرتی کہ "کبھی سچ نہ بولنا چاہیئے" یا "دوسروں کی خدمت کرنا ٹھیک نہیں" یا "بنی نوع انسان کو تباہ کر دینا چاہیئے"۔ بلکہ اس کے برخلاف جہاں تک اخلاقی اور طبیعاتی بہتری کا تعلق ہے سائنس ہمیشہ مذہب کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کے لئے تیار رہی ہے پس ہمیں اس تصادم کا سبب کہیں اور تلاش کرنا چاہیئے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور مذہب میں کشمکش کا بنیادی سبب خدا کا تخیل ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنس کے پرستاروں میں سے اکثر دہریئے ہیں اور تمام بڑے بڑے مذاہب (سوائے بدھ مت کے جیسا کہ مہاتما بدھ کی تعلیم سے ظاہر ہوتا ہے) سب کے سب خدا یا دیوتاؤں کا سہارا خاص طور پر ڈھونڈتے ہیں۔ خداوندی تصور کا ارتقا، اپنی مختلف منزلوں میں حد درجہ رنگین نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس میں انسانی شعور کی داستان پنہاں ہے۔

انسان اس دور سے گذر چکنے کے بعد جس میں وہ ہوا اور سورج، بارش اور گرج کے سامنے حیوانوں

کی طرح سربسجود ہوتا تھا، بظاہر خدا کا کوئی تصور قائم نہ کر سکا تھا۔ اسے ایک بے حس احساس کے ساتھ بعض طاقتوں اور اثرات یعنی منتروں اور جادوؤں کا اعتراف تھا۔ جو اس کے نزدیک قدرت کے جلوؤں میں چھپے ہوئے اور طلسماتی طور پر بعض چیزوں اور حرکات میں خوابیدہ تھے۔ بیپونا اور پولینیا کے علاوہ نہ جانے کتنے چھوٹے چھوٹے گروہ اب بھی انھیں فرسودہ اعتقادات کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ جب اس کی ہستی کے دھندلے اثرات بڑھتے گئے تو اس نے ان شخصیتوں کے مابین مطابقت پیدا کر لی جس سے اسے دوچار ہونا پڑا تھا بعد میں یہی شخصیتیں مختلف دیوتاؤں کی شکلوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ توہم پرستی پیدا ہوتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد یہ اصنام پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ارتقاء کی منزلوں میں اس کے بعد وحدانیت کا درجہ ہے۔

خدا یا دیوتاؤں کے اس تصور کے چاروں طرف سادھوؤں اور پیروں کا ایک گروہ اکٹھا ہو جاتا ہے ان کی زندگیاں، ارشادات، شعائر ظاہری اور مراسم سب مل کر ترویج مذہب کے میدان کو وسیع کرنے میں امداد کرتے ہیں پھر قدرت قوم میں ایک پیغمبر بھیجتی ہے جس کی آتش بیانی کا سیلاب پچھلے اعتقادات کو خس و خاشاک کی طرح بہا لیجاتا ہے اور قوم کو ایک مطمح نظر پر متحد کر دیتا ہے اور خدا یا دیوتاؤں کا تخیل ہمیشہ اس مطمح نظر کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے بعد خدا انسانی فطرت کی تمام خوبیوں —— نیکی، حقانیت اور حسن —— کا سرچشمہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ مذہب کی یہ سادہ صورت اپنی جگہ بڑی پاکیزہ چیز ہے کیونکہ یہ عوام کی جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کے ابھارنے اور چمکانے میں امداد کرتی ہے۔ دہریت اپنی عملی صورت میں ایک دودھاری تلوار کا سا کام کرتی ہے چند ہی آدمی ایسے ہوں گے جو ایک طرف سچے دہریئے ہوں اور دوسری طرف اخلاق کی کسوٹی پر بھی پورے اتریں ایک عمومی انسان جب خدا کا قائل نہیں رہتا تو وہ اپنے وجودی مقام سے ہٹ جاتا ہے اور کسی طاقت کا سہارا اس کی جسمانی اور اخلاقی عمارت کے کھنڈر کو گرنے سے نہیں روک سکتا

اگر کوئی مذہب اتنا سادہ ہو یا یوں کہنا چاہیئے کہ اپنی عملیت میں اتنا سادہ نظر آئے تو شاید سائنس اور مذہب میں کوئی وجہ مخالفت باقی نہ رہے۔ لیکن کوئی مذہب کم از کم اپنی ظاہری صورتوں میں اس حد تک سادہ اور مکمل دکھائی نہیں دیتا مروجہ توہمات تعصب مذہبی پیشواؤں کی خود غرضانہ مصلحتیں اور دوسرے مذاہب کے

نظاموں سے جنگ آزمائیاں ان سب بحرانی اثرات نے ہر مذہب کی اصلی صورت مسخ کر کے اس کو ملبوسات اور رسوم کا احمقانہ اور پیچیدہ گھروندہ بنا دیا ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اصنام پرستی کے دور تک خدا کا تصور پیدا ہوا اور اب دیکھنا یہ ہے کہ سائنسی فکر یہ نے اس پر کس طرح اثر اندازی کی ہے؟ فرانسس بیکن اور گیلیوان مردان مجاہد میں سے ہیں جنہوں نے فکری آزادی کی راہ میں روشنی دکھائی ہے سائنس کی تحقیقات اور مشاہدات کو مختلف مذہبی نظاموں کے مسلمہ عقائد سے دوچار ہونا پڑا۔ مذہب کے سچے اور پر خلوص پرستاروں نے ان باغیانہ خیالات کو روکنے کی سختی سے کوشش کی۔ گیلیو اور برونو اور ایسے ہی کتنوں کو اپنے "بلند آہنگی سے سوچنے" کے جرم میں بڑی گراں قیمتیں ادا کرنی پڑیں۔ کیونکہ مذہبی مطلق العنانی کی بارگاہ میں یہ بڑا ہولناک جرم سمجھا گیا۔ مگر یہ سب سختیاں اور مظالم جو مذہب کے پردہ میں ہوئے عقل پرستی کی اس آنے والی روح کو پژمردہ نہ کر سکے۔ "نشاۃ ثانیہ" کا دور آیا اور اس کے سایہ عاطفت میں ذہن اور دلیل کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور کسی طرح کی جیرہ دستی انسان کی اس ازلی پیاس کو بجھا نہ سکی۔ سائنسی روح عالم وجود میں آجانے کے بعد روشن خیال طبقہ نے مذہب کے آہنی بندھنوں کو توڑنا شروع کر دیا اور صدیوں کی دست اندازی کے خلاف گویا احتجاجی طور پر انھوں نے خدا کے تصور کو بھی ایک ڈھکوسلا قرار دے کر مسترد کر دیا۔

مگر اس بیسویں صدی میں پھر خداوندی تخیل نے حیرت انگیز طور پر نئے سرے سے جنم لیا ہے پہلی فتحمندی کے نشہ کے بعد سائنسدانوں میں زیادہ سنجیدگی اور ذہنی روحانیت پیدا ہو گئی۔ ایک متمدن سائنسداں جتنا زیادہ کائنات کی پہنائیوں میں اپنے آپ کو کھو دیتا ہے۔ اسی قدر وہ ریاضیاتی صحت سے زیادہ متعجب ہوتا ہے اور علت و معلول کا جچا تلا تعلق اسے اس حد تک انگشت بدنداں کرتا ہے کہ اس کو ہمیشہ کے لئے ہر چیز میں ایک بنیادی قانون اور منشا کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ایک ممتاز سائنسداں کے الفاظ میں خواہ اسے قوت کہا جائے یا رہنمایانہ عنصر یعنی دوسرے معنوں میں خدا، مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس کائنات کی ہر چیز میں ایک غرض اور ایک منشا کی کارفرمائی ہے۔"

حیاتیاتی نقطہ نظر سے بھی کسی خالق کے تصور کے باقی رکھنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کہ سائنس "زندگی"

کی تخلیق میں ناکام رہتی ہے "فطرت محض" کا نظریہ جو ایک زندگی سے دوسری زندگی اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے اب تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پھر اسی خیال کی روشنی میں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اولین زندگی پھر کس واسطہ سے پیدا ہوئی؟ ایک سائنسداں نے کہا "اگر مجھے اولیں مادہ اولیٰ دیدیا جائے تو ارتقا کے ایک سادہ عمل کے ذریعہ سے میں زندگی کی سب سے مختلف النوع شکل پر پہونچ جاؤنگا" حیاتیات کے ایک فرانسیسی عالم نے یہ انوکھا نظریہ پیش کیا ہے کہ دنیا کی اولین زندگی پہلے آسمانی اجرام میں سے کسی پر قائم تھی جس سے ایک دفعہ زمین اتصال میں آئی اور پھر اس کو جاندار حلیہ ملا لیکن یہ سب ایسا ہی ہے کہ سوال کو دلیل سمجھ کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیا جائے اور اس کو زمانہ کے پھیلاؤ سے ایک قدم اور پیچھے ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ یہ مسئلہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ "زندگی" اس سرکش کرہ پر کس طرح نمودار ہوئی؟ سائنس اس کا جواب دینے میں ساکت نظر آتی ہے۔ خدا کے مبحث پر اس کو خاموش رہنا ہی آسان نظر آتا ہے کیونکہ وہ اس کا اقرار کر سکتی ہے اور نہ انکار جیسا کہ ایک مصنف نے کہا ہے سائنس کی صحیح دعا یہ ہوگی "اے خدا ... اگر اس کا وجود ہے، میری روح کو بچا ... اگر یہ کوئی چیز ہے ..." کیونکہ روح ایک دوسرا معلول ہے جس کے وجود کے متعلق سائنس نے خموشی کو دانشمندی سمجھا ہے۔

گر پھر بھی یہ تفاوت سائنس اور مذہب کے مابین کوئی تصادم پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر آج تمام مذاہب کے مختلف نظام اپنے بے عقل اصولوں اور اوہام پرستیوں، دقیانوسی خیالوں اور بیہودہ ظاہرداریوں کی اصلاح کی کوشش کریں اور اصول اخلاق اور انسانی بھلائی کے دامن عاطفت میں سکون کی تلاش کریں تو شاید خدا اور روح کے مسئلہ میں اتنی پیچیدگی باقی نہ رہے۔ سائنس کے بنیادی اصول مادہ اور قوت ہیں۔ ان کا کھوج لگانے کیلئے ایک سرچشمہ کی تلاش ضروری ہے۔ سائنسدانوں کو حقیقت میں فی الحال خدا کے وجود پر نہ اعتراض ہے اور نہ ہو سکتا ہے

مگر اصل تصادم سائنس کے تحکمانہ طرز عمل اور مذہبی عقائد کے فرسودہ اصولوں اور روایات کو آنکھیں بند کر کے مان لینے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے بہت سے سائنسداں اپنی ابتدائی فتحمندیوں کے پندار میں یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے کہ انسان کا داخلی یا روحانی ماحول خود اپنے قوانین کی رہنمائی میں کام کرتا ہے اور سائنسی قوانین جو خارجی طاقت پر حکمرانی کرتے ہیں وہاں اسی درجہ پر جائز قرار نہیں دیے جا سکتے۔ روحانیت کی موجودہ تحقیقات اور تحلیل نفسی نے ان قدامت پسند سائنسدانوں کے اس فکری

گرد و غبار کو پوری طرح صاف کر دیا ہے۔ جدید سائنس۔ کامیاب علم کی تفتیش میں پیدا ہونے والی انکساری کی
روشنی میں یہ دیکھ لیتی ہے کہ وہ کائنات کے اس بسیط چیتان کے متعلق کچھ نہیں سیکھ سکی۔ اب اڈنگٹن اور جینز جیسے
ممتاز سائنسدانوں کی رہنمائی نے اس کا تعین سمتی روحانی طور پر کیا ہے اور وہ مادہ اور ادراک کے روحانی پہلو کو
زیادہ نظرانداز نہیں کر سکتی۔ جیسا کہ جولین ہکسلے نے لکھا ہے۔ "اس زمانہ میں کوئی حقیقی سائنسداں اس کی اہمیت
کو یہ کہکر کم نہیں کر سکتا کہ مذہب جیسی کسی شئے کا کوئی وجود نہیں اور یہ کسی دوسرے عالم کی چیز ہے۔ یا یہ ایک
عجیب ہراس ہے یا لطیف جنسی وجدان، یا خوش اعتقادی اور منافرت کا ایک امتزاج ہے۔"

دونوں کے تہذیبی پہلوؤں کے لحاظ سے بھی سائنس اور مذہب کی موجودہ صورتوں میں بڑا اختلاف ہے
سائنس نے ہمیشہ خیالی اور عملی آزادی کی حوصلہ افزائی کی ہے اور ذہن کو سوچنے کے لئے آزاد چھوڑا ہے اور
اس نے کبھی پرانی روایات کا خواہ مخواہ لحاظ بھی نہیں کیا لیکن مذہبی شعائر اور خصوصاً وہ جو آج ہماری آنکھوں کے
سامنے ہیں رسم و رواج کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔ ان میں مایوسانہ حد تک قدامت کی بُو
آتی ہے۔ انھوں نے اس حقیقت سے بالکل چشم پوشی کر لی ہے کہ پچھلی صدیوں میں انسان حیرت انگیز طور پر
ترقی کر چکا ہے اور اس کے ذہنی مطالبات کو صرف حکیمانہ قول، عقیدہ اور دعائے خیر زیادہ دنوں تک بیوقوف نہیں
بنا سکتے۔ مختلف زمانوں میں مصلحین نے قدیم اور جدید ذہنی میلانات کا اختلاف مٹانے کی کوشش کی مگر محض ایسی تاویلوں سے
کب کام چلا ہے؟ اگر "مذہب انسانیت" کی تلاش ہے تو ہمیں "طرح نو" ڈالنا ہوگی۔

ہم غیر محسوس طور پر "مذہب انسانیت" کے لئے بے چین ہیں۔ مگر ہمیں اب تک یہ نہیں معلوم کہ وہ کیا صورت
اختیار کرنے والا ہے سائنس کے اس ترقی یافتہ دور اور مشینوں کے پھیلے ہوئے جال نے ہماری اجتماعی زندگی
کی قیمتوں میں بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ دنیا کی تہذیب اب اس منزل پر پہونچ گئی ہے جہاں روایت اور عقیدہ
کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ اور استدلال کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری زندگی کی تلخیوں کو اب شاید
آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا اس کے اثرات مادہ فاسد کی طرح خطرناک حد تک پھیل چکے ہیں۔ اس دور
میں ایسے مذہبی نظام کی ضرورت ہے جو حالات کی ان پیچیدگیوں میں روحانی اور ذہنی اضطراب کی تسکین
کر سکے۔ اس کو بالکل استدلالی بنیادوں پر استوار ہونا چاہئے۔ اس کا مقصد ان تمام شدید اختلافات کی بیخ کنی کرنا ہوگا

جس سے متاثر ہو کر آج ایک مذہب دوسرے مذہب کا اور ایک انسان دوسرے انسان کے خون کا پیاسا نظر آتا ہے۔ اس کو یکسر لچکدار ہونا چاہئے تاکہ وہ نئے خیالات اور نئے نظریوں کو اپنے اندر سمو سکے۔ اپنی روحانی حیثیت میں وہ شخصی رجحانات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا تاکہ انسانی ذہن اور انسانی آرزومندیوں کی پوری طرح امداد کر سکے مگر اخلاقی نقطہ خیال سے چونکہ اس کا فرض سماج کی اخلاقی اور مادی فلاح کی پوری پوری نگرانی ہوگا۔ اس لئے اس کا حکم ہوگا کہ اس کے قوانین کی سختی سے پابندی کی جائے۔ اس نظام کے ماتحت خداوندی تصور کے بارے میں ہر شخص کو پوری پوری فکری آزادی دی جائے گی مگر اس کا واحد اور اساسی مقصد انسانیت کی خدمت ہوگا

ظاہر ہے کہ موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اب اس صورت میں جس میں وہ جلوہ فرما ہوتے ہیں معیاری حیثیت کو نہیں پہونچتا۔ مگر اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ کے تمام نمایاں مذاہب سے قطع تعلق کر لیا جائے ضرورت اس کی ہے کہ ان کے روشن پہلوؤں کی نئی تشکیل کر کے ان میں ہمہ گیر اثریت پیدا کی جائے جو پوری انسانیت کو متاثر کر سکے۔ ممکن ہے کہ اس کو خیال پرستانہ منصوبہ سمجھا جائے مگر اب یہ ایک بھیانک خواب نہیں رہا ہمارے نقطہ نظر میں پوری تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ ظاہرداری اور عصبیت کی اس فضا کو پاک کیا جائے۔

بہت سے شعرا اور مفکرین نے آنے والے انسانی مذہب کا رنگین خواب دیکھا ہے۔ بعضوں کے نزدیک مستقبل ایک ”بین الاقوامی جنگ“ کا نقشہ پیش کرتا ہے اور کچھ لوگوں کو اس میں آنے والے ”عہد سعادت“ کی مہک اپنی دلفریبیاں دکھاتی ہے۔ پس کوئی تعجب کی بات نہیں اگر بہت سے حلقوں میں ”عالمگیر مذہب“ کے تصور کو مضحکہ خیز سمجھا گیا اور دوسری طرف کچھ لوگوں کو مستقبل کی بینائیوں میں اس روشنی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ مذہبی اور سائنسی معتقدات کے مابین مستقبل قریب میں پھر جنگ آزمائیاں شروع ہو جائیں۔ مگر یہ بھی روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ انسان جتنا زیادہ متمدن ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی حقیقت اور سکون کی تلاش بڑھتی جاتی ہے۔ اس کی ذہنی صلاحیتوں اور سماجی بلندیوں کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی تصورات کو حقیقی اور بہتر صورتوں میں دیکھے جس کا مطمح نظر ایک ایسے عالمگیر مذہبی نظام تک پہونچنا ہے جو روحانی توقعات اور انسانی فکریات کو ابدی استواری اور ہم آہنگی کے رشتہ میں جوڑ دے۔

مقبول الرحمٰن صاحب بی۔ اے (آنرز)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری

(گذشتہ سے پیوستہ)

مولانا عبدالحق کی تنقید نگاری پر مجموعی نظر "تنقید پر صرف وہی لکھ سکتا ہے اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا تجربہ وسیع، مطالعہ گہرا اور نظر دور بیں ہو۔ جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادب کا شناور بھی ہو جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق رائے قائم کی ہو اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور دوسروں کے دل نشین کر سکتا ہے۔" (تنقیدات عبدالحق صفحہ ۹۹)

ان تمام شرائط پر مولوی صاحب کے خیال میں صرف مولانا حالی کی ذات پوری اترتی ہے۔ ان کی اس رائے سے تمام و کمال اتفاق کرنے کے بعد ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے بعد جس شخص نے صحیح معنوں میں ان کی تنقیدی روایات کو قائم رکھا اور اعلیٰ تنقید نگاری کو جس شخص نے اردو میں رائج کیا وہ خود مولوی عبدالحق صاحب ہیں۔

ایک خط میں مولانا حالی بھی ہمارے خط کی تائید کرتے ہیں اور مولانا کی تنقید نگاری کی داد دیتے ہیں مصنف حیات النذیر نے اپنی کتاب پر مولانا حالی سے ریویو لکھایا تھا لیکن اس کے شائع ہونے سے قبل مولوی عبدالحق صاحب کی تنقید شائع ہو گئی اس پر مولانا نے مولوی صاحب کو لکھا۔

"اب آپ کے ریویو کے بعد اس کی اشاعت کی ضرورت نہیں ہے مضمون کے لحاظ سے میرے اور آپ کے ریویو میں اختصار و اشباع یا ناقص و کامل کے سوا کچھ فرق نہیں"

(رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۴۱۹)

مولانا عبدالحق انگریزی دانی اور جدید علوم خصوصاً فلسفہ اور تاریخ سے بخوبی واقف ہونے کی وجہ سے نئے خیالات اور ترقی یافتہ زبانوں کے جدید ادب سے بہت اچھی واقفیت رکھتے ہیں خصوصاً اصناف ادب کے متعلق وہ بہت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور تنقید نگاری کے جدید ترین اصولوں کے علاوہ اس

فن کی باریکیوں سے بھی واقف ہیں۔ مولوی صاحب کی نظریں جب کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کے سنجیدہ اور علمی پہلو پر پڑتی ہیں۔ وہ جب کسی چیز پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو اس مضمون کی ساری وسعت اور پورے ماحول پر حاوی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے آپ کی تنقیدیں بہت مکمل ہوتی ہیں۔

مولانا عبدالحق کی تنقیدیں نہایت محققانہ اور مبصرانہ ہوتی ہیں۔ ان میں ان کی ذاتی تحقیقوں کو بھی جو کہ صحت و سچائی میں مسلمہ ہوتی ہیں بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ریسرچ کی مشان سے مزین ہو جاتی ہیں۔ وہ خود ادبی نکات اور معلومات کا مخزن ہوتی ہیں۔ اور اس طرح دنیا کی بلند ترین تنقیدوں کے معیار پر کامیابی سے پرکھی جا سکتی ہیں۔

مولا عبدالحق کی تنقید نگاری کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے بہت بلند ہیں۔ وہ تنقیدی معاملات میں صرف مطالبات ادب کا خیال رکھتے ہیں اور علم سے علم کی خاطر بحث کرتے ہیں۔ اس لئے ان کی رائے غیر جانبدارانہ ہوتی ہے اور اسی لئے ان کی تنقیدیں قابل وقعت، قابل قدر اور مقبول ہوتی ہیں۔

چونکہ مولانا ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں جو کہ انتہائی سادہ اور ساتھ ہی ساتھ شگفتہ بھی ہے۔ اور اپنے قلم کو خیالات سے مغلوب نہیں ہونے دیتے۔ اس لئے وہ اپنی وقیع رایوں کو بہت اچھے اسلوب میں لوگوں کے سامنے پیش بھی کر سکتے ہیں۔ جو اپنی جگہ نہایت ہی دلکش اور موثر ہوتا ہے۔

مولوی صاحب میں بزرگی اور سنجیدگی فطری ہے یہی خصوصیات ایک فطری نقاد پیدا کرتی ہیں حق یہ ہے کہ مولانا نے اپنی زندگی کو جس طرح تنقید نگاری کے لئے تج دیا ہے اور اپنی زندگی کا بلند ترین مقصد بنالیا ہے اس طرح اردو زبان کیا ایشیائی زبانوں میں کسی نقاد نے نہیں کیا۔

مولانا کے ادبی کارناموں کو اگر یورپ کی ترقی یافتہ زبان کے نقادوں کے مقابلہ میں تولا جائے تو کبھی کسی حیثیت سے بھی کم نہ نکلیں گے۔ بلکہ ان کی تنقیدوں اور علمی کوششوں کے ساتھ ساتھ اگر ان کی تحقیقی معلومات کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ ان میں سے ہر ایک سے بڑھ کر ہیں سچ تو یہ ہے کہ مولوی صاحب ایسے ملک اور ایسی قوم میں پیدا ہوئے ہیں جو اپنے خادموں اور رہناؤں کی صحیح قدر نہیں کرتی اور نہ انکی صلاحیتوں

سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے ہمیں چاہئے کہ ہم ان کی زیادہ سے زیادہ قدر کریں اور ان کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

اردو زبان و ادب پر مولانا کی تنقیدات کا اثر اور ان کی اہمیت

جس طرح حالی نے اردو ادب میں تنقید نگاری کی بنیاد ڈال کر ہماری زبان کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب نے تنقید نگاری کو کمال و عروج تک پہونچا کر نہ صرف اردو تنقید نگاری کو ہی دنیا کی بلند ترین زبانوں کے مقابلے میں پیش کیا ہے بلکہ ہماری زبان و ادب کا معیار بلند کر کے اس کو دنیا کی صف اول کی زبانوں کے مقابلے میں ترقی دینے کی کوشش کی ہے اور وہ دن دور نہیں جب آپ کی ان تنقیدی کوششوں سے اردو زبان انتہائی ترقی یافتہ زبانوں میں شامل ہونے لگے گی۔ زبان پر تنقید نگاری کے اثر سے بحث کرتے ہوئے ہمیں اس چیز کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ زبان و ادب کی ترقی میں نقاد کی کوششوں کا اثر زیادہ تر بالواسطہ طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ ہم اس کی تنقیدی خدمات کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں کر سکتے جب تک کہ زبان و ادب کے موجودہ ماحول اور جدید ترقیوں کو اس کے کارناموں میں شامل نہ کیا جائے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا زبان و ادب کی تمام تر ترقی صرف تنقیدی کوششوں کا ہی نتیجہ ہوتی ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ زبان اور لٹریچر کی اصلاح و ترقی میں تنقید نگاری کے علاوہ دوسرے عاملین بھی اثر رکھتے ہیں اور وہ ماحول تاریخی سیاسی اور معاشرتی حالات ہوتے ہیں لیکن ان موافق حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نقاد کی طرف سے ہوتی ہے اور وہی ادیبوں کو نئی شاہراہیں دکھا کر ترقی کی طرف مائل کرتا ہے لہٰذا زبان و ادب کی ترقی میں نقاد کی کوششوں کو ہی بنیادی کوشش سمجھنا چاہئے۔

اگرچہ عام تنقیدی کوشش نہ کسی ایک فرد کی کوشش کا نتیجہ ہوتی ہے اور نہ کسی ایک کے بس کی ہوتی ہے لیکن جس طرح سورج کی تمام قوت تمام عالم میں کارفرما ہوتی ہے اور اسی کے گرد تمام سیارے چکر لگاتے ہیں اسی طرح ایک مسلمہ نقاد کی شخصیت ہوتی ہے جس کی روح جس کے خیالات اور جس کا پرتو اس کے دور کے ہر نقاد اور ہر ادیب پر ہوتا ہے۔ اسی کے دم سے ادبی رجحانات قائم و دائم رہتے اور اسی کے اشاروں پر بدلتے اور سنورتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اردو زبان میں عناصر خمسہ کا دور اس کی بین مثال

ہے جس کا محور اُس وقت کے سب سے بڑے مصلح سر سید تھے جن کے خیالات و افکار اور جن کی قوت عمل ان کے معاصرین میں کارفرما نظر آتی ہے اور انہیں کے مشوروں سے اس زمانے کا تخلیقی ادب وجود میں آیا لیکن اس دور کے خاتمہ پر ہم دیکھتے ہیں کہ اردو ادب کے جدید دور میں ایک نیا آفتاب طلوع ہوتا ہے جو زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ گذشتہ محور سے قوت عمل میں کسی طرح کم نہیں جس کی فطری صلاحیتوں اور نقادی میں کسی کو کلام نہیں۔ جس کے خیالات طرز تحریر اور تنقید نگاری کا اثر موجودہ زمانے کے تمام ادیبوں پر نظر آتا ہے۔ اور اس زمانے کے ناقدین بھی انھیں کے پیرو ہیں۔ یہ مولوی صاحب ہی کی شخصیت ہے جو اُردو کی عنان قیادت ہاتھ میں لئے ہوئے ہے اور موجودہ زمانے میں جتنی بھی اصلاح زبان اور ترقی ادب کی کوششیں ہو رہی ہیں ان سب میں بالواسطہ مولانا کی تنقیدات کا زبردست حصہ ہے۔

زبان و ادب کی ترقی:۔ مولوی صاحب نے اگر ایک طرف زبان کی اصلاح کی ہے اور اسے سنوارا ہے تو دوسری طرف اس کی استعداد کو موجودہ حالات اور علوم جدیدہ کی ضروریات کے مطابق بہت وسعت دی ہے۔ بہت سے متروک الفاظ رائج کئے۔ جہاں ضرورت ہوئی نئے الفاظ کی تشکیل کی اور زبان و ادب کی کسوٹی پر تنقیدی نگاہوں سے پرکھ کر رائج کیا اور اس طرح اسے ایک علمی زبان بنا دیا۔

مولانا کی ایک بہت بڑی ادبی خدمت یہ ہے کہ آپ نے غیر زبانوں کے بلند اور بہتر خیالات و افکار کو اپنے قابل قدر مقدموں کے ذریعہ مقبول بنایا جس سے کہ ہماری زبان میں ادب کی نئی شاہراہیں کھلیں۔ علمی مسائل سے بحث اور تحقیقی مسائل کا اظہار اردو زبان میں نئی چیز ہے۔ اس کے علاوہ تنقید نگاری افسانہ نویسی، ناول نگاری، مضمون نویسی کا نیا طرز اور علمی مقالوں کے جدید ترین طرز جو یورپ کی زبانوں میں رائج ہیں انھیں کے معیار پر پرکھا جس کی بہترین مثال آپ کے رسالے اُردو کے مضامین اور تنقیدیں ہیں۔ یہی مولانا کی سب سے زیادہ قابل قدر خدمت ہے کہ انھوں نے جدید افکار و خیالات سے اردو زبان کے دائرہ ادب میں وسعت پیدا کر دی اور اعلیٰ ادبی مذاق پیدا کیا۔ اگر آپ اپنی بلند پایہ اور مقبول تنقید نگاری سے اُردو کو محروم رکھتے تو شاید اُردو زبان کی موجودہ اصلاح و ترقی کا خواب ہم دیکھ

میں دیکھ سکتے۔

اردو لٹریچر میں جدید اضافوں کا ذکر مولوی صاحب خود ایک خطبۂ صدارت میں کرتے ہیں۔
"اس زمانے میں اردو زبان وادب کے متعلق ہمارے معلومات میں ایک جدید اضافہ ہوا ہے بعض محققین نے بڑی محنت اور تلاش سے قدیم اردو ادب کا پتہ لگایا ہے اور بہت سی ایسی بے بہا اور نایاب کتابیں ڈھونڈھ نکالی ہیں جو اب تک گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں اس کی بدولت اردو زبان کی زندگی میں تقریباً تین سو سال کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اور اب اردو زبان وادب کی تاریخ کے لئے ایک نیا باب کھل گیا ہے" (خطبات عبدالحق صفحہ ۵۱)

لیکن ہم یہ کہیں گے کہ اردو زبان وادب کی یہ تمام ترقی اور اس کی زندگی میں اضافہ تمام تر آپ کی ہی تنقیدی و تحقیقی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولانا نے کوئی تخلیق کام نہیں کیا بجز قواعد اردو، اور صرف و نحو اردو کے۔ مگر ہم ان لوگوں سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ تنقیدی کاموں کی نوعیت کے قائل نہیں۔ اگر وہ ذرا بھی تخلیق کے لئے تنقید کی ضرورت پر غور کریں تو یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ ہر بڑے تخلیقی کام اور تخلیقی دور کے لئے بہت بڑی تنقیدی کوششوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں کیا باعتبار ضخامت اور کیا باعتبار نوعیت مولانا کے ادبی کارنامے کسی حیثیت سے بھی کم نہیں۔ مولانا کی تنقیدات اگر ان کے تخلیقی اثرات اور ان کے بالواسطہ فوائد کو نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ تب بھی بجائے خود وہ تخلیقی اہمیت رکھتی ہیں۔ وہ جہاں گہرے مطالعے، مشاہدے اور علمی مباحث سے مملو ہوتی ہیں۔ وہاں ادبی صفات اور نکات سے بھی مزین ہوتی ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ حالی کی طرح مولوی صاحب کی بھی تنقیدیں جہاں ہماری تاریخ ادب میں بحیثیت صنف ایک بہت بڑا کارنامہ اور اضافہ ہیں وہاں ایک عظیم الشان انقلاب کی یادگار بھی ہیں۔ جنھوں نے ہماری شاعری اور نثر کا رنگ ہی بدل دیا۔ عبارت آرائی اور الفاظ کی صناعی کی جگہ سادگی اور سنجیدگی نے لے لی۔ مولانا کی تنقیدوں نے ہمارے افکار و خیالات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی۔ بے بنیاد قیاس آرائی اور تخیلات کی بلند پروازی کی جگہ ٹھوس علمیت، معلومات اور حقیقت نگاری برتی جانے لگی غرض یہ کہ مولانا

کی تنقیدیں ہماری تاریخ ادب میں اس دور تغیر کی عظیم الشان یادگار اور در اصل اس کی اصل محرک ہیں جس نے ہمارے ادب کو پستی اور کم مائگی کے ابتدائی دور سے نکال کر موجودہ ادبی اور علمی ترقی کے دور میں داخل کیا۔ یہ تنقیدیں دراصل عروج اور کمال کا ایک زینہ ہیں جن کے ذریعہ اردو زبان اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

مولانا عبدالحق ہماری زبان کے ان بلند پایہ ادیبوں میں سے ہیں جن کا احسان ہم رہتی دنیا تک نہیں بھول سکتے۔ اردو زبان و ادب کی موجودہ ترقی ان کی بہت کچھ زیر بار منت ہے۔ ان سے قبل نہ ہماری زبان میں وہ خوبیاں تھیں اور نہ اس کا وہ رتبہ جو اسے اس وقت مولوی عبدالحق صاحب کی تنقیدی کوششوں کی بدولت حاصل ہے۔ اگرچہ آپ کی اصلاحات وہی تھیں اور جادۂ عمل وہی تھا جس کی بنیاد رکھنے کا فخر سرسید اور حالی کو حاصل ہے لیکن اس کی کامیابی اور تکمیل کا سہرا آپ کے سر ہے اور اس حیثیت سے اردو ادب میں مولوی صاحب اپنی تنقیدوں کے ساتھ موجودہ دور کے ہیرو کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

اخلاق الرحمٰن صاحب قدوائی بی، اے (جامعہ)

جان ڈیوی کے فلسفہ تعلیم کا اثر

جان ڈیوی نے ۱۸۹۹ء میں اپنی تصنیف "اسکول اور معاشرہ" میں لکھا ہے کہ اب تعلیمی دنیا میں جو انقلابات رونما ہو رہے ہیں وہ مرکز کشش کو منتقل کر رہے ہیں۔ انقلاب و تبدیلی کی نوعیت کوپرنیکس[1] کی طرح ہے جس نے علم ہیئت کے مرکز کو زمین سے آفتاب کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ آج اسی طرح تعلیمی دنیا میں بچہ آفتاب کی پوزیشن اختیار کر رہا ہے جس کے گرد تمام تعلیمی آلات و ذرائع گردش کر رہے ہیں۔ بچہ مرکز ہے اور اسی کے ارد گرد نظام تعلیم کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ الفاظ الہامی معلوم ہوتے ہیں اور ان میں انقلاب کی جھلک نمایاں ہے لیکن یہ حقیقت ہے جو تعلی و مبالغہ سے بالکل مبرا ہے ڈیوی کی اس تحریر نے تعلیمی دنیا پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور اس میں اس کے مندرجہ ذیل اصول خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔

۱۔ ڈیوی نے بچہ کے فطری میلانات، جبلی رجحانات اور طفلانہ ضروریات پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس نے اساتذہ و معلمین کو اس حقیقت سے روشناس کرایا ہے کہ بچے کی نشو و نما مضامین و نصاب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مدرسوں میں اسی بات کا زیادہ لحاظ رکھنا چاہیئے اور اس کی اشاعت و ترویج کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان خیالات کی داغ بیل اٹھارہویں صدی عیسوی میں ڈالی گئی تھی اور ہربارٹ کے پیرؤں نے بھی شوق اور دلچسپی کی اہمیت کو سراہا اور اس کی تلقین بھی کی تھی جو مدرسے ان کی تعلیمات کے اثر سے قائم کئے گئے تھے ان میں یہی روح کار فرما تھی یعنی عہد طفولیت کی اہمیت لیکن انھوں نے جو معاشرتی ورثہ یا ترکہ اور طور و طریقہ پر تاکید اور پانچ درجوں کے رسمی اصول (Formalism of five steps) پر زور دیا تھا۔ اس نے علمیت کے نظم و نسق کو اور زیادہ محدود اور جکڑ دیا۔ اور اساتذہ

---

[1] کوپرنیکس پروشیا کا باشندہ تھا۔ ۱۴۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۵۴۳ء میں وفات پائی۔ وہ دنیا کا پہلا ہیئت داں منجم تھا جس نے اجرام فلکی کی حرکت کی واضح تحلیل کی اور بطلیموس کے خلاف یہ ثابت کیا کہ اس نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے نہ کہ زمین۔

کی پوزیشن کو زیادہ اقتدار اور اہمیت دیدی عملی طور پر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اب تک خاص کر ہمارے ملک ہندوستان میں چند مضامین و نصاب کا طوطے کی طرح رٹ لینا ہی علمیت کے مرادف خیال کیا جاتا ہے اور یہ اسپرٹ عمومیت کے ساتھ تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جاری ہے۔ ڈیوی نے اس نظریہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور دنیا کو یہ بتایا کہ مضامین، نصاب اور علمی مشاغل کو منتہائے مقصود تصور کرنا سراسر غلطی ہے۔ وہ تو ایک ذریعہ اور راستہ ہے جس پر قدم رکھنے کے بعد بچے اپنی فطری جبلتوں کی نشو ونما اور قدرتی رجحانات کی افزائش اور تشکیل کر سکتے ہیں۔ اور ان کی جسمانی اور ذہنی قوتیں حساس بیدار ہو سکتی ہیں۔ ڈیوی کے نقطۂ نظر سے مدرسہ کا یہ فرض عین ہے کہ وہ بچے کی بالیدگی اور ترقی کو معاشرتی ماحول اور اجتماعی فضا میں پوری آزادی سے نشو ونما پانے اور معاشرہ کے سرچشموں، علوم و فنون، مشاغل اور رٹ سے پوری طرح سیراب ہونے دے کیونکہ سماج ایک جیتا جاگتا ماحول ہے۔

۲۔ ڈیوی کا اعتقاد ہے کہ تعلیم تجربات کے حاصل کرنے کا دوسرا نام ہے۔ اسی خیال کو اپنی تصنیف "بچہ اور نصاب" میں یوں ظاہر کیا ہے "نفس مضمون کو خارجی اثر سے بچوں کے اس طرح ذہن نشین کرنا کہ وہ دماغ میں گھر کر جائے ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ سیکھنا موثر ہے (بغیر بیرونی اثر کے)۔ اس کی مثال عضوی ہضم کی سی ہے جو اندر سے شروع ہوتا ہے"۔ وہ اپنی تصنیف "جمہوریت اور تعلیم" میں اسی حقیقت کو اس طرح بے نقاب کرتا ہے کہ "تعلیم تجربات کی مسلسل تعمیر نو کا نام ہے اور تجربہ کی از سر نو تشکیل و تجدید اجتماعی و معاشرتی آسودگی اور رضامندی کو وسیع اور عمیق کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ افراد میں اس کے (تجربہ کے) طور طریقے پر قابو پانے کی صلاحیت بھی پیدا ہوتی ہے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تعلیم تجربہ کے ہم معنی اور مرادف ہے اور جو کچھ ہم سیکھتے ہیں وہ ہماری عملی جد وجہد کا ثمرہ ہے تو مدرسوں کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ ان تمام مشاغل کو مہیا کریں جن کے بغیر مدرسے تعلیمی چمنستان اور چشمہ رواں نہیں بن سکتے۔ مدرسوں کا کام اور ان کی حقیقت اور اہمیت کا اندازہ صرف اس طور پر لگایا جا سکتا ہے کہ طلبا میں یہ استعداد و قوت پیدا ہو جائے کہ وہ نازک مواقع سے دوچار ہونے اور نئے تجربات کے پیش آنے کے باوجود ثابت قدم اور مستحکم رہیں، اور گذشتہ آزمودہ تجربات کی مدد سے

زمانے کے جدید مواقع اور پیچیدہ حوادثات کو مطیع و منقاد کریں اور نہایت اطمینان، سکون اور خندہ پیشانی سے مشکلات کی گتھیوں کو سلجھائیں۔

دانائی اور غور و فکر انسان کی قابلیت و لیاقت کا سنگ بنیاد ہے۔ بغیر اس کے کوئی شخص پیش آنے والے نئے واقعات پر نہ تو قابو پا سکتا ہے نہ گذشتہ تجربات کے نتائج سے کوئی خاص استفادہ کر سکتا ہے اور نہ نئے پیچیدہ مسائل کی گرہوں کو کھول سکتا ہے۔ بہت کم اسکولوں میں اس بات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے کہ بچوں کی دماغی نشو و نما مکمل طور پر ہو سکے اور ان کی قوت فکریہ پوری آزادی کے ساتھ ترقی پذیر ہو کر اعلیٰ مدارج تک پہونچ سکے۔

غور و فکر کا صحیح مقصد انسانی تجربات کی تعمیر و تشکیل ہے اور انسان مشکل مسائل سے دوچار ہوئے بغیر قوت فکریہ کو معرض عمل میں نہیں لا سکتا۔ ڈیوی کا خیال ہے کہ انسان اسی وقت غور و فکر کرتا ہے جب پیچیدہ حالات اور نئے مسائل و سوالات کا پہاڑ اس کے سامنے حائل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی دشواریاں معمے سے زیادہ مشکل اور فلسفہ سے زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہیں اور ایسی ہی حالت میں کسی عوض اور چارہ کار کی تلاش لازمی ہو جاتی ہے۔ تشویش و پیچیدگی کے علاج کا مطالبہ اس کی قوت فکریہ میں عزم و استقلال پیدا کرتا ہے اور اس طرح قوت فکریہ انسان کا ایک فطری جزو بن جاتی ہے۔ اقبال نے سچ کہا ہے

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر | تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

یہ زور دست و ضربت کاری کا ہے مقام | میدان جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات | فطرت لہو ترنگ ہے غافل! نہ جل ترنگ

۲۔ ڈیوی کا عقیدہ اصول "شوق و کوشش" یعنی (Interest & Effort) قابل توجہ ہے جس کا گہرا اثر تعلیمی دنیا میں عملی طور پر پڑا ہے اور جو اس کے نظریہ تعلیم بہ معنی تجربہ کا نتیجہ در اصل ہے۔ لفظ "شوق" کا رواج تعلیمی دنیا میں اسی کی کاوش ذہنی کا نتیجہ ہے۔ اس کے نزدیک "شوق و کوشش" میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ اپنی تصنیف "شوق و کوشش" کے صفحہ ۷ میں اسی خیال کی توضیح و تشریح کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ عام طور پر یہ فرض کیا جاتا ہے کہ کسی شئے، خیال اور انجام کی خارجیت کو مسخر کرنا خودی (Self)

کا کام ہے۔ کیونکہ شئے یا انجام عام طور پر خودی سے جدا اور الگ ہوتا ہے۔ اس کو دلچسپ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مصنوعی ترغیبات و تحریکات سے اپنے احاطہ میں لانے کی حاجت ہوتی ہے۔ اور وہی تحریص سے توجہ مبذول کی جاتی ہے۔ یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ چونکہ وہ شئے احاطہ خودی سے باہر ہے اس لئے محض قوت عزم وارادہ سے اپیل کی جائے۔ اور سعی و کوشش کو جس میں "شوق" کا شائبہ بھی نہ ہو مرکز ثقل بنایا جائے۔

تمام علمائے تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ "شوق کا اصلی سرچشمہ یہ ہے کہ جس بات یا واقعہ کو سیکھنا یا جس عمل کو پیش کرنا ہو اس میں اور ترقی پذیر نفس (self) میں تطابق اور ہم آہنگی پائی جائے۔ اس شوق کی ترقی کا دار و مدار عامل یعنی خود بچہ) کی ذاتی بالیدگی پر ہے اور اسی وجہ سے اس کا آمرانہ تقاضا ہوتا ہے۔ اگر عامل (یعنی بچہ) کو اپنی شخصیت کی تکمیل مقصود ہے۔ اگر تطابق (یعنی نفس اور شوق کی غیر شعوری ترقی کا تطابق) کی اس حالت کو ایک مرتبہ حاصل کرلیا جائے تو اس وقت نہ تو ہم کو قوت ارادہ سے اپیل کرنی پڑے گی اور نہ اس بات پر زیادہ وقت صرف کرنا پڑے گا کہ ان اشیاء کو دلچسپ بنائیں۔

ڈاکٹر فرینک میک مرے ڈیوی کے "شوق و کوشش" کے متعلق لکھتا ہے کہ بہت سے سن رسیدہ لوگ اس کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ خیال نہ کریں گے۔ پرانی لکیر کے شیدائیوں کا فتویٰ ہوگا کہ یہ خیال محض مذاق و استہزا ہے۔ کرنل پارکر نے ڈیوی کے خیال "شوق" سے بہت متاثر ہو کر غیر معمولی فریفتگی ظاہر کی۔ اس نے اس بات کو محسوس کیا کہ بچے کو بجائے نصاب و مضامین کا ماتحت بنانے کے خود مرکز و محور بنانا ترقی کی ایک نئی شاہراہ ہے اور اس صراط مستقیم پر گامزن ہونا کامیابی و فلاح کی دلیل ہے۔

۴- ڈیوی کا ایمان ہے کہ مدرسہ سماجی ادارہ ہے اور ہماری تمام اجتماعی و عمرانی ترقی کا ورثتاً ایک حصہ ہے۔ مدرسہ ایک چھوٹی جماعت اور سوسائٹی کا دوسرا نام ہے جس کا طور و طریق بعینہ جماعت کا چربہ اور نمونہ ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح خارجی دنیا کی راہ و روش سے علیحدہ اور متضاد نہیں ہوتا ۱۸۹۹ء میں ڈیوی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ مدرسہ ایک چھوٹی سی دنیا ہے جس میں سماج کی زندگی کا بہترین مرقع ہونا چاہئے جس میں سماج کے انواع و اقسام کی حرفت و صنعت کا پورا انعکاس ہو جس میں چمنستان زندگی کے رنگ برنگ کے پھول اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ ہوں اور جس میں آرٹ، تاریخ، سائنس، فلسفہ، فنون لطیفہ اور

دیگر مفید علوم کی تازہ اور پاکیزہ روح موجود ہو یعنی دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مدرسہ کو سماج کا آئینہ اور نقش ثانی ہونا چاہئے۔

جب مدرسہ میں ایسی چیزیں جاری ہوں گی اور بچوں کی ایسی تربیت اور نشو و نما ہوگی کہ وہ مدرسہ کی چار دیواری کے اندر معاشرہ کے باکار ممبر بننے کی صلاحیت اور لیاقت پیدا کرسکیں گے اور ان میں ایثار، انکسار، خدمت خلق، خود اعتمادی اور اپنی مدد آپ کرنے کی استعداد ہوگی اور کشتیٔ حیات کے کھینے کی خود مہارت تامہ حاصل کرلیں گے اور بحر زخار کے تلاطم و تموج کی بالکل پروانہ کریں گے اور منزل مقصود تک پہونچنے میں شجاعت اور عزم و استقلال سے کام لیں گے، تو ہم سوسائٹی کی خدمت میں ایسے افراد پیش کرسکیں گے جو فخر و ستائش کے قابل، احترام و عزت کے لائق اور معاشرہ کی زندہ یادگار ہوں گے۔ مدرسہ کا حقیقی مقصد بچوں میں قوت تعمیر و تخلیق کا ابھارنا ہے اور ان کی مخفی تخلیقی قوتوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچانا ہے

اخلاقی تعلیم | ڈیوی نے اخلاق پر بہت زور دیا ہے اور اس کے خیالات کا اثر اس شعبہ میں بہت گہرا پڑا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تعلیم کا صحیح مقصد ہر فرد میں اتنی قوت فکریہ پیدا کردینا ہے کہ وہ اپنی کشتی حیات کو سماجی افادہ کے لئے پار لگا سکے۔ اور اس کی شخصیت کا وجود جماعت و معاشرہ کے لئے مفید ثابت ہو۔ وہ پند و نصائح کے رسمی لکچروں اور وعظوں کو ناقص سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک تعلیم و اخلاق کی مفارقت کا باعث علم و عمل کا نفاق ہے۔ انسان کا اخلاق اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب وہ اس کو ذاتی تجربہ کے ساتھ ساتھ حاصل کرے اور تجربہ و عمل سے وہ (یعنی اخلاق) اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ وہ لکھتا ہے کہ بعض اخلاقی کیفیات کا سماجی تعلق ایسا ہوتا ہے کہ ہم ان کو اخلاقیات کے نام سے یاد کرتے ہیں جن میں راستبازی ایمانداری، تقویٰ، حیا، رواداری اور ہر دل عزیزی کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ یہ وہ مرکزی فضائل ہیں جن کے گرد دوسری خوبیاں گردش کرتی ہیں۔

اخلاقیات کے دائرے میں نیک کرداری خصلت اور سیرت شامل ہے۔ اور سیرت بحیثیت مجموعی انسانیت کے مرادف ہے۔ صفات حمیدہ سے متصف ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ عملی زندگی میں دوسروں سے میل جول، ربط و تعلق اور لین دین کیا جائے اور فطری قوتوں کو اعلیٰ مدارج تک پہونچانے کی انتھک

کوشش کی جائے۔ مدرسوں اور اسکولوں کا نظم ونسق، نصاب اور تعلیم وتدریس سب اسی وقت قابل قدر ہو سکتے ہیں جب ان میں سماجی و اجتماعی روح کارفرما ہو۔ تادیب، فطری ترقی، تمدن وتہذیب، سماجی استعداد وہ اخلاقی صفات ہیں جن سے ہر انسان کو متصف ہونا چاہئے۔ صرف ذاتی خوبی ایک بے معنی شئے ہوگی اگر وہ دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد نہ ثابت ہو۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے کہ خدمت خلق حسن اخلاق کا بہترین مظہر اور کمال تزکیہ نفس کا اعلیٰ ترین معیار ہے ؎

عبادت بجز خدمت خلق نیست

ڈیوی نے اخلاقی سیرت کے تین اہم اور لازمی اجزا قرار دئے ہیں اور بتایا ہے کہ اخلاقی سیرت کی تعمیر و تکمیل میں انھیں صفات کو شعوری طور پر اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔

ا۔ "قوت عمل یا کارکردگی کی صلاحیت"[1] ہم اکثر گفتگو میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص کی سیرت بہت مضبوط ہے یا بہت پختہ ہے۔ اس سے ہماری یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ قابلیت ہے کہ جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو اس کے انجام دینے میں استقلال، محنت، جرات اور حوصلے سے کام لیتا ہے۔ یہ فعالی صفات ہیں جو بحیثیت مجموعی ہماری سیرت کے اس رخ کو ظاہر کرتی ہیں جو ہمیں مشکلات پر قابو پانے میں مدد دیتا ہے اور مایوسیوں اور شکستوں کا مقابلہ کرکے آخر کار کامیابی کی منزل تک پہونچاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی طبیعت میں یہ عنصر نہ ہوگا وہ اپنے ارادوں کو عمل میں نہیں لا سکتا۔ عام اس سے کہ وہ ارادے اچھے ہیں یا برے۔ ہر ارادے اور عمل کے درمیان بالعموم ایک طویل منزل حائل ہوتی ہے جس میں انسان کو کاوش اور جد وجہد سے کام لینا پڑتا ہے۔ وسائل کی تنظیم کرکے اور مادی اور نفسی حالات کو قابو میں لاکر اپنے ماحول کو اپنا مددگار بنانا پڑتا ہے جو شخص صرف نیک ارادوں کی پونجی لے کر زندگی کے سفر پر روانہ ہوتا ہے اس کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہم اس کی نیک نیتی کی ایک حد تک تعریف کرسکتے ہیں لیکن ہمیں یہ توقع نہیں ہوتی کہ وہ منزل مقصود تک پہونچ جائے گا .... ہر تندرست اور صحیح دماغ رکھنے والے بچے میں فطرتاً یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ کچھ کرکے دکھائے کسی طرح اپنے عمل کا سکہ اپنے ماحول پر جمائے یہ وہی خواہش ہے جو چھوٹے بچوں کے کھیلوں میں ان کی تعمیر و تخریب میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس تقاضائے عمل کی حقیقت کو

[1] Force or Efficiency in Execution

سمجھنا اس کو ایسے مشاغل میں استعمال کرنا جو تعلیم و تربیت کے مقاصد میں معین ہوں اس کو حسب توقع ابھارنا اور راہ پر لگانا تاکہ بچہ میں مفید عادتیں پیدا ہوں یہ مدرسہ اور معلم کا فرض ہے۔

"قوت عمل کو قابل قدر اخلاقی مقاصد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ معاشری نقطۂ نظر سے مفید کاموں میں صرف ہو۔ اس کے لئے دو اور صفات کا ہونا لازمی ہے یعنی قوت فیصلہ (Judgment) اور ذکاوت احساس (Delicate personal Sensitiveness)

۲۔ "انسانی سیرت کا عقلی اور ذہنی پہلو اس وقت مکمل ہوگا جب انسان کی قوت فیصلہ کی تربیت کی جائے۔ یہ قوت محض علم تک محدود نہیں بلکہ عقل اور اس کے استعمال کی صلاحیت پر منحصر ہے۔ جب ہمارا علم مربوط اور منظم ہو جب وہ ذہن میں روشنی پیدا کرے تکمیل مقاصد میں مدد دے جب اس کی بدولت ہم میں معاملات کی سمجھ، احساس تناسب موقع شناسی اور مصلحت اندیشی پیدا ہو جائے اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم فیصلے کی قوت رکھتے ہیں۔

۳۔ تیسری صفت جو عمدہ سیرت کا جزو ہے جذبات سے تعلق رکھتی ہے اگر کسی شخص میں قوت عمل اور قوت فیصلہ دونوں موجود ہوں مگر وہ ذکاوت احساس سے محروم ہو تو وہ معاشرے کا مفید رکن نہیں بن سکتا لوگ اپنی عقل اور علم کو نہایت قابلیت کے ساتھ صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور چونکہ ان میں قوت عمل ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے مقاصد میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں تاریخ میں بہت سے ایسے بادشاہوں کی مثالیں ملتی ہیں اور خود ہم میں سے ہر ایک کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کو معاشری اغراض و مقاصد سے کوئی دلچسپی نہیں جن کو اخلاق کے اصول بالکل مجرد اور دوراز کار معلوم ہوتے ہیں جن میں روح انسانی کی بلند تر آرزوؤں کی مطلق حس نہیں وہ تالاب کے مینڈک کی طرح اپنے محدود دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ معلم کا اور مدرسے کی تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہئے کہ طلباً کے جذبات کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں ذکاوت احساس پیدا ہو، وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوں جب انھیں کسی اہم معاشری تحریک یا اخلاقی مسئلے سے سابقہ پڑے تو وہ اس کی طرف دل سے توجہ کریں اور اس پر محض اپنے شخصی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اجتماعی مفاد کے لحاظ سے غور کریں۔ ہر کام میں اس بات کو مدنظر رکھیں

کہ اس کا ردعمل دوسروں پر کیا ہوگا۔ اس میں ان کی حق تلفی تو نہ ہوگی۔ ان کے جائز جذبات کو ٹھیس تو نہیں لگیگی
جب انسان کے نفس میں ذکاوت احساس کی بدولت ہمدردی اور فراخدلی کی صفات پیدا ہو جاتی ہیں تو وہ
اپنی ذات کے تنگ دائرے سے نکل کر تمدنی اغراض ومقاصد سے آشنا ہوتا ہے اور اس کا شخصی نصب العین
اجتماعی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں اخلاق کی وہ امتیازی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کا
مقتضا یہ ہے کہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں بے جا فرق نہ کرے اور اپنی بھلائی اور بہتری ان مشاغل میں
تلاش کرے جن کا نتیجہ معاشری لحاظ سے قابل قدر ہو۔"

الغرض جن مدرسوں میں علم مسلسل عمل اور پیہم مشاغل کے ساتھ سکھایا جاتا ہے وہاں کے ماحول میں
سماجی زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے وہ ایک چھوٹا سا معاشرہ ہو جاتا ہے جس میں بیرونی زندگی کے تجربات سے
روشناس کرایا جاتا ہے۔ اس چھوٹے معاشرے میں بچے میل جول اور ارتباط و اختلاط کے باعث زندگی کے
نئے نئے تجربات اخذ کرتے اور مستفید ہوتے ہیں۔ اس سرچشمہ سے سیراب ہو کر ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جاتی
ہے کہ وہ سماجی زندگی میں مستعدی سے حصہ لے سکیں۔ وہ اس قابل بن جاتے ہیں کہ دنیا کے تغیرات کے
دوش بدوش چل سکیں اور ضرورت کے مطابق اپنی زندگی میں بھی تغیر و تبدل کر سکیں۔ یہی حسن اخلاق ہے۔
اسی کا نام سماجی افادہ ہے اور یہی علم وعمل کا ارتباط و اتحاد ہے۔ انہی خصائص کو مدرسوں کا منتہائے مقصود ہونا
چاہیئے تاکہ یہ فرد کی اخلاقی زندگی کے رگ و ریشہ میں پوری طرح سرایت کر جائیں اور اس کی سرشت کا ایک
جزو لاینفک بن جائیں۔

سماجی لیاقت وصلاحیت | ڈیوی اور بیگلے۔ نظریہ سماجی لیاقت (Social Efficiency) کے بہت بڑے علمبردار
ہیں۔ ان دونوں امریکی مفکروں نے اس خیال کو اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پھیلایا ہے۔ ان کی تمام تحریریں اسی
خیال سے لبریز ہیں۔ ڈیوی نے خاص طور پر "سماجی لیاقت" کی بڑی اشاعت کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ہر بچے
کو سماجی لیاقت کے لئے تیار کرنا اسکول کا فرض ہے۔ وہی شخص سماجی لیاقت رکھتا ہے جو جونک کی طرح دوسروں کا
خون چوس کر زندہ نہیں رہتا بلکہ خود اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو کر اپنی زندگی کا خالق ہوتا ہے۔ اس میں یہ بھی صلاحیت
موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنی کامیاب زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کی ترقی میں روڑے نہ اٹکائے۔

بلکہ دوسروں کا ہاتھ بٹانے میں ہر وقت مستعد رہے اور سماج کی ترقی میں ہر ممکن کوشش کرے۔

بقول ڈیوی "سماجی لیاقت" دو عناصر کا مجموعہ ہے (۱) معاشی لیاقت (۲) مدنی لیاقت جب تک یہ دونوں اوصاف ایک انسان میں جمع نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کو "سماجی لیاقت" کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ معاشی لیاقت اسی وقت ممکن ہے جب ہم فطری قوتوں کو سماجی افادہ کے لئے پوری طرح استعمال کریں۔ سماجی لیاقت میں صنعتی دسترس آسودہ حالی اور قابلیت شامل ہیں۔ ہر انسان کے لئے ذریعہ معاش حاصل کرنا لازمی ہے اور وہ بغیر اپنے پیٹ کی فکر کئے سماج کے لائق نہیں بن سکتا جن ذرائع سے روزی کمائی جاتی اور خرچ کیجاتی ہے ان سے باہمی تعاون اور لین دین پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ جو شخص یہ صلاحیت نہیں رکھتا کہ اپنی ذات اپنی اولاد اور متعلقین کے لئے روزی حاصل کر سکے اور دوسروں کے سہارے زندہ رہتا ہے تو وہ مفت خوار اور طفیلی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اسی لئے وہ تجربات زندگی سے محروم رہتا ہے جو انسان کے بہترین معلم اور ہادی ہیں۔ اگر وہ صنعتی پیداوار کے صحیح مصرف داستعمال کو نہیں سیکھتا تو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنی شخصیت کو ضائع کرنے کے علاوہ دوسروں کی مفید دولت کو برباد نہ کر دے اور ایک مچھلی کی طرح سارے تالاب کو گندہ نہ کر دے۔

جمہوری نقطہ نظر سے ہر انسان کا یہ فرض عین ہے کہ وہ اپنی زندگی اور قسمت کا مختار کل بن جائے اور اپنی زندگی کی ایک منزل مقصود ٹھہرائے ؎

کچھ مقصد لے کر آتا ہے اس دنیا میں جو آتا ہے　　　محروم عمل جو رہتا ہے وہ جیتے جی مر جاتا ہے

عموماً لوگ اس اصول کے خلاف کسی ایسے بہتر پیشہ اور برتر روزگار کو اختیار کرتے ہیں جس میں فطری رجحانات اور جبلی قوتوں کا مطلق لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ دولت اور موروثی پیشہ کو جانچ کا طریقہ ٹھہرایا جاتا ہے۔

مُدنی لیاقت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ لوگ اس قابل ہو جائیں کہ انسانوں اور تدابیر کو نہایت عقلمندی سے جانچ سکیں قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں دانستہ حصہ لے سکیں۔ یہ انسان کی ذہنی تربیت کا بہترین ذریعہ ہے اسی ذریعہ سے انسان اپنی فطری قوتوں کو عملی طور پر استعمال کر سکتا ہے یہی انسان میں باہمی تعاون اور اشتراک عمل کا احساس پیدا کرتا ہے اور اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کی انفرادی اہمیت کو عملی طور پر سمجھتا ہے تجربات کا مبادلہ ہوتا ہے۔ قوم کی سماجی بیداری میں حصہ لینے کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔ انسان کو دوسرے انسان کے تجربات سے مستفید ہونے کا زرین موقع

ملتا ہے اور اس طور سے کام بہتر طریقہ پر انجام پاتا ہے۔ اشیا کا اختراع آرٹ سے حظ اٹھانا۔ فنون لطیفہ سے تازگی حاصل کرنا۔ فرصت کے وقت کو صحیح استعمال کرنا، دولت کا موقع و محل سے خرچ کرنا، ضرورت کے وقت مستعد رہنا اور اپنی تمام قوتوں کا بہیت مجموعی بہتر استعمال کرنا۔ مدنیت کے مرادف و ہم معنی ہے۔ الغرض حقیقی مدنیت سے مراد دماغی اشتراکیت، عملی شائستگی اور وسیع النظری ہے جو سماجی طبقات کی خلیج کو فنا کر دیتا ہے جو تجربات کی آمد و رفت کو نہیں روکتا اور جس میں ہمدردی خوش مزاجی، بھلائی اور نیکی شامل ہیں۔

بیگلے کے نقطۂ نظر سے۔ سماجی لیاقت، وہ معیار ہے جس سے تعلیمی ذرائع ان تمام تجربات کا انتخاب کر سکیں جو افراد کے ذہن نشیں کرنا ہوں۔ یہی میزان ہونی چاہئے تاکہ جو خصائل و عادات بچے اسکولوں میں سیکھیں وہ ان کی زندگی میں سماجی لحاظ سے مفید ہوں۔

برٹرینڈ رسل جو انگلستان کا بہت بڑا مفکر ہے وہ اپنی تصنیف "اجتماعی نظم اور تعلیم" میں "تخلیقی مدنیت" کے پانچ اوصاف بیان کرتا ہے جس سے متصف ہو کر انسان مکمل شہری کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔

۱۔ قوت انشاء (Initiative) یعنی ہر تحریک اور سماجی کام میں پیش قدمی کرنے کی صلاحیت تاکہ ہر اجتماعی ارادہ کے لئے ملک کا ہر شہری اپنے فرائض کا احساس کر کے اس پر عملی قدم اٹھائے۔

۲۔ قیادت (Leadership) یعنی ملک کی سیاست اور تمدن کو برقرار رکھنے کیلئے دوسروں کا دست نگر نہ ہو بلکہ ہر شہری میں یہ اسپرٹ موجود ہو کہ اگر قوم کے جہاز کا ناخدا مر جائے تو وہ اس سے بہتر و لائق شخص کی خدمت کو پیش کر سکے گا۔

اذا سید منا خلا قام سید قؤل لما قال الکرام فعول

۳۔ تادیب و انضباط (Descipline) یعنی ایک ایسے اصول و نظم کے ماتحت کام کرنا جو سماج کے افادہ کے لئے ناگزیر ہو، اور جس سے اجتماعی شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے۔

۴۔ اتحاد و اشتراک عمل (Cooperation) یعنی سماج و قوم کی خدمت باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے کرنا تاکہ انفرادی نشو و نما کے ساتھ ساتھ قوم و ملک کی بھی ترقی ہو اور ہر شہری میں خود غرضی کے بجائے ہمدردی و ایثار کے جذبات پیدا ہوں۔

۵۔ رواداری (Tolerance) یعنی دوسروں کے جذبات و اختلافات کا لحاظ رکھنا اور ان کو آزادی رائے آزادی تقریر اور آزادی عمل دینا تاکہ چمنستان قوم کی آبیاری ہو سکے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن اے ذوق اس جہان کو ہے زیب اختلاف سے

(ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی۔ ایم۔ اے)

اقبال کا ذہنی ارتقاء

اقبال عہد حاضر کا سب سے بڑا شاعر ہوا ہے جس کے افکار کے نغموں نے "رنگ و آب شاعری" کے طلسم کو ایک نئے انداز سے باندھا اور جس کے خیالات کی بلند پروازی نے ادب کے خزانوں کو بھرپور کر دیا ہے خیالات کی بوقلمونی ہر مرتبہ ایک نئی ادا نئی شان کے ساتھ مختلف پیرائوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اور زمین شعر میں وہ گل کھلاتی ہے جس میں دائمی کشش، حسن اور سحر آفرینی کے عناصر ملے جلے ہوتے ہیں۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کا اصول اس کے اشعار میں پڑھ کر صاف سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس کے تخئیلی پیکروں میں سچا رنگ روپ ہوتا ہے۔ ان میں توانائی بھی ہوتی ہے صداقت بھی حسن بھی ہوتا ہے کشش بھی، لطافت بھی ہوتی ہے موسیقیت بھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ اعجاز ہوتا ہے جو اپنے نفس گرم سے "خاک ہزار سالہ" میں زندگی کا احساس اور گرمی، حرارت اور گداز پھونک دیتا ہے اور زندگی کی ایسی لہریں دوڑ جاتی ہیں جن سے دل گرفتہ غنچوں کی گرہیں کھل جاتی ہیں اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے دروں لالہ بھی تازہ ہو جاتا ہے۔ ان میں ایک الہامی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک سرمدی نشہ ہوتا ہے۔ ایک بے پئے کی مستی۔ لیکن اس سے خود فراموشی کی بجائے خود شعوری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تشائم پسندی کے بجائے تفاعل پسندی کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے۔ قنوطیت کے بادل چھنٹ جاتے ہیں۔ رجائیت کی سحر طلوع ہونے لگتی ہے سینوں میں تمناؤں کی فروزاں آگ مشتعل ہو جاتی ہے۔ زندگی میں حسن اور حسن میں زندگی نظر آنے لگتی ہے۔ آتش نفس تیز تر ہو جاتی ہے۔ ممکنات زندگی کا میدان وسیع ہو جاتا ہے اور دل کیف و مستی کی تھاہ میں ڈوب کر جب ابھرتا ہے تو قوت، حیات اور امید سے لبریز ہو جاتی ہے۔

اس کے ہر خیال میں ایک نئی شان اور ہر بات میں ایک نیا رنگ ہے۔ اس میں حدت بھی ہے اور خلاقی بھی، اوج بھی ہے اور تنومندی بھی۔ خون تازہ بھی اور حقیقت پژوہی بھی۔ اس کے ہاں محض الفاظ کی صنعت کاری نہیں بلکہ رنگ و آہنگ، کیف و کم اور خط و خال کے ایسے ایسے حسین مرقعے ہیں جن میں سے زندگی جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہے اور یہی اس کی بلندی کی دلیل ہے۔

اقبال کے ابتدائی اشعار میں داغ کی شوخ بیانی، جدت اور شیرینی صاف نظر آتی ہے۔ اس کی تصویروں میں وہی بانکپن، وہی رعنائی اور وہی دلکشی پائی جاتی ہے جن میں داغ کا انداز بیان سمویا ہوا ہے لیکن چونکہ اقبال نے فلسفیانہ طبیعت پائی تھی اس لئے غالب کے کلام کے اثر نے اسے اور چمکا دیا اور ان کے ذہنی ارتقار کے ساتھ ساتھ یہ حکیمانہ طرزِ فکر بڑھتا گیا۔ لیکن شاعر کی روح نے اسے شعریت کے سانچہ میں ایسا ڈھالا کہ اس کی شان انوکھی ہو گئی۔ حالی کے دردِ دل نے بھی اقبال کی رگ جاں کو متحرک کیا اور چونکہ اقبال کو بھی ایک سوئی ہوئی قوم کی واماندہ رگوں میں خون حیات دوڑانا تھا اس لئے اس کی لے نے بھی یہی طرز اختیار کیا۔ مگر اقبال ایک رجائی شاعر ہے۔ اور قوم کے سامنے ایک بلند اور امید افزا مطمح نظر پیش کرتا ہے۔ اس لئے اس کے اشعار نالہ وزاری اور حزن یاس کے عناصر سے آزاد ہیں۔ بلکہ ان کی بجائے ان میں امید اور زندگی کی حرارت اور سوز ہے لیکن جس طرح ہر بڑا شاعر قوت تخلیق کا مالک ہوتا ہے اسی طرح اقبال نے ان تینوں شاعروں کے اثرات کو اپنی فطرت میں اس طرح سمویا اور اپنی انفرادی ذہنی اپج سے اس طرح چمکایا کہ اس کی راہ سب سے الگ اور سب سے پُرشوکت نظر آتی ہے۔ ایسے ہی داغ کی زبان، غالب کا فلسفہ اور حالی کا درد اور تپش حل ہو کر موزوں قالب میں جلوہ گر ہو گئے ہیں۔

اقبال کے ابتدائی کلام کے مجموعہ "بانگ درا" میں داغ، غالب اور حالی پر بڑی نظمیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال ان تینوں کا کس حد تک رہینِ منت ہے اور اس کے قلب کی گہرائیوں میں احترام و عظمت کے کتنے لطیف جذبات ہیں۔ "بانگ درا" میں شاعری کے تین دھارے الگ الگ بہتے نظر آتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر جو ابھی پر تول رہا ہے آئندہ کن بلندیوں پر پرواز کرنے والا ہے۔ ان تینوں دوروں کو سامنے رکھنے سے تخیل کے تدریجی ارتقا کا نقشہ صاف نظر آجاتا ہے ہر نقش ثانی نقش اول سے زیادہ پختہ ہوتا ہے اور ایک دور کی خامیاں دوسرے دور میں رفع ہو جاتی ہیں۔ جو نقش پہلے دھندلے اور پھیکے ہوتے ہیں وہ ذہن کی نشو و نما کے ساتھ روشن، جاذب اور دلفریب بن جاتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے ایک تصویر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

اقبال کے پہلے دور کی نظموں میں سب سے پہلی نظم "ہمالہ" ہے اس میں خیالات انگریزی ہیں اور زبان پر فارسی کا رنگ غالب ہے تخیل لے انتہا حسین ہے۔ سادگی اور سلاست کے ساتھ رعنائی اور زیبائی کی

جھلکیاں شاعر کے مصورانہ کمال کی غمازی کر رہی ہیں۔ اس کے الفاظ قوس قزح کی طرح رنگین اور دلکش ہیں۔ اور خیالات کا تسلسل موسم بہار کی رنگا رنگ دلآویزیوں کی طرح دلپذیر ہے۔ شاعر کے دل میں وطن کی محبت کے جذبات بھی موجیں لے رہے ہیں اور اس کی روح اس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ یہ نظم پہلے دور کی نظموں کی خصوصیات کا آئینہ ہے۔ منظر کشی جس میں اقبال کو خاص مہارت حاصل ہے اس میں موجود ہے۔ ادبی مصوری کا یہ اچھوتا نمونہ ہے جس میں شعریت کا عنصر موجود ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی   کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئنہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی   سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی
چھیڑتی جا اس عراقِ دل نشیں کے ساز کو   اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

ایک نظم "ماہِ نو" میں تشبیہوں اور استعاروں کی لطافت اپنے انتہائی کمال تک پہونچ گئی ہے۔ "ماہِ نو" کو خورشید کی ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ٹکڑا قرار دینا انوکھا خیال ہے۔ اپنے بے مثل تخیل کی صناعی سے اقبال نے جو تصویر پیش کی ہے۔ اس کا ایک پہلو دیکھئے ؎

ٹوٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی غرقاب نیل   ایک ٹکڑا تیرتا پھرتا ہے روئے آب نیل
طشتِ گردوں میں ٹپکتا ہے شفق کا خونِ ناب   نشترِ قدرت نے کیا کھولی ہے فصدِ آفتاب؟
چرخ نے بالی چرا لی ہے عروسِ شام کی   نیل کے پانی میں یا مچھلی ہے سیمِ خام کی؟

تصویرِ درد اس دور کی بہترین نظموں میں ہے جس میں اقبال ایک وطن پرست کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ وہ احساس جس نے ان سے یہ کہلوایا کہ "خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے" یہاں بھی موجود ہے ان کا دل ہندوستانیوں کے نفاق پر نوحہ خوانی کر رہا ہے اور اس کے مستقبل کا خیال کر کے ان کا دل بیٹھا جاتا ہے۔ وہ ہندوستانیوں کی غیرتِ قومی کے جذبہ کو متحرک کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ فرقہ آرائیوں کی زنجیروں کو توڑ کر اور "افسانہ ہائے ماضی" کو بالائے طاق رکھکر موجودہ صورت حالات کا جائزہ لیں اور مستقبل کی تعمیر کی فکر کریں۔ وہ انھیں متنبہ کرتے ہیں کہ اگر انھوں نے قومی مصیبت کا احساس نہ کیا اور ماضی کے سیمیائی طلسم کے اسیر رہے۔ تو وہ ایک دن صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیے جائیں گے اور تاریخ ان کے قومی تشخص کی کوئی یادگار محفوظ

نہ رکھ سکے گی۔ قوموں کا اجتماعی احساس جب کمزور پڑ جاتا ہے تو دوسری قومی سیرت رکھنے والی قوموں کے اندر جذب ہو جاتی ہیں۔ اس نظم میں ایک قومی ہمدرد کی سچی اور مضطرب روح آہ و فغاں کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے دلدوز نغمے ہر ہندوستانی کے لئے ایک عمومی اپیل رکھتے ہیں ؎

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلک ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

بدقسمت ہندوستان کی حالتِ زار انھیں یہاں تک بے چین کرتی ہے کہ بالآخر پکار اُٹھتے ہیں ؎

مجھے کیا دیدہ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشم شاعر کی ہے ہر دم با وضو رہنا

وطنیت کے اس شدید احساس کے ساتھ ساتھ شاعر کی عشق پرور روح بھی اپنا مظاہرہ کئے بغیر نہیں رہتی۔ اسے فطرت کے ہر مظہر اور قدرت کی ہر نیرنگی میں حسن نظر آتا ہے۔ وہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں اس روح کو رقصاں دیکھتا ہے۔ ہر طرف اسے اسی کیف کی جلوہ سامانیاں نظر آتی ہیں۔ بتان شوخ و شنگ کا تو کیا کہنا جن کے عارض تاباں کی جھلک میں حسن کی تمام فتنہ زائیاں مرکوز ہو گئی ہیں اور جن کی نکیلی پلکوں کے ستم کش تیروں سے شاعر کا دل خون ہو کر رہ گیا تھا۔ اس چمن کا ذرہ ذرہ محشر بداماں ہے اور ہر شئے سے حسن کی شعاعیں پھوٹ کر نکل رہی ہیں۔ ماہ نو کی چاندنی، سورج کی کرن، شفق کے رنگ، چشمہ کی روانی، پہاڑ کی بلندی اور طائر خوش الحاں کے نغموں میں اسے حسن کے جلوے نظر آتے ہیں۔ اور جب کبھی وہ کسی ایسے نظارہ سے ہمکنار ہوتا ہے تو اس کی روح ابدی مسرت میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کا دل وفورِ شوق سے بیتاب ہو جاتا ہے اور اسے ایک روحانی کیف محسوس ہوتا ہے۔ اس کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ یہ پوری کائنات اس جذبہ سے بھر پور ہے اور اس کی رنگینیاں ہر چیز پہ چھائی ہوئی ہیں ؎

محفل قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن

حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے — مہر غوگستری، شب کی سیہ پوشی میں ہے
آسمان صبح کی آئینہ پوشی میں ہے یہ — شام کی ظلمت شفق کی گل فروشی میں ہے یہ
عظمت دیرینہ کے مٹتے ہوئے آثار میں — طفلک ناآشنا کی کوشش گفتار میں
ساکنان صحن گلشن کی ہم آوازی میں ہے — ننھے ننھے طائروں کی آشیاں سازی میں ہے
چشمۂ کوہسار میں دریا کی آزادی میں حسن — شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس
حسن کے اس عام جلوہ میں بھی یہ بے تاب ہے — زندگی اس کی مثال ماہی بے آب ہے

دور اول کی نظموں میں ہمیں دو عنصر کام کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اوّل وطن سے بے انتہا محبت دوسرے مظاہر فطرت میں زندگی کے رازہائے سربستہ کے انکشاف کی جستجو۔ اُن نظموں میں جہاں اقبال فطرت کی مصوری کرتا ہوا نظر آتا ہے وہاں ایک خاص قسم کی جھجک، جستجو اور تلاش کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ وہ حسن میں حقیقت کا متلاشی نظر آتا ہے۔ شاعر فطرت سے درس لینے کی کوشش کرتا ہے اور قدرت کی نیرنگیوں کو دیکھکر بعض اوقات حیران سا رہ جاتا ہے۔ اس کی حقیقت پژوہی کی صلاحیتیں ہر موقع پر اپنا اظہار کرتی ہیں۔ چاندنی رات آب رواں اور شمع فروزاں کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کچھ سوچتا ہے اور پھر اپنے ذہنی تاثرات کو صفحۂ قرطاس پر منقش کر دیتا ہے ؎

پروانہ اور ذوق تماشائے روشنی، — کیڑا ذرا سا اور تمنائے روشنی!
نور کا طالب ہوں گھبراتا ہوں اس بستی میں میں! — طفلک سیماب پا ہوں مکتب ہستی میں میں!
پھر بھی اے ماہ مبیں! میں اور ہوں تو اور ہے — درد جس پہلو میں اٹھتا ہے وہ پہلو اور ہے
گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو — سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے — یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثل جرس

اسی طرح "ایک پرندہ اور جگنو" میں بھی خیال بندی کے بعض نادر نمونے نظر آتے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں ڈاکٹر اقبال یورپ چلے گئے۔ ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت حضرت نظام الدین اولیائے کے مزار مبارک پر انھوں نے جو نظم پڑھی وہ اس دور کی آخری نظم ہے یہیں سے ان کی شاعری میں مغربی علم و حکمت کے اثرات کی ابتدا ہوئی اور دانش کدۂ فرنگ سے مستفید ہونے کے بعد انھوں نے جو نظمیں کہیں ان سے ان کی شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نظم میں اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں ان کی علو ہمتی اور خلوص صاف نظر آتے ہیں اور اس عقیدت کا پتہ چلتا ہے جو ہمیشہ انھیں بزرگان دین کے ساتھ رہی۔ اس وقت اقبال نے اپنے لئے جو دعا کی تھی وہ بارگاہ خداوندی میں قبول ہو گئی ؂

چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو
فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں — تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو
مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے — کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو
مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو
شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے — یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے

اقبال کے دوسرے دور کی نظموں میں ہمیں شاعر کی رومانی طبیعت کی تصویر بے نقاب نظر آتی ہے فطرت کی منظرکشی جو پہلے دور میں قومی اور وطنی نظموں کے جھرمٹ میں کبھی کبھی ایک لمحہ کے لے لمعہ افگن ہوتی تھی اب اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر نظر آتی ہے۔ اس کے قلم کی ہر جنبش فطرت کے حسین جلووں کے لئے مشاطگی کا کام دیتی ہے جس میں شاعر خود بھی کبھی کبھی اپنی تصویر دیکھ لیتا ہے۔ اجزائے کائنات میں حسن کی جو بظاہر خاموش قوتیں کام کر رہی ہیں، وہ انھیں نمایاں کرتا ہے اور فطرت کے نرم و نازک ہاتھ میں ساز حسن کو دیکھ کر بیخود ہو جاتا ہے۔ اور اس کی ایک ایک بوند کو ختم کر دینا چاہتا ہے اقبال کے نزدیک حسن و صداقت ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں جن کا منتہا یہ ہے کہ وہ ہمیں صداقت کے قریب کر دے اور ہمارے دل میں اعلیٰ مقاصد کی قدر کا جذبہ پیدا کرے حسن، محبت کی فطرت کے لئے جذبہ محرکہ کا کام کرتا ہے۔ اقبال محبت کو ایک لطیف کیفیت سمجھتا ہے جو زندگی کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ اس کے عناصر عالم خاکی سے نہیں بلکہ عالم بالا کے موسیقار کے ذروں سے مرکب ہیں۔ اس میں لرزتے ہوئے تاروں کی چمک، تڑپتی ہوئی بجلی

کی کڑک، حور کی پاکیزگی، شبنم کی افتادگی اور فرشتہ کی معصومیت کے اجزا ملے ہوئے ہیں۔ اور کائنات کی تمام حسین چیزیں اسی لطیف آمیزش کے خارجی مظاہر میں ہیں۔ محبت کے عنوان سے پہلی نظم میں لکھتے ہیں ؎

چمک تارے سے مانگی چاند سے داغ جگر مانگا — اڑائی تیرگی تھوڑی سی شب کی زلف برہم سے
تڑپ بجلی سے پائی حور سے پاکیزگی پائی — حرارت لی نفسہائے مسیح ابن مریم سے
ذرا سی پھر ربوبیت سے شان بے نیازی لی — ملک سے عاجزی افتادگی تقدیر شبنم سے
پھر ان اجزا کو گھولا چشمۂ حیواں کے پانی میں — مرکب نے محبت نام پایا عرش اعظم سے

اور پھر اس کا اثر یہ ہوا ؎

ہوئی جنبش عیاں ذروں نے لطف خواب کو چھوڑا — گلے ملنے لگے اٹھ اٹھ کے اپنے اپنے ہمدم سے
خرام ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے — چٹک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

"حقیقت حسن" کے نام سے جو نظم کہی ہے اسے اس دور کا شاہکار کہا جا سکتا ہے رمزیت (Symbolism) جو اقبال کے آرٹ کا ایک نمایاں پہلو ہے اس میں بھی موجود ہے۔ اس میں شاعر نے رمزو کنایہ سے حسن کی بے ثباتی پر بڑے لطیف پیرائے میں اظہار خیال کیا ہے۔ اور پھر "حقیقت زوال" کی توجیہ عجیب انداز سے کی ہے اس نظم میں کسی قدر قنوطی انداز نمایاں ہے جو اس دور کی ایک خصوصیت ہے اور جو حساس نوجوانوں میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ ان اشعار کی وقعت کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ایک شاعر کا دل اور ایک مصور کی نگاہ چاہیئے

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی — فلک پہ عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سنکر سنائی شبنم کو — فلک کی بات بتادی زمیں کے محرم کو
بھر آئے پھول کے آنسو پیام شبنم سے — کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے
چمن سے روتا ہوا موسم بہار گیا — شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا

"طلبائے علی گڑھ کالج کے نام" جو پیام اقبال نے دیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نظم ہستی کے ان اجزا کو کس قدر اہم سمجھتے تھے اور ملت کی زندگی نوجوانوں کے کردار سے کس حد تک وابستہ ہے۔ اقبال پوری قوم کو جو پیام دینا چاہتے تھے۔ وہی پیام انھوں نے اس قوم کے اہل علم نوجوان طبقہ کے سامنے پیش کیا۔

۱۹۰۷ء کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی شورش کا زمانہ تھا اور مسلمان اپنے نصب العین سے ہٹ کر مختلف راستوں کی طرف بھٹک رہے تھے۔ اس وقت اقبال نے نوجوانوں کو ذوقِ عمل اور ذوقِ تپش کا سبق دیکر انھیں اپنی زندگی کا ایک جزو بنا لینے کا پیام دیا اور ان کی سرد رگوں میں احساس اور زندگی کی تازہ لہریں دوڑا دیں۔ اس پیام میں ہمیں بعض وہ چیزیں ملتی ہیں جنھوں نے اقبال کی آئندہ شاعری میں ایک منظم فلسفہ زندگی کی صورت اختیار کر لی اور جنھوں نے اقبال کو رومانی شاعری سے اونچا اٹھا کر نشاۃِ جدیدہ کی طلوع ہونے والی سحر کا نقیب اور قوموں کی زندگی کے دھارے کو موڑ دینے والا مفکر اور شاعر بنا دیا۔ یہی وہ دبی ہوئی چنگاریاں تھیں جو بعد میں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں اور جنھوں نے اقبال کی شاعری کی پیشانی پر حیاتِ جاویدکا جھومر لگا دیا ؎

آتی تھی کوہ سے صدا رازِ حیات ہے سکوں ۔۔۔ کہتا تھا مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا ۔۔۔ اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیشِ جاوداں ذوقِ طلب اگر نہ ہو ۔۔۔ گردشِ آدمی ہے اور گردشِ جام اور ہے

شمعِ سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز ۔۔۔ غمکدۂ نمود میں شرطِ دوام اور ہے

یورپ کے عیش پرور ماحول نے اقبال کے دماغ پر جو تاثرات مرتب کئے ان کا عکس کم و بیش تمام نظموں میں نظر آتا ہے اس وقت اقبال عام نوجوان شاعروں کے انداز میں حسن وعشق کے رموز آشکارا کرنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ اور بعض وقت ایسا کھویا جاتا ہے گویا اس کی روح اس میں ڈوب گئی ہے۔ "حسن وعشق" کے عنواں سے ایک نظم میں یہ احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ یہاں اقبال محبوبِ مجازی کے جمال کے مشاہدہ میں غرق ہے تاکہ اس جذبہ کی تسکین کرسکے جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اقبال کا اندازِ بیان بہت دلکش اور سحر آفریں ہے۔ فرماتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیِ سیمینِ قمر ۔۔۔ نورِ خورشید کے طوفان میں ہنگامِ سحر

جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل ۔۔۔ چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول

جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم ۔۔۔ موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا!

اسی نوع کے چند اشعار اور سنیئے ؎

شیشۂ دہر میں مانندِ مئے ناب ہے عشق
روحِ خورشید ہے خونِ رگِ مہتاب ہے عشق

دل ہر ذرہ میں پوشیدہ کسک ہے اس کی
نور یہ وہ ہے کہ ہر شئے میں جھلک ہے اس کی

کہیں سامانِ مسرت کہیں سازِ غم ہے
کہیں گوہر ہے کہیں اشک کہیں شبنم ہے

شیلے کا فلسفۂ محبت بھی اسی کے قریب ہے اس کے نزدیک اجزائے عالم کی باہمی وابستگی کا نام محبت ہے جس کے بغیر کائنات کا وجود ناممکن ہے اور انسانی زندگی کیف سے خالی۔

"چاند اور تارے" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے نہایت دلکش انداز میں زندگی اور حرکتِ دوام کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور عمل پیہم اور ذوق طلب کو ترقی اور حیات کے لوازمات قرار دیا ہے قوموں کی زندگی میں جب یہ عنصر کمزور پڑ جاتا ہے۔ تو ان کا اجتماعی احساس ختم ہو جاتا ہے اور وہ بہت جلد اپنی انفرادیت کو ختم کر کے زندگی کے چراغ کو گل کر دیتی ہیں۔ اقبال نے چاند کی زبانی یہ پیام پہونچایا ہے۔ زبان اس قدر سادہ دلنشیں اور مسلسل ہے معلوم ہوتا ہے کہ غالب اور داغ کے بعض اجزا لیکر اقبال کے پیکر میں ڈھالے گئے ہیں ؎

کہنے لگا چاند ہم نشینو!
اے مزرعِ شب کے خوشہ چینو!

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی

ہے دوڑتا اشہبِ زمانہ
کھا کھا کے طلب کا تازیانہ

اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے

چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھیرے ذرا کچل گئے ہیں

انجام ہے اس خرام کا حسن
آغاز ہے عشق، انتہا حسن

یوروپین معاشرت کی رنگا رنگ بزم آرائیوں اور رومانی شعرا کے کلام نے اقبال کے نوجوان اور شاعرانہ دل پر جو اثرات ڈالے انھیں ایک حد تک ابیقوریت (Epicureanism) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے وہ زندگی سے جی بھر کر لطف اندوز ہونا چاہتا ہے اور غم واندوہ کے گرد وغبار سے شیشہ دل کو صاف رکھنے کا خواہشمند ہے۔ اسے ساقیانِ جمیل، شرابِ طہور، ذکرِ سلسبیل اور جلوۂ طور سے کوئی دلچسپی نہیں وہ تخیل کے ان طلسموں کو توڑ کر اس دنیا میں اپنی روح کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دور کرنا چاہتا ہے تاکہ اس کی

زندگی میں بالیدگی اور نمو کا سلسلہ جاری رہے۔ وہ عیش و سرور کے ان رنگین پردوں کو اٹھا دینا چاہتا ہے۔ تاکہ انسان کسی فریب میں مبتلا نہ رہے۔ سرمدی کیفیت کے یہ حسین جلوے ایک نوجوان شاعر کے دل کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ یہ اس کی بے چین اور ناشکیبا روح کی ایسی آزمائش ہے جس سے وہ دامن بچا کر نکل جانا چاہتا ہے اور شاعر زندگی کے چھلکتے ہوئے افشردہ کو خوب دل کھول کر پینا چاہتا ہے۔ وہ خیام کی طرح عشرت امروز کا قائل ہے ؎

مقام امن ہے جنت مجھے کلام نہیں — شباب کے لئے موزوں ترا پیام نہیں
شباب آہ کہاں تک امیدوار رہے — وہ عیش، عیش نہیں جس کا انتظار رہے
وہ حسن کیا ہے جو محتاج چشم بینا ہو — نمود کے لئے منت پذیر فردا ہو
عجیب چیز ہے احساس زندگانی کا — عقیدہ "عشرت امروز" ہے جوانی کا

لیکن شراب زندگی میں اس قدر منہمک ہونے کے باوجود بھی اقبال حقیقت کی جستجو سے غافل نہیں۔ وہ اسرار و رموز کے چہرہ سے نقاب اٹھا دینا چاہتا ہے۔ اس کا ذوق آگہی، زندگی کا راز معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہے۔ اور وہ ہمہ تن استعجاب بنا ہوا طلسم زمان و مکان کی پہنائیوں کو ناپ رہا ہے۔ اپنی نظم "انسان" میں اقبال نے انہی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان گنت مخلوقات کی اس نیرنگی میں اقبال نے انسان کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بہت دلکش ہے۔ اس کے ارد گرد تمام فضا میں ہر چیز کیف آور نشہ میں چور ہے۔ اور اپنی شخصیت کو نمایاں کرنا چاہتی ہے موج دریا، بادل، تارے، خورشید، اپنے اپنے کام میں منہمک ہیں۔ اور ان کی طمانیت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کائنات کے معموں کا حل پا گئے ہیں لیکن اس "نگارخانۂ چین" میں انسان یکہ و تنہا کھڑا اپنے تخیل کی گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تلخئ روزگار پر نوحہ خوانی کر رہا ہے ؎

قدرت کا عجیب یہ ستم ہے

انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوق آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے؟

لذت گیر وجود ہر شئے　　سرمست مئے نمود ہر شئے

کوئی نہیں غمگسار انساں　　کیا تلخ ہے روزگار انساں

تیسرے دور کی ایک نظم "انسان" میں قنوطیت کا یہ انداز رجائیت سے بدل گیا ہے اس تصویر میں انسان با اختیار اور دوسرے موجودات سے برتر نظر آتا ہے اور اس کی ہستی میں زندگی کے شاندار امکانات مضمر ہیں چنانچہ لکھتے ہیں ؎

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں　　انسان کی ہر قوت سرگرم تقاضا ہے!

اس ذرہ کو رہتی ہے وسعت کی ہوس ہر دم　　یہ ذرہ نہیں شاید سمٹا ہوا صحرا ہے

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستان کی　　یہ ہستی دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے!

"ایک شام" اور "تنہائی" دو نظمیں دوسرے دور میں امتیازی شان رکھتی ہیں ان دونوں نظموں میں ورڈز ورتھ (Wordsworth) کا تخیل اقبال کی زبان سے ادا ہو رہا ہے زبان اس قدر پیاری اور دلکش ہے۔ اور شاعر نے انداز بیان سے ایسا سحر پھونکا ہے کہ انھیں ادب العالیہ کے بہترین نمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ فطرت کی اس سے بہتر تصویر کشی جس میں جذبات، زبان اور تخیل مل جل کر افسوں بن گئے ہیں، خیال میں نہیں آسکتی جس وقت اقبال نے یہ نظم لکھی ہو گی تو اس کا تخیل آسمانوں میں پرواز کر رہا ہو گا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل فطرت کے ساتھ اس قدر ہم آہنگ ہو گیا ہے کہ اس کی انفرادیت غائب ہو گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خاموش ہے چاندنی قمر کی　　شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

وادی کے نوا فروش خاموش　　کہسار کے سبز پوش خاموش

فطرت بیہوش ہو گئی ہے　　آغوش میں شب کے سو گئی ہے

خاموش ہیں کوہ و دشت و دریا　　قدرت مراقبے میں گویا

اے دل تو بھی خموش ہو جا　　آغوش میں غم کو لے کے سو جا

تنہائی شب میں ہے حزیں کیا!　　انجم نہیں تیرے ہم نشیں کیا!

یہ رفعت آسمان خاموش | خوابیدہ زمیں، جہانِ خاموش
یہ چاند، یہ دشت و در، یہ کہسار | فطرت ہے تمام نسترن زار
موتی خوش رنگ پیارے پیارے | یعنی ترے آنسوؤں کے تارے
کس شئے کی تجھے ہوس ہے اے دل! | قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

"عبدالقادر کے نام" کی نظم میں اقبال کے ارادوں اور ولولوں کا خواب صاف نظر آتا ہے۔ یہ نظم دراصل ان کے ذہنی نقوش کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جو بعد میں شاعرانہ معجزنمائی کے ساتھ زیب قرطاس ہوئے یہی وہ دھندلی سی تصویر ہے جو آئندہ "شکوہ"، "جواب شکوہ"، "شمع و شاعر"، "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" میں تخیل کی صورت گری سے دلکشی و زیبائی کا جامہ پہن کر ظاہر ہوئی ہے اور جس کی نقاب کشائی نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

مارچ ۱۹۰۷ء کی نظم میں جو دوسرے دور کی آخری نظموں میں سے ہے، اقبال نے اپنے شاعرانہ ماضی کے خلاف کھلا ہوا مظاہرہ کیا۔ یہیں سے اقبال کی شاعری کا دوسرا دور ختم ہو جاتا ہے اور ایک نئے رجحان کا آغاز نمایاں ہوتا ہے۔ جو تیسرے دور کی نظموں میں پوری وسعت میں پھیل کر جلوہ گر ہوتا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا | سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے | بنے گا سارا جہاں میخانہ۔ ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

پہلے دور میں شاعر ذوق استفہام کی بدولت قدرت سے اصول زندگی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے دور میں فطرت کے جادوے اس پر رازہائے سربستہ کی پردہ دری کر رہے ہیں اور تیسرے دور میں وہ زندگی کے رازوں سے واقف ہو کر اپنی ملت کے سامنے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ اپنی شاعری کے عہد طفولیت میں وہ ایک وطنی شاعر تھا۔ یا زیادہ سے زیادہ فطرت کا ایک چابک دست منظر کش۔ دوسرے دور میں جذبات حسن و عشق کا تلاطم، فطرت کی حسین صناعی اور زندگی کے رازوں کی آشکارائی، اس کے ذہنی نشو و نما کی غمازی کر رہے ہیں۔ بعض نظمیں پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے جس چیز کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اب اسے پا گیا ہے اور ہمارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ تیسرے دور میں وہ ایک مفکر ملت اور نبض شناس

حکیم کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اپنی دوررس نگاہوں سے قومی زندگی کے مدوجزر کا جائزہ لیکر حیاتِ قومی کے اصول مرتب کر رہا ہے۔اور مسلمانوں کی کشتی حیات کو موجوں کے تھپیڑوں سے بچا کر ہمکنار ساحل کر دینا چاہتا ہے۔

قیام ولایت کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی پیغمبرانہ شان کا آغاز ہے۔اس سے پہلے کا اقبال محض شاعر تھا مگر اس کے بعد کا اقبال ایک پیغامبر کی حیثیت رکھتا ہے جو سست عناصر قوم کے جسد خاکی میں حیات نو کا شرارہ پھونک کر اور ممکنات زندگی کے شعلہ کو بھڑکا کر اسے بیدار کرنا چاہتا ہے۔ قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے مغرب کی معاشرتی زندگی رس بس کر اس تمدن کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس دریا کے عین منجدھار میں پہونچکر اس کی انتہائی گہرائیوں کا جائزہ لیا تھا۔چنانچہ اس کے غیر معمولی غور و فکر اور ژرف نگاہی نے اسے مغرب کی سرد روحانیت سے بیزار کر دیا اور اس نے کہا ؎

پیر مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر   اس میں وہ کیف غم نہیں مجھ کو تو خانہ ساز دے

مغربی تہذیب و تمدن کی رنگا رنگ دلفریبیوں نے اقبال کے ذہنی توازن کو بگاڑا نہیں بلکہ اس پر صیقل کر کے اس میں گہرائی، صداقت اور دور رسی پیدا کر دی اور جب اس نے اس کا مقابلہ اسلامی تمدن سے کیا تو حقیقت ظاہر ہو کر سامنے آگئی اور اقبال کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تمدن کی بنیاد کس قدر کمزور اور سست ہے۔اور ان رنگین پردوں کے پیچھے اوہام کا ایک حسین پیکر ہے جس کی اصلیت کچھ نہیں۔ان دونوں تہذیبوں کے موازنہ نے اقبال کی زندگی کا عظیم الشان نصب العین متعین کر دیا۔اور اس نے اپنے تخیل اور جذبات فکری اور ذہنی استعداد کے اظہار کے لئے ایک راہ نکال لی۔اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ تہذیب کی یہ چمک دمک زوال پذیر ہے اور اس کے ساتھ مغربی قوموں کا خرمن حیات بھی خاکستر ہو جائے گا۔انھیں اس تہذیب میں روحانیت کی موت نظر آرہی تھی۔اور ان کا خیال تھا کہ مادیت کی بنیادوں پر جو فلسفہ حیات مرتب کیا جائے گا وہ انسانیت کی حفاظت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔انہی خیالات کو اقبال نے دوسرے دور کے آخر میں ان الفاظ میں بلند آواز سے منتشر کیا ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے   کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی　　　جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اس موضوع پر اقبال نے اپنی آئندہ تصانیف میں مستقل طور سے اظہار خیال کیا اور ہندوستانیوں کو اس فریب سے آگاہ کر کے صحیح راہ عمل دکھائی۔

شروع شروع میں اقبال نے سیاسی تحریکات سے متاثر ہو کر وطنیت کی نغمہ سرائی کی تھی لیکن قومیت کے تصور کی تنگ دامنی ان کے بین الاقوامی فلسفہ کا ساتھ کیوں کر دے سکتی؟ اقبال نے دیکھ لیا تھا کہ ان کی آڑ میں قومیں کس طرح قوت و اقتدار کی خواہش کو پورا کر کے انسانیت کے زوال کا باعث ہوتی ہیں۔ اور اپنے حرص و آز کو شیریں الفاظ کا جامہ پہنا کر امپیریلزم کے قیام و بقا میں محو ہوتی ہیں۔ ہر بڑے شاعر کا پیام عالمگیر ہوتا ہے اور اسکی نگاہ میں جغرافیائی حد بندیاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اقبال نے اس بت کو جو تراشیدۂ تہذیب نوی" ہے پاش پاش کر دیا۔ اور ان خیالات کی بیخ کنی کر کے اسلامی نظریۂ قومیت پیش کیا۔ اب اس ترانہ ہندی کی بجائے ترانۂ ملی لکھا اور وطنیت کے مذموم اور اوچھے فلسفہ کو اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جس سے سب کو معلوم ہو گیا کہ مغربی تہذیب کے ان خوشنما کھلونوں میں کس قدر زہر ملا ہوا ہے ؎

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی　　　رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے　　　تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے　　　قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

"شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں اقبال نے مسلمانوں کے ماضی کی شاندار روایات، حال کی تباہ حالی اور مستقبل کی امید افزا جھلکیوں کا نقشہ ایک نئے انداز سے کھینچا ہے۔ "شکوہ" میں ماضی کا گلہ اور "جواب شکوہ" میں حال کی توجیہ جس انداز میں کی گئی ہے وہ خیالی مذہب پرستوں کے نزدیک بیباکانہ سہی مگر اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک انوکھی چیز ہے جس سے اقبال کی گہری نظر اور جدت کا پتہ چلتا ہے۔ "مسدس" بھی اسی قسم کی ایک نظم ہے جسے مسلمانوں کی حیات ملی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں گو انگریزی کی واقعیت (Realism) اور ہندی کی گھلاوٹ پوری طرح موجود ہیں جس سے حالی کی استادی کا پتہ چلتا ہے۔ مگر اس میں گہرائی کے ساتھ شگفتگی موجود نہیں۔ اور واقعیت نے شعریت کے چہرہ پر نقاب ڈالدی ہے۔ "شکوہ" میں حقیقت نگاری کے ساتھ جامعیت موجود ہے

اور انداز بیان اس قدر دلکش ہے کہ خود بقول اقبال "شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے" حالی نے اپنے پرسوز اشعار سے جن میں عرب شاعروں کی سی گرمی ہے نیند کے متوالوں کو چونکا دیا اور ان کے خون میں حرارت اور تپش پیدا کی مگر اس کے باوجود تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری نمک سے خالی ہے۔ مسدس کے دیباچہ میں انھوں نے خود اس کا اعتراف کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر شاعر اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے۔ اور اس دور کے لوازمات اور تقاضوں کے مطابق اس کی شاعری کا پیکر تیار ہوتا ہے۔ مگر طرز ادا ایک الگ چیز ہے جو شاعر کی شخصیت اور انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے حالی کے یہاں جو کسک اور کھٹک ہے اقبال نے اسے اور بڑھا دیا ہے۔ حالی کے یہاں قومی احساسات کی دھیمی دھیمی آنچ ہے۔ اقبال نے اسے شعلوں میں تبدیل کر دیا۔ فارسی شاعری کے رسیا ہر چیز کو نغمہ، جام، مے محفل، ساقی اور اسی قسم کے دوسرے اصطلاحات شاعری میں دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کے دماغوں میں تکلفات اس قدر رچ گئے تھے کہ وہ ہر چیز کو اسی روشنی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اقبال نے انھی پرانے ساغروں میں تند و تیز شراب ایک نئے انداز سے بھر کر پیش کی اور اپنی غیر معمولی قوت بیان سے کام لے کر اس کام کو پورا جس کی ابتدا حالی نے کی تھی۔ ایک جگہ شکایت کا انداز کس قدر پیارا ہے ؎

دشت لیلیٰ بھی وہی، قیس کا پہلو بھی وہی — نجد کے دشت و جبل میں رم آہو بھی وہی
عشق کا دل بھی وہی حسن کا جادو بھی وہی — امت احمد مرسل بھی وہی، تو بھی وہی
پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی؟ — اپنے شیداؤں پہ یہ چشم غضب کیا معنی؟

اور پھر ایک دوسری جگہ یہ طرز کس قدر دلکش ہے ؎

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے — سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکسو بیٹھے — تیرے دیوانے بھی ہیں منتظر ہو بیٹھے
اپنے پروانوں کو پھر ذوق خود افروزی دے — برق دیرینہ کو فرمان جگر سوزی دے

قدرت کے مناظر کی دلکشی کے ساتھ ساتھ اپنے پیام کی نشر و اشاعت کا سلسلہ تیسرے دور میں بھی جاری ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اہمیت پر اقبال نے جگہ جگہ زور دیا ہے۔ اجرام فلکی کی باہمی آویزش سے

اقبال نے اجتماعی قوت کا اصول مرتب کیا ہے جس کے بغیر افراد کی زندگی میں کوئی زور نہیں ہوتا۔ تنظیم اور اخوت اور اجتماعی احساس ملت کی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اور باہمی ربط سے وہ چشمے پھوٹتے ہیں جو کشت زار قوم کو سیراب کرتے ہیں۔ ایک نظم "بزم انجم" میں اقبال نے تاروں کی زبان سے زندگی کا اصول واضح کیا ہے ؎

اک عمر میں نہ سمجھے اس کو زمین والے | جو بات پا گئے ہم تھوڑی سی زندگی میں
ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے | پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

اجتماعی تنظیم کے بغیر انفرادی زندگی بیکار ہے قطرہ دریا میں ضم ہو کر اپنی انفرادیت کو ختم نہیں کر دیتا بلکہ اصل میں اس کی زندگی کے سوتے یہیں سے کھلتے ہیں۔ فرد اور ملت کے اس تعلق کو اقبال نے "شمع اور شاعر" میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی | چھوڑ کر گل کو پریشاں کاروان بو ہوا
زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار حیات | یہ کبھی گوہر کبھی شبنم، کبھی آنسو ہوا
پھر کہیں سے اس کو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ | زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی | جب یہ جمعیت گئی، دنیا میں رسوا تو ہوا
فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں | موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

"شمع و شاعر" میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کی اصلیت سے آگاہ کیا ہے ہمتیں بڑھائی ہیں ولولوں کو تازہ کیا ہے احساس کمتری کے افسوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ نظام کائنات میں ان کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے پیام کی عظمت کا احساس دلایا ہے۔ ذمہ داریوں سے آگاہ کیا ہے۔ اور حالات کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر مستقبل کا حسین اور تابناک چہرہ دکھایا ہے ؎

اپنی اصلیت سے ہو آگاہ اے غافل کہ تو | قطرہ ہے لیکن مثال بحر بے پایاں بھی ہے
کیوں گرفتار طلسم ہیچ مقداری ہے تو | دیکھ تو پوشیدہ تجھ میں شوکت طوفاں بھی ہے
سینہ ہے تیرا امیں اس کے پیام ناز کا | جو نظام دہر میں پیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے　　　یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

جواب شکوہ" میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی　　　برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی　　　فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے　　　یعنی وہ صاحب اوصاف حجازی نہ رہے

"خضر راہ" میں جو تیسرے دور کی مقبول ترین نظموں میں سے ہے۔ اقبال نے حالات حاضرہ پر بڑی گہری تنقید کی ہے یہ نظم ۱۹۲۲ء میں لکھی گئی اور سوز و گداز سے لبریز ہے جنگ عظیم کی ہولناک تباہ کاریوں کا نقش اقبال کے دل پر مرتسم ہو چکا تھا۔ انھوں نے اس میں انسانیت کا خون ہوتے دیکھا تھا۔ ممالک اسلامیہ کہ جو پہلے ہی سے اضمحلال کی گہرائیوں میں ڈوب چکے تھے۔ اس دھچکے کی تاب نہ لا سکے انتشار کی قوتیں نشوونما پا چکی تھیں۔ پراگندگی اور بدنظمی سے حالت پہلے ہی دگرگوں تھی اس پر دوسرا چرکہ لگا۔ دنیائے اسلام پر نکبت و ادبار کی گھٹائیں ہر چہار طرف سے چھا گئی تھیں، اور اسلامی سلطنت کا خیال افسانۂ پارینہ ہو کر رہ گیا تھا۔

اس نظم میں اقبال نے صحرانوردی کی حقیقت بیان کی ہے۔ زندگی کے رموز آشکارا کئے ہیں سلطنت اور حکومت کی ماہیت کا نقشہ کھینچا ہے۔ سرمایہ و محنت کی آویزش پر روشنی ڈالی ہے۔ ایشیا کی یورپ زدگی پر اظہار خیال کیا ہے ممالک اسلامیہ کی سیاسی روش پر تنقید کی ہے اور مسلمانوں کو امید کا درس دیا ہے۔ یہ نظم گوناگوں خیالات سے لبریز ہے اور اس میں زندگی کے بہت سے باریک نکات حل کئے ہیں۔

زندگی کا فلسفہ پیش کرنے میں اقبال نے بڑی ندرت سے کام لیا ہے وہ زندگی عام پیمانوں سے ناپنا نہیں چاہتے ان کے خیال میں حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے وہ ایک تخلیقی حرکت ہے جو زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے سخت کوشی زندگی کا اساسی اصول ہے اور آزادی اس کی نشوونما اور تسلسل کا جزو لاینفک۔ غلامی سے زندگی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں اور انسان زندگی کی حقیقی مسرت سے محروم ہو جاتا ہے۔ روح کی بالیدگی تخلیقی قوتوں کی نشوونما اور بلند مقاصد کو حاصل کرنے کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور انسانی تگ و تاز کا میدان تنگ ہو جاتا ہے ؎

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ جوئے شیر و تیشۂ و سنگ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

"طلوع اسلام" میں اقبالؔ نے اپنا رجائی پیغام بڑے پُر شوکت انداز میں پیش کیا ہے۔ یاس و ناامیدی کی کالی کالی گھٹاؤں میں امیدوں کا چمکتا ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اقبالؔ نے اسلام کی سربلندی کا جو خواب دیکھا تھا۔ زمانہ نے اس کی تفسیر پیش کر دی اور جنگ عظیم کے بعد کچھ ہی عرصہ میں اسلامی سلطنت کے تن خاکی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہر بڑے شاعر کے کلام میں الہامی رنگ ہوتا ہے۔ وہ محض افکار کی سرمستی میں محو نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے "آئینہ گفتار" میں مستقبل کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ اس کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے اور وجدان تیز تر۔ وہ زمانہ کا بڑا نبض شناس ہوتا ہے اور اسی لئے اس کے پیام میں حیات قومی کی تعمیر کے لئے ایک لائحہ عمل موجود ہوتا ہے۔ "شمع و شاعر" میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کر کے کہا تھا ؎

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

"طلوع اسلام" میں ایک نئے انداز سے پھر اسے دہرایا اور کہا ؎

تری فطرت امیں ہے ممکنات زندگانی کی جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

"خضر راہ" میں شاعر کے جذبات میں ایک ہلکا سا قنوطی انداز ہے لیکن اب اس کا پیام شک اور تذبذب، اضطراب و بے چینی کی جگہ یقین و وثوق، سکون اور اطمینان کے جذبات سے مملو ہے۔ اسے یقین ہے کہ اگر مسلمان کے ایمان کی چنگاریوں کو مشتعل کیا جائے تو وہ پھر تقدیر کی صورت گری کر سکتا ہے۔

"طلوع اسلام" میں وہ امید کے گیت الاپ رہا ہے اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اس کی لے میں ترنگ ہے اور انداز میں مستی۔ ترانوں میں تازگی ہے اور موسیقیت۔ وہ شراب زندگی سے مدہوش کیف و سرور کے عالم میں گائے جا رہا ہے اور نغموں کے روح پرور ارتعاش سے جذبات کو چھیڑ رہا ہے۔ اس کی آواز میں سحر ہے اور انداز بیان میں بے پناہ دلکشی۔ احساسات میں خوشی مسکرا رہی ہے

نواؤں میں زندگی ہے اور زندگی میں حسن۔ اس کے ہر لفظ سے امرت کے رس کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ اور اس کا دل انبساط کی لہروں کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔ یہی کیفیت اس کے ساز کے ہر تار سے نکل کر صفحۂ قرطاس پر نمایاں ہوگئی ہے ؎

بیا ساقی نوائے مرغزار از شاخسار آمد — بہار آمد نگار آمد نگار آمد قرار آمد

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا — صدائے آبشاراں از فراز کوہسار آمد

کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش — پس از مدت ازیں شاخ کہن بانگ ہزار آمد

بہ مرغاک شہیدے برگہائے لالہ می پاشم — کہ خونش با نہال ملت ما سازگار آمد

"بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم — فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم"

ادھر تو "بانگ درا" کی تیسرے دور کی نظمیں لکھی جا رہی تھیں اور اُدھر "اسرار خودی" اور "رموز خودی" کا تانا بانا تیار ہو رہا تھا۔ یہی وہ معرکۃ الآرا مثنویاں ہیں جنھوں نے اقبال کی شہرت کو چار چاند لگا دئے اور ان کے عالمگیر پیام کا شہرہ تمام دنیا میں پھیل گیا۔ جس طرح ملٹن کی "گم شدہ فردوس" نے اس کی شاعرانہ عظمت کا نقش دلوں پر بٹھا دیا۔ اور شہرت عام اور بقائے دوام کا مرصع تاج اس کے سر پر رکھ دیا اسی طرح اقبال سب سے پہلے ان ہی مثنویوں کی بدولت ایک مفکر کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اُن کی ان دو مثنویوں نے دنیائے تصوف اور دنیائے ادب میں تہلکہ ڈال دیا۔ ادر انھوں نے افراد، قوموں اور کائنات کی خودی کا جو نظریہ پیش کیا اس سے انانیت کے تمام پرانے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ ڈھکے ہوئے اشارے اور دھیمی آوازیں جو کبھی کبھی "بانگ درا" میں "ذوق عمل" اور "ذوق طلب" کی مبہم اصطلاحوں کے پردوں میں ظاہر ہوتی تھیں اب ایک گرج بنکر گونج اٹھیں۔ شاعری فلسفہ اور تصوف کی جھلکیاں پہلے بھی نظر آتی تھیں۔ اب اقبال نے ایک فلسفی شاعر کی قبا پہن لی اور اس کے فلسفہ نے ایک منظم فلسفہ زندگی کی حیثیت اختیار کر لی۔

اقبال کے فلسفہ کا سنگ بنیاد جو "اسرار خودی" کا موضوع ہے۔ اثبات خودی میں مضمر ہے۔ اپنی ہستی کا احساس اور اپنی قوتوں کا ادراک فرد کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔ اس سے انسان میں یقین، وثوق اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور اس پر زندگی کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوتا ہے۔ انسان خدا

کی ہستی کا ایک پر تو ہے۔ اس لئے شعور ذات کے بغیر ہستی مطلق کی معرفت حاصل ہونا ممکن نہیں۔ اگر خدا کو ایک بحر ذخار تصور کر لیا جائے تو اس میں انسان کی ہستی ایک قطرہ کی مانند ہے۔ شعور ذات سے انسان میں عمل کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ تمنائیں اور ولولے تازہ تازہ ہو جاتے ہیں جن سے رزمگاہ خیر و شر میں وہ اپنی دنیا آسانی سے بنا سکتا ہے۔ فرد کا نفس گو ایک فانی ہستی ہے مگر وہ اپنا علیٰحدہ وجود رکھتی ہے جو عمل سے پائیدار اور لازوال بن جاتی ہے۔ خودی کا استحکام اور نشو و نما اُس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ غیر خودی یعنی عالم طبعی سے مسلسل برسرپیکار رہے۔ اس سے نت نئی خواہشات کی تخلیق ہوتی رہتی ہے اور نئے نئے مقاصد کا تعین ہوتا ہے اسی سے ارادے اور امنگیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ سوز آرزو پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے تڑپ اور بے چینی بے قراری اور کسک پیدا ہوتی ہے۔ جو زندگی کا دوسرا نام ہے ؎

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دل خود زندہ دار　　تا نگردد مشت خاک تو مزار

آرزو جان جہانِ رنگ و بوست　　فطرت ہر شئے امیں آرزوست

آرزو ہنگامہ ہائے خودی　　موج بے تابے ز دریائے خودی

ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم　　از شعاع آرزو تابندہ ایم

خودی کی منازل ترقی زمان و مکان کی حد بندیوں کو قبول نہیں کرتیں بلکہ ان کے طلسم کو توڑ کر عالم ماورائے کی پہنائیوں میں ڈوب جاتی ہیں اور اپنی تگ و تاز کے لئے نئے نئے میدان تلاش کرتی ہیں ؎

خودی کی ہے یہ منزل اولیں　　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں!

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر　　طلسم زمان و مکاں توڑ کر!

"بال جبریل"

خودی کی تقویت اور رہنمائی کے لئے عشق ضروری ہے۔ اقبال نے عشق کو بہت وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس سے مراد وہ جذب اندروں ہے جس کا سرچشمہ وجدان ہے۔ محبت ہی سے خودی معراج کمال تک پہونچتی ہے اور اسی سے اس شرارہ میں سوز، جلا اور تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادیں اسی سے استوار ہوتی ہیں اور وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو روحانیت کا جوہر ہے۔ عشق ہی کائنات

کی اصل روح ہے اور اسی سے انسان اعلیٰ مدارج تک پہونچتا ہے ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیر خاک ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

عشق را از تیغ و خنجر باک نیست
اصل عشق از آب و باد و خاک نیست

دل ز عشق او توانا می شود
خاک ہمدوش ثریا می شود

احساس خودی کی اہمیت کو اقبال نے جگہ جگہ دہرایا ہے اور اس کی لازوال قوتوں کی مدح سرائی میں اپنی پوری طاقت صرف کردی ہے ؎

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی زِ اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالم پندار کرد

صد جہاں پوشیدہ اندر ذات او
غیر او پیداست از اثبات او

اقبال کا فلسفۂ انفرادیت جس میں زندگی اور کائنات کی وحدت کا تصور پیش کیا گیا ہے ہیگل کے فلسفہ سے بالکل مطابقت نہیں کرتا۔ اس کے خیال کے مطابق انسان کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ وہ حیات کلی میں جذب ہو جائے اور اپنی انفرادی حیثیت کو ختم کردے۔ اقبال خودی کی ابھار اور نشو و نما کے قائل ہیں جس سے انسان میں تسخیر نفس و آفاق کی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ خدا کو بھی اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کے عزائم کا یہ حال ہو جاتا ہے ؎

در دشت جنون من جبرئیل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ!

اقبال کی رائے میں مصائب و آلام خودی کی تربیت اور اصلاح کا موجب ہیں۔ شوپنہار کے نزدیک یہی چیز خودکشی کے جواز میں پیش کی جا سکتی ہے۔ فقر و استغنا خودی کی نشو و نما کے لئے ضروری ہیں۔ فقر مادی لذتوں سے بے نیازی، نوامیس فطرت کی تسخیر اور دنیا میں انسانیت کے نصب العین کو فروغ دینے کا نام ہے۔ جب خودی عشق و محبت اور فقر و استغنا سے پختگی حاصل کر لیتی ہے تو اس میں زندگی کی لازوال قوتیں بروئے کار آجاتی ہیں اور کائنات میں اپنی برتری کا سکہ جما دیتی ہیں۔ اس وقت اس کی

براتی کے خلاف کوئی روک تھیں کی جاسکتی اور انسان اپنی اس حیثیت سے بہت بلند ہو جاتا ہے اسی سے اس میں روحانیت کا عنصر طاقتور ہو جاتا ہے اور احساس نفس کے مکمل نشو و نما کے بعد وہ قرب الٰہی حاصل کر سکتا ہے اور یہی ارتقائے خودی کا انتہائی نصب العین ہے جو اقبال پیش کرتے ہیں۔

فرد اور ملت کے قانون کو اقبال نے بیخودی سے تعبیر کیا ہے جس سے انسان کی انفرادی قوتیں زیادہ منظم اور منضبط ہو جاتی ہیں۔ اجتماعی خودی کا احساس فرد کی خودی کے احساس کو تقویت پہونچاتا ہے اور اسے وسیع تر اور محکم تر کر دیتا ہے۔ اس سے اس کی تیغ خودی آبدار ہو جاتی ہے اور اس کی فطرت کا جوہر اپنے کمال کو پہونچتا ہے۔ اسلام کے تمام ارکان میں اجتماعی احساس کی یہی روح کام کر رہی ہے اور اسی نے ابھی تک مسلمانوں کو ایک مضبوط معاشرتی نظام میں باندھے رکھا ہے۔ ملت میں گم ہو کر افراد کی ہستی گم نہیں ہو جاتی بلکہ وہ زیادہ موثر اور معنی خیز بن جاتی ہے افکار اور کردار کی وحدت جو اسلامی تعلیمات کا اساسی اصول ہے۔ آئین ملت کو سامنے رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اسی سے کسی قوم میں سربلندی پیدا ہو سکتی ہے اقبال نے اس موضوع پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے

فرد را ربط جماعت رحمت است — جوہر او را کمال از ملت است

تا توانی با جماعت یار باش — رونق ہنگامہ احرار باش

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

خلافت راشدہ، کے زوال کے بعد مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی کمزوریوں کی وجہ سے اسلام کے بنیادی تصورات بھی متزلزل ہونے لگے۔ عباسیوں کے عہد حکومت میں جب عجمیت کا عنصر اپنے شباب پر تھا اور مسلمانوں کی ذہنی زندگی اس سے پورے طور پر مرعوب ہو چکی تھی۔ اسلامی نظریوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ یونانی اور ہندی فلسفہ جب مسلمانوں کے ہاں منتقل ہوا تو اس کے اثرات مسلمانوں پر بہت گہرے پڑے افلاطون کے فلسفہ نے مسلمانوں کی زندگی میں جمود پیدا کر دیا اور ان کے قوائے عملیہ شل ہو گئے۔ جن کا نتیجہ رہبانیت اور تباہی کی صورت میں نمایاں ہوا۔ ویدانت کے فلسفہ نے اسلامی فلسفہ کی صورت مسخ کر دی۔

اور مسلمانوں پر تصوف کا رنگ غالب آگیا۔ اسلام کا اساسی اصول توحید ہے اور تصوف کی بنیاد وہمہ اوست کے نظریہ پر قائم ہے۔ توحید مثبت ہے اور ہمہ اوست منفی، صوفیوں کا رقص متانہ افلاطونی روح کا عکس ہے۔ جس نے زندگی کی عملی قوتوں کو معطل کر دیا ہے۔ اقبال کے فلسفہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ وہ اسلامی تصائد اور عقائد کو ان تاثرات سے آزاد کردے اور مسلمان پھر جادۂ عمل پر گامزن ہوکر زندگی کی نبرد آزمائیوں میں شریک ہوں اور اس جہان رنگ و بو کی تزئین و آرائش کریں۔ فلسفۂ عمل کے متعلق "رموز بیخودی" میں لکھتے ہیں ؎

در عمل پوشیدہ مضمون حیات   لذتِ تخلیق قانون حیات
باجہانِ نامساعد ساختن   ہست درمیداں سپر انداختن
گر نہ سازد با مزاج او جہان   می شود جنگ آزما خود با جہاں
برکند بنیاد موجودات را   می دہد ترکیب نو ذرات را
می کند از قوت خود آشکار   روزگار نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست   ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
زندگانی قوتِ پیدا استے   اصل او از ذوق استیلا استے
عفو بے جا سردی خون حیات   سکتۂ در بیت موزون حیات
ناتوانی زندگی را رہزن است   بطنش از خوف و دروغ آبستن است

اقبال کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے انحطاط کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے عمل کی زندگی کی بجائے افلاطونی بے عملی اختیار کر لی ہے۔ وہ انھیں افلاطون کی متشائم پسندی کے خلاف خبردار کرتا ہے اور اس سے بہت بیزار ہے ؎

راہب دیرینہ افلاطون حکیم   از گروہ گوسفندان قدیم
گفت سر زندگی در مردن است   شمع را صد جلوہ از افسردن است
گوسفندے در لباس آدم است   حکم او بر جان صوفی محکم است
بسکہ از ذوق عمل محروم بود   جان او وارفتۂ معدوم بود

مسکر ہنگامۂ موجود گشت خالق اعیان نامشہود گشت
آہوش بے بہرہ از لطف خرام لذت رفتار برکبکش حرام
شبنمش از طاقت رم بے نصیب طائرش را سینہ از دم بے نصیب
ذوق روئیدن ندارد دانہ اش از تپیدن بے خبر پروانہ اش
قوم ہا از سکر او مسموم گشت خفت و از ذوق عمل محروم گشت "اسرارِ خودی"

اقبال نے اپنی تمام تصانیف میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقہ کے خلاف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن کی پروردہ و ساختہ نسل سے ان کی بیزاری کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس نے ان کے دماغوں سے اعلیٰ روحانی اور اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت کو زائل کر دیا۔ مادی فلسفہ و سائنس سے اکتساب نور کرنے والوں کا ذوق و شوق سرد پڑ گیا۔ ان کے دماغ تو روشن ہیں۔ مگر دل تیرہ اور نگاہیں بیباک ہیں فقر و استغنا جو اقبال کے آئیڈیل انسان کی لازمی صفات ہیں ان میں مفقود ہیں۔ کیونکہ موجودہ تن آسانیوں کے ساتھ ان چیزوں کا تطابق نہیں ہو سکتا۔ قومیت اور وطنیت کے خیالات ان کے دماغوں میں اس طرح رچ چکے ہیں کہ اب انسانیت کی کوئی قدر ان کی نگاہوں میں نہیں رہی اقبال کے نزدیک عورت کا سب سے بڑا جوہر عصمت و عفت ہے۔ جو یورپین معاشرت کے اثرات کی وجہ سے زنگ آلودہ ہو گیا ہے۔ اقبال اس کی نظر میں وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے اور اسے اپنی نسائیت کو برقرار رکھنے کی ہدایت کرتا ہے ؎

آں تہی آغوش نازک پیکرے خانہ پرورد و نگاہش محشرے
فکر او از تاب مغرب روشن است ظاہرش زن، باطن او نازن است
بندہائے ملت بیضا گسیخت تا ز چشمش عشوہ ہا حل کردہ ریخت
شوخ چشم و فتنہ زا آزادیش از حیا نا آشنا آزادیش
علم او بار امومت برنتافت بر سر شامش یکے اختر نتافت
این گل از بستان ما نارستہ بہ داغش از دامان ملت شستہ بہ "رموز بیخودی"

وطنیت کے مغربی نظریہ پر بھی اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار بڑی گرم جوشی کے ساتھ کیا ہے۔

یورپ میں سب سے پہلے اس ذلیل فلسفہ کو رواج دینے والا میکا دلی تھا جس نے مادیت کی بنیادوں پر یہ عمارت اٹھائی۔ وہ فلارنس کا رہنے والا تھا۔ اور اس نے "الملوک" ایک کتاب لکھی جو بعد میں شاہنشاہوں کا لائحہ عمل بنی مگر اقبال کی برہمی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے حب وطن کو جغرافیائی حدبندیوں میں مقید کر دیا۔ وطن یا وطنیت محض ایک عارضی چیز ہے۔ تاریخی حوادث اس کی حدود میں ہمیشہ تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمارے لئے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی میکا دلی کے اس فلسفہ نے یورپ میں اس قدر رواج پکڑا کہ اس کی ایک مستقل حیثیت قائم ہو گئی۔ آج بھی وہ یورپ کے مفکروں اور سیاستدانوں کے دماغ پر مسلط ہے اور اسی کی بنا پر اقوام یورپ مناقشات کا شکار ہو رہی ہیں۔ ہر ملک کے لئے اس کی متعینہ حدود کی انسانی آبادی سربلندی اور سرفرازی کے قابل ہے اور افراد کا انتہائی نصب العین وطنیت پرستی ہے۔ بین الاقوامی روح کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اقبال نے اپنی مثنوی میں لکھا ہے ؎

دہریت چوں جامۂ مذہب درید — مرسلے از حضرت شیطاں رسید
آں فلارنسائی باطل پرست — سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
تنگری مانند آذر پیشہ اش — بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت — فکرِ او مذموم را محمود ساخت
بوسہ تا بر سرِ پائے ایں معبود زد — نقدِ حق را بر عیارِ سود زد
طرحِ تدبیرِ زبوں فرجام ریخت — ایں خسک در جادۂ ایام ریخت
شب بہ چشمِ اہلِ عالم چیدہ است — مصلحت تزویر را نامیدہ است ("رموزِ بیخودی")

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بیخودی" کے کچھ ہی عرصہ بعد "پیامِ مشرق" منظرِ عام پر نمایاں ہوئی۔ "اسرارِ خودی" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں حقیقت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اور "رموزِ بیخودی" میں تخیلی عنصر غالب ہے "پیامِ مشرق" میں شاعر نے حقیقت اور تخیل کا بڑا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ اس پر فارسی کی شیرینی نے وہ اثر کیا ہے کہ "پیامِ مشرق" کو بجا طور پر دنیا کے بہترین ادبی شاہکاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ شعریت قدم قدم پر موتی لٹاتی ہے اور زبان کی سلاست اور ترنم ریزی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلکش نغمے الفاظ کے

پیکروں میں ڈھل گئے ہیں تخیل کے آبدار موتیوں سے تمام کلام مرصع ہے اور زبان کے سحر نے ان کی شان کو اور دوبالا کر دیا ہے۔ اس لالہ زار کی نکہت آنی جانی نہیں بلکہ دائم و قائم رہنے والی ہے۔ کیونکہ شاعر نے اسے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ اور اپنی بہترین دماغی صلاحیتوں سے کام لے کر اس میں رنگ و بو پیدا کیا ہے۔ یہ کتاب گوئٹے کی مشہور کتاب "سلام مغرب" کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اقبال نے شروع کے اشعار میں خود کہا ہے ؎

پیر مغرب شاعر المانوی　　آں قتیل شیوہ ہائے پہلوی

بست نقش شاہدان شوخ و شنگ　　داد مشرق را سلامے از فرنگ

در جوابش گفتہ ام پیغام شرق　　ماہ تابان ریختم بر شام شرق

اس مجموعہ کی تمام تصویریں بڑی پیاری ہیں جن میں اقبال نے اپنے موقلم سے بڑی شوخ گلکاریاں کی ہیں۔ اور ہر چند وہ "آرٹ برائے آرٹ" کے نظریہ کا قائل نہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خدا نے اسے شاعر پیدا کیا ہے۔ اس کے افکار کی صورتگری میں شعریت کا دامن کہیں بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ اور شاعر کا جمالیاتی ذوق ہر تصویر میں جھلکتا ہے "پیام مشرق" میں یہ رنگ اس قدر گہرا ہو گیا ہے کہ اسے رنگ اور لطافت کا دلپذیر مجموعہ کہا جا سکتا ہے جس نے اپنے اظہار کے لئے الفاظ کی شکل اختیار کر لی۔ صوری اور معنوی حیثیت سے اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اس کا صحیح ادراک کرنے کے لئے روح ادب سے واقف ہونا ضروری ہے کتاب کو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نکتہ دان المانوی" اور "بلبل شیراز" کی دو روحوں نے اقبال کے قالب میں جنم لیا ہے۔

کتاب "پیش کش" سے شروع ہوتی ہے جس کے بعد رباعیات ہیں جن میں اقبال نے زندگی، سخت کوشی، خودداری، عقل و عشق اور خودی پر بعض نہایت بلیغ اشعار قلمبند کئے ہیں۔ اور زبان کی نزاکت کے ساتھ عقل اور حکمت کے ایسے ایسے رموز آشکارا کئے ہیں جن سے ان کی وسعت فکر تازگی تخیل کا پتہ چلتا ہے ان انمول موتیوں میں سے اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے، چند گوہر بے بہا کو پیش کرتا ہوں ؎

دمادم نقشہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرار زندگی نیست

اگر امروز تو تصویر دوش است　　بخاک تو شرار زندگی نیست

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت — شریک سوز و ساز بحر و بر شو
تو این جنگ از کنار عرصہ بینی — بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

زمیں خاک درے خانۂ ما — فلک یک گردش پیمانۂ ما
حدیث سوز و ساز ما دراز است — جہاں دیباچۂ افسانۂ ما

دوام ما ز سوز ناتمام است — چو ماہی جز تپیش بر ما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل — تپیدی یک دم و مرگ دوام است

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

اگر آگاہی از کیف و کم خویش — یمے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے؟ — شب خود برا فروز از دم خویش

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است
گر از دست تو کار نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

سفالم را مئے او جام جم کرد — درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بتخانہ ریخت — خلیل عشق دیرم را حرم کرد

گدائے جلوہ رفتی بر سر طور — کہ جان تو ز خود نامحرمی است
قدم در جستجوئے آدمی زن — خدا ہم در تلاش آدمی است

فطرت کی منظر کشی کے بعض حسین نمونے جو ”بانگ درا“ میں ملتے ہیں، وہ ہم اس سے پہلے پیش کر چکے ہیں۔ ”پیام مشرق“ میں یہ نمونے اور زیادہ دلکش ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ان میں موسیقیت اور ترنم کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے۔ ”فصل بہار“۔ ”سرود انجم“۔ ”نوائے وقت“۔ ”نغمۂ ساربان“ اور ”ساقی نامہ“ اس طرز کے بہترین نمونے ہیں جن میں اقبال نے سبک و شیریں الفاظ کی نشست و ترکیب سے دل موہ لینے والی راگنیاں پیدا کی ہیں اور نغموں کے نشاط انگیز انتشار سے کیف آور فضا پیدا کر دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

مست ترنم ہزار طوطی و دراج و سار
بر طرف جوئبار کشت گل و لالہ زار

چشم تماشا بیار

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابر بہار

خیز کہ در باغ و راغ، قافلۂ گل رسید

باد بہاراں وزید مرغ نوا آفرید
لالہ گریباں درید حسن گل تازہ چید

عشق غم نو خرید

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گل رسید

حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزیں

بر لب جوئے نشیں آب رواں را ببیں
نرگس ناز آفریں لخت دل فرو دیں

بوسہ زنش بر جبیں

حجرہ نشینی گزار، گوشۂ صحرا گزیں ''فصل بہار''

ہستیٔ ما، نظام ما مستیٔ ما، خرام ما
گردش بے مقام ما زندگیٔ دوام ما

دور فلک بکام ما، می نگریم و می رویم

خواجہ ز سروری گذشت بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت دور سکندری گذشت

شیوۂ بت گری گذشت، می نگریم و می رویم

پردہ چرا ز ظہور چیست؟ اصلِ ظلام و نور چیست؟
چشم و دل و شعور چیست؟ فطرتِ ناصبور چیست؟
ایں ہمہ نزد و دور چیست؟ می نگریم و می رویم

"سرودِ انجم"

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم
در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم
من دردم و درمانم، من عیشِ فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم
چنگیزی و تیموری مشتے ز غبارِ من
ہنگامۂ افرنگی یک جستہ شرارِ من
انسان و جہانِ او ایک نقش ز نگارِ من
خونِ جگرِ مردان سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم، من روضۂ رضوانم
آسودہ و سیارم ایں طرفہ تماشا بیں
در بادۂ امروزم کیفیتِ فردا بیں
پنہاں بہ ضمیرِ من، صد عالمِ رعنا بیں
صد کوکبِ غلطاں بیں صد گنبدِ خضرا بیں
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم

"نوائے وقت"

ناقۂ سیارِ من آہوئے تاتارِ من
درہم و دینارِ من اندک و بسیارِ من
دولتِ بیدارِ من
تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست
دلکش و زیباستی شاہدِ رعناستی
روکشِ حوراستی غیرتِ لیلاستی
دخترِ صحراستی
تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست

نغمۂ من دلکشائے — زیر و بمش جانفزائے
قافلہ ہا را درائے — فتنہ ربا فتنہ زائے

اے بہ حرم چہرہ سائے
تیز ترک گام زن، منزل ما دور نیست

"نغمۂ ساربان"

خوشا روزگارے، خوشا نوبہارے — نجوم پرن رست از مرغزارے
لب جو خود آرائی غنچہ دیدی؟ — چہ زیبا نگارے چہ آئینہ دارے
نواہائے مرغ بلند آشیانے — در آمیخت با نغمۂ جوئبارے
تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را — نہاد است در دامن کوہسارے
چہ خواہم دریں گلستاں گر نخواہم — شرابے، کتابے، ربابے نگارے
بہ ساغر فرو ریز آبے کہ جاں را — فروزد چو نورے، بسوزد چو نارے

"ساقی نامہ"

(باقی آئندہ)

(اسلوب احمد صاحب انصاری متعلم مسلم یونیورسٹی)

انقلاب روس کا تاریخی پس منظر

انقلاب روس سے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا پر ایک عظیم و ہمہ گیر اثر پڑا ہے۔ انقلاب صرف سیاسی اور معاشری نظام کو درہم برہم نہیں کرتا بلکہ اس سے ذہنی رجحانات بھی یکسر بدل جاتے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے تجربات سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ انقلاب فرانس نے فرانس ہی کی شہنشاہیت کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کے اثرات اس قدر دور رس تھے کہ اس نے تمام یورپ کو آزادی، مساوات اور اخوت کا سبق دیا۔ اگر آپ یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس کا صحیح اندازہ ہو جائے گا

اس سلسلہ میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے انقلاب کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ نہایت اہم ہے۔ اسی صورت میں ہم انقلاب کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ کسی ملک میں انقلاب خود بخود نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے پس پشت ایک زبردست تاریخ ہوتی ہے۔ اس تاریخ کو بنانے والے ایک یا دو افراد نہیں ہوتے بلکہ ایک انقلابی جماعت ہوتی ہے جس کے افراد اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ وہ گمنامی کی حالت میں ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ انقلابی تحریک کا ابتدائی دور ہمیشہ ہنگامی ہوتا ہے جس میں بعض عجیب غریب باتیں رونما ہوتی ہیں۔ مگر یہ خاص حالات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ اس طرح انقلابی تحریک سماج کی گود میں پرورش پاتی رہتی ہے۔

روس کے انقلاب کو اکثر لوگ ایک معجزہ سمجھتے ہیں لیکن اگر اس کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ روس کی تاریخ کا ایک لازمی نتیجہ تھا۔ سیاسی اعتبار سے روس دیگر مغربی اقوام کے مقابلہ میں بہت پیچھے تھا۔ روس کی سیاسی جد وجہد ایک عجیب کش مکش کی تاریخ ہے۔ ایک طرف تو ہم قرون وسطیٰ کے گرجا اور ایشائی مطلق العنان بادشاہت کو دیکھتے ہیں اور دوسری طرف نراجی اور عدمیت پسند تحریکیں بروئے کار نظر آتی ہیں۔

روس کے دو بڑے تاریخی ادارے زار اور بڑے زمیندار تھے۔ زار کی اہمیت سیاسی تھی اور زمینداروں کی

کی سماجی۔ زار کی شخصیت کی وجہ سے روس کے لوگوں میں اتحاد رہا اور وہ تاتاریوں، ترکوں، پولینڈ اور سویڈن کے رہنے والوں کے مقابلہ میں لڑائیوں میں کامیاب رہے۔ اس کے علاوہ امراء اور جاگیرداروں کی سرکوبی ہوتی رہی اور انھیں سر اٹھانے کا موقعہ نہیں دیا گیا۔ اسی طرح پادریوں اور مذہبی رہنماؤں کو بھی زار کے خلاف کبھی دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ ایک طرح سے یہ لوگ زار کے ہمیشہ حلیف رہے۔ اسی طرح حالات نے روس میں ایک شخصی حکومت کو برقرار رکھا۔ اور زار کی شخصی قوت یورپ کی دیگر شخصی حکومتوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ رہی، روس ایک زرعی ملک رہا ہے۔ وہاں صنعتی اور شہری زندگی تقریباً مفقود تھی۔ وہاں کی زیادہ تر آبادی مزدور کاشتکاروں کی جماعتوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ صحیح معنوں میں کاشتکار بھی نہیں تھے۔ بلکہ زمینداروں کے غلام تھے جو قلیل اجرت پر کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ اس نظام کی وجہ سے زمینداروں اور زار میں یگانگت تھی۔ اس طرح حکومت کو لگان وصول کرنے اور فوج میں رنگروٹوں کو بھرتی کرنے میں آسانی رہتی تھی۔

اسی وجہ سے تمام ملک پر جہالت اور افلاس کی بلا مسلط رہی حکومت کی سختیوں سے لوگوں میں بے چینی پیدا ہوتی رہتی تھی۔ جو اکثر اوقات بغاوتوں کی شکل میں نمودار ہوتی۔ ان حالات نے اس سوئی ہوئی قوم میں انتہا پسند انقلابی جراثیم پیدا کر دئے۔

کیتھرائن اور الیگزنڈر اول کے زمانے میں انتہائی قسم کے لبرل خیالات اعلیٰ طبقہ کے لوگ صرف فیشن کی خاطر رکھتے تھے۔ چنانچہ نکوس کے عہد کے شروع میں پیٹرس برگ کے سنتریوں نے جن میں بہت سے لوگ خاندان کے افسران بھی شامل تھے بغاوت کرنا چاہی مگر انھیں سختی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ الیگزنڈر دوئم کے عہد میں مختلف حالات نے روس کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

جنگ کریمیا کی شکستوں کی وجہ سے اس وقت کی طرز حکومت کو غیر مفید خیال کیا جانے لگا۔ عام طور سے مغربی طرز حکومت کو ترجیح دی گئی۔ نوجوان زار نے اس ضرورت کو محسوس کیا چنانچہ اس نے غلام کاشتکاروں کی نجات کے لئے قانون بنائے نئی عدالتیں قائم کیں اور تعلیم عام کرنا چاہی مگر ان اصلاحات کی روس کے رجعت پسند طبقہ نے مخالفت کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح رجعت پسندوں اور انتہا پسندوں میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ ان اختلافات نے ان دونوں جماعتوں میں بڑی کشمکش پیدا کر دی۔ کیونکہ انتہا پسند جماعت سے نہ صرف

سیاسی اداروں کو خطرہ تھا۔ بلکہ وہ سماج کے پرانے اور بوسیدہ اداروں یعنی ملکیت، مذہب اور خاندان کے بھی درپے تھی۔

ان حالات میں روس کی انقلابی تحریک کی بنیاد پڑی۔ آسانی کے لئے ہم اس تحریک کی تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

پہلا دور ۱۸۵۵ء (جو الیگزنڈر دویم کے عہد سے شروع ہوتا ہے) سے ۱۸۷۰ء تک ہے۔ اس دور کی خصوصیت منفی اور تخریبی ہے جو عدمیت (Nchilism) کی صورت میں نمودار ہوئی مختصر الفاظ میں اس تحریک کا مقصد سوسائٹی کے تمام فرسودہ اداروں کو مٹانا ہے تاکہ پھر نئے سرے سے سماج کی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ نظریہ محض سیاسی نہیں تھا بلکہ ہیگلی فلسفہ کے بائیں بازو کی روح تھی۔ اور اس کی بنیاد Moleschott اور Buchner کے فلسفۂ مادیت پر تھی۔ اس ملک میں جہاں تعلیم یافتہ طبقہ پر مذہب کا اثر کم ہوا اور عوام کے دماغ فلسفہ کی ذہنی عیاشیوں سے پاک ہوں وہاں فلسفۂ مادیت کو قبول کرنا کوئی تعجب خیز بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روس کے اس زمانے کے بڑے بڑے مفکر فلسفۂ مادیت کے علمبردار تھے۔

تورگنیف نے اس تحریک کا نقشہ اپنے مشہور ناول "باپ اور بیٹے" میں اس طرح کھینچا ہے کہ نہلسٹ وہ لوگ تھے جو ــــــ "کسی قسم کی طاقت یا حاکم کے سامنے سر نہیں جھکاتے تھے اور کسی اصول کو خواہ وہ کتنا ہی قابلِ تعظیم ہو عقیدہ کا درجہ نہیں دیتے تھے۔" وہ لوگ سیاسی اور سماجی اداروں۔ مذہب اور خاندان پر منفی نقطۂ نظر سے تنقید کرتے تھے وہ اُن تمام باتوں کو جو پرانی ہیں (خواہ وہ اچھی ہوں یا بری) ٹھکراتے تھے۔ ان کے لئے آرٹ، شاعری یا رومان کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ ان کے خیال میں ایک نیا تجربہ جو مینڈک چیر کر کیا جائے اور ہمارے اثباتی علم میں اضافہ کرے زیادہ اہم تھا۔ بہ نسبت گوئٹے کی شاعری یا رفیئل کی مصوری کے۔

تورگنیف کے ناول کا ہیرو بیزروف نہلسٹ تحریک کا علمبردار ہے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو اس کے کردار میں جاذبیت نہ محسوس ہو کیونکہ وہ بہت خشک مزاج ہے اور اپنے خاندان سے بے تعلق نظر آتا ہے۔ مگر ہم اس کی جرأت، ایمانداری۔ صاف گوئی اور انانیت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کی قبل از وقت موت کی وجہ سے ہم اس کے متعلق اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ آئندہ کیا ہوتا لیکن اگر قصہ جاری رہتا تو ہم دیکھتے

کہ تعمیری خیالات اس کے تخریبی خیالات کی جگہ لے لیتے اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کوئی تخریبی تحریک مستقل نہیں ہوتی۔ بلکہ وقت کی ایک ضرورت ہوتی ہے۔ نہلیسٹ تحریک کے علمبرداروں نے ڈاوون، ہربرٹ اسپنسر اور مل کی تحریروں میں ایک وسیع دنیا پائی اور بعد میں سین سائمن۔ فورئیر۔ رابرٹ اوون اور مارکس کے نظریوں کے متاثر ہوئے۔ انھوں نے لوگوں کی توجہ آرٹ اور شاعری کی جذباتی دنیا سے ہٹا کر "روٹی۔ ابتدائی تعلیم اور عورتوں کے حقوق" کی منبذول کرائی یہ صرف اس لئے کہ انھیں مظلوم طبقہ سے ہمدردی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے فلسفہ حیات کی روس کے افکار کی تاریخ میں ضرورت تھی۔ چنانچہ اس سے باوجود اس کے انتہائی تخریبی ہونے کے مفید نتائج مرتب ہوئے۔ اُس ملک میں جو توہمات اور تعصبات کے بوجھ سے پسا جارہا ہو اس قسم کی تخریبی تحریک کی اشد ضرورت تھی۔ مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا، روس میں انقلابی تحریک نے ایک تعمیری اور اثباتی شکل اختیار کرنا شروع کی ؎

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا غالب

اس کے بعد انقلابی تحریک کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جبکہ اس تحریک پر اشتراکی خیالات کا عنصر غالب تھا اشتراکیت کی تعلیم دپرچار اس دور کی خصوصیت ہے۔ انٹرنیشنل کا بڑھتا ہوا اثر۔ اشتمالیوں کی پیرس کی جدوجہد اور جرمنی کی سوشل ڈیموکریسی یورپ کے ان تمام تاریخی واقعات نے روس کی آزادی کے علمبردار نوجوانوں میں ولولہ پیدا کردیا تھا۔ ان کے سامنے اب ایک نصب العین تھا اور وہ روس کی پرولتاریہ کی نجات دہندگی تھا ابتدا میں اس نئی تحریک پر باکونین کی اشتراکی نراجیت (Hnarchic Socialinn) کا کافی اثر تھا۔ باکونین کی تعلیم کے مطابق اس جماعت کے افراد نے "عوام سے ملاپ" اور ان نئے خیالات کی عوام میں اشاعت شروع کی۔ حکومت کی سخت گیر پالیسی نے اس تحریک کو اور ابھارا۔ انیسویں صدی کے آخر میں روس کے کئی طلبا یورپ خاص کر سوئزرلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ وہاں انھیں روسی جلاوطن سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیالات کا موقع ملتا تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر یہ طلبا بھی انقلابی خیالات کے حامی بن جاتے تھے۔ جب یہ اپنے وطن لوٹتے تو اپنے ساتھ نئے نئے خیالات لاتے۔ ان کی کوئی باقاعدہ جماعت نہ تھی اور نہ کوئی لائحہ عمل صرف ایک اصول

تھا اور وہ یہ کہ عوام میں جا کر نئے خیالات کا پرچار کیا جائے ان میں سے اکثر اس مقصد کے لئے استاد، نرسیں اور ڈاکٹر بن گئے۔ اور مواضعات میں بود و باش اختیار کر لی۔ کئی لوگوں نے محض اس وجہ سے کہ وہ عوام سے ممتاز نہ رہیں نہایت ہی ادنیٰ قسم کے پیشے اختیار کئے نجاری اور جوتے سینے کا کام نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر انھیں پیشوں کو ترجیح دی جاتی تھی بعض لوگ کارخانوں میں پندرہ پندرہ گھنٹے مسلسل کام کرتے تھے۔ تاکہ انھیں مزدوروں میں اپنے خیالات کے پھیلانے کا موقع مل سکے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں جن کا تعلق بڑے خاندانوں سے تھا اور جو بڑے ناز و نعم میں پرورش کئے گئے تھے۔ کسانوں میں رہ کر گمنامی میں اپنی زندگیاں گذار دیتے تھے وہ اپنے ہاتھوں اور چہروں کو کھُردرا بنا لیتے اور معمولی کسانوں کا لباس پہنتے تھے۔ صرف اس لئے کہ ان میں اور کسانوں میں جو فرق ہے وہ مٹ جائے۔

شروع شروع میں ان بے لوث کام کرنے والوں کی کوششیں زیادہ بارآور نہ ہو سکیں۔ کسانوں میں توہمات اور تعصبات زیادہ تر پائے جاتے ہیں اس لئے ابتدا میں یہ لوگ ان نئے خیالات کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے۔ اس کے علاوہ ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ اس انقلابی جماعت کے بہت سے افراد ان نئے خیالات کو مدلل اور عام فہم طریقہ پر لوگوں کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔ یہ لوگ دوسرے مغربی ممالک کی مثالیں دیتے تھے جنھیں روس کے مخصوص حالات اور ماحول سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

یہ تحریک حکومت کی جیرہ دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ان خیالات کے پھیلانے والے افراد نہایت جوشیلے تھے وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت میں مطلق احتیاط نہیں برتتے تھے۔ اور کھلے بندوں کام کرتے تھے حکومت کو اس تحریک کے علمبرداروں کو ڈھونڈنے میں زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ چنانچہ ۱۸۷۶ء کے آخر تک تقریباً تمام انقلابی جیل میں بھر دئے گئے ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۶ء کے درمیان دو ہزار سے زیادہ لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ بہت سے جیلوں میں مدت تک نظر بند رہے مقدمے چلانے کے بعد عدالتوں نے زیادہ لوگوں کو بری کر دیا۔ مگر حکومت نے حکمت عملی سے سب کو جلا وطن کر دیا۔

ان تلخ تجربات کے بعد انقلابیوں کو اپنا طرزِ عمل بدلنا پڑا انھوں نے پُر امن پروپیگنڈے کے بجائے مل کی طرف اپنی توجہ مبذول کی۔ انھوں نے عوام کے ساتھ بود و باش اختیار کی اور انھیں حکومت کے

خلاف کھڑے ہونے کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ چونکہ حکومت نے پر امن پرچار کو بھی ممنوع قرار دیدیا تھا۔ اس لئے انھوں نے تشدد آمیز طریقے استعمال کرنے کی کوشش کی۔

پچھلے تجربات نے انقلابیوں کو مفید سبق سکھایا۔ ان پر ان کی کمزوریاں ظاہر ہوگئیں اور وہ یہ اچھی طرح سمجھنے لگے کہ صرف انفرادی کوششوں سے انقلاب پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت کی سختیوں کی وجہ سے تحریک ختم ہوئی جارہی تھی۔ انھوں نے اس کی سخت ضرورت محسوس کی کہ ایک منظم جماعت قائم کی جائے۔ یہیں سے انقلابی تحریک کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب انھیں باکونین کے اصولوں کو چھوڑنا پڑا۔ کیونکہ پرانے طریقے انقلاب پیدا کرنے میں ناکام ثابت ہو چکے تھے۔ انھیں اب پورا یقین تھا کہ سوائے مطلق العنان حکومت اور اس کے حامیوں کے خلاف صف آرا ہو جانے اور اپنے مخالفین سے کسی صورت میں بھی صلح نہ کرنے کے کوئی چارہ کار نہیں ہے چنانچہ انھوں نے زاریت کے خلاف جہاد شروع کر دیا۔

اس مقصد کے لئے تمام کارروائیاں پارٹی کی مرکزی کمیٹی سے کی جاتی تھیں۔ چونکہ یہ جماعت غیر قانونی تھی۔ اس لئے کام خفیہ اور پوشیدہ طریقے سے کیا جاتا تھا۔ اس زمانہ کا مشہور واقعہ جنرل ٹرپوف (Trepoff) کا قتل ہے جو پیٹرس برگ میں ۱۸۷۸ء میں ہوا۔ اس کی قاتلہ ایک عورت تھی جس کا نام ویرا (Vera) تھا۔ عدالت میں اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ 'میرا مقصد ان مظلوموں کا بدلہ لینا ہے جو مطلق العنانی کے ہاتھوں پس رہے ہیں'۔ ویرا نے جنرل کو صرف اس لئے قتل کیا تھا کہ جنرل نے ایک سیاسی قیدی کے بازار میں کوڑے لگوائے تھے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ ویرا اس قیدی سے بالکل ناواقف تھی جیوری نے ویرا کو رہا کر دیا۔ لیکن پولیس نے اس کو پھر گرفتار کرنا چاہا مگر آخر کار وہ سوئٹزرلینڈ بھاگ جانے میں کامیاب ہوگئی۔ اس واقعہ سے متاثر ہوکر عوام نے ویرا سے ہمدردی کے کئی ثبوت دے چنانچہ اس کے تھوڑے ہی دن بعد پولیس کے متعدد افسران اور بعض صوبوں کے گورنر دن دہاڑے قتل کر دئے گئے۔ آخر کار انقلابیوں نے مطلق العنان حکومت کے سرچشمہ یعنی زار کو قتل کرنے کی سازش کی زار کو ختم کرنے کے لئے اس پر کئی مرتبہ گولی چلائی گئی۔ شاہی ٹرین پر بم پھینکے گئے اور ونٹر پیلس کو اڑانے کی کوشش کی گئی سو اتفاق سے ہر جگہ ناکامی ہوئی آخر کار ۱۳ مارچ ۱۸۸۱ء کو الیگزنڈر قتل کر دیا گیا۔

اس انقلابی تحریک کے علمبردار روس کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ان میں بعض امرا کے خاندانوں کے اور بعض پادریوں اور افسروں کی اولاد تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے نوجوان کسان اور مزدور اس تحریک میں شامل ہوگئے تھے۔ اس تحریک کو فروغ دینے میں عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی تھیں چنانچہ سوفیا نامی لڑکی نے جس کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا اپنی نقاب اُلٹ کر ان آدمیوں کی رہنمائی کی جنھوں نے بم پھینک کر الیگزنڈر دوئم کا خاتمہ کیا تھا۔ اس جماعت کے تقریباً تمام افراد نوجوان تھے۔ ان کی عمریں پچیس برس کی بھی نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں دولہ تھا اور خود اعتمادی تھی۔ وہ ذہنی گتھیوں کے سلجھانے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے تھے اور نہ بوڑھوں کی طرح خواہ مخواہ خطرات کے پہاڑ کھڑے کرتے تھے جو انھیں کام کرنے سے باز رکھ سکیں۔ انقلابیوں میں انتہا پسندی خود بخود پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ حالات کی وجہ سے مجبور تھے کہ اپنا طرز عمل اس قسم کا رکھیں سخت گیر حکومت کے ظلم و تشدد بے انتہا تھے۔ یونیورسٹی میں اگر طلبا کچھ گڑبڑ پیدا کرنا چاہتے تو انھیں دبانے کے لئے انسانیت سوز طریقے استعمال کئے جاتے تھے محض شبہ پر ہزاروں نوجوان بغیر مقدمہ چلائے جیلوں میں سڑتے رہتے تھے۔ روس میں ہر قسم کا پروپیگنڈہ خلاف قانون تھا۔ انقلابیوں کو جلسے منعقد کرنے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ اخبارات پر سخت پابندیاں عائد تھیں وہ ہر وقت جاسوسوں سے گھرے رہتے تھے اگر اُس وقت روس کی حکومت دیگر حکومتوں کی طرح آئینی ہوتی تو عوام کے حقوق کا خیال رکھتی اور ان کے مطالبات کو ماننے کے لئے تیار ہو جاتی اور انقلابی جماعت میں اتنی انتہا پسندی پیدا نہ ہوتی۔

اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ اس پارٹی کی مجلس عاملہ نے جو سپاس نامہ الیگزنڈر سوئم کو ۱۸۸۱ء میں پیش کیا اس میں انھوں نے وعدہ کیا کہ ہر قسم کی دہشت انگیزی کو ختم کردیں گے اگر ان کے صرف اس مطالبے کو مان لیا جائے کہ قومی اسمبلی منعقد کی جائے جس کے تمام ممبران عوام آزادانہ طور پر منتخب کریں اسی طرح انقلابی کچھ عرصہ تک حکومت کی سخت گیر پالیسی کے شکار رہے۔ اسی اثنا میں روس میں صنعت پھیلتی جا رہی تھی جس کی وجہ سے ایک کثیر تعداد میں مزدور طبقہ پیدا ہوا اور جلد ہی روسی سماج کا ایک اہم جزو بن گیا اب اشتراکیوں کو اپنے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔ پیٹرس برگ کا مشہور اسٹرائک جو ۱۸۹۶ء میں ہوا تھا

انقلابی تحریک میں ایک عظیم تبدیلی کا باعث ہوا۔ اس کے کچھ روز بعد ہی ایک سماجی اشتراکی پارٹی کی بنیاد پڑی جو مارکس کے اصولوں کی حامی تھی۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں پہلی مرتبہ روسی اشتراکی بحیثیت نمائندوں کے انٹرنیشنل کانگریس میں شریک ہوئے جو لندن میں منعقد ہوئی تھی۔

اشتراکیوں کی بعد میں دو جماعتیں بن گئیں۔ کچھ پرانے پسماندہ انتہاپسند اشتراکیوں نے اپنی ایک جماعت اشتراکی انقلابی پارٹی کے نام سے ۱۹۰۱ء میں قائم کی یہ پارٹی اس کی حامل تھی کہ کسانوں میں زور شور سے پروپیگنڈہ کیا جائے اور ساتھ ہی زاریت کے خلاف زبردست محاذ قائم کیا جائے۔ دوسری پارٹی اشتراکی جمہوریں کی تھی یہ لوگ روس میں اس وقت تک انقلاب کرانا نہیں چاہتے تھے جب تک کہ وہاں کے اقتصادی حالات اجازت نہ دیں اور مزدور طبقہ اچھی طرح پیدا نہ ہو جائے لیکن پہلی پارٹی کا اثر عوام پر زیادہ تھا۔

۱۹۰۱ء میں طلبا نے بڑا ہنگامہ کیا انھوں نے حکومت کے احکام کی مخالفت کی جن کی رو سے طلبا زبردستی فوج میں بھرتی کئے جاتے تھے۔ اس میں پیٹرس برگ اور ماسکو کے مزدوروں نے طلبا کا ساتھ دیا۔ چنانچہ حکومت کو مجبوراً بادل ناخواستہ ان احکام کو واپس لینا پڑا۔

لیکن زار کسی قسم کی آئینی ترقی بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ کاؤنٹ وٹی جس نے کچھ اصلاحات کرنے کی کوشش کی علیحدہ کر دیا گیا۔ اور اس کی جگہ فان پلیہو (Von Plehoe) مقرر کیا گیا۔ جو بعد میں کسی انقلابی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

جنوری ۱۹۰۵ء میں ایک پادری گیپن نے تقریباً ایک لاکھ مزدوروں کے ساتھ جو بالکل نہتے تھے جلوس کی صورت میں ونٹر پیلس کے سامنے مظاہرہ کیا اور ان کے حقوق کا مطالبہ کیا اس پر امن مجمع پر گولی چلوائی گئی جس میں ہزاروں عورتیں بچے اور ضعیف شامل تھے چنانچہ تقریباً دس ہزار آدمی ہلاک اور مجروح ہوئے گیپن وہاں سے کسی طرح بچ نکلا۔ مگر بعد میں اسے بھی کسی غیر معروف شخص نے ہلاک کر دیا یہ نامبارک دن اتوار کا تھا جسے لوگ "خونی اتوار" کہتے ہیں۔

اس کے بعد ہی وارسا اور تمام پولینڈ میں اسٹرائک ہوا۔ اوڈیسہ میں فوجیوں نے بغاوت کر دی بحیرہ اسود کے بیڑے میں بغاوت کی لہر دوڑ گئی چنانچہ مجبوراً زار نے اگست ۱۹۰۵ء میں آئینی دستور دیا جس میں

مزدوروں اور غریبوں کو رائے دینے کے حق سے محروم رکھا گیا۔ اس سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہوا چنانچہ ماسکو میں مشہور "عام اسٹرائک" ہوا جو تمام روس میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ تمام ٹرینوں کی آمد و رفت بند ہو گئی یہاں تک کہ اس اسٹرائک میں عدالتوں کے بہت سے ججوں نے بھی حصہ لیا۔ زار نے کاونٹ وٹی کو واپس بلایا اور ۳۰ اکتوبر کو اعلان کیا کہ ڈوما یعنی روسی پارلیمنٹ منعقد کی جائے گی اس کے دو روز بعد تمام سیاسی اسیروں کی معافی کا اعلان کیا گیا لیکن اب اس کی مراعات عوام کو مطمئن نہیں کر سکتی تھیں۔ انھوں نے اپنی ضرورتوں کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ پرانے نظام کو الٹے بغیر انھیں سچا اطمینان میسر نہیں آسکتا تھا چنانچہ اس کے بعد ماسکو میں جنوری ۱۹۰۶ء میں بلوے ہوئے اور ہزاروں جگہ کسانوں نے بغاوتیں کیں۔

مئی ۱۹۰۶ء میں پہلی ڈوما منعقد ہوئی۔ اشتراکی پارٹیوں نے اس کا بائیکاٹ کیا۔ ۱۹۰۷ء میں دوسری مرتبہ ڈوما کے انتخابات میں دونوں اشتراکی پارٹیوں نے حصہ لیا۔ اس میں ۴۲۵ ممبران میں سے ۱۳۲ اشتراکی تھے یہ تعداد ایسی کم نہیں تھی کیونکہ اس وقت اشتراکی خیالات رکھنے والوں پر بڑی سختیاں کیجاتی تھیں۔ دوسری ڈوما جون میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ہی سولہ اشتراکی ممبر گرفتار کر لئے گئے اور ۱۵۵ اشتراکی ممبران نظر بند کر دئے گئے۔ اس کے بعد ہی بغیر ممبران کی رائے کے ایک قانون بنایا گیا جس کی رو سے رائے دہندگی کا حق زیادہ تر زمینداروں اور سرمایہ داروں تک محدود رکھا گیا۔ جب اس کی مخالفت کی گئی تو پھر سختیاں شروع ہو گئیں بہت سے اخباروں کے اڈیٹروں کو سائبیریا جلا وطن کر دیا گیا۔ ڈوما کے بعض اشتراکی ممبروں کو قید بامشقت کی سزا دی گئی اور کئی کے سیاسی حقوق سلب کر لئے گئے۔ صرف ۱۹۰۸ء میں ستر ہزار افراد جلا وطن کئے گئے اور سات سو بیاسی آدمی پھانسی پر چڑھائے گئے۔

ان تجربات نے روس کے انقلابیوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔ ان میں آپس میں اختلافات رہے مگر ان کی نوعیت مختلف تھی۔ زاریت کے مظالم اور سختیوں کا یہی نتیجہ نکلا کہ ان کے ارادے مضبوط ہوتے چلے گئے۔ انھوں نے اپنی قربانیوں اور ان تھک کوششوں سے مزدوروں۔ کسانوں اور سپاہیوں میں ایک احساس پیدا کر دیا تھا۔ عوام پرانے نظام کی خامیوں کو سمجھنے لگے تھے۔ وہ اس کے منتظر تھے کہ حکومت کی مشنری کمزور ہو۔ اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر اس پر قابض ہو جائیں۔ انقلابی جماعت کے رہنماؤں کی دانشمندی

کی وجہ سے تحریک ہمیشہ صحیح راستہ پر رہی۔ انھیں حالات کا صحیح اندازہ تھا چنانچہ گذشتہ جنگ عظیم میں جب زار کی فوجوں کو پے در پے شکستیں ہوئیں تو وہ حکومت کے رویہ سے بد دل ہو گئے۔ اِدھر ملک میں ابتری بڑھتی گئی غاصکر کسانوں میں عام بے چینی پھیل گئی غرضکہ مواد اندر ہی اندر اتنا پک چکا تھا کہ زخم کا پھٹنا ضروری ہو گیا۔ انقلابی پارٹی اور اس کے رہنماؤں نے اس موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اگر اس وقت وہ اپنی کمزوری دکھاتے اور صرف اصلاحی اور سطحی رعایتوں پر ہی اکتفا کرتے تو یورپ کے اور ملکوں کی طرح آج انھیں بھی فاشزم اور سامراج کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پسنا پڑتا۔ مگر انھوں نے پرانے نظام کی بوسیدہ عمارت کو انقلاب ۱۹۱۷ء کے ذریعہ بالکل منہدم کیا۔ اور دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ اشتراکیت کی عمارت کی بنیاد ڈالی۔

یہ انقلاب صرف معدودے چند افراد کی مہم پسند طبیعتوں کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ہزاروں اور لاکھوں انسانوں کی خاموش اور مسلسل قربانیوں کا رہین منت ہے۔ مختلف زمانوں میں حالات کے مطابق مختلف انقلابی تحریکیں اٹھیں اور انھوں نے اپنے وقت کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ انقلابیوں نے ان تحریکوں کا پہلے سے کوئی خاکہ تیار نہیں کر رکھا تھا۔ وہ صرف زمانہ کی پیداوار تھیں۔ انقلابیوں کا کام یہ تھا کہ انھوں نے حالات سے متاثر ہو کر ان تحریکوں کو قبول کیا اور انھیں آگے بڑھاتے رہے یہاں تک کہ اپنے آخری مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مرزا اشفاق بیگ صاحب متعلم ایل ایل بی فائنل

امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

امانت کا خاص رنگ: مذکورالصدر خصوصیات لکھنؤ کے دیگر باکمال شعراء کے یہاں بھی کم وبیش موجود ہیں لیکن امانت کے کلام میں بعض ایسے عناصر بھی شامل ہیں جو انہیں سے مخصوص ہیں مثلاً

رعایت لفظی:۔ لکھنؤ میں اس کا شوق پہلے سے موجود تھا البتہ اسے فنی حیثیت امانت نے بخشی اور اس طرح یہ ان ہی کے کلام کا خاصہ بن گیا۔

یادِ دُرِ دندان میں مری جان گئی رِند — تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا

وصل کی شب پلنگ کے اوپر — مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

جو میٹھی میٹھی نظروں سے وہ دیکھے — کہوں آنکھوں کو ہیں بادامِ شیریں

مرغ جاں کو توڑے گی بلّی ترے دروازہ کی — رخصت تن کو کاٹے کا جو ہاتھ تمہاری ناک کا

امانت کے دیوان خزائن الفصاحت کے سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"دیوان امانت، خزائن الفصاحت، تاریخی نام ہے، بڑے استاد کا کلام ہے۔ یعنی شاعر شیریں مقال، ساحر سحر حلال، ذاکر امام مقبول انام، سخنور بے بدل استاد ضرب المثل، موجد رعایت لفظی، جناب سید آغا حسن صاحب لکھنوی۔۔"

اس سلسلہ میں امانت کے کلام میں رعایت لفظی کے بے شمار نمونے موجود ہیں۔ جہاں رنگ صاف ہے وہاں زبان و بیان سے لطف پیدا کر دیا ہے لیکن جہاں اعتدال سے گذر گئے ہیں وہیں عیب پیدا ہو گیا ہے

ہنگام رقص زلف سے نکلی تڑپ کے صاف — توڑا تمہاری کان کی مچھلی نے جال کیا

کر خط سے بوسہ لب شیریں دلا نہ ترک — قند و نبات میں نہیں ہوتا ہے بال کیا

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت — بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

آگیا اس شعلہ رو کے دھانی جوڑے کا خیال	خانۂ دل میں کنول اک سبز روشن ہوگیا
تو ہے وہ صید فگن دشت میں رکھے جو قدم	آنکھیں آ آ کے ملیں بھیڑیے گرگابی پر
ہند و لیسر کے عشق کا کشتہ ہوں باغباں	لالا کے بیچ دل رکھنا امانت کی گور پر
گر عین وعدہ پر نہ کسی روز آئے تو	سو جائیں بھی تو آنکھ ہماری کھلی رہے
اثر ہے گنجفہ میں بھی سیاہ بختی کا	ہماری بازی میں کب آفتاب نکلا ہے

اس قسم کی مثالیں امانت کے کلام میں بہت ہیں اور ان کی رنگینی نے ہی امانت کو بدنام کر رکھا ہے۔ ورنہ ان کے کلام میں بہت سی خوبیاں بھی موجود ہیں۔

سب سے اہم پہلو زبان کا ہے۔ مضمون کے اعتبار سے لکھنؤ کے سرآمد شعراء کا بیشتر کلام ادنیٰ درجے کا ہے لیکن ان کے کمال کا اصلی جوہر ان کی زبان ہے۔ غالب نے ایک موقع پر یہ مصرعہ پڑھ کر کہ

نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے جو دھوتی ہے

کہا تھا کہ مضمون دلّی کا اور زبان لکھنؤ کی خوب ہے۔ زبان کی خدمت شعرائے لکھنؤ میں ناسخ نے سب سے زیادہ کی اور فی الحقیقت زبان کے امام ناسخ قرار پائے۔ الفاظ کی صحت و عدم صحت کے اصول مقرر کر کے بہت سے قدیم و ثقیل الفاظ و محاورات کو ترک کر دیا اور ان کی جگہ نئی ایجادات سے زبان کو فروغ بخشا زبان کی خوبی کے اس عام اصول پر لکھنؤ کے تمام شعرا کاربند تھے اور معمولی شاعروں کے کلام بھی زبان کی لطافت و خوبی کا بہترین مرقع ہوتا تھا۔ آتش کے یہاں یہ رنگ بہت نمایاں ہے اور ان کے معاصرین میں اس وصف خاص میں شاید کوئی ان سے بازی لے جا سکے۔

امانت نے بھی زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ محاورہ بندی کی طرف توجہ کی ہے اور اس فن میں انھیں لکھنؤ میں اگر وہی درجہ دیا جائے جو بعد میں دلّی میں داغ کو ملا تو بے جا نہ ہوگا۔ ذیل کی مختصر فہرست سے بھی ان کی اس کوشش کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

محاورہ	شعر
پتا کھڑکنا:۔	آفت کی ہوا لاکھ چلی باغ جہاں میں — پتا بھی نہ کھڑکا مرے گلشن کے شجر کا

نہ اِدھر کا نہ اُدھر کا رکھنا۔

کعبہ کی نہ بت خانہ کی دی اس نے اجازت — رکھا مجھے کافر نے اِدھر کا نہ اُدھر کا

حق ادا ہونا۔ تپ ہجر سے دم فنا ہو گیا — قضا سے مرا حق ادا ہو گیا

آب آب ہونا۔ آمد سے یار کی یہ ہوئے ہیں گل آب آب — چہرا کا دُھو گیا ہے چمن میں گلاب کا

انگلیاں اُٹھنا۔ کیا مرتبہ ہوا ہے امانت کو دستیاب — سو انگلیاں اٹھیں وہ جدھر سے نکل گیا

در در کی ٹھوکریں کھانا۔

در در کی ٹھوکریں نہ کھلا بہر اہل بیت — بتلا دے اپنا گھر مجھے اے خانماں خراب

سر پر احسان لینا۔

آفتیں آئیں دلا اس سے فراواں سر پر — میں تو لوں گا کبھی قاتل کا نہ احساں سر پر

سر پر اٹھانا۔ فصل گل آئی چمن میں کہ قیامت آئی — عندلیبوں نے اٹھایا ہے گلستاں سر پر

سر آنکھوں پر بٹھانا۔

میں وہ ہوں رند اگر دیر و حرم میں جاؤں — گبر آنکھوں پہ بٹھائیں تو مسلماں سر پر

سر پر خاک اڑانا۔

کوہ ٹکرائیں گے آپس میں مروں گا جس دن — خاک اڑائیں گے مرے غم میں بیاباں سر پر

سر پہ شیطان چڑھنا، بھوت بن جانا

آدمی کیا وہ فرشتے کی نہیں سنتے ہیں — بھوت بنجاتے ہیں جب چڑھتا ہے شیطاں سر پر

گھانس کاٹنا۔

تعبہ کہتے میں نظر جب آگیا مجھ کو وہ گل — گھانس کاٹی عارض رنگیں کا سبزہ دیکھ کر

اوس پڑنا۔ شبنم کے ہیں گہر نظر آتے نہ گوش پر — کیا اوس پڑ گئی ہے چمن میں بہار پر

کان رکھنا، ناک میں دم ہونا۔

ناک میں دم ہے گل اندامون کی بیدردی سے — کان رکھتے نہیں عشاق کی فریادوں پر

گھی کے چراغ جلنا۔

بعد فنا بھی نعمت دنیا کی چاٹ ہے — گھی کے چراغ جلتے ہیں زاہد کی گور پہ

گریبان میں منہ ڈالنا۔

دیکھ کر تیغ کف میں نے یہ دلبر سے کہا — جان لیتے ہیں نہ دل آپ مرا دیتے ہیں
(ق)
بولا وہ غصہ سے منہ ڈال گریباں میں ذرا — مانگتے کب ہیں جو کچھ اہل وفا دیتے ہیں

ہاتھوں کے طوطے اڑنا۔

دھانی انگیا کی دو بھیڑکا کے چمن میں چڑیا — طوطے صیاد کے ہاتھوں کے اڑا دیتے ہیں

دنگ ہونا۔ تصویر کیا ٹھیر سکے اس رخ کے سامنے — آئینے دنگ ہوتے ہیں جوش صفا ہے یہ

ٹٹی کی اوٹ میں شکار کھیلنا

کھیلا کرتے ہیں سدا ٹٹی کی اوٹ ادیل شکار — طائر تصویر ہے نخچیر پشت آئینہ

زمین سر پر اٹھانا

بلاتا ہوں فلک کو لبِ مردن دل کے نالوں سے — لحد میں پاؤں پھیلا کر زمیں سر پر اٹھاتا ہوں

بنانا۔ کہتا ہے کوئی کالی بلا کوئی شب تار — شاعر لگے اب یار کی زلفوں کو بنانے

امانت کے یہاں اس قسم کے اشعار رعایت لفظی کے مضامین سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس لیے جہاں ان کے عیوب پر روشنی ڈالی جائے وہاں بطور تلافی یہ نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

اس سے قطع نظر پورے دیوان میں بہت سی غزلیں ایسی بھی نکل آئیں گی جن میں رعایت لفظی صرف چاشنی کی حد تک ہے اصل خوبی زبان کی سادگی اور بندش کی چستی پر مبنی ہے۔ مثلاً حمد میں دیوان کی پہلی غزل۔

کیا کیا ہے کرم مجھ پہ خدائے دو جہاں کا — شکر اس کا ادا کر سکے کیا منہ ہے زباں کا

تازہ ہے چمن حمد خدائے دو جہاں کا — کچھ دخل نہیں گلشن قدرت میں خزاں کا

جو آگیا اس راہ میں سالک وہی ٹھیرا — گمراہ ہوا جو نہ یہاں کا نہ وہاں کا

دیکھے تو کوئی نور سے قدرت کے کرشمے — شادی کہیں بچے کی کہیں غم ہے جوان کا
غم اپا ہیں ہوگیا شادی سے مبدل — جب نام لیا رنج میں اس راحت جاں کا
پوشیدہ بھلا کرسکے اس سے کوئی کیا بات — دانندہ و واقف ہے وہ ہر رازِ نہاں کا
دم مارنے کی جا نہیں اے صاحب ادراک — حقا کہ وہاں دخل نہیں وہم و گماں کا

علاوہ بریں ایسے اشعار بھی ناپید نہیں جو مضمون اور بیان دونوں کے اعتبار سے بلند پایہ ہیں۔

ہوگئی قطع اسیری میں امید پرواز — اُڑ گئے ہوش جو پر کاٹنے صیاد آیا

جب تک پر نہیں کٹے تھے یہ امید تھی کہ شاید کبھی رہائی ہو اور پرواز نصیب ہو لیکن اب تو رہائی نصیب ہونے پر بھی پرواز کی امید باقی نہ رہی۔

وہ بت مجھ سے ناحق خفا ہوگیا — خداوند عالم یہ کیا ہوگیا۔

ہمارے زمانہ کے ایک مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

بعد مدت کے ملے تو مجھ سے پردہ کس لیے — کچھ نئے تم ہوگئے یا میں نرالا ہوگیا

اس سے بھی بلند مضمون امانت نے پیدا کیا ہے۔ بجائے بعد مدت کے "ترک ملاقات کے بعد ملنے کا خیال ہے

مل جاؤ گر تو پھر وہی باہم ہوں صحبتیں — کچھ تم بدل گئے ہو نہ میں کچھ بدل گیا

میر صاحب امام الشعرا ہیں ان کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

رہ طلب میں گرے ہوتے سر کے بل ہم بھی — شکستہ پائی نے اپنی ہمیں سنبھال لیا

اسی مضمون کو امانت نے دو اشعار میں ادا کیا ہے۔

وہ بلبل بے برگ و نوا ہوں کہ ہمیشہ — خالق کے کرم سے رہی آرام کی صورت
محتاجی تقدیر نے آفت سے بچایا — اس باغ میں دیکھی نہ کبھی دام کی صورت

عشاق کی بدنامی کا مضمون عام ہے۔ امانت کا ایک شعر ہے ؎

نیک نامی ہے دلا فرقۂ عشاق میں عشق — ہے وہ بدنام محبت میں جو بدنام نہیں

اسی غزل میں ایک اور اچھا شعر ہے۔

ہر سخن پر مجھے دیتا ہے وہ بد خو دشنام　　　کونسی بات مری قابل انعام نہیں

غم فراق سے ضبط و تحمل کا ساغر لبریز ہو کر چھلکنا ہی چاہتا ہے، ور عاشق عاشقی سے توبہ کرتا ہے ؎

ایسے مزے چکھائے غم ہجر یار نے　　　واللہ دل لگانے کا اب حوصلہ نہیں

الم نصیبی کی حد اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے کہ انسان اس کا خوگر ہو جائے اور اگر کسی وقت رنج و محن سے نجات بھی ملے تو خود گرفتاری کی دعوت دے ؎

اسیری کے مزے نے کھو دیا مجھ کو زمانے سے　　　قفس سے چھوٹ کر صیاد کے چھپتا ہوں دامن میں

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے جس کی بندش اور ادا قابل داد ہے ؎

تڑپ اعضا میں ابرو میں کجی شوخی ہے چتون میں　　　جوانی میں غضب ہوگا جو آفت ہے لڑکپن میں

محبوبوں کی بے نیازی کے عام مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے ؎

بزم عالم کے حسینوں میں عجب اندھیر ہے　　　جان یوں پروانہ دے اور شمع کو پروا نہ ہو

اس شعر میں اگرچہ رعایت لفظی کو ملحوظ رکھا ہے لیکن آورد کا پتہ نہیں چلتا۔

ایک واقعہ کو کس خوبی سے نظم کیا ہے ؎

کسی نے ہاتھ ملے نعرہ زن ہوا کوئی　　　زمانے میں مرے مرنے کی جب خبر پھیلی

دبا کے دانتوں میں انگلی وہ بے وفا بولا　　　تپ فراق نے عاشق کی جان ابھی لے لی ؟

اپنے دل کے وا شد، نہ ہونے پر میر صاحب فرماتے ہیں ؎

سب کھلا باغ جہاں الا وہ حیران و خفا　　　جس کو دل کہتے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

اسی مضمون کو ذرا اور المیہ رنگ دے کر امانت نے پیش کیا ہے ؎

غنچۂ دل کے مقدر میں نہیں کھلنا لکھا　　　یاں صبا بھی آن کر باد خزاں ہو جائے گی

ایک مشکل زمین میں طبع آزمائی کی ہے لیکن عجب آبدار گوہر نکالے ہیں۔

یہی دل قلق کو رہا زیر زمیں نہ موسے پہ بھی رنج و الم سے چھٹے

جنھیں چھوڑتے تھے اکدم نہ کبھی تا حشر غضب ہے وہ ہم سے چھٹے

ہو کیوں نہ ہمیں مرنے کی خوشی کہ لحد میں فراق کے غم سے چھٹے
آنت سے چھٹے ایذا سے چھٹے ہر وقت کے رنج و الم سے چھٹے
سر پھوڑتے تھے دم توڑتے تھے عنقا تھی جہاں میں سیر چمن
موت آئی قفس میں خوب ہوا صیاد کے جور و ستم سے چھٹے
ہر طرح امانت مشکل ہے کوئی نہیں مشکل رہائی کی
ہستی کے وہ دام میں آکے پھنسے جو لوگ کہ قید عدم سے چھٹے

مقطع میں وہی مضمون ہے جسے علامہ اقبال نے ایک دوسرے انداز میں پیش کیا ہے ؎

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا — یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

حرف و حکایات کے سلسلہ میں ایک شعر ہے۔

بیداد مجھے یاد ہے واللہ تمہاری — یوسف کی قسم اب نہ کروں چاہ تمہاری

امانت کے کلام میں بعض اوقات ضمنی طور پر ان کے عقائد، حالات اور واقعات کا بھی سلسلہ مل جاتا ہے۔ اس قبیل کی غزلوں میں سب سے اہم درج ذیل ہے۔

کیوں نہ ہوں لطافت سے پر اشعار امانت — مائل ہے رعایت پہ دل زار امانت
کی بدلے عبادت کے سدا حسن پرستی — جنت ہو بھلا خاک طلب گار امانت
اخلاق سے پیش آئے شرافت ہے جتانا — بنتا ہے مروت کے سبب کار امانت
غم دوست ہے دل رنج سے راحت ہی جانیں — فرحت کا سرانجام ہے آزار امانت
کیوں ہوں نہ ریاضت پہ نظر کرکے عدو سرد — رحمت سے تری گرم ہے بازار امانت
لفظوں میں متانت ہے فصاحت ہو زباں میں — کہتا ہے ہر اک سن کے یہ اشعار امانت
کاذب ہیں مضامین کی بندش کو کہیں جھوٹ — معمور صداقت سے ہے گفتار امانت
مہتاب کی طلعت ہے کم از کرمک شب تاب — کس مرتبہ ہے تیرہ شب تار امانت
وحدت کے نظر آتے ہیں کثرت میں کرشمے — ہیں دور دل و دیدۂ بیدار امانت

رہتا ہے غمیں درد محبت سے ہمیشہ　　صحت سے بری ہے دل بیمار امانت

عشرت کسے کہتے ہیں شب وصل مہ کی　　فرقت ہے سدا درپئے آزار امانت

صورت میں اصالت میں نجابت میں ہے بے مثل　　ہر بلبل خوش لہجہ گلزار امانت

تحصیل مضامیں ہے سدا ملک سخن میں　　ہے طبع رسا ناظم سرکار امانت

کچھ تھوڑے سے شاگردوں کے نام ہیں ہوئے نظم
دیکھو بغور است سوئے اشعار امانت

اسی طرح ایک شعر میں آتش سے معاصرانہ چشمک کی طرف اشارہ کیا ہے اور بعض اشعار میں اپنے اثنا عشری عقائد ظاہر کئے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے ان کا کلام ان کی قادر الکلامی پر دلیل ہے اور اس عہد کی شاعری میں لکھنویت کے عناصر کا پورا پورا رنگ دکھاتی ہے۔ اور اس حیثیت سے ڈرامائی نظموں، واسوختوں اور سلام و مراثی پر نظر ڈالتے وقت ان کی غزل گوئی کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

محمد ابو اللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ)

جامِ صہبائی

(۱)

کوئی مری داستاں سنے یا نہ سنے
ہوں گرم بیاں جہاں سنے یا نہ سنے!

مانندِ جرس ہوں اے اثر وقفِ خروش
مجھ کو مرا کارواں سنے یا نہ سنے!

(۲)

دل تیرے خیال سے مزہ پاتا ہے
ہر مستی و بے خودی میں لہراتا ہے

وہ مست ہوں جو بے پیئے مست رہے
پی کر تو ہر ایک مست ہو جاتا ہے

(۳)

دل شکوۂ رنج و غم سے بیگانہ رہے
ہنگامۂ ہاؤ ہو سے مستانہ رہے

افسردہ نہ ہو کبھی مری آتشِ شوق
کچھ اور مرے پاس رہے یا نہ رہے

(۴)

دل میرا سیاہ اب بھی ہو جاتا ہے
کمبخت تباہ اب بھی ہو جاتا ہے

ان ماہ رخوں پر پڑ ہی جاتی ہے نظر
اتنا تو گناہ اب بھی ہو جاتا ہے

(۵)

ہے قلب و جگر میں مستی اب تک!
ہے روح کو ذوقِ مے پرستی اب تک!

ڈالی تھی کبھی نگاہِ الفت تو نے
اب تک ہے وہی ہجومِ مستی اب تک!

(۶)

یارب دلِ گرم و روحِ مستانہ ملے:
جاں سوزیٔ شمع و شوقِ پروانہ ملے!

سوزِ غمِ عشق سے نہ محروم رہوں
یارب مجھے اور کچھ ملے یا نہ ملے!

(۷)

ہے صبح کی تازگی ابھی تک معصوم
ہے شام کی خامشی ابھی تک معصوم

ہر چند ہوئی ہے بزمِ دنیا ناپاک
ہے چاند کی چاندنی ابھی تک معصوم

(۸)

رخ سے ترے کسبِ رنگ و بو کرتا ہوں
ہر سانس کو اپنی مشکبو کرتا ہوں

محفل سے بہت لذیذ تنہائی ہے
تنہائی میں تجھ سے گفتگو کرتا ہوں

(اثر صہبائی)

انتخاب غزلیات

دل دکھائے ہوئے سے ہیں پیارے
اشک آئے ہوئے سے ہیں پیارے

جو ستم تو نے روک رکھے ہیں
وہ بھی ڈھائے ہوئے سے ہیں پیارے

جو سراسر سکون ہیں وہ بھی
تلملائے ہوئے سے ہیں پیارے

رنگ اڑنے پہ بھی گل رخسار
رنگ لائے ہوئے سے ہیں پیارے

داغ دل کے چراغ ہیں لیکن
جھلملائے ہوئے سے ہیں پیارے

تجھ کو پاکر بھی تیرے غم دل میں
کیوں سمائے ہوئے سے ہیں پیارے

ہوش والے بھی ان نگاہوں کے
دھوکے کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

ترے افسردہ آگ سی ہر سمت
کیوں لگائے ہوئے سے ہیں پیارے

یوں تو تیرے ہیں پھر بھی عشق سے ہم
باز آئے ہوئے سے ہیں پیارے

اہل منزل پہونچ کے بھی کیا کیا
پھیر کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

ہم نے اہل خوشی کو دیکھا ہے
چوٹ کھائے ہوئے سے ہیں پیارے

کون دیتا ہے یہ صدائیں فراقؔ
ہم تو آئے ہوئے سے ہیں پیارے

(فراقؔ گورکھپوری)

میرے لئے

فصل گل میرے لئے، عہد خزاں میرے لئے
ہر قدم پر ہے نیا رنگ جہاں میرے لئے

سعیٔ تسکیں ہے امید رائگاں میرے لئے
ہر زمیں ہے آسماں ہی آسماں میرے لئے

چاک گل ہے درحقیقت چاک داماں کا پیام
وہ بہار آئی بعنوان خزاں میرے لئے

جل رہا ہوں ایک مدت سے بعنواں حیات
وقف ہیں سوز دروں کی گرمیاں میرے لئے

(عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

رحمت عالم:۔ از جناب سید سلیمان صاحب ندوی مطبع معارف اعظم گڈھ قیمت عہ صفحات ۱۵۷ سائز ۲۲×۱۸/۸ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

سید صاحب نے یہ کتاب مدرسوں اور اسکولوں کے طالب علموں کے لئے ترتیب دی ہے۔ ہمارے بچوں اور لڑکیوں کی صحیح دینی تعلیم ہمیشہ سے ہر مسلمان کے پیش نظر رہی ہے لیکن بہت کم عالموں نے خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے ان کی اس حاجت کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ زیادہ تر وہ علما اونچی قسم کی تصانیف و تالیفات میں مشغول و معروف رہے۔ لڑکیوں اور بچوں کے لیے کتابیں تیار کرنا محض ایک تجارتی سودا سمجھا جاتا اور اس لئے ایک گری ہوئی بات یوں بھی ہمارے ہندوستانی علما کے لئے چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کے لئے کتابیں تیار کرنا ایک ایسا کام تھا جو بڑے بڑے علما اپنی شایان شان نہیں سمجھتے تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دراصل یہ ہمارے بچوں ہی کی ابتدائی تعلیم جس کی طرف اولین توجہ ہونی چاہئے۔ بنا مضبوط ہوتی ہے تو ثریا تک دیوار سیدھی رہتی ہے لیکن ہمارے یہاں یہی نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ مذہبی تعلیم لڑکوں کی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے لیکن کوئی باقاعدہ اور سوچا ہوا انتظام دینی تعلیم کا نہیں رہا۔ اغلب ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوانوں میں جو عقائد کی کمزوری اور ایمان کی نا استواری نظر آتی ہے وہ بہت کچھ اسی ابتدائی دینی تعلیم کی کمی یا فقدان کے باعث ہو محض تقاضائے زمانہ یا انگریزی تعلیم کی بدولت نہیں سید سلیمان صاحب کی یہ کتاب تعلیمی نقطۂ نظر سے ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے ضرورت ہے کہ اس قسم کی مستند کتابیں مختلف اداروں سے نکلتی رہیں۔ ساتھ ہی اس کی بھی اشد ضرورت ہے کہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کا ایک ایسا مستند نصاب علما تیار کریں جو تعلیمی نقطۂ نظر سے مفید بھی ہو اور مستند بھی۔

زیر نظر کتاب میں سید صاحب قبلہ نے عرب، اہل قریش کا حال پیغمبر صلعم کا گھرانا پیغمبر صلعم کی حیات مبارک، پھر اسلام کی اشاعت، ہجرت اور لڑائیوں کا حال، آخر میں اسلامی نظام کی تاسیس نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج کے

اصول اور پیغمبر صلعم کی آخری وصیت سب کا اجمالاً ذکر کر دیا ہے۔ زبان دانستہ آسان رکھی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو اس کے مطالعہ سے ہرگز محروم نہ رکھیں گے۔

گلبانگ حیات :- مصنفہ امین حزین سیالکوٹی اردو اکیڈمی پنجاب لوہاری گیٹ لاہور قیمت عہ صفحات ۲۰۲۔ سائز ۲۰×۲۶/۸ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ۔

حضرت امین حزیں کا کلام عرصہ سے رسالوں میں شائع ہو کر مقبول ہوتا رہا ہے۔ شروع میں سر عبدالقادر کا تعارف نامہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے اقبال کی طرح آپ نے بھی علامہ شمس العلماء سید میر حسن صاحب مرحوم سے استفادہ کیا ہے۔ اور ادبیات کا ذوق وہیں سے حاصل کیا ہے۔ کلام پر اقبال مرحوم کا بہت زیادہ اثر ہے خود کو انھیں کا معنوی شاگرد سمجھتے ہیں۔

آپ کے کلام میں بھی یقین، خودی، زندگی کی اہمیت وغیرہ کے مضامین ہیں۔ آپ کا کلام گویا اقبال کے کلام کی تفسیر ہے آسان تر الفاظ میں پہلی نظم فاتحۃ الکتاب ہی سے آپ کا رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔

لا سے پڑے ہیں جان کے جینے کا اہتمام کر — جن میں ہو کیف زندگی بھر خدا وہ کام کر
طور حیات سے اڑا جذبۂ زیستن کی آگ — جب کہیں جا کے نیت زندگی دوام کر
پہلے یہ سوچ دام کے توڑنے کی سکت بھی ہے — بعد کو دل میں خواہش دانہ زیر دام کر
نقش نوی نہیں ہے تو صفحۂ روزگار پر — مٹنے سے گر نہیں مفر مٹ ہی کے اپنا نام کر
تجھ کو تری ہی آنکھ سے دیکھ رہی ہے کائنات — بات یہ راز کی نہیں اپنا خود احترام کر
بندۂ خواہشات کو کہتا ہے کون عبد حر — چاہیے حریت اگر دل کو امیں غلام کر

حیات محمد عبدہٗ :- مترجمہ جناب محمد مظہر الدین صاحب صدیقی بی۔ اے۔ شائع کردہ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور حجم ۸۳ صفحات، سائز ۲۰×۲۶/۸ قیمت ۱۲ر کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ۔

محمد عبدہٗ کا نام دنیائے اسلام کے ان جلیل القدر فرزندوں میں سے ہے جنھوں نے انیسویں صدی

کے آخر میں مغرب نے بڑھتے ہوئے سیلاب الحاد و عیسائیت کو روکنے میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ آخر انیسویں صدی میں تمام ممالک اسلامیہ خصوصاً مصر و ہندوستان میں عیسائیت اور الحاد و مغربیت کے طوفان برپا تھے۔ امت اسلامیہ اس وقت بڑے نازک دور سے گذر رہی تھی۔ ایسے وقت میں جمال الدین افغانی کی شخصیت نے اس خطرہ کو شدت سے محسوس کیا اور تمام ممالک اسلامیہ میں اس بیدینی اور غیر اسلامی تحریکات کے خلاف جد و جہد کرنے کے لئے ہر جگہ اور ہر ممکن صورتوں سے اس کا استیصال کرنا شروع کیا۔ مصر میں اسی قائد اعظم کے دست راست محمد عبدہٗ تھے۔

یہ ترجمہ دراصل چارلس ایڈیس ایک عیسائی مشنری کی کتاب "مصر اور جدیدیت" کے ان چند ابواب کا ہے جو محمد عبدہٗ کی حیات کے متعلق ہیں۔ باوجود عیسائی اور مشنری ہونے کے اس نے محمد عبدہٗ کے حالات کمال بے تعصبی اور غیر جانبداری سے پیش کئے ہیں۔ ترجمہ آزاد، رواں اور بے تکلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب اردو تالیفات میں بیش بہا اضافہ ہے آئندہ ایڈیشن میں اگر مرتب صاحب بین الاقوامی اتحاد ملت پر ایک باب کا اضافہ کر دیں تو خوب ہو۔ امید ہے کہ یہ کتاب ضرور مقبول و معروف ہوگی۔

اقبال اور قرآن:۔ از ابو محمد مصلح۔ ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ۔ صفحات ۱۹۱ سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$ کاغذ، کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

مولوی محمد مصلح صاحب عرصہ سے قرآن مجید کی تعلیمات عام کرنے کے سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں۔ خود اقبال مرحوم سے اسی سلسلے میں کئی ملاقاتیں رہیں۔ زیر نظر کتاب کا مقصد اقبال کی تصنیفات میں سے ان حصوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہے جو صاف لفظوں میں قرآن مجید سے متعلق ہیں۔ شروع میں مختصر مضامین، قرآن کا اثر اقبال پر اقبال کا مقصد شاعری، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ختم نبوت اور قادیانیت کے عنوان سے لکھے ہیں جو برے نہیں اور بہت مختصر ہیں۔ انتخاب نظم میں جگہ جگہ مختصر تبصرہ اور اشارے بھی دیئے گئے ہیں جو یقیناً مفید ہیں۔ قیمت دو روپے کچھ زیادہ ہے

مسافر کی ڈائری:۔ از خواجہ احمد عباس صاحب۔ حالی پبلشنگ ہاؤس قیمت عہ صفحات ۱۹۲۔ سائز $\frac{۲۰\times۳۰}{۱۶}$

کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

خواجہ احمد عباس صاحب نے ابھی جب جنگ شروع ہونے والی تھی دنیا کا سفر کر ڈالا محض تفریحاً۔ واپسی پر ایک کتاب اسی سفر پر لکھ ڈالی۔ پہلے انگریزی میں اب اردو میں۔ کتابیں اکثر لوگ اپنے سفر کے بعد لکھ ڈالا کرتے ہیں لیکن وہ اتنا لکھ جاتے ہیں جتنا نہ لکھنا چاہئے۔ اور اس طرح لکھتے ہیں گویا کتابیں پڑھ کر لکھ رہے ہیں دنیا دیکھ کر نہیں۔ خواجہ احمد عباس کی یہ ڈائری اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس کو پڑھ کر دنیا کا ہلکا سا نقشہ سامنے آجاتا ہے، دنیا کا جغرافیہ نہیں۔ اور یہ بات مصنف نے پہلے ہی سے صاف کر دی ہے "اگر آپ نے اس کتاب کو اس امید پر خریدا ہے کہ اس کو پڑھ کر آپ پر جاپان کی صنعتی ترقی کا راز کھل جائے یا ترکی کے ساجی انقلاب کا پورا حال معلوم ہو جائے ..... تو ممکن ہے آپ کو مایوسی ہو۔ اس کو پڑھ کر تو آپ کو یہ بھی نہ معلوم ہوگا کہ رومانیہ کی آبادی کیا ہے اور کنیڈا کا رقبہ کتنا ہے" پھر بھی اگر آپ اس کتاب کو شروع کریں تو بغیر ختم کئے جی چھوڑنے کو نہ چاہے گا لطف داستان نہیں اس میں لطف حیات ہے تمام ممالک کے لوگ اس میں آپ کو جیتے جاگتے نظر آئیں گے۔ حالانکہ آپ ان سے زیادہ واقف نہ ہو سکیں گے لیکن آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مصنف کے ساتھ آپ نے بھی تیزی سے ایک سفر تمام دنیا کا کر لیا ہے اختصار اور شگفتگی جو ایک کامیاب جرنلسٹ کی خصوصیات ہوتی ہیں آپ کو لطف بیان کا کافی مزا دینگی مختلف موقعوں کی تصاویر بھی دیدی ہیں۔

جدید جغرافیہ پنجاب ۔۔۔ از سندباد جہازی۔ اردو اکیڈمی پنجاب۔ لوہاری گیٹ لاہور، قیمت ایک روپیہ صفحات ۱۴۴، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ

سندباد جہازی صاحب نے اپنے مخصوص مزاحیہ رنگ میں پنجاب کی سیاسیات کو بیان کیا ہے۔ ممکن ہے پطرس کا لاہور کا جغرافیہ والا مضمون دیکھ کر موصوف کو یہ خیال پیدا ہوا ہو۔ بہر حال ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور پنجابیوں کے لئے خصوصاً یہ ایک دلچسپ چیز ہے۔ پنجاب کی قدرتی تقسیم اس طرح کی ہے (۱) اتحادی سلسلہ کوہ (۲) اشتراکی جوالامکھی (۳) احراری کاہستان (گھاس کے میدان) (۴) کانگریسی سلسلہ کوہ (۵) اکالی جنگلات (۶) وادی لیگ (۷) ہندو مہاسبھا کی ترائی۔ اسی طرح ہر پارٹی، ہر سیاسی تحریک اور ہر لیڈر کو کسی جغرافیٔ نام سے موسوم کیا ہے اور اس کی خصوصیات کو جغرافیہ کے اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ مقصود ظرافت زیادہ ہے بجائے طنز کے آخر میں اشارات بھی دیئے ہیں تاکہ وہ حضرات جو پنجاب کی سیاسی شخصیتوں سے واقف نہیں ہیں واقف ہو سکیں

رسائل:۔

ترجمان القرآن:۔ ستمبر، اکتوبر، نومبر، مرتبہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ مبارک پارک پونچھ روڈ لاہور قیمت فی پرچہ ۸؍ سالانہ صہ؍ صفحات ۴۸ ۲۔

رسالہ ترجمان القرآن کا یہ تین مہینے یعنی ستمبر، اکتوبر اور نومبر کا یکجائی پرچہ ہے جو مودودی صاحب کے خطبات پر مشتمل ہے۔ مودودی صاحب دین اسلام کی جو خاموش خدمت کر رہے ہیں وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں آپ اکثر و بیشتر مفید کتابیں مسلمانوں کی ہدایت و رہبری کے لئے لکھتے رہتے ہیں۔ موجودہ نمبر بھی اسی قسم کی تالیف ہے۔ اس میں مختلف ارکان اسلام پر آپ کے مدلل خطبات ہیں جو عوام الناس کے لئے بہت آسان زبان میں لکھے گئے ہیں چند عنوان یہ ہیں: کلمہ طیبہ پر ایمان لانے کا مقصد، مسلمان کسے کہتے ہیں۔ خدا کی اطاعت کس لئے، عبادت، نمازیں آپ کیا پڑھتے ہیں، نمازیں بے اثر کیوں ہو گئیں، حج کے فائدے، جہاد کی اہمیت وغیرہ یہ خطبات ہر حیثیت سے بہت مفید ہیں۔ ضرورت ہے جمعہ کی نمازوں میں ان خطبوں کو سنایا جائے۔

ساقی سالنامہ:۔ مرتبہ شاہد احمد صاحب۔ قیمت عہ؍ صفحات ۲۷۵۔

اپنی گذشتہ روایات کے مطابق ساقی کا یہ بارہواں سالنامہ بھی منتخب لکھنے والوں کے افسانوں اور نظموں سے مزین ہو کر نکلا ہے۔ اس میں تقریباً ہر افسانہ نویس نظر آئے گا۔ عظیم بیگ، عصمت، مدھوسودن، رفیق حسین، اور کملا چٹو پادھیا کے افسانے خصوصیت سے اچھے مطالعے ہیں۔ ویسے دوسرے افسانے بھی کم دلچسپ نہیں ہیں۔ ل۔ احمد اور محمد احمد کے مضامین "سوویٹ ادب اور شرم کی نفسیاتی تحلیل" بھی خوب ہیں۔ سرورق رنگین اور جاذب نظر ہے۔ کھاری باؤلی دہلی کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

رسید کتب:۔

پیام رسالت، (۲) اسلامی خاتون اور تہذیب نو (۳) ارشاد رسالت حصہ اوّل۔ ہر سہ کتب از تبسم قریشی۔ قیمت ۲؍ ۔ ۲؍ ۱۱؍ علی الترتیب۔ ملنے کا پتہ:۔ اسلامی دارالاشاعت۔ محلہ اقبال گنج گجرات (پنجاب)

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں. ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کی خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے. وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیا کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے. مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے. علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے. بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوئی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے (محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی. ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر خنا بلڈنگ، لکھنؤ

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیاتِ اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد دکن سے

دریافت کیجئے۔

قیمت سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

مقدمہ "زندگانی محمدؐ"

عہد حاضر کی ایک بے مثال کتاب

"زندگانی محمدؐ" علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہو گئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئیں پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے زندگانی محمدؐ کے مقدمہ کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہل مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دیے گئے ہیں اس کے متعلق مشاہیر جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ زندگانی محمدؐ ایک قابل قدر تالیف ہے۔ (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ "زندگانی محمدؐ کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے لبریز ہے میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے۔ مصنف کی کوششیں مستحق اجر و قابل داد ہیں (مولانا عبدالماجد دریابادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (مقدمہ زندگانی محمدؐ) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ (طلوع اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا۔ (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ از بس مفید ہے (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہل مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں، ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (حمایت اسلام)

۱۰۔ ہندوستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے جو اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ (پیام نسواں)

لکھائی چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا، ضخامت ۱۲۰ صفحے ۱۲ کے ٹکٹوں کی صورت میں یا بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر (پنجاب)

مختصر تاریخ ادب اردو

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لیکچرار شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی

اردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے. کوئی کتاب امیر و داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھی بھی ہے تو موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا شعراء کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی تو اس وقت کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کسی مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو۔

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اردو کے قدیم و جدید شعراء و نثر نگاروں کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں. تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

کتابت و طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات مجلد معہ گرد پوش۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے عہ

ملنے کا پتہ

منیجر (بکڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

اردو میں بالکل نئی چیز

جنگ آلودہ دنیا

معہ اہم نقشے و چارٹ

مرتبہ - پنڈت ونکٹیش نرائن تیواری

موجودہ جنگ کب اور کیسے شروع ہوئی؟ کس طرح یہ بڑھی اور پھیل گئی؟ کون کون سے ملک اس جنگ میں کس صورت سے حصہ لے رہے ہیں؟ کس ملک کے پاس کتنی بحری، بری، اور ہوائی طاقت ہے اور دنیا کے تمام ممالک مالی تعلیمی جغرافیائی حالات کے متعلق اگر آپ صحیح معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں جنگ کے متعلق اہم واقعات درج ہیں دوسرے حصے میں نقشوں اور چارٹوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل کے ساتھ دنیا کے مختلف ممالک کا ذکر ہے جس کے متعلق سے بین الاقوامی سیاسی صورت حال بڑی آسانی سے ذہن نشین ہو جاتی ہے تیسرے حصے میں مختلف ممالک کی فوجی قوت، رقبہ اور آبادی درآمد و برآمد، کپاس، سونا، پیٹرول کی پیداوار اور سکوں وغیرہ کے متعلق مفید باتیں درج ہیں۔ جنگ کے زمانے میں جن جن باتوں کا جاننا ضروری ہے وہ سب اس میں بتا دی گئی ہیں ہر شخص کے لئے خواہ وہ متعلم ہو یا معلم اخبار بین ہو یا اخبار نویس۔ اس کتاب کی ایک جلد اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو میں آج تک ایسی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ کتابت طباعت اعلیٰ۔ سرورق دیدہ زیب۔

باوجود ان سب خوبیوں کے قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

آج ہی پتہ ذیل سے طلب فرمایئے

منیجر (بکڈپو)، انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

اگر آنکھیں کمزور ہیں

آنکھیں تھوڑی دیر کے بعد تھک جاتی ہوں، ان کے سامنے اندھیرا آجاتا ہو حروف دھندلے نظر آتے ہوں، پانی بہتا ہو، سر میں خفیف درد کی شکایت ہو ابتدائے نزول الماء یا موتیا ہو تو مدنی دواخانہ کا خصوصیت کے ساتھ تیار کردہ "کحل الجواہر مشکی" فوراً استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ دو چار دن کے بعد ہی آپ کو اس سرمہ کی خصوصیات کا اندازہ ہو جائے گا۔ قیمت فی تولہ چھ روپئے علاوہ محصول ڈاک

دانتوں کی بیماریوں سے بچئے

اگر مسوڑھوں سے پیپ نکلتی ہے	اگر مسوڑھے متورم ہو جاتے ہیں
اگر منہ سے بدبو آتی ہے	اگر دانتوں سے خون نکلتا ہے
اگر دانتوں پر سردی اور ترشی کا اثر ہوتا ہے	اگر منہ سے بدمزہ رطوبت جاری رہتی ہو

اگر دانت گندے اور میلے رہتے ہیں تو

فوراً پایوری استعمال کرنا شروع کر دیجئے معدہ خراب ہو کر تندرستی بالکل خراب ہو جائے گی۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ، علاوہ محصول ڈاک پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

شربت اطفال

شربت اطفال لطیف اور خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بیحد مفید ہے۔ نمونیہ یعنی ڈبا یا پسلی چل جانا۔ موتی جھرہ، خسرہ، چیچک، قبض، دستوں کا آنا، آنکھیں دکھنا۔ دانتوں کے نکلنے میں تکلیف ہونا ان سب امراض کے لئے شربت اطفال اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ہوگا۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر مدنی دواخانہ۔ مدینہ منزل بجنور

حلوائے مغزی

ضعف دماغ ایسا مرض ہے جو ابتدا میں تو مریض کو کسی خاص تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا لیکن رفتہ رفتہ اس کے اثرات زندگی دوبھر کر دیتے ہیں۔ یہ مرض بالعموم تعلیم یافتہ طبقہ کو اور بالخصوص دماغی محنت کرنے والے لوگوں کو لاحق ہوتا ہے رفتہ رفتہ اعضا میں کمزوری اور بینائی میں کمی ہو جاتی ہے۔ زیادہ دیر تک لکھنے پڑھنے، سوچنے سمجھنے اور دھوپ میں رہنے سے دماغ چکرانے لگتا ہے۔ اگر اس مرض کے مریض خواہ وہ ابتدائی اسٹیج پر ہوں یا مذکورہ بالا تمام خرابیوں کا شکار ہو چکے ہوں "مغزی" کا استعمال کریں گے تو اس سلسلے کی ہر شکایت دور ہو جائیگی۔ مغزی دماغ کے لئے ایک ایسا ٹانک ہے جو ہر حال میں بے انتہا مفید ثابت ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے اعضا رئیسہ کو بھی کافی تقویت پہنچتی ہے۔ قیمت فی سیر ۵ روپئے علاوہ محصول ڈاک۔ خوراک ایک تولہ

اکسیر معدہ

فی زمانہ ننانوے فیصدی اشخاص ریاحی امراض میں مبتلا ہیں خصوصاً وہ اعلی التعلیم یافتہ طبقہ جو دماغی کام بھی کرتا ہو اور مرغنیات زیادہ استعمال کرتا ہو ان لوگوں پر اکسیر ننانوے فیصدی کامیاب ثابت ہوئی ہے چنانچہ درد معدہ ریاحی۔ درد گردہ ریاحی۔ بواسیر ریاحی چند یوم کے استعمال سے زائل ہو جاتی ہے قیمت فی شیشی ۴ قرص آٹھ آنے (۸/) علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ روانہ ہوگا۔

آب شفا

یہ آب شفا بے شمار امراض کے لئے نہایت زود اثر اور قابل اعتماد دوا ہے۔ اس کی ایک شیشی ہر انسان کو سفر و حضر میں اپنے پاس رکھنا گویا ایک طبیب یا ڈاکٹر کو ساتھ رکھنا ہے قیمت فی شیشی آٹھ آنے (۸/) علاوہ محصول ڈاک۔ ایک درجن کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

ملنے کا پتہ:- منیجر مدنی دواخانہ۔ مدینہ منزل۔ بجنور

قابل مطالعہ کتابیں

باقیات بجنوری۔ یہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے مضامین، خطوط اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مرحوم نے طرز تحریر میں اپنی ایک الگ اور مجتہدانہ راہ نکالی تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ اور علمی مباحث میں بھی شگفتگی زبان کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ یہ جواہر ریزے جو ایک طرح سے ان کے علمی و ادبی تبرکات ہیں۔ صرف ادب و زبان کی حیثیت سے قابل قدر نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض اہم علمی و معاشرتی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۲؍

بہارِ داغ۔ مرتبہ سید نذر نیازی بی اے جامعہ۔ یہ داغ دہلوی کے کلام کا انتخاب ہے داغ کی شاعری کسی تعارف کی محتاج نہیں ان کی رندگی اور شوخی ضرب المثل ہے۔ وہ شباب کے مفسر اور عشق و جنوں کے رازدار تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا دل حقیقت سے بے خبر نہیں تھا۔ اس مجموعہ میں آپ داغ کو اصلی رنگ میں دیکھیں گے۔ قیمت ۱۲؍

کمالِ داغ۔ حضرت داغ دہلوی مرحوم کے کلیات کا بہترین انتخاب اور ان کی شاعری پر بحث از حامد حسن صاحب قادری۔ قیمت ۱۲؍

مقدمہ تاریخ ہند قدیم۔ مصنفہ اکبر شاہ خاں صاحب۔ یہ مقدمہ عہد ہنود کا ایک جزو ہے۔ اس کا مطالعہ تاریخی ذوق اور تاریخ عہد ہنود سے فائدہ اٹھانے کی استعداد پیدا کرنے کا باعث اور علم میں قیمتی اضافہ کا موجب ہوگا۔ ۱۲؍

انور پاشا۔ مترجمہ عبدالرزاق ملیح آبادی۔ مجاہد ترکی انور پاشا مرحوم کے حالات زندگی اور مجاہدانہ کارنامے۔ قیمت ۶؍

مصطفیٰ کمال۔ یہ کتاب مصطفیٰ کمال پاشا کی سوانح عمری اور ان کے مجاہدانہ کارناموں پر لکھی گئی ہے۔ مصنفہ محمد اشفاق صاحب وکیل۔ قیمت ۸؍

مکتبہ جامعہ قرولباغ نئی دہلی

مصطفیٰ کمال اور تاریخ ترکی ۔ از محمد اظہر علی علوی۔ ایم۔ ایل۔ اے۔ ترک کس طرح مرکز زندہ ہوئے اور انھوں نے دستوری طریقہ کی سلطنت کیسے حاصل کی۔ جستہ جستہ ان ممالک و مقامات اور غیر قوموں کا حال بھی لکھا ہے جن سے ترکوں کو معاملہ پڑا۔ قیمت عہر

اوج کمال یہ عبد المجید صاحب عتیقی کی تصنیف ہے۔ اس میں مصطفیٰ کمال پاشا کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت عہر

مبادی سیاسیات مصنفہ پروفیسر ہارون خاں شروانی ایم۔ اے (آکسن) صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ حیدر آباد۔ ہمارے ملک میں لوگوں کی سیاسی معلومات اتنی کم ہیں کہ شاید کسی متمدن ملک میں یہ حالت نہ ہوگی۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خود ہماری مادری زبان میں علم سیاست پر اچھی کتابوں کا فقدان ہے۔ مبادی سیاسیات اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں عہد حاضر کے جملہ سیاسی مسائل شرح و بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں اور اسی سلسلہ میں جرمنی اور اٹلی کی فسطائیت اور روس کی اشتراکیت پر خاص طور پر تنقید کی گئی ہے۔ اصطلاحات کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ قیمت مجلد صہر

خطوط محمد علی مولانا محمد علی کی زندہ جاوید اور عظیم الشان شخصیت کا ایک صفحہ تو آپ مضامین محمد علی میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ مرحوم کی شخصیت کا دوسرا صفحہ خطوط محمد علی میں دیکھئے۔ بزرگوں کا وفادار اور نیاز مند دوستوں کا جاں نثار اور عاشق زار۔ بے باک اور بے ریا، ظاہر و باطن میں کھرا، حق کی خاطر اپنوں اور بیگانوں دونوں کی پرواہ نہ کرنے والا۔ مرتے دم تک اپنے اصولوں پر راسخ القدم محمد علی ——— یہ خطوط اسی محمد علی کی تصویر ہیں۔ قیمت عگار

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ قرولباغ۔ نئی دہلی

باقیاتِ بجنوری

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم سے اُردو دنیا اچھی طرح واقف ہے
ان کا پہلا کارنامہ دیوانِ غالب (نسخہ حمیدیہ) کا دیباچہ ہے۔ اسی کی بدولت
انھوں نے اُردو داں طبقے میں مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اپنی علمی
قابلیت اور زبان آوری کی بدولت ایک ممتاز حیثیت کے مالک تھے، طرز
تحریر میں انھوں نے اپنی ایک الگ اور مجتہدانہ راہ نکالی تھی۔ سنجیدہ سے
سنجیدہ اور علمی مباحث میں بھی شگفتگی، زبان ہاتھ سے نہ جانے پاتی تھی۔ یہ
جواہر ریزے جو ایک طرح سے ان کے علمی و ادبی تبرکات ہیں، صرف
ادب و زبان کی حیثیت سے قابلِ قدر نہیں ہیں بلکہ ان میں بعض اہم علمی
و معاشرتی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے۔ مکتبہ جامعہ نے اس کی ظاہری
نمود پر بھی بہت توجہ صرف کی ہے۔ پوری کتاب ٹائپ میں چھپی ہے، جلد اور
گرد پوش نہایت دیدہ زیب۔

قیمت دو روپئے آٹھ آنے

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

خطوط محمد علی

مولانا محمد علی کی زندہ جاوید اور عظیم الشان شخصیت کا ایک صفحہ تو آپ مضامین محمد علی میں ملاحظہ فرما چکے، مرحوم کی شخصیت کا دوسرا صفحہ "خطوط محمد علی" میں دیکھیے۔

مضامین مرحوم کی سیاسی اور اجتماعی سرگرمیوں کا مرقعہ ہے اور خطوط آپ کی شخصی اور باطنی زندگی کے آئینہ دار۔ محمد علی کی یہ زندگی بے حد تابناک اور بلند تھی۔ اس لئے خطوط کا یہ مجموعہ مرحوم کی بہترین متاع ہے۔

بزرگوں کا وفادار اور نیازمند، دوستوں کا جاں نثار اور عاشق زار بیباک اور بے ریا۔ ظاہر و باطن میں کھرا، حق کی خاطر اپنوں اور بیگانوں دونوں کی پرواہ نہ کرنے والا، اور مرتے دم تک اپنے اصولوں پر راسخ القدم محمد علی ——————— یہ خطوط اسی محمد علی کی تصویر ہیں۔

قیمت دو روپئے

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی



مکتبہ جامعہ دہلی

اسلامی ممالک کی سیاست

مصنفہ عشرت حسین صدیقی بی اے

مصنف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی اور تاریخی ارتقار پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر ٹرکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کی کیا حالت تھی جنگِ عظیم کے ختم پر اُن کی سیاسی اہمیت کیا باقی رہ گئی۔

مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی سیاسی تحریکیں اٹھیں۔ ان کا حشر کیا ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی پوزیشن کیا ہے۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ سیاست اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ایسے وقت میں جبکہ ہر شخص اسلامی ممالک کی موجودہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت عمر

مکتبہ جامعہ

دہلی نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت:۔ نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۴۳ نمبر ۳	بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ ۵ روپے فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر۔ پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہو گئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی مطبوعاتِ جامعہ
کے علاوہ دوسرے اداروں کی کتابیں بھی مختلف عنوانات
کے ماتحت درج کی گئی ہیں۔ اربابِ ذوق یہ نئی فہرست
منگا کر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

اقبال کا ذہنی ارتقا[1]

(گذشتہ سے پیوستہ)

زندگی کے متعلق اقبال کا نظریہ نامی اور دست پذیر ہے۔ زندگی ایک مسلسل حرکت ہے جو ہمیشہ بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ جمود اور سکون زندگی کی قوتوں کو مردہ کر دیتے ہیں۔ پیہم حرکت میں زندگی کا راز پنہاں ہے۔ اس سے خون تازہ پیدا ہوتا ہے، آرزوئیں ہوتی ہیں اور زندگی میں نمو کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ "پیام مشرق" میں اقبال نے "زندگی عمل" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھا ہے ؎

ساحل افتادہ گفت — گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد — آہ! کہ من چیستم
موج ز خود رفتۂ — تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم — گر نہ روم نیستم

زندگی اور موت کی حقیقت کے متعلق اقبال نے ایک بہت ہی بلیغ شعر کہا ہے یعنی خواب کیا ہے؟ ایک ہلکی سی موت، اور موت کیا ہے؟ ایک گہرا خواب ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں — خواب را مرگ سبک داں، مرگ را خواب گراں

زندگی کی آسائشوں کو ڈھونڈنے والی قوم کو جس کے افراد کا میخانۂ حیات خالی ہو چکا ہے اور جس میں زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت نہیں اقبال کا پیام یہ ہے ؎

اے کہ آسودہ نشینی لب ساحل برخیز — کہ ترا کار بگرداب و نہنگ است ہنوز
از سر تیشہ گذشتن ز خرد مندی نیست — اے بسا لعل کہ اندر دل سنگ است ہنوز

سوشلزم کے متعلق اقبال کا رویہ ہمدردانہ ہے۔ وہ سرمایہ داری کی موجودہ صورت کو انسانیت کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ انھیں مزدوروں کے ساتھ سچی ہمدردی ہے اور وہ دولت کی منصفانہ تقسیم کے مؤید ہیں

---

[1] اس مضمون میں مندرجہ ذیل مضامین سے مدد لی گئی ہے۔ (۱) سیرت اقبال (۲) جوہر اقبال (۳) "اردو" کا اقبال نمبر (۴) "نیرنگ خیال" کا اقبال نمبر (۵) "علیگڈھ میگزین" کا اقبال نمبر (۶) رسالہ "جامعہ" کے مختلف پرچے (۷) اقبال کا تعلیمی فلسفہ (انگریزی) از غلام السیدین۔ اسلوب احمد

اس میں شک نہیں کہ اقبالؔ اشتراکیت کے مادّی فلسفہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ اس تحریک کی عالمگیری سے پریشان خاطر نہیں ہیں۔ وہ اس جور و استبداد کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں جو قیصریت کے پردے میں مزدوروں پر روا رکھا جاتا ہے وہ ایک ایسا نظام چاہتے ہیں جس میں مزدوروں کو ابھرنے کا موقع ملے اور وہ انسانیت کے کسی حق سے محروم نہ رکھے جائیں۔ اپنی نظم "خضر راہ" میں انھوں نے سرمایہ و محنت کے مسئلہ پر اظہار خیالات کرتے ہوئے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی مذمت کی تھی اور مزدوروں کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی تھی۔ انھوں نے مزدوروں کو ایک روشن مستقبل کی خوشخبری سنائی تھی۔ "پیام مشرق" میں بھی انھوں نے اس کی ہمنوائی کی ہے ؎

بیا کہ تازہ نوائے تراود از رگ ساز — مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم — بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنان چمن انتقام لالہ کشیم — بہ بزم غنچہ و گل طرح دیگر اندازیم
بہ طوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے؟ — ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

اقبال مزدور کے جذبہ غیرت کو ابھار کر اسے موجودہ نظام کو درہم برہم کر دینے پر آمادہ کرتے ہیں اور اس کی خودداری سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ ان پرانے بتوں کو مسمار کر کے ایک نئی طرح ڈالے وہ اسے طواف غیر سے آزاد ہو کر اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہونے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک اس سرمایہ دارانہ استبداد کا شکار رہ چکا ہے لیکن آخر تابہ کے؟ انتقام کی آگ پوری طرح روشن ہو چکی ہے۔ اقبال اسے تیز تر کرنا چاہتے ہیں۔

"جاوید نامہ" اقبال کا بہترین شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے جس میں دماغی اور روحانی کیف کے لئے اچھا سامان موجود ہے۔ اقبال نے کافی عرصہ تک اس کا خاکہ اپنے ذہن میں کھینچا اور پھر اپنے جوش وجدان سے مستفید ہو کر ان نقوش کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا جو اس کی دماغی سطح پر قائم ہو چکے تھے۔ آسکر وائلڈ نے کہا ہے کہ "فن کار کا عمل اس کی یگانہ سرشت کا یگانہ ثمر ہوتا ہے" جاوید نامہ کو اگر اقبال کی دماغی کاوش کا یگانہ ثمر کہا جائے تو یقیناً اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا کیونکہ اس میں اقبال نے اپنی قوت تخلیق کا پورا ثبوت دیا ہے

اور فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ شعریت کے عنصر کو قائم رکھا ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال نے پیر رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے اور اسی سلسلہ میں مختلف روحوں سے ملاقات کا منظر دکھایا ہے۔ اس کا نقشہ کسی قدر ڈوائن کامیڈی (Divine Comedy) اور دوسری کتابوں سے ملتا ہے۔ مگر اس سے اقبال کی جدتِ طبعی پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس کے تخیل کا اچھوتا پن، انداز بیان کی ندرت اور طرز تحریر کا سحر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ جس کے ساتھ اس کی شاعرانہ عظمت کا دامن وابستہ ہے۔ ڈوائن کامیڈی نے دانتے کو بین الاقوامی شہرت کا مالک بنا دیا اور جدید ترین تحقیقات کی بنا پر یہ ثابت ہو جانے کے بعد بھی کہ دانتے اسلامی حکمار کے خیالات اور معراج کے واقعات سے بے انتہا متاثر ہوا تھا اس کی شہرت اپنی جگہ قائم ہے۔ اقبال بھی اپنی اس کتاب کی بدولت صدیوں یاد کیے جائیں گے اور دنیا ہمیشہ ان کے لازوال کارناموں سے اکتساب فیض کرتی رہے گی۔

"جاوید نامہ" میں موجودہ حالات پر بھی بڑے اہم مباحث موجود ہیں۔ اشتراکیت کے متعلق اقبال کا نظریہ ہم ابھی واضح کر چکے ہیں۔ اقبال کو اس بات سے خوشی ہے کہ اشتراکیت نے قیصریت کے چراغ کو گل کر دیا ہے اور سرمایہ داری کی بنیادوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ یہاں تک اسلامی نظریہ اشتراکیت بھی اس کا موید ہے مگر ہر تخریب کے بعد تعمیر کا عمل ضروری ہے ورنہ کوئی کارآمد رد عمل پیدا نہیں ہو سکتی لا کی تخریب کے بعد الا کی تعمیر ضروری ہے۔ ہم لامحدود نظریوں کے ہجوم میں کھوئے جاتے ہیں۔ اور کسی مستقل نظریہ کو اپنا نصب العین نہیں بنا سکتے۔ موجودہ تحریک اشتراکیت کی بے راہ روی اور شورانگیزی کا سبب یہی ہے۔ اشتراکیت کی بنیاد نفی سے شروع ہوتی ہے خدا کی نفی، کلیسا کی نفی، املاک کی نفی، ملوکیت کی نفی، حکومت کی نفی (یعنی کمیونزم کے انتہائی دور میں) مسائل زندگی کی نفی، تدبیر منازل کی نفی، اس نفی کے گرداب میں آج وہ تمام قومیں گرفتار ہیں جنہوں نے اشتراکیت کے دامن میں پناہ ڈھونڈی ہے اگر اشتراکیت میں نفی کے بعد اثبات کے عنصر کو بھی داخل کر لیا جائے تو پھر حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے جو موجودہ بے چینیوں اور ہنگامہ آرائیوں کا یک حد تک خاتمہ کرنے والی ہو جائے گی۔ اقبال نے "جاوید نامہ" میں انہی خیالات کو یوں پیش کیا ہے ؎

ترکِ طرحِ دیگرے انداختی ۔۔۔ دل ز دستورِ کہن پرداختی

ہیچو ما اسلامیان اندر جہاں ‏ ‏ قیصریت را شکستی استخواں

تابر افروزی چراغ اندر ضمیر ‏ ‏ عبرتے از سرگذشت ما بگیر

کردہ کار خداوندان تمام ‏ ‏ بگذر از لا جانب الا خرام

- تمہید آسمانی میں آسمان کی زبان سے زمین کو جو طعنہ دیا گیا اور اس طعنہ کو سن کر جب زمین خجل ہوئی جاتی تھی تو خدا کی طرف سے تسلی کی یہ ندا آئی ؎

اے امینے از امانت بیخبر ‏ ‏ غم مخور اندر ضمیر خود نگر

شستہ از لوح جاں نقش امید ‏ ‏ نور جاں از خاک تو آید پدید

عقل آدم بر جہاں شبخوں زند ‏ ‏ عشق او بر لامکاں شبخوں زند

- فلک زحل" میں ایک مقام اقبال نے ان ارواح رذیلہ کے لئے وقف کر دیا ہے جنھوں نے ملک و ملت کے ساتھ غداری کی۔ اقبال نے ان کی انتہائی مذمت کی ہے۔ اقبال نے اس مقام پر جعفر بنگالی اور صادق دکنی کو رکھا ہے جن کی پیشانیوں پر کلنک کا ٹیکہ لگا ہوا ہے یہی وہ غداران ملت ہیں جنھوں نے اپنی ناجائز خواہشات کی بر آری کے لئے سرزمین ہند میں نفاق کے بیج بوئے اور اپنی مذموم حرکات سے اپنی فطرت کے جوہر کو زنگ آلود کیا۔ اقبال نے اسی سلسلہ میں ہندوستانیوں کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنے ننگ انسانیت انسانوں سے خبردار رہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں سے ظلمت و ادبار کی گھٹائیں نہیں چھٹ سکتیں جب تک کہ یہ روح ان کے جسم میں موجود ہے اس لئے لکھتے ہیں ؎

کے شب ہندوستاں آید بروز؟ ‏ ‏ مرد جعفر زندہ روح او ہنوز

تا ز قید یک بدن وا مے رہد ‏ ‏ آشیاں اندر تن دیگر نہد

گاہ او را با کلیسا ساز باز ‏ ‏ گاہ پیش دیریاں اندر نیاز

دین او آئین او سوداگری ست ‏ ‏ عنتری اندر لباس حیدری ست

ظاہر او زغم دیں دردمند ‏ ‏ باطنش چوں دیریاں زنار بند

جعفر اندر ہر بدن ملت کش است ‏ ‏ ایں مسلمانے کہن ملت کش است

اقبال نے بڑے لطیف انداز میں تمام نام نہاد ملت پرستوں پر نکتہ چینی کی ہے اور انھیں ملت کے نظام میں ایک زہریلا عنصر قرار دیا ہے۔

سعید حلیم پاشا کی زبان سے ترک نوجوانوں کو جو پیام دیا گیا ہے وہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے جو صراط مستقیم سے ہٹ گئی ہے اور اپنے نصب العین سے غافل ہے صحیح راہ عمل کا کام دے سکتا ہے جس پر چل کر وہ اپنی کھوئی ہوئی سطوت و شوکت کو دوبارا حاصل کر سکتے ہیں اور اس مرتبہ پر پہونچ سکتے ہیں جو ان کے شایان شان ہے ؎

چوں مسلماناں اگر داری جگر   در ضمیر خویش و در قرآں نگر

صد جہان تازہ در آیات اوست   عصرہا پیچیدہ در آنات اوست

یک جہانش عصر حاضر را بس است   گیر اگر در سینۂ دل معنی رس است

بندۂ مومن ز آیات خدا است   ہر جہاں اندر بر او چوں قبا است

چوں کہن گردد جہانے در برش   می دہد قرآں جہانے دیگرش

"جاوید نامہ" کے تین سال بعد "بال جبریل" نکلی اور اس کے ایک ہی سال بعد "ضرب کلیم" نمودار ہوئی "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے فلسفہ خودی کو اجاگر کیا ہے۔ اسرار مرگ و زیست کی عقدہ کشائی کی ہے۔ تہذیب حاضر کا خاکہ کھینچا ہے، ہندی مکتب اور ہندی طالب علم کی نبض ٹٹولی ہے۔ سیاسیات مشرق و مغرب پر گہری تنقید کی ہے اور اپنے آئیڈیل مسلمان کے کردار کے نقوش کو چمکا کر دکھایا ہے۔ "بال جبریل" میں فلسفہ زیادہ ہے مگر زبان کی سلاست، پختگی اور شیرینی نے فلسفہ کے چہرہ پر رنگین پردہ ڈال دیا ہے۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کا عنصر قطعاً مفقود ہے۔ لیکن اس کے باوجود دلکشی کے اعتبار سے یہ اپنی جگہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ "ضرب کلیم" میں اقبال کا آرٹ روبہ انحطاط ہے۔ میری رائے میں اگر "ارمغان حجاز" کے متعلق اس قسم کا خیال ظاہر کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کا عنصر مفقود ہونے کے باوجود بعض جگہ سلاست اور برجستگی کے اچھے نمونے موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا اشہب قلم ابھی تک اپنی تگ و تاز سے تھکا نہیں ہے اور اس میں جولانی موجود ہے۔ "ضرب کلیم" میں شعریت کی کمی کی وجہ

یہ بھی ہے کہ لوگ اقبال کے کلام کو جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لئے پڑھنے لگے تھے۔ حالانکہ ان کا آرٹ کلیتہً زندگی کے تابع ہے۔ چنانچہ انھوں نے ضرب کلیم کے پیش لفظ میں ناظرین کو تنبیہ کی ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ضرب کلیم کے اشعار میں شعریت یا موسیقیت کے بجائے زندگی اور حقائق زیادہ ہیں۔ اپنے ان پیغاموں کو جنھیں پہلے وہ شعریت کے پردے میں سنا کر لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتے تھے اب لوگوں کو متوجہ دیکھ کر انھیں سیدھا سیدھا بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہم اسے انحطاط نہیں کہہ سکتے بلکہ ان کے ذہنی ارتقاء کی ایک کڑی۔

بال جبریل میں اقبال نے فلسفہ خودی کو نئے انداز سے بیان کیا ہے اور اسے زندگی کی نشوونما کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر شئے اپنے وجود کو اجاگر کرنا چاہتی ہے شعور ذات ہی اصل حیات ہے جس کا انجام روحانی اور اخلاقی قوت ہے۔ اس سے انسان کی دبی ہوئی طاقتیں بروئے کار آتی ہیں اور ارتقائے نفس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہی زندگی کا جوہر ہے۔ اور جب یہ انسان تما پوری طرح نشوونما پالیتی ہے تو وہ خود اپنی تقدیر کی ہیئت کو بدل سکتا ہے اور خدا کا راز داں بنجاتا ہے

ہر چیز ہے محو خود نمائی	ہر ذرہ شہید کبریائی
بے ذوق نمود زندگی موت	تعمیر خودی میں ہے خدائی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے	خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کے زور سے دنیا پہ چھا جا	مقام رنگ و بو کا راز پا جا
برنگ بحر ساحل آشنا رہ	کف ساحل سے دامن کھینچتا جا

یہ موج نفس کیا ہے؟ تلوار ہے	خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے؟ راز درون حیات	خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات

(بال جبریل)

جب انسان کا احساس ذات تربیت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس پر ترقی کے لازوال امکانات کھل جاتے ہیں۔ اور وہ دونوں جہاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے ؎

نہ میں عجمی، نہ ہندی، نہ عراقی، نہ حجازی　　　　کہ خودی سے میں نے سیکھی دوجہاں سے بے نیازی

اور پھر اس کا مرتبہ جس قدر بلند ہو جاتا ہے وہ بھی اقبال ہی کی زبان سے سنئے ؎

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی　　　　نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب　　　　خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیاں حریر

اقبال نے خودی کا جو تصور پیش کیا ہے اس کے لئے فقر ضروری ہے جس سے اس میں اصل قوت پیدا ہوتی ہے ؎

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی　　　　ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ!

اس فقر اور معمولی فقر میں امتیاز بھی اقبال کی زبان سے سنئے ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　　　اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری　　　　اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری　　　　میراث مسلمانی، سرمایہ شبیری

خودی کی تکمیل کے لئے نت نئی آرزوؤں کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے۔ ایک لازوال کھٹک اور کسک کا دل میں رہنا ناگزیر ہے۔ اقبال نے سوز ناتمام کو اپنے فلسفہ کا ایک جزو قرار دیا ہے۔ وہ ایک ایسی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں جہاں خدا اور شیطان دونوں موجود ہوں ان کا نظریہ ارتقا تضاد کا پابند ہے۔ وہ جنت کو اس لئے پسند نہیں کرتے کیونکہ وہاں یہ سوز اور دردمندی جو زندگی کی اصل روح ہے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اسے ایسی متاع گراں مایہ سمجھتے ہیں کہ اس کے آگے شان خداوندی کی بھی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ مقام بندگی میں انھیں یہ چیز حاصل ہو سکتی ہے ؎

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی　　　　مقام بندگی دے کر نہ لوں شان خداوندی

عقل و عشق اقبال کا بڑا دل پسند موضوع ہے جس پر انھوں نے متعدد مرتبہ اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال نے عشق کو ایک خاص مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ عقل سے مراد ظاہری علم ہے جس سے خارجی اشیاء کا ادراک بالواسطہ کیا جاتا ہے۔ عشق سے مراد وہ جذب اندروں ہے۔ جس سے حقیقت کا مشاہدہ

بلا واسطہ کیا جا سکتا ہے۔ تصوف میں عشق سے مراد وجدان ہے جس کا تعلق روحانیت سے ہے۔ انہی دو کو اصطلاحوں یعنی عقل اور عشق کو خبر اور نظر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چنانچہ اقبال نے ایک جگہ عقل کے متعلق کہا ہے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں

اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں کیونکہ عقل کا مشاہدہ محدود ہے اور حقیقت بینی اس کے بس کا کام نہیں وہ زمان و مکان کی حدبندیوں میں محصور ہے اور اس کی پرواز صرف اس عالم رنگ و بو تک محدود ہے اقبال نے "بانگ درا" میں عقل و دل کے عنوان سے ایک نظم میں نہایت دلکش طریقہ سے دونوں کا فرق ظاہر کیا ہے۔ دل عقل سے کہہ رہا ہے ؎

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن سے آشنا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
علم کی انتہا ہے بے تابی — اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکاں سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں

عقل کی محدود صلاحیتوں کی نسبت "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں متعدد اشعار ملتے ہیں حقیقت کے مشاہدہ کے لئے جس جرأت رندانہ کی ضرورت ہے عقل اس سے بالکل تہی دست ہے۔ زمانہ عقل و دانش کے چکر میں پھنسا ہوا ہے اور اس جنون کو مضحکہ خیز ٹھیراتا ہے جس کی سرحد عقل کے بعد شروع ہوتی ہے۔

زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک!

عشق کے جرأت رندانہ کی ایک جھلک اس شعر میں دیکھیے ؎

عشق کی ایک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسمان کو بے کراں سمجھا تھا میں

اور اس کے مقابلہ میں عقل کی بے بسی اور تنگ نظری بھی ملاحظہ کیجئے ؎

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے خرد کیا ہے؟ چراغ رہگذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے؟ (بال جبریل)

اسی لئے اقبالؔ کی تلقین یہ ہے ؎

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغ راہ ہے، منزل نہیں ہے

اقبالؔ نے جو تصور پیش کیا ہے اس کے مطابق عشق ہی اصل چیز ہے۔ عشق ہی سے وہ نظر پیدا ہوتی ہے جو زندگی کے راز آشکارا کرتی ہے۔ ارتقائے نفس اور معرفت الٰہی جو انسان کا انتہائی نصب العین ہے اور جسے اقبالؔ نے جگہ جگہ پیش کیا ہے عشق کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ راہ معرفت میں عقل کی لاچاری صاف عیاں ہے۔ اس راہ میں عشق ہی اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ عشق کسی احتیاط کا قائل نہیں۔ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہے۔ منطق اور فلسفہ صرف عقل کے لئے ہیں۔ عشق کا رہنما وجدان ہے جس کے سامنے یہ موشگافیاں بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ زندگی کی صحیح روح کا اندازہ صرف عشق ہی کی وساطت سے لگایا جا سکتا ہے۔ عقل اس معاملہ میں عاجز ہے ؎

عشق کے مضراب سے نغمۂ تار حیات عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

علم جو عقل کا نتیجہ ہے باطنی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتا۔ اس کی نظر سطحی اور غیر حقیقی ہوتی ہے۔ علم ہمارے "ذوقِ آگہی" کی مکمل تسلی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی تحقیقات ادھوری ہوتی ہیں " ضرب کلیم" میں علم اور عشق کے فرق کو یوں دکھایا ہے ؎

عشق کی گرمی ہے معرکۂ کائنات علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام شورش طوفاں حلال، لذت ساحل حرام
عشق پہ بجلی حرام، عشق پہ حاصل حرام علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے امّ الکتاب

لیکن اقبالؔ عقل کا مخالف نہیں ہے۔ اس کے نزدیک عقل و عشق میں تضاد نہیں ہے۔ بلکہ وہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جو لوگ اقبالؔ کے کلام میں تضاد کا اعتراض پیش کرتے ہیں، انہیں سمجھنا

چاہئے کہ اقبال عشق کو عقل کا انتہائی معراج سمجھتے ہیں۔ ان دونوں کے باہمی امتزاج سے تمام اخلاقی اور مابعد الطبیعیاتی مسائل کا حل سمجھ میں آسکتا ہے۔ جہاں عقل کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے عشق کی منزل شروع ہوتی ہے۔ ان کے خیال میں اگر کسی انسان میں ان دونوں کے درمیان ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ کمال انسانیت سے عاری ہے "نگاہ شوق" کے عنوان سے ایک نظم میں لکھتے ہیں۔

یہ کائنات چھپاتی نہیں ضمیر اپنا　　کہ ذرہ ذرہ میں ہے ذوق آشکارائی
کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں　　نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی
نگاہ شوق میسر نہیں اگر تجھ کو　　ترا وجود ہے قلب و نظر کی رسوائی

شاعر عقل سے پورے طور پر سیر ہو چکنے کے بعد خدا سے دعا کرتا ہے ؎

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبال "ملائے حرم" سے بے حد بیزار ہے کیونکہ اس نے مذہب کی صحیح روح کو سمجھے بغیر اس کی محافظت کا دعویٰ کیا ہے اس کے گفتار و کردار میں اقبال کو جو تضاد نظر آتا ہے وہی اس کی نظروں میں سب سے زیادہ کھٹکتا ہے۔ بحث و تکرار اور بدگوئی و غیبت اس کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ اس کے دل میں ایمان کی گرمی نہیں، گفتار میں سوز نہیں، قلب میں حرارت نہیں اور نظر میں وسعت نہیں۔ مسجدیں اس کی احمقانہ گفتگو کے لئے خاص مقام ہیں۔ اس لئے اقبال کا خیال ہے کہ جنت میں باوجود حور و شراب کے اس کے لئے کوئی دلکشی نہیں کیونکہ جنت بحث و تکرار اور لڑائی و فساد کے لئے نہیں ہے۔ "بال جبرئیل" میں ان ظاہر پرست ملاؤں پر بڑی سخت نکتہ چینی کی ہے۔ انداز بیان بالکل نرالا ہے ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا　　حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکم بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف　　خوش نہ آئینگے اسے حور و شراب لب کشت
نہیں فردوس مقام جدل و قال و اقوال　　بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا　　اور جنت میں نہ مسجد، نہ کلیسا، نہ کنشت

ان ظاہر پرست ملاؤں کی روح حقیقت کے نور سے تہی ہے۔ ان کی اذان میں کوئی کشش کوئی

جذب نہیں۔ سجدوں میں ذوق و شوق نہیں۔ اور دلوں میں خلوص کی تابندگی نہیں۔ ان تمام کمزوریوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ ان میں جذبِ اندروں باقی نہیں رہا۔ اُن کے دل کے سوتے صداقت سے خشک ہو چکے ہیں۔ "ضربِ کلیم" میں ملائے حرم کے عنوان سے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　　تری نگاہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال　　　تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام

اقبالؔ مذہب کی ظاہری نمائش سے بیزار ہے وہ گفتار اور کردار میں ہم آہنگی دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ فلسفی سے اس لئے نفرت کرتا ہے کیونکہ اس کا دل مردہ ہے۔ صوفی کے اس لئے خلاف ہے کیونکہ اس میں صرف مستیٔ احوال ہے ملا کو اس لئے برا کہتا ہے کیونکہ اس کے یہاں صرف وعظ و نصیحت کی گرما گرمی ہے اس کے یہاں خیر اور نظر میں فساد ہے۔ شاعر کی نواؤں میں صرف مستی ہے زندگی اور سچائی نہیں، اس کی ترنگ میں نشہ ہے جو انسان کو عالم خود فراموشی میں پہونچا دیتا ہے۔ حیات اور عمل کا پیغامبر اقبالؔ اسی لئے ان سب سے کنارہ کش ہے کہ وہ انسان کی قوت ارادی کو خواب آور نشہ کے ذریعہ سلا دیتی ہیں۔ ان میں حرکت اور اضطراب کی بجائے جمود اور تعطل ہے۔ سرگرمی کی بجائے سرمستی ہے۔ بیداری کی بجائے خواب ہے اقبالؔ ان سب سے منہ موڑ کر اور ناامید ہو کر اک مردِ مجاہد کا متلاشی ہے۔ جو ایک قلبِ تپاں، ایک چشمِ بینا، ایک خلیلی روح، ایک کلیمی نظر رکھتا ہو، "ضربِ کلیم" میں اس نے خود کہا ہے ؎

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　　ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق　　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار

وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　　ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اقبال زندگی کو ایک مسلسل حرکت سمجھتے ہیں جس میں سکون و ثبات نہیں۔ زمانہ ایک قسم کی دائمی گردش ہے۔ موت انسانی زندگی کا خاتمہ نہیں کر دیتی بلکہ یہ صرف ایک منزل ہے۔ حقیقی زندگی موت کے بعد شروع ہوتی ہے اور روح کا ارتقا برابر جاری رہتا ہے اسے ایک جوئے رواں سے تعبیر کر سکتے ہیں جو ازل سے ابد تک جاری رہنے والی ہے۔ زندگی کا دھارا ہمیشہ گردش میں رہتا ہے اور زمانہ اس کے بہاؤ

کے ساتھ چلتا رہتا ہے۔ زندگی اور موت اس کے دو نشان ہیں لیکن اس سے اس کا بند ٹوٹتا نہیں اور نہ اس میں سکون پیدا ہوتا ہے۔ تموج کی لہریں اسے ہمیشہ تازہ دم رکھتی ہیں اور اس کی روانی بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہتی ہے۔ اقبالؔ نے اسی تسلسل کے متعلق ایک جگہ بڑے بلیغ انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اس زندگی کے لئے اقبال انقلاب کو لازمی و ابدی سمجھتے ہیں ؎

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی — روحِ امم کی حیات کشمکشِ انقلاب

برگساںؔ کا تخلیقی ارتقا کا نظریہ اقبال کے خیالات سے بہت قریب ہے۔ اس کے نزدیک تغیر و انقلاب کائنات کی بنیادی حقیقت ہے۔ حیات ایک مستقل اور مسلسل تخلیق ہے جو بعض مخصوص قوانین اور نوامیس کی پابند ہے۔ برگساںؔ زمانہ کو ایک استمرار یا دوران سے تعبیر کرتا ہے جو دائمی حرکت میں ہے۔ تغیرات کی ایک لڑی ہماری زندگی میں موجود ہے۔ زندگی ایک تخلیقی تحریک ہے جو ہر چیز کو ارتقائی رنگ دیدیتی اس کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے عقل سے زیادہ وجدان کی ضرورت ہے کیونکہ علم کا حقیقی سرچشمہ وہی ہے۔ اسی سے نشو و نما کا سلسلہ قائم رہتا ہے اور زندگی بڑھتی اور پھیلتی رہتی ہے۔ اقبالؔ نے اسی حرکت دوام کے متعلق ایک دوسری جگہ یوں اشارہ کیا ہے ؎

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

سفر زندگی کے لئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز

سخت کوشی زندگی کا اولین اصول ہے اس سے زندگی کی تزئین و آرائش ہو سکتی ہے ؎

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

"ساقی نامہ" بالِ جبریل کی بڑی مشہور نظموں میں سے ہے۔ اس میں شروع میں اقبالؔ نے بہار کا نقشہ کھینچا ہے جو ادبی مصوری کا بہترین نمونہ ہے۔ منظر کشی کا ابتدائی انداز جو "بانگِ درا" میں نظر آتا ہے اور جو "پیامِ مشرق" میں اپنے شباب کو پہونچا۔ "بالِ جبریل" میں اور زیادہ حسین اور دلکش ہو کر سامنے آگیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

ہوا خیمہ زن کاروان بہار ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اُچکتی ہوئی اٹکتی لچکتی، سرکتی ہوئی!
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ڈاکٹر اقبال مغربی تہذیب کے بڑے اچھے مبصر ہیں عموماً جو لوگ اس پر تبصرہ کرتے ہیں ان کے یہاں تعصبات زیادہ کام کرتے ہیں۔ اس لئے وہ گہری تنقید کا حق ادا نہیں کرسکتے اور اساسی حقائق تک ان کی نگاہ نہیں پہونچتی۔ قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے یورپی تہذیب کا اچھی طرح مطالعہ کیا اور چونکہ انھوں نے خود اسے برتا تھا اس لئے ان کی نظر میں اس کی تمام کمزوریاں نمایاں ہوگئیں۔ انھوں نے خود کہا ہے ؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

وہ اس تہذیب کی مادیت سے بیزار ہیں ان کا خیال ہے کہ جس تہذیب کی سرشت میں مادّی عناصر ہوں گے وہ کبھی ہماری زندگی میں توازن اور ہم آہنگی نہیں پیدا کرسکتی۔ انھیں مغربی تہذیب پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس میں صرف "عقل فسوں پیشہ" پر زور دیا گیا ہے۔ دماغی نشو و نما کے پہلو بہ پہلو وہ دل کی تربیت پر بھی زور دیتے ہیں زندگی کی اعلیٰ اقدار اور مقاصد کا تعین صرف اسی صورت میں ممکن ہے۔ اس تہذیب کی ظاہری چمک دمک میں اقبال کو دل کی موت کے سامان نظر آتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب نے جس معاشرتی نظام کی بنا ڈالی ہے اس میں بے ربطی، انتشار اور اضطراب کے سوا اور کچھ نہیں ؎

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الا

"ضرب کلیم" میں مغربی تہذیب کے متعلق لکھتے ہیں ؎

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ۔۔۔ کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ۔۔۔ ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

وہ اس تہذیب سے پیدا شدہ نظام معاشرت کی بھی دھجیاں اڑا دینا چاہتے ہیں کیونکہ اس نے انسانیت کے ارتقا میں رکاوٹیں ڈال دی ہیں۔ علم و ہنر کی روشنی کے باوجود یورپ میں زندگی کا شعلہ سرد پڑا ہوا ہے دماغ روشن و براق ہیں مگر دل تیرہ و تار، زبانوں پر آزادی اور مساوات کے نغمے ہیں۔ مگر ہر طرف فرنگی مدنیت نے نظام زندگی کو درہم برہم کر رکھا ہے اس انتشار اور بدنظمی کی وجہ یہ ہے کہ اس تہذیب کے پیچھے کوئی زبردست اخلاقی و روحانی طاقت نہیں ہے جو اعتدال کا راستہ پیدا کر کے قلب و نظر میں ہم آہنگی اور مطابقت قائم کرے۔ وہاں کوئی ایک نصب العین نہیں جس سے افراد کی زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہو۔ ہر ایک کی راہ الگ ہے۔ بلند تر انسانیت کا کوئی نظریہ ان کے سامنے نہیں جس کے حصول کی طرف تمام افراد کی کوششیں مرکوز ہوں۔ ان کے افعال کو پرکھنے کے لئے کوئی کسوٹی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کی تمام قوتیں تعمیر کی بجائے تخریب میں مصروف ہیں اور کسی نتیجہ پر پہنچ ہونے کی بجائے لہو لعب پر صرف کی جا رہی ہیں۔ "بال جبرئیل" میں اقبال نے کہا ہے ؎

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے ۔۔۔ حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
یہ علم یہ حکمت، یہ تدبر، یہ حکومت ۔۔۔ پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس ۔۔۔ کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت ۔۔۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

"عہد حاضر کے انسان" کے متعلق "ضرب کلیم" میں چند بہت بلند اشعار کہے ہیں ؎

"عقل ناپید و خودی گردش صورت نار" ۔۔۔ عقل کو تابع فرمان و نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا ۔۔۔ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا ۔۔۔ آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ۔۔۔ زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

"آذرنگ زدہ" کے عنوان سے ایک نظم میں تنقید کا پیرایہ بالکل مختلف ہے ؂

تری نگاہ میں ثابت نہیں خدا کا وجود　　　مری نگاہ میں ثابت نہیں وجود ترا

وجود کیا ہے فقط جوہرِ خودی کی نمود　　　کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا　(ضربِ کلیم)

اقبال موجودہ تہذیب کے اس خیال کو بھی ناپسند کرتے ہیں کہ مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ اسلامی نظریۂ سیاست کے مؤید ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سیاست کو سیدھے راستہ پر رکھنے کے لئے مذہب کی باگ ڈور ضروری ہے۔ مذہبی اور اخلاقی قیود انسانی افعال کو انتہا پسندی اور بے جا تشدد کی طرف مائل ہونے سے بچائے رکھتی ہیں سیاست قوت کے اعتدال اور تنظیم کا نام ہے لیکن اگر اسے بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ بازیگری ہو جاتی ہے اور اقتدار و غلبہ کی خواہش سے مجبور ہو کر انسان بہت سی ایسی حرکات کر گزرتا ہے جو کسی طرح بھی جائز و محمود نہیں کی جا سکتیں۔ ہر نظام سیاست کو اجتماعی زندگی کی ایک مضبوط قوت بنانے کے لئے ایسی پابندیاں ضروری ہیں ورنہ یہی حالت چنگیزیت میں بدل جائے گی موجودہ 'لادین نظریۂ سیاست' میں اقبال مستقبل کی تاریک تصویر کو صاف دیکھ رہے ہیں اور اسی لئے انھوں نے واضح طور سے کہا ہے ؂

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو　　　جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

موجودہ سیاست لادین کے متعلق کہتے ہیں ؂

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں　　　کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمِ آزاد　　　فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر

"دین و سیاست" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے اسلامی اور مسیحی نظریۂ سیاست پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے موجودہ نظریہ پر کاری ضرب لگائی ہے اور دین و سیاست کی دوئی کو "چشمِ تہذیبِ حاضر کی نابصری" سے تعبیر کیا ہے۔ اگر ان دونوں عنصروں کو علیحدہ کر دیا جائے تو نتیجہ تباہی کی صورت میں نمایاں ہوگا۔ اقبال تہذیبِ حاضر کے شیدائی کو اسلامی نظریہ کی طرف متوجہ کرتے ہیں جس نے ان دونوں عناصر کو ملا کر ایک بہترین امتزاج پیدا کیا ہے ؂

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی | سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں | کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا | چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری
دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی | دوئی چشم تہذیب کی نابصیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا | بشیری ہے آئینہ دار نذیری (بال جبرئیل)

اقبالؔ ہندی مکتب سے بہت مایوس ہیں۔ موجودہ نظام تعلیم نے جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہے غیر شعوری طور سے پورے نظام زندگی کو جامد، پرسکون اور بے روح بنا دیا ہے۔ زندگی میں کوئی وسعت نہیں رہی۔ دماغوں سے جدت اور قوت تخلیق کا مادہ ختم ہوگیا۔ اور انفرادی زندگی کی تمام ابھرنے والی قوتیں کمزور ہو کر رہ گئیں۔ ایسے ماحول میں مفکر اور جدت پسند شاعر اور ادیب کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ اور اقبال کا پیغام اس فضا کے لئے کیسے سازگار ہو سکتا ہے۔ اقبال جن بلندیوں پر پرواز کرتے ہیں اور جہاں وہ دوسروں کو بھی لے جانا چاہتے ہیں اس کا ادراک ہندی مکتب کے ان ممولوں کی نظر کہاں تک کر سکتی ہے؟ وہ اس کی نواؤں کی تاب کہاں لا سکتے ہیں؟ احساس ذات اور شعور نفس کا یہاں کیا گزر؟ اور خودی کی نشوونما کے مقالات کس طرح ایسے مکتب کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتے ہیں ؎

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا | موزوں نہیں مکتب کے لئے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے ممولوں کی نظر سے | پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

اقبال موجودہ نظام تعلیم کے خلاف اپنی زہر فشانی سے تھکتے نہیں کیونکہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے کس طرح سے پوری قوم کی زندگی کو تباہ کر دیا ہے اور ان کی تمام اعلیٰ صلاحیتوں کو بیکار بنا دیا ہے۔ اس نوع کی تعلیم نے نوجوانوں کی شخصیت کو مسخ کر دیا ہے اور ان کی زندگی کے آئندہ تمام امکانات خواب ہو کر رہ گئے ہیں۔ اعلیٰ مقاصد کے حصول کا جذبہ جو صحیح تعلیم کا لازمی نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ فکر معاش نے مردہ کر دیا ہے۔ وہ اس ذہنی اُپج، تیزیٔ ادراک اور جوش وجدان سے محروم ہو گئے ہیں۔ جن کی بدولت وہ اپنی فطرت کی پوری بلندی تک پہونچ سکتے ہیں اور جس سے ان کی شخصیت کا پورا خاکہ تیار ہوتا ہے

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نظام تعلیم ان کی تاریخی روایات، قومی نفسیات اور روحانی ضروریات کو پس پشت ڈالدیا گیا ہے اور ان کے نرم و نازک دماغوں کو ایک غیر مانوس اور غیر طبعی سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اعتماد، یقین اور وثوق کے بلند جذبات جو کامیابی کے لئے لابدی ہیں ان کے دماغوں سے محو ہو گئے ہیں۔ زندگی میں کوئی سوز حرارت اور گرمی نہیں اور سخت کوشی کی جگہ عیش پسندی کا دور دورہ ہے ؂

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکر معاش

دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش

اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھدی ہے غلامی نے نگاہ خفاش

مدرسے نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

ان مکتب سے نکلے ہوئے طالب علموں کی حالت یہ ہے ؂

یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسے میں
نہ ادائے کافرانہ! نہ تراش آذرانہ!

اقبالؔ کو ان کی حالت پر سخت افسوس ہے، ایک نوجوان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؂

ترے صوفے ہیں افرنگی ترے قالیں ہیں ایرانی
لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی

امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراج مسلمانی

ان کے لئے اقبالؔ کی دعا یہ ہے ؂

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

اور اس کا پیام یہ ؂

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے مرا نورِ بصیرت عام کر دے

"فرمانِ خدا" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے مزدوروں کی حمایت میں بڑے سہانے گیت گائے ہیں اور بدلتے ہوئے حالات کو سامنے رکھ کر مزدور کے مستقبل کا تابناک چہرہ دکھایا ہے وہ اب "پیرانِ کلیسا" کے استبداد کو ٹھکرا کر سلطانیٔ جمہور کا جھنڈا نصب کر دینا چاہتا ہے۔ اور قیصریت کے اس طلسم زار میں اپنی پرشوکت آواز بلند کر کے مزدور کو دلاسا دیتا ہے۔ اسے غریبوں کے ساتھ اتنی ہی ہمدردی ہے جتنی کسی بڑے اشتراکی کو ہو سکتی ہے۔ وہ ان کے لہو میں یقین اور اعتماد کا سوز پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنی ہستی کا ادراک کر سکیں اور اپنے آپ کو اونچا ہوتے دیکھیں ؎

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو (بالِ جبریل)

اقبال کی نظم "شعاعِ امید" میں ہمیں ایک بار پھر "ترانۂ ہندی" اور "شوالہ" کے نوجوان کی تصویر نظر آتی ہے جس میں وہ جوش اور گرمی تو نہیں جو اس زمانہ شاعری کے ساتھ مخصوص ہے البتہ پختگی سلاست اور ریاض کا رنگ ٹپکتا ہے جس سے ایک کہنہ مشق شاعر اور محبِ وطن کا نقشہ کھنچ جاتا ہے جس احساس نے اقبال سے "بانگِ درا" کی وہ نظمیں کہلوائی تھیں وہ اب بھی باقی ہے، البتہ ذہنی نشو و نما کے ساتھ ساتھ خیالات میں بھی تدریجی ارتقاء ہوتا گیا پہلے اقبال وطن کے لئے بے تاب تھا اور وطن ہی ہیں اس کے لئے سب کچھ تھا۔ حبِ وطن کا جذبہ اب بھی باقی ہے بلکہ زیادہ پختہ ہو گیا ہے۔ مگر پہلے وطنیت مقصود بالذات تھی۔ اب بین الاقوامیت کعبۂ مقصود ہے جس میں حبِ وطن منطقی طور سے شامل ہے کیونکہ کل میں جزو ہمیشہ شامل ہوتا ہے پہلے وہ وطن کی محبت میں سرشار تھا اور اسے تمام فضا میں یہی سرزمین نظر آتی

تھی۔ اب بھی اس کا دل مسرت سے لبریز ہے۔ اب اس کی نگاہ زیادہ وسیع ہو گئی ہے پہلے اس نے جغرافیائی حدبندیوں میں اسے محصور کر دیا تھا۔ مگر اب اس نے خود یہ خبریں مٹا ڈالی ہیں اور ان کی بنیاد تاریخی واقعات اور طبعی حالات پر رکھی ہے لیکن اس کے بین الاقوامی نغموں پر کسی محدود ذہنیت کا پابند ہونے کا الزام لگانا سراسر ظلم ہے جس کے لئے کوئی جواز نہیں پیش کیا جا سکتا بھارت ماتا کے وسیع میدانوں، لمبے لمبے دریاؤں، زرخیز وادیوں، سورج کی تابناک شعاعوں، اونچے پہاڑوں اور حسین منظروں کو دیکھ کر اس کے دل میں اب بھی کیف و سرور کی موجیں اٹھتی ہیں۔ اس کی تاریخی روایات پر اب بھی فدا ہے اس خاک سے جو سپوت اٹھے ہیں اور جن کے علم و فضل کے کارناموں نے شہرت دوام حاصل کی ہے ان کیلئے اس کے دل میں اوروں سے زیادہ احترام اور عظمت موجود ہے اس کا سینماب بھی اپنے وطن کا نام سن کر پھول جاتا ہے اور وہ اُس کی سربلندی، یکجہتی اور قوت کا دل سے متمنی ہے

اک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور — آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو — جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہانتاب
چھوڑوں گی میں ہند کی تاریک فضا کو — جبتک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی — جن کیلئے ہر بحر پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں — محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اس پُر شوکت نظم کا ہر شعر اقبال کے جذبات کا آئینہ دار ہے جس سے اس کے قلب کی وسعت اور فکر کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نام نہاد قوم پرستوں کی نگاہ میں اقبال کے حجازی نغموں میں ہندی کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور اس کا دل حب وطن کے جذبات سے خالی ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے اور اقبال کے جذبات میں خلوص کی تابندگی کہاں تک نمایاں ہے

اقبال نے اپنے آئیڈیل مسلمان کا جو تصور پیش کیا ہے، اس سے ان کی تعلیمات کا خاکہ ذہن

میں آجاتا ہے وہ عام انسانوں سے بلند ضرور ہے مگر مافوق الفطرت نہیں۔ اس کے کردار میں وہ تمام خوبیاں پائی جائیں گی جو زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ وہ اپنی سرشت میں یگانہ ہوگا اور اس کا کردار تمام انسانوں کے لئے نمونہ کا کام دے گا۔ ایمان، خودی، عمل، محنت کوشی اور عالمگیر اخوت کے اصول پر اس کی تمام زندگی کا دارومدار ہوگا۔ اقبال کا یہ مردِ مومن نطشے کے "فوق البشر" سے مختلف ہوگا۔ نطشے نے اپنے "فوق البشر" کا ان الفاظ میں خاکہ کھینچا ہے:۔

"زمانہ آئندہ کا یہ مرد میدان جو مستقبل بعید میں ظاہر ہوگا اور زندگی کا کامل مظہر ہوگا، ہمیں موجودہ نصب العین اور اس کے نتائج سے آزادی دلائے گا اور اُن قوتوں کو فنا کرنے والا ہوگا جو زندگی کے خلاف مصروفِ عمل ہیں وہ اپنے ساتھ ایک انقلاب عظیم لائے گا جس کی بدولت دنیا میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوں گی جو ہماری قوت ارادی کو آزادی عطا کرے گا اور کائنات کو اس کے صحیح مقام پر قائم کرے گا۔ بنی نوع آدم کے اندر بہترین تمنائیں پیدا کرے گا۔ وہ مسیحیت کا مخالف اور تباہ کرنے والا ہوگا اور کائنات کی حقیقت کو ظاہر کرے گا۔ الغرض یہ فوق البشر جو غیر معمولی قوتوں کا مالک ہوگا۔ ایک دن دنیا میں ظاہر ہو کر رہیگا"

اقبال اور نطشے دونوں کے نزدیک یہ مادی دنیا خودی کی جدوجہد کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ وہ دونوں مسیحی فلسفہ اخلاق کے سخت مخالف ہیں کیونکہ یہ فلسفہ خودی کو کمزور کر دیتا ہے اور رہبانیت کی تعلیم دے کر تمام خداداد صلاحیتوں کو برباد کر دیتا ہے۔ اقبال بھی نطشے کی طرح مظہر قوت کا دلدادہ ہے اس کے نزدیک کمزوروں کو دنیا میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ وہ جب کبھی اور جہاں کہیں قوت دیکھتا ہے اس کا دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ وہ "خواہش اقتدار" کو کائنات کی بنیادی حقیقت سمجھتا ہے۔ اور اسی لئے اس کا پیام زندگی اور قوت کا حامل ہے۔

اقبال کے "مردِ مومن" کے مزاج میں سختی اور نرمی دونوں کا امتزاج موجود ہے۔ اس کے ہاں جلال بھی ہے جمال بھی، توانائی بھی اور حسن بھی۔ لیکن نطشے کا فوق البشر، اگر وہ کبھی پردۂ کائنات پر ظاہر ہو گیا تو یقیناً ظالم اور سنگدل ہوگا اقبال کے "انسان کامل" کے سامنے خدا کی ذات موجود ہے اور چونکہ وہ غیر محدود

ہے۔ اس لئے اس کی ترقی کے امکانات بھی ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں نطشے کا "فوق البشر" اپنی ذات میں محدود ہے۔ اس کے سامنے کوئی مطمع نظر نہیں چونکہ وہ خدا کے وجود کا قائل نہیں، اس لئے اس کی کوششوں کا میدان بہت تنگ ہے۔ اقبال کے مرد مومن کے تصور میں عبدالکریم جیلی کے خیالات کی جھلک نظر آتی ہے "ضرب کلیم" میں انھوں نے مرد مومن کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن	گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و جباری و قدوسی و جبروت	یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی	ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن	قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے	دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم	دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز	آہنگ میں یکتا صفت سورۂ رحمان

"مدنیت اسلام" کے عنوان سے ایک نظم میں اس نقش کو یوں پیش کیا ہے ؎

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے	یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنون
طلوع ہے صفت آفتاب اس کا غروب	یگانہ اور مثال زمانہ گونا گوں
حقائق ابدی پر اساس ہے اس کی	یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں
عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوق جمال	عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

"ضرب کلیم" میں اقبال نے آرٹ کے نظریہ کو بھی پیش کیا ہے وہ آرٹ برائے آرٹ کے نظریہ کو پسند نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ جو ادب محض جمالیاتی ذوق کی تسکین کرے، وہ ہماری زندگی کی قوت محرکہ نہیں بن سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ادب دماغی کیف کے لئے ضروری ہے۔ اور اس میں اس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان موجود ہونا چاہیئے لیکن جو ادب محض رنگ و بو کا مجموعہ ہو اور محض دماغی تعیش کا سامان مہیا کرے وہ ہمیں "ذوق عمل" اور "ذوق تپش" سے محروم کر دیتا ہے جو اصل روح حیات ہیں۔ جن نغموں

میں مستی کے ساتھ چستی نہ ہو وہ ہماری زندگی کو تقویت پہونچانے کی بجائے اسے کمزور کر دیتے ہیں اقبال اسی لئے حافظ کے مخالف ہیں۔ کیونکہ حافظ کی غزلیں پڑھ کر عموماً نوجوان کاہلی عیش اور بے راہ روی کے شکار ہو جاتے ہیں اور حقیقت کی شاہراہ سے ہٹ کر مجاز کی گلی میں ہو لیتے ہیں۔ جس سے ان کی زندگی کے سرچشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر کے زمانہ میں "دیوان حافظ" کے مطالعہ کی ممانعت کر دی گئی تھی اقبال ایسا ادب چاہتے ہیں جو نوجوانوں میں تازگی اور تنومندی پیدا کرے انھیں زندگی اور عمل کے لئے اکسائے اور ان کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لائے ان کے نزدیک آرٹ میں جمال اور جلال دونوں کا امتزاج موجود ہونا چاہئے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کی کمی ہمارے مقصد کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است

انھوں نے ایک جگہ نہایت صاف الفاظ میں اپنے مفہوم کو واضح کیا ہے لکھتے ہیں ۔

"بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر قوت ارادی کو بیدار کر دے۔ تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں۔ جو ہمیں ان حقائق گرد و پیش سے غافل کر دیں جن کے حصول پر زندگی کا انحصار ہے وہ در اصل بربادی اور موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی قوت پھونکے نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکر طاری کر دے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آرٹ کا منتہائے مقصود خود آرٹ ہے وہ نا دانستہ طور پر ہمیں گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ایسے نادان دوستوں سے ہوشیار رہیں۔"

خود فروزی کہ فرنگ داد مارا ہمہ آفتاب لیکن اثر ضیا نہ دارد

اسی خیال کو ایک دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے ۔

مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے یہ ایک نفس یا دو نفس مثل شرر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

"ضرب کلیم"

اقبال آرٹ کے حیاتیاتی پہلو پر زور دیتے ہیں اور "آرٹ برائے زندگی" کے نظریہ کے قائل ہیں مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ خود ان کے آرٹ میں حیاتیاتی اور جمالیاتی دونوں عنصر ایک دوسرے سے زیادہ طاقتور اور موثر ہیں۔

"ارمغان حجاز" اقبال کی آخری تصنیف ہے جس میں شاعر نے دریائے خیال کو بڑے سلیقہ کے ساتھ شعر کی لڑیوں میں پرو دیا ہے مگر یہ ایک چابکدست مصور کی مو قلم کے آخری نقش ہیں جن میں پختگی زیادہ اور تابناکی کم ہے اس مجموعہ میں اقبال کا آرٹ ایک حد تک زوال پذیر ہو گیا ہے اور قلم کی ہر جنبش میں تھکن اور بے کیفی کے آثار نمایاں ہیں۔ ہر شاعر اور ادیب کا اشہب قلم ایک خاص بلندی تک پرواز کرتا ہے جس کے بعد اس میں وہ ندرت اور تازگی نہیں رہتی بالکل اسی طرح اقبال کے ہاں جو تازگی تخیل "جاوید نامہ" اور "بال جبریل" میں ہے وہ "ارمغان حجاز" میں بالکل نہیں ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی یہ تصنیف شعر و سخن اور خیالات کا کوئی کم وقعت مجموعہ ہے بلکہ کہنا صرف اس قدر ہے کہ آرٹ کی وہ بلندی جو "بال جبریل" میں ہے "ارمغان حجاز" میں دب کر رہ گئی ہے۔ جہاں تک زندگی کے حقائق کا تعلق ہے اقبال کا ہر شعر اپنی جگہ مستقل چیز ہے اور اس کی اہمیت لازوال ہے "ارمغان حجاز" میں کم وبیش انھیں مضامین کو دہرایا گیا ہے جو ہمیں "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" کے صفحات میں نظر آتے ہیں، خودی، فقر و عشق، ملائے حرم، تہذیب حاضر، مکتب، زمانہ حاضر کا مسلمان اور اشتراکیت پر بڑے اچھے خیالات ملتے ہیں اور حالات حاضرہ پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ اس زمانہ میں خاص اہمیت رکھتی ہیں جن سے اقبال کی بالغ نظری عمق فکر اور وسعت مشاہدہ کا پتہ چلتا ہے۔

"ارمغان حجاز" میں ہمیں اس بڑے مفکر کے آخری پیغام کے نمونے ملتے ہیں اور اس میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی شخصی اور ملی زندگی کے لئے ایک ایسا نصب العین اور لائحہ عمل موجود ہے جو اُن کی پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے۔ اقبال کا سب سے اہم پیام جسے انھوں نے شروع سے آخر تک مسلمانوں کے سامنے پیش کیا وہ یہی تھا کہ وہ اپنی خودی کو بیدار کریں تاکہ وہ اپنی زندگی میں تبدیلی پیدا کر سکیں اُن کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سبب یہی ہے کہ وہ خود اپنی ہستی سے ناواقف ہیں اور نہیں جانتے کہ ممکنات زندگی کی کس قدر قوتیں ان کے اندر پوشیدہ ہیں۔ انھیں اگر شعور ذات کا احساس ہو جائے تو وہ روحانی اور اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے جد و جہد میں کامیاب ہو سکتے ہیں چنانچہ کتاب کے

شروع میں اقبال نے مسلمان کو مخاطب کرکے کہا ہے ؎

دل تو داغ نہانے نہ دارد　　تب و تاب مسلمانے نہ دارد
خیابان خودی را دادہ آب　　ازاں دریا کہ طوفانے نہ دارد

آگے چل کر مسلمانوں کی حالت زار پر یوں اظہار خیال کیا ہے ؎

آتی ہے دم صبح ہوا عرش بریں سے　　کھو گیا کس طرح تیرا جوہر ادراک؟
کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق　　ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟
تو ظاہر و باطن کی خلافت کا سزاوار　　کیا شعلہ بھی ہوتا ہے غلام خس و خاشاک؟
مہر و مہ و انجم نہیں محکوم ترے کیوں　　کیوں تیری نگاہوں سے لرزتے نہیں افلاک؟
اب تک ہے گرچہ رواں لہو تیری رگوں میں　　نے گرمیِ افکار، نہ اندیشہ بیباک؟
روشن تو وہ ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی　　جس آنکھ کے پردوں میں نہیں ہے نگہ پاک؟
باقی نہ رہی تیری آئینہ ضمیری　　اے کشتہ سلطانی و ملائی و پیری؟

مسلمان کی شان تو یہ تھی ؎

حدیث بندہ مومن دل آویز　　جگر پرخوں نفس روشن، نگہ تیز!
میسر ہو اکسے دیدار اُس کا　　کہ ہے وہ رونق محفل کم آمیز!

مگر ملائے حرم نے اسے موجودہ حالت تک پہونچا دیا۔ اسی ملائے حرم کے متعلق اقبال کا خیال ہے

زمن بر صوفی و ملا سلامے　　کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت　　خدا و جبرئیل و مصطفیٰ را

عقل کی ناتوانی اور عشق کی پختہ کاری کے متعلق ایک رباعی میں کہا ہے ؎

خرد عقل و خرد کی ناتوانی　　نظر دل کی حیات جاودانی
نہیں ہے اس زمانے کی تگ و تاز　　سزاوار حدیث لن ترانی

عصر حاضر کے کمالات ذہنی اور مدارج ترقی کے متعلق بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے ؎

مسلماں فقر و سلطانی بہم کرد　　　ضمیرش باقی و فانی بہم کرد
و لیکن الاماں از عصر حاضر　　　کہ سلطانی با شیطانی بہم کرد

اور مغربی تعلیم اور مکتب کی کور ذوقی تنگ نظری اور محدود مشاہدہ کے متعلق اپنے حکیمانہ انداز بیان میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے ؎

تب و تابے کہ باشد جاودانہ　　　سمند زندگی را تازیانہ
بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب　　　کتاب و مکتب افسون فسانہ!

اشتراکیت اور اسلام کے موضوع پر بھی بڑے دلپذیر خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ اگر اسلامی معیشت کے اصول آشکارا ہو گئے تو پھر اشتراکیت کا چراغ بہت جلد گل ہو جائے گا مگر مسلمان ابھی تک الٰہیات کی گتھیاں سلجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انھوں نے زمانہ کی روش کو ابھی نہیں پہچانا ہے۔ اقبال اسلامی اصول میں موجودہ دنیا کی اقتصادی اور سیاسی پریشانیوں کا علاج دیکھتے ہیں۔

"دختران ملت" کے عنوان سے ایک نظم میں اقبال نے مسلمان لڑکیوں کو جن پر مغربی سحر کا اثر آہستہ آہستہ ہو رہا ہے۔ بڑا روح پرور پیام دیا ہے جس پر عمل کر کے وہ زندگی میں وہ بہت اہم ذمہ داریوں کو پورا کر سکتی ہیں۔ اور ملت اسلامیہ کی واماندہ رگوں میں خون حیات دوڑا سکتی ہیں۔ انھیں مغربی تمدن سے تابانی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلام نے ان کے سامنے ایک مکمل پروگرام پیش کر دیا ہے جو ان کی زندگی کے دھارے کو صحیح راہ پر لگا سکتا ہے۔

ضمیر عصر حاضر بے نقاب است　　　کشادش در نمود رنگ و آب است
جہاں تابی ز نور حق بیاموز　　　کہ او با صد تجلی در حجاب است
ز شام ما بروں آور سحر را　　　بہ قرآں باز خواں اہل نظر را
تو میدانی کہ سوز قرأت تو　　　دگرگوں کرد تقدیر عمر را

اسی میں آئندہ نسلوں کی صحیح تربیت کا طریقہ ہے۔ اسی میں ملت کی سربلندی کا راز مضمر ہے!

اقبال کی تصانیف پر جو اظہار خیال ہم نے صفحات ماقبل میں کیا ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کا تخیل کس طرح مختلف وادیوں میں سے ہوتا ہوا اپنی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا شروع

میں جس انتہا طبیعت کے نقش "بانگ درا" میں نظر آتے ہیں، وہی جلد اُجاگر ہو کر دوسری تصانیف میں زیادہ رعنائی وزیبائی کے ساتھ نمایاں ہو گئے ہیں۔ خیالات کے مختلف دھارے جو شاعر کے ذہنی نشو ونما اور مختلف معاشرتی، سیاسی اور تمدنی تحریکوں سے اثر پذیر ہوئے ہم آہنگی، ہمواری اور تسلسل کے ساتھ بہتے ہوئے نظر آتے ہیں تخیل کی گہرائی اور پختگی اور انداز بیان کی جدت ہر آنے والی تصنیف میں پہلی تصنیف سے زیادہ قوت کے ساتھ نمایاں ہے۔ مگر زبان کا حسن ہر جگہ اپنی جلوہ ریزی کر رہا ہے۔ اقبال کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے فلسفہ اور شعر کو اس طرح سمویا کہ ان کے امتزاج سے ایک ایسی بلند چیز پیدا ہو گئی جو فلسفہ اور شعر دونوں سے فزوں تر ہے خودی۔ فقر اور عمل اقبال کے پیام کا نچوڑ ہے۔ انہی تینوں چیزوں کو انہوں نے رنگارنگ انداز میں پیش کیا ہے جس سے ہر مرتبہ ایک نئی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اقبال نے رومی، نطشے اور برگسان کے خیالات پر اپنے فلسفہ کی بنیادیں اٹھائی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ان تینوں فلسفیوں کے خیالات سے بے انتہا متاثر ہوا ہے۔ مگر اس کے فلسفہ کی حسین وادیاں سرزمین حجاز کے دریاؤں کی آبیاری کی ممنون احسان ہیں اور اس کے کشت زار شاعری کی بہار انہی کے فیض سے وابستہ ہے اس کے مضراب کے تاروں میں سے وہی حجازی نغمے نکل رہے ہیں ساغر عجمی سہی مگر بادۂ کہن وہی ہے جس میں کھجور کا افشردہ ملا ہوا ہے۔

بحیثیت ایک آرٹسٹ کے بھی اقبال کا پایہ بہت بلند ہے۔ آرٹ کے بعض بہترین نمونے "بانگ درا" کی نظموں میں ملتے ہیں۔ "اسرار ورموز" اور "پیام مشرق" اور "بال جبریل" میں وہ اور زیادہ جاذب توجہ ہو گئے ہیں۔ شاعر کی قوت فکریہ اور جوش بیان جو اس کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہیں اشعار میں صاف نظر آتے ہیں۔ کارلائل کے نظریہ کے مطابق اگر یہ کہنا درست ہے۔ کہ "ہر شخص کی تحریر میں اس کی شخصیت کا رنگ جھلکنا چاہئے" تو اقبال اپنی نظموں میں آسانی کے ساتھ دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر انہیں پہچاننے اور سمجھنے کے لئے خیال اور نظر کے درمیان سے تمام رنگین پردوں کو اٹھا دینا ہوگا اور اس کے لئے گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔ ان کے قلم کی ہر جنبش میں لطیف ترنم اور دقیق نکتہ سنجی کے متضاد عناصر کے ساتھ حیات نو کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس میں حرکت اور زندگی ہے تعطل اور سکر نہیں۔ اقبال نے فلسفہ اور شاعری میں خیالات کی جو طرحیں ڈالی ہیں، اور اپنی غیر معمولی فن کارانہ قوت سے کام لیکر جو گلکاریاں کی ہیں انہوں نے شاعر کی شخصیت کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

اسلوب احمد صاحب انصاری متعلم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

اِشتراکیت اور اِشتمالیت

۱۹۱۴ء کے بعد

۱۹۱۴ء کے آخر جولائی اور شروع اگست کے دنوں میں جبکہ یورپ کے سفارت خانوں میں دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ تمام ملکوں کے اشتراکی متحد ہو کر امن و آشتی کا نعرہ لگا رہے تھے لیکن سیاست کا پانسہ کچھ اس طرح سے پھینکا گیا کہ بندھے ہوئے جھنڈے لہرانے لگے۔ جنگی نقار خانوں کی آواز سے فضا گونج اٹھی۔ اس وقت لوگوں کی آنکھیں بند تھیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا کہ مزدوروں کے ان مظاہرات میں کس درجہ انحطاط موجود ہے۔ "اشتراکی وطن خطرہ میں ہے"، کا نعرہ لگاتے ہوئے ایک علم کے نیچے جمع ہو گئے وہ آخر وقت تک اپنی اپنی حکومتوں کی مدد کرتے رہے۔ مگر جب شکست کے امکانات کے ساتھ ساتھ معاشی اور اقتصادی تباہ کاری نے ان کی حالت کو ابتر کر دیا تو وہ ان تمام حکمرانوں کے مخالف بن گئے جنہیں آخری لمحہ تک جنگ جاری رکھنے میں لطف آتا تھا۔

برطانیہ میں آزاد مزدوروں کی جماعت ابتدا ہی سے جنگ کی مخالف تھی۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جنگ سرمایہ دار طاقتوں کی خفیہ سازشوں کا نتیجہ ہے لیکن لیبر پارٹی مسٹر اسکویتھ کی لبرل حکومت کے ہمیشہ حامی رہی اور اس جماعت کے لوگ آنے والی حکومتوں میں عہدۂ وزارت پر مقرر کئے گئے۔ یہی سیاسی چال فرانس اور بلجیم میں بھی چلی گئی۔ جرمنی میں بھی معاشری جمہوریت پسندوں نے اکثریت میں قیصر کا ساتھ دیا اگرچہ کارل لبکنغت نے (جو کہ اکیلا پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور جس نے ۱۹۱۴ء میں جنگی قرض کی مخالفت کی تھی)، مخالفین جنگ کی ایک چھوٹی سی جماعت بنالی تھی۔ اس جماعت کی شدت مخالفت جنگ روز بروز بڑھتی رہی۔

لیکن اٹلی میں ہوا کا رخ بدلا ہوا تھا کیوں کہ وہاں اشتراکی جماعت کی اکثریت جنگ میں شریک ہونے کے خلاف تھی۔ صرف ایک چھوٹی موٹی سی با اقتدار اور باہمت اقلیت بنیٹو مسولینی کی قیادت میں (جو کہ اشتراکیت کے ہرگن اخبار کا سابق ایڈیٹر رہ چکا تھا) اس امر کی متمنی تھی کہ جنگ کے خطرات اور اس کے مفید نتائج میں حصہ لے۔ تین سال گزر گئے مگر اشتراکیت پسندوں نے لڑنے والے ملکوں میں نہ تو قومی حکومت کی پالیسی کو لفظ بلفظ

دہرایا اور نہ اس پر عمل کیا بلکہ خاموشی اختیار کئے رہے لیکن ۱۹۱۷ء کے موسم بہار میں صورت حالات بالکل بدل گئی اس طرح نسل انسانی کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوا جس کی اہمیت کا اندازہ بعد میں ہوا۔ روسی سپاہی شکست سے ہمت ہار کر اور کشت و خون سے بدحواس ہو کر ایک لا علاج پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ اس لئے انہوں نے بکریوں کی طرح مذبح شہنشاہیت پر بے سود ذبح ہو جانا پسند نہ کیا بلکہ جنگ کی صفوں سے علیحدہ ہو گئے ان میں بددلی کی لہر پھیل گئی۔ ملکی حکومت کی دیواریں بیٹھ گئیں اس کی جگہ ایک لبرل سوشلسٹ حکومت برسر اقتدار آ گئی جسکو ہمیں طبقہ خواص کی حکومت کہنا چاہئے اس طرح انقلاب روس کی ابتدا ہوئی۔

عموماً واقعات کے اس رد و بدل نے اشتراکیت کے حامیوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ ہر ایک ملک میں وہ ایک سماجی انقلاب کا خواب دیکھ رہے تھے اس مقصد کے لئے انہوں نے احتجاج بھی کیا اور اکثر مقامات پر انھیں دکھ درد کی تنگ گھاٹیوں سے گزرنا پڑا۔ روس ایسے غیر معروف ملک میں جو سیاسی و صنعتی حیثیت سے دنیا کے تمام ملکوں سے پیچھے بھی تھا ایک ایسے انقلاب کا برپا ہو جانا خود نظریہ اشتراکیت کی صحت کے خلاف ہے لوگوں کا خیال تھا کہ سب سے پہلے یہ آگ جرمنی یا فرانس یا انگلستان میں بھڑکے گی جہاں سرمایہ داری کے زوال کی علامتیں صاف صاف ظاہر ہو رہی تھیں اور جہاں اشتراکی اصول و عقیدے کی انتہائی جوش اور استقلال سے تبلیغ کی جا رہی تھی۔

روس کو مغربی تہذیب میں کوئی درجہ حاصل نہ تھا صنعت و حرفت کی شکل سے ابتدا ہوئی تھی۔ تجارت کی اتحادی مجالس کی تنظیم ممنوع تھی۔ کسان اپنی جہالت اور بے علمی کی وجہ سے اپنے اضلاع کے معاملات میں اس درجہ الجھے ہوئے تھے کہ انھوں نے ملکی فلاح و بہبود کو اپنے ذاتی اغراض پر قربان کر دیا تھا اشتراکی پروپیگنڈا صرف شہر اور قصبوں کے مل مزدوروں تک ہی محدود تھا اور اس کے علاوہ سائبریا بھیجدئے جانے یا اس سے بھی زیادہ برے نتائج بھگتنے کے ڈر سے صرف خفیہ تبلیغ ہو سکتی تھی۔

بہرحال روس سرمایہ داری کے زنجیر کی سب سے کمزور کڑی تھا۔ آئندہ کے واقعات سے واقف ہونے کے بعد زار کے انحطاط اور اس کے نظام حکومت کے تہ و بالا ہونے کی علت تبلائی جا سکتی ہے یہ حکومت طویل عرصہ سے دم توڑ رہی تھی جس کو نحوست و ادبار، زوال و انحطاط نے گھیر لیا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں بھی

ایک چھوٹا سا انقلاب برپا ہوا تھا مگر ناکامیاب رہا لیکن یہ آنے والے ڈرامے کی ایک باقاعدہ مشق تھی۔

لینن نے اپنے غیر ملک سے بھیجے ہوئے خطوط میں جو ۱۹۱۷ء مارچ اور اپریل میں سوئٹزرلینڈ سے لکھے گئے تھے ایک جگہ لکھا ہے" انقلاب نے زمین کو ہموار کر دیا اور صدیوں کی تنگ نظری اور تعصب کو جڑ سے اکھاڑ دیا" اس نے لاکھوں مزدوروں اور کروڑوں کسانوں کے مردہ قالب میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی لینن کو اس انقلاب میں کوئی ایسی چیز نظر آئی جو غیر معمولی اور قابل دید ہو اسی لئے ان لوگوں کو جو اس کی خفیہ انقلابی تحریک سے واقف تھے اور جو اس کی فہم و ذکا کے قائل نہ تھے اس کے بعد اس رویہ پر سخت تعجب ہوا۔ بے انتہا بدنظمی ۱۹۰۵ء کے سخت ضابطے، روس اور روس کے شرکاء جنگ کی مسلسل جنگی ناکامیاں یہ سب مل کر لوگوں کو بدحواس کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ پس روس کے فاقہ زدوں نے متحد ہو کر روٹی امن اور آزادی کا ایک پر جوش مطالبہ کیا۔ یہ ایک خلاف معمول ایک تواریخی قیاس تھا جو اشتراکی روس کے وجود کا باعث ہوا لینن اور اس کے رفقاء کار وہاں کے سیاسی حالات پر پوری طرح حاوی تھے۔ وہ اس موقع کو ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اے ایف کرنزکی کی قیادت میں پہلی انقلابی حکومت روس کی فضا میں بڑی مشکلوں سے صرف چھ مہینے تک سانس لے سکی اس کے بعد حکومت کی باگ بالشویک جماعت کے ہاتھوں میں چلی گئی جو بہت دنوں سے این لینن اور لیون ٹراٹسکی کی رہنمائی میں معاشری جمہوریت پسندوں کے درمیان کام کر رہی تھی۔ مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں میں سوویٹ کی تبلیغ کرنا ان کا لائحہ عمل تھا۔ پس مارکس کے اصولوں پر ایک ایسے ملک میں عمل کیا جانے لگا جو معاشرتی خرابی کے قعر مذلت میں پہونچ گیا تھا۔

۸ نومبر ۱۹۱۷ء کو لینن کا پہلا فرمان صادر ہوا جس کے مطابق تمام اراضی قوم کی ملکیت بنا دی گئی۔ اور کاشت کے لئے کسانوں کو سپرد کر دی گئی۔ اس کے بعد اندرونی تجارت میں ریاست کو پورا پورا دخل حاصل ہو گیا اور ۱۹۱۸ء کی جولائی میں تمام اقتصادی نظام ریاست کے سپرد کر دیا گیا اور اس کی جگہ قومی کاروبار کی بنا ڈالی گئی۔ خرید و فروخت۔ بازار اور مقابلہ سب منسوخ کر دئے گئے۔ اس کی جگہ ایک ایسے نظام مبادلہ نے لی جس کے ماتحت دیہی اور شہری پیدا کرنے والوں کے درمیان افسران حکومت کے ذریعہ اشیاء کا

تبادلہ ہو جایا کرتا تھا۔ یہ جنگی اشتمالیت کا دور کہلاتا ہے جبکہ ٹراٹسکی ایک ہی وقت میں بالشویک سپاہیوں کو سولہ محاذوں پر لڑا رہا تھا۔ اس وقت بے چارے کسانوں کا ایک ایک دانہ غلہ "سرخ پوش سپاہیوں" کے قبضہ میں آ گیا تھا۔

خانہ جنگی فتح و نصرت لئے ہوئے ختم ہوئی لیکن اس فتح کی اہم قیمت کسانوں کی علیحدگی کی شکل میں ادا کرنی پڑی جب سفید پوش سالاران لشکر آخری مرتبہ علیحدہ کر دئے گئے تو لینن نے ایک نئی اقتصادی پالیسی کو جاری کیا۔ جبری غلہ کی فراہمی کا سدباب اور صنعت و حرفت پر حکومت کی جانچ پڑتال اور قبضہ و قدرت میں تخفیف انفرادی مہم اور ذاتی تجارت کی اجازت اس نئی پالیسی کا طغرائے امتیاز تھا۔ اتحاد باہمی کی انجمنوں کو بھی ترقی دی گئی اور یہ کچھ ہی دنوں میں ملکی کاروبار کے ایک بڑے حصہ پر حاوی ہو گئیں۔

اس نشوونما میں بہت سے عناصر ایسے تھے جو اشتراکی ضمیر کے لئے حد سے زیادہ تکلیف دہ تھے مارکسٹ لینن کی بری طرح نکتہ چینی کرنے لگے لیکن وہ حقیقتاً اپنے زمانہ اور اپنی نسل کا بہت بڑا آدمی تھا۔ اس کی چند سالہ حکومت میں روس نے جنگ عظیم اور خانہ جنگی اور قحط کے نقصانات کو پورا کر لیا۔ جنوری ۱۹۲۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔ روس کے لوگ اسے اپنا ہادی اور رہبر تصور کرتے ہیں کیونکہ اسی نے نئے روس کی طرح ڈالی تھی۔ کریملین کی دیوار در کے نیچے اس کی قبر ہے جسے اشتمالی عقیدے کے لوگ اپنا کعبہ خیال کرتے ہیں اصطلاحی رعایت کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے ہم اس وقت کی ریاستی سرمایہ داری کے نظام کو اشتراکیت کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے ہیں۔ جوزف اسٹالن لینن کا جانشین ہوا۔ اس کے برسر اقتدار آنے کے فوراً ہی بعد ایک نمایاں تغیر واقع ہوا نیپمین اور کلاک پر سارا غصہ اتارا گیا۔ ان کو اذیتیں پہونچائی گئیں اور آخر کاران دونوں طبقوں کو ختم کر کے ایک نیا اقتصادی پروگرام بنایا گیا۔ اس کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ تھا کہ ملک خود اپنی کفالت کر سکے اور کسانوں کی ذاتی آراضی اور املاک بھی منسوخ ہو جائیں۔

پانچ سالہ پروگرام ۱۹۲۸ء میں شروع کیا گیا۔ جونہی ۱۹۳۲ء میں پہلی اسکیم کی میعاد ختم ہوئی ایک دوسرے پروگرام کا نفاذ عمل میں آ گیا۔ یہ دونوں پروگرام غیر معمولی طور پر کامیاب ہوئے لیکن وہ باب جس میں کلاک کے مٹائے جانے کے واقعات درج ہیں انسانی قربانی کے صحیفہ میں کم ہولناک نہیں۔

انقلابی شورش کے وقوع پذیر ہونے کے بیس برس بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اشتمالیت نہ سہی اشتمالیت پسند حضرات ۸ کروڑ ڈھائی لاکھ مربع میل کی وسعت میں جس کی آبادی ۱۶ کروڑ نفوس پر مشتمل ہے مکمل طور پر حاوی ہو گئے ہیں۔ روس بھی دوسرے مغربی سرمایہ دار ممالک کی طرح صنعتی دور سے گذر رہا ہے لیکن یہاں باگ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ ایسے مجنونانہ جوش عمل رکھنے والوں کے ہاتھ میں ہے جو ایک نئے مذہب کے پیرو کار ہیں جس کو مسٹر جے۔ ایم کینس نے ۱۹۲۵ء میں لینیت کے مذہب کے نام سے یاد کیا تھا۔ اس نے اپنی کتاب ''روس پر سرسری نظر'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ لینیت بھی دیگر مذاہب کی طرح اپنی طاقت واقتدار کے لئے پرجوش معتقدین کے ایک چھوٹے سے گروہ پر منحصر ہے اس بے رواداری مگر پرجوش جماعت کا ہر فرد سینکڑوں بے پروا اور بے عمل لوگوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اس مذہب کے ماننے والے بھی دوسرے مذاہب کے پیروکار کی طرح اپنے مخالفین کو بلا رحم و انصاف بری طرح اذیت دیتے ہیں۔ اس دین اشتراکیت کی بھی بیدسالہ تاریخ مذہبی مظالم کی سنگین داستانوں سے خالی نہیں ہے۔

مسٹر کینز کو جو کہ برطانوی سرمایہ دار طبقہ کا تبحر ماہر اقتصادیات تھا اس نئے مذہب کی تصوراتی بنیادوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ وہ لکھتا ہے "میں ایک ایسے عقیدے کو کس طرح تسلیم کر سکتا ہوں جس کے ماتحت ایک متروک صحیفہ اقتصادیات کو تقدس اور وقعت میں انجیل کا درجہ دیا گیا ہو اور جس کتاب کو نقد و تبصرے بالاتر بتلایا گیا ہو جو کہ نہ صرف بہت حد تک غلط ہے بلکہ زمانہ حاضر کی دنیا میں غیر مفید اور ناقابل عمل بھی ہے۔ میں ایسے مسلک کو کس طرح اختیار کر سکتا ہوں جو کیچڑ کو مچھلی پر ترجیح دے اور جو جاہل اور غیر مہذب عوام الناس کو متوسط درجہ کے شہریوں اور اہل الرائے پر فوقیت دے۔ اس متوسط طبقہ میں تمام نقائص اور خرابیوں کے باوجود زندگی کی خوبیاں اور انسانی نشوونما کے بیج پائے جاتے ہیں۔ غرضیکہ میرا خیال یہ ہے کہ اگر نئے مذہب کی ضرورت بھی ہو تو ان سرخ پوشوں کے کتب خانوں میں اس کی تلاش بے سود ہے"۔

اشتمالیت اور اشتراکیت میں امتیاز کرنا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ یہاں تک کہ لوگ ابھی تک یہ طے نہ کر سکے کہ روس کا تجربہ اشتمالیت پر مبنی تھا یا اشتراکیت پر۔ جو لوگ تغیر کلی پیدا کرنے میں عملاً مشغول ہیں وہ اس منزل سے

اور آگے نہیں جانا چاہتے جہاں تک کہ وہ اشتمالیت کے راستہ پر عمل کر پہونچ چکے ہیں۔ سرمایہ دار نکتہ چین کیسا پر سخت نکتہ چینی کرتے ہیں کہ انھیں رہائش کے لئے بہتر مکان اور تھیئٹر میں سب سے اچھی جگہ کیوں دی جاتی ہے اور سرمایہ داروں کے طریق کار کے مانند بے چارے مزدوروں کو زیادہ اجرت، انعام واکرام کا دلاسا دلا کر آئے ملوں فیکٹریوں کانوں اور آلات ساز کارخانوں میں ضرورت سے زیادہ چیزیں کیوں بنوائی جاتی ہیں۔ ان اشتمالیوں پر ان اعتراضات کا کوئی اثر نہیں ہے روما ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا تھا اور اس طرح اشتمالی روس کی تعمیر کے لئے دو سے زیادہ پنج سالہ اقتصادی پروگرام کی ضرورت پڑے گی۔

لینن نے ۱۹۱۸ء میں اپنی کتاب "ریاست اور انقلاب" میں لکھا ہے کہ "سرمایہ دارانہ جمہوریت کبھی بھی خاموشی اور پرسکون طریقہ سے ایک بڑی اور صحیح تر جمہوریت کی طرف ترقی نہیں کر سکتی جیسا کہ اعتدال پسند ماہرین سیاست کم ظرف اور حقیر طبقہ متوسط سے تعلق رکھنے والے ابن الوقت کہا کرتے تھے۔ کسی ملک کے اس دور تغیر میں جبکہ اشتمالی نظام سرمایہ داری کی جگہ لے رہا ہے جمہوریت کی اس طور پر اصلاح کرنی چاہئے کہ وہ مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچا سکے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں پھر پرانا دور لوٹ نہ آئے۔ مزدوروں کو ظالموں ناجائز فائدہ اٹھانے والوں اور سرمایہ داروں کے خلاف مسلح رہنا چاہیئے،،

ریاست کا تدریجی انحطاط لینن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "سرمایہ داروں کی مدافعانہ طاقتوں کے یکسر مٹا دینے سماج سے طبقاتی تفریق کو اٹھا دینے غرضکہ سرمایہ داروں کے وجود کو یکسر قلع قمع کر دینے کے بعد ہی حقیقی ریاست کی طرح ڈالی جا سکتی ہے۔ اسی وقت اور صرف اسی وقت آزادی پر گفتگو کرنا بھی کوئی معنی رکھتا ہے، صحیح اور مکمل جمہوری راج بھی صرف اسی وقت قائم ہو سکتا ہے شہنشاہیت خود بخود مٹ جائے گی کیونکہ انسانیت سرمایہ داری کے ناجائز منافعہ کی غلامی، ذہن میں نہ آنے والے انجانے تشددات، بربریت اور حماقتوں سے رہائی حاصل کر کے معاشری زندگی کے ابتدائی اور سادہ اصولوں پر غور کرنے کی عادی ہو جائے گی۔ اس وقت ساری تلاش اور جستجو کسی اوپری دباؤ یا خوف کی وجہ سے نہ ہوگی اور نہ جبر وظلم کا کوئی آلہ ہوگا جس کو ریاست کہہ سکیں۔

اشتراکی سماج میں ــــــــ پرولتاری آمریت جس کی ایک نمونہ تمہید ہے ــــــ نہ طبقاتی تفریق ہوگی اور نہ ذاتی املاک رکھنے کا حق یا ذرائع پیداوار کا ذاتی انتظام۔ نہ نظام مقابلہ اور اقتصادی پیچیدگیاں

ہوں گی اور نہ تباہ کن اور غارت کرنے والی جنگیں۔ چند سر برآوردہ تجار کو مالامال کرنے کے لئے وحشی قبائل سے ناجائز منافع حاصل کرنے کے سارے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ صرف کماتے پیتے لوگ ہی تعلیمی سہولتیں نہ حاصل کر سکیں گے محنت ضرور ہوگی لیکن اس کے ثمرات کی تقسیم ایک خاص اصول کے ماتحت عمل میں آئے گی "ہر ایک سے بقدر استعداد اور ہر ایک کو بقدر ضرورت"

وہ معاشرتی نظام جس کا خاکہ ایک خاص نقطہ نظر کے مطابق ڈالا گیا ہے مروجہ سماج سے بہت مختلف ہے لیکن یہ صرف خیال پرستی ہی نہیں ہے جیسا کہ امرا کا خیال ہے اور جو اشتراکیوں کا محض اس لئے مذاق اڑاتے ہیں کہ وہ فرداً فرداً ہر شہری کو سماج کی طرف سے بغیر کسی ذاتی محنت کا خیال کئے ہوئے پیانو موٹر اور آرائش کا دیگر سامان وغیرہ دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ بیشک اس کی کامیابیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اشتمالیت اپنے اعلیٰ اور بلند ترین منزل کو پہونچ چکی ہے لیکن ہنوز روس کا مسافر منزل کی پہلی سیڑھی پر ہے سچ ہے کہ پیدا کرنے والی قوتیں ابھی اتنی زیادہ منظم اور ترقی یافتہ نہیں ہیں کہ ضرورت اور استعداد کے مذکورہ بالا اصول پر کاربند ہو کر لوگوں کو پورے طور پر ساز و سامان بہم پہونچایا جائے۔ اسی لئے مختلف اور جبری قوانین کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ شہر اور دیہات کے تنازعات ابھی تک حل نہیں ہوئے ہیں اور حقیقی مساوات و اخوت کی منزل ابھی تک گم ہے۔

کیمونسٹ اور انٹرنیشنل کا منشور جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا خود گویا ہے کہ کوئی بھی ایسی سماجی قوت نہیں ہے جو پرانی سماج کی بچی بچائی یادگاروں کی حفاظت کرتی ہو۔ چونکہ وہ پیدا کرنے والی قوتوں کے ایک خاص درجہ ارتقاء کی پیداوار ہے۔ اس لئے وہ اتنی جلد معدوم ہو جائیں گی جتنی جلد انسانیت سرمایہ دارانہ نظام کی زنجیروں سے چھوٹ کر قدرت کی قوتوں پر حادی ہو جائے گی اور جتنی جلد انسانیت اشتراکیت کے راستہ سے گذر کر اشتمالیت کی وادی میں پہونچ جائے گی جس شخص نے ۱۸۴۸ء کے اشتمالی منشور اور کارل مارکس کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے اسے اس میں اور آج کل کے اشتمالی بیانات میں خیالات، جذبات اور زبان کی موزونیت اور یکسانیت ملے گی۔ مسٹر کینز کا خیال ہے ـــــــ "سرمایہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک متروک اقتصادی درسی کتاب ہے مگر اس کا متروک ہونا اس کے مقبولیت کے راستہ میں کسی طور پر حائل نہیں ہو سکتا۔ اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی نئی کتاب نہیں پیش کی جا سکتی جس نے اول الذکر

سے زیادہ اثر کیا یا اثر کرتی ہو۔ اسی لئے لینن، اسٹالن اور اس کے ہم خیال ساتھی مارکسی خیالات کی حرف بہ حرف تقلید پر زور دیتے ہیں۔ گلیڈسٹن نے جو کچھ ۱۸۶۰ء یا ۱۸۸۰ء میں اعلان کیا تھا اس کی اب کوئی وقعت اور اہمیت باقی نہیں ہے لیکن مارکس نے ۱۸۶۷ء میں جو کچھ لکھا تھا وہ اب بھی کروڑوں انسانوں کے لئے بہت اہم ہے۔

بایں ہمہ یہ امر مسلم ہے کہ حالات کے تغیر کے ساتھ ساتھ کسی مصلح کے ارشادات میں اگر ترمیم نہیں تو کم از کم اضافہ کرتے رہنا لازم ہو جاتا ہے لیکن اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے لینن کے نظریہ اشتراکیت کے متعلق چند جملے لکھ دینا غیر موزوں نہ ہوگا۔

شہنشاہیت کے متعلق لینن کے خیالات | مارکس کے انتقال کے وقت مغربی دنیا کی عظیم طاقتیں اپنے سامراجی مقبوضات کو وسیع کرنے کے لئے کمربستہ رہی تھیں بیس ہی برس کے اندر صنعتی سرمایہ داری کے عہد اور مالیاتی سرمایہ داری کے عہد میں آسانی سے تفریق کی جا سکتی ہے۔ مالیاتی سرمایہ داری ایک ایسا نظام ہے جس میں آزاد مقابلہ کا امکان بالکل جاتا رہتا ہے تجارت پر اجارہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں سرمایہ کی برآمد اس پر سود کی مانگ۔ کارگاہوں کی تعداد میں اضافہ اور ان اشیاء کی فروخت کے لئے جن کی اپنے ملک میں کوئی مانگ نہیں تھی، منڈیوں کی ضرورت۔ یہ سب چیزیں باہم مل کر کمزور اور کم ترقی یافتہ ممالک کو سرمایہ دارانہ طاقتوں کا شکار بنا دیتی ہیں۔

۱۹۱۴ء میں اجارہ داری کی یہ صورت اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ لینن نے جنگ عظیم کو سامراجی جنگ قرار دے دیا۔ یہ سوچنا قطعاً غلط ہے کہ اس وقت اگر کوئی مدبر سیاست داں یا ایک بہتر منظم اشتراکی جماعت موجود ہوتی تو یہ جنگ یا تو ملتوی ہو جاتی یا ہمیشہ کے لئے رک جاتی لینن نے اس توہم کو قطعاً باطل خیال کیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ یہ جنگ برسوں کے اقتصادی نظام کے فاسد مادہ کا نتیجہ ہے جو پھوڑا بن کر اس شکل میں ظاہر ہو رہا ہے۔ لینن نے اپنی کتاب "شہنشاہیت، سرمایہ داری کی بلند ترین منزل" میں لکھا ہے کہ "شہنشاہیت سرمایہ داری کی اس منزل کا نام ہے جبکہ تجارت اور کاروبار میں اجارہ داری کو دخل حاصل ہو جاتا ہے، پیداوار اور اشیا کی مجموعی مقدار جو بازار میں موجود ہوتی ہے یہ سب اجارہ داری کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔

اس طرح انسانوں کی اقتصادی نیز سیاسی تقدیر چند ساہوکاروں کے رحم و کرم پر مبنی ہوتی ہے چند سرمایہ دار طاقتیں ساری دنیا کی منڈیوں کو اپنے نفع کے لیے آپس میں تقسیم کر لیتی ہیں۔ مارکس نے بتلایا تھا کہ اس زمانہ کی صنعتی سرمایہ داری کو فنا کرنے کے لئے خود بخود ایک انقلاب برپا ہوگا جو مزدوروں کی آمریت کا دروازہ کھولدے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اشتمالیت ساری دنیا میں پھیل جائے گی۔

ابھی تک تو ہم نے صرف روس میں اشتراکیت کے نظریہ و عمل کے ارتقاء پر بحث کی ہے ۱۹۱۷ء میں یہ ایک عام خیال تھا خصوصاً لینن، ٹراٹسکی اور اس کے معاون سرداروں کا کہ اشتراکیت سرمایہ داری کی دنیا میں نہیں پھیل سکتی۔ وہ کہتے تھے کہ انقلاب اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب عالمگیر ہو۔ لیکن زار کی حکومت کے بیس برس بعد بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اشتراکیت صرف ایک ہی ملک میں پھیل سکی گرچہ وہ خطہ رقبہ آبادی اور ذرائع پیداوار کی دولت کے لحاظ سے عظیم ترین ہے۔ بہت سے دوسرے ملکوں میں بھی شورشیں ہوئی ہیں یا کم سے کم پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہت سے مقامات میں اشتراکی حکومتیں بھی قائم ہوئی ہیں۔ مگر وہاں لوگ آخر وقت تک صلح و آشتی کا دامن پکڑے رہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ سوویٹ کی تقلید اور مارکسٹ کی پرستش کا خیال ابھی تک عالمگیر نہیں ہوا ہے

ایک نیا مدمقابل اس کے برعکس اشتراکیت کے مقابل میں ایک نیا دشمن کھڑا ہو گیا ہے جو واقعی اشتراکیت کی موجودگی کے بغیر وجود میں نہ آتا۔ یہ تحریک اٹلی سے اٹھی اس کی اہمیت اس لئے اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ ایک ایسے دماغ کی پیداوار ہے جو برسوں تک خود اشتراکیت کے بائیں بازو کا پرجوش رکن رہا ہے بینیٹو مسولینی جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں اٹلی کے شریک جنگ ہونے کے مسئلہ پر اطالوی اشتراکی جماعت سے بیزار ہو کر علیحدہ ہو گیا اور صلح کے بعد بھی اختلافات کی خلیج ہموار نہ کیجا سکی گویا اس طرح مارچ ۱۹۱۹ء میں ایک لوہار کے لڑکے نے فاشستی جماعت کی طرح ڈالی جو کہ یقینی ایک ترقی پذیر سیاسی اور معاشری اصلاح کی حامل تھی۔ اس زمانہ میں اشتراکیت کی پرجوش تبلیغ کی جارہی تھی۔ اطالوی بالشویکیوں نے بھی روس کے نقش قدم پر چل کر کسانوں کی بغاوت اور مزدوروں کی ہڑتال کا بڑے پیمانہ پر جتن کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں نے بہت سی ملوں اور فیکٹریوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن وہاں ٹراٹسکی ایسی کوئی شخصیت نہ تھی جو اس تحریک کو چلاتی۔ وہاں صرف مسولینی ہی کی ایک

ممتاز شخصیت تھی لیکن اطالوی اشتراکی اپنے اختلاف کی وجہ سے اسے اپنا لیڈر نہ بنا سکے۔ پس انقلاب کے لئے
ان کی ساری جدوجہد منت کش تعبیر نہ ہوئی بلکہ انھوں نے اپنا وقار بھی کھو دیا۔ طوں سے ان کے اخراج نے سماجی
جمہوریت پسندوں کی کمزوری کو نمایاں کر دیا اور آپس کی خوفناک رقابت میں کامیابی کا سہرا فاشستی جماعت کے
سر رہا۔ پرانے سپاہی اور نیچے درمیانی طبقہ کے لوگ مسولینی کے جھنڈے کے نیچے گروہ در گروہ جمع ہو گئے۔ آخرکار
اشتراکی اور فاشستی طاقتیں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔ خانہ جنگی کی ابتدا ہوئی اور اطالیہ کی سڑکیں اور گلیاں
خون کے چھینٹوں سے لالہ زار ہو گئیں۔

<u>فاشنیت اور اشتمالیت</u> اس دور کش مکش میں فاشیت کے نظریے اور اس کے طریق کار بھی ترقی کرتے رہے
بین الاقوامی اشتراکیت کے عقیدے پھٹے پرانے کپڑوں کی طرح اتار دئے گئے۔ مگر اس کی جگہ مرصع قومیت
اور ایک ایسے ریاست کے تخیل نے لی جو تمام چیزوں پر قادر ہو۔ اور جو ملک کے گوشہ گوشہ میں جاری اور ساری ہو
جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرے فاشیت اور اشتراکیت میں کچھ وجوہ مماثلت بھی پائی جاتی ہیں۔ دونوں
جگہ حکومت کی باگ ایک ہی جماعت کے ہاتھ میں ہے اور صرف ایک ہی آدمی حکومت کرتا ہے۔ چاہے روس
میں وہ اسٹالن ہو یا اٹلی میں وہ مسولینی۔ دونوں جگہ پارلیمنٹی جمہوریت مفقود ہے اور جمہوریت کے پیچھے ریاست
مطلق کا عقیدہ کارفرما ہے

جب ہم مقاصد کو معرض بحث میں لاتے ہیں تب کہیں جا کر پتہ چلتا ہے کہ یہ دونوں نظام قطعاً ایک دوسرے
کے متضاد ہیں۔ ایک اشتراکی اپنے نقطہ نظر کے مطابق غیر طبقاتی سماج کو پسند کرے گا جس میں ریاست کو زیادہ
اہمیت نہیں دی جائے گی۔ ملک کا تخیل اور اس کے تمام لزومات انسانوں کی بین الاقوامی برادری کے عقیدہ
پر قربان کر دئے جائیں گے۔ فاشیت کے حامیوں کا یہ خیال ہے کہ اصلی تہذیب بغیر نظام کے نہیں پیدا
ہو سکتی اور نظام بغیر حکومیت کامل کے بہتر طور پر نہیں چل سکتا۔ وہ ضابطہ اور قواعد کو آزادی۔ وطنیت کو بین الاقوامیت
اور آمریت کو جمہوریت پر ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں تحریکیں ایک قلیل مدت میں بہت زیادہ ترقی کر گئی ہیں ——
—— ایسی دو تحریکیں جو ابتدا میں ایک ہی تھیں۔ دونوں شخصیتیں برٹش میوزیم کے دار المطالعہ کے
گوشوں میں بیٹھ کر مارکس کی تصنیفات سے خوشہ چینی کرتی رہی ہیں۔ ایک جیش کا فاتح ہوا اور دوسرے نے

روس کو از سر نو تعمیر کیا۔

اگر اشتراکیت پسند حضرات کی نالائقی ایک طرف فاشیت کی افزائش کا سبب ہوئی تو دوسری طرف نازیت کو اپنے مد مقابل کھڑا کر لینے کی کچھ کم ذمہ دار نہیں ہے۔ قیصر کی فراری کے بعد ایبرٹ (جو در اصل ایک زین ساز تھا) نے اعضاء حکومت اپنے ہاتھ میں لئے۔ یہ سوشلسٹ بھی تھا۔ چنانچہ اشتراکی جمہوریت کے علمبردار ریخ پر مکمل طور پر حادی ہو گئے۔ کارل لیکنکٹ اور روزلگزمبرگ نے بغاوتیں کیں مگر ان کو بری طرح پسپا کر دیا گیا اور آخر میں پولیس نے انہیں گولیوں سے ختم کر دیا۔ ویریا کی ایک اشتراکی جمہوریت بھی اسی بے رحمی کے ساتھ ختم کر دی گئی۔

یہ جماعت ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اکثریت میں رہی اور کئی دفعہ برسر اقتدار ہوئی۔ اور اس کا اثر اس وقت زائل ہوا جب ۱۹۳۳ء میں ہٹلر نے طاقت حاصل کرتے ہی پارلیمنٹری طرز حکومت اور ویمر کے دستور اساسی کو پاش پاش کر دیا۔ اُن کی اعتدال پسندی ہی اُن کے زوال کا باعث ہوئی لیکن ان کے خلاف ابتدا ہی سے کچھ جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک اشتمالی جماعت روس کی رہنمائی میں ان کے خلاف کام کر رہی تھی۔ لوگ صلحنامہ ورسائی کی ساری ہتک اور بے عزتی انہیں کے سر تھوپ رہے تھے۔ گرچہ حقیقتاً وہ لوگ اس صلحنامہ کی ندامتوں کے کسی طور پر ذمہ دار نہیں تھے۔ اشتمالی کش مکش اور اعتدال پسندوں کی دشمنی اور مرکز کی مخالفت میں جب قومی اشتراکیوں (جو کہ وطن پرست سچ مچ تھے اور اشتراکی محض نام کے) کا اضافہ ہو گیا تو اول الذکر جماعت کا زوال بھی لازم ہو گیا اگرچہ یہ تدریجی طور پر ہوا۔

آج فاشیت اور اشتراکیت یورپ کی سرزمین میں نظر آ رہے ہیں۔ اب سماجی و اقتصادی و سیاسی تبدیلی چاہنے والے رسماً اشتراکی جماعت میں داخل نہیں ہوتے۔ فاشتی حضرات بھی لوگوں کو تبدیلیوں کا سبز باغ دکھاتے ہیں لیکن صرف وہ تبدیلیاں جن میں وطنیت کا عنصر شامل ہو۔ ابھی بیس برس پہلے نوجوانوں میں سرخ رنگ بہت مرغوب تھا مگر اب وہ بادامی یا سیاہ رنگ کی قمیص کو (جو فاشتی اور نازی جماعت کا نشان امتیاز ہے) بہت پسند کر رہے ہیں۔ سڈنی ویب جو کہ برطانوی اشتراکیت کا قابل ترین مفسر ہے لکھتا ہے کہ صرف فیبین اشتراکیت (جس کا وہ مخصوص طور پر علمبردار ہے) ہی کامیاب ہو سکتی ہے فیبین اشتراکیت بالفاظ دیگر اُس عقیدہ کا نام ہے کہ ذرائع پیداوار کا ہر شعبہ تدریجی طور پر حکومت کے زیر اقتدار ضرور بالضرور آ جائے گا۔

سوشلسٹ اور کمیونسٹ حکومت کی تدریجی اقتدار پر یقین رکھتے ہیں مگر لفظ ضرور یا بالضرور کی مخالفت کرتے ہیں۔ اکثریت اشتراکی نتیج جمہوری ملکوں میں اتنی ہی دور ہے جتنا کہ وہ ایام جبکہ قومیت پر بحث ہوتی تھی۔ جبکہ اسے پبلک بورڈ انجمن امداد باہمی، اور اسی قسم کی انجمنوں کے ذریعہ ذاتی ملکیت اور دولت کی فراہمی کا پُرامن آلہ سمجھا جاتا تھا۔

دو انٹرنیشنل میں رقابت فاشیت اشتراکیت کے مستقبل کی ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ خوف کے مارے ہر اشتراکی خواہ وہ کسی بازو یا طبقہ سے تعلق رکھتا ہو متحد ہو کر اس مشترک دشمن کے خلاف محاذ قائم کرنا چاہتا ہے۔ بالشویک حضرات کا خیال تھا کہ ۱۹۱۷ء میں جو شورش برپا ہوئی تھی وہ ایک عالمگیر انقلاب کی نقیب ہوگی اسی لئے ۱۹۱۹ء میں ایک نئے انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی گئی جس کا مرکز ماسکو تھا۔ جس کو تیسرے یا اشتمالی انٹرنیشنل کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ انقلابی تحریکات کی ہر ملک میں تبلیغ کی جائے۔ یہاں تک کہ ان ممالک کو بھی اس کے دائرہ عمل میں داخل کر لیا جائے جہاں پہلے سے اشتراکیت کی تحریکات مزدوروں میں چل رہی تھیں اور جو دوسرے انٹرنیشنل سے ملحق بھی تھے۔ یہ دونوں انٹرنیشنل مدتوں تک قائم رہے اور ان میں سے ہر ایک اشتراکیوں کی مدد کا متلاشی تھا اس طرح وہ اپنی بہت زیادہ طاقت بجائے قومی تحریکات کے چلانے میں صرف کرنے کے آپس کی سازشوں اور فضول بکواس میں خرچ کرتے رہے۔ یہ دونوں ہنوز علیحدہ علیحدہ وجود رکھتے ہیں لیکن ہٹلر کے میدان میں کود پڑنے کے بعد سے آپس کی دشمنی مدہم ہونے کے ساتھ ساتھ محو ہوتی جا رہی ہے۔ اب ماسکو سے جمہوری ملکوں کے اشتراکیوں اور سرمایہ داروں کے خلاف بدعتی ہونے کا فتویٰ نہیں صادر ہوتا اس کے برعکس اسٹالن کی طرف سے ہدایتیں شائع ہوتی ہیں کہ اشتمالی پروپگنڈے میں نرم بیانی سے کام لیا جائے۔

۱۹۳۶ء کے فرانس میں اشتمالی و اشتراکی و نیز ریڈیکل جماعتیں متحد ہو کر برسر اقتدار آگئیں تھیں اس وقت موسیو بلوم کی زیر قیادت یہ جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ اسپین میں بھی اشتراکی جماعتیں ۱۹۳۶ء میں فاشتی اتحادیوں سے عرصہ تک مصروف پیکار رہیں۔ مگر آخر میں اس کی محکوم ہو گئیں۔ جرمنی۔ آسٹریا۔ اٹلی میں یہ تحریک جبراً دبا دی گئی۔ اس کے قائدین یا تو جلاوطن کر دئے گئے یا جیل خانوں میں ٹھونس دئے

گئے۔ اور اشاعت بھی سختی سے ممنوع قرار دے دی گئی۔ گرچہ فرانس میں اشتراکی جماعت بہت زیادہ طاقتور تھی۔ مگر پھر بھی اسے اپنے مخالفین کے مقابلے میں اکثریت حاصل نہ ہوئی۔ یہی جملہ انگلستان کے لئے بھی موزوں تھا۔ سنہ ۱۹۲۴ء و سنہ ۱۹۲۹ء میں مزدوروں کی جماعت کو دو مرتبہ وزارت سپرد کی گئی مگر دونوں وزارتوں کا دور ملاکر تین سال سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس عہد میں وہاں کے قانون سازی کے نتائج بھی بہت افسوسناک رہے ہیں۔ دوسرے جمہوری ممالک مثلاً بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، سوئیڈن، ناروے آسٹریا میں بھی اشتراکی جماعتوں کو اکثر و بیشتر انتخاب میں فتح ہوئی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی اس جماعت نے بہت آگے تک قدم جمالیا ہے اور جنوبی امریکہ میں اس کی مختلف پارٹیاں موجود ہیں۔

ابھی تک اشتراکیت کی کہیں فتح ہوئی ہے تو کہیں شکست۔ کہیں اشتراکی قوانین نافذ کئے گئے ہیں اور کہیں ان کی ساری محنت جھگڑا فساد اور معمولی معمولی باتوں میں صرف ہوتی رہی ہے۔ ان ناموافق عناصر کو پیش نظر رکھ کر اشتراکیت کے مستقبل پر صحیح خیال آرائی کرنے کے لئے دقیق النظری اور دوربینی کی سخت ضرورت ہے جن کے لئے دھن اور دولت ایک خوش آئند خواب ہے اور جو رزق کی کش مکش میں بری طرح پسپا کر دئے گئے ہیں ان کے لئے اشتراکی جد و جہد بہت ہی حسین اور خوشنما ہے لیکن جو دولتمند ہیں انھیں اس کش مکش میں کوئی دلچسپی نہیں۔ لوگ محسوس بھی کرتے ہوں گے کہ فاشیت کے وجود میں آجانے کی وجہ سے اشتراکیت کا مستقبل اس قدر پیچیدہ اور مبہم ہو گیا ہے کہ اس کے متعلق کوئی پیشین گوئی بھی نہیں کی جاسکتی۔

مترجمہ ملک حامد حسین صاحب
متعلم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

نئی تعلیم کا نفسیاتی اثر

جن مدرسوں میں حرفوں کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے۔ وہاں کے بچوں میں خاص زندگی اور جان نظر آتی ہے۔ بچے تعلیم میں خوشی اور شوق سے حصہ لیتے ہیں۔ بچوں کو ایک ڈھرے پر کام کرنے کے بجائے نئے نئے طریقوں اور منصوبوں کے ذریعہ کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ اپنے استادوں سے بہت زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں اور ان کو اپنا ہمدرد اور مربی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے زیادہ سے زیادہ سیکھتے ہیں۔ بچوں کے شوق اور دلچسپی کی وجہ سے استاد بھی بچوں کو بڑی شفقت اور مہربانی سے کام کرانے لگتا ہے وہ مدرسہ کے بعد بھی اپنی مرضی سے اپنا بیش قیمت وقت ان کی تعلیم و تربیت پر صرف کرتا ہے حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے میں دونوں کا شوق اور دلچسپی برابر بڑھتی جاتی ہے۔ دونوں چھان بین میں مصروف رہتے ہیں۔ اور نئی نئی باتیں اس طرح معلوم کرتے رہتے ہیں۔ کتابی تعلیم کے برخلاف جہاں صرف دوسروں کا تجربہ بار بار پڑھتے پڑھتے استاد اور شاگرد دونوں کو کوئی لطف نہیں آتا وہاں حرفہ کی تعلیم میں نت نئی باتیں معلوم ہونے سے دونوں توجہ اور انہماک سے کام کرتے ہیں یہاں تک تعلیم بامقصد ہو جاتی ہے۔

حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے میں نہ صرف حصول علم کا شوق بڑھ جاتا ہے بلکہ بچوں کے اخلاق و عادات کی تربیت بھی بہتر طریقہ پر ہونے لگتی ہے۔ بچے مل کر کام کرنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں بغیر اس طریقہ کے یہ اندازہ کرنا ہی مشکل ہے کہ بچے آپس میں مل کر کام کرتے ہیں یا نہیں۔ جب کام تقسیم ہوتا ہے تو دو ایک بچے ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ ممکن ہے یہ صورت اسی وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ دوسرا ساتھی اس کام میں نکما ہو لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں میں کسی بات پر ان بن ہو گئی ہو۔ عموماً دو بہترین کام کرنے والوں میں یہ کشمکش پیدا ہو جاتی ہے لہذا استاد اس بات کا علم ہوتے ہی مل کر کام کرنے کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ یہ بہت معمولی بات ہے لیکن یہ بات آگے چل کر بہت بڑی خوبی بن سکتی ہے۔ ملک کے دو بہترین دماغ رکھنے والے اور بہترین کام کرنے والے جب مل کر کام کرتے ہیں تو کام میں بہت ترقی نظر آتی ہے۔ ہمارے مدرسہ میں

بچے اس بات کو اچھی طرح سمجھتے اور برتتے ہیں چنانچہ ایک لڑکا لکھتا ہے۔

"حرفہ کے کام میں میل جول اور بھائی چارہ پیدا ہوتا ہے یعنی جب ایک جگہ بیٹھ کر کام کرتے ہیں تو ذرا قینچی دینا یہ گتا کاٹنا ہے تمہارا چاقو لے رہا ہوں، اپنی پیالی میں سے ذرا سی لئی ہمیں بھی دینا بھئی تمہیں ریگمال تو نہیں چاہئے ؟ تمہارے بورڈ پر ہم بھی کام کئے لیتے ہیں، آپس کے اس لین دین، گفتگو اور پاس بیٹھنے سے میل جول پیدا ہوتا ہے امیر، غریب، چھوٹے بڑے سب کا فرق مٹ جاتا ہے۔" (سلطان احمد ابتدائی پنجم عمر ۱۳ سال)

ایسے مدرسوں میں جہاں تمام بچے شہر سے آتے ہوں مدرسہ اور بچے کا لگاؤ بہت تھوڑے عرصہ کے لئے ہوتا ہے۔ ان کا زیادہ وقت مدرسہ سے باہر اپنے گھر پر گذرتا ہے۔ وہاں ان کے لئے اگر کچھ کام نہ ہو تو اُن میں کئی قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً وہ بیکار وقت ضائع کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ گھر میں اپنے سے چھوٹے بھائی بہن کو پریشان کرنے لگتے ہیں، محلے کے لڑکوں کے ساتھ وہ نامناسب کھیل کھیلنے لگتے ہیں یعنی ان کی زندگی بے نظام ہو جاتی ہے حرفوں کے ذریعہ تعلیم کا انتظام کرنے سے بچے نہ صرف مدرسہ کے بعد چھٹیوں میں بھی مدرسہ میں کام کرنے آتے ہیں بلکہ وہ اپنے گھروں میں بھی حرفہ کا کام کیا کرتے ہیں اور تھوڑا سامان جمع کر کے اس میں اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک لڑکا لکھتا ہے

"جب ہم اس کام کے کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ بس اسے ہی کرتے رہیں جب کوئی چیز بنا لیتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں اور اگر کوئی تعریف کر دے تو اتنے خوش ہوتے ہیں جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا ہو ہم نے گھر پر بھی بہت سی چیزیں بنائی ہیں انشاءاللہ اور بہت سی بنائیں گے۔" (عبدالحامد ابتدائی چہارم عمر ۱۲ سال)

ایک دوسرا طالب علم لکھتا ہے

"مجھے حرفہ تمام کاموں سے اچھا لگتا ہے اور خالی وقت میں میرا جی چاہتا ہے کہ میں حرفہ کا کام کروں۔ خالی وقت میں جب میں کوئی فضول کام کرتا ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس وقت یہ کام کرنے کی بجائے حرفہ کا کام کر رہا ہوتا تو کیا اچھا ہوتا۔" (ماجد علی ابتدائی پنجم عمر دس سال)

اس طرح کام کرانے کے دوران میں ایک اور تجربہ ہو رہا ہے یعنی بچے بہت دیر تک کام کرنے کے عادی ہوتے جا رہے۔ اکثر بچے بڑی مستقل مزاجی سے کام کرتے رہتے ہیں اور جب تک کام ختم نہیں ہو جاتا اس میں لگے رہتے ہیں۔ نئی تعلیم کی یہ خوبی بھی بہت اہم ہے۔ ہمارے ہونہار بچوں میں اگر مستقل مزاجی اور جم کر کام کرنے کی عادت پیدا ہو جائے۔ تو بہت بڑی بات ہے۔ اس لئے کہ کام کا شروع کر دینا بہت آسان ہے لیکن اس کو تکمیل تک پہونچانا بہت مشکل۔ حرفہ کے ذریعہ اس خوبی کے پیدا ہونے کا امکان خود بخود ہوتا جا رہا ہے۔ بچے کام کو پورا کئے بغیر اٹھنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ چنانچہ ایک طالب علم یہ لکھتا ہے:۔

"لکھتے لکھتے پڑھتے پڑھتے جی اُکتا جاتا ہے لیکن کارڈ بورڈ کا کام ایسا نہیں ہے۔ اسے صبح سے لے کر شام تک کئے جاؤ لیکن کچھ نہیں۔ جی گھبراتا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کام سے ہمارے ہاتھوں میں صفائی بھی آتی ہے (محمد سلطان ابتدائی چہارم عمر ۹ سال)

بچوں میں سوچنے اور غور کرنے کی عادت بھی پیدا ہو رہی ہے۔ وہ مختلف کاموں کے متعلق اپنی تجویزیں پیش کرتے ہیں۔ اور ان تجویزوں کے متعلق دلیلیں بھی دیتے ہیں۔ وہ اپنی بات کو اس قدر وزنی خیال کرتے ہیں کہ بغیر کافی وجہ کے اس سے ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ اپنی تجویزوں کے لئے دوسروں کو ہم خیال بھی بنا لیتے ہیں۔

حرفہ کراتے وقت بچوں میں بڑی آمادگی نظر آتی ہے۔ اچھا استاد اس آمادگی اور تیاری سے بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ ایسے موقع پر بچے حرفہ کے کام کے متعلق ہر ہدایت سننے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ ڈرائنگ بنانے، اس کے متعلق کسی کتاب پڑھنے اور مضمون لکھنے کیلئے سو فی صدی تیار نظر آتے ہیں اچھے استاد کی رہنمائی میں بچے تعلیم میں خاطر خواہ آگے بڑھتے ہیں کسی بات کا مطالعہ ان کے لئے بار نہیں ہوتا اگر کسی رسالہ یا کتاب میں ان کو کوئی بات مل جاتی ہے تو خود بخود بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ اور استاد کو بھی بتاتے ہیں۔ ان میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔

بچوں میں صفائی اور چیزوں کو قرینے سے رکھنے کا خیال پیدا ہو جاتا ہے ہر طالب علم رومال رکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور کام کرنے کے بعد ہاتھ منہ دھو کر رومال سے صاف کرتا ہے۔ چیزوں کو ان کی مقررہ جگہ پر

رکھنے کا سلیقہ ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور گھر جا کر بچے اپنی چیزوں کو اِدھر اُدھر نہیں ڈالتے بلکہ قرینے سے رکھتے ہیں۔ بچے خود اپنے ہاتھوں سے کمروں میں جھاڑو دیتے ہیں۔ باغیچہ سے کنکر پتھر اور پتے وغیرہ اٹھا کر خود ہی باہر پھینکتے ہیں۔ باغیچہ کے صاف ستھرا رکھنے کی ذمہ داری انہیں پر ہوتی ہے۔ عجب تربیت ہے کہ جو بچے اپنے مکان پر تمام کام اپنے ملازم سے لیتے ہیں مدرسہ میں ان تمام کاموں کو خود کرنے میں ذرا پس و پیش نہیں کرتے۔

حرفوں کے ذریعہ تعلیم میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں لیکن یہ سب کچھ اچھے استاد پر منحصر ہے، نہ صرف اچھے استاد پر بلکہ اچھے استاد کی لگاتار محنت اور کوشش پر۔ ہو سکتا ہے کہ استاد بہت اچھا ہو لیکن محنت اور دل لگا کر کام نہ کرتا ہو۔ ایسے استاد کے کام کا نتیجہ یقیناً ان خوبیوں پر مشتمل نہ ہوگا جو حرفوں کے ذریعہ تعلیم میں پائی جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں خوبیوں کی جگہ خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں اور ایسے برے نتائج ظہور میں آسکتے ہیں۔ جو اس تعلیم کی خوبیوں کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔

عملی کام میں خواہ بچوں کو تکلی سکھائی جا رہی ہو، خواہ باغبانی کرا رہے ہوں، خواہ کارڈ بورڈ سے چیزیں بنوا رہے ہوں، ہر بچہ کے لئے کام کا مہیا ہونا نہایت ضروری ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہر بچہ کے لئے کام کا مہیا ہونا ضروری ہے بلکہ ہر بچہ کی حسب ضرورت اس کے کام میں مدد بھی کی جا رہی ہو۔ اگر استاد ایک دو طالب علموں پر توجہ دیگا تو دوسرے طلبا اپنے کام سے بددل ہو جائینگے اور کام کو بہت خراب طریقہ پر کرینگے اور مجوزہ خوبیاں حاصل نہ ہو سکیں گی۔

ابتدائی جماعتوں میں اس صورت حال پر قابو پانا بہت مشکل ہوتا ہے اور بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے کہ ہر بچہ کام سے ناواقف ہوتا ہے اور جب استاد مجوزہ حرفہ سکھانا چاہتا ہے تو ہر بچہ سیکھنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ اب اگر اس وقت ایسی صورت اختیار نہ کی جائے جس سے تمام بچوں کی تشفی ہو سکے تو جماعت میں بڑی گڑبڑی پیدا ہو جاتی ہے اور استاد کہہ اٹھتا ہے کہ حرفہ کے ذریعہ تعلیم کا ہونا بالکل ناممکن ہے لیکن آپ دو باتوں پر غور فرمائیں: بچوں کو حرفہ کس طرح سکھایا جائے؟ حرفہ کے کام میں بچوں کی کس حد تک نگرانی کی جائے؛ ان دو باتوں پر غور کرنے سے آپ سہولت سے تمام دشواریوں کا حل معلوم کر سکیں گے۔

سید احمد علی صاحب

مسئلہ تعلیم اور والدین

میرا خیال ہے کہ بچوں کی تعلیم کا فرض صرف اور صرف درسگاہوں ہی پر عائد نہیں ہوتا بلکہ اس اہم فرض کا وافر حصہ والدین سے بھی وابستہ ہے۔ یوں سمجھئے کہ درسگاہ کے معلم اور طلبا کے والدین جب تک دوش بدوش کام کرنے کے لئے اپنے اپنے فرائض کی اہمیت کا احساس نہ کریں گے اس وقت تک بچوں کی صحیح معنوں میں تعلیم کا مقصد عملی جامہ نہیں پہن سکتا مجھے معلوم ہے کہ والدین درسگاہوں کے نظم ونسق میں زیادہ سے زیادہ دخل کی اہلیت ولیاقت رکھتے ہیں لیکن بات ذرا غور طلب ہے کہ باوجود اس اہلیت اور لیاقت کے وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں کہاں تک دلچسپی لیتے ہیں اور یہ چراغ تلے اندھیرا، کی مثل کا ان پر کہاں تک صحیح اطلاق ہوتا ہے۔ شاید میرا اندازہ مبالغہ پر مبنی نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ ۹۹ فی صدی والدین اپنے بچوں کی تعلیم میں کما حقہٗ دلچسپی نہیں لیتے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے مشکل ترین فرض کی تکمیل کی صرف اور صرف درسگاہوں سے ہی توقع رکھتے ہیں۔ بہت کم والدین ایسے ملیں گے جو اس بات کو محسوس کرتے ہوں گے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کے باب میں ہماری دلچسپی بھی کتنی اہم اور لازمی ہے۔ اور ہماری توجہ کسی درسگاہ کے فرائض کو بہ حسن وخوبی انجام دینے میں کتنی اہمیت رکھتی ہے

والدین چاہے وہ جاہل ہوں یا تعلیم یافتہ، وہ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز ہوں یا کاروبار سے وابستہ اگر ان میں اس بات کا احساس نہیں ہے کہ وہ بھی اپنے بچوں کی تعلیم میں اسی توجہ اور دلچسپی کے ذمہ دار ہیں جتنا کہ کسی درسگاہ کے معلم، تو پھر مجھے کہنے دیجئے کہ ان حضرات سے زیادہ بد احساس اور نا فرض شناس اور کوئی نہ ہوگا۔ بچہ کی پیدائش کے بعد سے والدین عجیب وغریب اور ایک نئی فکر کو جس طور سے محسوس کرنے لگتے ہیں اُسے آپ ان کی زندگی کا سب سے پہلا تجربہ کہئے تو بے جا نہ ہوگا۔ پھر اس بچہ کی پرورش اور کچھ عرصہ کے بعد اس کو کسی کام یا کسی درسگاہ کی جانب رجوع کرنے کی فکر، ان احساسات سے بھی والدین کو فطری لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ صورت حالات میں اختلاف کی بنا پر والدین کی فکریں بھی

مختلف ہوں ظاہر ہے کہ مزدور اور جاہل والدین اپنے بچوں کی پرورش اور ان کے مستقبل سے متعلق اس طرح نہیں سوچ سکتے جس طرح کہ تعلیم یافتہ اور اعلیٰ عہدوں پر ممتاز والدین لیکن جہاں تک والدین کی فکر کا تعلق ہے اس احساس سے ہر فرد بشر کا دوچار ہونا فطری ہے۔ دراصل بچوں کی زندگی کا یہی ابتدائی دوران کی زندگی کا اہم ترین دور ہوتا ہے اور اس کا تمام تر تعلق والدین کی انفرادی اہلیت و لیاقت سے ہوتا ہے۔ فی زمانہ عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ والدین اپنے بچوں کو آنکھیں بند کر کے محض رسم کے طور پر کسی درسگاہ میں داخل کرا دیتے ہیں اور خود معاش اور کاروبار کی الجھنوں میں اپنے آپ کو اس طرح اور اس قدر گھرا رکھتے ہیں کہ جیسے درسگاہ میں ان کے بچہ کا وجود ہی نہیں ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی ہے جو خود کو بھی بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے درسگاہ کے معلمین کی طرح ہی ذمہ دار سمجھتے ہیں۔

والدین اور درسگاہ کا اشتراک اصل میں یہی وہ موزوں ترین وقت ہوتا ہے کہ جب بچوں کے والدین کو بھی اپنے اہم فرض کا بدرجہ اتم احساس کرنا چاہئے۔ بڑی ضرورت ہے کہ والدین اس درسگاہ سے جس میں ان کا بچہ تعلیم پا رہا ہے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ متعلق رکھیں۔ اس موقع پر میں ایک بات کو اور صاف کر دوں کہ والدین کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی ہوں۔ بلکہ علم سے بے بہرہ اور کم تعلیم یافتہ حضرات بھی درسگاہ سے اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ وابستہ رکھ سکتے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہم فرض جس طور سے درسگاہ کے معلمین پر عائد ہوتا ہے بالکل اسی طرح والدین پر بھی عائد ہوتا ہے۔ بچوں کی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کے لئے والدین کا معلمین کے ساتھ اشتراک عمل بے حد ضروری چیز ہے۔ یہ اشتراک والدین کو درسگاہ کے مقاصد اور اپنے بچوں کی ذہنی حالت سے جہاں ان کو آگاہ کر سکتا ہے وہاں ان کے قلوب میں درسگاہ سے ہمدردی اور تعلیم سے محبت اور دلچسپی کے جذبات بھی پیدا کر سکتا ہے معلمین کے ساتھ اشتراک عمل میں سو فیصدی والدین کا ہی فائدہ ہے۔ بچہ کو درسگاہ میں داخل کرا دینے کے بعد بے توجہی اور بے نیازی اختیار کر لینا اصل میں بنیادی غلطی ہے جو بچوں کے لئے زہر قاتل ثابت ہوتی ہے۔ بچہ سے باز پرس نہ کرنا اور معلمین سے بے تعلق رہنا یہی باتیں بچوں کی زندگی کو تباہ کرنے کا باعث بنجاتی ہیں

گھر اور درسگاہ کا اشتراک | ہندوستان میں گھر اور درسگاہ کے درمیان جو خلیج حائل ہے وہ بھی معلمین اور والدین کی بے تعلقی ہے اور جب تک اس خلا کو گھر اور درسگاہ کے درمیان گہرا ربط پیدا کر کے پُر نہیں کیا جائے گا۔ اس وقت تک اچھی سے اچھی درسگاہ بھی تعلیم کے صحیح مقصد کو پورا کرنے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کے اچھے اسکولوں تک کے بہت سے طلبا کیرکٹر کے اعتبار سے بہت گرے ہوئے ملیں گے حالانکہ ان اسکولوں میں معیاری اور عمدہ طریقہ تعلیم اخلاقی ہدایات اور کھیل وغیرہ کی کمی نہیں ہوتی۔ اس خامی اور اہم نقص کا دارومدار سراسر والدین اور معلمین کے درمیان بے ربطی اور بے تعلقی پر ہے۔ طلبا کے کیرکٹر میں اگر سفاہت پائی جاتی ہے تو اس کی ذمہ داری والدین اور معلمین دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر آپ تعلیم کے خوشگوار اور مفید نتائج دیکھنے کے آرزومند ہیں تو کوشش کیجئے کہ گھر اور درسگاہ میں زیادہ سے زیادہ ربط پیدا ہو سکے اور والدین اور معلمین ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں۔

والدین کو یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے دراصل حقیقی ذمہ دار وہی ہیں۔ درسگاہ تو محض ان کے بار کی سبکدوشی میں بطور مدد کے کام آ سکتی ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ درسگاہوں کے معلمین آزاد ہیں اور ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ ان کے فرائض بھی بہت اہم ہیں۔ انھیں اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ بچوں کے والدین سے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے میں صرف کرنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض درسگاہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے اور جہاں بھی والدین اور معلمین کا اشتراک عمل ہو سکا ہے وہاں نہایت ہی خوشگوار نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کی بدنصیبی ہے کہ والدین اور معلمین کا اشتراک عمل ابھی عام نہیں ہوا ہے اور یہ اہم ترین چیز ابھی بہت ہی تنگ دائرہ میں محدود ہے۔ بڑی ضرورت ہے کہ اس دائرہ کو زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جائے۔ معلمین کے فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی ہونا چاہئے کہ وہ عام والدین کو یہ سمجھائیں کہ ان کے بچے درسگاہ کی چہار دیواری سے باہر رہ کر کوئی ترقی نہیں کر سکتے درسگاہ ہی ان کے بچوں کو ملک و قوم کا مایہ ناز فرزند بنائے گی۔ وہ انھیں سیاستداں، بیرسٹر، مصنف، انجینیر، ڈاکٹر، پروفیسر، آرٹسٹ، میکینک حتیٰ کہ ایک ماہر تجار بنا سکتی ہے برخلاف اس کے درسگاہ کے باہر رہ کر ان کے بچے ننگ ملک و قوم بنیں گے۔ بداخلاق اور بدتہذیب کہلائے جائیں گے یہاں تک کہ چور، اُچکے، بدمعاش، آوارہ اور قاتل بھی ان کے بنجانے کا زیادہ

سے زیادہ امکان ہے ـــــ ایک درسگاہ کو ملک و قوم کے بچوں کے لیے نہ صرف ذریعہ بیداری ہی ہونا چاہیئے بلکہ اسے ملک و قوم کے لئے باعث ناز اور سرمایۂ امید بھی ہونا چاہئے

پہلا عملی قدم | اس باب میں جو پہلا عملی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ درسگاہ کے تمام بچوں کے والدین سے ملاقات کی صورت پیدا کی جائے۔ درسگاہ کے صدر مدرس کا یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طلبا کے والدین سے واقف ہو اور اسی طرح درسگاہ کے ہر معلم کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ ان طلبا کے والدین سے ضرور واقف ہو جن کو وہ پڑھاتا ہے طلبا کے والدین سے گاہ بگاہ ملاقات جسے رفتہ رفتہ خوشگوار اور پُرخلوص تعلقات میں تبدیل کیا جاسکتا ہے نتائج کے اعتبار سے بچوں کے لئے، والدین کے لئے اور معلمین کے لیے یکساں طور سے مفید ثابت ہوسکتی ہے لیکن صرف یہی کافی نہیں ہوسکتا کہ معلمین طلبا کے سرپرستوں سے واقف ہو جائیں بلکہ طلبا کے والدین کو بھی آپس میں ایک دوسرے سے واقف ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری ہے کہ سرپرست اور معلمین کا وقتاً فوقتاً دوستانہ اور ہمدردانہ باہمی اجتماع بھی ہوتا رہے۔ ان ہمدردانہ اجتماعات کے نتیجہ میں جو خوشگوار ماحول تیار ہوسکے گا وہ کسی درسگاہ کے مقاصد کی تکمیل میں زیادہ سے زیادہ مدد دے سکے گا۔ میرے خیال میں درسگاہوں کو اکثر و بیشتر اس قسم کے اجتماعات کے مواقع نکالنے چاہئیں کہ جہاں معلمین اور والدین ہمدردانہ طور پر تبادلۂ خیالات کر سکیں ایسے اجتماعات کے اہم مواقع پر معلمین کا فرض ہے کہ وہ طلبا کے سرپرستوں کا نہایت گرمجوشی سے خیر مقدم کریں۔ بغیر کسی تفریق سے متاثر ہوتے ہوئے اور کسی امتیاز کو جائز رکھتے ہوئے معلمین کا فرض ہے کہ وہ مزدور اور کم تعلیم یافتہ والدین کا بھی اسی گرمجوشی سے خیر مقدم کریں جتنا کہ وہ خوشحال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین کا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو درسگاہ کی سیر کرائی جائے اور درسگاہ کے پروگرام اور کام سے انھیں آگاہ کیا جائے۔ بچوں کی حالت سے انھیں آگاہ کیا جائے۔ بچوں کی صحت نگہداشت کے لئے ان سے درخواست کی جائے۔ اس کے علاوہ درسگاہ سے متعلق ضروریات کو ان کے علم میں لایا جائے ایسے مواقع پر درسگاہ کے صدر مدرس یا پھر کسی اچھے مقرر نائب مدرس کا یہ فرض ہے کہ وہ نہایت واضح طور پر طلبا کے سرپرستوں کے سامنے ایسی تجاویز پیش کرے جو ان کے لئے بچوں کی تعلیم و تربیت کے باب میں مددگار ثابت ہوں اگر درسگاہ سے متعلق کچھ مشکلات ہیں تو ان کا بھی ایسے مواقع پر ذکر کرنا ضروری ہے لیکن

ساتھ ہی وہ طریقے اور ذرائع بھی سرپرستوں کے گوش گذار کئے جائیں جن پر عمل کرنے سے وہ درسگاہ کی مشکلات کو ختم کرنے میں منتظمینِ درسگاہ کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ ایسے اجتماعات میں طلبا کے والدین کو بھی خیالات کے اظہار کا ضرور موقع دیا جائے۔ ان سے نہ صرف تقریر کرنے کی درخواست کی جائے بلکہ اس اجتماع کی صدارت بھی انھیں میں سے کسی اہل اور موزوں شخصیت کے لئے وقف ہونی چاہئے۔ یہ زیادہ بہتر اور موثر ثابت ہوگا اگر طلبا کے سرپرستوں میں سے ہی کوئی صاحب درسگاہ سے متعلق ضروریات اور مشکلات پر روشنی ڈالیں مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے اجتماعات بے معنی ثابت نہ ہوں گے اور درسگاہ کے لئے والدین کی محبت و ہمدردی کو زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکیں گے۔ اور یہی اجتماعات آخر کار "والدین اور معلمین" کی ایک "انجمن" کے مستقل قیام تک ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ یہی وہ طریقہ ہے جو ہمارا اعلیٰ قدم ہو سکتا ہے کہ جس کے ذریعہ ہم اُس خلا کو پورا کر سکتے ہیں جو درسگاہ اور والدین کے درمیان عرصہ دراز سے قائم ہے اور جس کو پُر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

امید ہے کہ والدین انجمن مذکور کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھیں گے۔ اور ان کے اور معلمین کے باہمی اجتماعات کے مفید اور خوشگوار نتائج کے متعلق اچھی رائے قائم کرنے میں بخل سے کام نہ لیں گے والدین بخوبی اندازہ کر سکیں گے کہ ان کا معلمین کے ساتھ اشتراک عمل اور تبادلہ خیالات ان کے بچوں کے لئے کس طور سے اور کس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ خوشگوار اور مفید نتائج دیکھنے کے بعد والدین خود بھی ان اکثر و بیشتر وقوع پذیر اجتماعات میں دلچسپی لیں گے اور انجمن مذکور کو کوئی فرد واحد بھی بیکار اور سطحی جماعت کہنے کی ہمت نہیں کر سکے گا۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے کسی درسگاہ کو انجمن مذکور کے قیام پر ہی قناعت نہ کرنی چاہئے بلکہ اسے اپنا نظم و نسق زیادہ سے زیادہ دلچسپی اور جوش کے ساتھ قائم رکھنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا بھی امکان ہے کہ والدین اور معلمین کا اشتراک وہ خوشگوار اور متوقع نتائج نہ پیدا کر سکے جن کے متعلق انجمن مذکور کی تشکیل سے پیشتر بہت ہی امید افزا رائے قائم کی گئی تھی۔ سوسائٹیوں، انجمنوں اتحادوں اور لیگوں کی فی زمانہ تشکیل اس قدر عام ہو گئی ہے کہ ان جماعتوں کا زرین مقصد، چاہے وہ کوئی تعلیم یافتہ حضرات کی جماعت ہو یا وہ کوئی جاہل مزدور طبقہ کے افراد کا گروہ ہو پورا نہیں ہونے پاتا۔ اکثر

ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کی جماعتوں کی تعمیر سے بجائے اس کے کہ مفید نتائج برآمد ہوں بر خلاف اس کے مشکلات میں اور پیچیدگی کا باعث بن جاتی ہے۔ اور بچوں کی تعلیم و تربیت کو بہتر و برتر طریقہ پر انجام دینے کی خاطر اگر اس۔ والدین اور معلمین انجمن کا بھی حسب معمول یہی حشر ہونے والا ہے تو پھر تو اس صورت میں یہی بہتر ہے کہ اس کی تشکیل کے متعلق سوچا تک نہ جائے لیکن باوجود ان خطرات کے تو دنیا بہ امید قائم اسکے مصداق ہمیں انجمن مذکورہ کے قیام کی کوشش کرنی چاہئیے۔ اور والدین اور معلمین کو اپنے اپنے طور پر سعی کرنی چاہئیے کہ ان کی یہ مشترکہ جماعت اپنے زرین مقاصد میں کامیاب ہو کر رہے۔

انجمن کا نظام عمل| والدین اور معلمین کے اجتماع کا انعقاد ایک ماہ میں دو دفعہ تو غالباً بہت زیادہ ہو جائیگا لیکن ایک ماہ میں ایک دفعہ تو غالباً بے حد ضروری ہے۔ ان اجتماعات میں کام کے نظام اور بحث و مباحثہ کے لئے موضوع کا دارومدار مقامی صورت حالات اور درسگاہ کی مخصوص مشکلات پر مبنی ہونا چاہئیے لیکن عام طور سے بحث و مباحثہ کا موضوع جن باتوں پر مشتمل ہونا چاہئیے وہ اس قسم کی ہوں تو بہتر ہے مثلاً مختلف عمر کے بچوں کے ساتھ کس کس قسم کا طرز عمل اختیار کیا جائے مختلف جماعتوں کے بچوں کی اہلیت و لیاقت اور ان میں تعلیم کے لئے زیادہ سے زیادہ شوق پیدا کرنے کے متعلق تبادلہ خیالات کیا جائے۔ بچوں کی اخلاقی حالت کیا گھر میں اور کیا درسگاہ میں بلند کرنے کے متعلق ذرائع سوچے جائیں۔ ان ذرائع پر غور کیا جائے جو بچوں کو درسگاہ کے باہر کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس باب میں انجمن ایسے ذرائع کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے جو بچوں کو درسگاہ کے باہر خراب اثرات سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ مثال کے طور پر سنیما دیکھنے کی عادت کو لیجئے بعض ناقص اور فحش قسم کی تصاویر سے چھوٹے چھوٹے بچوں اور کمسن طلبا کے ذہنوں پر جو خراب اثرات پڑتے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس چیز سے بچوں کو کیوں کر بچایا جائے اس قسم کی اور بہت سی باتوں کا والدین اور معلمین کی مشترکہ جماعت اپنی متفقہ کوشش سے سدِ باب کر سکتی ہے۔ درسگاہوں نے اکثر و بیشتر طلبا کے والدین سے درخواست کی کہ آپ اپنے بچوں کو سنیما دیکھنے سے باز رکھیں لیکن ان کی التجا "صدا بہ صحرا" ثابت ہوئی اور والدین نے اسے درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ والدین او معلمین کی مشترکہ انجمن خاص عمر تک کے بچوں کے سنیما میں داخلہ کو قانوناً بند کرا سکتی ہے۔ وہ فلم کمپنیوں سے درخواست کر سکتی ہے کہ وہ

بچوں کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر چند فلمیں تیار کرے۔ دوسری عام خراب عادت جو درسگاہوں کے بچوں میں پائی جاتی ہے وہ تمباکو نوشی کی عادت ہے۔ تمباکو فروش حضرات اور سینما ہاؤس کے منیجر صاحبان کو اپنے کاروباری نقطۂ نظر سے یہ پابندیاں ضرور قابل اعتراض ہوں گی لیکن انجمن جب ان پابندیوں کو اُن کے سامنے معلمین اور والدین کیطرف سے پیش کرے گی تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ انجمن کی کوششوں کو نہ سراہیں کیا کوئی باپ یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے بچے اوباش اور آوارہ مزاج بن جائیں؟ آخر تمباکو فروش حضرات اور سینما کے منیجر صاحبان بچوں کے باپ بھی تو ہوتے ہیں۔ اسی طرح اور بھی بہت سی فحش اور عریاں چیزوں کو بچوں کی نظر کے سامنے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔ اور یہ سب باتیں والدین اور معلمین کی انجمن بخوبی اور بآسانی انجام دے سکتی ہے بشرطیکہ معلمین اور والدین دونوں اپنے اپنے فرائض کا صحیح طور سے احساس کریں۔ ان کا باہمی ایثار، ان کی باہمی توجہ اور دلچسپی اور ان کی باہمی کوششیں ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہیں۔ انجمن کا یہ بھی ایک فرض ہوگا کہ وہ بچوں کے لئے مصروفیات کا ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرے جو بچوں کو ہمہ وقت گھر ا رکھے اس لائحہ عمل کے مطابق بچوں کو گھر ا رکھنے کا فرض معلمین اور والدین دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ والدین کی سخت نگہداشت بچوں کو بہت سی مہلک باتوں سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ اس انجمن کے ذریعہ معلمین کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ والدین اور عام پبلک کی درسگاہ اور اس کے نظام کے متعلق زیادہ سے زیادہ ہمدردی حاصل کرنے کی امکانی کوشش کریں اس طرح والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر معلمین اور درسگاہ کے کام میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے کی امکانی کوشش کریں اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین درسگاہ کی بہت سی باتوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں نکتہ چینی کرنا بری بات نہیں ہے لیکن تعلیم کے بہت سے موجودہ طریقوں پر (جو بچوں کی فطرت کا برسوں مطالعہ کرنے کے بعد محققین فن تعلیم نے وضع کئے ہیں) محض ناواقفیت کی بنا پر نکتہ چینی کرنا ضرور بری بات ہے۔ درسگاہ میں جسمانی سخت سزا عام طور سے ممنوع قرار دیدی گئی ہے لیکن اتفاق سے کسی درسگاہ کا کوئی معلم ضرورت و مصلحت کی بنا پر یا غلطی سے کسی طالب علم کو سخت سزا دیدیتا ہے تو والدین کی دنیا میں عجیب و غریب قسم کی چہ میگوئیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ والدین کا یہ ہنگامہ کہاں تک جائز اور درست ہے؟ کون نہیں جانتا والدین کا بچوں کو گھروں میں ذرا ذرا سی

بات پر سزا دیتے رہنا آئے دن کی بات ہے۔ انجمن مذکور اس قسم کی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کرتی رہے گی۔

والدین کی مشکلات اور ان کا حل | دو، تین اور چار سال کی عمر کا بچہ جہاں والدین کے لئے ایک خوبصورت کھلونے کا کام کرتا ہے وہاں اس کی بعض حرکات ان کے لئے وبال جان بھی بن جاتی ہیں۔ چھوٹے سے بچہ کی فطرت میں تجسس کا مادہ بالکل قدرتی ہوتا ہے وہ کیا جانے کہ کانچ اور چینی کے برتن بھی ٹوٹنے کی اشیاء ہوتی ہیں۔ اسے ان کے توڑنے میں ایک خاص قسم کی مسرت سی محسوس ہوتی ہے۔ والدین کا اس قسم کی اشیا کو بچہ کی زد سے بچا کر کسی اونچے مقام پر رکھتے رکھتے ناک میں دم آجاتا ہے لیکن باوجود احتیاط کے بچہ خاموشی سے کسی کونہ میں پہونچ کر کوئی تیل سے بھری ہوئی بوتل کے گرانے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے اور اس کی اس بھولی بھالی حرکت کے نتیجہ میں سارے گھر میں ایک ہنگامہ سا بپا ہو جاتا ہے۔ بعض بچہ کی فطرت سے ناواقف حضرات اس قسم کی حرکات پر بچہ کو کافی سے زیادہ سزا بھی دیدیتے ہیں۔ اکثر والدین کو عجیب عجیب قسم کی الجھنوں میں مبتلا ہونا پڑتا ہے جبکہ ان کے بچے آپس ہی میں گھر میں ایک دوسرے سے لڑتے ہیں یا پڑوسیوں کے بچوں سے کشتم کشتا کر بیٹھتے ہیں۔ ایک معلم بچہ کی ان حرکات کو اس کی اچھی تندرستی اور شوخئ طبع پر مبنی سمجھ کر ان سے بہتر اور اچھے طریقہ پر کام نکالنے کی کوشش کرے گا۔

چند سال بعد پھر وہ زمانہ آتا ہے جبکہ بچوں کو لڑکوں اور لڑکیوں کے نام سے پکارا جانے لگتا ہے۔ بچوں کا یہ دور والدین کیلئے اور بھی الجھن کا باعث ہوتا ہے۔ لڑکے یا لڑکیاں جو اپنی عمر کی دس منزلیں طے کرنے کے بعد گیارہویں اور بارہویں منزل میں قدم رکھ چکے ہیں اکثر والدین کیلئے غور و فکر کا موضوع بن جاتے ہیں۔ اگر بچوں کی حرکات و سکنات اور ان کی شکل و شباہت سے شرمیلا پن، سادہ لوحی اور مردہ دلی کا اظہار ہوتا ہے تو یہی چیز والدین کی پریشانی کا باعث بنجاتی ہے۔ ان کا بہت زیادہ وقت ان بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ دراصل بہت سے بچوں کی فطرت سے ناواقف والدین غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ یہ نہیں جانتے کہ بچوں کی اس عمر (گیارہ بارہ سال) کا فطری تقاضا یہی ہوتا ہے۔ دراصل سب سے زیادہ دقت طلب وقت والدین کیلئے وہ ہوتا ہے جبکہ ان کے لڑکے سولہ سے اوپر اور ان کی لڑکیاں چودہ سے اوپر پہونچتی ہیں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا گھر ہوتا ہوگا جہاں کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی اس عمر کا دور والدین کیلئے الجھن اور بے چینی کا باعث نہ بنا ہو ورنہ عام طور سے دیکھا جاتا

ہے کہ اس عمر کے لڑکے اور لڑکیاں جس طور سے والدین کو ذہنی تکلیف پہونچاتے ہیں اس قسم کی تکلیف سے انھیں زندگی بھر میں دوچار ہونا نہیں پڑتا ہوگا۔ ان کی عجیب و غریب اور مخصوص انفرادی حرکات و مصروفیات ان کی آزاد خیالی، دوستوں کا انتخاب، ان کا ازلی ذوق، ان کا لباس غرضکہ ان کی ہر ایک بات والدین کیلئے ایک عجیب قسم کی کشمکش اور الجھن کا باعث بن جاتی ہے۔ اس عمر کے بچوں سے ادائیگی فرض میں جو لغزشیں عمل میں آتی ہیں وہ اکثر و بیشتر والدین کو روحانی اور قلبی صدمہ پہونچانے کا باعث بن جاتی ہیں۔ بہت کم والدین اپنے بچوں کو معیوب باتوں سے باز رکھنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں ورنہ اکثر تو یہ گتھی ان کے لئے سلجھانا بہت مشکل ہوجاتا ہے بعض والدین تو بچوں کی بُری عادتوں کو لاعلاج مرض سمجھ کر ان سے بے نیازی اختیار کرلیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا یہ طریقہ قابل اعتراض ہے۔ والدین کی ان تمام مشکلات اور الجھنوں کا واحد حل والدین اور معلمین کی انجمن کے قیام میں مضمر ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ والدین اور معلمین کچھ عرصہ کے اشتراک عمل کے بعد ایک ماہر نفسیات معلم کی مدد حاصل کرنا مناسب سمجھنے لگیں۔ اس معلم کا کام ہوگا کہ وہ والدین اور معلمین کو باقاعدہ جماعتوں کے ذریعہ بچوں کی فطرت اور ان کی تعلیم و تربیت سے متعلق لیکچر کی صورت میں درس دیا کرے۔ ان جماعتوں کا انعقاد اگر ہفتہ میں دو دفعہ بھی ہو تو مناسب ہے ورنہ بعد میں ضرورت اور دلچسپی کے لحاظ سے اس میں توسیع کی جاسکتی ہے۔ یہ تجویز بعض حضرات کو شاید عجیب و غریب اور اجنبی سی معلوم ہو لیکن اس تجویز کے نتائج غور کرنے پر اچھی طرح معلوم ہوسکتے ہیں۔ انجمن کی تشکیل شہر کی متعدد درسگاہوں سے نمائندہ معلمین اور نمائندہ والدین کی طے کردہ تعداد پر مشتمل ہوگی۔ چند حضرات کو محکمہ تعلیم کی طرف سے نامزد بھی کیا جاسکتا ہے۔ فی زمانہ والدین کو جس خاص دقّت سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ بچوں کے لئے ان کے رجحان طبع کے مطابق کام اور پیشہ کا انتخاب ہے۔ ہندوستان میں غلط انتخاب کی وبا جس قدر عام ہے وہ ظاہر ہے۔ انجمن والدین کو ان تمام الجھنوں سے نجات دلاسکتی ہے۔ انجمن کے قیام کی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بہت سے سرمایہ کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی کہ والدین اور معلمین کی بہت سی باہمی توجہ اور کوشش۔ اس قسم کی انجمنیں نہ صرف ہمارے طلبا کے حق میں مفید ہوں گی بلکہ ملک میں ایسے نوجوان پیدا کرسکیں گی جو اس کے لئے باعث فخر و عزت ہوں۔

توکل صاحب بی۔ اے۔ ڈبائیوی

کچھ اپنی شاعری کے متعلق

حسب ارشاد اپنی شاعری کے متعلق یہ چند سطور حاضر خدمت کر رہا ہوں شاید آپ اور قارئین جامعہ انہیں دلچسپ پائیں میری شاعری کے متعلق اسے مفصل بیان نہ سمجھنا چاہئے۔ پھر بھی امید ہے کہ کافی اشارے ان سطور میں مل جائیں گے جو میرے اشعار کی چند خصوصیتوں کو نمایاں کرنے میں اور ان کی طرف توجہ دلانے میں کچھ کارگر ثابت ہوں۔ آپ شوق سے ان سطور کو جامعہ میں شائع کر سکتے ہیں ساتھ ہی اپنے دو سو اشعار کے قریب اپنے مجموعے سے خود منتخب کر کے بھیج رہا ہوں تاکہ میری یہ سطور ان اشعار پر روشنی ڈالیں اور یہ اشعار ان سطور پر روشنی ڈالیں۔

نگار لکھنؤ نے کئی زندہ اردو شعرا کا خود کردہ انتخاب حاصل کر کے اس بار اپنا سالنامہ مرتب کیا ہے اس میں بہت سے شعرا نے اڈیٹر نگار کی دعوت پر کچھ اجمال اور تفصیل کے ساتھ اپنے اور اپنی شاعری کے متعلق بھی لکھا ہے جو ہر ایک کے انتخاب کلام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ میرے منتخب کردہ دو سو اشعار کے قریب اور میرے خود نوشتہ حالات بھی شائع ہوئے ہیں۔ میں نے یہ کچھ نگار کو آپ سے چھ ماہ پہلے بھیجدیا تھا۔ موجودہ انتخاب اور اس بیان کو اس انتخاب اور بیان پر اضافہ سمجھئے جو نگار میں نکلے ہیں۔ جو اشعار آپ کے حسب ارشاد اب بھیج رہا ہوں ان میں نوے فیصدی تو نگار میں اپنا انتخاب بھیج چکنے کے بعد کہے گئے ہیں اور میرے تازہ ترین اشعار میں سے ہیں]

جناب نیاز فتحپوری نے نگار کے مذکورہ بالا شمارے میں ہر شاعر کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے میری شاعری سے اپنی انتہائی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ شاعری سے قطع نظر کر کے میرے اشعار کی چند خوبیاں انہیں متاثر کرتی ہیں۔ میری شاعری کی روش اور انداز کو دیکھتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اس کی پختگی کے متعلق انہیں ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے نہایت خلوص سے لکھا ہے۔ انہوں نے اب سے چار برس پہلے میری شاعری پر ایک مفصل اور مستقل مضمون نگار میں

شائع کیا تھا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ مجھے اردو شاعری کے کس دبستان اور کس رنگ، شاعری سے متعلق کیا جائے یہ طے کرنا مشکل ہے۔ میرے اشعار کی داخلیت پر غور کرتے ہوئے انھیں کچھ مومن کی جھلک ان میں نظر آئی۔ پھر بھی انھوں نے میرے یہاں اتنے انداز بیان پائے اور مضامین میں اتنا تنوع پایا کہ ان کے نقادانہ ذوق کو کچھ حیرت سی ضرور ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ میرے اشعار کو اتنا گوناگوں پاکر ہی جناب نیاز فتحپوری نے میری شاعری کی تشنگی کے متعلق یہ کہا ہے کہ "ڈر لگتا ہے۔ ان کے اس کہنے کو اگر خفیف سا اعتراض بھی سمجھا جائے تو مجھے یا کسی کو برا ماننے کی بات نہیں۔

شاعری میں اور شخصیت میں یکرنگی اور یکسانیت کی کئی شکلیں ہوتی ہیں داخلی اور خارجی دونوں لحاظ سے جہاں تک میری شاعری کا تعلق ہے۔ اگرچہ وہ کل کی کل میری زندگی کے مرکزی اثرات اور میری خاص افتاد مزاج کے تحت میں کہی گئی ہے۔ پھر بھی چند امور قابل غور ہیں۔ امیر اور داغ کے مرنے کے بعد سے یا یوں کہئے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے یہی نہیں ہوا کہ اردو شاعری کا ایک پرانا دور ختم ہو گیا اور ایک نیا دور شروع ہوا۔ بلکہ اس دور میں اپنے گوناگوں کوائف اور محرکات بیک وقت نظر آتے ہیں۔ ہماری زندگی اور ہمارے ادبیات میں اتنے پہلو پیدا ہو گئے ہیں کہ پہلے ادوار کی محدود یکرنگی کو دیکھتے ہوئے حیرت ہو جاتی ہے۔ اس دور میں کوئی ایک دبستان شاعری نہیں ہے جس سے ہم آج کل کے شعرا کو متعلق کر سکیں۔ اقبال۔ اصغر، جوش ملیح آبادی۔ جگر مرادآبادی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، آنند نرائن ملا وغیرہ اور دیگر شعرا ان معنوں میں ہم آہنگ اور ہم رنگ نہیں ہیں جن معنوں میں گذشتہ ادوار کے شعرا ہوا کرتے تھے۔ امیر اور داغ، آتش اور ناسخ، غالب و ذوق اور مومن، انشا اور مصحفی، میر اور سودا ان سب ادوار کی شاعری میں جو یکرنگی اور یکسانیت ہے وہ آج نظر نہیں آتی۔ آج کی اردو شاعری ہندوستان کی تغیر پذیر بلکہ انقلاب پذیر زندگی کی آئینہ دار ہے

اس دور کے شعرا میں یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کا انداز بیان اور اس کی جولانگاہ خیال دونوں بہ آسانی پہچانے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظمیں باہم ہم آہنگ اور ہم رنگ ہیں پھر بھی اقبال کی بانگ درا اور بال جبریل اور پھر دوسرے مجموعے باہم میل نہیں کھاتے۔ اب جہاں تک میری شاعری کا سوال ہے خود میری زندگی

کئی داخلی لحاظوں سے بدلتی رہی ہے۔ اس کے سینکڑوں مختلف محرکات اور اثرات رہے ہیں۔ وہ مختلف کلچروں سے اثر پذیر ہوتی رہی ہے۔ اور میرا نظریہ یا فلسفہ حیات و کائنات ساکن نہیں بلکہ متحرک رہے ہیں۔ میں مٹتا بھی گیا ہوں، اُگتا بھی گیا ہوں، بگڑتا بھی گیا ہوں، بنتا بھی گیا ہوں۔ ماضی کے بوجھ کو ہلکا کرنا اور اسے حال میں سمیٹ بھی لینا اور رخ مستقبل کی طرف کرکے چلنا، یہ تینوں کام ایسے تھے کہ کبھی کبھی پاؤں تھرتھراتے اور ڈگمگاتے نظر آئیں تو زیادہ جائے حیرت نہیں۔ میں قدما کی یکسانیت اور دورِ حاضر کے اصغر، جگر اور حسرت موہانی یا فانی بدایونی۔ یا یگانہ کی یکرنگی اپنے یہاں نہیں لاسکا۔ میرے یہاں صرف ایک رنگ پختہ سے پختہ تر ہوتا ہوا نہیں چلا گیا بلکہ ایک رنگ آتا تھا تو ایک رنگ جاتا تھا۔ میرا رنگ کچھ سے کچھ ہوتا رہا۔ لیکن میں ایک بے جان پتھر کی طرح زمانہ کی زدوکوب سے اِدھر اُدھر مارا مارا نہیں پھرا ہوں۔ ماضی کو حال کی رو میں اور مستقبل کی کشش میں بھولا نہیں۔ دیکھیے یہ اشعار ؂

کر عمر گذشتہ کو شریک غم امروز	خاکستر ماضی سے کچھ اٹھتا ہے دھواں بھی
نئی منزلوں کو سکون وطن دے	ٹھہرنا نہیں ہے یہ ہے دور جانا
مٹا ہے کوئی عقیدہ تو خون تھوکا ہے	نئے خیال کی تکلیف اٹھی ہے مشکل سے
رکیں تو پاؤں نہ مانیں چلیں تو منہ کی کھائیں	کریں تو کس سے کریں راہ عشق کا شکوہ

ان سطور کے ساتھ جو بہت سے اشعار میں بھیج رہا ہوں ان میں خود عشقیہ زندگی کے متعلق ایسے کئی شعر ملیں گے جن میں بیک وقت یادِ ماضی، کیفیت حال اور خواب مستقبل سب موجود ہیں۔ تکرار و تجدید کے سلسلے لامتناہی ہیں۔ بٹ مٹ کے زندگی اپنے کو بنایا کرتی ہے۔ غالباً یہی دیکھ کر جناب نیاز فتحپوری کو میرے کلام کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوا۔ جہاں تک یکرنگی اور یکسانیت تک میرے کلام کے محدود نہ رہنے کا تعلق ہے ان کا یہ کہنا صحیح ہے لیکن کیا میرے یہاں یہ مختلف رنگ کچے پھیکے یا ہلکے ہیں۔ یا بدرنگ ہیں۔ ممکن ہے یہ عیب بھی میرے کچھ اشعار میں ہوں وہ شاعر جس کے یہاں اتنا تنوع ہوگا اور جو اتنا کہے گا کبھی کبھی کمزور شعر بلکہ غلط شعر بھی ضرور کہدے گا۔ انگریزی شاعر پوپ کا یہ مصرعہ ضرب المثل ہوگیا ہے کہ کبھی کبھی ہومر بھی اونگھنے لگتا ہے اور کچھ راسخ العقیدہ مگر اللہ کو بھی چھیڑنے والے منچلے مسلمان قرآن پاک کو مسلسل نہ پاکر

کہہ اُٹھتے ہیں کہ اللہ میاں کیا سے کیا کہنے لگے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مختلف باتیں مختلف انداز سے، مختلف اسلوبوں سے میں نے کہی ہیں تو کیا اس کا بہت کچھ حصہ پختگی حاصل کر سکا ہے یا نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ جو باتیں میں کہنا چاہتا ہوں جن داخلی احساسات کو میں اپنے اشعار میں جگہ دیتا ہوں ان کے اظہار میں وہ پختگی برجستگی بے ساختگی یا تکمیل بیان آ ہی نہیں سکتی جو داغ کی جادو بیانی میں نظر آتی ہے لیکن کیا کبھی کبھی اور بہتوں کی رائے میں اکثر داغ کی آواز بھی گرفتہ نہیں ہو جاتی میرا ہر شعر زبان میں نہیں ہے لیکن بغیر اپنے شلوار معیار کو نیچا کئے ہوئے میں نے بہت سے شعر زبان میں بھی کہے ہیں لیکن عام طور پر میرا لب ولہجہ مانوس اور سامعہ نواز ہوتا ہوا بھی اگر کچھ غیر معمولی معلوم ہو یا کچھ اجنبیت اس میں نظر آئے تو اسے کبھی کبھی میرا عجز بیان سمجھئے لیکن زیادہ تر اسے میرے تخیل اور میرے احساس کے اچھوتے پن کی وجہ سے ہوا ہے۔ انگریزی تنقید میں ایک مقولہ یہ بھی ہے :- A clear idea is a small idea. یعنی بہت صاف خیال ایک چھوٹا خیال ہوتا ہے۔ خود مومن کے کلام میں کتنی ناہمواری پیدا ہو گئی ہے لیکن مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ میں ناہمواری کو پسند نہیں کرتا اور نازک راہوں سے گذرتا ہوا بھی اپنی چال کو ناہموار بنانے سے بچتا ہوں اپنے اس معیار کو برتنے میں جن آزمائشوں سے مجھے دوچار ہونا پڑا ہے انہیں میں خود بیان کرنا چاہوں تو بیان نہیں کر سکتا۔ اپنا ایک شعر پیش کرتا ہوں ؎

کھلیں نہ حسن کی فطرت کے راز عاشق سے ۔۔۔ برت خلوص بھی، جھوٹی قسم بھی کھائے جا

معشوق کی فطرت کے غیر شعوری یا تحت الشعور رموز اس شعر میں بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے خلوص کی "تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی"، اسی لئے اس کا برتاؤ اور سلوک باخلوص ہوتے ہوئے بھی اس کے قول و قسم کمزور ثابت ہوتے ہیں ؎

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ۔۔۔ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

بات تو غالب نے بھی یہی کہی تھی مگر غالب اس مسئلہ سے کھیل کر رہ گئے ہیں۔ میرے شعر میں جو اس بظاہر ان ہونی بات پر حیرت چھپی ہوئی ہے وہ قابل غور چیز ہے۔ اپنے تین چار اور شعر اسی نازک موضوع پر حاضر کرتا ہوں

نثار پیمان دوستی کے مگر ہے گردش میں آسماں بھی ۔۔۔ جو یادِ ماضی پہ منحصر ہو وہ عہد کیا استوار ہوگا

بیوفا تو نہیں اے دوست، جسے عشق کہیں — تجھے اُس شدت احساس کی برداشت نہیں

سچ جھوٹ کا سوال نہیں حسن و عشق میں — گر ہے کوئی سوال تو عنوانِ شوق کا

"عنوان شوق" کی نئی ترکیب ذرا مشکل سے ہاتھ آئی ہے۔

عشق میں سچ ہی کا رونا ہے — جھوٹے نہیں تم جھوٹے نہیں ہم

بقول ہیگل (Tragedy is conflict of good against good) المیہ میں نیکی کا تصادم نیکی سے ہوتا ہے۔

اپنا ایک اور شعر عرض کرتا ہوں ؎

حسن کے ہر تپاک میں جذب تھیں لاکھوں ستیاں — کون کسی کو یاد تھا کس نے کسے بھلا دیا

اب میں ان نازک باتوں کو داغ کی زبان میں امیر کی زبان میں بلکہ غالب اور حسرت اور مومن کی زبان میں بھی کیونکر ادا کروں یا خود اپنے ان اشعار کی زبان میں کیونکر ادا کروں جن کی زبان زیادہ سادہ اور صاف ہے میں اس کی بھی کوشش کرتا رہا ہوں کہ خود اپنا اور اپنے اپنی کا بوجھ کچھ ہلکا کروں۔ اس لئے ادھر کچھ دنوں سے اپنے رجحانات سے ذرا بچتے ہوئے دنیا کے ادب کے ان حصوں پر نظر ڈالی جو خواہ مخواہ میرے مزاج اور مذاق اور محدود فطری تاثرات کی ترجمانی نہیں کرتے ہر ایک کو اپنی چشم تنگ کو کثرت نظارہ سے وا کرنا چاہئے کسی انگریزی نقاد نے کہا ہے:-

In literature you can have preferences but no exclusions.

وکٹر ہیوگو کا قول ہے:-

Let the artist go where he will. He will find only one law Healing power.

اسی لئے میں نے اپنی محدود شخصیت کی زنجیروں کو ڈھیلا کر کے جدید ترین فکریات کے میدان میں قدم رکھنا شروع کیا۔ اس سے حسن و عشق کا نقطہ بھی وسیع ہو جانا لازمی تھا اور حسن و عشق کے علاوہ حیات و کائنات و اخلاقیات کے وہ پہلو بھی سامنے آئے جو محض رومانی حسن پرستی یا شاعرانہ کیف پروری سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اجتماعی زندگی کے قانون محض اچھی یا احساس طبیعت پالنے سے یا محض شاعرانہ

نیک نیتی سے معلوم نہیں ہوا کرتے سوچئے کہ ان اشعار کے کہنے میں میری کیا گت بنی ہو گی ۔

غفلت ہو تو کوئی جگائے جاگے ہوؤں کو کون جگائے
ہائے وہ کارجہاں خود جن سے نکلیں بے عملی کے بہانے

گھوڑے بیچ کے سوئے ہیں
پس ماندوں کا پوچھ نہ حال

جو لا نگاہ حیات کہیں ختم ہی نہیں
منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

"حدود سے دنیا بنی نہیں" کا ٹکڑا سامنے کا ٹکڑا نہیں تھا ہیگل کا فلسفہ اس ٹکڑے میں موجود ہے بقول اکبر الہ آبادی

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

تجھے دنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے اے کاش
تجھے دنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

منازل ارتقا کے دھوکے زمانہ پہلے بھی کھا چکا ہے
کسی کو جس کی خبر نہیں ہے وہ انقلاب ایک بار ہوگا

ہر ہر شکست ساز میں صد لحن سرمدی
یا نغمۂ حیات ازل گا رہی ہے آج

حیات اور کائنات اور سماج کے متعلق ان اشعار میں محض شدت احساس اور جمالیات کو دخل نہیں ہے کچھ سوجھ بوجھ کو بھی دخل ہے اور وہ بھی سوجھ بوجھ جو عجیب طور پر میرے وجدان کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی اسی لئے میرے ایسے اشعار کی زبان میں ایک ہلکا سا اٹکاؤ کچھ لوگوں کو اور خود مجھے بھی نظر آ سکتا ہے پختگی کی کمی نظر آ سکتی ہے اور کچھ آورد کی جھلک بھی۔

اب اپنی زندگی اور وجدان کے مرکزی اثر کا کچھ ذکر کر دوں اگرچہ بچپن ہی سے نئی باتوں پر میں جھلا اٹھتا تھا اور کچھ لوگوں کو دیکھتے ہی بلکہ ان کی تصویر دیکھتے ہی یہاں تک کہ ان کے بارے میں ایسی باتیں سن کر بھی جن میں بظاہر کوئی برائی نہ تھی مجھے سخت نفرت پیدا ہو جاتی تھی اور یہ جذبات دائمی ہوتے تھے۔ پھر بھی اس سنسار سے اتنی محبت تھی کہ میں اسے سینہ چیر کر اپنے کلیجے میں رکھ لینا چاہتا تھا۔ میں ترک دنیا کا قائل نہیں لیکن اپنے کو اشرف المخلوقات سمجھ کر دنیا کو محض استعمال کی چیز یا اپنے زیر نگیں رکھنے کی یا محض اپنی زندگی کا پس منظر نہیں مان سکتا تھا میں زمین دریا، پہاڑ، نباتات اور حیوانات کو یعنی پورے سنسار کو نا پاک اور اہم سمجھتا تھا کہ کسی آسمانی خدا کو یا انسان کو سنسار سے زیادہ نہیں پوج سکتا تھا۔ یہ نظریہ عبرانیت کے نظریے سے الگ سا ہے یہ نظریہ قبولیت (Affirmation and Acceptance) کا نظریہ رہا ہے میں اس

ٹھوس دنیا کی پاکیزگی کے احساس کو ہندو کلچر کا وہ قیمتی جزو سمجھتا رہا ہوں جو دنیا بھر کے لئے خیر و برکت کا پیغام ہے جو زندگی کو امرت میں نہلا سکتی ہے اسی احساس نے میرے اشعار میں بقول حضرت نیاز فتحپوری شاعری اور پختگی یا فنیت سے قطع نظر کرکے ایک حلاوت نرمی اور معصومی پیدا کر دی ہے اور ایک نغگی بھی۔ کائنات سے ہم آہنگی ہی یہ بات میرے اشعار میں پیدا کر سکتی تھی میں شاعر نہیں فن کار نہیں ہاں داخلی طور پر انسان ہونا ضرور چاہتا رہا ہوں۔ جو مٹی کی عزت نہیں کر سکتا شاید وہ خدا اور انسان کی بھی عزت نہیں کر سکتا خدا کی پرستش اور انسان کی خدمت ممکن ہے کر سکتا ہو۔ مجھے شعر کہنے سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ یہ سمجھوں کہ قدروں کے لحاظ سے دنیا اور زندگی کیا ہیں۔ میں برائیوں اور مصیبتوں کے وجود کا قائل ہوں میں فطرت اور انسان دونوں کے مظالم کا دشمن ہوں لیکن دنیا اور انسان میں برائیاں پاتے ہوئے بھی ان کا اجمالی اور بنیادی تصور مجھے ہمیشہ وجد میں لاتا رہا۔ اسی سے اگرچہ دکھ اور غم و حسرت کا شدید احساس میرے اشعار میں موجود ہے پھر بھی میرے اشعار میں وہ نرمی و صفت بھی شاید موجود ہے جسے ایک قوت شفا کہہ سکتے ہیں۔ خیر و برکت کا دامن میں نے اپنے اشعار کو نہیں چھوڑنے دیا اسی سے دکھ اور غم کا احساس میرے اشعار کو فانی بدایونی کے کلام سے الگ کر دیتے ہیں میں نہ غم کا شاعر ہوں نہ خوشی کا شاعر ہوں دنیا کے حسن و قبح کا احساس رکھتے ہوئے یعنی آنکھ کھول کر دنیا سے محبت کا شاعر ہوں۔

تحیر کا عنصر بھی میرے اکثر اشعار میں موجود ہے میرے نزدیک تحیر ہم آہنگی اور محبت کے تحت میں کسی چیز کے وجود کے شدید احساس اور ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بقول افلاطون فلسفہ کا آغاز حیرت سے ہوتا ہے ہاں تو میں دنیا کو محض سپنا یا سرائے فانی یا عارضی منزل نہیں سمجھتا۔ اپنے انفرادی وجود کو اشرف المخلوقات کہہ کر کوئی اہمیت نہیں دیتا میں مٹ جاؤں گا تو کیا میری حقیقت تو یہ دنیا ہے۔

ملتی رہتی ہے مجھے اپنی خبر شام و سحر ہوتے رہتے ہیں حقائق جلوہ گر شام و سحر

مادر گیتی سب کچھ ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ اسی کی کوکھ سے پیدا ہو کر پھر اسی کی کوکھ میں جذب ہو جانا ہی ہمیشگی اور نجات ہے ہمارے وجود کی بھی تجدید اور اپنے سہاگ کو نیا کرنا یہ دونوں کام مادر گیتی ہمیں مٹا کر دوسری نسلوں کو جنم دے کر کرتی رہتی ہے اس لحاظ سے ہم دنیا کے لئے ہیں۔ دنیا ہمارے لئے نہیں ہے۔

میرے اشعار میں حسن وعشق یا زندگی یا سنسار کے مخصوص اور محدود پہلوؤں کے بیان میں آپ کو وہ اشارے ملیں گے جو کائنات کے ورائی کیفیات کا پتہ دیتے ہیں۔ عموماً میرے اشعار کے لہجے سے یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ بغیر اس کے شاعری میں آفاقیت کی صفت اور عالمگیر ہونے کی صفت پیدا نہیں ہو سکتی حسن کا احساس قدروں کے علم کے لئے ضروری ہے۔ اور حسن کا احساس ہی محدود کو لامحدود بناتا ہے ؎

ہر دور ایک منزل معراج عشق ہے　　　درد اس نگاہِ ناز سے اٹھتا ہے آج بھی

اپنی زندگی کے جس ابتدائی اور بنیادی تاثر کا میں نے ذکر کیا ہے وہ تاثر ترقی پذیر چیز ہے۔ یہ تاثر کلچر کی سانس ہے اور جیسے جیسے کلچر میں تنوع، وسعت، بلندی اور ژرف پیدا ہوتا جاتا ہے جیسے جیسے کلچر کی تکمیل ہوتی جاتی ہے یہ سانس بھی گہری ہوتی جاتی ہے ؎

سرِ راہِ محبت آدمی کی سانس کیوں اکھڑے　　　نفس کی موج کو دیے ادائے کم روی اپنی

اسی ادائے کم روی میں حرکت اور سکون کی انتہائی منزلیں چھپی ہوئی ہیں۔

انتخابِ اشعار

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا　　　اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

چھڑ گئی ان آنکھوں کی بات　　　دنیا میں، اب دن ہے کہ رات!

جینے والے جی لیں گے　　　اب نہ ملو گے اچھی بات

ہجر میں پہلی نگاہ کا ذکر　　　کب یاد آئی کب کی بات

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں　　　لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

مدتیں گذریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں　　　اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست!　　　آہ اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

شوخیٔ پرسشِ کو بھی نذرِ تغافل کیوں کیا　　　جورِ پنہاں کو بھی کیوں جورِ نمایاں کر دیا

رنگ بو وا تو کچھ اس کا دردِ بھی تم پر کھلا　　　جس تبسم نے گلستاں کو گلستاں کر دیا

جو زہر ہلاہل ہے امرت بھی وہی لیکن — معلوم نہیں تجھ کو انداز ہیں پینے کے

میں یہ کہہ کے کرتا ہوں عرض تمنا — نگاہ محبت کے دھوکے نہ کھانا

وہی ہم وہی تم، وہی درد لیکن — محبت محبت، زمانا زمانا

دبدھا پیدا کر دے دلوں میں ایمانوں کو دے ٹکرانے — بات وہ کہہ اے عشق کہ سن کر سب قائل ہوں کوئی نہ مانے

امن واماں کی دنیا میں ایسوں کو کب ملتے ہیں ٹھکانے — کئی بار تو عشق گیا ہے موت کے منہ میں جان بچانے

اسی درد کا گھر گھر چرچا اسی درد سے دنیا غافل — ایک شبِ غم کی سو راتیں ایک محبت سو افسانے

کبھی برس بھی پڑے گا غم محبت کو — ابھی تو ابر سر کو ہسار ہونے دے

لبوں پہ اہل محبت کے ہیں گلے کیا کیا — کرے وہ جور تو منہ اس کا دیکھتے رہ جائیں

کہاں وہ خلوتیں دن رات کی اور اب یہ نوبت ہے — کہ جب ملتے ہیں دل کہتا ہے کوئی تیسرا ہوتا

ہیں آسمانِ محبت سے رخصتِ شب ہوں — ترا خیال کوئی ڈوبتا ستارا ہے

فراقؔ اپنی محبت پہ ناز کرتے ہو — ہر اک تمہیں سا جو ہوتا جہان مٹ جاتا

تجھ سے حیات عشق نے اُف کیا اثر لیا — ہستی تمام شکر شکایت ہے ان دنوں

جہاں بھی جستجوئے دوست میں ٹھہر جاتے — یقین جان کہ منزل قریب ہی ہوتی

تمہیں تو اہل ہوس امتحاں سے بھاگ چلے — یہ کیا ضرور کہ ہوتی تو موت ہی ہوتی

فراقؔ زندگیٔ غم کے راز کیا کہیے — اگر یہ موت نہ ہوتی تو زندگی ہوتی

کل پھر عشق نہ روٹھ سکے گا — آج منا لے آج منا لے

میں تجھ کو پا کے بھی کچھ منتظر سا ہوں تیرا — یہ دل کا قول ہے تو آپ اپنی آہٹ ہے

اشک سا دیدۂ انجم میں جھلک جاتا ہے — یہ بھی اک راز ہے انسان کی قسمت کی طرح

مشکلیں عشق کی آسان ہوئی جاتی ہیں — تجھ سے چھٹتا ہوں میں چھٹتی ہوئی ہمت کی طرح

چپ ہو گئے تیرے رونے والے — دنیا کا خیال آ گیا ہے

یہ بزم عام بھی اے دوست بزم عام نہیں — نگاہیں اٹھتی ہیں لیکن کسی کسی کے لئے

نہیں نصیب جو رنگینیٔ جمال کو بھی — وہ بانکپن ہے محبت کی سادگی کے لئے

حرارتیں ہیں نئے انداز آتشِ رخسار
تراوٹیں تری زلفوں کی ابتری کے لیے

ہر انبساط کا آخر بھرم ہے کھل جاتا
تو بے قرار ہے کس ربطِ باطنی کے لئے

احساس دیدہ و دل یہ ہے بدن کو اُسکے
دیکھیں تو حیرتیں کچھ مانوس ہو رہی ہیں

تمام شبنم و گل ہے وہ سر سے تا بہ قدم
رکے رکے سے کچھ آنسو رکی رکی سی ہنسی

نکھار اس کے بدن کا فراق کیا کہیئے
زِ فرق تا بہ قدم خندہ ہائے زیرِ لبی

جسم تیرا ہے راگ دیپک کا
تو جو آتا چراغ جل جاتے

وہ رنگ رخ تھا اٹھائی نگاہ جب اس نے
شراب جیسے چھلکتے چھلکتے رہ جائے

کوئی اس طرح مسکراتا ہے
چمک اُٹھتا ہے جیسے میٹھا درد

حسن کی زمیوں نے لو دیدی
مسکرانا ترا ہے یاد مجھے

عشق کیا حسن کا خلوصِ نہاں
حسن کیا ایک عشق کی جھنکار

جہاں سے دیکھو وہ گویا ہے بول اُٹھنے کو
وہ جسم سر سے قدم تک تمام جلوۂ رُخ

یقین یہ ہے کہ تو سامنے ہے محوِ سکوت
گمان یہ ہے کہ کچھ کہہ رہا ہے تو مجھ سے

میں تجھ کو سوچ رہا ہوں کہ دیکھتا ہوں تجھے
تو سر سے تا بہ قدم ایک خوابِ مستقبل

رگوں میں گردشِ خوں ہے کہ لے ہے نغمے کی
وہ زیر و بم کا ہے عالم کہ جسم گاتا ہے

آگیا ہوں کو ہوش جب اپنا نہیں رہا
اس دم شعورِ غیب ترا حسن بن گیا

اور ہو لے گا مآلِ عشق کا ردِ عمل
جب پشیمانی بھی دھوکا ہے تو پچھتائیں گے کیا

کسی کے حسن کو آئی ہوئی تھی نیند سی جیسے
مرے اشعار میں انگڑائیاں لیتا اٹھا کوئی

آنکھیں کس کو دیکھ رہی ہیں
روشنی، روشنی، اور روشنی!

جہاں سے دیکھو اُسے جیسے آنکھ لگ جائے
فراق جسم ہے اس کا نگارِ ناز تمام

بجا یہ ضبط بھی لیکن محبت میں کبھی رو لے
دبانے کیلئے ہر درد اے ناداں نہیں ہوتا

ترا فراق تو اس دم ترا فراق ہوا
جب ان سے پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں

کون یہ لے رہا ہے انگڑائی
آسمانوں کو نیند آتی ہے

دوزخ میں اُدھر آئی قیامت / جب یہ کھلا جنت بھی یہی ہے

نثارِ وعدہ دیدار پھر بھی سوچ یہ ہے / تجھے بھی بھول نہ جاؤں میں دیکھ کر تجھ کو

رہا ہوں عشق میں غمگیں بھی خوش بھی ہوں لیکن / غم و خوشی اسے کہنے میں کچھ تامل ہے

جو دل میں عشق کے ہے آرزوئے لطف و کرم / کسے خبر کہ وہی حسن میں تغافل ہے

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست / سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

میری تنہائیاں بجا لیکن / حسن کا بھی تو کوئی دوست نہیں

تنہائیوں میں اکثر گذرا یہ گماں خود کو / ہم جتنا سمجھتے ہیں کچھ اس سے زیادہ ہیں

جو آئینے میں دکھایا وہی تھا حسن ترا / کہ وہ جو اب مرے اشعار میں نمایاں ہے

روپ روئیں بھاگ کھائیں حال دنیا کچھ نہ پوچھ / عشق کو اپنی پڑی ہے یہ عجب اندھیر ہے

وصل کے کچھ لمحوں کی قیمت ہجر کے اجلے آنسو ہیں / حسن سے جو کچھ بھی پایا تھا کوڑی کوڑی ادا کیا

مجھ کو تم کو کیا معلوم وقت کا پانی مر کے بتائے / میں ہوں کتنے پانی میں تم ہو کتنے پانی میں

گریۂ ہجر پہ نہ جا اے دوست / عفو ہیں کر رہیں گے کام اپنا

رہ گئی تلملا کے روحِ نشاط / اُدھ سنا گیت ہے کہ حسن ترا

تو غور و فکر میں دن رات سر کھپائے جا / بڑے خیال مگر دل میں ہوتے ہیں پیدا

حسن کا ماضی کچھ بھی رہا ہو / مستقبل تو عشق کا ہے

مرے اشعار پر اے دوست تو ہے وجد میں مجھ کو / خبر بھی ہے مرا کیا حال ہے رشک و رقابت سے

آئے نہ نظر لکیر ایسی / نیکی و بدی کے درمیاں ہے

دل کا پرسا لے رہا ہوں حسن کی باتوں سے آج / ڈبڈباتی ہیں جب آنکھیں مسکرا دیتا ہوں میں

روگ پیدا کر لے کوئی زندگی کے واسطے / صرف صحت کے سہارے زندگی کٹتی نہیں

ہو گئے یکتا اک مدت سے / عشق کے ٹکڑے توڑ رہا ہوں

تو جو خوش میں بھی کچھ اداس نہیں / یہ کوئی زندگی نہیں اے دوست

جنس حسن جب سے لٹنے لگی دولت والے دوڑ پڑے / قیمت دنیا پڑ جائے تو آٹے دال کا بھاؤ کھلے

نام اُن کا لے کے رہ گئے دیکھا ہے حبِ نفس
آئے وہ آج بھولی ہوئی یاد کی طرح

جھجک تو دور ہوئی، ڈر یہ ہے کہیں دل میں
لگا دے آگ نہ تیرا رُکا رُکا سا تپاک

جو اضطراب ہے ناداں وہی شکیب بھی ہے
ترا یہ درد کبھی اپنی یاد بھی ہوگا

نہ گئیں سرگرانیاں تیری
آج یہ مہربانیاں تیری!

اب اتنے پر بھی کیوں رہتی شکایت کسمپرسی کی
مرے تم ہو گئے مجھ کو بھی گر اپنا بنا لیتے

آہ یہ چشمِ توجہ تری غفلت آمیز
عشق سر تا بہ قدم شکر شکایت آمیز

دیے جاتا ہوں تیری یاد کو راہ
تجھ کو سو سو طرح بھلاتا ہوں

یونہی سا کچھ وصال و ہجر، لذتِ عشق، دردِ عشق
آکے یہاں یہ قربِ دوست ہجرِ دوام بن گیا

دکھا گئی تری قربت مصیبتِ دوری
بتا گیا ترا کھلنا رکاوٹیں کیا ہیں

جفائے حسن یاد آنا، وفا کا درد سر جانا
ہوس کیا ہے خمارِ بادۂ الفت اتر جانا

بے وفا تو نہیں اے دوست جسے عشق کہیں
تجھے اس شدتِ احساس کی برداشت نہیں

ریاضِ دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

عجب نہیں کہ جگا دیں تجھے مرے اشعار
سنا کے اِن کو تجھے اٹھ گیا ہوں دنیا سے

ہجر کی شب ترس گئی یوں تو ترے پیام کو
آج مگر فسانۂ دار و رسن سنا دیا

راہِ طلب میں وہ نگاہ رہزنِ بے نیاز ہے
جس نے جہانِ صبر و ہوش لوٹ لیا، لٹا دیا

اور نگاہِ شوق ہو صرفِ جمال کس طرح
تیری قسم تجھی پہ آج میں نے تجھے لٹا دیا

نرگسِ یار میں نہیں دشت و چمن کی وسعتیں
ایک نگاہِ ناز نے ہوشِ جنوں اڑا دیا

اس درجہ اختلاط اور اتنی مغائرت
تو میرے اور اپنے کبھی درمیاں بھی ہو

عشق ہی سے ہیں منزلیں آباد
کارواں کارواں یکا بھی ہے

سر بسر غرقِ نور رہ لیکن
زندگی اکتسابِ نار بھی ہے

آگیا عشق بدگماں آخر
حسن کے لیے کیے بہانوں میں

تھا ذکرِ کرم فراق اس کا
کیوں آنکھ لگی ہے ڈبڈبانے

آدھا گلزار ہے قفس میں
ویران پڑے ہیں آشیانے

اک ذرا عشق سبک روح گرانبار سہی
نگہ ناز میں کچھ شرم کے آثار سہی

بڑھ بڑھ کے رہ گئی ہیں دلوں میں محبتیں
اٹھ اٹھ کے آج بیٹھ گئیں ہیں قیامتیں

عشق تو دنیا کا راجا ہے
کس کارن بیراگ لیا ہے

یہ ضبط و اضطراب میں کیا ساز باز ہے
کچھ مختصر بھی ہے شب غم کچھ دراز ہے

غم حیات وہی دور کائنات وہی
جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے

بس اک فریب نظر ہے یہ سب قرار و ثبات
جمود عالم ہستی بھی موج دریا ہے

عشق کے صدق و صفا رشک جہاں ہیں لیکن
کوئی الزام دیا چاہے تو الزام بہت

لب جاناں ہیں پھر تبسم ریز
ہو گئی نبض کائنات بھی تیز

دیکھ رفتار انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

تجھ میں کچھ زندگی کا رس بھی نہیں
اے غم عشق تجھ میں حبس بھی نہیں

آج اس کی بے خبری سے
پوچھ لے دنیا بھر کا حال

تکیہ چھوڑے مدت گذری
اب تو غم سجادہ نشیں ہے

سر بسر جسم کے امکان میں ہر جاں ہوتا
رگ ہستی کو نہ آیا ابھی لرزاں ہونا

رشک صد لطف و کرم ہو یہ نیا رنگ ستم
کچھ ہمیں جان سکے تیرا پشیماں ہونا

کچھ اس کا رنگ رخ سے مل ہی گیا
یہ میرا خون سر تیغ دار پر نہ سہی

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہو نا تجھے بھلانے میں

کسی کے دیکھنے والے کسی کو دیکھتے ہیں
اٹھائیں کس لئے زحمت نظر اٹھانے کی

صبح شب فراق ہوئی اور ابھی فراق
بیٹھا ہے اپنے گھر کو کئے رہ گزر تری

جام دل کی تہہ میں موج خوں سی اٹھ کر رہ گئی
اپنی قسمت میں کوئی چھلکا ہوا ساغر کہاں

اشاروں پر جنوں کے چل رہے ہیں تیرے زندانی
عجب بے ساختہ پن آج ہے شور سلاسل میں

کوئی ہوتا ہے دل سے دور کر لو صبر جانے دو
تمہیں آکر فراق اب بس رہو اس اجڑی منزل میں

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں چلتا اے دوست
یہ وہ معاملہ ہے جس میں یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں

دھیان آنکھ پھیرنے کے جو آئے ہوئے سے ہیں
یہ نقش بھی تو دل پہ بٹھائے ہوئے سے ہیں

مرہونِ احتمالِ نظر ہے حیاتِ عشق
رو کے ہوئے ستم بھی تو ڈھائے ہوئے سے ہیں

اہلِ وفا اب اور نکالیں فنا کی راہ
اہلِ ہوس بھی خود کو مٹائے ہوئے سے ہیں

اکثر سکوتِ شب میں اگر غور سے سنیں
آتی ہیں یہ صدائیں کہ ہم آئے ہوئے سے ہیں

حیاتِ عشق کے ہاتھوں ابھی حیات نہیں
غم و خوشی کے لئے آدمی کی ذات نہیں

خطا کے بعد ندامت بھی عشق کو نہ ملی
نگاہِ ناز یہ کہتی ہے کوئی بات نہیں

ہماری بت شکنی کے الگ فسانے ہیں
حدیثِ غزنوی و ذکرِ سومنات نہیں

اس آئینے سے نہ لڑ جائے تیری آنکھ کہیں
تو اپنے شیشۂ دل پر جلا تو کرتا ہے

شعورِ عشق کی تکمیل ہو چکی شاید
نہ بھولتا ہے کوئی اب نہ یاد آتا ہے

گر ہوا خاک تو غیرت وہ اکسیر ہے عشق
بھڑ دیتا ہے وہ ہڈی کو اگر خام رہا

اے سوزِ عشق اپنے مقدر کو کیا کہوں
جلنے کا غم کسے ہے مگر دل غلط جلا

جنت کے مکینوں کو بھی تم رشک میں لائے
اے اہلِ جہنم تمہیں جلنا نہیں آیا

شعرِ ناکمل تھا یہ جہاں اس دم تو
یوں نظر پڑا گویا سامنے کا مصرعہ تھا

فراق اسی کو تو کہتے ہیں عشق کے آثار
ہے دل میں درد بھی آنکھیں بھی کچھ گلابی ہیں

بس ایک آنچ محبت میں بھی ہے حسن میں بھی
نیاز و ناز ہیں جلنے کے مختلف انداز

فسردگیٔ محبت بھی راز ہے کوئی
جلا دے دونوں جہاں یہ ہے وہ آگ دل میں دبی

نصیبِ عشق کی خوبی یہ بیوفائیٔ حسن
وہ جسم قول و قسم ہے تمام کیا کہئے

درد و راحت جب ایک ہوئے کہ فراق
نکھر آئے تو جسم تھا اس کا

تو آئینے میں ذرا وصل کے کرشمے دیکھ
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

شبِ وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ ذرا
ترے جمال کی معصومیاں نکھر آئیں

اگرچہ خوب ہے دوشیزگی شباب کی بھی
اب آ گئے ہو تو آؤ تمہیں خراب کریں

کبھی دامانِ بادِ صبح بھی آلودہ ہوتا ہے
بچا لیتا ہے حسنِ نرم خو دوشیزگی اپنی

سرِ راہِ محبت آدمی کی سانس کیوں اکھڑے
نفس کی موج کو دیدے اداسکم رزی اپنی

اے دوست تجھکو چھیڑیں اس طرح وصل کی شب
دوشیزگی کو تیری دوشیزگی بنا دیں

پونچھ یہ جلتے جلتے آنسو
کس برتے پہ تتا پانی

ملتا ہے تو کہاں اب لیکن یہ رو رہا ہوں
پا کر بھی تجھ کو شاید اب خوش نہ ہو سکوں گا

تنہائیوں میں رہتے ہیں خوش کس طرح فراق
یہ راز کوئی اس کی طبیعت سے سیکھ لے

علم وعمل کے راز کھلے اہلِ عشق پر
سو مدرسوں سے بڑھ کے تیرے غم کا مدرسہ

فراق دیکھنے والوں کے کان بجتے ہیں
جہاں سے دیکھا اسے اک نرم بول بن گیا وہ جسم

بیانِ حالِ پریشاں میں تیرا نام آیا
کچھ اور بڑھ گئیں بے ربطیاں فسانے کی

شہود وغیب کا یہ اتحاد کیا کہنا
تمام جلوہ گری ہے بدن حجاب تمام

تو جا رہا ہے تو جا، الفراق، شرط یہ ہے
اگر ملیں تو نہ اک دوسرے کو پہچانیں

ہم دونوں کے راز کچھ باتوں میں کھل گئے مگر
عشق کو بھی خوشی نہ تھی حسن بھی شادماں نہ تھا

خوشی کے بھی تھے عناصر مزاج میں لیکن
بغیر غم کے توازن نہ ہو سکا پیدا

شعور و درک کو گہرا بنا دیا اس نے
ترا قصور کہ غم کو قنوطیت سمجھا

مزاجِ حسن سے ملتا ہے عشق کا بھی مزاج
وہ اعتدال و توازن کہاں سے پیدا ہو

یہ میں بھی جانتا ہوں، مگر تم نہ یہ کہو
"میرا مزاج اور تمہارا مزاج اور"

حسین بھی ہو تم اچھے آدمی بھی ہو گلہ یہ ہے
تمہیں اہلِ محبت سے محبت ہے مگر کم کم

زندگی اور واقعاتِ زندگی میں گر فراق
کچھ ہم آہنگی ہوئی پیدا تو غم ہی سے ہوئی

اک جانی ہوئی دنیا اک عالمِ حیرت ہے
ان دونوں کا مل جانا دنیائے محبت ہے

جو ہیں ہماری رگوں میں لرزاں جو ہیں ہمارے دلوں میں روشن
ہمارے کاموں میں بھی وہ شعلے دہکتے ہونگے لپکتے ہونگے

بھلا چکا ہوں تری یاد کو خیال یہ ہے
کچھ اور سوچ کے شاید اداس ہو جاؤں

میں تیرے آنے سے کچھ خوش بھی کچھ اداس بھی ہوں
نہ میرا جرم ہے اس میں نہ کچھ قصور ترا

میں دیر تک تجھے خود ہی نہ روکتا لیکن
تو جس طرح سے اٹھا ہے اسی کا شکوہ ہے

ترے خیال میں تیری جفا شریک نہیں
بہت بھلا کے تجھے کر سکا ہوں یاد اس طرح

کسی سے چھٹ کے یہ تحلیل رنج و غم کی فراغتی
رہی ہے دیر تک اب پھر اداس ہو جاؤ

اتنی تھوڑی دیر کو ملتے تھے جب تک تم رُکے
بس یہی سوچا کیا میں اب چلے جاؤ گے تم

ہم تم ملتے تھے لیکن ہو جاتے تھے جلد جدا
دیر تک اب رہتے ہیں جو ساتھ کچھ گھبرا سے جاتے ہیں

دل کو دُکھنے کے آئے اس گھڑی نئے انداز
مل کے تیرے جاتے وقت میں نے جب کہا "اچھا"

کچھ ایسا فرق نہیں دونوں حالتوں میں فراق
بہت اداس رہا ہوں تو شاد بھی ہو لوں

خطاب پھر نہ کیا تیری بے نیازی سے
تھکی تھکی سی وہ عرض وفا ہے یاد مجھے

ہزار طرح ترا حسن حسن ہو کے رہا
وہ ہم تھے عشق کو جو کر سکے نہ عشق کبھی

ترے ہجر میں بھی سنبھلتا نہ تھا
جو سوچیں تو کچھ ہی دنوں کی ہے بات

پوچھتے ہیں فائدہ کیا عشق سے
پوچھیے کیا فائدے سے فائدہ

اب کہاں عشق جا کے جان بچائے
موت کے منہ میں بھی پناہ نہیں

ہے یوں تو محبت کہیں پہلے سے زیادہ
کیوں تجھ سے جدا ہو کے بھی رونا نہیں آتا

ایک عمر کے بچھڑے آج ملے ہیں پھر نہ بچھڑنے کو
لیکن تھوڑی دیر کے بعد فرقت کا سا عالم ہے

ہر شخص چاہتا ہے کہ سچ ہو مری طرف
سچ کی طرف مگر کوئی ہوتا ہے شاذ بھی

ہے کامیابی وہ بدنصیبی کہ جس سے کم لوگ بچ سکے ہیں
مگر بہت بدنصیب ہیں جو انھیں بہت جلد ملتی ہے یہ

دنیا میں انھیں کیا کیا نہ ملا دولت، عزت، عشرت، ثروت
پیچیدہ طبیعت والوں کو اک سیدھی سادی خوشی نہ ملی

دنیا میں خوشی کی تلاش بجا برحق یہ خوشی کی کوشش بھی
انسان خوشی کیلئے لیکن پیدا نہ ہوا تھا دنیا میں

وہ جسم زسرتاپا خود عکس خود آئینہ
کچھ اشک کے قطروں میں موجیں ہیں تبسم کی

رنگ رخ کھلا اس طرح آنچ عشق کی کھا کر
پھول جس طرح نکھرے سو کھنے سے شبنم کے

زندگی میں ہر اک کو بس یہی تو حیرت ہے
عمر بھر نہ ہاتھ آئیں سامنے کی چیزیں بھی

نوٹ :۔ میں نے مندرجہ بالا سطور میں حضرت نیاز فتحپوری کی اس رائے کا ذکر کیا ہے کہ انھیں میری شاعری کی پختگی کی

طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے کیونکہ میں بجائے ایک اسلوب اور طرز کے کئی اسلوب اختیار کر لیتا ہوں لیکن حضرت نیاز نے اس کی دوسری وجہ بتائی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں۔ "فراقؔ کی شاعری پختگی سے قبل ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے" یعنی حلاوت کی بیش قیمت صفت جو میرے اشعار میں ہے اور زندگی و محبت پر لطیف و عمیق تبصرہ جس کا ذکر بھی میرے اشعار پر اظہار رائے کرتے وقت حضرت نیاز نے کیا ہے یہ وہ معنوی اور داخلی محاسن ہیں جنھوں نے مجھے اپنے اشعار میں پختگی پیدا کرنے کے باب میں کسی قدر لاپروا کر دیا ہے۔ پختگی سے مراد اشعار میں وہ انتخاب الفاظ کی و نشست الفاظ، بندش کی وہ چستی وہ برجستگی، انداز بیان کا بیک وقت نیا ہونا اور فطری ہونا یعنی لسانی لحاظ سے شعر کا مکمل ہونا ہے۔ میرے مشہور معاصرین میں پختگی کی یہ صفت یگانہ، حسرتؔ، اصغر مرحوم، جوشؔ ملیح آبادی فانیؔ بدایونی، آرزوؔ و ثاقبؔ لکھنوی، جگر مرادآبادی آزاد انصاری اور کچھ حضرات کے یہاں بھی نمایاں طور پر موجود رہے شاید ان حضرات کا تخیل اپنی آخری منزلیں طے کر چکا ہو یہ پوری بات کہتے ہیں میں ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو پوری طرح بیان نہ ہو سکیں مرے اشعار پر اگر آپ نظر ڈالیں گے تو بیان کا یہ رچاؤ یہ سجاوٹ اور نکھار بدلی ہوئی شکل میں نظر آئیں گے مرے اشعار کا حسن زبان و بیان پر حضور رہے۔ مرے پسندیدہ اشعار میں بھی کئی مقامات پر بجائے قدرت بیان کے عجز بیان کا احساس ہوگا معانی الفاظ پر حاوی نظر آئیں گے شعر کچھ کھویا کھویا سا نظر آئیگا۔ اکثر یہ احساس ہوگا کہ پوری بات یا تو میں کہہ نہیں سکا یا بات ہی ایسی تھی کہ پوری طرح کہی نہ جاسکے کبھی کبھی تو یہ معلوم ہوگا کہ مرے الفاظ معنی کی طرف گونگے اشارے ہیں۔ جہاں معانی میں ماورائیت اور معصومی کے ساتھ انتہا کی نزاکت ہوتی ہے اور وجدان پر ناقابل اظہار حیرت طاری ہو جاتی ہے وہاں معانی اور الفاظ کا ربط نازک سے نازک تر ہو جاتا ہے خود الفاظ میں ایک گم شدگی آنے لگتی ہے حضرت نیاز کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ میری شاعری میں پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ جیسے پکنے سے پہلے ہی کوئی پھل بہت رسیلا اور میٹھا ہو جائے پھل کا رنگ روپ ابھی نکھر کر پختہ نہ ہوا ہو اور اندر سے وہ رسمسا اٹھے مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری شاعری میں رنگ روپ یعنی بیان کی پختگی کا جتنا امکان ہے وہ پوری طرح ابھی اجاگر نہیں ہوا لیکن میں اس طرف سے لاپروا نہیں ہوں میری شاعری ایک داخلی لگاؤ رکھتی ہے اور وہ اندر سے پختہ اور پختہ تر ہونے والی چیز ہے۔ میرا یہ خیال ہے کہ خارجی پختگی مرے اشعار کی داخلی پختگی کے ساتھ پیدا ہوتی جائے گی داخلی پختگی دیر طلب اور دقت طلب چیز ہے بلکہ ایک بہت دور رس سلسلہ ہے۔ اس کی کوئی منزل آخری منزل نہیں ہے اسی سے میرے الفاظ بھی بجائے مستقل سنگ میل کے غبار راہ معلوم ہوتے ہیں یعنی ذرا ڈانواڈول میری شاعری میں بیان کی پختگی شاید تدریجی طور پر بہت آہستہ آہستہ آرہی ہے اتنا آہستہ کہ یہ سوچ کر حضرت نیاز کی طرح میں بھی ڈر جاتا ہوں کہ یہ پختگی کبھی آبھی چکے گی لیکن مرے خوف سے امید کے عناصر بالکل غائب نہیں

(رگھوپتی سہائے صاحب فراقؔ گورکھپوری)

تجلیات

نہ پوچھ گردش و نیرنگی جہاں کی خبر
نہیں ہے مجھ کو تو اپنے بھی جسم وجاں کی خبر

اسیر عشق کی پوچھو نہ خود فراموشی
کچھ آشیاں کی خبر ہے نہ گلستاں کی خبر

عجیب مستی جاوید دل پہ طاری ہے
بہار کی ہے خبر کچھ نہ کچھ خزاں کی خبر

یہی دعا ہے الٰہی! ہجوم مستی میں
مری جبیں کو رہے تیرے آستاں کی خبر

وہ ہو رہے ہیں مکدر ریاض عشرت سے
جنھیں ہوئی ہے مرے درد جاوداں کی خبر

ہے کچھ تو بات خراب مئے محبت میں
کہ لا رہا ہے وہ یوں سات آسماں کی خبر

میں اپنی رو میں ہوں دیوانہ وار گرم سفر
نہ کارواں کی نہ ہے گرد کارواں کی خبر

زبان شوق و محبت ہے گریۂ خونیں
نہیں ہے اس کو گل افشانی بیاں کی خبر

اثر کے دل میں تری آرزو رہی تازیست
ہوئی تجھے بھی کچھ اس کے غم نہاں کی خبر!

(اثر صہبائی)

جامِ صہبائی

(۱)

اے شوکتِ قیصری سے ڈرنے والو! شاہوں کے حضور سجدے کرنے والو!
اللہ کو چھوڑ کر ملا کیا تم کو اے دن میں ہزار بار مرنے والو!

(۲)

اے کاش وہ جانِ آرزو مل جائے اے کاش وہ خلد رنگ دل مل جائے!
اس مستی و بے خودی پہ سو ہوش نثار جس مستی و بے خودی میں تو مل جائے!

(۳)

اک جلوۂ نور ہے محبت اے دوست! اک خندۂ حور ہے محبت اے دوست!
کھل جاتے ہیں جس سے دو جہاں کے اسرار وہ کیف و سرور ہے محبت اے دوست!

(۴)

انوار ہیں سرخوشی میں جانے کیا کیا! اسرار ہیں عاشقی میں جانے کیا کیا!
مجھ سے مرے اشعار کی تفسیر نہ پوچھ کہہ جاتا ہوں بیخودی میں جانے کیا کیا!

اثر صہبائی

"اپنی اصلاح"

اسلامی تقویم

اسلامی تقویم کی ابتدا سے ہم چاند کے نکلنے کے محتاج رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اس کے سوا کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا۔ چاند کی مرضی کے ہم کیسے کیسے محتاج رہے ہیں۔ انتیس اور تیس کے جھگڑوں پر آپس میں نفاق بھی ہوا ہے ناچاقیاں بھی ہوئی ہیں اور اطمینان تو ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ چاند کچھ شرمیلا رہتا ہے طرح طرح کے انداز دکھاتا ہے کہیں نقاب سحاب میں ہے تو کہیں سرے سے بالکل غائب۔ ایک جگہ ظاہر ہوتا ہے دوسری جگہ بالکل نہیں۔ غرضکہ اس کا تلون بڑی مصیبتوں، پریشانیوں اور دقتوں کا باعث رہا ہے۔ اب تک تو خیر جس طرح اس کی نازبرداری کرتے رہے اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس کے پابند رہے لیکن اب جبکہ علم ہیئت اس قدر ترقی پذیر ہو چکا ہے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اب بھی اس کے پابند رہیں اور اس کے محتاج رہ کر اس کے منہ دیکھی باتیں کریں۔

علم ہیئت کی رو سے ہر قمری مہینہ تقریباً ۲۹½ دن کا ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کہیں چاند ابر غلیظ کی وجہ سے نظر نہ آئے یا کہیں اس قدر باریک ہو کہ دکھائی نہ دے۔ چونکہ اس کی گردش زمین کے گرد محض ۲۷⅓ دن کی ہوتی ہے۔ اس لئے گڑبڑ یہ ہوتی ہے کہ کسی خطۂ زمین میں تو یہ انتیسویں تاریخ کو نظر آ جاتا ہے اور کہیں تیس کو پورا قمری سال ۳۵۴ دن کا ہوتا ہے اس کے معنی یہ کہ اگر ہم ایک مہینہ انتیس اور ایک تیس کا مقرر کرلیں تو چاند دیکھنے کی پابندی سے نجات پا سکتے ہیں اور اپنے حساب میں زیادہ صحیح رہ سکتے ہیں۔ میں نے جو یہ اعداد پیش کئے ہیں اس میں صحیح گھنٹوں کا حساب چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن جب اس کا "باقاعدہ" انتظام کیا جائے تو ان کو اس میں شامل کرنا ضروری ہے اور اس حساب کو اور بھی باقاعدہ کرنا ہوگا۔

لیکن یہ ایک آدمی یا کسی ایک ادارہ کے بس کی چیز نہیں ہے۔ ضرورت ہے مسلمان ہیئت دانوں کی ایک باقاعدہ کمیٹی اس پر غور و خوض کرنے کے لئے بنائی جائے جو اس مسئلہ پر اپنی تحقیقات ملک اور علما کے سامنے پیش کرے۔ میرے خیال میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں یہ کام بہتر ہو سکتا ہے وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نمائندہ

یونیورسٹی بھی ساتھ ہے جہاں علم جغرافیہ کے کافی ماہرین مجتمع ہیں۔ اس لئے ان کو اس مشکل کو حل کرنے اور اس مسئلہ کو سلجھانے میں آسانی ہوگی۔ یا پھر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اس چیز کو اپنے پروگرام میں لا سکتی ہے۔ دراصل سب سے زیادہ حق مسلم لیگ کو ہے۔ اگر وہ سیاسی بیداری کے ساتھ ساتھ اس قسم کے اصلاحی پروگرام کو اپنے سپرد کرلے تو مسلمانوں کو فائدہ عظیم ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب محض اس فہرست کو گنانے سے یہ ہے کہ ایسا کام جب تک باقاعدہ اور ذمہ داری کے ساتھ نہ کیا جائے نتیجہ مقبول عام اور اچھا نہیں ہو سکتا۔

صرف ہندوستان ہی کے اندر نہیں بلکہ تقویم کا معاملہ تو تمام ممالک اسلامیہ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے جو کمیٹی یہاں ہندوستان میں بنے وہ دیگر ممالک اسلامیہ کو بھی اپنے اس مقصد و کوشش سے باخبر رکھے نیز ان کی رائیں بھی اس مسئلہ پر طلب کرے۔ اگر تمام ممالک اسلامیہ تقویم کے اس مسئلہ پر توجہ کریں اور اسے درست کرنا چاہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ مسئلہ جلد از جلد طے نہ ہو جائے اور ہمیشہ کے لئے آئندہ نسلیں اس پر عمل نہ کیا کریں۔

سنا ہے حیدرآباد میں اس قسم کی کوشش ہو رہی ہے اور وہ اس طرح کہ وہاں سے ہر صوبہ کو ایک ایک آدمی بھیجا جائیگا تاکہ وہ بذریعہ ٹرنک ٹیلیفون حیدرآباد کو چاند کی رویت یا عدم رویت کے متعلق مطلع کر سکے میرے خیال میں یہ چیز کامیاب نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ یقینی ہے کہ چاند اپنی مخصوص گردش کی وجہ سے ہر جگہ انتیس کو دکھائی نہیں دیتا اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ ہر جگہ مطلع صاف ہو ایسی صورت میں کیا کیا جائے گا اگر چہ صوبوں میں چاند دکھائی دیا اور بعض میں نہیں، ان دقتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرے خیال میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو میں نے اوپر پیش کیا ہے اور حیدرآباد چونکہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے نیز اس کا اثر ہندوستان کے باہر بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے بہت موزوں ہوگا اگر وہ ہیئت دانوں کو جمع کر کے ان سے اس مسئلہ پر ایک رپورٹ مرتب کرائے اور اس طرح ایک اسلامی تقویم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بن جائے۔

امید ہے کہ علما بھی اس مسئلہ پر تحقیق سے نظر ڈالیں گے اور ایک اسلامی تقویم کی تعمیر میں سب سے زیادہ عملی قدم اٹھائیں گے اگر انھوں نے اس میں سرگرمی دکھائی تو مجھے قطعی یقین ہے کہ یہ کام جلد تر اور بوجہ احسن انجام پائے گا کیونکہ وہ اتنے بڑے اہم اور اتنے عالمگیر مسئلے کو زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ناسمجھ مذہبی معترضین کو دندان شکن جواب بھی دے سکتے ہیں۔

مصطفےٰ علی صاحب بیرسٹرایٹ لا۔

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

شہنشاہیت :- مترجمہ جناب مظفر خاں صاحب ظفر یوسفی، مکتبہ برہان، نئی دہلی صفحات ۲۰۰، سائز ۲۰×۳۰/۱۶
قیمت ۱۲/ کاغذ کتابت اور طباعت بہت اچھی۔

یہ کتاب مشہور ہندی کتاب "سنسار کی راج نیتی میں سامراجواد کا ننگا ناچ" کا ترجمہ ہے جو ۱۹۳۸ء میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکی ہے آج کل اس قسم کی کتابوں کی اردو میں بھی بہت ضرورت ہے بلکہ تعجب ہے کہ ابھی تک کیوں شائع نہیں ہوئیں، شاید جنگ کے ختم ہو جانے کا ناشرین انتظار کر رہے ہوں تاکہ اس قسم کے مسائل پر مواد مکمل ہو کر سامنے آ جائے۔ حالانکہ موجودہ جنگ کے حالات کو دیکھتے ہوئے سرمایہ داری، شہنشاہیت، اشتراکیت اور بحر روم کی پالیسی اور اسی قسم کے دیگر سیاسی مضامین پر کتابوں کا شائع کرنا ملک کی معلومات کو بدرجہ اتم اور بڑے مناسب وقت پر بڑھانا ہوتا۔ مکتبہ برہان نے بہت اچھا کیا کہ ایسے موقع پر ایسی دلچسپ اور بامعلومات کتاب کا ترجمہ شائع کیا۔

سرمایہ داری اور شہنشاہیت کس طرح سے ملک، مذہب، تمدن و تہذیب اور انسانیت کی آڑ میں اپنا فائدہ شروع سے کرتی رہی ہے یہ اب کوئی مخفی راز نہیں رہا ہے اس نے ملک، تہذیب اور انسانیت کو فائدہ بھی پہونچایا ہے لیکن یہ فائدہ، فائدہ پہونچانے کی خاطر نہیں پہونچایا بلکہ ضمناً حاصل ہو گیا۔ دراصل مقصد کسی ایک کی ذاتی منفعت تھا یا چند مشترکہ سرمایہ داروں کا۔ زیر نظر کتاب نے اس قسم کی مکارانہ چالوں کا پول کھولا ہے۔ شہنشاہیت کیا ہے، صنعتی انقلاب اور توسیع شہنشاہیت، جس میں تمام ممالک کی شہنشاہی ذہنیت کو آشکارا کیا ہے، شہنشاہیت کے اسٹیج کے کھلاڑی، سنہ ۱۹۱۴ء، ۱۸ء کی جنگ عظیم، دور اشتراکیت، فاتحین کی فریب کاریاں، فسطائیت اور نازیت کا دور اور سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۸ء تک کے خاص خاص حالات اس کے خاص ابواب ہیں۔

باوجودیکہ سرمایہ داری کی بہت کچھ مخالفت میں کہا جا سکتا ہے لیکن کسی علمی مسئلہ کو جذباتی نقطہ نظر سے دیکھنا عصبیت کا الزام وارد کرا دیتا ہے محض موافق واقعات کا انتخاب کر لینا اور ان کو جذباتی اسلوب بیان سے پیش کرنا۔ ایک اچھا جرنلزم تو کہلایا جا سکتا ہے لیکن اچھی تحقیق نہیں۔ زیر نظر کتاب میں صرف یہی کمزوری ہے واقعات کا احاطہ خاصا کیا ہے لیکن ان میں علمی شان نظر نہیں آتی محض ایک کامیاب انتخاب کہا جا سکتا ہے۔ مزید یہ کہ موجودہ جنگ اور اس کے مقاصد کو بھی اگر مترجم صاحب شامل کر لیتے تو کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا اور وقت کی چیز ہو جاتی۔ پھر بھی ان معمولی کمیوں کے باوجود کتاب واقعی دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے

یورپ کی مہابھارت:- از مسٹر حامد علی صاحب ایم۔ اے۔ اُردو کلب جامع مسجد دہلی۔ صفحات ۱۰۷ سائز ۱۸×۲۲/۸ قیمت ۸؍ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

حامد علی صاحب نے خواجہ حسن نظامی صاحب کے ایما پر یہ مفید کتاب موجودہ جنگ کے متعلق لکھی ہے۔ شروع جنگ سے جولائی سنہ ۱۹۴۰ء تک کے واقعات کا اچھا احاطہ کیا ہے لیکن زیادہ تر جن کتابوں اور رسالوں سے انھوں نے مدد لی ہے وہ صرف تصویر کا ایک رخ دکھا سکتے تھے صحیح تنقیدی فیصلہ دونوں کے نقطۂ آرا پر بے تعصبانہ دلائل کے بعد آنا چاہئے تھا ورنہ ممکن ہے کہ یہ کتاب مدلل مداحی کے زمرہ میں نہ آ جائے ویسے واقعات کی فہرست اچھی دی ہے۔

ترقی کی پہلی سیڑھی:- از مسٹر ایس۔ اے خالق صاحب دہلوی، اُردو کلب جامع مسجد دہلی صفحات ۱۴۳ کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی۔

یہ کتاب بھی خواجہ حسن نظامی صاحب نے طبع کرائی ہے۔ خالق صاحب دہلوی ایک اچھے جرنلسٹ ہیں دلچسپ واقعات یا قصوں سے یہ اپنا ہر مطلب زیادہ بامزہ بنا دیتے ہیں مقصد اس کتاب کا تجارت کو مقبول بنانا اور تجارت کے گر بتانا ہے۔ خالق صاحب اس وادی کے بڑے مسافر رہ چکے ہیں اور ان کو اچھے اچھے اصول یاد ہیں امید ہے کہ یہ کتاب لوگوں کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ صفحہ ۸۰ پر اگر خواجہ صاحب کے قرآن شریف کا اشتہار نہ ہوتا تو اچھا تھا۔

تعلیمات اقبال:- مرتبہ یوسف خاں صاحب سلیم چشتی، شائع کردہ دفتر اقبال اکیڈمی ظفر منزل تاج پورہ لاہور، قیمت عہ، صفحات ۱۳۶

یہ سلسلہ مطبوعات اقبال اکیڈمی کی تیسری کتاب ہے۔ اس میں اقبال کی تعلیمات کا نچوڑ اور ان کی اسلامی خدمات کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے شروع میں مولانا عبدالمجید صاحب سالک مدیر روزنامۂ انقلاب لاہور کا پیش لفظ ہے۔ اس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال ان نفوس قدسیہ میں سے تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے موجودہ دور میں تبلیغ پیغام مصطفویؐ کے لیے چن لیا تھا۔ مولانا نے اقبال کی اسلامی خدمات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ہمیں سلیم صاحب کی اس کتاب میں نظر آتی ہے۔ پیش لفظ میں اخباری یا صحافتی اردو کا رنگ ذرا زیادہ ہو گیا ہے۔ تعقل و تعشق وساوس، تمسک، حدود و اعصار، شکست و ریخت، برق و دخان وغیرہ کو اور آسان بنا کر بھی لکھا جا سکتا تھا۔

سلیم صاحب نے اقبال کے کلام کا بڑے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے علامہ مرحوم کی صحبت سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے۔ وہ اقبال کو اپنا مرشد کہتے ہیں۔ اقبال کی تعلیم کو عام کرنا انھوں نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ان کا ارادہ گیارہ چھوٹی چھوٹی کتابوں کے ذریعہ سے اس کام کو پورا کرنے کا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔

مقدمہ کے تین حصے ہیں۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ خودی کا مسئلہ ہر قوم و ملک کے لئے اہم ہے اور ہر قوم نے اپنی صلاحیت و فطرت کے مطابق اس کا حل کیا ہے۔ اقبال چونکہ آب و رنگ والے شاعر نہ تھے بلکہ وہ اندازِ آفاقی رکھتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اس مسئلہ پر خاص طور سے توجہ کی، اور اس کو اپنے فلسفۂ حیات کا مرکز قرار دیا۔ مردہ قوم میں جان ڈالنے کی یہی صورت ان کو نظر آئی۔

آغاز سخن، مقام اقبال کی تشریح سے ہوتا ہے۔ اس میں بہت زیادہ زور اس بات پر دیا گیا ہے کہ اقبال صرف شاعر نہیں تھے۔ گویا صرف شاعر ہونا اقبال کی ذلت کا باعث ہے حالانکہ اقبال نے خود اپنے شاعر ہونے پر فخر کیا ہے اور ان کے حیرت انگیز اثر کا باعث ہی "آب و رنگ شاعری" ہے

ہاں وہ آب و رنگ شاعری کو سب کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے ایک خاص کام لینا چاہتے تھے۔

اقبال کے پیغام کو سلیم صاحب نے چار عنوانوں میں تقسیم کیا ہے۔ دعوت اسلام، اصلاح عقائد تنبیہات اور ہدایات، ان میں سے ہر عنوان کے تحت میں کئی مباحث آ گئے ہیں۔ اگرچہ ہر موضوع پر بحث چند اشعار اور چند تمہیدی کلمات سے آگے نہیں بڑھتی۔ غالباً ایک چھوٹی سی کتاب میں اس سے زیادہ تفصیل ممکن بھی نہ تھی

کتاب کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں ہدایات کے عنوان سے اقبال کے بہت سے اچھے اشعار درج کر دئے گئے ہیں۔

سلیم صاحب کی اقبال سے دلچسپی عقیدت کی حد تک پہونچ گئی ہے۔ اس سے کتاب کی ادبی حیثیت کم ہو جاتی ہے۔ دیسے بھی یہ دور اقبال کی پرستش کا دور ہے۔ ان پر صحیح تنقید کا وقت بعد میں آئے گا

(ص، ۲۰۲)

شعر العرب:۔ مولفہ حکیم محمد ہبۃ اللہ صاحب، ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد دکن، صفحات ۲۲۳ قیمت ۶ر سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی۔

یہ چھوٹا سا رسالہ ادارۂ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد نے شائع کیا ہے واضح ہے کہ اس کا مقصد اس موضوع پر کوئی بسیط کتاب لکھنا نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو عربی شعر سے روشناس کرانا ہے

شروع میں مطلق شاعری پر مختصر اور سادہ الفاظ میں تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کی تاریخ اور خصوصیات بتانے کی کوشش کی گئی ہے اس کے بعد لغت عربیہ پر مختصر نوٹ ہے بعد میں عربی شاعری کے مختلف ادوار قائم کئے گئے ہیں۔ یعنی دورِ جاہلیت، دورِ اسلامی، دورِ عباسی، دور حکومت ترکیہ اور نیا دور بعدہٗ غزل، مخریہ کلام مدح، حکیمانہ کلام اور نیچرل شاعری کا بھی مختصراً تذکرہ کیا گیا ہے۔

لیکن یہ موضوع تو ایسا ہے کہ بغیر بسیط کتاب کے اس سے قطعی تسکین نہیں ہو سکتی۔ ہماری رائے میں ہبۃ اللہ صاحب کو اس موضوع پر سیر حاصل تالیف پیش کرنی چاہئے۔ اردو میں اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

شذرات

منظر عالم صاحب سکریٹری انجمن اسلام ریاست گوالیار نے ایک اطلاع نامہ ہمارے پاس بھیجا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مہاراجہ کے اردو کے موافق ہونے کے وہاں کے حکام میں اردو کے خلاف تنی عصبیت پیدا ہوگئی ہے کہ تقریباً ہر محکمہ میں اردو کے بجائے سنسکرت آمیز ہندی رائج کر رہے ہیں۔

گوالیار ان مشہور ریاستوں میں سے رہی ہے جس نے ہندو مسلم تعلقات ہی بہترین نہیں رکھے ہیں بلکہ فارسی اور اردو کی پرانے بھی خواہ اور مربی رہی ہے گوالیار میں اردو زبان ایسی زبان ہے جو نہ صرف ہندوؤں مرہٹوں اور مسلمان مردوں کی مادری زبان رہی ہے بلکہ ان ہر سہ مذاہب کی عورتیں اور لڑکیاں بھی اردو کیا معمولی فارسی سے بھی واقف رہی ہیں ایسی حالت میں وہاں سنسکرت آمیز ہندی رائج کر دینا مصلحت اندیشی نہیں۔

ممکن ہے کہ یہ مہاسبھائی ذہنیت زمانہ آئندہ میں چند اور ریاستوں کو بھی اپنا ہمنوا کر لے کیونکہ شخصی ریاستیں جمہوریت کے بجائے عصبیت کا زیادہ لحاظ رکھتی ہیں خصوصاً موجودہ ہندوستانی ریاستیں اپنے وزیروں پر زیادہ اعتماد رکھتی ہیں لیکن یہ واضح ہے کہ کوئی زبان محض سیاسی طاقت پر نہیں بنا کرتی اور آج کل کے معاشی دور میں تو خصوصاً یہ چیز اور بھی زیادہ ناممکن ہو جاتی ہے۔ سیاسی طاقت تو بطرف معاشیات تو ذہنیت سے بھی آج کل بالاتر ہوتی جا رہی ہے ظاہر ہے کہ ایسے دور میں نہ صرف ہندوستان ہی جیسے مختلف النوع اور وسیع ملک میں ایک مخلوط زبان ہو جائیگی جسے الفاظ دیگر اردو کہئے بلکہ امید یہ بھی ہے کہ تمام دنیا کی ایک آفاقی زبان زمانہ آئندہ میں ضرور پیدا ہو جائے گی جسے ہم اردو تو ابھی نہیں کہہ سکتے ہیں لیکن وہ ایک مخلوط زبان یقینی ہوگی مختصر یہ کہ موجودہ عہد ایک تجارتی اور معاشیاتی عہد ہے اس میں محض سیاسی یا اکثریت کے زعم میں آکر ایک مصنوعی اور کرخت اور کریہہ الصوت زبان بنا کر رائج کرنے یا چند دیہاتی بولیوں کو رواج دینے سے کسی ملک کی زبان نہیں بدل سکتی جبتک ہندو مسلمان ہندوستان میں قائم ہیں ایک کو دوسرے کی مدد کی ہمیشہ ضرورت رہے گی یہ باہم میل ملاپ معاشیاتی اور تجارتی ضرورتوں کے ماتحت سیاسی ضرورتوں سے ہمیشہ بلند اور زیادہ اہم رہے گا مصنوعی تو دراصل یہ سنسکرت آمیز زبان ہے جسے یہ مہاسبھائی پیدا کر کے رائج کر رہے ہیں یہ ایک فعل عبث ہے جس کی بے اثری کا امید ہے انھیں بہت جلد احساس ہو جائے گا اور جیسا کہ اکثر جگہ انھیں اب بھی ہو رہا ہے۔

اسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائینس آغا خانصاحب　　عالیجناب ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ............ ساٹھ لاکھ روپے　۶۰۰۰۰۰۰

جاری شدہ سرمایہ............ پچیس لاکھ روپے　۲۵۰۰۰۰۰

ادا شدہ سرمایہ............ دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ روپے

اپنے تمام بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل ورسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کی خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے۔ وہاں کارخانے کی اشیاء کے مطابق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے کہ آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے۔) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ، لکھنؤ

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانب داری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا مسلک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کیساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی و دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد (دکن) سے

دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صہ فی پرچہ ۸ر

مقدمہ "زندگانیٔ محمد"

عہد حاضر کی ایک بے مثال کتاب

"زندگانی محمد" علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے اس کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہوگئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں صرف تین ماہ کے اندر اندر ختم ہوگئیں پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے زندگانی محمد کے مقدمہ کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہل مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دیئے گئے ہیں اسکے متعلق مشاہیر جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مقدمہ زندگانی محمد ایک قابل قدر تالیف ہے (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ زندگانی محمد کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے لبریز ہے میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے مصنف کی کوششیں مستحق اجر و قابل داد ہیں (مولانا عبدالماجد دریابادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (مقدمہ زندگانی محمد) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے (طلوع اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہل مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (حمایت اسلام)

۱۰۔ ہندوستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہی جو اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔ (پیام نسواں)

لکھائی چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا ضخامت ۱۲۸ صفحے ۱۲؍ کے ٹکٹوں کی صورت میں یا بذریعہ منی آرڈر بھیج کر ایک نسخہ طلب کیجئے۔

ملنے کا پتہ:۔ دفتر امت مسلمہ امرتسر (پنجاب)

اردو میں بالکل نئی چیز

جنگ آلودہ دنیا

معہ اہم نقشے و چارٹ

مرتبہ پنڈت ونگیشن نرائن تیواری

موجودہ جنگ کب اور کیسے شروع ہوئی ؟ کس طرح یہ بڑھی اور پھیل گئی ؟ کون کون سے ملک اس جنگ میں کس صورت سے حصہ لے رہے ہیں ؟ کس ملک کے پاس کتنی بحری، بری اور ہوائی طاقت ہے اور دنیا کے تمام ممالک مالی تعلیمی جغرافیائی حالات کے متعلق اگر آپ صحیح معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں جنگ کے متعلق اہم واقعات درج ہیں دوسرے حصے میں نقشوں اور چارٹوں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل کے ساتھ دنیا کے مختلف ممالک کا ذکر ہے جن کے مطالعے سے بین الاقوامی سیاسی صورت حال بڑی آسانی سے ذہن نشین ہوجاتی ہے۔ تیسرے حصے میں مختلف ممالک کی فوجی قوت، رقبہ اور آبادی، درآمد و برآمد۔ کپاس، سونا، پٹرول کی پیداوار اور سکول وغیرہ کے متعلق مفید باتیں درج ہیں جنگ کے زمانے میں جن جن باتوں کا جاننا ضروری ہے۔ وہ سب اس میں بتادی گئی ہیں ہر شخص کے لئے خواہ وہ متعلم ہو یا معلم۔ اخبار بیں ہو یا اخبار نویس۔ اس کتاب کی ایک جلد اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اردو میں آج تک ایسی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ کتابت طباعت اعلیٰ۔ سرورق دیدہ زیب۔

باوجود ان سب خوبیوں کے قیمت صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

آج ہی پتہ ذیل سے طلب فرمائیے

منیجر (بکڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

اگر آنکھیں کمزور ہیں

آنکھیں تھوڑی دیر کے بعد تھک جاتی ہوں۔ ان کے سامنے اندھیرا آجاتا ہو، حروف دھندلے نظر آتے ہوں، پانی بہتا ہو، سر میں خفیف درد کی شکایت ہو ابتدائے نزول الماء یا موتیا ہو تو مدنی دواخانہ کا خصوصیت کے ساتھ تیار کردہ کحل الجواہر مشکی فوراً استعمال کرنا شروع کر دیجئے۔ دو چار دن کے بعد ہی آپ کو اس سرمہ کی خصوصیات کا اندازہ ہو جائے گا۔ قیمت فی تولہ چھ روپئے علاوہ محصولڈاک۔

دانتوں کی بیماریوں سے بچئے

اگر موڑوں سے پیپ نکلتی ہے　　　اگر موڑھے متورم ہو جاتے ہیں

اگر منہ سے بدبو آتی ہے　　　اگر دانتوں سے خون نکلتا ہے

اگر دانتوں پر سردی اور ترشی کا اثر ہوتا ہے۔　　　اگر منہ سے بدمزہ رطوبت جاری رہتی ہو

اگر دانت گندے اور میلے رہتے ہیں تو

فوراً پالیوری استعمال کرنا شروع کر دیجئے ورنہ معدہ خراب ہو کر تندرستی بالکل خراب ہو جائے گی۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ، علاوہ محصولڈاک پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

شربت اطفال

شربت اطفال لطیف اور خوش ذائقہ ہونے کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بیحد مفید ہے۔ نمونیہ یعنی ڈبیا یا پسلی چل جانا۔ موتی جھرہ، خسرہ، چیچک، قبض دستوں کا آنا، آنکھیں دکھنا۔ دانتوں کے نکلنے میں تکلیف ہونا ان سب امراض کے لئے شربت اطفال اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر مدنی دواخانہ۔ مدینہ منزل، بجنور

حلوائے مغزی

ضعف دماغ ایسا مرض ہے جو ابتدا میں تو مریض کو کسی خاص تکلیف میں مبتلا نہیں کرتا لیکن رفتہ رفتہ اسکے اثرات زندگی دوبھر کردیتے ہیں۔ یہ مرض بالعموم تعلیمیافتہ طبقہ کو اور بالخصوص دماغی محنت کرنے والوں کو لاحق ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ اعضاء میں کمزوری اور بینائی میں کمی ہوجاتی ہے۔ زیادہ دیر تک لکھنے پڑھنے، سوچنے سمجھنے اور دھوپ میں رہنے سے دماغ چکرانے لگتا ہے۔ اگر اس مرض کے مریض خواہ وہ ابتدائی اسٹیج پر ہوں یا مذکورہ بالا تمام خرابیوں کا شکار ہوچکے ہوں "مغزی" کا استعمال کریں گے تو اس سلسلے کی ہر شکایت دور ہوجائیگی۔ مغزی دماغ کے لئے ایک ایسا ٹانک ہے جو ہر حال میں انتہا مفید ثابت ہوتا ہے اور اس کے استعمال سے اعضاء رئیسہ کو بھی کافی تقویت پہنچتی ہے۔ قیمت فی سیر صہ روپئے علاوہ محصولڈاک۔ خوراک ایک تولہ

اکسیر معدہ

فی زمانہ پچانوے فیصدی اشخاص ریاحی امراض میں مبتلا ہیں خصوصاً وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جو دماغی کام بھی کرتا ہو اور مرغنیات زیادہ استعمال کرتا ہو، ان لوگوں پر یہ اکسیر تناوے فیصدی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ چنانچہ۔ درد معدہ ریاحی، درد گردہ ریاحی، بواسیر ریاحی چند یوم کے استعمال سے زائل ہوجاتی ہے۔ قیمت فی شیشی ۲۴ قرص آٹھ آنے ۸؍، علاوہ محصولڈاک۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

آب شفا

یہ آب شفا بے شمار امراض کے لئے نہایت زود اثر اور قابل اعتماد دوا ہے۔ اس کی ایک شیشی ہر انسان کو سفر حضر میں اپنے پاس رکھنا گویا ایک طبیب یا ڈاکٹر کو ساتھ رکھنا ہے۔ قیمت فی شیشی آٹھ آنے ۸؍، علاوہ محصولڈاک ایک درجن کے خریدار کو محصولڈاک معاف۔ پرچہ ترکیب استعمال ہمراہ پیکٹ ارسال ہوگا۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر مدنی دواخانہ۔ مدینہ منزل بجنور (یوپی)

قابل دید کتابیں

شرارے ڈاکٹر آہ سیتاپوری کے ۱۱ افسانوں کا مجموعہ ان میں آپ کو روس کے انقلابی افسانہ نگار میکسم گورکی کے انداز کی جھلک نظر آئے گی۔ یہ سیاسی، معاشرتی اور ذہنی انقلاب پیدا کرنے کا پیام دے رہے ہیں۔ قیمت ۱۲

نئے افسانے مصنفہ سید حسن ریاض صاحب۔ سابق ایڈیٹر ہمت و نوید۔ یہ افسانے ہندوستانی سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے معاملات، معمولات، اعمال اور جذبات کی تصویریں ہیں۔ قیمت ۱۲

درد و انبساط مولوی عبدالودود درد بریلوی کے کلام کا مجموعہ۔ قسام ازل نے مولانا کے دل میں درد آنکھوں میں نم اور بیاں میں موزونیت عطا کی تھی۔ اپنی طبیعت کی افتاد اور ذوق شاعری کے اعتبار سے خیام کے سچے پرستاروں میں سے تھے۔ فلسفہ خیام کی تشریح بھی اپنے مخصوص انداز میں کی ہے۔ پھولوں، پھلوں، پہاڑوں کی مناظر، آبشاروں اور کہساروں وغیرہ پر معنی خیز نظمیں کہی ہیں۔ سیاست پر بھی چند نظمیں آپ کو ملیں گی۔ قیمت ۱۲

فرہنگ عامرہ اس میں لغات کے حروف تہجی کی ترتیب۔ اوائے تلفظ کا التزام، اعراب و علائم ترکیبی سے فارسی کی خلاف قیاسی اور عربی کی مستعمل جمع۔ کثیر الاستعمال فارسی مصادر، مردہ اور بے رواج چیزوں کے نام، مخرب اخلاق استعارات، اشیاء کی ماہیت اور معانی کی نئی تحقیقاتوں وغیرہ مکمل طور پر درج ہیں۔ قیمت - ۶

آسمانی گھڑی سورج اور چاند سے وقت معلوم کرنے کے طریقے بہت لوگ جانتے ہیں مگر تاروں سے وقت کی شناخت سے عموماً لوگ ناواقف ہیں۔ اس میں ۳۲ سالہ تجربہ کی بنا پر قطب تارے سے وقت کی شناخت پیش کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲

تاریخ الہ آباد یہ ۳۳۲ صفحے کی کتاب ہے جس میں مضامین و مقالات کے ساتھ ساتھ تصویروں اور نقشوں سے الہ آباد کی چپے چپے کی تاریخ درج کی گئی ہے۔ قابل دید ہے۔ قیمت مجلد للعمر

مکاتب مہدی مہدی حسن افادی الاقتصادی کے وہ خطوط جو انھوں نے اپنے دوستوں کے نام لکھے۔ مرتبہ مہدی بیگم۔ قیمت ؏

ترکان احرار یہ نہ صرف ترکوں کی داستان حریت ہے بلکہ اس میں جرأت ایثار، صداقت عزم بلند جذبۂ وطن کی غیر فانی واقعات سبق آموز ذخیرہ پیش کیا گیا ہے یہ مسلمانان ہند کے لئے بے شمار عبرتوں اور بصیرتوں کا مرقع ہے۔"

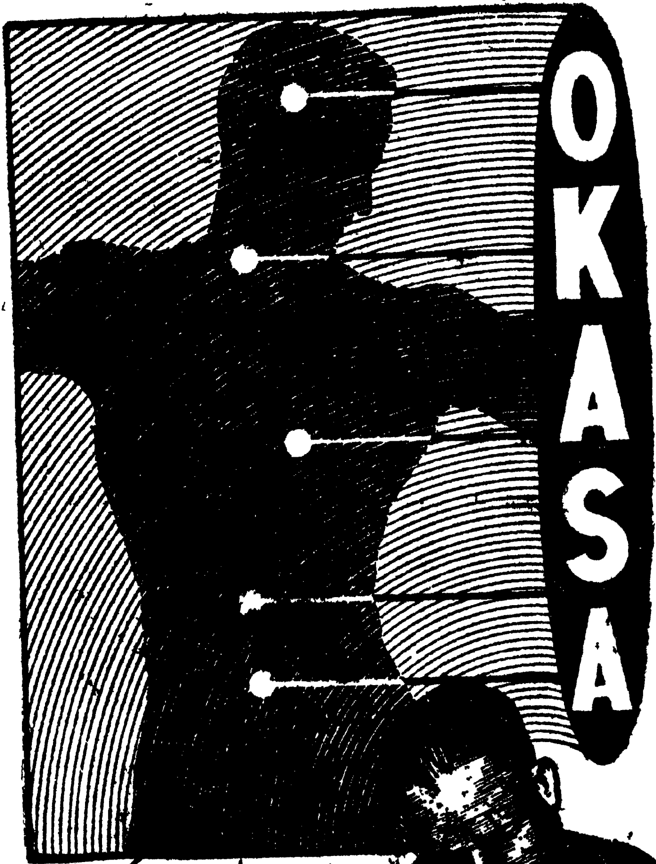
الامام الہند حضرت مولینا ابوالکلام آزاد

شہیدان حریت اس میں ترکی، مصر، سوڈان، الجزائر، طرابلس، رلیف افغانستان اور ہندوستان کے جلیل القدر، غیور، سرفروش محبانِ وطن کے حالات ہیں۔ قیمت ۱۲ ار

ریڈیو ڈرامے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اس کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے "زیر نظر ڈرامے ریڈیو سے نشر کئے جا چکے ہیں اور بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں قریشی صاحب (مصنف) بڑے ہوشیار نوجوان ہیں۔ ان کی نظر انسانی سیرت پر خوب پڑتی ہے اور وہ اسے بڑے لطف کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ زبان و بیان بالخصوص مکالمہ لکھنے میں وہ کافی بے تکلفی برت لیتے ہیں۔" قیمت ؏

تلاش مسرت یہ پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ مصنف نے بیشتر افسانے اخلاقی اور اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھے ہیں۔ مسرت کی تلاش، بہیمیت کی ریت اور انقلاب پسند کی مجبوبہ اچھے افسانے ہیں۔ قیمت مجلد صرف ؏

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ قرولباغ۔ نئی دہلی


OKASA

ناتسیت

مصنفہ ۔ شاہد حسین رزاقی

مصنف نے یہ بتایا ہے کہ ناتسیت اور ہٹلریہ ہم معنی لفظ نہیں ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ناتسیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ ہے تو ناتسیت خود بخود فنا ہو جائے گی، بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہٹلر ناتسیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ دراصل ایک جدید ارتقا کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔

مصنف نے آخر میں ناتسیت کے اچھے اور بُرے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناتسیت کا موجودہ ارتقا، ایک بحرانی کیفیت میں ہوا ہے اس لئے ہٹلر کے وجود سے قطع نظر بھی اس کا دیرپا ہونا مشکل ہے۔ قیمت ۔ عہ ر

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

مطبوعات ندوۃ المصنفین

اسلام میں غلامی کی حقیقت۔ مولانا سعید احمد صاحب مجلد غیر مجلد

غلامان اسلام

فہم قرآن

اسلام کا اقتصادی نظام مولانا حفظ الرحمن صاحب

اخلاق و فلسفہ اخلاق

تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام مولانا محمد طیب صاحب

[illegible] کی بنیادی حقیقت۔ [illegible]

نبی عربی صلعم مولانا زین العابدین صاحب ۱۲

شہنشاہیت [illegible]

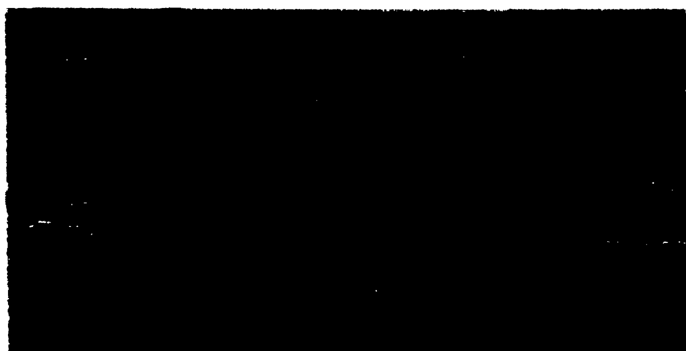
گلبانگ آزادی نہال سیوہاروی

ہندوستان میں قانون شریعت کے نفاذ کا مسئلہ مکمل

مکتبہ جامعہ

دہلی لاہور لکھنؤ بمبئی

[illegible]



مکتبہ جامعہ دہلی

ناتسیت

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

مصنف نے یہ بتایا ہے کہ ناتسیت اور ہٹلریہ ہم معنی لفظ نہیں ہیں۔ یہ سمجھنا کہ ناتسیت کا تخیل ہٹلر کی دماغی پیداوار ہے اور ہٹلر نہ رہے تو ناتسیت خود بخود فنا ہو جائے گی، بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہٹلر ناتسیت کی پیداوار ہے اور یہ نظریہ در اصل ایک جدید ارتقار کا نتیجہ ہے جسے ہٹلر نے پروان چڑھایا۔

مصنف نے آخر میں ناتسیت کے اچھے اور برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ناتسیت کا موجودہ ارتقار ایک بحرانی کیفیت میں ہوا ہے اس لئے ہٹلر کے وجود سے قطع نظر بھی اس کا دیرپا ہونا مشکل ہے۔ قیمت عہ/

مکتبہ جامعہ
دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۴ — نمبر ۵ | بابتہ ماہ مئی سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں

آپ کو اپنے پسند کی بہت سی کتابیں نظر آئیں گی

مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی

کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں

ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

طلبا کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب

ہندوستانی مدرسوں میں اگر طالب علم ناکامیاب ہو جائے یا مختلف مضامین میں کمزور رہتا ہو تو سرپرست اور والدین کی فوراً یہ رائے ہوتی ہے کہ مدرسہ کی پڑھائی اچھی نہیں ہے اساتذہ توجہ سے نہیں پڑھاتے ادھر اساتذہ یہ جواب دیتے ہیں کہ طالب علم کا دماغ اچھا نہیں ہے، کند ذہن ہے، محنت نہیں کرتا اس لئے فیل ہو گیا۔ لیکن صورت یہ ہے کہ دونوں طالب علم کی کمزوری کے اسباب پر غور نہیں کرتے اور اگر غور کرتے ہیں تو اس کو اتنا اہم خیال نہیں کرتے اور ایک دوسرے کو مورد الزام قرار دیتے ہیں اپنی اپنی کہتے ہیں اور طالب علم کا خیال نہیں کرتے استاد یہ کہتا ہے کہ ہاں کمزوری کے اسباب یہ یہ ہیں۔ لیکن چالیس پینتالیس لڑکوں کی جماعت میں اس مسئلہ کے حل کی کیا صورت نکالی جا سکتی ہے جبکہ ہم صرف چالیس پینتالیس منٹ کے لیے جماعت میں جاتے ہیں سرپرست کہتے ہیں کہ مجھے خود فرصت نہیں اب تو آپ ہی کے حوالہ کر دیا ہے آپ جو چاہیں کریں لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں کے تعاون بغیر طالب گرتا پڑتا تعلیم تو پا لیتا ہے لیکن اس کی چھپی ہوئی قوتوں کے ابھرنے اور تربیت پانے کا کوئی موقع نہیں ملتا طلبا کی تعلیم کا معیار ہر اعتبار سے پست رہتا ہے۔

کمزوری کی سب سے بڑی وجہ مدرسہ سے غیر حاضری ہے جو طلبا مدرسہ آنے میں پابندی نہیں کرتے وہ اپنی ذہانت اور ذکاوت کے باوجود بھی اس معیار سے نیچے رہتے ہیں جو ان کا پابندی سے حاضر رہنے کی صورت میں ہوتا اور کم ذہین اور کم محنت کرنے والے طلبا، تو بہت پیچھے رہ جاتے ہیں وہ اپنا ناقابل تلافی نقصان کرتے ہیں۔

مدرسہ سے غیر حاضری کی کئی صورتیں ہوتی ہیں بعض طلب کو مدرسین سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے یا شکایت نہ ہو لیکن ان کے دل میں یہ خیال کسی طرح پیدا ہو جاتا ہے کہ فلاں استاد سخت ہے اور یوں وہ مدرسہ جانے سے گھبراتے ہیں اور بجائے مدرسہ جانے کے ادھر ادھر چلے جاتے ہیں یا معمولی سا بہانہ کر کے گھر ہی پڑے رہتے ہیں اس کو عرف عام میں مدرسہ سے بھاگنا بھی کہتے ہیں۔ یہ عمل سخت سزا کے خوف سے بھی ہونے لگتا ہے اس صورت حال کی ذمہ داری مدرسین پر ہوتی ہے وہ طلبا سے محبت سے پیش نہیں آتے اور ان کی سختی

طلبا کو بھاگنے پر مجبور کرتی ہے یا جو کام وہ طلبا کو دیتے ہیں اس کا مطالبہ وہ اس سختی سے کرتے ہیں کہ طلبا مدرسہ نہ آنا ہی پسند کرتے ہیں بعض طلبا اس لئے بھی مدرسہ نہیں آتے کہ ان کو مدرسہ آنے میں کچھ دیر ہو جاتی ہے۔ اور مدرسہ میں دیر سے آنے پر باز پرس ہوتی ہے یا سزا ملتی ہے لہذا باز پرس اور سزا کے خوف سے مدرسہ سے غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اور بجائے ایک گھنٹہ کے نقصان کے تمام دن کی پڑھائی کا نقصان کرتے ہیں۔ مدرسوں میں ایسے طلبا بھی ہوتے ہیں کہ باز پرس نہ کرنے والے اور بہت کم سزا دینے والے استادوں کے گھنٹوں میں حاضر رہتے ہیں اور سخت استادوں کے گھنٹوں سے بھاگ جاتے ہیں یا چھٹی لے کر چلے جاتے ہیں اس طرح اس پڑھائی سے محروم رہتے ہیں جو اُن گھنٹوں میں ہوتی ہے یہ وہ تمام صورتیں ہیں جن میں مدرسین اور مدرسہ کے ڈسپلن کی وجہ سے طلبا مدرسہ نہیں آتے۔ مدرسہ کے ڈسپلن میں ہمیشہ لوچ ہونا چاہئے۔ یہ ڈسپلن فوجی ڈسپلن کی طرح بالکل حتمی نہ ہونا چاہئے طلبا کو اس کا تو بالکل یقین ہی نہ ہونا چاہئے کہ اگر میں کام کرکے نہ لے جاؤں گا یا دیر سے مدرسہ پہونچوں گا تو بس سزا ہی سے دو چار ہونا پڑے گا یا سخت باز پرس ہوگی ہاں آپ یہ خیال ضرور پیدا کر دیں کہ اگر کام نہیں کیا، سامان درست نہ رکھا یا دیر سے مدرسہ پہونچا تو سزا بھی مل سکتی ہے مدرسہ کے ڈسپلن میں تدریج کا خیال ہونا چاہئے۔ کیوں نہ آپ طالب علم کو سمجھائیں، دوسروں کی مثالیں دیں، فائدہ جتلائیں، سرپرستوں کو لکھیں سرپرستوں سے ملیں خفا ہو جائیں اور اس قسم کی سینکڑوں تدریجی صورتیں اختیار کریں اور جہاں تک ممکن ہو سزا دینے سے پرہیز کریں۔ طالب علم پر یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیں کہ آپ سخت مزاج ہیں۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ طالب علم کو سرپرستوں نے شادی بیاہ کوئی نجی کام یا سفر وغیرہ پر لے جانے کی غرض سے مدرسہ جانے سے روک دیا ہو۔ آخری وجہ خود طالب علم کی علالت ہے۔ گھر پر کسی کام سے روکنے میں سرپرست اور والدین بہت کم ذمہ داری محسوس کرتے ہیں وہ پوری طرح غیر حاضری کے نقصانات کی اہمیت نہیں سمجھتے اور ایک ایک دو دو دن کی رخصت کی درخواستوں سے لے کر دو دو تین تین مہینوں تک کی رخصت کی درخواستیں دیتے ہیں جو بچے پہلی اور دوسری جماعتوں میں پڑھتے ہیں وہ اپنی والدہ کے ساتھ اپنی ننھیال چلے جاتے ہیں اور جب تک بچے کی والدہ میکے سے واپس نہیں آتی ہیں بچہ مدرسہ سے غیر حاضر ہوتا رہتا ہے اور اس طرح اس کی ابتدائی تعلیم میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ یہ وہ نقصان ہے جس کا بچہ کو سخت خمیازہ اٹھانا

پڑتا ہے یعنی وہ فیل ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے پچھڑ جاتا ہے اس میں اپنی کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ آگے کی منزل کھوٹی ہو جاتی ہے شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی سرپرست بچوں کو چار پانچ دن کے لئے روک لیتے ہیں اور اگر شادی بیاہ وطن سے دور کسی دوسری جگہ ہوتے ہیں تو دو دو ہفتے بچے نہیں آتے۔ اس قسم کی طویل غیر حاضریوں کے بعد جب طلبا، مدرسہ آتے ہیں تو ایک دو ہفتے تو وہ جماعت میں بالکل اجنبی رہتے ہیں اس کے بعد پھر کہیں جا کر جماعت کی تعلیم کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر گھر پر کسی کی مدد حاصل ہو گئی یا ذہین ہوئے تو ایک حد تک یہ کمزوری دور ہو گئی ورنہ یہ کمزوری برابر ساتھ دیتی رہتی ہے

ہندوستان کی موجودہ تعلیمی فضا میں جبکہ تعلیم میں نیا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس اہم کام کی ذمہ داری بھی استاد ہی کو لینی چاہیئے۔ ایک طرف تو اسے اپنا طریقہ تعلیم دلچسپ بنانا چاہیئے کہ طلبار خود بخود مدرسہ آنے کے لئے بے چین ہو جائیں اور گھر پر رو کے نہ رکیں دوسری طرف استاد ہر غیر حاضر ہونے والے طالب علم کے سرپرست اور والدین سے ملے اور انھیں بتلائے کہ بچہ کی غیر حاضری سے کتنا نقصان ہوتا ہے۔ مدرسہ میں حاضری کا جھنڈا مدرسہ میں مختلف دلچسپ کام اور کھیل اور استاد کا بہتر سلوک مدرسہ کی حاضری کو بہت زیادہ بڑھا سکتے ہیں۔ مدرسین اپنے کام کو اس طرح ترتیب دیں کہ طلبا گھر سے زیادہ مدرسہ میں دلچسپی لینے لگیں وہ مدرسہ کے بعد اور تعطیلات میں بھی خوشی سے مدرسہ آئیں اور مدرسہ میں کام کریں۔ آپ مدرسہ اور طلبا میں ایک گہرا لگاؤ پیدا کر دیں۔

مختلف بیماریاں بھی بچوں کی تعلیمی کمزوری کا سبب ہوتی ہیں۔ اس میں والدین، سرپرستوں اور استادوں کی نگرانی کی کمی ہوتی ہے اکثر بچے صرف اس لئے بیمار ہوتے ہیں کہ وہ گھر کا پکا ہوا تازہ اور اچھا کھانا نہیں کھاتے بلکہ بازار سے مختلف قسم کی مٹھائیاں، چٹپٹی چیزیں خرید کر کھاتے رہتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سستی سر کے درد اور پیٹ کے درد کے دائمی مریض بن جاتے ہیں سستی اور درد کی وجہ سے پڑھائی کے دوران میں ان کی توجہ ادھر ادھر ہوتی رہتی ہے اور جو کچھ استاد سمجھاتا ہے وہ پورے طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آتا اور اس طرح گو وہ جماعت میں موجود رہتے ہیں لیکن ان کا ذہن جماعت سے باہر ہوتا ہے۔ بچے بے احتیاطی کی وجہ سے کبھی کبھی سردی اور لو کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ چھوت چھات کی وجہ سے جس کا وہ مطلق خیال نہیں کرتے کئی

بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں لیکن زیادہ تر بچے بار بار کھانے اور ناوقت کھانے سے بیمار ہوتے ہیں مدرسہ پر اس سلسلہ میں یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مدرسوں میں بچوں کی دوکان کا انتظام کرے جہاں سے بچے صاف ستھری کھانے پینے کی چیزیں خریدیں۔ دوسری چیز بچوں کا شفاخانہ ہونا چاہئے جس میں اس قسم کے مرض کی دوائیں موجود رہیں بچوں کی دوکان اور شفاخانہ میں بچے ہی کام کریں اور اس طرح ایک طرف لین دین سیکھیں اور دوسری طرف شفاخانہ سے وابستہ رہ کر صحت اور صفائی کے متعلق عملی طور پر سیکھیں مدرسہ میں کھیل اور ورزش کے انتظام سے بھی بچوں کی صحت پر نمایاں اثر پڑتا ہے لیکن کھیل اس طرح کھلائے جائیں کہ تمام بچے حصہ لے سکیں اور ورزش اس طرح کرائی جائے کہ بچے جبر نہ محسوس کریں۔

غیر حاضری اور بیماری کے علاوہ بچوں کے پاس لکھنے پڑھنے کا پورا سامان موجود نہ ہونا بھی بہت بڑی کمزوری کا سبب ہوتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک طالب علم سال کے دوران میں صرف دو ایک دفعہ بیمار ہوا ہو اور دوسری وجوہات کی بنا پر بھی وہ غیر حاضر نہ ہوا ہو لیکن وہ اپنا سامان مکمل نہ رکھتا ہو اس لئے کمزور ہو بعض بچوں میں سامان کھو دینے کی عادت ہوتی ہے یا وہ گھر سے سامان لانا بھول جاتے ہیں یا وہ مدرسہ میں سامان رکھتے ہیں اور ٹرنک کی چابی لانا بھول جاتے ہیں یا ان کا سامان مدرسہ میں کوئی چرا لیتا ہے اور وہ اپنے والدین اور سرپرستوں سے دوبارہ سامان طلب کرنے کی جرات نہیں رکھتے اس لئے کہ شاید سزا سے دوچار ہونا پڑے لہذا ان تمام صورتوں میں سامان کی عدم موجودگی کی وجہ سے طالب علم کا تعلیمی نقصان ہوتا رہتا ہے بعض سرپرست بچوں کو سامان دلانے میں بہت لاپروائی برتتے ہیں اور اس طرح بھی بچوں کا نقصان ہوتا رہتا ہے بعض بچوں کو سامان تھوڑا تھوڑا ملتا ہے یعنی پورا سامان اُن کے والدین یا سرپرست بیک وقت خرید کر نہیں دیتے کچھ بچے اُن پیسوں کی جن سے انہیں سامان خریدنا ہے کھانے پینے کی چیزیں خرید لیتے ہیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان نہیں خریدتے جس سے پڑھائی کا برابر نقصان ہوتا رہتا ہے اکثر سرپرست طلبا کی بات کا یقین نہیں کرتے کہ واقعی طالب علم کو مدرسہ میں فلاں چیز کی ضرورت ہے اور اس لیے چیزوں کی خریداری کے لئے قیمت نہیں دیتے کچھ لوگ ملازمین کے ذریعہ طلبا کو چیزیں خرید واتے ہیں جو وقت پر بچوں کو چیزیں خرید کر نہیں دیتے اس معاملہ میں مدرسہ کو رہنمائی اور مدد کرنی چاہئے مدرسہ ہر جماعت میں تعداد طلبا کے مطابق

دوات قلم اور پنسل اور بادامی کاغذ کا انتظام کر دے۔ اس لئے کہ بعض مرتبہ اس معمولی سامان کے نہ ہونے سے طلبا کا بہت نقصان ہوتا ہے جو ضروری باتیں استاد طلبا کو لکھانا چاہتا ہے وہ ان چیزوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے رہ جاتی ہیں۔ ادھر طالب علم اپنی سستی کی وجہ سے اسے کسی دوسرے طالب علم کی کاپی سے نقل کرنا بھول جاتا ہے۔ جہاں قلم کے واسطے سے لکھائی کا کام ہوتا ہے وہاں طلبا کے قلم روز ٹوٹے ہوئے اور بغیر بنے ہوئے ہوتے ہیں اس لئے ان کے تعلیمی نقصانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر جماعت میں بنے ہوئے قلم موجود ہونے چاہئیں اور جب لکھائی کا کام شروع ہو تو جن طلبا کے پاس قلم نہ ہوں یا بغیر بنے ہوئے اور ٹوٹے ہوئے ہوں ان سے ان کے قلم لے لئے جائیں اور اُن کو بنا ہوا قلم دے دیا جائے۔ بجائے اس کے کہ آپ طلبا کا قلم بنانے میں وقت ضائع کریں۔ آہنی قلم میں بھی اس قسم کی دقتیں ہوتی ہیں۔ اکثر طلبا اپنا قلم اپنی شیروانی یا کوٹ کے اوپر کی جیب میں رکھتے ہیں۔ اب جہاں کہیں وہ جھکے تو ان کا یہ قلم بھی گرا اور گرنے سے اس کی نب خراب ہوگئی۔ لہٰذا ان تمام دقتوں کو دور کرنے کا واحد علاج یہ ہے کہ مدرسہ قلموں کا انتظام کرے۔ مدرسوں میں ایسا انتظام بھی ہو سکتا ہے کہ ہر بچہ کا حساب بچوں کی دوکان میں کھولدیا جائے اور تھوڑی رقم ان کے کھاتہ میں جمع کرا لی جائے تاکہ جب ان کے پاس کوئی سامان نہ ہو تو وہ اپنے حساب میں سے اسی دن خرید سکیں جس دن ان کو ضرورت ہو۔

بچوں کی تعلیمی حالت پر ان کے ماحول کا بھی اثر پڑتا ہے۔ ہندوستان ایسے ملک میں اچھے تعلیمی ماحول کی بہت کمی ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے یہ ماحول بیشتر حالات میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ طلبا کے آس پاس اکثر ایسے بچے ہوتے ہیں جن کا بیشتر وقت کھیل کود اور بیہودہ مذاق میں گذرتا ہے اور جن کی تعلیم کا کہیں انتظام نہیں ہوتا۔ مدرسہ میں پڑھنے والے بچوں کا بھی تمام وقت انھیں بچوں کے ساتھ گذر جاتا ہے اور اس طرح تعلیم میں انھیں یکسوئی اور دلچسپی حاصل نہیں ہوتی جو ایک تعلیمی ماحول میں حاصل ہو سکتی تھی جب طلبا بیٹھ کر مدرسہ کا کام کرنا چاہتے ہیں یا اپنا نجی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو آس پاس کے بچوں کا کھیل کود اور شور شغب انھیں اس تعلیمی کام سے کھیل کود کی طرف کھینچ لے جاتا ہے اور متواتر ایسا ہونے سے وہ تعلیم سے لاپروا ہو جاتے ہیں۔

اکثر گھروں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں ہوتا۔ نہ والدین نہ سرپرست۔ اگر طالب علم کو اپنی پڑھائی اور اپنے کام میں کوئی دقت محسوس ہوتی ہے تو وہ اس کے متعلق کسی سے دریافت نہیں کر سکتا۔ اپنی دقت کو دور نہیں

کرسکتا اور جب ان کی دقت رفع نہیں ہوتی تو قدرتاً ان کو مایوسی ہوتی ہے۔ ایسے مایوس کن حالات میں چند ہی بچے آگے بڑھتے ہیں۔ اور باقی دو چار منزل پر ہی ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ اکثر گھروں میں بچوں کو اپنے گھر کا بھی کام کرنا پڑتا ہے اور بازار سے سودا سلف لانے کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کو بھی کھلاتے ہیں اور یوں آزادی سے اپنا مطالعہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ پھر بعض گھروں میں اس قدر شور و غل ہوتا ہے کہ طلبا کو سکون سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا یہ چند گھروں کے نمونے نہیں ہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں کم و بیش اسی قسم کے حالات نظر آتے ہیں اور ان میں سے بعض ایسی مجبوریاں ہیں جن کا علاج ان حالات میں بالکل ناممکن سا معلوم ہوتا ہے۔

ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی کے چند اسکولوں کی اونچی جماعتوں میں طلبا کو صبح بلاتے ہیں اور دن بھر مدرسہ میں رکھ کر شام کو گھر واپس بھیجتے ہیں گھر کے لئے جتنا کام تجویز کیا جاتا ہے وہ مدرسہ ہی میں کرا لیا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے جو مفید نتیجہ حاصل ہوتا ہے یعنی طلبا بری صحبت سے بچے رہتے ہیں اور امتحانوں میں پاس ہو جاتے ہیں وہ اس مضر اثر سے کہیں کم ہے جو اس جبری حاضری سے پیدا ہوتا ہے اس لئے بچے بالکل ڈرپوک ہو جاتے ہیں آزادی فکر کی جگہ استاد کے خیالات کے ہر وقت محتاج ہو جاتے ہیں ہر کام بلا چوں و چرا اور بلا سمجھے بوجھے کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذکاوت اپنی ذہانت، اپنی فکر، اپنی سمجھ بوجھ غرضکہ ہر چیز قربان کر دیتے ہیں دراصل یہ ان کے لئے ایسا نظام بن جاتا ہے کہ بس استاد کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلنا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کھیلنے تک کے لئے وقت نہیں ملتا۔

جہاں تک مدرسہ کے اوقات سے پہلے اور بعد میں طلبا کے آنے اور رکنے کا تعلق ہے یہ چیز اپنی جگہ بہت اچھی ہے لیکن جن مقاصد کے ماتحت بچوں کو بلایا جاتا ہے وہ طریقہ مناسب نہیں ہے بچے مدرسہ کے اوقات سے پیشتر اور بعد میں اگر اپنے شوق سے کوئی تعمیری کام کرنے کے لئے رکیں تو بہت مفید نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں بچے اپنے مقصد اور کام سے مدرسہ آئیں گے اور رک کر کام کریں گے صرفہ اور بامقصد کاموں کے ذریعہ جو مدرسے اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتے ہیں وہ اپنے بچوں میں اپنے اوقات کو مفید کاموں میں استعمال کرنے کا شوق اور عادت پیدا کر دیتے ہیں وہ بچوں کو بغیر کسی جبر کے مدرسہ میں اور گھر

پر اپنے اوقات کے صحیح استعمال کرنے کی تربیت دیتے ہیں۔

بچہ کی جسمانی خرابی بھی تعلیم میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ بچہ تندرست ہو، بہت کم بیمار پڑتا ہو لیکن کم سنتا ہو زیادہ فاصلہ سے بورڈ پر لکھی ہوئی باتیں نظر نہ آتی ہوں۔ پڑھنے اور بولنے میں ہکلاتا ہو تو بھی اس میں برابر کمزوری رہے گی جماعت کے چند لڑکوں میں یہ صورتیں ضرور ہوتی ہیں جو استاد ان باتوں کو معلوم نہیں کرتے یا معلوم کرکے توجہ نہیں کرتے اور جماعت کے طلبا کو تعلیم دیتے رہتے ہیں وہ ان بچوں کا بہت نقصان کرتے ہیں۔ استاد یہ خیال کرتا ہے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ تمام لڑکے سن رہے ہیں یا جو کچھ میں بورڈ پر لکھ رہا ہوں وہ تمام لڑکے دیکھ رہے ہیں حالانکہ چند بچے ایسے ہوتے ہیں جو کم سننے کی وجہ سے اور کم بینائی کی وجہ سے استاد کی تمام باتیں اچھی طرح نہیں سمجھتے اور اس طرح ان کا برابر نقصان ہوتا رہتا ہے اور وہ کمزور رہ جاتے ہیں۔ اس میں سرپرستوں کا بھی قصور ہے کہ وہ مدرسہ میں بچے کے داخلہ کے وقت مدرسین کو یہ نہیں بتلاتے کہ بچہ میں فلاں فلاں جسمانی خرابی ہے۔ جن بچوں کو سخت ملیریا یا ٹائیفائڈ ہو جاتا ہے۔ ان کے دماغ پر بھی ان بیماریوں کی وجہ سے خاص اثر ہوتا ہے ان کی ذہانت اور ذکاوت میں نسبتاً کمی ہو جاتی ہے تعلیم میں ان کی رفتار مدھم پڑ جاتی ہے۔ داخلہ کے وقت مدرسہ کو یہ تمام باتیں سرپرستوں سے دریافت کرنی چاہیئے تاکہ پڑھانے والے معلمین بچوں کی ان خرابیوں سے آگاہ ہو سکیں جو بچے کم سنتے ہیں یا بورڈ کی عبارت اچھی طرح نہیں پڑھ سکتے ان کو بورڈ اور استاد کے قریب بٹھانا چاہیئے چشمہ کا انتظام بھی اس وقت کو رفع کر سکتا ہے لیکن ہندوستان ایسے غریب ملک میں بہت کم سرپرست یہ انتظام کر سکتے ہیں۔ اور گاؤں میں تو بالکل ہی نہیں جو لڑکے بولنے اور پڑھنے میں ہکلاتے ہیں یا توتلے ہیں ان سے ہمدردی کرنی چاہیئے اس کا خیال رکھنا چاہیئے کہ دوسرے لڑکے اس لڑکے کی نقل کرکے اُس کا مذاق نہ اُڑائیں۔ اس لئے کہ اس سے ایک طرف دوسرے بچوں میں ہکلا پن پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ہکلانے والے بچوں میں اپنی کمتری کا احساس پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ بولنے سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔

اس قسم کی خرابیاں استاد میں بھی ہوتی ہیں۔ اس کا بھی بچوں کی کمزوری پر اثر پڑتا ہے اگر استاد بہت تیز بولنے کا عادی ہے تو پوری جماعت پر اس کا اثر پڑیگا اور لڑکے استاد کی باتوں کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے وہ استاد کو

فصیح و بلیغ تو خیال کرنے لگیں گے لیکن جو باتیں ایسا استاد ان کو سمجھانا چاہے گا اس کو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکیں گے گو استاد اپنی جگہ پر یہی خیال کرے گا کہ اس نے ہر بات کو اچھی طرح بچوں کو سمجھایا ہے۔ بعض استاد بہت آہستہ بولتے ہیں۔ اس کا بھی تیز بولنے کی طرح اثر پڑتا ہے گو آگے بیٹھنے والے بچے استاد کی باتیں سمجھ لیتے ہیں لیکن پیچھے بیٹھنے والے لڑکوں کی سمجھ میں استاد کی بات اچھی طرح نہیں آتی۔ استاد بھی ہکلے ہوتے ہیں اس سے بچے استاد کی باتیں اچھی طرح نہیں سمجھتے۔ جو استاد ہکلا کر بولتا ہے اُس سے اولاً بچے اس کی نقل کرتے ہیں دوم انھیں اس کی باتیں سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ جو استاد کم سنتے ہیں وہ اپنی تو کہہ لیتے ہیں لیکن شاگردوں کی کم سنتے ہیں۔ استادوں میں ان خرابیوں کا ہونا طلبا کے لئے مستقل مصیبت ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کے تمام مدرسوں میں بچوں کی کثیر تعداد ایسی ملتی ہے جو کسی نہ کسی قسم کی کمتری کے احساس میں مبتلا ہوتی ہے یہ وہ احساس ہے جو اکثر بچوں کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے۔ ہندوستانی گھرانوں کی تربیت اور اٹھان ہی اس انداز پر ہوتی ہے کہ بچوں میں شروع سے احساس کمتری پیدا ہونے لگتا ہے۔ جب ان کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ اپنی بے مائگی پر غور کرنے لگتے ہیں اور غور کرتے کرتے بالکل دلگیر ہو جاتے ہیں تعلیم میں دوسروں کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر کوفت اور غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ استاد کی ذراسی جھڑکی انھیں اپنی اپنی کمتری کا بار بار خیال دلاتی ہے۔ گھروں میں ذرا ذراسی باتوں پر والدین، سرپرست اور گھر کے دوسرے ممبران کی ہر وقت کی روک ٹوک اور گرفت بچوں کی فطری آزادی اور خوشحالی کو رفتہ رفتہ کم کر دیتی ہے۔ اس سے بچے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گھر کے لوگ ان سے ہمدردی نہیں کرتے اور اس طرح ان میں دلگیری اور احساس کمتری رفتہ رفتہ پیدا ہونے لگتا ہے اور جب بچہ اپنے چھوٹے بھائی بہن کے ساتھ والدین اور دوسروں کو اچھا سلوک کرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس میں یہ احساس اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے جن بچوں میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے انھیں نہ کھانا اچھا لگتا ہے نہ پہننا۔ وہ گھر میں اپنے والدین اور مدرسے میں استاد کو اپنا ہمدرد خیال نہیں کرتے ہیں مدرسہ جانے اور تعلیم پانے میں وہ نسبتاً کم دلچسپی لیتے ہیں۔ بس والدین کا حکم بجا لاتے ہیں۔ وہ استاد کے لئے ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ اگر مدرسے میں بھی ایسی فضا ہوئی یعنی مدرسین نے طالب علم کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تو پھر مدرسے سے بھاگنا ایک فطری فعل ہو جاتا ہے اور اگر مدرسے آتے رہے تو تعلیم میں برائے نام دلچسپی

رہ جاتی ہے۔ جن بچوں کی والدہ یا والد یا دونوں حیات نہیں ہوتے ان میں بہت ناخوشگوار قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے خیال میں دنیا ناہمدردی کا گھر ہو جاتی ہے۔ ایسے بچوں کے خیالات منتشر ہوتے ہیں ان میں توجہ اور انہماک کی کمی ہوتی ہے وہ زیادہ تر کھوئے ہوئے رہتے ہیں۔ اس لئے جماعت میں جو کچھ تعلیم ہوتی ہے اس کا بہت زیادہ حصہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

احساس کمتری کی تمام پیچیدگیوں اور ان کے نتائج کو اس مختصر مضمون میں قلمبند کرنا بہت مشکل ہے لیکن تعلیم میں یہ تمام پیچیدگیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اساتذہ کے نا ملائم کلمات ایسے بچوں کی زندگی ہی خراب کر دیں۔ اس لئے ایسے بچوں کی تعلیم کی رہنمائی بڑی ہوشیاری سے کرنا چاہئے۔ انھیں کبھی دلگیر نہ ہونے دینا چاہیے ان سے اس طرح پیش آنا چاہیئے کہ وہ خوش رہیں۔ ایسا موقع ہی نہ آنے دینا چاہئے کہ وہ فکرمند اور آزردہ خاطر ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسے بچوں میں بعض ایسی عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن پر گرفت کرنا بہت ضروری ہوتا ہے لیکن یہ گرفت ملائم طریقہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے کہ سخت بازپرس ان میں اور زیادہ پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ ایسے بچوں کے مسئلہ کو ہمیں اپنے خیال کے مطابق نہیں بلکہ اس بچے کے خیال کے مطابق دیکھنا چاہیے۔ اگر اس کا خیال مضر ہے تو اس کو رفتہ رفتہ تبدیلی کا خواہشمند بنانا چاہئے۔ بری عادتیں رفتہ رفتہ بنتی ہیں اور اگر مناسب طور پر تربیت کی جائے تو رفتہ رفتہ چھوٹ بھی جاتی ہیں اور بعض مرتبہ خود بخود۔

بچوں کی تعلیم میں کمزوری کے اسباب میں غیر دلچسپ طریقہ تعلیم اور داخلہ کے وقت بچوں کی صحیح جانچ کا نہ ہونا بھی ہیں۔ غیر دلچسپ طریقہ تعلیم میں اتنا عرض کروں گا کہ جو کچھ بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھکر نہیں کیا جاتا وہ سب کا سب غیر دلچسپ طریقہ تعلیم ہے اور بے نتیجہ (استفادہ کے اعتبار سے) ہونے کے علاوہ مضر بھی ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ دماغ سدھرتے ہیں نہ ذہن، نہ عادات سدھرتی ہیں نہ ہنر۔ رہا بچوں کی صحیح طریقہ پر جانچ کا نہ ہونا سو یہ بھی اپنی جگہ پر بہت اہم ہے اور بچوں کو ان کی استطاعت کے مطابق جماعتوں میں نہ رکھنا ان میں بے اعتمادی اور احساس کمتری پیدا کرتا ہے اور عارضی خوشی سے تمام پڑھائی کے سالوں کی کوفت مول لینا ہے بچوں کو اسی جماعت میں داخل کرنا چاہیے جس میں وہ آسانی سے چل سکیں اور اس جماعت کی تمام پڑھائی میں دشواری نہ محسوس کریں۔ اگر ابتدا میں اٹھان اچھی ہے تو آئندہ بھی خوشگوار طریقہ پر تعلیم جاری

رہے گی۔ ورنہ بچہ جماعت میں دبا ہوا ہو کر رہ جائے گا اور اس کی تمام صلاحیتوں میں انحطاط ہی انحطاط نظر آئیگا۔ مدرسوں میں عام طور سے بچوں کے تبادلے سارٹیفکٹ کے ذریعہ ہوتے ہیں اور جس جماعت سے ایک طالب علم ایک مدرسہ چھوڑ کر جاتا ہے دوسرے مدرسہ میں اسی جماعت میں داخل ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مدرسہ کی خامیاں دوسرے مدرسہ میں بھی جاری رہتی ہیں۔ اور اگر طالب علم ایک دو ماہ بیمار ہو گیا تو اس میں اور زیادہ تعلیمی کمزوریاں پیدا ہو گئیں۔ لہذا دوسری جگہ بچوں کو اچھی طرح امتحان لے کر داخل کرنا چاہیئے۔ اور اسے کمزور پودے کی بجائے تندرست پودے کی طرح بڑھنے کا موقع دینا چاہیئے۔

منشی پریم چند

گذشتہ سے پیوستہ

بحیثیت ناول نویس :- زمانہ کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں طرح طرح کی تبدیلیاں ہوئیں۔ زبان رفتہ رفتہ صاف اور آسان ہوتی گئی قصے کہانیوں نے بھی پلٹا کھایا اور داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال کی بے شمار پوتھیوں اور دوسرے بھوت پریت، اور جادو سے بھرے ہوئے قصوں کا بھی رنگ بدلا۔ دوسرے یہ کہ نظریہ زندگی ہی بدل گیا یعنی سیرت انسانی پر غور کیا جانے لگا۔ رچرڈسن۔ فیلڈنگ جیسے ماہر نفسیات پیدا ہوئے جنھوں نے اٹھارہویں صدی میں حقیقت نگاری کا بیڑا اٹھایا اور واقعات عالم کو دلچسپ پیرائے میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور ہندوستان میں بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہماری معاشرت پر بھی مغربی تعلیم کا رنگ چڑھنے لگا۔ ہندی میں للو لال جی نے اور اردو میں سب سے پہلے میر امن نے اس کی بنیاد ڈالی اور اس کو کمال تک منشی پریم چند نے پہونچایا۔ دراصل اردو میں ایسے ناولوں کی کمی تھی جن کو صحیح معنوں میں ناول کہہ سکیں۔

سرشار کے ناولوں میں ظرافت سے مکالمہ چست ہے لیکن پھر بھی ان میں پرانی کہانیوں کی طرح ترتیب اور ربط نہیں ہے۔ سیرت نگاری میں بھی زیادتی سے کام لیا گیا ہے اور ان کی ظرافت بھی بلند معیار کی نہیں ہے نذیر احمد کے یہاں زور ہے بے تکلفی ہے روانی ہے۔ قوت مشاہدہ بھی اچھی خاصی ہے سیرت نگاری میں بھی ایک حد تک کامیاب ہیں لیکن اسٹائل کے لحاظ سے ناہموار ہیں اور جس پردے پر وہ تعمیر بناتے ہیں بہت ہی چھوٹا ہے۔ اصل میں ان کی کہانیاں ناول اور رومانس کے بیچ کی کڑی ہیں۔

شرر کی کہانیوں میں ترتیب تو ہے لیکن یہ ناول زیادہ تر خیالی اور تاریخی ہیں آغا عبدالحمید کے بیان کے مطابق ان کے ہیرو ہیروئن بہت ہی گھٹیا درجے کے خیالوں میں ظاہر ہوتے ہیں ان کے ناولوں پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے اور تاریخی ناول حقیقت سے بہت دور ہیں۔ مولانا نے معاشرتی ناول بھی لکھے ہیں

لیکن یہ آج کل کی معاشرت کا صحیح خاکہ نہیں پیش کرتے۔

پریم چند نے اپنی قابلیت اور صلاحیت کا ثبوت تقریباً ایک درجن ناول لکھکر دیا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان میں خامیاں بالکل نہیں ہیں کیونکہ منشی صاحب کا اصل میدان افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے کمال حاصل کیا۔ ناول میں وہ اتنے کامیاب نہیں ہوسکے لمبے ناولوں میں یہ تسلسل قائم نہیں رکھ سکے ہیں اور کیرکٹر نگاری میں بھی کسی قدر کمزوری آگئی ہے۔ انسان کا کیرکٹر بدلتا رہتا ہے لیکن اس کے وجوہ بھی ہوتے ہیں جس کا دکھانا بہت ضروری ہوتا ہے اگر نکتہ چینی کرنے اور خامیاں نکالنے بیٹھیں تو ہر بڑے ناول نویس میں نکال سکتے ہیں منشی صاحب کو اس کا دعوی تو تھا نہیں۔ انھوں نے جس چیز کو اپنا موضوع بنایا اس میں بہت کامیاب ہوئے

انکے انداز بیان میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ ناول نویس کا اہم فرض ہے کہ وہ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرے اور اس کے روشن پہلوؤں کو اُبھارے ملکی اخلاقی، سیاسی معاشرتی، قومی، انفرادی، جماعتی علمی و تعلیمی مسائل و نکات کو سلجھا کر ان کا حل پیش کرے یہ سب باتیں منشی صاحب کے ناولوں میں موجود ہیں۔ ان کے ناول نہ صرف ہمارے ناقص سماجی نظام کی مذمت کرتے ہیں بلکہ قومیت اور وطنیت کے جذبے کے علمبردار بھی ہیں۔

پلاٹ : منشی صاحب ایک بڑے ناول نویس ہیں انکا پلاٹ نہایت دلکش اور چست ہوتا ہے ان کے ناول مذہبی، معاشرتی، قومی اور ملکی واقعات کی تصویر ہیں اور حقیقت میں ان کے سب ناول زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کے واقعات پڑھ رہے ہیں لیکن بعض ناولوں میں طوالت کی وجہ سے پلاٹ میں وہ دلکشی نہیں دکھائی دیتی۔

طرز بیان :۔ پریم چند کا طرز بیان بھی اچھوتا ہے۔ ان کی عبارت میں بلا کی انشاپردازی ہے۔ ان کی تحریر سادہ صاف اور دلکش ہے عبارت آرائی سے پاک ہے۔ ان کے مکالمے بہت دلچسپ ہیں انھوں نے جس طبقے کے اشخاص کو لیا ہے انھیں کی زبان میں مکالمہ ادا کروایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات میں ایک خاص خوبی پیدا ہوگئی ہے۔ ان کو اعلیٰ طبقہ کی زبان پر پورا قابو حاصل ہے لیکن جو زبان وہ دیہاتیوں کی زبانی ادا کراتے ہیں وہ ان کا شاہکار ہے۔ انھوں نے دیہاتی محاورے اور الفاظ کثرت سے شامل

کر دیے ہیں جس سے زبان عام فہم اور سلیس ہو گئی ہے۔

پریم چند کو کردار نگاری میں بھی کافی مہارت حاصل ہے۔ ان کے کردار بے جان مٹی کے پتلے نہیں ہیں بلکہ جیتے جاگتے انسان ہیں۔ ان میں برائیاں بھی ہیں اور بھلائیاں بھی ان کے جذبات اور احساسات میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں لیکن ان تبدیلیوں کے وجوہ کم دکھائے ہیں۔ دوسرے برائیوں کے مقابلہ میں خوبیوں کو زیادہ اُچھالا ہے جس سے برائیاں دب گئی ہیں یہ غالباً اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ "بازارِ حسن" میں پدم سنگھ وٹھل داس سدن اور سمن قابل ذکر کردار ہیں۔ پدم سنگھ اور وٹھل داس شاہدان بازاری کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں بھولی سمن کو بدی کی طرف مائل کرنا چاہتی ہے یہ باتیں سمن کے لیے زہر ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن بھولی کو بھی اس گناہ کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ سوسائٹی کی نظر سے گر جاتی ہے۔

اسی طرح "پردہ مجاز" میں چکر دھر کو ایک نڈر بے دھڑک اور دلیر آدمی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے وہ غریب مزدوروں اور کسانوں کی دل سے بھلائی چاہتا ہے اور ہندو مسلم فساد کو سلجھانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔ منورما حقیقی دیوی ہے وہ بہت سوں کے لئے ہدایت کا کام دیتی ہے اس کو چکر دھر سے محبت ہے لیکن اس محبت میں لجاتی ہے بدی سے بالکل پاک ہے۔ اس کی شادی ایک راجہ سے ہوتی ہے اور رانی ہو جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ غریبوں کسانوں اور دکھیوں کا ساتھ دیتی ہے۔

منشی صاحب ایک عملی فلاسفر اور حقیقت نگار تھے اپنے ناولوں میں انھوں نے فلسفہ زندگی کو پیش کیا ہے اور اس کے باریک سے باریک پہلوؤں کو بھی اجالے میں دکھایا ہے پریم چند کو اپنے وطن سے محبت تھی۔ وہ سچے وطن پرست تھے۔۔ کسانوں کی نوے فیصدی آبادی ہندوستان کی جان ہے اس لئے انھوں نے اپنا خاص موضوع کسانوں مزدوروں ادنیٰ درجے کے ملازمین کی آہ وپکار کو بنایا اور یہ موضوع ٹھیک بھی ہے جو باتیں انھوں نے بیان کی ہیں وہ روزانہ پیش آتی رہتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ایک مصلح قوم تھے انھوں نے ادب کے ذریعہ قوم وملک کی اصلاح کی کوشش کی ہے۔ اس نقطۂ نظر سے منشی صاحب ڈکنز، تھیکرے، ٹالسٹائی اور گورکی کے ہم پلہ ہیں۔

ادب کا سب سے بڑا مقصد سماج کا سدھار اور مسائل زندگی کا حل پیش کرنا ہے منشی صاحب

نے زندگی کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ انھوں نے ہر مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے ہندو مسلم فساد۔ کاشتکاروں پر کئے ہوئے ظلم اور مسئلہ تناسخ کا حل بہت کامیابی سے پیش کیا ہے۔ غرضکہ انھوں نے اپنا پیام کتابوں کے ذریعہ پہونچایا ہے ان کے ناول پڑھنے والے کے دل میں ایک جوش اور دلولہ پیدا ہوتا ہے وہ بلندی ہی کی طرف اٹھتا ہے نیچے نہیں گرتا مجھے تو ان کی تصانیف میں درد ملتا ہے، سوز ملتا ہے۔ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے الفاظ اتنا اثر ڈالتے ہیں کہ رونا آتا ہے۔

اردو میں منشی صاحب کا سب سے پہلا ناول "ہم خرما وہم ثواب" کے نام سے شائع ہوا جس کا ترجمہ ہندی میں "پریما" کے نام سے ہوا تھا مصنف کی یہ پہلی کوشش تھی اس لئے اس میں اکثر خامیاں موجود ہیں۔ اس کے بعد منشی صاحب کے متعدد ناول جلوہ ایثار، غبن، گوشہ عافیت، بازار حسن، نرملا، بیوہ چوگان ہستی، میدان عمل، گئودان وغیرہ شائع ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک پر تبصرہ کرنے سے تو مضمون طویل ہو جائیگا صرف دو تین ناول ہی دیکھیں گے۔

جلوہ ایثار۔ یہ ناول غالباً منشی صاحب کی دوسری کوشش ہے اس لئے اس میں اس زمانے کی افسانہ نگاری کا رنگ جھلکتا ہے۔ پورے ناول کا خلاصہ پہلے ہی باب میں موجود ہے۔ منشی صاحب کسی کو زیادہ دیر تک منتظر نہیں رکھنا چاہتے۔

پریم چند دیس کے پجاری تھے اس لئے ان کے بھی سورما دیس بھگت ہیں۔ آدمی کسی طبقے یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہو وہ ہر ایک کے لئے دیس سیوا ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے ہیرو، ہیروئن کا خاص جوہر یہی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ہیرو آئیڈیل رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کا ہر ہیرو سچائی کا پتلا، انصاف پسند، تیاگ اور ترک کا نمونہ اور قربانی کا دیوتا معلوم ہوتا ہے۔

اس ناول میں نئی روشنی اور پرانی روشنی خاص انداز میں پیش کی گئی ہے لیکن ایک نقص جو معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ منشی صاحب کبھی کبھی جزئیات اور تفصیلات میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے قصہ کا اصل حسن ماند پڑ جاتا ہے۔ وہ آمد نہیں رہتی کیونکہ آمد اختصار ہی میں آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طبیعت کبھی کبھی اکتا جاتی ہے۔ ان کے مکالموں سے بھی کبھی کبھی دلچسپی نہیں رہتی۔ وہ جب اپنے گرد و نواح کی زبان

میں گفتگو لکھتے ہیں تو لطف آجاتا ہے لیکن مکالموں میں جنسی تفریق نہیں رکھی یعنی عورتوں کی گفتگو میں زیادہ خیال نہیں رکھا گیا یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول واقعات کے لحاظ سے کئی جگہ غیر فطری سے ہو گئے ہیں مگر وہ اس موثر انداز میں بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے محسوس نہیں کرتے۔

بالاجی اس ناول کے ہیرو ہیں۔ ان کا کیرکٹر اتنا زوردار اور مکمل نہیں ہے کہ ہر شخص کے دل میں بالاجی بننے کی آرزو پیدا ہوتی ہو۔ وہ صرف ایک معمولی قومی لیڈر معلوم ہوتے ہیں۔ اس ناول کی دوسری سیرتوں میں بھی کسی کو کوئی خاص وقعت نہیں

دوسری چیز جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کیا پلاٹ کا تسلسل باقی نہیں رہتا۔ ہر پلاٹ الگ ایک افسانہ بنا ہوا ہے۔ یہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے نہیں معلوم ہوتے۔

مختصر یہ کہ اس ناول میں سرشار کا چٹخارا اور رسوا کے رنگ کا عجیب میل جول ہے اس کی زبان بھی ناہموار اور ثقیل ہے کہیں کہیں فارسی ہندی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ سنسکرت کے بے جوڑ الفاظ بھی موجود ہیں۔

دوسرا ناول "گوشۂ عافیت" ہے جس قدر خامیاں جلوہ ایثار میں نظر آتی ہیں اتنی ہی خوبیاں اس ناول میں سما گئی ہیں۔ اس ناول کی زبان اتنی سادہ اور پیاری ہے کہ صحیح معنوں میں ہندوستانی معلوم ہوتی ہے۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے زبان میں وہی لطف وہی زور باقی رہے گا۔

اس ناول میں مکالمہ بھی غضب کا ہے خاص طور سے دیہاتی لہجہ میں تو اتنی حقیقت اور سچائی ہے کہ معلوم ہوتا ہے لکھنے والے کو اس فن میں خاص ملکہ ہے

سیرتیں بھی مکمل معلوم ہوتی ہیں اور واقعات کا تسلسل بھی قائم رکھا گیا ہے اور اس میں بے جوڑ اور غیر فطری واقعات بھی نہیں ہیں۔ اس میں وہی باتیں ہیں جو رات دن گذرتی رہتی ہیں۔

منشی صاحب نے رشوت ستانی اور جبریہ رسوم پر بڑی آزادی سے تنقید کی ہے لیکن وہ کسی کی حمایت نہیں کرتے۔ دونوں پارٹیوں کی کمزوریوں اور اچھائیوں کو یعنی تصویر کے دونوں رُخ دکھائے ہیں کہ انصاف کا خون کہیں نہیں ہونے پایا۔

یہ ناول حقیقت میں انسانی نفسیات کا مرقع ہے۔ اس کے توازن میں جو شان ہے منشی صاحب کے دوسرے ناولوں میں نہیں۔

یہ تو پہلے حصہ کا تذکرہ تھا لیکن اس کا دوسرا حصہ اتنا ہی پست ہے جتنا پہلا حصہ بلند ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ ایک نشست میں نہیں لکھا کیونکہ وہ ایک ہی بیٹھک میں جو کچھ لکھتے ہیں وہ بہت خوب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانوں میں زیادہ کامیاب ہوئے ہیں لیکن ان کے طویل ناولوں میں ہم آہنگی اور روانی نہیں ملتی۔

منشی صاحب اپنے ناولوں میں خود پہلا نمبر بازار حسن کو دیتے ہیں لیکن ہمارا..... خیال ہے کہ پریم چند اپنی زندگی میں بجز چوگان ہستی کے کچھ نہ لکھتے تو دنیا اور آخرت میں کافی ہوتا۔ برنرڈ کی جسارت آسل کی آزادی ڈکنس کی غربت نگاری۔ گالزوردی کا طنز یہ تبسم ڈوما کی نقشہ کشی۔ راشد کی ٹیسیں۔ نظامی کی سادگی۔ شرر کا جوش رسوا کی معنویت ٹیگور کی لطافتیں۔ اس ناول میں جمع ہوگئی ہیں۔ کتاب کہیں سے کھول لیجیے۔ یکساں دلچسپ۔ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں آتا سادگی۔ بے ساختگی اور ہر قصہ میں دلکشی و دل آویزی موجود ہے۔

بنارس میں جان سیوک ایک دیسی صاحب ہیں نئی مذہب ہیں پرلے سرے کے دنیادار اور ان کی بیٹی کا رجحان ہندو مذہب کی طرف ہے ایک موقعہ پر ماں بیٹی کی گفتگو ہو رہی ہے وہاں لڑکی کے بوڑھے دادا ایشور سیوک بھی آجاتے ہیں۔

صوفیہ۔ میں مذہبی معاملہ میں اپنے ضمیر کے سوا کسی کے احکام نہیں مانتی۔

مسز سیوک۔ میں تجھ کو اپنی اولاد نہیں سمجھتی اور تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

یہ کہکر وہ صوفیہ کے کمرے میں گھس گئی اور اس کی میز پر سے بدھ مذہب اور ویدانت فلاسفی کی کتابیں اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ اسی جوش میں انھیں پیروں سے کچلا اور پھر جاکر ایشور سیوک سے بولیں۔ پاپا آپ صوفی کو ناحق بلوا رہے ہیں وہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے مسٹر ایشور سیوک ایسے چونکے گویا بدن میں آگ کی چنگاری گر پڑی ہو۔ اور اپنی بے نور آنکھوں کو پھاڑ کر بولے۔

کیا کہا صوفیہ حضرت مسیح کی ہجو کر رہی ہے ؟ صوفی ؟

مسز سیوک۔ ہاں ہاں صوفی کہتی ہے۔ مجھے ان کے معجزوں ان کے مواعظ اور احکامات پر اعتقاد نہیں ہے

ایشور سیوک۔ (ٹھنڈی سانس کھینچ کر) یسوع! مجھے اپنے دامن میں چھپا! اپنی گمراہ بھیڑوں کو راہ راست پر لا۔ کہاں ہے صوفی مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میرے ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ خدا میری بیٹی کے دل کو ایمان کے نور سے منور کر دے۔ میں اس کے پیروں پر گروں گا اس کی منتیں کروں گا اس کو عاجزی سے سمجھاؤنگا مجھے اس کے پاس لے چلو۔

مسز سیوک۔ میں سب کچھ کر کے ہار گئی۔ اس پر خدا کا قہر ہے میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔

ایشور سیوک بیٹی ایسی باتیں نہ کرو۔ وہ میرے گوشت کا گوشت، میرے خون کا خون۔ میری جان کی جان ہے۔ میں اسے کلیجے سے لگاؤں گا۔ یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا۔

جب مسز سیوک نے اب بھی سہارا نہیں دیا تو ایشور سیوک لکڑی کے سہارے اٹھے اور لاٹھی ٹیکتے ہوئے صوفیہ کے کمرے کے دروازے پر آکر بولے "بیٹی صوفی کہاں ہے ؟ ادھر آ بیٹی تجھے گلے لگاؤں ہاں یسوع خدا کا لاڈلا بیٹا تھا۔ غریبوں کا مددگار، کمزوروں کا محافظ، مفلسوں کا دوست، ڈوبتوں کا سہارا گنہگاروں کا ساتھی دکھیوں کا بیڑا پار کرنے والا! بیٹی ایسا کونسا نبی ہے جس کا دامن اتنا وسیع ہو جس کی گود میں اتنے سارے گناہوں ساری برائیوں کے لئے جگہ ہو۔ وہی ایک ایسا نبی ہے جس نے بدکاروں کو کافروں کو گنا ہگاروں کو نجات کا مژدہ سنایا نہیں تو ہم جیسے ناپاک لوگوں کے لئے نجات کہاں تھی ؟ ہم کو بچانیوالا کون تھا ؟

چوگان ہستی جلد اول ۴۶-۴۷ صفحہ

اس ساری گفتگو میں کتنی سچائی ہے اور مطابق واقعہ ہے کہ پڑھنے والے کے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے۔

اس ناول کا ہیرو ایک اندھا بھکاری ہے۔ ایسا کامیاب ہیرو ہے کہ مقبول ناولوں کے ہیرو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ ظاہری شان و شوکت کو ٹھکرا کر در در خدمت کو جگہ ملی۔

اس ناول میں نفسیاتی خوبیاں اور زور بیان کا لطف بھی ہے۔ ہر چیز میں ایک اثر ہے ایک جادو ہے

طوالت بہت ہے پھر بھی دلچسپی باقی رہتی ہے جی نہیں گھبراتا۔

دوسرے کامیاب ناول بازارِ حسن اور میدانِ عمل ہیں۔ بازارِ حسن کا ہندی میں بڑا پیارا نام ہے سیوا سدن اس کے کیرکٹر زیادہ تر مرصع ہیں۔ زبان بھی زیادہ ناہموار نہیں۔ اثر بہت زیادہ ہے دلچسپی اور دلکشی بلا کی ہے مکالمہ بھی چست ہے۔

میدانِ عمل ترکِ موالات اور ستیاگرہ کی پوری تاریخ ہے ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۲ء تک کی ہندوستان کی تمام تحریکوں پر دلچسپ تبصرہ ہے بحیثیت مجموعی یہ کتاب بہت اچھی ہے۔ زبان بہت اچھی ہے۔ اس میں سیرت نگاری آغاز و انجام اتحاد و ربط، پلاٹ کی عمدگی اور ظرافت غرضکہ یہ تمام چیزیں نفاست سے پیش کی گئی ہیں۔ منشی صاحب غریب اور اوسط طبقے کی زندگی دکھانے میں بہت کامیاب ہوئے ہیں لیکن جہاں اعلیٰ طبقہ اور سوسائٹی کا بیان آیا ہے وہاں کچھ لغزشیں نظر آتی ہیں اور ہونا بھی چاہیے چونکہ منشی صاحب ایک اوسط خاندان کے آدمی تھے۔ ان کی زندگی تمام تر دیہات ہی میں گذری اعلیٰ سوسائٹی میں آنے جانے کا کم اتفاق ہوا اس لئے یہ کمزوری نظر آتی ہے لیکن عیب سبھی میں ہوتے ہیں۔ کون ہے جس میں عیب نہیں ان تمام باتوں کے باوجود ان کے تمام ناول جو سادہ اور صاف زبان عوام اور خواص کے نفسیاتی مطالعہ کا گلدستہ بنے ہوئے ہیں ہماری زبان کے لئے قابلِ فخر ہیں اردو زبان میں ان سے پہلے ایسی مثالیں نہیں ملتیں منشی صاحب اسی طرح چند سال اور جیتے تو ناول نویسی میں بھی وہی کمال حاصل کر لیتے جو افسانہ نگاری میں کیا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ چیخوف اور گورکی کی طرح معاشرتی خرابیوں کو دور کرنے کی جو خدمت انجام دی ہے اسے ہندوستان کبھی نہیں بھول سکتا۔

بحیثیت ڈرامہ نگار :- منشی پریم چند نے ڈرامہ نگاری کے میدان میں بھی قدم رکھا لیکن حالات نے انھیں آگے نہیں بڑھنے دیا۔ ورنہ اس میں بھی کمال حاصل کر لیتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی صلاحیت کا ثبوت سب سے پہلے "کربلا" لکھ کر دیا۔ "کربلا" ادبی حیثیت سے بہت کامیاب ہے اس کے بعد منشی صاحب کو ۱۹۳۴ء میں اجنتا سینی ٹون نے بمبئی بلایا اور آپ سے ڈرامے لکھنے کی درخواست کی چنانچہ آپ وہاں ملازم ہو گئے اور دو ڈرامے "مزدور" اور "شیر دل عورت" کے نام سے لکھے۔ سب سے پہلے "مزدور" لکھا۔

لیکن اس میں کمپنی والوں نے کچھ نئی باتیں جوڑ لیں تمام حصے الگ کر دئے اور قصے کو نئی شکل دیدی۔ لیکن پھر بھی اصل مطلب باقی رہا۔ اس میں مل کے مالکوں اور مزدوروں کی کشمکش دکھائی گئی تھی۔ اور مالکوں کے ظالمانہ برتاؤ، مزدوروں کی خراب حالت ان کی بہو بیٹیوں کی غیر محفوظ حالت بڑی صفائی کیا تھ دکھائی گئی تھی۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ کہ اس فلم میں خود منشی صاحب نے پارٹ کیا تھا۔ پنچایت کے چودہری منشی صاحب ہی ہیں۔ لیکن افسوس کہ سینسر نے اس فلم کو برباد کر دیا۔ اس میں بہت کاٹ چھانٹ کی۔ موثر نظیار ستے نکالدئے۔ اس طرح اس فلم کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔

دوسرا ڈرامہ "شیر دل عورت" ابھی تک زندہ ہے۔ لیکن منشی صاحب اپنی تصانیف کا یہ حشر دیکھکر مایوس ہو گئے اور ڈرامے لکھنا بند کر دیا۔ اس طرح ان کی ڈرامہ نگاری کا مختصر دور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا (ان ڈراموں کے علاوہ ہندی میں بھی منشی صاحب نے دو ڈرامے "سنگرام" اور "پریم کی دیوی" لکھے تھے)

بحیثیت اخبار نویس :- ایک اچھے اور ایماندار اخبار نویس کے فرائض نہایت اہم ہوتے ہیں اور پھر ہندوستان جیسے غلام ملک میں تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اخبار نویس کی مختصر سی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ وہ سچا مصلح قوم، ایک سرفروش سپاہی، ایک مہربان استاد اور ایک بے خوف اور ہمدرد رہنما ہے۔

منشی صاحب نے اخبار نویس کے فرائض انجام دئے ہیں۔ ان کی اخبار نویسی غالباً رسالہ زمانہ سے شروع ہوتی ہے ۱۹۲۳ء میں وہ ہندی رسالہ "مریادا" کے ایڈیٹر تھے سمپورنانند جی تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں جیل چلے گئے تو اس کی ایڈیٹری کے فرائض منشی صاحب کے سپرد کئے گئے انہوں نے ڈیڑھ سال تک اس خدمت کو بخوبی انجام دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں مشہور ہندی رسالہ "مادھوری" کی ایڈیٹری ان کے سپرد کی گئی۔ اور انھوں نے اس خدمت کو بھی تین سال تک بخوبی انجام دیا۔ اس کے بعد جنوری ۱۹۳۰ء میں بنارس سے ایک ماہوار رسالہ ہندی میں "ہنس" نامی جاری کیا۔ جو اب تک نکل رہا ہے ۱۹۳۳ء میں ایک "جاگرن" نامی ہندی ہفتہ وار اخبار کی ایڈیٹری بھی اپنے ذمہ لے لی۔ دو ہی سال بعد یہ پرچہ بوجہ نقصان بند کرنا پڑا۔ لیکن دو سال تک یہ خوب چمکا۔

ہندوستان میں اردو ہندی کا جھگڑا ایک عرصہ سے چل رہا ہے ہندی والے اس کوشش میں ہیں کہ ہندی ہی ہندوستان کی زبان ہے اور اُردو والے کہتے ہیں کہ اردو تو بنی ہی سب زبانوں کے میل سے ہے۔ اصل ہندوستانی تو یہی ہے چنانچہ بہت سے لوگ اس جھگڑے کو ختم کرنے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ عام بول چال کی زبان جس میں نہ عربی فارسی کے مشکل الفاظ ہوں اور نہ سنسکرت کے کٹھن شبد ہوں۔ ایک صاف ستھری اور سادہ زبان ہونی چاہئے۔ جو واقعی ہندوستانی کہی جاسکے منشی صاحب اس خیال کے حامی تھے اور انھوں نے ہنس پرچہ اسی مقصد کے لیے جاری کیا جو ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب کو ہندوستانی زبان میں پیش کرے۔ لیکن ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی اردو والوں کو ہمیشہ یہی شکایت رہی ہے کہ ہنس کی زبان ابھی سنسکرت کے الفاظ سے پاک نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی منشی صاحب کی یہ کوشش قابل داد ہے۔

اخبار نویس کی حیثیت سے منشی صاحب نے ہماری قومی مجلسی زندگی کے ہر شعبہ میں بہت بیباکی سے حصہ لیا۔ اور انھوں نے سیاسی مالی، معاشرتی غرضکہ ہر تحریک آزادی میں بے دھڑک حصہ لیا۔ اور برابر تمام مسائل پر آزادی سے لکھتے رہے۔ اس کی پروانہ کی کہ انجام کیا ہوگا۔

منشی صاحب کی ادبی خدمات میں افسانوں، ناولوں، ڈراموں کے علاوہ چند متفرق کتابیں بھی ہیں اور ترجمے بھی کئے ہیں۔ زمانہ میں تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھے ہیں۔

"رام چرچا" بچوں کے لئے نہایت سلیس زبان میں لکھا ہے۔ اور دوسری درسی کتابوں میں باکمالوں کے درشن، جو کئی مضامین کا مجموعہ ہے شائع ہوا اور کئی سال تک صوبوں کے مدرسوں میں رائج رہا۔ اور ابتدائی درجوں کے لئے ریڈریں تیار کیں غرضکہ منشی صاحب آخر دم تک ہندوستانی ادب کی خدمت کرتے رہے

خاتمہ: منشی صاحب سنہ ۱۹۲۱ء میں تحریک آزادی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے آپ کو وطن کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ اور اپنی تصانیف کے ذریعہ قوم کے مردہ دلوں میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ افسانہ نگاری اور ناول نویسی میں ایک الگ کمال حاصل کر لیا لیکن یہ تمام افسانے اور ناول محض رونق محفل کے لئے نہیں لکھے گئے بلکہ ایک خاص مقصد پیش نظر تھا ان کا مقصد یہ تھا۔

۱- حسن اعمال اور حسن اخلاق کو مجازت حقیقت کی طرف لے جانا۔ اور اس طرح کے کرم ۔اعمال کو دھرم یا ایمان سے ہم رشتہ کرنا۔

۲- معیار انسانیت کو کمال تک پہونچانے والے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈالنا

۳- محبت وطن اور آزادی کے پیام سے مذہبی معاشرتی تعلیم بہم پہونچانا۔

منشی صاحب نے اس مقصد کو بڑے اچھے انداز سے پیش کیا ہے۔ کہیں ویدانیت کی تعلیم کہیں بھگتی کی کہیں اخلاقیات کی، کہیں علم النفس کی۔ کہیں رنگ فطرت کا غلبہ ہے۔ کہیں حقیقت مجاز کا امتیازی پہلو کہیں یگانگت اور اتحاد کے گیت ہیں کہیں فرقہ وارانہ نوک جھونک ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے اردو ہندی کی چاشنی سے عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔

پریم چند کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے دیہاتیوں، غریب گھرانوں اور اوسط طبقے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اپنی کتابوں میں جا بجا ان کی حالت کا نقشہ اس پر اثر انداز میں کھینچا ہے کہ پڑھتے وقت رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ بار بار ہندوستانیوں کو غیرت دلاتے ہیں کہ ہندوستان کی ۹۰ فیصدی آبادی کا کیا حال ہے اس وقت جبکہ دنیا ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ہندوستانی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس بے بسی اور بے کسی کے عالم میں پڑے سسکیاں لے رہے ہیں۔ کیا ساری دنیا کی مصیبت ہندوستانیوں کے حصہ آئی ہے۔ منشی جی کی کتابیں پڑھنے سے ہر شخص کو غیرت آتی ہے۔ اور اپنی زندگی سنوارنے اور آزادی حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔

متوسط طبقے کی طرز معاشرت کو مدنظر رکھتے ہوئے منشی صاحب قدامت پسند تھے لیکن لبرل خیال سے انھیں بیر نہ تھا۔ البتہ سیاسی اعتبار سے یہ انتہا پسند کانگریسی تھے۔ ان میں مذہبی رواداری بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کی تصانیف تعصب کے عیب سے پاک ہیں۔ ان کو متعصب کہنا سراسر غلطی ہے۔ ان میں شگفتگی بھی تھی اور کہیں کہیں ظرافت بھی ملتی ہے۔ ان کی تصانیف میں درد ہے سوز ہے دلکشی ہے انکا حساس دل جو کچھ محسوس کرتا تھا سیدھے سادے الفاظ میں ادا کر دیتے تھے

پریم چند ہمارے ادب کے رہنماؤں میں سے تھے۔ انھوں نے جو کچھ لکھا اپنی زبان کے لئے۔

اپنے وطن کے لئے غریبوں اور کمزوروں کے لئے۔ انھوں نے نوجوانوں کو ایک راستہ دکھایا جس پر چل کر سینکڑوں نوجوان ادبا اور اپنی قوم کا بھلا کر سکتے ہیں۔ منشی صاحب کی مختصر الفاظ میں اس سے بہتر تعریف نہیں کی جا سکتی جو مولوی عبدالحق صاحب نے کی ہے ان کے خیال میں

"منشی صاحب نے ادب کو زندگی کا ترجمان بنایا۔ زندگی کو شہر کے تنگ گلی کوچوں میں نہیں بلکہ دیہات کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں جا کر دیکھا انھوں نے بے زبانوں کو زبان دی اور ان کی بولی میں بولنے کی کوشش کی۔"

پریم چند کے نزدیک اردو ایک کھونٹی تھی ادب کو لٹکانے کے لئے۔ وہ سماج کو بہتر اور برتر بنانا چاہتے تھے۔

پریم چند ہمارے ادب کے سرتاجوں میں تھے وقتی مسائل کی اہمیت کو انھوں نے اس شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ فن کے معیار کو اس پر قربان کر دیا۔ افسانہ نگاری میں ان کا وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں حالیؔ کا۔ دونوں پیش رو تھے۔ دونوں پیغامبر تھے۔ دونوں بیداری کے نقیب تھے شخصی حیثیت سے بھی دونوں ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سادگی کے رسیا۔ اخلاص کے پجاری۔ انھوں نے زندگی کا مرانی کا پیغام سنایا۔ اسی میں عمر گذاری سختیاں جھیلیں اور شہادت کے درجہ کو پہونچے۔

محمد اسمٰعیل خاں بی۔اے (جامعہ)

لکھنویت کیا ہے؟

لکھنویت سے مراد شعر و ادب میں وہ خاص رنگ ہے جو لکھنؤ کے شعرائے متقدمین نے اختیار کیا اور جو اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر قدیم شاعری سے جدا ہے یہ صحیح ہے کہ متاخرین شعرائے لکھنو نے قدیم رنگ میں کچھ اصلاح کر کے ایک نیا انداز سخن گوئی کا پیدا کر لیا تھا لیکن وہ ردعمل کے طور پر واقع ہوا تھا۔ لکھنویوں کے اصلی رنگ کو دیکھنا ہو تو اس زمانہ پر نظر ڈالئے جب لکھنو کا شباب تھا دولت کے دریا بہہ رہے تھے۔ آسمان سے ہُن برس رہا تھا دور دور سے کمال اور اہل فن کھنچے چلے آ رہے تھے اور لکھنؤ تھا کہ ہر ایک کے لئے اس کی آنکھیں فرش راہ تھیں رفتہ رفتہ اودھ کی سرزمین فخر البلاد ہو گئی۔ اس کا اندازہ ایک معاصر کے اس بیان سے کیا جا سکتا ہے[1]

"صوبہ اودھ در اضلاع شمالی ہند واقع شدہ، اکثر طولش صد وسی کروہ واکثر عرضش صد و لبست حضارۂ آں مشحون شرفائے کرام و بداوۂ آں معمور بایلات و احتشام مقتدران ثغور او دھ را مزال اقدام یافتہ و بہائے سلطانیہ سلطان پور رنجبہ پور سا مربر تافتہ، قناد ان پرتاب گڈھ و صفدر گنج در صناعت خویش ید طولیٰ و نساجان مانڈہ و شاہ آباد تار و پود سے رسا دارند، گوئندگان بیسواڑہ مغنیان کمباچ و سندرا تکلیف بگوشمال و طوطیان ہند را تحریص بہ حکایت اعمال نمودہ۔ مرحومین میر علی صاحب تا آنکہ عارج ایں سُلّم و سَلِم ایں معارج بودند استفادہ خویش از یں جماعہ نقل می کردند علمائے فرنگی محل و سندیلہ کوس لِمَنِ المُلک نواختہ و منطقیان سالی و کسمنڈی نعرۂ ہَل مِن مُبارِد بلند ساختہ، مشائیہ خیرآباد در سلک تحقیق قدم زدہ و اشراقیہ گوپامئو با صبح صادق دم زدہ، سرزمین بلگرام در مردم خیزی بہشت آدم می نماید، و مرزمرزا پور در کنار خیزی پہلو بفلک سابع می ساید۔

ان ہی باکمالوں میں ایسے باکمال شاعر بھی تھے جن کے وجود پر ہندوستان کو ناز تھا اور جو اب تک گردش روزگار سے آوارہ وطن ہو کر بھٹکتے پھر رہے تھے ان میں سے جو یہاں آگیا پھر مر کر اٹھا۔

---

[1] تاریخ عماد السعادت۔ سید غلام علی خاں (۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء) قلمی نسخہ موجودہ کتب خانہ لٹن لائبریری عبدالسلام سکشن نمبر ۸۳/۴

لکھنؤ میں شاعری کی بزم قائم ہوئی تو اس سے بہت پہلے دو مجلسیں قائم ہو کر درہم برہم ہو چکی تھیں پہلی بزم دکن کی تھی، اور دوسری شاہان ہند کی۔

دلّی میں شاعری کی باقاعدہ مجلس ولی کی آمد سے شروع ہوتی ہے اور اس وقت قائم رہی جب تک دلّی دلّی رہی۔ اس دبستان یا دور کے شعراء نے سب سے پہلے زبان کی صحت و صفائی کی طرف توجہ کی اور بڑی کوشش سے ایسے الفاظ اور روابط جو ثقیل، ورنا مانوس تھے اور جو متقدمین شعرائے دکن بلکہ ولی اور ان کے معاصرین تک کے کلام میں موجود تھے ان کو متروک قرار دیا لیکن ان متروکات کے پس پردہ کوئی عصبیت کام نہیں کر رہی تھی یہی وجہ ہے کہ ہندی کے بہت سے شیریں اور سبک الفاظ باقی رہ گئے اور بعض فارسی کے محاورات کا ترجمہ ہو گیا۔

جذبات کے ادا میں متقدمین شعرائے دلّی نے خلوص اور صداقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کے شعر کی خوبی کا دار و مدار لفظی گورکھ دھندوں پر نہیں بلکہ جذبات کی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے ان کی شاعری داخلی اور قلبی ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے ہاں روحانی مضامین اور وجدانی کیفیات کی کثرت ہے۔ حُسن کے بیان میں حُسن کے اثر کو بیان کیا ہے۔ خارجی متعلقات حسن کی بحث ان کے ہاں یکسر مفقود ہے اور جن شعراء کے ہاں ہے بھی وہ نہ ہونے کے برابر ہے یعنی پوری کلیات میں اس مضمون کے دو چار شعر ہی نکلتے ہیں

مضمون کے علاوہ بیان میں بھی اس دبستان کی شاعری نے بڑا کمال پیدا کیا عشق و عاشقی، ہجر و وصال شکوہ و شکایات، حرف و حکایات کے جو مضمون ہمیشہ سے شاعر کہتے چلے آئے تھے انھیں اپنی زبان میں اس خوبی سے ادا کیا کہ ایک نیا لطف پیدا ہو گیا۔ ان کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز ہیں۔

یہ البتہ ہوا کہ ان متقدمین شعرائے دلّی نے دکن والوں کے مقابلہ میں نسبتاً زیادہ تشبیہ و استعارہ سے کام لیا ہے لیکن اعتدال کے دامن کو پھر بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے اور صنعت در صنعت، تشبیہ در تشبیہ یا استعارہ در استعارہ کر کے اشعار کو پیچیدہ اور مغلق نہیں بنایا ہے۔

اپنی جدت طبع سے انھوں نے جذبات اور خیالات اور مضامین میں باریکیاں نکالیں اور نزاکت و لطافت

کے پہلو کو زیادہ واضح اور روشن کیا لیکن تخیل کی پرواز میں انھوں نے کبھی حقیقت اور فطرت کو فراموش نہیں کیا یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں برس گزرنے پر بھی ان کا کلام ویسا ہی تر و تازہ ہے۔

شعر کے فن کے سلسلہ میں ان کی ایک بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ آزاد نے کسی موقع پر کہا ہے کہ "دوہوں کے انداز نے جو ہندوستان کا سبزۂ خودرو تھا اردو کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا" یہاں آزاد کا اشارہ ایہام اور ذو معنین کی طرف ہے۔ ہندی دوہوں میں بعض عجیب عجیب صنعتیں ہیں اگر ایک طرف سے پڑھیئے تو سیتا کی تعریف ہے اور دوسری جانب سے پڑھنا شروع کیجئے تو رام کی تعریف نکلتی ہے۔ اردو کے ابتدائی دکنی دور میں شاید زبان اس قابل نہ تھی کہ کسی صنعت کا بوجھ سنبھال سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کے عہد تک ان صنعتوں کا زیادہ زور نہیں رہا لیکن زبان میں قوت آتے ہی شاعروں نے اسی طرف توجہ کی اور شاہ مبارک آبرو اور ان کے معاصرین نے اسے بھی مستقل فن کی حیثیت بخشی۔

ان لوگوں نے اردو شاعری میں ایک نیا مضمون داخل کیا جو شعرائے دکن کے یہاں موجود نہیں یہ تصوف ہے۔ فارسی شاعری میں تصوف نے ایک خاص گداز اور کیفیت پیدا کر دی تھی۔ دکن میں چونکہ شاعری نے سلاطین کے زیر سایہ پرورش پائی اور دکنی سلاطین زیادہ تر اثنا عشری تھے اس لئے دکنی شعرا نے کبھی بھول کر بھی ان مضامین کی طرف رخ نہیں کیا جس طرح سلاطین صفوی کے اثر سے ایران میں کچھ عرصہ کے لئے متصوفانہ شعر و ادب کی ترقی رک گئی تھی اسی طرح سلاطین عادل شاہی و قطب شاہی کے عہد میں شعر و ادب کا سرمایہ ان خیالات سے خالی رہا۔ سب سے پہلے سراج نے اور پھر درد نے اس طرف توجہ کی۔ تصوف کی جگہ دکن میں شاعری میں مرثیہ گوئی شروع ہوئی تھی لیکن اسے بھی بحیثیت فن دکن میں کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ سب سے پہلے سودا نے مرثیہ کو مسدس میں لکھ کر وسعت پیدا کی۔

متاخرین شعرائے دلی کا رنگ متقدمین سے مختلف تھا۔ اپنے مذاق کے مطابق انھوں نے بھی زبان میں تراش خراش کی اور محاورہ کو ایسا درست کیا کہ ابتک اس میں بہت کم فرق آیا ہے لیکن ان کے خیالات بھٹکنے لگے اور جذبات عشق میں عشق حقیقی اور پاک و بے لوث الفت کے خیالات ترک کر کے ہوس پرستی کے جذبات نظم کرنے لگے جرات، انشا اور رنگین نے اس گندہ ذہنی کی ابتدا کی اور چونکہ یہی شعرا اگلے دور میں نمونہ بنے اس لئے جو زہر ان لوگوں نے اگلا تھا وہ تھوڑے ہی عرصہ میں شعر و ادب کے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔ ان ہی لوگوں نے ایجادت ریختہ کے ساتھ ریختی کو بھی ترقی بخشی ریختی دو قدیم دکنی شاعروں نے بھی لکھی ہے لیکن یہ ہندی شاعری کا نمونہ ہیں۔ ان میں وہ بدتمیزی اور ہوسناکی نہیں جو رنگین اور انشاء سے شروع ہوئی اور لکھنو پہونچ کر فن بن گئی۔

دلّی کی سلطنت کی بنیادوں کو عرصہ ہوا گھن لگ چکا تھا لیکن اب تک پوری عمارت بظاہر اسی شان و شوکت سے کھڑی تھی کہ یکایک ملک میں چاروں طرف سے طوفان اٹھا، ایک طرف مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دور دراز صوبوں میں آئے دن شورش ہونے لگی پنجاب میں جاٹوں نے، دکن میں مرہٹوں ادھر روہیلوں نے اپنی یورشوں سے اس عمارت کو ہلا دیا۔ لوگوں پر خواب و خور حرام ہوا۔ دربار برہم ہونے لگے تو درباری کہاں رہتے۔ یہ لوگ بھی کسی اور کا دامن تلاش کرنے لگے۔ کچھ لوگ مرشد آباد اور عظیم آباد کا قصد کر کے اٹھے اور جا پہونچے، کچھ حیدر آباد گئے لیکن یہ ان کا کام تھا جن کی ہمت جوان تھی اور اعضا اتنے دور دراز کے سفر کے مصائب برداشت کر سکتے تھے اس لئے یہی ہوا کہ شاعروں کی زیادہ تعداد فرخ آباد یا پھر فیض آباد میں جا بسی۔ فرخ آباد کی اسلامی ریاست بھی تھوڑے ہی دن ان لوگوں کا ساتھ دے سکی اور پھر صرف ایک مرکز فیض آباد یا اس کے بعد لکھنؤ رہ گیا جہاں ان لوگوں کو پناہ مل سکتی تھی۔ ان ہی مہاجرین کے اثر سے اردو شاعری کی تیسری محفل اودھ کی سرزمین پر قائم ہوئی جس کے تقدس پر آج تک ہندو دیومالا کی داستانیں اپنی مہریں ثبت کر رہی ہیں یہی دبستان شاعری لکھنؤ کا دبستان شعر ہے۔ جو اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے مذکور بالصدر دونوں دبستانوں سے ممتاز اور علیحدہ ہے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے

نواب سعادت خاں برہان الملک امین الدین نیشاپوری کو ان کی خدمات کے صلہ میں اودھ کی صوبہ داری عطا ہوئی تھی لیکن برہان الملک نے دلی کے دربار کا نقشہ دیکھ کر پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ اگر اپنے صوبہ کی خیر منظور ہے تو اپنا ہی بھروسہ کرنا پڑے گا۔ اور اسی لئے رفتہ رفتہ وہ اور ان کے جانشین دلی کے بادشاہ سے آزاد ہوتے گئے۔ اگرچہ عرصہ تک فرمانروایان اودھ نے نواب وزیر کے لقب پر قناعت کی اور دلی کے شطرنجی بادشاہ ہر نئے وزیر کے لئے خلعت اور خطاب بھیجا کرتا تھا لیکن انگریزوں نے بعض سیاسی مصالح کی بنا پر یہی بہتر سمجھا کہ نواب غازی الدین حیدر تاج شاہی زیب سر فرمائیں۔ اس دن سے گویا لکھنؤ کا دربار شاہی دربار ہو گیا اور دلی کا مقابلہ کرنے لگا۔ ایک مصنف جس نے یہ زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے:

> اپنے گھر سے جب نکلا تو پہلے ممتاز نگر پہونچا۔ یہ مقام شہر کے مغربی دروازے سے چار میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں دیکھا تو ایک بازار لگا ہوا تھا اور خرید و فروخت کی گرم بازاری

تھی۔ انواع و اقسام کے کھانے، مٹھائیاں، کباب، پراٹھے، نان خطائیاں، شربت اور فالودے والے ہر طرف نظر آتے تھے اور راہگیر خریداری میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے اور کثرت ہجوم میں ایک دوسرے پر گرتے پڑتے یہ ہنگامہ اور رونق دیکھ کر خیال گذرا کہ میں شہر میں داخل ہو گیا ہوں اور خاص چوک میں ہوں لیکن کسی نے مجھے بتایا کہ ابھی تو میں شہر پناہ کے دروازے میں بھی داخل نہیں ہوا تھا۔ آخر کار میں شہر میں پہونچا۔ ہر جگہ ناچنے اور گانے والوں کے طائفے دیکھے جنھیں دیکھ کر اور سن کر میری عقل دنگ رہ گئی۔ صبح سے شام تک اور غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک فوجوں کے ڈھولوں اور باجوں کی مسلسل صدائیں آتی رہتی تھیں گاڑیوں کی صداؤں سے کان بہرے ہوئے جاتے تھے، گھوڑے، ہاتھی، اونٹ، خچر شکاری کتے، بیل اور بیل گاڑیاں اور توپیں لے جانے والی باربرداری کی گاڑیوں کی قطاریں کی قطاریں سڑکوں پر چلتی رہتی تھیں۔ لباس فاخرہ پہنے شرفائے دہلی کے اعزا اور رشتہ دار، یونانی اطبا، ہر طرح کے گانے بجانے والے۔ قوال، بھانڈ اور طوائفیں ہر طرف دکھائی دیتی تھیں اور سب اپنی اپنی زندگی عیش و آرام میں بسر کر رہے تھے چھوٹے اور بڑے سب کی جیبیں زر و جواہر سے بھری ہوئی تھیں۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی مفلسی اور فلاکت کا خیال نہیں گزرتا تھا۔ نواب وزیر شہر کی آبادی اور رونق میں کوشاں تھے معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد دلّی کی ہمسری کا دعویٰ کرے گا۔[1]

اسی مصنف کا کہنا ہے کہ اگر کچھ برس اور فیض آباد کی آبادی کو گزرتے تو ایک دوسرا شاہجہاں آباد وجود میں آ جاتا لیکن نواب شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اجاڑ کر لکھنؤ کو بسایا۔ اہل فضل و کمال کا جو سیلاب اب تک فیض آباد کی طرف آ رہا تھا لکھنؤ کی طرف امنڈ پڑا۔ فیض آباد میں بھی شعرائے دلّی میں سے آرزو اور ضاحک آ چکے تھے۔ لکھنؤ دار السلطنت ہوا تو ضاحک کے بیٹے میر حسن اور ان کے پوتے میر مستحسن خلیق بھی آ گئے۔ میر سوز، ہ

---

[1] تاریخ فرح بخش از فیض بخش کاکوروی، قلمی نسخہ موجودہ لٹن لائبریری علی گڑھ۔ و انگریزی ترجمہ یادگار فیض آباد مصنفہ ولیم ہالی۔ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ مطبوعہ گورنمنٹ پریس صوبہ شمالی و مغربی ۱۸۸۸ء صفحہ ۱۲

مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، غلام ہمدانی مصحفی، میر انشا اللہ خاں انشا، شیخ قلندر بخش جرأت بھی آ گئے۔ پرانے شاعر تو مرکھپ گئے البتہ نوجوانوں نے میدان خالی پا کر اپنا رنگ کھل کر کھیلا دلی کی شاعری اپنے دور آخر میں جس رنگ میں انشا، رنگین اور جرأت کی بدولت رنگ رہی تھی وہاں سے لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی اور چونکہ بنیاد کج تھی اس لئے عمارت آخر تک کج ہی چلی گئی۔

لکھنؤ کی شاعری پر سب سے پہلا اثر لکھنؤ کی معاشرت کا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے سحر نے اپنے ان الفاظ میں بیان کیا ہے[1]

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو　　ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر اک کوچہ ہے عشرت کا

اسی دولت کی فضا نے تعیش اور آزادی کی راہ دکھائی، تماش بینی پر لوگ فخر کرنے لگے۔ شجاع الدولہ کے متعلق فیض بخش نے آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے کہ انھیں فطرتاً عورتوں کی صحبت پسند تھی۔ لہذا بازاری عورتیں اور ان کے گانے والے طائفے اس قدر کثرت سے تھے کہ کوئی محلہ یا کوچہ ایسا نہ تھا جہاں وہ موجود نہ ہوں اور مالی اعتبار سے ان کی حالت ایسی اچھی تھی کہ ان میں اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں اور ان کے ساتھ دو دو تین تین خیمے رہا کرتے تھے نواب وزیر جب اضلاع کا دورہ کرتے تھے تو ان کے ڈیرے بھی نواب وزیر کے ڈیروں کے ساتھ چلا کرتے تھے اور دس بارہ تلنگے ان کی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے فوجی حکام اور امرا بھی علانیہ بلا خوف رسوائی اپنے آقا کی نقل کرتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جذبات میں جو شرافت تہذیب، متانت اور شائستگی دلی کی عام سوسائٹی کا عام قاعدہ تھا۔ ان کی جگہ لکھنؤ میں رکاکت و ابتذال، ہوسناکی اور فحاشی نے لے لی اور اس میں دو ایک مستثنیات کے علاوہ سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ گویا یہ ایک حمام تھا جس میں سب ننگے ہی ننگے جمع تھے چنانچہ یہاں کا ابتدائی شعر و ادب کا سرمایہ بھی اسی میلان کا آئینہ دار رہے۔ جذبات کی وہ پاکیزگی جو دہلوی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے یہاں عنقا ہے۔ اس کی جگہ ایک نیا فن ہے جسے معاملہ بندی کا نام دیا گیا ہے یہ صحیح ہے کہ اس فن میں جرأت بہت زیادہ نام آور ہوئے اور وہ دلی سے آئے تھے لیکن ان کے

---

[1] گل رعنا صفحہ ۳۲۹۔

مذاق کی تسکین میں لکھنؤ کی فضا کو بڑا دخل ہے جس کے ماحول نے انھیں اس بات کا موقع بخشا کہ وہ اپنے فطری جذبات اور میلانات کو نظم کریں اور ملک سے خراج تحسین حاصل کریں۔ مثالیں ملاحظہ ہوں

کل واقف راز اپنے سے وہ کہتا تھا یہ بات | جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانئے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر | جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

چنانچہ ان شاعروں کی گل افشانی دیکھئے جن پہ لکھنؤ کو ناز ہے۔

رات کو پوری چھپے یہو بجا جو میں | غل مچایا اس نے دوڑ و چور ہے (ناسخ)
کھولئے شوق سے بند انگیا کے | لیٹ کے ساتھ نہ شرمائیے آپ (رند)
ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آگئی | آج ہم عنقا کو لائے دام میں (مسیح)
تیرے پستاں پہ نظر آتا ہے عالم نور کا | اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا "
کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت | ٹال کر کہنے لگا دن ہے ابھی رات کے وقت (انشا)
مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے | بہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا (امانت)

اس معاملہ بندی کے ساتھ قدرتی طور پر شاعری کی ہر صنف میں رکاکت اور ابتذال سرایت کر گئے۔ اس بڑھتے ہوتے سیلاب کو اگر ایک طرف انیس اور دوسری طرف دبیر و محسن نہ روکتے تو نہ معلوم یہ لکھنؤ شعر و ادب کو خس خاشاک کی طرح بہا کر کہاں لے جاتا لیکن ان دونوں کا رنگ لکھنؤ میں منفرد اور لکھنؤ کے عام طرز سے جدا ہے۔ لکھنؤ کا عام رنگ وہی تھا جس کی بحث اوپر آچکی۔

اسی سلسلہ میں نسائیت کا عنصر بھی شعر و ادب کی تعمیر میں شامل ہوگیا۔ ہندی شاعری میں جذبات کی آگ کو دہکانے کے لئے عشق کا اظہار عورت کی طرف سے کرایا گیا ہے اور قدرتی طور پر زبان اور خیالات عورتوں کے نظم ہوتے ہیں۔ اسی کی تقلید میں متقدمین شعرائے اردو نے اپنی داستان عشق صنف نازک کی آڑ لے کر ان کی زبان میں بیان کی ہے افضل جھنجانوی (المتوفی ۱۰۳۵ھ) کا مشہور بارہ ماسہ اس قبیل کی بہترین مثال ہے۔ شجاع الدولہ کے عہد سے حسین اور مہ جبین عورتوں کو سوسائٹی میں بڑا دخل ہوا۔ ادھر عیش و عشرت

---

[1] ملاحظہ ہوں گل رعنا صفحہ " امانت کی غزل گوئی پر ایک نظر از راقم السطور مطبوعہ جامعہ جنوری ۱۹۳۱ء۔

اور فراغت نے مردانہ جذبات اور خیالات کو کمزور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مردوں کے جذبات، خیالات اور زبان پر نسائیت غالب آگئی۔ بعض مسخروں نے ریختہ کے جواب میں ریختی کو ترقی دے کر رواج دیا اور اس میں اپنی بیہیائی کی داستانیں بے شرمی سے نظم کیں۔ ریختی کے ان نمونوں میں لکھنؤ کی جن عورتوں کے جذبات ان کی زبان میں ان گندہ دہن شاعروں نے نظم کئے ہیں وہ لکھنؤ کی سوسائٹی پر ہمیشہ بدنما داغ بن کر رہیں گے۔

نسائیت کا اثر صرف ریختی کی صورت میں ہی ظاہر نہیں ہوا۔ عام خیالات، جذبات زبان اور محاورہ میں نسائیت آگئی۔ اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ میں جو اردو کی ایک مستند لغت ہے جہاں کسی خاص محاورہ کو بیان کیا ہے تو جان صاحب یا کسی ایسے شاعر کا کلام سند میں پیش کیا ہے جو عورتوں کے جذبات ان کی زبان میں ادا کرتے ہیں۔

اسی لکھنوی فضا کا ایک اہم رخ آزادی تھا نواب وزیر نے دلی کے دربار سے آزادی کیا حاصل کی کہ لکھنؤ والوں نے ہر شے میں خود کو آزاد کر لیا۔ تہذیب و تمدن اور معاشرت کے نئے اصول مدون ہوئے لباس وضع قطع میں نئی نئی تراشیں اور خراشیں ہوئیں۔

آداب مجلس اور گفتگو میں فرق قائم ہوا چنانچہ ادیب اور شاعر بھی شاعری کے مروجہ اور مستعملہ اصولوں اور اسالیب سے انحراف کرنے لگے۔ وہاں شاعری جذباتی اور داخلی تھی تو یہاں لفظی اور خارجی ہو گئی۔ وہاں عین عالم فطرت تھا تو یہاں کمال صنعت معیار ٹھہرا۔ وہاں سادگی اور برجستگی تھی تو یہاں تکلف اور تصنع کو دخل ہوا۔ زبان میں ایسی تراش خراش کی اور اس کے اصول منضبط کئے جو اس سے پہلے موجود نہ تھے۔

اس آزادی کا تاریک پہلو تو یہ تھا کہ اثر جو متقدمین شعرائے دکن و دلی کے کلام کو ممتاز کرتا ہے رفتہ رفتہ کم ہونے لگا لیکن ایک پہلو روشن بھی تھا اور یہ صفائی زبان کا ہے اس سلسلہ میں جو کوششیں شعرائے دلی نے کی تھیں حضرات لکھنؤ نے انھیں جاری رکھا بلکہ انھیں ایک خاص صورت بخشی۔ مثلاً تذکیر و تانیث کے اصول باقاعدہ طور پر منضبط نہیں ہوئے تھے ناسخ نے بڑی کاوش سے انھیں مرتب کیا اور پھر خود سختی سے ان کی پابندی کی زبان کی صفائی کے سلسلہ میں لکھنؤ کا کارنامہ اردو کی تاریخ میں یقیناً زرین حروف سے لکھا جائے گا۔ اس کا اعتراف خود دلی والوں نے کیا ہے چنانچہ شاہ نصیر کو دلی والے اپنا ناسخ کہتے تھے اور غالب نے بھی اس مصرعہ کو سن کر۔

؎ نہاتا ہے وہ مہ دریا میں کپڑے جو رد ہوتی ہے

کہا تھا کہ مضمون دلی کا اور زبان لکھنؤ کی خوب ہے۔ اصلاح زبان کے سلسلہ میں اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

آزادی کے علاوہ لکھنؤ کی فضا کا ایک اہم ترین عنصر تکلف تھا۔ ان کے تمدن کی بنیاد ہی تصنع، تکلف اور بناوٹ پر رکھی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک لکھنوی حضرات اپنے تکلف کے لئے ضرب المثل ہیں۔ شعر و ادب میں بھی تکلف، ان کے ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کی ایک مثال رجب علی بیگ سرور کے فسانہ عجائب سے ملتی ہے۔ سرور نے اگرچہ اس کی معذرت کی ہے کہ ان کی کتاب کو میر امن کی باغ و بہار کا جواب نہ سمجھا جائے لیکن اس کو کیا کیجئے کہ خود ان کے بیان سے یہی مترشح ہوتا ہے۔ میر امن نے اپنا قصہ سادگی و سلاست سے بیان کیا ہے جسے سرور، محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑنا کہتے ہیں، سرور کی عبارت نہایت پر تکلف اور بے شمار صنائع لفظی و معنوی سے گرانبار ہے۔ یہی حال شعر کا ہے لکھنوی شعرائے شعر کے ظاہری پیکر پر زیادہ توجہ کی ہے اور اس اعتبار سے ان کے اشعار نہایت مرصع اور آبدار ہیں۔ اگر کسی کو صرف زبان کا لطف اٹھانا ہے تو وہ ایسے لکھنوی شاعروں کا کلام پڑھیں جنھوں نے مروجہ شکل پسندی سے اپنے دامن کو بچا کر عام خیالات کو اپنی زبان میں ادا کیا ہے۔

اس حیثیت سے ان کی تمام شاعری ایک جمالیاتی نظریہ کے تحت میں ہے یہ جمالیاتی نظریہ صنعتگری کا ہے اور ہر فن کی تاریخ میں اس کا ایک دور ضرور آتا ہے۔ اس عہد کو آپ چاہیں تو انتہائی کمال سمجھ سکتے ہیں۔ اور یہی ابتدائے زوال ہے۔ ہر فن کی ابتدا فطری ہوتی ہے۔ موسیقی میں پہلے پہل گانے والوں نے قدرتی آوازوں کے زیر و بم کی نقل کی اور اس کے دقیق اصول اور قانون وضع ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ آج موسیقی میں کمال پیدا کرنے کے لئے اس کی باقاعدہ تحصیل ضروری ہے یہی کیفیت رقص کی ہے۔ قوموں کے ساتھ ساتھ ان کے رقص بھی صنعت کا نمونہ بنتے چلے جاتے ہیں ورنہ ان قوموں کا رقص دیکھئے جو اب تک جدید تہذیب و معاشرت کی روشنی سے آگاہ نہیں ہوئے ہیں ان میں ایک فطری سادگی موجود ہے۔

یہی حال شاعری کا ہے ہماری شاعری کا اصلی سرچشمہ عربی شاعری ہے۔ ایران والوں نے اپنے مرصع تمدن سے عربوں کی سادہ شاعری پر ایک انقلابی اثر ڈالا جو عربوں کے فتح ایران کے بعد شروع ہوتا ہے۔

اور بقول ایک ناقد کے سادگی اصلیت اور جوش ہی شعر کے عناصرِ ثلاثہ ہیں۔ عربوں کی شاعری لفظی صنائع اور بدائع سے بہت کم گراں بار ہے۔ ان کے ہاں تشبیہہ اور استعارات کا رواج ہے لیکن ان کی تشبیہات اور استعارات سریع الفہم اور سادہ ہیں۔ ان کے اشعار کو پڑھ کر دل پر اثر ہوتا ہے۔ دماغ شعر کے معمہ کو حل کرنے میں نہیں الجھتا

لیکن ایرانیوں نے عربوں سے مل کر ان کے شعر و ادب پر ردعمل کیا اور یہی وجہ ہے ایرانی اسلامی شاعری میں صنعتگری کی ابتدا ہوئی اور جس زمانہ میں اردو شاعری کا ظہور ہوا۔ اس وقت فارسی شعرگوئی کا فن صنعتگری کے دور سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے فارسی گو شعرا نے جن میں امیر خسرو اور بیدل جیسے عظیم المرتبت شاعر بھی شامل ہیں شاعری میں باوجود اپنی جدت طبع کے اس نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اردو شاعری اس وقت بچپن کی حالت میں تھی اور اس صنعتگری کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اردو ایک بچہ تھی جس کی زبان ابھی صاف نہیں ہوئی تھی یہی وجہ ہے کہ متقدمین شعرائے دکن کی شاعری حد باقی اور نطری ہے متقدمین شعرائے دہلی نے جن کے ہاں ولی کی آمد کے وقت بیدل کی فارسی شاعری کا انداز مقبول تھا شعرگوئی شروع کی تو ایہام گوئی اور تجنیس سے شروع کی۔ دلی والوں نے پہلے پہل خود اس کے خلاف جدوجہد کی خصوصاً مرزا مظہر جانجاناں جو اس اصلاح کے امام کہے جا سکتے ہیں۔

اس کے بعد شاعری لکھنؤ پہونچی یہاں تہذیب و تمدن پر تکلف اور تصنع کا رنگ چڑھ ہی رہا تھا ادھر زبان میں وسعت پیدا ہو چکی تھی اس لیے شاعری جدید رنگ میں پیش کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی صورت ممکن نہیں تھی کہ اسے صنعتگری بنا دیا جائے۔ (باقی آئندہ)

ابواللیث صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ (علیگ)

نثر اُردو کی تدریجی ترقی

گذشتہ سے پیوستہ

چوتھا دور

کلکتہ کا ادبی دور

یعنی

فورٹ ولیم کالج کی نثر

سنہ ۱۸۰۰ء سے سنہ ۱۸۲۰ء

اب تک نثر اردو کے تین دوروں سے بحث کی گئی اور ہم نے دیکھا کہ کس طرح رفتہ رفتہ اُردو نثر تدریجی ترقی کرتی ہوئی منازل ارتقا طے کر رہی ہے۔ پہلے اور دوسرے دوروں کے اوائل میں اگر وہ صرف روزمرہ کی بول چال اور عام گفتگو یا سیدھے سادے مذہبی مسائل و احکامات بیان کرنے کی اہلیت رکھتی تھی تو دوسرے دور کے آخر آخر اور تیسرے دور میں وہ اس منزل سے گذر کر تخیلی اور زیادہ وسیع مباحث کے اظہار کا ذریعہ بن گئی اور عربی فارسی الفاظ کے کثرت استعمال سے اس کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلوب بیان، طرز ادا تکلف تصنع اور آورد پر مبنی ہوتا گیا اور وہ پرانی ابتدائی سادگی، خوبصورتی اور بے ساختہ پن ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے۔ جیسا کہ ہم تفصیلی طور پر مندرجہ بالا بحث میں دیکھ چکے۔

نثر اردو کی تاریخ میں وہ دن مبارک تھا جب فورٹ ولیم کالج کی بنیاد پڑی اور اس کے ذریعہ زبان کو ترقی دینے کی منظم کوششیں شروع ہوئیں یہ دن اس لئے اور بھی مبارک تھا کہ اس دن سے اردو میں جو تصنع آمیز اور دقیق رنگ مقبول تھا اس کی جگہ سیدھا سادہ اور آسان اسلوب بیان اور طرز تحریر پیدا کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔

اس کالج نے نثر اردو کی عمارت کی نیو کس طرح ڈالی ؟ اور نثر نویسی کی کیسی اساسی تحریک کی ؟ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے لئے وسیع میدان کھل گیا اور اردو زبان کی شاندار عمارت چنی جانے لگی۔ فورٹ ولیم کالج کے قائم کرنے والے اور اس سے فائدہ اٹھانے والے انگریز تھے جو ہندوستانی زبان وادب سے نا آشنا تھے۔ انگریز جو پہلے سے ہندوستان کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر مغلیہ سلطنت کو مال مردہ سمجھ چکے تھے اب حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن ملک کی زبان ان کی ذہنیت اور ان کے رجحانات سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔ اور یہ کام ڈاکٹر گلکرسٹ نے انجام دیا۔

انگریزوں کو اردو سے واقف کرانا اس ادارہ کا اولین مقصد تھا اس کام کے لئے ضروری تھا کہ ایسے اصحاب منتخب کئے جائیں جو زبان اردو کے مستند صاحب طرز ہوں اور ملک کے مختلف حصوں کی بولیوں سے واقفیت تامہ رکھتے ہوں دوسرے یہ کہ جس زبان میں تصنیف کریں وہ آسان اور سریع الفہم ہو۔ ایسی اردو جو خود ہندوستان والوں کی سمجھ میں نہ آئے انگریزوں کے لیے اس کا سیکھنا نا ممکن بھی تھا اور بیکار بھی چنانچہ اسی مقصد کو سامنے رکھکر فورٹ ولیم کالج کی تمام تصانیف سہل اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔

جو خدمات زبان اردو کی اس ادارہ نے انجام دیں وہ حقیقتاً اردو کے حق میں اکسیر ثابت ہوئیں۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے سب سے پہلے اُردو کا اس قسم کا دار التصنیف قائم کیا جس کی ضرورت اس کے بعد خود اہل زبان کو محسوس ہوئی جس قسم کا ادبی حلقہ سرسید نے اپنی کوششوں سے بعد میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے قائم کیا وہ اس ادبی حلقہ کا نقش ثانی تھا جو سب سے پہلے کلکتہ میں ڈاکٹر گلکرسٹ کی سرپرستی میں قائم ہوا تھا اور جس کی منظم کوششوں سے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے لئے وسیع ترین میدان کھل گیا۔

چوتھے دور کی تصانیف | اس دور کے مشہور مصنفین میں میر امّن، شیر علی افسوس، حیدر بخش حیدری، بہادر علی حسینی حفیظ الدین احمد، نہال چند لاہوری، اکرام علی، امانت اللہ، مرزا لطف علی اور للولال جی ہیں۔ یہ سب اردو زبان کے مشہور صاحب طرز استاد گذرے ہیں۔ ان کی تصانیف میں باغ و بہار، گنج خوبی، طوطا کہانی، آرائش محفل، گلزار دانش اخلاق ہندی، خرد افروز اور باغ اردو بہت مشہور ہیں لیکن فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں سے تین اشخاص

خاص طور پر مقبول ہوئے ہیں (۱) میر امن (۲) میر شیر علی افسوس (۳) حیدر بخش حیدری۔ ان میں سے بھی سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت صرف میر امن کے حصہ میں آئی ہے۔ ان کی "باغ و بہار" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ ان کی دوسری تالیف "گنج خوبی" ہے لیکن اس کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی "باغ و بہار" کی ابتدا میں میر امن فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"صاحبان ذیشان کو شوق ہوا کہ اردو زبان سے واقف ہو کر ہندوستانیوں سے گفتگو اور گفت وشنید کریں اور ملک کے کام کو بخوبی انجام دیں۔ اس واسطے کتنی کتابیں اس سال بموجب فرمائش کے تصنیف ہوئیں"۔

میر امن کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ باغ و بہار کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جو صاحب دانا اور ہندوستان کی زبان بولنے والے ہیں ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ یہ قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو نے اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیاء جو ان کے پیر تھے اور درگاہ ان کی دلی میں قلعہ سے تین کوس لال دروازہ کے باہر مٹیا دروازہ کے آگے لال بنگلے کے پاس ہے۔ آپ کی طبیعت ماندی ہوئی تب مرشد کامل کا دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو رحمہ اللہ یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے۔

میر امن کا طرز انشا | جہاں تک طرز انشا کا تعلق ہے پہلے دور اور اس دور کے طرز انشا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانی روش کے مطابق وہ عبارت جو مقفیٰ اور مسجع نہ ہو پھیکی اور غیر معیاری سمجھی جاتی تھی یہ دور اس تکلف اور تصنع سے بری ہے اور خصوصاً میر امن اپنی اس صفت میں اپنے تمام ہمعصروں سے بہت ممتاز ہیں۔ ان کی عبارت کو تو تصنع اور تکلف کہیں سے چھو بھی نہیں گیا جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے کہ۔

"میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"

بالکل واقعہ ہے کہ باغ و بہار کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے لیکن تکلف اور آورد کا کہیں نام ونشان بھی نہیں ملتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بغیر کسی کوشش کے مصنف کے قلم سے فقرے خود بخود ٹپک پڑے۔ لکھنے والے نے اپنی طبیعت پر زور ڈال کر کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ ان ہی وجوہ سے باغ و بہار کو باعتبار زبان اس وقت

کی نہایت سلیس سادہ، شیریں اور فصیح کتاب سمجھنا چاہئے۔ میر امن اسے معیاری اُردو کہتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"اب نئے سرے سے زبان کو رونق ہوئی۔ نہیں تو اپنی دستار و رفتار کو کوئی بُرا نہیں جانتا۔ ایک گنوار سے پوچھئے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے۔ خیر عاقلاں خود می دانند، بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کو دلّی میں گئے اور رہے وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے۔ جو شخص سب آفتیں سہہ کر دلّی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گذریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس چھڑیاں سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تلک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے یہ عاجز بھی ہر ایک شہر کی سیر کرتا اور تماشا دیکھتا یہاں تک پہونچا ہے۔"

میر آمن خاص دلّی کے رہنے والے تھے۔ ان کی زبان وہاں کی ٹھیٹھ روزمرہ اور ٹکسالی زبان ہے۔ اسی لئے وہ سند ہے یہ زبان سوا سو برس پہلے کی زبان کا نمونہ ہے۔ گو آج کی زبان سے کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے مگر بہت کچھ ہماری اس وقت کی زبان سے ملتی جلتی ہے یہی وجہ اس کتاب کی مقبولیت کی ہے۔ اس کا اسلوب بیان سادہ اور عبارت سلجھی ہوئی ہے۔ فارسی کے جو الفاظ او رترکیبیں استعمال کی گئی ہیں وہ اس خوبی سے اُردو میں کھپا دی گئی ہیں کہ بدزیب ہونے کے بجائے ان سے زبان کا حسن اور بھی بڑھ گیا ہے لیکن عربی اور فارسی کے موٹے اور ثقیل الفاظ او رترکیبیں ان کی عبارت میں ناپید ہیں۔ جگہ جگہ ہندی الفاظ بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے گئے ہیں اس کے علاوہ سادگی اور بے ساختہ پن عبارت کی جان ہے جس میں وہ رنگینی اور شیرینئ بیان ہے جو بہتر سے بہتر مقفیٰ، مرصع، مسجع عبارتوں میں نہیں ملتی اور یہی میر آمن کی طرز انشا کی ہمارے خیال میں سب سے بڑی خوبی ہے۔

جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے میر آمن نے فصاحت کے ہر پہلو کو مدنظر رکھا ہے ہر عبارت موقع و محل کی مناسبت سے ہے۔ وہ محاوروں اور روزمرہ کے آگے قواعد زبان کی پابندی کی پروا نہیں کرتے وہ بول چال کی زبان کو ہر دوسری چیز پر ترجیح دیتے ہیں۔ انھیں کسی واقعہ کا نقشہ کھینچنے اور اس کو اس طرح پیش کرنے

یں خاص کمال ہے کہ اصل سماں آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ منظر کشی بھی خوب کرتے ہیں۔ اور اس کی ابتدا امیر آتمن نے کی ہے جس کو عصر حاضر کے اردو ناول نگاروں نے ترقی دی مثلاً ایک جگہ منظر کشی اس طرح کرتے ہیں۔

"ایک روز بہار کے موسم میں مکان بھی دلچسپ تھا۔ بدلی گھمنڈ رہی تھی۔ بوندیاں پڑ رہی تھیں بجلی بھی کوندرہی تھی اور ہوا نرم نرم آتی تھی۔ غرض عجیب کیفیت اس دم تھی۔ جوں ہی رنگ برنگ کے حباب اور گلاب کی گلابیاں طاقوں پر چنی ہوئی نظر آئیں دل للچایا کہ ایک گھونٹ پی لوں جب دو تین پیالوں کی نوبت پہونچی وہیں مجھ کو خیال ہوا کہ اس باغ نو خرید کو دیکھوں کمال شوق سے باغ کی سیر کرنی چاہی .... یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا کہ جا بجا قمقمے، سرو چراغاں، کنول فانوس خیالی، شمع مجلس حیران اور فانوسیں، روشن تھیں کہ شب برات با وجود چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی تھی۔ ایک طرف آتش بازی چھٹتی تھی اس عرصہ میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا بعینہ جیسے نافرمانی جوڑا پہنے کوئی معشوق نظر آتا ہے۔"

قصے کے سلسلہ میں جب آداب و رسوم کا ذکر آ گیا ہے وہ ہندوستان کی اُس عہد کی معاشرت کی اچھی تصویریں ہیں مثلاً ایک موقع پر ایک تقریب کی تیاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ گلاب پاش عطر دان، پکدان چنگیریاں قرینے سے دھری ہیں۔ طاقوں میں رنگترے۔ کوزے، نارنگیاں اور گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹیٹوں میں چراغاں کی بہار ہے ایک طرف جھاڑ اور سرو کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان، اور شہ نشینوں میں طلائی شمعدانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوس اوپر دھری ہیں..... ...... غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے کنچنیاں، بھانڈ بھگتے، کلاونت، قوال، اچھی اچھی پوشاکیں پہنے اپنے اپنے سازوں سے سر ملائے حاضر ہیں۔"

اس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مغل بادشاہ یا شاہزادہ کی محفل طرب میں پہونچ گئے۔ الفاظ میں ایسا نقشہ

کھینچا ہے کہ اصل سماں آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے

میر امن کی ایک خاص خصوصیت جو ان کو اردو کے بہت سے مشہور نثر نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کرنے کی عادت ہے۔ ان کی عبارتوں میں بڑے بڑے جملے بہت کم نظر آتے ہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں چھوٹے چھوٹے جملوں میں بغیر حرف ربط کے استعمال کئے ہوئے کہہ جاتے ہیں مثلاً

"اسی طرح تین دن رات صاف گذر گئے ملکہ کے منہ میں ایک کھیل اڑ کر نہیں گئی وہ پھول سا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ کندن سا دمکتا رنگ ہلدی سا ہو گیا۔ منہ میں پھپڑی بندھ گئی۔ آنکھیں پتھرا گئیں مگر ایک دم اٹک رہا تھا کہ وہ آتا جاتا تھا"

ہم نے میر امن کی تالیف "باغ و بہار" اور ان کے طرز انشا پر کافی سے زیادہ زور دیا یہ اس لئے کہ ان تمام باتوں کے پیش نظر جو ہم اوپر ایک ایک کر کے گنا آئے ہیں۔ "باغ و بہار" ہی اس عہد کی بہترین تصنیف قرار پائی ہے اور دوسرے اس لئے کہ یہ اردو کے نشاۃ ثانیہ کی آئینہ دار بھی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" ان کا نقش ثانی معلوم ہوتی ہے اور یہ بالکل صحیح ہے کہ یہی زبان تھوڑے فرق سے نذیر احمد اور راشد الخیری کی زبان بن گئی ہے۔ ویسے ہی محاورے، ویسی ہی ضرب الامثال، اور وہی فقروں اور جملوں کی ترکیبیں جو میر امن نے استعمال کی ہیں نذیر احمد اور راشد الخیری کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں تین شخص خاص طور پر مقبول ہوئے ہیں پہلے نمبر پر میر امن ہیں جن کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم نے کیا۔ ان کے بعد حیدر بخش حیدری آتے ہیں جن کی طوطا کہانی، اور آرائش محفل بھی بہت مقبول ہوئی ہیں لیکن یہ میر امن کی عبارت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ حیدر بخش کا اسلوب بیان سنجیدہ اور پچھلے دور کے مصنفین سے نسبتاً سلجھا ہوا ہے لیکن ان کے جملے بڑے بڑے ہوتے ہیں عربی فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بھی انھوں نے بکثرت کیا ہے علاوہ بریں محاوروں کے استعمال میں انھوں نے خاص کوشش نہیں کی لیکن بہر حال ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ اس دور کے مصنفین کی اردو نے دور گذشتہ کی نثر کے مقابلہ میں کتنی ترقی کی۔ یہ ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ ہے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین ایک دوسرے پر اپنی مختلف خصوصیات کے لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے اور میر امن اس دور میں

اپنے ہمعصروں کے مقابلہ میں ہر حیثیت سے ممتاز نظر آتے ہیں لیکن نثر اردو کے مصنفین کی متفقہ اور منظم کوششوں سے ہی برگ و بار آسے اور ہر ایک نے اپنی اہلیت اور قابلیت کے مطابق اس کی ترقی میں حصہ لے کر پچھلے دورسے اس کو لسانی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ بنا دیا۔

نمونہ عبارت طوطا کہانی :-

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ سینہ پرسوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے مری جاتی ہوں اور تو ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے۔ فرد۔ نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا ہیں عاشق ہوں مجھ کو نصیحت سے کیا۔ طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہے دوستوں کی بات ماننا چاہئے کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے اور پشیمانی کھینچتا ہے :

نمونہ عبارت آرائش محفل :-

"یہ قصہ عبارت سلیس سے زبان فارسی میں کسی شخص نے آگے لکھا تھا۔ اب اس حیدر بخش متخلص بہ حیدری دہلی کے رہنے والے نے امیر والا تبار بیر ہشت و پناہ ہر پیر و جوان دستگیر درماندگان و بے کسان، نوشیرواں وقت، ہمایوں بخت زیدہ نوآئینان عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیواں بارگاہ انگلستان، مارکوس ولزلی گورنر دام اقبالہ کی حکومت میں اور خداوند والا شان عالی خاندان جان گلکرسٹ بہادر دام اقبالہ کے حکم سے۔"

غرض جملہ کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتا۔ اور قافیہ بندی کی کوشش بھی کی گئی ہے یہ عبارت تمہید کی تھی، پورے قصہ میں یہ رنگ نہیں ہے مثلاً

"حسن بانو نے کہا کہ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے دروازہ پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال، اور اس نے کیا نیکی کیا ہے اس کی خبر لا۔ اس سخن کے سنتے ہی حاتم اٹھ کھڑا ہوا اور حسن بانو سے پوچھنے لگا کہ وہ کون شخص ہے اور کس طرف کو رہتا ہے۔ حسن بانو نے کہا میں نے اپنی دادی سے سنا ہے کہ اس کی جگہ اتر کی طرف ہے۔ بس اتنی بات دریافت کر کے وہاں

سے توکل بخدا چل نکلا.......... اتنے میں ایک آواز سوزناک درد آلودہ ساتھ آہ وزاری کے کسی طرف سے اس کے کان میں ایسی پڑی کہ جس کے سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔"

طوطا کہانی کے نمونے سے ظاہر ہے کہ فارسی الفاظ اور ترکیبیں زیادہ ہیں لیکن بعد میں یہ چیز کم ہو جاتی ہے اور آرائش محفل میں جہاں انھوں نے آزادی سے ترجمہ کیا ہے تو وہ بھی سیدھی سادی اور سلیس عبارت لکھتے گئے ہیں جیسا کہ آخر کے نمونے سے ظاہر ہے۔

میر شیر علی افسوس بھی فورٹ ولیم کالج کے اُن تین مشہور نثر نگاروں میں شمار ہوتے ہیں جو خاص طور پر معروف و ممتاز ہیں۔ نثر میں افسوس کا شاہکار اور ان کا نہایت مقبول و معروف کارنامہ سعدی علیہ الرحمۃ کی گلستاں کا اردو ترجمہ ہے جو باغ و بہار کے نام سے مشہور ہے۔ گلستاں کے ترجمہ کرنے کی تقریب خود ان کے کی عبارت میں سنئے تاکہ ان کی طرز تحریر کے متعلق اندازہ ہو سکے۔

"ایک دن صاحب موصوف ڈاکٹر گلکرسٹ نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر میں نے دھیان کیا کہ عبارت اس کی بہ ظاہر صاف اور بہ باطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور رتبہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک" ارادہ کیا کہ اس سے پہلوتہی کروں اور سر عجز آگے دھروں۔ پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیہ خیال میں اُن کے گذرے اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو مہل جانا تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اسے ترجمہ کروں اگر بخوبی انجام ہوئی اور اہل معنی کو پسند پڑی تو فبہا و الا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔"

افسوس کے طرز بیان میں میر امن سے زیادہ گنجلک ہے۔ اس میں میر امن کے اسلوب بیان کا سا لوچ اور بے ساختہ پن نہیں میر امن کی زبان جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بالکل محاورہ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے وہ جو بات کہتے ہیں روزمرہ اور محاورہ سے خالی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف افسوس کی زبان میں سلاست اور صفائی کے ساتھ سنجیدگی اور وقار پایا جاتا ہے۔ وہ عربی فارسی کے فقرے بکثرت استعمال کرتے ہیں اور اس خصوص

میں حیدری سے بڑھے ہوئے ہیں۔ باغ و بہار کی عبارت کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"حکایت :- ایک فقیر کو میں نے سنا کہ فاقہ کی آگ میں جلتا۔ پیوند پر پیوند گانٹھتا اور تسلی اپنے خاطر کی ان دو بیتوں سے کرتا ؂

لباس فقر و نان خشک پر ہیں | یہ لازم ہے کہ کر بیٹھوں قناعت
ہر اک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا | ہے بہتر یا کہ اپنا بار محنت

کسی نے کہا اس سے کیا بیٹھا ہے تو فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دست کرم اپنا اس نے کھولدیا ہے اور اپنی کمر کو آزادوں کی خدمت کے لئے باندھ لیا ہے۔ اگر صورت حال سے تیری اطلاع پاوے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے۔ کہا اس نے چپ رہ کہ فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لے جانا۔

قطعہ۔ پیوند گانٹھ، صبر کا کونا کر اختیار | پر اغنیا سے کر نہیں جامہ کی التجا
مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب | جانا جو تیرا گلشن فردوس میں ہوا "

اُردو زبان میں گلستان کے ایک دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں۔ لیکن افسوس کے ترجمہ کے مطالعہ سے حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے انھوں نے گلستاں کا نہایت عمدہ اور بے نظیر ترجمہ کیا ہے انھوں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ زبان سلیس اور صاف ہو اور کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کا ترجمہ اس دور کی اردو کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ اور اس دور کی عبارتوں کا پچھلے دور کی عبارتوں سے مقابلہ کرنے پر بالکل صاف صاف واضح ہو جاتا ہے کہ نثر اردو نے اس دور میں منازل ترقی کتنی جلدی جلدی طے کی ہیں۔ اور کس طرح اس نے بناوٹی اور پر تصنع حسن کے مقابلہ میں فطری حسن کی سادگی، شیرینی، اور لطافت حاصل کر لی۔

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سے ہم تین مشہور اور مقبول ہستیوں کا ذکر کر چکے۔ اس ادارہ کے رفقا کی تعداد اُنیس تھی اور اس چھوٹے سے مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے کہ ہر ایک کی کتابوں اور طرز تحریر پر جدا جدا تبصرہ کیا جائے اس دور کی نثر کا ایک عام اندازہ لگانے کے لئے اوپر کے بیانات سے کسی حد تک مدد مل جاتی ہے۔ اور ہمارے مقصد کے لئے اتنا کافی ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی نثر پر ایک عام تبصرہ | اس دور کا ذخیرہ ادب یعنی قصے کہانیوں کے ترجمے، تاریخ، چند اخلاقی کتابوں اور کچھ صرف و نحو اور مذہب کی کتابوں پر مشتمل ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی تحریک اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ کی ابتدا ہے۔ اس کالج کی کتابیں اردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں۔ انھوں نے صفائی اور سادگی کی مشق کر خصوصیت کے ساتھ مختلف اسالیب بیان کے دروازے کھول دیے۔ اس سے قبل کی دکنی اردو نثر کا طرز بیان نہایت مغلق اور پیچیدہ تھا اور ایسے ہی شمالی ہند کی ابتدائی نثر نویسی کے نمونے بالکل فارسی کے مرصع اور مقفی طرز پر مبنی تھے اور ان میں بعض عبارتیں تو ایسی ہیں کہ انھیں بمشکل اردو عبارت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت فورٹ ولیم کالج کی منظم کوششوں سے قبل اردو کا کوئی مستقل اسلوب ہی نہ تھا جو کچھ تھا وہ فارسی کی اندھا دھند تقلید تھی۔ اس کالج کے قیام کی اصل غایت چونکہ نو وارد انگریزوں کو اردو سکھانی تھی۔ اس لئے فورٹ ولیم کالج کے مصنفین نے سادگی اور صفائی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفین ایک دو کو چھوڑ کر صاف اور سادہ عبارت لکھنے والے ہیں اور ایسے گوناگوں اور دل آویز اسالیب پیش کرتے ہیں جن پر اس وقت تک نثر اردو کی بنیاد قائم ہے۔ میر امن اور افسوس اپنی تحریروں میں محاورہ اور روزمرہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن حیدر بخش اور مولوی اکرام اللہ وغیرہ کی زبان صاف اور سادہ ہونے کے باوجود سنجیدہ اور علمی ہے۔

لیکن اس سے اگر کوئی یہ نتیجہ نکالے کہ فورٹ ولیم کالج کے زمانہ میں یا اس کی کوششوں کے فوراً بعد ہی عام مذاق بھی سادگی اور صفائی کی طرف مائل ہو گیا تھا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اردو میں اہل ملک نے اپنے مذاق کے مطابق ہر قسم کا تصنع اور تکلف پیدا کر لیا تھا فورٹ ولیم کالج نے اس بگڑے ہوئے مذاق کو سدھارنے کی ابتدائی کوششیں ضرور کیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس تحریک کے باعث دہلی کے مصنفین میں ان اسالیب کی تقلید کا ذوق زیادہ اور اس سے کم اہل لکھنو میں پایا جاتا ہے لیکن ملک کی ذہنیت اور انشا پردازوں کا انداز پورے طور پر سرسید کی ادبی تحریکات کے بعد ہی بدلا اگر اس وقت میر امن کا طرز مقبول ہو جاتا تو اردو میں جو چیز ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پیدا ہوئی اس سے پہلے ہی پیدا ہو جاتی۔ اسی وجہ سے ہم کہیں ۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کی ادبی تحریکات کے باعث عام مذاق میں تبدیلی دیکھتے ہیں۔

پانچواں دور

لکھنؤ کا ادبی دور

قدیم دور اور نشاۃ ثانیہ کے درمیان عبوری دور

سنہ ۱۸۲۰ء سے سنہ ۱۸۵۰ء

اس دور کو زبان اردو کے قدیم دور، اور نثر اردو کی نشاۃ ثانیہ کے درمیان ایک طرح کا عبوری دور کہنا چاہیے یعنی اگرچہ زبان میں ایک خاص قسم کی تبدیلی کے آثار فورٹ ولیم کالج کی منظم کوششوں سے نظر آنے لگے تھے لیکن اس کا اثر پوری طرح سے زبان پر ابھی نہیں ہوا تھا۔ اور عام مذاق اب بھی پرانے طرز کو پسند کرتا تھا یعنی سادگی اور سلاست نے عام مقبولیت ابھی نہیں حاصل کی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کی ادبی کوششوں نے اتنا تو ضرور کیا کہ دو چار کتابیں روزمرہ اور با محاورہ زبان میں تصنیف کرا دی تھیں۔ لیکن اس عام اور پرانی ذہنیت میں اتنی جلدی تبدیلی کیونکر ہو سکتی تھی اگر اس ادبی تحریک کا شیرازہ اتنی جلدی یعنی بیس سال کے بعد ہی نہ بکھر گیا ہوتا۔ اور کلکتے کی ادبی کوششیں برابر جاری رہتیں اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق ان میں اصلاح اور ترقی جاری رہتی تو اس سے کسی دیرپا اور مستقل اثر کی امید ہو سکتی تھی۔

اسی لئے ہم لکھنؤ میں وہی پرانا مذاق دیکھتے ہیں۔ لکھنؤ والے خصوصیت کیساتھ قدیم مذاق کو پسند کرتے تھے۔ اس میں ان کا قصور نہیں دلی اجڑ رہی تھی۔ اہل ہنر پریشان ہو ہو کر عافیت کی تلاش میں دلی چھوڑ چھوڑ کر کسی اور کا سایہ تلاش کر رہے تھے شاہان اودھ دربار سجائے بیٹھے تھے اس لئے جو بھی مغلوں کے دربار سے نکلا اس نے فیض آباد اور لکھنؤ میں شاہان اودھ کے سایہ میں آکر پناہ لی یہاں علم و فن کی اب بھی قدر تھی۔ اور اس طرح مشرقی تہذیب کا آخری نمونہ اودھ کے اُجڑے دربار نے دیکھا۔ یہاں وہ سب تھے جنھوں نے بزرگوں کی آنکھیں دیکھی تھیں اور وضعدار اتنے تھے کہ پرانی لکیر کے فقیر بننے ہی کو سرمایہ افتخار جانتے تھے۔ چنانچہ زبان میں بھی یہاں جدید رنگ ذرا دیر سے پیدا ہوا۔

کلکتہ کے دور کے بعد تصانیف کا خاص رنگ لکھنؤ میں نظر آتا ہے اور رجب علی بیگ سرور، اس کے

خاص نمائندہ ہیں مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانہ عجائب میں وہی پرانی مقفیٰ، مسجع اور رنگین عبارت لکھی ہے اور نئے طرز کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے۔

"دلی کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑتے ہیں پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے"

فسانہ عجائب کا نمونہ عبارت جس کا سنہ تصنیف ۱۸۲۴ء ہے ملاحظہ ہو۔

"ناگاہ ایک روز موکب حشمت و جلال بافر و شوکت و کمال ایک صحرائے باغ و بہار دشت لالہ زار میں ہوا۔ فضائے صحرا قابل تحریر کیفیت دشت گلشن آسا لائق تقریر، بو باس ہر برگ و گل کی رشک مشک اذفر صفحہ بیاباں عنبر و معطر چشموں کا پانی صفا میں آب گہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر۔ چلے کے جاڑے کڑاکے کی سردی تھی گویا زمین سے آسمان تک یخ بھر دی تھی۔ پرند و چرند اپنے اپنے آشیانوں اور کاشانوں میں جمے بیٹھے تھے بھوک پیاس کے صدمے اٹھاتے تھے دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے قصد سے تھرتھراتے تھے۔ سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دم تقریر ہر شخص کے منہ سے دھواں دھار دھواں نکلتا تھا آواز کسی کی کسی کے کان تک کم جاتی تھی۔ منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مار سیاہ اس چلے نے باہر نہ آتا تھا۔"

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے سرور کا طرز اور اسلوب تحریر وہی پرانا ہے۔ عبارت میں سادگی کی جگہ رنگینیت پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی عبارت سادہ اور سلیس ہونے کی جگہ مقفیٰ اور مسجع ہے۔

دوسری کتاب سرور سلطانی ترجمہ شمشیر خانی جس کا سنہ تصنیف ۱۸۳۶ء ہے۔ اس کی زبان فسانہ عجائب کے مقابلہ میں قدرے سادہ اور سلیس ہے اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا کہی جا سکتی ہے کہ امتداد زمانہ کی وجہ سے یہ تھوڑا فرق لازمی تھا کیونکہ دونوں تصانیف میں بارہ سال کا زمانہ حائل ہے اس کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

"روایان اخبار و حاکیان آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار بے ثبات میں روش سلطنت نکالی تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج لیا، وہ کیومرث تھا بیٹا

اس کا بیٹا سیامک نام تھا اس کو عبادت کے سوا کچھ کام نہ تھا۔ دیو نے اس کو مارا، کیومرث کو بہت
قلق ہوا، ہوشنگ سیامک کا بیٹا تھا اس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا۔ دیو کو قتل کیا تین سو برس
کیومرث نے سلطنت کی پھر دار فنا سے رحلت کی یہ قول فردوسی ہے۔"

لکھنؤ سے قطع نظر خود دلّی والے پرانی وضعداری نباہ رہے تھے۔ فقیر محمد خاں گویا جنھوں نے انوار سہیلی
کا ترجمہ بوستان حکمت کے نام سے کیا ہے، اور امام بخش صہبائی وغیرہ سب اسی رنگ میں رنگے ہوے تھے۔
پھر بھی دلّی نے لکھنؤ سے پہلے کروٹ لی اور اس دور کے بالکل آخر آخر جب "انشائے بہار بے خزاں" لکھی گئی تو ہم
اس میں طرز ادا کو ایک حد تک سادہ اور سلیس دیکھتے ہیں۔ اسی زمانہ میں مولوی سید احمد بریلوی کی مذہبی تحریک
شروع ہوئی اور مذہب کی اشاعت اور اپنے عقائد کی تبلیغ کے سلسلہ میں مولوی صاحب موصوف نے جو زبان
استعمال کی وہ اسی نئے طرز کی تھی۔

اس مختصر دور کی ابتدائی اور آخری تصانیف کی زبان میں نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ
کچھ تو زبان کی اپنی فطری صلاحیت اور کچھ ضروریات زمانہ کے رجحان کی وجہ سے سادگی اور سلاست کی طرف خود
بخود مائل ہوتی جاتی ہے اور اس کا پورا پورا عمل ہمیں اس دور کے ختم ہونے اور چھٹے دور کے شروع ہونے کے
بعد دکھائی دیتا ہے۔

نثر اردو کا چھٹا دور

نشاۃ ثانیہ۔ جدید نثر اردو کی ابتدا

یعنی

سرسید اور اُن کے رفقا کا زمانہ

سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء

سنہ ۱۸۵۷ء میں مظلوم ہندوستانیوں نے جنگ آزادی کے لئے کمر ہمت باندھی لیکن ان کی کوششیں
ناکام ہوئیں۔ اس کے اسباب اور نتائج موضوع زیر بحث سے قطعاً خارج ہیں، ہاں یہ بیان کرنا ضروری ہے

کہ اس کا فوری نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلا اور اس کے بعد ہمارا شیرازہ بالکل منتشر ہوگیا۔ سلطنت مغلیہ جو عرصہ سے موت کی گھڑیاں گن رہی تھی ایک ہچکی لے کر رخصت ہوئی اور اس کا رہا سہا نشان مٹتے ہی ہندوستانی تمدن کی بنیادیں ہل گئیں اس کا اثر ادب اور زبان پر بھی ہوا شاعری میں مایوسی کا رنگ بہت نمایاں ہوگیا اور شعر گویا شاعر کے دکھے دل کی پکار بن گیا۔ نثر نگاروں نے جب ایسی مایوسی ہر طرف چھائی دیکھی تو وہ خیالی جنت کے تصور میں مست رہنے لگے غرض ہر شخص کی دنیا نرالی تھی جہاں کہیں شگفتگی اور رنگینی پیدا تھی وہاں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مصیبت زدہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہے۔

اس نازک موقع پر سرسید نے بڑی ہمت کی سرسید جیسا کہ سب کو معلوم ہے ان لوگوں میں تھے جو وقتی ہڑبونگ کی بجائے ٹھوس کام کو زیادہ مفید سمجھتے تھے ان کے دل میں قوم و ملت کا درد تھا۔ ہندوستانیوں کی بداقبالی پر وہ گھنٹوں آنسو بہاتے تھے لیکن جذبات سے زیادہ ان میں عملی قوت تھی وہ قوم کے سامنے ایسا لائحہ عمل پیش کرنا چاہتے تھے جو ان کے حق میں مسیحائی کا کام کر سکے ان کے اس لائحہ عمل میں جہاں اور بڑے بڑے اور مفید پروگرام تھے وہاں زبان و ادب کی ترقی بھی شامل تھی کیونکہ زبان ہی سماج اور معاشرت کی بنیاد ہے۔

جدید نثر اردو کا دور غالب کے اردو خطوط اور سرسید کی ادبی کوششوں سے شروع ہوتا ہے اور دہلی کالج کی تصانیف اور تراجم نے بھی اس دور کے شروع ہونے میں بہت کافی امداد کی۔ اس وقت سے اردو کو جس کا سرمایہ اس وقت تک چند تراجم، کچھ تصنیفات، انتخابات اور قصص و حکایات نیز تاریخ و تذکرہ، لغات صرف و نحو اور مذہب کے مضامین پر مشتمل تھا منظم کوششوں کے ذریعہ علمی اور ادبی زبان بنانے کا عزم کیا گیا۔ اور یہی اردو زبان کی نشاۃ ثانیہ تھی۔

اردو کو سیدھے سادے طرز انشا سے آشنا کرنا فورٹ ولیم کالج والوں کا کام تھا لیکن ملک میں اس طرز کو مقبول کرانا غالب ہی کا کام تھا غالب نے اپنے خطوط کے ذریعہ عوام کی ذہنیت پر زبان کی سادگی، روانی اور سلاست کا دیرپا اور مستقل اثر ڈالا سادگی اور سلاست جو اب تک کم علمی کی نشانی سمجھی جاتی تھی وہ ان کے سامنے علمیت اور حسن کا جامہ پہن کر نمودار ہوئی غالب کے زمانہ ہی میں ان کے ہمعصر ان کے اس سادہ طرز پر فریفتہ تھے۔ ان کے بعد ان خطوط نے غالب کی جگہ نثر اردو کی تاریخ میں بہت زیادہ بلند کر دی۔

اس وقت خطوط میں جو آداب القاب لوازمہ خط بن گئے تھے محض رسمی طور پر لمبے چوڑے لکھے جاتے تھے اور اصل مطلب سے کہیں زیادہ غیر ضروری باتیں خط میں ہوتی تھیں۔ غالب نے جو ہر چیز میں جدت کے طالب تھے اور جن کی غیور طبیعت کسی چیز میں اتباع اور پیروی کو پسند نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اپنے لئے ایک نیا راستہ تلاش کیا۔ انھوں نے خطوط کو مکالمہ بنایا اور اس میں ایسے کامیاب ہوئے کہ خطوں میں ملاقات کا سا مزہ پیدا کر دیا اور خطوط کا وہ تمام پرانا تقہ پن ختم کر کے رکھدیا کہیں صرف بھائی میاں کہہ کر خط شروع کیا اور رسمی القاب و آداب چھوڑ کر فوراً اصل مطلب پر آ گئے اور کہیں اس کی بھی ضرورت نہ سمجھی سیدھی سادی اپنی مطلب کی بات لکھکر خط ختم کر دیا۔ لکھتے ہیں:۔

"بھائی یہ بات تو کچھ نہیں کہ تم خط کا جواب نہیں لکھتے خیر دیر سے لکھو اگر شتاب نہیں لکھتے"

ان کے طرز کی ایک اور خصوصیت اُن کی شوخی اور ظرافت ہے۔ جگہ جگہ ایسی چٹکیاں ہیں کہ پڑھنے والے کو لطف آ جاتا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"تیری جان کی قسم مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوست طالع کی تاثیر ہو کہ میرا ممدوح جیتا نہیں نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چلدئے واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے وہ عدم سے بھی پرے پہونچا نا صاحب دہائی خدا کی میں نہ تاریخ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔"

ان کے طرز کی بے ساختگی ذیل کے خط سے ظاہر ہے۔

"پیرو مرشد ۱۲ بجے تھے میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا میں نے کھولا پڑھا بھلے کو انگرکھا کرتہ گلے میں نہ تھا اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا۔"

میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں۔

"اے جناب میرن صاحب: السلام علیکم۔ حضرت آداب کہو صاحب آج اجازت ہے

یہ مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی حضور میں کیا منع کرتا ہوں۔ میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ
تندرست ہو گئے ہیں۔ بخار جاتا رہا ہے صرف پیچش باقی ہے وہ بھی رفع ہو جائے گی۔ میں اپنے
ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھدیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں۔ نہیں میرن صاحب
کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوتا ہوگا جواب لکھنا ضرور ہے۔"

خط نہ لکھنے کی معذرت کو کس اچھوتے اور نرالے انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل آمنے سامنے باتیں ہو رہی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے ترکیبیں اور الفاظ سہل اور آسان اور ان کے ساتھ ساتھ لطافت اور ظرافت کی چاشنی۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کیلئے اردو نثر غالب کی ہمیشہ احسان مند رہے گی اور ان کے خطوط کا مجموعہ اردوئے معلیٰ اردو ادب میں اپنی مثال آپ ہی رہے گا۔

اس دور میں اردو زبان کو علمی بنانے کی پہلی منظم کوشش دلی کالج میں ہوئی۔ دلی کالج کا ذکر اردو زبان کی تاریخ میں ہمیشہ تعریف سے کیا جائے گا۔ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا اور جہاں ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا جہاں اردو کے ذریعہ تمام علوم و فنون کی تعلیم دیجاتی تھی اور جس کے ماتحت ایک ادبی سوسائٹی قائم تھی جو کالج کے طلبا کے لئے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کا کام انجام دیتی تھی۔ اس مجلس کے ترجموں اور تالیفات کی تعداد قریب قریب سوا سو کے ہے جو مختلف مضامین پر مشتمل ہیں۔ اس طرح دلی کالج نے اردو کو خالص علمی زبان بنانے میں عظیم الشان خدمت انجام دی اور اس زمانہ کے لحاظ سے اس کا یہ کام قابل قدر ہے۔ ذکاء اللہ، نذیر احمد، آزاد جنھوں نے بعد میں سرسید کے ادبی اور علمی اسکول کو رونق دی یہ سب اسی دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔

اس کے باوجود جتنا بڑا احسان سرسید نے زبان اردو پر کیا ہے اتنا بڑا کسی دوسرے کا نثر اردو پر احسان نہیں ہے۔ انھوں نے نہ صرف اپنی ذات کو نثر اردو کے لئے وقف کر دیا بلکہ اپنی جادو اثر اور کشش آفریں شخصیت سے کام لے کر اپنے اردگرد سورج چاند اور ستارے جمع کئے جنھوں نے اپنی متفقہ کوششوں سے نثر اردو میں چار چاند لگا دیے اور جو انتہائی عروج اور ترقی نثر اردو کو حاصل نہیں ہو سکتی تھی وہ اسے اس دور میں حاصل ہوئی۔ نازک سے نازک، دقیق سے دقیق اور مشکل سے مشکل مفہوموں کو ادا کرنے کی صلاحیت

اس میں پیدا ہوئی اور در اصل اردو اس دور میں آکر کامل طور پر علمی اور ادبی زبان کہلانے کی مستحق قرار پائی۔

ابتدا میں سرسید نے چند چھوٹے چھوٹے رسالے مذہب اور ریاضی پر لکھے۔ یہ دونوں چیزیں سرسید کی خاندانی تھیں۔ اسی زمانہ میں شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اردو زبان کی خوش قسمتی تھی کہ سرسید کا دل بہت جلد شعر و شاعری سے ہٹ گیا۔ اور وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے نثر کا اس وقت جو حال تھا اس کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے۔ رنگین اور پر تکلف عبارت جس میں قافیوں اور ردیفوں کا التزام اور جو نئی نئی ترکیبوں دور از کار تشبیہات و استعارات سے مملو ہو عام طور پر مقبول تھی سرسید پر جن لوگوں کا اثر ہو سکتا تھا وہ سب خود پرانے طرز کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ سرسید کی اٹھان اسی انداز سے ہوئی ۱۸۴۷ء میں انھوں نے آثار الصنادید مرتب کی اس میں دہلی کی مختصر تاریخ اور وہاں کی عمارتوں کا تفصیلی حال درج ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض مفید تصویریں نقشے اور کتبے بھی شامل ہیں۔

آثار الصنادید لکھتے وقت سرسید کے سامنے میرامن کی باغ و بہار کا نمونہ موجود تھا اور ظاہر ہے کہ یہ نیا طرز انشا تاریخی مباحث کے لئے پر تکلف اور رنگین عبارت کے مقابلہ میں زیادہ موزوں تھا۔ لیکن سرسید صہبائی کا تتبع کرتے تھے اور صہبائی اردو نثر میں بیدل اور ظہوری کا رنگ دیکھنا چاہتے تھے لہذا آثار الصنادید میں بھی وہی پر تکلف اور رنگین انداز اختیار کیا گیا۔ مثلاً۔

> ان حضرات کی طبع رسا شکل رابعہ سے پہلے اس سے نتیجہ پیدا کرتی ہے کہ یہی الانتاج ہے ارباب فہم و ذکا سوا ورناخن فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے۔ گرحباب کو انگشت موج دریا سے سخن فہمی اس درجہ کی راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا۔ اور رمز شناسی اس مرتبہ کو واقعی معلوم ہو گیا کہ نرگس نے کیا اشارہ کیا اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جزو لا یتجزا کو دو نیم۔

اس نمونہ میں رنگینی، تکلف اور مشکل پسندی کی انتہا ہے اور اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرسید کی طرز تحریر کا ابتدائی رجحان کس طرف تھا اور اگر چند وجوہ سے ان کی اصلاح پسند طبیعت اصلاح زبان کی طرف مائل نہ ہو جاتی تو نثر اردو کا حشر نہ معلوم کیا ہوتا۔ زبان تو بہر حال پھر بھی امتداد زمانہ کے ساتھ اصول ارتقا کے

تحت صاف ہوتی نکھرتی اور ترقی کرتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اتنی جلدی اس کل کی چھوکری کو یہ بلند رتبہ اور امتیاز کبھی نہ حاصل ہوتا۔

۱۸۳۲ء میں ہندوستان میں ایک بڑا انقلاب رونما ہوا۔ اسی سال اردو زبان عدالتی اور دفتری زبان قرار پائی اور ظاہر ہے کہ جب کسی زبان کو حکومت کی سرپرستی مل جاتی ہے تو اس کی ترقی کے امکانات بے حد وسیع ہو جاتے ہیں۔ سرکاری زبان ہوتے ہی اردو کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ مصطلحات قانونی جو آج تک انگریزی اور فارسی قانون کی کتابوں میں موجود تھے اردو میں ترجمہ ہونے لگے اور اس طرح اردو زبان میں قانونی الفاظ کی بہت بڑی تعداد بڑھ گئی۔ اسی زمانہ میں سرکاری مدارس کے لئے اکثر کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں دلی کالج جس کی ادبی کوششوں کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اس نے کتابوں کے ترجمے کے سلسلہ میں بہت قابل قدر کام کیا۔ یہ ترجمے چونکہ خاص علمی کتابوں کے تھے اور ترجمہ کے ساتھ اسلوب بیان کا آنا بھی ضروری ہے جیسا کہ پہلے دوروں میں فارسی کتابوں کے ترجموں کے ساتھ فارسی اسلوب بیان رواں ہو گیا تھا۔ اس لئے اب انگریزی کتابوں کے ترجمے کے ساتھ انگریزی اسلوب بیان بھی اردو میں آنے لگا اور زبان میں بے ساختگی اور سادگی پیدا ہونا شروع ہو گئی۔

اردو کی نشاۃ ثانیہ میں پریس کے قیام کو بھی کافی دخل ہے اردو میں سب سے پہلے لوہے کا پریس فورٹ ولیم کالج کی طرف سے روشناس کرایا اور ڈاکٹر گلگرسٹ کی قواعد اردو میر امن کی باغ و بہار اور فورٹ ولیم کالج کے دوسرے مصنفین کی کتابیں اسی پریس سے شائع ہوئیں اور پریس کے رواج نے کتابوں کی طباعت اور اشاعت کے ذریعہ سے اردو زبان کی ترقی میں بہت مدد کی۔

۱۸۳۵ء میں پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا جس سے اخباروں کو تھوڑی بہت آزادی مل گئی اس ایکٹ کے نافذ ہونے کے فوراً بعد ہی ۱۸۳۶ء میں جس کو آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے اردو کا پہلا اخبار آزاد کے والد مولانا محمد باقر صاحب نے اردو اخبار کے نام سے نکالا پھر سید الاخبار بھی شائع ہونے لگا۔ سید الاخبار کے اجرا میں سر سید اور ان کے بڑے بھائی کی کوششیں شامل تھیں لیکن سر سید ہی نے زیادہ تر مضامین لکھے۔

۱۸۵۰ء میں غالب نے اردو میں خط و کتابت شروع کی اور جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ انھوں نے

اپنی جدت پسند طبیعت سے خط وکتابت کو مکالمہ بنا دیا، جیسے کہ دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں اس کے ساتھ ہی بہت سے خطوط میں انسانی جذبات رنج وغم، حسرت وبیکسی، مسرت وخوشی کو اس خوبی اور بے ساختگی سے ادا کیا کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی اور اس سے بھی بہت بڑی حد تک اردو میں ایک جدید طرز کے امکانات پیدا ہو گئے۔

سر سید عصر جدید کے مجتہد کی حیثیت سے فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں، اردو کا عدالتی زبان قرار پانا، سرکاری مدارس کے لئے انگریزی سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ ہونا، اردو پریس کا قیام، اخباروں کی آزادی اور غالب کے خطوط کی نئی طرز انشا، یہ سب مل کر ایک بڑے اور ہمہ گیر انقلاب کا مواد تیار کر رہے تھے سر سید نے اپنی پیش بینی کی وجہ سے حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر رفتار زمانہ کو بہت جلد صحیح صحیح سمجھ لیا اور اردو کے عصر جدید کے مجتہد ثابت ہوئے۔

آثار الصنادید کا جب دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو سر سید نے کتاب کی رنگین عبارت کو بالکل بدل دیا اور اس کی جگہ سلیس اور عام فہم اردو کر دی۔ اردو میں یہ انقلاب ہونا تو ضرور تھا اور اگر سر سید اس کی ابتدا نہ کرتے تو یہ سعادت کسی اور کے حصہ میں آتی لیکن سر سید کی خوش قسمتی تھی کہ اپنی بے نظیر قابلیتوں کی وجہ سے ہوا کا رخ پہچان گئے اور اس طرح اردو کی نشاۃ ثانیہ کے بانی ثابت ہوئے اردو پر سر سید کا سب سے بڑا احسان تہذیب الاخلاق کا اجرا تھا جو جدید طرز کا سب سے زیادہ کامیاب علمبردار ثابت ہوا اور اس نے قدیم اور جدید دور کے درمیان ایسا خط جدائی کھینچا جس سے دونوں دور بالکل علیحدہ علیحدہ ہو کر ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہو گئے۔

۱۲۸۷ھ میں سر سید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے "تہذیب الاخلاق" کا پرچہ نکالا۔ اس پرچہ نے اردو زبان کی جو خدمت انجام دی اس کا ذکر خود سر سید کی زبان سے سننا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے اجرا کے چار سال بعد تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں۔

"جہاں تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کے علم وادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔ جہاں تک ہماری کج فہم اور زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینی عبارت

سے نئے تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانہ کی مقفیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھالیا۔ جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی اور اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہموطنوں نے اسے کس قدر پسند کیا مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں۔ وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا چھوٹتا جاتا ہے۔ بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لفظوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا۔ صفائی اور سادگی روزبروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور سلیس عبارت میں کسی نہ کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو۔ صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات وسیع ہوں۔ جو مضمون ہم لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں اور پر ہو چکی ہیں اور جو امور ان کی نسبت محقق ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے انھیں کو پھر کہے جاتے ہیں۔ یہ نقص اس وقت رفع ہوگا جبکہ انواع و اقسام کے علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جائیں گی اور ہماری قوم کو عموماً ان پر دسترس ہوئی سائنٹفک سوسائٹی علی گڈھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس کا کام ادھورا پڑا ہے۔"

سرسید نے جتنی اہم اور ضروری اصلاحات اردو زبان میں کیں اُن ہی کی زبانی آپ سن چکے اور اس کے بعد یہ تسلیم کرنے میں کیا کچھ بھی مبالغہ ہے کہ اس دور میں آکر نثر اردو میں بالکل کایا پلٹ ہوگئی سرسید کے اجتہاد میں انگریزی انشاپردازی کو بہت دخل ہے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں بکثرت مضامین انگریزی کتابوں سے ترجمہ یا اخذ کرکے

لکھے۔ تہذیب الاخلاق کا سادہ اور سلجھا ہوا انداز بیان اور بے ساختگی اڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کے مطالعہ کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ سرسید نے اس کا اقبال خود کیا ہے۔

"ہم نے نامی یورپ کے عالموں اڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنے طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جہاں کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ A.D. اور T.S. کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری زبان اردو میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی و سادگی اس میں پیدا ہو سکتی ہے۔"

اسی وجہ سے سرسید کے اس دعویٰ میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کہ اردو انشا کا جو خاص طرز انھوں نے نکالا اور پیش کیا بالکل نرالا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ عبارت کے سادہ اور صاف ہونے کے ساتھ اس میں ہر قسم کے مطالب کو آسانی سے ادا کیا جا سکتا تھا۔ اردو کے قدیم دوروں میں صرف مذہب پر قلم اٹھایا گیا اس کے بعد کے دوروں میں عموماً قصے کہانیوں اور خیالی باتوں کو پیش کیا گیا۔ سنجیدہ اور وقیع مباحث میں پرانا اسلوب بیان اور طرز تحریر ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ سنجیدہ اور سلجھے ہوئے مضامین کے لیے طرز انشا ویسا ہی درکار تھا اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق میں عبارت کے نئے اور بالکل اچھوتے طرز کی بنا پر مفید اہم اور وقیع مباحث پر مضمون لکھے گئے اور عبارت کی سادگی نے اردو کے دامن کو بہت وسیع کر دیا یہاں تک کہ وہ اس دور میں ہر قسم کے علمی، ملکی، معاشرتی، تعلیمی مباحث کے ادا کرنے پر قادر ہو گئی۔ سرسید نے اپنے ایک اردو داں انگریز دوست کا خط نقل کیا ہے جو لکھتا ہے کہ

"تہذیب الاخلاق نے ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں۔"

سرسید کی اعلیٰ انشا پردازی کا کمال ان کے علمی مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔ اردو زبان چونکہ اس سے پیشتر کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام میں نہیں لائی گئی لہذا اس میں علمی اصطلاحات، علمی لغات بہت کم ہیں۔ اسی لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو میں لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہیں کرتے لیکن سرسید نے مشکل مشکل مسائل کو اس وضاحت صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہے اس کے ساتھ ہی سرسید کی تحریروں میں جگہ جگہ شوخی اور ظرافت کی چاشنی بھی مزہ دیتی ہے لیکن تہذیب اور لطافت کبھی ہاتھ سے نہیں جاتی۔

سرسید کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف اپنی ذاتی کوششوں سے زبان اردو میں

ایک انقلاب عظیم برپا کردیا بلکہ ان کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ارد گرد آسمان صحافت کے ایسے آفتاب اور ماہتاب جمع کئے جنھوں نے اپنی متفقہ کوششوں سے ملک کی پرانی ذہنیت کو یکسر تبدیل کردیا اور جن کے تنوع اور مختلف ادبی اور علمی کارناموں کے سامنے تمام پرانا ذخیرہ بالکل ماند پڑگیا۔

سرسید کے ادبی رفقا میں حالی شبلی۔ نذیر احمد۔ ذکا، اللہ تھے، یہ سب اردو ادب کے بڑے محسن ثابت ہوئے اور ان میں سے ہر ایک کی حیثیت ادب اردو میں ستونوں کی سی ہے زبان اردو کو علمی اور ادبی حیثیت سے انتہائی ترقی کے درجہ تک پہونچانے میں ان سب کی مختلف النوع متفقہ کوششیں کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں ان میں سے ہر ایک کا طرز تحریر اور اسلوب بیان اگرچہ جداجدا تھا لیکن اردو کو صاف سلیس اور آسان بنانے اور حسن سادگی کے ساتھ ساتھ اس کو ٹھوس علمی اور ادبی زبان بنانے کی بنیادی اصول میں سب کی کوششیں متفق تھیں اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی کوششوں سے باغ اردو میں اگرچہ مختلف پھول کھلے لیکن وہ سب حسین بھی تھے سادہ لطیف بھی تھے اور خوش رنگ بھی ان میں سے ہر ایک اپنی علمی ادبی خدمات کی وجہ سے اس بات کا مستحق ہے کہ مستقل تصانیف میں ان سے بحث کی جائے اور اردو کے دور جدید پر بالتفصیل لکھنے والے کے لئے بہت بڑا میدان سامنے ہے

خاتمہ کلام | غرض انیسویں صدی کے اختتام یعنی سرسید اور ان کے رفقا کے دور کے بعد اردو نثر کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے اور زبان میں جو کچھ تغیرات اور اصلاحات ہونی تھیں وہ ہو چکی تھیں البتہ سرسید کے عہد میں تخصیص (spe cialization) نہیں تھی۔ ایک ہی مصنف ادب سیرۃ، تاریخ فلسفہ مذہب اور سیاست سب پر لکھتا تھا اور اس کی تصانیف میں مختلف مضامین پر کتابیں ملتی تھیں اس دور کے اختتام پر اردو کی مختلف اصناف علیحدہ علیحدہ قائم ہوگئیں اور مصنفین نے ایک ایک صنف کو اپنے لئے منتخب کرلیا اور اسی میں تصنیفی کوششیں جاری رکھیں اور اب اردو دور پہلے کی طرح کسی مقام کے ساتھ مخصوص نہیں رہے۔ بلکہ ہر جگہ اردو کے اچھے اچھے لکھنے والے پیدا ہونے لگے ہیں

محمد عرفان صاحب ندوی بی۔ اے (جامعہ)

اُستانی

دونوں لڑکیاں اپنے کمرہ میں تنہا تھیں۔ روشنی گل ہو چکی تھی ہر طرف اندھیرا تھا البتہ دونوں بستروں سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھی۔ لڑکیاں آہستہ آہستہ سانس لے رہی تھیں جس سے دھوکا ہوتا تھا کہ وہ سو رہی ہیں

"میں کہتی ہوں" ایک بستر سے دھیمی لیکن رکتی ہوئی آواز آئی۔ بارہ سالہ لڑکی بول رہی تھی۔

"کیا ؟" اس کی بہن نے دریافت کیا۔ جو اس سے ایک سال بڑی تھی۔

"اچھا ہوا تم جاگ رہی ہو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے"

لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا گیا البتہ دوسرے بستر سے اٹھنے کی آواز آئی بڑی لڑکی اُٹھی اور منتظر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں دھندلی روشنی میں چمک رہی تھیں

"دیکھو میں تم سے یہ کہنا چاہتی ہوں کہ . . . . لیکن پہلے یہ تو بتاؤ کیا تم نے "مس مین" میں اس طرف کوئی عجیب بات دیکھی"

"ہاں" دوسری لڑکی نے تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ "کوئی بات ضرور ہے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہے اب وہ پہلے کی طرح زیادہ سختی بھی نہیں کرتیں۔ دو دن سے میں نے اپنا کام نہیں کیا ہے لیکن وہ مجھ پر بالکل خفا نہیں ہوئیں معلوم نہیں کیا وجہ ہے مگر اتنا تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اب وہ ہماری فکر نہیں کرتیں وہ تنہا بیٹھی رہتی ہیں مگر ہمارے کھیل میں پہلے کی طرح شریک نہیں ہوتیں۔

"میرا خیال ہے کہ وہ کچھ پریشان رہتی ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرنا نہیں چاہتیں۔ اب تو انھوں نے پیانو بجانا بھی چھوڑ دیا۔

تھوڑی دیر سکوت کے بعد بڑی لڑکی بولی "تم نے ابھی کہا تھا کہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں"

ہاں لیکن وعدہ کرو کہ میری بات کو اپنے ہی تک محدود رکھو گی اماں یا اپنی سہیلی "لوسی" کے سامنے اس کا ذکر نہ کرو گی"

"ہرگز نہیں" دوسری نے ذرا برا مانتے ہوئے کہا۔ "کہو تو سہی"

"قصہ یہ ہے کہ جب ہم سونے کے لئے یہاں آئے تو مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ میں نے مس ٹین کو آتے وقت سلام نہیں کیا میں ان کو چونکانا دوں اس لئے میں بغیر جوتا پہنے پنجوں کے بل ان کے کمرہ تک گئی آہستہ سے دروازہ کھولا، اور تھوڑی دیر تک اسی گمان میں رہی کہ وہ وہاں موجود نہیں ہیں۔ روشنی ہو رہی تھی لیکن میں ان کو نہ دیکھ سکی۔ تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ یکایک میں چونک پڑی میں نے کسی کے رونے کی آواز سنی اور میں نے دیکھا کہ وہ اپنے بستر پر لباس تبدیل کئے ہوئے لیٹی ہیں ان کا سر تکیہ میں دھنسا ہوا ہے وہ اسقدر خوفناک طریقے سے ہچکیاں لے رہی تھیں کہ مجھ کو جھرجھری سی آگئی لیکن وہ میری موجودگی سے بے خبر رہیں۔ میں باہر کھسک آئی اور انتہائی خاموشی کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر تک باہر کھڑی رہی کیونکہ مجھ میں چلنے کی سکت تک نہ تھی ہچکیوں کی آواز اب بھی دروازہ سے آرہی تھی اس کے بعد میں واپس چلی آئی"

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش رہیں پھر بڑی لڑکی ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی: "بے چاری مس ٹین" پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

"مجھ کو حیرت ہوتی ہے وہ روکیوں رہی تھیں، چھوٹی لڑکی نے سلسلہ شروع کیا ان کا تو آج کل کسی سے بگاڑ بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اماں نے تو ان کی عیب جوئی بھی ترک کر دی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ ہم لوگ ان کے لئے باعث تکلیف نہیں ہوسکتے پھر آخر وہ کیوں رو رہی تھیں"

"میرا خیال ہے کہ اس بارے میں میں کچھ نظا دوڑا سکتی ہوں" بڑی نے کہا

"اچھا بتاؤ"

بڑی نے جواب دینے میں توقف کیا لیکن پھر بولی "مجھے یقین ہے کہ انہیں کسی سے محبت ہے"

"محبت ہے!" چھوٹی لڑکی چونک سی پڑی "کس سے محبت ہے"؟

"کیا تم نے محسوس نہیں کیا؟"

"او تو سے تو نہیں!"

"ہاں ہاں انھیں کے متعلق۔ وہ بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔ تین سال ہوگئے وہ یہاں ہیں لیکن

دو تین مہینے سے پہلے کبھی ہمارے ساتھ ٹہلنے نہیں گئے لیکن اب تو وہ ایک دن بھی ناغہ نہیں کرتے، مس ین، کے آنے سے پہلے تو وہ ہم لوگوں کے پاس پھٹکتے تک نہ تھے اور اب یہ ہے کہ ہر وقت ہمارے قریب ہنگامہ مچایا کرتے ہیں ہم جب بھی باہر نکلتے ہیں وہ ہمارے ہمراہ ہوتے ہیں خواہ پارک کی طرف یا کسی باغ میں.........

.........جہاں بھی مس ین ہم کو لے جائیں۔ یقیناً تم نے اس پر غور کیا ہوگا؟"

"ہاں غور تو کیا ہے" چھوٹی نے جواب دیا "لیکن ابھی ابھی یہ خیال پیدا ہوا کہ............" وہ جملہ پورا نہ کر پائی۔

"اب تک میں اس پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتی تھی لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہم لوگوں سے وہ آڑ کا کام لیتے ہیں"

دیر تک خاموشی رہی، وہ دونوں اس پر غور کر رہی تھیں اس کے بعد چھوٹی نے سلسلہ کلام شروع کرنے میں اقدام کیا

"لیکن اگر ایسا ہو بھی تو آخر وہ رو کیوں رہی تھیں وہ تو ان کے بڑے دلدادہ ہیں.................

میں ہمیشہ اسی خیال میں رہی ہوں کہ محبت کرنا بھی کس قدر مسرت انگیز ہے"

"اور میں بھی" بڑی نے خواب آگین انداز میں کہا، "یہ راز سمجھ میں نہیں آتا" نیند بھری آواز میں ایک مرتبہ یہ آواز پھر سنائی دی "بے چاری مس ین"

اس رات کو پھر کوئی گفتگو نہ ہوئی۔

صبح انھوں نے اس معاملہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا دونوں ایک دوسرے کے متعلق جانتی تھیں ہر ایک اسی خیال میں غرق ہے۔ یہی نہیں کہ انھوں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا بلکہ اشارہ نہ کرنے کے باوجود جب بھی ان کی آنکھیں اسانی پر آکر جمتیں وہ ایک دوسرے سے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرلیتیں۔ کھانے کے وقت دونوں نے اوٹو کو اپنے سے الگ سا محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی اجنبی ہے۔ انھوں نے اس سے بات تک نہ کی اور بہت ہی غور سے جانچتی رہیں کہ شاید اس طرح اس کے اور مس ین کے درمیان کسی خفیہ تعلق کا پتہ لگ سکے۔

ان کی دلچسپیاں ختم ہو چکی تھیں وہ ہر دم اسی دھن میں لگی رہتیں کہ کسی طرح یہ معمہ حل ہو جائے۔ شام کو ایک نے دوسری سے مصنوعی لاپروائی کے ساتھ پوچھا۔

"کیا تم نے آج کسی نئی بات پر غور کیا؟"

"نہ" اس کی بہن نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ دونوں اس موضوع پر گفتگو کرنے سے خائف تھیں یہ حالت کئی روز تک باقی رہی مگر دونوں لڑکیاں خاموشی کے ساتھ حالات کا مطالعہ کر رہی تھیں ان کا دماغ بے چین تھا لیکن پھر بھی محسوس کر رہی تھیں کہ بہت جلد اُن کو حیرت انگیز راز معلوم ہو جائے گا

بالآخر دوپہر کے کھانے پر چھوٹی لڑکی نے دیکھا کہ استانی نے غیر مشہود انداز میں اشارہ کیا اور آدوٹ نے اس کو سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے ہیجان سے کانپتے ہوئے اپنی بہن کے میز کے نیچے آہستہ سے پیر مارا۔ بڑی نے دریافت طلب نگاہوں سے چھوٹی کو دیکھا اور معنی خیز نگاہوں سے چھوٹی نے جواب دیا کھانے کے اختتام تک دونوں عجیب کشمکش و پیچ میں رہیں کھانا ختم ہوتے ہی استانی نے لڑکیوں سے کہا "تم لوگ پڑھنے کے کمرے میں جا کر کچھ کام کرو میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ مجھے کم از کم گھنٹہ آدھ گھنٹہ لیٹ رہنا چاہیے۔

تنہائی پاتے ہی چھوٹی لڑکی بول اُٹھی "ابھی دیکھنا آدوٹ اس کے کمرے میں جائیں گے۔

"ہاں" دوسری نے کہا "اسی لئے تو انھوں نے ہم کو یہاں بھیج دیا ہے۔ ہم کو باہر سے سننا چاہیئے۔"

"لیکن فرض کرو کوئی آجائے!......... ...."

"کون آجائے؟"

"اماں"

"یہ تو بہت برا ہوگا" چھوٹی لڑکی خوف زدہ ہو کر چلا اٹھی۔

"دیکھو میں سنتی ہوں اور تم اس راستہ کی پاسبانی کرو"

چھوٹی لڑکی نے منھ پھلا کر کہا "لیکن تم مجھ کو سب باتیں نہیں بتاؤ گی"

"اطمینان رکھو"

"پکی رہی"

"ہاں جیسے ہی کسی کو آتے دیکھنا کھانس دینا"

راستہ میں دونوں ٹھہریں۔ ان کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ کیا ہونے والا تھا؟ انھوں نے قدموں کی چاپ سنی اور کمرے میں گھس کر پڑھنے لگیں۔

"ہاں او تو تھا! وہ مس مہن کے کمرہ میں گیا ہے۔ اندر سے دروازہ بھی بند کرلیا" بڑی لڑکی اپنی جگہ پر جا پہونچی اور دروازے سے سننے لگی۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ سانس بھی آسانی سے لے سکے چھوٹی لڑکی حاسدانہ نگاہیں ڈال رہی تھی حیرت زدہ ہوکر وہ بھی دروازہ کی طرف چپکے سے لپکی لیکن بڑی بہن نے اسے ڈھکیل دیا اور جھنجلا کر بولی کہ راستہ کے دوسرے کنارے پر جاکر پاسبانی کرو۔ انھوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا مگر چھوٹی بہن کو یہ چند لمحے پہاڑ معلوم ہو رہے تھے شدت بے قراری میں بے کل ہوکر ادھر سے اُدھر جاتی گویا آتش زیر پا ہے۔ دو فرطِ تجسس میں وہ اپنے آنسو مشکل سے ضبط کرسکی کیونکہ اس کی بہن سب کچھ سن رہی تھی۔ بالآخر ایک آواز نے اسے چوکنا کر دیا دونوں لڑکیاں اپنے پڑھنے کے کمرے کی طرف اس زور سے بھاگیں کہ تھوڑی دیر تک بول بھی نہ سکی تھیں۔ چھوٹی لڑکی نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

"اب تو سب کچھ بتا دو"

بڑی لڑکی عجیب الجھن میں پڑگئی۔ اس طرح جواب دیا گویا وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

"میں تو ان کی باتوں کو سمجھی ہی نہیں!"

"کیا؟"

"یہ معاملہ غیر معمولی طور پر اہم ہے"

دوسری نے جھنجلا کر کہا "کیا کیا؟"

بڑی لڑکی نے کہنا شروع کیا "ہم لوگوں کی خیال آرائیوں سے بالکل مختلف یہ عجیب اہم بات ہے جونہی اوٹو کمرہ میں داخل ہوا۔ اسے اپنی گود میں بٹھا کر پیار کرنا چاہا۔ کیونکہ میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے "ٹھہرو ابھی

نہیں مجھے چند اہم باتیں آپ سے کہنی ہیں،" میں کچھ نہ دیکھ سکی کیونکہ کنجی بیچ میں لٹک رہی تھی۔ مگر سب کچھ صاف صاف سنائی دیتا تھا۔

"تو پھر بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟"

آنند اس وقت ایسے انداز میں اور ایسے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا کہ میں نے اس سے قبل اس کی زبان سے نہیں سنی تھی تم تو جانتی ہی ہو وہ عموماً کس لب ولہجہ میں گفتگو کرتا ہے ——— بہت زور سے اور گستاخانہ انداز میں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت خوفزدہ تھا استانی نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ وہ فضول بکواس کر رہا ہے کیونکہ استانی نے صرف ان مختصر الفاظ میں جواب دیا۔

"میرا خیال ہے کہ تھوڑا نہیں بہت کچھ جانتے ہو۔ اگر ایسا ہے" اس نے انتہائی غمناک لہجے میں کہا "تو پھر مجھ سے اس قدر کھنچے کیوں ہو تقریباً ایک ہفتہ ہوا کہ تم سے ملاقات ہوئی تھی اس وقت سے تم نہیں بولے ہو اور مجھے سرموقع پڑ ٹالنے کی کوشش کی ہے۔ اب تم لڑکیوں سے ملنے میں بھی احتیاط برتتے ہو اور نہ پارک ہی میں ملنے آتے ہو۔ کیا یکبارگی تم مجھے بھول گئے آنند میں کیا بتاؤں کہ تم کیوں روٹھے ہوئے ہو اسے تم ہی بہتر سمجھتے ہو۔"

خاموشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد آنند نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"یقیناً تم محسوس کرتی ہو گی کہ میرا امتحان کس قدر سر پر ہے پڑھنے سے مجھے فرصت نہیں ملتی کیا اس معاملہ میں میں قطعاً معذور نہیں ہوں؟"

وہ رونے لگی اور سسکتے ہوئے دردمندی کے ساتھ کہا، "آنند تو بوچھ میں نے تم سے کیا خطا کی کہ تم مجھ سے اس قدر بدسلوک ہو گئے ہیں نے تم پر کسی دعویٰ کا اظہار بھی نہیں کیا۔ لیکن مسائل پر صاف گوئی سے رائے زنی کرنی چاہئے۔ تمہارے عذروں سے واقفیت کی بو آتی ہے۔ "

لڑکی کانپنے لگی اور خوف کے مارے جملہ پورا نہ کر سکی سننے والی نے اور نزدیک آ کر دریافت کیا

"آخر یہ سب کچھ کس لئے تھا؟"

"اس کے بچہ کے متعلق!"

"ان کا بچہ! چھوٹی لڑکی نے کہا۔ ایک بچہ نا ممکن ہے"

"سچ مچ یہی کہا تھا"

"تم اسے صحیح صحیح سن نہ سکی ہو گی۔ یہ ناممکن ہے"

"نہیں نہیں! میں نے سنا ہے اور مجھے کامل یقین ہے۔ بعد کو اوتو نے یہ دہراتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارا بچہ! اس کے کچھ ہی دیر بعد وہ کہنے لگی اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے تب...... ... ..."

"اچھا"

تب تم کھنکھارنے لگیں اور مجھے مجبوراً وہاں سے بھاگنا پڑا

چھوٹی بہن کی پریشانی خوف و وحشت کی حد کو پہونچ گئی۔

چھوٹی بہن نے کہا۔ "بچہ اس کو کہاں سے مل گیا؟

"میں خود تم سے زیادہ نہیں سمجھ سکتی"

شاید وہ اپنے گھر با گئی ہے۔ مگر ماں نے اسے یہاں آنے کی اجازت نہ دی ہو گی اسی وجہ سے شاید وہ اس قدر افسردہ خاطر ہے،

"کیسی مہمل باتیں کرتی ہو اس وقت تو وہ اوتو سے آشنا بھی نہ تھی،

دونوں متفکر سی ہو گئیں۔ مگر سعی بے حاصل۔ چھوٹی بہن نے کہا۔

بچہ تو قطعی ناممکن ہے۔ اس کے کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے صرف شادی کے بعد ہی بچہ پیدا ہو سکتا ہے شاید اس کی شادی ہو چکی ہو۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو اس کی نسبت اوتو سے کبھی نہیں ہوئی ہے۔

"اچھا تب ..... " دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔

"غریب مس مین ایک نے المناک انداز میں کہا۔

ان کی گفتگو اور ان کے احساسات و جذبات کا حاصل یہی ایک حسرت بھرا جملہ تھا جو تاسف اور رنج کے ظاہر کرنے کے لئے ان کی زبان پر بار بار آجاتا لیکن بچہ سا نہ جذبات انہیں بے چین کر دیتے۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی؟"

"تم ہی بتاؤ مجھے اس کا علم کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کتنا اچھا ہوگا اگر چالاکی سے میں سب کچھ اس سے اگلوا لوں۔"

"چپ رہو کیسی باتیں کرتی ہو۔"

"آخر میں کیوں نہ پوچھوں؟ وہ تو ہم لوگوں سے بے حد خوش اخلاق ہے!"

"فائدہ ہی کیا وہ اس قسم کی چیزیں ہم لوگوں سے کہنا پسند نہ کریں گی جب کبھی بھی اس قسم کی گفتگو کے درمیان ہم لوگ کمرہ میں داخل ہوتے ہیں وہ فوراً گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہیں ایسی فضول باتیں شروع کر دی جاتی ہیں جیسے ہم لوگ ابھی تک بچے ہیں اگرچہ میری عمر تیرہ سال سے زیادہ ہے۔ پوچھنے سے کیا فائدہ صرف ایک ہنگامہ ہو جائے گا۔"

"لیکن میں جاننا چاہتی ہوں۔"

"بیشک میری بھی یہی خواہش ہے مگر دل بیٹھا دینے والی چیز یہ ہے کہ اوتو نے اسے ہم لوگوں سے پوشیدہ رکھا۔ جس طرح اپنے والدین کا نام بتانے میں کسی کو شرم نہیں معلوم ہوتی اسی طرح کسی کے اگر بچہ پیدا ہو تو اس کے بتانے میں کیا شرم ہے وہ یونہی قسمیں کھا رہا تھا اصل میں وہ ہم لوگوں کو جھانسا دے رہا تھا......."

- -

اسی وقت استانی کمرہ میں داخل ہوئی وہ دکھاوے کے لئے کام پر لگ گئیں لیکن نظر بچاتے ہوئے انھوں نے دیکھ ہی لیا کہ آنکھوں کے پپوٹے سرخ تھے۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز سے اس کے شدید جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ لڑکیاں اس کی تعظیم کو ملحوظ رکھتے ہوئے بت کی طرح خاموش ہوگئیں اس کے ایک بچہ ہے یہ خیال ان کے ذہن میں پھر رہا تھا۔ ہو نہ ہو وہ اسی لئے بے حد غمگین ہے لیکن ان پر بھی نادانستہ طور پر غم کا اثر ہونے لگا۔

دوسرے دن دوپہر کو ایک حیرت میں ڈالنے والی خبر معلوم ہوئی۔ اوتو نے جلاوطنی کا قصد کر لیا اس نے اپنے چچا کو بتلایا کہ اسے سخت محنت کرنی ہے۔ گھر پر ٹھیک پڑھائی نہیں ہو سکتی وہ دو مہینے کے لئے کسی دوسر

مقام کو چلا جائے گا۔ لڑکیوں کے دل جوش سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کو کامل یقین تھا کہ اس کی جدائی اسی دن کی گفتگو سے تعلق رکھتی ہے اسلئے جب آدتو آخری مرتبہ ان سے رخصت ہونے آیا تو وہ جان بوجھ کر روٹھ گئیں اور اس کی طرف پیٹھ کرلی اس کے باوجود جب وہ مس تمین سے ملنے گیا تو وہ توجہ سے اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ آدتو نے خاموشی سے ہاتھ ملایا مگر استانی کے لبوں پر ہلکی سی جنبش ہوئی تھی اتنے دنوں میں لڑکیاں بہت بدل گئیں تھیں۔ وہ مشکل سے ہنستیں اور کسی خوشی میں بھی شریک نہ ہوتی تھیں ان کی آنکھوں سے حسرت ٹپکتی وہ ادھر سے ادھر اس طرح پھرتیں گویا ان کا صبر و قرار لٹ چکا تھا۔ اپنے بڑوں پر ان کا اعتماد بھی اٹھ چکا تھا کیونکہ ان کو شبہ تھا کہ ان کی سادہ دہی کی باتوں میں مکر و فریب پوشیدہ ہے۔ ہمیشہ تاک میں لگی رہتیں سایہ کے مانند وہ دبے پاؤں جاتیں اور دروازوں کی آڑ میں اس طرح سنتیں گویا وہ اس جال یا پردے کو جس نے اس بھید کو ان سے چھپا رکھا ہے چاک کرنے یا کم سے کم اس جال کے سوراخ سے دنیائے حقیقت پر ایک نظر ڈالنے کے لئے مضطرب ہیں۔ ایمان ... . عہد طفولیت کی بے نوری جس پر بچہ قانع رہتا ہے ـــــ ان کے دماغ سے محو ہونے لگا۔ اس کے علاوہ ہمیشہ کچھ نئے انکشافات کی منتظر رہتی تھیں۔ اور ہر موقع سے کچھ نہ کچھ اپنے علم میں اضافہ کرنا چاہتیں ـــــ ماحول کے مکر و فریب نے انھیں بھی مکار بنا دیا تھا۔ اپنے والدین کے سامنے اپنے کو بچہ بنانے کی کوشش کرتیں۔ ان دونوں بڑے بوڑھوں کی مخالف تھیں۔ اسی لئے آپس میں ذہنی قربت بھی پیدا ہوگئی تھی۔ جب کبھی ان کو اپنی ناواقفیت اور لاچاری کا خیال آتا تو ہمدردانہ انداز میں ایک دوسرے سے چمٹ جاتیں کبھی جذبات کی شدت میں ان کی آنکھوں سے زار زار آنسو نکل پڑتے بلا کسی ظاہری سبب کے ان کی زندگیاں نازک صورت اختیار کر رہی تھیں۔

ان کے گوناگوں مصائب میں یہ مرحلہ تلخ ترین تھا چپ چاپ انھوں نے فرداً فرداً مصمم ارادہ کرلیا کہ وہ مس تمین کو کچھ بھی تکلیف نہ پہونچائیں گی کیونکہ وہ یونہی افسردہ خاطر تھی۔ وہ انتہائی محنتی واقع ہوئی تھیں۔ اپنے سبق کے یاد کرنے میں ایک دوسرے کو مدد دیا کرتیں۔ خاموش اور خوش اخلاق ہوتے ہوئے انھیں اپنی استانی کی مرضی سمجھ جانے میں ملکہ حاصل تھا لیکن استانی کو کبھی بھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ اسی چیز سے تو ان کے دلوں کو ٹھیس لگتی تھی۔

استانی اب قطعاً بدل گئی تھی جب لڑکیاں اس سے گفتگو کرتیں تو وہ اس طرح چونک اٹھتی گو یا یکدم خواب سے بیدار ہو رہی ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ سے ایسا معلوم ہوتا کہ گویا وہ کسی عمیق تجسس میں پڑ گئی تھی۔ گھنٹوں بیٹھی ہوئی خیالات کی دنیا میں سیر کیا کرتی۔ لڑکیاں اپنے انگوٹھے کے بل اس کے پاس سے نکل جاتیں مبادا اس کے تصور میں کوئی خلل پڑے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ بچہ کے متعلق سوچا کرتی ہے۔ چونکہ لڑکیوں میں بھی نسوانیت کے جذبات بیدار ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ اپنی مہربان اور شریف استانی سے ہمدردی اور محبت کرنے لگی تھیں زندہ دل مس ہین جس کی بڑھی ہوئی زندہ دلی کسی زمانہ میں بری معلوم ہونے لگی تھی اب متفکر بن گئی تھی گو یا کہ کوئی بت ہے۔ اس کے تمام افعال سے حزن و ملال ٹپکتا اسے روتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں کے پپوٹے ہمیشہ سرخ رہتے تھے بالکل صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی تکالیف کو اپنے ہی تک چھپا کر رکھنا چاہتی تھی لیکن انھیں اس بات کا بے حد قلق تھا کہ وہ اس کے کسی کام نہ آ سکیں۔

آخرکار استانی ایک دن آنکھ پوچھنے کے لئے کھڑکی کی طرف گئی۔ چھوٹی بہن نے ہمت کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگی۔

"مس ہین آپ کبیدہ خاطر کیوں ہیں ہمارا کوئی قصور تو نہیں ہے"

استانی نے محبت بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی لمبی زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں عزیزم! یہ تمہاری غلطی نہیں ہے" یہ کہکر اس نے چھوٹی بچی کی پیشانی کا بوسہ لے لیا۔ اس کے بعد لڑکیاں ہمیشہ اسی فکر میں پڑی رہتیں۔ ایک دن ان میں سے ایک غیر متوقع طور پر اپنے والدین کے کمرہ میں گھس آئی اس نے ایک دو الفاظ ایسے سن لئے جو اس کے لئے موزوں نہ تھے۔ اس کے والدین نے اس کو دیکھتے ہی فوراً موضوع گفتگو بدل دیا لیکن ان کیلئے اتنا ہی سن لینا کافی تھا وہ تفکرات میں پڑ گئیں۔

"ہاں میرے ذہن میں بھی یہی بات آئی تھی" ماں کہہ رہی تھی "مجھے اس سے گفتگو کرنی پڑے گی"

پہلے چھوٹی لڑکی نے خود اس مسئلہ کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی مگر ناکامیاب رہ کر اپنی بڑی بہن سے رائے لینے کے لئے دوڑی ہوئی گئی۔

"آخر یہ گفتگو کس چیز کے متعلق ہو سکتی ہے؟"

لیکن کھانے کے وقت انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے والدین استانی سے کس قدر ناراض اور بدظن ہیں۔ کھانے کے بعد ان کی ماں نے مس مین سے کہا۔

"کیا آپ میرے کمرہ میں تشریف لائیں گی میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہوں؟"

لڑکیاں خوف سے کانپ رہی تھیں کوئی ہولناک واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن اب چھپکر سن گن لینا روزانہ کا معمول ہوگیا تھا جھجک اور شرم قطعاً معدوم ہو چکی تھی۔ ان کے ذہن پر صرف ایک خیال حاوی تھا کہ پوشیدہ راز کو کس طرح معلوم کیا جائے۔ جس دروازہ سے مس مین داخل ہوئی تھی اسی پردہ کھڑی ہوئی گفتگو کو سننا چاہتی تھیں ان کو صرف ہلکی سائیں سائیں کی آواز سنائی دی۔ کیا وہ راز کے معلوم کرنے میں ناکام رہیں گی؟ اتفاقاً ان کو ایک آواز سنائی دی۔ ان کی ماں کو غصہ آرہا تھا۔

"کیا ہم لوگ اندھے تھے کہ ہمیں تمہاری حالت کی خبر نہ ہوتی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ استانی کے فرائض کے بارے میں تمہارے نظریات کیا ہیں۔ تم ایسی عورت کے ہاتھ میں لڑکیوں کی تعلیم سپرد کرکے میں پچھتاتی ہوں۔ جونہی یہ خیال آتا ہے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں تمہاری بے شرمی اور غفلت شعاری انتہا کو پہونچ گئی ہے" استانی غصہ سے تمتما اٹھی۔ مگر اس کی آواز اس قدر ملائم اور نحیف تھی کہ لڑکیاں اسے سن نہ سکیں۔

"بولے جاؤ، بہانہ تو تلاش ہی کرلیا۔ ہر ابالی اور بدکار ایسا ہی کرتا ہے تم نے نتائج کی پرواہ نہ کرکے ایک آوارہ مہمان سے ناجائز تعلقات پیدا کئے تم سے خدا سمجھے گا۔ تم ایسی عورت کا استانی ہونا کتنا شرمناک ہے تمہیں میرے متعلق اب زیادہ حسن ظن نہ رکھنا چاہئے۔ اب میں تمہیں ایک لمحہ کے لیے یہاں نہیں ٹھہرا سکتی۔"

لڑکیاں کانپ اٹھیں وہ سب کچھ نہ سمجھ سکیں مگر پھر بھی ان کی ماں کی آواز دہشتناک تھی۔ اس کے جواب میں مس مین سسکنے لگی ان کی بھی آنکھوں سے آنسو کے قطرے نکل پڑے۔ مگر ماں کا پارہ چڑھتا ہی گیا۔

"اب چیخنے چلانے کے علاوہ رہ ہی کیا گیا ہے لیکن تمہارے آنسو مجھے نہیں رلا سکتے۔ مجھے تم جیسی عورت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ مجھے اس کی قطعاً پروا نہیں کہ مجھ پر کیا بیتے گی۔ تمہیں اپنا نام تو معلوم ہی ہوگا بہرحال تمہارے معاملہ میں مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس میرا حکم ہے کہ میرا مکان خالی کردو۔"

اس طرح مس تین کی پُرحسرت سسکیاں خاموشی میں گویائی کا کام کر رہی تھیں۔ ان لڑکیوں نے کبھی کسی کو روتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس کی آہ وزاری نے شکوک وشبہات کو دور کر دیا۔ ان کی ماں تھوڑی دیر بیٹھی ہوئی انتظار کرتی رہی۔ آخر کار تڑپ کر ترش روئی سے بولی

مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے کہدیا۔ ابھی سہ پہر کے بعد اپنا بوریا بستر سنبھال لو اور صبح اپنی تنخواہ لے کر زوچکر ہو جاؤ ——— اب تم جا سکتی ہو"

لڑکیاں بھاگ کر کمرہ میں گھس گئیں۔ آخر کیا ہونے والا ہے؟ اس برس پڑنے کی وجہ کیا ہے۔ وہ راز حقیقت جس پر پردہ پڑا ہوا تھا اب ظاہر ہونے لگا کئی مرتبہ والدین سے بغاوت کرنے کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوا۔

"ماں کا انداز گفتگو کس قدر کریہہ تھا" بڑی لڑکی نے کہا۔

چھوٹی بہن اس بیباک نکتہ چینی پر کانپ اٹھی اور ہکلاتے ہوئے بولی

"لیکن.........لیکن......... ہم تو یہ بھی نہیں جانتے ہیں کہ اس نے کیا کیا ہے؟"

"میں خوب جانتی ہوں کوئی نئی بات نہیں ہے مس تین کبھی بھی کوئی غلطی نہیں کر سکتی۔ ماں تو اس سے اتنا بھی واقف نہیں جتنا کہ میں"

"وہ بری طرح چلا اٹھیں مجھے تو یہ برا معلوم ہوا"

ہاں وہ برا تھا۔ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی دل کو کھٹا کر دینے والی تھی۔ غصے کے مارے اس کی زبان رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اسی وقت مس تین کمرے میں داخل ہوئیں۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

"مجھے آج سہ پہر کے وقت بہت کام کرنا ہے۔ اگر میں تمہیں چھوڑ کر چلی بھی جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ تم میں سے ہر ایک شریف لڑکی بننے کی کوشش کرے گی۔ آج شام میں تمہارے ساتھ گذاروں گی" یہ کہکر وہ باہر چلی گئی۔ مگر اپنے ساتھ چہروں کی تر و تازگی اور دلوں کی خوشی بھی ... لیتی گئی۔

"کیا تم نے اس کی آنکھوں کو نہیں دیکھا؟"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں آخر بیچاری مس آمین سے کیوں ناراض ہیں؟"

"غریب مس آمین"

اس کے منہ سے دوبارہ اکھڑی ہوئی آواز نکلی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس کے بعد اس کی ماں نے آکر پوچھا کیا وہ اس کے ساتھ سیر کرنے چلیں گی۔

"نہیں اماں! آج ہم لوگ نہیں جائیں گے"

درحقیقت وہ اپنی ماں سے ڈر رہی تھیں اور غصہ اس بات پر تھا کہ مس آمین کو نکالتے وقت ان کی ماں نے انھیں کیوں نہ بتایا۔ اس وقت تنہا رہنا ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ طائر قفس کی طرح وہ کمرہ میں پھڑپھڑاتی رہیں گر خاموشی اور فریب کے بار سے دبی جا رہی تھیں۔ انھوں نے مس آمین سے سب کچھ پوچھنے اور اسے اپنی ماں کے خلاف رو سکنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ وہ صاف طور پر کہہ دینا چاہتی تھیں کہ ان کی ماں کا رویہ اس کی طرف بہت غیر منصفانہ ہے۔ مگر وہ یہ کہکر اسے زیادہ غمگین بنانا پسند نہ کرتی تھیں اور یہ سب کچھ کہتے ہوئے وہ جھجکتی بھی تھیں کہ کسی کو یہ خیال ہو جائے کہ انھوں نے اسے کیسے معلوم کیا۔ ان کے دلوں میں چور تھا کیونکہ سب کچھ سن گن کر معلوم کیا تھا غرضکہ سہ پہر کا وقت اسی طرح افسردگی میں کٹا۔ اس درمیان میں جو کچھ انھوں نے دروازہ کی آڑ میں چھپکر سنا تھا بار بار یاد آرہا تھا.... اف ماں کی سنگدلی اور بے رحمی...... مس آمین کی حسرت بھری سسکیاں۔

شام کو استانی آخری ملاقات کے لئے آئی۔ جونہی وہ کمرہ سے باہر نکلی لڑکیوں نے سکوت کو توڑنا چاہا لیکن ان کی زبان پر ایک لفظ نہ آسکا دروازہ پر پہونچ کر جیسے وہ ان کی خاموش حسرتوں سے متاثر ہو گئی ہے اس ہین واپس ہوئی۔ اس کی آنکھیں جذبات کی شدت سے چمک رہی تھیں۔ وہ دونوں سے بغلگیر ہوئی جو فوراً بے تحاشا رونے لگیں انھیں دوبارہ پیار کر کے استانی فوراً باہر نکل گئی۔ لڑکیاں سمجھ گئیں کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ ایک نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"اب ہم اسے کبھی نہ دیکھ سکیں گے"

"کل جب ہم اسکول سے واپس آتے ہوں گے تو وہ چلی گئی ہوگی"

"لیکن اگر ہم پھر کبھی ملے تو اس کا بچہ بھی اس کے ہمراہ ہوگا"

"ہاں وہ تو بڑی ہی پیاری ہے۔ غریب مس ٹین۔"

معلوم یہ ہوتا تھا کہ اس حسرتناک جملہ میں ان کی قسمت کی پیشینگوئی مضمر ہے۔

"آخر اس کے جانے کے بعد ہم کیسے رہیں گے۔"

"میں تو اس استانی کے علاوہ شاید ہی کسی کے سامنے کھڑی بھی ہو سکوں۔"

"میں بھی نہیں۔"

مس ٹین کی طرح کوئی دوسری نہ ملے گی۔ اس کے باوجود ....جب سے معلوم ہوا وہ حاملہ ہے۔۔"

اس میں جملہ پورا کرنے کی ہمت نہ تھی ایک نادانستہ جذبہ نسوانیت نے مس ٹین کو ان کی نگاہوں میں وقیع اور معزز بنا دیا تھا۔

یہی خیال ہمیشہ ان کے ذہن میں چکر کاٹتا اور اسی کو سوچ کر ان کا دل پسیج جاتا۔

"مجھے ایک بات کہنی ہے،" ایک نے کہا

"ہاں کیا ہے؟"

"میرے دماغ میں ایک تدبیر آئی ہے۔ کیا اس کی جدائی سے پہلے ہم اس کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے جس سے اس پر ظاہر ہو جائے کہ ہم اسے کتنا چاہتے ہیں اور ہم لوگوں کی طبیعت اپنی ماں سے کس قدر مختلف ہے۔ کیا تم میری تدبیر میں شریک ہو گی؟"

"بالکل،"

تم جانتی ہو کہ اسے گلاب کے پھول کس قدر پسند ہیں۔ کل ہم لوگ علی الصبح باہر نکل چلیں اور اسکول جانے سے قبل کچھ پھول خرید کر اس کے کمرہ میں رکھدیں۔"

"لیکن کب۔"

"اسکول کے بعد۔"

تب تو اس سے کوئی فائدہ نہیں، اس وقت تک وہ چلی گئی ہو گی۔ دیکھو میں ناشتہ سے قبل ہی نکل جاؤنگی اور پھول جمع کر لاؤں گی پھر ایک ساتھ اس کے کمرہ میں چلیں گے۔"

"بہت خوب پھر ہمیں صبح سویرے اٹھنا چاہئے۔"

انھوں نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا۔ وہ خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھیں کیونکہ انھیں اپنی محبت کے اظہار کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ صبح سویرے ہاتھوں میں گلاب کے پھول لئے ہوئے انھوں نے مس ہمین کے دروازہ کو کھٹکھٹایا کوئی جواب نہ ملا۔ یہ سوچ کر کہ استانی سو گئی ہوگی۔ انھوں نے جھانکنا شروع کیا۔ کمرہ خالی پڑا تھا بستر پر شکن تک نہ تھی۔ گویا کوئی اس پر سویا بھی نہ تھا۔ میز پر دو خطوط پڑے تھے۔ لڑکیاں حیران ہو گئیں آخر کیا ہو گیا؟

بڑی لڑکی نے کہا۔ "میں سیدھی ماں کے پاس جاؤں گی۔"

"اس نے بے خوف و خطر پوچھا۔ "اماں مس ہمین کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔"

"کمرہ میں تو کوئی نہیں ہے، وہ آج سوئی بھی نہیں۔ ضرور وہ کل رات چلی گئی۔ اس کے متعلق آپ نے ہم لوگوں سے کیوں نہیں ذکر کیا؟"

ماں کو اس کی سخت آواز کا ذرا بھی خیال نہ ہوا۔ یہ سن کر وہ زرد پڑ گئی۔ اپنے شوہر کو لے کر وہ مس ہمین کے کمرہ میں داخل ہوئی۔

وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرے اس دوران میں لڑکیاں اپنی ماں کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتی رہیں۔ ماں انکا کوئی جواب نہ دے سکی۔ کچھ دیر میں ان کا باپ ایک کھلا ہوا خط لئے ہوئے واپس لوٹا وہ خود ہی بہت پریشان تھا۔ والدین اپنے کمرے میں چلے گئے اور دبی آواز سے باتیں کرتے رہے۔ اس مرتبہ لڑکیوں میں ان کی گفتگو سننے کی ہمت نہ تھی۔ انھوں نے اپنے باپ کو اس حالت میں کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔

جب ان کی ماں باہر نکلی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھنا چاہا مگر اس نے ترش روئی سے ڈانٹا۔

"اسکول جاؤ ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

انھیں جانا پڑا گھنٹوں درجہ میں کھوئی ہوئی بیٹھی رہیں۔ ایک لفظ بھی نہ سن سکیں چھٹی ہوتے ہی وہ گھر کی طرف دوڑیں۔ سبھی کے چہرے خوفناک ہو گئے تھے حتیٰ کہ نوکروں کا چہرہ بدلا ہوا تھا جب ماں ان سے ملنے آئی

تو اس نے کہا۔

بچو!! اب تم مس آمین کو کبھی نہ دیکھ سکوگی۔ وہ ... . جملہ پورا نہ ہو سکا۔ لڑکیوں کا چہرہ اسقدر خوفناک ہو گیا تھا کہ ماں کی کچھ ہمت نہ پڑی وہ مڑی اور اپنے کمرے میں جاکر پناہ لی۔

اسی دن سہ پہر کو آنٹو بھی وارد ہوا۔ ان خطوں میں سے ایک اس کے نام کا بھی تھا۔ جس میں اسے آنے کی دعوت دی گئی تھی وہ بھی اداس اور پریشان تھا کسی نے اس سے بات تک نہ کی۔ ہر ایک نے اس سے پرہیز کیا۔ وہ دونوں لڑکیوں کو ایک گوشہ میں غیر مطمئن پاکر انھیں کے پاس گیا۔

"ہمارے نزدیک مت آؤ" دونوں چلا اٹھیں۔ جیسے ان پر کوئی ناگہانی آفت ہی آنے والی ہو۔

تھوڑی دیر تک وہ اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ پھر غائب ہو گیا انھوں نے کسی سے اس کا تذکرہ تک نہ کیا اور نہ آپس میں کوئی بات ہوئی۔ بلا کسی مقصد کے علیٰحدہ علیٰحدہ وہ کمروں میں گھومتی رہیں اور جب ایک دوسرے کے پاس سے گذرتیں تو اشک آلود چہرے پر نظر اٹھا کر دیکھ لیتیں اب انھیں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا انھیں یقین تھا کہ انھیں سراسر دھوکا دیا گیا۔ وہ اپنے والدین کے کمینہ پن اور ذلالت پر چڑچڑا ئیں مگر کوئی چارہ نہ تھا ماں باپ پر ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ ہر شخص سے بدگمان ہو گئیں۔ ہر چیز سے انھیں مکر و فریب کی بو آتی احساس زندگی کے بارے ان کے نوجوان نازک شانے دبے جا رہے تھے۔ طفولیت کا انبساط بچپن کی بےپروائی ختم ہو گئی وہ نامعلوم خطرات کی منتظر رہنے لگیں اگرچہ اس واقعہ کی پوری اہمیت ان کی سمجھ اور عقل سے باہر تھی مگر پھر وہ اس کے دہشت ناک اور ہولناک امکانات کے معلوم کرنے کی جد و جہد کر رہی تھیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ رہتیں مگر ان میں ایک خاموش ربط قائم تھا وہ اس طلسم سکوت کو توڑ نہ سکتی تھیں۔ اپنے بڑے بوڑھوں سے علیٰحدہ رہتیں ان تک کسی کی رسائی نہ تھی کیونکہ انھوں نے اپنے دلوں کے دروازے بند کر دئے تھے .... شاید آنے والے کئی سالوں کے لیے۔ انھیں گرد و پیش کی ہر چیز سے نفرت تھی کیونکہ کچھ دنوں کے مختصر عرصہ میں وہ سن رشد و تمیز کو پہونچ گئیں تھیں۔ بچپن کی لاپروائی جوانی کی ذمہ داریوں اور نسوانی جذبات کے ناگہاں ارتعاش سے مغلوب ہو چکی تھی۔

ایک روز شام کو بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک بچپن کا آسیب ان میں پھر پیدا ہو گیا مرد وہ عورت کا خوف

اور خوفناک مکانات ان کے چاروں طرف شیطان ڈراؤنی شکل میں منڈلانے لگے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایسی گھبراہٹ میں وہ کمرہ کو گرم کرنے کے لئے آگ بھی نہ جلا سکیں دونوں لڑکیاں ایک ہی بستر میں گھس گئیں۔ اور کچھ تو گرمی پہونچانے اور کچھ ایک دوسرے کو تقویت دینے کے لئے کانا پھوسی کرنے لگیں۔
عنوان گفتگو بہت ہی معمولی تھا وہ اپنے مصائب کا دکھڑا بیان کر رہی تھیں لیکن چھوٹی لڑکی (جوکہ سریع الاحساس تھی) کے محبوس جذبات کو اشکوں کے راستہ تسکین ملی۔ بڑی لڑکی بھی رونے لگی۔ وہ ایک دوسرے کی آغوش میں روتی رہیں۔ وہ مس ہین کی جدائی پر اتنا غمگین نہ تھیں جتنا یہ سوچ کر کہ معلوم نہیں کس وقت کیا مصیبت نازل ہوجائے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے ایک حقیقی دردناک واقعہ دیکھا تھا۔ بھلا اسے کیسے بھلا سکتیں ان میں احساس اور بیداری پیدا ہوگئی تھی۔ جس کا ردعمل یہ ہوا کہ وہ زندگی سے بیزار ہوگئیں۔
زندگی کا جنگل ایک گھنا جنگل ہے جس میں درندے بستے ہیں انھیں یہ جنگل پار کرنا تھا۔ ابھی تک ـــــ بے خوف وخطر چلی جارہی تھیں مگر اب انھوں نے درندوں کے پاؤں کے نشانات دیکھ لئے اور یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ معصوم اور کمزور انسانوں کو کس طرح چیر پھاڑ ڈالتے ہیں۔ انھیں اپنی زندگی کے متعلق خطرہ پیدا ہوگیا ـــــ کہ نہیں معلوم یہ درندے ان پر کب حملہ کردیں۔
لیکن اس کے ساتھ بچپن کا تجسس بھی کم ہوتا گیا۔ اب نہ وہ زور زور سے روتیں اور نہ دیر میں آتیں ـــــ ان کی زندگی کی ندی میں طوفان اٹھتے تھے مگر خاموش تلاطم برپا تھے مگر بے آواز۔

مترجمہ ملک حامد حسین صاحب

جامِ صہبائی

(۱)

ہو مہر کہ ماہ دیکھتے ہیں تجھ کو!
ہم شام و پگاہ دیکھتے ہیں تجھ کو!

میداں ہو کہ کوہسار صحرا ہو کہ باغ
ارباب نگاہ دیکھتے ہیں تجھ کو!

(۲)

کرنا ہے جو مجھ کو کام کر جاؤں گا
حق کوش ہوں حق کی راہ پر جاؤں گا

اے لشکرِ اہرمن ڈراتا ہے کسے!
تیری صفیں چیر کر گزر جاؤں گا

(۳)

اخلاص و وفا میں بھی ہے طاقت پنہاں
تسلیم و رضا میں بھی ہے طاقت پنہاں

بے تیغ و تفنگ ہیں بہ ظاہر، مگر
مردانِ خدا میں بھی ہے طاقت پنہاں

(۴)

زردار بھی حکمراں بھی جھک جائیں گے
سرکش ہیں جہاں جہاں بھی جھک جائینگے

تو دامنِ حق اگر نہ چھوڑے گا اثر
تیرے لئے آسماں بھی جھک جائینگے!

(۵)

نمرود نے آگ پھر جلائی ہے یہاں
فرعون کو دعوائے خدائی ہے یہاں

یارب، ہیں کہاں تیرے خلیل اور کلیم
مردانِ خدا کی جگ ہنسائی ہے یہاں

(۶)

بڑھ بڑھ کے جگر پہ زخم کھاتا ہوں میں
ہر زخم پہ جھومتا ہوں گاتا ہوں میں

اوروں کی مصیبتوں پہ رو دیتا ہوں
اور اپنے غموں پہ مسکراتا ہوں میں

اثر صہبائی

بکھری ہوئی پتیاں

(سانیٹ)

اے دوست! پھر بھی میری پریشانیاں یہ کیوں؟
تاریخ باغ دہر کو ترتیب دے چکا
منظوم گلستاں کی بہاریں بھی لے چکا
لیکن پڑی ہیں، بکھری ہوئی پتیاں یہ کیوں!
مدت سے ایک فکر ہے، صدیوں سے کوششیں
لیکن ہوئیں نہ آج تک افسوس کامیاب
یعنی ابھی ہر ایک تغیر، ہر انقلاب
کھاتا رہا ہے چار قدم چل کے لغزشیں!
یہ نظم، یہ فسانہ، یہ تقریر، یہ پکار
اسٹیج سے زمانہ کے سوسرخیوں کے ساتھ
ان منتظر سی، تکتی ہوئی ہستیوں کے ساتھ
کس درجہ دلفریب مگر کتنا انتشار!!
—— کر شور اے حیات! کہ سمجھی نہیں ہوں میں
اے زندگی، پکار! کہ اندوہگیں ہوں میں!

سلام (مچھلی شہری)

آخری نصیحت

حیات ہو نفسِ مہر و ماہ تیرے لئے
جہاں تمام ہو اک درسگاہ تیرے لئے
اندھیری رات میں عصرِ رواں کی، تو نہیں
شرارِ عشق ہو قندیلِ راہ تیرے لئے
ترے ضمیر پہ روشن ہو باطنِ امروز
میں مانگتا ہوں خدا سے نگاہ تیرے لئے

حیاتِ دہر ہو اک بحرِ بیکرانہ تجھے
اسیرِ دام نہ کر دے تلاشِ دانہ تجھے

وفورِ غم سے تری روح بے قرار نہ ہو
شکستِ عمرِ جوانی سے اشکبار نہ ہو
تمام قلب و جگر ہو ترا، کنارِ طلب
مگر تو ساحلِ مقصد سے ہمکنار نہ ہو
تلاشِ رزق بھی ہے شرطِ زندگی لیکن
خودی کو بیچ کے فطرت سے شرمسار نہ ہو

رہے نظر میں ترے امتیازِ دین و وطن
ترے نصیب ہو، سوز و سرورِ عہدِ کہن

فضل حسین صاحب کیفؔ

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

بیسک انگلش:۔ از خیرات علی زیدی، مددگار مدرسہ فوقانیہ میدک حیدرآباد دکن۔ سائز ٢٠×٢٦/٨ صفحات ٨٢، قیمت ۸/ غالباً مصنف صاحب سے مل سکتی ہے، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی قیمت کچھ زیادہ ہے

انگریزی زبان کو دنیا بھر کی زبان بنانے کے مقصد سے ایک طریقہ تعلیم زبان ایجاد کیا گیا ہے جس کو "بیسک انگلش" کہتے ہیں اس کی رو سے انگریزی زبان کے ٢٥٠٠٠ الفاظ کو ٨٥٠ الفاظ کی مدد سے سمجھایا گیا ہے مقصد محض یہی ہے کہ جو لوگ انگریزی زبان نہیں جانتے وہ جلد از جلد سیکھ سکیں اور جو تھوڑی بہت جانتے ہیں وہ خاصی جاننے لگیں۔ حال میں اس بنیادی انگریزی نے اس قدر مقبولیت حاصل کی ہے کہ انگریزی ادب کی بہت سی مشہور کتابیں اسی سادہ زبان میں منتقل کی جانے لگی ہیں تاکہ نوشندہ انگریزی جاننے والے انگریزی ادب سے بھی مستفید ہو سکیں۔ خیرات علی صاحب نے بنیادی انگریزی کے اصول اور قاعدوں کو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لیا ہے۔ اس لئے بڑی وضاحت اور سلجھاؤ سے اس کے مسائل کو بیان کیا ہے انگریزی میں تو خیر اس موضوع پر بہت سی کتابیں ملتی ہیں لیکن اردو میں کوئی نہ تھی وہ لوگ جو انگریزی زبان سے مرعوب ہیں یا سچ مچ شوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ بنیادی انگریزی کی کتاب بہت ہی مفید ثابت ہوگی۔

اس انگریزی کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ہمیں اردو کی اشاعت میں بھی ایسی ہی جد و جہد کرنا ہے کچھ دن ہوئے رسالہ آردو میں بنیادی اردو پر کسی نے کچھ لکھا تھا لیکن ضرورت اس کی ہے کہ بنیادی اردو کا کام کوئی منظم جماعت مثلاً انجمن ترقی اردو یا حیدرآباد کی کوئی جماعت کرے یہ اپنی زبان کی بہت بڑی خدمت ہوگی

حسینؑ اور انقلاب:۔ از جوش ملیح آبادی، ملنے کا پتہ سرفراز بکڈپو سرفراز بلڈنگ ناداں محل روڈ لکھنؤ۔

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۴۰، قیمت ۵ ر، کتابت و طباعت خاصی۔

زیرِ نظر کتاب میں جناب جوشؔ ملیح آبادی کا ایک مسدس ہے جو حضرت امام حسینؑ کا ایک مرثیہ ہے دو چھوٹے چھوٹے سلام اور چار رباعیاں ہیں۔ مسدس مرثیت لئے ہوئے ہے لیکن ظاہر یہ کیا گیا ہے کہ حسین کی مدافعت حکومت کے خلاف ایک انقلاب تھی۔ آج کل جبکہ انقلاب کا لفظ فیشن بن رہا ہے اس قسم کی تاویل روایات کہنہ کو قائم رکھنے کی ایک سعی معلوم ہوتی ہے۔ جوشؔ سے کبھی کبھی مذہبی ائمہ کے متعلق نظمیں سرزد ہو جاتی ہیں غالباً کسی شہرت یا کسی طبقہ میں مقبولیت کے خیال سے نہیں بلکہ صرف عقیدت کے جوش میں۔ وہ خدا پر یقین نہ رکھتے ہوں لیکن خدا کے بعض بندوں پر فریفتہ ہیں سچ ہے "کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے"

جہاں تک نظم کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ بے پایاں جوش، بلند معانی اور مناسب خوشنما جڑے ہوئے الفاظ کا ایک گلدستہ ہے۔ خلوص، صداقت اور عقیدت ہر ہر مصرعہ سے طراوت کرتی ہے۔ دو بند نمونتاً پیش ہیں امام حسینؑ کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

جو صاحبِ مزاجِ نبوت تھا، وہ حسین — جو وارثِ ضمیرِ رسالت تھا، وہ حسین
جو خلق کا شاہدِ قدرت تھا، وہ حسین — جس کا وجود فخرِ مشیت تھا، وہ حسین
سانچے میں ڈھالنے کے لئے کائنات کو
جو تولتا تھا نوکِ مژہ پر حیات کو

جو اک نشانِ تشنہ دہانی تھا، وہ حسین — گیتی پہ عرش کی جو نشانی تھا، وہ حسین
جو خلد کا امیرِ جوانی تھا، وہ حسین — جو اک سنِ جدید کا بانی تھا، وہ حسین
جس کا لہو تلاطمِ پنہاں لئے ہوئے
ہر بوند میں تھا نوح کا طوفاں لئے ہوئے

اس میں شک نہیں کہ مسدس کے سانچے میں جوشؔ کا یہ تجربہ بہت کامیاب رہا ہے پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ میر انیس کی سی روانی، گھلاوٹ اور خوشنمائی ان میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ وجہ اس کی صاف ہے

مسدس میں اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ بند کی ابتدا اتار سے ہوتی ہے اور جب ٹیپ کے مصرعہ پر پہونچتے ہیں
تو چڑھاؤ کی انتہا ہوتی ہے جوش کی طبیعت میں جوش ہی جوش ہے ایسا جوش جو اتار چڑھاؤ نہیں جانتا
بلکہ صرف چڑھاؤ ہی چڑھاؤ کا پابند ہے اس لئے وہ مدوجزر کی خوبصورتی نہیں پیدا ہوسکتی جو میر انیس کی نرم
وگرم متین اور پرجوش طبیعت کا نتیجہ تھی یہاں تک کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ میر انیس کی طبیعت کو مسدس سے
جو فطری مناسبت تھی وہ اس سانچہ سے بہتر کسی دوسرے میں ظہور پذیر ہی نہیں ہوسکتی تھی جہاں تک جوش
کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ قدرت الفاظ، جوش بیان اور جوش تصور میں ان کا پلہ کسی سے کم نہیں لیکن
اپنی طبیعت کی افتاد کے باعث میرے خیال میں یہ سب سے بہتر رومانی نظموں میں اپنی صلاحیتوں کا بہترین
اظہار کرسکتے ہیں۔ رزمیہ یا انقلابی نظموں کا سانچہ مسدس نہیں ہے اس کے علاوہ رزمیہ یا انقلابی نظموں
سے زیادہ ان کا بہترین میدان رومانی نظمیں ہیں جب یہ اس ڈگر سے ہٹ جاتے ہیں تو کہنے کو تو وہ ہر چیز
کہہ لیتے ہیں اور اچھی کہہ لیتے ہیں لیکن رومانی نظموں کی سی خوشنائی اور کمال کسی میں نہیں آتا انقلابی نظموں
کے لئے ان کی روح میں تڑپ تو کافی ہے لیکن اس کے برابر کی رومانی سوجھ بوجھ اور تنقیدی نظر نہیں۔

رسالہ چمنستان (شاعر نمبر) مدیر آغا سرخوش قزلباش نائب مدیر گوردھن داس ایم۔ اے ملنے کا پتہ قصر شاعر دہلی قیمت ۱۲؍

مارچ کا رسالہ چمنستان کا شمارہ شاعر نمبر ہے جو آغا شاعر قزلباش دہلوی مرحوم کی یادگار میں نکالا گیا ہے
آغا شاعر مرحوم دہلی دبستان شاعری کے پرانے نام لیواؤں میں سے تھے۔ داغ مرحوم کے مشہور شاگردوں
میں سے تھے افسوس کہ ۱۲ رمارچ کو یہ شمع بھی گل ہوگئی۔ زیر نظر شمارہ میں مرحوم آغا شاعر کی حیات وکلام پہ
اچھے اچھے مضامین ہیں نیز مرحوم کے دوستوں کے بیانات بھی ہیں جن سے مرحوم کے کلام پر بھی کافی روشنی
پڑتی ہے۔ مہاتما گاندھی کا بھی تعزیتی تار خصوصیت سے بلاک بنوا کر شامل کیا گیا ہے حالانکہ اس کی بالکل
ضرورت نہ تھی۔ جن حضرات کو دہلوی محاورہ بندی اور زبان سے شوق ہے ان کے لئے یہ نمبر ایک تحفہ
ثابت ہوگا کیونکہ آغا شاعر مرحوم کا کلام زبان ومحاورہ کا ایک خوشنما البم ہے۔

رسید کتب:۔

شمامۃ العنبر من مولد خیر البشر۔ از قاری شاہ محمد رحیم۔ ملنے کا پتہ تراہا بیرم خاں بھاٹک مفتی والان دہلی
قیمت ۸؍

قومیت اور بین الاقوامیت

مصنفہ محمد قاسم حسن

مصنف نے اس مقالے میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے عناصر سے بحث کی ہے۔ قومیت کا ارتقا کیونکر ہوا مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلے کے متعلق اسلامی نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ وہ عنوانات ہیں جن پر فاضل مصنف نے اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ بین الاقوامیت کی تحلیل کی ابتدا کیونکر ہوئی اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ قیمت عہ

بحر الکاہل کی سیاست

مصنفہ امین خالدی

اس مقالے میں مصنف نے بحر الکاہل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے اس کا خیال ہے کہ اگرچہ اس وقت دنیا کی نظروں میں بحر الکاہل نے وہ جگہ نہیں لی ہے جو اس کا حق ہے پھر بھی مستقبل میں بحر الکاہل کی اہمیت دنیا کے تمام سمندروں سے بڑھ جائے گی جس طرح کسی زمانے میں بحر روم کے ارد گرد مصری، یونانی اور رومی تمدن کا عروج ہوا اور اب بحر اوقیانوس یورپ اور امریکہ کی جدوجہد کا میدان ہے اسی طرح آئندہ بحر الکاہل دنیا کی معاشی اور سیاسی ترقی کا مرکز ہوگا اس مقالے میں انھوں نے امریکہ، جاپان، روس، انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی تجاذب اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔ قیمت ۸/

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر ۹ کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب   عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ.......... ساٹھ لاکھ روپئے ۶

جاری شدہ سرمایہ- - - - - - - - پچیس لاکھ روپئے ...۲۵

ادا شدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ روپئے

اپنے تمام بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے، ایسٹرن فیڈرل، آگ زندگی، رسل و رسائل موٹر ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ ضمانت اور عام حادثات کے ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن ، لاہور ، بمبئی ، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں۔ ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کی خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے۔ وہاں کارخانے کی اشیا کے مطابق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیا کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوئی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

المشتہر

مینجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوع اسلام

جو بیادگار حکیم الامت حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ ۔ مئی ۱۹۳۸ء سے پابندی وقت سے شائع ہو رہا ہے اور جس میں سیاسیات حاضرہ کے تمام اہم مسائل کے متعلق کتاب وسنت اور حضرت علامہؒ کے پیغام کی روشنی میں نہایت بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ان مضامین کی اہمیت کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ انھیں الگ پمفلٹوں کی شکل شائع کرنا پڑتا ہے اور ہر پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوتا ہے۔ سیاسیات کے علاوہ نظام اسلامی کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی نہایت جامع مضامین شائع ہوتے ہیں، ایک کارڈ لکھ کر پرچہ اور پمفلٹوں کا تعارفی منشور حاصل کیجئے۔

بدل اشتراک:۔ سالانہ چندہ پانچ روپیہ صر
ششماہی تین روپئے سے ر
قیمت فی پرچہ آٹھ آنے ۸ر

ناظم ادارہ طلوع اسلام
شمیم منزل۔ رشیدی پورہ (قرول باغ دہلی)

ممالکِ اسلامیّہ کی سیاست

مصنفہ عشرت علی، صدیقی، بی۔اے

مصنّف نے اس کتاب میں مختلف اسلامی ملکوں کے سیاسی اور تاریخی ارتقار پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے مصر، ترکی، عراق، عرب، ایران وغیرہ کی کیا حالت تھی۔ جنگ عظیم کے اختتام پر ان کی سیاسی اہمیت کیا باقی رہ گئی۔

مُصنّف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جنگ عظیم کے ختم ہونے کے بعد ان ملکوں میں کس قسم کی تحریکیں اُٹھیں، اُن کا حشر کیا ہوا اور موجودہ وقت میں ان کی سیاسی اور جنگی پوزیشن کیا ہے۔

اسلامی ملکوں کی موجودہ سیاست اس وقت کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ایسے وقت میں جب کہ ہر شخص اسلامی ممالک کی موجودہ سیاست کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے یہ کتاب بہت اہم ہے۔ قیمت عہ

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

تاریخ مسلم لیگ

از مظہر انصاری

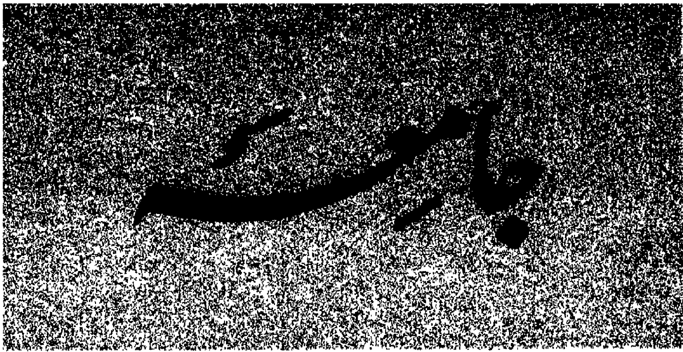
مسلم لیگ اور مسلمانوں کی پوری سیاسی تاریخ۔ اس کتاب میں مسلم لیگ کے قیام کے وقت سے موجودہ دور تک کے مکمل سیاسی حالات درج ہیں۔ تمام بڑی بڑی سیاسی تحریکوں کا ذکر ہے۔ بڑے بڑے لیڈروں اور سیاسی شخصیتوں اور ان کے اہم اور تاریخی کارناموں کا حال ہے۔ آخر میں مسلم لیگ کی ان کوششوں کا بھی تفصیلی ذکر ہے جو ۱۹۳۵ء کے دستور کے سلسلے میں اس کے رہنماؤں نے کیں۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ)

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکس) محبوب المطابع پریس دہلی



مکتبہ جامعہ دہلی

مطبوعات جامعہ

مکتبہ جامعہ نے اپریل ۱۹۴۱ء میں مندرجہ ذیل کتابوں کے جدید اڈیشن شائع کئے ہیں یہ کتابیں کچھ عرصے سے ختم ہوگئی تھیں، ورمانگ برابر آرہی تھی، اب انھیں نہایت اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ارباب ذوق توجہ فرمائیں۔

مضامین رشید بارسوم ۲۹۶ صفحے عـ۸ر
تاریخ القرآن بارسوم ۱۵۸ ″ عمر
حیات حافظ باردوم ۱۷۶ ″ عمر
رسول پاک باردوم ۴۸ ″ ۸ر
ضبط نفس اور نفس پرستی باردوم ۲۰۸ ″ عمر
ازہار العرب باردوم ۸۰ ″ ۸ر
جمال الدین افغانی باردوم ۷۰ ″ ۵ر
اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں بارچہارم ۶۲ صفحے ۵ر
دس جنتی باردوم ۸۰ ″ ۵ر
ہمزاد (ڈراما) باردوم ۴۵ ″ ۶ر
دلی کی دو سو برس کی تاریخ باردوم ۶۰ ″ ۵ر
شہری آزادی باردوم ۸۲ ″ ۱۲ر
دیہی قرض باردوم ۴۸ ″ ۴ر
ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ باردوم ۵۶ ″ ۱۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی ۳

جامعہ

زیر ادارت: نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۴: نمبر ۶ | بابتہ ماہ جون سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر: محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

استاد اور اس کے مسائل

(یہ مقالہ ٹیچرز ٹریننگ اسکول رامپور کی ایجوکیشن سوسائٹی میں وہاں کے طلبہ کی فرمائش پر پڑھا گیا)

استاد اور اس کے مسائل! لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا استاد کے بھی کوئی مسائل ہوتے ہیں؟ استاد اور اس کے مسائل، یہ پکار تو پہلے کبھی سنی نہ تھی۔ سنتے تھے کہ اقلیدس اور ہندسہ کے مسئلے ہوتے ہیں جنھیں استاد لوگ مدرسہ میں بیٹھے سلجھایا کرتے ہیں۔ اکثر منطق اور الہیات کے مسئلے بھی ہوتے ہیں جنھیں یہ لوگ الجھایا کرتے ہیں اور ان کے بعد استاد کیا اور اس کے مسئلے کیا! اور پھر مسئلے تو علمائے کرام کا حصہ ہیں اور استاد تو

نہ مفتیم، نہ فقیہم، نہ محتسب نہ امیر

میرے دوستو! سماج سمجھتی ہے کہ اس نے استاد کو مدرسہ کی چہار دیواری میں ہمیشہ ہمیش کے لئے بند کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ علم کی اس کال کوٹھری میں وہ اور اس کے مسائل آپس میں سر ٹکراتے رہیں لیکن اس ٹکراؤ کی گونج مدرسہ کے ایوانوں سے باہر نہ آنا چاہئے۔ تو پھر استاد کیا اور اس کے مسائل کیسے!

سماج کہتی ہے کہ ہم نے استاد کے لئے کام کرنے کو مدرسہ دیا، پیٹنے کو بچے دئے، آگے کو میز اور پیچھے بیٹھنے کو کرسی۔ اتنا شکر ہے کہ یہ نہیں کہہ دیا کہ کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا بھی دیا! تو پھر اب کونسے مسائل رہ گئے۔

بھلا جب گھوڑے کے لئے صاف ستھرا اصطبل موجود ہو۔ اگاڑی اور پچھاڑی لگی ہو کبھی کبھی دولتیں جھاڑنے کو دو چار ٹٹو بھی ادھر ادھر بندھے ہوں۔ جب چلنے کے لئے تعلیمی کوڈ کی وہ جرنیلی سڑک ہو کہ دونوں آنکھوں پر کھنے چڑھائے ہوئے بے فکر چلے جائیے اور ہانکنے کو محکمۂ تعلیم کا ہنٹر لگانے کی بھی ضرورت نہیں! ایک ہش کر دیجئے کہ تعلیمی گاڑی آسمان کی خبر لانے لگے۔

سماج سمجھتی ہے کہ استاد کیا اور اس کے مسائل کیا اور ہماری برادری بھی وہ شہ ماؤ اور لجاؤ برادری ہے کہ ان کے چہرے ہمہ تن سوال، ان کی صورت ہمہ تن مسائل لیکن اس سوال کو معرض بیان میں لانے کے لئے نہ تو ہمت ہے نہ سکت۔

میرے دوستو! اب وقت آچکا ہے کہ ہم بتائیں استاد ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کے مسائل زندہ حقیقتیں! استاد کے مسائل، مدرسے کے مسائل. مدرسے کی چار دیواری کے مسائل نہیں ہیں. استاد کے مسائل زندگی کے مسائل ہیں. جیسے زندگی کا ابوالہول ایک معمہ طلب ہمہ استفسار تبسم کا نشان استفہامیہ بنائے ہمارے سامنے کھڑا ہے کہ زندگی کیا ہے؟ اس کارخانہ حیات کا مقصد کیا ہے؟ استاد کے سامنے بھی تعلیم کی دیوی اپنے معنی خیز تبسم سے ایک چیلنج. ایک اعلان مبارزت پھینک رہی ہے بتاؤ تعلیم کیا ہے؟

اگر زندگی کی تفسیر اکبر الہ آبادی کے یہ الفاظ ہو سکتے ہیں کہ ؎

"بی۔ اے بنے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے"

تو تعلیمی زندگی کی تعبیر اس سے بھی مختصر الفاظ میں پیش کی جا سکتی ہے کہ

بی ٹی بنے، ٹیچر ہوئے، ساری عمر یوں کوڈ پر چلتے رہے جیسے چلے کولہو کا بیل
ہیڈ ماسٹر سے جنگ کی کچھ ساتھ والوں سے رہی اور آخرش پنشن ملی یعنی چھٹی آخر نکیل
اور اس رہائی پر ہوئی اتنی خوشی! اتنی خوشی! کہ بس خوشی سے مر گئے ملزم رہا قیدی جیل

لیکن اگر تعلیم زندگی کے مترادف ہے تو اس کے مسائل بھی اتنے ہی ہنگامہ خیز اتنے ہی ہمہ گیر ہونا چاہئیں تعلیم زندگی سے یوں ہم آغوش ہے جیسے دریا کی لہر ساحل سے بغلگیر ہوتی ہے. بھلا لہروں کے تلاطم کی دھمک ساحل کے سینہ میں نہیں اٹھتی. میرے دوستو! آج ہمیں تعلیم کو انھیں وسیع معنوں میں لیا ہے۔

ہمارے دیس میں علم اور زندگی کا رشتہ بہت گہرا رہا ہے. ایک زمانہ وہ تھا جبکہ پورا سماجی ماحول ایک زندگی بخش تعلیمی اثر لئے ہوئے تھا اس میں تعلیم و تربیت کی وہ خوشگوار لیکن نامعلوم سوتیں جاری تھیں جو فرد کو اپنے دامن میں یوں لپٹائے ہوئے تھیں جیسے کسی محبت بھری گود میں بچہ ہلکورے لے رہا ہو زندگی اور تعلیم ایک مسلسل اور مربوط سلسلہ تھا ایک نامعلوم اور بے پناہ وسعتیں دوسری میں یوں سرایت کرتی جاتی تھیں جیسے جھٹپٹے کے دھندلکے میں پتہ نہیں چلتا کہ اندھیرا کہاں ختم ہوا اور اجالے کی حدود کہاں شروع ہوئیں تعلیم اور زندگی دو ایسے جزیرے نہ تھے جن کے مابین ایک دریائے زخار اپنی طوفان خیز موجیں اٹھائے ہوئے ہو. اگر ایک دریا تھا تو دوسرا ساحل. اگر ایک چولی تو دوسرا دامن.

لیکن پچھلے سو سال سے ہمارے دیس میں ایک نئی تعلیم کا آغاز ہوا وہ تعلیم کسی دوسری فضا میں اچھی تعلیم تھی۔ کامیاب تعلیم تھی لیکن میرے دوستو! کسی تعلیم کی کامیابی کا معیار زمان و مکان ماحول اور فضا کی پابندیوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بھلا ایک دیو قامت پیپل کا درخت جو منطقہ حارہ کی ہواؤں کی گود میں پل کر برگ و بار لایا ہے جس کے پتے اس کی زندگی بخش گرم ہواؤں میں پھیلے اور پھیل کر سبز روشنی کا بقعہ نور بن کر رہ گئے۔ کیا یہی پتے شمال کی سرد ہواؤں میں سمٹ کر ان سوئیوں جیسے تیز نشتر نہ بن جائیں گے جن سے ان دیسوں کے درخت برفانی طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہیں؟ کیا جب منطقہ معتدلہ کے خطوں کا عطر بیز گلاب جب شمالی آب و ہوا میں پہونچایا جاتا ہے تو اپنی بو باس نہیں کھو دیتا؟ میرے دوستو! جب نباتی اشیا پر ماحول اور فضا کا اثر مسلمہ ہے تو نظام تعلیم جو مادی رشتوں سے زیادہ دقیق زیادہ نازک واسطوں کے ذریعہ اپنے سماجی اور کلچرل ماحول سے وابستہ ہے، کیسے اس مسلمہ سے بالا ہو سکتا ہے۔

میرے دوستو! ایک غیر معمولی طریقہ تعلیم کو اس ملک میں رائج کرنے کے سلسلے میں لوگوں نے وہی غلطی کھائی جو ایک معمولی کسان یا باغبان بھی نہیں کرتا اس کا جو نتیجہ ہوا وہ سب پر ظاہر ہے تعلیم اور زندگی کا وہ نازک رشتہ سیاستدانوں کے غیر ہمدردانہ سلوک کی تاب نہ لا سکا اس کے ریشے آہستہ آہستہ ٹوٹنے لگے اور ان دونوں میں ایک غیر شعوری اور نامعلوم طور پر خلیج پیدا ہو گئی۔ ہمارے ملک میں تعلیم اور زندگی جھیل ڈل پر دو تیرتے ہوئے جزیروں کی طرح تھے جن میں کشش عنابیب شعری ایک ذرہ کو دوسرے ذرہ سے وابستہ اور منسلک کرتی ہے آہستہ آہستہ یہ طاقت منتشر ہوتی چلی گئی اور ہمارے تعلیمی جغرافیہ میں ایک طرف زندگی، عوام کی زندگی ایک صحرائے ناپیدا کنار، ایک ریگستانوں کا سلسلہ ایک بنجر وادیوں کا ہجوم بیچ میں ایک خلیج اور دور پار نئی تعلیم کا نخلستان۔ میرے دوستو اس عظیم الشان خلیج کا پاٹنا آسان کام نہ تھا میں جانتا ہوں کہ پچھلی صدی نے چند ایسے دیو قامت انلس پیدا کئے جنہوں نے اس وسعت کو پانے کی کوشش کی۔ وہ عظیم الشان شخصیتیں جن کی پیامبرانہ نگاہ نے اس روزانہ بڑھنے والی خلیج کو پالیا تھا جن میں ایسی انتھک خود اتحادی تھی کہ انھوں نے اس نخلستان سے دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا تو ایسی بھیانک کھاڑی کو پار کر گیا جو عوام اور خواص کے مابین حائل تھا مگر پھر بھی انگریزی تعلیم والوں کو نئی دقتوں کا سامنا ہوا کوئی پودا ہم آہنگ آب و ہوا کے بغیر پروان نہیں بڑھا اور کوئی نظام تعلیم ایک شیش گھر میں رہ کر پنپ نہیں سکتا جب اس کے مصنوعی طریقوں سے کاشت کئے ہوئے پودوں کو صحرا کی سموم کا سامنا کرنا پڑا تو پہلے جھونکے میں ہی سنولا کر

رہ گئے ان میں زندگی کے لئے وہ ابدی اور مستقل اقدار کا احساس پیدا نہ ہوا جن سے حیات ابدی کی ہمک اٹھتی ہے اور جن کی صحیح پرکھ اور جانچ اصل مسرت کا راز ہے

کینڈیا کے مشہور تعلیم داں نے مدرسہ کو انسانوں کی بھٹی کہا ہے۔ اگر مدرسہ بھٹی ہے اگر ہماری درسگاہیں وہ لپکتا ہوا شعلہ ہیں جس میں تعمیر حیات کا عمل جاری ہے تو اسے زندہ رکھنے والی دھونکنی ہماری سماج اور کلچرل زندگی ہے جب تک اسے سانس ملتا رہے گا یہ زندہ ہے جس دن سانس بند ہو جائے گا یہ شعلہ بھی ٹھنڈا پڑ جائے گا تو دوستو! ہمارے نظام تعلیم کی تشکیل کرنے والوں نے دھونکنی تو بند کر دی اور امید یہ رکھی کہ بھٹی کا شعلہ جوں کا توں لپکتا رہے گا۔

تعلیم کا سچا اور وسیع مقصد محض مدرسے پورا نہیں کر سکتا مدرسہ تو سماجی اور معاشی زندگی کا ایک حد تک محدود اور تنگ ادارہ ہے جو محض کتابی تعلیم کے لئے وقف ہے لیکن وسیع معنوں میں تو پوری زندگی ایک دبستان علم و عمل ہے اس کے مختلف اداروں سے شخصیت کی اٹھان اور اس کی تکمیل نشوونما پاتی ہے زندگی کے ابتدائی دوروں میں انسان قبائلی گروہ میں رہتا تھا اور اس کی نئی پود غیر کتابی طریق تعلیم کی گود میں پلتی اور پروان چڑھتی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مدرسوں کی چار دیواری میں ان کے ضوابط اور بندھنوں کی پابند ہوتی گئی سب سے پہلے جس انقلاب آفریں معلم نے کتابی تعلیم کی بڑھتی ہوئی زنجیروں کو جھنجھوڑا یا وہ روسو تھا اس کی فطری تعلیم کی صدائے بازگشت اب تک وقت کے ایوانوں میں ٹکرا رہی ہے لیکن مدرسہ کو سماجی لحاظ سے زندہ حقیقت بنانے کا سہرا بیسویں صدی کے سر ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جب تک زندگی کی گرم اور ولولہ خیز لہریں مدرسہ سے یوں ہم آغوش نہ ہو جائیں جیسے کہ ایک محبت بھری ماں کی گود بچے سے ہوتی ہے' اسوقت تک مدرسہ میں زندگی کی حرارت گھر نہیں کر سکتی۔

میرے دوستو! آج ہمارے دیہی مدارس میں جو عام بے حسی اور زندگی سے سرد مہری پائی جاتی ہے اس کی بڑی وجہ یہی بڑھتا ہوا بُعد ہے جو مدرسہ اور زندگی میں پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے ہمارے تعلیمی اعداد و شمار کا مقیاس الحرارت صریحاً بتا رہا ہے کہ ابتدائی مدرسہ کی چار دیواری سے نکل کر فارغ التحصیل طلبہ کا معیار کس تیزی سے گرنے لگا ہے ہماری نئی نسل کی اکثریت مدرسہ سے باہر آکر یوں ٹمٹا کر رہ جاتی ہے جیسے دیوالی کا

چنڈول کسی جھکڑ میں آ گیا ہو۔

لیکن ایک زمانہ ایسا تھا کہ ہمارے مکتبوں کا فارغ التحصیل طالب علم باہر نکل کر اس سیاح کی طرح محسوس نہ کرتا تھا جس کے نتھنے کوہ ہمالیہ کی بلندیوں پر پہونچنے سے پھولے جارہے ہیں اور جس کا دم ہوا ہلکی ہونے کی وجہ سے گھٹتا جا رہا ہے اس کے برعکس اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی زندگی بخش فضا میں پہونچ گیا ہے جس میں علم وہنر کی وہ سوتیں جن کے سرچشمے مدرسہ نے کھولدئے تھے اب پوری قوت اور بہاؤ سے چل نکلیں گی۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب ہمارا سماجی اور معاشی ماحول تعلیمی اثرات سے یوں تنا ہوا تھا جیسے کسی کان کی فضا رقیق مادوں کی آمیزش سے آتش در آغوش ہوتی ہے۔

ایک زمانہ میں آپ کے اپنے شہر میں ہی چند اسباب سے کچھ ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی جس نے پورے شہر کی فضا کو وسیع اور عالمگیر معنوں میں تعلیمی بنا دیا تھا۔ انھیں معنوں میں جس میں ایتھنز ایک زمانہ میں عروس البلاد کہلاتا تھا یا غرناطہ شہروں کا سردار۔

کائنات کا وہ ترنم جس کے ہمہ گیر اثر سے صبح و شام، چاند اور سورج بھی بچ کر نہ نکل سکے۔ اس شہر میں پوری فضا کو تھرتھرا رہا تھا۔ رامپور کے موسیقی اسکول نے اس فن لطیفہ کی روایات کو ہی حیات جاوید نہیں بخشی؛ اس کے ترنم نے عوام کے دلوں میں وہ سکون اور کیف، توازن و تناسب کی وہ روح پھونک دی جو یونانی اخلاقیین کے نزدیک کامیاب زندگی کا اصل راز ہے۔ کتھک اسکول نے تربیت سمع کے ساتھ تہذیب نگاہ کا سامان بھی فراہم کیا۔ یہ حسن صوت کی بجائے پورے اعضائے انسانی کی شاعری تھی۔ میرے دوستو! ایسی مترنم فضا میں جہاں قدرت کا گرانبار عطیہ جسم انسانی خود ایک مجسم شعر اور پوری فضا ایک نغمہ ہو کون متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہ فضا وسیع معنوں میں تعلیمی فضا تھی۔

کچھ سال ہوئے ایک ولایت کے ماہر تعلیم نے ان ہی صوبجات میں مدرسوں کا دورہ کیا اور دورہ کے بعد انھیں یہ احساس ہوا کہ ہمارے مدرسوں میں مسرت اور خوشی کی فضا نہیں۔ ہمارے درس بے کیف ہمارا ماحول بے مزہ ہے اگر اس قسم کا ماحول جس کا میں نے ذکر کیا ہے ایک حد تک معصومانہ انداز میں ہم بچوں کی دنیا میں پیدا کر سکتے تو شاید ہم پر سے یہ الزام دھل جاتا بہرحال آپ دیکھئے کہ ہمارے پرانے تمدن میں ایک حد تک زندگی اور تعلیم کس طرح

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے شانہ بشانہ گامزن تھیں۔ آج ہماری یونیورسٹیوں میں ہندوستانی موسیقی کے اسکول کھولے جا رہے ہیں۔ ہمارے ماہرینِ تعلیم میں یہ احساس لطیف کافی دیر کے بعد بیدار ہوا ہے تاہم میں کہوں گا کہ علم موسیقی میں اعلیٰ اسناد پائے ہوئے حضرات (اور اب تو موسیقی میں ڈاکٹری کی سند بھی ملنے لگی ہے) اس فن لطیف کو پرکھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے میں اتنے کامیاب نہ ہوں گے جتنا رامپور کا ایک شہری۔

اور اس کے بعد آپ کا مشاعرہ ہے وہ موثر تعلیمی ذریعہ جس کی امداد سے عوام کا ادبی کلچرل معیار اونچا ہو جاتا تھا۔ پانی کے سیلاب کے برعکس ان ادبی کاریزوں کی سطح خواص کے معیار علم کے مطابق بلند ہوتی تھی اور اپنے ساتھ عوام کے خس و خاشاک جیسے مذاق کو بھی بلند کر دیتی تھی اس دلچسپ اور محبوب ذریعہ سے عوام میں توازن صوت کے ساتھ ساتھ تناسب خیال کا بھی عام مذاق پیدا ہوتا تھا آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ پچھلے زمانہ کا وہ اَن پڑھ شہری جس نے اس تاریخی شہر میں غالب اور امیر مینائی، جلال اور داغ کی آنکھیں دیکھیں ہوں گی حسن مذاق اور ذوق سلیم میں آج کل کے کتنے لکھے پڑھوں سے بڑھا ہوا ہوگا۔ ہمارا ادب کتنی ایک مثالیں ان شعرا کی مہیا کرتا ہے جنھوں نے ایک عرب بدو کی طرح فطرت کی گود میں یا ایک کلچرل ماحول سے متاثر ہو کر شاعری کی اور ایک حد تک کامیاب شاعری کی۔

اور ان سب کے بعد لیکن ان سب سے اہم مدرسہ عالیہ رامپور ہمارے پرانے نظامِ تعلیم کا وہ روشن چراغ ہے جس نے ایک اندھیاری دنیا میں، ایک ڈھلتے ہوئے زمانہ میں علم و ہنر کی کرنیں دوڑا دیں تھیں جس نے ہمارے ملک میں غرناطہ اور بغداد کی روایات زندہ کر دیں تھیں جس نے یونیورسٹی کے تصور کو جو حقیقتاً تعلیمی دنیا کے لئے اسلام کا خاص عطیہ ہے ایک روشن حقیقت بنا کر دکھا دیا تھا وہ قندیل علم جس کی لَو پر افغانستان، خوارزم بخارا اور ترکستان سے پروانے کھنچے چلے آتے تھے جو خواص اور عوام دونوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت تھا وہ ایسا خزینۃ العلوم تھا جس کی سوتیں ان آبشاروں کی طرح تھیں جو مسلمانوں کے عہد میں ان کی حسن تدبیر سے ہر صحن اور ہر پائیں باغ میں جاری و ساری تھیں، اس کے اساتذہ نہ صرف علمی دنیا میں بلکہ باہر کی دنیا میں بھی ایک مخصوص حیثیت رکھتے تھے، آج نگاہیں انھیں ڈھونڈھتی ہیں تعلیمی دنیا میں ان کے منصب، ان کے رتبے کو تلاش کرتی ہیں لیکن نہیں پاتیں؛ مولوی عبدالعلی فرنگی محلی بحرالعلوم علم و فضل کا وہ دریائے ذخار جو اپنی زندگی کے

ایک دور میں دکن پہونچا تو زمیں نے ان کی پالکی کو کندھا دے کر سعادت دارین حاصل کی مولوی حامد حسن صاحب خیرآبادی خیرآباد اسکول کے فلسفیانہ روایات کو زندہ رکھنے والے بزرگ، وہ نازک مزاج اور آزادمنش عالم جن کی وضعداریوں کو کچھ رامپور کی سرزمین ہی خوب نبھا سکی۔

جن کے لیے والی ملک نے اپنے خزانے کا منھ کھول دیا تھا جن کی نفاست طبع اور حسن ذوق کے بار کو رامپور کی قدردانی اور فیاضی ہی اپنا سکی وہ جب روٹھے تو والی ملک کے بنانے سے منے اور جب منے تو ایک زمانہ کے چہرے پر تبسم کھیلنے لگا۔

میرے دوستو! آپ کے شہر میں اس قسم کے زندہ ادارے تھے جن سے لہریں اُبھر اُبھر کر پورے ماحول کو مرتعش کر رہی تھیں آپ نے بزرگان دین کی تصاویر میں دیکھا ہوگا کہ ان کے چہرے کے گرد چاند کا ہالہ بنا ہوتا ہے اس قسم کا غیر محسوس اور غیر مرئی دائرہ فیضان ہر عالم اور ہر ادارے کا ہوتا ہے۔ عوام کے دلوں پر غیر شعوری اور شعوری طور سے ان کی ضیا منعکس ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے پرانے اداروں، ہمارے پرانے اساتذہ میں یہی خوبی تھی کہ وہ صحیح معنوں میں اخلاقی اور کلچرل لحاظ سے اس قسم کے مراکز نشر تھے جہاں سے علم و فضل کی لہریں اٹھتی تھیں اور پورے ملک کو شاداب و سرسبز کر دیتی تھیں۔

آپ کہیں گے کہ آخر ان اداروں کی کامیابی کا راز کیا تھا؛ یہ وہ ادارے تھے جو اپنے محدود دائرے میں ہماری سماجی اور مذہبی زندگی کے فطری اور طبعی نتائج تھے۔ یہ ادارے فطری جوش نمو سے ایک زرخیز مٹی سے اُگے اور اپنے برگ و بار سے ماحول پر سایہ فگن ہوئے ان کے اساتذہ کے درس بھی وہ سبق نہ تھے جو ایک شرمایا لجایا سا استاد احساس خودی کی گھبراہٹ سے بے چین اور پریشان استاد، ایک مدرسہ کی چار دیواری کے اندر محفوظ کر دینا چاہتا ہے یا ایک جھلملاتی ہوئی مشعل کی طرح جسے کوئی دونوں ہاتھوں سے ڈھانپے ہوئے ہو، ان اساتذہ کے درس فیضان قدرت کے کھلے خزانوں کی طرح جاری، چاند اور سورج کی طرح ضیا فگن، بادل کی طرح گوہر بار تھے ان کے اساتذہ برنارڈشا کے اساتذہ نہ تھے جس نے کہا ہے کہ "جسے کچھ آتا ہے کرتا ہے اور جسے کچھ نہیں آتا پڑھاتا ہے۔" میرے دوستو! یہ اساتذہ صحیح معنوں میں اساتذہ تھے ملک و قوم کے اخلاقی اور علمی لیڈر تھے ہمارے پیشہ کو ان سے فخر تھا۔ انھیں ہمارے پیشہ سے افتخار حاصل نہ تھا۔

آپ اس داستان پارینہ کو سنتے سنتے اکتا گئے ہوں گے لیکن نقش اس کے پس منظر کے ذریعہ سے ہی زیادہ روشن زیادہ معنی خیز ہو سکتا ہے اور ہر سماجی عمل اس کے تاریخی ماحول کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے ایک اجلے براق کپڑے پر سیاہ دھبے کتنے نمایاں. کتنے بدنما معلوم ہوتے ہیں لیکن صبح کے وقت پورب سے ابلتی ہوئی روشنی میں افق کے درختوں کے برگ و بار کتنے صاف، کتنے واضح ہوتے ہیں!

میرے دوستو! میں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ پچھلے زمانے میں استاد کے مدد و معاون، کتنے وسائل، کس قدر ذرائع تھے. آپ نے دیکھا کہ تعلیم خود زندگی سے گہرے انداز میں مربوط تھی. نصاب اور ذریعہ تعلیم ہمارے تمدن کا مرہون منت تھا. بچہ اگر مکتب سے محض نوشت و خواند سیکھ کر آتا تھا تو سماجی ماحول میں وہ زندگی بخش اثرات موجود تھے جو اسے حسن ذوق اور طبع سلیم اور جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ایک شگفتہ شخصیت عطا کر دیتے تھے. پھر پرانے زمانے میں استاد یا گرو کا مرتبہ خود حقوق، وقار، اثر اور رتبہ کا ایک جہان گھیرے ہوئے تھے.

اس پس منظر کے آئینہ میں نئے استاد کو دیکھو! اس جی ٹھا دینے والے ماحول کو دیکھو جس میں وہ کام کر رہا ہے. سماج میں اس کی جگہ کو دیکھو جو مسند سے کہیں پیچھے اور جوتیوں سے ذرا آگے ہے. اس کے مالی معاوضہ کو دیکھو جو چپڑاسی سے کچھ زیادہ اور پٹواری کی آمدنی سے کہیں کم ہے اور اس کے بعد دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ کیا دوبارہ تم وہی الفاظ اسی شان استغنا سے دہرا سکتے ہو کہ استاد کیا! اور اس کے مسائل کیا! استاد کے سامنے تعلیمی پس منظر کچھ بھیانک سا ہوتا جا رہا ہے. قدیم روایات کے ستارے ایک ایک کر کے افق کے پیچھے ڈوبتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ کوئی نئی امیدیں ابھر نہیں رہی ہیں. دیکھنا یہ ہے کہ ہماری تربیت گاہیں استاد کو ان نئے حالات میں ایک نئے تعلیمی جہاد کے لئے کہاں تک تیار کر رہی ہیں؟

کسی نے کہا ہے بچہ کو بالغ بنانے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم بچے کو بچہ بننا سکھائیں اور استاد کو استاد بننے سے پہلے ضروری ہے کہ اسے انسان بننا بتائیں. ہر پیشہ انسان کی عملی زندگی کے کسی ایک آئیڈیل کی نمائندگی کرتا ہے اور جب ہم ان اعلیٰ تصوری مقاصد کو اداروں میں مقید کرنا شروع کر دیتے ہیں تو محبس کے سایے ان پر گہرے ہونے لگتے ہیں وہ داخلی روشنی جو ان میں جھلملا رہی تھی آہستہ آہستہ مدہم پڑتی جاتی ہے اور بتدریج ہمارے ادارے ہمارے آئیڈیل کے مقبرے ہوتے جاتے ہیں

مجھے ڈر ہے ہمارے ملک کے ٹریننگ کالجوں پر بھی ایک حد تک یہی الزام عاید ہو سکتا ہے۔ ان اداروں میں آزادی اظہار شخصیت اور نشاط عمل کی خوش آیند صدائیں اٹھتی ہیں اور ان کی چار دیواری سے ٹکرا کر رہ جاتی ہیں۔ مجھے اپنا پرانا کالج یاد ہے۔ جہاں ہمارے کمرے "بارکیں" ہمارے استاد، اسٹاف ممبر، ہماری ریاضت جسمانی ملٹری ڈرل کہلاتی تھی اتنا شکر ہے کہ انھوں نے ہمارے ورزش ماسٹر کو ڈرل سارجنٹ اور ہمارے بورڈنگ سپرنٹنڈنٹ کو کوارٹر ماسٹر جنرل کا خطاب نہیں دیا تھا یہ بھی شاید انکساری تھی کیونکہ ظاہر میں تو یہ دونوں استاد ان فوجی افسروں سے کم نہ تھے۔ حیرانی ہے کہ ایک ہاتھ سے ہم آزادی کا گراں بہا عطیہ بچہ پر ہی نہیں ہر بالغ شہری پر نچھاور کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے یہی فطری حق استاد سے چھین رہے ہیں۔

جس استاد سے ایک ذمہ دار انسان کی طرح سلوک نہیں کیا گیا جسے اپنے اوپر بھروسہ کرنا نہیں سکھایا گیا جسے ایک سخت ضبط کے فولادی شکنجہ میں رکھا گیا۔ جسے کبھی تخلیقی خود اظہاری اور سماجی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔ وہ کیسے ایک نئی تعلیم کا علمبردار ہو سکتا ہے ایک نئی تعلیم نہیں ایک نئی زندگی کا اور وہ بچوں کو ایک نئی سماج، ایک نئے جمہوری نظام کیلئے کیسے تیار کر سکتا ہے۔

مگر میں ان پرانے فرسودہ اداروں میں ان کی سنگین دیواروں میں بھی رخنے پڑتے دیکھ رہا ہوں کہیں کہیں درزوں اور شگافوں میں سے نئے اصولوں کی روشنی پھوٹ نکلی ہے آپ لوگ جو ایک نئی تربیت گاہ میں کام کر رہے ہیں خوش قسمت ہیں۔ آپ کے ادارے کی اٹھان نئی تعلیم کے دور میں ہوئی ہے پرانے ادارے قدم آگے بڑھانا چاہتے ہیں لیکن ان کی نگاہیں ماضی کی طرف لگی ہیں اور پرانے ضبط اور روایات کی بھاری بھرکم زنجیریں ان کے پاؤں میں ہیں۔

اسی طرح مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس روشن خیال تربیت گاہ سے باہر جا کر تم بھی کبھی کسی ایسے مرقد گاہ میں نہ پہونچ جاؤ جہاں کے مجاور کوئی پرانا ہیڈ ماسٹر، جہاں کا سجادہ نشین کوئی سال خوردہ سکریٹری ہو جس پر پرانے تجربوں کی اتنی تہیں چڑھ چکی ہوں کہ وہ خود تعلیمی اصولوں کا ایک چلتا پھرتا تابوت ہو۔ وہ ہیڈ ماسٹر جو آپ کو اسکولی زندگی کے پہلے دن ہی ایک مربیانہ انداز میں ٹھیک کے ایک گوشہ میں لے جائے اور تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس انداز سے کہے گویا تعلیمی زندگی کے معموں کو ایک تو اس نے سمجھا ہے اور کچھ کچھ اس کی امداد سے تم سمجھنے کی کوشش

کر رہے ہو۔ وہ یہ کہے گا دیکھو بھیا! اپنے ٹریننگ اسکول کی باتوں کو ذرا تہہ کر کے رکھدو تمہارے سامنے یہ اصل زندگی ہے زندگی، یہاں ٹریننگ کالج کی ہوائی باتوں سے قلعہ سر نہیں ہوتا بچوں کو پڑھانے کا بس ایک ہی طریق ہے میاں باقی جتنے طریقے تم نے سیکھے ہیں وہ ان نئی تعلیم والوں کے چونچلے ہیں جیسے ہمارا خدا ایک ہے اور رسول ایک ہے پڑھانے کا طریق بھی ایک ہے اور وہ ہے ضبط اور اس کے گر دو ہیں۔ ایک تو ڈنڈے کو جماعت میں کبھی غیر حاضر نہ کرنے دو اور دوسرا ذرا الکھانس کر، دیکھنا یہ بہت اہم ہے اگر اسے نظر انداز کر دو گے تو دھوکا کھا جاؤ گے دوسرا یہ کہ کسی بچے کو جماعت میں کبھی سونے نہ دو اگر تم نے ان دونوں اصولوں کا دھیان رکھا تو دیکھ لینا کہ چند روز میں بچوں کا ناک میں دم آجائے گا واللہ ناک میں دم اور وہ جماعت میں صرف وقت گزارنے کے مقصد سے اس بے جگری سے کام کریں گے گویا زر خرید غلام ہیں یہ ہے تیس سال کے تجربے کا نچوڑ میرے دوستو! تم نے شاید پولیس کے تھرڈ ڈگری طریقے تو سنے ہوں گے یہ تعلیمی تھرڈ ڈگری ہے۔

اور اپنے نارمل اسکول کے جوش و ولولہ کے بعد یہ برفانی غسل۔ اس سرد آبی کے بعد جب اپنے ساتھیوں اپنے شرکائے کار کو دیکھو گے تو نظر آئے گا کہ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن میں زندگی کا شرار دھڑکا کیا سکیا بھی نہ لیتا ہوگا بلکہ سالوں پہلے جل بجھ کر ٹھنڈی راکھ بن چکا ہوگا یہ لوگ کم تنخواہ پر کام کر رہے ہوں گے اور اس کمی کا احساس ان کے چہروں پہ نمایاں ہوگا نہ تو ان کے ماتھے پر عزم صحیح، نہ ان کی نگاہوں میں جوش اور ولولہ نہ وہ چمک اور ذہنی جھلک جو نئی پود کے قائدین اور ان کے راہنماؤں کا حصہ ہوتی ہیں استادی کا پیشہ ان کے لئے کیا ہے ایک طوفان سے بچے ہوئے کی آخری پناہ گاہ کشمکش کا وہ طوفان جس کی تباہ کاری اپنے پیچھے نہ تو ذہن بیداری چھوڑتی ہے اور نہ علمی ذوق ہی!

ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ یہی لوگ اپنے مدرسوں میں طلبا کی برادری کے شاندار ستارے تھے۔ ان کے دل بھی جوش اور ولولہ سے لبریز تھے انھوں نے بھی اعلیٰ امتیازات حاصل کئے تھے۔ ان کے سینوں میں بھی زندگی کا طوفان اپنی قوت سے تلاطم خیز تھا ان میں بھی شوق عمل تھا ذوق جستجو تھا اور اب کیا ہیں اب مدرسے نے انہیں ایسے چوس لیا جیسے کسی ندیدہ بچہ نے سنگترے کی پھانک کو چوس لیا ہو۔ انھوں نے اسکولی زندگی کا تھکا دینے والا راستہ کٹ مر کر طے کر ہی لیا اور اس طول طویل سفر کو پورا کرنے کے بعد ان کے سامنے کیا تھا ایک کم مایہ پنشن یا پراویڈنٹ فنڈ

کا نخلستان !!!

تمہارے سامنے پورا مدرسہ ہوگا۔ اس کا پورا ماحول ہوگا۔ تمہیں محسوس ہو رہا ہوگا کہ پورے منظر پر اداسی پڑی ہوئی ہے، وہ اداسی جو گرم سے گرم جوش کو بھی ٹھنڈا کر سکتی ہے لیکن شاید اس افسردگی میں کسی ایک نے اپنے دل کی حرارت کو محفوظ رکھا ہو۔ کوئی ایک ایسا شریک کار جو اس تاریک ماحول میں بھی زندگی کی مدہم لو کو دونوں ہاتھوں سے اوٹ کئے ہوئے سینے سے لگائے کھڑا ہو شاید ایک دن وہ تمہارا دامن پکڑ کر کھڑا ہو جائے اس کی دو آنکھیں جن میں زندگی کی جھلک مدھم پڑتی جاتی ہو۔ ایک لمحہ کے لئے چمک اٹھیں اور روشنی کے مینار کے اس پاسبان کی طرح جو تن تنہا ایک سنسان جزیرے سے بھٹکتے ہوئے ملاحوں کو راستہ دکھا رہا ہو روح کی اس خوفناک تنہائی میں جہاں وہ اپنے آپ سے بھی بات کرتا ہوا گھبراتا ہو۔ شاید ایک دن وہ تمہارا دامن تھام لے اور کہے کہ دوست آج میں تمہیں سچ سچ بتا دینا چاہتا ہوں۔ سب کچھ سچ سچ اپنی روح کی بھلائی کے لیے سب کچھ سچ سچ اگر سچ پوچھو تو اب تک ہم نے کبھی کسی روح کی بھلائی کی پرواہ تک نہیں کی تھی مگر خدا جانے آج رہ رہ کر مجھے تمہارا خیال کیوں آ رہا ہے اور اس لئے میں تم سے دو باتیں کر لینا چاہتا ہوں۔ میرے جوان دوست میں تم سے دو باتیں کہہ دینا چاہتا ہوں بس ایک اور وہ یہ کہ یہاں سے بھاگو خدا کے واسطے یہاں سے کہیں باہر نکل جاؤ۔ ایسی تیزی سے نکلنے کی کوشش سے نکل جاؤ جیسے کہ تم اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہو۔ میرے عزیز یہ تمہارے جسم کا مسئلہ نہیں یہ تمہاری روح کا سوال ہے۔ بھاگو جلد بھاگو، اس سے پہلے کہ اس ادارے کی زندگی کا سایہ تمہاری روح پر پڑنا شروع ہو جائے اگر نہ بھاگو گے تو دیکھ لینا ایک سال تک نہ تم ہو گے نہ تمہاری روح تم مجھے اور دوسروں کو زندہ سمجھ رہے ہو کیسی بھلی خوش فہمی ہے میرے دوست ہم تو مردہ ہیں سولہ آنے مردہ ہیں ہم تو سالہا سال سے مردہ چلے آ رہے ہیں اور دیکھو نہ تمہیں یہ بات ہرگز نہ بتاتا لیکن کیا کروں سالہا سال کی مردنی سے میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے ہمیں زندگی کی آخری منزلوں میں ڈگمگا رہا ہوں میں کیا اور کیا میری زندگی! مگر تم جو اس سفر میں بھی نئے شوق سے قدم بڑھا رہے ہو خدا نہ کرے کہ تمہیں یہ زنگ لگ جائے میں یہ سب باتیں تم سے ہرگز نہ کہتا مگر میرے دوست سالوں کے یہ اور دردناک تجربے نے ان پر حقیقت کا رنگ دے دیا ہے میری زندگی کے سینے پر بالکل میں وہ داغ دے ہیں جن کے کچھ کہے میں خود ہی خوب جانتا ہوں۔ میں خود نہیں سمجھتا کہ میں تمہیں خواہ مخواہ کیوں تنگ کر رہا ہوں مگر

اب تو جو میں نے شروع کیا ہے اس کو سن لو۔ دیکھو بعد میں یہ نہ کہنا کہ تم سے کسی نے کہا نہ تھا"

میرے دوستو! پہلے مسائل ہمارے اصول تعلیم کے مسائل تھے یہ تمہاری عملی تعلیم کے مسائل ہوں گے۔ ان مسائل سے گھبرانا جانا! سنا ہے کہ دریا کا بدترین تلاطم نزدیکی ساحل کا پتہ دیتا ہے اور رات کا تاریک ترین حصہ صبح کے اجالے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

تعلیمی دنیا میں ایک نیا ستارا۔ ایک نیا آسمان اُبھرتا چلا آرہا ہے۔ یہ ستارۂ آزادی بچے کی آزادی کا ستارا ہے کسی نے کہا ہے کہ انیسویں صدی انسانیت کی جمہوریت کی صدی ہے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بیسویں صدی بچہ کی آزادی کی صدی ہے۔ اس ستارے کی کرنیں ابھی ابھی افق سے اوپر روشن ہو رہی ہیں۔ انھوں نے اب تک ان اداروں کو جگمگایا ہے جو ہماری تعلیمی دنیا کی چوٹیوں پر بنے ہوئے ہیں۔ ابھی اس کی گرم محبت بھرے بوسوں نے ان کے میناروں اور گنبدوں پر کندن جیسا رنگ ڈور دیا ہے۔ مگر دوستو! فطرت کے کوہساروں میں بھی ایورسٹ یا کنچن جنگا تو ایک دو ہی ہوتی ہیں مانا کہ ان کی بلندیوں میں ایک رومان ہے ان پر آکاش کے دیوتا آنکھ مچولی کھیلتے ہیں مگر اصل زندگی کی آبادیاں۔ اس کے گرجدار نغمے اس کی سنگین دشواریاں، اس کی جاندار پرشکوہ آبشاروں کی گونج وادیوں میں ہی ہوتی ہے میرے دوستو! ہمارے ملک کی تعلیمی وادی بھی وادیٔ مرگ سے کم نہیں۔ اس نئی صبح کا دھندلکا ابھی تک اس کی بے پناہ گہرائیوں اس کی دھند اور اندھیارے کو پار نہیں کرسکا ہے ابھی تک تو صرف اتنی روشنی ہے کہ جس سے ہمارے اندھیرے کا اور بھی احساس اس ظلمات کا اور بھی بھاری بھرکم بوجھ پڑ گیا ہے میرے دوستو اسی احساس اسی بے چینی۔ اسی موجودہ تعلیمی حالات سے ردعمل میں ایک نئی تعلیم بلکہ ایک نئی زندگی کا پیغام چھپا ہوا ہے۔

ابھی تک صبح کے دم سے وادیوں کے رہنے والوں پر کہیں لمبے لمبے گہرے گہرے سایے پڑ رہے ہیں جو آہستہ آہستہ کم ہوتے جا رہے ہیں کہیں کہیں کسمساہٹ کہیں کچھ بے چینی سی پیدا ہو رہی ہے۔ اس وادی کے ایسے گوشے ہیں جہاں رات کی تاریکی پھیلی ہوئی ہے یہ رات نیند کے ماتوں کی رات نہیں ہے یہ ایک پریشان کن اندھیرے کی رات ہے۔ نیند کے ماتوں سے تو یہ بھی امید ہے کہ صبح اٹھتے ہی تازہ دم ہو کر منزل مقصود کی راہ لیں گے یہ تاریکی جو ہمارے ادھ کچے، خام اور گنگا جمنی تعلیمی نظریے اور عمل کی تعبیر ہے اس اندھیرے میں نیک اور مخلص لوگ ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اس اندھیرے میں ہم طلبا کو ایک ہی ڈگر پر ہانکنا چاہتے ہیں۔ اس اندھیرے

میں ہمیں اس آسمانی لو کا پتہ نہیں چلتا جو ننھی سی جان کے سینہ میں روشن ہے کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ اندھیرا رٹائے ہوئے سبقوں طوطے کی پڑھائی کا، بے سمجھا ور سخت گیر ضبط کا، اندھا دھند مشق یا زبانی کام کا اندھیرا ہے۔

ان حالات میں استاد کا کام کیا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ اس اندھیرے میں بھی اپنی نگاہ ان ستاروں پر لگائے رکھے جو دور سے اسے منزل مقصود کا پتہ دے رہے ہیں لیکن میرے دوستو جو ستاروں پر ہی نظر جائے رکھے گا ممکن ہے کبھی ٹھوکر کھا کر گر جائے یہ سچ ہے کہ ہماری نگاہ ستاروں پر ہی ہونی چاہئے مگر دوستو ہماری زمین بھی تو ایک ستارہ ہے اچھا استاد، کامیاب استاد وہی ہے جو سماوی ستاروں اور ارضی ستارے کے بیچوں بیچ وہ راستہ ڈھونڈ نکالے جو کہکشاں کی طرح اسے منزل مقصود تک پہونچا دے۔

میرے دوستو تعلیمی شاہراہ پر سب سے روشن اور سب سے شاندار روشنی کا مینار تعمیر حیات کا مینار ہو دوسرے مانیں یا نہ مانیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ استاد کا پہلا اور سب سے اہم فرض تعمیر حیات ہے انسانوں کو انسان بنانا ہے۔ اس کا کام تعمیر حیات ہے اس کی مرمت نہیں ہے اس کی بخیہ گری یا ٹھگلی لگانا نہیں ہے جسم انسانی کی رفوگری یا کفش دوزی طبیبوں کے حصہ میں آئی ہے مگر استاد کا کام صحیح معنوں میں تعمیر حیات ہے۔

تعلیم کا عمل دو دہاری تلوار ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ جہاں ایک طرف استاد بچہ کی تعمیر حیات میں مشغول ہے۔ دوسری طرف بچہ ایک حد تک ایک چھوٹے پیمانے پر لیکن شاید زیادہ موثر انداز میں تعمیر حیات کے کام میں مصروف ہے۔ وہ تعمیر حیات کس کی ہوتا ہو گی؛ شاید اپنے اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر لوگ اس بارے میں اختلاف کریں لیکن ایک ٹریننگ کالج کے استاد کی حیثیت سے ذاتی تجربہ کی بنا پر میں تو یہی کہونگا کہ بچوں نے اپنی ہمت سے ان نوسیکھوں (یعنی پیوپل ٹیچر) کو اکثر استاد کیا انسان تک بنا دیا ہے

ملا شدن چہ آساں انساں شدن چہ مشکل؛

یہ تو آپس میں ادلے کا بدلہ ہے آپ بچوں کو انسان بنانے کی کوشش کریں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ وہ بھی آپ کو ٹریننگ اسکول سے نکلتے نکلتے انسان بنا کر چھوڑیں گے اور دوستو یہ انسان بنانے کا عمل کافی مشکل معلوم ہوتا ہے اس انسانی عمل کے قطرات میں نے (پسینہ کی شکل میں) اکثر نوسیکھیوں کے منھ سے ٹپکتے دیکھے ہیں اور انھیں اُس جھاڑن سے صاف ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے جو اتفاقاً چاک کے سفید پوڈر سے بھرا ہوا استاد کے ہاتھ آگیا تھا

میرے دوستو! ایک استاد کی شخصیت کا اثر گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ یہ اثرات کسی کھاری جھیل کی تہہ میں ان شیریں چشموں کی طرح ہوتے ہیں جو ان دیکھے اپنا خوشگوار عمل دن رات جاری رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی تنہائی اور مایوسی کی اندھیاری میں ایک بجلی سی چمک جاتی ہے۔ ہماری نگاہوں کے سامنے گذشتہ ایام کی کوئی تصویر ابھر کر ذہنی پردے کے سامنے جلوہ آرا ہو جاتی ہے۔ یہ تصویر ہے کسی پرانے استاد کی جس نے روزمرہ کے تدریسی چکر سے ذرا اوپر اٹھ کر زندگی کے ستار کو اس جوش اور گہرائی سے چھیڑا کہ اس کی لرزش اب تک روح کے تاروں کو مرتعش کر رہی ہے۔ اگر ہم ایسی یادوں پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ان لمحوں میں ہمارے ذہن میں نصاب کا کوئی ایسا مضمون نہیں آتا جو اس استاد نے پڑھایا تھا۔ نصابی عنصر زیادہ دیرپا نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات تو ہم ایک حد تک لکھا پڑھا بھلا دینا چاہتے ہیں اور نہیں بھلا سکتے تعلیمی یادوں کا دیرپا اور مستقل پہلو وہ گہرا اثر ہے جو ایک زوردار استاد کی شخصیت اپنے طالب علم پر چھوڑ جاتی ہے بقول ایک مصنف کے ان اثرات کے ماتحت اس نوجوان میں ایک نئے انداز کی ہستی تخلیق ہو جاتی ہے لیکن کتنے استادوں کو پتہ ہے کہ وہ کتنے نوجوانوں کے دلوں میں کتنے انسانوں کی زندگیوں میں دوبارہ جنم لے رہے ہوتے ہیں اور ابدی زندگی پا رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم اپنی زندگی کے دوسرے واقعات پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس قدر گہرے اثرات دوسرے واقعات کم چھوڑتے ہیں بہت کم۔ اکثر ادب یا آرٹ کا کوئی شاہکار، بچپن میں چھوٹی ہوئی والدہ کی یاد یا کوئی نفسیاتی زلزلہ جس نے زندگی کی بنیادیں تک ہلا ڈالی ہوں۔

کسی استاد کا ایک طالب علم جب قوم کا محبوب قائد بن گیا تو اس کی شہرت سن کر استاد نے کہا تھا کہ طور سینا پر خدا سے علم سے موسیٰ کی طرح ہم کلام تو میں ہوا تھا میرے شاگرد نے تو ہارون کا کام کیا ہے اس نے وہ پیغام قوم کو پہونچا دیا اور بس میرے دوستو اگرچہ اس جملہ میں ایک قابل معافی خود پسندی کی جھلک ہے لیکن کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ضرور ہے۔

استاد کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس کے الفاظ یاد رہیں گے مدتوں نہیں شاید صدیوں۔ میرے دوستو کوئی نیکی کا کام کوئی نصیحت کا بیج بیکار نہیں جاتا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان کسان نے کرسچن کولڈ ڈنمارک کے کسان استاد سے کہا کہ آپ کی باتیں سننے میں لطف تو بہت آتا ہے لیکن بعد میں آپ کے الفاظ یاد نہیں رہتے بار بار کوشش کرتا ہوں مگر ملتے ہی نہیں۔ کولڈ بولا۔ کوئی بات نہیں یہ الفاظ کہیں گم نہیں ہوئے کہیں نہ کہیں تم میں ہی موجود ہیں

اپنے وقت پر وہ خود بخود وہیں پھیلیں گے اور تمہیں پتہ بھی نہ ہوگا کہ وہ کہاں ہیں جب تم گیہوں بوتے ہو تو تمہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ بیج کہاں گرے مگر تاہم وہ اُگتے ضرور ہیں"

اور پھر میرے دوستو! الفاظ بھی تو آخر کار ایک ظاہری لباس ایک اوپری سجاوٹ ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ ظاہری چیز اینٹ اور گارے کا گھروندا بن جائے جو اس من مندر کی قندیل کی کرنیں اپنے میں ہی سمٹا لے یہ لباس بھی ان رنگین پردوں کا۔ ان روحانی لطیف نیتوں کا ہونا چاہئے جو حسن روح کی رنگینی کو دو آتشہ کر دکھائے لیکن پھر بھی لباس آخر لباس ہے۔ جب تک لباس والا نہ ہو تو لباس کیا کام آئے گا۔ میرے دوستو دیکھنا یہ ہے کہ ان الفاظ کی روح کیا ہو وہ روح جو اکثر اپنا لباس خود بنا لیتی ہے۔

روح اور الفاظ، جذبہ اور پرجوش طریق اظہار یہ دو اصول ہیں جن کی امداد سے معلمین نے قوموں کو زندہ کیا ہے وہ بیانیہ طریقہ یا لکچر میتھڈ جو ہر ٹریننگ اسکول اور کالج کے لئے تختہ ستم ہے ان کے ہاتھ میں کامیاب ذریعہ گرنٹ وگ ڈنمارک کا معلم جس نے اپنی قوم کو پچھلی صدی میں نئی زندگی بخشی انھیں دو اصولوں کے ذریعہ اپنی قوم کو بیدار کر رہا تھا ایک تو اس کے پیغام میں عوام کی روح پوشیدہ تھی اور دوسرے اس کے زندہ اور جاندار الفاظ زندہ الفاظ سے اس کی مراد اس ذاتی تعلق اور جذبہ سے تھی جو استاد کے سینے سے بچہ کے دل میں گھر کرتا ہے اور اس کے من کے مندر میں، اس کی اس مقدس عبادت گاہ پر زندہ شعلہ بھڑکا دیتا ہے۔

گرنوگ کے نزدیک استاد ایک اونچی روحانی قوت کا ذریعہ اظہار اور آلہ کار تھا۔ اس کے ذریعہ سے روحانی دنیا کی تڑپا دینے والی قوت ہماری دنیا میں زندہ اور جاندار الفاظ کے دھارے میں بہہ کر آ رہی تھی اس کا طریق تدریس یہ تھا کہ سب سے پہلے استاد دل کو بیدار کرنے والے ترنم اور نغمے سے تعلیم شروع کرے۔ اسے انتہائی روشن اور زندہ تقریروں کے ذریعہ پڑھانا چاہئے۔ اس کے لکچر میں زندہ واقعات جگمگا رہے ہوں اس طریق پر پڑھانے سے وہ محض فکر اور سمجھ کو اپیل نہ کرے بلکہ اس کا ہر لفظ روح کے بند دریچوں پر ایک ٹھوکا ہو۔

اور جب استاد دیکھے کہ اس کی روح کی گہرائیوں میں زندہ الفاظ تڑپ رہے ہیں اور قوت اظہار کے لئے بیتاب ہو رہے ہیں تو وہ اطمینان رکھے کہ اس کے الفاظ دسرزمین پر نہیں پڑیں گے ایک دہکتے

ہوئے انگارے کی طرح کہیں تو اقدار کی خس و خاشاک میں آگ لگا دیں گے۔ اسی خاک سے زمین پھر ایک دفعہ زندگی خیز اثرات سے مترنم ہو جائے گی اور اس میں تازہ پھول لہلہانے لگیں گے اور کہیں یہ شعلہ بجلی کے ان پوشیدہ مجمروں کی طرح ہو جائے گا جو بن دیکھے اپنی زندگی بخش حرارت پہونچا رہے ہوں۔

میرے دوستو! گرنٹوگ ایک شاعر معلم تھا اس نے شاعری کے انداز میں معلمی کی۔ ایک معلم کے انداز میں شاعری نہیں کی۔ وہ لکچر میتھڈ کا شاعر تھا، شاعر یعنی اپنے وجدانی قوت سے روح کو اپنا لینے والا! میرے دوستو اسی معنی میں ہم سب ایک حد تک شاعر ہو سکتے ہیں ایک حد تک تخلیقی کارکن ہو سکتے ہیں جس حد تک میکانکی طریق عمل، روزمرہ کے چکر سے اوپر اٹھتے جائیں گے ہم تدریس کی زمین پر ایک شاعر ہوں گے۔ دوستو تم نے ڈالٹن پلان بھی پڑھا ہوگا۔ تم نے مانٹسوری میتھڈ بھی یاد کیا ہوگا۔ یہ سب بڑے کام کی چیزیں ہیں مگر وہ استاد کیا جو اپنا طریق اپنا ڈھنگ خود تخلیق نہ کر سکے۔ فن تدریس ایک آرٹ ہے اور استاد ایک آرٹسٹ! تمہیں بھی طریق تعلیم کے محدود لیکن دلچسپ دائرہ میں اس تخلیقی عمل کو جاری رکھنا ہوگا۔

تمہارا آرٹ اس قبیل کا آرٹ نہ ہوگا۔ جیسے ادب، مصوری یا سنگتراشی ہیں ان میں آرٹسٹ کا مقصد اپنے روحانی تاثرات کا اظہار رہے۔ یہاں وہ اپنے مخصوص انداز میں، اپنے مخصوص ذریعہ اظہار میں اپنی روح کے اسرار کھول کے رکھ دیتا ہے۔ وہ پتھر یا الفاظ کو اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے مجسم یا رنگین بنا دیتا ہے۔ ایک سنگتراش پتھر کو اپنے تخیل کے مطابق جیسا دل چاہے تراش سکتا ہے۔ مگر استاد بچے کو اس کی فطرت کے خلاف کوئی رجحان نہیں دے سکتا۔ اس کے برعکس استاد تو ایک ایسی فوج کا جرنیل ہے جو بچے کی روح کے میدان میں اخلاقی اور معیاری زندگی کے لئے جنگ کرتا ہے۔ اس کے دست و بازو بچے کے وہ رجحانات ہیں جو اس کے تعلیمی منتہائے خیال کے حصول میں اس کے معاون ہیں اور اس کے دشمن وہ میلانات ہیں جو اس کے راستے میں حائل ہیں اس کا فرض ان دشمن عناصر کا مقابلہ کرنا ہے اس جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک جرنیل کو صرف طریق جنگ کا ہی پتہ نہ ہونا چاہئے بلکہ اسے میدان جنگ کے نشیب و فراز سے بھی واقف ہونا ضروری ہے اسے اپنے دوستوں کو تازہ دم اور بلند ہمت رکھنا چاہئے انھیں محفوظ جگہوں اور مناسب کمین گاہوں میں رکھنا چاہئے۔ دشمن کی طاقت کا اسے اندازہ ہو اور وہ حملے کے لئے ہمیشہ اچھے موقعوں کی تلاش میں رہ کر شنس ٹائنر

کی رائے میں تعلیم کا آرٹ یہ ہے۔

لیکن میرے دوستو! تعلیم کا آرٹ محض جنگ کا آرٹ نہیں حقیقی معنوں میں یہ امن کا آرٹ ہے۔ اگر ہم اس کے عملی پہلو سے گزر کر اس کے نتائج اور اس کی کامیابیوں پر غور کریں تو ہمارے لئے ایک اور تشبیہ شاید زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

میری رائے میں جس آرٹ سے معلمی کا پیشہ سب سے زیادہ ملتا جلتا ہے وہ باغبانی کا آرٹ ہے یہ تعلیمی کہانی کی وہ تاریخی تشبیہ ہے جس میں نئی تعلیم کی تحریک کے کئی ایک پہلوؤں نے جنم لیا ہے۔ میری رائے میں تو معلمی کا اصل آرٹ اس ڈنمارک کے آزاد مدرسوں کے اس استاد کا آرٹ تھا جو انسانوں کی تربیت ان پودوں کی طرح کرتا تھا جنھیں مدت سے نہ پانی ملا ہو نہ زندگی۔ اس کے اثر سے بچوں میں یوں معلوم ہوتا تھا گویا زندگی کے گہرے اور تاریک سایے ان پر سے اٹھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی بہترین خصوصیات روشن ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو چلی ہے اور ان کے چہروں پر زندگی کی سرخی دوڑ رہی ہے"

دوستو یہ ہے زندگی کا تخلیقی آرٹ:

عبدالغفور صاحب ایم۔اے
ٹریننگ کالج علی گڑھ

اقبال اور کارل مارکس

فلسفہ کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف فلاسفروں نے قدرت اور اس کی نیرنگی کو مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور جیسے جیسے علم ترقی کرتا گیا اور انسانی فکر میں گہرائی آتی گئی یہ زاویۂ نگاہ بھی بدلتا گیا حقیقت یہ ہے کہ کسی شئے پر غور کرنے کے بعد صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے ـــــ زاویۂ نگاہ کی اہمیت سمجھنے کیلئے چاند گرہن کی مثال لیجئے۔ چاند گرہن کے موقع پر سائنسداں مختلف ممالک کے رصد خانوں سے چاند کو دیکھتے ہیں لیکن چونکہ مختلف ممالک مختلف سمتوں میں واقع ہوتے ہیں اس لئے ہر سائنسداں چاند اور دوسرے ستاروں کو مختلف زاویہ سے دیکھتا ہے اور مختلف نتیجہ پر پہونچتا ہے ممکن ہے کہ ہندوستان کا دیکھنے والا ٹھیک زاویہ سے دیکھ رہا تھا اس لیے درست نتیجہ پر پہونچا اور جاپان والے کا زاویہ چونکہ درست نہ تھا وہ بہت سی ایسی الجھنوں میں پڑ گیا جو در اصل الجھنیں نہیں تھیں بلکہ غلط زاویۂ نگاہ تھا۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ کسی شئے کو درست زاویہ سے دیکھنا درست نتیجہ پر پہونچنے کے لئے بہت اہم ہے۔

آج سے تقریباً دو سو سال قبل اس زمانہ کی معلومات کی کمی کے سبب سے فلسفہ دانوں کا زاویہ نگاہ موجودہ دور کے زاویہ سے بالکل جدا تھا۔ وہ قدرت کو بے حس و حرکت سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا بے حس و حرکت اور ساکت اشیاء کے مجموعہ کا نام تھا اور ہر شئے کی نوعیت دوامی تھی لیکن وقت گذرنے پر علم کی ترقی کے ساتھ یہ نظریہ بدلتا گیا اور آخر کار چند فلسفہ داں جن میں مارکس بھی تھا اس نتیجہ پر پہونچے کہ قدرت اور اس کے کارخانہ میں عمل اور رد عمل کا قانون کام کرتا ہے۔ ہر شئے ادلتی بدلتی بنتی بگڑتی پیدا اور فنا ہوتی رہتی ہے قدرت میں سکوت نہیں روانی ہے، قیام نہیں سفر ہے اور جو شئے بھی ارتقاء کر رہی ہے وہ ایک قانون کے مطابق کر رہی ہے۔

قدرت اور اس کے کارخانہ کو جدید زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مارکس کو اس دنیا میں ایک

نئی دنیا نظر آنے لگی اور اس نے اپنا ایک نظریہ پیش کیا جس میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ہر وہ شے جو ارتقا کی منازل طے کر رہی ہے ایک خاص اصول کے مطابق ترقی کر رہی ہے۔ ارتقاء کے اس اصول کو مارکس نے جدلیات کا نام دیا اب[1] یہ دیکھنا ہے کہ جدلیات کا نظریہ کیا ہے اور علامہ اقبال کے کلام سے اس نظریہ کی تائید کہاں تک ہوتی ہے۔

جدلیات کا نظریہ | فی زمانہ کارل مارکس کے اس خیال سے تو سب کو اتفاق ہے کہ دنیا انفرادی اور بے تعلق اشیاء کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ بہت سے عملوں (Processes) کا مجموعہ ہے جن میں سے ہر ایک نہ صرف بذات خود ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے بلکہ ایک دوسرے پر عمل کر کے ایک دوسرے کو بدل رہا ہے یہاں یہ غور کرنا ہے کہ جو شے ترقی کرتی ہے اس میں ارتقائی حرکت کیسے پیدا ہوتی ہے۔ کارل مارکس کہتا ہے کہ ہر شے جس میں ارتقا ہوتا ہے دو تکراروں سے مرکب ہوتی ہے یہ تکراریں کسی شے میں آناتی طریقہ پر ملی ہوئی نہیں پائی جاتیں کہ ان کو وقت ضرورت الگ الگ کر دیا جائے۔ بلکہ جس طرح جزو لایتجزا (Atom) میں انکاری قوت (Negative Energy) اور اقراری قوت (Positive Energy) کے ستون (Poles) ایک دوسرے میں ضم ہوتے ہیں اور ان کو جدا کرنا ممکن نہیں اسی طرح یہ تکراریں بھی ایک دوسرے میں ضم ہوتی ہیں اس سلسلہ میں دوسری مثال جبرالمقابلہ سے دی جاسکتی ہے کہ جس طرح ($ا^۲$) میں ا اور اس کی تکرار (-ا) نہاں ہوتی ہے اسی طرح کسی شے میں اس کی تکرار پوشیدہ ہوتی ہے اگر ا کو ا سے ضرب دیا جائے تو حاصل ضرب $ا^۲$ آتا ہے اور اگر اس کی تکرار (ا) کو (-ا) سے ضرب دیں تب بھی ($ا^۲$) حاصل ضرب آتا ہے ($ا^۲$) ایک ایسی وحدت ہے جس میں ا بھی پوشیدہ ہے اور اس کی تکرار -ا بھی۔ ایک روشن مثال زندگی اور موت کی ہے۔ زندگی میں اس کی تکرار موت پوشیدہ ہے۔ جدید تحقیقات کی بموجب انسانی جسم خلیات (Cells) کا مجموعہ ہے جس میں ہر لحظہ نئے خلیے پیدا ہو رہے ہیں اور اور پرانے مر رہے ہیں اور اگر انسانی جسم میں موت و زندگی کی یہ تکرار بند ہو جائے تو ارتقا ختم ہو جائے اور آدمی مر جائے۔

---

[1] جدلیات کا نظریہ دراصل ہیگل کا نظریہ ہے اور مارکس نے اسے ہیگل ہی سے حاصل کیا۔ البتہ سماجی اقدار پر اس نظریہ کا اطلاق مارکس ہی نے کیا (مدیر)

کارل مارکس کہتا ہے کہ جس طرح انکاری قوت اور اقراری قوت آپس میں ایک دوسرے کی تکرار ہیں اور ان کی کش مکش روشنی پیدا کرتی ہے اسی طرح جو شئے قوت ارتقا کے راستہ پر گامزن ہے اور اس میں دو تکراریں پیدا ہوتی ہیں جن کی آپس کی کش مکش اس شئے کو ارتقائی حرکت دیتی ہے۔ مثلاً مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ داری ایک وحدت ہے جس کی نوعیت تکراری ہے یعنی اس میں طریق پیداوار تو اجتماعی ہے لیکن ملکیت انفرادی ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ بہت سے مزدور مل کر ایک شئے پیدا کرتے ہیں جس کا واحد مالک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ چونکہ مزدور اور سرمایہ داران دو تکراروں کے نمائندہ ہیں اس لئے ان میں کشمکش ہوتی رہتی ہے۔ جو سرمایہ دارانہ طریق پیداوار کو اشتراکی طریق پیداوار کی طرف لے جا رہی ہے دوسری مثال لیجئے مزدور ایک وحدت ہے اس میں دو تکراریں پوشیدہ ہیں یعنی وہ جنس بھی پیدا کرتا ہے اور نہیں بھی کرتا کیونکہ جب وہ کوئی جنس بناتا ہے تو وہ جنس کارخانہ دار کو سپرد کرنے پر مجبور ہے۔ یہ تکرار مزدور کو اپنے ارتقا یعنی انقلاب پر مجبور کرتی ہے۔ فلسفہ دان مندرجہ بالا خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ وحدت کو ارتقائی حرکت دوئی دیتی ہے یعنی وحدت میں اس کی تکرار کثرت پوشیدہ ہوتی ہے اور یہ کثرت ہی ہے جو وحدت کو ارتقائی حرکت دیتی ہے۔ زندگی کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

مذاق دوئی سے بنی زوج زوج اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج

لیکن جو تکراریں وحدت کو ارتقائی حرکت دیتی ہیں خود اس وحدت سے جدا نہیں کی جا سکتیں وہ تکراریں اسی وقت تک زندہ ہیں جب تک ان میں وحدت ہے۔ مثال کے طور پر مزدور اور سرمایہ دار ایک دوسرے کی تکرار ہیں لیکن اسی وقت تک یہ دونوں جماعتیں قائم ہیں جب تک کہ سرمایہ داری قائم ہے سرمایہ دارانہ نظام کئی جماعتوں سے مرکب ہے اور سب جماعتیں سرمایہ داری کے واحد رشتہ میں منسلک ہیں۔ اس نکتہ کو فلسفیانہ زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وحدت میں کثرت ہے اور کثرت میں وحدت۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تکرار سے کیا مراد ہے۔ وحدت میں کثرت ہونے اور کثرت میں وحدت ہونے کے کیا معنی ہیں اور تکراروں کی آپس میں کش مکش سے کس طرح ارتقائی حرکت پیدا ہوتی ہے اب ہم مارکس کے جدلیات کے نظریہ کو چار ٹکڑوں میں تقسیم کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال

جدلیات کے نظریہ سے کہاں تک متفق تھے

کارل مارکس کہتا ہے:۔

۱۔ کائنات میں ارتقا کا قانون کام کرتا ہے

۲۔ وحدت میں کثرت ہے

۳۔ کثرت میں وحدت ہے

۴۔ ارتقائی حرکت ٹکراروں کی کش مکش سے ہوتی ہے۔

اب دیکھیئے کہ اقبال کا ان چاروں باتوں کی بابت کیا خیال تھا۔

۱۔ کائنات میں ارتقار کا قانون کام کرتا ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

فریب نظر ہے سکون وثبات　　تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی

ان اشعار میں علامہ نے صاف طور پر کہدیا ہے کہ دنیا کی اشیا میں جھولے کی طرح آلاتی حرکت نہیں ہے بلکہ ارتقائی ہے جو کاروان وجود کو ہر لحظہ تازہ شان دیتی ہے انسانی زندگی میں اگر کوئی راز پوشیدہ ہے تو وہ یہ ہے کہ اس میں ذوقِ پرواز ہے یعنی وہ ارتقار کی منازل طے کرنا چاہتی ہے اس خیال کو شاعر مشرق نے بار بار دہرایا ہے اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ علامہ کائنات کے سکون وثبات کو فریب نظر سمجھتے تھے لیکن کائنات میں انسانی اور سماجی زندگی بھی شامل ہے سماجی زندگی میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے جو سماج کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے رسم ورواج بدلے لیکن چونکہ کسی قوم کے آئین وقوانین، رسم ورواج، تمدن وتخیل کا بہترین مظہر اس کا مذہب ہوتا ہے اس لیے سماجی ارتقا کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی بدلنا پڑتا ہے یا یہ کہیئے کہ مذہب میں اجتہاد کرنا پڑتا ہے چنانچہ مذہبی معاملات میں علامہ اقبال اجتہاد کے بڑی شدومد سے قائل ہیں۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اجتہاد کا قائل ہونا اس امر کا اعتراف کرنا ہے کہ مذہب کو کھینچ تان کر کسی دور کے وقتی تقاضوں کے

مطابق کیا جا رہا ہے۔ یہ دور میں مذہب کی جو نئی تفسیر کی جاتی ہے اس کی تہہ میں بھی یہی امر پوشیدہ ہوتا ہے کہ ہر دو کا زاویۂ نگاہ و فلسفہ بدلتا رہتا ہے، اور اس امر کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے کہ مذہبی کتاب کی تفسیر اس طرح کی جائے کہ وہ موجودہ دور کے زاویۂ نگاہ و فلسفہ ذہنی ارتقاء اور وقتی تقاضوں اور رجحانات کے مطابق ثابت ہو جائے اب دیکھنا یہ ہے کہ بنیادی شے کونسی ٹھہری آیا کسی دور کا فلسفہ و زاویۂ نگاہ اور رجحان یا مذہب؟ ظاہر ہے کہ اول الذکر بنیادی اشیاء ہیں کیونکہ ان کی مطابقت میں مذہب کو لایا جاتا ہے اگر یہ استدلال درست ہے تو مذہب کی حیثیت بھی ارتقائی ہو جاتی ہے جو خود دنیا کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدل رہا ہے

اب دوسرے مسئلہ کو لیجئے

۲۔ وحدت میں کثرت ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں :-

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر   مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات   اسی نے تراشا ہے یہ سومنات

یہ تو ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کے نزدیک وحدت بھی اپنی تکرار کثرت میں اسیر رکھتی ہے اور یہ اسیری خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی ہے کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وحدت کثرت میں اسیر لیکن واقعہ یہی ہوتا ہے کہ جس طرح حرکت کے وقت ایک شے اپنی جگہ بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی اسی طرح وحدت میں کثرت ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی ہوتی جب ہم قدرت کو اس کی اصل نوعیت میں دیکھتے ہیں تو ہم کو اس میں اتنی تکرار معلوم ہوتی ہے کہ ہماری پرانی منطق جس کا پہلا اصول یہ ہے کہ الف الف ہی ہو سکتا ہے۔ ب نہیں ہو سکتا غلط معلوم ہونے لگتا ہے اور یہیں نئی منطق کی ضرورت ہوتی ہے جس کی رو سے یہ ثابت کرنا ممکن ہو کہ ایک شے ہے بھی اور نہیں بھی ہے قدرت کی نیرنگی نے انسانوں کو مجبور کر دیا کہ ایسی منطق ایجاد کرے جس میں تکرار کی گنجائش ہو۔ مارکس نے یہ منطق ایجاد کی جس کا نام جدلیات ہے۔ دوسرے شعر میں اقبال نے صاف کہہ دیا کہ وحدت نے جو کثرت میں اسیر ہے یہ بت خانہ شش جہات پیدا کیا یعنی دنیا کے ارتقاء کا انحصار تکرار پر ہے۔ ہر وقت میں تکراریں ہوتی ہیں۔ جو ارتقاء کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہونچتی ہیں کہ ان میں سے

ایک نئی وحدت پیدا ہوتی ہے۔ اس نئی وحدت کی نوعیت پرانی وحدت سے جدا ہوتی ہے اور اب نئی وحدت کی نئی تکراریں پیدا ہوتی ہیں اور اسی طرح یہ بت خانہ شش جہات ترقی کرتا رہتا ہے۔

اب تیسرے مسئلہ پر غور کیجیے۔

۳۔ کثرت میں وحدت ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ اقبال فرماتے ہیں :۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں	کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں	مگر عین محفل میں خلوت نشیں

علامہ فرماتے ہیں کہ وحدت کو تکرار کی خو نہیں وہ تو اس کے ارتقا کا اصول ہے من و تو یعنی تکرار سے تو وحدت کو صرف انجمن آفرینی یعنی ارتقا مقصود ہے لیکن اس تکرار میں بھی وحدت ہوتی ہے جس طرح عین محفل میں خلوت رہتی ہے اسی طرح من و تو یعنی کثرت میں بھی وحدت رہتی ہے۔ یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ "من و تو"، اور "محفل و خلوت" ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ اس مسئلہ پر بھی علامہ اقبال کارل مارکس کے ہم خیال معلوم ہوتے ہیں۔

اب آخری بات کو لیجیے :۔

۴۔ ارتقائی حرکت تکراروں کی کشمکش سے پیدا ہوتی ہے۔

اس مسئلہ کی بابت علامہ فرماتے ہیں۔

دما دم رواں ہے یم زندگی	ہر ایک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود	کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی	عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل	خوش آئی اسے محنت آب و گل

علامہ فرماتے ہیں کہ ہر شے کا ارتقا تکراروں کی کشمکش سے ہوتا ہے۔ بدن کی نمود اسی وقت ہوتی ہے جبکہ دو تکراریں آپس میں ارتقائی کشمکش کریں اور یہ تکراریں ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہوتی ہیں

جیسے شعلہ میں موج دود ارتقاء اس اصول پر ہوتا ہے کہ ہر شے اپنی تکرار اپنے کنار میں لئے ہوئے ہوتی ہے ان دونوں کی آپس کی کش مکش سے ارتقائی حرکت پیدا ہوتی ہے۔ زندگی کو صحبت آب و گل گراں بھی گذرتی ہے اور خوش بھی آتی ہے۔ گرانی اور خوشی ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ اگلے شعر میں فرماتے ہیں کہ زندگی ثابت بھی ہے اور سیار بھی سیار اور ثابت ایک دوسرے کی تکرار ہیں۔ کارل مارکس ایک جگہ اسی مسئلہ پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے کہ کسی شے کے اچھے پہلو کو برے پہلو سے جدا کر کے دیکھنا جدلیات کے نظریہ کے منافی ہے۔ اچھے اور برے پہلو ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ حق کے لئے باطل کا ہونا ضروری ہے۔ علامہ اقبال اس حقیقت کو "مکالمہ جبریل و ابلیس" میں ابلیس کی زبان سے یوں بیان کرواتے ہیں۔

میری جرأت سے ہے مشت خاک میں ذوق نمو — میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر — کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے — قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح — تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اس مکالمہ میں علامہ اقبال نے اس نظریہ کو کہ ارتقاء کے لئے تکرار ضروری ہے۔ صاف صاف بیان کر دیا ہے۔ دنیا میں رزم خیر و شر جاری ہے۔ خیر و شر آپس میں ایک دوسرے کی تکرار ہیں اور اس تکرار سے مشت خاک میں ذوق نمو ہے یعنی انسان کے اخلاقی ارتقا کی محرک یہی تکرار ہے اور پھر علامہ اقبال کارل مارکس کے نظریہ کی بھی تائید کرتے ہیں کہ خیر و شر ایک دوسرے کے دل میں گھسے ہوئے ہیں دل یزداں میں ابلیس کا نٹا بنا ہوا ہے۔ خیر کے ارتقا کے لئے شر کا ہونا ضروری ہے۔ قصۂ آدم کو رنگیں کرنے والا لہو رزم خیر و شر سے پیدا ہوتا ہے

نہ صرف ان چار مسئلوں میں اقبال اور مارکس ہم خیال معلوم ہوتے ہیں بلکہ ایک اور اہم نکتہ پر بھی اقبال مارکس کی تائید کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ کارل مارکس کا خیال تھا کہ جس طرح ایک مرکب کے اجزا کی صرف مقدار میں فرق کر دینے سے اس مرکب کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ اسی طرح سے کسی شے کی تکراروں میں مقداری فرق ہو جانے سے ایک ایسی شے پیدا ہو جاتی ہے جو پہلی شے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے

طور پر پانی لیجئے۔ اس کو آنچ دیجئے کچھ دیر تک جیسے جیسے پانی کو آنچ لگے گی وہ گرم ہوتا چلا جائے گا فرض کیجئے کہ اس طرح پانی کی حرارت ۹۸ ڈگری ہو جاتی ہے ایک ڈگری آنچ اور دی تب بھی وہ پانی ہی رہا لیکن جست لگانے کے قریب ہو گیا۔ اب ایک ڈگری آنچ اور دی اور پانی نے جست لگا کر اپنی نوعیت بدل دی۔ پانی بھاپ بن گیا حالانکہ اس میں کوئی نیا جزو شامل نہیں کیا گیا۔ آنچ پہلے بھی دی جا رہی تھی اور اب بھی آنچ ہی دے رہے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ایک جزو یعنی حرارت کی مقدار میں فرق کر دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی نوعیت بدل گئی وہ رقیق شے سے بخارات میں تبدیل ہو گیا۔ اگر پانی کو ٹھنڈا کریں تب بھی یہی ہوتا ہے۔ بہت دیر تک برابر ٹھنڈک بڑھتی رہتی ہے لیکن اس پر بھی پانی رقیق ہی رہتا ہے لیکن جب اس کی حرارت صفر درجہ سے گری وہ یک لخت جا۔ اب وہ رقیق پانی منجمد ہو گیا۔ علمی زبان میں اس کو کمیت و کیفیت کا نظریہ کہتے ہیں یعنی کسی مرکب شے کے کسی جزو کی کمی یا بیشی اس شے کی کیفیت بدل دیتی ہے اور چونکہ ہر شے دو یا زیادہ تکراروں سے مرکب ہوتی ہے اس لئے ہر شے کی تکراریں ارتقا کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہونچتی ہیں جہاں ان میں کسی ایک کا کم یا زیادہ ہونا اس شے کی نوعیت بدل دیتا ہے۔ مارکس اس نظریہ کو سماجی زندگی پر بھی منطبق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب سرمایہ داری کی تکراریں بڑھتے بڑھتے ایک خاص مقدار پر پہونچیں گی تو جیسے پانی بھاپ میں تبدیل ہو جاتا ہے اسی طرح سرمایہ داری سوشلزم میں تبدیل ہو جائے گی صاف زبان میں یوں کہنا چاہیے کہ سرمایہ داری ایک حقیقت ہے اور سرمایہ دار اور مزدور تکراریں ہیں۔ ان میں کشمکش جاری ہے اور مزدور طبقہ طاقت ور ہوتا جا رہا ہے اور وہ وقت دور نہیں کہ سوشلزم ظہور میں آ جائے۔ اس لمحہ کو جب کہ ایک نوعیت دوسری نوعیت اختیار کرتی ہے مارکس "ارتقائی جست" کے نام سے موسوم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ارتقا [illegible] اولین یہی جست ہوتا ہے کسی شے کا ارتقا اس جست کے لئے تیاری ہوتی ہے ارتقا کا حاصل یہ جست ہے ہر شے ارتقا کرتے کرتے ایک ایسی منزل پر پہونچتی ہے جہاں اس شے کو ایک جست لگا کر دوسرا قالب اور روح اختیار کرنی پڑتی ہے لیکن وہ روح اور قالب کہیں باہر سے داخل نہیں ہوتے بلکہ ان تکراروں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جیسے زرد اور نیلا رنگ ملانے سے ہرا رنگ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ان تکراروں سے تیسری نوعیت پیدا ہوتی ہے۔ اس ارتقائی جست کے نظریہ کو اس لئے بہت اہمیت حاصل ہے کہ انقلاب کا نظریہ اسی

پر قائم ہے۔ کارل مارکس کے نزدیک انقلاب اس ارتقائی جست کا نام ہے جو ایک سماج اپنی تکراروں کے ارتقا کی وجہ سے لگاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پہلے سے بالکل جدا نوعیت کی سماج قائم ہو جاتی ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اس ارتقائی جست کی بابت جس کا دوسرا نام انقلاب ہے علامہ اقبال کا کیا خیال تھا علامہ فرماتے ہیں

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں　　کچھ کام نہیں چلتا بے جرأت رندانہ

کیا یہ جرأت رندانہ ارتقائی جست لگانے کی ترغیب نہیں ہے؟

یہاں ہم علامہ اقبال کے کلام سے کچھ انتخاب پیش کر دیں جس سے ناظرین خود فیصلہ کر لیں گے کہ علامہ کا انقلاب کی بابت (جس کو مارکس نے ارتقائی جست کا نام دیا ہے) کیا خیال تھا۔ علامہ فرماتے ہیں:۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی　　روح امم کی حیات کش مکش انقلاب

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو　　کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے　　کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

پرانی سیاست گری خوار ہے　　زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دور سرمایہ داری گیا　　تماشا دکھا کر مداری گیا

اور زبور عجم میں تو علامہ نے خدا سے دعا ہی یہ مانگی ہے کہ یا اللہ

یا بکش در سینۂ من آرزوئے انقلاب　　یا دگرگوں کن نہاد ایں زمان و ایں زمیں

یا چناں کن یا چنیں

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ ارتقائی جست کے نظریہ جس کو سیاسی زبان میں انقلاب کہتے ہیں مانتے تھے وہ ارتقا کا مقصد جست کو سمجھتے تھے۔

م۔م۔ جوہر صاحب میرٹھی

تعلیم اور تعلقات باہمی

ذیل کا مضمون ایک مقتدر . . . امریکی تعلیمی رسالہ سے اخذ و ترجمہ کے بعد پیش کیا جاتا ہے تعلیمی ذریعہ سے قومی اتحاد اور تعلقات باہمی کو سلجھانے کے سلسلے میں اس مقالہ میں جو کچھ امریکہ کے متعلق کہا گیا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ ہندوستان پر بھی صادق آتا ہے (مدراسی)

یوں تو ممالک متحدہ امریکہ کے باشندے امریکی کہلاتے ہیں لیکن یہ قوم مرکب ہے ان بہت سی جماعتوں سے جو مختلف تہذیب و تمدن کی حامل ہیں۔ یہ اختلاف تہذیب یا تو سماجی ہے یا نسلی یا مذہبی۔ ہر تہذیبی و مدنی جماعت چند خاص عقائد، رسم و رواج، عادات و اخلاق اور مخصوص نظریہ پر کاربند ہے لیکن ان تمام تہذیبی جماعتوں Cultural groups کا رشتہ قوم کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک فرد کا رشتہ اس کے خاندان سے۔

چند خیالات ایسے ہیں جو ہر ترقی پذیر تہذیبی جماعت میں پائے جاتے ہیں اور جن کو ہم Cultural Behaviour یا عادت تہذیبی سے تعبیر کر سکتے ہیں ان میں سے بعض یہ ہیں۔

۲ ا۔ ہر ترقی پسند تہذیبی جماعت یہ چاہتی ہے کہ اپنے نوجوانوں میں زندگی کی نئی روح پھونکے ان میں اسلاف کا سا جذبہ ایثار پیدا کرے اور ان کی بدولت خود زندہ رہے۔

ب۔ ہر تہذیب زندہ رہنا چاہتی ہے خودکشی کرنا نہیں چاہتی۔ اس لئے جب وہ دیکھتی ہے کہ خطرات نے اسے گھیر لیا ہے تو وہ اپنی بقا کے لئے پوری جدوجہد کرتی ہے بے جا و بجا معقول اور نامعقول، جائز و ناجائز غرض ہر طریق کار کو عمل میں لاتی ہے۔

ج۔ آسودہ حال اور ترقی پذیر تہذیبی جماعت کا اقتضا یہ ہوتا ہے کہ دوسری تہذیبی جماعتیں نہ صرف اس کی خودداری کو تسلیم کرلیں بلکہ اس کے ہر مطالبہ کو بلا چون و چرا کئے مان لیں۔

د۔ ہر جماعت فطرتاً اپنے میں تبلیغی احساس پاتی ہے اور چاہتی ہے کہ دوسروں کو بھی اپنی تہذیب و کلچر سے متاثر کرے۔ اس لئے ان تمام مسائل کا حل چاہتی ہے جو اس کی ترقی کی راہ میں سد راہ بنتے ہوں۔

امریکہ کی پوری تاریخ اس بات کی ترجمانی کرتی ہے کہ مختلف تہذیبی و مدنی جماعتوں کے باہمی تصادم اور آپس کے مناقشات نے ملک کو سخت نقصان پہونچایا ہے۔ زمانہ نوآبادیات سے جبکہ کواکرس پر ظلم شروع ہوا تھا [illegible] واقعات تک مذہبی و نسلی اقلیتوں پر بے انتہا ظلم ڈھائے گئے۔ تشدد و تحقیر کا کوئی حربہ ایسا نہ تھا جو ان کے لئے روا نہ رکھا گیا ہو۔ مختصر یہ ہے کہ ظلم و جبر کے جوئے تلے حبشی آج تک پسے جا رہے ہیں۔ آج تین کروڑ نفوس امریکہ میں ایسے ہیں جو ماضی قریب میں آئے ہوئے مہاجر والدین کی اولاد ہیں لیکن ان کو زمانہ قدیم سے آباد شدہ طبقہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے ان کا ماحول غیر دلچسپ، ان کی اقتصادی حالت کمزور، ان کی سماجی حیثیت قابل رحم بنا دی گئی ہے ان کو مختلف برے ناموں مثلاً ڈوگیں، کولاکس وغیرہ سے پکارا جاتا ہے اور ان کو یہ محسوس کرایا جاتا ہے کہ وہ ہر حالت، ہر بات غرض ہر حیثیت سے اس ماضی بعید سے آباد شدہ طبقہ سے کمتر ہیں۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ان تین کروڑ نفوس کی زندگی کتنی اجیرن ہو گئی ہو گی۔ ان میں اچھے جذبات پیدا ہوں تو کیسے: وہ اپنے مہاجرین والدین جو ایک خاص تہذیب کے حامل تھے، کے نقش قدم پر چل کر اپنے اسلاف کے کارناموں کو زندہ کریں تو کس طرح؟ اس حالت میں تو نہ وہ کسی تہذیب میں ضم ہو سکتے ہیں نہ کسی اور کو اپنی تہذیب سے متاثر کر سکتے ہیں۔ ان کا امریکی سے پس منظر تو جرائم آلیس، اور شہر کی گندہ و گنجان آبادی ہے کان کنی اور محنت و مشقت کی زندگی ان کا معمول ہے یہ مفلوک الحال ستم رسیدہ اپنے والدین کی مہاجرانہ حماقت کا ماتم کرتے ہوئے امریکی واقعات و حادثات کے دھارے میں بہے چلے جا رہے ہیں، بالکل غیر شعوری طور پر۔

ان غریب بستیوں کا مسئلہ تعمیری ممکنات کے نظریہ سے غور طلب ہے۔ ان کی نئی پود مزاج اور قابلیت میں دوسروں سے بہتر ہو سکتی ہے اگر ان کو اچھا پس منظر دیا جائے تو امریکہ کی قومی تہذیب میں چار چاند لگا سکتے ہیں۔ ان تین کروڑ نئے شہریوں کو ان کی گذشتہ تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنا ہوگا۔ اور دوسرے امریکیوں کے برابر درجہ دینا ہوگا۔

امریکہ کو چاہئے کہ وہ ایک خطرۂ عظیم سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے یعنی وہ یورپی احساس کمتری کو اپنے یہاں داخل نہ ہونے دے۔ یورپ پر شاؤنی[1] قومیت کا بھوت سوار ہے۔ جو مختلف تہذیبی جماعتوں کو باہم دست و گریبان

---

[1] اس قسم کے والہانہ جذبہ قومیت کو کہتے ہیں جو اپنی قوم کی برتری کے لئے دوسروں پر اشد ظلم و جبر روا رکھے۔

سکئے ہوئے ہے۔ یورپ کی یہ متخاصم اقلیتیں اتحاد ملی کی ہر معقول و نامعقول آواز کے خلاف لڑنے کے لئے تیار رہتی ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہنا دوبھر ہو گیا ہے۔

تدبر نام ہے اس فن کا جو حالات کو قابو سے باہر ہونے سے پہلے سنبھال لے جمہوریت کو اگر زندہ رکھنا ہے تو لوگوں کی ذہنیتوں میں اور خیالات میں ایک انقلاب پیدا کرنا ہوگا اور یہ انقلاب پیدا ہو سکتا ہے صرف تعلیم سے جمہوری نظام کار میں تعلیم کا مقصد ایک قسم کی تہذیبی اجتماعیت پیدا کرنا ہے بعض حضرات تہذیبی اجتماعیت کے خیال ہی سے کانپ اٹھتے ہیں انھیں خوف یہ ہے کہ تہذیبی جماعتوں کا دقیانوسی و قنوطی ردعمل بجائے اتحاد کے نفاق پیدا کرے گا لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ امریکی تہذیب مجموعہ ہے بہت سے کلچروں کا۔ اگر اختلاف و تخصیص ہی کسی تہذیب کی خصوصیات ہیں تو ماہرین تعلیم کا یہ فرض ہے کہ وہ امریکی بچوں کو ایک ایسے سماج میں سکون و اطمینان کی زندگی گذارنے کے لئے تیار کریں جس کی بنیادیں تہذیبی اجتماعیت کے اصول پر کھڑی کی گئی ہوں۔

جے لے رابنسن نے اپنے مقالہ سیولائیزیشن میں بہ تشریح واضح کیا ہے کہ فنون لطیفہ صنعت حرفت اور سائنس وغیرہ میں ایک کلچر دوسرے کلچر سے کیا کچھ نہیں حاصل کرتا اور ایک تہذیبی جماعت کا دوسری تہذیبی جماعت کے احسان کو مان جانا ہی اتحاد ملی کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے جمہوریت کا فرض ایک ایسے سماج کو جنم دینا ہے جس میں ہر قوم اور ہر جماعت کا فرد سکون اور اطمینان سے زندگی گذار سکے، ایک دوسرے سے پورا فائدہ اٹھا سکے۔ اپنی خوبیاں دوسروں کو دے اور دوسروں کے محاسن کو خود اختیار کر سکے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی اسکول یا کالج ایک قوم کے مختلف الخصائل گروہوں میں ربط و اتحاد کیسے پیدا کر سکتا ہے؟ وہ ان کو یہ کیسے سمجھا سکتا ہے کہ ایک گروہ کی بعض ضروریات دوسرے گروہوں کی بعض ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ اس لئے ایک دوسرے کا آپس میں لڑنا خلاف مصلحت ہے؟ ان تجربات کو کیسے وسعت دے سکتا ہے جن کے ذریعہ تمام گروہ مل کر عام فائدے کے لئے مصروف کار ہوں

ہم جواباً یہ عرض کر سکتے ہیں کہ ہر اسکول و کالج کسی ملک و قوم کے عناصر ترکیبی کے مطالعہ کے لئے ایک

سلہ قارئین ہندوستان کی نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعتوں کے اعمالنامہ کو نظر کے سامنے رکھیں۔

دارالعمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے ان میں ہم کلچری گروہوں کے اتحادِ عمل کے نقشے تیار کریں اور سماجی ترقی کے
لئے نئی نئی راہیں ڈھونڈھ نکالیں مثلاً امریکی اتحاد ملی کے لئے ان نعروں کا نشر کرنا کہ "ہم سب امریکی ہیں اور مہاجر"
بہت مفید ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ایک قوم مختلف جماعتوں اور گروہوں کا مجموعہ ہوتی ہے اس لئے آپس کے میل
جول کی وجہ سے قوم کا ہر فرد اپنی جماعت کے علاوہ دوسری جماعتوں کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ ایسی حالت
میں تعلیم کا مقصد سماجی اصلاح کار کی حیثیت سے یہ ہونا چاہئے کہ وہ ہر گروہ پر یہ بات ظاہر کردے کہ اس کا مستقبل
پوری قوم کے مستقبل سے وابستہ ہے۔ وہ کل نہیں ہے بلکہ جزوِ کل وہ قوم کے پہیہ کا ایک حصہ ہے۔ دوسرے
گروہوں کے ساتھ اتفاق و رواداری سے کام لینے ہی میں اس کی ترقی کا راز مضمر ہے تعلیمی نظام کار کو اس طرح
ترتیب دیا جائے کہ اس سے وحدت ملی کے خوشگوار نتائج پیدا ہوں ہر اسکول اور کالج میں یہ قابلیت پیدا کرنی
چاہئے کہ وہ اتحاد بین الملل کے تعلقات کے متعلق تجربات کرے۔ گول میز کانفرنس، مجلس اتحاد یا اسی قسم کی کوئی مجلس
کسی نام سے بنائی جائے جس میں مختلف تہذیبی جماعتوں کے نمائندے ایک جگہ جمع ہو کر تہذیبی جمہوریت کا مطالعہ
کریں انسانی رشتوں کو استوار کرنے کے لئے جو بھی نصاب تعلیم مرتب کیا جائے اس میں ذہنی وجذباتی ہر
طریقوں سے کام لینا ہوگا۔ اس لئے کہ مذہبی و نسلی تہذیبی جماعتوں کا ماحول جذباتی ہوتا ہے وہ ایک شخص واحد کو اپنا
نجات دہندہ قرار دے کر والہانہ اس کی پیروی کرتے ہیں اس لئے ہمارے ادارہ ہائے تعلیم پر یہ فرض عائد ہوتا
ہے کہ وہ اتحاد بین الملل کے لئے سازگار فضا پیدا کریں اسکولوں اور کالجوں میں جلسے کئے جائیں اور خاص طور
پر ترتیب دادہ جلسوں کے موقع پر طلبا دوسری تہذیبی جماعتوں کے مدعو شدہ باقتدار اور قابل قدر ہستیوں سے
شرفِ نیاز حاصل کریں اور خود بھی دوسری تہذیبی جماعتوں کے جلسوں میں شریک ہوں اپنی خوبیاں ان پر روشن
کریں اور ان کی خوبیوں سے خود مستفید ہوں۔ آپس میں مل جل کر کام کرنا اور رواداری کا برتاؤ سیکھیں۔

ہمیں اس اتحاد ملی کے مسئلہ کو سلجھانے میں اقتصادی حالات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ
اقتصادی کساد بازاری اور بڑھتی ہوئی بیکاری کے ساتھ ساتھ آپس کی کشیدگی بڑھ جاتی ہے اور جھگڑے فساد
پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ والنٹین اپنی کتاب میں جو "ضد سامیت" پر لکھی گئی ہے ایک ایسے قبیلے کا ذکر کرتا ہے
جو درخت بق بق کے پھلوں پر گذارہ کرتا تھا۔ جب فصل اچھی ہوتی تھی تو یہ قبیلہ جشن مناتا اور دوسرے قبیلوں کو

بھی مدعو کرتا۔ مگر جب فصل خراب ہوتی تو یہ اپنے پاس دوسروں کو پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ اور جب قحط سالی ہوتی یہ دوسروں کو مار ڈالتا۔

ہمارے تعلیمی اداروں کا فرض ہے کہ وہ جذبۂ نفرت و حقارت، احساس کمتری و برتری کو جلد از جلد دور کرنے میں کوشاں ہوں اس لئے کہ کسی فرقہ، نسل، مذہب یا قوم کے خلاف جذبہ تحقیر کا ہونا اقتصادی گتھیوں کو سلجھانے اور حالات کو بہتر بنانے میں سنگ راہ ثابت ہوتا ہے۔ یہ ادارے آئندہ شہریوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ اقتصادی مسائل کو سائنٹفک طریقوں سے سلجھائیں اور ان تمام اشخاص کے ساتھ رواداری برتیں جو صدق دل سے مختلف اقتصادی نظریات کے حامل ہوں زندگی ایک مجموعۂ اضداد ہے اور اس کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر فرد کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ ایک ہی منزل کی مختلف راہیں اور ایک ہی سوال کے ہزاروں حل ہوتے ہیں لیکن اچھی تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے جو مختلف خیال و عمل رکھنے والے اشخاص کو ایک رشتہ میں منسلک کر سکتی ہے۔ ان کے دلوں سے احساس دوئی مٹا کر انھیں متحد کر سکتی ہے اور اقتصادیات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا کر دنیا کو قتل و خون، لوٹ کھسوٹ اور غارتگری سے نجات دلا سکتی ہے۔

محمد علی صاحب مدراسی

عرب کی معاشی حالت اور پیغمبر صلعم

واقعہ یہ ہے کہ کسب اور حصول معاش کی جد و جہد کے متعلق رسول اکرمؐ کا جو طرز عمل تھا مسلمان اگر اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا پر چلنے کو اپنی سعادت قرار دیں تو شاید مشکل ہی سے کوئی مسلمان بیکار، یا بے روزگار رہ سکتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے۔

انی لاکرہ ان اری الرجل فارغا — میں یہ ناپسند کرتا ہوں کہ کسی شخص کو دنیا یا آخرت

فی عمل الدنیا والاخرہ — کے کام سے بیکار دیکھوں۔

اور یہی وجہ ہے کہ بھیک (گداگری) جہاں دنیا کے بعض مذاہب میں مذہب اور مذہبی فرائض کے لوازم سے ہے اور وہاں ان کا سب سے زیادہ استحقاق اسی کو ہے جو مذہب سے جتنا زیادہ تعلق رکھتا ہو (جیسا کہ ہمارے ملک میں برہمنوں کا حال ہے) نیز جن لوگوں نے مذہبی تعلیمات سے غلط طور پر متاثر ہو کر ترک دنیا کو اپنا مسلک بنایا۔ ان کے جانشینوں میں جو زیرک اور نفسیات انسانی کے عالم تھے انھوں نے تو بالباطل ذرائع سے عوام کی کمائی کا اپنے آپ حصہ دار بنا لیا، کمائے کوئی کھائے کوئی، لیکن اسی گروہ میں جو بے چارے بیوقوف اور احمق تھے انھیں گداگری کو اپنا پیشہ بنانا پڑا اور رفتہ رفتہ یہ ان کا خاندانی پیشہ ہو گیا کس قدر افسوس کی بات ہے کہ دوسرے مذاہب میں یہ بات پائی جاتی تو اتنا تعجب نہ ہوتا لیکن اسلام جس میں آنحضرت نے بھیک کے لقمہ کو

رضفا یاکلہ فی جھنم (ترمذی)

قرار دیا تھا ہم گداگری کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھاتے۔ آپ فرماتے تھے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لاتزال المساء لہ باحدکم حتی — تم میں سے جو کوئی ہمیشہ بھیک مانگتا ہے تو جب

یلقی اللہ تعالے ولیس فی وجھہ — وہ خدا کے سامنے جائے تو اس کے چہرہ پر

مزعۃ لحم — گوشت کی ایک بوٹی بھی نہ ہوگی۔

بکثرت آپ اعلان فرماتے تھے کہ

الصدقة تميت القلب   صدقہ آدمی کے فطری احساسات کو مردہ کر دیتا ہے

اور تجربہ شاہد ہے کہ صدقہ کھانے والے خودداری، عزت نفس، رحم وغیرہ کے جذبات سے مفلس ہو جاتے ہیں حضور انور اکثر یہ فرماتے جیسا کہ بخاری میں ہے۔

لان یحطب احدکم حزمة علی   کسی کا اپنی پیٹھ پر بوجھ لادنا بہتر ہے بہ نسبت

ظهره خیر له ان یسال احدا   اس کے کہ کسی سے سوال کرے

مشہور واقعہ ہے کہ ایک انصاری نے حضور اکرم کے پاس سوال پیش کیا۔ رسول اکرم نے دریافت کیا کہ تمہارے پاس کسی قسم کی کوئی چیز ہے؟ بولے کہ ہاں ایک ٹاٹ ہے جس کا کچھ حصہ پہنتا ہوں اور اس کے کچھ حصہ کو اوڑھتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں" آپ نے فرمایا" اس کو لے آو" وہ لے آئے حضور اکرم نے اپنے دست مبارک میں دونوں چیزوں کو لے کر ہراج کرنا شروع کیا ایک صحابی نے ایک درہم دام لگایا آپ نے فرمایا اس سے زیادہ بھی دینے والا کوئی ہے" کسی صحابی نے دو درہم دام لگائے حضور انور نے ان ہی کے حوالے کر دیا اور دو درہم لے کر سوال کرنے والے انصاری کے حوالے کر دیئے اور حوالے کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ ایک درہم کا غلہ لے کر گھر والوں کو دے آؤ اور دوسرے درہم سے ایک کلہاڑی خرید کر لاؤ۔ کلہاڑی آئی دنیا نے دیکھا کہ آسمان و زمین کے سردار خاتم الانبیا نے بذات خود

شدّ فیه عودًا بیده   اس کلہاڑی میں ایک لکڑی ٹھونکی

اور انصاری کے حوالے کر کے فرمایا۔

اذهب فاحطب و بع ولاارینك   جاو اس سے جنگل جاکر لکڑی کاٹو اور میں چاہتا

خمسة عشر یومًا   ہوں کہ پندرہ دن تک تمہیں نہ دیکھوں۔

انصاری نے یہی کیا اور پندرہویں دن حاضر خدمت ہوئے پوچھا گیا کہ کیا ہے؟ بولے کہ اس عرصہ میں دس درہم آمدنی ہوئی جس میں سے چند درہم کے کپڑے خریدے اور چند درہم کے اناج۔ حضور اکرم نے فرمایا کہ" یہ اس سے بہتر ہے کہ تم کسی سے بھیک مانگو اور قیامت میں ذلت اٹھاؤ"۔

غور کرنے کی بات ہے کہ بجائے اس غریب کے ٹاٹ اور پیالہ کے یہ بھی ممکن تھا کہ خود حضور اکرم یا کسی

صحابی سے ان کو دو درہم دلوا سکتے تھے لیکن جو آپ کی غرض تھی یعنی حتی الوسع ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کرے اور یہ مقصد بہترین طریقہ سے اس تدبیر سے حاصل ہو سکتا تھا کچھ اسی قسم کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کا بھی ہے۔ مسجد میں ایک شخص کہتے ہوئے داخل ہوا کہ جہاد کرنے میں کون میری مدد کرتا ہے؟ حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے پاس بلایا اور ہاتھ پکڑ کر مجمع سے فرمانے لگے

من یستاجرہ منی ھذا یعمل ارضہ — اپنی زمین پر کام کرنے کے لئے مزدوری پر کون لیتا ہے

کسی انصاری نے کہا کہ میں لیتا ہوں حضرت عمرؓ نے فرمایا

بکم تاجرہ کل شھر — اس کو ماہوار کیا دوگے

انصاری نے تنخواہ بتائی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا

خذہ — تم اس کو نوکر رکھ لو۔

بہرحال نوکر ہو کر وہ شخص چلا گیا چند مہینوں کے بعد حضرت عمرؓ نے انصاری سے پوچھا

ما فعل اجیرنا — میرے رکھائے ہوئے نوکر نے کیا کیا؟

انصاری نے عرض کیا۔

صالح یا امیر المؤمنین — اچھا ہے اے امیر المومنین

حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ

ائتی بہ وما اجتمع لہ من الاجرۃ — اس کی جمع شدہ پونجی کے ساتھ میرے پاس لے آؤ

آدمی حاضر کیا گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ حاضر ہوا اس شکل میں کہ ایک تھیلی بھی درہموں سے بھری اس کے ساتھ تھی۔ حضرت عمرؓ نے تب اس کو مخاطب کر کے فرمایا۔

خذ ھذہ فان شئت فالآن اغز — لو یہ تھیلی اپنے پاس رکھو اب جی چاہے تو جا کر

وان شئت فاجلس (کنز العمال) — جہاد کرو چاہے گھر بیٹھو۔

اس میں شک نہیں کہ مفلس اور غریب عربوں کے متعلق تاریخی کتابوں میں عجیب و غریب افسانے درج ہیں۔ ابن خلدون ہی کا بیان ہے کہ عرب کے دیہاتی بے چارے

کانو یقتاتون بلحم الضب او الیرابیع	سوسمار کا گوشت، ٹڈے، گوبریلے اور بچھو کھاتے
او العقارب او الخنافس واذا جاعوا اکلوا	تھے اور بھوک سے بیتاب ہوتے تو اونٹ
العلهز وهو دبر الابل مهونة فی الحجارة	کی لید میں خون کوٹ کر کھاتے تھے اور قریش
فی الدم تبط خونه وکان حال القرشی بیاعز فلک	کا بھی تقریباً یہی حال تھا۔

گورنر کسریٰ کے سوال کرنے پر مغیرہؓ نے۔

قال نحن اناس من العرب کنا فی شقاء	کہا کہ ہم عرب کے باشندے ہیں، ہم پر سخت
شدید وبلاء عظیم نمص الجلد والنوی	تنگی گذرتی تھی اور آفتوں میں گرفتار تھے۔ بھوک
من الجوع ونلبس الوبر والشعر	میں چمڑا اور کھجور کی گٹھلیاں کھاتے تھے اور
بخاری کتاب الجهاد	بالوں کے کپڑے پہنتے تھے۔

پھر اسی عرب کو اسلام کے بعد پایا گیا جس حال میں پایا گیا یقیناً اس معاشی انقلاب میں سیاسی فتوحات کو بھی دخل ہو لیکن محض یہی ایک سبب نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کی رہنمائی رسول اکرمؐ کے ذریعہ سے قدرت نے کی تھی وہیں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ان کو بلکہ سارے جہان کو ایک آخری "معاشی پیغمبر" بھی دیا گیا تھا۔ آخر غور کرنے کی بات ہے کہ جہاں دنیا کے اور پیغمبروں نے اپنی اپنی امتوں کے لئے مغفرت و ہدایت کی دعائیں کی تھیں حضور ان دعاؤں کے ساتھ ہی غریب عرب کے لئے یہ بھی دعا فرمایا کرتے تھے۔

اللهم! انهم حفاة فاحملهم۔ اللهم انهم	پروردگار! یہ ننگے پیر ہیں انھیں سوار کر، پروردگار
عراة فالبسهم اللهم انهم جیاع فاشبعهم	یہ ننگے ہیں انھیں کپڑے پہنا، پروردگار یہ بھوکے
(ابوداؤد)	ہیں انھیں پیٹ بھر کھلا۔

"معاشی دعا کا اس سے بہتر نمونہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضور انور کو اگر ایک طرف عربوں کی اعتقادی و اخلاقی بربادیوں سے تکلیف ہوتی تھی اور اتنی تکلیف ہوئی کہ قرآن مجید میں حق تعالیٰ کو۔

فلعلک باخع النفسک الا یکونوا مؤمنین	شاید کہ آپ ان کے ایمان نہ لانے پر اپنی جان دیدیں گے

جیسی متعدد آیتیں نازل کرنی پڑیں لیکن قریب قریب اسی قسم کی اذیت آپ کے رؤف و رحیم قلب مبارک کو عربوں کے افلاس، فقرا، رفاقہ سے ہوتی تھی صحیح مسلم میں ایک لمبی روایت ہے جو جریرؓ بن عبداللہ بجلی سے مروی ہے اس حدیث کا ابتدائی حصہ یہ ہے حضرت جریرؓ فرماتے ہیں۔

کنا فی صدر النھار عند رسول اللہ	ہم نصف النہار کے وقت رسول اکرمؐ کے
صلی اللہ علیہ وسلم فجاء قوم عراۃ	پاس تھے کہ کمل پوش ننگے پاؤں تلوار لٹکائے
مجتابی النمار او العباء متقلدالسیوف	ہوئے ایک قوم آئی ان میں اکثر بلکہ کل کے
عامتھم من مضر بل کلھم من مضر	کل مضر قبیلہ کے تھے۔ رسول اللہ کے چہرۂ
فتمعر وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	مبارک کا رنگ بدل گیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر تمعر[1] کی یہ کیفیت کیوں طاری ہوئی حضرت جریرؓ خود ہی اس کے بعد وضاحت فرماتے ہیں۔

لما رای بھم من الفاقۃ	جب آپ نے ان کے فاقہ کی حالت کو دیکھا۔

حضور انور کے لئے ان کی یہ حالت اتنی ناقابل برداشت ہوئی کہ پہلے آپ اندر زنانہ میں تشریف لے گئے اور اسی پریشانی کی حالت میں باہر نکلے بظاہر گھر میں کوئی ایسا سامان نہ تھا جس سے ان کمل پوش ننگے پاؤں والوں کی امداد فرما سکتے ہوں اسی وقت بلالؓ بلائے گئے۔ اذان دینے کا حکم ہوا۔ نماز ہوئی اور باوجودیکہ جمعہ کا دن نہ تھا آپ منبر پر تشریف لے گئے اور آیت قرآنی

یاایھا الناس! اتقوا ربکم الذی خلقکم	لوگو! اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو پیدا کیا
من نفس واحدۃ	ایک ہی جان سے

تلاوت کرتے ہوئے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کی طرف توجہ دلاکر آدمیت کے اس جسد کے ہر ہر عضو کو بے چین کر دیا۔ پھر اور آیتیں تلاوت فرمائیں فرمایا کہ کل لینے کے لئے آج اگر کوئی دیا چاہے تو دے سکتا ہے عطیوں کی بارش شروع ہوگئی ڈھیر لگ گیا اور وہی چہرہ انور جو فاقہ کو دیکھ کر "متمعر" ہوا تھا حضرت جریرؓ کے الفاظ میں۔

---

[1] تمعر رنگ کا بدل جانا حالت کا متغیر ہونا۔

رأيت وجه رسول الله صلى الله عليه وسلم يتهلل كأنه مذهبة	میں نے رسول اللہ کے چہرہ مبارک کو دیکھا کہ وہ چمک اٹھا ایسا معلوم ہو کہ اس پر سونے کی قلعی چڑھا دی گئی ہے۔

ایک "معاشی روح" اور "معاشی دل" کے احساسات کیا اس سے زیادہ ہو سکتے ہیں؟ "خوباں ہمہ دارند" کا جو تنہا مظہر اتم تھا اس کی ان باتوں پر تعجب نہ کرنا چاہئے وہی جس کے قدم مبارک نمازوں میں قیام کی وجہ سے لوگ متورم دیکھتے تھے یہی لوگ اس کا بھی تماشا کرتے تھے کہ آپ بازار میں جارہے ہیں غلہ کا ایک ڈھیر سامنے نظر آتا ہے۔

فادخل يده فيها فنالت اصابعه بللاً	اپنے دست مبارک کو اس انبار میں ڈالدیتے ہیں آپ کی انگلیوں میں تری لگ جاتی ہے۔

انبار کے مالک سے فرمایا جاتا ہے۔

ما هذا! يا صاحب الطعام	غلہ والے! یہ کیا ہے؟
فقال! يا رسول الله! اصابته السماء	اس نے کہا اے اللہ کے رسول اس پر بارش ہو گئی

معاشی تعلقات کی تصحیح کے پیغمبر کی زبان مبارک سے آواز آتی ہے۔

افلا جعلته فوق الطعام حتى يراه الناس من غشنا فليس منا	پھر تم نے اس تر غلہ کو اوپر کیوں نہ رکھا کہ لوگ دیکھتے جو فریب کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

محمد یوسف الدین صاحب بی۔اے (عثمانیہ)

والٹیر[1]

۲۱ نومبر ۱۶۹۴ء کے خنک ایام میں پیرس میں ایک بیمار اور کمزور بچہ پیدا ہوا۔ اتنا کمزور کہ اس کے جینے میں بھی شبہ تھا۔ اس کی عمر ۸۳ سال کی ہوئی لیکن ساری عمر اس کی تندرستی کی یہی حالت رہی۔ یہ کہا جائے کہ اس نے مرتے مرتے اسّی سال لئے تو غلط نہ ہوگا۔ جب وہ مرا تو وہ دنیا کا سب سے مشہور آدمی تھا۔

اس کے والدین نے اس کا نام ارویت رکھا تھا لیکن بڑے ہو کر اس نے خود اپنا نام بدل کر والٹیر رکھا اور دنیا میں اسی نام سے شہرت حاصل کی۔ یہ اس کی خود رائی کا پہلا مظاہرہ تھا۔ وہ خود رائی جس نے آگے جاکر اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اسے ایک معمولی مقبول شاعر سے مغربی آزادی کا پیامبر بنا دیا۔

اس کا باپ ایک درباری تھا۔ اس کا مذہبی باپ (   ) ایک لامذہب اور آزاد منش قسم کا انسان تھا۔ ارویت ابھی تین سال ہی کا تھا کہ اس کے مذہبی باپ نے اسے ایک نظم یاد کرادی جس میں دنیا کے تمام مذاہب پر لعنت بھیجی گئی تھی۔ اسے چچا تیو بوف کی تربیت نے اسے بچپن ہی سے تعصب اور تنگ نظری کا دشمن بنا دیا۔

دس سال کی عمر میں اسے یسوعی کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یسوعی عیسائیوں میں سب سے زیادہ متعصب فرقہ ہے لیکن اس زمانہ میں ان کا نظام تعلیم نہایت مکمل اور اپنے قسم کا بہترین نظام تھا۔ خاص طور سے اس زمانے میں جبکہ یورپ میں تعلیمی تنظیم کی طرف سے عام بے توجہی اور لاپروائی تھی یسوعیوں کے مدرسے اپنی آپ مثال تھے ارویت کو کھیلنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ پڑھنے کا بہت شوقین تھا۔ اس کے اندر بچپن سے ہر چیز کے متعلق تفتیش کرنے کا مادہ تھا۔ استادوں کا اس کے سوالوں سے ناک میں دم تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک میں اپنا دماغ دوڑاتا۔ یسوعی استادوں نے اس کو بڑے شوق سے پڑھایا بارہ برس کی عمر میں وہ بلا تکلف شعر کہنے لگا۔ طنز اور شوخی اس کو فطرت سے ملی تھیں چنانچہ اس کی جملہ بازی بچپن ہی سے مشہور ہو گئی

---

[1] وال ٹے آر

جب وہ کالج سے نکلا تو قدیم کلاسیکل ادب اپنے زمانے کے مذہبی تنازعات اور سائنس کی جدید تحقیقات پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ اب قانون کی تعلیم حاصل کر کے کسی اچھے سرکاری عہدہ پر فائز ہو لیکن والٹیر کو ادب سے دلچسپی تھی اس لئے اس نے ادبی زندگی کو ترجیح دی۔

اس کی نئی زندگی کے ابتدائی ایام بہت خوشی بلکہ عیش میں گذرے۔ چچے تیو نیوف نے اسے پیرس کے بہترین حلقوں میں متعارف کرا دیا اور خود والٹیر نے اپنی شگفتگی طبع اور شوخی کی بدولت اپنے لئے ان حلقوں میں جگہ بنا لی۔ اس کا بیشتر وقت پیرس کے شوقین رئیس زادوں میں گذرتا۔ وہاں کی فیشن ایبل خاتونوں کے اشعار کی اصلاح کرتا۔ سب لوگ اس کی تعریف کرتے جو نہ کرتے وہ اس کی طنز کا شکار ہوتے۔

کچھ عرصہ بعد چچے تیو نیوف ہالینڈ میں سفیر مقرر ہو گیا چنانچہ والٹیر بھی اس کی معیت میں ہالینڈ گیا۔ وہاں اسے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی اس کا نام اس نے پیار میں "پمپی" رکھا لیکن پمپی کی ماں کو یہ سلسلہ پسند نہ آیا اس نے چچے تیو نیوف سے شکایت کی چچے تیو نیوف نے والٹیر کی نگہداشت کرنا چاہی جس میں اسے ناکامی ہوئی تنگ آکر اس نے والٹیر کو پیرس واپس بھیج دیا پیرس میں اس کے باپ نے بھی اس کا استقبال نظر بندی سے کرنا چاہا والٹیر کو ایک اور جگہ پناہ لینی پڑی اور وہیں سے اس نے اپنی محبوبہ کے اغوا اور اپنے باپ کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کی پہلے میں ناکام رہا دوسرے میں کامیاب۔

اس عرصہ میں فرانس کے بڑے بادشاہ لوئی چہار دہم کا انتقال ہو گیا اس کے مرتے ہی اس کی سخت گیری کے خلاف ردعمل ہوا۔ آزادی اور بے ضابطگی کی ایک عام ہوا چل پڑی جس کے جو منہ میں آیا بلا خوف خطر کہنا شروع کیا کسی نے مرے ہوئے بادشاہ کی ہڈیوں پر لعنت بھیجی کسی نے ریجنٹ[1] کے کردار پر حملہ کیا۔ والٹیر نے بھی طبع آزمائی کی نتیجہ یہ نکلا کہ چند ایسے اشعار کے لئے جو کسی اور کے لکھے ہوئے تھے بسٹیل جانا پڑا۔ بسٹیل فرانس کا وہ تاریخی جیل ہے جس پر انقلاب فرانس کی پہلی چوٹ پڑی۔

یہاں والٹیر تقریباً ڈیڑھ سال نظر بند رہا۔ یہ زمانہ اس نے بیکار نہیں گذارا بلکہ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا جب وہاں سے نکلا تو باہر بے اعتدالی اور آزادی کی ہوا کو اور بھی زور پر پایا۔ ادھر ڈیڑھ سال کے دبے ہوئے جذبات

---

[1] ولی عہد کمسن تھا اس لئے حکومت کی باگ ڈور ریجنٹ (ولی بادشاہ) کے ہاتھ میں تھی۔

اظہار چاہتے تھے چنانچہ اس نے ایک ڈراما تیار کیا جس کے پردہ میں ریجنٹ کے کردار پر خوب حملے کئے۔ یہ ڈراما پیرس میں بہت مقبول ہوا۔ ریجنٹ خود اسے دیکھنے آیا۔ والٹیر کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں پھر بسٹیل نہ جانا پڑے اس لئے پیرس چھوڑ کر ایک اور جگہ پناہ کی غرض سے چلا گیا۔ یہاں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کی زندگی اور کردار کو نئے راستے پر ڈال دیا۔

والٹیر شروع ہی سے بڑے لوگوں کی صحبت کا شوقین تھا۔ چنانچہ یہاں بھی اس نے امیرزادوں کے حلقے میں اپنے لئے جگہ پیدا کر لی۔ اس کا زیادہ تر وقت ان لوگوں کے ساتھ خوش مذاقی اور دل لگی میں گذرتا۔ اس خوش وقتی میں والٹیر بالکل بھول گیا کہ اس میں اور ان امیرزادوں میں کچھ فرق بھی ہے۔ وہ سب سے بالکل مساویانہ برتاؤ کرتا اور لاپروائی سے مذاق کرتا۔ وہ یہ بھول گیا کہ پیرس میں آزادی، اخوت اور مساوات کا وہ دور ابھی نہیں آیا ہے جس کا وہ خود ایک ممتاز پیش رو ہونے والا تھا۔

اسی حلقے میں فرانس کے ایک نامی خاندان کا ایک نوجوان آیا کرتا تھا جسے والٹیر کی یہ ہمسری خاص طور پر ناگوار ہوتی۔ ایک روز اس نے حقارت آمیز انداز میں والٹیر کے متعلق دریافت کیا کہ "یہ کون شخص ہے جو میری باتوں کا اتنی زور سے جواب دیتا ہے؟" "جناب" والٹیر نے جواب دیا۔ "یہ وہ شخص ہے جس کے نام کے ساتھ کوئی لمبا چوڑا خاندانی نام نہیں لگا ہوا ہے لیکن وہ اپنے نام کی عزت کرانا چاہتا ہے"۔

چند روز بعد اس نوجوان امیرزادے کے آدمیوں کے ہاتھوں والٹیر کی سر بازار مرمت ہو گئی۔ والٹیر نے انتقام لینے کے لئے اپنے دوسرے امیر دوستوں سے مدد مانگی لیکن ان لوگوں نے ہنس کے ٹال دیا کیونکہ ان کے لئے یہ کوئی خلاف معمول واقعہ نہ تھا۔ والٹیر نے شمشیر بازی سیکھنا شروع کر دی اور ساتھ ہی اعلان کر دیا کہ وہ ضرور انتقام لے کر رہے گا۔ اس اعلان کا نتیجہ یہ ہوا کہ والٹیر کو بسٹیل جانا پڑا لیکن صرف چند روز کے لئے بہت جلد اسے ملک چھوڑنے کی اجازت دیدی گئی۔

والٹیر کی ابتدائی زندگی کا بلاشبہ یہ اہم ترین واقعہ ہے۔ اس واقعہ نے اسے "نظام قدیم" کے غیر منصفانہ پہلوؤں کے آمنے سامنے لاکر کھڑا کر دیا۔ اب اسے معلوم ہوا کہ جس ملک میں آزادی اور مساوات نہیں ہوتی وہاں کی زندگی کس قسم کی ہوتی ہے۔ اس واقعہ نے اس کے خیالات کو ایک نئے راستہ پر ڈال دیا۔ پرشوق جوانی کی جگہ

فکر اور سنجیدگی نے لے لی وہ موجودہ نظام کا دشمن ہو گیا۔ وہ امیرزادے سے انتقام نہ لے سکا مگر اس نے تہیہ کر لیا کہ پورے نظام سے انتقام لے گا۔

فرانس کے قید خانے سے نکل کر والٹیر انگلستان کی سرزمین میں پہونچا جسے آزادی اور رواداری کے اعتبار سے یورپ کے سب ممالک پر سبقت حاصل تھی یہاں نہ لوگ مذہب کے نام پر ایک دوسرے کا گلا گھونٹتے تھے اور نہ حکومت ہی ایسی جابرانہ تھی کہ ثبات پر واں زبان کٹتی ہو"آزادی، رواداری، مفاہمت اور اعتدال پسندی یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ انگلستان کا نشان امتیاز رہی ہیں۔ غرضکہ اس زمانہ میں کوئی دو ملک اتنے مختلف نہ تھے جتنے فرانس اور انگلستان۔

والٹیر کے قیام انگلستان کے متعلق کوئی تفصیل اور قابل اعتبار مواد موجود نہیں فرانس کے ملک بدر والٹیر پر انگلستان کا کیا اثر پڑا ہوگا اس کا اندازہ بہرحال لگایا جا سکتا ہے۔

والٹیر نے انگلستان میں وہ تمام چیزیں پائیں جن کی غیر موجودگی نے اس کے لئے فرانس میں رہنا دوبھر کر دیا تھا اس نے وہاں شخصی آزادی اور مذہبی رواداری دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ وہاں تجارت پیشہ لوگوں کی عزت کی جاتی ہے (فرانس میں ان لوگوں کو جو اپنی کوشش اور قابلیت سے روپیہ کماتے تھے اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور شریف صرف اسے سمجھا جاتا تھا جس نے شرافت اور دولت اپنے بزرگوں سے میراث میں پائی ہو۔ اس نے اسحاق نیوٹن کا شاندار جنازہ دیکھا جس میں شاہی وزراء اور تمام اہالیان ملک شریک تھے یہ شخص فرانس میں مرتا تو کیا اس کی یہی قدر ہوتی ؟ والٹیر نے ضرور سوچا ہوگا۔ دوران قیام میں اس نے انگلستان کے فلسفے ادب اور سائنس سے بھی خاصی واقفیت پیدا کر لی۔

کچھ عرصہ بعد اسے فرانس واپس آنے کی اجازت مل گئی فرانس پہونچا تو وہاں کی وہی بے ڈھنگی چال پائی۔ پادریوں نے محض اختلاف رائے کے الزام پر تقریباً بیس ہزار آدمیوں کو جیل بھجوا دیا تھا۔ ادبی حلقوں میں ایک نہایت ضمنی معاملے پر پھوٹ پڑی ہوئی تھی اور تمام زور سخن اور زور قلم اس پر خرچ ہو رہا تھا۔ والٹیر نے آتے ہی ان اختلافات کی بے وقوفی پر ایک رسالہ لکھا اُس کے بعد اس کے دو ڈرامے اسٹیج کئے گئے اور انھیں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی تصنیف "تاریخ چارلس دوازدہم" شائع کی جو بہت مقبول ہوئی۔

والٹیر ابھی اپنی کامیابیوں پر خوش ہی ہو رہا تھا کہ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جو اس کی بے پناہ قوت مخالفت کو عمل میں لے آیا۔ اس زمانے کے فرانس میں اور اس سے کچھ عرصے پہلے انگلستان میں اداکاروں (ایکٹروں اور ایکٹریسوں) کو ایسی ہی نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا جیسے آج کل ہمارے ہندوستان میں۔ فرانس کی ایک مشہور اداکارہ جس کی فن کاری کا والٹیر دلدادہ تھا، انتقال کر گئی۔ کلیسا نے اسے اپنے قبرستان میں جگہ دینے سے انکار کر دیا اور اسے ایک ویرانے میں دفنانا پڑا۔ والٹیر کے احساسات بھڑک اٹھے اور اس نے ایک زوردار احتجاجی نظم لکھی۔ اس کی اس حرکت کو بہت نازیبا تصور کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے پیرس چھوڑ کر ایک گاؤں میں پناہ لینی پڑی یہیں سے وہ کتاب شائع ہوئی جسے فرانس کے "نظام قدیم" پر پہلی کاری ضرب سمجھنا چاہئے۔

"فلسفیانہ خطوط"[1] قیام انگلستان کے تاثرات تھے یہ پہلی کتاب تھی جس نے فرانس کو انگلستان کی مذہبی رواداری سیاسی خود مختاری، شخصی آزادی، سائنس[1] کی ترقی اور ادب کی رفعت سے آگاہ کیا۔ یہ کتاب کوئی معیاری کتاب نہ تھی اور نہ آج اس کی کوئی خاص وقعت ہے لیکن اس زمانے میں جبکہ فرانسیسیوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس چھوٹی سی رودبار کے پار کس قسم کی دنیا آباد ہے اور وہاں شکسپیر کے نام کا بھی کوئی شاعر گذرا ہے۔ اس زمانے میں اس کتاب کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ والٹیر کے انداز تحریر نے اس کے اثر کو اور بھی دوبالا کر دیا۔ والٹیر کا مخصوص طنز اور پیرایہ کی شگفتگی دونوں اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے

اس کتاب کے اثر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ شائع ہوتے ہی خلاف قانون قرار دیدی گئی۔ ناشر کو بسٹیل بھیجدیا گیا اور پارلیمنٹ کے حکم کے بموجب جلاد نے کتاب کو پبلک میں جلا[2] دیا۔ والٹیر کو پناہ لینے کے لئے بھاگنا پڑا۔

---

[1] اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے فرانس میں ڈے کارٹ کے نظریوں کو روایاتی احترام حاصل تھا اس طلسم کو والٹیر کے ان مضامین نے توڑا جو اس نے نیوٹن کی تحقیقات پر گہرے مطالعہ کے بعد لکھے تھے۔ اس کے بعد فرانس میں بہت سی نئی تحقیقاتیں سر ہوئیں لیکن نیا راستہ دکھانے کا سہرا بلاشبہ والٹیر کے سر ہے

[2] کسی تحریر کے خلاف سخت ترین قانونی اقدام یہ ہوتا تھا کہ اسے کسی کھلی جگہ میں پبلک کی موجودگی میں نذر آتش کر دیا جائے یہ کارروائی سرکاری جلاد کے ہاتھوں عمل میں آتی یہ گویا کتاب کے لئے سزائے موت ہوتی تھی لیکن بیشتر کتابیں جنھیں یہ سزائے موت ملی آج بھی زندہ ہیں۔

والٹیر کی زندگی کی نمایاں خصوصیتوں میں ایک اس کی خوش قسمتی بھی ہے۔ اس کی زندگی کے بیشتر خوشگوار یا ناخوشگوار واقعات کسی نہ کسی طرح اس کی اس شخصیت کی تعمیر میں مد ہوئے جو اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ کر پورے یورپ پر چھا گئی۔ اس کی جسمانی کمزوری جس نے اس کے دماغی حس کو تیز کر دیا، اس کی زود کوب جس نے اسے سنجیدہ بنا دیا، اس کی جلاوطنی جس نے اسے ایک نئی دنیا دیکھنے کا موقع دیا، ان سب اور آگے آنے والے واقعات سے اس کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے

ان ہی واقعات میں سے خاتون چے تولت سے ملاقات ہے۔

خاتون چے تولت ایک عجیب عورت تھی۔ وہ خوبصورت نہیں تھی لیکن پھر بھی ایک مخصوص دلکشی کی مالک تھی وہ ایک نہایت تیز فہم، تیز مزاج اور اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت تھی۔ ادب، طبعیات اور ریاضی سے اسے خاص دلچسپی تھی۔ اس کی شادی ہو چکی تھی لیکن اپنے خاوند مارکوئس چے تولت کے بعض اوصاف (یا عدم اوصاف) کی بنا پر شادی ہونا نہ ہونا سب برابر تھا۔ والٹیر سے جب اس کی ملاقات ہوئی تو اس کی عمر ۲۷ سال کی تھی۔

والٹیر حکومت کی مسلسل ایذا رسانی سے تنگ آ چکا تھا۔ اسے ایک مقام امن کی ضرورت تھی۔ یہ مقام امن اب اسے خاتون کے مکان میں مل گیا خاتون کا مکان فرانس کی سرحد پر واقع تھا۔ اس لئے اگر حکومت، والٹیر کے خلاف کوئی اقدام کرنا چاہتی تو وہ بڑی آسانی سے سرحد پار کر کے دوسرے ملک میں پناہ لے سکتا تھا۔ اس خاتون کے ساتھ والٹیر نے اپنی زندگی کے اگلے چودہ سال گذارے۔

اس عرصے میں والٹیر کو پڑھنے لکھنے کا بہت اچھا موقع ملا۔ خاتون نے اپنے یہاں ایک تجربہ خانہ کھول رکھا تھا جس میں دونوں مل کر سائنس کے تجربے کیا کرتے تھے۔ شام کو دونوں بیٹھ کر مہمانوں کے ساتھ (جو اکثر آتے رہتے تھے) ادب اور فلسفہ پر گفتگو کرتے۔ دونوں تیز مزاج واقع ہوئے تھے اس لئے اکثر اَن بن ہو جاتی لیکن پھر ایک دوسرے کو منا لیتے۔

اس چودہ سال کے مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ میں والٹیر کی علمیت کی دھاک بیٹھ گئی اس کی باتوں کو اب ایک خاص وقعت حاصل ہو گئی گویا اس کو کھڑے ہونے کے لئے ایک مضبوط بنیاد مل گئی۔ اس کے اعتراضات اب غیر اہم سمجھ کر نہیں ٹالے جا سکتے تھے۔ یورپ اب اس کی بات سننے اور اس پر غور کرنے کے لئے مجبور تھا۔ اب تک

اسے صرف ایک شاعر اور ایک کامیاب تمثیل نگار سمجھا جاتا تھا۔ اب اسے عالم اور فلسفی اور اس کے قول کو سند مانا جانے لگا۔

ایک بار پھر والٹیر کی خوش قسمتی نے زور مارا اور خاتون کا نہایت صحیح وقت پر انتقال ہو گیا۔ موت کا سبب ایک بچی کی پیدائش تھا جو نہ مارکوس تجے تولت کی تھی اور نہ والٹیر کی۔ اس خاتون کی دوستی سے والٹیر کو جو فائدہ پہونچا وہ ابھی بتایا جا چکا ہے لیکن اگر یہ تعلق جاری رہتا تو پھر والٹیر کی شخصیت کے لئے مضر ثابت ہوتا۔ خاتون والٹیر کے اوپر بہت حاوی تھی اور وہ اسے اپنے پاس سے کہیں نہ جانے دیتی تھی۔ والٹیر خود اس سے اتنا وابستہ ہو چکا تھا کہ وہ خود اسے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ غرض والٹیر کی زندگی بندھ کر رہ گئی تھی۔ اگر خاتون بروقت نہ مرجاتی تو والٹیر کی شخصیت کا ارتقا رک جاتا۔

خاتون کے انتقال کا والٹیر کو بہت صدمہ ہوا لیکن رفتہ رفتہ تھیٹر کی دلچسپیوں اور فریڈرک شاہ پروشیا کی نوازشوں نے سب کچھ بھلا دیا۔

فریڈرک اپنے زمانہ ولی عہدی سے ہی والٹیر کا معتقد تھا۔ اٹھارویں صدی کے درمیانی دور میں فرانس کی شاعری اور زبان، وہاں کی تہذیب اور طرز رہائش کو یورپ میں معیاری درجہ حاصل تھا اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ فرانسیسی زبان تھی۔ درباروں میں فرانسیسی عالموں کو بڑا رتبہ دیا جاتا تھا۔ فریڈرک کی تعلیم بھی حسب معمول فرانسیسی زبان میں ہوئی تھی۔ اسے فرانسیسی زبان سے عشق تھا۔ فرانسیسی زبان کا مصنف اور شاعر بننے کا شوق اسے دیوانگی کی حد تک تھا۔ اس منزل تک پہونچنے کے لئے والٹیر سے بڑھ کر اور کون راہبر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ولی عہدی کے زمانے سے ہی اس نے والٹیر سے خط و کتابت شروع کر دی تھی اس نے ایک خط میں لکھا تھا، "میرا عقیدہ ہے کہ دنیا میں صرف ایک خدا اور صرف ایک والٹیر ہے"

فریڈرک ولی عہدی کے زمانے میں بہت آزادانہ اور ترقی پسندانہ خیالات رکھتا تھا۔ اس نے سولہویں صدی کے مشہور لا اخلاقی مصنف میکاولی کے خلاف ایک کتاب لکھی تھی والٹیر اور یورپ کے تمام علمی حلقوں کو اس سے بہت خوش آئند امیدیں تھیں۔ ایک فلسفی اور لبرل بادشاہ یورپ کے لئے ایک نئی بات تھی۔ آزادی اور ترقی کو دوست رکھنے والے تمام اشخاص اس دن کے منتظر تھے جب فریڈرک تخت نشین ہوگا۔

۱۷۴۰ء میں فریڈرک بادشاہ ہوگیا شاہی لباس پہنتے ہی فریڈرک بالکل بدل گیا۔ وہ بالکل نرالا بادشاہ ہوگیا اس تبدیلی کا اثر والٹیر اور فریڈرک کے تعلقات پر بھی پڑا۔ رفتہ رفتہ دونوں کو ایک دوسرے کے اصل کردار کا اندازہ ہوتا گیا والٹیر کے خواب۔ "فلسفی بادشاہ" کی تعبیر جھوٹی نکلی۔ فریڈرک ایک فاتح جفاکش اور بے رحم بادشاہ نکلا جس نے اپنے باپ کی تیار کردہ فوجی طاقت کے ذریعہ پروشیا کو یورپ کی اہم ترین دول کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ اسی کارنامہ کی بنا پر وہ فریڈرک اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِدھر فریڈرک کی تیز نگاہوں نے بھانپ لیا کہ والٹیر جتنا فرانسیسی شاعری کا استاد ہے اتنا ہی چالاکی میں استاد ہے۔ باہمی اعتبار اور خلوص رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا لیکن دونوں میں سے کوئی بھی تعلقات ختم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ فریڈرک کا فرانسیسی شاعری سے عشق ویسا ہی زور پر تھا۔ اُدھر والٹیر کی حریص نگاہیں دربار پروشیا کے اعزاز و انعام پر لگی ہوئی تھیں۔ روپیہ کی محبت والٹیر کو ابتدائی زندگی سے تھی۔ علاوہ ازیں باوجودیکہ والٹیر کا اپنے ملک میں کافی اعزاز و احترام ہوتا تھا لیکن فرانس کے بادشاہ نے کبھی اسے اس وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا جس کا وہ مستحق تھا۔ والٹیر کو یہ بات بہت شاق گذرتی تھی۔ شاید محض اسی غصہ کی بنا پر وہ پروشیا کے دربار میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ بہرکیف باہمی بے اعتمادی کے باوجود والٹیر اور فریڈرک ایک دوسرے کے مشتاق تھے۔

تین چار مختصر ملاقاتوں کے بعد ایک مرتبہ والٹیر کو فریڈرک کے دربار میں جانے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں فرانس کے انگلستان اور آسٹریا سے تعلقات اچھے نہ تھے فرانس کی حکومت اس بارے میں فریڈرک کا عندیہ معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اگر فرانس کی ان دول سے لڑائی ہوئی تو وہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں۔ فرانسیسی حکومت کی نظر میں اس کام کے لئے سب سے موزوں آدمی والٹیر تھا۔ والٹیر نے بھی سوچا کہ شاید اس طرح وہ یورپ کی سیاست کار میں اپنے لئے کوئی اہم جگہ پیدا کر سکے اور اسی لئے برلن جانے پر راضی ہوگیا لیکن فریڈرک کی نظروں نے مضمون بھانپ لیا اور والٹیر کوئی کام کی بات معلوم نہ کر سکا۔ اُدھر فریڈرک خفیہ طور سے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ والٹیر کا فرانس واپس جانا محال ہو جائے۔ والٹیر کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ اور بھی بددل ہوگیا اور اپنی ناکامیوں کی تلخی دور کرنے کے لئے خاتون چے تولت کے پاس چلا آیا۔ ابھی اس واقعہ کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ خاتون کا انتقال ہوگیا جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔

فریڈرک نے پھر والٹیر کو بلانے کے لئے خط لکھا۔ اس مرتبہ خاتون چیٹولٹ کی محبت اس کے راستہ میں حائل نہ تھی۔ اس لئے وہ فوراً تیار ہوگیا۔ فریڈرک نے خوب آؤ بھگت کی۔ ایک ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ شاہی چمبرلین کا عہدہ ملا۔ ایک کامیاب فرانسیسی شاعر بننے کے لئے فریڈرک سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ والٹیر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا لیکن اسے خود اپنے اوپر بہت اعتبار تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چال، نرمی اور سختی سے والٹیر کو اپنے قابو میں رکھ سکے گا۔ لیکن ابھی تک وہ صرف والٹیر کے کردار کی کمزوریوں سے واقف تھا اس کی قوت سے آگاہ نہ تھا۔

قیام برلن کے ابتدائی ایام بہت اچھی طرح گذرے لیکن دو خود پرست شخصیتیں کب تک بغیر ٹکرائے رہتیں ادھر اہل دربار کے حسد نے غلط فہمیاں پیدا ہونے میں مدد دی۔ والٹیر کو کسی نے آکر بتلایا کہ بادشاہ نے اس کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ "سنترہ چوسنے کے بعد اس کا بکل پھینک دیا جاتا ہے" یعنی جب والٹیر سے کام نکل جائے گا تو اسے نکال دیا جائے گا۔ اسی طرح کسی نے فریڈرک سے کہا کہ اس نے والٹیر کو اصلاح کلام شاہی کے بارے میں یہ کہتے ہوئے سنا "کیا میں ہمیشہ اس (فریڈرک) کے گندے کپڑے دھوتا رہوں گا" ویسے بھی اب فریڈرک اور والٹیر کا تعلق آقا اور ملازم کا تھا اور والٹیر اس سے کچھ زیادہ عرصے تک مطمئن نہیں رہ سکتا تھا۔

پہلی ٹکر کی ذمہ دار اس کی طمع زر تھی۔ اس نے ایک یہودی سے ساز باز کرکے غیر قانونی ذرائع سے خوب روپیہ کمایا۔ کچھ دنوں بعد دونوں چوروں میں پھوٹ پڑگئی۔ والٹیر اور یہودی میں مقدمہ بازی ہوئی۔ یہودی ہار گیا۔ لیکن والٹیر کا کردار بھی بے داغ ثابت نہ ہوسکا۔ سب جانتے تھے کہ اس نے اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کے لئے جعلی کارروائی کی تھی۔

فریڈرک بہت غصہ ہوا۔ "اگر تمہیں سازشوں کا شوق ہے تو بہتر ہوگا اگر تم کہیں اور چلے جاؤ" وہ چلایا فریڈرک اسے علیٰحدہ کرنا چاہتا تھا لیکن ایک بار پھر فرانسیسی شاعری درمیان میں آگئی۔ کچھ ہفتے گذرنے پر وہی نوازش خسروانہ ہونے لگی۔

لیکن والٹیر کا راستہ ابھی صاف نہ تھا۔ فریڈرک کے دربار میں کئی اور فرانسیسی تھے جو اس کے آنے سے خوش نہ تھے۔ ان سب میں سربرآوردہ ایک سائنسداں ماپرتوئی تھا۔ جسے فریڈرک نے اپنی برلن اکادمی کا

صدر بنایا تھا۔ اس کی شہرت کی بنیاد چند تجربوں پر مبنی تھی جو اس نے سفر لیپ لینڈ کے دوران میں کئے تھے۔ ان تجربوں کے ذریعہ اس نے نیوٹن کے نظریہ (کہ قطبین پر زمین چپٹی ہے) کی تائید کی تھی۔ اس کے علاوہ ماپرتوی فن مجلس سے واقف تھا۔ اس کی گفتگو خاصی دلچسپ اور ظریفانہ ہوتی تھی غرضیکہ ماپرتوی اپنی جگہ ایک کامیاب سائنسداں اور کامیاب درباری تھا۔

فریڈرک کے دسترخوان پر دونوں کی آنکھیں ملیں۔ ماپرتوی نے جان لیا کہ دربار میں ایک ایسا آدمی آگیا ہے جو اس کے امتیازی مقام کو چھین لے تو کچھ تعجب نہیں ادھر والٹیر نے دیکھا کہ اس سے کم درجہ کا ایک آدمی اس سے فائق رتبے پر متمکن ہے۔ دونوں کامیابی، شہرت اور رتبے کے حریص تھے۔ ایک دوسرے کو کیسے برداشت کرتے ٹکر ہونا لازمی تھی۔

پہلا اقدام ماپرتوی کی طرف سے ہوا۔ والٹیر کے آنے سے ماپرتوی شاہی حلقہ کا مرکز تھا وہ باتیں کیا کرتا تھا اور سب سنا کرتے تھے اور ہنستے تھے لیکن والٹیر جس کا شمار انسانی تاریخ کے بہترین باتیں کرنے والوں میں ہوتا ہو اس کے سامنے ماپرتوی کی بات کون سنتا۔ ماپرتوی کو اپنے پیروں تلے کی زمین کھسکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس نے اظہار عداوت کے لئے ایک ایسے شخص کو اپنی پناہ میں لے لیا جو والٹیر کا دشمن تھا یہ گویا اعلان جنگ تھا۔

والٹیر کو بھی بہت جلد حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔

ماپرتوی کا دعویٰ تھا کہ اس نے ریاضی کا ایک اہم اصول "اصول عمل اقل" معلوم کیا ہے۔ ایک سوئیس سائنسداں نے جو کہ برلن اکادمی کا رکن تھا اس دعوی کا ارتداد کیا اور بتلایا کہ یہ اصول بہت پہلے معلوم کیا جا چکا ہے۔ ماپرتوی نے بجائے اس کے کہ اعتراض کا مناسب جواب دے ایک نہایت قابل اعتراض رویہ اختیار کیا اس نے اکادمی کا اجلاس طلب کیا اور ممبروں پر دباؤ ڈال کر سوئس سائنسداں کے خلاف ایک قرارداد پاس کرادی اور اسے اکادمی کی رکنیت سے علیحدہ کر دیا۔

والٹیر کے لئے حملہ کرنے کو اس سے بہتر اور کون سا موقع مل سکتا تھا۔ دشمن کے محاذ کا سب سے کمزور

لہ برلن اکادمی فرانس کی مشہور پیرس اکادمی کی نقل اور جواب میں فریڈرک نے برلن اکادمی قائم کی تھی۔ برلن اکادمی پر اسے بہت ناز تھا اور اسے اپنے کارناموں میں شمار کیا کرتا تھا۔

مقام اس نے پا لیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اخباروں میں سوئس سائنسداں کی تائید میں ایک گمنام زوردار مضمون نکلا جو اتنا زوردار تھا کہ والٹیر کے علاوہ کوئی لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ماپرٹوی کی تمام شہرت اس مضمون نے خاک میں ملا دی۔ ماپرٹوی کی پشت پر فریڈرک تھا۔ اس پر حملہ گویا فریڈرک پر حملہ تھا۔ ماپرٹوی کو فریڈرک نے سب سے بڑا علمی اعزاز بخشا تھا یعنی اپنی اکادمی کا صدر بنایا تھا۔ اس کی علمیت کی ہنسی اڑائی گئی تھی۔ اس کی ہنسی اڑانا گویا فریڈرک کی ہنسی اڑانا تھی۔ فریڈرک نے خود ماپرٹوی کی طرف سے ایک رسالہ لکھا جس میں اس کی حد سے زیادہ تعریف کی گئی لیکن جب والٹیر مقابلہ پر آتا تھا تو پیچھے ہٹنا نہیں جانتا تھا، بادشاہ کی شرکت نے اس کی ضد کو اور بڑھا دیا۔

شامت اعمال کہ ماپرٹوی نے اس دوران میں ایک اور کتاب لکھ ماری والٹیر نے اس پر ایک مفصل تنقید لکھی جو طنز اور ہجو کا بہترین شاہکار ہے۔ اس تنقید نے گویا ماپرٹوی کی حماقتوں کو لافانی بنا دیا۔ لطف یہ کہ والٹیر اس کتاب کا مسودہ فریڈرک کو دکھا چکا تھا۔ فریڈرک نے اس سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے بعد اس کی اشاعت کو منع کر دیا تھا۔ والٹیر نے فریڈرک کے صریح احکام کے خلاف اس کو شائع کر دیا۔ والٹیر کی ہمت کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ فریڈرک اعظم پروشیا کا خود پرست، خود رائے سخت گیر بادشاہ جس کی مخالفت مول لینے سے یورپ کی پرانی حکومتیں بھی گھبراتی تھیں، والٹیر نے خاص اسی کے احاطہ مملکت میں اس کی نافرمانی کی۔ والٹیر کے پاس سوائے قلم اور دماغ کے کچھ بھی نہ تھا۔ یہ تھی کردار کی وہ قوت جسے فریڈرک اب تک نہ سمجھ سکا تھا۔

کتاب کے سب نسخے فریڈرک کے حکم سے ضائع کر دیے گئے لیکن ہالینڈ کے چھاپہ خانوں سے اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے تھے جو خفیہ طور سے جرمنی میں بکثرت فروخت ہو رہے تھے۔ پورا یورپ آگاہ ہو چکا تھا کہ برلن اکادمی کے صدر کی علمی حیثیت کیا ہے۔ خود صدر اکادمی کو اس کا اتنا صدمہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ فریڈرک نے اظہار غصہ کے لئے کتاب کے سب نسخے جمع کرکے پبلک میں سپرد آتش کرائے والٹیر نے جواب میں شاہی خلعت واپس کر دی جو استعفا دینے کے مترادف تھا۔ لیکن اس کے لئے فریڈرک تیار نہ تھا۔ اس نے مختلف طریقوں سے والٹیر کو روکنا چاہا۔ اسی رد و کد میں تین ماہ گذر گئے۔ لیکن والٹیر کو اندازہ ہو چکا تھا کہ فریڈرک سے اس کا نباہ مشکل ہے۔ مارچ ۱۷۵۳ء میں وہ برلن سے آخری بار رخصت ہو گیا۔

پروشیا سے نکل کر والٹیر نے سوئٹزرلینڈ کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ سوئٹزرلینڈ میں مستقل قیام کا تھا چنانچہ اس نے وہاں پہونچتے ہی اپنے خطوں پر سوفستانی والٹیر لکھنا شروع کر دیا وہ سمجھتا تھا کہ یہاں اس کو وہ آزادی میسر ہو گی جس سے وہ ہر جگہ محروم رہا ہے لیکن اس کی خوش آیند امیدیں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ اس کا ایک ڈراما اسٹیج کیا گیا جسے پادریوں نے بہت ناپسند کیا۔ اس کے بعد والٹیر سے اور دو ایک ایسی فروگذاشتیں ہوئیں کہ اس کی مخالفت برابر بڑھتی رہی۔

والٹیر کی زندگی اب تک انھیں پریشانیوں میں گذری تھی۔ فرانس میں لوئی پانزدہم ہمیشہ اس کے درپے رہتا تھا۔ پروشیا میں وہ فریڈرک سے بگاڑ کر چکا تھا اب سوئٹزرلینڈ میں آیا تو وہاں کے پادری اس سے ناخوش ہو گئے اس مسلسل کشاکش سے بچنے کے لیے اس نے ایک ترکیب سوچی جو واقعی کارگر ثابت ہوئی۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر دو مکان فروخت ہو رہے تھے اس نے دونوں خرید لئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی اب ذرا سے خطرہ پر وہ فرانس سے سوئٹزرلینڈ اور سوئٹزرلینڈ سے فرانس میں پناہ لے سکتا تھا۔

فرنی والٹیر کے آنے سے پہلے ایک غیر آباد مقام تھا اس کے آنے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی وہ ایک آباد، پر رونق شہر میں بدل گیا۔ والٹیر کی عمر اب ساٹھ سال کی تھی۔ اس کی تندرستی ویسی ہی تھی جیسی کہ پیدائش کے وقت تھی یعنی یہ کہ عنقریب مرنے والا معلوم ہوتا تھا لیکن وہ غیر معمولی قوت عمل جو قدرت نے اسے بخشی تھی عمر کے ساتھ زیادہ ہوتی گئی۔ فرنی کو اس کی کوششوں نے بدل کر رکھ دیا۔ اس نے اپنے مکان کے قریب ایک گرجا اور ایک تھیٹر تیار کرایا۔ اس کے علاوہ اور بہت سی عمارتیں تیار کرائیں۔ اس نے پاس کے علاقہ کو کاشت سے سرسبز بنا دیا۔ اس نے جنیوا سے بہت سے گھڑی ساز بلوا کر فرنی میں گھڑی کی صنعت کو فروغ دیا۔ جب وہ کسی دوست کو خط لکھتا تو آخر میں یہ بھی لکھ دیتا کہ یہاں گھڑیاں بہت اچھی بنتی ہیں ایک بار آزما دیکھو۔ فرنی کا نیا جنم والٹیر کی غیر معمولی قوت عمل اور صلاحیت تنظیم کا جیتا جاگتا شاہکار تھا۔

فرنی میں والٹیر نے اپنی زندگی کے آخری بیس سال گذارے۔ تاریخی حیثیت سے یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہے۔ یہیں بیٹھ کر اس نے ذہنی آزادی کی اس تحریک کو چلایا جس کے ساتھ اس کا نام ہمیشہ وابستہ رہے گا یہیں اس نے وہ تصانیف کیں جن پر آج اس کی ادبی شہرت غیر متزلزل کھڑی ہے والٹیر

جب فرنی آیا تھا تو وہ محض اپنے زمانے کا مشہور ترین شخص تھا۔ جب وہ وہاں سے آخری بار رخصت ہوا تو اسے خلعت دوام مل چکی تھی۔

فرنی میں والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما "کینڈڈے" لکھا۔ یہ بلاشبہ اس کی سرتاج تصنیف ہے شیکسپیر کی تمثیلوں کی طرح یہ انسانی فطرت کے ایک پہلو کو پیش کرتا ہے۔ اسی لئے یہ انسانی فطرت کی طرح لافانی ہے فنی اعتبار سے بھی اس کا درجہ بہت بلند ہے۔

فرنی میں والٹیر نے اور بہت سی چھوٹی چھوٹی تصانیف سرانجام دیں جن میں اس کی کہانیوں کو خاص امتیاز حاصل ہے مستقل تصانیف کے علاوہ بہت سے پمفلٹ، بہت سے مضامین اور بے شمار خطوط اس زمانے کی یادگار باقی ہیں۔ والٹیر کا شمار دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے کامیاب صحافت نگاروں میں ہے۔ اس کو فرانس کی رائے عامہ پر غیر معمولی اثر حاصل تھا۔ اسی سبب سے لوئی پانزدہم نے اسے کبھی پیرس نہ آنے دیا۔ شاید یہ اس کے لئے اچھا ہی ہوا۔ والٹیر اگر کہیں پیرس پہونچ جاتا تو وہاں کی حسین سوسائٹی اور دلچسپ صحبتوں میں پھنس کر رہجاتا وہاں کی گرمی محفل کا شکار ہو جاتا اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں اس کی زبان بند ہو جاتی۔ اس کی خوش قسمتی نے پیرس کا دروازہ اس پر بند کر دیا۔ فرنی کے مسلسل قیام نے اس کے نام کو لافانی بنا دیا۔

والٹیر کو فرانس میں جو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اس میں اس کی تصانیف سے زیادہ چند واقعات کا حصہ ہے۔ ان واقعات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اولاً تو ان سے اس دور کے فرانس کی حالت کا صحیح اندازہ ہوگا ثانیاً ان سے والٹیر کے کردار کا ایک اہم پہلو اجاگر ہوتا ہے یعنی اس کی حق پرستی۔

شہر تولوز کے ایک پروٹسٹنٹ تاجر ژان کیلیے کے لڑکے مارک انٹائن نے خودکشی کر لی کسی نے افواہ اڑادی کہ مارک کیتھولک ہونا چاہتا تھا اور اس کے باپ نے تعصب میں اسے مار ڈالا۔ واقعات عدالت تک پہونچے۔ کیلی ستغاثہ کوئی وقیع ثبوت مہیا نہ کر سکے لیکن جج صاحبان کیتھولک تھے اور ملزم پروٹسٹنٹ۔ اٹھارویں صدی کے فرانس میں ایسے ملزم کے خلاف کسی ثبوت کی کیا ضرورت تھی۔ ملزم کے لئے سزائے موت کا حکم ہوگیا۔ ملزم کو پہلے لوہے کی سلاخوں سے مار مار کر لہولہان کیا گیا اس کے بعد تعذیبی پہیے کے ذریعہ اسے آہستہ آہستہ مار ڈالا گیا۔

والٹیر کو جب یہ خبر پہونچی تو وہ طیش میں آگیا۔ اس کے بعد مسلسل چار سال تک وہ ججوں کے فیصلہ پر نظرثانی کرانے

کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے تمام یورپ میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ ہر جگہ اسی کا چرچا تھا حکومت کے سامنے ججوں کے وقار کا سوال تھا لیکن والٹیر کی کوششیں رائیگاں نہ گئیں۔ مرحوم کیلے کی بے گناہی تسلیم کر لی گئی۔ کیلے کے لئے تو یہ اب بیکار تھا لیکن اس واقعہ نے یورپ میں انصاف پرستی کا نیا جذبہ پیدا کر دیا۔

اس قسم کے کئی اور واقعات ہوئے۔ والٹیر نے ہر مرتبہ حکومت اور ججوں کے فیصلہ کے خلاف آواز بلند کی اور ہر بار آخری اپیل میں اس کی آواز سنی گئی۔

آخر عمر میں یورپ کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ میں والٹیر کے رتبہ کو مان لیا گیا تھا۔ وہ گویا یورپ کا ذہنی باپ بن گیا تھا فریڈرک نے پانچ سال کی خموشی کے بعد پھر خط و کتابت شروع کر دی تھی اور دونوں میں پھر وہی پہلے سے مراسم ہو گئے تھے۔ روس کی نامآور ملکہ کیتھرین کو بھی اس سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی اور ان دونوں کے تعلقات آخر تک اچھے رہے

والٹیر کی عمر ۸۳ سال کی تھی کہ وہ دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر فرنی سے پیرس کو روانہ ہوا۔ اس کا سفر ہنگامہ خیز استقبالوں کا ایک سلسلہ تھا۔ لوگ اسے دیکھنے آتے اور خوش ہوتے نوجوان اس کی خدمت کرنا فخر سمجھتے۔ پیرس میں نہایت شاندار استقبال ہوا۔ پورا شہر اسے خوش آمدید کہنے میں شریک تھا جہاں بھی جاتا لوگ اسے دیکھ کر چلاتے والٹیر! والٹیر زندہ باد!! والٹیر نے پیرس پہونچ کر اپنا ایک نیا ڈراما اسٹیج کرایا جسے غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

لیکن پیرس آتے ہی والٹیر کی صحت خراب ہو چلی تھی۔ شاید سفر اور قیام پیرس کے ہنگاموں نے اس کی صحت کو نقصان پہونچایا ہو۔ پیرس آئے ہوئے اسے چند ہفتے ہی ہوئے تھے کہ وہ بخار میں مبتلا ہو گیا اور چند روز بعد انتقال کر گیا۔

نئے یورپ کی تعمیر میں والٹیر کا بہت اہم حصہ ہے۔ روایاتی مذہب اور "نظام قدیم" پر کاری ضربیں لگا کر اس نے انقلاب فرانس کا راستہ صاف کر دیا۔ انقلاب فرانس کا سب سے قوی محرک وہاں کی زبوں حالی نہ تھی بلکہ احساس زیاں تھا اور اسی احساس کو ابھارنے میں والٹیر کا بڑا حصہ ہے۔

والٹیر روایاتی عیسائیت کا سخت ترین دشمن تھا۔ کلیسا کو شاید ہی کبھی اتنے سخت مدمقابل کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ پادری اس کا نام سن کر ایسے گھبراتے تھے۔ جیسے بچے ہوّا کے نام سے ڈرتے ہیں۔ وہ اسے انسانی شیطان تصور کرتے تھے۔ والٹیر نے اپنی طنز اور پھبتی کی تمام قوتیں اس محاذ پر لا کر جمع کر دی تھیں کبھی وہ توریت کی ایک روایت کو دوسری روایت سے ٹکرا کر ان کا بطلان ثابت کرتا کبھی کلیسا کے پوشیدہ گوشوں کو اپنی طنز کی تیز روشنی سے پبلک کے سامنے اجاگر کرتا۔ انقلاب عظیم کے دوران میں کلیسا کے خلاف جس نفرت اور غصہ کا اظہار ہوا تھا وہ ایک بڑی حد تک والٹیر کا ہی ابھارا ہوا تھا۔ اسی

بنا پر اسے "لامذہبیت کا نبی" کا متضاد لقب ملا ہے گو اس کی کلیسا دشمنی کو لامذہبیت کے نام سے یاد کرنا سراسر مبالغہ ہے چنانچہ پیرس کے آخری قیام میں ایک نوزائیدہ بچے کو والٹیر کے پاس دعا کے لئے لایا گیا تو اس نے بچہ کے سر پر ہاتھ رکھکر کہا "خدا اور آزادی"

والٹیر کو بجا طور سے دور جدید کی ذہنی آزادی کے سب سے بڑے پیش رؤوں میں شمار کیا جاتا ہے اس نے فرانس میں ایک نئی سائنٹفک تحریک کا راستہ تیار کیا۔ اس نے ان تمام اداروں کی نہایت سخت نکتہ چینی کی جو آزادی رائے کی راہ میں حائل تھے۔ اس معاملے میں اس کا جذبہ تعصب کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ وہ نئے خیالات کے لئے آزادی اور رواداری مانگتا تھا لیکن پرانے خیالات کے لئے وہ ذراسی رواداری کا بھی حامی نہ تھا۔ وہ خود ان پر بڑی بیرحمی اور سختی سے تنقید کرتا تھا۔ اس کی ذمہ داری کسی قدر والٹیر کی ذاتی سختی طبع تھی لیکن دراصل اس قسم کی کمزوریاں ہر اصلاحی دور کے ابتدائی مراحل میں پائی جاتی ہیں۔ پہلا ردعمل ہمیشہ سخت ہوتا ہے

ادب میں والٹیر کی ایک دو تصانیف ایسی ہیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی اور ان کے علاوہ چند ایسی تصانیف ہیں جو بعض حلقوں میں اب بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں لیکن وہ بہت سے ڈرامے جنھیں پیرس اسٹیج پر دیکھ کر دیوانہ ہو جاتا تھا اب انھیں کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ دراصل والٹیر کی تمام تحریرات صحافتی رنگ لئے ہوئے ہیں اور صحافت اور شہرت دوام کی ہمیشہ سے ان بن رہی ہے۔ صحافت اس شمع کی طرح ہے جس کی روشنی قریب قریب تو خوب تیز ہو لیکن دور پہونچ کر دھندلی پڑجاتی ہو۔ یہی سبب ہے کہ والٹیر کی بے شمار تصانیف میں سے اب صرف گنی چنی کتابیں باقی ہیں باقی سب بھلادی گئیں۔

والٹیر کو کسی بڑے مفکر کا رتبہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کا علم وسیع تھا لیکن گہرا نہ تھا۔ اس نے روسو کی طرح کوئی بنیادی سوال نہیں اٹھایا۔ اس نے جو کچھ کہا وہ اسی عصر کے لئے محدود تھا۔ نہ اس نے ہیوم کی طرح انسانی علم کی بنیاد ڈھونڈنے کی کوشش کی دراصل نہ وہ کسی غیر معمولی فطانت کا مالک تھا اور نہ گہری نظر کا اسی لئے آج اس کے خیالات اور تصانیف کا کوئی اثر باقی نہیں۔ اب اس کی اہمیت زیادہ تر تاریخی ہے۔ اس کا نام اس لئے یاد کیا جاتا ہے کہ اس نے اٹھارویں صدی میں ذہنی بسٹیل کی دیواریں مسمار کرکے ایک نئے دور کی آمد کیلئے راستہ ہموار کردیا تھا۔ اسی لئے ذہنی آزادی اس کے نام سے ہمیشہ کے لئے منسوب ہوگئی ہے آج اس کے نام کیساتھ کوئی سیاسی نظریہ یا اصول فلسفہ یا سائنٹفک انکشاف وابستہ نہیں اور اس کا نام صرف ایک نشان ہو کر رہ گیا ہے۔ آزادی کا نشان! لیکن یہ کیا کوئی معمولی کارنامہ ہے؟

ریاض الاسلام صاحب بی۔ا۔

جان ڈیوی کا نظریہ جمہوریت

جمہوریت کا سب سے پہلا علمبردار افلاطون تھا جس نے نظام حکومت کا ایک ذہنی خاکہ اپنی معرکہ آرا تصنیف "ریاست" میں پیش کیا۔ وہ حکومت کو افراد کی بہبود و فلاح کا ضامن ٹھہراتا ہے اور تعلیم کو حکومت کے اہم ترین فرائض میں شمار کرتا ہے اور ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانتا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افلاطون کی "ریاست" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

"افلاطون سے پہلے بھی عام طور سے یونانیوں میں ریاست کو ایک اخلاقی جمعیت مانا جاتا تھا یعنی ایسی جمعیت جو ایک مشترک متاع روحانی و اخلاقی کی مالک ہو۔ اس لئے ریاست کے فرائض لازمی میں سے یہ تھا کہ وہ اس مشترک متاع روحانی میں اپنے سب ارکین کو حصہ دار بنانے کا اہتمام کرے یعنی اپنے آپ کو ایک تعلیمی ادارہ بنا دے جس میں رہ کر ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو پوری ترقی دے سکے اور اس مشترک متاع روحانی کے ذریعہ دوسرے افراد سے رشتہ اتحاد پیدا کرے۔ اس متاع مشترک سے مراد وہ لکھے اور بے لکھے قوانین تھے جن پر عمل پیرا ہونا جماعت کی فلاح اور حسن اخلاق کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ افلاطون بھی جماعت کے اس تعلیمی مقصد کا قائل ہے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ ریاست میں حکومت کا کام تعلیم ہے اور تعلیم کا کام افراد کو جمعیت کے مقاصد سے آشنا کرنا اور انھیں جسم سیاسی کا صحیح عضو بنانا ہے۔" صفحہ ۱۸۔

افلاطون کی سرکردگی و قیادت میں یورپ کے بڑے بڑے فلاسفر و مفکرین نے قدم اٹھایا جس میں روسو، پسٹالوزی، فروبل اور ڈیوی وغیرہ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ڈیوی بیسویں صدی میں جمہوریت کا سب سے بڑا علمبردار ہے اور اس کے نشہ سے سرشار ہے کہ افراد کو وہ کسی حالت میں جماعت سے جدا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اپنے جدید مضمون تخلیقی جمہوریت (Creative Democracy) میں جو حال ہی میں جریدہ یونٹی (Unity) میں شائع ہوا ہے لکھتا ہے:-

جمہوریت ذاتی زندگی کا طریق عمل ہے جو نہ صرف تمام انسانی فطرت کے عقیدہ کا تابع ہے بلکہ اس کا انحصار اس یقین پر ہے کہ اگر صحیح حالات و ماحول فراہم کر دئیے جائیں تو انسانی قوت مناسب امتیاز اور عمل کر سکے گی مجھ پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ مجھ کو فطانت اور ارتباط تعلیم و فطانت میں وہی یقین ہے لیکن اس عقیدہ و ایمان کے ایجاد کا سہرا میرے سر نہیں ہے میں نے تو اس کو اس ماحول و گرد و پیش سے حاصل کیا ہے جس میں جمہوریت ایک پیکر مجسم اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔ عقیدۂ جمہوریت کیا ہے ؟ اور کس شے کا نام ہے ؟ وہ ذہانت کی اس قوت میں مضمر ہے جس سے ایک معمولی انسان اپنی معمولی عقل اور سوچ بچار سے واقعات و خیالات مروجہ کا جواب دینے پر اعتماد کامل رکھتا ہو۔ اور یہ آزاد تحقیق و تفتیش۔ آزاد آئین مجلس اور آزاد آمد و رفت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے

آج جب ہم بیرونی ممالک کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں جہاں عورتوں اور مردوں کو مخبر اور جاسوس کا خوف ہر وقت دامنگیر رہتا ہے اور جہاں دوستوں سے گفت و شنید بھی باعث خطر ہے اور جہاں اجتماعی حیثیت سے اکٹھا ہونا بھی جرم و تقصیر ہے تو ہم کو اس عقیدہ میں اور زیادہ استحکام اور پختگی ہو جاتی ہے کہ جمہوریت ہی میں آزاد طور پر امیر و غریب، شہری و دیہاتی، جاہل و عالم سب لوگ مکان کے اندر اور باہر گفتگو اور بات چیت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جمہوریت اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتی کہ اس میں تعصب، ترشگوئی ہتک عزت یا ذاتی بدنامی جس سے مذہبی، سیاسی، معاشی اختلاف برپا ہو یا جس سے رنگ، نسل، دولت اور تمدن کا افتراق ہو سراہا جائے۔ وہ ان تمام چیزوں کو بغاوت و سرکشی کے مترادف تصور کرتی ہے حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شے جو آزادیٔ آمد و رفت اور آزادیٔ گفت و شنید کی ترقی میں مانع ہوتی ہے بنی نوع انسان کو تفرقوں، ٹولیوں، فرقوں اور ٹولیوں میں تقسیم کرتی ہے اور متضاد جماعتوں میں تصادم پیدا کرتی ہے زندگی کے جمہوری طور و طریقہ کی عمارت کو متزلزل کرتی ہے۔ شہری و ملکی آزادی مثلاً آزاد خیالی، آزادیٔ رائے، آزادیٔ اجتماع صرف قانونی ضمانت و کفالت سے سود مند نہ ہوگی اگر روزمرہ زندگی یعنی آزادی آمد و رفت، آزادی خط و کتابت، آزادی لین دین، آزادیٔ عمل و تجربات میں باہمی بدگمانی و شبہ، سخت کلامی، خوف اور بغض و عناد سد راہ ہو جائیں یہ تمام چیزیں جمہوری طرز معاشرت کی اہمیت کو برباد کرتی ہیں اور ان کی بربادی و تباہی ظاہری جبر و استبداد سے زیادہ مہلک ثابت ہوتی ہیں اس کا

بین ثبوت اور عملی مثال موجودہ آمری اور استبدادی حکومتوں میں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب افراد کے دماغ میں عناد و بدگمانی اور تعصب گھر کر جاتی ہے تو وہ بہت پرخطر ہو جاتے ہیں۔

جمہوریت بحیثیت زندگی کی راہ و روش و طریق عمل کے ذاتی عقیدہ کی تابع ہے اور روزمرہ کے اشتراک عمل پر مبنی ہے۔ جمہوریت وہ عقیدہ ہے جہاں ہر فرد کے لئے ضروریات اور نتائج و ثمرات جدا جدا ہوتے ہیں اور برادرانہ تعاون اور اشتراک کی عادت خود ہی زندگی کے لئے ایک گراں مایہ اضافہ کرتے ہیں جیسا کہ کھیل کود میں لاگ ڈانٹ اور مقابلہ کا درجہ ہوتا ہے ہر اُس فساد اور جھگڑے کو جو پیدا ہوتے ہیں اور جن کا پیدا ہونا لازمی ہے مباحثہ کا رنگ دیدیا جائے، جہاں ذہانت کا مظاہرہ ہو اور اخوت و برادری جذبہ کارفرما ہو۔ حقیقی جمہوری امن و آشتی کیا ہے؟ کیا وہ ایک فرقہ کا دوسرے فرقہ پر بالجبر دباؤ ڈالنے کا نام ہے؟ کیا وہ دباؤ یا انسداد کسی نہ کسی صورت میں متشددانہ ہے، چاہے وہ بجائے ظاہری قید و بند کے نفسیاتی طور پر یعنی استہزا، مذاق، سخت کلامی اور دھمکی سے ہو؟ نہیں! امن اس ایمان و یقین پر مبنی ہے کہ جس کی رو سے جھگڑے فسادات اور اختلافات کا رد عمل میل جول، بھائی چارہ اور اشتراک عمل سے کیا جائے اور جس میں دونوں فریق ایک دوسرے کو خیالات کے ظاہر کرنے اور عمل کو پیش کرنے کا موقع دے سکیں۔ اختلاف رائے کو اس لئے باہمی اور متحدہ طور پر موقع دینا کہ اظہار رائے اور اظہار اختلاف نہ صرف دوسروں کا حق ہے بلکہ شخصی تجربات زندگی کو وسیع کرنے کا ایک کامیاب ذریعہ و وسیلہ بھی ہے۔ یہی روح جمہوری زندگی کے طریق عمل میں کارفرما ہے اور اس کی جبلت و فطرت ہے۔ وہ اخلاقی نصب العین ہے اور اس کا حصول روزمرہ کی زندگی ہے

جمہوریت ایک عقیدہ ہے انسانی تجربہ کی لیاقت و صلاحیت کا جو مقاصد و ذرائع کی افزائش کرتا ہے۔ اور جس سے جدید تجربے منظم طور پر ترقی کرتے ہیں۔ ہر اخلاقی و معاشری عقیدہ کی تشکیل و تنظیم اس خیال پر مبنی ہے کہ تجربہ کو کسی نہ کسی موقع پر اور کسی نہ کسی صوری و ظاہری چیز کا یا کسی حاکم کا جو احاطہ تجربہ سے باہر ہو تابع ہونا چاہیئے۔ جمہوریت وہ ایمان ہے جس کی رو سے تجربہ کا عمل بہ نسبت کسی نتیجہ کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے تاکہ مخصوص نتائج جو حاصل ہوتے ہیں اعلیٰ اقدار کے ہوں اور ان سے متحرک عمل کی تشکیل و تعمیر ہو۔ چونکہ یہ عمل تعلیمی ہے اس لیے جمہوریت میں عقیدہ رکھنا تجربہ اور تعلیم کے فوائد کے مترادف ہے۔ تمام نتائج و اقدار جو حرکت و ترقی کرنے

والے ہیں مستحکم و پائدار ہو جاتے ہیں اور حاصل شدہ چیزیں میں استحکام پیدا کرنے کی جدو جہد کرتے ہیں اور نئے اور بہتر تجربات ان کی رہبری کرتے ہیں اگر کوئی شخص اس سلسلہ میں دریافت کرے کہ تجربہ کیا ہے تو میں یہ جواب دونگا کہ انسانی افراد اور گرد و پیش کے حالات کے تفاعل کا نام ہے۔ ماحول انسانی ہونا چاہئے جو ضروریات و خواہشات کی تکمیل کرے اور اطمینان و تسکین بخشے اور جو ہماری معلومات میں اضافہ کرے۔ مروجہ حالات کا علم آمد و رفت اور اشتراک عمل کی بنا ہے۔ علاوہ ازیں آمد و رفت سے مرد چند لوگوں کا دوسروں کی ذاتی رائے کی غلامی اور پیروی ہے۔ احتیاج ضرورت اور خواہش ہمت و قوت کی افزائش کرتی ہے یہ دائرہ ہستی سے ارفع و بلند تر ہے اور اسی وجہ سے علم و سائنس کے دائرہ عمل سے باہر ہے۔

جمہوریت کا اگر زندگی کے دیگر طریق عمل سے مقابلہ کیا جائے تو وہ معیشت و زیست کا واحد طریقہ ہے جو تجربہ کے عمل پر کامل یقین رکھتا ہے اور وہ خود ہی راہ خود ہی منزل، آپ ہی ابتداء اور آپ ہی انتہا ہے اور جو سائنس کی افزائش و ترقی کے قابل و لائق ہے اور جس کا حقیقی انحصار مزید تجربہ کی رہنمائی کرنے پر ہے اور جو جذبات، حاجات و خواہشات کو آزاد کرتا ہے اور ایسی چیزیں مہیا کرتا ہے جس کا ماضی میں وجود تک نہیں ہوتا کیونکہ زندگی کی ہر راہ جو جمہوریت کے معیار تک نہیں آتی اتصال مبادلہ، آمد و رفت اور تفاعل کو جن سے استقلال، استحکام و پائداری ہوتی ہے محدود کرتی ہے۔ آزادی و تونگری کا کام ایسا ہے جس کا روزانہ انجام دینا لازمی ہے۔ چونکہ وہ لامتناہی ہے اور اس کا منتہائے مقصود تجربہ کی اکملیت و انتہا ہے۔ اس لئے جمہوریت کا ہمیشہ یہ فرض ہے کہ وہ زیادہ آزاد اور بہتر انسانی تجربہ کی تخلیق کرے جس میں ہر شخص کو باہم حصہ ملے اور ہر شخص معین و شریک ہو۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی

بھید

(ترجمہ "کینڈڈا" مصنفہ برنارڈ شا)

("کینڈڈا" برنارڈ شا کے مشہور ترین ڈراموں میں سے ہے۔ اس کا نام بھید اس لئے ترجمہ کیا گیا ہے کہ اگر "کینڈڈا" کا کوئی دوسرا نام ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔ یہ ڈرامہ برنارڈ شا کے اشتراکی عقائد کے زمانے کی چیز ہے۔ اس میں ازدواجی زندگی پر اشتراکی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے ضمناً یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مذہبی پادری بھی اشتراکی خیالات کو کس طرح اور کس حد تک قبول کر سکتے ہیں) (مترجم)

افراد ڈرامہ

جیمس میور ماریل	ایک پادری	مخفف نام ج
یوجین مارچ بینکس	ایک لڑکا	" ی م
کینڈڈا	پادری کی بیوی	" ک
برگیس	پادری کا خسر	" ب
مس گارنٹ پرازر پائن	ٹائپسٹ	" پ
الیگزنڈر لیکسی مِل	پادری کا معین	" ل

پہلا ایکٹ

لندن کا شمالی مشرقی حصہ، اکتوبر ۱۸۹۴ء کی ایک صبح — ایک نہایت وسیع محلہ۔ اوسط طبقہ کے لوگوں کی آبادی سڑکیں خوب کشادہ، آبادی خوب گنجان۔ جگہ جگہ وہی پرانے پیشاب خانے۔ جا بجا کلب۔ سڑکوں پر ٹرام کے زرد زرد ڈبے۔ برابر دوڑتے پھرتے ہوئے سڑکوں کے کنارے مکانات، ان کے آگے چھوٹے چھوٹے باغیچے اور ان میں سبزہ نہایت تروتازہ اور صاف بیچ میں ایک پگڈنڈی جو لوگوں کی آمدورفت کی وجہ سے گھر کی چوکھٹ سے لے کر پھاٹک تک بن ہی جاتی ہے۔ سڑکوں پر ایک ہی طرز کے سینکڑوں

مکانات، بھدے بھدے سنگین اور ان کے سامنے سیاہ چہار دیواریاں، ہر جگہ وہی پتھریلے صحن، سلیٹ کی چھتیں۔ لوگ نہایت اچھی خاصی طرح (یا نہایت بری طرح) خراب لباسوں میں ملبوس نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ چپے چپے سے واقف، انتہائی غور و فکر میں ڈوبی ہوئی شکلیں لیکن اپنے متعلق کم، دوسروں کے متعلق زیادہ۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے گویا کسی خاص کاروباری پہلو پر عمیق نظر ہے کبھی کبھی پولیس کی وردیاں یا کلیسائی پادریوں کی شکلیں بھی نظر آتی ہیں۔ آج سورج خوب چمک رہا ہے کہرہ بھی نہیں ہے اور وہ دھواں بھی جو کسی کو چمکنے نہیں دیتا (خواہ چونے گارے کا کام ہو یا کسی کا صاف چہرہ) آج اس قدر تکلیف دہ نہیں ہے۔

لیکن یہ غیر دلچسپ یکرنگ ریگستان اپنے میں ایک نخلستان بھی چھپائے ہوئے ہے۔ ہیکنی روڈ کی دوسری جانب، ۲۱۷ ایکڑ کا ایک کشادہ میدان ہے جس کے چاروں طرف سینچے لگے ہوئے ہیں۔ لوہے کے نہیں بلکہ لکڑی کے، اندر گھاس بکثرت ہے۔ درخت بھی بہت ہیں۔ نہانے والوں کے لئے ایک جھیل بھی بنا دی گئی ہے۔ چمن کی آرائش لندن کے بہترین مالیوں کے ہاتھ میں ہے۔ بچوں کے کھیلنے کے لئے ریت کا ایک تودہ بھی ایک جگہ سمندر کے کنارے سے لایا گیا ہے لیکن اب مختلف محلوں کا کوڑا خانہ ہو جانے کی بدولت مستعفی کر دیا گیا ہے۔ ایک چبوترہ بینڈ باجہ والوں کے لئے، ایک سیدھا سادا پلیٹ فارم مذہبی یا لامذہبی یا سیاسی مقررین کی مشق فصاحت کے لئے کرکٹ کھیلنے والوں کی بھی ایک طرف چھوٹی سی زمین ہے کسرت اور جمنا سکٹ کرنے والوں کا گوشہ الگ ہے۔ پتھر کی ایک پرانے قسم کی چھوٹی سی بارہ دری بھی بنی ہوئی ہے۔ غرضکہ یہ سب چیزیں اس پارک کی خاص زیبائشوں میں سے ہیں۔ جہاں کہیں درختوں کا سایہ زیادہ ہے گھاس خوب پھیلی ہوئی ہے۔ وہ نہایت دلچسپ مقامات ہیں برخلاف اس کے جہاں کہیں زمین چٹیل چلی گئی ہے یا کائی خوردہ ہے یا جہاں چمنیاں اور دھواں ہے وہاں سناٹا ہے اور ویرانی۔

لیکن وکٹوریہ پارک کا بہترین منظر سینٹ ڈومنی کے گھر کی کھڑکی سے ہے کیونکہ وہاں سے چمنیاں یا مکانات وغیرہ نظر نہیں آتے۔ بس پارک ہی پارک اور اس کی دلفریبیاں صرف دکھلائی پڑتی ہیں۔ پادری کا یہ مکان پارک سے بس ذرا سے فاصلہ پر بنا ہے۔ سامنے ایک غلام گردش ہے اور اس کے

آگے ایک باغیچہ۔ ملاقاتی اور کاروباری لوگ نیز گھر کے افراد اس دروازہ پر ہو کر جاتے ہیں جو ناشتہ کے کمرے سے الیکن جہاں سب ہی کھانے کھائے جاتے ہیں، ملا ہوا ہے۔ باورچی خانہ پشت پر ہے۔ زینہ چڑھ کر یعنی نیچے کے ہال کی چھت پر ڈرائنگ روم ہے۔ سامنے ایک بڑی سی کھڑکی ہے جس میں سے پارک بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اس کمرے میں جو لڑکوں بچوں کی چپقلش یا کھانوں کے رکھ رکھاؤ سے بچا ہوا ہے پادری جیمس میوماریل اپنا کام کیا کرتا ہو کھڑکی کے سامنے ایک بہت بڑی اور لمبی میز کے اختتام پر ایک بہت بڑی گھومنے والی کرسی پر پادری بیٹھا ہوا ہے۔ بائیں طرف سے پارک کا منظر بالکل صاف نظر آتا ہے۔ میز کے دوسرے کنارے پر اور اسی سے بالکل ملی ہوئی اس سے تقریباً نصف لمبی چوڑی ایک اور میز بچھی ہوئی ہے جس پر ٹائپ رائٹر رکھا ہوا ہے۔ ٹائپسٹ اپنی کرسی پر جمی ہوئی بیٹھی ہے۔ کھڑکی کی طرف پیٹھ کئے ہوئے بڑی میز پر مختلف قسم کے رسالے، اخبار اور خطوط بکھرے ہوئے ہیں۔ ایک آفس ڈائری بھی دھری ہوئی ہے اور خطوط تولنے کی مشین وغیرہ وغیرہ۔ بیچ میں ایک کرسی ان لوگوں کے لئے پڑی ہوئی ہے جو پادری کے پاس کسی ضرورت سے ملنے آئیں۔ پادری کے دائیں جانب اور اس کی دسترس پر ایک چھوٹا سا اسٹیشنری کیس رکھا ہوا ہے اور ایک فریم کی ہوئی تصویر۔ پیچھے دیوار میں الماریاں لگی ہوئی ہیں جن میں کتابیں باقاعدہ جمی ہوئی ہیں۔ پادری کے مذاق کا پتہ اس کے کتابوں کے انتخاب سے چل سکتا ہے۔ ایک طرف تو مائیا کے مضامین ہیں مذہبی، دوسری طرف براؤننگ کی نظموں کا مکمل سٹ۔ مذاق سیاسی کے اندازہ کے لئے زرد رنگ کی "ترقی و افلاس" کی ایک جلد، مضامین فرقہ فیبانی "خواب جان بال" اور کارل مارکس کی "سرمایہ" نامی کتابیں ہیں۔ کمرے کے دوسری جانب بالکل سامنے ٹائپ رائٹر کے قریب دروازہ ہے۔ آتشدان کے پاس ایک کونے پر ایک کتابدان رکھا ہوا ہے۔ قریب ہی ایک صوفہ بچھا ہے۔ آتشدان میں آگ نہایت فیاضی سے جل رہی ہے اور اس کے ایک طرف تو ایک آرام کرسی پڑی ہوئی ہے اور ایک سیاہ کوئلہ دان جس پر جاپانی پھول بنے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف بچوں کے لئے ایک چھوٹی کرسی پڑی ہے۔ آتشدان کی کانس وارنش شدہ لکڑی کی ہے جس میں بہت خوبصورت چھوٹے چھوٹے چوکھٹے بنے ہیں اور ان میں چھوٹے چھوٹے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ ایک سفری گھڑی بھی چمڑے کے

کیس میں رکھی ہوئی ہے۔ دیوار پر...... اوپر ایک بڑی تصویر مشہور مصور طیلیان کی بنائی ہوئی۔ تصویر مریمؑ ہے۔ نہایت جاذب نظر ہے غرضکہ تمام کمرے کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کمرہ کسی سلیقہ مند نگراں کے تحت میں ہے۔ حالانکہ جہاں تک میز کا تعلق ہے وہاں تو کسی غیر موزوں شخصیت سے شکست کھا گیا ہو ورنہ باقی باتوں میں کمرہ تمامتر آئینہ ہے۔ فرنیچر اور اسکی آرائش کا جہاں تک تعلق ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قریب ہی کے معمولی فرنیچر کو خرید لیا گیا ہے لیکن کمرے میں کوئی چیز بیکار یا دکھاوے کے طور پر نہیں ہے کیونکہ پادریوں کے گھر میں اور خصوصاً وہ بھی مشرقی حصۂ شہر کے باشندوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں کہ اسے نمائشی تکلف میں صرف کیا جائے۔

جیمس میو مارل ایک اشتراکی عیسائی ہے جو کلیسائے انگلستان سے تعلق رکھتا ہے۔ اور انجمن سینٹ میتھو کا ایک نہایت سرگرم رکن اور ساتھ ہی ساتھ اشتراکی یونین کا ایک سرگرم ممبر بھی ہے۔ چالیس سال کی عمر مضبوط، نہایت توانا، وجیہہ چست، خوش مزاج، پرتکلف، نیز نہایت صاف دل، صاف باطن، نہایت مستحکم و مضبوط جسم، پاک و صاف لہجہ جس کے ذریعہ وہ جلسوں میں نہایت پراثر اور پرزور طریقہ پر اثر ڈالتا ہے۔ قوت اظہار اور وسعت افکار پر قابو۔ غرضکہ نہایت ہی اعلیٰ درجہ کا پادری ہے۔ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے اور جس کسی سے کہنا چاہتا ہے نہایت آسانی سے کہہ لیتا اور سمجھا لیتا ہے غلطیوں پر بیدھڑک ٹوک دیتا ہے اور کبھی کوئی ناراض نہیں ہوتا۔ اور اکثر تو دوسروں کے معاملات میں جا الجھتا ہے لیکن کوئی برا نہیں مانتا۔ اس کا جوش اور جذبہ ہمدردی کبھی اس سے جدا نہیں ہوتے۔ اس عمر میں بھی وہ خوب کھانے کھاتا ہے اور بڑے اطمینان سے سوتا ہے تاکہ دوسرے دن کے لئے جتنی کسل ہوگئی ہے نکل جائے اور وہ اپنے دن بھر کے کام کو ختم کرنے کے لئے پھر تیار ہو جائے۔ پھر بھی وہ ایک بڑا گلگو تھنا بچہ کہا جا سکتا ہے جو لائق معافی طور پر اپنے کمالات پر نازاں ہے اور نادانستہ طور پر اپنے سے خوش ہے۔ چہرہ نہایت بشاش، کشادہ پیشانی، بھویں کچھ چھوٹی، آنکھیں روشن اور مشتاق، بھدی سی ناک اور منھ مستحکم لیکن اسکی کاٹ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔ اور خوب پھولے ہوئے نتھنے۔ جو ایک ڈرامائی خطیب کے لئے کافی موزوں ہیں لیکن جن کو اس کے جسم پر کسی طور پر سبک نہیں کہا جا سکتا۔

ٹائپسٹ مس پرازر پائین گارنیٹ ایک نہایت تیز مگر مختصر قسم کی عورت ہے عمر تقریباً ئیس سال معمولی اوسط درجہ کی ہے لباس معمولی لیکن صاف۔ سیاہ مرینے کی قمیص اور بلاوز، نہایت منہ چڑھی، زبان کی تیز، اخلاقاً زیادہ خلیق نہیں لیکن نہایت حساس اور بہت خیر خواہ۔ وہ اپنی مشین پر نہایت اطمینان سے بیٹھی کھٹ پٹ کر رہی ہے۔ موریل اپنی صبح کی ڈاک کا بنڈل کھولتا ہے اور ان کے مضامین کا مفہوم سمجھ کر ایک نہایت مایوسانہ سانس بھرتا ہے لیکن اس انداز سے کہ دیکھ کر ہنسی آجائے)

پرازر پائن۔ کیوں کیا کوئی اور لیکچر؟

ماریل۔ ہاکسٹن فرقہ آزادی والے چاہتے ہیں کہ اتوار کی صبح کو ان کے ہاں لیکچر دوں (لفظ اتوار کو خاص طور پر زور دے کر کہتا ہے، کیونکہ یہ شرط ذرا ٹیڑھی ہے)

پ۔ یہ کون لوگ ہیں؟ جہاں تک میرا خیال ہے یہ لوگ اشتمالی نراجی ہوں گے۔

م۔ بالکل نراجی، کہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اتوار کو بھلا ایک پادری کیسے آسکتا ہے۔ ان کو لکھ دو کہ اگر وہ میرا وعظ ہی سننا چاہتے ہیں تو بہتر ہے میرے گرجے میں آجائیں۔ یہی ان کے لئے مناسب بھی ہوگا ان کو لکھ دو کہ میں محض دوشنبہ اور جمعرات ہی کو آسکتا ہوں۔ کیا تمہارے پاس وہاں ڈائری ہے؟

پ۔ جی ہاں (ڈائری کو اٹھاتے ہوئے)

م۔ ذرا دیکھنا مجھے آئندہ دوشنبہ کو کہیں لیکچر دینے جانا تو نہیں ہے؟

پ۔ (ڈائری دیکھتے ہوئے) ہاں ٹاور ہیملٹس ریڈیکل کلب میں۔

م۔ اچھا جمعرات کو؟

پ۔ انگلش لینڈ رسٹوریشن لیگ۔

م۔ اس کے بعد اور؟

پ۔ انجمن سینٹ میتھو دوشنبہ کو، آزاد مزدور پارٹی، گرینوچ شاخ جمعرات کو، سماجی ڈیموکرات فیڈریشن مائیل اینڈ شاخ دوشنبہ کو، پہلا کنفرمیشن کلاس جمعرات کو (تنگ آکر) میرے خیال میں بہتر یہی ہے میں ان کو لکھ دوں کہ آپ تشریف نہیں لاسکتے۔ ایک آدھے درجن تو آدمی ہیں۔ جاہل مغرور ٹچے پانچ ٹکے تو ان کے

پاس نکلیں گے نہیں۔

م۔ ارے ایسا نہ کہو وہ سب ہمارے نہایت عزیز رشتہ دار ہیں۔

پ۔ (حیرت سے منہ تکتے ہوئے) آپ کے رشتہ دار؟

م۔ ہاں ہم سب کا باپ وہی ایک ہے آسمانوں والا۔

پ۔ (مطمئن ہو کر) بس یہی رشتہ داری ہے نا؟

م۔ (ذرا اداسی کے ساتھ لیکن جو مایہ لطف ہے ایک ایسے شخص کے لئے جو اس کو نہایت خوبصورتی سے ادا کر سکتا ہے) افسوس تم اسے یقین نہیں مانتیں ہر ایک یہی کہتا ہے کوئی اس میں یقین نہیں کرتا۔ کوئی بھی نہیں (تیزی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے) اچھا خیر مس پرآزر یا ئن جلد ان لوگوں کے لئے کوئی تاریخ مقرر کر دو پچھپیں کیسی رہے گی؟ پرسوں تو خالی تھی۔

پ۔ (ڈائری دیکھتے ہوئے) خالی نہیں ہے۔ فیبیان سوسائٹی۔

م۔ ہٹاؤ بھی فیبیان سوسائٹی! اٹھائیسویں؟

پ۔ شہر میں ڈنر کو جانا ہے۔ فاؤنڈرس کمپنی نے مدعو کیا ہے۔

م۔ ٹھیک ہے بس؛ اس کے بجائے میں پاکسٹن فرقہ آزادی کو جاؤں گا (وہ خاموشی سے اس تاریخ کو درج کر لیتی ہے لیکن چہرہ سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ پاکسٹن نراجیوں کو ذلیل سمجھ رہی ہے۔ مارل ایک رسالہ اصلاح کلیسا نامی کو جو ابھی ڈاک سے آیا ہے اٹھاتا ہے اور مسٹر اسٹوارٹ میڈلام کے اڈیٹوریل اور انجمن سینٹ میتھو کی خبروں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اتنے میں اس کے ماتحت ایگزینڈر ملی کی صورت دکھائی دیتی ہے اور یہ خشک مشغولیت بامزہ ہو جاتی ہے۔ ملی ایک نوجوان آدمی ہے جس کو مارل نے وہیں لندن یونیورسٹی سے حاصل کر لیا ہے وہ آکسفورڈ کا باشندہ ہے اور مشرقی لندن کو اپنی تعلیمات سے فائدہ پہونچانے آیا تھا کہ مارل نے اس کی خدمات حاصل کر لیں نہایت بانمکین لیکن نیک اور پرجوش حالانکہ اپنے کام میں ہنوز ناپختہ۔ بولتا ذرا ہونٹوں کو دبا کے ہے۔ محض اس لئے کہ الفاظ ذرا خاص یونیورسٹی کے پاکیزہ لبوں میں نکلیں ایک قسم کی شان کے ساتھ جس کو وہ صفائی کہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طرح لندن کے غیر تعلیم یافتہ لوگوں کا مذاق پاک وصاف ہو جائے گا۔ مارل اجس کو اس نے سگ نما وفاداری محبت

سے خوب رام کرلیا ہے (اصلاح کلیسا سے نظر اٹھا کر اس کی طرف نہایت تلطف سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے)

م۔ کہو لیکسی آج پھر دیر!

ل۔ غالباً! کیا کروں، چاہتا تو بہت ہوں لیکن سویرے آنکھ ہی نہیں کھلتی۔

م۔ (اپنی سحر خیزی پر نازاں ہوکر) خوب! خوب!! (دمن میں) شب بیداری کیا کرو، نمازیں پڑھا کرو، لیکسی نمازیں پڑھا کرو

ل۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے (ایک مناسب جواب سوچ کر) لیکن میں کیسے شب بیداری کر سکتا ہوں یا نمازیں پڑھ سکتا ہوں جبکہ میں سوتا ہی رہتا ہوں۔ کیوں مس پرازی؟ (آتشدان کی طرف جاتا ہے)

پ۔ مہربانی سے مجھے مس گارنٹ کہا کیجئے۔

ل۔ معاف کیجئے گا مس گارنٹ۔

پ۔ آج آپ کو تمام دن کام کرنا ہوگا۔

ل۔ (آتشدان کے پاس سے) کیوں؟

پ۔ کیوں دیوں جانے دیجئے کھانا کھانے سے پہلے بہتر یہ ہے کہ کھانا کھایا جائے جیسا کہ میں کرتی ہوں آیئے کاہلی نہ فرمایئے آپ کو اپنے گشتی کام پر جانے میں آدھ گھنٹہ کی دیر ہو چکی ہے۔

ل۔ (پریشان ہوکر) کیا یہ صحیح کہہ رہی ہے مسٹر ماریل؟

م۔ (خود کو نہایت ارفع محسوس کرتے ہوئے آنکھیں جھپکتی ہوئیں) ہاں اس لئے کہ آج میں کاہلی کرنے جا رہا ہوں۔

ل۔ آپ! لیکن آپ تو یہ جانتے ہی نہ تھے

م۔ (اٹھتے ہوئے) ہا! ہا! خوب! میں جانتا ہی نہیں؟ آج اِس صبح کو میں اپنی صبح بنانا چاہتا ہوں یعنی میری بیوی آج واپس آ رہی ہے۔ وہ یہاں ٹھیک پونے بارہ بجے پہونچ جائے گی۔

ل۔ (متعجب ہوکر) واپس آ رہی ہیں! بچوں سمیت؟ میرا خیال تھا کہ وہ سب کم از کم ایک مہینہ بعد آئیں گے۔

م۔ ہاں یہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ اکیلی صرف دو دن کے لئے آ رہی ہے جیمی کے لئے کچھ فالالین کی چیزیں لینا ہیں اور یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم لوگ اس کے بغیر گھر کا کام کس طرح چلا رہے ہیں۔

ل۔ (پریشانی سے) لیکن مسٹر ماریل جیمی اور فلفی کو تو سرخ بخار آیا تھا میرے خیال میں یہ مناسب نہیں ہے کہ ـــ

م۔ سرخ بخار، ہش! محض خسرہ تھا بلکہ وہ تو میں خود پائی کرافٹ اسکول سے لایا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ ایک پادری ایک ڈاکٹر کی طرح ہوتا ہے۔ وہ متعدی امراض کا مقابلہ اسی طرح کرتا ہے جس طرح ایک سپاہی گولیوں کا (لیکسی کی پیٹھ نہایت پدرانہ شفقت کے ساتھ تھپتھپاتا ہے) اگر تم میں کچھ ہمت ہے تو ذرا خسرہ کہیں سے لگا لاؤ۔ میری بیوی تمہاری تیمارداری کرے گی اور یہ موقع تمہارے لئے کیا نایاب ہوگا! کیوں نا؟

ل۔ دبے ہوئے مسکراہٹ کے ساتھ) مسز ماریل کے متعلق آپ کی باتیں کچھ سمجھ میں نہیں آتیں۔

م۔ میرے بچے شادی کر شادی! (محبت سے) پہلے ایک کسی نیک عورت سے شادی کر لو تب تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ وہ آسمانی حکومت جو ہم زمین پر قائم کرنا چاہتے ہیں ایسی شادی اس جنت ارضی کا تمہیں قبل از وقت لطف بخش دے گی اور تمہاری کاہلی بھی اس سے قطعی دور ہو جائے گی۔ ہر سمجھدار آدمی جو خود سے مطمئن اور اپنی حالت سے خوش ہے اس کو ہر گھنٹہ کی زکوٰۃ ایسا کام کرکے دینا چاہئے جس سے دوسرے خوش ہو سکیں۔ ہم کو کوئی حق نہیں ہے کہ ہم اس کا مصرف تو کریں لیکن اسے پیدا نہ کریں۔ بالکل اسی طرح کہ ہم روپیہ خرچ تو کریں لیکن کمائیں نہیں۔ ایک بیوی تلاش کرو بالکل میری کینڈڈا کی سی، اور تم خوشیوں کی زکوٰۃ کبھی پوری نہ ادا کر پاؤ گے (لیکسی کو نہایت محبت سے تھپتھپاتا ہے اور باہر جانے کا ارادہ کرتا ہے)

ل۔ ذرا ٹھہرئیے! میں بالکل بھول گیا (ماریل۔ کتا ہے اور دروازہ کا دستہ پکڑتے ہوئے اس کی طرف مڑتا ہے) آپ کے نسبتی خسر صاحب آپ سے ملنے تشریف لا رہے ہیں۔ (ماریل متعجب ہوتا ہے اور کچھ خوشی کا اظہار نہ کرتے ہوئے دروازہ کو پھر بند کر دیتا ہے اور لہجہ میں ذرا تبدیلی آجاتی ہے)

م۔ مسٹر برگیس؟

ل۔ جی ہاں مجھے وہ پارک میں ملے تھے کسی سے مباحثہ میں مصروف تھے۔ مجھ سے کہہ دیا کہ میں آپ سے ان کی آمد کے متعلق عرض کر دوں۔

م۔ (نیم اعتباری سے) لیکن وہ تو یہاں تین سال سے نہیں آئے لیکسی کیا تمہیں بالکل یقین ہے۔ مذاق تو نہیں کر رہے ہو لیکسی؟

ل۔ (نہایت صاف دلی سے) نہیں صاحب۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔

م (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں! خیر ابھی وقت ہے کہ وہ کینڈڈا کو کچھ دن اور دیکھ لے. ورنہ بعد میں وہ شاید اُس کی سمجھ سے باہر ہو جائے (آنے والی آفت پر صبر کر لیتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

(لیکسی اس کی طرف نہایت ہی عقیدتمندانہ نظروں سے دیکھتا رہتا ہے: مس گارنٹ چونکہ لیکسی کو بات چیت میں شکست نہ دے سکی تھی اسے جھنجلاہٹ ٹائپ رائٹر پہ برابر اتار رہی تھی

ل۔ کس قدر عمدہ آدمی ہے! کتنی محبت والا! (وہ مارِل کی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور نہایت اطمینان سے سگریٹ پینے لگتا ہے)

پ۔ (نہایت گھبراہٹ سے اس خط کو نکالتے ہوئے جس کو کہ وہ ٹائپ کر رہی تھی اور پھر موڑتے ہوئے) ہُوں ہر شخص کو ایسا نہ چاہئے کہ اپنی بیوی سے محبت تو رکھے لیکن ہر جگہ خواہ مخواہ اس کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرے۔

ل۔ چونک کر) آئیں! مس پرازی!

پ۔ (اسٹیشنری کیس میں سے ایک لفافہ نکالتی ہے اور اس میں خط رکھتے ہوئے) یہاں کینڈڈا! وہاں کینڈڈا! ہر جگہ کینڈڈا ہی کینڈڈا (لفافہ کے گوند کو ہونٹوں سے تر کرتی ہے) آخر کوئی حد بھی ہے. آدمی سنتے سنتے بوکھلا جائے۔ (لفافہ کے پرت کو زور سے جاتے ہوئے کہ خوب جم کر چپک جائے) آخر یہ کونسی بات ہے کہ ایک عورت کی اس قدر تعریفیں کی جائیں، اور پھر وہ بھی کوئی خاص بات بھی تو ہو. سوائے اس کے کہ ذرا بال اچھے ہیں اور صورت شکل کسی قدر غنیمت ہے۔

ل۔ (مجروح ہو کر سنجیدگی سے) مس گارنٹ میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ نہایت خوبصورت ہے (وہ اس کی تصویر اٹھا لیتا ہے، اس کو دیکھنے لگتا ہے اور پھر اور بھی یقین کے ساتھ کہتا ہے) نہایت ہی خوبصورت آنکھیں کس قدر عمدہ ہیں!

پ۔ آنکھیں! اس کی آنکھیں قطعی میری آنکھوں سے بہتر نہیں ہیں۔ (وہ تصویر نیچے رکھ دیتا ہے اور نہایت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) لیکن تم تو مجھے یہی سمجھتے ہو گے کہ غریب ہے بھدی ہے محض دوسرے درجہ کی۔

ل۔ (اپنی جگہ سے نہایت آن سے اٹھتے ہوئے) خدا نہ کرے کہ میں خدا کی کسی مخلوق کے متعلق ایسا خیال رکھوں۔ (وہ نہایت اطمینان سے اٹھ کر کتابوں کے کیس کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے)

پ۔ شکریہ، آپ کا یہ جملہ نہایت عمدہ ہے اور بہت تسکین دہ۔

ل۔ (اس کی کم ظرفی سے رنجیدہ ہو کر) مجھے اس امر سے قطعی ناواقفیت تھی کہ آپ کو مسز مارپل سے کوئی خاص شکایت ہے

پ۔ (خفا ہو کر) مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں ہے، وہ نہایت ہی عمدہ عورت ہے۔ نہایت نیک۔ نہایت شریف مجھے اس سے بے حد محبت ہے بلکہ میں اس کی جتنی قدر کر سکتی ہوں اور کرتی ہوں اتنی کوئی مرد نہیں کر سکتا (وہ اپنا سر افسردگی سے ہلاتا ہے وہ اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اس کے پاس نہایت طنطناتی ہوئی آتی ہے) تم میری بات کا یقین نہیں کرتے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں حاسد ہوں؟ مسٹر لیکسی تم تو انسانی فطرت کے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہو، تم کو جیسے عورت کی کمزوریاں خوب معلوم ہی تو ہیں! مرد ہونا بھی کس قدر دلچسپ ہوتا ہوگا کہ ایسی دور رس عمیق نگاہیں رکھے، نہ کہ ہم لوگوں کی طرح جو محض جذبات ہیں اور پھر کس قدر آسانی سے فرض کر لیتے ہو کہ چونکہ ہم تم لوگوں کی طرح رومانی مغالطے میں نہیں پھنستے۔ اس کا سبب محض حسد ہوگا (اسے پھر گردن ہلاتی ہوئی آتشدان کے پاس جا کر ناچنے لگتی ہے، گویا کہ پالا مار لیا)

ل۔ مس پرازی اگر اسی قدر علم تم کو مرد کی طاقت کا ہوتا جیسا کہ اس کی کمزوریوں کا ہے تو پھر مسئلہ نسواں اٹھتا ہی نہیں۔

پ۔ (ہاتھ سینکتے ہوئے گردن گھما کر) تم نے مارپل کا یہ کہنا کہاں سے سنا؟ یہ خود تمہارا جملہ ہرگز نہیں ہے۔ تم اتنے سمجھدار نہیں ہو کہ ایسا جملہ سوچ سکو۔

ل۔ ہاں! یہ بالکل ٹھیک ہے اور مجھے قطعی اعتراف ہے کہ اکثر حقائق مجھے اس سے حاصل ہوئے ہیں۔ ہاں اس نے یہ جملہ آزادی نسواں فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس کے موقعہ پر کہا تھا۔ ایک بات کہئے تو اور بتا دوں، وہ یہ کہ اس جملہ کو وہاں کسی نے پسند نہ کیا تھا سوائے ایک مرد کے یعنی میں نے (کتابوں کے کیس کی طرف پھر مڑ جاتا ہے یہ خیال کر کے کہ بس اب اس نے اس کو کچل ہی ڈالا ایسی شکست دیدی ہے کہ اب کیا منہ کھولے گی)

پ۔ (مینٹل پر جو آئینہ رکھا تھا اس میں اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے) خیر، لیکن جب کبھی آپ مجھ سے باتیں کیجئے تو بہتر یہ ہے کہ اپنے ہی خیالات کا اظہار کیا کیجئے جیسے کچھ ہوں نہ کہ دوسروں کے۔ جب تم مارپل کی نقل پر آ جاتے ہو تو تم پر ذرا بھی نہیں کھپتا۔

ل۔ (چڑ کر) میں اس کے نقش قدم پر ضرور چلنے کی کوشش کروں گا حالانکہ اس کی نقل بالکل نہیں کرتا۔

پ۔ (پھر اس کے پاس سے گذر کر اپنے کام پر جاتے ہوئے) نہیں، تم نقل ضرور کرتے ہو قطعی کرتے ہو! تم اپنی چھتری کیوں ان کی طرح اپنی بائیں بغل میں دبا لیتے ہو اور جس طرح اور لوگ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں کیوں اسی طرح نہیں لیجاتے! تم اپنی ٹھوڑی اٹھا کر کیوں چلتے ہو۔ اور آنکھوں میں وہی ترحم کی نظریں کیوں ظاہر کرتے ہو۔ تم جو کہ کبھی سویرے ساڑھے نو بجے سے پہلے اٹھتے ہی نہیں؛ جب گرجا جاتے ہو تو وہاں علم کو بہت گہری آواز سے کیوں کہتے ہو۔ سیدھی سادی طرح کیوں نہیں کہتے جیسے یہاں آپس میں بولتے ہو۔ جائیے بھی آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے معلوم ہی نہیں (ٹائپ رائٹر کے پاس چلی جاتی ہے) آئیے اب اپنے کام پر بیٹھیے! ہم لوگوں نے کافی وقت خراب کر ڈالا ہے۔ یہ لیجیے آج کی ڈائری کا کام ہے (وہ ایک یادداشت حوالے کرتی ہے)

ل۔ (نہایت ہی چونکر) لائیے، شکریہ! (وہ اسے لے لیتا ہے اور اس کی طرف پیٹھ کئے ہوئے میز کے پاس کھڑا ہو کر پڑھنے لگتا ہے، پرازی شارٹ ہینڈ کو ٹائپ کرنے لگتی ہے اور اس کے احساسات کی تکلیف کا بالکل خیال کرنا نہیں چاہتی)

(دروازہ کھلتا ہے اور مسٹر برگیس بغیر اطلاع کئے اندر تشریف لے آتے ہیں۔ کوئی ساٹھ کی عمر ہوگی معمولی کاروبار میں پڑکر ضروری خودغرضی نے اس شخص کو نہایت ابتر اور اچھی طبیعت کا بنا دیا ہے۔ اور پھر پُرخوری اور کاروباری کامیابی نے موٹاپا، کاہلی اور رانیت پیدا کر دی ہے۔ ایک نہایت ہی جاہل، اوچھا اور طامع آدمی ہے ان لوگوں سے تو نہایت حقارت اور تکبر سے ملتا ہے جن کی آمدنی کم ہو لیکن جن کے پاس روپیہ ہو یا جو کسی مرتبہ کے آدمی ہوں ان کی تو ہمہ وقت نہایت ہی ادنی خدمت کو تیار رہتا ہے لیکن دراصل نہ اِن کا ہے نہ اُن کا دنیا یا قسمت نے اسے اور کوئی کام نہیں دیا سوائے اس کے کہ وہ ایک کارخانہ کا نہایت ظالم مالک ہو جائے اور چنانچہ وہ خاصا درندہ ہوگیا ہے لیکن خود اس کو اس بات کا علم نہیں، اور نہایت سچے دل سے سمجھتا ہے کہ اس کاروباری فروغ و کامیابی محض صلاحیت لیاقت، دیانتداری، محنت، تجربہ اور دوربینی کا لازمی نتیجہ ہے ایک ایسے انسان کا اپنی نجی زندگی میں نہایت خوش باش، نیک ہمدرد ہے اور خوش طبع تو اس قدر ہے کہ ضرورت سے زیادہ، جسمانی حالت آپ کی یہ ہے کہ نہایت چھوٹے موٹے سے آدمی ہیں، ناک کی تو تنی ایک مربع چہرے پر نہایت لمبی چلی گئی ہے۔ بھوری ڈاڑھی جس میں ٹھوڑی کے نیچے سفید بالوں کا دائرہ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہلکی نیلی جن سے لجاجت آشکارا ہے اور جس کو وہ اپنی آواز میں منتقل کر لیتا ہے کیونکہ اپنے جملے نہایت شان سے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے)

نورالحسن ہاشمی

باقی آئندہ

بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس

ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ زندگی کی جتنی جیتی جاگتی تصویریں شاعر یا ادیب کا قلم بنا سکتا ہے، اتنی مصور کی رنگ آمیزیوں یا چنگ و رباب کے دلکش نغموں میں بھی ممکن نہیں۔ زندگی کی مصوری کی قلمرو میں شاعر اور ادیب کی حکمرانی میں کوئی اس کا برابر کا شریک نہیں، لیکن اس بیسویں صدی نے جہاں صدہا دوسرے بنے بنائے اصولوں کو تہ و بالا کر دیا وہاں شاعر اور ادیب کی یہ مسلمہ حکمرانی بھی کسی اور کو سونپ دی۔ اب یہ کہنا کہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، اتنا صحیح نہیں جتنا یہ کہنا کہ "تعلیم زندگی کا آئینہ ہے"۔ بلکہ اب تو ہم شاید زیادہ آسانی سے یہ تک کہہ سکتے ہیں کہ تعلیمی دنیا ہی ہماری دنیا ہے، دنیا کے تیزی سے بدلتے ہوئے نظام کا اثر زندگی میں اور کہیں اتنا نظر نہیں آتا، جتنا تعلیمی نظام میں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ جس انقلاب آفریں زمانہ کی کروٹیں، خطرات کو بھی بہت پیچھے چھوڑ کر، زندگی کو خدا جانے کہاں سے کہاں لئے جا رہی ہیں، اس میں بیچارے شاعر یا ادیب کا کہاں گذر، اس کا قلم اس تیز روی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آج کے بنائے ہوئے نقوش کل اتنے پھیکے نظر آنے لگتے ہیں کہ زندگی کی تصویر دھندلی ہوتے ہوتے تاریک ہو جاتی ہے۔

لیکن بیسویں صدی کی تعلیم چاہتی ہے کہ زندگی اس میں سما جائے اور وہ زندگی میں۔ تعلیم اور زندگی میں کوئی فرق باقی نہ رہے۔ امریکہ، جرمنی، روس، آسٹریا، انگلستان اور جاپان ہر جگہ پچھلے ۲۵ - ۳۰ برسوں سے زندگی اور تعلیم کو ایک دوسرے سے اتنا قریب لانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مدرسے دنیا کی رنگین اور متنوع زندگی کا ایک چھوٹا موٹا نمونہ بن جائیں۔ ان میں سے پڑھ کر نکلنے والے بچے زندگی کا صحیح مفہوم سمجھنے کے قابل ہوں۔ وہ زندگی کو اپنا سمجھ سکیں۔ زندگی انھیں اپنا بنا سکے، ان کی بنائی ہوئی دنیا اور زمانے کی پیدا کی ہوئی دنیا میں بیر نہ رہے۔ زندگی انھیں آگے بڑھانے اور وہ زندگی کو "زندگی" سے ان کی زندگی رنگین ہو اور ان سے

"زندگی" زیادہ رنگین بنے۔ یہ ہے "نئی تعلیم" اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "تعلیم زندگی کا آئینہ ہے۔" تعلیم اور زندگی دونوں ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔

ہندوستانی اپنی غلامی کے ہاتھوں جہاں زندگی کی دوسری دوڑوں میں ساری دنیا سے پیچھے ہے، وہاں تعلیم کی راہوں میں بھی وہ سب سے بچھڑا ہوا ہے۔ اس کا احساس کچھ آزاد دماغوں نے وقتاً فوقتاً کیا تو لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ ہندوستان میں بھی تعلیم اور زندگی کو ایک بنایا جائے یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ تعلیم میں زندگی کا رنگ بھرا جائے۔ اس خیال نے عملی جامہ اس وقت سے پہنا جب اب سے کوئی تین سال پہلے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں 'بنیادی تعلیم' کا تجربہ شروع ہوا۔ ایک سال کے تجربہ کے بعد ۱۹۳۹ء کے آخر میں پونا میں بنیادی تعلیم کی پہلی کانفرنس ہوئی۔ اس تجربہ کو چلانے والے جگہ جگہ سے آکر یہاں جمع ہوئے۔ اپنے تجربوں سے دوسروں کو سکھایا، دوسروں کے تجربے سے خود سیکھا۔ کامیابیوں پر خوش ہوئے، ناکامیوں کو دور کرنے کی ترکیبیں سوچیں اور پھر ملک کے مختلف حصوں میں پھیل کر اپنے کام کو نئے تجربوں کی نئی روشنی میں چلانا اور آگے بڑھانا شروع کیا۔ پہلی کانفرنس نے بتایا تھا کہ تعلیم سچ مچ اب زندگی سے قریب آرہی ہے اس کی طرف قدم بڑھا رہی ہے۔ کوئی سوا سال گذر گیا نئی تعلیم کا تجربہ کرنے والے پھر اپنے اپنے تجربے کی شمعیں لے کر جمع ہوئے کچھ سیکھا، کچھ سکھایا اور یہ بتا کر کہ تعلیم نے زندگی کی طرف ایک قدم اور بڑھا دیا ہے، سب پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے یہ بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس تھی۔

بنیادی تعلیم کی دوسری کانفرنس ۱۱ اپریل سے ۱۴ اپریل ۱۹۴۱ء جامعہ نگر میں ہوئی۔ گجرات، بنگال، ممالک متوسط، بہار، اڑیسہ، ممالک متحدہ، جنوبی ہند، کشمیر، حیدرآباد، اندور اور راجپوتانہ سے تقریباً سو سرکاری اور غیر سرکاری معلم کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنے تجربے کو ایک قدم اور آگے بڑھانے آئے تھے۔ کانفرنس کا افتتاح ۱۱ اپریل کو شام کے ۵ بجے بابو راجندر پرشاد نے کیا۔ بابو راجندر پرشاد کے خطبے سے پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے مہمانوں کا استقبال

کرتے ہوئے پہلی اور دوسری کانفرنس کا فرق بتایا اور کہا کہ پہلی کانفرنس ایک صوبے کی امیر حکومت نے بلائی تھی اور آج کی کانفرنس ایک غریب قومی ادارے کی دعوت پر ہو رہی ہے۔ اس فرق کو دیکھ کر ہی ہمارا دھیان اس طرف جاتا ہے کہ بنیادی تعلیم کے کام کو سنبھالنا آزاد اداروں کے بس کی بات نہیں، یہ کام تو حکومت ہی کو سنبھالنا ہوگا لیکن مشکل یہ ہے کہ ایسی حکومت ہمیں خود ہی پیدا کرنی ہے۔ ہم اپنی کوششوں سے ایک آزاد حکومت بنائیں گے، وہ اس کام کو سنبھالے گی۔ ہم اپنے آزاد تجربوں سے حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔ حکومت کو یہ کام سونپ کر ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔ ہمارا کام تو حکومت کے کام کے بعد بھی جاری رہے گا۔ اس سلسلے میں ذاکر صاحب نے کہا کہ

> "میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی تعلیم کا کام ریاست کا کام ہے۔ یہ اتنا بڑا اور اتنا پھیلا ہوا کام ہے کہ نجی کوششیں اسے سمیٹ نہیں سکتیں، لیکن اگر ریاست کسی ایک فرقے یا ایک گروہ کی حکومت کا نام ہے تو یہ ایسی چلتی پھرتی چھاؤں ہے کہ تعلیم اس کے ہاتھ میں کبھی زیادہ دیر تک ٹھیک راستے پر نہیں چل سکے گی، ہاں، ریاست اگر سماجی زندگی کی اس تنظیم کو کہتے ہیں جس کی بنیاد انصاف پر ہے۔ جو خود روز بروز اپنی اس بنیاد کو مضبوط کر کے اخلاقی ترقی کرتی جاتی ہے اور دن بدن اپنے شہریوں کی کوشش سے ہر گروہ اور ہر طبقے کیا ہر آدمی کی شخصیت کی ترقی کا راستہ اس میں سہل سے اور سہل ہو جاتا ہے تو پھر تعلیم ایسی ریاست کا سب سے ضروری کام ہے اس لئے کہ خود اس کی اخلاقی ترقی اس کام سے ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی ریاست کامل بے عیب ریاست نہیں ہو سکتی مگر بعض ریاستوں کی بنیاد اخلاق اور نیکی پر ہوتی ہے، بعض کی نہیں ہوتی۔ بعض اخلاقی بہتری کی طرف چلتی ہیں بعض نہیں چلتیں بعض عدل کے قریب ہونا چاہتی ہیں، بعض نہیں ہونا چاہتیں۔ بعض میں سب کے لئے ترقی کی راہیں کھلی ہوتی ہیں۔ بعض میں کچھ کے لئے کھلتی جاتی ہیں اور کچھ کے لئے اور

بند ہوتی جاتی ہیں۔ بنیادی تعلیم کا کام پہلی قسم کی ریاست کا کام ہے۔ دوسری قسم کی ریاست کے ہاتھ میں یہ نہ پہنچے تو اچھا۔ ہمارے ملک میں ابھی اس اخلاقی ریاست کا بننا باقی ہے۔ پھر جب تک وہ نہیں بنتی کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں؟ نہیں جس طرح آزاد اور اچھے آدمیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنی سماجی زندگی کی بنیاد ایسی اخلاقی ریاست پر رکھیں جس کا میں نے ابھی ذکر کیا، اسی طرح ہر سچے تعلیمی کام کرنے والے کا فرض ہے کہ وہ ایسی ریاست کے بننے میں اپنے کام کی پوری مدد دے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کا کام اس ریاست میں بہت مشکل ہوگا۔ لیکن اس وجہ سے اُسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور جاننا چاہیئے کہ کھودنا بہت ہوگا اور پانی بہت کم نکلے گا۔ مگر کیا عجب ہے کہ اس محنت ہی سے لوگوں کا دھیان کچھ چلے، اور ہمارے ملک میں وہ ریاست وجود میں آجائے جو ہمارے کام کو ایک ہی ہلے میں کہیں سے کہیں پہنچا دے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین نے راجندر بابو سے مخاطب ہو کر کہا کہ وہ ان کی طرف سے ملک کے سیاسی رہنماؤں کی خدمت میں یہ التجا پیش کر دیں کہ

خدا کے لئے اس ملک کی ریاست کو سدھارئیے اور جلد سے جلد ایسی ریاست کی بنیاد ڈالئے جس میں قوم قوم پر بھروسا کر سکے، کمزور کو زور آور کا ڈر نہ ہو غریب امیر کی ٹھوکر سے بچا رہے۔ جس میں تمدن تمدن امن کے ساتھ پہلو بہ پہلو پھل پھول سکیں اور ہر ایک سے دوسرے کی خوبیاں اُجاگر ہوں جہاں ہر ایک وہ بن سکے جس کے بننے کی اس میں صلاحیت ہے، اور وہ بن کر اپنی ساری قوت کو اپنے سماج کا چاکر جانے۔ میں جانتا ہوں کہ ان باتوں کا کہہ دینا سہل ہے اور کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ آج یہ بات ہمارے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں اتنی ہے جتنی کہ پہلے کبھی نہ تھی کہ کچھ سمجھ کر کچھ

سمجھا کر، کچھ مان کر، کچھ منوا کر، ایسی ریاست کی بنیاد رکھ دیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہم تعلیمی کام کرنے والوں کا حال قابل رحم ہے۔ ہم کب تک اس سیاسی ریگستان میں ہل چلائیں؟ کب تک شبہ اور بدگمانی کے دھوئیں میں تعلیم کا دم گھٹ گھٹ کر سسکتے دیکھیں، کب تک ہم اس ڈر سے کانپتے رہیں کہ ہماری عمر بھر کی محنت اور عمر بھر کی محبت کو کوئی ایک سیاسی حماقت اور سیاسی ضد مٹا دے گی، تو ہم کہاں سہارا ڈھونڈھیں؟ کیا اس سماج میں جس میں بھائی، بھائی ایک دل نظر نہیں آتے، کوئی قدر آخری قدر معلوم نہیں ہوتی۔ جس میں کوئی گیت نہیں جو سب مل کر گائیں، کوئی تہوار نہیں جو سب مل کر منائیں، کوئی شادی نہیں جسے سب مل کر رچائیں، کوئی غم نہیں جسے سب بٹائیں۔ ہماری یہ مشکل دور کیجئے اور جلد کیجئے اب بھی بہت دیر ہو چکی ہے، اور دیر نہ جانے کیا دن دکھائے۔

اور آگے چل کر ذاکر صاحب نے بنیادی تعلیم کے اصولوں کا مختصر ذکر کیا اور اس سلسلے میں "تعلیمی کام" کے مفہوم کو واضح کرتے ہوئے فرمایا کہ

ہر کام تعلیمی کام نہیں ہوتا۔ کام تعلیمی کام جب ہی ہو سکتا ہے کہ اُس کے شروع میں ذہن کچھ تیاری کرے۔ جس کام میں ذہن کو دخل نہ ہو وہ کام مردہ مشین بھی کر سکتی ہے۔ ...... کام سے پہلے کام کا نقشہ، کام کا خاکہ ذہن میں بنانا ضروری ہے۔ پھر دوسرا قدم بھی ذہنی ہوتا ہے۔ یعنی اس نقشے کو پورا کرنے کے ذریعے سوچنا۔ تیسرا قدم ہوتا ہے ان میں سے کسی کو لینا، کسی کو چھوڑ دینا اور چوتھا قدم ہے کئے ہوئے کو پرکھنا۔ کہ جو نقشہ بنایا تھا، جو کرنا چاہا تھا وہی کیا اور جس طرح کرنے کا ارادہ کیا تھا، اسی طرح کیا یا نہیں۔ اور نتیجہ اس قابل ہے یا نہیں کہ اسے کیا جاتا۔ یہ چار منزلیں نہ ہوں تو تعلیمی کام ہو ہی نہیں سکے گا لیکن اگر یہ چاروں ہوں بھی۔ تب بھی ہر کام تعلیمی نہیں ہو جاتا۔ ہر ایسے کام سے کچھ

ہنرمندی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، چاہے ہاتھ کی ہنرمندی ہو، چاہے ذہن کی
چاہے زبان کی۔ لیکن ہنرمندی تعلیم نہیں تعلیم پائے ہوئے آدمی کی جو تصویر
ہمارے سامنے آتی ہے اس میں خالی ہنرمندی کا رنگ نہیں ہوتا...... تعلیمی
کام وہی کام ہو سکتا ہے جو کسی ایسی قدر کی خدمت میں کیا جائے جو خودغرضی
سے پرے ہو۔"

ڈاکٹر صاحب نے ان الفاظ پر اپنا خطبہ ختم کیا۔

خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے کو کام سے اُس کا اچھا چاکر بنا سکیں، اُس
سے دُعا ہے۔ ہمیں سیدھی راہ دکھائے۔ ان لوگوں کی راہ جن پر اس نے انعام
کیا اور ان کی راہ سے بچائے جو سیدھے راستے سے بھٹک گئے اور جن سے
وہ ناخوش ہوا۔"

ڈاکٹر صاحب کے بعد بابو راجندر پرشاد کانفرنس کا افتتاح کرنے کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ
بنیادی تعلیم کی ابتدا ملک کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اب سے بہت پہلے ۱۹۲۱ء میں
گاندھی جی نے کی تھی۔ یہ تجربہ ان دنوں تو کچھ کامیابی نہ حاصل کر سکا، لیکن پچھلے بیس برس کے
اندر سیاسی بیداری اور سماجی ضرورتوں سے لوگوں کے دل میں تعلیم کی از سر نو تنظیم کی ضرورت
کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور اس نے جب ۱۹۳۷ء میں بنیادی تعلیم کو قومی بنانے کا
سوال ملک کے سامنے آیا تو بہت سے لوگوں نے اسے پسند کیا، کچھ اب بھی شبہ اور بدگمانی
میں مبتلا رہے، کچھ نے اس کی مخالفت بھی کی۔ لیکن تین سال کے تجربے نے مخالفتوں میں بھی کمی
کر دی ہے۔ شبہ اور بدگمانی کی بدلیاں بھی اب ویسی گھنگھور نہیں رہیں، اور لوگوں کے دل کا
یقین اور بھروسا بھی اب پہلے سے زیادہ پکا ہو گیا ہے۔ لیکن کامیابی کی خوشی میں خاموش
بیٹھ رہنا دانائی نہیں ہے۔ ہمیں اسکیم کو اور زیادہ تجربے کی روشنی میں پرکھنا ہے۔ اپنی
محنت اور تن دہی سے اسے آگے سے اور آگے بڑھانا ہے۔ مخالفتوں کو کم اور شبہوں کو

دور کرنا ہے۔ ہماری کامیابی اسی میں ہے۔

۱۲ر اپریل کی صبح کو سکریٹری نے اپنی رپورٹ پڑھی۔ مختلف صوبوں کے نمائندوں نے اپنے اپنے صوبے کی بنیادی تعلیم کی ترقی کا حال بیان کیا، اسی دن شام کو مسٹر جڑبی وائس چانسلر آگرہ یونیورسٹی نے بنیادی تعلیم کی نمائش کا افتتاح کیا۔ دوسرے دن صبح کو پھر مختلف جگہوں کی بنیادی تعلیم کی ترقی کی رپورٹیں پیش کی گئیں

اس تین سال کے تجربے کی روشنی میں ہمیں جو خاص خاص باتیں معلوم ہوئیں ان کا اندازہ کچھ اس طرح کا ہے۔

جب مختلف مقامات پر بنیادی تعلیم کا تجربہ شروع کیا گیا تو مختلف گروہ کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ دیہاتی اسے ایک بالکل انوکھی سی چیز سمجھ کر اس سے دور بھاگے۔ انھیں اس اسکیم میں کسی چھپے ہوئے خطرے کا احساس ہوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم ان کی کئی کئی نسلوں کی بنی بنائی رسموں کو مٹانے آئی ہے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ یہ تعلیم بچوں کو ان کی گھریلو زندگی سے دور ہٹا کر ایک خیالی دنیا میں بسا دے گی، جہاں کھیل کود اور باتوں کے سوا کام کاج کا گذر بھی نہیں، انھیں یہ بھی ڈر تھا کہ یہ تعلیم ان کی سکھ چین کی زندگی میں بے چینی اور کھل بلی پیدا کر دے گی۔ سیدھے سادے دیہاتی، جو اپنے دل کی باتوں کو چھپانا نہیں جانتے جو سوچتے ہیں، وہ کہہ دیتے ہیں۔ جو کہتے ہیں وہ کر بیٹھتے ہیں۔ اس لئے جو چیز انھیں پسند نہ آئی جس میں انھیں ڈر لگا، اُسے ویسا ہی کہہ دیا۔ لیکن سب کے دل تو آئینہ کی طرح نہیں ہوتے، خصوصاً حکومت اور سیاست دل کے آئینوں پر زنگ لگا دیتی ہے اس آئینہ میں ہر شکل بدلی ہوئی نظر آنے لگتی ہے۔ دل کچھ چاہتا ہے زبان کچھ کہتی ہے، یہاں دھوکا اور بناوٹ ہی سب کچھ ہے، نہ کچھ کرکے بھی دوسروں کو یہ جتانا کہ ہم سب کچھ کر رہے ہیں دشمن ہو کر بھی دوست دکھائی دینا، حکومت اور سیاست کا پہلا سبق ہے۔ اس لئے حکومتوں نے بھولے بھالے دیہاتیوں کی ایک آدھ صوبے کو چھوڑ کر یہ تو کہیں بھی نہیں کہا

کہ ہمیں یہ اسکیم پسند نہیں ہم اسے نہیں چلانا چاہتے۔ لیکن چلا کر بھی اسے اس طرح چلایا کہ یہ چلانا نہ چلانے کے برابر ہے، ایک حکومت بہت دن تک اپنے دل کی بات دل میں نہ رکھ سکی اور چھ مہینے کے تجربے کے بعد اسے بند کر دیا۔

لیکن اب تین سال کے تجربے نے بہت فرق پیدا کر دیا ہے۔ دیہاتی اس اسکیم کو پسند کرنے لگے ہیں۔ اس کے چلانے میں ہر طرح کی مدد دے رہے ہیں، اس کے بند ہونے پر انھیں بہت رنج ہوتا ہے۔ اس میں انھیں بہت سی چیزیں ایسی نظر آنے لگی ہیں جن میں اُن کے اور ان کے بچوں کے لئے بھلائی ہے۔ استاد ان کے دوست اور بھلا چاہنے والے ہیں، وہ ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ زندگی کو دن بدن اچھے سے اور اچھا بنا رہے ہیں۔ عام مخالفت کرنے والوں نے بھی اسکیم میں کچھ اچھائیاں دیکھی ہیں اور جہاں دلوں میں تعصب اور ہٹ دھرمی نہیں، وہاں مخالفت کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے، بالکل بند ہو گئی ہے۔
حکومتوں نے بھی کہیں کہیں اسے بالکل اپنا لیا ہے، اور اسے آگے بڑھانے میں ہر طرح کی مدد دے رہی ہیں۔ یہ تو ہوا بڑوں کا حال۔ بچوں کی حالت کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے، ہر جگہ کے بچے ہر لحاظ سے اب پہلے کے بچوں سے کہیں زیادہ اچھے نظر آتے ہیں۔ ان کے دل خوش ہیں اور ان کے چہروں پر چمک ہے، ان کے دماغ روشن ہیں اور زبانیں پہلے سے زیادہ تیز وہ سوچ بھی سکتے ہیں اور جو کچھ سوچتے ہیں اسے کہہ بھی سکتے ہیں، ان کے ہاتھوں میں پھرتی پاؤں میں تیزی اور بدن میں چستی ہے۔ وہ اب صحیح معنوں میں زندہ ہیں، وہ زندگی میں لطف لینے لگے ہیں، انھیں قدرت میں دلکشی محسوس ہوتی ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ زندگی کیسے آگے بڑھتی ہے اور وہ اسے آگے بڑھانے میں کس طرح حصّہ لے سکتے ہیں۔ وہ پڑھنے میں کھیلتے ہیں اور کھیلنے میں زندگی کا سبق سیکھ کر، اُسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھیں اپنے دیس اور اس کی چیزوں سے محبت ہے۔ انھیں اس کی آزادی پیاری ہے، انھیں اپنی آزادی پیاری ہے، اور وہ اپنی آزادی سے اپنے دیس کی آزادی کو زیادہ قریب لانے

میں بڑوں کے ساتھ ساتھ ان کے برابر کے حصے دار بن کر چل رہے ہیں ۔

۱۳ اپریل کی شام کو مربوط پڑھائی کے متعلق تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ بنیادی تعلیم کے تجربے کے سلسلے میں جو مختلف دقتیں پیش آئی ہیں ان میں ربط کے طریقے کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھانے والوں کو اس سلسلے میں جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان کی بنا پر وہ اس بحث میں بڑی شد و مد سے حصہ لیتے ہیں۔ بغیر کسی جھجک کے اپنے شبہوں کو دور کرکے تعلیم کی راہ کو رکاوٹوں سے پاک کرتے ہیں۔ مربوط پڑھائی پر جو گفتگو ہوئی اس میں خواجہ غلام السیّدین صاحب کے خیالات خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ مربوط پڑھائی کی بحث کو شروع کرتے وقت سیدین صاحب نے فرمایا کہ "بنیادی تعلیم کا نصاب بنانے والوں کے سامنے دو باتیں تھیں۔ پہلی تو یہ کہ بچے کا تعلق اس کے آس پاس کی زندگی سے بہت گہرا ہوتا ہے اور اسکول کا ہر مضمون ایک کھڑکی ہے جس میں سے ہو کر وہ اس زندگی کے کسی نہ کسی پہلو میں داخل ہوتا ہے، دوسری بات یہ کہ بچہ مکمل حقیقت ہے اور اس لئے اس کے نصاب کو بھی مکمل ہونا چاہیے، چونکہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کی طرح اسکول کے مضمون بھی کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اس لئے انھیں آپس میں ملا جلا کر پڑھانا چاہیے۔ انھیں الگ الگ کرکے پڑھانا، زندگی کی ہم آہنگی اور ترنم میں فرق ڈالنا ہے۔" آگے چل کر پروفیسر سیدین نے فرمایا کہ "زندگی میں وسعت اور تنوع ہے۔ تعلیم نے اس سے پہلے کبھی اس بات کو محسوس نہیں کیا۔ نئی تعلیم 'زندگی' کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے ہماری اسکیم کا نصاب جان بوجھ کر پھیلا ہوا اور بڑا رکھا گیا ہے۔ پہلا نصاب بہت گھرا ہوا تھا اور اس سے زندگی کی مختلف راہوں کی کھڑکیاں بچے کے سامنے پوری طرح نہیں کھلتی تھیں۔ لیکن اس بڑے نصاب کو دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہو جانا چاہیے۔ اس لئے ربط کا اصول اس بظاہر بہت پھیلے ہوئے اور قابو میں نہ آنے والے نصاب کو ہمارے لئے بہت آسان بنا دیتا ہے۔ ہم اگر ربط صرف بنیادی دستکاری ہی سے پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ بچے کی ضرورتوں، اس کی خواہشوں اور اس کے

آس پاس کی چیزوں سے بھی ربط میں مدد لیں تو ہمیں یہ بظاہر بے قابو سی چیز بہت آسان معلوم ہونے لگے۔

اسی رات کو آٹھ بجے پروفیسر سیدین نے 'بنیادی تعلیم' کے بعض اہم پہلوؤں پر ایک بصیرت افروز تقریر کی اور فرمایا کہ ہمارا زمانہ جنگ اور خوں ریزی کا زمانہ ہے، ہر طرف جنگ اور تباہیوں، بربادیوں کی حکومت ہے اور یہی زمانہ ہے جب تعلیم کی ذمہ داریاں، عام دنوں سے بھی کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔ تعلیم کا کام ہے تہذیب اور تمدن کو زندہ رکھنا اور اسے ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانا۔ امن کے زمانہ میں یہ کام آسانی سے ہوتا رہتا ہے۔ جنگ کے بادل امن کی راہوں کو تنگ و تاریک بنا دیتے ہیں اور اس زمانہ میں صرف تعلیم کی روشنی اس تنگی میں وسعت اور تاریکی میں نور پیدا کرتی ہے، اس زمانہ میں انسانیت کی قسمت کا فیصلہ گویا تعلیم ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

پہلے زمانہ میں بچوں کو تعلیم اس طرح دی جاتی تھی کہ وہ زندگی کے کاموں میں شریک رہ کر ایسے بن سکیں کہ آئندہ زندگی میں سماج کو آگے بڑھانے میں مدد دے سکیں۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا جب سب کچھ کتابوں ہی سے پڑھایا جانے لگا۔ کھیتی۔ باڑی، دستکاری، سائنس ہر چیز گویا صرف کتابیں ہی پڑھ کر سیکھی جا سکتی ہے۔ کتابوں کے راج میں تعلیم اور زندگی ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ جوں جوں یہ راج پھیلا زندگی اور تعلیم کی دوری بھی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ تعلیم میں زندگی کی ہلکی سی جھلک بھی باقی نہ رہی اور اب ہم نے یہ سوچنا شروع کیا کہ تعلیم کا یہ طریقہ صحیح نہیں۔ زندگی اور بچے کی تعلیم کے بیچ میں کتاب کو ایک روک بنا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ بچے کچھ کر کے، کاموں میں شریک ہو کے ہی کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ان کی اپنی کوشش اور اپنا تجربہ ہی سچی تعلیم ہے۔

یہی اصول بنیادی تعلیم کی بنیاد ہے صرف یہی نہیں۔ تعلیم کو عام، مفت اور لازمی ہونا چاہیئے۔ تعلیم کم سے کم سات سال تک دی جائے، مادری زبان میں دی جائے اور کسی دستکاری

کے ذریعہ سے دی جائے تاکہ جو کچھ سیکھا جائے وہ کرکے، دیکھ کے اور زندگی میں حصہ لے کے سیکھا جائے۔ بچے کی شخصیت کی صحیح نشو و نما اسی طرح ہو سکتی ہے۔ یورپ میں بھی تعلیم کسی ہاتھ کے کام کے ذریعہ دی جاتی ہے، لیکن ہمارے اور ان کے طریقے میں ذرا فرق ہے۔ ہم اپنے ہاتھ کے کام سے کچھ آمدنی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ آخر میں سیّدین صاحب نے فرمایا کہ لوگوں کا یہ خوف "یہ تعلیم مدرسوں کو کارخانے بنا دے گی"، قطعی بے بنیاد ہے۔ ہمارے تین سال کے تجربے نے ہمیں بتایا کہ نئی تعلیم نے بچوں کو ہر حیثیت سے پہلے سے کتنا اچھا بنا دیا ہے۔ ہمیں تو ہر خطرے کے خیال سے نڈر ہو کر میل جول، یقین اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہنا چاہئے۔

۱۴ اپریل کو کانفرنس کا آخری دن تھا۔ صبح کے اجلاس میں پھر مربوط پڑھائی پر تقریریں اور بحثیں ہوئیں۔ شام کے اجلاس میں استادوں کی ٹریننگ کے متعلق کئی مضمون پڑھے گئے اور ان پر دلچسپ بحث ہوئی۔ چونکہ ابھی کام باقی تھا اس لئے رات کے وقت بھی ایک اجلاس ہوا۔ پہلے ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں صاحب نے بنیادی تعلیم میں آرٹ کی اہمیت پر ایک بیحد دلچسپ اور مفید تقریر کی اور اس سلسلے میں بتایا کہ جب تک ہم تعلیم میں آرٹ کا نقطۂ نظر نہیں پیدا کریں گے اس وقت تک بنیادی تعلیم کے صحیح نصب العین کا حاصل کرنا غیر ممکن ہے۔

اس کے بعد کانفرنس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کانفرنس کے سامنے وہ نتیجے پڑھ کر سنائے جو مختلف اجلاسوں میں بحث مباحثوں کے بعد مرتب کئے گئے تھے۔

کانفرنس کے نمائندے دور سے اور پاس سے، نئی امیدیں اور نئی آرزوئیں لے کر، کچھ سیکھنے، کچھ سکھانے کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے تھے۔ چار دن کی لگاتار محنت کے بعد، کچھ سیکھا، کچھ سکھایا، اور پھر نئی امیدیں لے کر، اپنے کام کو ایک قدم اور آگے بڑھانے چلے گئے۔ "آزاد فضا میں رہ کر کامیابیوں اور ناکامیوں کے جو سبق سیکھے جاتے ہیں، ان میں امیدوں کا سہارا سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے"۔ تین سال کے تجربے نے ہمیں یہ سکھایا ہے اور زیادہ تجربہ ہمارے کام کے لئے اور بڑا سہارا بنے گا"۔ یہ ہمیں یاد رکھنا ہے۔

سید وقار عظیم

گزارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیار استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کی خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کیے۔ وہاں کارخانے کی اشیار کے مطابق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیار کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوئی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجیے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

المشتہر

مینجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر خانا بلڈنگ لکھنؤ

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا ممالک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ اس رسالہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر اس شخص کو پڑھنا چاہیئے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی و دیگر امور کے متعلق **مولوی سید عبد الوہاب صاحب و سید عبد القادر صاحب۔ اینڈ سنس چار مینار حیدرآباد (دکن) سے** دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صہ/ فی پرچہ ۸/

مختصر تاریخ ادب اردو

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لیکچرار شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی

اردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔ کوئی کتاب میر و داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھتی بھی ہے تو وہ موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا شعراء کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی تو اس وقت کی کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے، مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ کسی مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو۔

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اردو کے قدیم و جدید شعراء و نثر نگاروں کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

کتابت، طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے۔ حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات مجلد مع گرد پوش۔ قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے (عـہ)

ملنے کا پتہ

منیجر (بکڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

قومیت اور بین الاقوامیت

مصنفہ محمد قاسم حسن

مصنف نے اس مقالہ میں قومیت کے مفہوم کی تشریح کی ہے اور اس کے ساتھ صراحت و تفصیل سے نیز بتایا ہے کہ قومیت کا ارتقا کیونکر ہوا۔ مشرق میں قومیت کا تصور کیا ہے اور یورپ والے کس قسم کی قومیت کے قائل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے یہ وہ عنوانات ہیں جن پر فاضل مصنف نے اس کتاب میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ بین الاقوامیت کے تخیل کی ابتدا کیونکر ہوئی ہے۔ اس کا موجودہ تصور کیا ہے اور مستقبل میں اس کی نوعیت کیا ہوگی۔

آخر میں انجمن اقوام کی حیثیت، اس کے ارتقا، اس کی کارگزاریاں اور اس کی ناکامی کے اسباب پر مفید تبصرہ ہے۔ قیمت سوا روپیہ (عہ)

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیبؒ بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

زیرادارت: نورالحسن ہاشمی ایم۔ اے

سالانہ چندہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ	بابتہ ماہ جولائی ۱۹۴۱ء	جلد ۳۵ نمبر ۱

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مطبوعات جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے اس فہرست میں
آپ کو اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں
کی کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی
گئی ہیں۔ ارباب ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں

مکتبہ جامعہ نئی دہلی

مالیات جنگ

جنگ کے سب سے زیادہ نمایاں اثرات ملک کے مالیہ پر پڑتے ہیں یوں تو معاشی زندگی کے ہر شعبہ کا جنگ سے متاثر ہونا ناگزیر ہے لیکن ہم ان اثرات کو فوراً محسوس نہیں کرتے البتہ حکومت کے مالیہ میں جنگ کی وجہ سے جو تغیرات ہوتے ہیں ان کا ہمیں نسبتاً جلد علم ہو جاتا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حالت امن کی بہ نسبت حالت جنگ میں حکومت کے اخراجات کافی بڑھ جاتے ہیں۔ آلات حرب کی فراہمی، سپاہیوں کے لئے خوراک کی رسد، فوجوں کی حمل ونقل، رنگروٹوں کی بھرتی اور ان کی تنخواہیں یہ وہ بعض مدات ہیں جن کے لئے جنگ کے زمانہ میں حکومت کو زاید اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں اور ان جدید اخراجات کی پابجائی کے لئے حکومت کو مالیہ میں تغیرات کرنے پڑتے ہیں۔ نئے نئے مدات آمدنی نکالے جاتے ہیں اور ان مدات کی تقسیم بھی ایسی نہیں ہوگی جیسی کہ زمانہ امن میں ہوا کرتی ہے حکومت کے پاس دست غیب تو ہے نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان نئے مدات کے تحت جو آمدنی حاصل ہوگی وہ اہل ملک کی جیب ہی سے نکلے گی۔ گویا حکومت کے مالیہ میں تغیر وتبدل کا اثر بالراست اہل ملک پر پڑتا ہے۔

مالیات میں ان تغیرات کا اثر دوران جنگ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ جنگ کے بعد بھی جاری رہتا ہے حکومت اور عوام کو مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ جنگ کے اختتام سے بیرونی ہیجان تو ختم ہو جاتا ہے لیکن یہی بیرونی سکون اندرونی سیاسی ہیجان کا باعث ہوتا ہے جنگ کے زمانہ میں جو صنعتیں رواج پاتی ہیں وہ جنگ کے بعد بند ہو جاتی ہیں اور ان صنعتوں میں جو افراد مصروف تھے بیکار ہو جاتے ہیں ان اشخاص کو کام پر لگانا ایک حل طلب مسئلہ بن جاتا ہے۔ جنگ سے قبل جو تجارتی حالات تھے عود کر آتے ہیں ان تمام حالات کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں عام طور پر بےچینی اور ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ ان غیر معمولی حالات کے پیدا ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہی حکومت کے مالیہ کی تبدیلیاں ہیں۔ جنگ کے بعد حکومت کے زائد اخراجات میں کمی ہوتی ہے دوران جنگ میں حکومت کی حیثیت ایک بہت بڑے خریدار کی سی ہوتی ہے لیکن جنگ کے بعد حکومت کی طلب میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے قیمتوں میں تخفیف ہوتی ہے اور اس کا لازمی اثر آمدنیوں پر بھی پڑتا ہے

جنگی مالیات کے یہی وہ اثرات ہیں جن کی وجہ سے متمدن ممالک میں موازنوں پر حکومت اور عوام خاص نظر رکھتے ہیں اور دونوں کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ موازنہ کی ترتیب ایسی ہو کہ اس سے ایک طرف جنگی ضروریات کامل طور پر پوری ہوں اور دوسری طرف ملک کا معاشی توازن بگڑنے نہ پائے۔

سوال یہ ہے کہ جنگی مالیات کا مقصد کیا ہے؟ ہم نے بتلایا ہے کہ زمانہ جنگ میں حکومت کو نئے نئے اخراجات لاحق ہوتے ہیں ان اخراجات کی جس سرعت کے ساتھ پابجائی کی جائے گی اسی قدر جنگ میں کامیابی کے امکانات بھی قوی ہوتے جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں اخراجات جنگ کی پابجائی جنگی مالیات کا بنیادی کام ہے لیکن اخراجات جنگ کا ٹھیک ٹھیک مفہوم کیا ہے؟ فرض کیجئے کہ جنگ کے لئے انگلستان کو دس کروڑ پونڈ کی ضرورت ہے یہ ہو سکتا ہے کہ حکومت دس کروڑ پونڈ کے سکے دارالضرب میں ڈھال لے اور اپنی ضروریات پوری کرے۔ بادی النظر میں تو یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن مسئلہ کی نوعیت یہ نہیں ہے حکومت کو اپنی ضروریات کے لئے دس کروڑ پونڈ کے نہیں بلکہ ان کے ہم قدر وسائل اشیا و خدمات درکار ہیں تاکہ جنگی ضروریات پوری ہو سکیں اور ظاہر ہے دس کروڑ پونڈ کے سکے ڈھالنے سے یہ کام سرانجام نہیں پا سکتا۔ حکومت کو جن اشیا و خدمات کی ضرورت ہے امن کے زمانہ میں عوام ان سے مستفید ہوتے تھے لیکن اب اغراض جنگ کے لئے حکومت ان اشیا و خدمات کو حاصل کرے گی اور دس کروڑ پونڈ کے ہم قدر اشیا و خدمات کے استعمال کی حد تک عوام کو حکومت کے حق میں دست بردار ہونا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر جنگ کے مصارف صحیحہ ان اشیا و خدمات پر مشتمل ہیں جن کی تیاری و استعمال کو اس لئے ترک کرنا پڑتا ہے کہ جنگی ضروریات کی تکمیل ہو سکے مختصراً یہ کہ ملک کے معاشی وسائل کے کثیر حصہ کو زمانہ امن کے کاروبار کی انجام دہی اور اشیا کی تیاری سے زمانہ جنگ کے کاروبار کی سربراہی اور اشیا ضروریات کی فراہمی کی طرف منتقل کرنا ہی مالیات جنگ کا بنیادی مقصد ہے۔

مالیات جنگ کے مختلف طریقے:۔

حکومت اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتی ہے۔ قدیم زمانہ میں بادشاہ شاہی خزانوں میں معتد بہ رقم زیادہ تر اسی غرض سے رکھا کرتے تھے۔ یا پھر بھاری قرضے لیتے تھے اور محاصل میں اضافہ بھی کر دیا کرتے تھے۔ بعض بعض اوقات رعایا سے جبراً رقومات وصول کی جاتی تھیں کبھی کبھی خطابات

اور جاگیریں دے کر ملک کے مالدار اشخاص سے روپے پیسے لیتے تھے۔ انعام عطیات اور جاگیر کے معاوضہ میں اشخاص کی خدمات اور آلات حرب حاصل کئے جاتے تھے جاگیرداری نظام میں ہر جاگیر دار اپنی جاگیر کے پورے وسائل کے ساتھ مرکزی حکومت کی جنگی ضروریات پوری کرتا تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں جہاں طریقہ ہائے جنگ میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ وہاں جنگی ضروریات پورا کرنے کے قدیم ذرائع کے بجائے نئے طریقے رائج ہوگئے ہیں جس طرح جدید جنگی طریقے میکانی اور سائنٹفک اصولوں کی بنا پر ہر قدیم طریقے سے مختلف ہیں۔ اسی طرح مالیات جنگ کے جدید طریقے اپنے علمی و عملی اتی نوعیت کے لحاظ سے قدیم ذرائع سے جداگانہ ہیں۔

موجودہ زمانہ میں اخراجات جنگ کی پابجائی کے چار مختلف طریقے ہیں۔

۱۔ صنعتی نگرانی۔

۲۔ محصول۔

۳۔ قرضہ۔

۴۔ افراط زر۔

۱۔ صنعتی نگرانی :-

اس طریقے کے مطابق ملک کے تمام معاشی شعبے حکومت کے تحت آجاتے ہیں اور حکومت ان تمام شعبوں کی نگرانی کرتی ہے ایسی صورت میں آلات حرب کی تیاری کے لئے تقلیل (Rationing) اور تقلیل قیمت کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ حکومت کو عوام کی آمدنی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی آمدنیاں علیٰ حالہٖ برقرار رہتی ہیں۔ اشیا کی تیاری میں جو اخراجات پہلے لاحق ہوا کرتے تھے اب بھی وہی برداشت کئے جاتے ہیں۔ البتہ ان کی قیمتوں میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ اس طرح اس اضافہ قیمت سے حکومت جنگی اخراجات کے لئے آمدنی حاصل کرتی ہے اور بقیہ حصہ سے ان اشیا کی تیاری کے اخراجات کی پابجائی کی جاتی ہے۔

غور کیا جائے تو اس طریقہ میں بعض خوبیاں بھی ہیں اور بعض خرابیاں بھی۔

اس طریقہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عوام کی آمدنیوں میں تغیرات نہیں ہونے اور جنگی

ضروریات کی فراہمی کا جو بار عوام پر پڑتا ہے وہ ان کے لئے کچھ زیادہ بارگراں نہیں ہوتا۔ جنگی ضروریات کے لئے جو محصول لگایا جاتا ہے اس کو عوام بخوشی پسند نہیں کرتے۔ اس طریقہ میں عوام پر قرضہ کا بار نہیں پڑتا حکومت کے لئے بھی یہ طریقہ بہت سہولت بخش ثابت ہوتا ہے۔ تمام جنگی مساعی ایک ہی مرکز اور نظام کے تحت شروع کی جاتی ہیں اور ان میں اعلیٰ درجہ کی مرکزیت پیدا کی جاسکتی ہے۔ چونکہ جنگی اشیاء وخدمات کی فراہمی ایک نظام کے تحت ہوتی ہے اس لئے اس میں کافی وقت بچتا ہے اور جنگ کے زمانہ میں وقت کی بچت فتح کا پیش خیمہ ہے۔ اس طریقہ پر عمل کرنے کے لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ماہرین کی نگرانی میں ایک لائحۂ عمل تیار کیا جائے۔ موجودہ جنگ میں جزئی طور پر انگلستان اس طریقہ پر عمل کررہا ہے۔ یہاں زمانہ امن کے غیر اہم کاروبار کو جنگی صنعتوں میں منتقل کر دیا گیا ہے اور وزارت رسدان کی نگرانی کرتی ہے اس وزارت کے دو فرائض ہیں ایک تو یہ کہ قومی تحفظ کے لئے ضروری اشیاء فراہم کیجائیں اور دوسری حکومت کے اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کفایت شعاری سے کام لیا جائے۔

نقائص:۔

اس طریقہ کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کو سرعت کے ساتھ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جنگ کے ابتدائی زمانہ میں اس طریقہ پر عمل پیرا ہونا دشوار ہے۔ اس کے لئے بہت سے پیچیدہ انتظامی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں صنعتیں منتخب کی جائیں ان کے انتظام ونگرانی کے لئے کمیٹیاں بنائی جائیں۔ ان کی مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔ یہ سب پاپڑ بیلے جائیں تب کہیں جاکر اس طریقہ کو پورے طور پر نافذ کیا جاسکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان تمام انتظامات کے لئے وقت درکار ہے۔

اشتمالی نظام میں اس طریقہ کو بہت جلد اختیار کیا جاسکتا ہے۔ معاشی شعبے حکومت کے زیر نگرانی تو ہوتے ہی ہیں البتہ غیر اہم کاروبار ومصنوعات کو جنگی ضروریات تیار کرنے والے کارخانوں میں منتقل کر دینا پڑتا ہے۔ اور اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

موجودہ جنگ کے چھڑنے سے پیشتر ہی جنگ کی قیاس آرائیاں شروع ہوگئیں تھیں۔ اسی لئے انگلستان میں کئی صنعتوں مثلاً حمل ونقل، جہاز رانی، طیارہ سازی وغیرہ کو جنگ سے قبل ہی قومی تنظیم ونگرانی کے تحت لے لیا گیا تھا

۴۔ محصول:- یوں تو امن کے زمانہ میں بھی حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ محصول ہی ہے لیکن زمانہ جنگ میں جو محاصل لگائے جاتے ہیں ان کی نوعیت زمانہ امن کے محاصل سے جداگانہ ہوتی ہے۔ زمانہ امن میں محصول لگاتے وقت کئی باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے مثلاً زمانہ امن کی محصول اندازی کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ اشیاء ضروری پر محصول نہ لگایا جائے تاکہ اس کا بار غریب طبقہ پر نہ پڑے یعنی آدم اسمتھ کا یہ قانون کہ ٹیکس کم سے کم ضرر رساں ہو، پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ زمانہ امن میں اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ محصول خصوصاً محصول آمدنی اس تناسب سے لگایا جائے کہ اس کا رد عمل پس اندازی کی تخفیف کی صورت میں ظاہر نہ ہو یعنی محصول اتنا زیادہ نہ ہو کہ افراد کی خطرات برداشت کرنے اور پس انداز کرنے کی قابلیت میں کمی ہو جائے ورنہ اس سے بیروزگاری پھیلے گی اور معاشی ترقی میں یہ محصول سنگ گراں ثابت ہوگا۔ بالفاظ دیگر آدم اسمتھ کے قانون معدلت پر عمل کیا جاتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں ان اصولوں کا کچھ زیادہ پاس و لحاظ نہیں کیا جاتا۔ جنگ کے زمانہ میں حکومت اشیاء ضروری پر محصول لگانے سے نہیں چوکتی۔ چنانچہ جنگ کے چھڑتے ہی حکومت ہند نے دیا سلائی پر محصول لگا دیا ہے اور اب اس میں اضافہ کر رہی ہے غرض یہ کہ زمانہ جنگ میں چونکہ حکومت کو غیر معمولی اخراجات لاحق ہوتے ہیں اس لئے ان کی پابجائی کے لئے غیر معمولی محاصل لگاتے جاتے ہیں۔ البتہ یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ان کا بار ان افراد پر نہ پڑے جو فاقے کے حد پر پہونچ گئے ہوں۔

جنگ کے زمانہ میں اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ محاصل کا بار دولتمند طبقہ پر زیادہ پڑے۔

محاصل کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ محاصل میں اضافہ کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ نئے محاصل عائد کئے جائیں۔ موجودہ جنگی ضروریات کی فراہمی کا انتظام صرف محاصل میں اضافہ ہی سے ممکن نہیں۔ اس لئے دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ نئے نئے محاصل عائد کئے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو طریقہ عام طور پر اختیار کیا جاتا ہے وہ (Fanoy Taxes) یا بے اندازہ محصول ہے۔ اس سے وہ محصول مراد ہے جس سے پس اندازی کا محرک متاثر نہ ہو محصول منافع زاید یا محصول آمدنی زاید اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے تحت ہر اس شخص پر جس کی آمدنی جنگ کے زمانہ میں بہ نسبت امن کے زمانہ کے زیادہ رہی ہو محصول عائد کیا جاتا ہے لیکن ان محاصل سے زمانہ جنگ میں زیادہ امداد نہیں ملتی کیونکہ منافع زاید آمدنی زاید کا انحصار بیشتر قیمتوں کے اضافہ پر ہے اور جنگ کے زمانہ میں عوام اور حکومت دونوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ قیمتوں کو زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔

اور اسی لئے قیمتوں کی نگرانی کی جاتی ہے ظاہر ہے کہ جب صورت حال یہ ہو تو حکومت کو ان محاصل سے زیادہ آمدنی پیدا کرنے کے مواقع کم ہوتے ہیں محصول منافع زائد کے متعلق عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ زمانہ جنگ میں جو زائد منافع ہوتا ہے اس پر محصول لگایا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے زمانہ جنگ کے منافع پر جو محصول لیا جاتا ہے اس کو محصول منافع جنگ (War Profit Tax) کہتے ہیں محصول منافع زائد درحقیقت ایک تجارتی یا کاروباری محصول ہے۔ دولت پر تین طرح سے محصول لگایا جا سکتا ہے۔ ایک تو جائیداد آمدنی پر، دوسرے اشخاص یا اداروں پر تیسرے اشخاص یا اشیاء پر۔ اشیاء پر جو محصول لگایا جاتا ہے وہ یا تو زمین پر لگایا جائے گا یا اصل پر یا پھر تجارت پر محصول منافع زائد اشیاء پر ہی لگایا جاتا ہے۔

زمانہ جنگ میں جو نئے محاصل لگائے جاتے ہیں ان کے منجملہ دو تو اوپر بیان ہو چکے ہیں یعنی (۱) محصول منافع زائد (۲) محصول آمدنی زائد (۳) ایک تیسرا محصول، محصول تعیشات عاید کیا جاتا ہے۔ یہ بھی بے اندازہ محصول کی ایک قسم ہے ظاہر ہے کہ جنگی معیشت میں "طاؤس ورباب" کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ مالیات جنگ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ اشیائے تعیشات کا استعمال کم سے کم ہو۔ اس لئے ان پر محصول لیا جاتا ہے۔

سالانہ اصل پر محصول (Annual Carital Tax) یہ بھی زمانہ جنگ کا ایک نیا محصول ہے ایک سال گزرنے کے بعد جائیداد کی معمولی قیمت پر محصول لیا جاتا ہے۔ اس محصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا سالانہ رجسٹر رکھا جائے اور عموماً اس کی ادائی کے لئے چھ ماہ کی مدت دی جاتی ہے۔

۴۔ غیر مکتسب[۱] آمدنی کا محصول:۔ یہ بھی منجملہ ان نئے محاصل کے ایک قسم کا محصول ہے جو زمانہ جنگ میں غیر مکتسب آمدنی مثلاً معاشی لگان، جاگیر کی آمدنی وغیرہ پر عاید کیا جاتا ہے۔ اس محصول کے عاید کرنے کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ پوری کی پوری آمدنی حکومت لے لے یا دوسرے یہ کہ غیر مکتسب آمدنی کا ایک حصہ لے لے اور بقیہ حصہ چھوڑ دے جو حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے اس کا انحصار شخص متعلقہ کی آمدنی پیدا کرنے کی قابلیت، اس کے سابقہ مطالبات اور اس کے زیر پرورش افراد کی تعداد پر ہوتا ہے۔

مزدوروں اور چھوٹی چھوٹی آمدنی والوں پر محصول عاید کرنے میں کئی ایک انتظامی دشواریاں پیش آتی ہیں اس لئے

---

[۱] Unearned Income

ان پر ٹیکس لگانے کا واحد طریقہ بالواسطہ محصول ہے یعنی اخراجات زندگی کی معمولی اشیا، مثلاً بیڑی، تمباکو، شکر وغیرہ پر محصول لگایا جاتا ہے اور ہم پہلے بیان کر آئے ہیں زمانہ جنگ میں حکومت کا ان ضروری اشیا پر محصول لگانا کچھ معیوب نہیں خیال کیا جاتا۔

اخراجات جنگ کی پابجائی کے اس طریقہ میں نقائص بھی ہیں اور فوائد بھی۔

فوائد:۔ اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے اشیا کی قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا البتہ اشیا کی طلب میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ کہ محصول عائد کرنے سے پہلے محصول ادا کنندہ جن اشیا کو زیادہ استعمال کرتا تھا محصول عائد کرنے کے بعد ان میں سے بعض اشیا کی طلب میں کمی کر دے گا ممکن ہے کہ بعض کا استعمال ترک کر دے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی محصول عائد کرنے کے بعد اشیا کی سابقہ طلب میں کمی ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان اشیا کی انفرادی قیمت میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ہو۔

(۲) اگر صرف محاصل کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کی جائے تو جنگ کے بعد مالیات کے غیر معمولی مسائل باقی نہیں رہتے اور نہ انھیں حل کرنے کے لئے غیر معمولی طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ نہ تو قرضہ عام میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور نہ ہی شرح سود میں، اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے زیادتی کا رجحان پیدا ہوگا۔ الغرض اس طریقہ کے اختیار کرنے کی وجہ سے جنگ کے بعد حکومت کو ملک کی مالی و معاشی حالت درست کرنے کے لئے غیر معمولی دردسری نہیں کرنی پڑے گی بلکہ حکومت کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ مجوزہ محاصل میں کمی کرے اور اس طرح عوام کی آمدنیوں کو جو دوران جنگ میں گھٹ گئی تھیں سابقہ معیار پر لے آئے۔

نقائص:۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ عوام اس کی دلی تائید نہیں کرتے جنگ کے زمانہ میں بھی بہت کم افراد ہوتے ہیں جو اپنی جیب پر بار پڑتے دیکھ کر چیں بجبیں نہ ہو جائیں۔

قرضے:۔ اخراجات جنگ کی پابجائی کے لئے حکومت کثیر مقدار میں قرضے لیتی ہے اس قسم کے قرضوں کو غیر پیدا آور کہا جاتا ہے۔ قرض کی صورت میں بھی ٹیکس کی مانند رقم افراد کی جیب سے نکل کر حکومت کے ہاتھوں میں آتی ہے لیکن قرض و ٹیکس میں فرق یہ ہے کہ قرض دہندہ کی رقم کو ختم میعاد پر حکومت واپس کرنے کا وعدہ کرتی ہے لیکن محصول ادا کنندہ سے اس قسم کا وعدہ نہیں کیا جاتا۔ نہ صرف قرض دہندہ کو اس کا اصل واپس مل جاتا ہے بلکہ اس اصل پر مقررہ

شرح سے سود بھی ادا کیا جاتا ہے۔

قرض حاصل کرنے کے دو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ اہل ملک سے حاصل کیا جائے یا دیگر ممالک سے۔ اگر اہل ملک سے حاصل کیا جائے تو اس کی دو نوعیتیں ہو سکتی ہیں یعنی لازمی یا اختیاری۔ لازمی قرض سے مراد قرض کی وہ مقدار حکومت حاکمیہ کی جانب سے مقرر کی جائے۔ اور اگر اختیاری قرض ہو تو افراد کی آمدنی کا صرف وہی حصہ حاصل کیا جا سکتا ہے جو ان کے اپنے صرف سے بچ جائے یا جو محصول کی صورت میں ان کی جیب سے نہ چلا گیا ہو۔ جنگ کے زمانہ میں بعض بڑی بڑی سلطنتیں بھی غیر جانبدار ممالک سے قرضے حاصل کرتی ہیں۔ مثلاً گذشتہ جنگ عظیم میں سلطنت برطانیہ نے ۱۳۵۰ ملین پونڈ امریکہ سے قرض لئے تھے۔

اب ہم اس طریقہ کے حسن و قبح پر روشنی ڈالیں گے۔

مذکورہ بالا طریقوں میں یہ طریقہ عوام کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ قرض و ٹیکس دونوں صورتوں میں افراد کی کچھ رقم ان کی جیبوں سے نکل حکومت کے خزانے میں داخل ہو جاتی ہے لیکن قرض کی صورت میں نہ صرف اصل کی واپسی کی امید رہتی ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں سود بھی ملتا ہے۔ اس لئے قرض دہندہ کے لئے یہ امر ناگوار نہیں گذرتا۔ حکومت کو اس طریقہ سے نسبتاً آسانی کے ساتھ رقم مل جاتی ہے۔ قرضے حاصل کرنے کے لئے صنعتی نگرانی کے طریقہ کی مانند پیچیدہ انتظامات نہیں کرنے پڑتے۔

یہ طریقہ بھی نقائص سے پاک نہیں ہے۔ قرض لیتے وقت حکومت کو جتنی آسانی ہوتی ہے اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ دشواریاں اس کو ادا کرتے وقت لاحق ہوتی ہیں۔ حکومت اس قرضۂ عامہ کو ادا کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتی ہے۔ عام طریقہ یہ ہے کہ اس رقم کی ادائی کے لئے حکومت سنکنگ فنڈ یا ذخیرہ ادائی قائم کرتی ہے اس فنڈ میں ہر سال ایک معینہ رقم جمع کی جاتی ہے تاکہ جمع شدہ رقم قرض کی ادائی میں دی جاسکے۔ ایک دوسرا طریقہ طریقۂ تبدیل ہے یعنی یہ کہ اختتام جنگ پر حکومت شرح سود میں کمی کر دے اور اسی شرح سے سود ادا کرنے کا اعلان کر دے قرض دہندے اس طرز عمل پر احتجاج کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں حکومت اسی کم شرح سود پر نیا قرضہ حاصل کر کے پرانا قرضہ ادا کر دیتی ہے۔ برطانوی حکومت نے نپولیانی جنگوں کے سلسلہ میں یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ کثیر المقدار قومی قرضوں میں تخفیف کرنے کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ملک کے مالکان جائداد کی نقد مالیت کا

ایک حصہ حکومت حاصل کرے۔ اس طریقے کے اختیار کرنے میں کئی دشواریاں ہیں۔ اول تو یہ کہ جائداد کی مالیت کا تعین مشکل سے ہوتا ہے۔ بڑے بڑے ماہرین کا اندازہ بھی غلط ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر قیمت کا صحیح اندازہ قائم بھی ہو جائے تو اس جائداد کا فروخت کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ہر مستطیع شخص جو اس جائداد کو خریدنے کے قابل ہوگا وہ خود بھی ہمارے مفروضہ کے مطابق اپنی جائداد فروخت کرنے کی فکر میں ہوگا۔ البتہ اگر مالکان جائداد حکومت کے لیندار ہوں تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے حصہ کی اُس رقم کی حد تک دستبردار ہو جائیں مثلاً ایک شخص کے پاس حکومت کا پانچ ہزار کا تمسک ہے اور اب یہ شخص اس رقم کے لینے سے دستبردار ہو جائے۔ اسی طرح ایک شخص کے پاس ریلوے کمپنی کے حصص ہوں اور وہ اپنے حصص حکومت کو دیدے۔ حکومت ان حصص کو فروخت کر کے یا اس کی آمدنی سے اپنا قرضہ چکا سکتی ہے

آخر الذکر طریقہ کے سوا مندرجہ بالا دونوں طریقوں یعنی ذخیرہ ادائی یا طریق تبدیل کے ذریعہ قومی قرضہ کی ادائی کے لئے حکومت کو عوام پر محصول لگا کر ہی رقم حاصل کرنی پڑتی ہے اس طرح گویا اگر قرض کے ذریعہ اخراجات جنگ کی پابجائی کی جائے تو اس کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے کیونکہ ان ہی پر ٹیکس لگا کر اس قرض کی ادائی عمل میں آتی ہے۔ بعض معاشیین کا خیال ہے کہ اخراجات جنگ کی ادائی موجودہ نسلوں کے اندوختہ وسرمایہ اور محنت سے ہونی چاہئے اور آئندہ نسلوں پر اس کا بار غیر منصفانہ اور معاشی زندگی کے لئے مضرت رساں ہے لیکن بعض اشخاص اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جنگی مصارف کا بار آئندہ نسلوں پر بھی پڑنا چاہئے۔ کیونکہ جنگ کے خطرات اور مضر اثرات سے ملک کو محفوظ رکھ کر موجودہ نسل بیش بہا خدمات انجام دیتی ہے اور اسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ جنگ سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں ان سے نئی نسلیں بھی مستفید ہوتی ہیں۔ موجودہ نسلوں کی یہی قربانی کیا کم ہے وہ جنگ اور اس کی ہولناکیوں کے مقابلہ میں اپنا خون بہاتی ہیں۔ اگر آئندہ نسلوں پر اخراجات جنگ کے ایک حصہ کا بار پڑتا ہے تو یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔

الغرض قرض لینے کی صورت میں اخراجات جنگ کا بار آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کی ادائی کے لئے ملک کے مختلف طبقوں پر ٹیکس لگایا جاتا ہے جس میں دولت مند، متوسط حتیٰ کہ غریب طبقہ کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح اخراجات جنگ کا بار نہ صرف دولت مند بلکہ متوسط اور غریب طبقوں پر بھی پڑتا ہے

بادی النظر میں یہ ہوتا ہے کہ ان طبقوں پر اسی تناسب سے بار پڑتا ہے جس تناسب سے کہ ٹیکس کی رقم وصول کی جاتی ہے لیکن بہ نظر غائر دیکھنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ غریب طبقہ پر اس کا بار زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ دولت مند طبقہ کی جیب سے ٹیکس کی صورت میں کچھ رقم نکالی جا رہی ہے تو انھیں پھر یہ رقم سود کی شکل میں واپس مل جاتی ہے لیکن غریبوں سے ٹیکس تو برابر لیا جاتا ہے مگر انھیں کوئی معتد بہ معاوضہ سود کی شکل میں واپس نہیں ملتا گویا دولت مند طبقہ مزید دولت مند بن جاتا ہے اور غریب طبقہ غریب تر ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ جنگی اغراض کے لئے زیادہ تر دولت مند طبقہ کے اندوختوں سے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ دولت مند و غریب کی اضافی حیثیت جنگ کے زمانہ میں ایک سی نہیں ہوتی۔ جنگ کے زمانہ میں علی العموم قیمتیں اعلیٰ ہو جاتی ہیں۔ قیمتوں کے اضافہ سے امیر کی بہ نسبت غریب زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اخراجات جنگ کا جو بار غریب طبقہ پڑتا ہے وہ اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ الغرض قرض کے ذریعہ اخراجات جنگ کی بہم رسانی سے معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان دولت کی غیر منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور عدم مساوات آمدنی میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ کی ایک اور یہ خرابی ہے کہ نئی نئی صنعتیں جنھیں جنگ کے زمانہ میں جاری کرنے کے کافی مواقع رہتے ہیں محض اس وجہ سے جاری نہیں کی جا سکتیں کہ ملک کا کثیر سرمایہ قرضوں میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح ملک کی صنعتی و معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

یہ تو ہوا ان قرضوں کا حال جو اندرون ملک حاصل کئے جاتے ہیں اگر جنگی اغراض کے لئے بیرون ملک سے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں تو اس کے نتائج اور بھی خطرناک ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ یہ قرضے غیر پیداآور ہوتے ہیں ان سے کوئی آمدنی نہیں ہوتی کہ جس سے غیر ملکی قرض دہندوں کو سود ادا کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اصل و سود کی بہم رسانی اہل ملک پر محصول عائد کر کے کی جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں جس مقدار میں بیرون ملک سے قرض حاصل کیا جاتا ہے اس سے زائد مقدار میں (اصل معہ سود) رقم واپس کی جاتی ہے گویا اس مقدار کی حد تک ملک کی دولت بغیر کسی معاوضہ کے ملک سے باہر چلی جاتی ہے۔ اس قسم کے غیر ملکی و غیر پیداآور قرضوں کی وجہ سے ملک کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو جاتی ہے۔ جرمنی نے گذشتہ جنگ عظیم میں جو قرضے کثیر مقدار میں غیر ممالک سے حاصل کئے تھے ان کے بوجھ سے جرمنی کی معاشی حالت ایک عرصہ دراز تک سنبھل نہیں سکی تھی اور بعض معاشیین کا

کا تو اس وقت یہ خیال تھا کہ بس اب جرمنی ختم ہو چکا۔

الغرض اس طریقے سے ما بعد جنگ مالیات کے مختلف اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

افراط زر۔ ہم نے بیان کیا ہے کہ قرض کے ذریعہ بھی مالیات جنگ کا انصرام کیا جاتا ہے۔ یہ قرض دو ذرائع سے لیا جاتا ہے۔ حکومت یہ قرض یا تو عوام سے لے سکتی ہے یا اداروں یعنی بنکوں سے۔ اگر حکومت بنکوں سے قرض لے تو عوام کے پاس جو مقدار رقم ہوتی ہے اس میں اضافہ کرنا ہوگا مثلاً اگر برطانوی حکومت انگلستان بنک سے قرض لے تو خزانوی بل (Treasury Bills) جاری کرنے پڑیں گے اور بنک ان کی ضمانت پر اپنے کھاتہ داروں کے کھاتوں میں اضافہ کرے گا اور یہ اضافہ غیر متناسب ہوگا۔ یا اگر حکومت معمولی بنکوں سے قرض لے تو بھی یہ بنک خزانوی بل کی طمانیت پر اپنے کھاتا داروں کے کھاتوں میں اضافہ کریں گے۔ البتہ یہ اضافہ متناسب طریقہ سے ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں مقدار اعتبار میں اضافہ ہوتا ہے اور اسی لئے زر نقد کی مقدار میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اسی اضافہ کو افراط زر کہا جاتا ہے۔ اگر عوام سے قرض لیا جائے تو یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی۔

افراط زر کے ایک سے زیادہ مفہوم ہیں لیکن مالیات جنگ میں اس اصطلاح کو صرف ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کرکے عوام کے صرف میں کمی کی جاتی ہے۔ مالیات جنگ کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے صرف میں کمی کی جائے۔ محصول، قرضہ، صنعتی نگرانی بھی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہیں محصول اور قرضے کے ذریعہ عوام کی جیب سے رقم لے لی جاتی ہے قبل ازیں کہ وہ اس رقم کو اپنے صرف میں لائیں۔ افراط زر میں یہ ہوتا ہے کہ انھیں خرچ کرنے کی اجازت حسب معمول دی جاتی ہے لیکن جتنا وہ خرچ کرتے ہیں اس سے پہلے کی بہ نسبت کم اشیا حاصل ہوتی ہیں۔

افراط زر کے دو طریقے ہیں ایک سادہ اور دوسرا پیچیدہ سادہ طریقہ یہ ہے کہ حکومت زر کاغذی کا کثیر مقدار میں اجرا کرتی ہے اور یہ زر علی العموم غیر نقد پذیر ہوتا ہے یعنی حکومت اس کے معاوضہ میں سونا دینے کی ذمہ داری نہیں لیتی لیکن اس کے باوجود یہ زر اس وجہ سے جاری ہوتا ہے کہ حکومت اسے زر قانونی قرار دیتی ہے جس کے قبول کرنے پر ہر شخص اندرون مملکت مجبور ہے۔ یہ زر فوجی ضروریات اور سپاہیوں کی تنخواہ میں دیا جاتا ہے زر کی مقدار میں اس حد تک اضافہ کیا جاتا ہے کہ حکومت کو اشخاص کی مطلوبہ تعداد اور ساز و سامان فراہم ہو جائے

پیچیدہ طریقہ وہ ہے جس کو ہم مختصراً ابتدا میں بیان کر آئے ہیں۔ ہم نے افراط زر کی سادہ صورت بیان کی ہے کہ حکومت زر کاغذی کا اجرا کرتی ہے لیکن موجودہ زمانہ خصوصاً متمدن ممالک میں زر کاغذی کا استعمال کم ہوتا ہے کاروبار زیادہ تر چیک کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ ایسی صورت میں افراط زر کی نوعیت مختلف ہوگی۔ حکومت بنکوں سے خزانہ کے بلز کی طمانیت پر مصنوعی کھاتے کھولنے کی خواہش کرتی ہے اور دوسری طرف جنگی قرضہ جات کا اعلان کرتی ہے۔ عوام جنگی قرضوں میں حصہ لینے کی خاطر ان کھاتوں میں سے رقومات لیتے ہیں ظاہر ہے کہ اس طرح حکومت کو قرضوں کی شکل میں جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ عوام کی آمدنی کا کوئی حصہ نہیں ہے بلکہ مقدار اعتبار میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے زر کی مقدار میں اضافہ ہوتا ہے اور یہی مقدار حکومت کو قرضوں کی شکل میں حاصل ہوتی ہے۔ گویا یہ رقم مصنوعی طریقہ سے خاص طور پر حکومت کو قرض دینے کے لئے مہیا کی جاتی ہے حکومت افراط زر کی پالیسی اختیار کر رہی ہے یا نہیں اس کے آزمانے کا ایک یہی طریقہ ہے۔ حکومت جو کچھ خرچ کر رہی ہے وہ کسی کی آمدنی کا حصہ ہے تو یہ صورت افراط زر کی نہیں ہوگی۔ لیکن اگر حکومت کے خرچ میں اضافہ ہو اور عوام کے خرچ میں کمی نہ ہو تو یہ صورت افراط زر کی ہوگی۔ اس سلسلہ میں ایک استثنیٰ یاد رکھنے کے قابل ہے حکومت اگر سکوں کو زیادہ مقدار میں ڈھالدے تو اس سے قیمتوں میں لازماً اضافہ نہیں ہوتا اگر ملک میں بے روزگاری ہو تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ زاید رقم اجرتوں میں چلی جائے۔ اسی اصول پر نازیوں نے مالیات کا انتظام کیا تھا جب ڈاکٹر ساخت سابق صدر رائخ بنک نے اس طریقہ کی کمزوری بتلائی تو انھیں برطرف کر دیا گیا لیکن یہ واضح رہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کر دینے کے بعد صرف اسی صورت میں قیمتوں میں اضافہ نہیں ہوتا جب کہ بے روزگاری زیادہ شدید ہو۔

اب ہم اس طریق کی بعض خوبیوں اور خامیوں پر غور کریں گے

زمانہ جنگ میں بھی ہمارے صنعتی وسائل کا ایک کثیر حصہ ایک عرصہ تک حکومت کی نگرانی میں نہیں رہتا بلکہ خانگی افراد کی زیر سرکردگی ان کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اگر ان افراد کی خدمات کو حکومت اغراض جنگ کے لئے حاصل کرنا چاہے تو پھر ان کے منافع میں بھی کچھ نہ کچھ اضافہ کرنا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر عام حالات میں عاملین پیدائش اسی شعبہ پیدائش میں مصروف رہتے ہیں جہاں شرح منافع زیادہ ہوتا ہے۔ جنگ کے زمانہ میں حکومت ان عاملین کو ان کا ماسوائے پیدائش میں استعمال کرنا چاہتی ہے جو اغراض جنگ کے لئے مفید ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ ان

عاملین کو ان شعبوں میں منتقل کرنے کے لئے حکومت دو طریقے اختیار کرتی ہے یعنی اختیاری اور جبری۔ جبری طریقہ کو ہم صنعتی نگرانی کے طریقے کے تحت وضاحت سے بیان کر آئے ہیں اور اس کی خامیوں کی بھی ہم نے صراحت کر دی ہے۔ ان ہی خامیوں کے پیش نظر یہ تو ناممکن ہے کہ جملہ شعبہ ہائے پیدائش کے عاملین فی الفور جنگی کارہائے پیدائش میں جبری طور پر منتقل کر دئے جائیں اس لئے حکومت منتقلی کا اختیاری طریقہ بھی رائج کرتی ہے۔ اس اختیاری طریقہ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان عاملین کو جن کو کارہائے پیدائش میں منتقل کرانا مقصود ہے وہاں شرح منافع زیادہ ہو۔ افراط زر سے یہ شرط بخوبی پوری ہو سکتی ہے۔

گذشتہ مباحث کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ مالیات جنگ کے کامیاب انصرام کے لئے پس انداز کرنا ضروری ہے۔ افراط زر سے پس اندازی میں خاطرخواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ جنگ عظیم سے قبل انگلستان کی قومی آمدنی پانچ ہزار ملین پونڈ تھی جس میں سے چھ سو یا پانچ سو ملین پونڈ پس انداز کئے جاتے تھے گویا کل آمدنی کا تقریباً دس یا بارہ فی صد حصہ پس انداز کیا جاتا تھا لیکن حکومت نے اس جنگ میں کل آمدنی کا ۸۰ فی صد قرض لیا ہے ظاہر ہے کہ پروپیگنڈہ ترغیب و تحریص کے ذریعہ اس قدر رقم پس انداز نہیں کی جا سکتی تھی پس اندازی میں غیر معمولی اضافہ کی ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ آمدنی بشکل زر میں اضافہ ہو اور صرف پر پابندی عائد کی جا سکے۔ گویا حکومت ایک ہاتھ سے مقدار زر میں اضافہ کرے اور دوسرے ہاتھ سے پروپیگنڈے، اضافہ قیمت، حمل و نقل کی دشواریوں ان مختلف ذرائع سے صرف پر پابندی عائد کرے۔ ایسی صورت میں ایک شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اس زر کی مقدار میں تو اضافہ ہو گیا ہے لیکن وہ اس اضافہ کو صرف نہیں کر سکتا۔ اس طرح جبری پس اندازی ہوتی ہے۔

افراط زر کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ حکومت اخراجات جنگ کی تکمیل کے لئے قرض لیتی ہے۔ قرض لینے کے بعد اس قرض کے مطالبات سالانہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ ان زائد مطالبات کی ادائی کا بہترین طریقہ افراط اجرائی زر ہے۔

افراط زر سے بعض طبقوں کو جن کی آمدنی غیر معین ہوتی ہے۔ فائدہ بھی پہونچ جاتا ہے مثلاً تاجر اس سے بعض اوقات کافی نفع اٹھاتے ہیں خصوصاً اس وقت جبکہ اشیا کے خریدنے اور بیچنے کے درمیانی وقفہ میں قیمتوں میں اضافہ ہو جائے تو تاجر کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ اشیا اس کو کم قیمت پر دستیاب ہوتی ہیں اور وہ انہیں

زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔ اسی طرح کارخانہ داروں کو بھی اضافہ قیمت سے بعض دفعہ فائدہ ہوتا ہے اس لئے کہ قیمتوں میں اضافہ کے ساتھ ہی مصارف پیدائش مثلاً اجرتوں میں فی الفور اضافہ نہیں ہوتا گویا کارخانہ دار کو مصارف پیدائش حسب سابق کم وبیش برقرار رہتے ہیں لیکن اس کو اپنی اشیا کی نسبتاً زیادہ قیمت ملتی ہے اس طرح اس کو منافع کمانے کے زیادہ مواقع پیدا ہو جاتے ہیں واضح رہے کہ یہ صورت حال افراط زر کے ابتدائی زمانہ میں رہتی ہے لیکن جوں جوں افراط زر کے اثرات پھیل کر کم وبیش تمام اشیاء کی قیمتوں کو متاثر کرتے ہیں اور دوسری طرف اجرتوں میں اضافہ کا معاملہ شروع ہو جاتا ہے تو کارخانہ داروں کا یہ زائد منافع غائب ہو جاتا ہے۔

مشہور ماہر معاشیات سے۔ ایم کینیس کے اس قول سے بھی افراط زر کی تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "افراط کے لئے کسی کو ذمہ داری لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ایک دفعہ افراط زر ہو جانے کے بعد یہ خود بخود جاری رہتی ہے" نقائص:۔ افراط زر کی خرابیاں اس کی خوبیوں سے زیادہ ہیں اگر افراط طویل مدت تک جاری رہے تو ایک نقطہ ایسا آپہونچتا ہے جبکہ زر بے قدر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ افراط زر کے باعث جرمنی میں ۱۹۲۳ء میں مارک کی قدر گھٹ کر ....۱ ہو گئی تھی یہ صورت حال نہایت خطرناک سمجھی جاتی ہے اس سے معاشرہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

افراط زر کا بار امیر و غریب دونوں پر یکساں پڑتا ہے معاشرہ کے مختلف طبقوں پر جن کی مقدار آمدنی ایک ہی ہو لیکن نوعیت جداگانہ ہو تو افراط زر کا بار ان طبقوں پر مختلف طور سے پڑتا ہے

وظیفہ خوار یا سود کے ذریعہ آمدنی حاصل کرنے والوں پر سب سے زیادہ بار پڑتا ہے۔ اس لئے کہ ان لوگوں کی آمدنی تو حسب سابق ہی رہتی ہے لیکن قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس آمدنی سے وہ اتنی مایحتاج زندگی نہیں خرید سکتے جتنی کہ وہ پہلے خریدا کرتے تھے جو اشخاص اجرتوں کے ذریعہ آمدنی حاصل کرتے ہیں وہ اضافہ قیمتوں کے بعد اپنی اجرتوں میں بھی اضافہ کا مطالبہ کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا جاتا ہے مختصر یہ کہ افراط زر سے قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اضافہ معینہ آمدنی پانے والوں کے لئے مضر ہوتا ہے۔

مقدار زر میں جس تناسب سے اضافہ کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتوں میں اضافہ ہو جاتا ہے کیونکہ عوام اس کے عادی ہو جاتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ کرنے کے باوجود بھی زر کی قلت محسوس کی جاتی ہے۔ اس مستبعد صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ سبھی کو یہ معلوم رہتا ہے کہ زر کی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے

اس لئے زیادہ قیمت طلب کی جاتی ہے

افراط زر سے قیمتوں میں جو اضافہ ہو جاتا ہے وہ جنگ کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ اور روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے انسداد کے لئے حکومت کو تفریط زر کی حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے جس سے قیمتوں میں کمی ہوتی ہے اور کساد بازاری پھیل جاتی ہے اس طرح افراط زر کی وجہ سے ختم جنگ پر معمولی حالات کے احیاء کیلئے حکومت اور عوام دونوں کو کئی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

افراط زر سے بعض معاشری خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ مزدوروں کی جانب سے اضافہ اجرت کا مطالبہ پیش کیا جاتا ہے۔ ادھر آجرین نئے حالات سے اتنی جلدی تطابق نہیں پیدا کر سکتے۔ اس لئے اکثر صورتوں میں مزدور ہڑتال کر دیتے ہیں۔ اس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے آجرین اور حکومت دونوں کوشش کرتے ہیں مصالحتی کمیٹیاں بنائی جاتی ہیں۔ باہمی سمجھوتوں اور راضی ناموں سے حالات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ختم جنگ کے بعد حکومت افراط زر کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوتی۔ اس طرح زر کی مقدار میں اضافہ تو ختم ہو جاتا ہے لیکن قیمتیں معمول سے زائد معیار پر مستقیم ہو جاتی ہیں۔ اس سے وہ طبقے جن پر زیادہ بار پڑا ہے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اگر اس کا جلد انسداد نہ ہو تو ان کی تکالیف حکومت و معاشرہ کے لئے خطرناک صورت اختیار کرنے لگتی ہیں۔

ان تمام خرابیوں کے پیش نظر افراط زر کی پالیسی میں نہایت احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ اس امر کا خاص طور سے خیال رکھا جاتا ہے کہ زر کی مقدار میں غیر معمولی اضافہ نہ ہو اور یہ کہ یہ اضافہ کہیں قابو سے باہر نہ ہو جائے غیر ارادی یا اضطراری افراط زر سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

بعض معاشئین نے افراط زر کے سلسلے میں اس بات پر زور دیا ہے کہ حکومت تجارتی بنکوں سے خفیف یا معمولی شرح سود پر قرض لے اور ساتھ ہی تجارتی بنکوں کے معمولی معاملات قرض دہندگی پر نگرانی رکھے۔ یہ لوگ براہ راست تجارتی بنکوں سے قرض لینے پر اس لئے زور دیتے ہیں کہ اس سے مرکزی ارباب اقتدار کو افراط زر کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ مرکزی بنک مثلاً انگلستان بنک سے قرض لیا جائے تو معتدلا عقبار کا جو اضافہ ہوگا اس کا اندازہ "حساب گھر" (Clearing Banks) کے ذخیرۂ محفوظہ کے تناسب سے ہو سکتا ہے

اور جب تک کوئی خاص قانون نہ نافذ کیا جائے اس کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

دیگر طریقے: گذشتہ صفحات میں ہم نے مفصل طور پر مالیات جنگ کے مختلف طریقوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے یہ تو وہ مختلف طریقے تھے جن کا ماہرین معاشیات یکساں اہمیت کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں لیکن ان مذکورہ طریقوں کے علاوہ بعض اور طریقے بھی ہیں جن کی اہمیت یقیناً اس قدر زیادہ تو نہیں ہے لیکن جنہیں مصارف جنگ کی بابجائی کے سلسلہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ان طریقوں کا مختصراً تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱۔ درآمد | درآمد سے بھی مالیات جنگ میں مدد ملتی ہے بالفاظ دیگر اس کے ذریعہ مبادلات خارجہ حاصل کئے جاتے ہیں۔ مبادلات خارجہ حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں ایک تو یہ کہ اشیا برآمد کی جائیں۔ سونے چاندی کو غیر ممالک کے ہاتھوں فروخت کیا جائے اور ان کے معاوضہ میں جنگی ضروریات حاصل کی جائیں بعض اوقات قومی دولت د اصل قائم، مکانات، زمینات وغیرہ کو غیر جانبدار ممالک کے ہاتھوں فروخت کر کے مصارف جنگ کی تکمیل کی جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خدمات برآمد کی جائیں لیکن یہ طریقہ دوران جنگ میں بہت کم قابل عمل ہے۔ تیسرا طریقہ یہ کہ بیرونی کاروبار کے ملکی تمسکات کو غیر ممالک میں فروخت کر دیا جائے اور ان کے معاوضہ میں جنگی ضروریات درآمد کی جائیں۔

ان تمام طریقوں سے مصارف جنگ کا بار بڑی حد تک آئندہ نسلوں پر پڑتا ہے۔

۲۔ مصارف جنگ کی بابجائی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ محنت میں اضافہ کر کے مزید آمدنی حاصل کی جائے مثلاً بیروزگاروں سے کام لیا جائے اوقات کار میں اضافہ کیا جائے اور آرام و اطمینان سے بسر کرنے والی عورتوں و مردوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔

۳۔ جنگی عطیات | دوران جنگ میں عوام کو طرح طرح سے ترغیب و تحریص دلائی جاتی ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ جنگ کی امداد میں بطور عطیہ دیں۔ ان کے قومی جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ حب وطن، آزادی و حریت، خودداری، ایثار و قربانی جیسے لطیف جذبات کو ہوا دی جاتی ہے۔ نو آبادیات اور توابع سے بھی جنگی امداد کے فنڈ میں کثیر رقومات وصول کی جاتی ہیں۔ اصحاب ثروت سے بھی مختلف طریقوں سے عطیئے وصول کئے جاتے ہیں۔ دیسی

ریاست کے والیوں سے قدیم حلیفانہ تعلقات کے تحت بھاری مقداریں عطیئے لئے جاتے ہیں۔

۴۔ پروفیسر کینس کی اسکیم | پروفیسر کینس نے اپنے رسالہ (How to Pay for the War) میں لازمی بچت یا جبری پس اندازی کی ایک نئی اسکیم پیش کی ہے اس اسکیم کو مختصراً اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک معینہ مقدار سے زائد آمدنی پانے والے اپنی آمدنی کے ایک مقررہ حصہ کو لازمی طور پر پس انداز کریں اور اپنے استعمال میں نہ لائیں اور یہ رقم وہ لوگ سیونگ بنکس میں جمع کرائیں۔ حکومت اس بچت کو جنگی اغراض کے لئے کام میں لائے اور ختم جنگ پر حکومت ملک کی کل دولت پر محصول لگا کر اس رقموں کو معہ سود ان کے کھاتوں میں جمع کر دے۔ کینس کا خیال ہے کہ یہ طریقہ قرضہ و محصول کا درمیانی راستہ ہے اور اس سے مالیات جنگی کی تمام مشکلات پر قابو پا لیا جا سکتا ہے اور پھر اس طریقہ سے چھوٹی چھوٹی آمدنیاں پانے والے اشخاص بھی حکومت کا ہاتھ بٹا سکتے ہیں دوران جنگ میں تخفیف آمدنی کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف ہوگی اس کے ارتفاع کے لئے وہ دو تجاویز پیش کرتا ہے ایک تو یہ کہ حکومت کی جانب سے اس امر کا معقول انتظام کیا جائے کہ ان اشخاص کو اپنی ضروریات زندگی معقول اور واجبی داموں پر مل سکیں اور دوسرے یہ کہ ۱۵ سال سے کم عمر بچوں کو ۵ شلنگ فی ہفتہ بھتہ دیا جائے۔ پروفیسر کینس کی اس اسکیم پر ماہرین معاشیات کے حلقوں میں نہایت دلچسپی سے غور کیا جا رہا ہے اور اکثریت کی رائے یہ ہے کہ اس اسکیم کو کچھ حذف و ترمیم کے ساتھ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک تو ہم نے ان مختلف طریقوں کا ذکر کیا جن کے ذریعہ موجودہ زمانہ میں مصارف جنگ کی ادائی عمل میں آتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان مختلف طریقوں میں سے کون سا طریقہ مناسب اور قابل عمل ہے۔

مندرجہ بالا مباحث سے ہم بعض ایسے نتائج اخذ کر سکتے ہیں جنھیں طریقہائے مالیات جنگ کے انتخاب میں اصول و معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔

۱۔ اخراجات جنگ کی ادائی کا سب سے بہتر اور مثالی طریقہ وہ ہے جس میں عوام پر مزید بار نہ پڑے۔ اس کی وضاحت ایک مثال کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے کہ زید کو شکار کا شوق ہے اور وہ اس شوق کی تکمیل کے لئے سالانہ ایک مقررہ رقم ضروری اشیا مثلاً بندوق، بارود وغیرہ کی خریداری پر صرف کرتا ہے۔ اب اگر جنگی مصارف کی ادائی کے لئے حکومت اس سے قرض یا ٹیکس یا کسی اور صورت میں

یہ مقررہ رقم وصول کرے تو اس سے عوام پر کوئی بار نہیں پڑے گا اس لئے کہ یہ اشیاء پہلے بھی تیار ہوتی تھیں۔ اب بھی تیار ہوں گی اور ان اشیاء کے تیار کرنے والوں پر اور ان کی آمدنی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ صرف ان اشیاء کے استعمال میں تبدیلی ہوگی۔ پہلے یہ چیزیں شوق و تفریح کی خاطر استعمال کی جاتی تھیں، اور اب جنگ میں استعمال ہوں گی اس کے برعکس صورت وہ ہے جس میں اخراجات جنگ کا عوام پر مزید بار پڑتا ہے مثلاً یہ پہلے جو رقم اپنی عمدہ پوشاک پر صرف کرتا تھا اب جنگی مصارف کے لئے دے تو ظاہر ہے کہ اس رقم کی حد تک جو اشخاص پوشاک تیار کرنے کی مختلف صنعتوں میں مشغول تھے ان پر برا اثر پڑے گا۔ ممکن ہے کہ وہ اس حد تک بیکار ہو جائیں پھر حکومت یہ رقم اسلحہ اور دیگر ضروریات جنگ پر صرف کرے گی اور ظاہر ہے کہ ان کی تیاری کے لئے دیگر کاروبار سے خدمات حاصل کی جائیں گی۔ اس طرح عوام ان خدمات سے محروم ہو جائیں گے۔

۲۔ جنگی اخراجات کا بار موجودہ نسلوں پر پڑنا چاہئے یا آئندہ نسلوں پر اس مسئلہ کے متعلق کافی اختلاف رائے موجود ہے جس کا مفصل تذکرہ ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں اس سلسلہ میں اگر بالکلیہ کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکے تو کم از کم یہ امر تو قرین عقل معلوم ہوتا ہے کہ اس بار کو موجودہ اور آئندہ نسلوں میں مناسب طریقہ سے تقسیم کیا جائے یعنی یہ تو نہ ہو کہ مصارف جنگ کا تمام تر بوجھ آئندہ نسلوں پر ڈال دیا جائے کسب معاش اور توفیر آمدنی کے جو مستقل قومی وسائل ہیں انھیں جنگ کے بھینٹ چڑھا دینا قومی خودکشی اور معاشی غلامی کے مترادف ہے اس لئے ان وسائل کو بہرصورت محفوظ رکھنا موجودہ نسلوں کا قومی فرض ہے۔

۳۔ جنگی مصارف کی ادائی کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس میں یہ چیز ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس کا بار زیادہ تر دولت مند طبقہ پر پڑے اور غریب طبقہ کو اس بوجھ سے جس قدر طویل عرصہ تک بچایا جا سکے بچایا جائے۔ اگر اس طبقہ کے وسائل سے استفادہ ناگزیر ہی ہو تو دانشمندانہ طریق عمل یہ ہوگا کہ ان کی چھوٹی موٹی بچت پر ہی ہاتھ ڈالا جائے ان کی ناگزیر ضروریات کے کسی حصہ کو اغراض جنگ کے لئے استعمال کرنے کی بالکل آخری صورت میں ہی اجازت دی جا سکتی ہے۔

۴۔ جنگ کے غیر معمولی حالات میں عوام کی رضامندی خوشنودی اور دلی تائید ہی جنگی مہمات کے سر کرنے میں ہمارا بڑا اور آخری مورچہ ہے اس لئے مالیات جنگ کا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کے لئے عوام کی

دلی تائید ضروری ہے۔

۵۔ ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس سے ملک کی صنعتی و معاشی ترقی میں روڑے نہ اٹکائے جاسکیں

۶۔ مالیات جنگ کا کامیاب طریقہ وہ ہے جس میں نظام زر مستقیم رہے اس میں غیر معمولی تبدیلیاں نہ ہوں اور نہ اس پر کسی قسم کے برے اثرات پڑیں۔

۷۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جنگی مہمات کو سر کرنے کی دھن میں ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جس کے مضر اثرات کو حکومت اور عوام دونوں دوران جنگ میں نہ محسوس کریں لیکن اختتام جنگ پر جب حکومت اور عوام کو پیچیدہ مالی مسائل سے دوچار ہونا پڑے تو فتح و کامیابی کا سارا نشہ ہرن ہو جائے۔ اس لئے اس امر کا خیال مالیات جنگ کے انصرام کے وقت ضروری ہے کہ جنگ کے بعد پیچیدہ مالی مسائل سے دوبراہ نہ ہونا پڑے۔

۸۔ جنگ میں کامیابی کے لئے اندرونی امن و امان نہایت ضروری ہے اگر حکومت کی توجہ اندرونی جھگڑوں کے ارتفاع کی طرف مبذول رہے تو اس سے جنگی کامیابی میں بڑا رخنہ پڑ جائے گا۔ اس لئے مالیات جنگ کے ایسے طریقے اختیار کئے جائیں جن کی وجہ سے اندرون ملک کسی قسم کی معاشری خرابی اور شورش نہ پیدا ہونے پائے۔

۹۔ ایک طرف ان تمام امور کا لحاظ رکھنا ضروری ہے اور دوسری طرف ایسے طریقے اختیار کرنا ضروری ہیں جن سے مالیات جنگ کا مقصد جلد از جلد حاصل ہو جائے۔ تھوڑے سے وقت اور معمولی کوشش سے وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جس سے مصارف جنگ کی پابجائی ہو سکے۔ اس لئے حکومت کو مالیات جنگ کے انصرام کے لئے جس قدر کم پیچیدہ انتظامات کرنے پڑیں اتنی ہی کامیابی یقینی ہے

مالیات جنگ کے مختلف طریقوں کا تنقیدی مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کا ان تمام معیاروں پر بالکلیہ پورا اترنا ناممکن ہے علاوہ ازیں ماہرین مالیات اور ماہرین جنگ کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی عظیم الشان —— جیسی کہ گذشتہ جنگ عظیم تھی یا موجودہ جنگ ہے —— کے مصارف کی پابجائی کسی ایک طریقے سے ممکن نہیں ہے۔ مختلف طریقوں بلکہ شاید ان تمام طریقوں کا استعمال

کرنا ناگزیر ہے۔ ان حالات اور واقعات کی موجودگی میں ہم سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے کہ ان کا ایک ترجیحی سلسلہ قائم کیا جائے۔ ان مختلف طریقوں کی خوبیوں اور خرابیوں پر غور کرنے کے بعد ہمارے خیال میں سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی جانی چاہئے کہ صنعتی نگرانی کے طریقے کو اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اس کو وسعت دی جائے۔ اس کے بعد محصول کے ذریعہ جنگی مصارف برداشت کئے جائیں۔ اگر یہ طریقے ناکافی ثابت ہوں تو اندرون ملک عوام کی حقیقی بچت سے قرضے حاصل کئے جائیں۔ اس کے بعد بھی مزید ذرائع آمدنی کی ضرورت ہو تو ہمارے خیال میں پروفیسر کینس کی اسکیم پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ افراط زر کا طریقہ اور بیرونی قرضے حاصل کرنے کا طریقہ پورے غور و خوض اور کامل احتیاط کے ساتھ سب سے آخر میں استعمال کیا جائے۔

احمد خاں صاحب متعلم ایم۔اے (فائنل) عثمانیہ

اقبال اور مارکس کے زاویہ ہائے نگاہ

یہ خیالی مکالمہ اقبال اور کارل مارکس کے فلسفہ کا موازنہ ہے۔ جہاں تک اقبال کے فلسفہ کا تعلق ہے میرا منبع علم بال جبریل ضرب کلیم، سیدین صاحب کی کتاب "اقبال اور تعلیم" اور علامہ اقبال کے لکچر ہیں۔ اور جہاں تک کارل مارکس کا تعلق ہے وہ اس کی مشہور تصنیف "سرمایہ" اور دو چار اقتصادی کتب اور پروفیسر کول صاحب اور اسٹریچی صاحب کی تصانیف ہیں اور نیز فلسفہ کارل مارکس جو لینن گراڈ ادارہ فلسفہ نے شائع کی ہے۔ ان سب کتابوں کے مطالعے میں نے ان دونوں بزرگوں کے زاویہ نگاہ میں جو فرق سمجھا وہ اس مکالمہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشتراکی کتب میں کہیں میری نظر سے ایسی چیز نہیں گذری جس سے مارکس کے خاص اسلام کی بابت خیالات معلوم ہوتے لیکن مذہب کی بابت ضرور ہیں۔ اس کے نزدیک ایک مذہب اتنا ہی اچھا یا برا ہے جتنا کہ دوسرا۔ اب سنئے کہ اس کے خیالات مذہب کے متعلق کیا ہیں؟

"انسان جو خطرات کی دنیا میں رہتا ہے مجبور ہے کہ حفظ و امان کی جگہ تلاش کرتا رہے یہ وہ کس طرح کرتا ہے؟ قدرت کی تسخیر سے گورنمنٹیں بنا کر، بجلی پیدا کر کے وغیرہ وغیرہ اور اس طرح وہ سماجی زندگی کے پیچ در پیچ بندھن پیدا کر لیتا ہے۔ دنیا کو عمل سے بدلنے کا یہی طریقہ ہے لیکن ایک اور طریقہ بھی ہے یعنی خود کے جذبات اور تفکرات کو بدلنے کا جب دنیا کو بدلنا نہایت مشکل ہو جائے۔ یہ اوّلاً مذہب اور بعدہٗ فلسفہ کا طریقہ ہے اس میں پہلے دنیا کو سازگار بنانے کی کوشش ہوتی ہے اور جب نہیں ہو پاتی تو خود کو اس سے سازباز کرنا پڑتا ہے یعنی، اگر زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز اور اس طرح انسان فنا ہو جانے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھتا ہے۔"

مسلمانوں کا فلسفہ اس معنی میں مسخ ہو گیا کہ بقول علامہ اقبال کے مسلمان تقدیر کا راکب ہونے کی بجائے مرکب ہو گیا۔ اسی امر کی طرف میں نے کارل مارکس سے اشارہ کروایا ہے کہ شروع میں مسلمان میں ماحول سے تجربہ کرنے کا شوق تھا لیکن وقت گذرنے پر وہ یونانیوں کے فلسفہ کے زیر اثر آ گیا جو تخئیلیت ہے۔ اب یہ سنئے کہ تخئیلیت کیا ہے؟

"علم و عمل کی کشمکش سے فلسفہ کا مسئلہ اور تخئیلیت (مذہب) اور مادیت کے تنازعات پیدا ہوتے ہیں"...... تخئیلین کے نزدیک یہ دنیا ایک کمتر درجہ کی دنیا ہے جس میں اشیا تغیر پذیر رہتی ہیں استحکام نہیں یہ دنیا بالکل فریب اور دھوکا ہے جس میں بجائے وحدت کے کثرت بہت زیادہ ہے لیکن بدقسمتی سے یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ اس لئے عمل ہمیشہ خیال سے کم اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ مایا کی چیزوں سے تعلق رکھتا ہے تخئیلین کے نزدیک علم کا کام یہ ہے کہ حقیقت کے رموز کھولے بجائے اس کے

کہ اس قسم کی واقفیت حاصل کرتا رہے جس کی ضرورت معمولی روزمرہ کی زندگی میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔
مندرجہ بالا اقتباس مارکسی فلسفہ میں سے پیش کیا گیا ہے۔ فی زمانہ مسلمانوں کا بھی یہی تخیل (صوفیانہ زاویہ نگاہ رہ گیا ہے)
بسیط اقتباسات بخوف طوالت نظر انداز کئے گئے۔
غرض یہ عرض ہے کہ مکالمہ کا ہر خیال اقبال اور کارل مارکس کی تصانیف سے اخذ کیا گیا ہے اور یہ خیالی مکالمہ محض دو
مفکروں کے فلسفوں کے فرق کی سعی بھی جائے۔ اور اگر میں نے علامہ اقبال کے سمجھنے میں کچھ غلطی کی ہو تو ممنون ہوں گا اگر
کوئی صاحب مجھے میری غلطیوں سے آگاہ کر دیں۔ (م۔م جوہر)

مارکس۔ اس وقت آپ کچھ سوچ رہے ہیں کیا مسئلہ زیر غور ہے؟

اقبال۔ مسلمانان عالم کے مستقبل کی بابت سوچ رہا تھا کہ ان میں جذبۂ عمل، خود اعتمادی اور بے خوفی کس طرح
پیدا کی جا سکتی ہے۔

مارکس۔ میرے خیال میں مسلمانوں کا زوال اس لئے ہوا کہ ان کا فلسفہ زندگی مسخ ہو گیا۔

اقبال۔ درست فرمایا مسلمانوں کے فلسفہ زندگی کی داستان بھی عجیب ہے۔ شاید آپ کو علم ہو گا کہ مسلمانوں میں
صوفیوں کے دو گروہ ہیں جس میں ایک کے بموجب زندگی کا مقصد ہستی کو ابھارنا، شخصیت کو جلا دینا
اور انفرادیت کو مستحکم کرنا ہے ان تینوں خصوصیات کو وہ گروہ "خودی" کے نام سے پکارتا ہے اور اسی
شخص کو صاحب کمال یعنی قلندر سمجھتا ہے جو اپنی خودی کو اتنا ہمہ گیر بنائے کہ خدا کو اپنے آغوش میں لپیٹ لے
دوسرے گروہ کا نظریہ اس سے بالکل مختلف ہے اس کے مطابق وہ شخص قلندر ہے جو اپنی شخصیت اور
انفرادیت کو اس درجہ مٹائے کہ اپنے آپ کو خدا میں ضم کر دے اور بس۔

مارکس۔ درست۔ یہ نظریئے ایک دوسرے کی تکرار ہیں آپ کس نظریہ کے قائل ہیں؟

اقبال۔ میں نے صاف طور پر کہہ دیا ہے ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے — مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

میرے نزدیک ہر شے کا مقصد اپنی ہستی اور انفرادیت کو جلا دینا ہے۔ میں اپنی ہستی کو کسی دوسری ہستی میں
ضم کرنے کا قائل نہیں ہوں بلکہ دوسری ہستی کو اپنی آغوش محبت میں لینے کا قائل ہوں اگرچہ قطرہ سہی لیکن
سمندر میں ملنا نہیں چاہتا بلکہ اپنے اندر سمندر کی سی وسعت و طغیانی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا یقین ہے
کہ ہر ہستی اپنی انفرادیت قائم رکھنا چاہتی ہے اور انسان اسی لئے اشرف المخلوقات ہے کہ اس میں اپنی

خودی محکم کرنے کا جذبہ اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے میں نے کہا ہے ؎

چوں حیات عالم از زور خودی است | بس بقدر استواری زندگی است
چوں زمیں بر ہستی خود محکم است | ماہ پابند طواف ہیم است
ہستیٔ مہر از زمیں محکم تر است | پس زمیں مسحور چشم خاور است

خودی کو مستحکم بنانے کے لئے عمل ضروری ہے۔ انسان کا طرۂ امتیاز تخلیقی عمل ہے۔ وہ دوسری مخلوق کی طرح کسی خاص راستہ پر چلنے کے لئے مجبور نہیں بلکہ انسان کو صحیح و غلط راستہ منتخب کرنے کا اختیار ہے۔ اس آزادی و اختیار سے غلطی کرنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ یہ غلطی کرنے کا امکان انسان کو تجسس و فکر اور اپنے ماحول سے تجربہ کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

زندگی ہم فانی و ہم باقی است | ایں ہمہ خلاقی و مشتاقی است
زندۂ! خلاق شو مشتاق شو | ہم چو ما گیرندۂ آفاق شو
در شکن آنرا کہ ناید ساز گار | از ضمیر خود دگر عالم بیار
ہر کہ او را قوت تخلیق نیست | پیش ما جز کافر و زندیق نیست
بندۂ آزاد را آید گراں | زیستن اندر جہان دیگراں

بندۂ آزاد قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول میں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ قدرت کے پیدا کئے ہوئے ماحول پر تخلیقی عمل کر کے خود اپنا ماحول پیدا کرتا ہے اور اس میں رہتا ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ میں بھی تخلیقی عمل کا قائل ہوں لیکن کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً آپ نے اپنے لکچروں میں یہ کہا ہے "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشیت الٰہی ہمارے سامنے یہ حقیقت بے نقاب کر رہی ہے کہ اسلام کا بنیادی تخیل نہ قومیت ہے نہ سامراج بلکہ جمیعت الاقوام ہے" اب ظاہر ہے کہ جمیعت الاقوام کا تخیل ترقی یافتہ ماحول ہی میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ مختلف اقوام کے نمائندے ٹیلیفون تار اور ہوائی جہاز کے ذریعے اپنی اپنی حکومتوں سے برابر تعلق قائم رکھ سکتے ہیں۔ آج سے تیرہ سو سال قبل جمیعت الاقوام کا تخیل پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ

اس زمانے میں نہ جمعیت الاقوام بنانے کی ضرورت تھی اور نہ وہ حالات موجود تھے جو ایسی جمعیت کے قیام کے لئے ضروری ہیں۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلام کا تخیل بین الاقوامی ہے غلط ہے۔

اقبال۔ آپ کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ خیال و عمل کسی خاص ضرورت کے تابع ہوتے ہیں اور وہ ضرورت ماحول کے تابع ہوتی ہے اس لئے کسی خاص ماحول میں کوئی خاص خیال و عمل ہی پیدا ہو سکتا ہے۔

مارکس۔ جی ہاں! خیال و عمل کی نوعیت کا دارومدار انفرادی یا اجتماعی ضرورت پر ہے اور ضرورت کا انحصار ماحول پر ہوتا ہے ماحول سے میری مراد نہ صرف قدرت کے عملیات ہیں بلکہ وہ تمام اشیا بھی ہیں جو انسان کے تخلیقی عمل کا نتیجہ ہیں لیکن معاملہ یہاں ہی ختم نہیں ہوتا۔ ضرورت سے متاثر ہو کر انسان کے دماغ میں ماحول کے امکانات کی بموجب چند خیالات پیدا ہوتے ہیں پھر ان خیالات کی بموجب انسان عمل کرتا ہے اس عمل سے انسان کے ماحول میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے پھر یہ بدلا ہوا ماحول انسان کی ضرورتوں اور نتیجتاً خیالات کو بدلتا ہے اور پھر ان خیالات کی بموجب انسان اپنے ماحول کو بدلتا ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے میں نے اپنی کتاب سرمایہ کے صفحہ اول پر یہ کہہ دیا تھا کہ انسان قدرت پر عمل کر کے اس کو بدلتا ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو بدلتا ہے میں مذہب کو بھی ماحول کا پابند سمجھتا ہوں کسی زمانہ کے مذہبی اصول ہیں زمانہ کے ماحول اور ضرورتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں اور چونکہ ماحول اور ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں اس لئے مذہب کو بھی بدلنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے زاویہ نگاہ کے مطابق مذہب کی تفسیر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور اسی لئے آپ کو مذہب میں اجتہاد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے

اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں اس لئے ہر وہ شے جو انسان اور ماحول کی پیدا کردہ ہو اس کو بھی بدلنا چاہئے۔ مذہب کو بھی آپ انسان اور ماحول کی پیداوار خیال کرتے ہیں؟

مارکس قطعی۔

اقبال۔ لیکن مذہب کا معاملہ دوسرا ہے وہ عشق و نظر کا معاملہ ہے۔ اس میں استحکام بھی ہے اور تبدیلی بھی۔ مذہب ارتقا کے خلاف نہیں ہے لیکن دنیا جہاں ادلتی بدلتی بنتی بگڑتی رہتی ہے وہاں اس میں ایک اٹل اور لافانی عنصر بھی ہے ؎

اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا　　　نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

جس کو کیا ہو کسی مرد خدا نے تمام　　ہے مگر اس نقش میں رنگ ثبات دوام

تفسیر لکھنے اور اجتہاد کرنے کا میں قائل ضرور ہوں لیکن میں مذہب کو ماحول کے مطابق بدلنا نہیں چاہتا بلکہ مذہب کے اصولوں کو ماحول کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال۔ اقبال صاحب! اصول واضح کرنے ہی میں تو ساری تبدیلی کر دی جاتی ہے کسی اصول کے الفاظ تو وہی رکھے جاتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بالکل بدل دیا جاتا ہے۔ عورت کی آزادی کا مسئلہ لیجئے جس معاملہ میں آپ بہت رجعت پسند معلوم ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک جزوی بات عرض کرتا ہوں فرض کیجئے کہ یہ اصول قائم کیا جائے کہ عورت کو زینت و زیبائش نمایاں نہیں کرنی چاہئے۔ بظاہر بہت معصوم اصول معلوم ہوتا ہے اور یکبارگی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صرف زیبائش ہی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ عورت کی غلامی اور آزادی کا مسئلہ ہے۔ آپ یہ غور فرمائیں کہ لفظ زینت و زیبائش کی کئی طریقہ پر تفسیر کی جا سکتی ہے اور اس لفظ کو کئی مفہوم دے جا سکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ میں ماحول کی ضرورت سے متاثر ہو کر عورت کی زیبائش سے مراد اس کی آواز، چال، ڈھال رنگ روپ۔ چہرہ مہرہ لیا جاتا تھا اور زینت نمایاں نہ کرنے کے اصول کی اس طرح تفسیر کی جاتی تھی کہ عورت مقید ہو کر رہ جاتی تھی اب جبکہ سماجی زندگی میں عورت کے حصہ لینے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور ماحول بدل رہا ہے تو زینت و زیبائش سے صرف بُندے، چوڑیاں، زیور مراد لی جانے لگی ہے اور عورت کو چہرہ بے نقاب کرنے اور وقت ضرورت نامحرم سے گفتگو کرنے کی اجازت مل گئی ہے۔ زینت کے لفظ کا مفہوم بدل دینے سے عورت مقید سے آزاد ہو گئی۔ اس مثال سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ زندگی اپنے ساتھ ساتھ لفظ کا مفہوم بھی بدل ڈالتی ہے۔ جب آپ کسی مذہبی اصول کو مندرجہ بالا طریق پر واضح کرتے ہیں تو گویا آپ الفاظ تو وہی رکھتے ہیں لیکن ان کا مفہوم بدل ڈالتے ہیں۔ مجھے یہ باور کرنے میں تامل ہے کہ ایک ہی دائرے میں رہ کر اصول اس قدر بدلا جا سکتا ہے کہ اس کے بالکل برعکس نتیجے برآمد ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ماحول سے متاثر ہو کر آپ الفاظ کا مفہوم بدل کر اصول بدل ڈالتے ہیں اور کہتے یہ رہتے ہیں کہ اصول اپنی جگہ قائم ہے نفس اصول الفاظ نہیں ہوتے بلکہ ان کا

مفہوم ہوتا ہے جس کو ضرورتاً بدل دیا جاتا ہے۔

اقبال۔ لیکن عورت کی زینت کا مسئلہ تو کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے اگر جزوی باتوں کو ماحول کے اثر سے بدل بھی دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے

مارکس۔ چلئے آپ نے یہ تو مانا کہ جزوی امور ماحول کے پابند ہوتے ہیں۔

اقبال۔ اس امر کو مان لینے میں کیا مضائقہ ہے لیکن اصول کو نہیں بدل سکتے۔ مساوات کا اصول لیجئے جب ہم نے یہ اصول مان لیا کہ بنی نوع انسان میں مساوات ہونی چاہیئے تو سماجی اور انفرادی زندگی کی تشکیل اس طریقہ پر کرنی ہوگی کہ یہ اصول نہ ٹوٹے لیکن طریقہ کار بدل سکتے ہیں۔

مارکس۔ لیکن دیگر اصولوں کی طرح مساوات کے اصول کا مفہوم بھی ہر زمانہ میں اس زمانے کے ماحول کے مطابق بدلتا رہا ہے۔ آج سے چند صدی پیشتر جب اجناس تجارت کے لئے بننی شروع ہوئیں اور خرید و فروخت کا سلسلہ اتنا ترقی کر گیا کہ بازار اور منڈیاں پیدا ہو گئیں اور اس امر کا امکان پیدا ہو گیا کہ غریب انسان بلا غلامی قبول کئے بھی پیٹ بھر لے تو اس وقت مذاہب نے مساوات کو اپنا بنیادی اصول بنایا۔ لیکن غلام رکھنے کی اجازت دینا اصول کو ماحول کے مطابق لانا تھا۔ مذاہب نے مساوات کا اصول بھی قایم کیا لیکن غلام، بیگاری اور مزدور کے وجود کی بھی حمایت کی۔ امیر اور غریب کے فرق کو بھی مستقل طور پر سماجی زندگی کا جز بنایا لیکن اس ماحول میں وہی ہو سکتا تھا جو کچھ کیا گیا لیکن آج کل کے ماحول نے مساوات کے لفظ کو نیا مفہوم دیا ہے۔ آج کل دنیا مساوات قائم کرنے کے یہ معنی سمجھتی ہے کہ سماج کو انفرادی ملکیت سے نجات دلائی جائے اور اقتصادی مساوات قائم کی جائے۔ میں بھی مساوات کا قائل ہوں لیکن میرے اور آپ کے مساوات کے مفہوم میں زمین آسمان کا فرق ہے اگر آپ یہ فرمائیں کہ دیکھو مارکس بھی ہمارے مساوات کے اصول کا قائل ہے تو یہ کتنا غلطی ہوگی کیونکہ اگر چہ میں بھی اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے مساوات ہی کا لفظ استعمال کرتا ہوں لیکن اس لفظ سے میرا مفہوم مساوات کے اسلامی مفہوم سے بہت جدا ہوتا ہے کسی زمانہ میں انسان کا ماحول قدرت کا عطا کردہ تھا لیکن اب انسان نے اپنے عمل سے ایک

نیا ماحول پیدا کر لیا ہے جس کے سامنے قدرتی ماحول کی اہمیت نسبتاً بہت کم رہ گئی ہے۔ اب ہمارا ماحول دریا، پہاڑ، میدان نہیں ہیں بلکہ انجن، موٹر، ہوائی جہاز اور ریڈیو وغیرہ ہیں۔ یہ نیا ماحول نئے امکانات اور نئی ضرورتیں پیدا کر کے ہمارے دماغ میں نئے خیالات پیدا کر رہا ہے اور ہم کو نئے طریقہ پر عمل کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس وقت یہ یقین کرنا کہ پرانے تخیلات کو از سر نو زندہ کیا جائے رجعت پسندی ہے۔

اقبال۔ تو یوں فرمائیے کہ انسان اپنے کردار کے ماحول میں رہتا ہے۔ انجن وغیرہ کیا ہیں یہ لوہے کی شکل میں انسان کا صدیوں کا تفکر و عمل ہی تو ہے۔

مارکس۔ درست فرمایا۔ انجن صدیوں کے انسانی تفکر و عمل کی داستان ہے۔ انجن لوہے کی شکل میں انسانی ذہن ہے۔ انسان جب تک اپنے تخیل کو مادی شکل نہ دے اس وقت تک اپنی خودی کو نمایاں نہیں کرتا۔

اقبال۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے فکر سے اپنے آپ کو بدلتا ہے۔

مارکس۔ جی ہاں اس خیال کو میں اس طرح بیان کرتا ہوں کہ طریقہ پیداوار سماجی تخیل اور عمل کی تشکیل کرتا ہے۔ طریقہ پیداوار مادی شکل میں کسی سماج کا صدیوں کا فکر و عمل ہوتا ہے۔ سماج اپنے فکر سے اپنے فکر کو بدلتی ہے یا یوں کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ انسان اپنے عمل سے اپنے عمل کو بدلتا ہے۔

اقبال۔ درست آپ کا مطلب یہ ہے کہ انسان اور ماحول ایک دوسرے پر عمل کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو بدلتے رہتے ہیں۔

مارکس۔ ہمارا خیال ہمارے ماحول کا نتیجہ ہوتا ہے اور ہمارا ماحول ہمارے خیال و عمل کا لیکن میں ماحول کو مقدم اور خیال کو موخر سمجھتا ہوں یعنی پہلے وجود بعد میں شعور، شعور وجود کا محتاج ہے لیکن جہاں تک خودی کو مستحکم کرنے کا تعلق ہے مجھے آپ سے قطعی اتفاق ہے۔ خودی صرف عمل سے مستحکم ہو سکتی ہے

اقبال۔ لیکن ایشیا والوں کی بدقسمتی دیکھئے وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ صرف مراقبہ ہی سے انفرادیت یا خودی مستحکم ہوتی ہے حالانکہ خودی اس وقت جلا پاتی ہے جبکہ انسان اپنے ماحول کے ساتھ تجربہ کرتا ہے اور بہت غور و فکر کے بعد بہت سی غلطیاں کرنے کے بعد وہ ایک راہِ راست تلاش کرتا ہے۔ جب انسان وہ کام کرتا ہے جو خدا کرتا ہے اس وقت انسان کی خودی مستحکم ہوتی ہے۔ خدا بھی مادہ کی شکل بدلتا ہے

اور انسان بھی۔ خدا لوہا پیدا کرتا ہے تو انسان پہاڑوں میں سے نرم لوہا نکال کر اس کا فولاد بناتا ہے میں نے
اس خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے ؂

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کوہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم — من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

جب تک عمل فکر کا ساتھی نہ ہو اس وقت تک خودی مستحکم نہیں ہو سکتی ؂

خیز و خلاق جہان تازہ شو — شعلہ در بر کن خلیل آوازہ شو
دم بدم مشکل گر و آسان گذار — دم بدم نو آفرین و تازہ کار

انسان خود مختار پیدا ہوا ہے اور خیر و شر کرنے پر قادر ہے وہ سورج کی طرح ایک راستہ چلنے پر مجبور
نہیں۔ عمل کی آزادی ہی خودی کو مستحکم کرتی ہے اور یہ معاملہ صرف افراد کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ
قوموں کی خودی بھی آزادئ عمل سے مستحکم ہوتی ہے۔ میں انسان کو جنت سے نکالے جانے کے قصہ کو
بھی اسی زاویہ سے دیکھتا ہوں جنت میں انسان سورج کی طرح ایک قانون میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ خیر ہی
خیر کر سکتا تھا اور اس پابندی کی وجہ سے وہ اپنی انفرادیت کو مستحکم نہیں کر سکتا تھا۔ جنت سے نکالے
جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے آزادئ عمل حاصل کی اور خیر و شر کا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہرایا
اور یہی ایک راستہ خودی کو مستحکم کرنے کا ہے کہ انسان اپنے عمل کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر ترقی کی
راہیں ڈھونڈے ؂

از گل خود آدمی تعمیر کن — آدمی را عالمے تعمیر کن

مارکس۔ مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔ انسان اور اس کا ماحول آپس میں ایک دوسرے پر عمل کرتے
رہتے ہیں۔ انسان اسی وقت مہذب کہلاتا ہے جبکہ وہ فکر و عمل سے قدرت کی طاقتوں پر قابو پا لیتا ہے اور اپنے
لئے ایک ایسا ماحول پیدا کر لیتا ہے جس میں وہ کر وہ بہتر انسان بن سکے

اقبال۔ لیکن میں خودی کی ترقی کے لئے ایک اور امر بھی اہم خیال کرتا ہوں وہ یہ کہ کسی دوسرے کے افکار و عمل

کی نقالی سے خودی طاقتور نہیں ہوتی بلکہ کمزور ہوتی ہے۔ فرد کی خودی اس کی اپنی سماج کی کلچر اپنی تہذیب و تمدن میں رہ کر ترقی کر سکتی ہے کسی دوسری قوم کی کلچر اور تہذیب کی تقلید سے خودی کمزور ہوتی ہے ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہ دیگراں رفتن عذاب است

مارکس۔ اب تو دنیا کی مختلف قوموں کی کلچر ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک نئی کلچر پیدا ہو رہی ہے جو تمام دنیا کی مشترکہ کلچر ہوگی۔ یہ کلچر تمام دنیا کے مزدوروں کے باہمی ارتباط سے پیدا ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ کسی ملک و قوم کی خاص کلچر نہیں ہوتی بلکہ کسی خاص دور میں کسی خاص طبقہ کی خاص کلچر ہوتی ہے مثلاً اگر یورپ کے جاگیردار دور کے جاگیردار طبقہ کی کلچر کا مقابلہ ہندوستان کے جاگیردارانہ دور کے جاگیردار طبقہ سے کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یورپ کے جاگیردار اور ہندوستان کے جاگیردار میں کوئی فرق نہیں اسی طرح یورپ کے بیگاری اور ہندوستان کی بیگاری کی کلچر ایک تھی۔ اس وقت جو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ مشرق یورپ کی کلچر اختیار کرتی جا رہی ہے وہ صرف یہ بات ہے کہ یورپ میں سرمایہ دارانہ دور شروع ہوئے مدت ہوئی اور اس دور نے یورپ کو ایک خاص کلچر دی اب چونکہ ایشیا میں بھی وہی سرمایہ دارانہ دور حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے ایشیا میں سرمایہ دارانہ دور کی کلچر رواج پاتی جا رہی ہے لیکن جیسا کہ ہر عبوری زمانہ میں ہوتا ہے یہ تبدیلی بہت خرابی کے بعد اپنی اصلی شکل اختیار کرے گی۔ کلچر بھی ارتقائی شے ہے۔ ایک ہی ملک میں مختلف طبقوں کی مختلف کلچر ہوتی ہے۔ جیسے جیسے ماحول بدلتا جاتا ہے کلچر بدلتی جاتی ہے۔ مختلف طبقوں کی محبت، مروت، وفاداری، خودداری، حیا و شرم۔ سچ جھوٹ کے معیار مختلف ہوتے ہیں۔

اقبال۔ یہ تو درست ہے کہ دنیا میں ایک مشترکہ کلچر نمودار ہو رہی ہے لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ اپنی ہی کلچر کو ضرورت کے مطابق بدلنا چاہیئے۔ میں کسی دوسرے کا بچہ خواہ وہ کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اپنی بغل میں نہیں لے سکتا۔ میں اپنا ہی بچہ پیدا کرنے اور پرورش کرنے کا قائل ہوں۔

تا کجا در تہ بال دگراں می باشی در ہوائے چمن آزاد پریدن آموز

مارکس۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ جس طرح ایک عورت جوانی کو کار آمد نہ بنائے تو ۵۰ برس کے بعد اگر چاہے بھی تو اولاد پیدا نہیں کر سکتی اور کسی دوسرے کا بچہ گود لینے پر مجبور ہوتی ہے اسی طرح اگر ایک قوم مدت تک بے عمل رہے تو وہ اپنی تخلیقی قوت کھو دیتی ہے اور پھر اگر ترقی کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی بلکہ اس کو ترقی یافتہ قوم کا طریقۂ کار اور تہذیب و تمدن اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایشیا کی اقوام ترقی کی دوڑ میں اس وجہ پیچھے رہ گئی ہیں کہ اب ان کو اس کے سوا چارہ نہیں کہ نہ صرف مغرب کا آلاتی طریقہ پیدا وار اختیار کریں کہ بلکہ جو اشتراکی کلچر اس وقت یورپ میں پیدا ہو رہی ہے اس کی تعمیر میں پورا حصہ لیں۔

اقبال۔ دلا نارائی پروانہ تا کے نگیری شیوہ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز طواف آتش بیگانہ تا کے

مارکس۔ لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ ایشیا کا اپنا سوز تو ختم ہو گیا۔ اب تو ایشیا میں تخلیقی شعلہ اسی طرح پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ مغرب سے تفکر و تدبر صنعت و حرفت کی چنگاری مستعار لے۔

اقبال۔ از سوال آشفتہ اجزائے خودی بے تجلی نخل سینائے خودی
از سوال افلاس گردد خوار تر از گدائی گدیہ گر نادار تر

مارکس۔ میں کب کہتا ہوں کہ آپ گدا بن کر سوال کریں یورپ کی تہذیب و تمدن صنعت و حرفت قرض لیجئے اور یہ قرض معہ سود کے ادا کر دیجئے گا۔ یورپ نے بھی تو ایشیا سے علم و فضل لیا مغرب کو مشرق ہی نے مذہب دیا یہ یورپ کی قابلیت ہے کہ انھوں نے ایشیا سے قرض لے کر کام شروع کیا اور اسکو اتنا بڑھایا کہ اب وہ اس قابل ہیں کہ ایشیا کو قرض دیں۔ آخر ایشیا یورپ سے قرض لینا کیوں کسر شان سمجھتی ہے۔

اقبال۔ زخاک خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست تجلی دگرے درخور تقاضا نیست

مارکس۔ لیکن یورپ نے بھی تو ایشیا کے شعلہ سے اپنی آگ روشن کی تھی اب ایشیا کو یورپ کی چنگاری سے اپنی شمع روشن کرنے میں کیوں عار معلوم ہوتا ہے۔

اقبال۔ افغانہ شیشہ گران فرنگ کے احساں سفال ہند سے مینا و جام پیدا کر

مارکس۔ لیکن ہندوستان کی قوت عمل تو شل ہو چکی ہے اب وہاں مینا و جام کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

اقبال۔ لیکن قوت عمل کسی زمانہ میں تو جدت طراز تھی اس سے تو آپ کو بھی انکار نہیں کہ کسی زمانہ میں ایشیا یورپ کا استاد تھا آخر وہ تخیلات اور جدت عمل ایشیا ہی میں پیدا ہوئے تھے جن کی بدولت وہ یورپ کا استاد بنا وہ تخیلات آج بھی ہماری روایات اور کتابوں میں موجود ہیں یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے ان کو فراموش کر دیا ہے۔ میرا مقصد حیات صرف یہ رہا ہے کہ ان پرانے تخیلات کو از سر نو جگا دیا جائے۔ میں مغربی فکر و عمل کا مخالف نہیں ہوں میں نے خود کہا ہے ؎

علم و فن را اے جوان شوخ شنگ مغربی با سینہ ملبوس فرنگ

قوت افرنگ از علم و فن است از ہمیں آتش چراغش روشن است

لیکن مغربی تہذیب و تمدن کے جو خراب پہلو ہیں میں ان کا مخالف ہوں۔ یورپ کی عریانی مجھے نہیں بھاتی اور جس درندگی کا ثبوت یورپ آج دے رہا ہے وہ اس کی کلچر کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔

مارکس۔ خراب پہلو۔ خوب اور ناخوب کی تکرار ہی تو ارتقائی حرکت پیدا کرتی ہے۔ شیطان کی کارفرمائی ہی سے تو مشت خاک میں ذوق نمو ہے۔ اگر رزم خیر و شر نہ جاری رہے تو ارتقا ہی بند ہو جائے۔ یورپ میں آج جو کچھ ہو رہا ہے یہ درندگی کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ جیسا آپ نے کہا ہے ؎

جہان نو ہو رہا ہے وہ عالم پیر مر رہا ہے جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جب بچہ ہوتا ہے تو ماں کو درد و تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کوئی شے بلا درد و کرب کے پیدا نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب ایک سماج کے بطن سے دوسری سماج نکلتی ہے تو تمام دنیا درد و کرب محسوس کرتی ہے۔ یورپ میں جہان نو پیدا ہو رہا ہے لیکن ایشیا والے آج کل مغربی تہذیب کے متعلق آپ کا یہ شعر بہت پڑھتے ہیں ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یورپ کا ہنگامہ خودکشی نہیں بلکہ جراحی ہے۔ بنی نوع انسان کے جسم پر سرمایہ داری

کا جو چھوڑا کل آیا تھا اس میں شگاف دیا جا رہا ہے۔

رہا یہ امر کہ ایشیائی قوت تخلیق کو پرانی روایات و تخیلات کے ذریعہ سے از سر نو زندہ کیا جا سکتا ہے تو میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ آپ نے خود ایک جگہ اس قول کی تائید کی ہے کہ تاریخ عالم کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ جن روایات و اقوال کو کسی قوم نے مردہ ہونے دیا ہو ان خیالات و اقوال کے ذریعہ سے اس قوم میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ پرانی روایات کو زندہ کرکے قوم کو زندہ نہیں کر سکتے جس طرح پرانی دوا اثر کرنا چھوڑ دیتی ہے اسی طرح پرانی روایات اور کہنہ اصطلاحات و تخیلات بھی انسانوں پر اثر کرنا چھوڑ دیتے ہیں یا یوں کہئے کہ جس طرح مدت تک شراب پیتے پیتے انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے کہ پھر پرانی خوراک اس پر اثر نہیں کرتی اسی طرح پرانی روایات سنتے سنتے مسلمان ان کے سننے کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ اب وہ ان پر اثر نہیں کرتیں ؎

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و کرم اور

م۔م۔ جوہر صاحب میرٹھی

ارتباطِ نصاب

(یہ چند الفاظ نصابی مضامین کے ربط پر ایک مختصر مقالے کے سلسلے میں تمہیدی طور سے لکھے گئے تھے)

کہتے ہیں کہ بنیادی تعلیم کا راز اس کے جرنے میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت کا راز اس کے اپنا خرچ آپ چلانے میں ہے۔

لیکن میں تو یہی کہوں گا کہ اس کی کامیابی کا راز اس کے ارتباط میں ہے۔ اس کا وہ ارتباط جو نصاب کے ایک حصہ کو دوسرے حصے سے، ایک مضمون کو دوسرے مضمون سے اور پورے مدرسے کو پوری زندگی سے مربوط کر دیتا ہے

جس طرح اتحاد ہماری سماجی زندگی کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ اسی طرح ارتباط ہماری بنیادی تعلیم کا سنگ بنیاد ہے جس طرح ہم سماجی زندگی میں ایک دوسرے کے گلے کاٹنے والے مقابلے کو ختم کرنے پرتلے ہوتے ہیں اسی طرح ہم نصابی زندگی میں بھی مضامین کے باہمی تصادم اور ٹکراؤ کو ختم کر دینے پر آمادہ ہیں۔ ہماری تعلیمی گاڑی میں ہمارے مضامین پرانے رومن رتھوں کے گھوڑوں کی طرح برابر برابر جُتے ہوئے ہیں جو اکثر باہم مل کر کھینچنے کی بجائے ایک دوسرے کو دولتیوں اور کاٹ کھانے کے آداب بجالاتے رہتے ہیں۔ ہمارے طلبا اور ہمارے استاد ہمارے اسکول اور ہمارے نصاب، ہمارے چھوٹے اور ہمارے بڑے سبھی ایک سماجی تعلیمی معاشی گھوڑ دوڑ میں مشغول ہیں۔ اس کے داؤں کہیں دولت کے منافع ہیں اور کہیں امتحانوں کے نمبر ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم ایک تعاونی کوشش سے آپس میں سر جوڑ کر کندھے سے کندھا ملا کر کام کرنے والا جذبہ پیدا کریں۔ اس جذبے کے پیدا کرنے کی صحیح راہ ہمیں بنیادی اسکیم نے بتائی ہے ارتباط رہن سہن کے اسی اصول کا نصابی پہلو ہے

آپ نے پرانے مکتبوں اور پاٹھ شالاؤں کے پڑھے لکھے اپنے بزرگوں کو بھی دیکھا ہوگا آپ نے اکثر ان کی کمزوریوں اور ان کی تعلیم و تربیت کے کچے پن ان کی خامیوں پر تو سوچا ہی ہوگا۔ لیکن آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ اکثر ان پرانے لکھوں پڑھوں کے کردار میں، ان کے کیرکٹر میں کیسی ہم آہنگی، کیسا توازن ؟ اور وزن ہوتا ہے اس

ہم آہنگی کو ہم آج کل کے لکھوں پڑھوں میں ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے اس ہم آہنگی اس توازن کا راز کیا تھا اگر ہم پرانے نصاب پر ایک ہمدردانہ نگاہ ڈالیں تو ہمیں پتہ چل جائے گا کہ اس کا ایک بڑا سبب نصابی ارتباط تھا وہ ارتباط جو کتب کو زندگی سے مربوط کرتا تھا، وہ ارتباط جو ایک مضمون کو دوسرے سے مربوط کرتا تھا، اس جاری وساری اصول کو خواہ آپ مذہبی یا روحانی ماحول کا نام دیں یا اسے انسانیت کی روح بتائیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان مدرسوں کی فضا میں ایک توازن تھا جو غیر شعوری طور پر ان کے اداروں کو ان کی فضا کو ان کے بچوں کو اور ان کے بڑوں کو گرمائے ہوئے تھا۔

کسی شاعر نے کہا ہے کہ نئی عمارت کی اٹھان اور اس کی تعمیر اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہم پرانی بنیادوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں لیکن پرانی تعلیم کی جڑوں کو اڑا دینے کی بارود نہ تو حرفہ ہے نہ اپنا خرچ آپ چلانے کا پہلو ہے یہ بارود تو ارتباط نصابی ہے اگر ہم ارتباط کو کامیاب کر دکھائیں گے تو ہم پرانی تعلیم کے کھلاڑی کو اس کی چال پر۔ اس کی زد سے مات دے سکیں گے۔ اس کے بعد ہمارے سامنے تعمیری میدان کھلا ہوگا جہاں ہم نئے اصولوں نئے طریقوں کی امداد سے ایک نیا کعبہ۔ ایک نیا تعلیمی بیت المقدس تعمیر کر سکیں گے۔

عبدالغفور صاحب ایم۔ اے
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مارکسزم اور فلسفہ اخلاق

مارکسی اخلاقیات کی بنیاد ہیگل کی جدلیات اور فیورباخ کے نظریہ سائنسی انسانیت نے ڈالی ہے۔ فیورباخ نے وقتی قابل احترام مذہبی دینی اور مابعد الطبیعاتی عقائد سے کنارہ کش ہو کر گوشت پوست کے انسان کو اس رنگ و بو والی دنیا میں لاکھڑا کیا۔ اس نے ہر ایک چیز کو یہاں تک کہ عقائد کو بھی انسانی معیار سے پرکھا۔ مارکس اور اینگلس نے اس مجرد تصور کو جس میں انسان جمودی فرد کی حیثیت رکھتا ہے بدل دیا۔ انھوں نے انسان کا متحرک اور اجتماعی وجود تصور کیا۔ اس طرح فلسفہ مارکس نے فیورباخ کے نظریہ انسانیت کو ترقی دے کر تاریخی اور سماجی اصولوں کو جدلیات پر پرکھ کر سمجھنے میں مدد پہونچائی۔ فیورباخ کی تنقید بہت زیادہ وسیع اور بڑی حد تک تجزیہی ہے اس وجہ سے ہر چیز ایک نئی روشنی میں ظاہر ہوتی ہے۔ پھر تھوڑے بہت دقیانوسی خیالات کے اثرات کی وجہ سے اس کے نظریہ میں کہیں کہیں مذہبی اور دینی رموز بھی جھلکتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمیں مذہب کی بنیادی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے یعنی یہ کہ عقائد کی بنیاد انانیت (Egoism) پر ہے لیکن فیورباخ کے فلسفہ میں ایک بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے اس کے اور مارکس کے فلسفہ میں اختلاف ہے۔ فیورباخ کے خیال میں انسان کی ہستی اس کے احساس اور شعور کو پیدا کرتی ہے اور خود اس کے اپنے قوانین کی محکوم ہے۔ مگر آخر وہ قوانین ہیں کیا؟ وہ کس طرح اثر ڈالتے ہیں؟ فیورباخ ان سوالات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ انسان ہر چیز کی تشریح کرتا ہے لیکن بدقسمتی سے خود انسان کی کوئی تشریح نہیں کی گئی اور وہ خود اپنی جگہ پر ایک ناقابل تشریح تسم مان لیا گیا۔

<u>مارکس نے کس طرح تشریح کی</u> | مارکس نے یہ بتایا کہ انسان کا شعور اس کے طبعی ماحول کا نتیجہ ہے لیکن انسان کا ذہنی ارتقا نتیجہ ہے سماجی ماحول کا، جو کہ بعد میں انسان کی طبعی ہستی کے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر انسان کو اپنی جگہ پر مکمل معیار تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کے خیالات اور افعال ہر زمانہ اور ہر مختلف ماحول میں یکساں ہوتے ہیں۔ اس سے ہمیں مجبوراً یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑے گا کہ سچائی ایک غیر متغیر چیز

ہے اور اخلاق کے قوانین بھی کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔

انسان کی ہستی کو قائم رکھنے کی جدوجہد انفرادی نہیں اجتماعی ہے۔ تاریخ کے آغاز سے ہی انسان کی ہستی سماجی ہے اس لئے انسان کی ہستی اور اس کے خیالات جن قوانین کے محکوم ہیں انہیں ہم کو اس کے اجتماعی روابط میں تلاش کرنا چاہیئے۔ مارکس نے تاریخ کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ انسانی شعور اس ماحول کی پیداوار ہے جس میں وہ اپنی معاش پیدا کرتا ہے اور چونکہ معاش پیدا کرنے کے طریقے مختلف زمانوں میں بدلتے رہتے ہیں، اس لئے انسان کے خیالات اور ان کے اظہار کرنے کے طریقے بھی اسی مناسبت سے بدلتے رہتے ہیں۔ مذہب، فلسفہ، اخلاقیات، جمالیات اور قوانین سب ایک قسم کے ذہنی ڈھانچے ہیں۔ ان کی بنیاد معاشی روابط پر مبنی ہے جن سے افراد کی جماعتیں بنتی ہیں۔

زندگی کا بنیادی اصول جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ بحیثیت ایک اجتماعی ہستی کے اسے خود اپنی قسمت بنانا ہے تو وہ اپنے آپ کو مابعد الطبیعاتی فلسفہ، اخلاقیات کی زنجیروں اور عقائد کے بندھنوں سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کا بنیادی اصول نہ تو بالذات سچائی ہے اور نہ مجرد نیکی۔ وہ تبدیلی (یا تغیر پسندی) ہے۔ ایک مسلسل ترقی جس کی وجہ سے انسان روحانی اور اخلاقی ترقی کے مدارج طے کرتا رہتا ہے۔ انسان کے خیالات اور نصب العین ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں۔ انسان کی تاریخ تمدن اس تبدیلی کے عمل کی شاہد ہے۔ پرانے زمانہ میں سماجی تبدیلیاں بے تکے پن سے ہوتی تھیں۔ مگر جب سے انسان نے سائنس کی معلومات کے ذریعہ سے ایک طاقت حاصل کرلی ہے اس وقت سے اس نے مستقبل کی ترقی کے راستوں پر عبور حاصل کرلیا ہے۔ اسی وجہ سے خیالات کو ایک حسب اختیار تمیزی طاقت حاصل ہوگئی ہے اور انسان نے انھیں انسانی وجود سے متعلقہ باتوں پر ایک طرح کا عبور حاصل کرلیا ہے۔ چنانچہ اب پہلے سے ایک خاکہ تیار کرکے سماجی تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس لئے فلسفۂ اخلاق کو بھی تغیر پسند ہونا چاہئے تاکہ وہ انسانیت کے آنے والے سماجی ڈھانچے کو مزید اونچے معیار پر پہونچا سکے۔ صرف وہی اصول اور معیار جو مجموعی سماج کے تجربات سے اخذ کئے جاسکتے ہیں عام مقبولیت حاصل کرسکتے ہیں اور اس کے دعویدار ہوسکتے ہیں کہ عوام ان پر عمل پیرا ہوں۔ یہ اصول اور معیار کسی طرح بھی مفاد عامہ کے متضاد نہیں ہوسکتے۔ اس طرح اخلاقیات کے تصورات جو تجربہ پر مبنی ہوں سماجی ماحول کے ساتھ ساتھ بدلنا ضروری ہیں۔

روایتی فلسفہ اخلاق | فلسفہ اخلاق اپنی روایتی شکلوں میں جس کے اصول مقرر ہوتے ہیں ہمیشہ قایم شدہ سماجی نظام کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے ہی اصولوں کو جھٹلاتا ہے۔ وہ مفاد عامہ کے خلاف سماج کے صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے مفاد کو محفوظ رکھتا ہے۔ کس لئے؟ اس وجہ سے کہ مفاد عامہ کے لئے سماجی روابط میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے

روایتی اخلاقیات کی بنیاد نیکی اور بدی صحیح اور غلط، مناسب اور نامناسب اور اسی قسم کے تصورات پر موقوف ہے۔ جن کی حقیقت جھوٹے نگوں سے زیادہ نہیں۔ ان تصورات کی کبھی صاف صاف تعریف نہیں کی جاتی اور نہ یہ بتایا جاتا ہے کہ آخر ان کی ابتدا کیوں اور کیسے ہوئی؟ ہمیں ذرا غور کرنے کے بعد معلوم ہوجاتا ہے کہ ان تصورات میں باہم کس قدر تضاد ہے۔ جب ہمارے خیالات اور افعال ان تصورات کی مطابقت نہیں کرتے تو اس نظریہ کی رو سے برے ہیں۔ اس طرح جو چیز زمانہ حاضر میں بری ہے مستقبل میں اچھی ہے کیونکہ جب مفاد عامہ کے لئے سماجی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے تو پرانے اصولوں اور معیاروں پر نکتہ چینی کی جاتی ہے اور بعد میں نظرانداز کئے جاتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اسی وجہ سے کہ روایتی عقائد کے مقابلہ میں ایسی طاقتیں کام کرتی ہیں جنھیں سماجی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تبدیلی جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے زندگی کے بنیادی اصول پر مبنی ہے۔

انسان فطری طور پر غیر متعلد ہے | انسان فطری طور پر غیر متعلد ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اپنی ابتدائی حیوانیت کی حالت میں ہی قانع رہتا۔ اس لئے ہیگل کے الفاظ میں ــ "بجائے اس کے کہ پرانی باتوں کی طرح یہ دہرایا جائے کہ انسان کی فطرت نیک ہے، یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ اس کی فطرت بری ہے" جب کبھی بھی انسان نے کوئی قدم آگے بڑھانا چاہا اسے ہمیشہ قائم شدہ نظام کے قوانین اور روایتی اخلاقیات کے اصولوں کو توڑنا پڑا۔ غالباً اسی وجہ سے ہم ہندوستانیوں میں بھی مغربی تہذیب کو برا بھلا کہنے کی عادت ہے۔ موجودہ مغربی تہذیب کے اصول روایتی اخلاقیات کے قوانین کے مطابق نہیں ہیں جو فرسودہ تہذیب کا آئینہ ہیں اور اسی وجہ سے برے کہے جاتے ہیں۔ لیکن وہ ان لوگوں کے لئے مناسب اور ضروری ہیں جو رجعت پسند سماجی نظام کو ختم کرنے کے بعد فائدہ حاصل کریں گے

فلسفہ اخلاق میں اسی وقت انقلاب پیدا ہو سکتا ہے جب ہم اپنے دماغ سے اقدار مطلق کے تصور کو نکال باہر کریں۔ اسی صورت میں ہم لوگوں میں عدم تقلید کا احساس پیدا کر سکتے ہیں جو کہ زندگی کا بنیادی اصول ہے۔ مارکسزم ایک انقلابی فلسفہ ہے جو سماجی تبدیلی کے عمل کو آگے بڑھاتا ہے۔ جو انسان کی ترقی اور مفاد کے لئے ضروری ہے۔ مارکسزم کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ اس فلسفہ اخلاق سے کنارہ کشی اختیار کرے جو عقائد پر مبنی ہے اس سے صرف کنارہ کشی ہی اختیار نہیں کیجاتی بلکہ مارکسزم علوم سائنس کی روشنی میں پرانے عقائد کا بھانڈا پھوڑ کر انہیں خود بخود ختم کر دیتا ہے۔

مذہب اور اخلاقیات | خاص طور پر مغرب میں اخلاقیات کی بنیاد پرانے نظریہ فطرت پرستی پر قائم ہوئی۔ اس نظریہ پر مذہب کا اثر بہت کم تھا۔ مغربی فلسفہ اخلاق کا بانی سقراط ہے جو اس زمانے کے مذہب کے مطابق دیوتاؤں کا معتقد نہ ہونے کی وجہ سے مارا گیا۔ قرون وسطیٰ میں "نظریہ انسانیت" اور "عقلی مابعد الطبیعات" نے ان جذبات کی ترجمانی کی جو اعتقادی مذہب اور باطنی دینیات کے خلاف پیدا ہو گئے تھے۔ پھر بھی فلسفہ اخلاق خواہ قدیم ہو یا موجود اس کے تصورات کی بنیاد عقیدہ ہے ان تصورات کا سرچشمہ وجدان (Intuition) ہے جس کی خود تشریح نہیں کی گئی۔ اس لئے مجبوراً آخری معیار وجدان ہی تصور کر لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ کے ایسے نظام کی بنیاد کھوکھلی اور کمزور ہونا چاہئے یہی وجہ ہے کہ اس کمزوری کی پردہ پوشی کے لئے ایسے معیار کو مافوق الفطرت اور مابعد الطبیعاتی دنیا کے احکامات سے منسوب کیا گیا۔

فلسفہ اخلاق کا بانی تو سقراط تھا مگر اس کے شاگرد رشید افلاطون نے اپنے استاد کے اصولوں کی تشریح کی اور ان سے ایک مابعد الطبیعاتی "نظام اخلاق" اخذ کیا۔ سقراط کی غیر مذہبی تعلیم کی یہی مابعد الطبیعاتی بنیاد بعد میں جا کر عیسائی دین کی فلسفیانہ بنیاد ہو گئی۔

ہندوستان اور فلسفہ اخلاق | ہندوستان میں صحیح معنوں میں کوئی خاص فلسفہ اخلاق کا نظام تعمیر ہی نہیں ہوا جو مذہب کے بندھنوں سے آزاد ہو۔ ہر نظام کی بنیاد کوئی نہ کوئی مقدس کتاب ہے۔ انفرادی اور اجتماعی افعال کے قوانین اور اصول، اخلاق کے ان تصورات سے مختلف ہیں جو انسان کو بغیر مذہبی رسومات کے ادا کئے روحانی ترقی پر پہونچاتے ہیں اس کے علاوہ ذات مطلق کا خیال جو کہ اخلاق کے اعتقادی تصورات پر مشتمل

سب ہے۔ فلسفہ اخلاق کی بنیاد ہے۔ اسی وجہ سے نیکی، انصاف بھلائی وغیرہ اسی قسم کے متعین معیار انسانی اعمال کے مشعل راہ مانے جاتے ہیں لیکن اگر کسی فلسفہ اخلاق کے ماہر سے دریافت کیجئے کہ نیکی کیا ہے؟ تو اس کے کل جواب کا مطلب یہی ہوگا کہ نیکی وہی ہے جو نیکی کے تصور سے مطابقت کرے! پھر اسی سے نیکی کی تعریف دریافت کی جائے تو آپ کو یہ جواب ملے گا کہ اس اصطلاح کا کوئی تجزیہ یا تشریح نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کا تعلق دماغ سے نہیں ضمیر یا دل سے ہے! دوسرے الفاظ میں وہ ایک مجرد تصور ہے اس لئے مابعد الطبیعاتی ہے۔

موجودہ فلسفہ اخلاق افلاطون کے فلسفہ کی ترقی یافتہ شکل ہے "اخلاقی نظام" کا یہ غیر عقلی تصور خیالی دنیا کی ایک حماقت ہے اس لئے فرض کر لیا گیا ہے کہ انسان جبلی طور پر اخلاق کا معیار وجدانی مانتا ہے۔ اگر نظری اعتبار سے یہ تسلیم کر لیا جائے تو ہر شخص کا فعل اخلاقاً جائز ہے لیکن عملی دنیا میں فلسفہ اخلاق اعتقادی ہو جاتا ہے اور انسانی افعال کے لئے قوانین وضع کرتا ہے جب نظریہ اور عمل میں اختلاف ہوتا ہے تو اس کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے کہ ماحول کی وجہ سے ضمیر کی روشنی کم ہو گئی یا عام الفاظ میں قلب سیاہ پڑ گیا! اس وجہ سے جبلت "اخلاقی نظام" پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔ اس لئے نیکی جو انسان کی سرشت میں داخل ہے صرف انسانوں ہی میں پائی جاتی ہے جو اپنے آپ کو ان کے ماحول سے بلند رکھ سکتے ہیں! یعنی نیکی ایک منعکس شعاع ہے جو صرف پاک روحوں پر پڑتی ہے۔

فلسفہ اخلاق اضافی ہے | جب ہمیں یہ علم ہو جاتا ہے کہ مطلق سچائی ایک کھوکھلا تصور ہے تو نتیجہ میں فلسفہ اخلاق کا کل ڈھانچہ خود بخود منہدم ہو جاتا ہے۔ انقلابی جستجو صرف موجودہ علوم سائنس کی روشنی ہی میں کی جا سکتی ہے جس کا فلسفیانہ ماحصل مارکسزم ہے۔ اخلاقی اقدار مطلق نہیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ ایک چیز اگر انسان کے لئے اچھی ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ دوسروں کے لئے بھی اچھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے لئے بری ہو۔ پھر کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا وقتی بھی ہو سکتا ہے آج ایک چیز اچھی ہے وہی کل بری بھی ہو سکتی ہے اس لئے کوئی چیز بھی بذات خود قطعی طور پر اچھی یا بری نہیں کہی جا سکتی نظریہ قطعیت کو اس رنگ و بو کی دنیا کے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے اس نظریہ کی اہمیت جس کی بنیاد عقیدہ اور مابعد الطبیعات پر ہو خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سائنس نے فلسفہ اخلاق میں ایک انقلابی روح پھونک دی ہے۔

نظریہ انسانیت کیوں مناسب نہیں ہے | نظریہ انسانیت اگرچہ عقائد کی سختیوں کو جنہیں مافوق الانسان قسم کی

چیزوں کی سرپرستی حاصل ہے ختم کرنا چاہتا ہے مگر اس کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے۔ یہ سختیاں جو اخلاقیات یا دوسرے ذرائع سے عائد کی جاتی ہیں صرف اسی وقت ختم ہو سکتی ہیں جب ہم ما فوق الانسان چیزوں کے بجائے خارجی تجربی اور قابل فہم فطرت کی حقیقتوں کو انسانی افعال کردار کا معیار بنائیں نظریۂ انسانیت ایسا نہیں کرتا۔ وہ ما فوق الانسان طاقت سے تو جھگڑتا ہے مگر انسان کے مجرد تصور کو فطرت سے بلند رکھتا ہے۔ اس طرح ہمیں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی کیونکہ انسان کو خاص، وقتی، تاریخی اور اجتماعی ماحول سے علیحدہ رکھا جاتا ہے جو حقیقت کے بالکل خلاف ہے وہ انسانی فطرت کو دائمی، غیر متبدل اور جبلی طور پر نیک تصور کرتا ہے۔ انسانی فطرت کے ایسے تصور اور روح کی ابدیت میں نیز ما فوق الانسانی چیزوں اور ما بعد الطبیعاتی اخلاقی نظام میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا کیونکہ دونوں میں خارجی حقیقت نہیں پائی جاتی۔

انسانی فطرت بدلتی رہتی ہے انسان ما فوق انسانی اور ما بعد الطبیعاتی رموز کی سختیوں اور تشدد سے اسی وقت آزاد ہو سکتا ہے جب اپنے آپ کو اس طبعی دنیا کا ایک جز سمجھنے لگے۔ فلسفہ اسی وقت مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے جب انسانیت کا نظریہ فطرت پر مبنی ہو نہ کہ اخلاقیات پر۔ انسان کی فطرت اسی طرح تغیر پذیر ہے جس طرح فطرت کے دوسرے پہلو متغیر ہیں۔ اگرچہ انسان میں ذہنی اور جذباتی کیفیات پائی جاتی ہیں مگر وہ پھر بھی طبعی کائنات کا ایک جز ہے۔ اس لئے انسان کی فطرت کا ابدی اور غیر متغیر تصور جس کی کوئی تشریح نہیں کی جا سکتی اخلاقی اقدار کا آخری معیار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ انسانی فطرت چونکہ بدلتی رہتی ہے اس لئے قدر کے معیار بھی بدلتے رہنا چاہئیں۔ اگر ہم ذرا سمجھ کر اجتماعی ارتقا کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم مجبور ہوں گے کہ انسان کی غیر متغیر فطرت کے تصور کو خیرباد کہدیں۔

اخلاق کے معیار زمان و مکان کے اعتبار سے بلحاظ طبعی ماحول اور سماجی حالات جن میں کہ انسان رہتا ہے بدلتے رہتے ہیں۔ انسان ایک اجتماعی حیوان ہے اس کی فطرت اسی ماحول سے بنتی ہے جس میں وہ سوسائٹی کے مفاد کے لئے اور اپنے وجود کو قائم رکھنے کے لئے کام کرتا ہے یا کام کرنے کے لئے مجبور ہوتا ہے انسانی سوسائٹی ایک جامد اور بے جان جماعت نہیں ہے وہ ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس کے وجود کو قائم رکھنے کے ذرائع اور طریقے اور اسکی اجتماعی ترقی اور مفاد کی وجوہات بدلتی رہتی ہیں جن سے انسان کے اخلاقی تصورات پر اثر پڑتا رہتا ہے انسان کی کوئی انفرادی ہستی نہیں ہے اور نہ وہ اجتماعی روابط سے آزاد ہے۔ اسے اپنی انفرادیت کا خیال بحیثیت جماعت کے

ایک فرد کے ہوتا ہے اس انفرادیت کو بنانے والا بھی جماعت کا ماحول ہوتا ہے۔ انسان مجموعہ ہے تاریخی اور اجتماعی تجربات کا۔ اس لئے اخلاقیات ایک اجتماعی فلسفہ ہے۔ اخلاق کے قوانین سماجی ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بنتے ہیں۔ اس لئے اقدار کا معیار جماعت کا مفاد ہے۔

مارکسی اخلاقیات | فلسفہ اخلاق کے تصورات ذہنی، مابعد الطبیعاتی، باطنی اور غیر استدلالی ہیں۔ مثلاً نیکی بذات خود ایسے تصورات کا مقصد شعوری یا غیر شعوری طور پر قائم شدہ سماجی نظام کو قائم رکھنا ہے جو سماج کے کسی ایک طبقہ کے مفاد کے لئے ہے۔ ایسا فلسفہ کل سوسائٹی کے عام مفاد کا ہمدرد نہیں ہو سکتا ایک غیر متغیر مطلق اخلاقی نظام پہلے ہی اسے ایک غایاتی نظام فرض کر لیا گیا ہے مثلاً دنیا اس طرح کی ہے کیونکہ اس کے علاوہ وہ دوسری طرح کی ہو نہیں سکتی کیونکہ اسے کسی مافوق انسان نے بنایا ہے اس طرح کے تصورات انسان کی ذہنیت کو پست بناتے ہیں اور جد وجہد کی صلاحیتوں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ نتیجہ میں انسان مجبور محض بن جاتا ہے اور اپنے مفاد کے لئے بھی جد وجہد نہیں کر سکتا۔

مارکسزم، اخلاقیات کو مخفی اور باطنی مابعد الطبیعات اور اسی قسم کی چیزوں سے علیحدہ رکھتا ہے اس کے مطابق اخلاق کا معیار سوسائٹی کا مفاد ہے۔ اگر کسی سوسائٹی کا نظام صرف ایک طبقہ کے مفاد کی جس میں چند افراد شامل ہیں، حفاظت کرتا ہے تو ایسے نظام کے قوانین غیر مفید ہیں۔ سوسائٹی کے عام مفاد کے لئے ایسے قوانین کا ختم کرنا ہی ضروری ہے اگرچہ قائم شدہ نظام کے مطابق ایسا کرنا اخلاقیات کے اصولوں کے خلاف ہے۔ اس طرح وہ انسان کو اس لائق بنا دیتا ہے کہ وہ خود بجز دبغیر کسی جبر کے اخلاقی قوانین پر جو کہ پوری جماعت کے لئے مفید ہیں عمل کرے اور ان قوانین کی پابندی کرے۔

مارکسی اخلاقیات کا بنیادی اصول نتورس کے ان الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے :-

"میں دیوتاؤں کے ظلم سے آزاد ہونا چاہتا ہوں تاکہ میں نیک بن سکوں کیونکہ نیک بننے سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے۔"

مرزا محمد اشفاق احمد صاحب بی اے ایل ایل بی

رسوم ورواج اور ان کی خصوصیات

رسوم ورواج کی ماہیت اور سماجی زندگی میں ان کی اہمیت کے متعلق ولیم گراہم سمنر (۱۸۴۰-۱۹۱۰ء) پروفیسر عمرانیات ییل یونیورسٹی نے نمایاں تحقیق کی ہے بسلسلہ ۱۹۰۶ء میں اس کی ایک کتاب "Folk Ways" کے عنوان سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۶۹۲ صفحات، بیس ابواب اور ایک اشاریہ ضمیمہ پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں سمنر نے عادات و اطوار اور رسوم ورواج کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔ عادات و اطوار اور رسوم ورواج میں فرق کیا ہے، رسوم ورواج کی خصوصیات بتلائی ہیں اور معاشرتی زندگی میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ مزید براں غلامی، اسقاط حمل، طفل کشی، مردم خوری اور بوڑھیوں کو مار دینے کے جو طریقے زمانہ ماسبق میں مروج تھے انکا دلچسپ پیرائے میں ذکر کیا ہے عمرانی نقطہ نظر سے اس کتاب کا مطالعہ باعث دلچسپی اور معلومات ہوگا۔

سمنر نے طور طریق یا عادات و اطوار کے لئے "فوک ویز" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور رسوم ورواج کو "مورس" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ "مورس" ایک لاطینی لفظ "موس" کی جمع ہے جس کے معنی رسوم ورواج کے ہیں۔ طور وطریق عادات و اطوار کی ابتدا انسانی ضروریات و احتیاجات کی وجہ سے ہوئی۔ بھوک، محبت، شیخت اور ڈر انسانی جدوجہد کی چار اہم تحریکات ہیں۔ اگر اپنی روزمرہ زندگی پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ ہماری ہر جدوجہد براہ راست یا بالواسطہ جزاً یا کلاً مذکورہ چار تحریکات میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ وابستہ نظر آئے گی۔ ان ہی تحریکات کی وجہ سے ہم مختلف نوعیت کی جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ جدوجہد جس قدر ․ ․ ․ وسیع ہوگی طور طریق اور عادات و اطوار بھی اسی قدر وسیع ہوتے جائیں گے کسی مخصوص احتیاج کے رفع کرنے کے لئے جب ایک ہی نوعیت کی جدوجہد کو بار بار دہرایا جائے گا تو وہ عادت بن جائے گی۔ انسان کی چند احتیاجات فطری اور جبلی ہیں لیکن اکثر اکتسابی اور عادتی ہوا کرتی ہیں۔ فطری احتیاجات کی بجائی کے سلسلے میں اکتسابی اور عادتی احتیاجات رونما ہوتی ہیں۔ انفرادی عادات جب پسندیدہ اور مقبول عام ہوتے ہیں تو انھیں اجتماعی ترتیب حاصل ہوجاتا ہے اور بعد ازاں اجتماعی عادات و اطوار، رسوم ورواج کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں۔ چنانچہ

تیمز نے طور طریق اور رسوم و رواج پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انفرادی خصائل عادات و اطوار ہیں اور اجتماعی خصائل رسوم و رواج کہلاتے ہیں۔ رسوم و رواج درحقیقت کسی سوسائٹی یعنی سماج یا معاشرہ کے وہ مروجہ طور طریق ہیں جن پر عمل کر کے مختلف احتیاجات، خواہشات، اعتقادات، توہمات اور وجدانیات وغیرہ کی تکمیل کی جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی میں رسوم و رواج کا حصہ بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ رسوم و رواج کا اثر محض معاشرتی زندگی تک محدود ہے۔ سیاسی اور معاشی زندگی سے بھی رسوم و رواج کا بہت ہی قریبی اور گہرا تعلق ہوتا ہے۔ سیاست اور معیشت کی تشکیل، ترقی یا تنزل میں رسوم و رواج کی اہمیت کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذیل میں ہم رسوم و رواج کی مختلف خصوصیات کا ذکر کریں گے۔

۱۔ رسوم و رواج کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تشکیل کسی مقررہ کمیٹی کی جانب سے کسی خاص پروگرام یا لائحہ عمل کے تحت نہیں ہوتی بلکہ وہ موسمی حالات، جغرافیائی ماحول اور دیگر امور کا لحاظ کرتے ہوئے خود بخود رونما ہوتے ہیں۔

۲۔ جسمانی عضو کی طرح رسوم و رواج بھی ترقی کرتے اور تنزل کی طرف مائل ہوتے ہیں لیکن جسمانی عضو کی رفتار ترقی یا تنزل کے مقابل رسوم و رواج کی ترقی یا تنزل کی رفتار سست ہوتی ہے جسمانی عضو کی عمر مقابلتاً محدود ہوتی ہے اور رسوم و رواج بالعموم طویل عرصہ تک باقی رہتے ہیں

۳۔ رسوم و رواج نسلاً بعد نسلاً چلے آتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ کوئی رسم کسی معاشرہ میں شروع ہو جاتی ہے تو اس کا سلسلہ مدتوں جاری رہتا ہے۔ رسوم و رواج کی ابتدا اور وجہ ابتدا کے متعلق مابعد نسلیں بالعموم نابلد رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود نہایت شدت کے ساتھ اس کی پابندی کی جاتی ہے وجہ یہی بتلائی جاتی ہے کہ "چونکہ باپ دادا نے ایسا کیا تھا لہذا ہم بھی کر رہے ہیں"

۴۔ مختلف قوموں کے رسوم و رواج مختلف ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے رسوم و رواج اور جاپان و چین کے رسوم و رواج میں اختلافات پایا جائے گا۔ اسی طرح ایشیائی ممالک کے مقابل یورپی ممالک کے رسوم و رواج جداگانہ ہوں گے۔ اگر ہم ہندوستان اور انگلستان کے رسوم و رواج کا مقابلہ کریں تو یہ فرق بخوبی واضح ہو جائے گا۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی ملک میں رہنے والی مختلف ذاتوں اور فرقوں کے رسوم و رواج جدا جدا

نظر آئیں گے۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ رسوم و رواج کی حیثیت اضافی ہوتی ہے۔ وقت، مقام اور جماعت یا گروہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے منجملہ اور امور کے اس اختلاف کی ایک اہم وجہ موسمی حالات اور جغرافی خصوصیات ہیں۔

۵۔ رسوم و رواج میں بہ سرعت تبدیلی کرنا بہت ہی دقت طلب ہے بلکہ ناممکن ہے اگر رسوم و رواج کی قوت اور استحکام کا لحاظ کئے بغیر ان میں تبدیلی کی کوشش کی جائے تو خطرناک اور ناخوشگوار نتائج برآمد ہونگے رسوم و رواج میں تبدیلی کی جا سکتی ہے لیکن اس میں سماج کی مرضی کو بہت بڑا دخل ہے

۶۔ مختلف قوموں کے ارتباط بین دین اور میل ملاپ کی وجہ سے رسوم و رواج میں بتدریج تبدیلی ہوتی ہے اور مشترک نوعیت کے رسوم و رواج خود بخود رونما ہوتے ہیں۔ رسوم و رواج کی تبدیلی میں سب سے اہم حصہ ربط اور ارتباط کا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی تسلط اور استحکام کے بعد یہاں کی سابقہ تہذیب اور رسوم و رواج پر اسلامی تہذیب اور رسوم و رواج کا اثر پڑا اور اکثر رسوم و رواج میں مشترکہ خصوصیات پیدا ہوئیں۔ اسلامی حکومت کے زوال کے بعد انگریزی تسلط اور استحکام کی وجہ سے ہمارے طور طریق عادات و اطوار اور رسوم و رواج پر انگریزی تہذیب و تمدن کا نمایاں اثر پڑ رہا ہے۔ روزمرہ زندگی میں اس کی بیسیوں مثالیں مل سکتی ہیں تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہندوستانی باشندوں کے عادات و اطوار اور رسوم و رواج انگریزی تہذیب سے بہت کچھ متاثر ہو چکے اور ہو رہے ہیں جس کی بنیادی وجہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کا باہمی ربط ہے

۷۔ رسوم و رواج کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی میں افراد کی رہنمائی کرتے ہیں، انفرادی جدوجہد پر ان کا اقتدار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور ہماری ہر قسم کی جدوجہد اپنے معاشرہ کے رسوم و رواج کے مطابق ہوتی ہے ہم وہی غذا استعمال کرتے ہیں جو ہمارا معاشرہ استعمال کرتا ہے۔ ہم وہی لباس پہنتے ہیں جو ہمارے معاشرے کے دیگر افراد پہنا کرتے ہیں ہم اسی نوعیت کے مکانات میں رہتے ہیں جس نوعیت کے مکانات میں ہمارے معاشرے کے دیگر ارکان رہتے ہیں۔ پیدائش سے لے کر موت تک ہم رسوم و رواج کے پابند نظر آئیں گے۔

۸۔ رسوم و رواج اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی بعض رسوم و رواج اور طریقے کسی زمانہ میں مفید

ہوتے ہیں اور کسی زمانے میں مضر مفید رسوم و رواج کی ترویج اور مضر رسوم و رواج کا ترک کرنا سماجی خوشحالی کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان میں سماجی خوشحالی کے دیگر امور کی اصلاح کے علاوہ تخریبی رسوم و رواج کی اصلاح کا مسئلہ بھی بہت اہمیت رکھتا ہے کسی ملک کی سیاست اور معیشت حقیقی معنی میں اس وقت تک ٹھیک نہیں ہو سکتی جب تک معاشرتی حالات میں بھی مناسب حال ترمیم نہ کی جائے۔

۹۔ تعلیم یافتہ افراد کے مقابل غیر تعلیم یافتہ افراد پر رسوم و رواج کا اثر اور اقتدار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ جو معاشرہ جس قدر غیر تعلیم یافتہ ہوگا وہ اسی قدر قدامت پرست اور قدیم رسوم و رواج کا پابند نظر آئے گا۔ ہندوستان کی دیہی آبادی اس کی نمایاں مثال ہے۔ قدیم رسوم و رواج کا اثر دیہی معیشت پر بہت نمایاں نظر آئے گا۔

۱۰۔ رسوم و رواج کو گو کہ قانونی حیثیت حاصل نہیں ہوتی تاہم ان کی پابندی قانونی احکامات کی طرح کی جاتی ہے۔ ان کی قوت اس قدر ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ تحفظ ذات کے جذبات کو بھی اس کی پابجائی کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے۔ ستی کی رسم کے تحت بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ نذر آتش ہو جانا پڑتا تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ تکلیف سے بچنے کی خواہش انسانی جبلت میں داخل ہے کون عورت جیتی جاگتی آگ میں جل جانے کے لئے بخوشی رضامند ہو گی مگر معاشرہ کے رسوم و رواج اسے بے زبان بنا دیتے تھے اور وہ بغیر کسی دفاعی کوشش کے ستی ہو جاتی تھی اولاد کے ساتھ ماں باپ کی محبت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اس سے ہم سب واقف ہیں لیکن ستی ہونے والی عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی کو جیتے جی جلتا ہوا دیکھ سکتے تھے لیکن رسم ستی کی مخالفت کی سکت ان میں نہ تھی۔ نومولود لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کا جو طریقہ عرب میں مروج تھا اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ رسوم و رواج کے آگے ماں کی ممتا بھی بے سود ثابت ہوتی ہے۔ کون عورت بخوشی گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی بچی کو زندہ درگور کر دیا جائے محض یہ رسوم و رواج کی قوت ہے کہ ناقابل برداشت امور بھی قابل برداشت ہو جاتے ہیں۔ رسوم و رواج کو در حقیقت نفس اجتماعی (سوشیل مائنڈ) کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور بہت کم افراد میں نفس اجتماعی (جس کا مظاہرہ طور طریق اور رسوم و رواج کے ذریعہ ہوتا ہے) کا مقابلہ کرنے کی استطاعت ہوتی ہے۔ جو افراد تعمیری نقطہ نظر سے نفس اجتماعی کا مقابلہ کرتے ہیں وہ مصلح معاشرت ہوتے ہیں۔ ہر شخص میں یہ صلاحیت نہیں ہو سکتی نفس اجتماعی کے آگے نفس انفرادی کو بالعموم سر جھکانا پڑتا ہے۔ بعض ہندو فرقوں میں اب بھی بیوہ عورتوں کا سر مونڈ دیا جاتا ہے

کوئی عورت اس سلوک کو بخوشی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ ہوگی لیکن نفس اجتماعی اور سماجی رسوم و رواج کی قوت کے آگے وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر نوجوان بیوہ عورتیں اس وجہ سے اپنی ساری عمر یوں ہی میں گذارنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں کہ عقد ثانی کے طریق کو سماج کی نگاہ میں عیب تصور کیا جاتا ہے۔ بالغ بیواؤں سے کہیں زیادہ افسوسناک حالت نابالغ بیواؤں کی ہوتی ہے جنھیں معاشرہ کے رسوم کے مطابق ساری عمر سوگ میں گذارنا پڑتا ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کا قوی ترین اور منظم ترین ادارہ حکومت ہے لیکن ہر قسم کی فوجی اور حربی طاقت کے باوجود حکومت کے لئے بھی یہ ناممکن ہے کہ وہ تخریبی رسوم و رواج کا یک لخت خاتمہ کر دے۔ کیونکہ کسی قسم کا عملی اقدام کرنے سے قبل ملکی روایات اور رسوم و رواج کا پورا پورا لحاظ ضروری ہوتا ہے ورنہ بحالت دیگر خطرناک نتائج رونما ہوتے ہیں۔ امیر امان اللہ خاں کی اصلاحی کوشش واقعی تعمیری حیثیت رکھتی تھی لیکن سماجی روایات اور رسوم و رواج کو نظر انداز کرنے سے جو نتائج برآمد ہوئے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ رسوم و رواج کی اسی اہمیت اور قوت کے پیش نظر قدیم مفکرین نے انھیں "معاشرہ کا بادشاہ" کہا ہے۔ شیکسپیر نے "ظالم" کا لقب دیا ہے اور بیکن نے "انسانی زندگی کا سب سے بڑا مجسٹریٹ" قرار دیا ہے۔ تارد کہتا ہے کہ "انسان کو رسوم و رواج کے پنجہ سے چھٹکارہ نہیں۔ اگر ایک نوعیت کی رسم سے رہائی پاتا ہے تو پھر دوسری کا شکار ہو جاتا ہے" بہرصورت انسان کے لئے رسوم و رواج کی پابندی لازمی اور ضروری ہوتی ہے۔ حکومتی قوانین کی خلاف ورزی ہو سکتی ہے لیکن رسوم و رواج کی خلاف ورزی ممکن نہیں۔ ہر شخص کیلئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ سماج کے طور طریق اور اپنے عادات و اطوار میں مطابقت پیدا کرے ورنہ وہ رکن معاشرہ کی حیثیت سے زندگی نہیں بسر کر سکتا۔

محمد ناصر علی صاحب ایم۔اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبہ معاشیات

بھید

(ترجمہ کینڈڈا، مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(برگیس کا لہجہ اور زبان خاص لندن کے جاہل لوگوں کی بولی میں ہے۔ اس کے الفاظ ادھ کچرے ہوتے ہیں۔ جوہ ھ میں۔ جو منہ سے نہیں نکالتا اور جہاں ہ لگانا ہوتا ہے وہاں اڑا جاتا ہے اور جہاں ضرورت نہیں ہوتی وہاں لگاتا ہے جس طرح ہمارے ہندوستان کی بولیوں میں جہلا خ اور ق کو الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ یا یہاں کو ہیاں، افسوس کو ہفسوس، جا رہے کو جا ریے یا کہہ دیا کو کیہ دیا کہتے ہیں۔ ترجمہ میں ملیس زبان ہی رکھی گئی ہے) (مترجم)

برگیس۔ (چوکھٹ پر رکتے ہوئے اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ مسٹر مارل یہاں موجود ہیں۔

پ۔ (اٹھتے ہوئے) میں جا کر بلائے لاتی ہوں۔

ب۔ (اس کی طرف ناامیدی سے گھورتے ہوئے) آپ وہ نوجوان لیڈی نہیں جو یہاں پہلے ٹائپ کیا کرتی تھیں؟

پ۔ جی نہیں۔

ب۔ (آتش ان کی طرف بڑھتے ہوئے اور زیر لب بڑبڑاتے ہوئے) ہاں! وہ آپ سے کم عمر تھیں کیوں نا؟ (مس گارنٹ اس کی طرف تکنے لگتی ہے، پھر دروازے کو زور سے بند کرتی ہوئی باہر چلی جاتی ہے) کیا اپنے گشت پر جا رہے ہو مسٹر مل؟

ل۔ (اپنی یادداشت کو تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) جی ہاں مجھے جلدی جانا ہے۔

ب۔ (فوراً) مسٹر مل میں آپ کو روکنا نہیں چاہتا۔ مجھے مسٹر مارل سے ایک نجی کام ہے اور اسی لئے میں آیا ہوں

ل۔ (جھنجلا کر) میرا ہرگز ارادہ مداخلت کا نہیں مسٹر برگیس، گڈ مارننگ

ب۔ (نہایت شفقت سے)

(جیسے ہی لیکسی جاتا ہوتا ہے مارگی واپس آتا ہے)

م۔ (لیکسی سے) کیا چل دیئے؟

ل۔ جی ہاں۔

م۔ میرا ریشمی رومال لے لو اور گلے میں لپیٹ لو، باہر ہوا بہت سرد ہے۔ جاؤ۔

(لیکسی اس عنایت سے برگیس کی ناملائمت بھول جاتا ہے، خوش ہوتا ہے اور چلا جاتا ہے)

ب۔ جیمس بس تم اپنے ماتحتوں کو ہمیشہ خواب ہی کیا کرتے ہو گڈ مارننگ میں جب کسی اپنے ملازم کو کچھ دیتا ہوں اور جس کی کمائی کا انحصار مجھ ہی پر ہوتا ہے تو میں اس کو بس اسی کی اوقات ہی پر رکھتا ہوں۔

م۔ (ذرا تیزی سے) میں ہمیشہ اپنے نائبوں کو اپنا ساتھی اور مددگار سمجھتا ہوں، اور اس لئے جتنا وہ میرا خیال کرتے ہیں اگر اتنا ہی کام آپ کو اپنے کلرکوں اور آدمیوں سے حاصل ہو جائے تو آپ بہت جلد امیر ہو جائیں لیجئے اپنی پرانی کرسی (وہ ذرا ترشروئی سے اُس آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آتشدان کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ اس کے بعد ایک خالی کرسی میز سے اٹھالیتا ہے اور اپنے مہمان سے ذرا فاصلہ پر بیٹھ جاتا ہے)

ب۔ (بغیر حرکت کئے) تم بس ویسے ہی رہے جیمس!

م۔ آپ جب پچھلی دفعہ آئے تھے یعنی کوئی تین برس کا عرصہ گذرا جہاں تک میرا خیال ہے تو آپ نے یہی بات ذرا اور صفائی سے کہی تھی۔ آپ کے صحیح الفاظ اس وقت یہ تھے: "جیمس! ہاں تم وہی ہمیشہ کے ایسے بڑے بیوقوف ہی رہے!"

ب۔ (لطف، اطمینان دلاتے ہوئے) غالباً۔ ہاں میں نے ایسا کہا تھا لیکن (مصالحت کے لہجہ میں خوش کرتے ہوئے) میرا مطلب اس سے کوئی تکلیف پہونچانا نہیں تھا۔ ایک پادری کو اس کا حق ہوتا ہے کہ وہ ذرا بیوقوف بھی ہو یہ تو تم جانتے ہی ہو بلکہ اس کے پیشے کے لئے یہ ضروری بھی ہے۔ بہرحال میں پرانی بدمزگی کو یاد کرنے نہیں آیا ہوں اس لئے گذشتہ پر صلواۃ بھیجو (یکایک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اور ماریل کے قریب

آتے ہوئے) جیمس تین سال کا عرصہ گذرا تم نے میرے ساتھ بڑا گھاٹا کیا تھا تم نے میرا ایک ٹھیکہ تڑوا دیا تھا اور جب میں نے غم و افسوس کے باعث تم پر غصہ کا اظہار کیا تھا تو تم نے میری لڑکی کو میرے خلاف کر دیا تھا لیکن بہرحال اب میں ایک سچے عیسائی کا فرض ادا کرنے آیا ہوں (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) یہی جیمس میں تم کو معاف کرتا ہوں۔

م۔ (چونک کر اُٹھ بیٹھا) خدا غارت کرے تمہاری اس دیدہ دلیری کو۔

ب۔ (پیچھے دبتے ہوئے اور اس قسم کے برتاؤ پر آنکھیں نمناک کرتے ہوئے) جیمس کیا ایک پادری کے لئے اس قسم کی بات زبان پر لانا مناسب ہے اور خاصکر تمہاری زبان پر!

م۔ (غصہ سے) نہیں جناب، ایک پادری کے لئے یہ الفاظ مناسب نہیں ہیں۔ میں نے غلط الفاظ استعمال کئے بلکہ مجھ کو تو یہ کہنا چاہئے کہ جہنم میں جائے تیری بے غیرتی بلکہ یہی الفاظ سینٹ پال یا ہر ایماندار آدمی تم سے کہتا کیا تم سمجھتے ہو کہ میں تمہارا وہ ٹھیکہ بھول گیا۔ جب تم نے محتاج خانے کو کپڑے مہیا کرنے کا ٹھیکہ لیا تھا؟

ب۔ (پبلک مفاد کے جوش میں آکر) جیمس میں نے محصول ادا کرنے والوں کے حق میں بڑا مفید کام کیا۔ میرا ٹھیکہ سب سے کم ٹھیکہ تھا تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔

م۔ ہاں، سب سے کم خرچ کا؛ اس لئے کہ تم نے مزدوروں کو نہایت ہی کم تنخواہیں دیں جتنی کہ کوئی دوسرا مالک کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی کم کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آجائے، بلکہ اس سے بھی کم خصوصاً ان بیچاری عورتوں کو جو تمہارے یہاں کپڑے سیتی تھیں۔ تمہاری تنخواہیں اس قدر کم تھیں کہ ان بیچاریوں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیتیں (غصہ اور بھی تیز ہوتا جاتا ہے) وہ عورتیں میرے گرجے میں آتی تھیں اس لئے مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اس ٹھیکہ کو منسوخ کرانے کے لئے میں خیرات خانے کی مجلس انتظامی کے رکنوں کو غیرت دلائی۔ میں نے خیرات خانہ کا محصولی چندہ ادا کرنے والوں کو غیرت دلائی، ہر شخص کو غیرت دلائی لیکن تمہیں نہ دلا سکا (بے حد گرم ہو کر) اب یہاں تم کس منہ سے آئے ہو اور پھر یہ کہنے کی جرأت کرتے ہو کہ تم مجھے معاف کرتے ہو اور اپنی لڑکی کو بیچ میں لاتے ہو اور ـــــ

ب۔ غصہ نہ ہوا غصہ نہ ہو! جبھی ایک ذرا سی بات پر اتنے خفا نہ ہو۔ میں نے مان تو لیا کہ میں نے غلطی کی۔

م۔ کب تم نے مانا، میں نے نہیں سنا۔

ب۔ نہیں۔ واقعی میں نے اعتراف کرلیا اور اب پھر اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں اس خط کے متعلق جو میں نے تمہیں لکھا تھا۔ بس اب کافی ہے؟

م۔ (انگلیاں چٹخاتے ہوئے) نہیں! ابھی نہیں۔ پہلے یہ بتلائیے کہ آپ نے تنخواہیں بڑھا دیں کہ نہیں؟

ب۔ (فاتحانہ انداز میں) ہاں

م۔ کیا!

ب۔ (چاپلوسی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے مصنوعی جوش اور رقت کے لہجہ میں) اب میں ایک مثالی مالک ہوگیا ہوں اب میں عورتوں کو نوکر نہیں رکھتا۔ وہ اب سب کی سب ہٹا دی گئی ہیں۔ اب سب کام مشینری سے کیا جاتا ہے اور کسی شخص کو پچیس فی گھنٹہ سے کم نہیں ملتا، اور جو کاریگر ہیں ان کو ٹریڈ یونین کے نرخ سے مزدوری دیتا ہوں (فخریہ) کہئے اب آپ کیا کہتے ہیں؟

م۔ (نہایت مسرور ہو کر) کیا واقعی! کیا واقعی! اس گنہگار کے لئے جو توبہ کرلے آسمان کے خزانے بے حد بے انتہا خوشیاں نچھاور کرتے ہیں (زمین کے پاس صدق دل سے نہایت عفو طلب لہجہ میں جاتے ہوئے) میرے بزرگ! کس قدر ارفع و اعلیٰ کام آپ نے کیا ہے! میں آپ سے تہ دل سے اپنے خراب خیالات کی معافی چاہتا ہوں (ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے) اب آپ کو کس قدر مسرت حاصل ہوئی ہوگی!۔ کیوں نا! کہئے کہئے کہ اب آپ کا دل بیحد خوش، بیحد مسرور ہے بلکہ آپ روحانی طور پر خوش تو اب نظر آتے ہیں۔

ب۔ (نہایت پژمردگی سے) ہاں خوشی تو ہے، بلکہ خوش تو ہونا ہی چاہئے، اور خصوصاً جبکہ تم اس بات کو دیکھ ہی رہے ہو لیکن خیر اب ضلع کی کونسل سے میرا معاہدہ تو طے ہی ہوگیا ہے (نہایت وحشیانہ پن سے، وہ ہرگز تیار نہیں تھے جبتک کہ میں ابھی تنخواہیں دینے کا وعدہ نہ کروں، برا ہو ان گدھوں کا کہ میرے معاملات میں دخل دیا ہے۔

م۔ (اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے نہایت اداسی سے) تو یہ کہئے اس ڈر کے سبب آپ نے تنخواہیں بڑھا دیں لاولاسی سے

بیٹھ جاتا ہے)

ب۔ (سنجیدگی سے خوب اینڈ کر الائیوں میں) اور آخر میں کس لئے کرتا! لیکن جانتے ہو آخر اس سے ہوتا ہی کیا ہے!
سوائے اس کے کہ مزدور شراب میں پی کر مست اور گستاخ ہو جاتے ہیں (نہایت آن بان سے آرام کرسی میں سما کر بیٹھ
جاتا ہے) لیکن جیمس تمہارا کام بہت اچھا ہے، تمہارا نام اخبارات میں آجاتا ہے اور تم بڑے آدمی ہو جاتے
ہو، لیکن جیمس دیکھو، تم کتنی بے انصافی کرتے ہو کہ ان مزدوروں کو اس قدر روپیہ دیتے ہو جو جانتے بھی نہیں
کہ خرچ کس طرح کیا جاتا ہے اور ان لوگوں سے لے لیتے ہو جو اس کا بہت بہتر مصرف کر سکتے تھے۔

م۔ (نہایت گہری آہ بھر کر اور سرد مہری سے کہتے ہوئے) آج آپ میرے پاس آخر کس کام سے آئے ہیں! یہ تو
مجھے یقین ہے کہ آپ محض عزیزدارانہ محبت کے طور پر نہیں آئے ہیں۔

ب۔ (زرد ہو کر) ہاں، میں یوں ہی عزیزدارانہ طور پر آیا ہوں۔ کسی کام سے نہیں۔

م۔ (اطمینان اور خاموشی سے) مجھے آپ کی بات کا قطعی اعتبار نہیں ہے۔

ب۔ (نہایت غصہ سے اٹھتے ہوئے) جیمس میور مارل! اب یہ پھر میری نسبت نہ کہنا۔

م۔ (بغیر کچھ اثر لئے) جتنی بار اس کی ضرورت ہو گی تمہیں معقول کرنے کے اتنی بار کہوں گا قطعی، کہ میں تمہاری
بات کا بالکل اعتبار نہیں کرتا۔

ب۔ (نہایت مجروح ہو کر) خیر! اگر تم نے یہ طے ہی کر لیا ہے کہ ہم دونوں کے تعلقات ناخوشگوار ہو جائیں تو
خیر بہتر ہے کہ اب میں جاؤں (نہایت بیدلی سے دروازہ کی طرف جاتا ہے۔ مارل کوئی اثر نہیں لیتا۔ وہ ذرا رکتا
ہے) جیمس! مجھے امید نہیں تھی کہ تمہاری ایسی نہ معاف کرنے والی طبیعت ہو گی (مارل پھر بھی کوئی جواب
نہیں دیتا۔ وہ چند اور قدم بیدلی سے دروازہ کی طرف بڑھتا ہے اور پھر ایک دم منہ پھلائے واپس آتا ہے۔ رونے
لہجہ میں کہتے ہوئے) ہم ضرور باہم دوست رہیں گے خواہ ہماری رائیں کتنی ہی خلاف کیوں نہ ہوں۔ یہ
آخر آج تم اس قدر بدل کیوں گئے ہو؟ میں قسمیہ کہتا ہوں کہ میں آج محض دوستانہ طور پر آیا تھا۔ تم
سے لڑنے کیلئے نہیں۔ اور پھر میں تم سے لڑوں! میری چہیتی بیٹی کے تم شوہر ہو! آؤ، آؤ جیمس اور
جیو اور ہاتھ ملاؤ (مارل کے کاندھے پر محبت کے جذبہ سے ہاتھ رکھ دیتا ہے)

م۔ (اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) دیکھو برگیس! کیا تم واقعی چاہتے ہو کہ ہم تم ویسے ہی دوست ہو جائیں جیسے کہ پیشتر تھے یعنی اُس ٹھیکہ والے معاملہ سے پہلے؟

ب۔ ہاں جیمس! ہاں ویسے ہی بالکل ویسے ہی۔

م۔ تو اچھا پھر تم اپنا برتاؤ ویسا ہی کیوں نہیں رکھتے جیسا کہ پہلے تھا۔

ب۔ (نہایت احتیاط سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے) کیا مطلب تمہارا جیمس؟

م۔ مطلب یہ کہ پہلے تم مجھے نوجوان بیوقوف سمجھا کرتے تھے۔

ب۔ (مناتے ہوئے) میں تمہیں بیوقوف سمجھتا تو نہیں تھا، میں......

م۔ (بات کاٹتے ہوئے) تم واقعی سمجھتے تھے، اور میں تم کو کھوسٹ پاجی سمجھا کرتا تھا۔

ب۔ (مارلی کی خود الزامی کو جوش سے رد کرتے ہوئے) نہیں تم ہرگز نہیں سمجھتے تھے، جیمس اب تم صاف صاف اپنے متعلق ناانصافی سے کام لے رہے ہو۔

م۔ نہیں میں واقعی سمجھتا تھا لیکن اس سے کوئی ہم لوگوں کی دوستی میں فرق نہیں آسکتا۔ تم کو ایسا ہی شخص بنایا جس کو میں نہایت پاجی کہتا ہوں۔ اسی نے مجھ کو ایسا شخص بنایا جس کو تم بیوقوف کہتے ہو۔ بھئی اس کی مصلحت میں کیا چارہ! (اس بات کا یہ اثر ہوتا ہے کہ برگیس کے چہرہ پر وہ اخلاقی نقاب جسے وہ قائم کئے ہوئے تھا معدوم ہو گئی، جسم زرد پڑ گیا اور مارلی کی طرف نظر گڑ کے رہ گئی۔ خود کو ایک ہاتھ سے سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے جیسے زمین اس کے پیروں کے نیچے سے نکلی جا رہی ہے۔ مارلی اپنے اسی اطمینان کے لہجہ میں کہتا چلا جاتا ہے) میری بھلا کیا مجال تھی اس کے معاملات میں دخل دیتا، نہ اپنے بارے میں کچھ کہہ سکتا تھا نہ تمہارے لئے۔ بس اس وقت تک جب تک کہ تم یہاں نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ یقین کرتے ہوئے آؤ کہ تم نہایت پاجی اور کمینے آدمی ہو اور اپنے اس پاجی پن پر ناز بھی کرتے ہو تو اُس وقت تک میرے تمہارے ساتھ دوستانہ اور خوشگوار تعلقات رہیں گے اور تم کو میں ہمیشہ خوش آمدید کہوں گا لیکن (اب مارلی کا لہجہ تیز اور درشت ہو جاتا ہے۔ وہ کھڑا ہو جاتا ہے اور کرسی پر نہایت زور سے ہاتھ مارتے ہوئے) اپنا اس کی قطعی اجازت نہیں دے سکتا کہ تم چھچھورے کرتے ڈینگیں مارتے یہاں آؤ کہ تم ایک مثالی مالک ہو گئے

ہو اور ظلم و ستم سے تائب ہو گئے ہو حالانکہ یہ ظاہری تبدیلی صرف ضلع کی یونین کے خوف سے واقع ہوئی ہے (وہ یہ بات اس کی طرف اہمیت دینے کے لئے سر جھکا کر کہتا ہے، پھر آتشدان کے قریب چلا جاتا ہے جہاں وہ نہایت اطمینان و شان سے جا کر بیٹھ جاتا ہے بیٹھا آتشدان کی طرف ہے اور سلسلۂ سخن جاری ہے) میں یہ چاہتا ہوں کہ ہر شخص اپنے متعلق صداقت سے کام لے خواہ وہ برا ہی کیوں نہ ہو۔ اچھا خیر، تو مطلب یہ کہ یا تو آپ اپنا ہیٹ سنبھالئے اور چلے جائیے یا بیٹھئے یہ مان کر سچے دل سے کہ آپ نہایت پاجی آدمی ہیں اور پھر اپنی پاجیانہ جہیں بتائیے کہ سچ سچ آخر آپ اب مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں (ہوگیں جس کے جذبات اب بہت کافی تھم چکے ہیں۔ اتنے کہ وہ ایک کھسیانی ہنسی اپنے ہونٹوں پر پیدا کر سکتا ہے اس عملی تجویز سے نرم ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہتا ہے اور آخر کار آہستہ آہستہ نہایت تمیز سے اس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے جو مارچل نے اس کے واسطے خالی کی تھی) ہاں بس اب یہ ٹھیک ہے۔ اچھا اب بتاؤ۔

ب۔ (کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے) جیمس، تم بھی عجیب قسم کے جانور ہو۔ اس میں کوئی بھی شک نہیں لیکن ذرا جوش کے ساتھ، پھر بھی تمہاری باتوں پر پیار آ ہی جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ کسی کو بھی پادری کی باتوں کا زیادہ اثر نہ لینا چاہیئے ورنہ دنیا کا کوئی کام ہی نہیں چل سکتا (اپنے کو سنجیدہ گفتگو کے لئے خاموش کرتا ہے اور مارچل کی طرف دیکھتے ہوئے خشک سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کرتا ہے) لیکن خیر میں تمہاری باتوں کو برا نہیں مانتا اور جبکہ تم چاہتے ہو کہ ہم ایک دوسرے سے آزادانہ ملیں تو میں اس بات کو چھپانا نہیں چاہتا کہ میں واقعی تم کو ایک زمانہ میں کچھ بیوقوف سمجھتا تھا لیکن اب میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ شاید میں اس بات کو قبل از وقت کہتا تھا۔

م۔ (ایکدم بشاش ہو کر) اہاہا! آخر تم کو پتہ لگ گیا نا؟

ب۔ (فخر سے) ہاں، زمانہ بہت کافی گذر گیا۔ پانچ سال گذرے کہ تمہارے خیالات پر غور کرنے کا کوئی خیال تک نہ کرتا تھا اور میں سوچا کرتا تھا کہ آخر تمہیں وعظ دینے ہی کیوں دیا جاتا ہے مجھے ایک پادری کا حال معلوم ہے کہ اسے لندن کے اعلیٰ پادری نے عرصہ سے معتوب کر رکھا ہے حالانکہ وہ بیچارہ اسی قدر لامذہب ہے جتنے کہ تم ہو، لیکن آج اگر کوئی مجھ سے شرط کرے تمہارے متعلق کہ تم خود آخر عمر تک لندن کے

ک۔ یوجین ماربل کی ایک دریافت ہے۔ جون میں یہ ماربل کو ٹیمز کے پشتے پر سوتا ہوا مل گیا۔ کیا آپ نے ہم لوگوں کی نئی تصویر نہیں دیکھی ؟ (تصویر مریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ اسی کی دی ہوئی ہے۔

ب۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) ارے بس رہنے دو بیٹی گویا تم مجھے۔ اپنے باپ کو یہ بتلا رہی ہو! ایک معمولی گاڑیبان کا دلال جو پشتے پر سوتا ہو اور پھر وہ ایسی تصویر خریدے (سختی سے) مجھے دھوکہ نہ دو۔ یہ ایک بہت اعلیٰ مذہبی تصویر ہے اور جیمس کا اپنا انتخاب۔

ک۔ نہیں پاپا، یوجین گاڑیوں کا دلال نہیں ہے۔

ب۔ پھر آخر وہ کیا ہے (طنزیہ) شاید کوئی امیر کبیر! کیوں نا؟

ک۔ (مسکرا کر سر ہلاتے ہوئے) ہاں، اس کا چچا ایک لارڈ ہے۔ زندہ سچ مچ کا لارڈ۔

ب۔ (ایسی عمدہ خبر پر یقین نہ کرتے ہوئے) ارے نہیں!

ک۔ ہاں جب جیمس نے اسے بند پر پایا۔ اس کی جیب میں ایک ہفتہ کا پچیس پونڈ کا بل پڑا ہوا تھا اور اس کا خیال یہ تھا کہ اسے ایک ہفتہ سے پہلے کہیں روپیہ نہیں مل سکتا۔ کسی سے قرض لینے میں اسے شرم آتی تھی۔ وہ بڑا پیارا لڑکا ہے ہم لوگ اسے بہت چاہتے ہیں۔

ب۔ (اشرافیت کو حقیر دکھلاتے ہوئے لیکن پھر بھی چمکتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ) ہوں! میرا تو خیال نہیں کہ کسی لارڈ کا بھتیجا اس طرف وکٹوریہ پارک میں آئے گا۔ ہاں جب تک کچھ بیوقوف نہ ہو (تصویر کی طرف پھر دیکھتے ہوئے) حالانکہ کینڈی مجھے یہ تصویر زیادہ پسند نہیں پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ آرٹ نہایت اعلیٰ قسم کا ہے دیکھو تم اس سے میرا تعارف ضرور کرا دینا بھول نہ جانا کینڈی (اپنی گھڑی کی طرف گھبرا کر دیکھتا ہے) میں اب صرف دو منٹ اور ٹھہر سکتا ہوں۔

ماربل یوجین کو ساتھ لئے واپس آتا ہے۔ برگیس یوجین کو نہایت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے یوجین ایک نہایت عجیب قسم کا شرمیلا لڑکا ہے کوئی اٹھارہ برس کی عمر ہوگی، دبلا پتلا، نسوانیت لئے ہوئے بہت باریک بچوں کی سی آواز اور نہایت گھبرایا ہوا سا چہرہ، ڈری سہمی ہوئی سی باتیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آغاز شباب کی آمد آمد سے گھبرا رہا ہے نہایت مستقل۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں کھڑا ہو یا کیا کرے

وہ برگیس یعنی ایک نئی صورت کو دیکھ کر وحشت زدہ ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر موقعہ ملے تو ذرا کسی گوشہ میں بھاگ جائے۔ کسی غیر معمولی عالم صحبت کا احساس بھی اس کے اعصاب پر بہت شدید ہوتا ہے لیکن اس کے نتھنے، منہ اور آنکھیں سب کی بناوٹ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ضدی بہت کافی ہے تاس کی کشادہ بھوؤں سے یہ بھی ہویدا ہے کہ طبیعت میں رحم بھی ہے۔ حلیہ اس قدر غیر معمولی ہے کہ اس دنیا کا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ خشک اور سنجیدہ آدمیوں کو تو اس کی صورت تکلیف دہ معلوم ہوگی لیکن شاعرانہ داغ والے اسے فرشتہ ہی سمجھیں گے۔ اس کا لباس بے تکا سا ہے۔ ایک پرانی نیلی سرج کی جیکٹ ہے جس کے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ اس کے نیچے ادنیٰ ٹینس کی قمیص ہے۔ ٹائی کا کام دینے کے لئے ایک ریشمی رومال بندھا ہوا ہے۔ پتلون جیکٹ ہی کے رنگ کا ہے، پیر میں بھورے کینوس کے جوتے ہیں۔ اس کی ہیئت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ غالباً پارکوں کی گھاس میں پڑے رہتے ہیں۔ اور کہیں پانی مل گیا تو وہ بھی منہ بھایا ہے اور برش۔ خیر سے معلوم ہوتا ہے کبھی کرتے ہی نہیں۔

جیسے ہی یوجین ایک اجنبی کی شکل دیکھتا ہے رک جاتا ہے اور دیوار سے لگے لگے کمرے کی دوسری طرف جانے لگتا ہے)

م۔ (داخل ہونے پر) ادھر آؤ، اُدھر کہاں جاتے ہو، ابھی کچھ دیر ٹھہرو تو۔ آپ میرے خسر ہیں مسٹر برگیس اور آپ مسٹر مارچ بینکس۔

یوجین مارچ بینکس۔ (گھبراتے ہوئے اور کتابدان کا سہارا لیتے ہوئے) جناب نہایت مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔

ب۔ (اس کے پاس جاتے ہوئے نہایت خندہ پیشانی سے۔ ماریل اس عرصہ میں کینڈڈا کے پاس جو آتشدان کے پاس بیٹھی ہے چلا جاتا ہے) یقین جانیے آپ سے مل کر بے انتہا مسرت ہوئی (اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے گویا ہاتھ ملانے پر مجبور کرتے ہوئے) مسٹر مارچ بینکس کہئے آج کا موسم کیسا ہے؟ مجھے امید ہے کہ آپ جیمس کے احمقانہ خیالات سے متاثر نہ ہوئے ہوں گے۔

ی م۔ احمقانہ خیالات؟ اچھا آپ کا مطلب ان کے سوشلزم سے ہے، بالکل نہیں۔

ب۔ ہاں یہ ٹھیک ہے (پھر اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے) اچھا میں اب جاؤں گا۔ مجبوری؛ سخت کام ہے۔ آپ کیا

میری طرف تو نہیں آرہے ہیں مسٹر مارچ بینکس؟

ی م۔ کس طرف؟

ب۔ وکٹوریہ پارک اسٹیشن۔ وہاں سے ایک گاڑی شہر جانے کو بارہ بجکے پچیس پر ملتی ہے۔

م۔ جی نہیں میرا خیال ہے یوجین ہم لوگوں کے ساتھ اب کھانا کھا کر جائے گا۔

ی م۔ (گھبرا کر معافی چاہتے ہوئے) نہیں امیں۔میں —

ب۔ اچھا خیر میں آپ کو مجبور نہ کروں گا۔ میری بھی رائے یہی ہے کہ بہتر ہے آپ یہاں کینڈی کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد تشریف لے جائیں لیکن کسی دن غریب خانہ پر بھی ماحضر تناول فرمائیں مجھے امید ہے آپ میرے کلب پر تشریف لائیں گے۔ فریین خاؤ نڈرس۔ نارتن فالگیٹ۔ دیکھئے آیئے گا ضرور، کہیئے آپ آئیں گے؟

ی م۔ شکریہ، مسٹر برگیس لیکن یہ نارتن فالگیٹ ہے کہاں؟ سَرے میں نا!؟

(برگیس آناسن کر مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے)

ک۔ (یوجین کو اپنے پاپا سے نجات دلانے کے لئے آتے ہوے) پاپا دیکھئے آپ کی گاڑی چھوٹ جائے گی اگر آپ فوراً وہاں نہ پہونچ جائیں گے۔ شام کو پھر آکر مسٹر مارچ بینکس کو بتا دیجئے گا کہ آپ کا کلب کہاں ہے۔ اس وقت تاخیر مناسب نہیں ہے۔

ب۔ (ہنسی سے بے حال، سَرے میں! ہا ہا ہا! خیال برا نہیں ہے امیں نے آج آپ ہی کو ایسا شخص پایا ہے جو یہ نہیں جانتا کہ نارتن فالگیٹ کہاں ہے (اپنے فعل پر خود نادم ہو کر) خدا حافظ مسٹر مارچ بینکس مجھے امید ہے کہ آپ میری اس ہنسی کو معاف فرمائیں گے اور کچھ اثر نہ لیں گے (میرا اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے)

ی م (گھبراہٹ سے ہاتھ ملاتے ہوئے) نہیں، نہیں کوئی بات نہیں!

ب۔ خدا حافظ کینڈی! پھر کبھی آؤں گا جیمس خدا حافظ!

م۔ تو کیا آپ جائیے ہی گا؟

ب۔ نہیں، تمہارے آنے کی ضرورت نہیں! (شاداں و فرحاں باہر چلا جاتا ہے)

م۔ میں تمہیں کچھ دور تو پہونچا آؤں (اس کے پیچھے جاتا ہے)

(یوجین ان دونوں کی طرف سہما ہوا دیکھتا رہتا ہے، سانس نہیں لیتا یہاں تک کہ برگیس نظروں سے غائب ہو جاتا ہے)

ک۔ (ہنستے ہوئے) یوجین (یوجین چونک پڑتا ہے اور نہایت مشتاقانہ اس کی طرف آتا ہے لیکن اس کی ہنستی ہوئی نظروں کو دیکھ کر ایک دم رک جاتا ہے) میرے باپ کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

ی م۔ میرا۔ میں ابھی تک اُن کو اچھی طرح سمجھ نہ سکا لیکن نہایت عمدہ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔

ک۔ (ہلکے طنز سے) اور تم فری مین فاؤنڈرس کلب ان کی دعوت کھانے جاؤ گے ضرور کیوں نا؟

ی م۔ (گھبراہٹ سے اور اس مذاق کو سنجیدہ بات سمجھتے ہوئے) ہاں! اگر آپ کی ایسی ہی خواہش ہے۔

ک۔ (متاثر ہو کر) تمہیں معلوم ہے کہ تم بہت ہی اچھے لڑکے ہو یوجین! بہت عجیب، اگر تم میرے والد پر اس وقت ہنسے ہوتے تو مجھے برا نہ معلوم ہوتا لیکن، تم نے بہت اچھا کیا کہ تم ہنسے نہیں اور ان سے اچھی طرح پیش آئے

ی م۔ کیا مجھے ہنسنا چاہئے تھا؟ ہاں میں نے بھی یہ خیال کیا تھا کہ انھوں نے کوئی دلچسپ بات کہی تھی لیکن قصہ یہ ہے کہ اجنبیوں کے سامنے میں اس قدر غیر مطمئن رہتا ہوں کہ مجھے کسی مذاق کا بھی پتہ نہیں چلتا مجھے بہت افسوس ہے (وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے کہنیاں گھٹنوں پر اور سر کو مٹھیوں سے دبائے گویا بہت ہی تکلیف میں ہے)

ک۔ (اسے خوش کرتے ہوئے) اچھا ہوگا، خیر بڑے بچے! آج تو تمہاری حالت ہر روز سے زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے، کیا بات ہے؟ گاڑی میں اس قدر سست اور رنجیدہ کیوں بیٹھے رہے؟

ی م۔ وہ کچھ نہیں، میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ گاڑیبان کو کرایہ کتنا دوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایسا سوچنا محض بیوقونی ہے لیکن آپ کو معلوم نہیں ہے کہ یہ چیزیں میرے لئے کس قدر تکلیف دہ ہوتی ہیں اور میں اجنبی لوگوں سے ملنے جلنے میں کس قدر الگ الگ جان چھپائے پھرتا ہوں (جلدی اور خجستگی سے) لیکن اب وہ تو سب قصہ ختم ہو گیا۔ گاڑیبان خوشی سے کس قدر پھول گیا تھا اور کس ادب سے اس نے اپنی ٹوپی

اٹھائی جب ماریل نے اسے دو شلنگ دئے۔ میں تو دس دینے والا تھا۔

(ماریل اندر واپس آتا ہے چند خطوط اور اخبار ہاتھ میں ہیں جو ابھی دوپہر کی ڈاک سے آئے ہیں)

ک۔ ارے جیمس، ڈیر! یوجین گاڑیبان کو دس شلنگ دینے جا رہا تھا۔ دس شلنگ صرف تین چار منٹ کے کرایہ کے لئے! اوہ، ڈیر!

م۔ (میز پر سے اپنے خطوط دیکھتے ہوئے) مارچ بینکس! ان کے کہنے کا تم خیال نہ کرو۔ زیادہ دینے کی طبیعت بہتر ہے بہ نسبت کم دینے کی کے یہ آج کل بہت شاذ ہوتی ہے۔

ی م۔ (نا امید ہوتے ہوئے) نہیں، یہ سب محض بزدلی اور کمزوری ہے۔ مسز ماریل بالکل حق بجانب ہیں۔

ک۔ ہاں واقعی ہیں (اپنا ہنڈبیگ اٹھالیتی ہے) اچھا میں تمہیں جیمس کے پاس فی الحال چھوڑے جاتی ہوں میرا خیال ہے کہ تم اس قدر کافی شاعر ہو کہ شاید ہی محسوس کر سکو کہ ایک عورت بیس اکیس دن بعد اپنے گھر واپس آتی ہے تو اسے اپنا گھر کیسا لگتا ہے اوہ میرا کمبل کا بنڈل تو اٹھا دو (یوجین وہ پارسل کوچ سے اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے، وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ میں لے لیتی ہے اور بیگ دائیں ہاتھ میں) اچھا اب میرا لبادہ میرے ہاتھ پر لٹکا تو دو (وہ ایسا ہی کرتا ہے) اور میری ہیٹ! (وہ ہیٹ کو بیگ والے ہاتھ میں دیتا ہے) اچھا اب میرے لئے دروازہ تو کھولدو (وہ جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولدیتا ہے) شکریہ! (وہ باہر چلی جاتی ہے اور مارچ بینکس دروازہ بند کر لیتا ہے)

م۔ (اب بھی اپنی میز پر مشغول ہے) تو مارچ بینکس تم کھانا کھا کر جاؤ گے۔ سمجھ گئے!

ی م۔ (گھبرا کر) نہیں، اب مجھے رکنا نہیں چاہئے (وہ ماریل کی نظروں کی طرف جلدی سے دیکھتا ہے لیکن اس کی مہربانی کی نظر سے بچا جاتا ہے اور نہایت ہی گڑبڑ میں کہتا ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ میں رک نہیں سکتا۔

م۔ تمہارا مطلب یہ کہ تم رکو گے نہیں!

ی م۔ (خلوص اور مستعدی سے) نہیں۔ میں رکتا تو ضرور قطعی۔ شکریہ، بہت بہت لیکن ــ لیکن

م۔ لیکن لیکن لیکن۔ لیکن ہش! اگر تمہیں رکنا ہے تو رک جاؤ۔ اگر تمہیں شرم معلوم ہوتی ہے تو جاؤ اور ذرا پارک میں دو ایک چکر لگا آؤ۔ ڈیڑھ بجے تک خوب شاعری کرو پھر اس کے بعد چلے آنا اور خوب پیٹ بھر کے کھانا کھانا

ی م۔ شکریہ میں ضرور ایسا کرتا لیکن مجھے واقعی ایسا کرنا چاہئے؟ اصل یہ ہے کہ مجھ سے مسز ماریل نے کہدیا تھا کہ میں ایسا نہ کروں۔ انھوں نے کہا تھا کہ میرا خیال نہیں ہے کہ مسٹر ماریل تم کو کھانا کھانے کے لئے روکیں گے لیکن اگر روکیں تو تم نہ رکنا کیونکہ وہ جی سے نہ کہیں گے (بھرائی ہوئی آواز سے) انھوں نے کہا تھا کہ تم سمجھ جانا لیکن میں سمجھ ہی نہیں پاتا ہوں کہ اب جیسا آپ کہہ رہے ہیں تو مجھے رکنا چاہئے کہ نہیں لیکن آپ مہربانی سے اون سے نہ کہئے گا کہ میں نے آپ سے یہ بات کہدی۔

م۔ (ہنسی سے پھولتے ہوئے) اوہ، بس اتنی سی بات ہے، تو بس اب تم میرا ہی کہنا مانو گے ذرا پارک میں دو چار چکر لگا آؤ تمہاری دقت رفع ہو جائے گی

ی م۔ کیسے ؟

م۔ (ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے) بڑے گدھے ہو لیکن اس قدر صفائی خود اسے اور یوجین کو ناگوار معلوم ہوتی ہے چنانچہ وہ اپنے کو روکتا ہے) نہیں میں اس طرح نہ کہوں گا۔ (وہ یوجین کے پاس نہایت بزرگانہ مہربانی سے آتا ہے) پیارے لڑکے ہم دونوں کی سی پرمسرت شادیوں میں بیوی کا گھر واپس آنا نہایت متبرک حیثیت رکھتا ہے (مارچ بینکس جلدی سے اس کی طرف دیکھتا ہے کچھ کچھ اس کا مطلب سمجھتے ہوئے) اگر کوئی پرانا ساتھی یا درحقیقت کوئی واقعی ہمدرد ہستی ہو تو کوئی حرج نہیں لیکن کبھی کبھی کا آنے والا ایسے موقعوں پر حارج ہوتا ہے۔ (یوجین کو جس بات کا ڈر تھا وہی کہی جاتی ہے چنانچہ اس کا چہرہ اس بات کو سمجھ کر ڈر جاتا ہے لیکن ماریل اپنے خیالات میں محو اس بات کو محسوس نہیں کرتا اور کہے جاتا ہے) کینڈڈا نے یہ خیال کیا کہ شاید میں تمہاری موجودگی یہاں پسند نہ کروں لیکن اس نے غلطی کی۔ میں تمہیں بیحد چاہتا ہوں، چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ تم بھی دیکھ لو کہ ہماری ازدواجی زندگی کس قدر پرمسرت ہے۔

ی م۔ پرمسرت! تمہاری شادی! تمہارا ایسا خیال ہے۔ آپ کو اس امر کا یقین ہے!

م۔ (خوشی سے) لڑکے میں اسے قطعی جانتا ہوں لاروشی فوکالڈ نے لکھا ہے کہ اکثر شادیاں غنیمت ہو جاتی ہیں لیکن پرمسرت شادی کوئی نہیں ہوتی لیکن تم نہیں سمجھ سکتے کہ میں کس خوشی سے ایسے چھوٹے، مکار کی افترا پردازی دیکھتا ہوں ہا، ہا، اچھا اب تم پارک جاؤ اور اپنی نظم لکھو۔ پورے ڈیڑھ بجے آجانا۔ اچھی طرح سمجھ لو

کہ ہم انتظار نہیں کیا کرتے۔

ی م۔ (غصہ سے) نہیں ذرا رک جائیے، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اِسے کھلواؤں گا قطعی۔

م۔ (متعجب ہو کر) آئیں! آخر کیا چیز کھلواؤ گے؟

ی م۔ میں ضرور کہوں گا۔ ایک بات ایسی ہے جو ہمارے آپ کے درمیان قطعی طے ہو جانا چاہئے۔

م۔ (اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے) ابھی؟

ی م۔ (نہایت جوش سے) ابھی قبل اس کے کہ آپ کمرے سے باہر جائیں (وہ چند قدم پیچھے ہٹتا ہے گویا کہ ماریل کو دروازہ کی طرف جانے دینا نہیں چاہتا)

م۔ (بغیر حرکت کئے۔ نہایت سنجیدگی سے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ واقعی کوئی خاص بات ہے) میں ابھی جاتا نہیں ہوں میاں صاحبزادے۔ بلکہ میرا خیال یہ تھا کہ تم جا رہے ہو (یوجین اس کے بخنۃ لہجہ سے اور بھی مشتعل ہو جاتا ہے لیکن مارے غصہ کے کانپ رہا ہے اور اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو جاتا ہے۔ ماریل اس کے پاس جاتا ہے اور اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر نہایت محبت سے لیکن جا کے رکھتا ہے اور اس کا کچھ خیال نہیں کرتا کہ وہ اس کے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے) کیا بات ہے میاں! اطمینان سے بیٹھ تو جاؤ اور پھر بتاؤ کہ آخر بات کیا ہے یاد رکھو کہ ہم لوگ تو آپس میں دوست دوست ہیں اس لئے ایک دوسرے کی بات صبر و توجہ سے سنیں گے وہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

ی م۔ (گھوم کر منہ سامنے کرتے ہوئے) نہیں میں کچھ بھول نہیں رہا ہوں، نہیں صرف (اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے چھپاتے ہوئے) ڈر رہا ہوں (ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے اور اپنے منہ کو ماریل کی طرف نہایت غصہ سے بڑھاتے ہوئے اور ریچ کرتے ہوئے) تم کو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ یہ وقت صبر و توجہ کا ہے کہ نہیں (ماریل بالکل پتھر کی طرح مضبوط ساکت بیٹھا اس کی طرف نہایت مہربانی سے دیکھ رہا ہے) مجھے ایسی مطمئن نظروں سے نہ دیکھو تم شاید سمجھتے ہو کہ تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو لیکن اگر تمہارے دل میں ذرا بھی احساس ہے تو میں تم کو چکرا دوں گا۔

م۔ (نہایت بخنۃ خود اعتمادی سے) مجھے چکرا دو گے! صاحبزادے بولو تو آخر کس طرح!

ی ام۔ پہلی بات تو یہ کہ ـــــ

م۔ ہاں، پہلی بات تو یہ کہ؟

ی ام۔ کہ میں تمہاری بیوی سے محبت کرتا ہوں۔

(ماریل کچھ رکتا ہے اس کے بعد ایک لمحہ بھر اس کی طرف تکتا رہتا ہے اور پھر اس کے بعد نا قابل برداشت ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ یوجین چونک پڑتا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا اور جلد ہی غصہ اور حقارت سے بھر جاتا ہے)

م۔ (بیٹھتے ہوئے تاکہ اپنی ہنسی کو ختم کر لے) ہاں ہاں! میرے پیارے بچے تم کو واقعی اس سے محبت ہو گی ہر شخص اس سے محبت کرتا ہے بلکہ لوگ مجبور ہیں اس سے محبت کرنے کے لئے اور مجھے یہ چیز پسند ہے لیکن (اس کی طرف نہایت خوش مزاجی سے دیکھتے ہوئے) میں کہتا ہوں یوجین کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارا معاملہ ایسا ہے کہ ہر کسی سے کہا بھی جائے؟ تم ابھی بیس برس کے بھی نہیں ہوئے اور وہ تیس کے اوپر ہے کیا در اصل تمہاری محبت ایسی نہیں معلوم ہوتی گویا طفلانہ محبت ہو؟

ی ام۔ (گرج کر) کیا تم اس کے متعلق ایسے الفاظ کہہ سکتے ہو! وہ جس محبت اور جس جذبہ عشق کو پیدا کرتی ہے۔ اسے ان الفاظ سے تعبیر کرنا اس کی ہتک کرنا ہے۔

م۔ (نہایت تیزی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے اور بالکل بدلے ہوئے لہجہ میں) اس کی ہتک! یوجین! ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو، ابھی تک میں خاموش رہا اور مجھے امید ہے کہ خاموش رہوں گا لیکن چند باتیں ایسی ہیں جن کی میں قطعی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھ کو اس بات پر مجبور نہ کرو کہ میں اپنا برتاؤ تمہارے ساتھ بالکل ویسا رکھوں جیسا کہ ایک بچہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ آدمی بنو! آدمی تم اب بچہ نہیں ہو۔

ی ام۔ (ہاتھ کی ایسی حرکت سے گویا وہ چند چیزوں کو پیچھے چھوڑ دینا چاہتا ہے) اونہ! یہ سب تصنع اور بناوٹ چھوڑ دو میری روح کانپ جاتی ہے جب میں سوچتا ہوں کہ اس کو اتنے برس اسی قسم کی مصنوعی اور بناوٹی باتیں سننے میں برداشت کرنے پڑے جبکہ تم اپنی خود بینی اور آرام کے لئے اپنی اغراض پر اندھا دھند اس کو بھینٹ چڑھاتے رہے۔ تم (اس کی طرف منہ کرتے ہوئے) جس کا ایک خیال ایک احساس بھی اس کے

خیالات و احساسات سے لگا نہیں کھاتا۔

م۔ (فلسفیانہ طور پر) لیکن وہ ان سب باتوں کو اطمینان سے برداشت کرلیتی ہے (اس کے چہرے کی طرف بالکل سامنے دیکھتے ہوئے) یوجین، پیارے لڑکے تم محض اپنے کو بیوقوف بنا رہے ہو۔ بہت ہی بیوقوف۔ یہی لفظ تمہارے بالکل صحیح ہے اور اس وقت تمہارے حسب حال بھی۔ (اس بات کو اپنے پرانے طریقے پر سر کو جھکا کر کہتا ہے اور آتشدان کے قریب چٹائی پر جاکر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہاتھ سینکنے لگتا ہے)

ی م۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ سب میں جانتا نہیں ہوں؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ چیزیں جن کے متعلق لوگ اپنے کو بیوقوف بنا لیتے ہیں، وہ ان چیزوں کی بہ نسبت جن کے متعلق لوگ اپنے کو عقلمند بنائے رکھتے ہیں کم صحیح یا کم سچی ہوتی ہیں؟ (ماریل کا اطمینان پہلی مرتبہ غائب ہوتا ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے متحیر ہو جاتا ہے، اپنے ہاتھ سینکنا بھول جاتا ہے کھڑا سنتا رہتا ہے چوکنا۔ اور سوچ میں) بلکہ وہی چیزیں زیادہ سچی اور حقیقی ہوتی ہیں۔ تم اپنے کو بہت خاموش اور متحمل اور اپنے کو بہت عقلمند بنائے ہوئے ہو۔ کیونکہ تم دیکھتے ہو کہ میں تمہاری بیوی کے متعلق بے وقوف بنا ہوا ہوں بالکل اسی طرح جس طرح کہ وہ بڈھا شخص جو ابھی یہاں تھا نہایت عقلمند تھا کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ تم سوشلزم کے متعلق نہایت بیوقوف بنے ہوئے ہو۔ (ماریل کی پریشانی نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے۔ یوجین اپنی بات بڑھتی دیکھ کر گفتگو بڑھاتا ہے اور اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتا ہے) کیا اس سے تمہیں اپنی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ کہ نہیں؟ کیا یہ آپ کی انتہائی متانت اور ظاہری سکون اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں؟

م۔ مارچ بینکس، شیطان تمہارے دل میں اس قسم کے خیالات پیدا کر رہا ہے۔ ایک شخص کے جذبۂ خود اعتمادی کو متزلزل کر دینا بہت آسان بات ہے۔ نہایت ہی آسان! لیکن اس سے فائدہ اٹھا کر آدمی کی روح کو برباد کر دینا یہ شیطانی کام ہے۔ اس لئے غور کرو۔ اور دیکھ لو کہ تم کیا کر رہے ہو۔ سوچو کہ تم کیا کر رہے ہو۔

ی م۔ (درشتی سے) میں جانتا ہوں۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں میں یہ دیدہ و دانستہ کر رہا ہوں۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں جکڑا دونگا (دونوں ایک دوسرے کے مدمقابل آجاتے ہیں اور ایک لمحہ تک

حریفانہ نگاہیں بدلتی رہتی ہیں اس کے بعد ماریل کو اپنی عظمت کا بھر احساس ہوتا ہے)

م۔ (نہایت شریفانہ عنایت و محبت کے لہجہ میں) یوجین سنو! کسی نہ کسی دن مجھے امید کیا قطعی یقین ہے کہ تم بھی میری طرح ایک نہایت خوش و مطمئن آدمی ہو جاؤ گے (یوجین نہایت بے چینی سے پھرتا ہے جیسے کہ وہ خوشی اور اطمینان سے قطعی التفات نہیں رکھتا۔ ماریل اس پر بڑی ذلت محسوس کرتا ہے لیکن پھر بھی نہایت خوبصورتی سے اپنے کو قابو میں رکھتا ہے مستقل مزاجی اور نہایت خوبی سے اپنے طرز تقریر کو قایم رکھتا ہے) تمہاری شادی ہو جائے گی اور تم اپنی تمام کوششوں سے، دنیا کے چپہ چپہ میں اپنے گھر کی ایسی خوشی و مسرت پھیلانے کی کوشش کرو گے۔ دنیا کو جنت بنانے والوں میں سے ایک تم بھی ہو گے۔ ممکن ہے تم مجھ سے بھی بڑھ جاؤ اور ایک بڑے تعمیری شخص نکلو اور میں محض ایک معمولی مسافر۔ تم ابھی نوجوان ہو لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم میں خوبیاں اور لیاقت مجھ سے بڑھ کر ہیں۔ تم شاعر ہو اور شاعر ہی کے اندر خدا اپنی تمام الوہیت کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ اس وقت تم کو اتنی بڑی بات سن کر کانپ جانا چاہئے یہ سوچ کر کہ ایک بہت بڑا بار امانت تم کو اٹھانا ہے اور اتنے بڑے عطیہ کا حامل ہونا ہے۔

ی م۔ (بغیر متاثر ہوئے اور بیدردی سے۔ اس کے لڑکپن کا بے ڈھنگا جوش ماریل کی بلاغت کے سامنے ایک واضح تضاد پیش کرتا ہے) میں اس بات کو سن کر نہیں کانپتا۔ ہاں البتہ جب اس الوہیت کے فقدان کو دوسروں میں دیکھتا ہوں تب البتہ کانپ جاتا ہوں۔

م۔ (اپنی فصاحت و بلاغت کو دو آتشہ کرتے ہوئے سچے جوش اور یوجین کی ضد سے متاثر ہو کر) اچھا اگر ایسا ہی ہے تو وہ الوہیت اُن لوگوں میں، مجھ میں پیدا کر دو اسے ختم کرنے کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ آئندہ جب تم بھی اتنے ہی خوش ہو جاؤ گے جتنا کہ میں ہوں تو میں تمہارا دینی بھائی بن جاؤں گا۔ میں تم کو اس اعتقاد میں مدد دوں گا کہ خدا نے ہمیں ایک دنیا دی ہے جسے ہم محض اپنی بیوقوفی کے باعث جنت نہیں بنا پاتے۔ میں تمہارے اس یقین میں مدد دوں گا کہ تمہارا ہر فعل خوشی و مسرت کے بیج بو رہا ہے اور جس سے تمام دنیا، معمولی لوگ بھی رہتی دنیا تک فائدہ و مسرت اُٹھاتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی میں تم کو تمہارے اس یقین میں مدد دوں گا کہ تمہاری بیوی تم سے

محبت کرتی ہے اور تمہارے گھر میں نہایت خوش و خرم ہے۔ ایچ بینکس ہم میں سے ہر ایک کو اس قسم کی استعانت کی ضرورت رہتی ہے بلکہ بے انتہا رہتی ہے اور ہمیشہ۔ دنیا میں بہت سی چیزیں اور باتیں ایسی ہیں جو ہمیں شک میں ڈالنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں اگر ہم ذرا سی ڈھیل دیں تو یہ ہم پر فوراً یورش کر دیں گی۔ اپنے گھروں میں بھی ہم ایسے رہتے ہیں جیسے کسی میدان میں خیمہ ڈالے پڑے ہوں اور چاروں طرف شک کی فوجیں گھیرا ڈالے ہوئے ہوں۔ کیا تم غداری کر کے ان فوجوں کو میرے گھر میں داخل کر کے مجھے تباہ کر ڈالو گے ؟

ی م۔ (وحشت سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے) کیا وہ اسی طرح کے لفظی گورکھ دھندے تمہارے ہاں سنا کرتی ہے ایک عورت جس کا دل اعلیٰ، دماغ ارفع اور جس کی روح حق، سچائی اور آزادی کی طلبگار رہی اسے تشبیہ و استعارات، وعظ، فرسودہ تقریروں اور محض لسانی کے خالی گھونٹ دئے جاتے ہیں۔ کیا تم سمجھ سکتے ہو کہ عورت کی روح محض ان تقریروں پر زندہ رہ سکتی ہے ؟

م۔ (جل کر) ایچ بینکس! ابھی تک تو میں کچھ بولا نہیں لیکن اب تم مجھے بے اختیار کئے دے رہے ہو۔ میری لیاقتوں میں اسی قدر حقیقت موجود ہے جتنی کہ تمہاری لیکن اظہار حقیقت کے لئے صحیح اور مناسب الفاظ مہیا کرنا یہ ایک عطیہ فطری ہوا کرتا ہے۔

ی م۔ (غصہ سے) یہ محض چرب زبانی کا عطیہ ہے اور کچھ نہیں۔ تمہاری لغاظی کے عطیہ کو حقیقت بیانی سے کیا نسبت اور اگر ہے تو بس اسی قدر کہ جتنا ایک باجہ بجانے کے لئے ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں تمہارے گرجے میں کبھی نہیں گیا ہوں لیکن میں تمہارے سیاسی جلسوں میں گیا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ واقعی تم مجمع کو اس قدر متاثر کر لیتے ہو گویا وہ سب شراب پئے ہوئے ہوں اور ان سب کی بیویاں اپنے اپنے شوہروں کا منہ تکتی رہتی ہیں کہ یہ کس قدر بیوقوف ہو گئے ہیں۔ ہاں! خوب یاد آیا یہ قصہ تو پرانا ہے تم کو انجیل میں بھی مل جائے گا۔ وہ یہ کہ داؤد علیہ السلام کو جوش برانگیختہ کرنے میں تمہاری طرح کمال حاصل تھا لیکن نہایت زور دے کر کہتے ہوئے) ان کی بیوی دل میں ان سے نفرت کرتی تھیں۔

م۔ (بڑے غصہ سے) اچھا میرے گھر سے فوراً نکل جاؤ۔ سنا تم نے ؟ (وہ اس کی طرف نہایت غصہ سے بڑھتا ہے)

ی م۔ (صوفے سے چپکتے ہوئے) مجھے چھوڑ دو۔ مجھے مت چھوؤ! (ماریل نہایت مضبوطی سے اس کے کوٹ کا کالر پکڑتا ہے یوجین صوفے میں دبک جاتا ہے اور زور سے چیخنے لگتا ہے) چھوڑ دو ماریل! دیکھو اگر تم نے مجھے مارا تو میں اپنے کو مار ڈالونگا میں اسے برداشت نہیں کر سکتا (منہ بسورتے ہوئے) مجھے جانے دو۔ ہٹاؤ اپنا ہاتھ!

م۔ (حقارت سے آہستہ لیکن زور دے کر کہتے ہوئے) بزدل، (وزنا یاؤ اسے چھوڑتے ہوئے) جا قبل اس کے کہ تو ڈر کر رونے لگے۔

ی م۔ (صوفے پر گہری سانسیں لیتے ہوئے لیکن ماریل کی دست کشی سے مطمئن ہو کر) میں تم سے خوفزدہ نہیں ہوں بلکہ دراصل تم مجھ سے ڈرتے ہو۔

م۔ (نہایت اطمینان سے اس کے سر پر کھڑے ہوئے) یہ تو ظاہر ہی ہے! بالکل صاف ظاہر ہے۔ یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو۔

ی م۔ (بڑبڑاتے ہوئے ضد سے) ہاں یہ بالکل صاف ظاہر ہے (ماریل حقارت سے منہ پھیر کر آگے بڑھتا ہے۔ یوجین کوشش کر کے کھڑا ہوتا ہے اور اس کے پیچھے جاتا ہے) تم یہ سمجھتے ہو چونکہ میں مار کھانے سے ڈرتا ہوں (آواز روہنی ہو جاتی ہے) چونکہ میں کچھ کر نہیں سکتا سوائے اس کے کہ میں رو دوں جب میرا مقابل کوئی طاقتور شخص ہو جائے۔ چونکہ میں گاڑی کی چھت سے اتنا بڑا اور بھاری بنڈل نہیں اٹھا سکتا جتنا کہ تم اٹھا سکتے ہو چونکہ ایک مدہوش مزدور کی طرح تمہاری بیوی کی خاطر تم سے لڑ نہیں سکتا۔ ان سب باتوں سے تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تم سے ڈرتا ہوں لیکن یہ تمہاری بھول ہے۔ اگرچہ مجھ میں جسے تم برطانوی ہمت کہتے ہو نہیں ہے تو مجھ میں برطانوی بزدلی بھی نہیں ہے۔ میں ایک پادری کے خیالات کو شکست دیدوں گا۔ قطعی اور فاش۔ میں خود اپنے خیالات ان کی جگہ قائم کروں گا اور اس کو تمہارے خیالات کی غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ تم مجھے گھر سے باہر نکالے دے رہے ہو اس لئے کہ تم اُسے میرے اور اپنے خیالات میں اپنی مرضی کے مطابق پسند کرنے کی اجازت اور آزادی دینا نہیں چاہتے اور اسی ڈر کی وجہ سے اب مجھے اس سے ملنے نہیں دینا چاہتے ہو (ماریل غصہ سے ایک دم اس کی طرف مڑ پڑتا ہے یوجین مارے ڈر کے دروازے کی طرف بھاگتا ہے) مجھے چھوڑ دیجئے۔ میں جا رہا ہوں۔

م۔ (حقارت آمیز نفرت سے) نہیں، تھوڑی دیر رک جاؤ اب میں تمہیں چھوؤں گا بھی نہیں، ڈرو مت۔ جب میری

بیوی واپس آئے گی، وہ مجھ سے پوچھے گی کہ تم کیوں چلے گئے اور جب اس سے کہا جائے گا کہ اب تم کبھی ہماری دہلیز پر قدم نہیں رکھ سکتے تو وہ پوچھے گی کہ کیوں؛ پھر مجھے تشریح کرنا ہوگی اور میں تمہارے پاجی پن کا قصہ سنا کر اسے غمگین کرنا نہیں چاہتا۔

ی م۔ (تازہ جوش سے پھر واپس آتے ہوئے) نہیں تم کو بتانا چاہئیے، بلکہ بتانا ہوگا اور اگر تم ذرا بھی جھوٹ بولے تو میں تمہیں نہایت بزدل جھوٹا اور فریبی سمجھوں گا۔ اس سے وہی کہنا جو کچھ میں نے کہا ہے اور یہ بھی کہنا کہ کس طرح تم نے اپنی طاقت اور پامردی دکھا کر مجھے ایسا جھنجھوڑا کہ جیسے کتا چوہے کو جھنجھوڑتا ہے اور کس طرح میں دبک گیا اور ڈر گیا۔ اور یہ بھی کہنا کہ کس طرح تم نے مجھے بزدل رونا اور رکتے کا پلّا بنایا اور گھر سے نکل جانے کو کہا۔ اگر یہ سب اُس سے نہ کہو گے تو میں خود کہہ دوں گا بلکہ اسے سب حالات لکھ کر بھیجدوں گا۔

م۔ (حیران ہوکر) یہ آخر تم یہ سب باتیں کیوں اسے بتانا چاہتے ہو؟

ی م۔ (شاعرانہ بشاشت کے ساتھ) کیونکہ وہ مجھ کو سمجھ جائے گی اور یہ بھی سمجھ جائے گی کہ میں بھی اس کو سمجھتا ہوں۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی اسے بتانے میں چھوڑا، اگر تم حرف بحرف سچا واقعہ اس کے سامنے رکھنے کے لئے تیار نہیں ہو جیسا کہ میں چاہتا ہوں تو سمجھ لو کہ آخر زندگی تک تمہیں اس کا احساس رہے گا کہ درحقیقت وہ میری ملکیت ہے نہ کہ تمہاری۔ بس خدا حافظ! (جاتے ہوئے)

م۔ (نہایت پریشان ہوکر) رکو! میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔

ی م۔ (دروازہ کے قریب گھومتے ہوئے) بہر حال جب میں چلا جاؤں گا تو تم اس سے کچھ تو کہو گے ہی — یا سچ کہو گے یا جھوٹ — بہر حال دونوں میں میرا فائدہ ہے۔

م۔ (مصالحت کے لہجہ میں) ایوجے مینکس! اب اوقات مصلحت کا تقاضا یہ ہوتا ہے ——

ی م۔ (بات کاٹتے ہوئے) ہاں میں جانتا ہوں کہ جھوٹ بولا جائے لیکن یہ سب بیکار ہوگا۔ خدا حافظ پادری۔ (جیسے ہی یوجین جانے کیلئے دروازہ کھولتا ہے ادھر سے کینڈڈا آجاتی ہے۔ جو گھر کے کام کاج کا لباس پہنے ہوئے ہے)

ک۔ یوجین کیا چلدئیے؟ (اس کی طرف بہت غور سے دیکھتے ہوئے) اُفوہ۔ خدا کی پناہ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ اس

حالت میں باہر جا رہے ہو۔ واقعی تم بڑے شاعر ہو جیمس ذرا اس کو دیکھو تو (وہ اس کے کوٹ کا کالر پکڑ کر اس کے سامنے لاتی ہے اور ماریل کو دکھلاتی ہے) ذرا آپ کا کالر تو دیکھئے، ٹائی دیکھئے اور ذرا بالوں کی حالت دیکھئے کوئی دیکھے تو کہے کہ خدا نخواستہ جیسے کسی نے گلا گھونٹنے کی کوشش کی ہے (یوجین اب ماریل کے چہرہ کی حالت دیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کینڈڈا اسے پھر گھسیٹتی ہے) بس اب ذرا سیدھے کھڑے رہو، چپ چاپ (وہ اس کے کوٹ کے بٹن ایک ایک کر کے بند کرتی ہے ٹائی کی گرہ باندھتی ہے اور بالوں کو سدھار دیتی ہے) ہاں اب تم ٹھیک معلوم ہوتے ہو ایک اچھے لڑکے کی طرح۔ ایسے کہ اب میں تم سے کہہ سکتی ہوں کہ بہتر یہ ہے تم ہم لوگوں کے ساتھ کھانا کھا کر جاؤ حالانکہ میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ ایسا نہ کرنا کھانا بس آدھ گھنٹے میں تیار ہو جائے گا۔ (وہ اس کی ٹائی کی گرہ کو آخری بار ٹھیک کرتی ہے اور یوجین اس کا ہاتھ چوم لیتا ہے) اونہ، بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔

ی م۔ میں رکنا واقعی چاہتا ہوں اگر آپ کے شوہر صاحب کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔

ک۔ جیمس، اگر یوجین ایک اچھے لڑکے کی طرح رہنے کا وعدہ کرے اور میرے کام میں مدد دے تو اس کو رکنے کی اجازت ہے؛

م۔ (مختصراً) ہاں ہاں ضرور (وہ میز کی طرف چلا جاتا ہے اور اپنے کا غذات مشغول ہونے کا بہانہ کرتا ہے)

ی م۔ (اپنا بازو کینڈڈا کی طرف بڑھاتے ہوئے) آئیے میز پر کھانا چن دیں (وہ اس کا بازو قبول کر لیتی ہے۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھتے ہیں جب باہر جاتے ہیں تو یوجین کہتا ہے) اس وقت میں دنیا کا سب سے زیادہ مسرور شخص ہوں۔

م۔ میں بھی تھا۔ ایک گھنٹہ ہوا۔ (پردہ) (باقی آئندہ)

مترجمہ نورالحسن ہاشمی

شاعر خدا کے حضور میں

شاعر

اے الٰہ العالمیں!

اے کہ تجھ سے رونقِ روئے فلک، روئے زمیں! اے کہ تیرے نور سے روشن ہے گیتی کی جبیں!
اے کہ پہنائے دو عالم ہے ترے زیرِ نگیں! اے مرے معبود! کوئی بھی ترا ہمتا نہیں!!

اے الٰہ العالمین!

اپنے درد و غم کا تجھ سے ماجرا کہنے کو ہوں روح پر جو جھیلتا ہوں برملا کہنے کو ہوں
جانے اب حرف روا یا ناروا کہنے کو ہوں خون میں ڈوبا ہوا ہے میرا حرفِ آتشیں

اے الٰہ العالمیں!

لعل و یاقوت و گہر سرمایہ داری کیلئے مخلوں کی زرنگاری، شہریاری کیلئے
حور و غلماں اہرمن کی بیش کاری کیلئے تیرے بندوں کے لئے آب خنک نانِ جویں

اے الٰہ العالمیں!

عشرتیں ہی عشرتیں ہیں اہرمن کے واسطے جنتیں ہی جنتیں ہیں اہرمن کے واسطے
تیری ساری نعمتیں ہیں اہرمن کے واسطے جو بچاری ہیں ترے ان کے لئے کچھ بھی نہیں!

اے الٰہ العالمیں!

اہلِ حق کے واسطے زخمِ جگر، رنج و محن! اہلِ حق کے واسطے زندان ہے یا دار و رسن!
اہلِ حق کی میتیں ہیں خوار، بے گور و کفن! ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے دلِ اندوہگیں

اے الٰہ العالمیں!

بےکسوں کے پاس محنت کے سوا کچھ بھی نہیں ان کی قسمت میں مصیبت کے سوا کچھ بھی نہیں

اک تری رحمت کی حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں ڈر ہے یہ بھی تجھ سے برگشتہ نہ ہو جائیں کہیں!!

اے الٰہ العالمیں!

غمزدوں کی سرد اور خاموش آہوں کی قسم پھیکی پھیکی صورتوں، غمگیں نگاہوں کی قسم

تیری خاموشی کی، تیرے دادخواہوں کی قسم ڈگمگا جاتا ہے میرا بھی کبھی پائے یقیں!

اے الٰہ العالمیں!

خدا

کارزار دہر میں شمشیر اٹھانا چاہیئے زخم بڑھ بڑھ کر لگانا اور کھانا چاہیئے!

باغ ہستی میں اگر ہے شوق گل چینی تجھے خار چبھنے پر بھی تجھ کو مسکرانا چاہیئے

زندہ لاشیں ہیں جنہیں کہتے ہیں مزدور و کساں زندہ رہنے کا سبق ان کو سکھانا چاہیئے

دیکھ کیسے ٹوٹتا ہے شہریاری کا فسوں! خفتہ بختوں کا ذرا شانہ ہلانا چاہیئے

خود ہی گر جانے کو ہے دیوار استبداد کی اس کو گرنے کا مگر کوئی بہانا چاہیئے

ق

ریزہ ریزہ ہو کے پیوند عدم ہو جائے گی ضرب کاری "نام حق" لے کر لگانا چاہیئے

ابلہی اور بے حسی کا نام "مذہب" ہے اگر صفحۂ ہستی سے مذہب کو مٹانا چاہیئے

زندگی ہی زندگی ہے، آگہی ہی آگہی "حق" کو راہِ زیست میں مشعل بنانا چاہیئے۔

"حق" ہی "حق" تجھ کو نظر آنے لگا ہر سو جلوہ گر اک ذرا باطل کے پردے کو ہٹانا چاہیئے

اہرمن نے کر دیا تیرا گلستاں پائمال پھر اسی اجڑے گلستاں کو بسانا چاہیئے

میں مٹا سکتا ہوں دم بھر میں وجود اہرمن لیکن اے شاعر! تجھے خود ہی مٹانا چاہیئے

اہرمن ہو سرنگوں، میری مسرت ہے یہی

تیرے ہاتھوں یہ گرے میری مشیت ہے یہی

نغمۂ شاعر

یورش ہو اہرمن کی بلند حق کا نشاں رہے گا! رہے گا جب تک بھی نقش باطل کا مردِ حق تیغ راں رہیگا!

مری نوا بانگِ صورِ حق ہے، مری ضیا شمعِ نورِ حق ہے
ہزار ہو برق و باد و باراں، رواں مرا کارواں رہیگا!

رہے گا وہ دورِ کامرانی چلے گا وہ دورِ شادمانی
کشاکشِ خیر و شر رہے گی، نہ فکرِ سود و زیاں رہیگا!

دلوں میں ہوگا ظہورِ یزداں فضاؤں میں ہوگا نورِ یزداں
رہے گا نام اہرمن کا باقی نہ اہرمن کا نشاں رہیگا!

رہے گی باطل کی شہریاری نہ اہلِ باطل کی فتنہ کاری
رہے گا فرمان حق ہی جاری کہ حق ہی حق کامراں رہیگا!

نہ شوکتِ خواجگی رہے گی، نہ نخوتِ سروری رہے گی
نہ سطوتِ قیصری رہے گی نہ غرۂ حکمراں رہیگا!

نہ ہوگی بے کاریوں کی کلفت نہ ہوگی ناداریوں کی آفت
نہ شکوۂ آسماں رہے گا نہ گریۂ خوں فشاں رہیگا

رہیں گی پامال آرزوئیں نہ رائگاں جائیں گی وفائیں
نہ حسن دامن کشاں رہے گا نہ عشق گرمِ فغاں رہیگا

رہے گا دل شادِ عشق دائم رہے گا شاداب حسن دائم
رہے گا بلبل کو شکوۂ گل نہ گل کو خوفِ خزاں رہیگا

اِدھر سے ہوگی دعائے الفت اُدھر سے ہوگا نزولِ رحمت
نہ حق سے ہم سرگراں رہیں گے نہ ہم سے حق سرگراں رہیگا

رہیں گی معصوم عرش والوں سے روز و شب صحبتیں ہماری
رہے گا کوئی حجاب باقی، نہ آسماں درمیاں رہیگا

اتر کے عرشِ بریں سے ہوگا ہماری جنت میں جلوہ فرما
خدائے حق بن کے نورِ الفت ہمارے ہی درمیاں رہیگا

شجر حجر سے، شب و سحر سے نجوم و خورشید سے قمر سے
سرائے گیتی کے بام و در سے سدا یہ نغمہ رواں رہیگا

"خلیفۂ حق" نے اہرمن کو جہاں سے آخر مٹا کے چھوڑا
اور اپنے اجڑے ہوئے گلستاں کو رشکِ جنت بنا کے چھوڑا!"

(اثر صہبائی)

ڈرائنگ رُوم

(سانیٹ)

یہ سینری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں

یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے

یہ ریڈیو ہے، یہ قمقمے ہیں، یہ میز ہے، یہ گلدستہ ہے

یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شاہنشہ، یہ ملکہ ہیں!

——— ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہے یہ!

——— ہاں اس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے!

ہاں اس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گل ہو جاتی ہے!

سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے۔ ہاں میرا ڈرائنگ روم ہے یہ!

——— اتنی جلدی مزدور عورت! آخر یہ گلے میں باہیں کیوں!

لے دیر ہوئی اب بھاگ بھی جا۔ بس اتنی محبت کافی ہے!

اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے ہی کی حاجت کافی ہے!

آنکھیں نم، خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں ———؟!

——— میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا پائپ کے دھوئیں کے بادل میں

میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک تخیل کے میلے آنچل میں

(سلام مچھلی شہری)

ہمارے یتیم خانے

یتیم بچوں کی پرورش بھی قوم کا ایک اہم فریضہ ہے۔ مسلمانوں کے ہاں بھی یتیم خانے موجود ہیں مگران کی حالت اس قدر زبوں ہے کہ بیان سے باہر ہے بعض لوگوں نے تو اس کو معاش کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ چار پانچ اندھے لولے یتیم بچوں کو لے کر اور ایک رسید بک چھپوا کر گلی گلی پھرایا جاتا ہے اور یتیم بچوں سے بھیک منگوا کر اپنا علوا مانڈا سیدھا کیا جاتا ہے۔ کچھ باقاعدہ یتیم خانے بھی ہیں جن کی آمدنی کا دارومدار کچھ وقف شدہ جائداد اور چندوں پر منحصر ہے۔ چندہ کرنا کچھ عیب کی بات نہیں ہے مگر جو طریقہ ہمارے یتیم خانوں نے اختیار کر رکھا ہے وہ نہ صرف معیوب ہے بلکہ یتیم بچوں کی آئندہ زندگی کے لئے بھی مضر ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ دو دو تین تین یتیم بچے چندہ کا ایک مقفل بکس ہاتھ میں لئے ریلوں کے ڈبوں میں آتے ہیں اور اپنی درد بھری کتھا سنا کر مسافروں سے چندہ کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یتیم بچوں کو لے کر شہر در شہر کوچہ بہ کوچہ پھرایا جاتا ہے۔

اگر یتیم خانوں کے اندرونی حالات دیکھے جائیں تو اور زیادہ مایوس کن ہیں، نہ کوئی باقاعدہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہوتا ہے نہ یتیم بچوں کو کام کاج سے لگانے کی کوشش ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں فقیروں کی کثرت کا باعث خود ہمارے یتیم خانے بھی ہیں جو انھیں بچپن ہی سے بھیک مانگنے کی عادت ڈال دیتے ہیں۔

میرے خیال میں مندرجہ ذیل اصولوں پر یتیم خانوں کی تنظیم کی جا سکتی ہے :-

۱۔ ایک شہر میں صرف ایک یتیم خانہ ہو جو شہر کے معزز متمول حضرات اور تعلیم یافتہ حضرات کے تحت میں چلے لوگوں کو تلقین کی جائے کہ وہ ایسے لوگوں کو جو یتیم بچوں اور بچیوں کو لے کر ان کے گھروں پر آتے ہیں ہرگز چندہ نہ دیں۔

۲۔ یتیم خانے کی ایک عمدہ خوبصورت اور کشادہ عمارت ہو جس میں بچوں اور بچیوں کے رہنے کا باقاعدہ انتظام ہو عموماً یہ عمارت شہر کے باہر ہو۔ اس کے قریب کھیتی وغیرہ کے پارک ہوں تاکہ بچے کھیل کود کیلئے انھیں استعمال کر سکیں۔

۳۔آمدنی کے ذرائع | (۱) جو جائداد یں یتیم خانوں کے نام ہیں انھیں کمیٹی اپنے تحت میں کرے۔

(ب) اگر شہر میں ایسی مسجدیں ہوں جن کی آمدنی بہت زیادہ ہو تو ان کی منتظمہ کمیٹی کو مجبور کرکے ایک آدھ جائداد یتیم خانے کے نام وقف کرالی جائے۔

(ج) یتیم خانے کی کمیٹی کے معزز ممبران اپنی جیب سے کچھ ماہوار چندہ مقرر کردیں لیکن یہ رقم متعین نہیں کیجائے

(د) چندہ کے خوبصورت بکس بنواکر مسلمان تاجروں کی دوکانوں اور متمول ملازم پیشہ حضرات کے مکانوں میں لٹکائے جائیں تاکہ وہ روزانہ یا ہفتہ واری یا ماہواری اس میں کچھ چندہ ڈالدیا کریں۔ ہر ماہ یتیم خانہ کا ایک ملازم اسما بکس میں سے باقاعدہ رسید دے کر رقم لے آئے۔

(س) عموماً شہر کی میونسپل کمیٹیاں یتیم خانوں کو کچھ رقم سالانہ دیا کرتی ہیں اسے وصول کیا جائے۔

(ص) بارہا سنا ہے کہ مسلمانوں کا لاکھوں روپیہ جو انہیں سود کی شکل میں ملتا ہے ہر سال عیسائی مشنریوں کو چلاجاتا ہے۔ جس حد تک ہوسکے اس رقم کو وصول کیا جائے۔

یتیم خانے کا اندرونی انتظام | عموماً یتیم خانوں میں اس بات کا انتظام کیا جاتا ہے کہ بچوں کو کچھ قرآن شریف کی تعلیم اور کچھ لکھنا پڑھنا سکھایا جائے۔ اس کے علاوہ چند یتیم خانوں میں بعض دستکاریاں سکھانے کا انتظام بھی کیا جاتا ہے یہ چیزیں اپنی جگہ بہت اچھی ہیں مگر ان کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں نکل رہا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر مندرجہ ذیل طریقہ ہے۔

(۱) بجائے خود پرائمری تعلیم کا انتظام کرنے کے بچوں کو میونسپل کمیٹی کے پرائمری اسکولوں میں تعلیم دلوائی جائے۔ اس سے یتیم خانے کو خواہ مخواہ تعلیم کے خرچ کا زیر بار نہیں ہونا پڑے گا۔

(ب) پرائمری تعلیم کے بعد جو چند لڑکے خوب ہوشیار اور ذہین معلوم ہوتے ہوں ان کو ہائی اسکول میں داخل کرادیں۔ ان کے کھانے اور رہائش کا انتظام یتیم خانے میں ہو۔

(ج) عموماً ہر ایک صوبے میں صوبے کی حکومت کی طرف سے دستکاری سکھانے کا مفت انتظام ہوتا ہے۔ مثلاً دہلی میں محلہ چوڑی والان میں سرکاری دست کار انسٹیوٹ ہے۔ جہاں کپڑا بننا، کپڑا رنگنا، موزہ بنیائن بنانا، نواڑ بننا دری بننا وغیرہ وغیرہ کا کام مفت سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر سال عموماً جنوری فروری کے مہینے میں شہد کی

کھیاں پالنے کے طریقہ کی تعلیم مفت دی جاتی ہے حکومت کی طرف سے اس قسم کا انتظام ہوتے ہوئے یتیم خانوں کا خود بخود اس قسم کی تعلیم کا انتظام کرنا نہ صرف فضول خرچی ہے بلکہ بچوں کے لئے مضر ہے کیونکہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے یتیم خانے خاطر خواہ انتظام نہیں کرسکتے صرف معمولی انتظام پر اکتفا کرتے ہیں جو بچوں کو عمدہ دستکار نہیں بنا سکتا۔ برخلاف اس کے سرکاری دستکاری انسٹیٹیوٹ میں بخوبی انتظام ہوتا ہے سخت افسوس ہے کہ حکومت روپیہ صرف کرے دوسری قومیں فائدہ اٹھائیں ہم فائدہ نہ اٹھائیں۔ اس واسطے بچوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ایسی دستکاری انسٹیٹیوٹوں میں داخل کرایا جائے تاکہ یتیم بچے عمدہ دستکار ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں۔

(د) اکثر بڑے لوگ جب کبھی کچھ بڑی دعوت کرتے ہیں تو یتیم بچوں کی دعوت بھی کر دیا کرتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ یتیم خانے کے لوگ یتیم بچوں کی لین ڈوری بنا کر بازاروں میں سے گذارتے ہوئے دعوت کے مقام پر لیجاتے ہیں اس طریقہ کو بالکل بند کیا جائے کیونکہ یہ نہ صرف معیوب ہے بلکہ بچوں کی آئندہ زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس سے ان میں احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے۔

(و) اکثر بڑے کارخانوں اور ریلوے ورکشاپ میں دس دس بارہ بارہ سال کے بچے بطور شاگردی Apprentice کے رکھے جاتے ہیں جنھیں چار پانچ سال تک کارخانے کا کام سکھایا جاتا ہے۔ شاگردی کے زمانے میں کچھ اجرت بھی دیجاتی ہے شاگردی کی مدت کے بعد انھیں وہاں پر باقاعدہ ملازم رکھ لیا جاتا ہے مثلاً حال ہی میں این۔ ڈبلیو ریلوے کے ورکشاپ میں تین سو لڑکوں کی بطور تنخواہ دار شاگردوں کے ضرورت تھی جنھیں پانچ سال تک ٹرننگ دیجائے گی۔ ٹرننگ کے زمانہ کی اجرت پانچ آنے یومیہ پہلے سال۔ سات آنے یومیہ دوسرے سال۔ بارہ آنے یومیہ پانچویں سال مقرر تھی اس کے بعد چودہ آنے یومیہ یا ایک روپیہ یومیہ پر انھیں باقاعدہ ملازم رکھ لیا جائیگا یتیم خانوں کو چاہیے کہ جب کبھی اس قسم کے اعلانات آئیں تو کچھ بچوں کو ورکشاپ میں داخل کرا دیں وقتاً فوقتاً یتیم خانہ کا کوئی ممبر ان بچوں کی ورکشاپ میں جاکر دیکھ بھال کرلیا کرے۔

(ی) جو نوجوان بچے کمانے کے لائق ہوجائیں ان کی شادی کا انتظام یتیم بچیوں سے کردیا جائے یتیم بچیوں کو کشیدہ کاری اور دیگر گھریلو دستکاریاں سکھانے کا انتظام کیا جائے کچھ یتیم بچیوں کو دایہ گیری کی تعلیم دلائی جائے کہ وہ عمدہ اور قابل دایہ بن سکیں۔

(ک) اگر سرمایہ اجازت دے تو یتیم خانے کی حدود کو وسیع کیا جائے یعنی یتیم خانہ نہ صرف بچوں کی تعلیم و تربیت وغیرہ کا انتظام کرے بلکہ شہر کے ان غریب مسلمانوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت و پرورش کا انتظام بھی کرے جو غربت کے باعث اپنے بچوں کو نہ تعلیم دلا سکتے ہیں نہ کوئی دستکاری سکھا سکتے ہیں۔

محمد یونس صاحب متعلم ایم۔ اے دہلی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سوگوار شباب :۔ از مجنوں گورکھپوری۔ ایوان اشاعت گورکھپور، سائز ۱۷×۲۷ صفحات ۱۳۶ قیمت عہ مجلد عمر کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

یہ ایک طویل افسانہ ہے جسے مجنوں گورکھپوری صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہے پلاٹ ہارڈی کے ایک مشہور ناول سے لیا گیا ہے اور ہندوستانی ماحول میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ آصف پور کا حاتم ایک جہاندیدہ جہاں گشت زمیندار سندیلہ کی ایک پڑھی لکھی خوبصورت مہذب گھرانے کی لڑکی سائرہ سے شادی کر لیتا ہے اور تین سال بعد پھر رگ دیوانگی پھڑکتی ہے اور وہ غائب ہو جاتا ہے۔ واقعات قصہ اس وقت سے شروع ہوتے ہیں جب اسے لاپتہ ہوئے آٹھ سال گذر جاتے ہیں اور سائرہ اٹھارہ برس کی حسینہ سے ۲۶ برس کی پختہ کار اور اپنی زمینداری کا انتظام کرنے والی بڑی منظم بی بی ہو جاتی ہے مشتاق اس کا ایک دور کا نوجوان رشتہ دار جو اپنی تعلیم صرف ایف۔ اے تک پوری کر کے اسے ختم کرنے پر مجبور ہو گیا ہے اس کی املاک کے ایک بوسیدہ اور شکستہ قدیم عمارت کنوز کوٹ کو اپنی لائبریری بنانے کیلئے اجازت حاصل کر لیتا ہے سائرہ بھی وہاں آنے جانے لگتی ہے اور محبت کے تماشے شروع ہو جاتے ہیں لیکن چونکہ تمام رومانیت اور شعریت محض ایک جذبہ (جسے جنسی جبلت کہتے ہیں) کی کرشمہ سازیوں کا نام ہے جہاں یہ پورا ہوا یا عقل کو کسی طرح موقعہ مل گیا وہیں یہ جوش یہ آندھی محض ایک خوشنما لیکن بے بنیاد ڈھکوسلا معلوم ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ اسی تلخ حقیقت کا ظاہر کرنا مجنوں صاحب کا مقصد اولین ہے۔ واقعات کچھ ایسے پلٹا کھاتے ہیں کہ مشتاق کو اس کا چچا پھر تعلیم کے لئے بھیج دیتا ہے۔ سائرہ کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کی محبت محض ایک خود غرضی ہے ورنہ درحقیقت مشتاق کی جائز حقدار مشتاق سے کم عمر اس کی چچازاد بہن زینب ہے اس حقیقت کا احساس اسے روکتا ہے کہ وہ مشتاق کو اپنی خود غرضی کا شکار نہ ہونے دے چنانچہ شیخ حاتم کی وفات کی خبر سن کر ایک بہت معمولی آدمی سے شادی کر لیتی ہے اور اپنی تہائی جائداد مشتاق کے نام لکھ دیتی ہے اور ان تمام باتوں کی اطلاع مشتاق کو دیدیتی ہے

مشتاق کئی سال گھر نہیں آتا اور بالا بالا علی گڑھ سے ولایت چلا جاتا ہے اور وہاں کئی سال بعد سائرہ کے شوہر کی وفات کی خبر سن کر سائرہ سے شادی کرنے کی غرض سے واپس آتا ہے۔ سائرہ یہ مژدہ سنتے ہی جاں بحق ہو جاتی ہے۔

مجنوں صاحب میں رومانیت زیادہ ہے اور ہارڈی کی سی قنوطیت بہت کم ہے اسی لئے اس افسانے میں وہ پہلو کمزور ہیں جہاں قدرت کی سفاکی اور بیرحمی جتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی مقامی حالات کی کم واقفیت نے اس ناول کو ایک رومانی دنیا میں ہی رکھا ہے اور ہارڈی کی طرح مفصل مقامی رنگوں کی تشریح سے جو دنیاویت پیدا ہو جاتی ہے وہ اس میں کمتر پائی جاتی ہے۔ اس کا بہت کچھ ذمہ دار مجنوں صاحب کا فضیلت ناشاعرانہ خطابت کا اسلوب بھی ہے ممکن تھا کہ وہ چیز پیدا ہو جاتی اگر یہ افسانہ ناول کی شکل میں مفصل لکھا جاتا اور اسی اختصار کی وجہ سے ہارڈی کی طرح قدرت کے سامنے اُس بے بسی کا اظہار نہیں ہو پایا جس میں انسان گرفتار نظر آتا ہے۔ البتہ مصنف کا مقصد واضح ہو گیا ہے کہ تمام شعریت اور رومانیت محض ایک جذبہ جنسی کی کرشمہ سازیوں کا ایک رنگین خواب ہے اور بس اردو داں طبقے کی رومانیت سے حد سے زیادہ انس کیلئے تو یہ اچھا زہر ہے ورنہ شعریت بھی اپنی اقدار رکھتی ہے۔ امید ہے کہ مجنوں صاحب کا یہ افسانہ بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

شہرِ خموشاں: ازسید محمود مورخ بی۔اے۔ گلفروش پبلشنگ ہاوس دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۱۵ قیمت مہ ر کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

یہ محمود صاحب کے سات سائنٹفک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں شاہد صاحب مدیر ساقی کا ایک مختصر تعارف نامہ بھی ہے۔ سائنٹفک افسانوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ افسانے فرضی سائنس کے مفروضوں پر مبنی ہیں مثلاً کسی کو آب حیات مل گیا ہے اور کوئی نظروں سے غائب ہونے کے راز سے واقف ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے وضعی سائنس کی کہانیاں محمود صاحب نے عوام کی تفریح طبع کے لئے لکھی ہیں اس لئے انہیں موجودہ معنی میں افسانے نہ سمجھا جائے بلکہ طلسم ہوشربا کی سی کہانیاں۔ جن لوگوں کو دلچسپی ہو اور جو دنیا کے کاروبار اور عقلی تیقن سے لمحہ بھر کے لئے آزادی حاصل کرکے ایک خیالی و فرضی دنیا میں پہنچ جانا چاہتے ہوں وہ ضرور پڑھیں۔ قیمت ذرا زیادہ ہے۔

(م۔ح)

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال — **عالیجناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب**

مجوزہ سرمایہ	ساٹھ لاکھ روپے	۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ	پچیس لاکھ روپے	۲۵۰۰۰۰۰
اداشدہ سرمایہ	دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ روپے	

اپنے تمام بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجیے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، ریل، سائیکل، موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۴ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں، ان کے سامنے خاص ترقی کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی بعض لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے، وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ ان اشیاء کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ نفاست سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ نہیں۔ خوشبو کا جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے، آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی، محمد علی تاجران عطر۔ حنا بلڈنگ۔ لکھنؤ

ضرورتِ مترجمین

عربی، فارسی، انگریزی سے براہِ راست شستہ و رفتہ سلیس اُردو زبان میں ترجمہ کرنے والوں کی ضرورت ہے۔ جو مناسب اُجرت پر علمی ادبی تاریخی نیز متفرق علوم و فنون کی کتابوں اور رسائل کے مضامین کا ترجمہ کر سکیں کسی ایک زبان اور اردو کا جاننا کافی ہے۔ علمی قابلیت نیز تجربے کے متعلق تفصیل سے جواب آنا ضروری ہے۔

نوٹ:۔ ہر قسم کی اُردو فارسی، عربی انگریزی کتابیں مطبوعات: ہندوستان ایران، مصر، امریکہ وغیرہ ہماری معرفت نہایت ارزاں قیمتوں پر مل سکتی ہیں۔ شائقین اپنے اسمائے گرامی اور مکمل پتوں سے مطلع فرمادیں کہ جدید فہرستیں وقتاً فوقتاً ارسال کی جاسکیں

پتہ ذیل پر خط و کتابت کریں

شباب کمپنی۔ پوسٹ بکس ۳۱۲۶ بمبئی نمبر۳

مختصر تاریخ ادب اردو

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے۔ لکچرار شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی

اُردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے۔ کوئی کتاب میر، داغ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی چند قدم آگے بڑھی بھی ہے تو وہ موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا شعرا کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی اس وقت کی کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے۔ مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظر انداز نہ ہو۔

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اردو کے قدیم و جدید شعرا و نثر نگاروں کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

کتابت، طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات مجلد مع گرد پوش۔ قیمت صرف عہ

ملنے کا پتہ

منیجر (بک ڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد

کوزہ میں دریا

تازہ خبریں، سیاسی مضامین، دلچسپ تبصرے

ہفتہ میں دو بار

پڑھئے اور دنیا کے واقعات سے پوری واقفیت حاصل کیجئے

اخبار "انصاری"

کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ افراط و تفریط سے بالاتر ہے

معقولیت اور آزادی

کا بہترین مقصد "انصاری" نے پورا کردیا ہے

چھ سال سے

برابر جاری ہے اور پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے

غریب اور امیر

سب انصاری کو پڑھتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں۔

زمانہ جنگ

میں بھی عوام الناس کے لئے ایک روپیہ سالانہ کی رعایت کردی گئی ہے

سالانہ چندہ ۶ ششماہی ۳

رعایتی سالانہ ۵ ششماہی ۲/۸

منیجر انصاری اردو بازار، دہلی

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

مئی [illegible]ء کے چند مضامین:-

۱- حیدرآباد میں شکر سازی۔

۲- تمباکو۔ اس کا استعمال اور نقائص۔

۳- پودے میں بالیدگی کے ہارمون۔

۴- پودوں کے امراض۔

۵- حیوانات کی تربیت

جون [illegible]ء کے چند مضامین

۱- ایک اور ایک سے زائد انجن کے ہوائی جہاز

۲- بجلی اور گرج پر ابن سینا کے خیالات

۳- حشرات کی تباہ کاریاں اور فائدے۔

۴- تاریخ زمین کے ماخذوں پر ایک نظر

۵- مچھلی کا تیل

۶- ہماری غذاؤں کے ماخذ۔

۷- آیوڈین۔

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب۔ سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہیں۔

چندہ سالانہ صہ سکۂ انگریزی — نمونے کا پرچہ آٹھ آنے

المشتہر

معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

شکسپیر ہند آغا حشر کاشمیری (مرحوم) کی واحد یادگار ماہوار مجلہ

جاری شدہ ۱۹۳۶ء **حشر** (جالندھر شہر) حجم ۸۰ صفحات

رعایتی سالانہ چندہ اس ماہ کی آخر تاریخ تک صرف دس آنے

ہندوستان کا پہلا ماہانہ پرچہ جس کے متعلق ملک کے مشہور و معروف

۱۰۵ رسائل و اخبارات نے نہایت شان دار توصیفی نوٹ لکھے ہیں

آپ دس آنے کا منی آرڈر روانہ کر دیجیے۔ یہ نایاب علمی ادبی تحفہ ایک سال

تک حاضر خدمت ہوتا رہے گا اگر پرچہ پسند نہ آئے تو حلفاً چندہ واپس کر دیا جائے گا

نوٹ:۔ اس ماہ کے بعد چندہ مقررہ ۲ روپے لیا جائے گا۔

مینیجر رسالہ حشر۔ جالندھر شہر، پنجاب



مذہب اور سیاست کا آئینہ

اسلام کا داعی، ملت بیضا کا خادم، آزادی کا علمبردار اور بلند پایہ صحافت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

ہر جماعت کے اچھے کاموں کی تحسین اور غلط روی پر برہنہ شمشیر بن کر نکتہ چینی کرتا ہے۔

عرب ... کی اہم خبریں ہندوستان بھر میں سب سے پہلے شائع کرتا ہے۔

گندی ذہنی فواحش، مذہبی منافرت اور انفرادی جھگڑوں سے پرہیز کرتا ہے۔

ہر مسئلہ پر ... سیاسیات پر ... حقائق پیش کرتا ہے۔

اس کا مسلسل مطالعہ آپ کو دین کا پرجوش حامی، اسلام کا سچا رکن، سیاست کا مبصر اور فہم و فراست کا مالک بنا دیگا۔

ہفتہ میں دو بار ٹھیک وقت پر شائع ہوتا ہے

زمزم۔ لاہور

شرح چندہ اخبار

سالانہ چھ روپے

ششماہی ساڑھے تین روپے

سہ ماہی دو روپے

برما کیلئے

سالانہ آٹھ روپے

ششماہی ساڑھے چار روپے

سیاست

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے ۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعے اُردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے ۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا ممالک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے ۔ رسالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اُردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے ۔ یہ رسالہ ہر شخص کو پڑھنا چاہیے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی ہے ۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں ، پروفیسر شعبۂ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ، سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی و دیگر امور کے متعلق مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چارمینار حیدرآباد دکن ، سے دریافت کیجیے

قیمت سالانہ صہ ، فی پرچہ ۸ر

ماہنامہ "ایشیا" میرٹھ کا مکاتیب نمبر

ہندوستان کے تمام مشاہیر ادب شعراء، انشاء پردازوں، افسانہ نگاروں اور مشہور ہستیوں کے خطوط کا غیر فانی مجموعہ

مرتبہ:۔ حضرت ساغر نظامی

اردو میں اس قسم کی کوئی مستند اور اعلیٰ کتاب اس وقت تک شائع نہیں ہوئی جس میں ترتیبا در لطیف حواشی کے ساتھ ملک کی مشہور ہستیوں کے سیاسی، علمی، ادبی، شعری اور اسلامی خطوط بہ یک وقت جمع کر دیے گئے ہوں ایشیا نے اپنا تازہ نمبر "مکاتیب نمبر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یوں تو ہر لفظ جو کسی زبان سے نکلتا یا لکھا جاتا ہے، اپنے موضوع پر کم و بیش روشنی ڈالتا ہے لیکن خطوط اور خاص کر وہ خطوط جو بڑے آدمیوں کی طرف سے اپنے بے تکلف احباب کو لکھے جاتے ہیں زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔ ان سے طبیعت کی گہرائیوں اور حالات و واقعات کی اصلیتوں کا راز فاش ہوتا ہے جو سماجی رکھ رکھاؤ اور ادبی رسوم و تکلفات کی متحمل نہیں ہو سکیں۔ مکاتیب کی مدد سے ہمیں لکھنے والوں کی پبلک زندگی سے لے کر خانگی حالات اور ذاتی رجحانات تک کا پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح ان تمام افعال کی توجیہہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتے ہیں اور اصل میں احساسات کے نازک اور لطیف رشتوں سے منسلک ہیں۔

یہ نمبر کتابی صورت میں ۲۲×۱۸ سائز کے ۴۰۰ صفحات پر شائع ہوا ہے۔ اس جنگ کے زمانے میں نہایت بہتر چھپائی، نفیس سپید کاغذ۔ شاندار سرورق۔ جدت نواز گرد پوش اور اپنے خطوط کے لحاظ سے تو سینکڑوں جدتوں اور دلچسپیوں کا حامل ہے اس نمبر کی مثال دنیائے ادب میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔

قیمت فی جلد عہ مع محصول، جو صاحب "ایشیا" کی مستقل خریداری فرمائیں گے وہ اسے

مفت

حاصل کر سکتے ہیں۔ قیمت "ایشیا" میرٹھ سالانہ للعہ

مینیجر رسالہ "ایشیا" ادبی مرکز "میرٹھ"

OKASA



کامل صحت اور جوانی کی طاقت
حاصل کرنے کے لئے

اوکاسا استعمال کیجئے

براہ راست اوکاسا ڈپو

مطبوعاتِ جامعہ

مکتبہ جامعہ نے طے کیا ہے کہ اُردو نظم و نثر کی بعض منتخب کتابوں کے سستے ایڈیشن شائع کئے جائیں۔ چنانچہ کچھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ چند اور زیرِ طبع ہیں۔ جو شائع ہو چکی ہیں، ان کے نام اور قیمتیں درج ذیل ہیں۔

انتخاب میر ۱۰/
انتخاب حسرت ۱۰/
انتخاب سودا ۱۰/
مسدس حالی ۱۰/
دیوان غالب ۱۰/

ملنے کے پتے:-

صدر دفتر۔ مکتبہ جامعہ - قرول باغ - نئی دہلی

شاخیں - مکتبہ جامعہ - جامع مسجد دہلی۔ مکتبہ جامعہ - امین آباد، لکھنؤ
مکتبہ جامعہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور۔ مکتبہ جامعہ - پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ایجنسیاں - سرحد بک ایجنسی بازار قصہ خوانی پشاور۔ کتاب خانہ عابد شاپ، حیدرآباد

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

بحر الکاہل کی سیاست

(مصنفہ امین خالدی)

اس مقالے میں مصنف نے بحر الکاہل کی سیاسی اور معاشی اہمیت ظاہر کی ہے ان کا خیال ہے کہ اگرچہ اس وقت دنیا کی نظروں میں بحر الکاہل نے وہ جگہ حاصل نہیں کی ہے جو اس کا حق ہے پھر بھی مستقبل میں بحر الکاہل کی اہمیت دنیا کے تمام سمندروں سے بڑھ جائے گی. جس طرح کسی زمانہ میں بحر روم کے ارد گرد مصری، یونانی اور رومی تمدن کا عروج ہوا اور اب بحر اوقیانوس یورپ اور امریکہ کی جدوجہد کا میدان ہے۔ اسی طرح آیندہ بحر الکاہل دنیا کی معاشی اور سیاسی ترقی کا مرکز ہوگا۔ اس مقالہ میں انھوں نے امریکہ، جاپان، روس انگلستان اور چین کے مفاد کے باہمی اتحاد اور ان کی ایک دوسرے سے ٹکر کے امکانات پر بھی گہری نظر ڈالی ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ)

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

حمائل شریف

مشہور خوش نویس فاطمۃ الکبریٰ بنت محمد دین صاحب خوش نویس کی لکھی ہوئی حمائل شریف جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ کتابت کی دلآویزی اور پاکیزگی کی وجہ سے خاص شان کی مالک ہے۔ ترجمہ شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ محترمہ فاطمۃ الکبریٰ وہی خاتون ہیں جنھیں اپنے فن میں کامل ہونے کے باعث حکومت حیدرآباد سے ایک گراں قدر وظیفہ دیا جاتا ہے۔ ہدیہ سے

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی ۳

جامعہ

زیر ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم۔اے

جلد ۳۵ — نمبر ۲ | بابتہ ماہ اگست ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ ۵ر فی پرچہ ۸ر

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔اے آکسن، محبوب المطابع دہلی

مطبوعاتِ جامعہ

کی مفصل فہرست شائع ہوگئی ہے۔ اس فہرست میں آپ کو
اپنے پسند کی بہت سی نئی کتابیں نظر آئیں گی
مطبوعات جامعہ کے علاوہ دوسرے اداروں کی
کتابیں بھی مختلف عنوانات کے ماتحت درج کی گئی ہیں
اربابِ ذوق یہ نئی فہرست منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

اقبال

بروں زیں گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے ‌‌ ‌ ‌ کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحرگاہے
پس از من شعر من خوانند و دریابند و می گویند ‌ ‌ ‌ جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے!

(اقبال)

(یہ غنائیہ، نظر اور خیال کا ایک سفر ہے جو کلام اقبال کی روشنی میں بارگاہ تجلی تک کیا گیا ہے اس میں میں نے اقبال کے چند خاص تصورات اور ان کا مقام دکھانے کی کوشش کی ہے اہل نظر جانتے ہیں کہ اقبال کو دیکھنے اور دکھانے کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں میں نے ان میں سے وہی پہلو لیا ہے جسے میں سب پر حاوی اور اہم سمجھ سکا۔ یہ غلط نہیں کہ فکر اقبال کی گہرائیوں تک پہونچنا دشوار ہے۔ یہ شاید توفیق ازلی تھی کہ ایسے نازک موضوع پر سب سے پہلے مجھے غنائی تمثیل لکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ میری اس "سعی دشوار پسند" پر رائے زنیاں ہوں گی لیکن اقدام اولین کی توقع سے قطع نظر، اگر اس میں ناظر کو شاعر مشرق کا پیام نظر آجائے تو مجھے بڑا اطمینان ہوگا)

پہلا منظر

میلادِ آسمانی

(جنت کے ایک رنگین ترین حصہ میں جہاں شاعروں کی روحیں اپنے بلند تخیل اور دلی تمناؤں کو پھولوں کی طرح کھلتا ہوا دیکھتی ہیں اور ان کی آزادی کے ساتھ آبیاری کرتی ہیں، غالب کی روح ایک بلند مقام پر کھڑی ہوئی مسرور نظر آ رہی ہے، اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روحِ غالب۔ نورِ ایوانِ تصور، مری یزداں نگہی — برقِ طوفانِ تجلی، میری پروازِ خیال

آج آشفتہ ہوئے گیسوئے شبگونِ فراق — آج بیتاب ہوا شاہدِ رنگینِ وصال

قابلِ رشک ہے اندازِ جنوں کا انجام — ہو گیا جنتِ اسرار بیابانِ خیال

سجدہ ریزی میں ہے مصروف مری لوحِ جبیں — خوآسینہ فردا ہے مرا ذوقِ جمال

ایک فرشتہ۔ ہمرہِ طائرِ سدرہ ترے ارمانِ بلند — رنگِ بیتابیِ فطرت تھے دل کے احوال

دوسرا فرشتہ۔ بحرِ فردا پہ مچلنے لگی تیری اُمید — بھر گیا بادۂ الفت سے ترا جامِ سفال

(جنت کے پھولوں کا ایک خوشنما گلدستہ ہاتھ میں لیے ہوئے روحِ حالی آتی ہے اور غالب کو پیش کرتی ہے)

روحِ حالی۔ میرے اشکوں نے دیا تھا جسے اک رنگِ نمو — اُس گلستانِ تمنا میں بہار آئی ہے

خشک تھی وادیِ ناشادِ محبت کی زمیں — آج اس دشت پہ گھنگھور گھٹا چھائی ہے

ارمغاں یہ اسی گلزار کا لایا ہے غریب

آپ کے ہاتھ میں بیدار ہوں اس کے نصیب!

(سامنے سے گوئٹے کی روح ایک عجیب و غریب شیشہ سنبھالے ہوئے گذرتی ہے۔ اس میں چند حسین جلوے نظر آتے، بعض انسان بعض پھول، بعض پریاں بعض ستاروں اور چاند سے ملتی جلتی ہیں کبھی کبھی ایک عجیب و غریب شکل بھی اس میں سے جھانکتی ہے۔ چلتے ہوئے گوئٹے کی روح غالب کو دیکھ کر مسکراتی ہے)

گوئٹے کی روح۔ جامِ افلاک میں رقصاں مری صہبائے نظر — فرشِ انجم پہ درخشاں مری مخلوقِ خیال

عشق نے توڑ دیا بندِ نقابِ ماضی — آج رنگیں نظر آتا ہے سراپردۂ حال

(ایسے میں حافظ اور عراقی کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ملائے ہوئے آتی ہیں گوئٹے کی روح ان کے لیے تھوڑا سر جھکاتی اور گذر جاتی ہے)

حافظ۔ دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند — گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند

عراقی۔ نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز چشم مست ساقی وام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش — عراقی را چرا بدنام کردند

(اس گلشن سے دور ایک چٹان پر ورجل اور دانتے کی روحیں کھڑی ہوئی باتیں کر رہی ہیں ان کے مایوس چہروں پر بھی جوش کی ایک لہر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ غالب اور حالی یہ نظارہ دیکھتے ہوئے گذرتے ہیں تھوڑی دور چلنے کے بعد انھیں ایک وسیع میدان ملتا ہے اور اس میں ایک بلند فصیل نظر آتی ہے اس پر دو روحیں چڑھنے کی کوشش کر رہی ہیں ایک شوپنہار اور دوسری حکیم نطشے کی ہے۔ دونوں کچھ تھکی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن ان کے چہروں پر غیر معمولی شگفتگی ہے)

شوپنہار کی روح مستی عقل و ہوش سے گرمیٔ شش جہات ہے — میرا جنون و بیخودی زینۂ کائنات ہے

وہم وجود ہے نقاب فطرتِ بے نیاز کا — مرحلۂ حیات بھی مرحلۂ حیات ہے

نطشے کی روح (گنگناتی ہے)

لذت وہم و گماں چھائی ہر غم خانوں میں — گونج اٹھا نغمۂ غم میرے صنم خانوں میں

میری بیباکیٔ افکار نے ڈالے رخنے — دہر کے خالق و مخلوق کے افسانوں میں

شکر ہے چھائے گا اک شانِ ستیاب کا رنگ — زندگی آئے گی کچھ دہر کے ویرانوں میں

(اب [illegible] وہیں ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں سیکڑوں قسم کی روشنیاں جگمگا رہی ہیں سارا باغ عالیشان ایوانوں سے مزین ہے سامنے خوبصورت پہاڑ اور وادیاں نظر آتی ہیں اتنا سایہ دار مقام ہے کہ روح کو ٹھنڈک سی آنے لگتی ہے چشموں میں بجلیاں بہتی ہوئی نظر آتی ہیں نور کے آبشار نگاہوں کے سامنے گرتے ہیں۔ باغ کی ایک زرنگار محراب سے پیر رومی تاج پہنے ہوئے نکلتے ہیں۔ یہ اقبال کا ہاتھ تھامے ہوئے فرشتوں کے آگے چل رہے ہیں پیچھے فرشتوں کا نغمہ رہتا ہے)

فرشتوں کا نغمہ۔
نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد | حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور | خود گرے، خود شکنے خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں زشبستان ازل | حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد

دوسرا منظر

کوہ ہمالہ

(کوہ ہمالہ کی سربفلک چوٹیاں کہر اور بادلوں کا ایک پرشکوہ نقاب ڈالے ہوئے ہیں۔ زور کے جھکڑ چلتے ہیں اور چوٹیوں سے برف پھسل پھسل کر گرتی ہے۔ دور بلند قامت چنار کے درخت عمیق وادیوں میں جھومتے ہیں۔ کہر، بادل، برف اور چنار اپنا اپنا حال دل بیان کرتے ہیں۔)

کہر۔
اس نیلگوں فضا میں سردی جمی ہوئی ہے | یا چتر آسماں کو جھالر لگی ہوئی ہے!
اک وحی زندگی ہے زنگ نزول میرا | شاید پیام ہستی ہوگا قبول میرا

بادل۔
کتنا اجلا ہے مرا ذوق تجلی یا رب! | ماہ و خورشید بناتے ہیں مجھے اپنی نقاب
ایک پیمان تسلی ہیں مرے اشک حزیں | ایک طوفان تماشا ہے مرا رنگ حجاب!

برف۔
دہشت ہے زندگی کی جوشش زوال میرا | کہسار کی جبیں پر ہے انفعال میرا
تعمیر سے کسی کی گرتی ہوں آہ بن کر | دل وقت سنگدل کا ہے پائمال میرا

(زور کا طوفان آتا ہے چنار کے درختوں میں آگ لگ جاتی ہے۔ جلتے ہوئے درخت پکارتے ہیں)

چنار کے درخت۔
ہوا اور پانی سے ہم جل رہے ہیں | یہ رحمت کے اضداد میں پل رہے ہیں
فرشتہ اجل کا ہمارا دروں ہے | یہ جنگل ہے یا موت کا ارغنوں ہے
ہماری صداؤں کی آتش نوائی | کئے جا رہی ہے لگائی بجھائی!
محبت کی گرمی سے پامال ہیں ہم | خدا رکھے شاید جواں سال ہیں ہم!

(فطرت کی اس ہم نوائی کا ساتھ ہمالہ نہیں دیتا۔ سب حیرت سے پوچھتے ہیں۔ ہمالہ جواب دیتا ہے)

ہمالہ۔
مری خاموشیوں میں میری فطرت کی نوازش ہے | بلندی فطرت خاموش کی اک آزمائش ہے

ثنا اے ہمنوا و اُجھ سے اپنی ہو نہیں سکتی | مری جاں اپنا گنج خامشی یوں کھو نہیں سکتی
اگر ہو طائر بام فلک سیاح انجم ہے | بیا بحر ازل میں فکر کا جس کے تلاطم ہے
صدا اس کی سمو روح تصور جھوم جائے گی | نظر اک فطرت عالی کی نغمہ بن کے آئے گی!

(اس وقت ہمالہ کی خاموش اور بلند چوٹیوں پر فضائے آسمانی میں یہ نغمہ گونجتا ہے)

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستاں | چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں | تو جواں ہے گردش شام و سحر کے درمیاں

ایک جلوہ تھا کلیم طور سینا کے لئے
تو تجلی ہے سراپا چشم بینا کے لئے

آتی ہے ندی فراز کوہ سے گاتی ہوئی | کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہد قدرت کو دکھلاتی ہوئی | سنگ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراق دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر دل سمجھتا ہے تری آواز کو! (بانگ درا)[1]

تیسرا منظر

نغمۂ کائنات

(کرۂ ارض کی ایک پر سکون وادی۔ آبت آہستہ ناچ رہا آسمان پر ستارہ زہرہ جگمگا رہا ہے۔ اقبال کی روح اس میں کھڑی ہے۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان روح اور ہے۔ یہ دنیا میں کسی دن پیدا ہونے والے شاعر کی ہے اقبال اسے زمین کی طرف رخصت کر رہے ہیں نوجوان روح اقبال کو سلام کرنے آگے بڑھتی ہے اور سطح ارض پر اتر آتی ہے اسے آتا ہوا دیکھ کر روح ارضی یہ ترانہ گاتی ہے)

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ فضا دیکھ[2] | مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو جلوؤں میں چھپا دیکھ | ایام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

---

[1] بانگ درا صـ۲ [2] بال جبریل صـ۱۷۸

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے — دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے — پہونچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

(شاعرِ مستقبل کی روح جب گذرتی ہے تو اقبال فلکِ زہرہ سے مسکراتے ہیں۔ اتنے میں عالمِ ناسوت ان سے یوں مخاطب ہوتا ہے)

عالمِ ناسوت — مجھ پہ کھلا وہ عکسِ جاں آئینۂ حیات کا — میں بھی تو ایک شعر ہوں محفلِ کائنات کا

میرے یہ باغ و راغ ہیں حسنِ ازل کی داستاں — محفلِ نازِ دوست میں رنگ ہوں التفات کا

(روحِ اقبال عالمِ ناسوت سے کہتی ہے)

عالمِ[1] آب و خاک و باد، سرِ عیاں ہے تو کہ میں — وہ جو نظر سے ہے نہاں اس کا جہاں ہے تو کہ میں؟

وہ شب و روز و سوز و غم کہتے ہیں زندگی جسے — اس کی سحر ہے تو کہ میں اس کی اذاں ہے تو کہ میں؟

کس کی نمود کے لئے شام و سحر ہیں گرمِ سیر — شانۂ روزگار پر بارِ گراں ہے تو کہ میں؟

تو کفِ خاک و بے بصر، میں کفِ خاک و خود نگر — کشتِ وجود کے لئے آبِ رواں ہے تو کہ میں؟

(اس کے اثر سے افلاک میں نغمے گونجنے لگتے ہیں۔ چند آوازیں اس طرح آ رہی ہیں)

ستارے — کسی کی شوخیِ غم دل کی آہ بن کے رہی — کسی کی روح ہماری نگاہ بن کے رہی

ہمارے آگے بھی پہونچا خیالِ حسن پرست — شعاعِ منزلِ جاں خضرِ راہ بن کے رہی

چاند — لے رہا تھا میری ہستی کا سکوں انگڑائیاں — سوزِ خاموشی میں جلتی تھیں مری تنہائیاں

میرے غاروں میں اداسی تھی عدم آباد کی — میرے کہساروں میں وحشت تھی دلِ برباد کی

کس نے روحِ آسماں کو اپنی منزل کر دیا — کس نے مجھ کو سینۂ آفاق کا دل کر دیا

خورشید — میری نگاہ: نگار ازل کی ترشگاں تھی — میری فضائے آتشیں ہیبتِ ذوالجلال تھی

خنجرِ برق آشنا میری تجلیوں میں تھا — دشنۂ غیظِ کبریا میری تسلیوں میں تھا

آتشِ دل بڑھا سی دی کس کی صدائے درد نے — سوزشِ عشق بخش دی، کون فلک نورد نے؟

---

[1] بالِ جبریل ص [illegible]

فضائے آسمانی ۔ کون کہتا ہے کہ طے کرتی ہوا اک جست نگاہ — یہ طلسم برق و رنگ و نور کی جانسوز راہ؛

رضواں ۔ مری نگاہ محبت کا آشنا ہے کوئی — مجھے خیال عبادت سے دیکھتا ہے کوئی

فردوس ۔ یہاں نہ روحوں میں تشنگی تھی — نہ ان کی بیتاب تھیں نگاہیں!

نہ کانپتی تھیں نظر سے ان کی — عروس فطرت کی بارگاہیں!

یہ کون بولا مرے ستاروں — میں فکر و ذوق عمل نہیں ہے؟

یہ کون بولا کہ عشق انساں — کا دو جہاں میں بدل نہیں ہے؟

دو جہاں ۔ سنکر ہے ہم بھی آ گئے ایک نگاہ ناز میں — پردۂ چشم ہٹ گیا محفل امتیاز میں

وقت ۔ کس نے دیکھی تھی مرے رنگ سیاست کی بہار — کس نے سمجھا تھا مرے دور حکومت کا مدار؟

کس نے ظلمت سے نکالا تھا شبستانوں کو — کس نے انجم سے اجالا تھا بیابانوں کو؟

ساقی ۔ محبت سوز دل کو گرما گئی — دعا دار تشنہ دہن آ گئی

شراب کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا — مری خاک جگنو بنا کر اڑا

بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات — کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات

سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسم زماں و مکاں توڑ کر

تو ہی آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے، تو جہاں سے نہیں

ملائکہ ۔ نعرۂ اللہ ہو کے پاسباں رہتے تھے ہم — بینوائے سوز دل تسبیح خواں رہتے تھے ہم

کس نے ہم کو آشنائے درد انساں کر دیا — کس نے ہم کو راز دار سوز ایماں کر دیا

جبریل ۔ نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

سروش ۔ لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

لعبت خاک ساختن می نہ سزد خدائے را

له بال جبریل کی اس نظم میں اشعار مختلف مقامات سے انتخاب کر کے جمع کئے گئے ہیں ۔ انگریزی الفاظ WHITEN کا ترجمہ

چوتھا منظر

مسجد قرطبہ

(روح اقبال مسجد قرطبہ میں ہے ہسپانی آسمان کا چاند مسجد کے مینار سے کہتا ہے)

چاند۔ موج ہستی کوئی ساحل سے نکل کر دیکھے | رنگ عالم مری منزل سے نکل کر دیکھے
کس قدر اوج پہ ہے قیس محبت کا جنوں | میری لیلیٰ! مجھے محمل سے نکل کر دیکھے
لا الہ کی جو صدا مسجد و محراب میں ہے | ایک ایمان بھرے دل سے نکل کر دیکھے
عہد اسلام کے ماضی پہ تمنا بن کر | آہ غم سینۂ بسمل سے نکل کر دیکھے

مینار۔ نظر اٹھائی تو برباد تھا جہان عمل | میں سرفراز ہوا یا گنا ہگار رہا
گیا نہ چرخ کے دل تک مری نگاہ کا تیر | سمجھ رہا تھا کہ اس کے جگر کے پار ہوا
سنی تھی میں نے بڑی شان کی صدائے دل | وہی نشہ مرے انکار کا خمار ہوا
نظر نہ آئے گا شاید کبھی زمانے میں | جو انقلاب کہ عالم پہ آشکار ہوا

مسجد قرطبہ۔ روح اسلام کبھی دہر سے ہوگی نہ فنا | ایک پُر درد کی سن اب بھی صدا آتی ہے

(روح اقبال عالم محویت میں)

کافر ہندی ہوں میں، دیکھ مرا ذوق و شوق[1] | دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق مری لے میں ہے ذوق مری نے میں ہے | نغمۂ اللہ ہو، میری رگ و پے میں ہے
تیرا جلال و جمال، مرد خدا کی دلیل | وہ بھی جلیل و جمیل، تو بھی جلیل و جمیل
تیرے در و بام پر وادیٔ ایمن کا نور | تیرا منار بلند، جلوہ گہ جبرئیل

پھر اٹھ کر وادی الکبیر کی طرف جاتی ہے اور کہتی ہے)

آب[2] روان کبیر، تیرے کنارے کوئی | دیکھ رہا ہے کسی اور زمانہ کا خواب
عالم نو ہے ابھی پردہ تقدیر میں | میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

ایسے میں زندگی اقبال کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے وہ اس سے لانگ فیلو کی نظم "نغمہ حیات" سنانے کی

---

[1] بال جبریل ص۱۳۱ [2] بانگ درا ص۲۹۲

فرمائش کرتے ہیں۔ زندگی مسکراتی ہے اور چند خوبصورت لڑکوں کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ زندگی کہتی ہے

ـ لانگ فیلو کی نظم انھیں یاد نہیں رہی ایک اور نظم سنئے۔)

لڑکوں کی سنگت

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی — ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے — سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب — اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

("عہدِ مسلم" سامنے آتا ہے اور کہتا ہے)

اے کلیمِ بزمِ دل، دل والے خلیلِ سوزِ جاں — تیری ہی چشمِ شوق پر روشن زمین و آسماں

تیری فطرت رازدانِ شوکتِ اہلِ حجاز — تیری حکمت امتِ مرحوم کی آئینہ ساز

تیرے دل میں مرتعش نورِ محمدؐ کا چراغ — تیرے باتوں میں منور عشق و عرفاں کا ایاغ

قومِ مسلم نیم جاں ہے ہیچ و بے انجام ہے — ان غریبوں کے لئے اب تیرا کیا پیغام ہے؟

(روحِ اقبال جواب دیتی ہے)

نہ سلیقہ[1] مجھ میں کلیم کا نہ قرینہ مجھ میں خلیل کا — میں ہلاکِ جادوئے سامری تو قتیلِ شیوۂ آذری

میں نوائے سوختہ در گلو تو پریدہ رنگ رمیدہ بو — میں حکایتِ غمِ آرزو تو حدیثِ ماتمِ دلبری

دمِ زندگی، رمِ زندگی، غمِ زندگی، سمِ زندگی — غمِ رم نہ کر سمِ غم نہ کھا کہ یہی ہے شانِ قلندری

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر — کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

کرم اے شہِ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظرِ کرم — وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغِ سکندری

(عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں سے آمین کی صدائیں آتی ہیں اور پھر چند شہر کہتے ہیں)

مکہ۔ یاں گرمیِ طواف تو ہے سوزِ جاں نہیں — لب پر وہ سنج زمزمۂ [illegible] نہیں

مدینہ۔ گم سیاست میں ہے پیامِ مصطفےٰ — ہے دماغوں میں مقامِ مصطفےٰ

---

[1] بانگِ درا صفحہ ۲۸۴۔

درس اب دیتی نہیں اُم الکتاب — انقلاب اے دورِ ہستی انقلاب!

قسطنطنیہ۔ ماتمِ جورِ زمانہ میں سنا کرتا ہوں — پاکیٔ حسنِ عمل کی میں دعا کرتا ہوں

دستِ جمہوریت آزاد قیادت بیدار — اک نئی لذتِ ایماں میں جیا کرتا ہوں

بغداد۔ کاش کے سارے اہلِ دل کام لیں اعتماد سے — یاں کی زمیں پاک ہے لذتِ اعتقاد سے

دمشق۔ اے وائے انقلاب سے اوندھی ہوئی ہوں میں — کن قدسیوں کے پاؤں کی روندی ہوئی ہوں میں

مصر۔ ہر چیز پہ چھایا ہے اب ذوقِ شہنشاہی — مذہب نے سکھائے تھے آداب خود آگاہی

ایران۔ عرب کی تہذیب سے ملا تھا عجم کی تعمیر کو سہارا — نہیں ہے اب دہر دو زباں کو یہ صلح و آشتی گوارا

شام۔ نغمۂ اغیار ہوں نغمۂ اغیار ہوں — کتنی دل افگار ہوں کتنی دل افگار ہوں

میری زمیں پاک تھی میری جبیں پاک تھی — آج اُس عہد کی دل سے طلبگار ہوں

ایک سے بڑھ کر ہے ایک میرے لئے دشنۂ تیز — کفر کی آغوش میں قیدی ندار ہوں

فلسطین۔ جورِ یہود و جورِ نصاریٰ کسے دکھاؤں — بہتا ہے خونِ مسلمِ ناداں کیا بتاؤں:

ہندوستان۔ الفاظِ شوخ و شنگ کی تلوار چل گئی — قاسم کی روح میرے بدن سے نکل گئی

(روحِ اقبال ان آوازوں کو سن کر دعا کرتی ہے)

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے — جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

(نوجوان شاعرِ مستقبل کی روح پر اسرار طریقے سے مسجد کے ایک گوشے میں چھپی ہوئی یہ سن رہی ہے اور دیکھ رہی ہے وہ اپنے آپ سے کہتی ہے)

شاعرِ مستقبل۔ روحِ فردا سے بنا ہے دلِ نالاں میرا — وقت آتے ہوئے لائے گا گلستاں میرا

میری جاں روشنیٔ عشق پہ رقصاں ہوگی — حسن بن جائے گا جس روز بیاباں میرا

دل مرے رہبرِ عالی پہ فدا ہوتا ہے — اس کے الہام میں پوشیدہ ہے ایماں میرا

روز بڑھتی ہی رہی تشنگیٔ ذوقِ صدا — ایسے نغموں سے ہوا درد کا درماں میرا

شاعرِ مستقبل رو، رہا ہوتا ہے۔ روحِ ابلیس ایک زاہد کے لباس میں نمودار ہو کر راستہ میں حائل ہوتی اور کہتی ہے۔

روحِ ابلیس۔ آ بتادوں تجھ کو اپنے دل کی بات — فکر کی آزادیوں میں ہے نجات

دوسروں کی آنکھ سے دیکھیں اگر — ہیچ ہے یہ انتظامِ کائنات

غور سے خود پڑھ کلامِ اقبال کا — رائگاں ورنہ یہ صبح و شام ہے

کر خودی پیدا کہ مل جائے خدا — تیرے شاعر کا یہی پیغام ہے

شاعرِ مستقبل ایک عالمِ فکر اور اندیشہ میں پڑ جاتا ہے اور سر جھکائے ہوئے چلتا ہے۔ روحِ ابلیس پرستارانِ اقبال کے ذوق و شوق کا جائزہ لینے جاتی ہے کئی جگہ آزمائش کے بعد خوشی خوشی واپس آتی ہے کہ اس کے وسوسوں کو ہنوز دھکا نہیں پہونچا۔ وہ جیسے تھے ویسے ہی ہیں وہ اطمینان کا سانس لیکر کہتی ہوا

روحِ ابلیس۔ شکر ہے علم نے کی میری تسلی ورنہ — میں بھری بزم میں بے چین ہوا جاتا تھا

شورِ ہستی کا بھلا ہو کہ مٹا یا اس کو — نعرۂ حق و یقیں مجھ سے سنا جاتا تھا؛

میں نے دکھلائی زمانہ کو وفاؤں کی بہار — شاعرِ دل مری تعریف کئے جاتا تھا؛

چھٹا منظر

بارگاہِ فطرت

(ایک دن بارگاہِ فطرت میں مظاہرِ حیات کی ایک مجلس گرم ہوتی ہے ہوا، پھول، شبنم، صبح، نور، روحِ رقص، فوارہ، لالہ، صحرا، سمندر، موج، شمع، پروانہ، جگنو، ابر، کوہسار، نسیمِ سحری، امید، وجود، نگاہ، جلال و جمال، جدت و تخلیق کے حسین پیکر سب جمع ہوتے ہیں ہوا کی پری پاؤں میں شبنم کے گھنگرو باندھ کر رقص کرتی ہوئی آتی ہے اور یوں نغمہ سرا ہوتی ہے)

ہوا کی پری۔ چھنن چھنانن، چھنن چھنانن — چھنن چھنانن، چھنن چھنانن

سحر[1] مرا دل نظر مری جاں — اثر مرا غم خطر مری شاں

---

[1] یہ بحر موسیقی کی ایک خوبصورت لیکن مشکل تال "ہوری" یا "چاچر" پر قائم کی گئی ہے۔ بول ہیں۔ دھا دھن دھا دھا تن تا تن دھا دھا دھن اور تقطیع ہوگی۔ فَعَل فَعِلَن فَعَل فَعِلَن۔

پانچواں منظر

وسوسۂ شیطانی

(روحِ ابلیس عالمِ تنہائی میں بے قرار نظر آ رہی ہے اور اپنے آپ سے کہتی ہے)

روحِ ابلیس۔ آہ تیرہ سو برس پہلے جو گونجی تھی صدا — کیا غضب ہے پھر وہی روحوں کو گرمانے لگی
گم کیا تھا جس کو میں نے خوابہائے زیست میں — پھر وہی تعبیر میرے سامنے آنے لگی
کروڑوں تین زندگی کی میں نے ٹالا تھا جسے — بے قراری پھر وہی آفاق پر چھانے لگی
کیوں ہوا ہے اب جہاں میں نور کا روشن چراغ — ظلمتِ قلب و نظر کیوں دل سے شرمانے لگی
یاالٰہی کیوں مٹا جاتا ہے مغرب کا فسوں — روحِ مشرق کس لئے پھر ہوش میں آنے لگی؟
کیوں ہوا پیدا دیارِ ہند میں اک بے قرار — کس لئے روحِ غلاماں جھوم کر گانے لگی؟
نعرۂ جذبِ قلندر سے لرز جاتا ہوں میں — کیوں صدائے حق دلوں میں پھر جگہ پانے لگی؟
خیر اب بھی اک تسلی ہے کہ شاید اہلِ ہوش — سن کے آوازِ جرس ہوں گے بیاباں میں خموش
جا کے بزمِ زیست میں یہ راز دیکھوں تو سہی — عظمتِ شاعر کو دیوانوں سے پوچھوں تو سہی

(اتنے میں شاعرِ مستقبل کی روح ایک شفاف چشمہ کے کنارے کلامِ اقبال کا مطالعہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے کہ کہہ رہی ہے)

شاعرِ مستقبل۔ کیسے نظر آئے گا اس کا مقامِ بلند — جو ہے ستاروں سے دور جو ہے تصور سے دور
عقل و خرد جس کے پر ذوقِ جنوں جس کی روح — بزمِ یقیں کے قریب چشمِ تحیر سے دور
چاہتا ہوں جاننا اس کے سخن کا پیام — نغمۂ ذات و صفات جس کی صداؤں میں ہے
چاہتا ہوں منکشف مجھ پہ ہو اس دل کا راز — تاب و تبِ کائنات جس کی اداؤں میں ہے

(اس وقت حضرت خضر سامنے آ کر شاعرِ مستقبل کو ایک صحیح رہبر کا پتہ نشان بتاتے ہیں جو ہنگامۂ ہستی سے دور ایک خانقاہ میں اقبال پر خاموشی کے ساتھ فکر کر رہا ہے)

حضرت خضر۔ اے خوش خیال بزمِ محبت، نہ فکر کر — جا اور اس کی محفلِ علم و ہنر کو ڈھونڈھ
ہر گام پہ خیال رہے راہِ راست کا — ہو طالبِ پیامِ ازل یا بشر کو ڈھونڈھ

میں پیامِ عالمِ راز ہوں میں صدائے بزمِ حیات ہوں

وفا کا فلک دعا کی زمیں   خضر ہے کہیں سفر ہے کہیں

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

وطن میں کبھی چمن میں کبھی   چمک میں نہاں گگن میں کبھی

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

فلک سے پرے زمیں پہ سفر   ملک سے ملوں خدا پہ نظر

میں پیامِ عالمِ راز ہوں، میں صدائے بزمِ حیات ہوں

چھنن چھنا نن، چھنن چھنا نن   چھنن چھنا نن، چھنن چھنا نن

(ہنستے ہوئے پھول شبنم پری سے کہتے ہیں)

پھول۔ شاید تو سمجھتی تھی وطن دور ہے میرا   اے قاصدِ افلاک نہیں دور نہیں ہے

ہوتا ہے مگر محنتِ پرواز سے روشن   یہ نکتہ کہ گردوں سے زمیں دور نہیں ہے

(صبح اٹھلاتی ہوئی آتی ہے)

صبح۔ مانند سحر صحنِ گلستاں میں قدم رکھ   آئے تہ پا گوہرِ شبنم تو نہ ٹوٹے

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن   ہاتھوں سے ترے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

(اتنے میں آفتاب کی کرنیں نور برساتی ہوئی مسکراتی آتی ہیں)

ایک کرن۔ مرے نزول میں جاں بخشیوں کی فیض و عطا   مرے خرام میں ارواحِ آسماں کا جمال

میں چھن رہی ہوں کہ فطرت میں ہے نمود مری   میں چل رہی ہوں کہ گردش میں آئے جامِ سفال

(اسے دیکھ کر شبنم پری گاتی ہوئی اڑ جاتی ہے۔ کرن کہتی ہے)

کرن۔ دل آئینے کی طرح صاف ہے مغنی کا   نگاہِ صاف کو عالم میں کوئی باک نہیں

نوا کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود   وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

(اتنے میں سمندر کی گونجتی ہوئی آواز آتی ہے)

سمندر۔ میں[۱] بھی ہوں روح یزداں مجھ میں ہے زورِ طوفاں
تاروں کا میں افسانہ جلوؤں کا میں دیوانہ
عالم میں میری شوکت ہستی میں میری عظمت
آئینہ نورِ جاں کا گنجینہ میں ایماں کا
شورش ہے میرے دل میں میں بھی ہوں آب و گِل میں

(موجِ دریا لہریں مارتی ہوئی آتی ہے اور کہتی ہے)

موجِ دریا۔[۲] مچلتی ہوں کبھی جذبِ مہِ کامل سے — جوش میں سر کو پٹکتی ہوں کبھی ساحل سے
ہوں وہ رہرو کہ محبت ہے مجھے منزل سے — کیوں تڑپتی ہوں یہ پوچھے کوئی میرے دل سے
زحمتِ تنگیِ دریا سے گریزاں ہوں میں
وسعتِ بحر کی فرقت میں پریشاں ہوں میں

(شمع نور کا تاج پہنے ہوئے آتی ہے اور کہتی ہے)

شمع۔ پوچھتا ہے مجھ سے یہ ایک شاعرِ رنگیں نوا — کس کی ممنون کرم ہے میری فطرت کی ضیا
از کجا ایں آتشِ عالم فروز اندوختی — کرمکِ بے مایہ را سوزِ کلیم آموختی؟

(جگنو چمک کر کہتا ہے)

جگنو۔ کس طرح میرا جلوہ کوئی دکھا رہا ہے — آتی ہیں سن صدائیں فطرت کی انجمن میں
جگنو[۳] کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا — ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

---

۱ یہ بحر موسیقی کی ایک اور تال جھومرا پر ہے بول ہیں - دھن دھن نا - دہاگے ترکٹ دھن نا تن تن نا - دہاگے ترکٹ دھن نا۔ تقطیع ہوگی - مفعولن، مفعولاتن مفعولن، مفعولاتن - ۲ بانگ درا ص۵۵ ۳ بانگ درا ص۱۳۔

(پروانہ آواز دیتا ہے)

پروانہ۔ پروانے کی منزل سے بہت دور ہے جگنو کیوں آتشِ بے سوز پہ مغرور ہے جگنو؟

(جگنو جواب دیتا ہے)

جگنو۔ اللہ کا سو شکر کہ پروانہ نہیں میں دریوزہ گرِ آتشِ بیگانہ نہیں میں

(ایک آواز آتی ہے)

اے کرمکِ شبتاب سراپائے تو نور است

پرواز تو یک سلسلہ غیب و حضور است آئینِ ظہور است

مائیم کہ مانند تو از خاک دمیدیم

دیدیم تپیدیم نہ دیدیم تپیدیم جائے نہ رسیدیم[1]

(نگاہ کی پری مسکراتی ہوئی آتی ہے اور گنگناتی ہے)

نگاہ کی پری۔ بہار و قافلہ لالہ ہائے صحرائی شباب و مستی و ذوق و سرود و رعنائی

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی یہ بحر یہ فلک نیلگوں کی پہنائی

سفر عروسِ قمر کا عماریِ شب میں طلوعِ مہر و سکوتِ سپہرِ مینائی

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی[2]

(روحِ اقبال اس روح پرور بارگاہ میں اب جو ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی اپنا گیت گا رہی ہے۔ پہاڑوں سے آواز ٹکرا کے ساری فضا میں گونجتی ہے۔ پریاں حسین پیکر اور ساری مجلس رقص کرتی اور خوشیوں کی بانسریاں بجاتی ہے)

روحِ اقبال۔ میری نوائے شوق سے شور حریمِ ذات میں غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں میری نگاہ سے خلل تیری تجلیات میں!

گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود گاہ الجھ کے رہ گئی میرے توہمات میں

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں![3]

---

[1] پیامِ مشرق۔ [2] ضربِ کلیم ص۱۱۰۔ [3] بال جبریل ص۵۔

(آواز سروش پراسرار طریقہ سے گونجتی ہے۔ روح اقبال اسے سن کر)

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو — پلا کے مجھ کو مئے لاالہ الا ہو
نہ مے، نہ شعر، نہ ساقی، نہ شورِ چنگ و رباب — سکوت کوہ ولبِ جو و لالۂ خودرو!

ساتواں منظر

خانقاہ

(شاعرِ مستقبل کی روح حضرت خضر کے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے اور خاموش مفکر کی خانقاہ کی طرف جا رہی ہے راستے میں اسے کالج، فوجی تربیت گاہیں، سیاسی دفاتر، دارالمباحث ملتے ہیں یہ ان کی طرف سے منہ پھیر کے گذر جاتی ہے،

(شہر کی سرحد پر پُر فضا جنگل اور گنجان درختوں کی چھاؤں میں ایک چھوٹی سی خانقاہ ہے اس کے کنگرے پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا روح شاعر کا استقبال کرتا ہے۔)

پرندہ۔ اے گلستانِ عشق کے راہی خوش آمدی — اے پیکرِ حسین نگاہی خوش آمدی
گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے — عالم تمام رحمتِ پروردگار ہے
ہنگامۂ حیات سے خاموش ہے فضا — مستیٔ جاں سے میکدہ بردوش ہے فضا
آشفتگیٔ فکر و تماشا یہاں نہیں — اک نورِ منتظر ہے زمیں آسماں نہیں
ہر موجۂ نسیم میں ہیں خوشگواریاں — ہر پردۂ نگاہ میں ہیں یادگاریاں
پرواز میں طیور کے طوفانِ زندگی — ہر برگِ گل کی چھاؤں گلستانِ زندگی
یاں عزمِ مطمئن ہے یہاں فکرِ پُر سکوں — ہر جنبشِ خیال محبت کا ارغنوں
شہرت کی دھوپ سایہ مٹاتی نہیں کبھی — گرمیٔ غلط نگاہ کی چھاتی نہیں کبھی
خوش ہوں کہ تیری روح میں اک ارتعاش ہے — خوش ہوں کہ تجھ میں جرأتِ فکر و تلاش ہے
یاں آکے اپنے دل کی تمنا مٹائے گا — خاموشیٔ حیات سے کچھ فیض پائے گا!

(شاعر کی روح پرندے کا یہ گیت سن کر محو ہو جاتی ہے پھر کہتی ہے)

شاعرِ مستقبل۔ اے مطربِ خیال ابھی نغمہ سنائے جا
اس منزلِ سکوں کا ابھی گیت گائے جا

(طائر پھر نغمہ سرا ہوتا ہے)

پرندہ۔ منزلگۂ سکون کی تمنا خدا گواہ
تسکینِ آرزو کا تقاضا خدا گواہ

اک زندگی ہے دولتِ کون و مکاں ہے
اک جنتِ خیال ہے ہفت آسمان ہے

اس سرزمینِ پاک کے نزدیک کے دیکھ
یہ خاک بے نیاز جبیں سے لگا کے دیکھ

یاں کھڑکیاں ہیں جلوۂ حسن و جمال کی
چھن چھن کے گر رہی ہیں شعاعیں خیال کی

(یہ گا کر پرندہ اڑ جاتا ہے۔ شاعر کچھ سوچ کر خانقاہ میں قدم رکھتا ہے۔ یہاں ایک درویش کتابوں کا انبار لگائے ہوئے کچھ لکھ رہا ہے روحِ شاعر اجازت مانگ کے یوں گویا ہوتی ہے)

شاعرِ مستقبل اے رہنمائے فکر و نظر خضرِ بے نیاز
جس کی نگاہِ پاک پہ ظاہر دلوں کا راز

اک بے قرارِ زیست ہوں آشفتہ نگاہ
کرتا ہوں فکرِ شعر کا ہر سانس میں گناہ

اقبال کے کلام سے مجھ کو نیاز ہے
اقبال میری زیست، مرا فخر و ناز ہے

کرتا ہوں اس کے ساتھ تماشائے زندگی
پاتا ہوں اس میں اپنی تمنائے زندگی

لیکن بہت عمیق یہ بحرِ خیال ہے
مجھ سے بہت بلند یہ اوجِ کمال ہے

آتا نہیں ہے فہم میں اس زور کا کلام
سمجھائیے مجھے مرے اقبال کا پیام!

(درویش کچھ تبسم کر کے اور تھوڑی سی فکر کے ساتھ عینک کتاب پر رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقبال کے پیام سے پہلے انھیں ایک نصیحت کرنی ہے)

مفکر درویش۔ سن پہلے کہ آنا ہے تجھے بزمِ جہاں میں
کر غور کہ تاثیر ہے کچھ تیری زباں میں

نزدیک ہے آزادیِ خیالی کا زمانہ
بن جائے گی یہ بزمِ جہاں غم کا فسانہ

تو ہو نہ کبھی بادہ کشِ محفلِ اغیار
برباد نہ کر دہر میں آزادیِ افکار

آفت ہے دل و جاں کیلئے دہر کا جادو
اک آگ ہے ارماں کے لئے دہر کا جادو

عظمت کے تلاطم میں بہے جاتا ہے انساں
ہر بات پہ رائی ہی سے کیے جاتا ہے انساں

پھیلا ہے تیرے سامنے مستقبل خاموش | وا تیرے دل و جاں کیلئے وقت کی آغوش
ہوگا تیرے ہاتھوں میں زمانے کا تخیل | آئے گا ترے سامنے قوموں کا تجاہل
عظمت کی مے ناب سے بھر ساغر الہام | ہے شاعر عالی سے دل پاک کا انعام
اس میں مگر آزادی فطرت نہ بہا دے | کونین کو اپنا کوئی پیغام سنا دے

شاعر مستقبل۔ اپنی کمزوری تعظیم کو پہچان گیا | واہ کیا بات بتائی ہے کہ دل مان گیا

(مفکر درویش پھر کہتے ہیں)

اے نوجوانِ شوق ترے درد کے نثار | اقبال کے پیام کا اب کر نہ انتظار
کھول آنکھ اور دیکھ نگاہ نیاز سے | آتے ہیں کون کون حریم مجاز سے؟

(شاعر مستقبل دیکھتا ہے کہ چار خوبصورت پیکر جن کے چہروں پر آسمانی تجلیاں برس رہی ہیں زرنگار تاج پہنے ہوئے داہنے ہاتھوں میں تاروں کی شمعیں لئے اور اپنے بائیں ہاتھ ایک دوسرے سے ملائے ہوئے رقص کناں آرہے ہیں۔ ان پیکروں کے تاجوں پر سنہری حروف میں "عشق"، "یقین"، "خودی" اور "عمل" لکھا ہوا ہے۔ جلوس یہ ترانہ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

عشق۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں[۱] | ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
خودی۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر | چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں
یقیں۔ اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم | مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
عمل۔ تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا | ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
سب مل کر۔ اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا | کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

(درویش کہتے ہیں)

مفکر درویش۔ اس گوشۂ تاریک میں ہم اہل نظر ہیں | اک شعل رہ، روشنی راہ گذر ہیں
سمجھاتے نہیں آنکھوں دکھاتے ہیں مسائل | رہتے نہیں الفاظ یہاں دید کے حائل
اقبال کے پیغام کے یہ چار عناصر | احساس پہ تیرے ہوئے اس شان سے ظاہر

---

[۱] بال جبریل صفحہ

اللہ کرے دل ہو ترا ان کا پرستار | اللہ کرے ان کا ہو نزدیک سے دیدار

(صدائے الہام آتی ہے)

عشق و خودی یقین و عمل چار عکس ہیں | یہ ایک آئینہ ہیں تری جلوہ گاہ میں
ان چار موتیوں کو پرو ایک ہی جگہ | اک رشتۂ خیال ہو تیری نگاہ میں

شاعرِ مستقبل۔ قربان اس نگاہ کے جس نے بہ یک نگاہ | اقبال کے پیام کو آنکھوں دکھا دیا
کوندا ئیں بجلیاں مرے وہم و گمان پر | گویا مرے خیال کو عارف بنا دیا

(پھر یوں دعا کرتا ہے)

رواق فلک پر کھلی ہیں نگاہیں | نظر آ رہی ہیں تری بارگاہیں
الٰہی مجھے ذوق فکر و عمل دے | الٰہی مجھے قوت بال و پر دے
سرافراز ہے انقلاب زمانہ | تلاطم میں ہے زندگی کا فسانہ
ملے مجھ کو اس بزم میں راست راہی | تجلی سے پیدا ہو روشن نگاہی
میں جذبات عالم کو رستہ دکھاؤں | نظر کی طرح ساری دنیا پہ چھاؤں
مرے دل پہ روشن ہو پیغام شاعر | دل و جاں رہیں آسماں کے مسافر
ہو جوش محبت مری رہنمائی | مرے دل پہ چھا جائے رنگ خدائی!

(باقی آئندہ)

عبدالقیوم خاں صاحب باقی

علاّمہ اقبال کا فلسفہ

(جوہر صاحب نے اس مضمون میں علامہ اقبال کے فلسفہ کو ان کی تقاریر سے اخذ کر کے اور ان کے کلام سے ان کی تشریح کر کے واضح کرنے کی کوشش کی ہے ضمناً وہ ابہام بھی ظاہر کیا ہے جو دل اور عقل کے مقامات پیش کرنے میں علامہ کی تقریروں میں پیدا ہو گیا ہے "تن کی دنیا" اور "من کی دنیا" کی کشمکش کو بھی واضح کیا ہے۔ علامہ اقبال من کی دنیا کے قائل ہیں لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تمام صوفیا من کی دنیا کے قائل رہے ہیں لیکن علامہ تصوف کے خلاف ہیں کیونکہ یہ خودی کو فنا کی طرف لے جاتا ہے حقیقت کو منفی طور سے حاصل کرنے کی بجائے وہ مثبت طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں یعنی خودی کو طاقتور بنا کر۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ علامہ عشق کو عقل پر فوقیت دیتے ہیں لیکن عشق کا جذبہ اگر بغیر عقل کے ہو تو وہ فنا کی طرف لے جاتا ہے عشق کی انتہا خود کو دوسرے میں محسوس کرنا ہے لیکن اس انتہا تک پہنچنے کے یہ معنی ہیں کہ فرد اپنی خودی سے ہاتھ دھو بیٹھے اس طور پر خودی اور عشق خود متضاد چیزیں ٹھہریں۔ خودی کی ترقی کیلئے عقل و عدل کی زیادہ ضرورت ہے بہ نسبت عشق کے کیونکہ عشق کا جذبہ عمل کی طرف راغب کرتا ہے لیکن خود تعمیری اور خودی کو ترقی کرنے کا جذبہ بھی عمل اور تڑپ کی طرف مائل کرتا ہے عشق دوسروں کی تعمیر میں خود کو فنا کر دینے پر مائل کرتا ہے خود تعمیری کا جذبہ اپنی اور دوسروں دونوں کی تعمیر کی طرف راغب کرتا ہے بغیر خود کو فنا کئے۔ یہیں علامہ کے بیان میں ابہام پیدا ہو گیا ہے ایک طرف وہ صوفیوں کے عشق کو سراہتے ہیں دوسری طرف وہ خود تعمیری کے جذبہ کو اتنا ابھارتے ہیں کہ خود کو بھی خدا میں جذب کرنا نہیں چاہتے بلکہ یزداں گیری کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

عشق، دل، من کی دنیا، روح اور ضمیر کا کرب و اضطراب جب سکون پذیر ہوتا ہے تب کچھ اصول بنا لیتا ہے تاکہ من کی دنیا مطمئن رہے۔ غارِ حرا اور وحی کے نزول نے اسی "من کی دنیا" کی خاطر بنیادی اصول مقرر کر دئے تاکہ امت انسانی مزید کشمکش میں نہ پڑے اس لئے اب "من کی دنیا" کا ذکر کرنا ہی عبث ہے اگر ان اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اب اگر فکر کی جائے تو "تن کی دنیا" کی کیونکہ یہی ہماری زندگی ہے اور ساتھ ساتھ بنیادی اسلامی اصولوں کی۔ من کی دنیا یا عشق یا تصوف میں پڑنا ایک سعی لا حاصل ہے۔

چنانچہ اس مضمون میں انہیں باتوں کی طرف جوہر صاحب نے اشارہ کیا ہے اگر کوئی صاحب اس موضوع پر کچھ اور لکھنا چاہیں تو شکریہ کے ساتھ ہم اسے قبول کریں گے) (مدیر)

اختر۔ آداب عرض یوسف صاحب! کیا مطالعہ ہو رہا ہے؟

یوسف۔ آئیے اختر صاحب! علامہ اقبال کے لکچر کتابی شکل میں نکل آئے ہیں انہیں دیکھ رہا ہوں۔

اختر۔ خوب کیا کچھ ادق کتاب ہے۔ پہلا باب کس موضوع پر ہے۔

یوسف۔ وہی موضوع جس سے مرحوم کی شاعری پُر ہے۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے ۔۔۔ خرد کیا ہے چراغ رہ گذر ہے
درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا ۔۔۔ چراغ رہ گذر کو کیا خبر ہے
گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور ۔۔۔ چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

اختر۔ جی ہاں۔ یہ امام غزالی کا فلسفہ ہے۔ ضرب کلیم میں علامہ نے امام صاحب کا فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن ۔۔۔ عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرم کتابی نہ بن ۔۔۔ عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

یوسف۔ پہلے لکچر کا موضوع بھی یہی ہے کہ کیا حقیقت کو صرف عقل سے سمجھ سکتے ہیں؟ علامہ کا خیال ہے کہ خدا یعنی حقیقت کو عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس کا صرف تجربہ کر سکتے ہیں اور وہ تجربہ بھی عقل سے نہیں کر سکتے بلکہ اس کے لئے وجدان یعنی عشق یا نظر کی ضرورت ہے۔

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات ۔۔۔ علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات عشق حیات و ممات ۔۔۔ علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہاں جواب

علامہ کے نزدیک خرد سے تو حقیقت کو جزوی طور پر سمجھا جاتا ہے لیکن دل یا عشق یا نظر سے کُل حقیقت کا مجموعی طور پر احساس یا تجربہ کیا جاتا ہے۔ خرد حقیقت کو سمجھنے کے لئے ناممکل ہے لکھتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں ۔۔۔ اُس کی تقدیر میں حضور نہیں

علامہ کے نزدیک خرد و نظر ایک ہی شے کے دو رُخ ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ممد و مددگار ہیں۔ علامہ برگسان کے اس خیال سے متفق ہیں کہ عشق یا نظر یعنی وجدان بھی اعلیٰ قسم کی خرد ہوتی ہے۔

اختر۔ میں کچھ سمجھا نہیں یوسف صاحب!

یوسف۔ آپ کیا نہیں سمجھے۔ برادر یہ وہی خیال ہے جس کا علامہ بار بار اظہار کرتے ہیں۔ بال جبریل میں ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں	ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں	راہبر ہو ظن و تخمیں تو زبوں کار حیات

اختر۔ یوسف صاحب! میں خرد اور نظر کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں اگر خرد اور نظر میں وہی فرق ہے جو عقل اور تیز عقل میں ہوتا ہے تو یہ کہہ دینا کافی ہے کہ حقیقت زیادہ غور و فکر کرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہے۔ اس شکل میں حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک نئی شئے ایجاد کرنے کی ضرورت ہے جس کو علامہ نے کبھی دل کبھی عشق کبھی نظر کہا ہے۔ نہ صرف یہی کہ علامہ عشق و نظر کے قائل ہیں بلکہ عقل کو باغی اور کم مایہ خیال کرتے ہیں کبھی فرماتے ہیں ؎

بیا تا زہ برانگیزم از ولایت عشق	کہ در حرم خطرے از بغاوت خرد است

کبھی فرماتے ہیں ؎

تڑپ رہا ہے فلاطوں میان غیب و حضور	ازل سے اہل خرد کا مقام ہے اعراف

جیسا ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے علامہ کے نزدیک نظر اور خرد کی نوعیت میں فرق ہے۔ ان کے نظریہ کے مطابق نظر کو تیز عقل کہنا غلطی ہو گی۔

یوسف۔ علامہ فرماتے ہیں کہ نظر سے حقیقت کے اس پہلو کا شعور ہوتا ہے جس کو خرد سے نہیں سمجھ سکتے علامہ کے نزدیک دل بھی مشاہدہ کرتا ہے اور اگر اس مشاہدہ کی درست ترجمانی کے بعد عمل کیا جائے تو انسان سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔ بزرگان دین کی سوانح کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دل کے مشاہدات اسی طرح حقیقی تجربہ ہوتے ہیں جس طرح خرد کے تجربات۔ البتہ دل کے مشاہدات کو تحلیل کر کے نہیں بتا سکتے ؎

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ	معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اختر۔ کیا علامہ کا یہ خیال ہے کہ تجربہ دو طرح ہوتا ہے ایک دل سے اور دوسرا دماغ سے اور یہ دل ہی ہے جو بیک وقت کل حقیقت کا تجربہ کر سکتا ہے؟

یوسف۔ علامہ کا یہ خیال ہے کہ دل کی نظر سے حقیقت کو دیکھنے اور تجربہ کرنے سے انسان کو وہ الہامات ہوتے ہیں جن سے خرد بے بہرہ ہے۔ آپ خرد کے ذریعہ سے مجموعی حقیقت کا دیدار نہیں کر سکتے لیکن دل بسا اوقات دھوکا کھا بھی جاتا ہے اور غیر حقیقت کو حقیقت اور غیر حقیقت کے پیغام کو حقیقت کا پیغام یعنی وحی و الہام سمجھنے لگتا ہے ہاں بعض مرتبہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دل حقیقت کے پیغام کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتا اور اس وجہ سے غلط راستہ پر چل کھڑا ہوتا ہے۔ دماغ صرف جزوی حقیقت معلوم کر سکتا ہے اور جزوی اور مجموعی حقیقت میں وہی فرق ہے جو باجے کے ایک سرا اور ایک راگ میں ہوتا ہے۔ راگ اگرچہ سروں کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن وہ اثر اور نوعیت میں کسی ایک سر سے مختلف ہوتا ہے بعینہٖ مجموعی حقیقت جزوی حقیقت سے اثر اور نوعیت میں جدا ہوتی ہے

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی　　　نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی

اختر۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ درست علم حاصل کرنے کے لئے عشق پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔

یوسف۔ جی ہاں۔ علامہ نے یہ لکھا ہے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے لئے بھی شیطان کی پیش کردہ حقیقت اور پیغام اور اصل حقیقت اور پیغام میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا تھا۔ علامہ نے اس خیال کی تائید میں کلام مجید کی ایک آیت بھی پیش کی ہے۔

ترجمہ: تم سے قبل بھی ہم نے رسول اور پیغمبر بھیجے جن کی خواہشات میں شیطان نے غلط خواہش داخل کر دی لیکن خدا شیطان کے چاہے کو پورا نہیں ہونے دے گا۔

بال جبریل میں سالک راہ کو اس طرح خبردار کرتے ہیں ؂

دل ہو غلام خرد یا کہ امام خرد　　　سالک راہ ہوشیار سخت ہے یہ مرحلہ

اختر۔ تب تو یوسف صاحب اول بینا بھی خرد چالاک کی طرح ہو گیا غلطی کا امکان دونوں جگہ ہے خرد بھی غلطی کر سکتی ہے اور نظر بھی۔

یوسف۔ نظر بھی غلطی کر سکتی ہے لیکن خرد تو صرف جزوی حقیقت دیکھ سکتی ہے۔ علامہ فرماتے ہیں۔

نشان راہ زعقل ہزار حیلہ مپرس   بیا کہ عشق کمالے زیک فنے دارد

اختر۔ لیکن یوسف صاحب یہ تو فرمائیے کہ جب آپ نے دل کا غلطی کرنا تسلیم کر لیا تو یہ معلوم کرنے کا کیا معیار رہا کہ دل کا فلاں مشاہدہ حقیقت کا مشاہدہ تھا یا غیر حقیقت کا۔ پھر علامہ ایک اور بات بھی فرماتے ہیں کہ بعض دل مشاہدات کی درست ترجمانی نہیں کر سکتا۔ اس شکل میں یہ کس طرح فیصلہ ہوگا کہ دل مشاہدہ کی درست ترجمانی کر رہا ہے یا غلط۔

یوسف۔ اختر صاحب علامہ نے وہ معیار بھی بیان فرمائے ہیں۔ اس کتاب کا دوسرا لکچر ان معیاروں کی بات ہے۔ علامہ نے دو معیار مقرر کئے ہیں۔ ایک عقلی دوسرا افادی۔ عقلی معیار سے یہ مراد ہے کہ حقیقت وہ ہے جس کی نوعیت کو عقل قبول کر لے۔ افادی معیار یہ ہے کہ انھیں پیغامات کو حقیقی سمجھنا چاہئے جن پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے برآمد ہوں۔

اختر۔ یوسف صاحب! علامہ نے یہ معیار قائم کر کے اپنے "دل بینا" کے نظریہ کی تردید کر دی۔ علامہ ایک طرف تو یہ فرماتے ہیں کہ عقل کے ذریعہ سے نہ مجموعی حقیقت کا شعور کر سکتے ہیں اور نہ اس کے پیغامات سمجھ سکتے ہیں۔ دوسری طرف بے چاری عقل پر حقیقت اور غیر حقیقت میں تمیز کرنے کا بار ڈالتے ہیں اگر علامہ کے نزدیک عقل میں یہ اہلیت ہے کہ وہ حقیقت اور اس کے پیغامات اور غیر حقیقت اور اس کے پیغامات میں تمیز کر سکے اور ان کو جانچ سکے تو گویا علامہ نے یہ تسلیم کر لیا کہ عقل چالاک دل بینا سے کہیں زیادہ بیدار ہے کہ وہ دل کی محسوس کردہ حقیقت اور پیغام کو پرکھتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ افادی معیار بھی عقلی معیار ہے عقل تو اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ حقیقت کے کسی خاص پیغام پر عمل کرنے سے اچھے نتیجے نکل رہے ہیں یا برے۔

یوسف۔ اختر صاحب آپ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ اگر نظر یا دل بھی غلطی کر سکتا ہے تو دل کو دماغ سے الگ علم حاصل کرنے کا ذریعہ مان لینے سے مشکل حل نہیں ہوتی۔

اختر۔ یوسف صاحب میرے خیال میں عقل میں ہر حقیقت سمجھنے کی اہلیت ہے۔ صرف فکر و جستجو درکار ہے۔

حقیقت کے جن پہلوؤں کو ہم فی الحال نہ سمجھ سکیں ان کی طرف ہمارا غیر جانبدارانہ رویہ ہونا چاہئے نہ ان کا انکار اور نہ اقرار کرنا چاہئے مجھے ایسا گمان ہوتا ہے کہ چونکہ کاملین کے بہت سے بنیادی تخیلات عقل میں نہیں آتے لیکن ان پر ایمان لانا بھی ضروری قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس لئے ان مفکرین کو جنھوں نے مذہبی ماحول میں پرورش پائی ہے ضرورت ہوتی ہے کہ مذہبی تخیلات کو درست ثابت کرنے کے لئے عقل کو معذور۔ اور دل کو روشن بتائیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہدیں کہ دل جو علم حاصل کرتا ہے وہ عقل کے احاطے میں نہیں آسکتا۔ علامہ پہلے تو فرماتے ہیں کہ دل ہی حقیقت آشنا ہو سکتا ہے عقل انسانی مجموعی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ پھر یہ فرماتے ہیں کہ دل حقیقت کا تجربہ تو کرتا ہے لیکن بعض مرتبہ اس کو بتا شبہ لگ جاتا ہے اور وہ غیر حقیقت کو حقیقت تصور کرنے لگتا ہے۔ یہاں عقل اس کی مدد کرتی ہے اور تجربہ کی صحت اور غیر صحت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب عقل دل کے تجربات کے حقیقی و غیر حقیقی ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے تو وہ خود اس حقیقت کو سمجھنے سے کیوں قاصر ہے۔

یوسف صاحب اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو یہ عرض کر دوں کہ دل بینا کے فلسفہ نے دنیا کو عام طور پر اور ایشیا کو خاص طور پر جتنا نقصان پہونچایا ہے شاید ہی کسی دوسرے فلسفہ نے پہونچایا ہو۔ دل کو عقل پر ترجیح دینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مشرق نے عقل کو معطل قرار دے دیا جس کی وجہ سے فکری اضمحلال پیدا ہو گیا اور بجائے زندگی میں جد و جہد کرنے اور عقل سے کام لے کر قدرت کی طاقتوں پر قابو پانے اور ان کو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے استعمال کرنے کے ایشیا والے مراقبہ، تصوف اور علم باطن کے پیچھے پڑ گئے جس کے نتائج ہماری غلامی کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

یوسف۔ لیکن اختر صاحب علامہ کے فلسفہ میں عقل کے لئے بھی کافی میدان ہے عقلی جد و جہد کو کسی نے منع نہیں کیا بلکہ اس سے بھی جزوی حقیقت کا علم ہوتا ہے جس قسم کے تصوف کے آپ خلاف ہیں علامہ بھی اس سے خوش نہیں ہیں۔ علامہ کے نزدیک وہ مراقبہ تصوف اور علم باطن باطل ہے جس سے عمل پیدا نہ ہو۔ شاعر مشرق کے نزدیک مراقبہ وغیرہ سے انسان میں جراَت عمل پیدا ہوتی ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو وہ ریاضت بیکار ہے۔ اختر صاحب جہاں تک میں سمجھا ہوں علامہ نے خرد و عشق میں تمیز صرف اس بنا پر

کی ہے کہ خرد انسان کو عمل پر مجبور نہیں کرتی۔ اکثر صاحب کے دماغ بے عمل ہوتے ہیں یہ عشق کا کام ہے کہ وہ انسان کو عمل پر مجبور کرتا ہے

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

علامہ ضرب کلیم میں تصوف کے عنوان سے لکھتے ہیں ؎

یہ حکمت ملکوتی یہ علم لاہوتی | حرم کے درد کے درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور | تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی اقبال کی اصطلاح میں انفرادیت کا نام ہے جو انسان کے اپنے ماحول پر عمل کرنے سے مستحکم ہوتی ہے۔ توحید کے عنوان سے علامہ فرماتے ہیں۔

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی | آج کیا ہے؛ فقط اک مسئلہ علم کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمت کردار نہ ہو | خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
آہ اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ | وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

خرد اگر عمل بھی پیدا کرتی ہے تو اس کے نتائج اچھے نہیں نکلتے۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف خرد کے تابع ہو کر عمل کرنے کا نتیجہ ہے اگر عشق کے تابع ہو کر عمل کیا جائے تو اس سے بہت اچھے نتیجے برآمد ہوں۔ خرد کو عشق کے تابع رکھ کر عمل کرنا چاہئے۔

اختصار حسن اتفاق سے ایسی دنیا میں یورپ اور امریکہ موجود ہیں جہاں کے انسان بلا "دل و عشق" کی مدد کے صاحب عمل ہیں۔ دل نہیں بلکہ خرد ان کے تمام تر عمل کی محرک ہے۔ ان کی خرد نے آپ کی دل کی دنیا کی تحلیل کرکے رکھ دی۔ اس حقیقت کے سامنے آپ کا دل کا فلسفہ مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔ دل بینا کا فلسفہ اپاہجی کا فلسفہ ہے۔ آپ خود غور کیجئے کہ جب یہ مان لیا کہ کل حقیقت کا مشاہدہ اور تجربہ کرنے کا طریقہ عقل سے جدا ہے اور انسان کا مقصد حیات حقیقت کا مجموعی دیدار ہے جس سے زندہ و پائندہ علم حاصل ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ ہر انسان کل حقیقت کا دیدار اور زندہ و پائندہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور حقیقت کا دیدار ایک دو روز کے مراقبہ سے تو ہو نہیں سکتا اس کے لئے عمر درکار ہے

جس کے یہ معنی ہوئے کہ انسان تمام عمر ریاضت اور مراقبے میں گزار دے۔ یوسف صاحب! ایشیا کی غلامی اسی عشق و نظر کے فلسفہ کا نتیجہ ہے۔ یورپ کی زندگی اور ترقی سے متاثر ہو کر اقبال اس پر تو مجبور ہو گئے کہ ذوقِ کردار کا پیام دیں لیکن اس کے ساتھ انھوں نے عشق و نظر کا نظریہ پیش کر کے ایسا کیا جیسے کسی کے ہاتھ کاٹ کر اس کو عمل کی تلقین کی جائے۔ مسلمانوں میں عشق و نظر کا افیونی فلسفہ اتنا سرایت کر گیا ہے کہ اب ان کو افیونی فلسفہ کی خوشبو بھی پینک میں لانے کے لئے کافی ہے مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ علامہ ہی کی ہستی تھی کہ جس نے وقتی تقاضہ کو سمجھا اور اردو شاعری کو نیا رنگ دیا اور گل و بلبل اور خط و خال سے ہٹ کر عمل کا پیام دیا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ علامہ نے دل کی دنیا کا راگ الاپ کر اپنے پیام کو کالعدم کر دیا۔

یوسف۔ اختر صاحب یہ تو آپ درست فرماتے ہیں کہ باطن کی کشاد اور مراقبے کے ذریعہ سے حقیقت کی جستجو کی آڑ لے کر ایشیا اپاہج بن گیا۔ مشرق من کی دنیا میں پھنس گیا اور تن کی دنیا ت اتنا بے نیاز ہوا کہ ایک عرصہ سے یورپ کا غلام ہے لیکن اختر صاحب جیسا میں عرض کر چکا ہوں علامہ اس قسم کے تصوف سے بہت بیزار ہیں اور اس کا شکوہ اس طرح کرتے ہیں:

صوفی کی طریقت میں فقط مستیِ احوال ملا کی شریعت میں فقط مستیِ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستیِ کردار

اختر۔ یوسف صاحب یہ تو میں بھی مانتا ہوں کہ اقبال کے فلسفہ میں کردار پر از حد زور دیا گیا ہے لیکن علامہ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ خرد کے علاوہ عشق و نظر کو مانتے ہیں اور ان کو جوش کردار پیدا کرنے کا سبب بتاتے ہیں۔ عشق و نظر کے فلسفہ پر کسی تمدن کی بنیاد رکھ کر افراد کو کردار کا پیام دینا ایسا ہے جیسے پیاسے آدمی کا گلا دبا کر اس کو پانی پلانے کی کوشش کرنا۔ یورپ اس فلسفہ کی مجسم تردید ہے یوسف صاحب میں تو ایشیا کے زوال کا یہی سبب سمجھتا ہوں کہ ایشیا والوں نے فکر و جستجو سے کنارہ کر لیا اور عقل سے بیگانہ ہو کر اپنے آپ کو معجزات کے سمندر میں ڈال دیا جہاں توہمات کی مچھلیوں نے

انھیں ہڑپ کر لیا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ایشیا کو صاحب جذب وسوز ومستی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صاحب عقل کی ہے جو جستجو و تجربہ سے کام لے کر حقیقت کو پہچانے۔ علامہ اگرچہ دنیا کو پیام عمل دیتے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تلقین بھی جاری ہے۔

من کی دنیا من کی دنیا سوز ومستی جذب و شوق — تن کی دنیا تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن

من کی دولت ہاتھ جب آتی ہے تو جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

ایشیا والوں کی ساری عمر من کی دولت حاصل کرنے میں صرف ہو جاتی ہے اور تن کی دولت اغیار کے حصہ میں آتی ہے اور لطف یہ ہے کہ تن کی دنیا میں آلودہ رہنے والے من کی دنیا میں غرق رہنے والوں پر حکومت کر رہے ہیں۔

یوسف صاحب آپ کو یہ تو علم ہوگا کہ علامہ رہبانیت اور خانقاہی کے بہت خلاف ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی فرماتے جاتے ہیں۔

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر — کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریق خانقاہی

علامہ ہر بات میں کچھ مذبذب معلوم ہوتے ہیں

یوسف۔ اختر صاحب۔ دراصل ایشیا والوں کی تباہی اس لئے ہوئی کہ مولانا روم نے من کی دنیا میں رہنے والوں اور دل بینا کے دعویداروں کے لئے جو کسوٹی بتائی تھی جس کے علامہ بھی قائل ہیں۔ اس کسوٹی کو ہم نے فراموش کر دیا ہے۔

اختر۔ وہ کسوٹی کیا ہے؟

یوسف۔ آں کہ بر افلاک رفتارش بود — بر زمیں رفتن چہ دشوارش بود

مولانا فرماتے ہیں کہ جو افلاک پر چل سکتا ہے اس کے لئے زمین پر چلنا کیا مشکل ہے جب ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ فلاں شخص واقعی بزرگ یعنی حقیقت آشنا ہے تو ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس کی دنیاوی حالت کیسی ہے۔ باطن کی تلاش کا اسی کو حق ہے جو ظاہر کو اپنے تابع کر چکا ہو۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پہ زمیں کے ہنگامے — بری ہے مستی اندیشہ ہائے افلاکی

ایشیا میں اب تک یہ ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ جب دنیا کے طمانچے نہ سہہ سکے تو تارک الدنیا ہو کر مراقبہ کرنے لگے۔ جو تن کی دنیا پر قابو نہ پا سکا وہ من کی دنیا میں کیا کر سکتا ہے۔ مجھے علامہ کے یہ اشعار بہت پسند ہیں۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں — بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور — کہ معرکے ہیں شریعت کے دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی — اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

اختر۔ خیر آپ نے یہ تو مانا کہ پہلی حقیقت تن کی دنیا ہے اور من کی دنیا میں داخل ہونے کے لئے مادی دنیا کو مسخر کرنا ضروری ہے معاف کیجئے گا میں من کی دنیا کے فلسفہ ہی کو ایشیا کی تباہ حالی کا باعث خیال کرتا ہوں یورپ والے بلا جذب و شوق و عشق و مستی اور من کی دنیا کے پیچھے پڑے ہر اعتبار سے ہم سے بہت بہتر ہیں۔

یوسف۔ اختر صاحب یورپ میں جو کشت و خون ہو رہا ہے اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ یورپ کی نظر صرف تن کی دنیا تک محدود ہے

شرق حق را دید عالم را ندید — غرب در عالم خزید از حق رمید
چشم بر حق باز کردن بندگی است — خویش را بے پردہ دیدن زندگی است

اختر۔ یوسف صاحب یورپ کی نظر تن کی دنیا تک محدود سہی لیکن وہ ایشیا سے تو بہتر ہے جس کی نظر خلا میں دیکھتی ہے۔ مشرق کو ترقی کرنے کے لئے دونوں دنیائیں فتح کرنی ہوں گی لیکن یورپ نے تن کی دنیا فتح کر لی ہے اور علم نفسیات کے ذریعہ سے من کی دنیا بھی قریب نصف کے فتح کر لی ہے رہا یورپ کا کشت و خون تو وہ تباہی نہیں ہے

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے — جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

جس طرح بچہ پیدا ہوتے وقت ماں کو درد و کرب برداشت کرنا پڑتا ہے اسی طرح جب "جہان کہن" کے بطن سے "جہان نو" پیدا ہوتا ہے تو تمام دنیا میں تشنج پیدا ہوتا ہے یہ جنگ وہی تشنج ہے جس کو آپ تباہی و بربادی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

یوسف۔ عصر حاضر را خرد زنجیر پاست — جان بے تابے کہ من دارم کجاست
اختر۔ مست رکھو ذکر و فکر صبح گاہی میں انہیں — پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں انہیں

م۔م۔ جوہر صاحب میرٹھی

جدید تعلیمی نظریہ

تعلیم کی تعریف | تعلیم کی مختلف تعریفیں بیان کی گئی ہیں لیکن اس کا عام مفہوم یہ ہے کہ وہ انسانی معاشرہ کے بالغ ممبروں کی سعی اور جد وجہد ہے جس سے آنے والی نسلوں کی نشو ونما اور تشکیل، زندگی کے نصب العین سے ہم آہنگ ہو۔ یہ سچ ہے کہ اکثر تعلیم کا لفظ اس سے وسیع معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جان اسٹوارٹ مل نے تعلیم کے دائرہ میں ان تمام چیزوں کو شامل کر لیا ہے جو "نوع انسانی کے تعمیر میں مدد ومعاون ہوتی ہیں" اور شاعرانہ حیثیت سے ہم تمام بنی نوع انسان کی تعلیم بھی مراد لیتے ہیں لیکن یہ تمام استعمالات خطیبانہ ہیں جو عامیانہ خیالات پر مبنی ہیں۔ اس سلسلے میں ذاتی ہدایت اور تربیت ایک ضروری عنصر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیمی اسکیمیں تمامتر پڑھے لکھے لوگوں کے تجربات سے بنائی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ تمام تجربات (بچے کے لئے) سبق آموز ہوتے ہیں۔ آیا ایک تجربہ ایک فرد (یعنی بچہ) کی تعلیم کا جزو ہے یا نہیں؟ اس کا جواب اس وقت دیا جا سکتا ہے جب ہم یہ معلوم کر لیں کہ تعلیم کا طریقہ ان لوگوں نے مرتب کیا تھا جن کی آغوش تربیت میں پلا تھا اور وہ اسی کا تجربہ تھا (اگر وہ بچہ کا تجربہ تھا تو تعلیم کا جزو ہوگا ورنہ نہیں) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم خواہ اچھی ہو یا بری۔ اس کی اچھائی یا برائی کا انحصار معلم کی حسن سیرت، دانائی اور ذکاوت پر ہوگا۔ وہ اچھی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب اس سے صحیح نتیجہ نکلے اور اس کیلئے جو ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں وہ اس قدر موزوں و مناسب ہوں کہ ان سے مطلوبہ نتیجہ حاصل ہو سکے۔ نیز وہ عقلمندی، یک رنگی اور ثابت قدمی سے کام میں لائے جا سکیں۔

یوں تعلیم معین طور پر ایک انفرادی فعل ہے اور ہر سوسائٹی میں اس کی وسیع تاثیر اور وقعت کے درمیان اختلاف ہوگا۔ کیونکہ تمام زمانوں اور تمام مقامات میں ان لوگوں کی فضیلت، دانائی اور صلاحیت کے متعلق اختلافات ہیں جن کے ہاتھوں میں بچوں کی ذمہ داری اور نشو ونما ہے۔ تاہم باوجود ان اختلافات کے ہر معلم اپنے عہد اور ملک کے رائج تصور اور نظریہ کو کم وبیش مکمل اور واضح طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس بنا پر کامیاب تعلیمی جد وجہد کیلئے پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ قوم کو بہ حیثیت مجموعی تعلیم کی نظرت اور قیمت کا بخوبی اندازہ کرنا چاہئے۔

بہرکیف اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ ایک بیدار اور حساس قوم میں معلمین کا جو قوم کی حاجتوں کو پورا کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں پہلے کرنا بہت ہی عام اصطلاحات کے سوا ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کو تعلیم کس طرح دیں کیونکہ جب ہم ان افراد پر نظر ڈالتے ہیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم کو افلاطون سے متفق ہونا چاہئے کہ "تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ افراد کے جسم و روح میں ان تمام خوبیوں اور کمالات کی نشو ونما ہو جن کی صلاحیت ان میں موجود ہے"۔ اس سے ان خوبیوں اور کمالات کی فطرت سامنے نہیں آتی اور ان نقطہ ہائے نظر پر کبھی عالمگیر اتفاق نہ ہو سکا بلکہ ہر عہد میں اندازے کے بیّن اختلاف رہے ہیں۔ انفرادی حسن و کمال کا مظہر حقیقی زندگی اور صرف حقیقی زندگی ہے۔ اور ایسی زندگی زمان و مکان، تہذیب و تمدن، قومی جذبات اور مادی حالات پر دسترس کے معین حالات میں بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے افلاطونی عہد کے ایتھنز کا کمال زندگی، موجودہ لندن پیرس اور نیویارک سے بہت مختلف تھا۔ لہذا جہاں تک کوئی تصور تعلیم عملی طریقے کی رہبری کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرہ کی حالت ترقی اور تعلیم میں ہر لحاظ سے تعلق ہو جس میں وہ دی جاتی ہے۔

تعلیم اور قوم | ایک لحاظ سے قوم کے آئین اور عام نظریہ کا اس کی تعلیمی سیرت پر خاص اثر ہوتا ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ وہ قوم کی زندگی کے تحفظ و تکمیل میں سرگرم رہے لیکن وہ زندگی انفرادی ممبروں کی زندگی سے وابستہ ہے۔ ایک مثالی قوم میں انفرادی اور اجتماعی اغراض و مقاصد کی مماثلت ہونی چاہئے لیکن تاریخ مثالی اقوام کے وجود پر کوئی روشنی نہیں ڈالتی اور اس کے حالات کے متعلق تاریخ کے صفحات بالکل سادہ ہیں۔ عملاً اختلافات کا دور دورہ ہمیشہ رہا ہے جس کا نتیجہ کہیں جلب منفعت اور کہیں انسداد ترقی ہوا ہے۔ مختلف زمان و مکان میں معاشروں کا باہم اختلاف رہا ہے ہر ایک کی دلچسپیوں اور انفرادی ترقی کے دعووں میں مصالحت یا موخر کو مقدم کا تابع بنانے میں سوسائٹیوں کی رغبت بڑی حد تک کامیاب ہوتی ہے، اور اُن کے تعلیمی تصورات میں اختلافات کی جھلک فطرتاً نمایاں ہوتی ہے۔ اقوام کا ابتدائی رجحان افراد کی شخصیت کو مکمل طور سے تابع بنانا ہے لیکن مغربی قبائل میں عیسائیت کی آمد کے وقت سے، انفرادی زندگی کی اہمیت بڑھ جانے کے سبب اس رجحان کو روکا گیا اور لطیف بنا کر منعطف کیا گیا۔ ذہنی طور پر متناقض لیکن واضح واقعہ ہے کہ جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) نے اپنی بہت وسیع صف کے حیرت انگیز کھلم کھلا مظاہرے سے گہرے، قرب نے اور جدید اجتماعی تنظیم کے وسیع الجهاو

نے واقعتاً قدیم رجحان کے خلاف ردعمل پیدا کیا۔ اور تعلیمی خیالات میں اس کو ظاہر کیا۔ تعلیمی نظریہ کو ہمیشہ کم وبیش مرکزیت طفل پر مبنی ہونا چاہیئے یعنی پہلے ایک ہی بچہ پر ساری توجہ منعطف کرنی چاہیئے اور ان فطری صلاحیتوں اور خلقی قوتوں کو جو اس کو تعلیم یافتہ بناتی ہیں مرکز توجہ بنانا چاہیئے۔ لیکن موجودہ میلان اس سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اس کی رو سے فرد کی تکمیل تعلیمی جدوجہد کی علت غائی ہے۔ اس میں اجتماعی مطالبات سے بے پروائی شامل نہیں ہے اور نہ اس سے معاشرتی انتشار ہی مراد ہے بلکہ نقطہ نظر یہ ہے کہ قومی زندگی کی بہترین تشکیل ایسی تعلیم سے ہوگی جس میں معاشرتی سرگرمیوں کو انفرادی زندگی کے اعلیٰ درجوں تک ترقی کرنے کا ایک ضروری واسطہ خیال کیا جائے۔ یہ بہتر ہے اس چیز کی بہ نسبت جس کے ماتحت انفرادی نشوونما کے مطالبات کو قرار دیا جائے۔ یہ تصور کم وبیش صاف طور پر محسوس ہو کر امریکہ، برطانیہ اور دیگر متمدن ممالک میں نشوونما کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتا رہا اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے اس کی روشنی میں متمدن قوموں نے عملی ترقی کی طرف قدم اٹھایا۔

نظریہ کے تغیر کی حیرت انگیز علامت ترقی کرنے والے ملکوں میں جمہوری تعلیم کی ازسرنو تشکیل تک منتج ہوتی ہے۔ اس کی امتیازی صفت قدیم تصور کو مٹا کر جدید کو لانا ہے جس میں ابتدائی اور ثانوی مدارس، اہم معاشرتی طبقات سے مطابقت رکھیں۔ اس خیال سے ہر طبقے کے بچے ایسی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقع پائیں جس میں طفلانہ ضروریات بہم پہونچانے کا سامان موجود ہو۔ نیز اس میں ثانوی تعلیم عنفوان شباب کی ضرورتوں کے مطابق ہو۔ ممالک متحدہ امریکہ میں ابتدائی تعلیم کی عمارت اسی ستون پر قائم ہے۔ اس لئے وہاں جونیر اور سینیر ہائی اسکول موجود ہیں جو چھ^۱ تین تین۔ اصول پر قائم ہیں۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء میں تعلیمی بورڈ کی کمیٹی نے عنفوان شباب کی تعلیمی رپورٹ اسی اصول پر شائع کی ہے۔ جرمن ریخ بھی ان تعلیمی تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک حد تک یہ ترقیاں اس لئے ہوئی ہیں کہ جدید صنعت وحرفت اور آئین حکومت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر اوسط درجہ کے شہری کا قدیم شہریوں سے زیادہ بلند معیار علم وتربیت ہونا چاہیئے لیکن اس کی اصولی تشریح اس تصور میں موجود ہے۔

---

[۱] امریکہ میں قدیم آٹھ سالہ نصاب تعلیم ختم کر دیا گیا ہے اور اب اس کے بجائے چھ سال کا ایک جدید نصاب تیار کیا گیا ہے۔ جس کی رو سے تین سال تک جونیر ہائی اسکول کورس کی تعلیم ہوتی ہے جس میں بچوں کے حیاتیاتی، نفسیاتی اور سماجی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے اور تین سال کا سینیر ہائی اسکول کورس عنفوان شباب کیلئے مرتب کیا گیا ہے جس میں ان کی نفسیاتی ضروریات کو پیش نظر رکھا گیا ہے

کہ ایک قوم کا فرض ہے کہ وہ ذاتی ترقی اور خود فہمی کے بہترین مواقع تمام افراد کی دسترس میں دیدے جو اُن سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

نصاب | ان اعتبارات سے نصاب تک خیال کا پہونچنا فطری بات ہے۔ بچوں اور بچیوں کو کیا پڑھنا چاہئے؟ اس کا صحیح جواب اُس اصول میں ہے جو مقصد تعلیم میں بیان کیا جا چکا ہے۔ اسکول کا یہ کام ہے کہ وہ ترقی و تکملہ اور خاندانی زندگی کے اثرات کی صلاح کے ساتھ ساتھ بچوں پر ان روحانی قوتوں کا اثر ڈالے جو اس قوم یا جماعت کی خصوصیات میں سے ہوں اور ان کو اس لئے تیار کرے کہ وہ قوم کی زندگی کی محافظت اور ترقی میں حصہ لے سکیں۔

اس کام کے انجام دینے میں اسکول کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک حقیقی معاشرہ ہو جس میں قومی سیرت کے بہترین نصب العین موجود ہوں اور اس لئے اس قابل ہو کہ بچوں کے رگ و ریشہ میں وہی خصلتیں اور سیرتیں منتقل ہو کر مستحکم ہو جائیں۔ انگلستان کے نام نہاد پبلک اسکولوں کی شہرت کا دار و مدار انھیں اصول کو کامیابی کے ساتھ چلانے پر ہے۔ یہ بات مشہور ہے کہ ان اسکولوں کے معاشرتی نصب العین میں جسمانی قوت اور جرأت، نیک اخلاق، قومی روح، ضبط نفس اور آزادی و حکومت خود اختیاری کے لئے تربیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کسی شہری کی تخلیق کے لئے یہ تمام باتیں قیمتی عناصر ہیں اور اس لئے ان کا وجود ہر قسم کے اسکولوں کی زندگی میں لازمی ہے۔

۲- دوسری بات یہ ہے کہ اسکولوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلبا کو متعدد مضامین کی تعلیم دیں۔ یہاں پر ہم جس اصول کی پیروی کرتے ہیں اس کے گوناگوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص قوم کی زندگی اور ضروریات کا وسیع یا محدود نقطۂ نظر رکھے۔ محدود نقطۂ نظر کی رو سے قوم کو کسی وقت کسی قسم کے علم و حذاقت کی ضرورت پیش آتی ہو تاکہ وہ اپنی اقتصادی اور دوسرے قسم کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے اور اسکولوں کا یہ کام ہے کہ وہ ایسے نوجوان طلبا پیدا کریں جو اُس علم و حذاقت سے بہرہ ور ہوں وسیع نقطہ نظر کے لحاظ سے حال کی افادی ضروریات کو کم اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے بجائے طلبا کو ان عناصر سے روشناس کرایا جاتا ہے جو لوگوں کی تاریخی زندگی میں نہایت دائمی اور بنیادی طور پر وقیع خیال کئے جاتے ہیں۔ ان نظریوں کے تبائن سے صنعتی اور لبرل (عام تعلیم جو تہذیب نفس کے لئے دی جائے) تعلیم اور جدید اور کلاسکل تعلیم میں اور کم واضح طور پر اس تعلیم میں جو علم کی قیمت پر زور دیتی ہے اور اُس میں جو ذہنی تربیت اور تادیب پر زور دیتی ہے تناقض پیدا ہو گیا ہے۔

ان متصادم خیالات میں جو مذکورہ بالا تناقضات میں شامل ہیں ہم کو ایک معقول نصاب تعلیم کا تعین لازمی ہے ایسے نظریہ کی بنیاد یقیناً اس پر قائم ہونا چاہیے جس کو وسیع نقطہ نظر کہا گیا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کے خاص اصول یہ ہوں گے کہ اسکولی معاشرہ اپنے تخلیقی اثرات میں ان ذہنی، جمالیاتی اور عملی سرگرمیوں کی کیفیتوں کو شامل کرے جنھوں نے انسانی روح کے ارتقا میں اہم حصہ لیا ہے اور جن کی وجہ سے عصر جدید کے دماغ کی تشکیل ہوئی، ادب اور آرٹ، موسیقی و صنعت ریاضی اور سائنس، جغرافیہ اور تاریخ مکمل نصاب کے ضروری جوہر ہیں لیکن یہ چیزیں صرف گوناگوں طریقوں سے نصاب میں داخل نہیں ہو سکتیں۔ وہ داخل ہو سکتی ہیں اگر مختلف قسم کے طلبا کی گوناگوں ضرورتوں کے لحاظ سے مناسب ہوں مثلاً کسی مخصوص صنعت کے لئے تیار کرنا کسی خاص اصول کے مطابق ہوتا ہے اگر اس کا مقصد صرف اوزار کے استعمال کی حذاقت یا تجربی صنعتی علم نہ ہو بلکہ متعلم کو اسکول میں کسی ایسے ضروری پیشہ یا فن کے اخلاقی، سائنٹفک یا جمالیاتی روایات کے اندر رکھا جائے جس نے ہمارے تمدن و تہذیب کی ترقی میں ایک اہم حصہ لیا ہے اور برابر لے رہا ہے۔ اس طرح عمل کرنے سے صنعتی تربیت آبادی کے بڑے حصوں کے لئے حقیقی لبرل تعلیم کی تکمیل اور ہمواری کا موزوں طریقہ ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف وہ تربیت جو زیادہ تر قدیم کلاسکس (ادب القدما) کے مطالعہ پر مبنی ہو لبرل کہلانے کی مستحق نہیں ہے جب تک کہ وہ ایسی نہ ہو کہ اس سے ایک طالب علم موجودہ دنیا میں آزاد انسان نہ بن سکے۔ اس کے خیالات حساس ہوں اور وہ اس تربیت کی ذہنی اور معاشرتی تحریکات کی اہمیت سے باخبر ہو۔

اس نقطہ نظر سے ذہنی تربیت یا تادیب کا ترقی دینا اور سنوارنا تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے تعلیمی نظریہ اور عمل پر وہ اتنا گہرا اثر برابر ڈال رہا ہے کہ اس کی پُر احتیاط تحلیل کی ضرورت ہے۔ اسی خیال کو لطیفے کے طور پر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک انسان کی تعلیم ان چیزوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کو وہ اسکول میں سیکھنے اور پھر بھلا دینے کے بعد یاد رکھتا ہے لیکن ایک دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کیا یاد رکھتا ہے؟ خام نقطہ نظر کے مطابق اسکولی مطالعوں سے بعض قابلیتیں اور دماغی قوتیں ترقی پاتی ہیں اور وہی ترقی ان کو جاری رکھنے کا اصلی باعث ہوتی ہیں۔ مثلاً نظمیں جو بچہ روزانہ سیکھتا ہے۔ ممکن ہے کہ اسکول چھوڑتے ہی وہ بہت جلد فراموش ہو جائیں لیکن یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس تعلیم سے اس کا حافظہ قوی ہو جاتا ہے اور یہی اس کی کافی تائید ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کو کبھی بھی اپنے حاصل کردہ علم طبعیات اور علم کیمیا کے استعمال کرنے کا موقع نہ ملے لیکن کوئی مضائقہ نہیں اگر اس نے ان علوم سے

قوت مشاہدہ اور قوت استدلال حاصل کرلی ہو جن کی قیمت عالمگیر ہے اور اس نے تمام بحث طلب امور میں سائنٹفک طریقہ کے استعمال کی عادت ڈال لی ہو۔ اسی طرح یہ خیال بھی رائج ہے کہ علم ہندسہ سے قوت تفکر کی تربیت ہوتی ہے اور جبر و مقابلہ سے دماغی درستی۔ ان مثالوں میں نفسیاتی قوت ذہنی یا نظریۂ نقل تربیت ذہنی کا مسئلہ پیش نہیں کیا گیا ہے جس کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی فطری قوت کو ایک موضوع پر تربیت دینے میں دوسرے موضوع کی تربیت کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن جدید نفسیاتی تجربات نے اس خیال پارینہ کی عمارت کو متزلزل کر دیا ہے۔ ان سے یہ ثابت ہے کہ ایک انسان جو اشعار کے یاد کرنے میں طویل مشق سے اپنی قوت حافظہ کو تربیت کرتا ہے وہ کسی حالت میں نثر کے ٹکڑوں کو اس سے کم محنت میں یاد نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ بھی قابل یقین نہیں کہ علم نباتات اور علم طبقات الارض کا ایک ذکی ناظر جس نے اپنی تربیت سے آنکھ کی سرعت اور اعتماد کے اوصاف حاصل کرلئے ہیں وہ ان کو دہلی کی شاہراہوں پر موٹر چلانے میں مدد دیں گے ان یقینی واقعات اور عمومی اعتبارات سے دماغی تربیت کا خیال باطل ثابت ہو رہا ہے۔ لیکن یہ باور کرنا مشکل ہے کہ دہ ظنیات جو جان لاک اور دیگر قابل اور تجربہ کار معلموں کی کاوش کا نتیجہ ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں ہے اس مسئلہ میں ہربرٹ اسپنسر نے اپنی کتاب "تعلیم" میں صحیح نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اسکولی مطالعوں کی قدر علم اور قدر تربیت کا تناقض بالکل غلط ہے۔ اگر ہم اپنے طلبا کو ایسے علم سے روشناس کریں جو بیش قیمت ہے یعنی وہ علم جس کی امور زندگی کے منضبط کرنے میں ناگزیر عملی قیمت ہے تو ہم اس کے ساتھ ساتھ ان کی بہترین ممکن دماغی تربیت کر سکیں گے۔ کیونکہ یہ ناقابل یقین ہے کہ بہترین قسم کے علم کی تلاش سے بہترین دماغی تادیب نہیں ہو سکتی اس دلچسپ عقیدہ کو جہاں تک اسپنسر کا ذاتی تعلق ہے مسئلہ ارتقاء کے ماننے والے کے عقیدے کا ایک جزو سمجھنا چاہئے۔ لیکن اس کو مذکورہ بالا عام اصول نصاب کا نتیجہ بھی خیال کرنا چاہئے۔ یہ کہا جاتا تھا کہ بہترین تعلیمی سرگرمیاں وہ ہیں جنھوں نے تمدن کی ترکیب اور ترقی میں ضروری اور مستقل مدد پہونچائی ہے ان امدادوں کا حقیقی سہرا ان لوگوں کے سر ہے جو قوم کے نابغہ (Genius) تھے۔ مثلاً بڑے بڑے آرٹسٹ، صناع، شعراء، ادبا، مغنی اور سائنٹسٹ، ارباب سیاست یہی لوگ ایوان تمدن کے نقاش اور معمار ہیں اور انھیں لوگوں نے سرگرمیوں کی تشکیل اور شائستگی کی ہے۔ ان کے لئے انھوں نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی تھی اور اس طرح سرگرمیوں کی روایات — ذہنی جمالیاتی اور عملی کی تخلیق ہے جن کی معین اور مخصوص شکلیں آج ہمارے سامنے

ہیں۔ اسی طرح شعری اور نفیس ادبی روایات کی نشو ونما عالمگیر عادت نطق اور ارتباط سے ہوئی ہے۔ فن تعمیر اور صنعت
مادی زندگی کی عالمگیر ضروریات سے بڑھے ہیں۔ سائنس کی ترقی عالمگیر عطیہ تجسس اور بے پایاں عملی مقاصد کے
لئے قطعی علم کی ہمہ گیر ضرورت سے ہوئی اور اسی طرح دوسری بنیادی سرگرمیوں کی جو نصاب تعلیم میں داخل ہیں
نشو ونما ہوئی۔ جس قدر ایک طالب علم کا مطالعہ ان روایات سے اس کا قریبی تعلق پیدا کر دیتا ہے یا اس میں ان کو
جذب کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اسی قدر اس کا دماغ ان اعلیٰ دماغوں کا پرتو اور آئینہ ہو جاتا ہے جنھوں
نے ان کو وضع کیا تھا اور یہی وہ طریقہ ہے جس سے اس کا دماغ منظم بھی ہو جاتا ہے۔ الغرض اسکولی زندگی کے
نظم اور مطالعہ سے یہ مراد ہے کہ بچوں میں یہ قوت و صلاحیت چھوٹے پیمانے پر پیدا ہو کہ وہ جلیل القدر شعراء کے
ہم جلیس، ماہرین فن کے ہمسر، حکما اور فلاسفہ کے ہمرتبہ ہو سکیں۔ ان میں وہ دقت نظر پیدا ہو کہ فطرت اور کائنات کا
مطالعہ ایک سائنسداں کی عینک سے کریں اور ایسے شہری ہوں کہ ان کے پیش نظر عظیم الشان شہریوں کی مدنی
زندگی کا نصب العین ہو۔ اس قسم کی تادیب و تربیت مستحکم ہوتی ہے نہ کہ پا در ہوا اور اس کی قیمت ہمہ گیر ہے کیونکہ جو
سرگرمیاں اس کی تشکیل کرتی ہیں وہ متمدن زندگی کی بنیادی سرگرمیاں ہیں۔

ابھی تک مدرسہ کے نظام میں مذہبی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا۔ اس مختصر مضمون میں شرح و بسط سے لکھنا
ممکن نہیں کچھ تو یوں کہ مذہب کی اصطلاح بہت ہی پیچیدہ اور بے پایاں مظاہر پر مشتمل ہے اور کچھ یوں کہ لوگوں کا اندازہ
مذہب کے متعلق اس قدر گوناگوں ہے کہ بعض حالتوں میں بالکل متضاد ہو جاتا ہے علاوہ بریں بہت سے لوگ
متناقض معتقدات کے پیرو ہیں جو اخلاقیات کی تعلیم بغیر مذہب کے جائز اور لازم خیال کرتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک
مذہب ایک روحانی مرض ہے یا یوں سمجھئے کہ تہذیب کے عہد طفولیت کا فریب محض ہے جس کو موجودہ زندگی میں
ناپید ہو جانا چاہئے۔ جو لوگ انتہائی نقطہ نظر کے علمبردار ہیں وہ نصاب سے مذہبی تعلیم کو الگ رکھنا چاہتے ہیں۔
کیونکہ ان کی نظر میں وہ قوموں کی زندگی میں کسی اہم اور مستحکم قیمت والے عامل کی نمائندگی نہیں کرتی باوجود اس کے
کہا جا سکتا ہے کہ یہ انتہا پسند بھی ایمان رکھتے ہیں جن کے پیش نظر متعین نصب العین کی اعلیٰ قیمت ہوتی ہے یہ معترف
ہیں کہ وہ نصب العین بجا طور پر خدمت کا مطالبہ کرتے ہیں اور اصلاح باطن پر کچھ اثر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے
کہ ایسا ایمان یقیناً مذہبی کہلائے گا کیونکہ وہ تمام صحیح اور سچے مذاہب کا لب لباب ہے تو یہ شبہ کہ آیا نصاب تعلیم کا عام

اصول مذہبی تعلیم پر منطبق ہوتا ہے۔ رفع ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ مذہب اس وسیع مفہوم میں انسانی جماعتوں کی بقا اور ترقی کا ایک بنیادی عامل ہے اور اس لئے .... اُس مذہبی تعلیم کو لازماً اسکولی معاشرہ کا ایک عامل ہونا چاہئے لیکن یہاں پر مذہبی تعلیم (بہت عام مفہوم میں) اور مخصوص معتقدات کے مابین رشتہ کا سوال باقی رہتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس پر کوئی اتفاق بآسانی نہیں ہو سکتا۔ غالباً دماغی ترقی کے عام خط و خال کے متعلق سب لوگ متفق ہوں گے یعنی مذہب اعتقادی عناصر (جن کی فطرت اس منظم نظریہ کی ماثل ہے جو مذہبی عبادت کے مقاصد اور سرچشموں سے متعلق ہے) ان پر عنفوان شباب سے پہلے کم زور دینا چاہئے لیکن اگر یہ رائے تسلیم بھی کر لی جائے تو اس کی تطبیق مباحثے کا دروازہ کھلا رکھتی ہے۔

اسکولی حکومت | اسکولی نظم حکومت کے متعلق اسی قسم کی کچھ نظری مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اسکولی معاشرہ کا دارو مدار اس مصنوعی مجبوری پر ہے جس کی نوعیت اُس بڑی سوسائٹی کے دبانے والے اثرات سے مختلف ہوتی ہے جن سے ایک شہری ہر وقت گھرا رہتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسکولی حکومت کا حاصل بزرگوں کے منتخب مقاصد کی روشنی میں بچوں کی زندگی کا انضباط ہے تاہم چونکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ بچے اور بچیاں بہ حیثیت مرد اور عورت کے بڑی سوسائٹی کی عمومی زندگی میں عزت اور شرافت کی زندگی بسر کر سکیں، اس لئے یہ ناگزیر ہے کہ کسی نہ کسی شکل میں زندگی کے بنیادی خط و خال اسکولی معاشرہ میں موجود ہوں۔ جہاں جہاں جمہوری عقائد کا دور دورہ ہے وہاں اس اصول کو کام میں لانا غیر یقینی ہے۔ موجودہ دور میں انگلستان، امریکہ، جرمنی اور دیگر ممالک میں اسکولی نظام حکومت کو مکمل جمہوری بنیاد پر چلانے کے تجربات کئے گئے ہیں جن کی رو سے بچے اپنے اساتذہ کے ساتھ اپنی چھوٹی سی ریاست میں بحیثیت قانون ساز اور حاکم عدل کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ چونکہ اس قسم کے تجربات بچوں کی نشو و نما کی روایات سے متناقض ہیں اس لئے ان کی عملی کامیابی میں بہت مشکلات ہوتی ہیں۔ ایسے ماحول میں یہ تجربات کامیابی حاصل کرتے ہیں جہاں قصور وار طلبا کو بداخلاقی سے زیادہ ارباب بست و کشاد کی نظمی اور بدعملی سے نجات دلانے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بعض ممالک میں اسکولی حکومت کی باگ ڈور اسکولی معاشرہ کے بالغ ممبروں کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ انگلستان میں خاصکر موجودہ اسکولوں اور گزشتہ صدی کے اسکولوں کے موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک نمایاں عام ترقی اسی جانب میں ہوئی ہے جس کو زیادہ دلیر مصلحین بہت آگے

بڑھا سکے ہیں۔ اساتذہ کا استبدادی رویہ جو ایک زمانہ میں ان کا طرۂ امتیاز تھا محسوس طور پر معتدل ہوتا جاتا ہے۔ اب وہ حاکم مطلق کی طرح اپنی مرضی کا اثر ڈال کر کام نہیں کرتے بلکہ ان کی حیثیت ایک نظریہ' فطری مربی کی ہے جس کے قائم رکھنے میں ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ اب اسکولوں میں یہ خیال عام طور پر پھیل رہا ہے کہ اسکول کی حکومت کا بوجھ ان بالغ طلبا کے کاندھوں پر رکھا جائے جو اسکولی افادے کو سمجھ سکتے اور اس کی ذمہ داریوں کو برداشت کر سکتے ہیں کیونکہ اس طریقے سے طلبا کی مرضی کے مطابق کام ہوگا۔ خود اختیاری اور ذمہ داری کا احساس ہوگا اور نیز اس سے اخلاق کی نشو ونما بھی ہو سکے گی۔

سزا سزا کا قدیم نظریہ بھی اسکولی حکومت کے نظریہ کی طرح بدلتا ہوگا کیونکہ سزا حکومت کا ایک آلہ ہے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کسی زمانہ میں سزا اسکولی حکومت کا ایک اہم آلہ تھا لیکن آج کل کوئی معلم اس کا استعمال اس تشدد سے نہیں کرتا جیسا کہ پہلے معقولیت اور درستی کے خیال سے کرتا تھا۔ اس کی وجہ موجودہ مذہب انسانیت نہیں ہے کیونکہ موجودہ تعلیمی نظریہ کی روشنی میں استاد بے چینی اور پریشانی سے مجبور ہو کر یہ محسوس کرتا ہے کہ سزا کی ضرورت اس بات کی علامت ہے کہ طلبا کی حقیقی ضروریات اور اسکولی زندگی کے حالات میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اس ہم آہنگی نہ پائے جانے کا ذمہ دار خود استاد ہی ہے۔ اسی لئے وہ اصلاح شر کے لئے سزا کی طرف رجوع کرنے سے زیادہ ان حالات کی درستی کی سعی کرتا ہے۔ ایسی پالیسی عام اصول کے مطابق ہے جس کی وجہ سے اسکول کا کام صحت بخش اور قیمتی قسم کی قطعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ نیز یہ خیال بھی اہم ہے کہ دماغی نادیب کی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب صحیح کام کو صحیح طریقہ سے انجام دیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اسکول میں خود بخود نمودار ہو جائے گی۔ چاہے وہ کتنا ہی سائنٹفک طریقہ سے چلایا جائے کیونکہ معلم کا فرض نہ صرف طلبا کے غلطی کرنے کے انسانی رجحان کا جانچنا ہے بلکہ والدین کے غیر دانشمندانہ سلوک کا معلوم کرنا ہے جو انہوں نے بچوں کی ابتدائی زندگی میں ان کے ساتھ کیا۔ غلط کاری اور اس کے متعلق سزا کے انسداد کی جتنی بھی خواہش کی جائے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ باوجود اس کے بچوں کے ساتھ حکیمانہ برتاؤ، کورانہ استبدادی ضابطہ سے زیادہ اصلاح کا حامل ہو سکتا ہے۔

ضیاء الدین احمد صاحب الہ آبادی بی۔اے

تعلیم کب موثر ہوتی ہے؟

ہندوستان میں موثر تعلیم کے نتائج کا ریکارڈ شاذونادر ہی کسی مدرسہ میں ملے گا۔ ابھی ہم اس اسٹیج پر نہیں پہونچے ہیں۔ ہماری تنخواہوں کی کمی اور ہماری سستی اس قسم کے تجربوں میں مانع ہے۔ ہم میں سے اکثر معلمی کے کام کو کوئی اچھا درجہ نہیں دیتے اور ابتدائی جماعتوں میں پڑھانے والے اکثر اُستاد فخر کے ساتھ اپنا کام نہیں کرتے ان میں اور اُن کی تنخواہ میں ایک کشمکش سی رہتی ہے جس کا بالآخر نتیجہ مایوسی یا تنخواہ بڑھانے کے وسائل کا تلاش کرنا ہوتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں صورتوں میں تجربہ کی یادداشت محفوظ ہونا اور اسے ملک کے افادہ کے لئے پیش کرنا امر محال رہا ہے۔ ہمارے قابل مفکرین نے بھی جو کم وبیش کسی تجربہ کو دیکھتے رہے ہیں باہر کی کتابوں کے ترجموں سے آگے قدم نہیں بڑھایا ہے۔ یہ سب سے بڑا قومی نقصان ہے غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ ذاتی بے اعتمادی ہو۔ ہم یا ہمارے ساتھی جو کچھ تجربہ کرتے ہیں اس کے درست ہونے میں انھیں ہمیشہ شک ہوتا ہے۔ ہمیں دوسرے ملکوں کا کیا ہوا تجربہ بالکل صحیح اور بالکل اصولوں کے مطابق معلوم ہوتا ہے بے اعتمادی کی وجہ سے ہم اپنا کیا ہوا تجربہ خواہ وہ کتنا ہی اصولوں کے مطابق کیوں نہ ہو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے اعتراض اور اپنی کم مائگی کا خیال ہر وقت دامنگیر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اچھی سے اچھی چیز بطور یادداشت کے محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے لوگوں کے سامنے نہیں آتی۔

بے شمار تعلیمی مسائل ہیں جن پر تجربہ کیا جا سکتا ہے اور دیکھا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے کیا نتائج ہوتے ہیں یہاں کے حالات کے مطابق کس قسم کے ردوبدل کی ضرورت ہے۔ مثلاً طلبا میں اچھی عادتیں کیسے پیدا کی جا سکتی ہیں؛ اس کے لئے کیا کیا عملی وسائل اختیار کئے گئے؛ طلبا مختلف مضامین میں کیوں کمزور رہ جاتے ہیں؛ کیا کیا صورتیں ہوتی ہیں؛ تعلیم کب موثر ہوتی ہے؛ کون کون سے مواقع پر طلبا نے موثر طریقہ پر سیکھا؛ حاضری بہتر بنانے کے لئے گاؤں یا شہر میں کون کون ذرائع اختیار کئے گئے۔ کون کون سی صورتیں زیادہ موثر ثابت ہوئیں؛ چھوٹے بچوں کو کوئی حرفہ سکھانے کے دوران میں کیا کیا دقتیں پیش آتی ہیں؛ اُن پر کس طرح قابو پایا

جاتا ہے؟ ایسے اور اسی قسم کے دوسرے مسائل میں جو تجربہ کرنے کے بعد لوگوں کے لئے پیش کئے جا سکتے ہیں یہ ہماری امداد ہوگی خواہ اس میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں۔ اس خیال سے تو کوئی تجربہ پیش ہی نہ کرنا چاہئے کہ یہ تجربہ اور اس کے نتائج سو فی صدی صحیح اور درست ہوں گے۔ تعلیم میں کوئی بات بالکل آخری نہیں ہوتی کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ یا اس کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہو سکتی۔ ہاں تجربوں کو دل سے کرنا چاہئے اور بغیر کسی قسم کے فرضی اور خیالی اضافہ کے اس کے نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر دینا چاہئے۔ اس مضمون میں میں اسی چیز کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنا تجربہ "تعلیم کب موثر ہوتی ہے" کے متعلق چند باتیں اور اس کے نتائج پیش کرتا ہوں۔

جامعہ ملیہ کے قرول باغ کے مدرسہ میں جسے تعلیمی مرکز بھی کہتے ہیں بچوں کے کام کے ریکارڈ رکھنے کی برابر کوشش کی جاتی رہی ہے۔ ایک ریکارڈ روم ہے جہاں بچوں کی بنائی ہوئی ڈرائنگ، بچوں کی لکھائی کے نمونے، بچوں کے مضامین۔ بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں، بچوں کی لکھی ہوئی نظمیں اور بچوں کے قلمی رسالے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ ان رسالوں میں بچوں کی کسی مسئلہ کے متعلق جو مدرسہ یا ان کی اپنی ذات سے متعلق ہوتی ہے۔ آزاد رائے کی یادداشت بھی محفوظ رکھی جاتی ہے۔ ادھر جب سے ہم نے حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینا شروع کی ہے، بچوں کے بنائے ہوئے کاغذ ابری اور کارڈ بورڈ کے نمونے بھی یہاں رکھے جاتے ہیں۔ اس تمام کام میں ہم بچوں کی طبیعتوں کے رجحان کا اندازہ کرتے رہتے ہیں اور معلوم کرتے رہتے ہیں کہ بچے کہاں موثر طریقہ پر سیکھتے ہیں۔ کہاں ان کی توجہ سب سے زیادہ ہوتی ہے؟ کہاں وہ بے توجہی کی وجہ سے نقصان کر بیٹھتے ہیں؟ کام کتنے عرصہ دلچسپ رہتا ہے اور کب سے اس کی دلچسپی کم ہونے لگتی ہے؟ ایک موٹی سی بات اس تمام کام میں یہ سمجھ میں آئی ہے کہ تعلیم اس وقت تک موثر نہیں ہوتی جب تک وہ طالب علم کا اپنا مقصد نہیں ہو جاتی خواہ وہ کسی قسم کی تعلیم ہو ہم استاد اسی بات کی کوشش کرتے رہتے ہیں کہ کام کھیل اور کسی بات کے بتلانے اور سکھانے کو طالب علم کا مقصد بنا دیں۔ وہ یہ سمجھنے لگیں کہ اس بات کو ہم اپنی ضرورت سے سیکھ رہے ہیں۔ بغیر سیکھے ہماری ضرورت نہیں پوری ہوگی۔ اگر آپ تعلیم اور کام کو طلبا کے لئے بامقصد بنا دیں تو آپ دیکھیں گے کہ تعلیم خود بخود موثر ہوتی چلی جائے گی۔ آپ کو طریقہ تعلیم سے بھی کم مدد لینی پڑے گی۔ طالب علم اپنی ضرورت کی تکمیل کے لئے

جو بات سیکھنا چاہے گا اُس کے لئے وہ خود طریقہ تعلیم معلوم کرلے گا اور آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ سیکھنے کے تمام درجے طریقہ تعلیم کے متعلق طے کر رہا ہوگا۔

تعلیمی مرکز میں جہاں باغبانی، کارڈ بورڈ، ابری بنانا اور کاغذ بنانا سکھلایا جاتا ہے اور اس کام کی دلچسپی کو تعلیم دینے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے وہاں لین دین اور حسابی مشق کے لئے بچوں کے بنک، بچوں کی دوکان اور شعبہ مصنوعات کی اشیا، فروخت کرنے سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ میں نے جن مواقع کا اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر ان جرفوں اور مقاصد سے متعلق ہیں۔ ہم نے زیر بحث بات اس وقت پیش کی جب طلبا نے اُس کے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی، جب وہ آمادہ نظر آئے، جب ہم نے یہ اندازہ کرلیا کہ یہ بات اُن کا مقصد ہو چکی ہے۔

بچوں کے بنک کا سالانہ جلسہ ہونے والا ہے جن بچوں کی رقمیں بنک میں جمع ہیں ان کو اس موقع پر ان کی رقم پر منافع ملے گا۔ بنک کے تین سو ممبر ہیں، ۲½ فی صدی سالانہ کے حساب سے منافع دیا جائے گا۔ ابتدائی ششم کے طلبا جو بنک کا کام کرتے ہیں ہر طالب علم کا منافع اس کی رقم پر لگانا چاہتے ہیں۔ استاد ان کی اس ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے منافع یا سود پھیلانے کا طریقہ بتلاتا ہے۔ بچے اس کو سیکھتے ہیں اور تمام ممبران کا منافع پھیلاتے ہیں منافع کے رجسٹر میں درج کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو طلبا نے شوق سے سکھا انھیں اس کی ضرورت تھی۔

۲۔ گُل دیوار کے کئی پودوں کو باغبانی میں دیمک نے خراب کر دیا۔ موتیا کے کئی پودے بھی دیمک کی نذر ہو چکے ہیں، طلبا چاہتے ہیں کہ کسی طرح دیمک کا خاتمہ ہو جائے تاکہ باقی پودے بچ جائیں۔ کتابوں اور رسالوں سے دیمک کو تباہ کرنے کے کئی نسخے انھوں نے معلوم کئے اپنی کاپیوں میں لکھے۔ ان نسخوں میں سے دو کا استعمال کر کے دیمک کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بات بہت موثر طریقہ پر ان کو معلوم ہو گئی۔ دیمک کا حال اپنے شوق سے پڑھا۔

۳۔ نیا سال شروع ہوا ہے۔ بچوں کی دوکان میں بچوں کی ضروریات کی تمام چیزیں خریدی جا چکی ہیں۔ ابتدائی پنجم کے طلبا جو بچوں کی دوکان کا کام کرتے ہیں، یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کس چیز پہ دوکان کو کتنا فی صدی منافع لینا چاہئے؟ وہ عملی طور پہ فی صدی نکالنا جاننا چاہتے ہیں انھیں اس کی ضرورت ہے۔ وہ سو فی صدی اس کیلئے

تیار ہیں جو کچھ ان کو بتلایا گیا انھوں نے سو فی صدی موثر طریقہ پر سیکھ لیا ہے۔

(۴) ابتدائی ششم کے طلبا ردّی کاغذ بنا رہے ہیں۔ کچھ لگدی کچل رہے ہیں، کچھ کاغذ اٹھا رہے ہیں، کچھ چکنا کر رہے ہیں، کچھ چوکور بنا رہے ہیں۔ استاد اس دوران میں ان کو یہ بتلاتا ہے کہ سب سے پہلے ہاتھ سے کاغذ کن ملکوں میں بنتا تھا اور اس کو سیاحوں نے کس طرح دوسرے ملکوں میں پہونچایا؟ سیاحوں کی کہانیوں سے کچھ سیاحوں کے حالات بتلائے گئے۔

(۵) پانچویں جماعت کے طلبا چھ پہلو والی کشتی بنانا چاہتے ہیں لیکن اس کے بنانے کا طریقہ انھیں نہیں معلوم ہے۔ وہ استاد سے پوچھتے ہیں۔ استاد چھ پہل کشتی بنوانے سے پیشتر طلبا کو چھ پہل شکل بنانا سکھلاتا ہے۔ طلبا اسے خوشی سے سیکھتے ہیں۔

(۶) ابتدائی اول کے طلبا ابری بنانے کے دوران میں لئی ایک دوسرے کے لگا دیتے ہیں دری میں پوچھ دیتے ہیں ہاتھ نہیں دھوتے یا دھوتے ہیں تو کرتے یا شیروانی کے دامن میں ہاتھ پوچھ لیتے ہیں استاد سب کو جمع کر کے صاف رہنے کے متعلق بتلاتا ہے، رفتہ رفتہ اس کی عادت پیدا کراتا ہے طلبا اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، صاف رہنا سیکھتے ہیں۔

(۷) لئی پکانے کے لئے ابتدائی پنجم کے طلبا انگیٹھی میں کوئلہ جلانا چاہتے ہیں۔ کوئلہ، کاغذ اور ماچس منگائی جاتی ہے۔ استاد لئی پکانے کے دوران میں ماچس کے متعلق تھوڑی سی واقفیت دیتا ہے۔ لئی پکنے کے بعد کمرہ جماعت میں ماچس پر ایک سبق ان کی کتاب سے پڑھاتا ہے۔ سبق کا مطالعہ پوری دلچسپی سے ہوتا ہے۔ اسی موقع پر پہلی جماعت کا ایک استاد لئی پکنے کے دوران میں بچوں کو بتلاتا ہے کہ بہت پہلے جب ماچس وغیرہ کا رواج نہیں ہوا تھا لوگ آگ کس طرح جلاتے تھے اور اس طرح بچوں کو ابتدائی انسان کی کہانی سناتا ہے۔ جستہ جستہ تصویروں سے مدد لیتا ہے۔

(۸) ابتدائی اول اور دوم کے بچے لئی اور پانی کی ابری بناتے ہیں۔ یہ دو طرح کی ابریاں ہیں ایک لئی اور رنگ سے بنائی جاتی ہے، دوسری پانی پر۔ روغنی رنگ چھڑک کر۔ اور فروخت کرتے ہیں۔ ایک پیسہ کا ایک فل اسکیپ تختہ فروخت کرتے ہیں۔ وہ روزانہ گننا، پیسوں سے آنے بنانا اور آنوں سے روپے بنانا سیکھتے ہیں

اور اس کی مشق کرتے ہیں۔ روزانہ اپنی آمدنی کا حساب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ بامقصد طریقہ پر اس کی مشق کرتے ہیں کیونکہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔

(۹) آج کل ٹیوب کے رنگ سے ابری نہیں بنوائی جاتی۔ بچے مصر ہیں کہ ٹیوب کے رنگوں سے ابری بنائی جائے اس لئے کہ ٹیوب کے رنگ سے بچے بہت اچھی ابری بنا چکے ہیں۔ استاد بچوں کو بتلاتا ہے کہ یہ رنگ جرمنی اور انگلستان سے آتے تھے۔ پہلے ایک ٹیوب ۲ء رکا ملتا تھا اب اول تو ملتا ہی نہیں اور اگر ملتا ہے تو بہت پرانا جس سے ابری اچھی نہیں بنتی اور ایک ٹیوب ۴ء رکا ملتا ہے استاد نقشہ کا استعمال کرتا ہے اور یورپ کے نقشہ پر جرمنی اور انگلستان دکھلاتا ہے اور بتلاتا ہے کہ مال کس راستہ سے ہندوستان آتا تھا۔ ابتدائی ششم میں اس موقعہ پر موجودہ جنگ کی وجوہات پر ایک مختصر معلومات دی جاتی ہے۔

میں نے چند بامقصد مواقع کا تذکرہ کیا ہے جہاں تعلیم موثر طریقے پر ہوئی ہے۔ اس پر اور اضافہ کیا جا سکتا ہے اور جماعت میں طلبا کے کام کا ریکارڈ رکھنے سے اس سے اچھے مواقع کی یادداشت ترتیب دی جا سکتی ہے۔ بغیر یادداشت کے اچھے سے اچھے مواقع نظرانداز ہو سکتے ہیں اس لئے موثر تعلیم کے نتائج کا اندازہ کرنے کے لئے یادداشتوں کا ہونا ضروری ہے جو بہت باضابطہ طریقہ پر رکھی جائیں۔

سید احمد علی صاحب

بھید

(ترجمہ "کینڈڈا" مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوسرا ایکٹ

(اسی دن شام کو — وہی کمرہ مہمانوں کی کرسی میز پر دوبارہ رکھدی گئی ہے۔ مارچ بینکس تنہا بیٹھا ہوا ہے وقت کاٹنے کے لئے وہ ٹائپ رائٹر چھونے لگتا ہے اور جاننا چاہتا ہے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے۔ دروازہ پر کسی کی آہٹ سنتا ہے اور چپکے سے کھڑکی کے پاس کھسک جاتا ہے اور کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے کچھ کرہی نہیں رہا تھا مس گارنٹ ہاتھ میں ایک نوٹ بک لئے ہوئے (جس میں وہ ماریل کے ارشادات شارٹ ہینڈ میں لکھا کرتی ہے) اندر داخل ہوتی ہے اور آکر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے تاکہ کچھ عبارت ٹائپ کرے۔ کام شروع کردیتی ہے اور اس قدر مشغول ہوتی ہے کہ یوجین کا خیال بھی نہیں کرتی لیکن جب دوسری سطر ٹائپ کرتی ہے تو ایکدم رک جاتی ہے اور مشین دیکھنے لگتی ہے۔ کچھ گڑبڑ ہے)

پ۔ اچھا مارچ بینکس تم نے میرے ٹائپ رائٹر کو خراب کردیا ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس طرح اس طرف دیکھ رہے ہو جیسے تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہی نہیں۔

ی م۔ (دب کر) مجھے بہت افسوس ہے مس گارنٹ! میں صرف اس سے ٹائپ کرنے کی کوشش کر رہا تھا (شکایت کرتے ہوئے) لیکن ٹائپ ہی نہیں ہوا۔

پ۔ تم نے اس کی روشنائی والے پرزے کو بدلا ہوگا۔

ی م۔ (یقین دلاتے ہوئے) ۔ نہیں میں سچ کہتا ہوں کہ میں نے بالکل نہیں بدلا۔ میں نے صرف ایک چھوٹا

پینہ گھمایا تھا۔ وہ ٹائپ سا ہوا

پ۔ اچھا اب میں سمجھ گئی (وہ فیصلہ ٹھیک کر دیتی ہے اور باتیں بھی کرتی جاتی ہے) میرے خیال میں تم اسے آسان قسم کی مشین کا باجا سمجھے کہ ذرا ہینڈل گھمایا اور اس نے ایک عشقیہ خط تمہارے لئے لکھ دیا۔ کیوں نا؟

ی م۔ (سنجیدگی سے) میرے خیال میں اس مشین سے بھی عشقیہ خطوط لکھے جا سکتے ہیں۔ مشین مشین سب برابر ہیں کیوں نا؟

پ۔ (کچھ ناگوار خاطر ہو کر گویا اس قسم کی باتیں اگر تفریحاً ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں ورنہ اس قسم کی باتیں کرنا اس کے دستور العمل کے خلاف ہے) مجھے کیا معلوم۔ تم مجھ سے آخر یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟

ی م۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ہر سمجھدار آدمی خصوصاً وہ لوگ جو دن بھر کاروبار میں لگے رہتے ہیں یا محرری قسم کا پیشہ کرتے ہیں ضرور مشغلہ محبت رکھتے ہوں گے تاکہ ان کا دماغ خراب نہ ہو جائے۔

پ۔ (غصہ سے کھڑے ہو کر) مسٹر ہارچ بینکس! (وہ اس کی طرف نہایت سختی سے دیکھتی ہے اور نہایت شان کے ساتھ بک کیس کی طرف چلی جاتی ہے)

ی م (اس کے پاس نہایت عاجزی سے جاتے ہوئے) مجھے امید ہے کہ آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ شاید مجھے نہ چاہئیے تھا کہ آپ کے معاملات دل کی طرف اشارہ کرتا۔

پ۔ (الماری میں ایک نیلی کتاب رکھتے ہوئے اور اس کی طرف نہایت تیزی سے مخاطب ہوتے ہوئے) میرے کوئی دلی معاملات نہیں ہیں۔ تم آخر اس قسم کی مجھ سے باتیں کرنے کی جرأت کیسے کر رہے ہو؟ (کتاب کو اپنی بغل میں دبا لیتی ہے اور مشین کی طرف اکڑتی ہوئی جا رہی ہے، یوجین کے دل میں درد سا پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ نہایت ہمدردانہ طریقہ پر مخاطب ہوتا ہے)

ی م۔ اچھا تو میں سمجھ گیا۔ تم کو بھی میری طرح لب حیا دامنگیر ہے۔ جھینپ معلوم ہوتی ہے

پ۔ ہرگز نہیں، میں قطعی شرم نہیں کرتی اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟

ی م۔ (چپکے سے رازدارانہ طور پر) تم محبت کرتی ہو اور یہی تو وجہ ہے کہ دنیا میں اس قدر کم معاملات دل ہوتے ہیں ہم سب محبت کے بھوکے ادھر ادھر گھوما کرتے ہیں۔ محبت ہماری فطرت کی اولین ضرورت ہے ہمارے

دلوں کی اولین خواہش لیکن ہم اپنا شوق اپنی زبان سے کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ ہم سب کو حیا دامنگیر رہتی ہے (بڑے خلوص سے) مس گارنٹ بھلا تم ہی بتاؤ کہ اس خواہ مخواہ کی جھجک، اس ڈر، اس شرم سے نجات پانے کے لئے کیا کیا دل نہ چاہتا ہوگا۔

پ۔ (اپنی ہتک محسوس کرتے ہوئے) ایں سچ کہتی ہے!

ی م۔ (ملامت کرتے ہوئے) اونہہ! یہ خواہ مخواہ کی باتیں میرے سامنے رہنے دو، یہ سب تصنع بناوٹ ہوتی ہے میں ان سے مرعوب نہیں ہوتا آخر ان باتوں سے فائدہ ہی کیا تم اپنی اصلی شخصیت مجھ پر ظاہر کرنے سے کیوں ڈرتی ہو؟ میں بھی بالکل تمہاری طرح ہوں۔

پ۔ میری طرح! یہ آخر بات کیا ہے؟ یہ تم مجھے خوش کر رہے ہو یا اپنے کو میری سمجھ میں نہیں آتا کس کو؟ (وہ پھر ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہونا چاہتی ہے)

ی م۔ (اسے چپکے سے روکتے ہوئے) ہش! میری سنو، میں ہر جگہ محبت کی تلاش میں گھومتا ہوں میں دیکھتا ہوں کہ دوسروں کے سینوں میں بھی یہی چیز طوفانی شدت سے موجزن ہے لیکن جب میں کسی سے اس کی درخواست کرنا چاہتا ہوں تو یہی شرم، یہی حیا میرا گلا پکڑ لیتی ہے، اور میں گونگا کھڑا رہ جاتا ہوں بلکہ گونگے سے بھی بدتر بے معنی باتیں اور احمقانہ جھوٹ کہنے لگتا ہوں اور پھر طرّہ یہ کہ میں دیکھتا ہوں وہی محبت جس کے لئے میں بیتاب تھا، جس کا میں بھکاری تھا کتے بلیوں اور ریزہ دوں کو دی جاتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ وہ آتے ہیں اور اس کے طالب ہوتے ہیں، مانگ سکتے ہیں اور مانگ لیتے ہیں (خاموشی سے سرگوشی کرتے ہوئے) محبت ہر جگہ طلب کرنا چاہئے۔ یہ بالکل ایک جن کی طرح ہے جبتک تم خود اس سے نہ بولو یہ نہیں بولتی لیکن (پھر اپنے اصلی لہجہ میں لیکن مایوسی کے ساتھ) دنیا میں محبت ہر جگہ اظہار کیلئے بے قرار و مضطرب رہتی ہے لیکن اظہار کی جرأت نہیں کرتی اس لئے کہ وہی شرم دامنگیر ہو جاتی ہے، حیا مانع آتی ہے۔ بس یہی دنیا کا ایک المناک پہلو ہے (نہایت گہری سانس لیتا ہے اور ملاقاتیوں والی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا منھ اپنے ہاتھوں سے چھپا لیتا ہے)

پ۔ (نہایت متعجب ہو کر لیکن ہوش و حواس قائم رکھتے ہوئے اور اجنبی نوجوانوں کے سامنے اپنے عفت و عصمت کے احساس کی نمود کرتے ہوئے) لیکن خراب قسم کے لوگ تو اس شرم پر غالب آجاتے ہیں۔ کیوں؟

ی م۔ (جھٹ پٹ اٹھ بیٹھتے ہوئے اور نہایت شدت سے کہتے ہوئے) خراب لوگ وہ لوگ ہیں جن میں محبت کا جذبہ نہیں ہوتا اسی لئے ان کو شرم بھی نہیں ہوتی۔ ان کو محبت طلب کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہوتی اس لئے کہ ان کو اس کی ضرورت نہیں۔ اور اپنی محبت جتانے کی ان میں طاقت ہوتی ہے اس لئے کہ ان کے پاس ہوتی ہی نہیں (وہ اپنی جگہ پر مضمحل ہو جاتا ہے اور حسرت سے کہتا ہے) لیکن ہم۔ ہم لوگ جو محبت والے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہماری محبت دوسروں کی محبت سے ہم آہنگ ہو جاتے۔ ایک لفظ منہ سے نہیں نکال سکتے (نہایت بے کرار) سمجھیں آپ!

پ۔ اچھا سنو! اگر تم نے اس قسم کی باتیں مجھ سے کرنا بند نہ کیں تو میں کمرے کے باہر قطعی چلی جاؤں گی مسٹر مارچ بینکس! میں سچ مچ چلی جاؤں گی یہ باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔

(وہ پھر اپنے ٹائپ رائٹر پر چلی جاتی ہے۔ اپنی نیلی کتاب کھولتی ہے اور اس سے ایک صفحہ نقل کرنے کا ارادہ کرتی ہے)۔

ی م۔ (ناامیدی سے) ہاں سچی باتیں کبھی اچھی باتیں نہیں ہوتیں (وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کمرہ میں کھویا ہوا سا ٹہلنے لگتا ہے) مس گارنٹ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اور کیا باتیں کروں؟

پ۔ (بے رخی سے) ادھر اُدھر کی باتیں کرو۔ موسم کی باتیں کرو۔

ی م۔ فرض کرو اگر ایک بچہ قریب ہی بھوک کے مارے چلا رہا ہوتا تو کیا تم اس سے بس ادھر اُدھر کی باتیں کرو گی؟

پ۔ نہیں

ی م۔ بس اسی طرح میں ادھر اُدھر کی باتیں نہیں کر سکتا جب میرا دل اپنی بھوک کی وجہ سے تڑپ رہا ہے

پ۔ اچھا! تو پھر چپ رہو۔

ی م۔ ہاں بس یہی تو ہوتا ہی ہے۔ ہم سب اپنی اپنی زبانیں بند رکھتے ہیں کیا اس سے دل کی دھڑکن بھی خاموش ہو سکتی ہے؟ نہیں دل برابر رو دئیے جاتا ہے۔ ہے نا؟ ضرور اور قطعی یہی ہوتا ہوگا۔ اگر تمہارے پاس واقعی دل ہے۔

پ۔ (ایکدم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اپنا ہاتھ سینے پر رکھتے ہوئے) کوئی فائدہ ہی نہیں کہ میں کام کرنے کی کوشش

کروں جبکہ تم اس قسم کی باتیں کئے چلے جا رہے ہو (میز سے اٹھ کر صوفے پر آ بیٹھتی ہے احساسات منتقل ہیں) تمہیں اس سے کیا مطلب کہ میرا دل رو تا ہے کہ نہیں، پھر بھی میرا ارادہ ہوتا ہے کہ تم کو بتا دوں۔

ی م۔ نہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی سے جانتا ہوں

پ۔ لیکن دیکھو، اگر تم نے ذرا بھی کہیں زبان کھولی تو میں فوراً انکار کر دوں گی۔

ی م۔ (ہمدردی سے) ہاں، یہ بھی جانتا ہوں۔ اچھا تو تمہاری ہمت نہیں پڑتی کہ اس سے کہہ سکتیں!

پ۔ (اچھل پڑتے ہوئے) اُس سے! کس سے؟

ی م۔ وہ جو کوئی ہو۔ میرا مطلب یہ کہ وہ شخص جس سے تم محبت کرتی ہو۔ وہ کوئی ہو۔ مسٹر ل شاید۔

پ۔ (حقارت سے) مسٹر ل!!! خوب وہ بڑا اچھا آدمی ہی ہے کہ جس پر اپنا دل کھو بیٹھوں ؟ اس سے زیادہ تو میں تمہیں پسند کر سکتی ہوں۔

ی م۔ (جھجک پڑتے ہوئے) نہیں، نہیں میں نہیں۔ مجھے بہت افسوس ہے لیکن تمہیں اس کا کچھ خیال نہ کرنا چاہئے میں۔

پ۔ (زچ ہو کر آتشدان کے پاس جا کھڑی ہوتی ہے، اس کی طرف پیٹھ کر کے) تمہارے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ شخص تم نہیں ہو بلکہ دراصل کوئی خاص شخص نہیں ہے۔

ی م۔ میں جانتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں تم اس سے محبت کرو گی جو تم سے اظہار ـــــ

پ۔ (مڑتے ہوئے نہایت خفگی سے) مجھ سے اظہار ـــ نہیں ہرگز نہیں ـــ تم نے مجھے آخر سمجھا کیا ہے ؟

ی م۔ (ناامید ہو کر) اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ تم سچ سچ جواب کبھی نہ دو گی۔ وہی جھوٹی باتیں کرتی ہو جو ہر شخص کہنے لگتا ہے (وہ صوفے کی طرف جاتا ہے اور انتہائی ناامید ہو کر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (چڑ کر گویا وہ اسے غریب طبعہ کا سمجھ کر باتیں کرنا نہیں چاہتا) اگر تم ہمیشہ نئی اور نرالی باتیں چاہتے ہو تو بہتر یہ ہے کہ تم خود اپنے سے تنہائی میں جا کر باتیں کر لیا کرو۔

ی م۔ ہاں، یہی تو پھر کرنا ہوتا ہی ہے۔ ہر شاعر یہی کرتا ہے۔ وہ اپنے سے بلند آواز میں باتیں کیا کرتے ہیں اور دنیا ان کی باتیں سن لیتی ہے پھر بھی یہ سخت تنہائی کی باتیں ہیں۔ اس لئے کبھی کبھی دوسروں کی باتیں سننے کو بھی جی چاہتا ہے۔

پ۔ اچھا رکو! مسز مارلی آتے ہوں گے۔ وہ تم سے باتیں کریں گے [illegible]
اور سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تم سے بہتر باتیں کر سکتے ہیں (بیزار ہو کر) باتیں کرتے کرتے تمہارا بھیجا۔
دماغ درست کر دیں گے (لانتا لکھ کر وہ غصہ سے اپنی جگہ جانے کے لئے مڑتی ہے لیکن یوجین ایکدم چونک پڑتا ہے
بشاش ہو جاتا ہے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو روک لیتا ہے

ی م۔ خاہ! اب میں سمجھا!!

پ۔ (سراسیمہ ہوتے ہوئے) کیا سمجھے؟

ی م۔ تمہارا راز کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ سچ بتانا کیا واقعی او حقیقتاً یہ ممکن ہے ایک عورت کے لئے کہ اس
سے محبت کر سکے؟

پ۔ (گویا اب بات حد سے گذر گئی) خوب!

ی م۔ (جوش سے) نہیں نہیں، سچ مجھے بتلاؤ تو ذرا۔ میں جاننا چاہتا ہوں میں قطعی جاننا چاہتا ہوں میری سمجھ میں
یہ بات بالکل آتی ہی نہیں سمجھے تو اس میں کچھ نظر نہیں آتا سوائے الفاظ کے متبرک خیالوں کے، اور وہ
بات جسے لوگ الوہیت سے تعبیر کرتے ہیں لیکن تم ان باتوں سے تو محبت کر نہیں سکتیں؟

پ۔ (تجاہل عارفانہ سے اس کی بات کو ٹالنے کی کوشش کر [illegible]
ہو۔ آخر تمہارا مطلب کیا ہے؟

ی م۔ (رو دے سے) تم جھوٹ بول رہی ہو۔ تم قطعی میری بات سمجھ رہی ہو۔

پ۔ اچھا!

ی م۔ تم قطعی سمجھ رہی ہو اور قطعی میرا مطلب تمہاری سمجھ میں آ رہا ہے (جواب لینے پر بضد ہوتے ہوئے) کیا واقعی یہ
یہ ممکن ہے کہ ایک عورت اس سے محبت کرے؟

پ۔ (اس کی طرف آنکھیں چار کر کے) ہاں! (وہ اپنے منہ کو اپنے ہاتھوں سے بند کر لیتا ہے) ہائیں یہ تمہیں کیا ہو گیا؟
(وہ اپنے ہاتھوں کو ہٹا لیتا ہے پراز۔ پائن اس کی اس حالت کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور جتنا دور ہو سکتا ہے ہٹ
جاتی ہے لیکن اس کی طرف برابر دیکھے جاتی ہے یوجین اس کی طرف سے نگاہ ہٹا کر اٹھتا ہے اور بچوں والی

کرسی پر جا بیٹھتا ہے نہایت ہی نا امیدی کے ساتھ وہ باہر چلی جانا چاہتی ہے لیکن جیسے دروازے کے پاس پہونچتی ہے دروازہ کھلتا ہے اور برگیس اندر داخل ہوتا ہے اور وہ ایک دم بول اٹھتی ہے) خدا کا شکر ہے۔ آخر کوئی آ تو گیا (اسے گونہ اطمینان ہو جاتا ہے اور سیدھی اپنی جگہ آ بیٹھتی ہے ٹائپ رائٹر میں ایک نیا کاغذ لگا دیتی ہے برگیس یوجین کے پاس چلا جاتا ہے)

ب۔ (معذرت آمیز ملاقاتی کی سی بے تکلفی ظاہر کرتے ہوئے) خوب! تو گیا اسی طرح آپ تنہا چھوڑ دیئے جاتے ہیں! مسٹر مارچ بینکس میں آپ سے باتیں کرنے کے لئے آگیا ہوں (یوجین اس کی طرف وحشت سے دیکھتا ہے لیکن وہ اسے نہیں سمجھتا ہے [illegible] سے کمرے میں کسی دفعہ سے باتیں کر رہا ہے اور کینڈی اور کسی لڑکی کو کشیدہ کاری [illegible] دینے ہمدردی جتاتے ہوئے) یہاں آپ کی اکیلے اکیلے طبیعت گھبرا گئی ہوگی کہ سوائے ٹائپسٹ کے اور کوئی باتیں کرنے والا نہ تھا (وہ آرام کرسی کو اپنی طرف گھسیٹتا ہے اور اس پر بیٹھ جاتا ہے)

پ۔ (نہایت ہی برافروختہ ہو کر) انھیں اب اطمینان ہو جائیگا کیونکہ اب انھیں آنجناب سے شریفانہ گفتگو کرنیکا شرف حاصل ہو گیا ہے یہ بھی کیا کم ہے (اتنا کہکر وہ زور شور سے ٹائپ کرنے لگتی ہے)

ب۔ (اس کی جرات پر متعجب ہو کر) جوان عورت میں تجھ سے باتیں نہیں کر رہا تھا میرا جہاں تک خیال ہے۔

پ۔ مسٹر مارچ بینکس آپ نے اس قسم کا بھی خراب اخلاق کہیں دیکھا ہے؟

ب۔ (شاندار سنجیدگی سے) یوجین ایک شریف آدمی ہے اور اپنی پوزیشن سے بخوبی واقف ہے اور یہ وہ خوبی ہے جو لوگوں میں کم ہوتی ہے۔

پ۔ (جھلا کر) اچھا تو گویا نہ تم شریف آدمی ہو اور نہ میں شریف عورت اگر یوجین یہاں نہ ہوتے تو میں تم سے ذرا صاف گفتگو کرتی (وہ اپنی مشین سے ٹائپ کیا ہوا خط اتنے زور سے نکالتی ہے کہ پھٹ جاتا ہے) دیکھا، یہ خط آخر تمہاری وجہ سے خراب ہو گیا اب مجھے دوبارہ پھر اسے ٹائپ کرنا پڑے گا۔ لاحول ولا قوۃ، میں اپنے کو ضبط نہیں کر پا رہی ہوں۔ کھوسٹ، احمق، گدھا۔

ب۔ (اٹھ کھڑے ہو کر غصہ سے ہانپتے ہوئے) خوب! میں کھوسٹ احمق اور گدھا ہوں خوب، خوب (بہت گہری سانسیں لیتے ہوئے) اچھی بات چھوکری، بہت اچھی بات ہے۔ ذرا رک جاؤ تمہارا مالک آلے پھر میں تمہیں بتلا دونگا

پھر دیکھنا، پھر تبلاؤں گا۔

پ۔ (محسوس کرکے کہ وہ تھی وہ کچھ زیادہ کہہ گئی) میں ــــ

ب۔ (اس کا کلام قطع کرتے ہوئے) نہیں، بس اب جو کچھ تمہیں کہنا تھا کہہ چکیں۔ بس اب تمہیں مجھ سے بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں تبلا دوں گا کہ میں کون ہوں (پ ٹائپ رائٹر میں دوسرا کاغذ چڑھاتی ہے اور حقارت سے کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنا کام شروع کر دیتی ہے) مسٹر یوجین آپ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوجیے گا۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں (نہایت شان سے پھر بیٹھ جاتا ہے)

ی م۔ (بہت پریشان ہوکر اور سہم کر) میرے خیال میں بہتر یہ ہے کہ ہم اپنا موضوع کلام بدل دیں میرا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مس گارنٹ کا مطلب آپ کی طرف ایسا نہ تھا۔

پ۔ (قطعی یقین کے ساتھ) میں نے وہی کہا جو میرا مطلب تھا۔

ب۔ ایسی عورتوں کی باتیں سننا میری شان کے خلاف ہے۔

(ایک برقی گھنٹی دو دفعہ بجتی ہے)

پ۔ (اپنے کاغذات و نوٹ بک اکٹھا کرتے ہوئے) یہ میرے لئے ہے (وہ جلدی سے باہر چلی جاتی ہے)

ب۔ (اس کی طرف منہ کرکے کہتے ہوئے) خیر جاؤ! ہم لوگ تم کو جانے کی اجازت دئے دے رہے ہیں (اس بات سے مسرور ہوکر کہ آخری جملہ انہیں کا رہا اور پھر ذرا اور اثر جانے کے لئے آپ پ کی طرف برابر دیکھتے رہتے ہیں۔ جب وہ بالکل اوجھل ہو جاتی ہے تب اپنی جگہ پر یوجین کے قریب بیٹھ جاتے ہیں۔ اور اس سے رازدارانہ لہجوں میں بات چیت کرنے لگتے ہیں) مسٹر یوجین اب ہم اس وقت بالکل تنہا ہیں میں ایک بات آپ سے دوستانہ مشورہ کے طور پر کہتا ہوں جو اور کسی سے نہ کہتا۔ اچھا پہلے یہ بتائیے آپ سے اور میرے داماد جیمس سے کتنے عرصہ سے ملاقات ہے؟

ی م۔ مجھے یاد نہیں۔ تاریخیں مجھے یاد ہی نہیں رہتیں، جہاں تک میرا خیال ہے یہی ایک دو ایک مہینے ہوئے ہونگے

ب۔ آپ کو اس میں کوئی عجیب بات نظر آئی؟

ی م۔ نہیں مجھے تو نہیں نظر آئی۔

ب۔ مؤثر طور پر) اور نہ آپ کو نظر آئے گی اور یہی شکل ہے۔ خیر تو سنیئے جیمس پاگل ہے۔

ی م۔ پاگل!

ب۔ بالکل پاگل! ایسا پاگل جیسا مارچ میں خرگوش پاگل ہو جاتا ہے۔ ذرا آپ غور کیجئے گا آپ کو فوراً پتہ چل جائے گا۔

ی م۔ (بے دلی سے) لیکن غالباً اس کے خیالات کی وجہ سے وہ ایسا ــ

ب۔ [illegible] تاکہ وہ اس کی طرف متوجہ رہے) بس بس امسٹر مارچ بینکس انہیں خیالات سے میرا مطلب تھا۔ اور میری بات یاد رکھیئے گا کہ خیالات جب تک محض خیالات رہیں اس وقت تک تو کوئی حرج نہیں لیکن جب اُن پر لوگ عمل کرنے لگیں تو معاملات بہت اہم ہو جاتے ہیں لیکن ان باتوں کو بلا درمیان میں لانے کا ارادہ میرا نہ تھا (ادھر ادھر دیکھتے ہوئے تاکہ یقین ہو جائے کوئی اور تو نہیں ہے پھر اس کے بعد یوجین کے کان کی طرف جھکتا ہے) آپ کو معلوم ہے اس نے آج سویرے مجھ سے کیا کہا؟

ی م۔ کیا!

ب۔ کہنے لگا اور یقین مانیئے کہ میں اتنا ہی سچ کہہ رہا ہوں جیسے یہ بات کہ میں اور آپ یہاں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے کہنے لگا کہ "میں ایک بیوقوف آدمی ہوں اور تم ایک بدمعاش"؛ میں اور ایک بدمعاش ذرا دیکھئے تو اور پھر مجھ سے اس بات پر ہاتھ ملایا گویا اس میں میری تعریف زیادہ ہے کیا آپ ان باتوں کو ہوش وحواس کی باتیں کہہ سکتے ہیں؟

م۔ (باہر پ کو پکارتے ہوئے اور دروازہ کھولتے ہوئے) اُن سب کے نام اور پتے لکھ لینا مس گارنٹ!

پ۔ (دور سے) بہت خوب مسٹر مارل!

(مارل اندر آجاتا ہے۔ وفد کے کاغذات ہاتھ میں ہیں)

ب۔ (یوجین سے الگ) دیکھو وہ آگیا ہے ذرا نگاہ رکھئے گا اور اس بات کا خیال رکھئے گا (ایکدم اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) جیمس! مجھے افسوس ہے کہ مجھے تم سے ایک شکایت کرنی پڑ رہی ہے۔ حالانکہ میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے کرنا چاہئے بطور ایک فرض کے۔

م۔ خیریت کیا بات ہے؟

ب۔ مسٹر ی م اس کی شہادت بھی دے سکتے ہیں۔ نہایت سنجیدگی سے) تمہاری وہ جوان سی چھوکری اپنے آپ کو اتنا بھول گئی کہ مجھے ایک کھوسٹ، احمق اور گدھا کہنے لگی۔

م۔ (نہایت شدید مسرت سے) اچھا! خوب یہ پرازی نے کہا ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرا زیادہ صاف گو اور بیباک ہے۔ وہ کسی بات کو دل میں روک ہی نہیں سکتی۔ بیچاری! ہا ہا۔

ب۔ (غصہ سے کانپتے ہوئے) اور کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ میں اس قسم کے لوگوں کی باتوں کو برداشت کروں گا۔

م۔ اونھ! لاحول ولا قوۃ! تم اس کا بالکل کچھ خیال ہی نہ کرو۔ بالکل سنو ہی نہیں (وہ میز کی طرف چلا جاتا ہے اور کاغذات کو درازوں میں رکھ دیتا ہے)

ب۔ ہاں میں نے خیال تو واقعی نہیں کیا۔ میں ان معمولی باتوں سے بہت بلند ہوں لیکن یہ اس کی کچھ ٹھیک حرکت نہیں ہے۔ تم ہی بتلاؤ کہ بھلا یہ بھی کونسی حرکت ہے کہاں تک درست ہے؟

م۔ درستی اور نادرستی کا سوال تو خیر پادریوں کے لئے ہے عوام کے لیے نہیں لیکن کیا اس بات سے تمہیں تکلیف پہونچی ہے؟ میرا تو خیال نہیں ہے کہ تمہیں کوئی اذیت پہونچی ہوگی۔ اس لئے اب اس کا خیال ہی چھوڑ دو (وہ اس مضمون کو بس یہیں پر ختم کر دیتا ہے اور اپنے لکھنے پڑھنے میں معروف ہو جاتا ہے)

ب۔ (ی م ت الگ) میں نے آپ سے کہا نہ تھا: بالکل اور قطعی پاگل (وہ میز کے پاس جاتا ہے اور بھوکے آدمیوں کی طرح ایک طرح کے گرسنہ لہجہ میں پوچھتا ہے) کھانے میں کتنی دیر ہے جمیس؟

م۔ ابھی دو گھنٹہ تک تو تیار ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔

ب۔ (صبر کے لہجہ میں) اچھا تو پھر مجھے جب تک کوئی اچھی سی کتاب دیدو۔ میں وہاں آتشدان کے قریب پڑھوں گا۔ ساتھی بھی عمدہ ہے۔

م۔ کس طرح کی کتاب چاہئے کوئی واقعی عمدہ کتاب؟

ب۔ (ایک دم شدت سے انکار کرکے اٹھتے ہوئے) ارے نہیں۔ بس یونہی کوئی دلچسپ کتاب۔ بس وقت کاٹنے کے لئے (مارل میز پر سے ایک تصویردار اخبار اٹھاتا ہے اور اسے دیدیتا ہے وہ اسے بہت نیازمندی سے

قبول کر لیتا ہے۔ بشکریہ جیمس: (آتشدان کے قریب اپنی بڑی آرام کرسی پر چلا جاتا ہے اور وہاں نہایت اطمینان سے بیٹھ جاتا ہے اور پڑھنا شروع کر دیتا ہے)

م۔ (لکھتا بھی جا رہا ہے) آکینڈ، تم لوگوں سے باتیں کرنے کے لئے بس اب آتی ہی ہو گی پڑھانے سے تو اسے چھٹی مل گئی ہے لیکن وہ ابھی لیمپوں میں تیل بھر رہی ہے۔

ہی م۔ (نہایت ہی وحشت زدہ ہو کر چونک پڑتے ہوئے) لیکن اس سے تو اس کے ہاتھ میلے ہو جائیں گے ماریل: میں یہ برداشت نہیں کر سکتا یہ نہایت شرمناک بات ہے میں جاتا ہوں اور خود بھر دوں گا۔ (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

م۔ بہتر یہ ہے کہ تم نہ جاؤ (ہی م ایک دم رک جاتا ہے) کیونکہ تم سے بجائے اس کے وہ میرے بوٹ صاف کرانے لگے گی تاکہ میں اپنے صبح کے اس کام سے بچ جاؤں۔

ب۔ (بہت ناپسندیدگی سے) جیمس کیا اب تم نوکر نہیں رکھتے؟

م۔ ہاں ہے تو لیکن وہ غلام نہیں ہے پھر بھی گھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے پاس تین چار نوکر موجود ہوں یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص گھر کے کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ پراز ی اور میں ناشتہ کے بعد اپنے کام کی باتیں بھی کرتے جاتے ہیں اور کپڑے بھی دھوتے جاتے ہیں جب دو آدمی ہوتے ہیں تو کپڑے دھونے میں کوئی دقت معلوم نہیں ہوتی۔

ہی م۔ (بے چین ہو کر) تو اس سے کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ ہر عورت مس گارنٹ کی طرح گھٹیا ہو جائے۔

ب۔ (زور دے کر) ہاں بس، یہ ایک بات کہی مسٹر ہی م۔ گھٹیا بالکل مناسب لفظ ہے۔ گھٹیا وہ واقعی ہے۔

م۔ (خاموشی اور سنجیدگی سے) ملاح بینکس!

ہی م۔ کہیئے؟

م۔ تمہارے والد کے پاس کتنے نوکر ہیں؟

ہی م۔ (جھنجھلا کر) اونہہ مجھے نہیں معلوم (صوفے کی طرف بڑھ جاتا ہے گویا چاہتا ہے کہ ماریل کے سوالات سے جتنا دور ہو جائے اتنا اچھا ہے اور نہایت رنج و الم کی حالت میں جا کر بیٹھ جاتا ہے تیل ہی کا خیال رہ رہ کر آرہا ہے)

م۔ (بہت سنجیدگی سے) اس قدر کہ تمہیں معلوم نہیں (اور زیادہ بڑھاتے ہوئے) جب کوئی ایسا مکروہ کام کرنا ہوتا ہو تو تم بس گھنٹی بجا دیتے ہو اور وہ کام دوسرے کے سر ڈال دیتے ہو کیوں نا!

ای م۔ اوہو، بیکار مجھے پریشان نہ کرو، تم تو گھنٹی بھی نہیں بجاتے بلکہ تمہاری بیوی کی خوبصورت انگلیاں دیا سلائی میں پھنسی رہتی ہیں اور تم خود یہاں نہایت اطمینان سے کرسی پر بیٹھے ہوئے لکچر دیتے رہتے ہو۔ لکچر ہی لکچر۔ شیطان کی آنت لکچر۔ الفاظ، الفاظ، الفاظ!

ب۔ (اس جواب سے بے انتہا مسرور ہوتے ہوئے) اہا ہا یہ بات کہی، بہت عمدہ (خوشی سے چہکتے ہوئے) کہو جیمس! اب تم کیسے پھنسے!

(کینڈڈا اندر آجاتی ہے آگے پیش بند خوب صاف لگا ہوا ہے۔ پڑھنے والا لیمپ خوب صاف کیا ہوا ہر نئی کٹی ہوئی لیمپ تیل سے پر ہو میز پر مارل کے نزدیک وہ اسے رکھ دیتی ہے تاکہ اسے جلاسے)

ک (اپنی انگلیوں کی پوروں ناک صاف کرتے ہوئے) یوجین! اگر تم رکو تو میں تمہیں تمام لیمپ سپرد کر دوں

ای م۔ میں یہاں صرف اسی شرط سے رک سکتا ہوں کہ تمام بھدے کام تم میرے سپرد کر دو۔

ک۔ یہ بڑی ہمت کی بات ہے، شاباش! لیکن پہلے میں دیکھ تو لوں کہ تم کیسے کام کرتے ہو (مارل کی طرف رخ کرکے) جیمس! تم نے گھر کا انتظام میری غیر موجودگی میں کچھ اچھا نہیں رکھا۔

م۔ کیوں، ڈیر کیا میں نے نہیں کیا، کیا بات نہیں ہوئی!

ک۔ (بیچ بچ کی پریشانی سے) میرے ذاتی پسندیدہ برش سے جوتے صاف کرنے کا کام لیا گیا ہے۔ (ای م کے منھ سے ایک سخت آہ نکلتی ہے۔ کینڈڈا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے کہ صوفے کی طرف دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے، کیا تمہاری طبیعت اس وقت ناساز ہے۔ کیا تم کچھ علیل ہو!

ای م۔ نہیں، کچھ بیمار نہیں صرف دہشت، وحشت، دہشت (وہ اپنا سر اپنے ہاتھوں پر رکھ لیتا ہے)

ب۔ (مضطرب ہوکر) کیا کوئی دورہ ہوا! مسٹر ای م۔ یہ بہت برا ہے آپ کی سی عمر پر اکسی طرح اس سے ضرور نجات حاصل کیجئے۔

ک۔ (اطمینان دلانے کے لئے) اونہ پاپا! آپ کی بھی کیا باتیں ہیں، یہ محض شاعرانہ دورہ ہے کیوں نا یوجین!

(اسے سہلاتے ہوئے)

ب۔ (شرمندہ ہو کر) آئیں! شاعرانہ دورہ! اچھا! میں معافی چاہتا ہوں مسٹر یوجین (اپنے منہ پر آتشدان کی طرف کر لیتا ہے اور اپنی جلد بازی پر متاسف ہے)

ک۔ کیا بات ہوئی یوجین! میرا برش! (وہ کانپ جاتا ہے) او نہ تو اس میں کیا بات ہے (اس کے قریب بیٹھ جاتی ہے) کیا تم اسے پسند نہ کرو گے کہ تم ایک نہایت اچھا سا برش بہت خوبصورت ہیئر کر جس کی پشت ہاتھی دانت کی ہو اور جس میں سیپ جڑی ہو۔

ی م۔ (آہستگی اور ترنم سے لیکن افسوسناک لہجہ میں) نہیں برش نہیں بلکہ ایک کشتی۔ ایک چھوٹی سی کشتی جس میں ہم تم دونوں بیٹھ کر اس دنیا سے الگ کوسوں دور چلے جائیں۔ ایک ایسی جگہ جہاں شفاف سنگ مرمر کی چٹانیں ہوں جن کو باران رحمت سے غسل دیا جاتا ہو اور جنھیں نیر درخشاں سکھاتا ہو۔ جہاں کے مخملیں سبزہ زاروں کی صفائی نسیم سحری کرتی ہو۔ یا پھر ایک ایسا تخت رواں ہو جس پر ہم تم دونوں بیٹھ کر آسمان کی طرف اُڑ جائیں جہاں کے ستارے ہمارے لیمپ ہوں گے اور جن کو روزانہ مٹی کے تیل سے بھرنے کی ضرورت نہ ہوگی

م۔ (ترشی سے) اور جہاں کچھ کرنا نہ ہوگا سوائے اس کے کہ کاہل، خود غرض اور بیکار بنے بیٹھے رہو۔

ک۔ او نہ جیمس! تم نے اس کی شاعری کو کیوں تباہ کر دیا۔

ی م۔ (آتش بجاں) ہاں، کاہل خود غرض اور بیکار! یعنی خوبصورت آزاد اور خوش! کیا یہ شخص یہ بھی اپنے دل و جان سے نہیں چاہتا اُس عورت کے ساتھ جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ میری معراجِ تخیل تو یہی ہے تمہاری کیا ہے؟ اور تمہارے جیسے ان تمام لوگوں کی جو ان بھدے بدصورت مکانوں کی قطاروں میں رہتے ہیں؟ لکچر، وعظ اور برش! تمہارا معراج تخیل تو بس یہی ہے کہ تم وعظ دیا کرو اور تمہاری بیوی جھاڑو دیا کرے!

ک۔ (متانت سے) یوجین! وہ بھی اپنے جوتے خود صاف کرتا ہے اور اس الزام کے بدلے کل تم کو انھیں صاف کرنا پڑے گا۔

ی م۔ او نہ! جوتوں کی باتیں نہ کرو، تمہارے مرمریں پیر بہاڑوں پر بھی خوبصورت معلوم ہوں گے۔

ک۔ لیکن میرے پیر بیکنی روڈ پر بغیر جوتوں کے خوبصورت نہ معلوم ہوں گے۔

ب۔ (یوجین کے خلاف باتیں سن کر) ارے کینڈی یہ کیا خلاف تہذیب باتیں کر رہی ہو۔ مسٹر یوجین اس قسم کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں تم پھر انھیں پریشان کر رہی ہو مجھے ڈر ہے کہ پھر انھیں دہشت کا دورہ ہو جائے میرا مطلب ہے شاعرانہ دورہ!

(مارل خاموش ہے ظاہرا وہ اپنے خطوں میں مشغول ہے لیکن در اصل وہ اس ادھیڑبن میں ہے کہ اس کے مضبوط سے مضبوط اور پختہ سے پختہ جملے اس چھوکرے کے سامنے بیکار جا رہے ہیں چنانچہ ایسے شخص سے خوفزدہ ہونے کے خیال سے جس کو وہ اپنا چھوٹا سمجھتا تھا تکلیف ہونے لگتی ہے مس گارنٹ ایک تار لیکر اندر آتی ہے)

پ۔ (مارل کو تار حوالہ کرتے ہوئے) جوابی ہے۔ باہر ڈاکیہ جواب کے لئے کھڑا ہے (اپنی مشین پر جا کر بیٹھ جاتی ہے ک سے) مسز مارل! میری یا باورچی خانہ میں آپ کا انتظار کر رہی ہے (ک اٹھ کھڑی ہوتی ہے) پیاز آگئے ہیں

ی م۔ (لرزتے ہوئے) پیاز!

ک۔ ہاں پیاز! اور وہ بھی کچھ اچھے قسم کے ہسپانوی پیاز نہیں معمولی چھوٹے قسم کے امید ہے کہ تم ان کے چھیلنے میں مجھے مدد دوگے اچھا ادھر آؤ۔

(وہ اس کی کلائی پکڑتی ہے اور دوڑاتی ہوئی لے جاتی ہے۔ برگیس متوحش اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور آتشدان کے پاس مبہوت کھڑا رہ جاتا ہے۔ ان دونوں کی طرف تکتے ہوئے)

ب۔ کینڈی کو نہ چاہئے تھا کہ ایک نواب زادے کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرے یہ بہت زیادتی ہے۔ جیمس دیکھو تو کیا تم نے اس سے پیشتر اس طرح کی تعجب انگیز بات دیکھی ہے،

م۔ (تار لکھنے میں مصروف ہے) مجھے نہیں معلوم

ب۔ (دردمندی سے) اس کی باتیں بڑی پیاری ہیں مجھ کو شاعری تو ہمیشہ سے پسند رہی کینڈی بھی مجھ ہی کو پڑی ہے جب کوئی اتنی ہوگی (ہاتھ کو دو تین فٹ اونچا کرتے ہوئے) تو مجھ سے کہانیاں کہلوایا کرتی تھی۔

م۔ (مشغول) اچھا! خوب (تار پر جاذب لگاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے)

پ۔ لیکن کیا تم وہ کہانیاں خود اپنے دماغ سے سوچ کر نکالتے تھے ؟

(برگیس اسے جواب دینا حقیر بات سمجھتے ہوئے نہایت مجبرانہ حقارت کا رویہ اختیار کر لیتا ہے)

پ۔ (آہستگی سے) میرا خیال ہے تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ خیر برسبیل تذکرہ میں آپ کو ایک بات سے آگاہ کر دوں۔ آپ یوجین کی اس قدر پرستش کر رہے ہیں لیکن آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ پاگل ہے

ب۔ پاگل! کیا وہ بھی!!

پ۔ بالکل پاگل! بالکل مارچ کے مست خرگوش کی طرح۔ میں بتلاتی ہوں ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ تمہارے آنے سے قبل اس نے مجھے بے انتہا ڈرا دیا تھا۔ کیا تم نے ان تمام عجیب باتوں کا خیال نہیں کیا جو وہ بکتا رہتا ہے۔

ب۔ اچھا تو شاعرانہ دورے کا یہی مطلب ہے۔ دراصل یقین مانو کہ اکثر ایک دو دفعہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ کچھ پاگل سا ہے (وہ دروازہ تک ٹہلتا، سوچتا ہوا جاتا ہے۔ بہ آواز بلند) دراصل یہ اچھا سا پاگل خانہ ہے جہاں سوائے تمہارے کسی کی کوئی خبر لینے والا بھی نہیں ہے

پ۔ (جب وہ اس کے پاس سے گذرتا ہے) ہاں، اگر خدانخواستہ آپ پر کسی قسم کا حادثہ ہو گیا تو کس قدر باعث افسوس بات ہو گی۔

ب۔ (بڑے پن سے) خیر۔ مجھ پہ، میرے اوپر آپ کسی قسم کے جملے نہ کسیئے۔ ذرا میں باغیچہ میں سگار پینے جا رہا ہوں اپنے مالک سے کہدینا۔

پ۔ (چڑاتے ہوئے) آخاہ!

(لیکن قبل اس کے کہ برگیس کوئی جواب دے، ماریل واپس آجاتا ہے)

ب۔ (کمزور لہجہ میں) اجمیس۔ میں ذرا باغ میں سگار پینے جا رہا ہوں۔

م۔ (تیزی سے) ہاں، ہاں ضرور، (ایک تھکے ہوئے بڈھے کی طرح برگیس باہر چلا جاتا ہے۔ ماریل میز پر کھڑا ہوتا ہے اور اپنے اخبارات کو الٹتے پلٹتے پراز ریائن سے کچھ تفریح کے لہجہ میں اور کچھ یونہی مخاطب ہوتا ہے) مس پراز ری تم نے آخر میرے خسر کے نام کیوں لکھے ؟

پ۔ (چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ تیزی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ ڈر کچھ افسوس کا اظہار) میں! (رو پڑی)

م۔ (ہمدردانہ سمت سے اس کی طرف رخ کر کے میز پر جھکتے ہوئے اور تسکین دیتے ہوئے) ارے ہوگا، ہوگا جانے بھی دو، میں نے تو ایسے ہی کہا تھا۔ پر اسی؛ وہ واقعی گھوسٹ، گدھا تو ہے ہی کیوں نا!

(رونے کی ایک ہچکی آئی اور وہ دروازے کی طرف بھاگی، زور سے دروازہ بند کیا اور باہر غائب ہو گئی)
مارل نے اپنا سر ہلایا گویا افسوس کیا اور با دل ناخواستہ اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور کام کرنے لگا جیسے بہت تھکا ہوا ہو اور ذمہ داریوں میں گھرا ہوا ہو۔ کینڈڈا اندر آتی ہے۔ اس نے گھر کا سب کام کاج ختم کر دیا ہے۔ پیش بند اب اتر گیا ہے۔ مارل کی تھکی ہوئی حالت کو فوراً محسوس کرتی ہے اور نہایت خاموشی سے آکر بھالو والی کرسی کے نزدیک کھڑی ہو جاتی ہے اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگتی ہے منہ سے کچھ نہیں بولتی)

م۔ (اوپر نظر اٹھاتے ہوئے لیکن قلم اب بھی انگلیوں میں ہے گویا لکھنے کے لیے اب بھی تیار رہے) کیا ہے؟ پروجین کہاں ہے؟

ک۔ نل پر اپنے ہاتھ دھو رہا ہے وہ بڑا اچھا باورچی ہو سکتا ہے لیکن ابھی میریا سے ڈرتا ہے۔

م۔ (مختصراً) اچھا! ہاں، بیشک (پھر لکھنا شروع کر دیتا ہے)

ک۔ (اس کے قریب جاتے ہوئے اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر آہستہ سے رکھ کر اسے روکتے ہوئے) بس اب ادھر آؤ ڈیر! ذرا میں تمہیں دیکھوں تو (وہ اپنا قلم چھوڑ دیتا ہے اور خود کو اس کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ اسے اٹھاتی ہے اور میز سے کچھ اُدھر لے جاتی ہے۔ برابر تنقیدی نظر سے اس کی طرف دیکھے جاتی ہے) ذرا اپنا چہرہ روشنی کی طرف تو کرو۔ (وہ اسے کھڑکی کے رخ کھڑا کر دیتی ہے) اوہ! میرا پیارا آج کچھ ٹھیک نہیں۔ اس نے آج حد سے زیادہ کام کر لیا ہے۔

م۔ نہیں تو وہی حسب معمول روزانہ کے اتنا۔

ک۔ نہیں اس کا چہرہ آج زرد ہے۔ مرجھایا ہوا۔ تھکا ہوا۔ بوڑھوں کا سا۔ (مارل کی اداسی اور گہری ہو جاتی ہے اور وہ اپنے جملوں کو اور بھی تیز کر دیتی ہے) ادھر آنا (اس کو آرام کرسی کی طرف کھینچتے ہوئے) بس اب آج کا کام تم بہت کر چکے بس اب ختم کرو۔ بقیہ پراژی ختم کر دے گی اب ذرا مجھ سے باتیں کرو۔

م۔ لیکن ــــ

ک۔ نہیں (ضد کرتے ہوئے) میری طبیعت باتیں کرنے کو چاہتی ہے (وہ اسے بٹھلا دیتی ہے اور خود بھی قالین پر نیچے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی ہے) ہاں بس اب (اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے) تم اچھے لگنے لگے ہو۔ یہ آخر میں کہتی ہوں کہ تم ہر روز رات کو وعظ و لکچر دینے کیوں چلے جاتے ہو؟ مجھے مشکل سے ایک ہفتہ میں ایک شام مل پاتی ہے ہاں یہ صحیح ہے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ بالکل ٹھیک ہے اور بہت نیک کام لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا یعنی وہ لوگ جن سے تم یہ سب باتیں کرتے ہو ذرا بھی تو تمہاری باتوں کو خیال میں نہیں لاتے تمہاری بات وہ مان لیتے ہیں لیکن ان کے ماننے سے کیا فائدہ۔ جب وہ اس پر عمل ہی نہیں کرتے بلکہ ادھر تمہاری سنتے ہیں اور مان لیتے ہیں اور ادھر تھوڑی ہی دیر بعد جہاں تمہاری پیٹھ پھری بالکل اس کے خلاف کرنے لگتے ہیں۔ تم اپنے سینٹ ڈومینک ہی کے لوگوں کو دیکھو! آخر وہ مذہب کی باتیں کیوں ہر اتوار کو سننے آتے ہیں؟ محض اسی لئے کہ ہفتہ کے چھ دنوں میں وہ روپیہ اور کاروبار میں اس قدر منہمک رہتے ہیں کہ ہفتہ میں ایک دن چاہتے ہیں کہ یہ سب باتیں بھول جائیں اور ایک روز کم سے کم آرام کرلیں۔ تو بس سمجھے وہ اسی آرام کے لئے آتے ہیں تاکہ تر و تازہ ہو کر پھر اور دھڑلے سے روپیہ پیسہ پیدا کریں۔ گویا اس طرح روکنے کی بجائے تم انھیں اور سگ دنیا بناتے ہو۔

م۔ (پر زور سنجیدگی سے) کینڈا تم جانتی ہو کہ اکثر میں ان کو اس امر پر زور دار فہمائش بھی تو کر دیا کرتا ہوں لیکن اگر وہ محض تفریح ہی کے لئے آتے تو اور بھی جگہیں ان کے لئے کھلی تھیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ اور پر لطف! آخر کوئی بات تو ہوگی کہ وہ سینٹ ڈومینک ہی کو اتوار کے دن دوسروں پر ترجیح دیتے ہیں۔

ک۔ نہیں، خراب جگہیں اس دن کھلی نہیں ہوتیں اور اگر کھلی بھی ہوتیں تو بھی وہ نہیں چاہتے کہ انھیں کوئی ان مقامات پر دیکھے۔ اس کے علاوہ جیمس پیارے تم دعظ اس عمدہ طریقہ سے دیتے ہو کہ وہ ان کے لئے تفریح کا باعث ہوتا ہے جتنا کوئی کھیل تماشا۔ اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ عورتیں تمہارا وعظ سننے اس قدر جوق جوق کیوں آتی ہیں؟

م۔ (گھبرا کر) کینڈا!

ک۔ ہاں مجھے معلوم ہے، سیدھے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب تمہاری سوشلزم اور مذہب کی وجہ سے ہے! اگر ایسا ہوتا تو بجائے تمہیں بار بار دیکھنے آنے کے وہ اس پر عمل کرتیں جو تم ایک دفعہ کہدیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سب کو پراسی والی شکایت ہے۔

م۔ پراسی والی شکایت! کیا مطلب ہے تمہارا کینڈڈا؟

ک۔ ہاں، پراسی اور ان تمام سکریٹریوں کو جنھیں تم ملازم رکھ چکے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ پراسی اتنا سب کام ہم لوگوں کا کر دیتی ہے آخر کس لئے؟ آلو چھیلتی ہے۔ چیزیں صاف کرتی ہے اور تمام ادنیٰ کام کر دیتی ہے محض چھ شلنگ فی ہفتہ پر۔ حالانکہ شہر میں وہ اس سے زیادہ پاتی تھی جیسی قصہ اصل میں یہ ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا کام کر دیتی ہے۔ اسی طرح لکچر سننے والی تمام عورتیں تم سے محبت کرتی ہیں اور تم کو اپنے وعظ سے محبت ہے کیونکہ تم اسے نہایت خوبصورتی سے ادا کرتے ہو۔ میرے سیدھے سادے پیارے موریل تم سمجھتے ہو کہ یہ سب ان کا یہ اشتیاق تمہارے نظریہ ربانی یا دشاہت کی وجہ سے ہے ہاں وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے اسی میں یقین کرنے لگتی ہیں۔ سمجھے میرے نادان۔

م۔ کینڈڈا کیا خوفناک باتیں کر رہی ہو! کس قدر روح فرسا! مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟ یا یہ تو نہیں ہے کہ شاید تم کو حسد ہوتا ہو۔

ک۔ (عجیب طرح سوچتے ہوئے) ہاں مجھ کو واقعی بعض اوقات تھوڑا سا حسد ہوتا ہے۔

م۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) پراسی سے؟

ک۔ (ہنستے ہوئے) ارے نہیں، نہیں نہیں! اسی خاص شخص سے نہیں بلکہ کسی اور شخص کی طرف سے حسد ہوتا ہے جس سے کہ اتنی محبت نہیں کی جاتی جتنی کہ اس سے کی جانا چاہئے۔

م۔ میرے متعلق؟

ک۔ تمہارے متعلق: نہیں، تم تو بلکہ محبت اور پرستش سے خراب کر دئے گئے ہو۔ تمہیں تو محبت اتنی ملتی ہے جتنی تمہارے لئے مفید نہیں۔ میرا مطلب یوجین سے ہے۔

م۔ (چونک کر) یوجین!

ک۔ یہ ناانصافی معلوم ہوتی ہے کہ سب محبت صرف تمہاری طرف چلی جائے اور اسے کچھ نہ ملے۔ حالانکہ اسے تم سے زیادہ محبت کی ضرورت ہے (ماریل کے بدن میں باوجود ضبط کے بھی ایک کپکپاہٹ سی دوڑ جاتی ہے) کیا بات ہے؟ کیا میری باتوں سے تم کچھ پریشان ہو رہے ہو؛

م۔ (جلدی سے) نہیں بالکل نہیں۔ (اس کی طرف تکلیف دہ جوش سے دیکھتے ہوئے) تم جانتی ہو کہ مجھے تم پر بالکل اعتماد ہے کینڈڈا۔

ک۔ اللہ رے غرور! کیا تم کو اپنی کششوں پر اس قدر ناز ہے؛

م۔ کینڈڈا تم مجھ کو سخت تکلیف دے رہی ہو۔ میں نے اپنی کششوں کا کبھی خیال نہیں کیا۔ مجھے ہمیشہ تمہاری نیکی، محبت اور عفت و عصمت کا خیال البتہ رہا ہے اور اسی میں مجھے اعتماد رہا ہے اور رہتا ہے۔

ک۔ اونھ مجھ سے یہ کیا فضول کی باتیں کرتے ہو! تم بس پادری ہی ہو۔ پورے پادری۔

م۔ (اس کی طرف منھ پھیر کر دلی تکلیف سے) یہی یوجین بھی کہتا ہے۔

ک۔ (نہایت اشتیاق سے موریل کی طرف جھکتے ہوئے، اس کے گھٹنوں پر دونوں بازو رکھ کر) یوجین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے۔ وہ نہایت عجیب وغریب لڑکا ہے جتنے عرصہ میں باہر رہی میرا اشتیاق اس کی طرف بہت بڑھتا ہی گیا۔ تمہیں معلوم ہے جیمس، حالانکہ وہ خود نہیں جانتا لیکن وہ مجھ پر عاشق ہو جانے کے لئے بری طرح تیار ہے؛

م۔ (سنجیدگی سے) اچھا! لیکن اسے خود نہیں معلوم کیا واقعی؛

ک۔ بالکل نہیں! (وہ اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر سے ہٹا لیتی ہے اور انھیں اپنی گود میں رکھ کر کچھ سوچنے لگتی ہے) لیکن ایک زمانہ آئے گا کہ اسے معلوم ہو جائے گا یعنی جب وہ بڑا ہو جائے گا اور تمہاری طرح تجربہ کار ہوگا اور تب اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ضرور یہ جانتی ہوں گی۔ میں کہتی ہوں کہ تب وہ میرے متعلق کیا خیال کرے گا؛

م۔ کوئی خاص بات نہیں۔ وہ تمہیں برا ہرگز نہ خیال کرے گا۔

ک۔ (شک سے) یہ دوسری بات پر منحصر ہے۔

م۔ (گھبرا کر) کیا انحصار؟

ک۔ (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) ہاں، ہاں! اس بات کا انحصار تو اس بات پر ہوگا کہ اس پر کیا گذرتی ہے (وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگتا ہے) اس کا انحصار اس پر ہے کہ وہ اس بات کو کیسے جانتا ہے کہ دراصل عشق کیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اُس عورت پر منحصر ہے جو اُس کو عشق سکھائے؟

م۔ (بالکل نہ سمجھتے ہوئے) ہاں نہیں میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

ک۔ (سمجھاتے ہوئے) اگر اس نے عشق کسی اچھی عورت سے سیکھا تب تو ٹھیک ہے۔ پھر وہ مجھے معاف کر دے گا

م۔ معاف؟

ک۔ لیکن اگر فرض کرو کہ اس نے عشق کسی خراب قسم کی عورت سے سیکھا جس طرح عام طور پر لوگ کیا کرتے ہیں خصوصاً شاعر قسم کے لوگ جو ہر عورت کو فرشتہ سمجھتے ہیں۔ فرض کرو اگر محبت کی قدر اسے اُس وقت معلوم ہوئی جب وہ اسے برباد کر چکا ہو اور اپنی ناواقفیت کی بنا پر خود کو تباہ کر لیا ہو۔ تب بھی کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟ تمہارا کیا خیال ہے؟

م۔ معاف! ارے بھئی کس بات پر تمہیں معاف کر دے گا؟

ک۔ (محسوس کرتے ہوئے کہ وہ کس قدر بیوقوف ہے اور کچھ ناامید ہو کر پھر بھی نہایت ہمدردانہ لہجہ میں) ارے کیا تم نہیں سمجھے؟ (وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے۔ وہ اس کی طرف پھر مڑ جاتی ہے اور نہایت ہی محبت سے سمجھانے کی کوشش کرتی ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ کیا مجھے وہ اس بات پر معاف کر دے گا کہ میں نے خود اسے کیوں نہیں سکھایا اور اپنی نیکی، عفت و عصمت اور پاکی کی وجہ سے جیسا کہ تم کہتے ہو خراب قسم کی عورتوں پر اسے چھوڑ دیا جیسی تم میری اچھائی اور پاکدامنی کی باتیں کرتے ہو کس قدر ناسمجھی کی بات ہے۔ میں ان دونوں چیزوں کو بخوشی یوجین کو دیدیتی اگر کوئی بات مانع نہ ہوتی، بالکل اسی طرح جس طرح میں کسی غریب محتاج فقیر کو جو سردی سے مر رہا ہوتا اپنا دوشالہ دیدیتی جیسں تم اپنے لئے میری محبت پر یقین رکھو کیونکہ اگر یہ اعتبار تمہارا میری طرف سے جاتا رہا تو پھر ان خطبات اور وعظوں میں قطعی مجھے دلچسپی نہ رہے گی محض لفظی گورکھ دھندے جن سے تم ہر روز خود کو نیز دوسروں کو دہوکا دیا کرتے ہو (اتنا کہکر وہ اٹھنے کو ہوتی ہے)

م۔ اُس کے الفاظ!

ک۔ (اٹھتے ہوئے رک کر) کس کے الفاظ؟

م۔ یوجین کے!

ک۔ (خوش ہوکر) وہ ہمیشہ سچی بات کہتا ہے۔ وہ تم کو، مجھ کو اور پراسی سب کو خوب اچھی طرح سمجھتا اور جانتا ہے لیکن پیارے تم کچھ نہیں سمجھتے (ہنسنے لگتی ہے اور دل ہی کے لئے اس کا منہ چوم لیتی ہے، وہ منہ ہٹا لیتا ہے گویا جیسے کوئی چیز بھونک دی گئی ہو اور اٹھکر کھڑا ہو جاتا ہے)

م۔ آخر، یہ تم نے پیار کس طرح کر لیا۔ اُف کینڈڈا (کملیف سے) بہتر یہ تھا کہ تم میرے دل میں پگھلتا ہوا لوہا ڈال دیتیں بجائے اس طرح پیار کرنے کے۔

ک۔ (متعجب ہوکر) پیارے میرے۔ کیا بات کیا ہوئی؟

م۔ (مجنونانہ طرز سے ہٹاتے ہوئے) مجھے نہ چھوؤ، مجھ سے الگ رہو۔

ک۔ جیمس!!!

(اتنے میں یوجین اور برگیس اندر داخل ہوتے ہیں لیکن دروازہ کے قریب ہی رک جاتے ہیں۔ ہکا بکا)

ی م۔ کیا کوئی بات ہوگئی؟

م۔ (ایک دم سفید لیکن طبیعت پر فولادی قابو رکھتے ہوئے) نہیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ آج صبح یا تو تمہاری باتیں سب صحیح تھیں یا کینڈڈا پاگل ہوگئی ہے۔

ب۔ (بہت ہی زور سے) کیا! کینڈڈی بھی پاگل ہے؟! ارے، ارے، ارے (وہ گڑگڑاتا ہوا، بڑبڑاتا، آتشدان کے پاس چلا جاتا ہے اور اپنے پائپ کی راکھ آتشدان کے سیخوں پر جھاڑنے لگتا ہے)

(مارل تنگ آکر اپنی میز پر بیٹھ جاتا ہے آگے کو جھک کر تاکہ اپنے چہرے کو چھپالے۔ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا لیتا ہے تاکہ مستحکم رہیں)

ک۔ (جیمس سے مطمئن ہوکر اور ہنستے ہوئے) تم کو محض میری بات کا صدمہ ہوا ہے کیوں نا؟ تم سب غیر ذہنی لوگ بھی کس قدر ذہنی ہوتے ہو! (نہایت خوشی سے کرسی کے ہتھے پر بیٹھ جاتی ہے)

ب۔ کینڈی! ذرا سنبھل کر باتیں کر۔ آخر مسٹر یوجین تیری نسبت کیا خیال کریں گے۔

ک۔ جیمس نے مجھے ہمیشہ اپنے متعلق خود غور و فکر کرنا سکھایا ہے اور یہ بھی کہ کبھی اس بات سے نہ ڈروں کہ دوسرے میری نسبت کیا خیال کرتے ہیں اور یہ اس وقت تک تو ٹھیک رہتا ہے جب تک میں بالکل اس کے خیالات کے مطابق سوچتی رہوں لیکن دیکھو میں نے ذرا سی مختلف سوچا تھا کہ صورت دیکھ لو۔ ذرا دیکھو تو حالت! (وہ جیمس کی طرف بڑی خوش طبعی سے اشارہ کرتی ہے)

(یوجین دیکھتا ہے اور ذرا اپنے ہاتھ سے اپنا دل تھام لیتا ہے گویا ایک دم ٹیس اٹھی ہو۔ وہ صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس صورت سے جیسے کوئی المیہ سین دیکھ رہا ہو)

ب۔ (آتشدان کے پاس سے) جیمس آج تم قدرے سست نظر آرہے ہو۔ روز کے سے چست نہیں۔

م۔ (ایک ہلکے قہقہہ کی کوشش کرتے ہوئے حالانکہ وہ قہقہہ رونے کی ہچکی معلوم ہوتا ہے) نہیں تو میرا خیال تو ایسا نہیں خیر مجھے بہت افسوس ہے کہ مجھے اس کا احساس نہ ہوا کہ آپ صاحبان کو تکلیف دے رہا ہوں (خود کو سنبھالتے ہوئے) خیر خیر۔ خیر خیر خیر! (نہایت مضبوط ارادے کے ساتھ بظاہر خوش ہو کر وہ اپنے کاغذات لیکر پھر بیٹھ جاتا ہے)

ک۔ (صوفے کے پاس جاتے ہوئے اور یوجین کے پاس بیٹھتے ہوئے۔ اب بھی اسی مذاق اور تمسخر کی حالت میں) یوجین کیوں تم اس قدر افسردہ کیوں ہو۔ کیا پیاز چھیلنے سے آنسو نکل آئے؟

ی م۔ (چپکے سے) یہ تمہارا ظلم ہے اور ظلم سے مجھے نفرت ہے۔ میں یہ کبھی نہیں دیکھ سکتا کہ ایک شخص دوسرے کو اتنی تکلیف دے۔

ک۔ (اس پر طنز سے دست شفقت پھیرتے ہوئے) بیچارے! کیا میں نے واقعی ظلم کیا؟ کہ ان چھوٹے سرخ پیازوں کو تم سے ترشوایا؟

ی م۔ (سنجیدگی سے) اونہہ! یہ بات نہیں، یہ نہیں میرا مطلب اپنی ذات سے نہیں مطلب یہ ہے کہ تم نے اُسے بے انتہا تکلیف دی ہے۔ اس کے درد اور اس کی تکلیف کو میں خود اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ تمہاری خطا نہیں یہ ایک بات تھی جو آخر کبھی نہ کبھی تو ضرور۔ ہو کر رہتی لیکن اس کا مذاق نہ اڑانا چاہیے، نہ اس کو یوں ہلکا بنا کر ہنسی میں اڑانا چاہیے میں کانپ جاتا ہوں جب دیکھتا ہوں کہ تم اس کو یوں

اور ماں قدر اذیت دیتی ہو اور اس پر ہنستی ہو۔

ک۔ (یقین نہ کرتے ہوئے) میں اور جیمس کو اذیت پہونچاؤں! کیا فضول کی باتیں کرتے ہو یوجین۔ تم کس قدر مبالغہ سے کام لے رہے ہو بیوقوف (وہ اٹھتی ہے اور میز کی طرف جاتی ہے کچھ متفکر اور قدرے پریشان ہو کر) بس اب زیادہ کام نہ کرو پیارے ذرا آؤ اور ہم لوگوں سے باتیں کرو۔

م۔ (محبت سے لیکن تلخ لہجہ میں) نہیں نہیں میں بات چیت کر ہی نہیں سکتا۔ میں تو صرف وعظ دے سکتا ہوں۔

ک۔ (اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے) اچھا خیر! آؤ وعظ ہی دو

ب۔ (شدت سے انکار کرتے ہوئے) نہیں کینڈی، ہٹاؤ بھی وعظ وغیرہ۔

(لیکسی مل گھبرایا ہوا اندر آتا ہے صورت سے معلوم ہوتا ہے کسی اہم کام کے لئے آیا ہے)

ل۔ (کینڈا سے عجلت ہاتھ ملاتے ہوئے) مزاج تو اچھا ہے مسز ماریل آپ کی واپسی سے بے حد مسرت ہوئی۔

ک۔ شکریہ لیکسی۔ یوجین کو تم جانتے ہو گے؟

ل۔ ہاں! ہاں! کیا مزاج ہے آپ کا مسٹر یوجین؟

ی م۔ بالکل اچھا ہوں شکریہ۔

ل۔ (مارل سے) میں ابھی سینٹ میتھو انجمن (گیلڈ) سے چلا آرہا ہوں۔ وہ لوگ آپ کے تار کی وجہ سے نہایت کشمش و پنج میں ہیں۔

ک۔ جیمس! تم نے آخر کاہے کے متعلق تار دیا؟

ل۔ (کینڈا سے) آج آپ کا اُن لوگوں کے وہاں وعظ تھا اور چنانچہ انھوں نے میر اسٹریٹ میں ایک بڑا سا ہال لے رکھا تھا اشتہار وغیرہ میں بیحد روپیہ خرچ کیا تھا لیکن عین وقت پر آپ کا تار پہونچا کہ آپ نہ آسکینگے ان لوگوں پر تو گویا بجلی ہی گر پڑی سب کیا کرایا بس خاک میں ملا جا رہا ہے۔

ل۔ (متعجب و پریشان ہو کر کہ جیمس کو کچھ ہو گیا ہے) کیا لکچر کا وعدہ۔ اور توڑ دیا!

ب۔ میرے خیال میں تو اُس کی زندگی میں یہ پہلا ایسا واقعہ ہے۔ بلکہ میں اس پر شرط لگا سکتا ہوں کیوں ناکینڈی؟

ل۔ (مارل سے) اُن لوگوں نے آپ کو ایک جوابی تار دیا تھا کہ کیا آپ اپنا ارادہ بدل نہیں سکتے۔ کیا آپ کو وہ تار ملا تھا؟

م۔ (بے چینی کو ضبط کرتے ہوئے) ہاں، ہاں مجھے مل گیا تھا۔

ل۔ وہ جوابی تھا۔

م۔ ہاں یہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے اس کا جواب دے دیا کہ میں نہیں آسکتا۔

ک۔ لیکن کیوں جمیس! کیوں۔ آخر یہ کس لئے؟

م۔ (قریب قریب غضب ناک ہوکر) اس لئے کہ میں نہیں چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ میں بھی آخر آدمی ہوں اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ گویا میں کوئی بولنے والی مشین ہوں جو ہر شام کو من کی تفریح کے لئے چلادی جایا کرے یعنی آخر کیا میں ایک شام بھی اپنی بیوی، اپنے دوستوں کے ساتھ نہ گذاروں۔ آخر مطلب کیا ہے؟

(سب کو اس تقریر سے تعجب ہوتا ہے لیکن یوجین پر کوئی اثر نہیں ہوتا وہ چپ چاپ اپنی جگہ پر بیٹھا ہے)

ک۔ جمیس تم کو ہرگز اُس بات کا اتنا خیال نہ کرنا چاہئے جو میں نے کہی تھی اور دیکھو اگر تم آج نہ جاؤگے تو کل تمہارا ضمیر اس پر ملامت کرے گا۔

ل۔ (سہا ہوا لیکن بات اہم ہے) ہاں صاحب، یہ صحیح ہے کہ وہ لوگ آپ پر بیجا اور نازیبا بار ڈالدیتے ہیں لیکن یہ سمجھ لیجے کہ بیچارے ہر جگہ تار بھیج چکے ہیں اور ان بیچاروں کو دوسرا واعظ دستیاب نہیں ہو رہا ہے سوائے لاادری کلیسا کے صدر کے۔

م۔ (جلدی سے) ہاں وہ تو بہت عمدہ آدمی ہیں بس اس سے بڑھ کر انھیں کیا چاہئے؟

ل۔ لیکن وہ تو ہمیشہ سوشلزم اور عیسائیت کو جدا رکھنے پر اصرار کرتے ہیں اور اس طرح جو کچھ اب تک ہم لوگوں نے کیا ہے وہ سب خاک میں مل جائے گا۔ یہ تو خیر آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں (اپنے شانے ہلاتا ہے اور آتشدان پر برگیس کے پاس چلا جاتا ہے)

ک۔ (مناتے ہوئے) جاؤ ضرور جمیس ضرور، ہم سب بھی چلیں گے۔

ب۔ (بڑبڑاتے ہوئے) دیکھو کینڈی! میں کہتا ہوں کہ ہم لوگوں کو تو یہیں گھر میں آگ کے قریب نہایت اطمینان سے ٹھہرنا چاہئے۔ اس کو بس دو گھنٹے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔

ک۔ نہیں ڈیڈی! جلسے میں بھی آپ کو اسی قدر آرام ملے گا کیونکہ یہاں ہم سب لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھیں گے

اور گویا بڑے آدمی ہو جائیں گے۔

ی م۔ (سہم کر) نہیں نہیں بھئی ہم لوگ پلیٹ فارم پر نہیں جائیں گے۔ وہاں سب کی نظریں ہماری طرف اٹھیں گی میں وہاں نہیں بیٹھ سکتا میں پیچھے کے کمرے میں بیٹھوں گا۔

ک۔ ڈرو مت، وہ سب لوگ جمیں کی طرف دیکھنے میں اس قدر مشغول ہوں گے کہ کوئی تمہاری طرف خیال بھی نہ کرے گا۔

م۔ پر اسی والی شکایت؟ کیوں کینڈڈا؟

ک۔ (بشاش ہو کر) ہاں پر اسی والی شکایت!

ب۔ (پریشان ہو کر) پر اسی والی شکایت! جمیں کیا مطلب ہے تمہارا؟

م۔ (اس کی طرف کچھ خیال نہ کرتے ہوئے اٹھتا ہے دروازہ تک جاتا ہے اسے کھولتا ہے اور تحکمانہ لہجہ میں پکارتا ہے) مس گارنٹ!

پ۔ (دور پر) جی! مسٹر ماریل حاضر ہوئی۔

(سب لوگ انتظار کرتے ہیں سوائے برگیس کے جو نہایت آہستہ سے لیکسی کی طرف مخاطب ہوتا ہے)

ب۔ ادھر سنو مسٹر ل پر اسی والی شکایت کیا چیز ہے؟ آخر وہ کیا بیمار ہے؟

ل۔ (رازدارانہ طور سے) حقیقت یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا ہوں کہ یہ کیا چیز ہے لیکن آج صبح اس نے مجھ سے اس عجیب و غریب طرز سے گفتگو کی تھی کہ میرا خیال ہے اُس کے دماغ میں کچھ فتور کبھی کبھی آجاتا ہے۔

ب۔ (گھبرا کر) خوب! پھر تو یہ مرض متعدی معلوم ہوتا ہے ایک گھر میں چار چار!

پ۔ (دروازہ پر آتے ہوئے) کیا بات ہے مسٹر ماریل؟

م۔ انجمن سینٹ میتھو کو تار دیدو کہ میں آ رہا ہوں۔

پ۔ (تعجب سے) مگر وہ لوگ تو آپ کا خود انتظار کر رہے ہوں گے۔

م۔ (تحکمانہ) جو کچھ کہتا ہوں وہ کرو۔

(پراز رہائی سہم کر ٹائپ رائٹر پر بیٹھ جاتی ہے اور تعمیل حکم کرتی ہے۔ ماریل اب بے حد مستعد اور پر جوش ہے۔ برگیس کے پاس جاتا ہے۔ کینڈڈا اس کی حرکات کو بہت تعجب اور بے چینی سے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے)

م۔ برگیس تم آنا نہیں چاہتے؟

ب۔ نہیں جیمس اس طرح نہ کہو۔ بات یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ آج اتوار تو ہے نہیں کہ فرصت کا دن ہو۔

م۔ مجھے بہت افسوس ہے خیال تھا کہ تم اگر چلو گے تو میں وہاں کے صدر سے تمہاری ملاقات کرا سکوں گا۔ وہ ضلع کونسل ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی ہے اور ٹھیکے کے معاملات میں بہت کچھ اثر رکھتا ہے (برگیس ایکدم چونک پڑتا ہے) کیا پھر چلو گے نہیں؟

ب۔ (جوش سے) ہاں، ہاں ضرور چلوں گا جیمس تم وعظ بھی خوب دیتے ہو۔ واقعی تمہارا وعظ ہمیشہ عمدہ ہوتا ہے۔

م۔ (برازنی کی طرف گھومتے ہوئے) مس گارنٹ میں چاہتا ہوں کہ تم وہاں پر کچھ نوٹس لکھ لو۔ اگر تمہیں کوئی اور کام نہ ہو تو چلو (وہ سر ہلاتی ہے اور ڈر کی وجہ سے بول نہیں سکتی) لیکسی تم تو آ ہی رہے ہو جہاں تک میرا خیال ہے؟

ک۔ جیمس ہم سب لوگ چل رہے ہیں۔

م۔ نہیں، تمہارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے : یوجین کی تم کو یہیں رہنا چاہئیے اور اس کی خاطر و مدارات کرنا چاہئیے۔ گھر واپس آنے کی کچھ تو خوشیاں منا لو (یوجین کی سانس نہیں سماتی، اٹھ کھڑا ہوتا ہے)

ک۔ لیکن جیمس......

م۔ (حکمیہ) میں اصرار کرتا ہوں نہ تو تم آنا چاہتی ہو نہ وہ (کینڈڈا کچھ کہنا چاہتی ہے) نہیں اپنی فکر نہ کرو، وہاں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو تمہاری خالی کرسیوں پر بیٹھ جائیں گے اور چونکہ وہ لوگ ابھی تک میرے خیالات سے ناواقف ہوں گے لہذا ان کا بیٹھنا زیادہ مفید ہوگا۔

ک۔ (پریشان ہوکر) کیا یوجین تم چلنا نہیں چاہتے؟

م۔ میں یوجین کے سامنے وہاں بول نہیں سکتا وہ میرے وعظوں پر اس قدر معترض ہوتا ہے (اس کی طرف دیکھتے ہوئے) اور وہ یہ جانتا بھی ہے کہ میں اس سے ڈرتا ہوں۔ آج صبح یہ اس نے مجھ سے کہا بھی تھا تو کینڈڈا آج میں اس کو تمہاری حفاظت میں چھوڑ کر دکھا دوں گا کہ میں اس سے کس قدر ڈرتا ہوں۔

ی م۔ (خود سے خوشی اور جذبہ سے) یہ واقعی عالی ہمتی ہے، بہت خوبصورت۔

ک۔ (پریشان اور تشویشناک ہوکر) لیکن۔ لیکن۔ جیمس کیا کوئی بات ہوگئی؟ (بہت بےچین ہوکر) میری سمجھ میں نہیں آتا ——

م۔ (اس کو محبت سے اپنے بازوں میں لیتے ہوئے اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے) اچھا! پیاری میں تو سمجھتا تھا کہ میں ہی کچھ نہیں سمجھ پاتا ہوں۔ (پردہ) (باقی آئندہ)

مترجمہ نورالحسن ہاشمی

دہر آشوب

ابتریِ عام وزمیں گیر نظر آتی ہے — خواب ابلیس کی تعبیر نظر آتی ہے
عافیت بستۂ زنجیر نظر آتی ہے — زندگی موت کی تفسیر نظر آتی ہے

امن کے جسم پہ ہے جنگ کا خونیں قالب — روحِ اقوام پہ ہیں مرگ و تباہی غالب
خاک اور خون میں لتھڑی ہوئی ارضِ مغرب — نعشِ عریاں پئے تشہیر نظر آتی ہے

طرب آموز تھا آغازِ جمالِ پیرس — دردانگیز ہے تصویرِ مآلِ پیرس
نازک اندام و سیہ چشم غزالِ پیرس — خوں میں ڈوبا ہوا نخچیر نظر آتی ہے

لٹ گئی رونق و تمکینِ شبستانِ نظر — مٹ گئی زینت و آرائشِ ایوانِ نظر
لعبتِ چین کہ تھی حاصلِ ارمانِ نظر — زخمی و خستہ و دلگیر نظر آتی ہے

موجۂ نیل پھر آمادۂ طغیانی ہے — چین پرور پھر ابوالہول کی پیشانی ہے
مصر پھر منتظرِ ہادیٔ عمرانی ہے — روحِ فرعون عناں گیر نظر آتی ہے

دلِ جاپان نظر روس سے ہے ازآلودہ — درِ لعنت پہ جبینیں ہیں نیاز آلودہ
ترکی و روم و فلسطین و حجاز آلودہ — آتشِ جنگ جہاں گیر نظر آتی ہے

فتنہ درسر ہیں شرر اور ہوا آج، مگر — حشر در بر ہیں قدر اور قضا آج مگر

تھر پہ پور ہیں بشر اور خدا آج مگر — صور پھنک جانے میں تاخیر نظر آتی ہے

للہ الحمد کہ نزدیک ہے وہ روز سعید — عشرہ بن جائے گی جب ہر ستم ایجاد کی عید
حق کو مژدہ ہو کہ بالائے سر شمر و یزید — تیغ مظلومی شبیر نظر آتی ہے

انقلاب آیا ہے یوں چاند کی ہر منزل پر — چھا گیا ہے شفقی رنگ فلک کے دل پر
اک نئے دور کے آئینۂ مستقبل پر — دیکھ وہ سرخی تحریر نظر آتی ہے

جان باقی ہے سسکتی ہوئی تہذیب میں بھی — شرر صدق ہے خاکستر تکذیب میں بھی
یعنی اس سلسلۂ غارت و تخریب میں بھی — اک نئے عہد کی تعمیر نظر آتی ہے

شرح صدر حرم و دیر ہوا چاہتی ہے — فاش تزویر شر و خیر ہوا چاہتی ہے
عقل آزاد و سبک سیر ہوا چاہتی ہے — پائے اوہام میں زنجیر نظر آتی ہے

ہے بدلنے ہی کو نظم و نسق چرخ کبود — باغ بن جانے کو بیتاب ہے نار نمرود
خنکی قلب براہیم ہے سرگرم شہود — آگ میں برف کی تاثیر نظر آتی ہے

پھر نم آگیں ہیں شرر شعلے ہیں شبنم آلود — پھر دل آہن و خارا میں ہے نرمی کی نمود
شاعر شرق کو بخشا گیا لحن داؤد — سنگ میں موم کی تاثیر نظر آتی ہے

حق ہوا چاہتا ہے پردۂ باطل سے عیاں — کفر کے دل میں ہے تابندہ شرار ایماں
ہو بشارت کہ ضمیر شب غم میں غلطاں — صبح نوروز کی تنویر نظر آتی ہے

(سروش عسکری طباطبائی بی۔اے لکھنوی)

نوائے سحر

تیری فرقت سے جو غمگین کبھی ہو جاتا ہوں
طفل ناداں کی طرح سوچ میں کھو جاتا ہوں
رات بھر دیکھتا رہتا ہوں ستاروں کی راہ
صبحدم تھک کے تری یاد میں سو جاتا ہوں

بانگ فطرت کا ترنم ہے جنوں ساز ابھی
ضو فشاں ہے مرے دل میں شرر راز ابھی
زندہ ہے خاک کی آغوش میں احساس کی آگ
گونجتی ہے تری شب میں مری آواز ابھی

ظلمت دہر سے بیتاب نوا ہوتا ہوں
کشت ہستی میں تری دانۂ غم بوتا ہوں
درد دل سے، تری درگاہ میں ہنگام سحر
اکثر اک طفلک تنہا کی طرح روتا ہوں

فکر محبوس، ابھی طالب پرواز نہیں
اس کا ہنگامۂ تعمیر شرر ساز نہیں
خلوتوں میں غم امروز سناتا ہوں تجھے
کہ ترے دہر میں میرا کوئی ہمراز نہیں

شیشۂ عمر مئے تند سے لبریز نہ کر
دہر میں یوں مری فطرت کو جنوں خیز نہ کر
فکر ہستی کے لئے فرصت یک لحظہ تو دے
موج دم سے یہ دبی آگ ابھی تیز نہ کر

یہ جہاں تنگ ہے کتنا دل پُر شور کو آہ!
سخت مشکل ہے شب و روز میں فطرت سے نباہ
اک ننھی سی خطا پر تو خفا ہے اور ابھی
کروٹیں لیتا ہے دل میں مرے اک حشر گناہ

فضل حسین صاحب کیف

مے کہنہ

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ ملک و مال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

کھلی ہے خانۂ صیاد میں ہماری آنکھ
قفس کو جانتے ہیں آشیاں نہیں معلوم

مشتاقِ دردِ عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے
کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

آئینہ دیکھنے کا گذرتا نہیں خیال
اپنی خبر نہیں انھیں میری خبر کہاں

یہ کھلا آتشِ عناصر سے دلِ دیوانہ کو
چار دیواریں اکٹھی ہو کے زنداں ہو گئیں

آباد میرا خانۂ ویراں ہے ان دنوں
سیلاب مجھ غریب کا مہماں ہے ان دنوں

کعبہ و دیر میں وہ خانہ برانداز کہاں
گردشِ کافر و دیندار لئے پھرتی ہے

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
مجھ کو غربت وطن سے بہتر ہے

صورتِ شمع ہوں ہرچند فروغِ محفل
بات کر لے نہیں پاتا کہ زباں کٹتی ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

کعبہ سے دیر، دیر سے کعبہ کو جا چکے
کیا کیا نہ اس دوراہے پہ ہم پھیر کھا چکے

زیرِ زمیں بھی چین کی صورت نہیں نصیب
آسودگانِ خاک کی مٹی خراب ہے

میری تعظیم نے مجلس سے نکالا مجھ کو
اُٹھتے اُٹھتے نہ رہی بیٹھنے کی جا باقی

بلبل ہی کو بہار کے جانے کا غم نہیں
ہر برگ ہاتھ ملتا ہے گلزار کے لئے

بت خانہ کھود ڈالیئے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیئے یہ خدا کا مقام ہے

طریقِ عشق میں آتش قدم مجھ سا نہ گذرے گا
گریباں میں لگی ہے جب لگی ہے آگ داماں میں

وہ گریباں آگ میں رکھ دیجئے
موسمِ گل میں ہوں جو بے چاک کے

(آتش لکھنوی مرحوم)

غزل

کچھ اپنا آشنا کیوں اے دل ناداں نہیں ہوتا
کہ آئے دن یہ رنگ گردش دوراں نہیں ہوتا

ریاض دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچۂ خنداں نہیں ہوتا

سراپا نار ہونا نور کا آساں نہیں ہوتا
فرشتوں میں جو اعلیٰ تر نہیں شیطاں نہیں ہوتا

ابھی تک حسن بک جاتا ہے بازار محبت میں
مگر ہر بکنے والا یوسف کنعاں نہیں ہوتا

کسی کے حسن سے ناداں کبھی انکار بھی کر لے
کوئی بے کفر کے شائستۂ ایماں نہیں ہوتا

کبھی پابندیوں سے چھٹ کے بھی دم گھٹنے لگتا ہے
در و دیوار ہوں جس میں وہی زنداں نہیں ہوتا

تجھے پا کر بھی اہل شوق تجھ کو پا نہیں سکتے
یہ عقدہ حل بھی ہو کر عقدۂ آساں نہیں ہوتا

نظر سے گدگدائے جا، ستم سے دل دکھائے جا
میں یوں خنداں نہیں ہوتا میں یوں گریاں نہیں ہوتا

فنا اپنی بقا اپنی ہے جس کو عشق کہتے ہیں
وہ مرگ و زیست کا شرمندۂ احساں نہیں ہوتا

ہر اک شے کے پس منظر ہو جیسے نور کا عالم
کہاں نظارۂ شمع تہ داماں نہیں ہوتا

فضائل لاکھ ہوں لیکن محبت ہی نہیں جس میں
فرشتہ ہو خدا ہو کچھ بھی ہو انساں نہیں ہوتا

یہ دنیا سر بسر گویا پرستاں بنتی جاتی ہے
کہ ان آنکھوں کا عالم، عالم امکاں نہیں ہوتا

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ خوش ہونا محبت میں
کبھی مشکل نہیں ہوتا، کبھی آساں نہیں ہوتا

مزاج حسن کی مجبوریوں کو کیا کرے کوئی
ترے وعدوں میں یوں تو جھوٹ کا امکاں نہیں ہوتا

اٹھے ہی جاتی ہیں موجیں تبسم ہائے پنہاں کی
گلستاں در گلستاں کب رخ جاناں نہیں ہوتا

فراق اک اک سے بڑھ کر چارہ ساز درد ہیں لیکن
یہ دنیا ہے یہاں ہر درد کا درماں نہیں ہوتا

(فراق صاحب گورکھپوری)

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

منتخب داغ: منتخبہ احسن مارہروی مرحوم مطبع انوار احمدی الہ آباد قیمت حصہ اول و دوم عہ روپے صفحات ۷۷، ۳۴، کاغذ کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

داغ کے دو ایک انتخابات نکل چکے ہیں لیکن ایک مفصل انتخاب کی ضرورت پھر بھی باقی تھی اس انتخاب میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ان کے ایک محبوب اور مشہور شاگرد کا کیا ہوا ہے حصہ اول میں داغ کی غزلوں کے ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جو فارسی عطف و اضافت سے خالی ہیں حصہ دوم میں یہ قید اٹھا دی گئی ہے اور ایسے اشعار منتخب کئے گئے ہیں جن میں فارسی عطف و اضافت موجود ہے۔ اس کے علاوہ پہلے حصے میں ہر قسم کے اشعار لئے گئے تھے۔ دوسرے حصہ میں صرف بہتر اشعار کا انتخاب دیا گیا ہے۔ گویا پہلا حصہ ہندوستانی اردو کا نمونہ ہے دوسرا حصہ خالص اردو کا۔ ابتدا میں ۱۲ صفحوں کا احسن صاحب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی ہے جس میں داغ کی شاعری پر تبصرہ ہے نیز ان کی زندگی کے چند پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے جو اس وجہ سے اور بھی مستند ہیں کہ احسن صاحب کے اپنے دیکھے ہوئے ہیں۔ داغ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے احسن مرحوم نے ایک پارے میں ان کی خصوصیات کو اس طرح بند کر دیا ہے" داغ نہ صوفی تھے نہ مفتی، صرف ایک شاعر تھے اور شاعر بھی غزل کے اور غزل بھی ایسی جس میں شوخی۔ شرارت، چلبلی کی طعن تشنیع۔ رشک بدگمانی۔ چھیڑ چھاڑ، لاگ ڈانٹ، چھین جھپٹ کے سوا کچھ نہیں۔ .... داغ نے سیدھی سادی باتوں میں ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلے ہیں کہ بڑے بڑے کھلاڑیوں کو نیچا دیکھنا پڑا ہے ؎

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول   سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

مقدمہ سے پہلے احسن مارہروی مرحوم کے حالات اور ان کے کلام کا مختصر انتخاب بھی دس بارہ صفحات میں دے دیا گیا ہے۔

غرضکہ یہ انتخاب بہ ہمہ نوع مکمل ہے اور کیا باعتبارِ معنی اور کیا باعتبارِ بندش شاید ہی کوئی اچھا شعر باقی رہ گیا ہو جو اس انتخاب میں نہ آ گیا ہو۔

پھریری:- از عظیم بیگ صاحب چغتائی۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ تاج آفس، محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳۔ قیمت عہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، کتابت طباعت عمدہ۔

یہ چغتائی صاحب کے چودہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں نکلتے رہے ہیں اور ان خوبیوں اور خامیوں کے حامل ہیں جو چغتائی صاحب کی خصوصیات رہی ہیں۔ چغتائی صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے افسانے کسی نہ کسی واقعہ پر ضرور مبنی ہوتے ہیں۔ زیبِ داستان کے لئے افسانہ نگار البتہ ان میں تغیر و تبدل ترمیم و تنسیخ کر لیتا ہے یہ خصوصیت جہاں اتنی خوبیاں رکھتی ہے وہاں اس میں یہ خامی بھی ہے کہ اکثر افسانے افسانہ نگار کی کم توجہی کے باعث محض واقعات کی ایک ڈائری ہو کر رہ جاتے ہیں چغتائی صاحب کے بعض افسانوں میں یہ کھردری واقعیت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔

بعض افسانوں کی طرزِ نگارش میں رشید صدیقی اور پطرس کا رنگ پایا جاتا ہے "ہمارا پرنس" والے افسانے میں انگریزی طرزِ معاشرت کی بہت دلچسپ تصویر کھینچی ہے بقیہ افسانے زیادہ تر چغتائی صاحب کے پر شرارت پلاٹوں سے مزین ہیں۔ دلچسپ چیز ہے۔

گرام سدھار:- مصنفہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۴؍ ملنے کا پتہ سکرٹری شری گاندھی آشرم شاہدرہ لاہور۔

یہ ایک چھوٹی تقطیع پر ۱۲۸ صفحہ کی کتاب ہے جس میں دیہی اصلاحات کے سلسلہ میں گاؤں والوں کی طرزِ زندگی اور معاشی حالات کا تمام تر جائزہ لے کر ان کی فلاح و بہبود کی خاطر علمی اور فائدہ مند تدابیر نہایت خوبی سے بیان کی گئی ہیں۔ زراعت و گھریلو صنعت کی ترقی اور بڑھتی ہوئی بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے نیز صحتِ عام اور تعلیمِ عام کی طرف حکومت کو اس کے فرائض بتلا کر متوجہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی قوم کو اپنے جائز و ضروری مطالبات گورنمنٹ سے منوانے کی پرزور ترغیب دی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر کام کی بات لوگوں کو اپنے اوپر آپ بھروسہ کرنے اور اپنی ضروریات خود پورا کرنے کی ہے۔ یہ وہ زرین اصول

ہے جو زمانہ قدیم میں ہندی تمدن کا خاص الخاص طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اس مسلک کو اختیار کرنے سے اُن تمام بدیسی چیزوں سے چھٹکارا ہو جاتا ہے جن سے آج کل ہندوستان کے بازار بھرے پڑے ہیں اور جو روزمرہ کی ضروریات میں بھی دوسروں کا محتاج کئے ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں اس مفید کتاب کے اضافہ کرنے پر اُس کے لائق و مخلص مصنف قابل مبارکباد ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے اچھا سبق حاصل کریں گے۔ دراصل اس کتاب کو بجائے گرام سدھار کے قوم سدھار کہنا زیادہ موزوں ہے۔

منگل پربھات:۔ مترجمہ پنڈت اوم پرکاش ترکھا۔ قیمت ۱ر ملنے کا پتہ، سکرٹری شری گاندھی سیوا آشرم شاہدرہ لاہور۔

یہ کتاب مہاتما گاندھی کے اُن چند ہندی خطوط کے مجموعہ کا ترجمہ ہے جو ہر ہفتہ منگل منگل انھوں نے اپنے قائم کردہ سابرمتی آشرم کے رہنے والوں کو لکھے تھے۔ ان سے مہاتما گاندھی کے مذہبی اعتقادات، پاکیزہ خیالات اور فلسفۂ اخلاق پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ جس طرح یہ اُن کے معتقدین کے لئے پیام تعلیم اور رہنمائے ہدایت ہیں اُسی طرح عام پبلک کے لئے بھی معلومات مذہبی و بلند خیالی میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ اس کتاب میں حق اور حق پر چار کا اظہار کیا گیا ہے اور معیار انسانیت بلند کرنے کے لئے جن اوصاف حمیدہ اور اخلاق عالیہ کی ضرورت ہے ان کو مختصراً بیان کیا گیا ہے چنانچہ حق پرستی بے خوفی۔ عدم ایذا دہی۔ تزکیہ نفس کے لئے ریاضت، مذہبی رواداری اور انسانوں کے ساتھ مساویانہ برتاؤ ان خطوط میں زیر بحث لائے گئے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی تعلیمات سے اردو داں حضرات کو واقف کرنے کے لئے مترجم کی یہ کوشش لائق ستائش ہے۔ جا بجا بعض ٹھیٹھ ہندی الفاظ محتاج تشریح ہیں جنھیں طبع ثانی کے وقت ملحوظ رکھا جائے تو مناسب ہے۔ (م ح)

جغرافیہ دنیا (میسور ایڈیشن):۔ مؤلفہ سید شرف الدین قادری۔ ایم۔ اے، بی۔ ٹی لکچرار ٹیچرز ٹریننگ اسکول اورنگ آباد دکن ملنے کا پتہ سید عبدالقادر اینڈ سنس کتب فروش چار مینار حیدرآباد دکن قیمت ۱۲ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، کاغذ، کتابت و طباعت بہت عمدہ۔

شرف الدین صاحب نے یہ جغرافیہ پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کیلئے ترتیب دی ہے۔ شروع میں طبیعی جغرافیہ بھی ہے اس کے بعد ہر ملک کی جغرافیہ مختصراً بیان کی ہے مختلف تصویریں اور ضروری نقشے بھی دئے گئے ہیں۔ نقشوں میں موجودہ جنگ سے قبل جو حدود تھیں وہی برقرار رکھی گئی ہیں۔ مشہور ہندوستانی ریاستوں کی جغرافیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ طالب علموں کیلئے بہت مفید کتاب ہے اور یوپی کے اسکولوں میں جو اردو جغرافیہ رائج ہے اس سے یہ بہتر ہے۔

رسالہ ہندوستانی ادب:۔ چنچل گوڑہ حیدرآباد دکن۔ زیر ادارت غلام محمد خاں صاحب ایم اے (عثمانیہ) چندہ سالانہ للعہ رفی پرچہ ۶ ر کاغذ، کتابت وطباعت اچھی صفحات ۶۴۔

جون ۱۹۴۲ء سے یہ ماہوار رسالہ غلام محمد خاں صاحب نے نکالنا شروع کیا ہے ہر قسم کے ادبی مختصر مضامین کے علاوہ دنیائے سائنس، معلومات، دلچسپیاں اور فلمی معلومات بھی دی گئی ہیں۔ رسالہ کی ترتیب اچھی ہے ہر قسم کے مذاق کا خیال رکھا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے مضامین مختصر ہوگئے ہیں۔ تنوع اور اختصار اور دلچسپی کو مد نظر رکھنا ہے تو بہتر یہ ہوگا اگر غلام محمد خاں صاحب تمام ہندوستانی رسالوں یا کم از کم تمام اردو کے رسالوں کے بہترین مضامین کا اختصار دیدیا کریں یہ اردو کے لئے ایک نئی چیز ہوگی دلچسپ بھی، انوکھی بھی اور آسان بھی۔ ورنہ ایسے رسالے تو بہت سے نکلتے رہیں گے۔

رسالہ پیام اسلام:۔ مدیر محمد احمد خاں صاحب ذاکر ملنے کا پتہ دارالقرآن۔ جالندھر۔ صفحات ۴۸۔ چندہ سالانہ تے ر۔ طلبہ سے ۱۲ فی پرچہ ۴ ر

دراصل یہ رسالہ مدرستہ البنات کی طالبات کے لئے نکالا گیا ہے لیکن عام عربی پڑھنے والے طالب علموں اور عربی زبان سیکھنے کی خواہش رکھنے والوں کے لئے کارآمد ہوسکتا ہے۔ اس میں عربی اسباق کے علاوہ قرآن اور حدیث اور تفسیر کے بھی عام فہم اقتباسات ہیں۔ طالب علموں کے لئے بہت مفید چیز ہے۔

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہاز راں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی اور کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام
نئی وضع کے سات جہازوں کا شان دار بیڑا جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس اسلامی
وزن ۵۸۷۹ ٹن
بھی شامل ہے

گذشتہ موسم میں جب کہ جنگ کی وجہ سے جہاز رانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے
مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن، جدہ اور بحر احمر کی بندرگاہوں۔ نیز
پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروس

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جاسکتی ہیں
تفصیلات کے لئے خط کتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بنک اسٹریٹ، بمبئی

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں اُن کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی اُنھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں مُلک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں، جن کے خالص ہونے میں کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر وتیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعثِ مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اِس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی، محمد علی تاجرانِ عطر۔ حنابلڈنگ۔ لکھنؤ

مختصر تاریخ ادب اُردو

مصنفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لکچرار شعبۂ اُردو الہ آباد یونیورسٹی

اُردو زبان میں تاریخ ادب پر ایسی کوئی کتاب نہیں جو اس کی ابتدائے آفرینش سے آج تک کا حال بتا سکے کوئی کتاب میرؔ، داغؔ کے واقعات تک پہنچتے پہنچتے خاموش ہوجاتی ہے اور کوئی چند قدم آگے بڑھی بھی ہے تو وہ موجودہ دور کے نثر نگاروں کا تو ذکر ہی کیا، شعراء کی اچھی خاصی تعداد پر انفرادی حیثیت سے کوئی تبصرہ و تنقید نہیں پیش کرتی اور شاید ایسی اس وقت کی کوئی کتاب ہی نہیں جو تاریخی لحاظ سے نثر نگاری کے سلسلے میں موجودہ دور کے طرز تحریر وغیرہ پر روشنی ڈال سکے۔

اس زبردست کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ تاریخ لکھی گئی ہے جو اگرچہ مختصر ہے مگر لکھتے وقت اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی کوئی امتیازی خصوصیت نظرانداز نہ ہو۔

اگر آپ کو اپنی زبان سے محبت ہے اور آپ اُردو کے قدیم و جدید شُعراء و نثر نگاروں کے حالات زندگی سے واقفیت حاصل کرنے کے علاوہ ان کی شاعری اور نثر نگاری پر صحیح تنقید کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمائیے۔

کتابت، طباعت کے لئے انڈین پریس کا نام ہی ضمانت ہے حجم تقریباً ۵۰۰ صفحات۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت صرف ؏

ملنے کا پتہ

منیجر (بک ڈپو) انڈین پریس لمیٹڈ، الہ آباد

رسالہ ہندوستانی

رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ
کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہورہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے،
جو اکیڈمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم وجدید علوم وفنون کے اہم موضوعات
پر، ماہرینِ فن اور کہنہ مشق اہلِ قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں اس استناد
کی وجہ سے یہ رسالہ، رسالہ نہیں ہے؛ بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے! ہر کتب خانے میں
اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے رسالے نے ۱۰، ۱۱ سال کے
عرصے میں علم وادب کے جو اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، اُن کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز
حاصل ہوگیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں سے
ایک ہے! جناب کی علم دوستی سے اُمید ہے کہ اس کے معاونین میں شامل ہوکر
علم وادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمائیں گے۔ اسی سلسلے میں اُس کی
توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں۔ جو حضرات اس کی خریداری
منظور فرمائیں گے؛ یا جو پانچ خریدار پہنچائیں گے؛ اُن کی خدمت میں اکیڈمی
کی بعض مطبوعات رعایتی قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ اِن مطبوعات کی
تفصیل، دفتر سے معلوم ہوسکے گی۔ رسالے کا سالانہ چندہ للعہ ہے۔
ترسیلِ زر اور اس سلسلے کی خط وکتابت کے لئے ذیل کے پتے سے یاد فرمایا جائے۔
دفتر رسالہ ہندوستانی۔ ہندوستانی اکیڈمی صوبجات متحدہ، (الہ آباد)

ہندوستانی اور اسلامی سیاسیات

سے باخبر رہنے کے لئے "نوائے وقت" لاہور کا مطالعہ کیجئے۔ اپنی آزاد پالیسی اور سنجیدہ ومتین تنقید کی وجہ سے اس اخبار کو شمالی ہندوستان کی اردو صحافت میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس اخبار کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ہر پرچے میں علامہ اقبالؒ کے پیغام وکلام کی تشریح پر ایک بلند پایہ مضمون ضرور شائع ہوتا ہے۔ مسٹر محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولوی عبدالحق اور سر عبدالقادر نے نوائے وقت کو وقت کی ایک اہم ضرورت بتاتے ہوئے اس کی کامیابی کی دعا کی ہے۔ خواجہ غلام السیدین۔ میاں بشیر احمد پروفیسر حمید احمد خاں۔ پروفیسر اشتیاق حسین قریشی۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ مسٹر ایم اے رحمٰن (آئی سی ایس) شیخ انوار الحق (آئی، سی، ایس) مسٹر ہادی حسن (آئی۔ سی۔ ایس) سابق مدیر ہزار داستان۔ پروفیسر یوسف سلیم ڈاکٹر محمد باقر۔ مسٹر محمد شفیع اس اخبار کے قلمی معاونوں میں شامل ہیں۔

اخبار نوائے وقت محکمہائے تعلیم پنجاب و سندھ کا منظور کردہ ہے

چندہ سالانہ عہ/ نمونے کے لئے پانچ پیسے (۱/۔) کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں مفت نہیں بھیجا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

منیجر اخبار "نوائے وقت" لاہور

سیاست

زیرِ ادارت

ڈاکٹر یوسف حسن خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ ماہی رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعے اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اُسے منتقل کیا جائے۔ یہ خالص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا ممالک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ رسالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر شخص کو پڑھنا چاہیے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن، سے خط و کتابت کی جائے اور انتظامی و دیگر امور کے متعلق

مولوی سید عبدالوہاب صاحب و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چار مینار حیدرآباد دکن، سے

دریافت کیجیے

قیمت سالانہ عہ فی پرچہ عہ

رسائل تعلیم و ترقی

مکتبہ جامعہ نے ادارہ تعلیم و ترقی کی طرف سے جولائی میں حسب ذیل رسالے شائع کئے ہیں ان کو شامل کرکے کل رسائل کی تعداد ۵۲ ہو جاتی ہے

۱۔ قصہ حاتم طائی اول	ار	۱۳۔ دوہے	ار
۲۔ " " " دوم	ار	۱۴۔ دلچسپ شعر	ار
۳۔ " " " سوم	ار	۱۵۔ مرثیے	ار
۴۔ " منصور موہنا	ار	۱۶۔ مسدس حالی	ار
۵۔ " فردوس بریں	ار	۱۷۔ حالی کی نظمیں	ار
۶۔ " لیلےٰ مجنوں	ار	۱۸۔ گنتی	ار
۷۔ شکنتلا	ار	۱۹۔ بڑی گنتی	ار
۸۔ تانگے والا	ار	۲۰۔ پہاڑے پہاتے	ار
۹۔ بھتی	ار	۲۱۔ اجرت کا حساب	ار
۱۰۔ صوبے کی حکومت	ار	۲۲۔ تنخواہ کا حساب	ار
۱۱۔ حکومت ہند	ار	۲۳۔ چاند تارے	ار
۱۲۔ جمہوریت	ار	۲۴۔ نزلہ زکام	ار

مکتبہ جامعہ، دہلی

غالب کا گم شدہ دیوان

مرزا غالب مرحوم کے اُردو دیوان کا یہ جدید تعلیمی نسخہ سو برس کے بعد ملک کے سامنے آیا ہے۔ اس میں اُن کے وہ شہ پارے ہیں جنھیں اُنھوں نے بادلِ ناخواستہ حذف کر دیا تھا۔

غالب کے انتقال کے پچاس سال بعد پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک کا وہ ابتدائی کلام طبع ہو کر اربابِ ذوق کے سامنے جلوہ افگن ہے جو اُنھوں نے اپنے ہم چشموں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر خود الگ کر دیا تھا۔

غالب کے جس دیوان کو معدوم سمجھا جاتا تھا اتفاق سے وہ بجنسہٖ مکمل حالت میں مل گیا۔ اس نایاب نسخے کے تحفظ کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہوا ہے جس نے اب اسے شائع کرکے ادبیاتِ اُردو میں ایک بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

قیمت بلا مقدمہ للعہ ۔ مع مقدمہ ﷲ

مکتبہ جامعہ
دہلی ۔ نئی دہلی ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

ایک اُستاد کی

آپ بیتی

ایک اُستاد نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ یہ آپ بیتی کیا ہے جامعہ ملیہ کی اکیس سال کی مکمل تاریخ ہے۔ جامعہ کے نئے اور پُرانے طالب علم مولوی عبدالغفار مدھولی سے ضرور واقف ہوں گے۔ یہ تاریخ انھی کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب دو جلدوں، ۸۰۰ صفحے کی ہے۔ قیمت مکمل للعہ روپے ہے۔ نئے اور پُرانے جامعی حضرات ایک یا دونوں جلدوں کی قیمت پیشگی بھیج دیں تو کتاب کے چھپنے میں بہت سہولت ہو جائے۔

یہ کتاب ہر لحاظ سے قیمتی ہوگی۔ ماہرین اور شائقین تعلیم کے لئے اس میں اکیس سالہ جدید تعلیمی تجربے کا نچوڑ ہے۔

اس پتے پر خط کتابت کیجئے۔

عبدالغفار صاحب مدھولی۔ مدرس

مدرسہ ابتدائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ

ڈاک خانہ ۔ جامعہ نگر ، دہلی

پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

حمائل شریف

مشہور خوش نویس فاطمۃ الکبریٰ بنت محمد دین صاحب خوش نویس کی
لکھی ہوئی حمائل شریف جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے. کتابت کی دلآویزی اور
پاکیزگی کی وجہ سے خاص شان کی مالک ہے. ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب
رحمتہ اللہ علیہ کا ہے. محترمہ فاطمۃ الکبریٰ وہی خاتون ہیں جنھیں اپنے فن میں
کامل ہونے کے باعث حکومت حیدرآباد سے ایک گراں قدر وظیفہ
دیا جاتا ہے۔ ہدیہ تین روپے (سے)

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی

جامعہ

زیرِ ادارت:- نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۵ ✠ نمبر ۳ | بابتہ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

اقبال

(گذشتہ سے پیوستہ)

آٹھواں منظر

وادیٔ ظلمت

(آدھی رات۔ شاعرِ مستقبل کی روح ایک جنگل میں بیٹھی ہوئی تصور کے گلستاں کھلا رہی ہے آدھی رات اس سے کہتی ہے)

آدھی رات: اک مشعلِ جاں ہو مری فطرت کی سیاہی — اے نجمِ درخشاں تری تابت ہے گواہی

اُٹھا اے نگہ شوخ کے خاموش پہ تار — لمتی ہے بیاں دولتِ آشفتہ نگاہی

ہے دستِ درازی کے لئے دامنِ عالم — ہے سایہ فگن فرق پہ نشانِ الٰہی

میں نے تو کیا پردۂ اسرار کو بھی چاک — دیرینہ ہے میرا مرضِ کور نگاہی

روحِ شاعر: ہے فروغِ تخیل کا فیض ہے عالم — یہ کائنات مری چشمِ دلنواز میں ہے

تو دیکھ نہیں تخلیق جو دداں کا حرم — ہے مدینہ میں ہے اور مجھے حجاز میں ہے

ہے رسول ہیں یہ دلبرانِ حسن و جمال — پیامِ شوق منی وحی جاں نواز میں ہے

کھلے ہیں میرے لئے جبرئیل کے بازو — ہجوم حور و ملک میری بزمِ ناز میں ہے

اگر میں چاہوں تو پیدا کروں جہاں اپنا — دکھا دوں چشمِ تماشا کو آسماں اپنا

آدھی رات: اگر ہے دعویٰ تخلیق تجھ کو اے شاعر — تو اپنا کوئی زمیں آسماں بنا کے دکھا

مری نگاہ پہ چھلتے نہیں فقط دعوے — ہر ایک منظرِ تخلیق جگمگا کے دکھا

روحِ شاعر: خشک تھی یہ سرزمیں فیضانِ قدرت کے مگر — دیکھ اس وادی میں اک بہتا ہوا چشمہ مرا

(ایک شفاف چشمہ بہتا ہوا نظر آتا ہے)

چشمہ۔ ہر حسن صفائی ہے ہر حسن تماشا ہے — بہتا ہوا دنیا میں دریائے تمنا ہے
جاری رہے عالم میں اک انجمن آرائی — تخلیق مسلسل ہی فطرت کا تقاضا ہے

روح شاعر۔ تیرے پہلو سے نکالا میں نے اک چھوٹا سا باغ — دیکھ اس پر ناچتے ہیں کتنے پھولوں کے ایاغ

(پھولوں کا ایک شاداب باغ چشمے کے کنارے اُگتا ہے اور لہلہاتا ہے)

باغ۔ لے گئی باغ میں طوفان محبت کو بہا۔ — ڈالی ڈالی مرے محبوب کا افسانہ ہے
ہر طرف بادۂ مستی کے چھلکتے ہیں جام — پھر بھی اک چیز سے خالی مرا پیمانہ ہے

روح شاعر۔ اچھا تو اپنی چھاؤں میں اک طائر حزیں — اپنی صدائے درد سے ہے نغمہ بار دیکھ

(شاخ پہ ایک پپیہا پی کہاں، پی کہاں کی آواز دیتا ہے)

روح شاعر محو ہو کر گاتی ہے:-

تو کیستی و من کیم، از صحبت ما چیست[1] — بر شاخ گل ایں طائرک نغمہ سرا چیست

مقصود نوا چیست؟

مطلوب صبا چیست؟

ایں کہنہ سرا چیست؟

شاید کہ چمن رزم حیات ہمہ جوئی است — بزمے است کہ شیرازہ او ذوق جدائی است

دم؛ گرم نوائی است

جاں؛ چہرہ کشائی است

ایں راز خدائی است

پپیہا کی آواز۔ برخیز و دل از صحبت دیرینہ بپرداز — با لالہ خورشید جہاں تاب نظر باز

با اہل نظر ساز

چوں من بہ فلک تاز

داری سر پرواز؟

[1] پیام مشرق ص ۱۴۸

(یہ گا کر پپیہا اڑ جاتا ہے۔ روحِ شاعر پپیہے کو آسمان کی طرف اڑتا ہوا دیکھتی ہے۔ اس کی نظر جھلملاتے ہوئے تاروں پر پڑتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پپیہا ستارہ سرطان کے سامنے گذر گیا۔ روحِ شاعر کی نظر ستارۂ سرطان پر جم جاتی ہے اور بیتاب ہو کر جواب دیتی ہے)

روحِ شاعر— خالی سر پرواز نہیں قوتِ جاں بھی | یہ وسعتِ افلاک بھی یہ کون و مکاں بھی
اڑتے ہوئے میں شعلۂ انجم کو ہوا دوں | بجھتے ہوئے سیاروں کی آنکھوں کو جگا دوں
پیچھے مرے آتا رہے یہ گنبدِ دوّار | آگے مرے چلتا رہے ہر ثابت و سیار
ہر عظمتِ گرداں کے تلے گتا ہوا نکلوں | طوفان سے نکلوں کبھی آواز سے نکلوں
ہو جائیں تجلی کی بہت تیز ہوائیں | دیکھیں جو مجھے اہلِ فلک رقص میں آئیں!

(شاعر کی روح آسمان کی طرف اڑتی ہے۔ ستارہ سرطان خود بھی قریب آتا ہے۔ اس کے اطراف چکر لگانے والا محورِ نور صاف نظر آنے لگتا ہے۔ سرطان اس طرح دعوت دیتا ہے)

آ۔ اے نظر افروزِ تجلی پہ کھڑا ہو | اس مرکزِ انوار کا آئینہ نما ہو
پی آنکھ سے یہ بادۂ پیمانۂ افلاک | چل پاؤں سے بالائے طربخانۂ افلاک
انجم کی نگاہوں سے اڑا ذوقِ تماشا | دیکھ آنکھ سے آئینۂ ایوانِ تجلے
کس شان سے ہوتی ہے یہاں گردشِ انجم | سن غور سے سیاروں کے نغموں کا تلاطم
آنکھوں کے مقابل ہے یہاں چرخ کی رفعت | نزدیک نگاہوں کے ہے کونین کی وسعت
جو دور تھا نزدیک ہے، جو سرد تھا روشن | دامن سی لگا ہے ترے افلاک کا دامن!

(روحِ شاعر سرطان کے محور پر کھڑی ہوئی رقص کرتی ہے اور وجد میں آکر گاتی ہے)

روحِ شاعر— میں تعمیر و تخلیق کی ناخدا ہوں | بڑی خود نما ہوں، بڑی خود نما ہوں
بہت حیرت افزا ہیں گو یہ فضائیں | بہت دلربا ہیں یہ سب ماہ پارے
مگر مجھ کو ہوتی نہیں اس سے تسکیں | سلامت رہے روح کا فخر و تمکیں
اضافہ کروں خود نمائی میں شاید | ابھی کچھ کمی ہے خدائی میں شاید!

ایہ گاتے ہو سرطان کا محور نور تیز گردش کرنے لگتا ہے اور اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ روح شاعر اس پر سے تنکے کی طرح اڑ جاتی ہے اور ایک وسعت بے کنار کی طرف بہتی چلی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے سیارں کے شعلے، گردش کی ہوائیں، رقص کی آوازیں شور کرتی ہیں۔ اندھیرا چھانے لگتا ہے روح شاعر کاروان درکار واں ستاروں کو تیزی سے گذرتا ہوا دیکھتی ہے۔ انجم کا یہ سرود سنائی دیتا ہے)

جلوہ گہ شہود را[1]   بت کدۂ نمود را
رزم نبود و بود را   کشمکش وجود را
عالم دیر و زود را   می نگریم و می رویم
خواجہ ز سروری گذشت   بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گذشت   دور سکندری گذشت
شیوۂ بتگری گذشت   می نگریم و می رویم

روح شاعر اب ایک ایسی ظلمت بے جہت میں آ جاتی ہے جہاں اسے خود اپنے وجود کا احساس نہیں رہتا۔ اس ظلمت میں وہ زور کے ساتھ ایک سرخ رنگ کے دریا میں ڈال دی جاتی ہے جس کی موجیں قیامت خیز جزر و مد کے ساتھ اٹھ رہی ہیں۔ سوائے دریا کی سرخ موجوں اور ان کی آتشیں دنداں نمائی کے کچھ نظر نہیں آتا دریائے آتشیں کہتا ہے)

دریائے آتشیں:
آ مری آغوش میں تخلیق کے اے ناخدا   تجھ پہ شاید ہنس رہی ہے ظلمت دنداں نما
ناز تھا اے بے خبر اپنے تصور پر تجھے   صبر کرنا ہے یہاں اپنے تحیر پر تجھے
التہاب شعلۂ تمکین قلب جاں ہوں میں   امتحان کفر ہوں آئینہ ایماں ہوں میں
میری موجوں میں اجل سے بھی زیادہ انتقام   میرے پانی میں جنوں سے بھی زیادہ اقتام
کم نظر کی رہنما ہے شعلہ آشامی مری   بے اثر کا راستہ ہے آتش افشانی مری

(روح شاعر دریائے آتشیں میں غوطے کھاتی ہے۔ ظلمت سے ایک آواز آتی ہے)

چو موج می تپد آدم بہ جستجوے وجود   ہنوز تا بہ کمر در میانہ عدم است

---

[1] پیام مشرق صفحہ ۱۰۳

روح شاعر۔ نے فروغ چشم و دل ہے نے چراغ قلب جاں
الاماں اے ظلمت دریائے آتش الاماں

جور اتنا کس لئے اولادِ آدم ہوں نا میں
شور اتنا کس لئے افسانۂ غم ہوں نا میں؛

ڈوبتی جاتی ہے میری کشتیِ عقل و خرد
المدد اے شاعرِ حسنِ خدائی المدد!

(روح شاعر کے سامنے ایک مہیب شکل و صورت کی مچھلی جس کا چہرہ دیو نما ہے ظلمت سے دو سرخ آنکھیں چمکاتی ہوئی ابھرتی ہے اور اسے پشت پر بٹھا کر کھینچ لے جاتی ہے۔ دوسری آواز آتی ہے)

بے زورِ سیل کشتیِ آدم نمی رود
ہر دل ہزار عربدہ وا رد بہ ناخدائے

از من حکایت سفرِ زندگی مپرس
در ساختم بہ درد و گذشتم غزل سرائے

(روح شاعر پکارتی ہے)

اے ظلمت حیات مرے دل پہ رحم کر
اک وادیِ فنا میں مجھے اس طرح نہ کھینچ

تیسری آواز۔ بیش نگر کہ زندگی راہ بہ عالمے برد
از سر آنچہ بود و رفت درگذر انتہا طلب

روح شاعر۔ فنا کی طرف مجھ کو لے جا رہی ہے
مری انتہا مجھ کو دکھلا رہی ہے

چوتھی آواز۔ بہ آں تاب تابے کہ فطرت بہ بخشد
درخشم چو برقے بہ ابرِ سیاہے

(روح شاعر تڑپ کر مچھلی کی پشت پر سے کود جاتی ہے۔ کودتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دریا کا پانی تھم گیا اور شاعر کو تھوڑی دیر کے لئے سکون کی ایک چٹان سی مل گئی۔ اس وقت روح اقبال کی یہ صدا آنے لگی)[1]

انجم بہ گریباں ریخت ایں دیدۂ تر مارا
بیروں ز سپہر انداخت ایں ذوقِ نظر مارا

شام و سحر عالم از گردشِ ما خیزد
دانی کہ نمی سازد ایں شام و سحر مارا

شایانِ جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست
ایں راہ گذر مارا، آں راہ گذر مارا

(تھوڑی دیر بعد موجوں کی رفتار دھیمی دھیمی شروع ہوتی ہے۔ روح شاعر اس سے بکل نہیں سکتی۔ تھوڑی دیر جا کر موجیں منجمد ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ روح شاعر بھی مدہوش ہو جاتی ہے۔ عالم سکوت یوں گویا ہوتا ہے)

عالمِ سکوت۔ یہ سکوت منجمد ہے یا اجل کا دام ہے
نا شناسائے خدائی کا یہی انعام ہے

اے خیالِ مضطرب تیری تگ و دو کیا ہوئی
اے نگاہِ بے محابا تیری وہ رو کیا ہوئی؛

---

[1] زبورِ عجم صفحہ

کیا ہوا وہ زندگی کا ذوق و شوق بے حجاب
کیا ہوئی وہ گرم رو پیہم صدائے انقلاب؛

کیا ہوئی غافل وہ شوخی تیری چشم نازکی
کیا ہوئی ناداں وہ لرزش گرمی آوازکی؛

تیرے سینے میں جو برپا تھا وہ طوفاں کیا ہوا
کوہ و صحرا کیا ہوئے، صحن گلستاں کیا ہوا؛

تھم گئی یہ آشفتگی، عقل و عرفاں کس لئے
ہو گیا بےحس و حرکت قلب لرزاں کس لئے؛

(روح شاعر منجمد دریا میں بےحس پڑی ہوئی ہے مدتوں پڑی رہنے کے بعد اس کے کانوں میں ایک آواز آنے لگتی ہے یہ ایک قوی ہیکل کشتی بان کی آواز ہے جو ایک عجیب و غریب کشتی میں بیٹھا ہوا ہے)

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگراں خیز[1]
کاشانہ ما رفت بہ تاراج خزاں خیز

از نالۂ مرغ چمن، از بانگ اذاں خیز
از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

ناموس ازل را تو امینی تو امینی
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی
صہبائے یقیں درکش و از دیر گماں خیز

از خواب گراں، خواب گراں، خواب گراں خیز
از خواب گراں خیز

(کشتی بان روح شاعر کو کشتی میں بٹھا کر لے چلتا ہے اور گاتا ہے)

سفینہ دو جہاں کا ہے، یہ دریا لامکاں کا ہے
یہ موجیں زندگی کی ہیں، یہ طوفاں آسماں کا ہے

ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

نظر ہے بادباں اپنی، تصور ہے ہوا اپنی
ہے آغوش خدائی میں بقا اپنی فنا اپنی

ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

دل درد آشنا ساتھی تو لایا ہے ازل سے پھر
ہر اک موج رواں کے ہاتھ میں عرفان کا ساغر

ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ
چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

---

[1] زبور عجم صفحہ ۱۱

یہاں ہے صبر پیمائی، یہاں ہے حوصلہ کاہی — مگر اس امتحاں سے ڈر نہ اے طوفان کے راہی
ملے گر ناخدا کوئی تو پھر آسان ہے رستہ — چلیں آہستہ آہستہ، چلیں آہستہ آہستہ

(روح شاعر کو ہوش آتا ہے لیکن پوری طرح نہیں۔ اس کے کانوں میں یہ شیریں نغمہ گونجتا ہے)

بینی جہاں را، خود را نہ بینی — تا چند ناداں غافل نشینی
نور قدیمی شب را بر افروز — دست کلیمے در آستینی
بیروں قدم نہ از دور آفاق — تو پیش ازینی تو بیش ازینی
از مرگ ترسی اے زندہ جاوید — مرگ است صیدے تو در کمینی
جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند — آدم بمیرد از بے یقینی

(روح شاعر جاگ اٹھتی اور اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ یکایک ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بہت بڑا پرندہ جس کے پروں کی ہوا سے وادیٔ ظلمت کے کنکر پتھر اڑ جاتے ہیں۔ اسے اپنے پنجوں میں اٹھائے ہوئے پرواز کرتا ہے۔ یہاں بھی ظلمت کامل ہے۔ روح شاعر اپنے آپ کو معلق محسوس کر کے کانپنے لگتی ہے۔ کوہ پیکر پرندہ کہتا ہے)

کوہ پیکر پرندہ ظلمت کی روح ہستی فانی پہ چھا گئی — ٹھنڈی ہوا چراغ محبت بجھا گئی
بے باکی خیال قیامت اٹھا گئی — احساس نور ظلمت ہستی مٹا گئی

اڑتا ہے کوئی راہگذر جانتا نہیں
رہبر ہے ساتھ اور اسے پہچانتا نہیں

میرے پروں میں موت کا ہے زلزلہ نہاں — میری ہوا سے بجھنے لگی شمع لامکاں
میری نظر میں جذب ہوا رنگ آسماں — میری صدا میں ڈوب گیا شور الاماں

بے جہت ظلمتوں میں اڑا جا رہا ہوں میں
کہسار میں عدم کے چلا جا رہا ہوں میں

(کسی گوشے سے آواز آتی ہے)

لہ زبورعجم صہ۲۴

آتشؔ از نالۂ مرغانِ حرم گیر و بسوز | آشیانے کہ نہادی بہ نہالِ دگراں
در جہانِ بال و پرِ خویش کشودن آموز | کہ پریدن نہ تواں با پر و بالِ دگراں

(یہ آواز سنتے ہی روحِ شاعر تڑپتی ہے اور پرندے کے چنگل سے چھوٹ جاتی ہے اور بلندی کا ایک صبر آزما خلا طے کرتی ہوئی کئی گھنٹوں کے بعد ایک جگہ اتر آتی ہے۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتی ہے اور افتاں و خیزاں چلتی ہوئی ہر چیز کو چھونے لگتی ہے۔ اس وقت آواز آتی ہے۔)

از خود اندیش و ازیں بادیہ ترساں مگذر | کہ تو ہستی و وجودِ دو جہاں چیزے نیست

(روحِ شاعر تیزی کے ساتھ چلنے لگتی ہے بہت دور سرخ روشنی کی ایک ہلکی سی دھار اس طرح دکھائی دیتی ہے کہ اس کی وجہ سے خود فراموشی دور ہوتی اور احساس جاگنے لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روحِ شاعر اوپر چڑھ رہی ہے۔ پہاڑ صدا دیتا ہے)

پہاڑ۔ اندیشہ کر کسی کے مقامِ حجاب کا | پھر جائزہ لے اپنے خیالِ خواب کا
جلوہ فروش کون ہے قصرِ خیال میں | کس کا فروغ ہے نگہہ پائمال میں؟
ذوقِ انا کی منزلِ فکر و عمل ہے کیا | بیکار دل کی بزم میں دستِ اجل ہے کیا؟
مدہوشیٔ نگاہ میں کس کا جمال ہے؟ | ارمان کے حصار میں کس کا خیال ہے؟
کس کی صدا سے تیز ہیں اعمال کے قدم | کھلتے ہیں کس کے سامنے جذبات کے علم؟
منصف ہے کوئی درد کے محشر بپا تو ہیں | چلتی ہے روح عقل و خرد رہنما تو ہیں؟

(یہ سن کر روحِ شاعر پر ایک لرزہ طاری ہوتا ہے لیکن وہ سنبھل کر پہاڑ سے کہتی ہے)

روحِ شاعر طے کرے گی ظلمتوں میں بھی انھیں میری حیات | سامنے تو چاہے جتنی سیڑھیاں پیدا کرے
یاد آتا ہے مجھے خضرِ محبت کا پیام | سینۂ مضطر میں جو برقِ رواں پیدا کرے
ہو صداقت کیلئے جس دل میں مرنے کی تڑپ | پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار | اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
سوئے گردوں نالۂ شبگیر کا بھیجے سفیر | رات کے تاروں میں اپنا رازداں پیدا کرے،

---

[1] پیامِ مشرق صہ ۲۰۹

(روح شاعر پہاڑ پر چڑھ جاتی ہے۔ اسے ایک غار سے آواز آتی ہے)

ہشت این میکدہ و دعوت عام است اینجا | قسمت بادہ بہ اندازۂ جام است اینجا
حرف آں راز کہ بیگانہ صوت است ہنوز | از لب جام چکیدہ است و کلام است اینجا
ما کہ اندر طلب از خانہ بروں تاختہ ایم | علم جاں را بدمیدیم و عمل ساختہ ایم[1]

(روح شاعر یہ آواز سن کر سوچنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

روح شاعر۔ ہر ذرہ حیات ہے اک روح ارتقار | اس خود رو ازل کا کوئی رہنما بھی ہے
حیرت کا آئینہ ہے بیابان کائنات | ظلمت کی وادیوں میں کوئی راستا بھی ہے
موت و حیات کھیل ہیں طوفان وقت کے | یاں ابتدا ہے اور کوئی انتہا بھی ہے
امید پر قیام وجود و عدم ہے کیا | سامان زندگی میں علاج قضا بھی ہے؟
اک پردۂ نظر ہیں ازل اور ابد کے راز | کیا عالم شہود کوئی دیکھتا بھی ہے؟
فرد بشر نے پائی ہے تہذیب زندگی | دنیا میں امتیاز ثواب و خطا بھی ہے؟
بیگانگی کی آگ میں جھونکے ہوئے غریب | میں پوچھتا ہوں دہر میں اپنا خدا بھی ہے؟

(روح شاعر پہاڑ کی چوٹی کے قریب ہے۔ جو آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ دور سے پیغام آتا ہے)

"از خلش کرشمہ کار نمی شود تمام | عقل و دل و نگاہ را جلوہ جدا جدا طلب"

(اب شاعر کو اوپر سے کچھ اُجالا قریب آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت اسے ایک نہایت تنگ سرنگ سے گذرنا پڑتا ہے۔ جہاں ہاتھ پھیلانے کی جگہ بھی نہیں ملتی اور نہ سر اٹھا کر چلنے کی۔ اسے جھکے ہوئے پتھروں سے ٹکراتے ہوئے گذرنا پڑتا ہے۔ اسے سرنگ سے آخری گوشے پر پھر روشنی دکھائی دیتی ہے جو بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ روح شاعر تیزی سے دروازے پر پہنچتی ہے سامنے سے دو حسین پیکر روح شاعر کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے اور گذرتے ہیں۔ ان کے تاجوں پر "عمل" اور "خودی" لکھا ہوا ہے دونوں گاتے ہیں)

پیکر عمل۔ چو خورشید سحر پیدا نگاہے می تواں کردن | ہمیں خاک سیہ را جلوہ گاہے میتواں کردن[2]

---

[1] پیام مشرق ص ۱۴۴۔ [2] زبور عجم ص ۱۵۱۔

نہ ایں عالم حجاب او را، نہ آں عالم حجاب او را
اگر تاب نظر داری نگاہے میتواں کردن

پیکر خودی۔ دم چیست؟ پیام است شنیدی نہ شنیدی
در خاک تو یک جلوہ عام است ندیدی
دیدن دگر آموز، شنیدن دگر آموز

واسوختہ یک شرر از داغ جگر گیر
یک چند بہ خود پیچ و نیستاں ہمہ درگیر
چوں شعلہ بہ خاشاک دویدن دگر آموز

(روح شاعر ظلمت سے نکل کر ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ ان کی روشنی میں اس کے دل پر یقین کا کچھ القا ہونے لگتا ہے)

نواں منظر

طوفان تجلی

(عمل اور خودی کے پیکر تھوڑی دور چل کے شفق کے ایک جھروکے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اب روح شاعر ذروں سے زیادہ لطیف نور کے دھوئیں میں اپنے آپ کو محصور دیکھتی ہے۔ آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس وقت سامنے سے ایک عجیب قسم کا دیوہیکل جانور نمودار ہوتا ہے جس کا آدھا جسم گوشت کا اور آدھا سخت دھات کا بنا ہوا معلوم ہوتا ہے اس کی آنکھوں سے روشنی کی ایسی تیز دھاریں دوڑتی ہیں کہ شبنمی نور میں ان کی چمک صاف نظر آتی ہے۔ وہ اژدہے کی طرح چار پاؤں سے رینگتا ہے۔ جب وہ سامنے آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوہ البرز سامنے آیا۔ اس کی چال میں مایوسی ہے اور وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا ہے روح شاعر کے سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور انسانی لب ولہجہ میں کہتا ہے)

جانور۔ خاکدان آب و گل میں عقل کا زنداں ہوں میں
عظمت و گم گشتگی کا آہنی ساماں ہوں میں

پیکر سنگیں میں میرے جذب نور ونار ہے
میری چشم دوربیں اک روزن دیوار ہے

سرحد افلاک کا عزم سفر تھا رہ گیا
آتنا وزنی ہو کے ہلکی جنبشوں میں بہ گیا

تھا حریف روح و دل اور دشمن جوش جنوں
کر دیا اسرار نے اس بزم میں خوار و زبوں

---

[1] زبور عجم۔

نور کے بادل میں کوئی رہنما ملتا نہیں — جھانکتا ہوں دیکھتا ہوں راستہ ملتا نہیں
سانس رک جاتی ہے جب اپنا بڑھاتا ہوں قدم — منہ جھلس دیتی ہے میرا گرمیٔ لوح و قلم
آہ اتنی منزلیں طے کر کے بھی ناکام ہوں — آہ اپنی روشنی کی ظلمت انجام ہوں

(یہ کہکر عقل کا دیو پیکر رینگتا ہوا گذر جاتا ہے۔ ایک ایوان کے ریشمی پردوں سے چند ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے کوئی زور سے ذکر و شغل کر رہا ہو۔ یہ روح اقبال کا ذکر و شغل ہے)

پہلی آواز۔ عشق[1] ناپید و خرد می گزدش صورت مار — عقل کو تابع فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا — آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

دوسری آواز۔ میری[2] متاعِ حیات علم و ہنر کا سرور — میری متاع حیات ایک دل ناصبور
معجزہ اہل فکر فلسفہ پیچ پیچ — معجزہ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور
ایک زمانے سے ہے چاک گریباں مرا — تو ہے ابھی ہوش میں میرے جنوں کا قصور
فیض نظر کے لئے ضبط سخن چاہیئے — حرف پریشاں نہ کہہ اہل نظر کے حضور

تیسری آواز۔ یہ ہیں[3] سب ایک ہی سالک کی جستجو کے مقام — وہ جس کی شان میں آیا ہے علم الاسما
مقام ذکر کمالات رومی و عطار — مقام فکر مقالات بو علی سینا
مقام فکر ہے پیمایش زمان و مکاں — مقام ذکر ہے سبحان ربی الاعلیٰ

(روح شاعر میں ایک تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ ایک جست میں شبنمی پردوں سے گذر جاتی ہے۔ تھوڑی دور تیز روشنیوں میں چلنے کے بعد اس کے سامنے ایک نور کی چادر سی بہتی ہوئی آتی ہے۔ چادر پر اتنی چمک ہے کہ راستہ نظر نہیں آتا۔ روح شاعر دیکھتی ہے کہ پانی میں سے ایک حور سرخ رنگ کی نکلتی ہے اس کے زجاجی سینے میں ایک زمردیں تیر چھپا ہوا ہے اور اس سے دل کی شکل کا ایک ایک خونیں قطرہ گرتا ہے جس سے نور کی چادر سرخ ہو جاتی ہے۔ یہ حور (روح ہی) آواز میں یہ ترانا گاتی ہے)

---

[1] ضرب کلیم ص۶ [2] ضرب کلیم ص۱۴ [3] ضرب کلیم ص۱۶

حورِ دل۔ ہے جلوہ گاہ عرش کی نگاہ میں تجلیاں
حریم قدس عشق کی خیال میں تسلیاں

خرد کی برق تیز رو ہے زلف تابدار میں
جنوں کے لالہ حزیں ہیں قلبِ داغدار میں

نظر اٹھا کے جب چلوں تو مستیاں نثار ہوں
جھکا کے آنکھ جب چلوں تجلیاں نثار ہوں

قدم قدم پہ جام مے لنڈھائے شوخیاں مری
شباب زندگی میں ہوں ہزار گرمیاں مری

ازل کی تابشوں سے ہے رخ حسین تابدار
جبیں شوق سے گرا تجلیوں کا آبشار

قیامت آفریں یہ دل ہجوم آرزو سے ہے
جگر میں موج آتشیں مذاق جستجو سے ہے

مری ہتھیلیوں میں ہیں فلک کے ماہ و آفتاب
مرے خرام ناز میں ہے کہکشاں کا التہاب

مری فضائے زیست میں جنوں کا اہتمام ہے
مری حیات خوں چکاں، وصال ناتمام ہے

(اس کے پیچھے ایک روح اپنے سینے پر ہاتھ رکھے ہوئے اور قدم قدم پہ اپنے آگے چلنے والی کو یاد کرتے ہوئے کہتی ہے)

روح قصہ دار و رسن بازیٔ طفلانہ دل
التجائے ارنی سرخیٔ افسانہ دل

اس کو اپنا ہے جنوں اور مجھے سودا اپنا
دل کسی اور کا دیوانہ میں دیوانہ دل،

(روح شاعر سپاٹ بانوریں سے آگے بڑھتی ہے۔ اب اس کے سامنے ایک زرین تختہ بہتا ہوا آتا ہے جس پر ایک نازنین بیہوش پڑی ہوئی ہے۔ ہاتھ پانی کو چھوتے ہیں۔ اس کا لباس آئینوں اور تاروں سے بنا ہوا ہے، جگہ جگہ سبز شعاعیں تیر کی طرح نکلتی ہیں۔ اس کے پیچھے ایک ایک بیتاب پیکر بال پریشان ہاتھ پیر مارتے ہوئے تختہ کو تھامنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر تختہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے بیتاب پیکر پکارتا ہے)

بیتاب پیکر۔ گرمیٔ قلب و نظر جذب سے اب کام لے
اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

ٹھوکریں کھاتی ہے گو میرے لئے کائنات
ہل نہیں سکتا کبھی عشق کا پائے ثبات

رقص میں لاتی ہے جب وقت کی گردش مجھے
ملتی ہے کونین میں قلب کی لرزش مجھے

شیشۂ عقل و خرد، ساغر چشم و نظر
آئینۂ زندگی پردۂ شام و سحر

منزل امن و سکوں مشغل علم و عمل
مستیٔ کون و مکاں، بزم ابد و ازل

لذت ایمان و دل، دولت شوق وصال — بتکدۂ خوش نگاہ، میکدۂ لازوال
سب مری وحشت کے قید سب مرے ساغر میں ہیں — سب مری ٹھوکر میں ہیں سب مری ٹھوکر میں ہیں
گرمیٔ قلب و نظر، جذب سے اب کام لے — اے مری دیوانگی اس کو ذرا تھام لے

(تختۂ نازنین کو لئے بہتا ہوا چلا جا رہا ہے اور کہتا ہے)

نگاہ شوق کو سیلاب ناز لے کے چلا — صدائے عشق کو طوفان ساز لے کے چلا
رواں ہے حسن نظر نور کے سفینے پر — عروس ناز کو اک بے نیاز لے کے چلا
نظر عروس ہے اور عقل و دل خراب نظر — جو جستجو میں ہوا سرفراز لے کے چلا
جنوں کی دست درازی سے بچ گیا شاید — حسین جلوے کو آئینہ ساز لے کے چلا

(روح شاعر محو نظارہ ہو جاتی ہے۔ اوپر سے دو فرشتے چاند تارے اوڑھے ہوئے گذرتے ہیں ایک فرشتہ گاتا ہے)

فرشتہ: کھو نہ جا اس سحر و شام میں اے صاحب ہوش — اک جہاں اور بھی ہے جس کا نہ فردا ہے نہ دوش
دوسرا فرشتہ: عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام — یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل رہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک،

(روح شاعر یہاں سے گذر کر ایسے مقام میں آتی ہے جہاں رنگ و بو کا ایک طوفان برپا ہے خوشبو مجسم معلوم ہوتی ہے۔ رنگ کی دیواریں کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس طوفان سے دو خوبصورت پھول رقص کرتے ہوئے گذرتے ہیں۔)

پھول۔ ہوا ٹھنڈی ٹھنڈی — وہ ساون کے جھولے
وہ حوروں کے قدموں — سے گلزار پھولے
ملی ننھی کلیوں کو — اک خوش نگاہی
وہ کوئل پکاری — الٰہی الٰہی
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت

مبارک سلامت مبارک سلامت

جوانی کی ٹھوکر میں چاند اور تارے
کنواری صداؤں سے کوئی پکارے
وہ زریں کمر لڑکیاں کھلکھلائیں
وہ ہنس ہنس کے جوبن کی پینگیں بڑھائیں
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت
مبارک سلامت مبارک سلامت

ہر اک بھولی صورت وہی زندگی کی
ہر اک پاک مورت کلی زندگی کی
وہ رنگیں ادائیں متاع جوانی
وہ بھولی صدائیں مئے لن ترانی
بہاروں کی مستی نگاہوں کی دولت
مبارک سلامت مبارک سلامت

(ان کے پیچھے ننھی سی قوس قزح ہاتھ میں لئے اور ہاتھ سر پر بلند کئے ہوئے شبنمی پریاں رنگین قبائیں پہنے ہوئے گزرتی ہیں اور گاتی ہیں)

رنگ اور بو کے دریا جاگے ووڑے تارے آگے آگے
بادل بادل رنگت چھائی جوگن بن کر قدرت آئی
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں
آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں!

اس نگری میں پیت بھری ہے ڈالی ڈالی دل کی ہری ہے
اپنے آگے نور کا پردہ اللہ اللہ اللہ اللہ

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

آؤ سکھی تاروں سے کھیلیں

(سامنے سے حضرت جبرئیلؑ اڑتے ہیں۔ ان کے پروں کی ہوا سے سیارے تنکوں کی طرح دور ہو جاتے اور فضا ایک نیلگوں نور بن کر رہ جاتی ہے۔ روح اقبال گنگناتی ہوئی گذرتی ہے)

(سینہ کشادہ جبرئیل از بر عاشقاں گذشت — تا شررے بہ او فتد ز آتش آرزوئے تو
هم بہ ہوائے جلوۂ پارہ کنم حجاب را — هم بہ نگاہِ نارسا پردہ کشم زروئے تو)

(روح شاعر اقبال کے پیچھے رواں ہوتی ہے۔ وہ حیرت کے ساتھ بلند اور نیلگوں فضا کی طرف دیکھتی ہے جس کی رنگینی وسعت اس کی بلندی کو بڑی شان کے ساتھ ظاہر کر رہی ہے۔ وہ دیکھتی ہے کہ کروڑہا میل اوپر گہری فضا میں فرشتوں کا رقص ہو رہا ہے۔ حلقوں کے حلقے ہاتھ میں ہاتھ ملائے اڑ رہے ہیں ان کے سامنے رنگین ستاروں کی جھلک نظر آتی ہے فضائے نیلگوں سے روح اقبال آواز دیتی ہے)

بیا[1] کہ خاوریاں نقش تازہ بستند — دگر مرو بطواف بتے کہ بشکستند
چہ جلوۂ ایست کہ دلہا بہ لذت نگہے — ز خاک راہ مثال شرارہ برجستند
تو ہم بہ ذوقِ خودی رس کہ صاحبان طریق — بریدہ از ہمہ عالم بہ خویش پیوستند
غلام ہمت بیدار آں سوارانم — ستارہ را بہ سناں سفتہ در گرہ بستند

(روح شاعر چاروں طرف دیکھتی ہے اور فکر میں ڈوب جاتی ہے)

روح شاعر۔ یہ تماشائے نظر اور یہ تجلی کا ہجوم — نیلگوں وسعت افلاک میں یہ رقص نجوم
یہ ملائک کی سر چرخ منور پرواز — حور و غلماں کی سراپردۂ جاں سوز آواز
اخضریں بحر میں یہ نور کا سیلاب رواں — کشتی حسن میں بیٹھی ہوئی حوراں جناں
اور اس اوج نظارہ پہ مرا ذوق سفر — ہر قدم پر دل بیتاب کو اک خوف و خطر
قاصد شوق ہے کیا محفل ہستی کے لئے — ساغر عشق ہے کیا حسن پرستی کے لئے
کیا مجھے منزل آخر کا پتہ ملتا ہے — کیا مجھے وادی حیرت میں خدا ملتا ہے؟

---

[1] زبور عجم صفحہ ۱۵۲

(سامنے سے دو فرشتے یہ گاتے ہوئے گذرتے ہیں)

ایک فرشتہ: "ایں دل کہ مراد دی لبریز یقیں بادا | ایں جام جہاں بینم روشن تراز یں بادا"

دوسرا فرشتہ: "جب اس انگارہ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا | تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا"

(یہ گا کر فرشتے نیلگوں بلندی کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ روح شاعر اب ایسے مقام پر پہونچتی ہے جہاں سے ایک قدم آگے بڑھنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ مقام نہایت بلند ہے اور آگے عدم کی طرح عظیم الشان خلا ہو سوائے اڑنے کے چارہ نہیں۔ روح شاعر بہت گھبراتی ہے۔ ایک آواز آتی ہے)

"یوں ہاتھ نہیں آتا وہ گوہر یک دانہ | یکرنگی و آزادی اے ہمت مردانہ
یا حیرت فارابی یا تاب و تب رومی | یا فکر حکیمانہ یا جذب کلیمانہ"

(روح شاعر اڑنے کے لئے کسی فرشتے کی مدد کی طالب ہوتی ہے پھر آواز آتی ہے)

"در دست جنوں من جبریل زبوں صیدے | یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ"

(یہ سن کر روح شاعر پر ایک وجد طاری ہوتا ہے۔ وہ بلند حوصلہ ہوتی ہے لیکن ہمراز اور ساتھی کوئی نہیں۔ وہ ایک کشمکش میں پڑ جاتی ہے اور کہتی ہے)

آہ کیا بیگانگی ہے اس طلسم عرش کی | کوئی میری دستگیری کے لئے آتا نہیں
پائے ماندن ہے نہ جائے رفتن از طوفان شوق | جذبۂ توفیق بھی یاں نازفرماتا نہیں

(فرشتوں کا ایک جھرمٹ گاتے ہوئے گذرتا ہے)

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے ناتمام ابھی | نقش گر ازل ترا نقش ہے ناتمام ابھی
دانش و دیں و علم و فن بندگی ہوس تمام | عشق گرہ کشائے کا فیض نہیں ہے عام ابھی
جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی | آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگئ نیام ابھی

(روح شاعر دیکھتی ہے کہ پیچھے سے ملنا ب نور کھچ رہے ہیں اور اس کے کھڑے رہنے کا مقام تنگ ہو رہا ہے۔ وہ چیختی ہے اور کہتی ہے)

اے خدائے مہر و مہ خاک پریشانے نگر | ذرۂ در خود فرو پیچید بیابانے نگر

۱؎ بال جبریل ص ۱۴۱۔ ۲؎ زبور عجم ص ۸۶

حسن بے پایاں درون سینۂ خلوت گرفت — آفتاب خویش را زیر گریبانے نگر
بر دل آدم زدی عشق بلا انگیز را — آتش خود را بہ آغوش نیستانے نگر

(روح اقبال کی آواز آتی ہے)

دل زندہ و بیدار اگر ہو تو بتدریج — بندے کو عطا کرتے ہیں چشم نگراں اور
احوال و مقامات پہ موقوف ہیں سب کچھ — ہر لحظہ ہیں سالک کے زماں اور مکاں اور

(روح شاعر پوچھتی ہے)

اے رہبر حیات مرے بال و پر کو دیکھ — معراج رنگ و نور پہ میری نظر کو دیکھ
جی چاہتا ہے قوت پرواز کے لئے — بے چین دل ہے گرمیٔ دمساز کے لیے
لیکن یہ عزم سوز تجلی خدا گواہ — گم کر رہی ہے ذوق نظر شوخیٔ نگاہ
اس اوج منتہی پہ رسائی ہو کس طرح — اور آشکار راز خدائی ہو کس طرح

(روح اقبال جواب دیتی ہے)

میٔ[1] شود پردہ چشم پر کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے
وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

(روح شاعر ایک آہ عارفانہ کھینچتی ہے جس سے اس میں قوت پرواز آجاتی ہے، وہ روح چشم زدن میں ستاروں سے آگے فضائے نیلگوں میں پہونچ جاتی ہے قریب پہونچنے کے بعد اسے ایک بانداز عظیم لوح پر شاندار حروف میں لکھا ہوا نظر آتا ہے "مقام عشق" روح اقبال ایک پردہ رنگیں سے آواز دیتی ہے)

تو[2] اے اسیر مکاں لامکاں سے دور نہیں — وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں — غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں
فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے — قدم اٹھا یہ مقام آسماں سے دور نہیں

(یہاں روح شاعر کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ چل تو رہی ہے لیکن اس کے پاؤں کسی چیز سے نہیں چھوتے جدھر نظر ڈالتی ہے اسے کوئی مقناطیسی قوت اپنی طرف کھینچتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ساری فضا کا رنگ

---

[1] بال جبریل صفحہ ۴۷۔ [2] زبور عجم صفحہ ۲۔

نیلگوں ہے۔ دور دور زمردیں درختوں کی چھاؤں میں زجاجی مینار، گنبد اور محل نظر آتے ہیں۔ فضا میں جو چیز اڑتی ہے دوہری نظر آتی ہے۔ ڈالی پر ذرافشاں طیور کے جوڑے چہچہاتے ہیں، روح شاعر کا یہاں اس طرح خیر مقدم ہوتا ہے)

مینار۔
وحدت کی صدائیں دیتا ہوں — الفت کی فضائیں دیتا ہوں
نیلی ہے قبا ایوانوں کی — آتی ہے صدا ارمانوں کی
ہر گام پہ زینہ نور کا ہے — ہر جلوہ برق طور کا ہے
جلتا ہے مرے سینے میں چراغ — تھامے ہوئے ہوں میں دل کا ایاغ
آ اور یہ شمع عشق اٹھا — آ حسن ازل کی آگ لگا

بلوریں گنبد۔
ہم یہاں جیتر شادمانی ہیں — زینت فرق آسمانی ہیں
نقش رنگیں ہیں ان فضاؤں پر — خواب شیریں ہیں ان ہواؤں پر
عشق مضطر کا دل لبھاتے ہیں — روشنئ نظر بڑھاتے ہیں
ٹھنڈی ٹھنڈی نگاہ میں کھو جا — چھاؤں میں رنگ و نور کی سو جا

طیور آسمانی۔
اڑتے ہیں گاتے ہیں — برق دل چمکاتے ہیں
قدس جاں دکھلاتے ہیں — تکبیریں برساتے ہیں

اللہ ہو اللہ ہو

رنگ و بو پائے جا — جاں بن کر چھائے جا
اپنا دل بہلائے جا — مستی سے یہ گائے جا

اللہ ہو اللہ ہو

(روح شاعر کے سامنے ایک زرنگار تخت، مرصع درخت کی چھاؤں میں نظر آتا ہے۔ پتے جب ہلتے ہیں تو ان سے بہ یک وقت نغمۂ رنگا رنگ اور نسیم سحری کی موجیں نکلتی ہیں۔ روح شاعر تخت پہ بیٹھ کے ستاتی ہے اور اس کا دل بے اختیار گنگنا نا چاہتا ہے)

روحِ شاعر۔ نغمہ کی چھاؤں نکہت بیدار کی ہوا | رنگوں کے قصر و بام سے آرائش فضا
تنہائی و سکون میں شیریں لطافتیں | ہر جنبشِ نگاہ میں رنگیں نزاکتیں
دل جلوہ گاہِ حسن میں مدہوش اقبال | امید کی شعاع تصور کا اختیار
ہر گام پر حیات نظر آزمائے شوق | ہر بات میں خیالِ ازل مبتلائے شوق
انوار کے ظروف میں رنگینیِ خیال | الطاف کے رباب میں اک نغمہ وصال
جذب و کشش سے خونِ جگر کھیلتا ہوا | ہنستے ہوئے فراق کا غم جھیلتا ہوا
کون و مکاں مچلتے ہیں لیتے ہیں نامِ عشق | ہے کتنا دل گداز الٰہی مقامِ عشق

(روحِ شاعر یہ گنگناتے ہوئے سو جاتی ہے۔ مدتوں تک سوئے رہنے کے بعد جاگتی ہے تو عالم ہی کچھ اور ہے۔ سوائے تنہائی اور چند دور کے نغموں کے اور کچھ نہیں ہے۔ لحظہ بہ لحظہ روشنیاں تیز ہوتی جاتی ہیں۔ نور کے پردوں میں لپٹی ہوئی روحِ اقبال گاتی ہوئی گذرتی ہے)

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ[۱] | عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفٰے | عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام
عشق فقیہہ حرم، عشق امیرِ جنود | عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

(پھر آگے بڑھ کے)

صدقِ خلیل بھی ہے عشق، صبرِ حسین بھی ہے عشق[۱] | معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق
تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا | عشق تمام مصطفٰے، عقل تمام بولہب
گاہ بہ حیلہ می برد، گاہ بہ زور می کشد | عشق کی ابتدا عجب، عشق کی انتہا عجب

(روحِ شاعر کہتی ہے)

دلِ مایوس کا امید بھی غم کھائے گی | اس سفر کی کوئی منزل بھی نظر آئے گی؟

(آواز آتی ہے)

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر[۲] | کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتا ہے حجاب آخر

---

[۱] بالِ جبریل ص۱۷۱ و ص۱۵۰ [۲] پیامِ مشرق

(روح شاعر نظر اوپر اٹھاتی ہے اور عالم محویت میں کہتی ہے)

چند بہ روئے خود کشی پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را

(اس وقت ہجوم تجلی سو گنا تیز ہو جاتی ہے۔ نور کی چادریں سیلاب در سیلاب آنے لگتی ہیں۔ روح شاعر اپنی آنکھوں کو خیرہ ہوتی ہوئی دیکھتی ہے یکایک چادروں سے ایک علم لہراتا ہوا گذرتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے)

سطوت از کوہ ستانند و بہ کاہے بخشند
کلہ جم بہ گدائے سر راہے بخشند

گاہ شاہی بہ جگر گوشہ سلطاں ندہند
گاہ باشد کہ بہ زندانی چاہے بخشند

(اس طوفان تجلی سے ایک بڑا فرشتہ نکل آتا ہے جس کے پروں پر سیارے ناچتے ہیں۔ وہ کہتا ہے)

مرکب عشق ہوں انوار کے پر رکھتا ہوں
سطوت کون و مکاں زیر و زبر رکھتا ہوں

مرحبا تجھ کو ملا ذوق یقیں، لذت عشق
دیکھ آئینۂ کونین میں اب شوکت عشق

سوز و ساز نظر و لذت دیدار جگا
نگہ عشق کی اب چشم طلب گا رجگا

پاک کرتا ہے شعاع نگہ حسن طلب
جان آلودہ کو دھو، گود میں لے بخشش رب

گرم کر محفل دل سوز تجلی کی طرح
مست ہو لذت آواز تسلی کی طرح

[illegible] تو عیں کی نگہ پاک سے دیکھ
جلوہ عشق کو سینے دل بے باک سے دیکھ

تیری آہ دل مضطر میں اثر آئے گا
جلوہ شاید تجھے رحمت کا نظر آئے گا

(یہ کہکر فرشتہ روح شاعر کو لے اڑتا ہے دونوں شفق سے بھی زیادہ رنگین بادلوں سے گذرتے ہیں یہ وہ روح کو ایک بہت بڑے ایوان میں چھوڑ دیتا ہے ایک طرف ستاروں کی طرح جھاڑ اور دوسری طرف چاند کا فانوس آویزاں ہے روح اقبال ایک مصلے پر بیٹھی ہوئی گا رہی ہے)

من بندۂ آزادم عشق است امام من
عشق است امام من عقل است غلام من

جاں در عدم آسودہ بے ذوق تمنا بود
مستانہ نواہا زد در حلقۂ دام من

اے عالم رنگ و بو ایں صحبت ما تا چند
مرگ است دوام تو عشق است دوام من

پیدا بہ ضمیرم او پنہاں بہ ضمیرم او
ایں است مقام او، دریاب مقام من

پیام مشرق ص ۱۰۵ [illegible]

(یہاں روح جدھر نظر ڈالتی ہے دیواروں میں تجلیوں کے آئینے نصب کئے ہوئے نظر آتے ہیں روح شاعر جب ان کے سامنے جاتی ہے تو ان میں اپنا عکس نظر نہیں آتا تجلی الٹ کر اس کے منہ پر زد لگاتی ہے۔ روح شاعر کہتی ہے)

بر جہان دل من تاختنش رانگرید   کشتن و سوختن و ساختنش رانگرید

روشن از پرتو آں نور دلے نیست کہ نیست   با ہزار آئینہ پرداختنش رانگرید

(ایوان تجلی میں اب نور کے اتنے سیلاب آنے لگتے ہیں کہ روح شاعر اپنے آپ کو اس میں بہتی ہوئی پاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں آفتاب ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ ایوان کے چاروں طرف دیکھتی ہے لیکن راستہ نظر نہیں آتا۔ ایوان کہتا ہے)

عشق میں نور کا غبار   عشق میں نور کا فشار

عشق میں نور کا حصار   عشق میں نور کا منار

حیرت صد نگاہ ہے، حیرت صد نگاہ ہے

ظرف نہیں تو دید کیا   گوش نہیں شنید کیا

رنج نہیں نوید کیا   سوز نہیں امید کیا

ہیچ یہ جلوہ گاہ ہے، ہیچ یہ جلوہ گاہ ہے

سوز یقیں جگا ابھی   درد جگر بڑھا ابھی

عشق کو جگمگا ابھی   حسن کے گیت گا ابھی

یاں کی یہ رسم و راہ ہے، یاں کی یہ رسم و راہ ہے

دید سے ہے بلند حسن   عشق کی ہے کمند حسن

سوز سے ارجمند حسن   عشق کی قید و بند حسن

سر دہیان نگاہ ہے، سر دہیان نگاہ ہے

(اس وقت نور کی ایسی موجیں اٹھتی ہیں کہ ایوان تجلی اور روح شاعر دونوں اس میں بہ جاتے ہیں۔

بے انتہا مسافت طے کرنے کے بعد روح شاعر ایک بلند مینار سے ٹکراتی ہے جب روح شاعر سنبھل کر مینار پر نظر ڈالتی ہے تو اس کا کلس نگاہ کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا ہے حتی کہ نیلگوں رواق سے بھی گذر جاتا ہے۔ روح شاعر اس مینار پر چڑھ جاتی ہے نور کا طوفان نیچے ٹکراتا ہے چڑھتے ہی وہ اطراف کی فضا کو دیکھتی ہے۔ جہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معشوق ازل اس کی طرف آرہا ہے۔ یہ مقام امید ہے۔

روح شاعر امید کی ترنگ میں معشوق ازل کی آمد کے تصور کر کے گاتی ہے)

"نہ تو اندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی — ولیکن سوئے مشتاقاں چہ مشتاقانہ می آئی

قدم بے باک تر نہ در حریم جان مشتاقاں — تو صاحب خانہ آخر چرا دزدانہ می آئی"

(مینار کے کلس پر جلوۂ ربانی کوندنے لگتا ہے اور روح شاعر یہ دیکھتی ہے کہ چاروں طرف ایک چکاچوند کرنے والا عکس دوسرے پر پڑتا ہے۔ اس طرح برق در برق جلوہ در جلوہ پیدا ہو رہا ہے۔ روح شاعر کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ آنکھ بند کر کے جھومنے لگتی ہے اور کہتی ہے)

از[1] چشم ساقی مست شرابم — بے مے خرابم بے مے خرابم

شوقم فزوں تر از بے حجابی — بینم نہ بینم در پیچ و تابم

از من بروں نیست منزل گہ من — من بد نصیبم راہے نیابم

(اب اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مینار اور روح شاعر دونوں گھمائے جا رہے ہیں۔ اس چکر میں وہ عرش کے نیچے ایک ایسے ازلی میدان میں آنکھ کھولتی ہے۔ جہاں فرش شعاعی اور وسعت لاانتہا کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ بہت دور نور کی ایک لکیر پر یقین اور عشق کے پیکر ستاروں کے ساتھ ساتھ گذرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ روح شاعر یہ کہتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے)

ما را ز مقام ما خبر کن — ما ئیم کجا و تو کجائی؟

پردہ

---

[1] زبور عجم ۵۵

خطاب آخریں

شاعر مستقبل کی روح ہے

رازِ ازل عیاں ہوا سینۂ جبرئیل سے
پوچھ لے زندگی اسے تاب و تب خلیل سے

دستِ کلیم کی قسم، نور کا فیض عام تھا
خنجرِ دوست پنجۂ عشق میں بے نیام تھا

قدس کی نیک زندگی روح حبیب بن گئی
اوج پہ عشق آ گیا، ایک صلیب بن گئی!

آئینہ سازِ عشق تھیں، غارِ حرا کی خلوتیں
لوٹ رہی تھی اک نظر حسنِ ازل کی دولتیں

چاند ستاروں کی جبیں حق کا علم بنی ہوئی
کون و مکاں کی سروری نقشِ قدم بنی ہوئی

روزِ ازل سے اس کا تھا کون و مکاں میں اہتمام
صبحِ حسین پر ہوئی عشق کی زندگی تمام

عرشِ خیال پر وہی نورِ ازل عیاں ہوا
آج پیامِ حسن و عشق نغمۂ جاوداں ہوا

وقت کے آنے والے دور ذوقِ یقیں سے کام لے
فکرِ عمل نہ کر سکے عرش نشیں سے کام لے

جلوۂ روح و عقل و دل آئینۂ خودی میں دیکھ
مستیٔ سوزِ جاوداں ساغرِ بے خودی میں دیکھ

حکمت و علم و فلسفہ، خار و خس حیات ہیں
تیری سیاستیں نہیں ظلمتِ شش جہات ہیں

عالمِ حسن دوست میں عشق کی پر فشانیاں
دور کریں گی دہر سے روح کی ناتوانیاں

عشق کا بادۂ ازل ورثۂ جبرئیل ہے
عشق کی بزمِ آتشیں گل کدۂ خلیل ہے!

(۱۹۲۸)

محمد عبدالقیوم خاں صاحب باقی

دیسی صنعتیں

سنہ ۱۹۱۸ء کی صنعتی کمیشن کا بیان ہے کہ اس وقت جبکہ جدید صنعتی نظام کا جنم بھوم یعنی مغربی یورپ غیر متمدن قبائل سے آباد تھا، ہندوستان کے بادشاہوں کی دولت اور اس کے صناعوں کی چابکدستی کا شہرہ تھا اور اس کے بہت عرصہ بعد بھی جبکہ مغرب کے اولوالعزم تاجروں نے پہلی بار ہندوستان میں قدم رکھا۔ اس ملک کی صنعتی ترقی یورپ کی ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ مگر آج وہی ہندوستان اپنی بیشتر صنعتی ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں کا محتاج ہے قدیم زمانے میں ہندوستان کی صنعتوں کی شاندار ترقی اور انیسویں صدی میں ان کا افسوسناک زوال ہمیں دعوت فکر دیتا ہے اس حالات کے ذمہ دار کئی اسباب ہیں نامساعد حالات بھی، اہل ملک کی غفلت اور باہر والوں کی ریشہ دوانیاں بھی۔ ذیل میں ان اسباب کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان کی صنعتوں کے زوال کا سبب یورپ میں طریق پیدائش میں تبدیلی تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد کاروبار کے سیدھے سادے طریقوں کی جگہ پیدائش بر پیمانۂ کبیر، پیچیدہ تر تقسیم عمل، اعلیٰ تنظیم اور بڑی بڑی کلوں نے لے لی۔ ذرائع نقل وحمل کی بڑھتی ہوئی سہولتوں، ذرائع معاش کی افزائش اور نوآبادیات کی دریافت نے یورپ والوں کے آگے صنعتی ترقی کا میدان پیش کیا ادھر ہندوستان میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی پستی بھی پھیلی۔ حکومت اور عوام کسی نے بھی صنعتی ترقی کی کوشش نہ کی۔ ہمارے ہاں کا کاروبار اسی پرانی ڈگر پر چلتا رہا۔ قدیم درباروں کے تباہ ہو جانے اور محض بیرونی اثرات کی وجہ سے صنعتوں کا حال پہلے ہی خراب ہو رہا تھا اور بقول مسٹر دت "یورپ میں مشین کی بُنائی کی ایجاد نے ہندوستانی صنعتوں کے زوال کی آخری منزل بھی پوری کرادی"

(۲) دیسی دربار ملک کی مصنوعات کے سرپرست تھے سیاست کی کروٹ نے ان کو تباہ کر دیا عوام میں افلاس پھیلا۔ جدید حاکموں کا مذاق دوسرا تھا۔ وہ قدیم درباری مصنوعات کے قدردان نہ تھے۔

ادھر عوام میں جو لوگ کچھ استطاعت رکھتے تھے۔ اُن پر حاکموں کی تقلید اور مغربی تعلیم کا اثر مذاق کی تبدیلی میں نمودار رہا۔ غرض یہ کہ مصنوعات بے آسرے کے رہ گئیں تباہی یقینی تھی۔

(۳) برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش اور حکومت ہند کی غفلت بھی دیسی صنعتوں کے زوال کا بہت بڑا سبب ہے ایچ، ایچ، ولسن صاحب کی رائے ہے کہ "اگر اس قدر بھاری محصول اور ممانعتی قوانین نہ ہوتے تو باوجود دخانی قوت کے پیلی اور مانچسٹر کے کارخانے شاید ہی چل سکتے" برطانوی صناع نے سیاسی ناانصافی کے ہتھیار کو اپنے حریف کے نیچا دکھانے کے لئے استعمال کیا کیونکہ برابر کے مقابلہ میں وہ اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا" غرض یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ برطانیہ نے جان بوجھ کر ہندوستان کی صنعتوں کو تباہ کیا۔ یہاں کے صناعوں پر طرح طرح کے ظلم ڈھائے کمپنی کی حکومت کے زمانے میں اس کے دلال ملک کے ہر حصہ میں پھیل گئے۔ سیاسی قوت کے اثر سے انھوں نے دیس کے بےبس صناعوں کو مجبور کیا کہ وہ کمپنی کے سوا کسی سے لین دین نہ رکھیں کمپنی کے کارندے اجارے کے سامان کی من مانی قیمتیں مقرر کرتے۔ صناعوں سے زبردستی معاہدہ کراتے کہ وہ کمپنی ہی کا کام کریں گے اگر وہ وعدہ خلافی کرتے تو ان کو قید میں ڈالدیا جاتا۔ بدنصیب صناعوں نے تنگ آکر زراعت کی طرف رجوع کیا مگر ان کی قسمت سے ان کو وہاں بھی پناہ نہ ملی۔

باوجود اس قدر جور و زبردستی کے بھی ہندوستان کی مصنوعات انگلستان کے بازاروں میں بکتی رہیں آخر کار انگلستان میں ہندوستان کی مصنوعات کی درآمد پر بھاری محاصل عائد کئے گئے کئی ایک صنعتوں کی درآمد انگلستان میں بالکل ہی بند کر دی گئی ذیل میں چند محاصل کی کیفیت واضح کی جاتی ہے۔ جو کہ "نمونہ مشتے از خروارے" ہے۔

اشیا	برطانوی مال پر ہندوستان کا محصول	ہندوستانی مال پر انگلستان کا محصول
روئی کی مصنوعات	۳½ فی صد	۱۰ فی صد
اونی مال	۲ فی صد	۳۰ فی صد
کچا لوہا	×	۵ شلنگ فی ٹن

(۴) انگلستان نے اٹھارویں صدی میں خود تامین تجارت کی بدولت ترقی کی تھی اور اب جب

اس کی صنعتی حالت مستحکم ہو گئی تو اس نے دوسرے ملکوں کو اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیئے تاکہ اگر یہ ملک اور خاص کر ہندوستان تامین کے طریقے پر عمل پیرا ہوتے تو انگلستان کے مال کی کھپت ممکن نہ ہوتی اسلیئے برطانیہ نے آزاد تجارت کی علمبرداری کی۔ مانچسٹر اور لنکا شائر کے کارخانہ داروں کے دباؤ سے حکومت ہند نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی۔ برطانیہ کے بغیر کسی روک ٹوک کے مصنوعات ملک میں درآمد ہونے لگے اور ہندوستان کے سپرد خام پیداوار پیدا کرنے کا کام ہوا۔

(۵) ضرورت تھی کہ برطانوی مال ملک کے گوشے گوشے میں پہونچ کر ہندوستانی مصنوعات کا گلا گھونٹے اس کے لئے برطانوی سرمایہ داروں نے سب سے پہلے ریلوں میں روپیہ لگایا۔ اگرچہ یہ کام شروع میں منافع بخش ثابت نہ ہوا مگر چونکہ حکومت ہند نے برطانوی سرمایہ داروں کو منافع کی ایک خاص شرح ادا کرنے کا وعدہ کر لیا تھا اس لئے انھوں نے اندھا دھند روپیہ لگایا۔ ولیم میسے صاحب نے جو وائسرائے کی کونسل کے وزیر مالیات تھے ایک پارلیمنٹری کمیٹی کے آگے برطانیہ کے سرمایہ داروں کی روش کے متعلق بیان دیا کہ انھیں " اس چیز کی پرواہ نہیں کہ جو روپیہ انھوں نے قرض دیا وہ کسی تعمیری کام میں صرف ہوتا ہے یا دریائے ہگلی میں غرق کیا جارہا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ روپیہ کثیر تعداد میں خرچ کیا گیا اور ایسٹ انڈین ریلوے میں فی میل ۳۰۰۰۰ پونڈ خرچ ہوئے" بہرحال اس طرح ریلوں کا جال سارے ہندوستان میں پھیل گیا۔ مشین کی بنی ہوئی سستی بیرونی مصنوعات کے مقابلے میں دیسی صنعتیں پنپ نہ سکیں۔ ریلوے کے محاصل اس انداز سے مقرر کئے گئے کہ باہر کا آیا ہوا مال ملکی مال سے کم خرچ میں منتقل ہو سکے۔

(۶) دیسی صنعتوں کو کسی قسم کی مالی امداد نہ مل سکی۔ حکومت ہند نے ہندوستان کے زر کے ذخیروں سے انگلستان کے کارخانوں کو روپیہ قرض دیا مگر ملک کی مستحق صنعتوں کی سرپرستی نہ کی۔ حکومت کے بنکاری کے اداروں یعنی پریزیڈنسی بنکوں اور امپیریل بنک نے اہل ہند کے مفادات کی طرف سے ہمیشہ مجرمانہ غفلت برتی۔

(۷) معاہدہ اٹاوہ میں شاہی ترجیح کا اصول تسلیم کیا گیا۔ جس سے برطانیہ کے علاوہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت برآمد کو نقصان پہونچتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ برطانیہ یا برطانوی مقبوضات

کے مقابلہ میں دوسرے ممالک ہندوستان سے زیادہ سامان منگاتے ہیں۔ ترجیح ہمارے لئے صرف ایک حد تک ہی مفید ثابت ہوگی بلکہ برطانیہ کی مانگ ہماری ... اشیا ... کی مانگ بھی کم نہ ہو۔ ترجیح کا فائدہ مشتبہ ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ برطانیہ عظمیٰ کو ہماری ... کے زیادہ مقدار میں جانے کی امید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں نئے ملکی مال کی ... باعث ان ممالک میں ہندوستانی اشیا کی مانگ یقیناً گھٹ جائے گی۔"

(خیالات پروفیسر برج نرائن صاحب)

غرض یہ کہ ان سب اسباب نے مل کر ہندوستان کی صنعتوں کو موجودہ حالت پر پہونچا دیا اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس انقلابی دور میں حکومت اور اہل ہند کو صنعتوں کے متعلق کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے کیا انگلستان اور امریکہ کے نقش قدم پر چل کر ہندوستان میں بھی اسی طرح کی صنعتی ترقی کے حصول کی کوشش کی جائے؛ یا جدید طرز کی صنعتوں کی طرف سے بالکل بے نیازی برتی جائے! یا پھر جاپان کی طرح جدید صنعتوں اور گھریلو دستکاریوں کو ساتھ ساتھ چلایا جائے۔

صنعتی ترقی کی نوعیت کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ ہمیں یہ ہرگز نہ بھولنا چاہیئے کہ صنعتی ترقی محض ایک ذریعہ ہے جس کا مقصود تمام قوم کی معاشی خوش حالی ہے۔ یورپ کے جدید صنعتی نظام کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہاں ذریعہ کو مقصد قرار دے لیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے اکثر سیاسی جھگڑے اسی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ وہاں مشین آدمیوں کو بیکار کر دیتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جدید انتظام کی بدولت جسے (Rationalisation) کہتے ہیں، امریکہ میں چالیس فی صدی آدمی بیکار ہو گئے۔ (بحوالہ رسالہ ہندوستانی اقتصادیات، مضمون متعلقہ معاشی خیالات از مہاتما گاندھی) علاوہ اس کے ان ممالک میں جو پیداوار ہوتی ہے وہ اپنے ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جس کی نکاسی کے لیے ان کو دوسرے ممالک کو اپنی منڈی بنانا پڑتا ہے۔

ہندوستان کی آبادی کا صرف ایک فی صد بڑے پیمانے کی صنعتوں میں مشغول ہے اور ہندوستان دنیا میں آٹھویں درجے کا صنعتی ملک تصور ہوتا ہے۔ اگر موجودہ صنعتی پیداوار کو دوگنا کر دیا جائے تو یہ اچھی خاصی ترقی ہوگی۔ مگر ہندوستان کی آبادی ہی کا اضافہ ایک فی صد سالانہ ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ صنعتی ترقی کا

یہ اضافہ آبادی کے اضافے کی وجہ سے بیکار ہو جائے گا۔ اور ہمارا اصل مقصد حاصل نہ ہو سکے گا جو تمام ملک کے باشندوں کے لئے روزگار فراہم کرنا ہے۔

پھر اگر بالفرض ہم اپنی تمام آبادی کو بھی بڑے پیمانے کی صنعتوں میں لگا دیں تو ہماری صنعتی پیداوار اتنی بڑھ جائے گی کہ ہمیں برطانیہ اور امریکہ سے بھی کہیں زیادہ بڑے علاقے کو اپنی منڈی بنانا پڑے گا اور یہ چیز خود کفالتی اور معاشی بے نیازی کے چرچوں کی وجہ سے بالکل ناممکن ہے۔ ہندوستان محض برآمدی ملک بھی نہیں بن سکتا کیونکہ آج کل تجارتِ خارجہ مبادلہ اشیا کے طریقے پر چلتی ہے۔ جتنی قیمت کا مال ہم برآمد کریں (جس کی مقدار مفروضہ بالا میں بے انتہا ہو گی) اتنا ہی مال درآمد بھی کرنا پڑے گا لیکن اگر ملک میں اسکی طلب اور مصرف نہ ہو تو تجارت خارجہ سرے سے بند ہو جائے گی۔

غرض یہ کہ محض جدید پیمانے کی صنعتوں کا چلانا کسی صورت میں بھی قابل قبول نہیں ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ صرف قدیم وضع کی صنعتوں سے بھی کام نہیں چل سکتا۔ یہ مانا کہ قدیم زمانے میں ہندوستان میں چھوٹے اور متوسط پیمانے کی صنعتوں ہی کا رواج تھا۔ ملک خود کفیل تھا اور خوشحال۔ مگر آج کل حالات بدل چکے ہیں۔ مسابقت کے اس دور میں یہ طریق کار نہیں چل سکتا۔

بہتر صورت اس مسئلے کا یہ ہے کہ قدیم اور جدید صنعتوں کو پہلو بہ پہلو چلایا جائے۔ جاپان کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اہل جاپان نے بعض ایسے کاموں کو جو تمام کے تمام مشین سے ممکن تھے چھوٹے چھوٹے کاموں میں تقسیم کر کے گھریلو دستکاروں کو دیدیا۔ دستکار کارخانوں کی ہدایت کے مطابق کام کرتے ہیں اور بعد میں اپنے نتائج لا کر کارخانے کو دیدیتے ہیں جہاں مشین کے ذریعہ ان کی تکمیل کر دی جاتی ہے دیاسلائی اور پارچہ بافی خصوصاً ریشم کی صنعت اور بہت سی دوسری صنعتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہندوستان میں بھی یہی طریقہ کامیاب بن سکتا ہے۔ ایک ہی ملک میں ایک ہی پیشہ کی مسابقت سے چھوٹے دستکاروں کو نقصان کا زبردست اندیشہ ہے لیکن اگر مندرجہ بالا طریقے سے گھریلو صناعوں اور بڑے بڑے کارخانوں میں اشتراک عمل پیدا کر دیا جائے تو بہترین نتائج کا حاصل ہونا یقینی سے۔ حاصل یہ کہ ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کو ترقی دینی چاہیئے لیکن طریق پیدائش میں اصلاح کر کے جدید مصنوعات سے ان کا ربط

قائم کر دینا چاہئے۔

اب ہمیں غور یہ کرنا ہے کہ کیونکر ان دستکاریوں کو ترقی دی جائے۔ ان کی امداد اور اصلاح کیلئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

(۱) قدیم صنعتوں کی امداد اور ترقی کے لئے پہلا قدم یہ اٹھانا چاہئے کہ ملک کی تمام گھریلو دستکاریوں کی مکمل تحقیقات کی جائے اور جو صنعتیں ابھرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں ان کی ممکنہ امداد کی جائے۔

(۲) گھریلو دستکاریوں کی کامیابی کے لئے پہلی ضرورت دستکاروں کی تعلیم کی ہے۔ ان کو عام تعلیم اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں بہم پہونچانی چاہئیں جگہ جگہ صنعتی اسکول کھولدینے چاہئیں اور اگر ممکن ہو تو عام طور پر اسکولوں اور کالجوں میں بھی دستکاریوں کی تعلیم بحیثیت ایک لازمی مضمون کے دی جائے تاکہ پڑھ لکھ کر ہمارے نوجوان بیکاری کی مصیبت میں گرفتار نہ ہوں۔

(۳) ضرورت ہے کہ تحقیقات فنی کا ایک ایسا ادارہ کھولا جائے جو گھریلو دستکاریوں کے کاروبار کی اصلاح اور ان کی وسعت کے امکانات پر غور کرے اور دستکاروں کے آگے بہتر سے بہتر لائحہ عمل پیش کرے۔

(۴) عمل پیدائش میں کافی اصلاح کی گنجائش ہے۔ چھوٹے پیمانے کے کاروباروں میں تقسیم عمل کی گنجائش کم ہوتی ہے لیکن جدید آلات اور زیادہ تنظیم کی بدولت تقسیم عمل کو بڑھایا جا سکتا ہے جدید آلات کے ساتھ اعلیٰ درجے کی خام پیداوار کی بھی ضرورت ہے تاکہ تیار شدہ اشیا کی قسم بہتر بنائی جا سکے۔ سستی قیمت پر اعلیٰ درجے کی خام پیداوار اور جدید آلات دستیاب نہیں ہو سکتے۔ بغیر معقول مالی امداد کے یہ کام ناممکن ہے

۵۔ مالی امداد۔ صنعتی کمیشن کی رائے ہے کہ صنعتوں کے ناظم کی وساطت سے دستکاروں کو اصل کی ضروریات کے واسطے قرضے دئے جائیں۔ بالاقساط طریقۂ خرید پر آلات تقسیم کئے جائیں لیکن بہترین حل اس مسئلے کا شاید امداد باہمی سے ممکن ہے۔ اگر صنعتی بنک کھولدئے جائیں تو وہ نہ صرف بڑے پیمانہ کی صنعتوں کو مدد دے سکیں گے بلکہ اپنی شاخوں کے ذریعہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی بھی امداد کر سکیں گے۔ بہت سے صوبوں میں صنعتوں کو حکومت کی مالی امداد دینے کے متعلق قوانین بھی بن چکے ہیں لیکن ابھی حکومت کی امداد کو بڑھانے کی بہت ضرورت ہے۔

(۶) دستکاروں کی جہالت اور ان میں کسی تنظیم کا نہ ہونا بھی گھریلو دستکاریوں کی پست حالی کا بڑا سبب ہے۔ کارخانہ داری کا طریقہ قابل اعتراض ہے۔ کارخانہ دار ملازمین سے کام تو لیتا ہے لیکن ان کی فلاح کا زیادہ خیال نہیں رکھتا۔ ضرورت ہے کہ امداد باہمی کی انجمنوں کے ذریعہ دستکار خود اپنے کارخانے قائم کریں

(۷) جب تک فروخت پیداوار کی سہولتیں نہ ہوں یہ سب انتظام بیکار ثابت ہوگا۔ منظم بازار نہ ہونے کی وجہ سے دستکار اپنی چیزوں کی پوری پوری قیمت وصول نہیں کر سکتا۔ فروخت پیداوار کے لئے انجمنہائے فروخت کا وجود ضروری ہے۔ ہمارے پاس بیرونی بازار تو ہیں ہی نہیں اور اندرونی منڈیوں کی حالت بھی قابل اصلاح ہے۔ بمبئی کے سودیشی اسٹورز میں ملکی پیداوار کی فروخت کے لئے قابل تقلید نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ محکمہ صنعت کو اس قسم کے تجارتی اداروں کے ساتھ کام کر کے ہندوستان کی دستکاریوں کو اندرون ملک و بیرون ملک کے گاہکوں تک پہونچانے میں مدد کرنی چاہئے۔ بکھری ہوئی دیہی صنعتوں کے اتحاد اور وسیع ترین ممکنہ منڈی کے حاصل کرنے کے لئے مرکز میں ایک تجارتی ادارہ قائم کرنا چاہئے۔ لائسنس یافتہ گوداموں اور امدادی فروخت گاہوں کی بھی ضرورت ہے۔ جہاں دیہی پیداوار کے ذخیرہ کرنے اور فروخت کرنے کا انتظام ہو۔

(۸) ایک عام شکایت یہ ہے کہ پبلک کا مذاق بگڑ گیا ہے اور وہ گھریلو دستکاریوں کی طرف توجہ نہیں دیتی اس کے لئے ضرورت ہے کہ دستکاروں کو کام کرنے کے لئے جدید قسم کے نمونے فراہم کئے جائیں نیز ضرورت ہے کہ پوری قوت کے ساتھ دیسی فن کاری کے نمونوں کی تشہیر کی جائے نمائشیں منعقد کی جائیں اور ہر طریقہ سے گھریلو صنعتوں کو رواج دیا جائے۔ پروپیگنڈے کی ضرورت ہر جگہ ہے اور دیہی صنعتوں کی ترقی کی ہر کوشش میں اس سے کام لینا چاہئے۔

اگر ہم گھریلو صنعتوں کو مکمل طور سے ترقی دینے میں کامیاب ہو گئے تو یقین ہے کہ ملک کے سب سے بڑے مسئلے یعنی بیروزگاری کے مسئلے کو حل کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

آیت اللہ بیگ صاحب عارف

جرمنی اور سوویٹ کی جنگ

لینن اور ٹروٹسکی کا خیالی مکالمہ

(اس مضمون کا مواد ٹروٹسکی کی مشہور کتاب THE REVOLUTION BETRAYED سے لیا گیا ہے جو ہر صاحب ٹروٹسکی کے معتقدین میں سے ہیں یہ مضمون انھوں نے جنگ کے شروع ہونے پر لکھا تھا۔ اگر کوئی صاحب اس کا جواب لکھنا چاہیں تو وہ "جامعہ" میں چھاپا جا سکتا ہے" مدیر)

لینن۔ آج تو عجیب خبر سن رہا ہوں ٹروٹسکی؟

ٹروٹسکی۔ کیا خبر؟

لینن۔ کہ جرمنی اور سوویٹ میں جنگ شروع ہوگئی کیا تمہیں اس کا کچھ علم ہے؟

ٹروٹسکی۔ جب میں دنیا میں تھا اس وقت تو جرمنی اور سوویٹ میں ایک معاہدہ دستخطی ہوا تھا اور میں اسی وقت سمجھتا تھا کہ اس معاہدہ کی عمر شاید ہی دو برس ہو بہت ممکن ہے کہ جنگ شروع ہوگئی ہو میں ابھی معلوم کر کے آتا ہوں۔ (ٹروٹسکی جاتا ہے اور کچھ دیر بعد معلوم کر کے واپس آتا ہے)

لینن۔ کیوں ٹروٹسکی کیا معلوم ہوا؟

ٹروٹسکی۔ وہاں تو لاکھوں سپاہی آئے ہوئے ہیں جنگ بڑے زور شور سے جاری ہے۔ روسی افواج پسپا ہو رہی ہیں جنگ شروع ہوئے ۱۶ دن بھی نہیں ہوئے ہیں کہ جرمنی کی فوجیں ماسکو کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ سنتا ہوں کہ سوویٹ فوجیں مقابلہ تو کر رہی ہیں لیکن جرمنی کا پلہ بھاری ہے۔

لینن۔ یہ کیسے ہوا ٹروٹسکی۔ میں تو سمجھتا تھا کہ میرے بعد بھی ترقی جاری رہے گی اور سوویٹ ایک طاقتور پرولتاری حکومت ہو جائے گا لیکن جرمنی کی کامیابی سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوویٹ کی جو حالت میرے زمانہ میں تھی شاید اس سے بھی ابتر ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ وہاں کی اقتصادی حالت کیسی ہے۔

ٹروٹسکی۔ وہاں کی اقتصادی حالت؟ کیا حالت بتاؤں! مجھے تو اسٹالین نے روس سے نکال دیا تھا اس لئے جو کچھ

اخباروں اور دوستوں کے ذریعہ سے معلوم ہوتا رہتا تھا وہی جانتا ہوں۔ یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ملک کی اقتصادی حالت اچھی نہیں ہے سوویٹ کی تیل کی صنعت کا افسرِ اعلیٰ لکھتا ہے:۔

"ہماری صنعت میں وہی مشینیں استعمال ہوتی ہیں جو امریکہ میں لیکن ہمارے یہاں ماہر کاریگر کم ہیں اس لئے مشینوں کی ٹوٹ پھوٹ بہت ہوتی ہے کام کرنے والے لاپروا ہیں اور ماہرین اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کرتے"

مولوٹوف کہتا ہے۔

"ہم عمارت کے کام میں بہت پیچھے ہیں۔ عمارت کا کام پرانے طریقہ پر پرانی وضع کے اوزاروں سے کیا جاتا ہے"

اس قسم کے بہت سے جملے سوویٹ کے سربرآوردہ اصحاب کی زبان سے نکلتے رہتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کام تسلی بخش نہیں ہو رہا ہے۔ اگرچہ روس میں خام جنسوں کی پیداوار میں کافی ترقی ہوگئی ہے لیکن جب تک ملک میں اعلیٰ قسم کی مشینیں نہ تیار ہوں اسوقت تک لوہے، کوئلہ وغیرہ کی پیداوار بہت کم معنی رکھتی ہے۔ ملک کی صنعت وحرفت زیادہ تر فوجی محکمہ کا کام کرتی رہتی ہے لیکن محکمہ فوج کا اعلیٰ افسر ریشیوٹوف ٹسکا بیتا کہتا ہے:۔

"جس قسم کی اشیا فوجی محکمہ کے لئے تیار کی جاتی ہیں ان کی مضبوطی وغیرہ قابل اطمینان نہیں ہوتی" یہ کافی مخدوش بیان ہے۔ رسل و رسائل بڑی خراب حالت میں ہیں۔ سڑکیں اتنی خراب ہیں کہ بڑی شاہراہوں پر موٹر گھنٹے میں صرف ۶ میل چل پاتی ہے۔ ملک میں سڑکیں بہت کم ہیں ہر ۱۰۰۰ آدمیوں کے لئے جرمنی میں ۴،۸ کیلو میٹر اور روس میں صرف ۵ کیلو میٹر ریل ہے۔ سوویٹ میں ریل کی پٹری تمام ترقی یافتہ ملکوں سے کم ہے۔ فرانس میں ۱۰۰۰ آدمیوں کے پاس ۵،۴ موٹریں ہیں لیکن روس میں صرف ۲، ہیں۔ سوویٹ میں ایک سال میں مال کی موٹر امریکہ کی مال کی موٹر کی نسبت صرف ⅓ سفر طے کرتی ہے۔ ۱۰۰ میں سے ۵۵ مشینیں اس قابل نکلتی ہیں کہ کچھ عرصہ کام کرسکیں باقی کو کچھ کام کے بعد مرمت خانہ جانا پڑتا ہے۔ مرمت کا خرچ نئی مشین تیار کرنے سے دوگنا ہے

حکومت اس نقص کا اعتراف کرتی ہوئی کہتی ہے :۔

"موٹر کے ذریعہ سے ریل ورسائل کا خرچ جنس بنانے کے پڑتے کو بہت بڑھا دیتا ہے۔"

بقول Council of Peoples' Commissars ریل میں بھی ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سوویٹ میں ماہر کاریگروں کی بہت کمی ہے۔ اس کمی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ بجلی کی سویچ صاف رکھنا ایک ایسا مشکل کام ثابت ہو رہا ہے کہ ان کی صفائی کے متعلق کریملین کے سب سے بڑے افسروں کو رپورٹ کی جاتی ہے۔ پراودا اخبار لکھتا ہے۔

"کپڑے کی صنعت بڑی ردی حالت میں ہے۔ مال اکثر ناقص سستا اور صرف دو چار نمونہ کا ہوتا ہے" یہی ہے کہ روزمرہ کے استعمال کے برتن اور فرنیچر بڑا بھونڈا تیار ہوتا ہے ملک کی عام پسماندگی کا یہ عالم ہے کہ روس میں اچھے قسم کے بٹن ملنے مشکل ہیں دارالخلافہ اور دوسرے تجارتی شہر اپنے آپ کو بڑے اور خوشنما سنیما، تھیٹر اور کلب گھروں سے تو مزین کر رہے ہیں لیکن رہنے کے مکانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ اخبار اسوستیا لکھتا ہے۔

"ہم کافی خرچ کرنے کے بعد بھی ایک خراب عمارت بنا پاتے ہیں۔ عمارتیں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی خراب حالت میں ہیں مرمت اول تو ہوتی ہی نہیں اور اگر ہوتی ہے تو بری طرح اور ناکافی"

ملک کی صنعت وحرفت کا چونکہ ایک دوسرے سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ایک صنعت کی پسماندگی کا اثر دوسری پر پڑتا ہے اور دوسری کا دوسری اور پڑ اس طرح ملک کی تمام صنعت وحرفت آشوبی ہو کر رہ گئی ہے ۱۹۳۵ء کے اعداد وشمار سے معلوم ہوتا ہے کہ سوویٹ میں ایک مزدور ۲۰ ٹن کوئلہ نکال پاتا ہے اور جرمنی ۱۴۰ ٹن نکالتا ہے۔ ایک مزدور سوویٹ میں ۷۶ کیلو گرام فولاد نکال پاتا ہے اور امریکہ میں ۵۰۰ کیلو گرام نکالتا ہے ۱۹۳۵ء میں سوویٹ یونین میں فی کس ۱۵۳ کلو واٹ بجلی حصہ میں آتی ہے اور جرمنی میں ۴۷۶ ۱۹۳۵ء میں سوویٹ میں ایک میٹر فی کس حصہ میں آتا تھا۔ اونی کپڑا صرف سربرآوردہ طبقہ کے لوگوں کو میسر آتا تھا عوام جاڑوں میں بھی سوتی کپڑا استعمال کرنے پر مجبور تھے۔

سوویٹ یونین میں جتنے لوگ ننگے پیر رہتے ہیں شاید ہی دوسرے ملکوں میں رہتے ہوں سوویٹ میں

ہر ۸ اور جرمنی میں ہر ۹ آدمیوں کے پاس گائے ہے اور اگر دودھ کی مقدار کا حساب لگایا جائے تو جرمنی کی ایک گائے روس کی دو گایوں کے برابر ہے کاغذ کے اعداد و شمار بہت دلچسپ ہیں کیونکہ یہ کسی ملک کی تہذیب و تمدن و ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں روس میں فی کس ۴ کیلوگرام کاغذ خرچ ہوتا تھا۔ اور جرمنی میں ۴۰ کیلوگرام امریکہ میں ایک سال میں فی کس ۱۲ پنسلیں استعمال کی جاتی ہے اور سوویٹ میں صرف ۴ اور وہ چار بھی امریکہ کی ایک پنسل کے برابر کام دیتی ہیں۔ اخباروں میں اکثر اس قسم کی خبریں پڑھنے میں آتی ہیں کہ کاغذ اور پنسل کی کمی کی وجہ سے اسکول کے کام میں بہت دقت محسوس ہوتی ہے

لینن۔ ٹراٹسکی تمہاری باتیں سن کر تعجب ہوتا ہے۔ گرچہ یہ حالات ۱۹۳۵ء کے ہیں لیکن اس سے روس کی ۱۹۴۱ء کی حالت کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ سنتا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو استالین ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔ مجھے احساس ہے کہ روس اپنی پسماندگی اپنے کاندھوں پر اٹھا کے چل رہا ہے۔ ہر قوم کو اپنا ماضی اپنے ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ اشتراکی ملکیت قائم کرنے اور نقشہ کے مطابق اقتصادی زندگی کو ترتیب دینے کا یہ اثر ہوگا کہ روس دس پندرہ سال ہی میں سرمایہ دار ملکوں کے دوش بدوش آجائے گا۔

ٹراٹسکی۔ میرا بھی یہی خیال تھا اور اس ترقی کا امکان بھی تھا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پارٹی کمزور ہوگئی اور حکومتی طبقہ کو دبانے کیلئے ہم نے جو کنٹرول کمیشن مقرر کیا تھا حکومتی طبقہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کو اپنے طبقہ کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا آپ کے یہاں آنے کے فوراً ہی بعد استالین اور حکومتی طبقہ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ سوشلزم ایک ملک میں جاری کیا جا سکتا ہے اس کو دوسرے ملکوں کی سیاسی اور اقتصادی حالت سے کوئی سروکار نہیں جب میں نے یہ کہا کہ سوویٹ کو اقتصادی دوڑ میں بین الاقوامی ترقی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رفتار کو بہت تیز کرنا چاہیے تو مجھ سے کہا گیا کہ میرا بین الاقوامی نقطۂ نگاہ غلط ہے جب میں نے بجلی کا ایک بڑا اسٹیشن بنانے کی تجویز پیش کی تو استالین نے کہا کہ بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لئے ایسا ہے جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا۔ سوویٹ میں اقتصادی ترقی کچھوے کی چال سے ہوتی ہے حالانکہ دنیا

کی اقتصادی حالت دیکھتے ہوئے ہرن کی رفتار درکار ہے۔

لینن۔ یہ ایک ملک کا نظریہ کیا ہے؟

ٹروٹسکی۔ کہ ہم صرف سوویٹ میں اشتراکی نظام قائم رکھ سکتے ہیں ہمیں بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کرنے کی سعی کی ضرورت نہیں ہے۔ اسٹالین نے ایک نامہ نگار رائے ہیو ورڈ کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دنیا میں انقلاب کرنا نہ ہمارا مقصد ہے اور نہ ہم اس کی تدبیر کرتے ہیں یہ ایک بڑی تکلیف دہ اور مضحکہ خیز غلط فہمی دنیا میں پھیل گئی ہے کہ ہم تمام ممالک میں اشتراکی انقلاب کرنا چاہتے ہیں ہمارا ہر کہیں انقلاب کرنا لغو ہے۔ ہاں اگر کوئی ملک خود انقلاب کرنا چاہے تو کرے۔ ہم انقلاب کرنا چاہتے تھے چنانچہ ہم نے انقلاب کر دیا"

لینن۔ اس پر نامہ نگار نے اسٹالین سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اگر ایک ملک میں انقلاب کا نظریہ درست ہے تو ماسکو میں کیمونسٹ انٹرنیشنل کس مقصد کے لئے قائم ہے؟

ٹروٹسکی۔ بھلا نامہ نگار اس قسم کے سوالات کیسے کر سکتا تھا۔ اس قسم کے سوال وجواب تو ملی بھگت ہوتے ہیں

لینن۔ جب ہم نے کیمونسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی تو پکار پکار کر کہا کہ مختلف ملکوں کی پرولتاری جماعتوں کو ایک دوسرے کی مدد زبانی نہیں بلکہ ہتھیاروں سے کرنی چاہیے۔ ہم نے خود فنلینڈ، لٹویا، استھونیا، جارجیہ کی مدد لال فوج سے کی تھی جب پولینڈ کی پرولتاری جماعت نے انقلاب کرنا چاہا تو ہم لال فوج لے کر وارسا پر جا دھمکے۔

ٹروٹسکی۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں ہم نے چینی کیمونسٹ کی مدد کے لئے کمانڈر اور تنظیم کرنے والے روانہ کئے اور اسی سال لاکھوں ڈالر انگلستان کے ہڑتالی مزدوروں کو روانہ کئے کسی زمانہ میں بین الاقوامی انقلاب کا تخیل ہمارا بنیادی سیاسی تخیل تھا آج وہ اسٹالین کے نزدیک ایک تکلیف دہ اور مضحکہ خیز غلط فہمی ہو گیا ہے۔ سنتا ہوں کہ موجودہ جنگ میں یوگوسلاویا پر حملہ ہوا جہاں اشتراکیوں کا زور تھا لیکن سوویٹ کا حکومتی طبقہ باوجود معاہدہ ہونے کے اس کو تباہ ہوتے دیکھتا رہا۔

لینن۔ اسٹالین اور حکومتی طبقے نے جب ملکی اور قومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنا چاہا تو پرولتاری جماعت

اور ہماری پارٹی کے عام ممبروں نے مخالفت کیوں نہیں کی؟

ٹروٹسکی۔ پارٹی کے عام ممبر اور پرولتاری جماعت کیا مخالفت کرتی۔ آپ کے سامنے ہی خود پارٹی میں ایک اونچے لوگوں کی ذات پیدا ہو گئی تھی۔ آپ کے دنیا سے روانہ ہوتے ہی اس سربرآوردہ طبقہ نے آپ کی یادگار میں Leninist Levy کی یعنی پارٹی کے دروازے کھولدئے اور جس کسی نے درخواست کی اسی کو پارٹی کا ممبر بنا لیا چنانچہ پارٹی میں بے اندازہ بورژوازی اور ٹٹ پونجیا بورژوازی داخل ہو گئے یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے انقلاب کرنے میں تو حصہ نہیں لیا تھا لیکن جو انقلاب سے فائدہ اٹھانے میں پیش پیش تھے۔ یہ لوگ اپنے مفاد کی خاطر حکومتی طبقہ سے جا ملے اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ پارٹی میں حکومتی طبقہ کی بہت بڑی اکثریت ہو گئی اور بلا خوف مخالفت حکومتی طبقہ اپنے مفاد میں حکومت چلانے لگا۔ حکومتی طبقہ نے آہستہ آہستہ نہ صرف مرکزی کیمونسٹ انٹرنیشنل کے اعمال کو بدل دیا بلکہ دوسرے ممالک کی کیمونسٹ پارٹی کے احرار کو بھی اپنے اثر سے بدل ڈالا اور بجائے انقلابی لوگوں کے ایسے لوگوں کو لیڈر مقرر کر دیا جو سوویٹ کے حکومتی طبقہ کی پالیسی کے مطابق چلیں سوویٹ کی پالیسی اسٹالین کے محدود انقلاب کے نظریہ کی بموجب چلنے لگ گئی تھی ملکی ا۔ رقومی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرنے کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے ملکوں کی کیمونسٹ پارٹیوں کو مدد نہیں دی گئی اور وہ تباہ ہو گئیں ان کی تباہی کا روس کی پرولتاری جماعت پر یہ اثر ہوا کہ ان کا دل بیٹھ گیا۔ میرے ہم خیال لوگوں کی بابت حکومت نے یہ کہنا شروع کر دیا۔

"یہ لوگ بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پیش کر کے سوویٹ کو دوسرے ملکوں سے لڑوانا چاہتے ہیں۔ ہم کافی زخم کھا چکے ہیں۔ اب ہمیں حق ہے کہ کچھ عرصے آرام کریں۔ ہم اپنے ملک میں اشتراکی نظام رکھیں گے سب کو چاہئے کہ لیڈروں کی رہنمائی پر اعتبار کریں"

حکومتی طبقہ کا آرام کا نظریہ اکثریت کو بھا گیا۔ "بین الاقوامی پرولتاری متحد ہو جاؤ" کا نظریہ پیچھے جا پڑا۔ اسٹالین کی سیاست بین الاقوامی نظریہ سے ہٹ کر ملکی اور قومی نقطہ پر آٹھہری اور دوسرے ملکوں کی پرولتاری تحریکوں کی فنا و بقا کا معیار یہ ٹھہرا کہ روس کا مفاد کس میں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ

ہوا کہ ہر ملک میں قومی اور ملکی مفاد کا نظریہ زور پکڑ گیا اور سوویٹ منجملہ اور سلطنتوں کے ایک سلطنت ہوگیا سوویٹ کی ملکی اور قومی سیاست کا یہ اثر ہوا کہ تمام یورپ میں فسطائی رجحانات زور پکڑ گئے اور فسطائی ڈکٹیٹر برسر اقتدار آ گئے۔ میں برابر یہ اعلان کر رہا تھا کہ بین الاقوامی انقلاب کے نظریہ پر عمل کرو اور دوسرے ملکوں کی سرمایہ دارانہ معاہدہ کرنے کے بجائے ان ملکوں کی پرولتاری جماعت سے اتحاد عمل رائج کرو اور ان کو ہر امکانی کوشش سے طاقتور بناؤ تاکہ اگر کوئی سرمایہ دار حکومت روس پر حملہ بھی کرنا چاہے تو مقامی پرولتاری جماعت کے خوف سے سوویٹ پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اگر آج جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی طاقتور ہوتی اور اس کا مطمح نظر کسی ملک اور قوم کا بچانا نہ ہوتا بلکہ ان اصولوں کو بچانا ہوتا جو ہمارے اکتوبر کے انقلاب کے حاصل ہیں تو روس کو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ ستم تو یہ ہو رہا ہے کہ سوویٹ کے احرار کی تقریروں میں بھی عوام سے یہ اپیل کی جاتی ہے کہ مادر وطن کو بچاؤ سوویٹ کی ایک انچ زمین کے لئے خون بہا دو۔ سوویٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو وغیرہ۔ در اصل کہنا یہ چاہئے کہ اشتراکی ملکیت کو بچاؤ۔ غریب کی آزادی کو بچاؤ۔ اشتراکی طریق پیداوار کو بچاؤ۔ اب سوویٹ کے حکومتی طبقہ کا بھی وہی تخیل ہے جو سرمایہ دار ملکوں کا۔ واقعہ یہ ہے کہ جرمنی سے قبل ہی سوویٹ میں ڈکٹیٹری حکومت قائم ہو گئی تھی اور بورژوازی اثرات اتنے نمایاں ہو گئے تھے کہ عوام میں ایک لفظ (Sov Bom) عام ہو گیا تھا۔ یہ لفظ Soviet Bourgeois کا مخفف ہے۔

لینن۔ پارٹی نے بین الاقوامی انقلاب کے تخیل کو پس پشت ڈال کر روسی انقلاب کو فنا کر دیا۔ ہماری تو زندگی ہی بین الاقوامی انقلاب کی مرہون منت ہے شروع زمانہ میں آسٹریا اور جرمنی کی فوجیں اس وجہ سے ہم پر حملہ نہ کر سکیں کیونکہ ان ممالک میں خود انقلابی حالات پیدا ہو گئے تھے۔ کوئی چار ماہ کے اندر ہی اندر جرمنی آسٹریا اور ہنگری میں بلوے ہو گئے اور بریسٹ لٹوسک کا معاہدہ جو ہمارے مفاد کے خلاف تھا خود بخود کالعدم ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء میں کالے سمندر میں ملاحوں نے بلوہ کر کے فرانس کو مجبور کیا کہ روس سے فوجیں ہٹائے۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں مزدوروں کی جدوجہد سے مجبور ہو کر انگلستان نے

اپنی فوجیں روس سے ہٹائیں جب ہمیں ۱۹۲۰ء میں وارسا پر شکست ہوئی تو یہ دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی پرولتاری جماعت کی جدوجہد تھی جس نے سرمایہ دار ملکوں کو پولینڈ کی مدد پر آنے سے روکا

دراصل سوویٹ کی طاقت کا انحصار دو قسم کی فوجوں پر ہے ایک تو سوویٹ فوج اور دوسرے ہماری وہ فوج جو سرمایہ دار ملکوں میں ہے یعنی سرمایہ دار ملکوں کی پرولتاری جماعت وہ بھی ہماری فوج ہی ہے اس فوج کو طاقتور بنانا بھی ہمارے لئے اتنا ہی ضروری ہے۔ جتنا کہ سوویٹ کی فوج کا پرولتاری جماعت خفیہ سازشوں سے دشمن کو سوویٹ فوج کی نسبت زیادہ نقصان پہونچا سکتی ہے۔

ٹروٹسکی۔ لیکن آج کل تو ایک تیسری فوج کو طاقتور بنایا جا رہا ہے۔

لینن۔ وہ کونسی؟

ٹروٹسکی۔ خفیہ پولیس (G.P.U) جس نے روس میں ایسا غدر مچایا کہ آپ کے ساتھیوں میں سے ایک بھی زندہ نہیں ہے اور سب انقلابی لوگ سائبریا پہونچا دے گئے ہیں۔ میں بھی اسی پر زور دیتا تھا کہ یورپ کی پرولتاری جماعت اور دنیا کی محکوم قوموں سے اتحاد عمل پیدا کرو لیکن روس جمعیتہ الاقوام میں داخل ہو کر موجودہ ملکی تقسیم کا حامی ہو رہا تھا۔ اور وہ موجودہ ملکی تقسیم کی پالیسی اس قسم کی تھی کہ جب اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تو اٹلی کے بیڑے کو باکو سے تیل جاتا رہا جب جاپان نے مشرقی چینی ریل پر قبضہ کر لیا تو سوویٹ نے کان تک نہ ہلایا کہ کہیں دنیا کی صلح ختم نہ ہو جائے۔ اس رویہ سے جاپان اور دوسرے سرمایہ دار ملکوں کی جرات اور بھی بڑھی اور جاپان نے منگولیا پر بھی آنکھ ڈالی سوویٹ کے حکومتی طبقہ کا خیال تھا کہ سرمایہ داری کا تضاد سرمایہ دار ملکوں میں جنگ برپا کر دے گا۔ اور جس نسبت سے سرمایہ دار ملک تباہ ہوں گے اسی نسبت سے سوویٹ طاقتور ہو جائے گا اور پھر ان ملکوں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اشتراکی انقلاب کرنا آسان ہو جائے گا۔ میں نے امریکہ میں بیان دیتے ہوئے صاف صاف کہدیا تھا کہ سرمایہ دار حکومتیں آپس میں خواہ کتنا ہی کشت و خون کریں لیکن دوران جنگ میں ایک ایسا موقعہ ضرور آئے گا جبکہ وہ آپس میں لڑنے کے بجائے سوویٹ پر حملہ کر دیں گے۔

لینن۔ ٹراٹسکی یہ تو بتاؤ لال فوج کا کیا حال ہے۔

ٹراٹسکی۔ سنہ ۱۹۳۹ء میں جبکہ جرمنی کی طرف سے خطرہ نہیں تھا اسوقت کل فوج ۲۰۰۰ ۶ تھی جرمنی سے خطرہ ہوا تو ۳۰۰۰۰۰۰ کر دی گئی تھی لیکن اب فوجی نظام بدلدیا گیا ہے۔ آپ کے زمانہ میں تو فوج میں جمہوری طریقہ پر انتخاب کے بعد افسر مقرر کئے جاتے تھے جس طریقہ کار کی یہ خوبی تھی کہ لائق اور تجربہ کار لوگ افسر مقرر ہوتے تھے لیکن اب حکومتی طبقہ اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر افسر مقرر کرتا ہے۔ ہم نے فیلڈ مارشل، جنرل، کمانڈر وغیرہ کے خطابات اڑا کر مساوات قائم کی تھی لیکن اب وہ سب خطابات ازسر نو جاری ہو گئے ہیں اور فوجی افسروں کی ذاتیں بن گئی ہیں۔ دراصل فوج بھی سماج کا ایک جز ہوتی ہے جب سماج میں ذاتیں بن گئیں، تو فوج کہاں بچ سکتی ہے چنانچہ نااہل لوگ فوج میں بڑے بڑے عہدوں پر آگئے ہیں جس کا نتیجہ اس جنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ سوویٹ فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔ سامان حرب جس قسم کا بنا ہوا ہے اس جنگ سے اس کا بھی پردہ فاش ہو گیا۔ جب میں ان امور پر تنقید کرتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ ٹراٹسکی تو اسٹالین کا رقیب ہے اس لئے تنقید کر کے جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا ہے لیکن اب سنتا ہوں کہ سامان حرب کے لیے انگلستان اور امریکہ سے التجا ہو رہی ہے اور فیلڈ مارشل بدلے جا رہے ہیں۔

لینن۔ ٹراٹسکی۔ آخر اس جنگ کا کیا نتیجہ ہو گا؟

ٹراٹسکی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں خواہ اسٹالین فتح پائے یا شکست سوویٹ کا جو کچھ بھی بگڑا ہوا نظام ہے وہ ختم ہو جائے گا۔ اگر دوسرے ممالک میں پرولتاری انقلاب ہو جائے تب تو البتہ امید ہے کہ اشتراکی نظام اور مستحکم ہو جائے۔ بہت ممکن ہے کہ جیسے پہلی جنگ میں سرمایہ داری کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ٹوٹ گئی تھی اسی طرح اس جنگ میں شاید سرمایہ داری کی کوئی مضبوط کڑی ٹوٹ جائے۔ اس وقت ہمارے اشتراکی اصولوں کی فتح ہونا لازمی ہے۔ سرمایہ دار ملکوں کی مدد سے اگر سوویٹ کو فتح بھی ہو گئی تو وہ ملک سوویٹ کو مجبور کریں گے کہ اشتراکی نظام کو خیرباد کہے بلکہ شاید حکومتی طبقہ ان کی مدد کی احسان مندی میں خود ہی اشتراکی اصول چھوڑ دے۔

لینن۔ اگر سرمایہ دار ملکوں کو فتح ہوگئی اور جنگ کے دوران میں پرولتاری انقلاب نہیں ہوا تو پھر سرمایہ داری کا تضاد دوبارہ رنگ لائے گا اور دوبارہ جنگ ہوگی

ٹروٹسکی۔ یقیناً اب دنیا کے سامنے دو راستے ہیں یا تو اشتراکی اصولوں کو اختیار کرے ورنہ تباہ ہوجائے انسان فطرتاً اپنی بربادی نہیں چاہتا۔ اس لئے لازمی ہے کہ کچھ عرصے بعد انسان ایک دوسرے کی بربادی سے متاثر ہوکر اشتراکی اصول قبول کرے۔ ہم اسٹالین اور سوویٹ کی حکومت کی طرف سے مایوس ہوسکتے ہیں لیکن دنیا کی پرولتاری جماعت سے قوی امید ہے کہ وہ دنیا کو بربریت کی طرف جانے سے روکے گی۔

لینن۔ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسٹالین اور سوویٹ روس تباہ ہوسکتے ہیں لیکن وہ اشتراکی اصول فنا نہیں ہوسکتے اور سرمایہ داری کا تضاد دنیا کو اس پر مجبور کرے گا کہ پھر اکتوبر کے انقلاب کو زندہ کیا جائے۔

م۔م جوہر صاحب میرٹھی

زندگی اور موت

سائنس کی روشنی میں

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہور ترتیب
(چکبست)
موت کیا ہے؟ انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

جب ہم اپنے جسم اور اس کی ساخت پر ایک غائر نظر ڈالتے ہیں تو دماغ ایک سوال پیدا کرتا ہے وہ یہ کہ ہم کیا ہیں کیوں بنے اور کیسے بنے؟

کیا واقعی ہمارا تعلق کسی طرح سے ایک خلیہ کے جانور امیبا سے ہو سکتا ہے۔ اور اگر یہ تعلق ہے تو اس کی کیا شہادت ہے؟

یہ واقعہ ہے کہ اگر ہم انسانی وجود کی ابتدا پر ایک نظر ڈالیں تو ہم کو صاف طور سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ضرور ہمارا تعلق دنیائے وجود کے کسی نہ کسی زمانہ میں اِس ایک خلیہ کے جانور امیبا سے تھا۔ ہم اور ہم کیا تمام عالم حیات اپنی زندگی ایک خلیے سے شروع کرتے ہیں انڈا ایک خلیہ ہے اور مادہ منویہ کے وہ چھوٹے خوردبینی کرۂ حیات (SPERMS) بھی ایک خلیے کے جانور ہوتے ہیں انھیں دو خلیوں یا ان کے نواۃ کے آپس میں ایک خاص طریقہ کے اختلاط (ملاؤ) سے ہمارا وجود عالم ہستی میں آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انڈے یا منی کے اجزائے تولید و تناسل (SPERMS) ایک خلیے کے جانور امیبا سے بہت مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً۔

(۱) دونوں ایک خلیے کے بنے ہوئے ہیں۔

(۲) دونوں میں ایک ایک نواۃ موجود ہوتا ہے۔

(۳) دونوں اجسام حیاتیات کی طرح کھاتے ہیں۔ ہوا اپنے جسم کے اندر لیتے ہیں اور بیکار اجزا اپنے جسم سے خارج کرتے ہیں۔

(۴) اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ دونوں میں حیات مع اپنے لوازمات کے موجود ہوتی ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ حیات ہے کیا شئے؟

یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہر کیمیاوی مرکب کی ایک خاص خاصیت ہوا کرتی ہے مثلاً پانی دو ہواؤں کا مرکب ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ وہ معمولی درجہ حرارت پر رقیق ہوجاتا ہے۔ اونچی جگہ سے نیچی جگہ کو بہتا ہے اور جس برتن میں رکھا جاتا ہے اس کی سطح کو گیلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے مادہ حیات (Protoplasm) میں بھی چند خصوصیات موجود ہوتی ہیں۔

(۱) یہ مادۂ حیات بھی ایک کیمیاوی مرکب ہے۔ اس میں کاربن، گندھک، آکسیجن اور پانی وغیرہ ایک خاص کیمیاوی مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

(۲) ہر ایک جاندار خلیے میں مادہ حیات کا موجود ہونا ضروری ہے۔

(۳) اسی مادہ حیات کی بدولت ہمارے جسم کا ہر خلیہ ہوا لیتا ہے جو کہ زندگی کی ایک نشانی ہے

(۴) ہر خلیہ کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی غذا مادۂ حیات کی زیست کو برقرار رکھتی ہے۔

(۵) فضلہ کا بدن یا خلیہ کے باہر نکلنے کی خاصیت بھی مادہ حیات ہی کی ایک ادنیٰ سی خصوصیت ہے۔

(۶) تولید و تناسل بھی مادہ حیات کی خصوصیات کا ایک کرشمہ ہے۔

ہم نے یہ دیکھا کہ ہماری حیات کا دارومدار اسی حیات پر ہے جو کہ ہمارے جسم کے ہر خلیہ میں موجود ہوتا ہے لیکن اب ایک دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا زندگی صرف مادہ حیات کی خصوصیات ہی کا نام ہے یا اس میں کوئی اور راز بھی پنہاں ہے یا یوں کہیئے کہ مادہ حیات میں یہ حیات آئی کہاں سے اور ہے کیا شئے؟

اگر ہم حیات کو ایک طبیعاتی نظر سے دیکھیں تو ہم اس کو ایک برقی طاقت کہہ سکتے ہیں۔ کلیولینڈ کے ڈاکٹر کرائل نے تو اپنے تجربات سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حیات بجلی کے چارج ہی کا نام ہے۔ ڈاکٹر موصوف کی یہ رائے کسی فلسفیانہ یا خیالی بنیاد پر مبنی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ رائے ان کے مشاہدات و تجربات پر منحصر ہے ڈاکٹر موصوف نے ایک کتے کا تھوڑا سا بھیجہ بجلی کے ذریعہ سے جلا کر ناک کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ مادہ فنا تو ہو نہیں سکتا ہاں ایک شکل سے دوسری شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ڈاکٹر صاحب نے بھیجے کو خاک

کی شکل میں تبدیل کر کے اس خاک میں سے کچھ نمک اور دوسرے اجزا کو کیمیاوی تحلیل سے علیحدہ کیا اور پھر اس میں کچھ لحمیات اور کچھ اور چیزیں ملا دیں۔ اب اس سفوف کو بجلی کے ذریعہ تحریک دینے سے ڈاکٹر صاحب مصنوعی زندہ خلیوں کے بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

اس کامیاب تجربہ نے ان کی امیدوں کو بڑھا دیا اور کئی اور تجربوں کے بعد ڈاکٹر صاحب نے امیبا پر ایک تجربہ کیا جس نے ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ حیات بجلی کی لہر ہی کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ایک بڑے جانفشاں تجربہ سے معلوم کیا کہ امیبا میں منفی (-) قسم کی بجلی ہوتی ہے۔ انھوں نے صرف بجلی کی قسم ہی معلوم کرنے پر قناعت نہیں کی بلکہ اپنے اعلیٰ تجربات کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ اس امیبا میں ایک وولٹ کے ساتویں ($\frac{1}{7}$) حصہ کے برابر منفی بجلی ہوتی ہے۔ یہ معلوم کر کے ڈاکٹر صاحب نے ایک خوردبینی بجلی کے تار سے مثبت (+) بجلی جس کی مقدار بھی $\frac{1}{7}$ وولٹ تھی اس امیبا میں داخل کی طبیعاتی اصول کے مطابق نتیجہ یہ ہوا کہ دو متضاد اور ہم مقدار قسم کی بجلیوں کے ملنے سے دونوں قسم کی بجلیوں کا اثر زائل ہو گیا۔ اور وہ امیبا جو کہ پہلے تیزی سے چلتا پھرتا تھا۔ کھاتا پیتا تھا اور نسل کو بڑھاتا تھا حیات کی یہ تمام خصوصیات کھو بیٹھا اور آخر میں اس دنیائے فانی سے عالم بقا کی طرف رخصت ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے تجربات سے یہ بھی معلوم کیا کہ اگر مثبت (+) قسم کی بجلی کی مقدار اس اصلی منفی (-) قسم کی بجلی کی مقدار سے کم یا زیادہ ہو جائے تو امیبا نہیں مرتا۔ اس کو اجل کا گھونٹ جب ہی پینا پڑتا ہے جبکہ دونوں قسم کی بجلیوں کی مقدار یکساں ہو۔ اگر ایک قسم کی بجلی دوسرے قسم کی بجلی سے زیادہ یا کم ہو جائے تو یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ متضاد ہم مقدار بجلیاں تو ایک دوسرے کا اثر زائل کر دیتی ہیں اور بچی ہوئی بجلی حیات کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ ہمارا جسم امیبا جیسے سیکڑوں بلکہ لاانتہا خلیوں سے بنا ہے اور ہمارے جسم کا ہر خلیہ ایک قسم کی بیٹری ہے کم عمر اور نوجوان خلیے بہت تیز بجلی پیدا کرتے ہیں لیکن زیادتی عمر کے ساتھ اس بجلی کی طاقت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ موت کیا ہے؟ اسی بجلی کی طاقت کا بالکل زائل ہو جانا جیسے کہ شہر کی بجلی اور دیگر بجلی کے کام کا دارومدار پاورہاؤس کی بجلی کی مقدار پر منحصر ہوتا ہے اسی طرح ہمارے افعال اور حرکت

وغیرہ کا دارومدار بھی انھیں خلیہ نما بیٹریوں پر منحصر ہے۔

اب اگر ہم سے کوئی حیات اور موت کی تعریف پوچھے تو ہم یوں کہہ سکیں گے کہ حیات جانور کے عالم وجود میں آنے کا وہ زمانہ ہے جبکہ بجلی کی طاقت یا اور زیادہ صحیح الفاظ میں بجلی کا پوٹنشل ( ) موجود ہو اور موت اسی قوت یا Potential کے ضائع یا منتشر ہو جانے کا نام ہے جس طرح ہم کہتے ہیں کہ پانی ایک اونچی سطح سے نیچی سطح کو بہتا ہے اسی طرح سے بجلی یا برق ایک اونچے potential سے نیچے potential کو بہتی ہے

روس کے دو سائنسدانوں نے کتے کا ایک سر اور انسان کا دل ان کی موت کے کئی گھنٹے بعد تک زندہ رکھا ہے۔ امریکہ کے ڈاکٹر اے کیرل کے دار التجربہ میں بیس سال کے مرے ہوئے مرغی کے بچوں کے جسمانی خلیے زندہ اور تندرست موجود ہیں۔ حالانکہ مرغی کی زندگی عام طور سے پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کے جسمانی خلیات کو ایسی فضا میں رکھا کہ وہ ۲۰ سال سے زندہ ہیں۔

یہ سن کر ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی ہمارے جسم کے زندہ خلیات بجلی کی قوت یا potential کے لحاظ سے حیات ابدی رکھتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے جانور اور اشرف المخلوقات انسان کو اجل کا جام پینا پڑتا ہے،

دراصل یہی ایک مسایہ ہے جس نے سائنسدانوں کے دماغ کے پرخچے اڑا دئے ہیں اور مذہب اور عالم ارواح کی بنیادوں کو مستحکم کر دیا ہے ورنہ اگر حیات دائمی ہوتی تو نہ تو کوئی مذہب کا نام لیتا اور نہ جنت و دوزخ کا خیال اس کو خوشی یا رنج پہنچاتا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا لیکن ہاں اگر واقعی دار التجربہ میں ایسے حالات اور فضا پیدا کی جا سکتی ہے جس میں کہ انسانی جسم کے کٹے ہوئے اعضا زندہ رہ سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم انسان کو موت کے منھ سے نہیں بچا سکتے؛

ڈاکٹر کیرل صاحب اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے جسم کے خلیات اگر علیحدہ علیحدہ کر لئے جائیں تو وہ غیر فانی ہیں لیکن جب وہ دو یا دو سے زیادہ ایک جگہ جمع ہو کر ہمارے جسم کو

ترتیب دیتے ہیں تو ان کا تعلق پڑوس کے دوسرے خلیوں اور بھیجے سے ناقابل علیحدگی ہو جاتا ہے اور یہی خلیوں کا الجھاؤ یا ایک جگہ جمع ہونا ہماری موت اور بربادی کا باعث ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایک زندہ خلیہ (جیسے امیبا) اپنے زہریلے اندرونی فضلہ کو اپنے جسم سے نکال کر باہر پھینک دیتا ہے لیکن ان اجسام زندگی کو جن کا جسم کئی خلیوں کا بنا ہوتا ہے ان زہریلے اجزائے فضلہ کو جس کی کہ ہمارے جسم کو قطعاً ضرورت نہیں ہوتی جسم سے باہر پھینکنے کا موقعہ نہیں ملتا اور وہ زہریلے اجزا جسم کے باہر نہیں نکلتے برخلاف اس کے امیبا میں یہ اجزا جسم یا خلیہ سے باہر نکل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے جسم میں زہریلے اجزا کا قیام ہماری موت کا باعث ہو جاتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک خلیہ کا جانور (مثلاً امیبا) کبھی اپنی قدرتی موت سے نہیں مرتا۔

قدرت کے اس قانون کو سن کر ہمیں اپنی بدبختی پر نہایت ہی افسوس ہوتا ہے اور فوراً ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کاش کیا اچھا ہوتا اگر امیبا کی طرح ہم بھی غیر فانی ہوتے لیکن موت تو انسان کے اعلیٰ وارفع ہونے کی دلیل ہے اور بغیر اس کے زندگی کا مزا ہی کیا۔ اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے ؎

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کیا پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

عبدالحسیب صاحب
متعلم مسلم یونیورسٹی

بھید

(ترجمہ کینڈڈا، مصنفہ برنارڈ شا)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تیسرا ایکٹ

(رات کے دس بج چکے ہیں، پردے کھنچے ہوئے ہیں اور لیمپ روشن ہیں، ٹائپ رائٹر اپنے کیس میں رکھا ہوا ہے۔ بڑی میز بالکل صاف کر دی گئی ہے۔ ہر بات سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کی مصروفیتیں ختم ہو چکی ہیں۔ کینڈڈا اور مارچ بینکس آتشدان کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔ پڑھنے کے لئے لیمپ پنسل پر یوجین کے سر کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ وہ خود چھوٹی کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور کوئی کتاب زور زور سے پڑھکر سنا رہا ہے۔ کچھ مسودات اور شاعری کی دو تین کتابیں پاس ہی قالین پر رکھی ہوئی ہیں۔ کینڈڈا آرام کرسی پر لیٹی ہوئی ہے۔ پنسل کی آگ کریدنی اس کے ہاتھ میں ہے۔ آرام سے جھکی ہوئی ہے اور آگ کریدنی کو اٹھائے بہت محویت سے اس کی نوک دیکھنے میں مشغول ہے۔ پیر آگ کی طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ جاگ تو رہی ہے مگر بالکل کھوئی ہوئی سی خیالات اپنے ماحول سے میلوں دور ہیں۔ یہاں تک کہ یوجین کی موجودگی کا بھی ہوش نہیں ہے)

ی م۔ (پڑھتے پڑھتے رکتے ہوئے) دنیا کے ہر شاعر نے اس خیال کو باندھا ضرور ہے بلکہ اسے باندھنا پڑتا ہے۔ وہ مجبور ہے اس کے لئے (وہ کینڈڈا کی طرف رائے لینے کے لئے دیکھتا ہے لیکن کیا دیکھتا ہے کہ وہ کریدنی میں کھوئی ہوئی ہے) کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟ (کوئی جواب نہیں) مسز مارل!

ک۔ (چونک کر) کیا؟

ی م۔ کیا آپ سن نہیں رہی تھیں؟

ک۔ (کافی سے زیادہ اخلاق ظاہر کرتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں یہ تو بہت اچھی نظم ہے۔ آگے پڑھو یوجین! میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اُس فرشتہ کا کیا حشر ہوتا ہے

ی م۔ (مسودہ کو اپنے ہاتھ سے گراتے ہوئے) معاف کیجئے گا کہ میں نے آپ کو خواہ مخواہ اس قدر زحمت دی۔

ک۔ لیکن تم نے مجھے بالکل زحمت نہیں دی میں تمہیں یقین دلاتی ہوں اور سچ کہتی ہوں کہ میں سن رہی تھی۔ مہربانی سے اور آگے پڑھو۔

ی م۔ مگر میں نے وہ فرشتہ والی نظم تو کوئی پندرہ بیس منٹ ہوئے ختم کر دی اس کے بعد سے اور بہت سی نظمیں بھی پڑھ چکا ہوں۔

ک۔ (شرمندگی سے) اچھا تو پھر مجھے واقعی افسوس ہے۔ یوجین خیال ہے کہ اس کریدنی نے مجھ پر ہپناٹزم کر دیا ہوگا (وہ اسے نیچے رکھ دیتی ہے)

ی م۔ مجھ کو اس سے بڑی تکلیف ہوئی

ک۔ تو پھر تم نے مجھ سے کہہ کیوں نہیں دیا میں اسے فوراً رکھ دیتی۔

ی م۔ لیکن میں آپ کو بھی تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا معلوم ہوتا تھا گویا یہ کوئی اسلحہ ہے۔ اگر میں پرانے زمانہ کا کوئی ہیرو ہوتا تو میں اپنی تلوار اپنے اور آپ کے درمیان رکھدیتا۔ اگر مارلیں آجاتا تو وہ یہی سمجھتا کہ آپ نے کریدنی اسی لئے اٹھالی ہے کہ ہم دونوں کے درمیان کوئی تلوار نہیں تھی۔

ک۔ (متعجب ہو کر) کیا؟ (تعجب کی نظر سے اسے دیکھ کر) میں سمجھ نہیں پائی تمہاری نظموں نے میرا دماغ بالکل ماؤف کر دیا ہے۔ آخر ہمارے درمیان تلوار کیوں ہوتی؟

ی م۔ (ٹالتے ہوئے) یونہی، کچھ نہیں (اپنا مسودہ اٹھانے کے لئے جھکتا ہے)

ک۔ نہیں یوجین! بس اب رہنے دو۔ آخر میرے شوق شاعری کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے وہ خواہ تمہاری شاعری ہی کیوں نہ ہو۔ تم دو گھنٹے سے زیادہ یعنی جب سے جمیس گیا ہے پڑھتے رہے ہو۔ اب میں باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ی م۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے ڈر کر) نہیں مجھ کو باتیں نہیں کرنی چاہئیں (وہ اِدھر اُدھر بھولا ہوا سا دیکھتا ہے اور پھر اکیدم

کہنے لگتا ہے، میں جاتا ہوں ذرا باہر جا کر پارک میں دو ایک چکر لگا آؤں دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ بیوقوف پارک تو کبھی کا بند ہو گیا ہوگا۔ اِدھر آؤ اور قالین پر بیٹھ جاؤ اور اپنی وہی تیغ چلی والی باتیں اڑاؤ۔ میں اب ذرا تفریح چاہتی ہوں تم بھی تو چاہتے ہوگے؟

ی م۔ (ڈرتے ہوئے اور خوش ہوتے ہوئے) ہاں!

ک۔ اچھا تو پھر اِدھر آؤ (وہ اپنی کرسی کچھ پیچھے دبالیتی ہے تاکہ اس کے لئے جگہ نکل آئے۔ وہ پہلے تو کچھ ہچکچاتا ہے پھر ڈرتے ڈرتے آتشدان کے قریب بچھے ہوئے کمبل پر لیٹ جاتا ہے اس کا سر کینڈڈا کے گھٹنوں پر ہے اور نظر اس کے چہرے پر)

ی م۔ آج میں دن بھر اس قدر پریشان رہا ہوں کہ کیا بتاؤں اور وہ سب اس لئے کہ قاعدہ کی باتیں کر رہا تھا اور اب جبکہ بے قاعدہ باتیں کر رہا ہوں میں خوش ہوں۔

ک۔ (مسکرا کر شفقت سے) ہاں میرے خیال میں تم اب اپنے کو بڑا پختہ شریر اور تجربہ کار کامیاب فریبی سمجھ رہے ہوگے اور خود پر نازاں! کیوں نا؟

ی م۔ (اپنا سر جلدی سے اوپر اٹھاتے ہوئے اور اس کی طرف مڑ کر دیکھتے ہوئے) ذرا ہوشیار رہیئے گا میں آپ سے بہت زیادہ تجربہ کار اور معمر ہوں۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا (گھٹنوں پر الٹ جاتا ہے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ میں پڑی ہوئی ہیں اور ہاتھ اس کی گود میں ہیں۔ آواز میں جذبہ آجاتا ہے اور خون میں گرمی) کیا میں چند شریر باتیں کہہ سکتا ہوں؟

ک۔ (بغیر خوف اور سنجیدگی کے کہ اس کے جذبات کا کافی احترام کرتے ہوئے پھر بھی مادرانہ و شفقانہ طرز میں کہتی ہے) لیکن تم ہر وہ بات کہہ سکتے ہو جسے واقعی اور سچے دل سے محسوس کر رہے ہو (وہ کوئی بات ہو۔ کوئی چیز ہو مجھے ڈر نہیں ہے لیکن ہونا چاہئے حقیقت کوئی وقتی حالت نہ ہو۔ شریر، رندانہ، شاعرانہ حالت نہ ہو۔ میں تم کو تمہاری عزت و صداقت کی قسم دلاتی ہوں کہ کسی وقتی حالت کا ذکر نہ کرنا۔ اب کہو جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو۔

ی م۔ (اس کے چہرے سے وہ شوخی کی رنگ آمیزی جو پیدا ہو گئی تھی ایک دم غائب ہو جاتی ہے آنکھیں اداس گرنگہ

ہو جاتی ہیں) اب، اب میں کچھ نہیں کہہ سکتا جتنے الفاظ میں جانتا ہوں سب کسی نہ کسی حالت سے متعلق ہیں، سوائے ایک لفظ کے۔

ک۔ وہ کیا؟

ی م۔ (نرمی سے اور خود کو اس کے نام کی موسیقی میں کھوتے ہوئے) کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا، کینڈڈا اب میں یہی کہوں گا کیونکہ تم نے مجھے میری عزت اور صداقت کی قسم دلا دی ہے میرے دل میں تمہارا تخیل مسز مارل کی حیثیت سے کبھی نہیں ہے ہمیشہ کینڈڈا کی حیثیت سے ہے۔

ک۔ ہاں، ہاں بیشک لیکن تم کینڈڈا سے کہنا کیا چاہتے ہو؟

ی م۔ کچھ نہیں سوائے اس کے کہ تمہارا نام ہزاروں بار رٹا کروں کیا تم محسوس نہیں کرتیں کہ ہر بار گویا میں تمہاری تسبیح پڑھتا ہوں اور پرستش کرتا ہوں۔

ک۔ کیا تمہیں اس سے مسرت نہیں ہوتی کہ بس تم پرستش کئے جاؤ؟

ی م۔ ہاں بے حد مسرت۔

ک۔ بس یہی مسرت تمہاری پرستش اور تمہاری تسبیح کا صلہ ہے اب اس سے زیادہ کسی اور چیز کی بھی تمنا ہے؟

ی م۔ نہیں بالکل نہیں میں بس اب جنت میں ہوں جہاں خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی۔

(مارل اندر آجاتا ہے وہ دہلیز پر ایکدم رکتا ہے، در منظر پیش نظر کو ایک نظر میں سمجھ جاتا ہے)

م۔ (سنجیدگی اور متانت سے) مجھے امید ہے کہ میں حاج نہیں ہو رہا ہوں۔

(کینڈڈا تیزی سے چونک پڑتی ہے لیکن بغیر کسی گھبراہٹ کے خود پر ہنستے ہوئے یوجین کینڈڈا کے ایکدم اٹھ کھڑے ہونے سے قلابازی کھا جاتا ہے لیکن بیٹھے ہی بیٹھے اپنی حالت سنبھالتا ہے اور کمبل پر اکڑوں اپنے گھٹنوں کو سینے سے لگا کر بیٹھ جاتا ہے اس کو بھی کسی قسم کی گھبراہٹ نہیں ہے)

ک۔ جیمس تم نے تو بالکل مجھے چونکا دیا میں یوجین کی باتوں میں اس قدر مصروف تھی کہ میں نے تمہیں دروازہ کھولتے سنا بھی نہیں، میٹنگ کیسی رہی، تم تو خوب بولے ہو گے؟

م۔ میں زندگی بھر آج سے بہتر کبھی نہیں بولا۔

ک۔ بہت ہی خوب۔ چندہ کتنا جمع ہوا؟

م۔ یہ میں پوچھنا بھول گیا۔

ک۔ (یوجین سے) مسٹر ماریل ضرور آج بہت ہی اچھا بولے ہوں گے ورنہ وہ ایسی باتیں کبھی نہیں بھولتے (ماریل سے) اور دوسرے سب لوگ کہاں ہیں؟

م۔ وہ لوگ تو مجھ سے بہت پہلے چل چکے تھے۔ مجھے تو چھٹکارا ہی نہیں ملتا تھا۔ خیال ہے وہ لوگ کھانے کے لئے کہیں رُک گئے ہوں گے۔

ک۔ (اپنے گھریلو کام کاج کے لہجہ میں) تب تو پھر میں میریا سے کہدوں کہ وہ سونے کے لئے جائے۔ میں جاکر اس سے کہے دیتی ہوں (وہ باورچی خانہ کی طرف چلی جاتی ہے)

م۔ (یوجین کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) کہیئے!

ی م۔ (کمبل پر اکڑوں بہت ہی مضحک بے ڈھنگے پن سے بیٹھے ماریل کی طرح نہایت مطمئن بلکہ ہونٹوں پر شرارت کھیلتی ہوئی) کہیئے؟

م۔ کچھ کہیئے گا؟

ی م۔ صرف اتنا کہ جب تک تم وہاں پبلک میں خود کو بیوقوف بناتے رہے میں یہاں تخلیہ میں خود کو بیوقوف بناتا رہا۔

م۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے بالکل ہی ایک دوسرے کی طرح نہیں۔

ی م۔ (استعدی سے اچھی طرح اُٹھ بیٹھتے ہوئے) بالکل، بالکل۔ بالکل ایک دوسرے کی طرح، بالکل تمہاری طرح میں یہاں ایک نیک آدمی کا پارٹ ادا کرتا رہا۔ جب سے تم بلند ہمتی کا مظاہرہ کر کے کینڈڈا کو یہاں میرے پاس چھوڑ گئے ــــــــ

م۔ (بے اختیارانہ چونک پڑتے ہوئے) کینڈڈا!

ی م۔ ہاں میں یہاں تک پہونچ گیا ہوں، لیکن ڈرو مت بلند ہمتی متعدی ہوا کرتی ہے۔ مجھ کو یہ بیماری تم سے لگ گئی۔ میں نے تم سے قسم کھائی تھی کہ تمہاری عدم موجودگی میں کوئی ایسا لفظ کبھی نہ کہوں گا جو تمہاری

موجودگی میں کم از کم ایک ماہ پیشتر نہ کہہ چکا ہوں گا۔

م۔ اور کیا تم نے اپنی قسم برقرار رکھی؟

ی م۔ (ایک دم کرسی کی پشت پر بیٹھتے ہوئے) ہاں کوئی دس منٹ تک تو کسی نہ کسی صورت سے برقرار رہی یعنی اس وقت تک تو میں برابر اور لگاتار اپنی اور ہر شخص کی نظمیں سناتا رہا تاکہ بات چیت کا موقعہ ٹلتا رہے۔ میں گویا جنت کے دروازہ پر کھڑا ہوا تھا لیکن اندر جانے سے انکار کر رہا تھا۔ تم سمجھ نہیں سکتے کہ کس قدر بلند ہمتی کی یہ بات تھی اور کس قدر تکلیف دہ۔ اُس کے بعد۔۔۔۔

م۔ (اپنے ضبط کو بہ جبر روکتے ہوئے) اس کے بعد؟

ی م۔ (بہت بدمزگی اور معمولی طریقہ سے کرسی میں بیٹھتے ہوئے) اس کے بعد اُس نے کہا کہ بس اب تمہارا پڑھنا وڑھنا میں نہیں سن سکتی۔ بند کرو۔

م۔ اور تم چنانچہ جنت کے دروازہ کی طرف آخر کار بڑھے؟

ی م۔ ہاں۔

م۔ اچھا؟ (غضبناک ہو کر) آگے بول۔ مردِ خدا کیا میرے جذبات کا تجھے کچھ احساس نہیں ہے؟

ی م۔ (نرمی اور موسیقیت کے ساتھ مزے لے لے کر بیان کرتے ہوئے) اس کے بعد وہ ایک فرشتہ ہو گئی۔ اس کے علاوہ ایک جلتی ہوئی تلوار تھی کہ ہر طرف گھوم رہی تھی چنانچہ میں اندر نہ جا سکا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ وہ دراصل دوزخ کا دروازہ تھا۔

م۔ (مسرت سے پھول کر) یعنی اُس نے تم کو مسترد کر دیا۔

ی م۔ (سخت حقارت سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) نہیں بیوقوف آدمی۔ اگر وہ ایسا کرتی تو مجھے کبھی معلوم ہی نہ ہوتا کہ میں درحقیقت جنت ہی میں تھا۔ مسترد کر دیا! تم شاید یہ سمجھتے ہو کہ اس طرح ہم لوگ بچ جاتے! کیا خوب اطمینان کا پہلو! ارے تم تو اس دنیا میں اس کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہو (وہ نہایت حقارت سے کمرے کے دوسری طرف چلا جاتا ہے)

م۔ (جو اسے اسی جگہ کھڑا بغیر کچھ حس و حرکت کئے برابر دیکھتا رہتا ہے) کیا تم سمجھتے ہو یہ جین کر تم اس طرح گالیاں

دینے سے اپنے کو بہتر ثابت کر سکتے ہو۔

ی م۔ یہ گویا آپ کی آخری واعظانہ نصیحت ٹھہری۔ ماریل میں تمہارے وعظوں کا قائل نہیں ہوں۔ وعظ تو میں سمجھتا ہوں، تم سے بہتر میں خود دے سکتا ہوں لیکن اس شخص سے ضرور ملنا چاہتا ہوں جس سے کینڈڈا نے شادی کی۔

م۔ وہ آدمی جس سے۔ تمہارا مطلب مجھ سے ہے نا؟

ی م۔ میرا مطلب عالی جناب جیمس میور ماریل سے نہیں جو کہ محض ناصح اور ہوا کا ایک بھکنا ہے بلکہ میرا مطلب اس اصلی شخص سے ہے جو عالی جناب کے سیاہ کوٹ میں کہیں پوشیدہ ہے۔ اس شخص سے جس سے کینڈڈا محبت کرتی تھی۔ تم کینڈڈا جیسی عورت سے محض اس بات پر محبت نہیں کروا سکتے کہ وہ محض تمہارے کالر کو پادریوں کی طرح بجائے سامنے کے پیچھے بند کیا کرے

م۔ (ہمت و استقلال سے) جب کینڈڈا نے مجھ سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا تب بھی میں ایسا ہی ناصح اور بقول تمہارے ہوا کا بھکنا تھا جیسا کہ اب تم دیکھتے ہو۔ اسوقت بھی میں سیاہ کوٹ پہنتا تھا اور میرا کالر بجائے آگے کے پیچھے سے بند کیا جاتا تھا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اگر اپنے پیشے میں فریب سے کام لیتا تو وہ مجھ سے زیادہ محبت کرتی؟

ی م۔ (صوفے کے اوپر اپنے گھٹنوں کو اپنے سینہ سے لگاتے ہوئے) نہیں، اس نے تمہیں معاف کر دیا جس طرح اس نے میرے بزدل اور کمزور ہونے کو معاف کر دیا بلکہ جیسا تم کہتے ہو کہ رونے کتے کے پلے ہونے کی وجہ سے معاف کر دیا (محویت میں آکر) اس قسم کی عورت ملکوتی عقل و ہوش رکھتی ہے۔ وہ ہماری روحوں سے محبت کرتی ہے نہ کہ ہماری بیوقوفیوں سے یا مغالطوں سے یا ہمارے فضول خیالات سے۔ نہ ہمارے کوٹوں سے نہ ہمارے کالروں سے اور نہ ہمارے طرح طرح کے فضول چیتھڑوں سے جس میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے رہتے ہیں۔ (اس بات پر وہ کچھ دیر تک محو رہتا ہے اس کے بعد ماریل سے بڑے شوق سے سوال کرنے لگتا ہے) ہاں، میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر تم اس آتشیں تلوار سے کیونکر بچ کر نکل گئے جس نے مجھے روک لیا۔

م۔ غالباً اس لئے کہ دس منٹ بعد کسی نے مداخلت نہیں کی تھی۔

ی م۔ (متعجب ہو کر) کیا!

م۔ آدمی بلند سے بلند چوٹیوں پر پہونچ سکتا ہے لیکن وہاں دیر تک رہ نہیں سکتا

ی م۔ (اُچک پڑتے ہوئے) یہ جھوٹ ہے۔ وہ وہاں ہمیشہ ہمیشہ رہ سکتا ہے۔ عمر بھر وہیں۔ یہ تو دوسرے لمحات ہوتے ہیں جب اس کو آرام نصیب نہیں ہوتا اور اُسے زندگی کے پر سکون جمال کا احساس نہیں ہوتا۔ آخر مجھے تم سمجھتے کیا ہو۔ میں اگر اعلیٰ بلندیوں پر اپنے لمحات نہ گذاروں گا تو کہاں گذارونگا!

م۔ باورچی خانہ میں۔ پیاز چھیلنے میں اور لیمپ میں تیل بھرنے میں۔

ی م یا ممبر کلیسا کی میز پر معمولی ذلیل مٹی کی روحوں کی گرد جھاڑنے میں۔

م۔ ہاں یوں بھی لیکن ایسے ہی لمحات تھے جب مجھ کو وہ سنہرا موقعہ حاصل ہوا اور اس بات کا حق بھی کہ میں اس سے محبت کی التجا کروں۔ میں نے ایسے لمحات کسی سے قرض نہیں لئے اور نہ میں نے ان میں کسی دوسرے آدمی کی مسرت چرانے کی کوشش کی۔

ی م۔ (بے انتہا نا امید ہو کر۔ آتشدان کی طرف بعجلت جاتے ہوئے) مجھے اس کا بالکل یقین ہے کہ تم نے معاملت بالکل ایمانداری سے کی ہو گی۔ بالکل اسی ایمانداری سے جس طرح کہ سیر آدھ سیر پنیر خریدنے میں کیجاتی ہے (وہ آتشدان والے قالین کے کنارے پر رک جاتا ہے۔ اریل کی طرف پیٹھ ہے۔ کچھ سوچتا ہے خود سے مخاطب ہوتا ہے) البتہ میں صرف بطور ایک فقیر کے اُس سے مانگ سکتا تھا۔

م۔ (چونکتے ہوئے) ایک ایسا فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ مانگ رہا ہو!

ی م۔ (تعجب سے مڑتے ہوئے) شکریہ! کہ تم نے میری شاعری کی تکمیل کر دی۔ ہاں اگر آپ کا جی چاہے تو یوں ہی کہہ لیجئے۔ ایک فقیر جو سردی سے مر رہا ہو اور اس کا دوشالہ مانگ رہا ہو!

م۔ (جوش سے) اور اس نے انکار کر دیا۔ کیا میں تمہیں بتلا دوں کہ اس نے کیوں انکار کر دیا۔ میں خود اُسی کے الفاظ تمہیں بتلا سکتا ہوں۔ اس نے انکار اس لئے کر دیا کہ ——

ی م۔ اُس نے انکار نہیں کیا۔

م۔ نہیں کیا!!

ی م۔ اس نے سب کچھ دیا جو میں نے مانگا۔ اپنا دوشالہ دیا۔ اپنے پر دئے۔ اپنے ماتھے کے تارے دئے، اپنے ہاتھ کے سوسنی پھول دئے۔ اپنے قدموں کے نیچے کا ہالاں دیا ـــــ

م۔ (اس کو پکڑتے ہوئے) سچ بول، سچ آدمی! میری بیوی میری بیوی ہے۔ میں تمہاری یہ شاعرانہ فضولیات کچھ نہیں سننا چاہتا۔ یہ مجھے خوب معلوم ہے کہ اگر اب وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی ہے اور تم سے محبت کرنے لگی ہے تو دنیا کا کوئی قانون اسے مجھ سے باندھ نہیں سکتا۔

ی م۔ (تکلف سے بغیر کسی خوف دھجک کے) مارتل! میرے قمیص کے کالر سے مجھے بیکار پکڑتے ہو۔ وہ پھر آ کر ٹھیک کر دے گی جیسے اس نے صبح کیا تھا (خاموش مسرت سے) اور پھر مجھے اسی طرح اس کے ہاتھ چھونے کو ملیں گے۔

م۔ شیطان کے بچے تجھے نہیں معلوم کہ ایسی باتیں میرے سامنے کرنا کہاں تک روا ہیں؟ (یاشک کرتے ہوئے) کچھ ایسی بات ہو گئی ہے جس نے تجھے اس قدر نڈر بنا دیا ہے۔

ی م۔ مجھ کو اب ڈر بالکل نہیں ہے۔ میں تم سے پہلے نفرت کرتا تھا اور اسی لئے پہلے تمہارے چھونے تک سے گھبراتا تھا لیکن آج صبح کو جب وہ تمہیں پریشان کر رہی تھی میں نے دیکھا کہ تم واقعی اس سے محبت کرتے ہو۔ اس وقت سے میں اب تمہارا دوست ہو گیا ہوں۔ اب جی چاہے میرا گلا گھونٹ دو مجھے ڈر نہیں۔

م۔ (اسے چھوڑتے ہوئے) اگر یوجین تم یہ ظالمانہ مکر سے نہیں کہہ رہے ہو اگر تم میں انسانی احساسات کی ایک چنگاری بھی باقی رہ گئی ہے تو کیا مجھے بتاؤ گے کہ میری عدم موجودگی میں کیا ہوا؟

ی م۔ کیا ہوا! ہوتا کیا وہی آتشیں تلوار (مارتل بے چینی سے اپنا پاؤں پٹکتا ہے) ــ اچھا تو خیر سیدھی سیدھی نثر میں یہ کہ میں نے اس قدر اعلیٰ طریقہ کی محبت کی کہ مجھے کسی بات کی آرزو نہ رہی سوائے اس کے کہ میں اسی محبت کی حالت میں رہوں۔ قبل اس کے کہ میں اپنی بلند ترین بلندیوں سے نیچے آتا تم آ گئے۔

م۔ (بے انتہا مکلیف سے) تو گویا یہ بات اب بھی ناتمام رہی۔ پھر بھی شک و شبہ کی مصیبتیں۔

ی م۔ مصیبت! مجھ سے بڑھ کر اب خوش کوئی نہیں ہے۔ مجھے اب کسی بات کی آرزو نہیں سوائے اُس کی خوشی کی (جذبہ میں آکر) مارِل حقیقت یہ ہے کہ ہم دونوں کو اسے چھوڑ دینا چاہئے ہم اس کے شایانِ شان نہیں ہیں میں ایک چھوٹا کمزور عصبی مریض، تم ایک نہایت احمق پادری۔ چلو ہم دونوں دنیا کے سفر کو چلیں تم مشرق جاؤ اور میں مغرب اور اس کے لئے ایک نہایت لائق نہایت مناسب اور اس کی جوڑ کا بر تلاش کر کے لائیں۔ کوئی ایک نہایت ہی خوبصورت فرشتہ ہو جس کے احمریں شہپر ——

م۔ یعنی کوئی بیوقوف! افسوس اگر وہ اتنی پاگل ہو گئی ہے کہ مجھے چھوڑ کر تمہارے ساتھ جانے پر تُل گئی ہے تو پھر اس کی حفاظت کون کرے گا؟ کون اس کے لئے محنت کرے گا؟ کون اس کے بچوں کی نگہداشت کرے گا؟ (وہ صوفے پر پریشان ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ گھٹنوں پر کہنیاں ہیں اور اپنے سر کو ہاتھوں سے دبا لیتا ہے)

ی م۔ (بے تحاشا اپنی انگلیاں چٹخاتے ہوئے) وہ تو اس قسم کے بیکار سوالات نہیں کرتی اصل میں وہ مدد نہیں چاہتی بلکہ وہ خود کسی دوسرے کی حفاظت کرنا مدد کرنا اور اس کیلئے محنت کرنا چاہتی ہے ارے احمق وہ خود کسی دوسرے کے بچوں کی نگہداشت، ان کی مدد اور ان کیلئے کام کرنا چاہتی ہے کوئی ایسا بوڑھا آدمی جو دوبارہ بچہ ہو گیا ہو۔ ارے بیوقوف ایسا شخص میں ہوں۔ مارِل ایسا شخص میں ہوں (جوشِ مسرت سے اٹھ کر ناچنے لگتا ہے اور کہتا ہے) تم نہیں جانتے کہ عورت کیا چیز ہے مارِل اسے فوراً بلا بھیجو اسے بلا بھیجو اور ہم دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کر لینے دو——

(دروازہ کھلتا ہے اور کینڈیڈا اندر داخل ہوتی ہے۔ یوجین ایک دم ناچتے ناچتے سہم کر رہ جاتا ہے)

ک۔ (متعجب ہو کر دہلیز پر سے) یوجین یہ آخر تم کیا کر رہے ہو؟

ی م۔ (اوکھے پن سے) جیمس اور ہم دونوں وعظ دینے کا مقابلہ کر رہے ہیں اور وہ ہار رہا ہے۔

(کینڈیڈا مارِل کی طرف دیکھتی ہے اور یہ دیکھ کر کہ وہ پریشان معلوم ہوتا ہے۔ اس کی طرف بہت

فکرمند ہو کر بڑھتی ہے)

ک۔ تم اس کو پریشان کر رہے تھے یوجین میں ایسی باتیں پسند نہیں کرتی سنا تم نے؟ (اپنا ہاتھ ماریل کے کندھے پر رکھتی ہے اور اپنے غصہ کی وجہ سے اپنا اطیانہ ہنر بھول جاتی ہے) میرے پیارے کو بس اب پریشان نہیں کیا جائے گا۔ میں اس کی حفاظت کروں گی۔

م۔ (فخر سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہوئے) حفاظت!

ک۔ (اس کی بات نہ سنتے ہوئے، یوجین سے) آخر تم کیا کہہ رہے تھے؟

ی م۔ (ڈر کر) کچھ نہیں۔ میں ۔۔۔

ک۔ یوجین! کچھ نہیں؟

ی م۔ (روا سا ہو کر) میرا مطلب یہ۔ میں ۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ میں اب ایسا پھر نہ کروں گا۔ سچ اب نہ کروں گا۔ میں اسے بالکل چھوڑ دیا کروں گا۔

م۔ (غصہ سے یوجین کی طرف بڑھتے ہوئے) مجھے چھوڑ دے گا! شیطان کے ۔۔۔

ک۔ (اسے روکتے ہوئے) نہیں۔ رُک جاؤ جیمس، میں دیکھو اسے ٹھیک کئے دیتی ہوں۔

ی م۔ کیا آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ک۔ (سختی سے) ہاں میں تم سے بے حد خفا ہوں اور میرا قطعی ارادہ ہے تم کو گھر سے باہر نکال دوں۔

م۔ (کینڈڈا کی جرأت سے متعجب ہو کر پھر بھی یہ نہ چاہتے ہوئے کہ کسی مرد کے مقابلہ میں اس کی بیوی اسے بچائے) نرمی سے کینڈڈا! نرمی سے کینڈڈا!! میں اپنی حفاظت آپ کر سکتا ہوں۔

ک۔ (اسے تھپتھپاتے ہوئے) ہاں ہاں کیوں نہیں پیارے لیکن تم کو اب پریشان کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ کرنے دوں گی۔

ی م۔ (تقریباً روتے ہوئے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے) تو اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ نہیں تمہارے جانے کی ابھی ضرورت نہیں ہے اتنی رات گئے تمہیں گھر سے باہر نہ نکالوں گی (زور سے) تمہیں شرم نہیں آتی بے شرم!

ی م۔ (تنک آ کر) لیکن میں نے کیا کیا ہے ؟

ک۔ مجھے خوب معلوم ہے جو کچھ تم نے کیا ہے اور اس قدر گویا کہ میں خود یہاں موجود تھی تم نے بہت ہی نالائق بات کی ہے تم بالکل بچوں ہی کی طرح ہو اپنی زبان کو روک نہیں سکتے۔

ی م۔ مجھے ایک چھوڑ دس موتیں آ جائیں! اگر میں آپ کو ایک لمحہ کی بھی تکلیف دینے کا خیال کروں۔

ک۔ (اس لڑکپن کی بات پر سخت تنفر ظاہر کرتے ہوئے) تمہارے مرنے سے مجھے بڑا فائدہ ہی ہو جائے گا!

م۔ کینڈڈا ڈیر یہ سوال و جواب بالکل بیکار اور نامناسب ہیں۔ در اصل قصہ یہ دو آدمیوں کا ہے اور میں ہی اسے بہتر طے کر سکتا ہوں۔

ک۔ دو آدمیوں کا! کیا تم ایسے شخص کو ایک آدمی سمجھتے ہو؟ (یوجین سے) شریر کہیں کا!

ی م۔ (اس ملامت سے خود میں ایک عجیب ہمت محسوس کرتے ہوئے) اگر مجھے لڑکوں ہی کی طرح برا بھلا کہا جاتا ہے تو پھر لڑکوں کا سا جواب بھی دوں گا۔ جھگڑا اصل میں اس نے پہلے شروع کیا اور یہ مجھ سے بڑا لڑکا ہے۔

ک۔ (ذرا پریشان ہوتے ہوئے کیونکہ اپنی شان پر دھبہ آتا تھا) یہ صحیح نہیں ہو سکتا (مارل سے) جیمیس تم نے تو باتیں شروع نہ کی ہوں گی۔ کیوں نا جیمیس ؟

م۔ (حقارت سے) نہیں۔

ی م۔ (غصہ سے) آئیں!

م۔ (یوجین سے) تم نے خود آج صبح اس قسم کی ابتدا کی (کینڈڈا اس سے فوراً وہ سمجھ جاتی ہے کہ سویرے کی باتوں سے تعلق ہے۔ چنانچہ وہ شکست اور تیزی سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے اور مل اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتا ہے اس لہجہ میں گویا اس کی برتری کو صدمہ پہنچ رہا ہے) تمہاری دوسری بات البتہ درست ہے کہ میں بڑا لڑکا ہوں اس لئے زیادہ مضبوط ہوں۔ لہٰذا تم یہ معاملہ میرے ہاتھ پر چھوڑ دو۔

ک۔ (میرا سے تسکین دیتے ہوئے) ہاں پیارے کیوں نہیں میں ضرور چھوڑ دوں گی۔ لیکن (پریشان ہو کر) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج صبح کیا معاملہ تھا۔

م ۔ (اس کی بات کو نرمی سے ٹالتے ہوئے) پیاری تمہیں اس کے سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ک ۔ لیکن جیمس میں (باہر گھنٹی بجتی ہے) ۔۔۔ اوہو، تو یہ وہ لوگ آرہے ہیں (وہ دروازہ کھولنے کے لئے چلی جاتی ہے)

ی م ۔ (ماریل کی طرف دوڑ کر جاتے ہوئے) ماریل، ماریل! یہ کس قدر خراب بات ہوگئی کہ وہ ہم لوگوں سے خفا ہوگئی ہے۔ مجھ سے تو اسے نفرت ہی ہوگئی ہے۔ اب میں کیا کروں؟

م ۔ (عجیب پریشانی کی حالت میں کمرہ میں ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے) یوجین میرا سر چکرا رہا ہے، میں تھوڑی دیر میں کہیں پاگلوں کی طرح ہنسنے نہ لگوں۔

ی م ۔ (فکرمند ہو کر اس کے ساتھ ٹہلتے ہوئے) نہیں نہیں ایسا نہ کرنا ورنہ وہ سمجھے گی کہ تم کو میں نے پاگل بنا دیا ہے۔ ہنسنا مت۔

(غل شور اور قہقہوں کی آوازیں قریب آتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں لیکیسی مل کی آنکھیں چمک رہی ہیں طرز عمل سے غیر معمولی شگفتگی عیاں ہے لیکن ہوش و حواس بجا ہیں۔ برگیس کے ساتھ داخل ہوتا ہے برگیس بدستور اپنی جگہ مطمئن ہے اور چکنی چپڑی باتیں کر رہا ہے مس گارنٹ اپنی بہترین ٹوپی اور بہترین جیکٹ جمائے ہوئے ان دونوں کے پیچھے آتی ہے۔ حالانکہ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ چمک رہی ہیں لیکن بظاہر ابھی خود کو مدہوش نہیں سمجھتی۔ اپنے ٹائپ رائٹر والی میز کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک ہاتھ میز پر خود کو سہارا دینے کے لئے رکھتی ہے۔ دوسرا پیشانی پر رکھتی ہے جیسے کچھ تھک گئی ہو یا کچھ چکر سا آرہا ہو۔ ارچ ڈینکس کو پھر اپنے شرمیلے پن کا شدید احساس ہوتا ہے اور کھڑکی کی طرف جہاں ماریل کی کتابیں رکھی ہیں چپکے چپکے کھسکنا شروع کرتا ہے)

ل ۔ (انتہائی شگفتگی سے) مجھے آپ کو ضرور مبارکباد دینی چاہئے (اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے) آپ نے کس قدر عمدہ، کس قدر اعلیٰ درجہ کا وجدانی خطبہ، ارے آپ تو خود اپنے سے بڑھ گئے۔

ب ۔ اس میں کوئی شک نہیں جیمس میں تو تمہارے آخری لفظ تک برابر جاگتا رہا کیوں نامس گارنٹ؟

پ ۔ (جھنجھلا کر) مجھے کیا معلوم مجھے تو تمہارا خیال بھی نہ تھا میں تو اپنے نوٹس لکھ رہی تھی (اپنی نوٹ بک نکالتی ہے اور اپنی مختصر نویسی کو دیکھتی ہے اور دیکھ کر تقریباً اداس ہوجاتی ہے)

م۔ پماس کیا میں بہت تیز بولا؟

پ۔ بہت ہی تیز۔ آپ جانتے ہیں کہ میں نوّے الفاظ فی منٹ سے زیادہ نہیں لکھ سکتی چنانچہ بہت کچھ چھوٹ گیا۔ (غصہ میں نوٹ بک کو اپنی مشین کی طرف پھینکدیتی ہے کہ دوسرے دن دیکھا جائے گا اور اب مطمئن ہو کر بیٹھتی ہے)

م۔ تسکین دیتے ہوئے) خیر، خیر کوئی حرج نہیں۔ جانے دو، جانے دو۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم سب لوگ کھانا کھا چکے؟

ل۔ مسٹر برگیس نے آج ہم لوگوں کو بلگریو ہوٹل میں ایک نہایت اعلیٰ درجہ کی دعوت دی۔

ب۔ (فیاضانہ شان سے) مسٹر ل یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے (انکساری سے) آپ لوگوں کی ہمیشہ ایسی ہی خاطر تواضع کرنے کے لئے تیار رہوں۔

پ۔ ہم لوگوں کو شمپین پینے کو ملی۔ میں نے تو اس سے پہلے اسے چکھا بھی نہ تھا۔ مجھے چنانچہ ذرا چکر محسوس ہو رہا ہے۔

م۔ (تعجب سے) شمپین کے ساتھ دعوت! یہ تو واقعی بہت اعلیٰ رہی۔ کیا بات تھی برگیس۔ یہ میری فصاحت کا اثر تھا کہ جس کے سبب تم اس قدر خرچ پر آمادہ ہو گئے؟

ل۔ (خطیبانہ شک ملاتے ہوئے) آپ کی فصاحت اور مسٹر برگیس کی دریا دلی (انتہائی شگفتگی لے جوش میں آکر) اور ساریل صدر بھی کیا لاجواب آدمی تھا وہ بھی ہمارے ساتھ کھانے پر آیا تھا۔

م۔ (نتیجہ بکمال کو برگیس کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا! آ۔ آ۔ صدر! تو اب میں سمجھا (برگیس انکساری کے طور پر کھانسنے لگتا ہے یہ چھپانے کے لئے کہ اپنی چالاکی پر مسرور و مطمئن ہے۔ لیکسی اپنے بازوؤں کو لپیٹ کر ایک شان کے ساتھ صوفے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک چکر آتا ہے لیکن خود کو سنبھال لیتا ہے۔ کینڈڈا ایک کشتی میں گلاس، لیموں اور گرم پانی کا ایک جگ لاتی ہے)

ک۔ لیمونیڈ کون پئے گا؟ تم لوگ ہمارا قاعدہ جانتے ہو یعنی شراب سے قطعی پرہیز (کشتی کو میز پر رکھدیتی ہے اور لیمونچوڑنے والی مشین اٹھاتی ہے اور ہر ایک کی طرف دیکھتی ہے)

م- کوئی ضرورت نہیں اس کی کینیڈا۔ یہ سب لوگ شمپین پی کر آئے ہیں۔ پر اس نے بھی اپنا عہد توڑ دیا
ک- (پرازر بائن سے) کیا واقعی تم نے بھی شمپین پی ہے؟
پ- (زور دے کر) ہاں میں نے پی۔ میں نے توصرف بیر کے متعلق توبہ کی تھی۔ بیر کو میں سخت ناپسند کرتی ہوں۔ مسٹر ہاریل آج اب اور کوئی خط تو میرے جواب لکھنے کے لئے نہیں ہے؟
م- ہاں بس اب آج کوئی نہیں۔
پ- اچھی بات تو پھر۔۔۔ سب لوگ خدا حافظ!
ل- (ہمت مردانہ سے) اس گارنٹ کوئی مضائقہ نہ ہو تو میں آپ کو آپ کے مکان تک چھوڑ آؤں؟
نہیں شکریہ میں خود کو اس وقت کسی پر چھوڑ نہیں سکتی۔ کاش کہ میں وہ ذلیل شئے ذرا بھی نہ پیتی۔ (وہ لڑکھڑاتی ہوئی دروازہ کی طرف بڑھتی ہے اس سے ٹکرا جاتی ہے اور بمشکل گرتے گرتے بچتی ہے)
ب- (غصے سے) ذلیل شئے! لڑکی جانتی بھی نہیں کہ شمپین کیا چیز ہے پامری اور گرینو کمپنی کی ساڑھے بارہ شلنگ کی ایک بوتل! اور وہ پورے دو گلاس پی گئی!
م- (اس کے متعلق فکرمند ہو کر) ٹیکسی جاؤ اور اسے حفاظت سے گھر پہونچا آؤ۔
ل- (دو گلاس سن کر اور فکرمند ہو کر) لیکن اگر وہ واقعی ۔۔۔ یعنی فرض کیجئے اگر وہ سڑک پر گانے لگے یا اسی طرح کی کوئی اور حرکت ۔۔۔
م- ہاں یہی مجھے بھی ڈر ہے کہ شاید وہ ایسا کر بیٹھے۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ جاکر اسے حفاظت سے گھر پہونچا آؤ۔
ک- ہاں ٹیکسی ضرور شاباش! (وہ اس سے ہاتھ ملاتی ہے اور آہستہ سے دروازہ کی طرف ڈھکیل دیتی ہے)
ل- ہاں جانا مجھ پر فرض ہے مگر مجھے امید ہے اس کے ساتھ جانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ خدا حافظ! مسٹر ہاریل (سب سے مخاطب ہو کر) خدا حافظ (وہ چلا جاتا ہے اور کینیڈا دروازہ بند کر دیتی ہے)
ب- وہ خود بھی دو گھونٹوں کے بعد بڑی احتیاط سے پی رہا تھا لوگ اب اتنی پیتے نہیں جتنی کہ اگلے زمانہ والے پیا کرتے تھے (آتشدان کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا جیمس بس اب گھر کے دروازہ بند کر لینے کا

وقت آگیا ہے مسٹر مارچ بنکس آپ بھی مکان چل رہے ہیں نا؟ کیا میں راستہ میں کچھ دور تک آپ کی شرف ہمراہی سے سرفراز ہو سکتا ہوں؟

ی م۔ (ڈر کر) ہاں، ٹھیک اب مجھ کو واقعی جانا چاہیئے (وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے لیکن کینڈڈا سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور اس کا راستہ روک لیتی ہے)

ک۔ (خاموش تحکمانہ لہجہ میں) تم ادھر بیٹھو چل کے تم ابھی نہیں جا سکتے۔

ی م۔ (التجا کرتے ہوئے) نہیں، ہیں ــــ میرا مطلب جانے کا نہیں تھا (آکر چپکے سے صوفے پر بیٹھ جاتا ہے)

ک۔ پاپا، مسٹر مارچ بنکس آج ہم لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے۔

پ۔ اچھا اچھا تو میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ جیمس (ماریل سے مصافحہ کرتا ہے اور یوجین کی طرف آتا ہے) مسٹر مارچ بنکس تم اپنے بستر کے قریب ان لوگوں سے ایک لیمپ رکھوا لینا کیونکہ ممکن ہے تم کو وہی دورہ پڑے تو وقت نہ ہو۔ اچھا خدا حافظ

ی م۔ شکریہ میں ضرور ایسا کروں گا خدا حافظ مسٹر برگیس (دونوں مصافحہ کرتے ہیں۔ برگیس دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ (ماریل کو روکتے ہوئے جو برگیس کے پیچھے اسے پہونچانے جا رہا ہے) ذرا ارکنا ڈیر میں پاپا کو اُن کا اوورکوٹ تو پہنادوں (وہ برگیس کے ساتھ باہر چلی جاتی ہے)

ی م (چپکے سے اُٹھ کر ماریل کے پاس جاتے ہوئے) ماریل بس اب ایک زبردست منظر پیش ہونے والا ہے تم خوفزدہ تو نہیں ہو؟

م۔ ذرہ برابر بھی نہیں۔

ی م۔ تمہاری ہمت پر اس وقت البتہ رشک معلوم ہوتا ہے (وہ تعریف کے طور پر اپنا ہاتھ ماریل کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے) میرے قریب رہنا۔ رہو گے نا؟

م۔ (اسے ہٹاتے ہوئے) نہیں یوجین ہر شخص اپنی آپ حفاظت کرے۔ بس آج اس وقت اس کو ہم دونوں میں سے کسی کو ہمیشہ کے لئے انتخاب کر لینا ہے۔

(کینڈڈا واپس آجاتی ہے۔ یوجین ایک خطاوار اسکول کے لڑکے کی طرح چپکے سے دبکا ہوا پھر صوفے پر واپس آتا ہے)

ک۔ (ان دونوں کے درمیان آکر یوجین سے مخاطب ہوتے ہوئے) تمہیں اپنے کئے پر ندامت ہے؟

ی م۔ (صداقت سے) ہاں، دلی تکلیف۔

ک۔ اچھا خیر تو پھر تم معاف کئے جاتے ہو۔ اور بس اب ایک اچھے چھوٹے لڑکے کی طرح جا کر بستر پر سوتے رہو۔ میں جمیس سے کچھ تمہارے متعلق باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

ی م۔ (سخت انتشار سے اٹھتے ہوئے) نہیں۔ ریل، میں ایسا نہیں کروں گا میں یہیں رہوں گا۔ تم اس سے سب کچھ کہہ دو۔

ک۔ (اپنے شکوک صحیح پاتے ہوئے) مجھ سے کیا کہہ دو؟ (یوجین کی نگاہیں اس سے چار نہیں ہوتیں وہ مڑتی ہے اور ماریل کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

م۔ (انجام کے لئے خود کو تیار کرتے ہوئے) مجھے اُس سے کچھ کہنا نہیں ہے سوائے اس کے کہ (یہاں اس کی آواز نرم و گلوگیر ہو جاتی ہے) وہ دنیا میں میرا بہترین خزانہ ہے۔ اگر واقعی وہ میری ہی ہے۔

ک۔ (اس کے اس خطیبانہ لہجہ کو برا مان کر نیز اس بات کو برا مانتے ہوئے کہ وہ اس سے گویا سینٹ میتھو کا مجمع سمجھ کر مخاطب ہو رہا ہے) میرا خیال یہ ہے کہ اگر صرف اتنا ہی کہنا تھا تو یوجین بھی اس سے کچھ کم نہیں کہہ سکتا

ی م۔ (ناامید ہو کر) ماریل وہ ہم دونوں پر ہنس رہی ہے

م۔ (جز بز ہو کر) اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ کینڈڈا کیا تم ہم پر ہنس رہی ہو۔ کینڈڈا:

ک۔ (دبائے ہوئے غصہ سے) جمیس یوجین بہت تیز لڑکا ہے۔ ممکن ہے کہ میں ہنسنے لگوں لیکن یہ زیادہ ممکن ہے کہ مجھے سخت غصہ آجائے۔ وہ آتشدان کے پاس چلی جاتی ہے اور وہاں مینٹل پر اپنا بازو رکھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک پیر آتشدان کے سیخچوں پر ہے۔ یوجین ماریل کے پاس چپکے سے جاتا ہے اور آہستہ سے اس کی آستین پکڑ کر جھنکاتا ہے۔

ی م۔ (چپکے سے کان میں کہتے ہوئے) دیکھو ماریل ہم لوگوں کو کوئی بات زبان سے نہ نکالنی چاہئے۔

م۔ (یوجین کو ہٹاتے ہوئے بغیر اس کی طرف دیکھے ہوئے) کینڈڈا تم یہ دھمکی دے رہی ہو۔ مجھے اُمید تو ایسی نہیں ہے۔

ک۔ (روز سے دہکاتے ہوئے) ہاں جمیں غالباً: یوجین میں نے تم سے جانے کو کہا تھا۔ جانتے ہو کہ نہیں؟

م۔ (اپنا پیر زمین پر زور سے مارتے ہوئے) نہیں وہ نہیں جا سکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ یہیں رہے۔

ی م۔ نہیں میں چلا جاؤں گا جو کچھ تم مجھ سے کہو گی وہی کروں گا (وہ دروازہ کی طرف بڑھتا ہے)

ک۔ رکو (وہ رک جاتا ہے) کیا تم نے جمیں کا کہنا سنا نہیں کہ وہ نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ یہاں کا مالک جمیں ہے۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم؟

ی م۔ (ایک نوجوان شاعر کی طرح ظلم کے خلاف برافروختہ ہوتے ہوئے) لیکن وہ مالک ہے کس حق سے؟

ک۔ (آہستہ سے) اسے بتلا تو دو جمیں!

م۔ (چونک کر) میری پیاری! مجھے نہیں معلوم کہ وہ کونسا ایسا حق ہے جس سے میں یہاں کا مالک ہوں میں تو اس قسم کا کوئی حق نہیں جتاتا۔

ک۔ (سخت ملامت کے لہجہ میں) تم نہیں جانتے جمیں۔ ارے جمیں! (یوجین کی طرف متوجہ ہوکر) یوجین تمہیں تو معلوم ہوگا (وہ اپنا سر نفی میں ہلاتا ہے لیکن اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا) ہاں تم ابھی بہت بچے ہو۔ خیر، اچھا تو اب تمہیں یہاں رکنے کی اجازت دیتی ہوں تاکہ تم یہ باتیں سیکھ لو، جان لو (وہ آتشدان کے پاس سے آتی ہے اور ان دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہو جاتی ہے) اچھا جمیں، اب یہ بتاؤ واقعہ کیا ہے؟ بتاؤ، مجھ سے کہو!

ی م۔ (ماریل کی طرف جھکے سے کہتے ہوئے) مت بتانا۔

ک۔ بولو منھ سے کہو تو!

م۔ (آہستہ سے) میں چاہتا تھا کہ تمہارے دماغ کو رفتہ رفتہ تیار کروں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ پیدا ہونے پائے۔

ک۔ ہاں، ہاں پیارے یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم نے ایسا کیا لیکن ان باتوں کا خیال نہ کرو مجھے کوئی غلط فہمی نہ ہوگی۔

م۔ اچھا تو ـــ (رک جاتا ہے اس سے کہ وہ ایک لمبی تشریح کرنا چاہتا تھا لیکن الفاظ نہیں ملتے)

ک۔ اچھا تو!

م۔ (ایکدم صاف صاف بول اٹھتا ہے) یوجین یہ کہتا ہے کہ تمہیں اس سے عشق ہے۔

ی م۔ (جلدی سے اور انتہائی گھبراہٹ سے) نہیں نہیں نہیں نہیں کبھی نہیں مسٹر ارل یہ میں نے کبھی نہیں کہا یہ صحیح نہیں ہے میں نے یہ کہا تھا کہ مجھے محبت ہے اور میں نے یہ کہا تھا کہ میں تم کو خوب سمجھ پاتا ہوں اور یہ نہیں سمجھ پاتا۔ اور یہ سب اس وقت نہیں کہا تھا جب وہ تمام باتیں آپ کے سامنے ہوئی تھیں میں قسمیہ کہتا ہوں آج صبح صرف یہ بات ہوئی تھی۔

ک۔ (واقف ہوکر) آج صبح!

ی م۔ ہاں (وہ کینیڈ ڈا کی طرف دیکھتا ہے تاکہ یقین ان سے اور پھر آگے کہتا ہے) میرے کالر خراب ہوجانے کی وجہ یہی تھی۔

ک۔ تمہارا کالر؛ مطلب سمجھ کر ذرا ارل کی طرف مڑتی ہے۔ (سنجیدہ او متعجب) ارے تمہیں کیا تم نے ——! (رک جاتی ہے)

م۔ (شرمندہ ہوکر) کینیڈ ڈا تم جانتی ہو کہ مجھے اکثر غصہ آجاتا ہے۔ اور یہ بک رہا تھا (کانپ کر) کہ تم مجھ سے سخت نفرت رکھتی ہو۔

ک۔ جلدی سے یوجین کی طرف مڑتے ہوئے) کیوں، کیا تم نے ایسا کہا تھا؟

ی م۔ (ڈرکر) نہیں۔

ک۔ (تقریباً غضبناک ہوکر) تو اس سے تمہارا یہ مطلب ہے کہ تمہیں مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔

ی م۔ نہیں نہیں میں یہ (بہت ہمت کرکے) وہ داؤد علیہ السلام کی بیوی کا قصہ تھا اور وہ واقعی بھی گھر میں نہیں ہوا تھا بلکہ ان سے خفا ہوگئی تھیں اور نفرت کرنے لگی تھیں جب انھوں نے ان کو دوسرے لوگوں کے سامنے طیبانہ رقص کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

م۔ مناظرہ کرنے والوں کی طرح (اپنا موقع پائے ہوئے) سنا کینیڈ ڈا! تمام لوگوں کے سامنے رقص کر رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ اپنی ان حرکتوں سے تمام لوگوں کے دل موہ کر ان کی اصلاح کر رہا ہے حالانکہ وہ

سب پر اسی والی شکایت میں مبتلا تھے (کینیڈا کچھ کہنے کو ہوتی ہے لیکن وہ اپنا ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیتا ہے) نہیں تمہیں غصہ ظاہر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کینیڈا —

ک۔ ظاہر کرنے کی!

م۔ (سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے) یوجین صحیح کہتا تھا جیسا کہ تم نے بھی چند گھنٹے گذرے کہا تھا کہ یوجین ہمیشہ صحیح بات کہتا ہے اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس کو خود تم اس سے بہتر طریقہ پر نہیں کہہ چکی تھیں۔ وہ شاعر ہے اور ہر بات سمجھ جاتا ہے میں صرف پادری ہوں جو کچھ بھی نہیں سمجھتا۔

ک۔ (تاسف کے لہجہ میں) جو کچھ ایک بیوقوف لڑکا کہے تم اسے مان لوگے اگر وہی بات میں نے بھی مذاق میں کہدی ہو۔

م۔ یہ بیوقوف لڑکا ایک معصوم بچے کی طرح الہامی گفتگو کر سکتا ہے لیکن اس میں ایک فہمی کی مکاری شامل ہوتی ہے۔ اس نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تم دراصل اس کی ہو نہ کہ میری۔ اور صحیح یا غلط مجھکو بھی یہ شک پیدا ہو گیا ہے کہ شاید ایسا ہی ہو۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ شک وشبہ میں مبتلا ہو کر ادھر ادھر پریشان مارا مارا پھروں۔ میں ایسی بھی زندگی برداشت نہیں کر سکتا کہ ہوں تو ساتھ ساتھ لیکن دل میں غبار بھرے رہوں۔ میں حسد کرنے کی ناقابل برداشت ذلت اپنے لئے روا نہیں رکھ سکتا۔ اس لئے ہم دونوں اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ تم ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کر لو۔ اب میں تمہارے انتخاب کا انتظار کرتا ہوں۔

ک۔ (آہستہ سے ایک قدم پیچھے ہٹتی ہے اس عبارت آرائی سے اس کا دل نفرت ہوجاتا ہے اور وہ دیکھ لیتی ہے کہ یہ الفاظ محض جذبات سے کہے گئے ہیں) اچھا تو مجھے انتخاب کرنا ہے تو کیوں نا ہو تو میرے خیال میں غالباً تم دونوں میں یہ مسئلہ بالکل طے ہو گیا ہے کہ میں دو میں سے ایک کی ہو جاؤں

م۔ (استقلال سے) بالکل اب تم اپنے قطعی طور سے اپنا انتخاب کر لو۔

ی م۔ (پریشانی سے) ماریل تم سمجھے نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود تم پر اپنی مالک ہے۔

ک۔ (اس کی طرف مڑتے ہوئے) ہاں میاں یوجین میرا یہ مطلب بھی ہے اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی جو ابھی تم دونوں

کو معلوم ہو جائے گا اچھا میرے مالکین دعا بغیں ذرا یہ تو مجھے بتائیے کہ آپ لوگ اپنے انتخاب کے لئے اپنا اپنا کیا عطیہ مجھے پیش کرتے ہیں۔ اس وقت میں نیلام پر چڑھی ہوئی ہوں۔ اچھا بولو جیمس تم کیا قیمت پیش کرتے ہو میرے لئے ؟

م۔ (انتہائی تکلیف سے) کینڈ ــــــــ (اس کی آواز کام نہیں کرتی۔ آنکھیں اشک آلودہ ہو جاتی ہیں اور آواز گلوگیر خطیب ایک زخمی جانور ہو کر رہ جاتا ہے) میں بول نہیں سکتا۔

ک۔ (بے اختیار ہو کر اس کے پہلو میں جاتے ہوئے) آہ ! میرے پیارے ــــ

ی م۔ (گھبرا کر) رکو ! یہ معاملہ کی صفائی نہیں ہے مارل تم یہ نہیں دکھلا سکتے کہ تم پر تکلیف ہے میں خود سخت مجروح ہوں لیکن اپنی جراحت دل دکھا کر اس کو اپنی طرف ہمدردانہ راغب کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے میں نہیں روتا۔ اس کے جذبہ رحم کو نہ ابھارو جو کچھ تمہیں کہنا ہے کہو ــــ مردانہ وار کہو۔

م۔ (اپنی تمام قوتیں مجتمع کر کے) ہاں یہ تم ٹھیک کہتے ہو مجھے رحم کی قیمت لگانا مطلوب نہیں ہے (اپنے کو کینڈا سے کھینچ لیتا ہے)

ک۔ (واپس ہوتے ہوئے رکھائی سے) معاف کرنا جیمس میں تم سے مس ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اچھا اب میں تمہاری قیمت سننا چاہتی ہوں۔

م (غرور و انکساری کے ساتھ) کینڈا میرے پاس تمہاری قیمت کے لئے کچھ نہیں ہے سوائے اپنی طاقت تمہاری حفاظت کے لیے۔ اپنی ایمانداری تمہارے اطمینان کے لئے۔ اپنی محبت و لیاقت تمہاری معاش کے لئے اور اپنا اثر و اقتدار تمہاری شان کے لئے۔ بس یہی چیزیں ایک مرد ایک عورت کو پیش کر سکتا ہے۔

ک۔ (بہت ہی خاموشی سے) اور تم یوجین ؟ تم کیا پیش کرتے ہو ؟

ی م۔ اپنی کمزوری۔ اپنی بے بسی۔ اپنی حسینانہ دلی۔

ک۔ (متاثر ہو کر) یوجین یہ قیمت اچھی ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اپنا انتخاب کس طرح کروں۔

(وہ کچھ دیر رکتی ہے اور ہر دو کی طرف دیکھتی ہے گویا دونوں کو تول رہی ہے۔ مارل جس کا زور خودی یوجین

کی قیمت سن کر ایکدم شکست ہو گیا ہے اب اپنی پریشانی کو چھپا نہیں سکتا۔ یوجین شدت اضطراب و بیچینی سے بالکل بت کی طرح ساکت ہے)

م۔ (بھاری گلو گیر آواز میں۔ اس کی روح سخت ترین تکلیف کی وجہ سے بے اختیارانہ التجا کر رہی ہے) کینڈڈا!

ی م۔ (الگ حقارت کے لہجہ میں) بزدل!

ک۔ (معنی خیز انداز میں) میں تم دونوں میں سے کمزور ترین شخص کو اپنے تئیں حوالہ کرتی ہوں۔

(یوجین فوراً اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے اور اس کا چہرہ مٹی کے ڈھیر کی طرح سپید پڑ جاتا ہے)

م۔ (اپنی شکست سمجھ کر سر تسلیم خم کرتے ہوئے) کینڈڈا میں تمہارا فیصلہ قبول کرتا ہوں۔

ک۔ تم سمجھے یوجین؟

ی م۔ اف! میری تو دنیا تباہ ہو گئی۔ وہ اس خوشی کا بار نہیں اٹھا سکتا۔

م۔ (نہ یقین کرتے ہوئے اپنا سر ایک دم مضحک انداز میں اٹھاتے ہوئے) کیا تمہارا مطلب مجھ سے ہے کینڈڈا؟

ک۔ (کچھ مسکرا کر) اب ہمیں بیٹھ کر بالکل دوستوں کی طرح اس گفتگو کو ختم کر ڈالنا چاہئے۔ (ماریل سے) بیٹھ جاؤ پیارے (ماریل بالکل خود فراموش آتش ان کے پاس سے لڑکوں والی کرسی اٹھا لیتا ہے) یوجین میرے لئے وہ کرسی اٹھا تو لینا (آرام کرسی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یوجین بہت خاموشی سے کرسی لاتا ہے اور ماریل کے پاس اس سے کچھ پیچھے رکھ دیتا ہے خود مہمانوں والی کرسی لے لیتا ہے اور آہستہ سے اس پر بے حس بیٹھ جاتا ہے جب سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں تو وہ اپنے متین، خاموش اور ہلکے لہجوں سے ان پر ایک سکون طاری کر دیتی ہے) تمہیں یاد ہوگا یوجین جو کچھ تم نے اپنے متعلق مجھے بتایا تھا کہ جب سے تمہاری بوڑھی دایہ فوت ہوئی کسی نے تمہاری طرف التفات سے نہیں دیکھا ہے اور کس طرح تمہارے فیشن ایبل بھائی اور بہنیں، تمہارے باپ اور ماں کے چہیتے تھے اور کس طرح تم آئین میں تکلیف اٹھاتے تھے اور کس طرح تمہارا باپ آکسفورڈ میں تم کو جبراً بھیجنے کے لئے تم کو مالی تکلیف دے رہا ہے اور کس طرح تم کو پریشان، بے آسرے اور بے ٹھکانے رہنا پڑا ہے۔ ہمیشہ تنہا بے یار و مددگار۔ نفرت اور بدگمانی کا شکار۔ بے چارہ!

ی م۔ (اپنی خوبی قسمت کو مکمل کرتے ہوئے) میرے لئے میری کتابیں تھیں میرے سامنے مظاہر قدرت تھے اور آخر کار

تم سے ملاقات ہوئی۔

ک۔ خیر، اس کا فی الحال ذکر چھوڑو۔ اب میں تمہیں اِس بڑے لڑکے کے متعلق بتانا چاہتی ہوں اسکو شروع ہی سے لاڈ و پیار نے خراب کر دیا۔ ہم لوگ ہر مہینہ کم از کم دو مرتبہ اس کے والدین کے وہاں جاتے ہیں تم کبھی یوجین آنا تو میں تمہیں اُس گھر کے پرانے ہیرو کی تصویریں دکھاؤں گی۔ جیمس کے بچپن کی تصویر جس میں وہ تمام بچوں سے عجیب و غریب ہے۔ جیمس کی آٹھ سال کی عمر کی تصویر جب اس نے اسکول میں پہلا انعام حاصل کیا تھا۔ جیمس کی گیارہ برس کی تصویر جب وہ اپنی ٹیم کا کپتان ہوا تھا۔ جیمس اپنے پہلے فراک کوٹ میں غرضیکہ جیمس کی مختلف شاندار حالتوں کی تصویریں ہیں تم جانتے ہو کہ جیمس کس قدر مضبوط آدمی ہے مگر مجھے امید ہے کہ اس نے تمہیں زیادہ اذیت نہ پہونچائی ہوگی کس قدر ہوشیار ہے کس قدر خوش و خرم (سنجیدہ ہوتے ہوئے) جیمس کی ماں اور اس کی تینوں بہنوں سے پوچھو کہ ان لوگوں نے اسے صرف مضبوط، بہادر، ہوشیار اور خوش و خرم بنانے میں کس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھ سے پوچھو کہ مجھے کس قدر تکلیف اُٹھانا پڑتی ہے جبکہ تنہا مجھے اس کی ماں اس کی بہنوں اور اس کی بیوی اور اس کے لڑکوں کی ماں سب کا پارٹ ادا کرنا ہوتا ہے۔ پراسی اور میریا سے پوچھو کہ گھر کے کاموں میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے اور خاص جب ہمارے ہاں کوئی ملاقاتی ہم کو پیاز چھیلنے میں مدد دینے کے لئے نہیں ہوتا۔ ان سوداگروں سے پوچھو جو جیمس کو پریشان کرنے اور اس کے دلچسپ خطبے خراب کرنے آیا کرتے ہیں۔ کون ہے جو ان کو دور رکھتا ہے؟ جب ہم لوگوں کے پاس روپیہ ہوتا ہے تو جیمس انھیں دیتا ہے جب نہیں ہوتا تو ان سے معافی میں مانگتی ہوں۔ میں اس کے آرام آسائش اور محبت کی خاطر گھر کو ایک قلعہ سا بنائے رکھتی ہوں اور دروازے پر ہمیشہ ایک نگراں کی طرح کھڑی رہتی ہوں کہ معمولی قسم کی فکریں اندر نہ آنے پائیں۔ میں اس کو یہاں مالک بناتی ہوں۔ حالانکہ وہ خود اسے نہیں جانتا اور ابھی کچھ دیر ہوئے تمہیں تبلا بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کس طرح مالک ہے (شیریں طنز سے) اور حالانکہ جب اسے یہ شک ہوا تھا کہ شاید میں تمہارے ساتھ چلی جاؤں تو پہلی فکر اسے یہ ہوئی تھی کہ ——— میرا کیا حشر ہوگا اور میرے یہاں قائم رہنے کیلئے

جانتے ہو اس نے کس چیز کی ترغیب دی۔ (اس کی طرف جھک کر اور ہر جملہ پر اس کے بالوں کے لچھوں کو سہلاتی ہوئی) اپنی طاقت میری حفاظت کے لئے۔ اپنی محنت میری زندگی کے لئے۔ اپنا وقار میری شان کے لئے (نرم پڑتے ہوئے) نہیں میں تمہارے دلکش نغمہ کو غلط ترتیب سے خراب کئے دے رہی ہوں کیوں نا پیارے (محبت سے، اپنا گال اس کے گال سے ملا دیتی ہے)

م۔ (بالکل از خود رفتہ ہو کر اس کی کرسی کے پاس گھٹنوں کے بل جھکتے ہوئے اور اس سے بالکل بھولے بچوں کی طرح ہم آغوش ہوتے ہوئے) جو کچھ تم نے کہا بالکل صحیح کہا ایک ایک لفظ صحیح۔ جو کچھ میں ہوں تمہارا ہی بنایا ہوا ہوں تمہیں نے مجھے اپنے ہاتھوں کی محنت اور دل کی محبت سے بنایا ہے۔ تم میری بیوی بھی ہو، میری ماں بھی اور میری بہنیں بھی۔ ہر ایک کی محبت اور خبر گیری تم میں ملی ہوئی موجود ہے

ک۔ (اس کے بازوؤں میں ہنستی ہوئی یوجین سے) کیا یوجین میں تمہارے لئے بھی تمہاری ماں اور تمہاری بہنیں ہوں

ی م۔ (اٹھتے ہوئے سخت حقارت کے انداز میں) نہیں کبھی نہیں !! اچھا تو بس اب میں جاتا ہوں۔

ک۔ (ایک دم اٹھ کھڑی ہوتی ہے) نہیں یوجین کیا تم آتنی رات گئے چلے جاؤ گے؟

ی م۔ (اس کے الفاظ میں اب ایکدم مردانہ لہجہ آگیا ہے لڑکوں والا لہجہ نہیں رہا) مجھے معلوم ہے کہ کونسا وقت کس بات کے لئے مناسب ہے۔ جو کچھ مجھے کرنا ہے اس کو کرنے کے لئے بیتاب ہوں۔

م۔ (وہ بھی کھڑا ہو گیا ہے کینڈڈا اسے کوئی عجلت کی بات نہ کرنے دینا۔

ک۔ (مطمئن۔ یوجین کی طرف مسکراتے ہوئے) نہیں اس کا ڈر نہیں ہے۔ وہ بغیر خوش ہوئے زندہ رہنا سیکھ گیا ہے۔

ی م۔ مجھ کو اب خوشی کی تمنا نہیں رہی۔ زندگی خوشی بہت بہتر اور برتر چیز ہے۔ پادری جیمس میں دونوں ہاتھوں سے اپنی خوشی تم کو دیتا ہوں مجھے تم سے محبت ہے۔ اس لئے کہ تم نے اس عورت کو آسودہ کر دیا ہے جس سے میں محبت کرتا تھا۔ خدا حافظ۔ (وہ دروازہ کی طرف جاتا ہے)

ک۔ اچھا ایک آخری بات اور سن لو (وہ رک جاتا ہے لیکن بغیر اس کی طرف مڑے ہوئے کینڈڈا اس کے پاس جاتی ہے) تمہاری عمر کیا ہے یوجین؟

ی م۔ اس قدر جتنی کہ اس وقت دنیا کی عمر ہے۔ حالانکہ صبح میں صرف اٹھارہ برس کا تھا۔

ک۔ (انہارہ)! اچھا تو تم میری خاطر ذرا دو جملوں کو ایک نظم میں نظم کر دینا اور مجھ سے وعدہ کرو کہ جب کبھی میرا خیال آئے گا ان کو ضرور کہہ لیا کروگے

ی م۔ (بغیر کوئی حرکت کئے) جلے بتاؤ کیا ہیں؟

ک۔ جب میری عمر تیس برس کی ہوگی اس کی پینتالیس کی جب میں ساٹھ کا ہوں گا تو وہ پچھتر کی ہوگی۔

ی م۔ (اس کی طرف مڑتے ہوئے) یہ تو کوئی بات نہیں ایک سو برس میں ہم دونوں عمر کی ایک ہی منزل میں ہوں گے لیکن اس سے بہتر مجھے ایک بھید معلوم ہوگیا ہے جو میرے دل میں محفوظ ہے اچھا بس اب مجھے جانے دو۔ رات بہت جا رہی ہے اور موسم باہر بہت خراب ہے۔

ک۔ خدا حافظ۔ (اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے تو وہ اس کا مطلب سمجھ جاتا ہے، اور فوراً گھٹنوں کے بل ہو جاتا ہے وہ اس کی پیشانی چوم لیتی ہے اس کے بعد وہ تیزی سے چلدیتا ہے کینڈڈا اماریل کی طرف واپس آتی ہے اپنے بازو پھیلائے ہوئے) آہ جمیں!

(دونوں ہمکنار ہو جاتے ہیں لیکن دونوں یہ نہیں سمجھ پاتے کہ شاعر کونسا بھید اپنے دل میں لے کر گیا)

(پردہ)

مترجمہ نورالحسن ہاشمی

نوید فردا

اب غم دل ہی علاج غم دوراں ہوگا
درد کونین ہی اب مژدۂ درماں ہوگا

دور تاریکیِ پیہم ہے تو غم کیا ناداں!
تپش زیست اگر کم ہے تو غم کیا ناداں!

شعلۂ مرگ جو برہم ہے تو غم کیا ناداں!
شعلۂ مرگ ہی اب سر بگریباں ہوگا

یہ تباہی ہے اک آبادیِ نو کی تقریب
غرق کر دے گی مشیت یہ طلسم تخریب

خواب ہو جائے گا آلام کا سیلاب مہیب
سرد آتشکدۂ فتنۂ دوراں ہوگا

یہ جو لہرا کے اُٹھا ہے افق امکاں سے
پھول برسیں گے اسی ابر شرر افشاں سے

کیوں ہے تجھکو غم طوفاں کہ اسی طوفاں سے
اک نیا ساحل امید نمایاں ہوگا

اک نئی صبح کی تعمیر ہے تاریکیِ شام
لمحہ لمحہ ہے یہاں قاصد تجدید نظام

یہی شعلے کہ جو لائے ہیں خزاں کا پیغام
انہیں شعلوں سے چراغان بہاراں ہوگا

خود ہی اٹھ جائینگے سرمایہ و محنت کے حجاب
رخ گیتی نظر آئے گا برافگندہ نقاب

جگمگا دے گا جہاں کو نفس عالمتاب
پردہ ابر سے خورشید نمایاں ہوگا

عدل و انصاف و مساوات کا پرچم لے کر
ابن آدم کے لئے جنت آدم لے کر

زندگی آئے گی تسکین دو عالم لے کر
یہ جہاں غیرت کاشانۂ رضواں ہوگا

سینۂ دہر سے ہٹ جائے گا سنگ بیداد
کر سکے گا نہ کوئی روح بشر کو ناشاد

تازگی قلب کو بخشے گا ضمیر آزاد
ذوق پرواز بصد ناز پر افشاں ہوگا

بند ہو جائے گا دروازۂ مکر و تزویر
نہ سنے گا کوئی افسانۂ دار و زنجیر

دل شکن ہی نظر آئے گا نہ کوئی دلگیر
دل انساں ہی نثار دل انساں ہوگا

جلوہ گر ہوگی زمانے میں وہ تہذیب عظیم
ہمہ تن شوق ہے جس کیلئے ہر قلب سلیم

جس کی موجوں سے رواں کوثر و تسنیم و نسیم
تازہ تر فیض سے جس کے چمن جاں ہوگا

شعلۂ غم کو بجھا دے گی ہوائے دوراں — سر آلام جھکا دے گی ہوائے دوراں
پھول کانٹوں کو بنا دے گی ہوائے دوراں — دامن دہر گل افروز و گل افشاں ہوگا

خود پرستی کا جہاں سوز ترانہ کب تک! — امتیازات تمدن کا بہانہ کب تک!
نسل اور رنگ کا تاریک فسانہ کب تک! — عام اب ہر شرفِ عالم امکاں ہوگا

یہ تمدن جسے پندار خود آرائی ہے — یہ تمدن کہ جو پروردہ دارائی ہے
یہ تمدن کہ جو انسان کی رسوائی ہے — یہ تمدن ہی اب اک خواب پریشاں ہوگا

عافیت خانۂ جمہور بنے گی دنیا! — سوز دل سے ہمہ تن نور بنے گی دنیا!
ہم نشینِ شہ و مزدور بنے گی دنیا! — کوکب امن و مساوات درخشاں ہوگا

خاک ہو جائے کی کندن انھیں میدانوں کی — خلد بن جائے گی دنیا انھیں ویرانوں کی
اب بدلنے کو ہے تقدیر بیابانوں کی — اور ہی رنگ رخ گردش دوراں ہوگا

صبح نو عرش سے پیغام بقا لائے گی — بہر ارباب وفا روح وفا لائے گی
مژدہ خدمت مخلوق خدا لائے گی — خدمت خلق خدا مذہب انساں ہوگا

بھوک اور غم کے مظالم نہ سہے گا انساں — اب نہ افلاس کی موجوں میں بہے گا انساں
کسی انساں کا بھکاری نہ رہے گا انساں — ہر بشر نازکش رحمت یزداں ہوگا

شمع بیداری افکار فروزاں ہوگی! — آگہی جرأت احساس پہ نازاں ہوگی!
زندگی نغمۂ آزادی انساں ہوگی! — دہر گہوارۂ آزادی انساں ہوگا

کم نگاہی کی نہ وہ رت نہ رہے گی باقی — یہ سلگتی ہوئی نفرت نہ رہے گی باقی
یہ چمن سوز سیاست نہ رہے گی باقی — ایک ہی مرتبۂ دہلۂ و دہقاں ہوگا

اب جسے دولت عرفاں مبیں حاصل ہے — چشم بیدار و دل درد نشیں حاصل ہے
سوز دل سوز وفا سوز یقیں حاصل ہے — وہی تاباں و درخشاں و فروزاں ہوگا

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی) — روش صاحب صدیقی

رابندرا ناتھ ٹھاکر (ٹیگور)

تری نوا تھی کہ ایک سحر کا کرشمہ تھا؟ ترا کلام تھا یا ایک طلسم زندہ تھا؟
خمارِ عشرتِ عرفاں سے نغمہ پُرکیف وہ تیرے گیت نہیں سادگی کا معجزہ تھا!

وہ سوز و درد کی لذت ترے بیان میں تھی
جو ریشہ ریشہ میں ہر دل کے کُل جہان میں تھی

سرودِ گیتی کے تاروں کو کیسا ملایا تھا! دلوں کے چنگ میں اک زمزمہ جگایا تھا
خزاں نصیبوں کو مژدہ بہارِ نو کا دیا پیام کیا تھا جو تو نے انھیں سنایا تھا؟

گداز و سوز کا کیا راز آشکار کیا؟
زمین سوختہ بختی کو لالہ زار کیا!

نچوڑ کر فلک نیلگوں کا سوسنی رنگ، سمیٹ کر شفق لالہ گوں کی بھولی ترنگ
ہلالِ صبح کی سیمیں شعاع میں ٹپکا کر، ملا کے برق طربناک، صوت بے آہنگ

وہ کھینچی عیش ترنم کی جانفزا صہبا
سرورِ مستی سے لبریز کر دیا مینا!

تو سونے مندروں میں پھولوں کی مہک لایا تو اجڑے باغوں میں شادابی کی لہک لایا
سکھائے تو نے شگوفوں کو کس جہاں کے گیت گویا باغ کا جن سے اڑا چہک لایا!

وہ بول جوئی کے جھرتے تھے تیری بنسری سے
جو بھینی بھینی صداؤں کا روپ بھرتے تھے!

شرارِ لالہ سے آتشکدے بنائے ہیں تبسمِ گلِ انجم سے گل کھلائے ہیں!
چراغ پھولوں کے روشن صنم کدوں میں کئے جہاں صبا نے شگوفوں کے گیت گائے ہیں

شمیمِ نامہ ترے مطربِ چمن کا بنی
نسیمِ پیک ترے پھولوں کے وطن کا بنی

وہ لوریاں سی تھیں تیری رسیلی باتوں میں — پہیلیوں کی سی الجھن وہ سیدھی باتوں میں
وہ چٹکیاں سی اچھوتے ترے تقاضوں میں — وہ میٹھا میٹھا سا اک درد میٹھی باتوں میں

یہ کہنا "دل میں تو آتے ہو سامنے بھی تو آؤ
جو گنگناتے ہو وہ گیت مجھ کو بھی سکھلا دو"

برہ کی آگ سے دل کے دیے کو سلگانا — دکھوں کی بتیاں ایک ایک کر کے اکسانا
کبھی یہ پوچھنا "پوجا یہ کب قبول ہوگی؟" — غموں کے داغوں کو تاروں کی طرح گنوانا

یہ کہنا "آتے کدھر سے ہو یہ بتاؤ مجھے؟
کواڑ دل کے مرے کھول کے دکھاؤ مجھے!"

کبھی وہ پتوں کی تتلاتی سرسراہٹ پر — کبھی وہ بچوں کی شرمیلی چلبلاہٹ پر
کبھی وہ دور کے جیسے سروں کے جھونکے پر — کبھی ہوا کے دبے پاؤں کی آہٹ پر

یہ کہنا چونک کے "دیکھو وہ آنے والے ہیں،
کدھر ہو جھانکو اندھیرے بھرے ہیں تارے ہیں!"

جو گیت چھیڑے رباب حیات پر تو نے — ڈھلے ہیں ہونٹوں سے پھولوں کے موج خوشبو نے
بسا دے وہ نئی آس اور امنگوں سے — جو دل کہ یاس میں مدت سے تھے لگے سڑنے

سما گئی ترے نغمہ کی لے زمانہ میں!
کہ جیسے چاندنی گردوں کے آشیانہ میں،

بسے دلوں میں ترے گیت جیسے پھولوں میں بو — مدور کیف سے لبریز جیسے شب ہے جو
کرن خیال کی تیرے جہاں میں پھیل گئی — کہ جیسے بزم میں خوشبو سے تانے آہو

ہر ایک کشتِ سخن نغمہ ترا ترانہ ہوا
تری نوا سے کوئی تھا جو آشنا نہ ہوا!

سریلے ترے گیتوں کے دل میں کھبتے تھے — جو نشتروں کی طرح جان کی سی تیز چبھتے تھے

نوٹ: ۵، ۶، ۷، ۸ ان تینوں بندوں میں ٹیگور کے گیتوں سے کم و بیش لفظاً و خیالاً دہرائے گئے ہیں۔

کبھی چراغ سے پٹ بیجنوں کی روشنی کے — خیال تیرے چمکتے تھے اور بجھتے تھے

وہ لوریاں سی تھیں تیرے اچھوتے خوابوں کی

کہ جن میں چاندنی اور رات مل کے بہتی تھی!

سما گیا تھا ترے دل میں کس جہاں کا جمال — جو دل کے پردوں میں بھی چھپ کے رہ گیا تھا خیال!

سروں میں بھرتی تھیں پرچھائیاں سی شہانی! — جو ہو گیا کبھی بیتا بی نظر کا سوال!

وہ کون تھا کہ جو چھپ چھپ کے گنگنا تا تھا؟

دھنوں میں چھن کے تری راگ کس کا آتا تھا؟

شفق کے پھول تھے یا دھن ترے ترانہ کی — جو ٹہنیوں میں صبح شام کے لٹکتی تھی!

تری نوا میں نہ جانے کہاں کا جادو تھا — ہر ایک بات کلیجہ مسوس لیتی تھی!

سروں میں بین کے کیا بجلیاں سی کوندتی تھیں!

جو رازِ عشق کے کون و مکاں کو روندتی تھیں!

فضائے سوز کا تو آفتاب ہو کے رہا — جہان دہر میں تو آفتاب ہو کے رہا

نشاطِ عشق کا کیا راز تو نے کھول دیا! — کہ روئے حسنِ ازل بے نقاب ہو کے رہا!

سرورِ کیف دو عالم ترے کلام میں ہے

خمارِ بادۂ وحدت ترے پیام میں ہے

وہ شعلہ عشق کا بھڑکایا خاکِ انساں میں — رفو کی جگہ نہ چھوڑی فنا کے داماں میں

چراغ اشک سے الفت کا راز ڈھونڈ لیا — جہانِ سوز کی شمع شعلہ ساماں میں

نقاب تو نے اجل کا اٹھا کے دیکھ لیا

کہ زیست ماہ ازل پر کتاں کا پردہ تھا!

ستارے اب بھی وہی ہیں جو تو نے دیکھے تھے! — وہ پھول آج بھی کھلتے ہیں کل جو کھلتے تھے!

نسیم صبح وہی، بلبلوں کے گیت وہی — وہ اب بھی ملتے ہیں جو پہلے وقت ملتے تھے!

ہے کارواں وہی منزل وہی ہے، راہ وہی — وہی ہے عشق، وہی حسن دل کی آہ وہی!

وہی جمال وہی ساز، اور وہی نغمہ — وہی ہے مطرب عشق اور درد کا زخمہ

وہی بہار و خزاں ہے، وہی حیات و ممات — وہی ہے بزم، وہی شمع و سوز پروانہ!

ظروف میکدہ ہیں جام و شیشہ و مینا

ہوئے گسار کوئی، خم میں ہے وہی صہبا!

وہی ہیں حسن کے گیسو اور عشق کا شانہ — وہی ہے ذوق خود آرائی اور آئینہ

وہی لباس بدلنا بہار کا ہر بار — وہی شہید خزاں کا ہے شاہد غنچہ

سبو نئے سہی، مے بھی نئی، نیا ساقی

ہیں کیف روح کے سامان تو وہی باقی

نظر وہی ہے نظارہ ہزار تازہ ہو — وہی ہے رنگ گل نو بہار تازہ ہو

وہی خموشیٔ غنچہ وہی تبسم گل — ہے دل میں داغ وہی لالہ زار تازہ ہو

ہزار پر گلیں، لیکن وہی ہے روح شمیم

پیام صبح ازل کا وہی ہے پیک نسیم

ہے نقش فانی ازل کے نقاب کے باہر — کہ جیسے سایہ مہ و آفتاب کے باہر

نہ کیف بادہ ہے پیمانہ میں نہ شیشہ میں — ہے نغمہ زخمہ و تار و رباب کے باہر

دوام کا ہے ترے راز تیرے گیتوں میں

ہو جسم خاک، مگر تو رہے گا جیتوں میں

مئے کہن ترے ابیات عنبریں میں نہ تھی — بھری تھی بجلیوں میں ماہتاب کی مستی!

کبھی جو مشک ملا کر وہ بادہ تند کیا — تو ذرہ دو نشوں میں کرتی تھی رقص مدہوشی!

اسی جہان کا صہبائی وہ جہان بھی ہے

اسی خمار کی انگڑائی آسمان بھی ہے!

(از سنٹرل جیل، لاہور) — آصف علی صاحب بیرسٹر

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

انجمن تاریخی تحقیقات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا رسالہ بابتہ ماہ اپریل ۱۹۴۷ء (انگریزی)

مدیر شیخ عبدالرشید صاحب ایم۔اے ملنے کا پتہ نمبر ۸ شبلی روڈ علی گڈھ قیمت فی پرچہ ۸؍ سائز ۱۸×۲۲/۸ کاغذ وطباعت بہت عمدہ۔

یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کو ایک عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوا کہ کسی ملک کی آئندہ نسلوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس کی سچی تاریخ لکھی جائے تاکہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو پڑھ کر اور ہر پہلو سے دیکھ کر سمجھ سکیں کہ دنیا کی سلطنتیں صرف قوت پر قائم نہیں رہتیں بلکہ رعایا پروری پر۔ ہندوستان کی زمانہ وسطی کی تاریخ جو انگریزی زمانہ میں لکھی گئی ہے اس میں زیادہ تر سیاسی پہلو دکھلایا گیا ہے اور معاشی رخ کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کا بیڑہ علی گڈھ کی انجمن نے اٹھایا ہے اور چار ماہ کے بعد یہ تحقیقی رسالہ نکالنا شروع کیا ہے۔ خدا کرے اس جدوجہد میں وہ کامیاب ہو۔ ہندوستان کی زمانہ وسطی کی تاریخ جو مسلمانوں نے لکھی ہے وہ فارسی زبان میں ہے اور اس زمانہ کے علمی مذاق کے مطابق ادب و اخبار کو جدا نہیں کیا گیا ہے نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخی واقعات ادب کے استعارات اور مضمون نگاری کی بلند پروازیوں میں الجھ گئے۔ انگریزی مورخوں کو یہ اچھا موقع ملا کہ واقعات کو الجھاؤ سے نکال کر انہوں نے اپنی پالیسی کی اشاعت کے لئے ان پر رنگ آمیزی کی۔ بہت سے واقعات ہندوستان کے زمانہ وسطی کی تاریخ میں موجود ہیں جن کے نفس مطلب کو انگریز مورخوں نے صرف مفقود ہی نہیں کیا ہے بلکہ جن پر اچھی طرح رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ ضرورت اس کی شدید تھی کہ اساتذہ مسلم یونیورسٹی جو اس کام کے اہل ہیں اور جن کے پاس لٹن لائبریری کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے وہ پورے تجسس کے بعد ہندوستان کی زمانہ وسطی کی ایک ایسی تاریخ لکھیں جو سچے واقعات سے معمور ہو اور اس بات کو ثابت کر دے کہ مسلمانوں کی ہفت صد سالہ

سلطنت صرف تلوار کے بل پر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ زیر نظر اشاعت میں بہمنی حکومت کے واقعات، عہد مغلیہ کی ڈائریاں، سلاطین دہلی کا طریقہ اطلاق جاگیر، شاہان تغلق کا نظام زراعت، اورنگ زیب کی پالیسی، وغیرہ مضامین بہت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ رسالہ کی چھپائی اور کاغذ باوجود آج کل کی گرانی کے قابل تحسین ہے۔ قیمت میں کمی کی گنجائش اس وقت نہیں ہے۔ مگر چونکہ اس کی ضرورت ہے کہ ایسے رسالہ کی اشاعت ملک میں وسیع ہونا لازم ہے کہ قیمت میں کمی ہونی چاہیے۔

البیان (جون و جولائی نمبر) قیمت ۱۲ر صفحات ۱۴۴، دفتر امت مسلمہ امرتسر۔

البیان کا یہ خاص نمبر "الوراثۃ فی القرآن" نمبر ہے۔ اس میں وراثت کا مسئلہ قرآن سے اخذ کر کے ثابت کیا گیا ہے اور بعض مروجہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فردوس: قیمت فی پرچہ ۶ر سالانہ للعہ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ فردوس جموں۔ کاغذ و کتابت اچھی طباعت معمولی صفحات ۴۸

بزم اردو جموں و کشمیر کا یہ ماہانہ رسالہ جون ۱۹۴۱ء سے نکلنا شروع ہوا ہے پیش نظر جولائی نمبر میں مدیر کا نام درج نہیں، مضامین کا درو بست اچھا ہے۔ سرورق اور آخری صفحہ پر کشمیر کے چند نظارے ہیں۔ انور مختار صاحب کا مضمون "ہم محبت کیوں کرتے ہیں" بہت اچھا ہے۔ ویسے بھی دیگر نثر و نظم کے مضامین خاصے ہیں صفحات کے زیادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ کشمیر کی بزم اردو کی اس اولین سعی کی ہر ممکن طرح سے ہمت افزائی کی جائیگی

جدید اردو (سالنامہ) قیمت ۱۲ر صفحات ۲۰۰ ملنے کا پتہ نمبر ۳۶ مارسڈن اسٹریٹ کلکتہ۔

کلکتہ سے یہ رسالہ عرصہ سے نکل رہا ہے اور اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ زیر نظر نمبر میں اچھے اچھے مقالے، ادبی شہ پارے نظمیں اور افسانے ہیں۔ بنگال میں اردو کا چرچا جس محنت اور خوبی سے اس نے قائم کر رکھا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

رسید:

مجلہ نظامیہ (خصوصی شمارہ) بہ یادگار فخر قوم ملا عبدالقیوم، مرتبہ ابوالخیر کنج نشین۔ صفحات ۱۹۲ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی۔ حیدرآباد دکن۔

دارالاسلام (خاص نمبر یعنی پارہ عم مع ترجمہ تفسیر و معانی الفاظ) مرتبہ شعبہ اشاعت قرآن ادارہ دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ پنجاب، قیمت فی پرچہ ۸ر

مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قائم کی ہوئی واحد جہازراں کمپنی

خاص حج سروس

تھوڑے تھوڑے وقفے سے بمبئی اور کراچی سے جدہ کو جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام نئی وضع کے ساتھ جہازوں کا شاندار بیڑا جس میں جہازوں کا سرتاج ایس ایس اسلامی

وزن ۹ ۵۰ ۷ ٹن

بھی شامل ہے۔

گذشتہ موسم میں جب کہ جنگ کی وجہ سے جہازرانی کے مصارف بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مغل لائن نے نہ تو حاجیوں سے زیادہ کرایہ لیا اور نہ حج سروس بند کی۔

بمبئی اور کراچی سے عدن، جدہ اور بحیرہ احمر کی بندرگاہوں نیز پورٹ لوئی اور ماریشس تک مسافر اور باربرداری کی سروسیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کی جا سکتی ہیں تفصیلات کے لئے خط کتابت کیجئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خالص چیز پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں، جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

المشتہر

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر۔ حنا بلڈنگ۔ لکھنؤ

معاصر مدینہ کی رائے

نئی کتابیں

اردو ہندوستان کی مشترکہ زبان ہے۔ اور یہاں کے تعلیمیافتوں میں اردو خواں طبقہ کی اکثریت ہے لیکن اردو لٹریچر کا دامن ایسی کتابوں سے تقریباً خالی تھا۔ جن کے مطالعہ سے حالات حاضرہ کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ہمیں مسرت ہے کہ بہی خواہان اردو نے اس طرف توجہ فرمانا شروع کر دیا ہے۔ اور ایسی کتابوں کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ جن سے پڑھنے والوں کی نہ صرف سیاسی تربیت ہو سکتی ہے بلکہ وہ آئے دن کے سیاسی و فوجی انقلابات کے اسباب و نتائج کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے لئے جو بڑی بڑی قیمتی کتابیں نہیں خرید سکتے۔ یا ان کے پڑھنے کے لئے وقت نہیں نکال سکتے۔ ان کا مطالعہ بہت زیادہ مفید ہوگا۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست۔ از عشرت علی صدیقی بی اے۔ کتابی سائز۔ مجلد صفحات ۱۷۲ - عمر

قومیت اور بین الاقوامیت۔ از محمد قاسم حسن۔ بی اے۔ بی ٹی کتابی سائز۔ مجلد صفحات ۱۶۴۔ عمر

بحر الکاہل کی سیاست۔ از امین خالدی۔ کتابی سائز مجلد صفحات ۱۹۲۔ قیمت عہ

نازیت۔ از شاہد حسین رزاقی ایم اے (عثمانیہ)، کتابی سائز۔ مجلد صفحات ۱۷۲ " عمر

ملنے کا پتہ:۔ **مکتبہ جامعہ نئی دہلی**

پرواز خیال

یہ مجموعہ ہے ملک کے مایہ ناز ترقی پسند ادیب و شاعر جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کے ان مقید المثال افسانوں کا مجموعہ ہے جو رفعت تخیل اور حسین پرشکوہ الفاظ کے اعتبار سے شاہکار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ یہ ہندوستان کے مختلف معیاری رسائل اور اخبارات میں شائع ہو کر ملک سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

یہ عدیم النظیر افسانے اردو لٹریچر میں بالکل نئی چیز تسلیم کیے گئے ہیں جو ہماری اخلاقی اور مجلسی زندگی کی بہترین تصویر ہیں۔

اس مجموعہ میں جزئیات، سیرت نگاری اور تخیل جذبات یعنی تبسم و مسکراہٹ، حسن و محبت ناز و نیاز، سوز و گداز، یاس و امید، ناکامی و کامرانی، اخلاق و کردار، محبت و نفرت اور آزادی و غلامی کے ایسے ایسے نادر نمونے مطالعہ کے بعد آپ کی نظر سے گزریں گے جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتے۔

غرضیکہ ہر افسانہ مصنف کی اعلیٰ ترین علمی طرز نگارش اور قلبی کیفیات اور روحی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ کاغذ، لکھائی، چھپائی اور ترتیب دلکش جلد نظر افروز۔

حجم ۲۴۰ سائز ۲۶×۱۷/۸ قیمت عار مجلد

کتاب میں مصنف کا فوٹو بلاک بھی شامل ہے

ملنے کا پتہ

نظامی پریس، بدایوں

سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہنامہ رسالہ

جولائی ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ کاغذ سازی
۲۔ بچہ پر موروثی اثرات
۳۔ اصول تعلیل اور جدید طبیعیات
۴۔ ہوائی حملہ اور زہریلی گیسیں

اگست ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ سائنس
۲۔ حیوان کی گرمائی اور سرمائی نیند
۳۔ اوزان اور پیمانوں کی معیار بندی
۴۔ ہمارے دانت
۵۔ دوران خون

یہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہر ماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب، سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین حضرات زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔
اشتہارات کے نرخ طلب کئے جا سکتے ہیں۔

چندہ سالانہ صہ سکۂ انگریزی ✤ نمونے کا پرچہ آٹھ آنے۔

المشتہر

معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

رسالہ ہندوستانی

رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہورہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے، جو اکیڈمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم وجدید علوم و فنون کے اہم موضوعات پر، ماہرین فن اور کہنہ مشق اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس استناد کی وجہ سے سے یہ رسالہ رسالہ نہیں ہے بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے ہر کتب خانے میں اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے۔ رسالے نے ۱۱، ۱۰ سال کے عرصہ میں علم وادب کے جو اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، ان کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہوگیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں سے ایک ہے! احباب کی علم دوستی سے امید ہے کہ اس کے معاونین میں شامل ہوکر علم وادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمائیں گے۔ اسی سلسلے میں اس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں۔ جو حضرات اس کی خریداری منظور فرمائیں گے، یا جو پانچ خریدار بہم پہنچائیں گے؛ ان کی خدمت میں اکیڈمی کی بعض مطبوعات رعایتی قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ ان مطبوعات کی تفصیل دفتر سے معلوم ہو سکے گی۔ رسالے کا سالانہ چندہ للعہ ہے۔

ترسیل زر اور اس سلسلے کی خط وکتابت کے لئے ذیل کے پتے سے یاد فرمایا جائے

دفتر رسالہ ہندوستانی ہندوستانی اکیڈمی صوبجات متحدہ

(الہ آباد)

کانفرنس گزٹ علی گڈھ

یعنے

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلیمی و اصلاحی اخبار

جو زیر نگرانی

جناب نواب صدر یار جنگ بہادر آنریری سکریٹری کانفرنس

صدر دفتر کانفرنس سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے اور اس میں علی گڑھ کی تعلیمی تحریک. مسائل تعلیم و تربیت. موجودہ نظام تعلیم اور اصلاح تمدن و معاشرت پر بحث کی جاتی ہے. ہندوستانی کے اسلامی پریس نے اس اخبار پر نہایت عمدہ الفاظ میں ریویو کر کے اس کے اخلاقی و اصلاحی بلند پایہ مضامین کی مدح و ستائش کی ہے. متعدد تعلیم یافتہ اصحاب اس میں مضامین لکھتے ہیں. ایک کارڈ لکھنے پر نمونہ مفت ملتا ہے. قیمت سالانہ تین روپیہ.

ہر خریدار کو جو اخبار کی سالانہ قیمت پیشگی عنایت فرمائیں. حسب ذیل کتابیں پیش کی جاتی ہیں.

۱. التربیۃ والتعلیم. ضخامت مع ٹائٹل ۱۵۰ صفحے.

یہ کتاب مصر کے مشہور فاضل علامہ سید رشید رضا ایڈیٹر المنار کی تین معرکۃ الآرا تقریروں کا مجموعہ ہے جو ممدوح نے سیاحت ہندوستان کے موقع پر اجلاس ندوۃ العلما لکھنؤ، محمڈن کالج علی گڑھ اور مدرسہ دیوبند میں فرمائیں. ہر تقریر کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے.

۲. رسالہ تمدن و معاشرت. ضخامت ۱۰۰ صفحے.

یہ کتاب ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم کے ۲۲ مفید مضامین کا مجموعہ ہے. مثلاً اس میں ۸ بہترین مضامین سرسید مرحوم کے ہیں. تین نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں کے ہیں اور پانچ مضمون نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب کے ہیں. اس کے علاوہ سید محمود مرحوم اور مولانا حالی مرحوم کے مضامین بھی ہیں.

مندرجہ بالا کتابوں کا محصول خریدار کے ذمہ ہوگا. لہذا جو صاحب خریداری منظور فرمائیں وہ تین روپئے سالانہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں یا وی پی بھیجنے کی اجازت دیں.

ملنے کا پتہ:۔ **دفتر کانفرنس سلطان جہاں منزل علیگڈھ**

سیاسیات

زیر ادارت

ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر جامعہ عثمانیہ (حیدرآباد دکن)

یہ سیاسی اور اجتماعی علوم کا سہ روزہ رسالہ ہے جو جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر میں شائع ہوتا ہے۔ اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعے اردو داں طبقوں میں مقبول بنایا جائے اور جدید تمدن کے مختلف پہلوؤں پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں جو تحقیق ہوئی ہے اسے منتقل کیا جائے۔ یہ خاص علمی رسالہ ہے جس میں حیات اجتماعی کے مختلف مسائل پر غیر جانبداری کے ساتھ بے لاگ تحقیق کے نتائج شائع ہوتے ہیں اور کسی خاص جماعت یا ممالک کے خیالات کی نشر و اشاعت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ رسالے کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عمرانی علوم کے دقیق اور حکیمانہ تصورات کو اردو زبان میں کس طرح سلاست اور سہولت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ ہر شخص کو پڑھنا چاہیے جو ہندوستان اور باہر کی دنیا کی سیاسی اور اجتماعی تحریکوں سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے مضامین سے ہماری زبان کی ایک بڑی کمی پوری ہو گئی۔

مضامین کے متعلق ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر شعبہ تاریخ و سیاست جامعہ عثمانیہ حیدرآباد (دکن) سے خط و کتابت کیجائے اور انتظامی اور دیگر امور کے متعلق
مولوی سید عبدالوہاب صاحب۔ و سید عبدالقادر صاحب اینڈ سنس چار مینار حیدرآباد (دکن) سے
دریافت کیجئے

قیمت سالانہ صرف فی پرچہ عہ

اردو لٹریچر میں گراں قدر اضافہ

موجودہ زمانے کی بہترین کتاب

بین الاقوامی سیاسی معلومات

تمام دنیا کی سیاسیات سے متعلق افراد و اقوام، ملک و مقامات اور معاہدات و اصطلاحات کی مکمل یادداشت آپ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن مطالعے کے دوران میں آپ کے سامنے ایسے بیشمار الفاظ آتے ہیں جن کا صحیح مطلب سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے خبروں اور واقعات کی اہمیت اور ان سے پیدا ہونے والے نتائج کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ "بین الاقوامی" سیاسی معلومات اور بین الاقوامی سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں، قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام ملکوں اور قوموں کے تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں جمع کر دیا گیا ہے۔ جس کے بعد بین الاقوامی سیاسیات کو آسان سمجھ لینا آسان ہوتا ہے۔ معلومات کے یکجا کرنے میں پوری تحقیق و کوشش سے کام لیا گیا ہے۔ بین الاقوامی سیاسی معلومات اردو زبان میں پہلی شاندار کتاب ہے جس سے اردو لٹریچر میں ایک گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

تمام اسکولوں، مدرسوں، لائبریریوں اور اخبارات کے دفتروں میں اس کی موجودگی ضروری ہے۔ علمی اور سیاسی کام کرنے والوں کے لئے یہ کتاب نہ صرف بہترین رفیق بلکہ ایک اچھے استاد کا کام دے سکتی ہے۔ کتابت، طباعت نہایت اعلیٰ، خوبصورت گردپوش مضبوط جلد۔ صفحات ۲۳۶۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے (عہ)

ملنے کا پتہ

مکتبہ برہان۔ قرول باغ۔ نئی دہلی۔

اچھّی کتابیں

انی بے نیا

ضمنیاتِ قانون کا ایک دلچسپ اور سبق آموز رومانی ڈرامہ ہے، جسے مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے اپنے زورِ قلم سے اور بھی قبول عام بخشا اور یورپ کی متعدد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ نوجوان ادیب ابوالقلم دبیر صاحب نے بہت محبت سے اس ڈرامے کا اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں ترجمہ خاصہ ہے۔ لیکن درحقیقت اس کام کے لئے ایک پختہ کار ادیب کی محنت و توجہ کی ضرورت تھی تاہم دبیر صاحب کی محنت قابل داد ہے۔ قیمت ۱۰ ار

(مدینہ، بجنور)

سہارا اور دوسرے رومانی افسانے مصنفہ شفیق بانو صاحبہ۔ شفق۔ سہارا چھوٹے چھوٹے اکیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ موصوفہ نے اپنی زبان میں یعنی اس زبان میں، جو ہماری بہنیں گھروں میں بولتی ہیں، یہ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ زبان میں روانی ہے اور اظہار خیال کا طریقہ پاکیزہ ہے۔ ستھری زبان کے ساتھ جگہ جگہ چست اور چبھتے ہوئے فقرے افسانوں کی جان ہیں۔ قیمت عمر

حیاتِ اجمل حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات ہے۔ جس میں مرحوم کے اخلاق و عادات علمی و طبی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں۔ قیمت عار

انتظام کتب خانہ اس رسالے میں کتب خانے کی عمارت اور فرنیچر، کتابوں کے شعبوں، ان کے انتخاب اور خریداری، ان کی تقسیم، ترتیب، اجرا، آرائش، ترتیب فہرست مصنف، ٹائیٹل اور موضوع کے اعتبار سے اور جلد سازی کا مختصر مگر جامع تذکرہ ہے۔ یہ رسالہ آپ کو بتلائے گا کہ لائبریرین اور اس کے فرائض کیا ہیں۔ قیمت ۸ر

مکتبہ جامعہ قرولباغ، نئی دہلی

غالبؔ کا گمشدہ دیوان

مرزا غالبؔ مرحوم کے اردو دیوان کا یہ جدید تعلیمی نسخہ سو برس کے بعد ملک کے سامنے آیا ہے۔ اس میں ان کے وہ شہ پارے ہیں جنھیں انھوں نے بادلِ ناخواستہ حذف کر دیا تھا۔

غالبؔ کے انتقال کے پچاس سال بعد پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک کا وہ ابتدائی کلامِ طبع ہو کر اربابِ ذوق کے سامنے جلوہ افگن ہے جو انھوں نے اپنے ہم چشموں کی تنگ نظری سے مجبور ہو کر خود الگ کر دیا تھا۔

غالبؔ کے جس دیوان کو معدوم سمجھا جاتا تھا اتفاق سے وہ بجنسہٖ مکمل حالت میں مل گیا۔ اس نایاب نسخے کے تحفظ کا شرف کتب خانہ حمیدیہ، بھوپال کو حاصل ہوا ہے جس نے اُسے شائع کر کے ادبیاتِ اردو میں ایک بیش بہا اضافہ کیا۔

قیمت بلا مقدمہ للعہ، مع مقدمہ صہ

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لاہور، لکھنؤ، بمبئی ۳

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

ایک معلّم کی زندگی

نومبر سنہ ۱۹۴۱ء میں شائع ہو جائے گی

ایک استاد نے بہت ہی اچھے انداز میں اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ یہ آپ بیتی کیا ہے، جامعہ ملیہ کی اکیس سال کی مکمل تاریخ ہے۔ آپ جامعہ کے نئے اور پرانے طالب علم مولوی عبدالغفار صاحب مدہولی سے ضرور واقف ہوں گے یہ تاریخ انھی کی لکھی ہوئی ہے۔ کتاب دو جلدوں، ۸۰۰ صفحے کی ہے قیمت مکمل للعہ روپے ہے۔ نئے اور پرانے جامعی حضرات ایک یا دونوں جلدوں کی قیمت پیشگی بھیج دیں تو کتاب کے چھپنے میں بہت سہولت ہو جائے۔

یہ کتاب ہر لحاظ سے قیمتی ہوگی۔ ماہرینِ تعلیم کے لئے اس میں کیر... جدید تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے۔

اس پتہ پر خط کتابت کیجئے

عبدالغفار صاحب مدہولی۔ مدرس
مدرسہ ابتدائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ
ڈاکخانہ، جامعہ نگر، دہلی

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

حمائل شریف

مکتبہ جامعہ کی طرف سے خاص رعایت

اس حمائل شریف کی کتابت محترمہ فاطمۃ الکبریٰ بنت جناب محمد دین صاحب خوشنویس کی ہے۔ موصوفہ کو ہندوستان کی سب سے بہتر عربی خوشنویس ہونے کی حیثیت سے مختلف انجمنوں اور نمائشوں کی طرف سے بہت سے طلائی تمغے مل چکے ہیں۔ بیگم صاحبہ بھوپال اور اعلیٰ حضرت نواب صاحب حیدرآباد نے ہدیے اور وظائف پیش کئے ہیں۔ حمائل مترجم ہے اور ترجمہ شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہے

رمضان المبارک کے احترام میں مکتبہ نے حمائل شریف کے ہدیے میں رعایت کر دی ہے یعنی بجائے ستّے کے ۶ کر دیا ہے امید ہے کہ مسلمان اس رعایت سے فائدہ اٹھائیں گے۔ محصول ڈاک ،

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

جامعہ

زیرادارت :- نورالحسن ہاشمی ایم اے

جلد ۳۵ نمبر ۴	بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی- اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی

احسن مارہروی (مرحوم)

عشق کوئی ہمدرد کہیں مدت میں پیدا کرتا ہے
کوہ رہیں گو نالاں برسوں لیکن اب فرہاد نہیں (میر)

مولنا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی مرحوم کے ساتھ شعبہ اردو میں سالہا سال کام کرنے کا اتفاق رہا۔ اس دوران میں مرحوم کی صدہا خوبیاں ہم سب کے سامنے آئیں شعبہ کو ان سے بڑی تقویت تھی اور مسلم یونیورسٹی کے اندر باہر ان کا نام بڑی عزت اور محبت سے لیا جاتا تھا ان کے خاندان کی بزرگی کا دور و نزدیک شہرہ تھا۔ اردو داں طبقہ میں وہ بڑی توقیر کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ زبان کے مستند عالم تھے اور اس بارہ میں ان کے فیصلے اکثر و بیشتر بے چون و چرا تسلیم کئے جاتے تھے۔

مولنا قدیم مسلک شاعری کے پیرو تھے۔ زبان کی صحت کا بڑا لحاظ رکھتے تھے اور شاعری کے اُن لوازم کی پوری پابندی کرتے تھے جو ان کے پیشروؤں سے ان تک پہنچے تھے بایں ہمہ وہ اردو ادب و شاعری کے جدید اسالیب اور جدید تصورات سے نہ بیگانہ تھے نہ بیزار۔ اس نئے دبستان کے نقطہ نظر کو پورے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتے تھے وہ شاعرانہ کمال کی جی کھول کر داد دیتے تھے خواہ شاعر کا مسلک ان کے مسلک سے بالکل جداگانہ ہی کیوں نہ ہوتا۔ اردو میں مغربی انداز کی تنقید ان کے سامنے مقبول و مروج ہوئی۔ وہ خود اس کے پیرو نہ ہوئے لیکن اس قسم کے مباحث بڑی توجہ اور شوق سے سنتے اور جہاں قائل ہو جاتے وہاں داد دینے میں ذرا تامل نہ کرتے۔ اُردو زبان یا شاعری پر خواہ کوئی بحث کرتا یا کسی قسم کی بحث کرتا مولنا اس میں بڑے شوق و انہماک سے شریک ہوتے۔ اپنے خیالات اور تصورات کے اظہار میں بڑے مخلص و دلیر تھے دوسرے کے نقطۂ نظر کو توجہ اور صبر کے ساتھ سننے میں بے نظیر تھے اس اعتبار سے ان کو ترقی پذیر اور ترقی پسند قرار دینے میں تامل نہ کرنا چاہئے۔ ترقی پذیر اور ترقی پسند کا مفہوم آخر یہی تو ہے کہ جراٴت کے ساتھ اپنی کہے اور صبر کے ساتھ دوسرے کی سُنے

رحلت کے وقت مرحوم کا سن ۶۵-۶۶ کے لگ بھگ رہا ہوگا جسم کے بھاری بھر کم تھے۔ ہر طرح کی سوسائٹی میں اپنی خوشدلی اور تواضع منشی سے مقبول تھے۔ علمی باتوں بالخصوص زبان و بیان کے مسائل کو منقح کرنے کے بڑے دلدادہ تھے۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کو دوسرے سے پوچھ لینے میں خواہ وہ اُن سے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہوتا مطلق تامل نہ کرتے تھے۔ ہم سب نے اکثر دیکھا کہ شعبہ میں بیٹھے ہوئے ہیں باتوں باتوں میں کوئی لفظ یا محاورہ ایسا آگیا جس کی صحت یا محل استعمال پر اختلاف آراء ہوا فوراً اس کی ٹوہ میں لگ گئے اکثر یہ محسوس ہوتا جیسے کھوئے کھوئے سے ہیں۔ بار بار حوالہ کی کتابوں کی ورق گردانی کرتے مطلب براری نہ ہوئی تو بلا کسی لحاظ اور تامل کے حاضرین کو چھوڑ کر لائبریری چلے گئے۔ وہاں بھی کام نہ چلا تو کئی کئی دن اسی ادھیڑ بن میں رہے۔ بالآخر بات واضح ہوگئی تو خوش خوش اس دن کی صحبت میں بیٹھنے والوں کو فرداً فرداً تحقیقات کے نتائج بتائے۔

اس بارہ خاص میں مولانا کی سرگرمی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کوئی علمی مسئلہ جو ان کو نہ معلوم ہوتا اس کے دریافت کرنے میں مولانا کی سی سعی و جستجو آج کل کے لوگوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میں نے یہ بات پروفیسر کرنکو میں بھی پائی جو کچھ دنوں کے لئے مسلم یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہو کر آئے تھے۔ پروفیسر کرنکو کے عالم متبحر ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان کا بھی یہی عالم تھا۔ جو بات نہیں معلوم ہوتی تھی اس کا اقرار جلد سے جلد نہایت واضح الفاظ میں کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وعدہ کرتے کہ دریافت کرکے بتائیں گے۔ جب بات منقح ہو جاتی تو ہر ایک کو بڑے لطف و اہتمام سے بتاتے پروفیسر کرنکو اکثر یونیورسٹی لائبریری کے دفتر میں بیٹھتے تھے۔ بوڑھے ہنس مکھ، بات کرنے کے شائق، متوسط جسم، لمبا قد، عینک لگائے ہوئے۔ اجنبی سے بھی اس طرح ملتے جیسے اس سے کہانی واقف ہیں۔ جماعت اساتذہ کے اکثر لوگ تھوڑی دیر کے لئے اکثر لائبریری پہونچتے ہیں۔ پروفیسر کرنکو کسی نہ کسی علمی بحث پر ضرور گفتگو کرتے ہوتے اور ہر شخص کو فرداً فرداً مخاطب رکھتے گفتگو کے دوران میں کوئی آجاتا تو اسے مخاطب کرکے جس حد تک بحث ہو چکی ہوتی اس کا خلاصہ سنا کر آگے بڑھتے۔ مجھے یاد ہے ایک بار (Model de Luxe) کے تلفظ پر بحث چھڑ گئی۔ پروفیسر کرنکو نے فرمایا کہ اس لفظ کا صحیح تلفظ

بہت کم لوگ کر پاتے ہیں۔ پھر اس کا صحیح تلفظ اپنے ہونٹوں کو ایک خاص شکل دے کر بتایا اور اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ فرداً فرداً ہر شخص سے صحیح تلفظ کرایا۔ اس وقت حاضرین کی تعداد سات آٹھ سے کم نہ تھی

زبان و بیان یا شعر و شاعری سے متعلق باہر سے اکثر استفسارات آتے رہتے اور یہ تمام تر مرحوم ہی کے سپرد کئے جاتے۔ ان پر وہ بڑی محنت کرتے اور بڑی جستجو و تحقیق کے بعد جواب مرتب فرماتے سند میں اساتذہ کے شعر فی الفور پڑھتے۔ کہتے تھے استاد داغ مرحوم کے آخری دور میں ان کے حلقہ میں بیٹھنے والوں کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث یا محل استعمال کے بارہ میں استاد سے فرمائش کرتے رہتے کہ وہ ان الفاظ کو اشعار میں استعمال کر دیں استاد اس فرمائش کو بڑی خوشی سے پوری کرتے اس سے داغ مرحوم کے شاگردوں میں تحقیق الفاظ اور محل استعمال سے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ جو استفسارات باہر سے شعبہ اردو میں آتے ان پر مرحوم کا محاکمہ بڑے معرکہ کا ہوتا۔ وہ اس قسم کی بحث میں لفاظی کو دخل نہ دیتے بلکہ بڑے مستند دلائل اور حوالے پیش کرتے۔ اکثر استفسار کرتے والے بعد میں لکھتے کہ مولنا مرحوم ہی کا فیصلہ قول فیصل قرار دیا گیا۔

مرحوم کے پاس اردو کتابوں کا بہت اچھا اور بیش قیمت ذخیرہ تھا۔ کتابیں بڑے شوق اور محنت سے جمع کرتے کہتے تھے دو چوریاں جائز ہیں ایک دل کی اور دوسری کتاب کی۔ مولنا کی خدمت میں ہم سب بہت بے تکلف اور شوخ تھے۔ مرحوم بھی ترکی بترکی جواب دینے میں تامل نہ کرتے۔ مولنا کی صحبت میں ہر مذاق اور ہر عمر کے لوگ موجود ہوتے۔ ان کے خلوص اور شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص مرحوم کی باتوں سے اپنی اپنی جگہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بوڑھوں میں وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے بوڑھے خود ان کو بزرگ سمجھتے ہیں نوجوانوں میں نوجوان اور بچوں میں ایسے معلوم ہوتے جیسے اُن میں ان سے زیادہ دلچسپ کوئی اور نہیں لیکن ایک چیز ایسی تھی جس کی ان کو تاب نہ تھی یعنی زبان کی غلطی یا شاعری کے اسقام کہتے تھے زبان کی غلطی کیسے سن لوں؟ ساری عمر اسی میں گنوائی۔ زبان و بیان میں کہیں کوئی سقم دیکھ یا سن پاتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔ مولانا کی اس بات پر ہم سب خوب ہنستے لیکن وہ اس بارہ میں کبھی تکلف یا تامل سے کام نہ لیتے۔

ایک دن شعبۂ اردو میں ایک صاحب تشریف لائے۔ یہ گورداسپور میں ریلوے میں ملازم تھے۔ سودا کا بستہ ساتھ تھا اردو شعراء کا مبسوط تذکرہ مرتب فرما رہے تھے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ غریب نے ملازمت کس محکمہ میں کی اور کام کیا شروع کر رکھا ہے ہم سب نے ان کے کاموں سے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا اور ان کی محنت کی داد دی۔ اسی اثنا میں مرحوم تشریف لائے۔ نووارد کا ان سے تعارف کرایا گیا۔ لیکن کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے مولنا "غیر حاضر" سے ہیں۔ نووارد سے نہ کسی قسم کی ہمدردی کی نہ تعرض۔ کچھ دیر بعد مہمان عزیز نے مولنا کی قصیدہ خوانی شروع کی۔ ہم سب نے ہاں میں ہاں ملائی اور مولنا پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ سودہ کی طرف مائل ہوں مولنا نے مطلق التفات نہ کیا اس سے نہ تو نووارد کی دلجمعی ہوئی نہ حاضرین کو تفریح۔ مہمان کو اصرار تھا کہ مولنا بھی کوئی مشورہ دیں۔ حاضرین نے بھی شہ دی مولنا نے کسی قدر اکتا کر سودہ کو بالکل یونہی ایک جگہ سے کھولا اور دو چار سطریں پڑھ کر فرمایا۔ یہ کہاں کی اردو ہے اور یہ کیا خرافات لکھ مارا ہے۔ جاؤ اسے ٹھیک کرو۔ یہ کہکر سودہ واپس کر دیا اور دوسری طرف مخاطب ہو گئے۔ اجنبی نے دبی زبان سے عرض کیا حضور اسے ٹھیک کر کے کب حاضر ہوں۔ مولنا نے بغیر ان کی طرف رخ کئے ہوئے جواب دیا۔ دس برس بعد! اجنبی کو بڑی مایوسی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد بڑے مایوس لہجہ میں عرض کیا دس برس بعد تو بڑی مدت ہوئی مولنا نے فرمایا تو میں کیا کروں۔ مجھے تو اس کام میں چالیس سال لگ گئے پھر بھی پڑھے لکھے لوگوں کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ آپ کا کیا کا تا اور لے دوڑے۔

مولنا کی اس بے رخی سے ہم سب بھی خفیف ہوئے۔ میں نے عرض کیا مولنا یہ بھی معلوم ہے یہ آپ کن صاحب کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ فرمایا کون صاحب ہیں؟ میں نے کہا آپ ریلوے میں ملازم ہیں۔ فرمایا وہ تو ہیں پھر؟ میں نے کہا چاہیں تو بے ٹکٹ سفر کرنے والوں کو نہ پکڑیں اور چاہئے مفت میں پلوا دیں!

مولنا نے بے ساختہ بہت زور سے قہقہہ مارا۔ نووارد سے بہت کچھ التفات فرمایا اور بات بڑی خیر و خوبی سے ختم ہو گئی۔

مولنا کے دل میں نہ کینہ رہ سکتا تھا نہ راز۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے دل میں ان کی سمائی نہیں اس سے میں نے بہت نقصان اٹھائے لیکن کیا کروں۔ شاید یہ شاعری کی مار ہے کہ دل میں بات نہیں رکھ پاتا

ایک دوست نے مولٰنا کو انتہائی رازدار سمجھ کر ایک معاملہ میں شریک کار بنایا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد مولٰنا میرے پاس آئے عجیب حیص بیص میں مبتلا تھے۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی راز ہے جو اپنی بدنصیبی سے مولٰنا کے دل میں جاگزیں ہوگیا ہے اور بقول غالب "سینۂ بسمل سے پرافشاں" نکلنا چاہتا تھا۔ میں نے عمداً دوسری باتیں شروع کر دیں۔ مولٰنا سنی اَن سنی کرتے جاتے تھے اور جب انہیں یقین آنے لگا کہ میں کسی طرح ان کی ہمت افزائی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں تو انھوں نے بے اختیار ہو کر اپنے بھاری بھرکم جسم کو اس طرح تولا یا اس سے اپنے آپ کو ہلکا کرنے کی کوشش کی جیسے گرمی میں کوئی شخص اپنے لباس کو جسم سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور مکان میں آکر پھونکیں مارتا ہے۔ ایک دفعہ اِدھر اُدھر دیکھ کر کہ کوئی غیر تو موجود نہیں ہے اپنی کرسی میری کرسی سے قریب کرلی اور کچھ کہنا چاہا۔

میں اُن کے ارادہ سے واقف ہوگیا میں نے بھی ایک لمبا سانس لے کر اپنی کرسی ان سے اتنی ہی دور کرلی جتنی انھوں نے قریب کی تھی۔ مولٰنا کچھ ایسے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھے کہ انھوں نے میری بے تمیزی کا مطلق خیال نہ کیا اور نفس مضمون پر آنے کی جد وجہد شروع کر دی۔ میں سمجھ گیا کہ مولٰنا اس دفعہ چپ نہ ہونگے چنانچہ میں نے ۔رک مقام کی بجائے راہ فرار اختیار کی اور اٹھ کر بھاگا۔ مولٰنا باآں جسد عنصری میرا تعاقب بھی نہ کر سکتے تھے اس لئے انھوں نے بیٹھے بیٹھے ہی فرمایا۔ رشید صاحب ارے وہ بھی سنا۔ میں بھاگنے کی سائنس و آرٹ یعنی د Rearguard action " ریرگارڈ اکشن" (جنگ پسپائی) سے پورے طور پر واقف تھا۔ میں نے بھاگتے ہی ہوئے جواب دیا جی ہاں مولٰنا میں ابھی آتا ہوں مولٰنا نے دیکھا کہ شکار نکلا جاتا ہے میں دروازے سے نکل جانے والا ہی تھا کہ مولٰنا نے جان پر کھیل کر آخری گولی چلا ہی دی میں گر گیا مولٰنا نے راز فاش کر دیا تھا

مولٰنا کا خاندانی تعلق سادات بلگرام سے تھا۔ سید شاہ برکت اللہ علیہ الرحمۃ سترہویں صدی کے آخر یا اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں بلگرام سے مارہرہ تشریف لائے اور اس خاندان کے بانی ہوئے

---

[1] اس سلسلہ میں غالب کا ایک شعر آپ کو یاد ہوگا

اہل ہوس کی فتح ہے ترک نبرد عشق — جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

چنانچہ مرحوم کے عظمت و وقار کا ہر چھوٹا بڑا معترف ہے۔ علم و فضل کو اس گھرانے سے بڑا دیرینہ اور گہرا تعلق رہا ہے اور خاندان و خانقاہ برکاتیہ کا نام دور دور تک مشہور ہے۔ مرحوم کو اپنے خاندانی وقار و روایات کا بڑا احساس تھا اور اس کے تحفظ اور رکھ رکھاؤ میں حتی الوسع کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ہر ملنے والے سے بڑی تواضع اور محبت سے ملتے تھے۔ وہ بہت جلد بے تکلف بھی ہو جاتے تھے لیکن سفلگی اور بے تمیزی کے کبھی روادار نہ ہوئے۔

اس کی سب سے نمایاں مثال اس وقت نظر آتی جب مولانا کے گھر پر چھوٹے چھوٹے بچوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا۔ مولانا کو بچوں سے بڑی الفت تھی اور بچے بھی ان سے اس طرح وابستہ رہتے جیسے مولانا ان کا کھلونا تھے۔ جب کوئی بچہ آتا اور مرحوم کے پاس کوئی ملاقاتی بیٹھا ہوتا تو بچے نہایت احترام سے جھک کر آداب بجا لاتے اور جو کچھ کہنا ہوتا مولانا کے قریب جاکر آہستہ سے کہتے۔ ایسے وقت مولانا بھی ان بچوں کا بڑا احترام کرتے اور جلد سے جلد نہایت لطف و شفقت سے انکی طرف مخاطب ہو جاتے اور ایسا ظاہر کرتے گویا بچے کی آمد کو بہت اہمیت دے رہے ہیں چھوٹے بڑے ہر بچہ کا یہی وطیرہ تھا۔ بچوں کا لباس اور وضع قطع بالکل قدیم زمانہ کی ہوتی۔ سفید ستھرے پاجامے۔ سر پر بال باریک ترشے ہوئے۔ پاؤں میں جوتا، سر پر ٹوپی، چلنے پھرنے ہنسنے بولنے میں ایک طرح کی شگفتگی و شائستگی پائی جاتی تھی۔

آج کل کے نوجوانوں اور بچوں میں سر پر طرح طرح کے بال رکھنے اور سنوارنے ننگے سر پھرنے یا انواع اقسام کے نکر اور قمیصیں پہننے کا جو عام رواج ہے اور جسے آزادی کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے، مولانا کے ہاں کے بچے ان سے بہت دور رہتے تھے بعض لوگ اس پر کہہ اٹھیں گے کہ یہ قل آعوذیت تھی۔ قل آعوذیت کا میں بھی قائل نہیں ہوں لیکن نسوانیت یا شہدپن کے مقابلہ میں قل آعوذیت کو گردن زدنی بھی نہیں قرار دیا جا سکتا لباس و جسم کی تزئین میرے نزدیک صرف عورتوں کے لئے مباح ہے۔

اس مسئلہ پر یہاں میں نہ مردوں سے لڑنا چاہتا ہوں اور نہ عورتوں سے بگاڑ کرنا پسند کروں گا۔ البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ اگر زندگی کا اپنے اور دوسروں کے لئے انفرادی یا مجموعی طور پر نفع رساں ہونا ہی زندگی کا اصلی مقصد ہے تو میرا خیال ہے کہ جہانتک وضع قطع، رہن سہن، مرنے جینے، نفع یا بے نفع رسانی کا تعلق ہے۔

پرانے لوگ نئے لوگوں سے کسی طرح خسارہ میں نہیں ہیں نہ ان کو ملزم قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر ترس کھانے کی ضرورت ہے۔ نئی زندگی و دنیا زمانہ مجموعہ صد کرامات سہی لیکن میں تو کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ پرانی زندگی جو مدت الایام کے جبر و ترک کا حاصل اور جو کرامت نہیں ریاضت کا ثمرہ تھی انسانوں اور انسانیت کے لئے زیادہ بامعنی اور زیادہ باعث خیر و برکت ہے۔

مرحوم پرانی دنیا کے آوردہ تھے اور ان کی زندگی کی کشتی کے بندھن اور چپو سب پرانی ہی تھیں لیکن وہ نئے دور کے طوفان میں ان لوگوں سے زیادہ کامیاب اور نفع رساں تھے جن کے پاس جدید ترین کشتیاں اور جدید ترین آلات و علوم تھے۔ مرحوم سے جن لوگوں کو ملنے جلنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ کسی محفل اور کسی موقع پر بند نہ تھے ہر جگہ ان کی پذیرائی خوشدلی سے کی جاتی تھی اس کے علاوہ وہ بڑے دوست پرست اور کنبہ پرور تھے۔ ہر طرح کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اس سلسلہ میں وہ زیر بار بھی بہت ہو گئے تھے۔ تقریباً ساری آبائی ملکیت ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ تنگ حالی سے اکثر پریشان رہتے تھے اور دوستوں عزیزوں اور حاجت مندوں کی جیسی مدد کرنا چاہتے تھے نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا ان کو دلی رنج تھا لیکن وہ اپنی جیبی کو گذرنے میں کبھی تامل بھی نہ کرتے تھے وہ جس طرح دوستوں کی مدد کر چکے تھے اسی طرح لیکن اس سے کہیں کم وہ دوستوں سے مدد کے متوقع رہتے تھے اور حاصل بھی کر لیتے تھے اس پر ہم سب کبھی ان پر فقرے بھی چست کرتے تھے ایسے ہی موقع پر ایک بار فرمایا، بھائی دیکھو تو جب میرے پاس کچھ تھا تو میں نے دوستوں اور حاجت مندوں کو بہت کچھ دیا اب جبکہ میرے پاس کچھ نہیں ہے تو اپنے جسم و جان کو اکٹھا رکھنے میں تماشائے اہل کرم دیکھنا چاہوں تو معترض کیوں ہوتے ہو!

مرحوم شاعری کے قدیم دبستاں کے پیرو تھے۔ ساری عمر شعر و شاعری تصنیف و تالیف تحقیق و تدقیق میں گذار دی اپنے استاد کے سلم الثبوت پیرو تھے لیکن کلام میں استاد جیسی اچھوتی چینی جا گتی شوخی رنگینی و جدت آفرینی نہ تھی اور واقعہ یہ ہے کہ بڑے شاعر کی طرح داغ نے بھی اپنا ثانی پیدا ہونے نہ دیا لیکن فن شاعری میں مرحوم کا پایہ نہایت اونچا تھا۔ زبان، محاورہ و مصطلحات و متعلقات شاعری کے

سمجھنے پرکھنے اور برتنے میں مرحوم بے مثل تھے۔ ایسے لوگ اب خال خال رہ گئے ہیں اور جلد جلد اٹھتے جا رہے ہیں صحت زبان اور مصطلحات شاعری کی پیروی اب کون کرتا ہے۔ کس کو فکر و فرصت ہے اور کوئی کرے بھی تو کس برتے پر کرے۔ شاعر ہم میں اب بھی اچھے سے اچھے موجود ہیں اور پیدا ہوتے جا رہے ہیں لیکن فن کے واقف کار کہاں۔ فنی تبحر بڑی چیز ہے۔ شاعری زبان و بیان ہی کے منتروں میں جادو جگاتی ہے اس لئے زبان و بیان کے مبصر و معیار کو ہم کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا جیسا قادر الکلام اور زود گو شاعر میری نظر سے کم گذرا ہے۔ شعر کہنا ان کے نزدیک اتنا ہی آسان تھا جتنا کہ نثر لکھنا۔ کئی سال ہوئے دکن کے ایک اخبار میں چند مضامین شائع ہوئے تھے جو اعلحضرت خسرو دکن کے خورد سال جگر گوشہ کی غیر متوقع سانحہ وفات پر ہوش بلگرامی نے لکھے تھے اور جن میں بعض فرمودات خسروی بھی شامل تھے۔ مولانا احسن مرحوم نے ان مضامین کو مثنوی کے پیرایہ میں قلمبند کرنا شروع کیا عالم یہ تھا کہ شعبہ اردو میں بیٹھے ہوئے ہیں ہر طرح کے طلبا اور رفقائے کار سے گفتگو بھی جاری ہے علمی بحثوں میں بھی حصہ لے رہے ہیں ہنسی مذاق میں بھی شریک ہیں اور مثنوی بھی لکھی جا رہی ہے مشکل سے تین چار دن گذرے ہوں گے کہ مثنوی مکمل ہو گئی۔ مولانا کی مشکلات اور ان کے شاعرانہ کمال کا اندازہ اسوقت ہو سکتا ہے جب اصل مضامین جن سے یہ مثنوی (موسوم بہ شاہکار عثمانی) لفظاً و معناً ماخوذ ہے پیش نظر ہوں

ایک دن شعر و شاعری پر بحث ہو رہی تھی۔ حاضرین میں سے ایک صاحب نے برسبیل تذکرہ فرمایا کہ اصغر گونڈوی مرحوم (جو اس وقت زندہ تھے) کی شاعری کا میں اس وقت قائل ہوں گا جب مصرع طرح دیدیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ سامنے بیٹھ کر غزل مکمل کر دیں۔ مولانا مرحوم یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے آواز میں لکنت تھی اس لئے جب کبھی جوش میں آ جاتے تھے ان کا لب و لہجہ نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا تھا ململ کا ڈھیلی آستین کا کرتہ پہنے آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔ فوراً اٹھ بیٹھے۔ آستینیں چڑھالیں اور بڑے ہی کڑے تیور سے بولے۔ میاں ہوش میں آؤ، یہ کیا بک گئے۔ شاعر کو یوں پہچانتے ہیں؟ اصغر صاحب کو تمہارے فرشتے بھی نہیں پہچان سکتے' جس کو تم شاعر سمجھتے ہو اس مسخرے کو میرے پاس لاؤ اور اس کی ٹانگ میری ٹانگ سے باندھ دو اور ہم دونوں کے سر پہ پڑیں تابڑ توڑ جوتے اس وقت مصرع طرح دو دیکھیں

کون کتنے پانی میں ہے۔

مولانا کی برہمی کا یہ منظر بھی دیکھنے کے قابل تھا جب کسی قدر دھیمے پڑے تو میں نے عرض کیا، مولانا آپ مسلم یونیورسٹی کی انجمن حدیقۃ الشعر کے صدر ہیں۔ اگر مجوزہ آداب آئندہ سے مشاعروں میں نافذ کر دیے جائیں تو کیسا ہو۔ مرحوم قہقہہ مار کر کرسی پر لیٹ گئے، کہنے لگے بڑا اچھا ہو کمبخت گویّوں سے نجات ہو جائے!

مسوری جانے والوں کو معلوم ہے کہ وہاں فصل میں کس کس قسم کے وحوش و طیور کہاں کہاں سے کھنچکر آتے ہیں اور صید و صیاد، دانہ و دام، تمنا و تماشا کی کیسی کیسی نیرنگیوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک سالانہ مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ایک مشاعرہ میں مولانا بھی شریک تھے۔ صف اوّل میں وہ سب کچھ تھا جس کی ترجمانی ایک شعر میں ہوتی ہے جو میرے بچپن میں بکہ بازوں میں بہت مقبول تھا اس کا ایک مصرعہ مجھے یاد ہے

کہاں لے جاؤں دل دونوں جہاں میں سخت مشکل ہے

مولانا کی باری آئی۔ بھلے مانسوں کے سیدھے سادے لب و لہجہ میں یہ رباعی پڑھی۔

سازندوں کے انداز کہاں سے لاؤں   بجتی ہوئی آواز کہاں سے لاؤں

فرمائیں معاف نوجوانان سخن   بوڑھا ہوں نیا ساز کہاں سے لاؤں

سننے والے اچھل پڑے اور مجمع میں ایک ہمہمہ سا پیدا ہو گیا اس کے بعد طرح میں غزل پڑھنی شروع کی جس کے اس شعر پر جو صف اول کو مدنظر رکھکر پڑھا گیا، مجمع سے وہ نعرۂ تحسین و تہنیت بلند ہوا کہ دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

بٹتی ہے امیروں میں ترے حسن کی دولت   یہ مصرف خیرات سمجھ میں نہیں آتا

مرحوم کو مشاعرہ منعقد کرنے کا بڑا شوق تھا۔ بڑے لطف و انہماک سے اس کا اہتمام کرتے تھے اور شعرا مہمانوں کی پذیرائی اس طور پر کرتے جیسے خود مولانا ہی کے یہاں کوئی تقریب منعقد ہے۔ مولانا کے دم سے دو ایک دن بڑی چہل پہل کے گذرتے۔ ہر شاعر کا پورا پورا حفظ مراتب ملحوظ رکھتے جس سے ہر شخص بہت مسرور و مطمئن رہتا۔

اسی سلسلہ میں ایک بار مولانا کے پاس بمبئی سے مشاعرہ میں شرکت کا ایک دعوت نامہ آیا چنانچہ

رخصت لے کر بمبئی گئے۔ وہاں احباب اور قدر دانوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ رخصت سے زائد ایک دن وہاں ٹھہرنا پڑا۔ توسیع رخصت کی درخواست کی۔ اس زمانہ میں یہاں پر وائس چانسلر ایک انگریز تھے جن کی سیرت کا عجیب پہلو یہ تھا کہ وہ بغیر کسی طرح کا نوٹس دیے ہر بات پر یا تو نہایت درجہ مسرور و متواضع ہو جاتے یا نہایت درجہ بیزار و برہم۔ ان کے ہاں بیچ کا کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ مولانا کی عدم حاضری پر سخت برہم ہوئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے مولانا کے ساتھ ساتھ شعبہ کی بھی خیر نہیں۔ میری طلبی ہوئی۔ مکالمہ سنئے۔

صاحب۔ (سرخ ہو کر اور معہ کرسی میری طرف رخ کر کے) یہ کیا لغویت ہے؟

میں۔ (متعجب و سراسیمہ ہو کر) غالباً آپ کا مطلب میرے علاوہ کسی اور سے ہے، جناب!

صاحب۔ (چیں بجبیں ہو کر) بے شک مولانا صاحب نے کیوں درخواست دی۔ ان کو کیا حق تھا۔ اپنے فرائض سے انھوں نے غفلت برتی۔

میں۔ جناب والا مجھے بالکل نہیں معلوم کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا لیکن قیاس یہ ہے کہ کوئی غیر معمولی بات ہوگی ورنہ بظاہر مولانا صاحب اس قسم کے آدمی نہیں معلوم ہوتے جو اپنے حقوق یا فرائض کو ویسا ہی نہ سمجھتے ہوں جیسا کہ سمجھنا چاہیئے۔

صاحب۔ (نہایت غصہ ناک لہجہ میں) میں کہتا ہوں وہ آخر گئے کیوں؟

میں۔ شعر پڑھنے

صاحب۔ شعر!

میں۔ شعر، جناب والا!

صاحب۔ اپنے شعر؟

میں۔ مولانا سے توقع تو یہی کی جاتی ہے۔

صاحب۔ لیکن یہ ہوا کیا؟

میں۔ ہوتا ہوا تا کچھ نہیں عالیجاہا لیکن مانتا کوئی نہیں۔

صاحب۔ تم شعبہ کے انچارج ہو اس کا انسداد کیوں نہیں کرتے؟

میں۔ جناب والا میں اپنی نالائقی تسلیم کرتا ہوں لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا تشریف لائیں تو جناب ان سے بھی گفتگو فرمالیں بہت سی باتیں واضح ہوجائیں گی۔

صاحب۔ بہت خوب مولانا کو میرے ہاں لانا۔ (کسی قدر زہرخند فرماکر) مجھے اب تک ان سے ملنے کی مسرت بھی نصیب نہیں ہوئی ہے۔

(دوسرا منظر)

پردہ وائس چانسلر صاحب کو اطلاع کی گئی۔ فوراً طلبی ہوئی۔ میں اور مولانا حاضر ہوتے۔ صاحب یک لخت جھجکے لیکن فوراً ہی سرو قد ہوکر مولانا کو تعظیم دی۔ انتہائی گرمجوشی کا اظہار کیا مزاج پرسی فرمائی۔ پذیرائی میں بچھ بچھ گئے۔ گفتگو بالکل نہ ہوئی۔ میرا کوئی پرساں حال نہ تھا۔ البتہ میں یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ کورنش بجالانے میں زیادہ اہتمام مولانا کی طرف سے ہے یا صاحب کی طرف سے یکایک کیا دیکھتا ہوں کہ دونوں سرو قد کھڑے ہوگئے۔ میں یہ سمجھا کہ اب وداعی معانقہ ہوگا۔ لیکن مصافحہ پر یہ صحبت ختم ہوگئی۔

(ڈراپ سین)

مرحوم سے کلاس میں اکثر طلبا شوخیاں بھی کرتے تھے مولانا کے پڑھانے کا انداز قدیم طرز کا تھا۔ وہ ہمہ تن معلم بن کر پڑھاتے تھے اور طالب علموں سے ان آداب کی توقع رکھتے تھے جو خود مرحوم اپنے استادوں کے ساتھ مکتب میں ملحوظ رکھ چکے تھے۔ وہ بات اس زمانہ میں کہاں۔ ایک دن دیکھا کہ مولانا کلاس سے سخت آزردہ و برہم چلے آرہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں طلبا بھی آگئے۔ معلوم ہوا بعض طلبا کلاس میں سکوت و سکون قائم نہیں رہنے دیتے۔ مولانا کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور کلاس سے چلے آئے۔

معاملہ رفت وگزشت ہوا۔ کچھ دیر بعد اس مسئلہ پر مولانا سے گفتگو ہوئی فرمایا۔ رشید صاحب! طلبا پڑھنے نہیں آتے۔ وقت گذارنے اور تفریح و تفنن کے لئے آتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو چاہیں کرلیں علم تو ان کو آنے کا نہیں میں نے عرض کیا۔ مولانا آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے لیکن کیا کیجئے گا۔ یہ طلبا کا قصور نہیں ہے دنیا کا یہی رنگ ہے۔ جو باتیں ہمارے آپ کے زمانہ میں قدر و قیمت رکھتی تھیں اب وہ مردود

ہو چکی ہیں جنظ مراتب اٹھ چکا ہے۔ یہ زمانہ احتساب نفس کا نہیں ہے مطالبات نفس کا ہے۔ کڑھیئے نہیں لڑکوں کو معاف کر دیجئے۔ ان کو نہیں معلوم کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کن اثرات کا شکار ہیں۔

مرحوم کا اطمینان نہیں ہوا۔ بولے جی نہیں۔ میں نالائقوں سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتا۔ مجھے کوئی دوسرا کلاس دیجئے۔ مولانا کی اس برہمی سے میں لطف اندوز ہوا۔ میں نے عرض کیا مولانا فرض کیجے یہ لڑکے بڑے نالائق ہیں آپ شوق سے دوسرا کلاس بھی لے لیجے لیکن ایک بات مجھے سمجھا دیجئے۔ آخر ہم آپ چھوٹوں ہی کی نالائقی پر کیوں برہم ہوتے ہیں اور بڑوں کی نالائقی انگیز کر لیتے ہیں۔ مولانا دھیمے پڑ گئے اور کسی قدر مدھم سروں میں انا للہ ـــــ پڑھ کر جلد ہی دوسری باتوں میں لگ گئے۔

مولانا کو چائے سے عشق تھا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ صرف شکر کھانے کا بہانہ تھا۔ نصف پیالی شکر اور نصف چائے اسی طرح آموں کے بھی بڑے شائق تھے۔ برسات میں پھنسیوں سے لد جاتے لیکن آم اور شکر کا ترک کرنا تو درکنار کم کرنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ذیابیطس کے پرانے مریض تھے لیکن اس کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے۔ اس وضعداری نے کاربنکل سے دوچار کیا اور کاربنکل نے انھیں ان کے پیدا کرنے والے سے جا ملایا۔

مرحوم مقررہ میعاد عمر ختم کر کے ملازمت سے سبکدوش ہوے تھے۔ لیکن اس سن وسال کے باوجود وہ اتنا کام کر لیا کرتے تھے جو ان سے بہت کم عمر والوں کے لئے مشکل تھا۔ ان کے قوائے ذہنی وجسمانی پورے طور پر استوار و بیدار تھے شگفتگی و زندہ دلی کا دامن کہیں سے چھوٹنے نہ پایا تھا۔ رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، خوردوں میں خورد، بزرگوں میں بزرگ۔ کیسے کیسے زمانے کیسی کیسی محفلیں اور صحبتیں دیکھے اور برتے ہوے، یہ ہمہ جہت شخصیت بالآخر ۳۰ راگست ۱۹۴۰ء کو جمعہ کے دن آغوش رحمت میں پہونچ گئی۔

اگست ۱۹۴۰ء کا غالبا پہلا ہفتہ تھا۔ مکان سے یونیورسٹی آرہا تھا کہ خبر ملی کہ مولانا احسن صاحب کاربنکل کی اذیت میں مبتلا ہیں۔ مولانا کی اقامت گاہ پر پہونچا تو شدید کرب میں مبتلا پایا۔ مرحوم دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ابھی پورے طور پر سلام وپیام بھی نہیں ہوا تھا کہ بے اختیار ہو کر بولے اللہ کیوں

حضور، سنتا ہوں خنداں[1] شائع ہوگئی۔ میرا نسخہ کہاں ہے۔ ہر ایک سے پوچھتا ہوں کوئی نشان نہیں دیتا۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اپنا ہی نسخہ بھیج دیجئے۔ پڑھ کر واپس کر دوں گا۔

کہاں مرض الموت کا یہ کرب اور کہاں ایک معمولی سی کتاب کی طلب اللہ اکبر! میں مبہوت ہوگیا اور ایک لمحہ کے لئے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے آسمان و زمین کی ساری پہنائیوں پر مریض کی شخصیت مستولی ہوگئی ہے۔ میں تھوڑی دیر تک دم بخود رہا لیکن مرحوم پھوڑے کی مسلسل ٹیس سے ذرا نجات پاتے تو یہی کہتے رشید صاحب خدارا کتاب بھیجدیجئے۔ میں آدمی ساتھ کر دیتا ہوں وہ لائے گا۔ دل کی لگن اسے کہتے ہیں!

عجیب اتفاق کہ کتاب نہ میں بھیج سکا اور نہ مولانا کو مل سکی۔

رشید احمد صدیقی

---

[1] راقم الحروف کی ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ جو اسی زمانہ میں شائع ہوا تھا۔

گرانی اور ہندوستان

وہ زمانہ تو بہت دور گیا جب سیاسی جنگیں لڑی جایا کرتی تھیں۔ اب تو معاشی لڑائیوں کا زور ہے ہر فریق دوسرے کو معاشی زک پہونچانے کی کوشش کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے اثاثوں کو ضبط کرنا بحری ناکہ بندی، سامان لانے اور لیجانے والے بدرقوں پر حملے، دشمن کے کارخانوں اور گوداموں پر گولہ باری اور اپنے علاقوں کو دشمن کے قبضہ میں جانے سے پہلے خود ہی ہر طرح تباہ کر دینا کامیابی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ نازیت، فاشیت، اشتراکیت، جمہوریت، شہنشاہیت اب صرف سیاسی اصطلاحیں نہیں ہیں بلکہ ان میں معاشی مفہوم بھی پنہاں ہیں۔ بلکہ ہر "یت" کا بذات خود ایک مکمل معاشی نظام ہے اور ان ہی مختلف نظاموں میں کشمکش جاری ہے۔ پھر چونکہ ذرائع حمل ونقل کی آسانیوں، صنعتی ترقیوں، اور تجارت خارجہ کی سہولتوں کی وجہ سے ساری دنیا ایک بین الاقوامی معاشی نظام کے دائرے میں آگئی ہے اس لئے یہ کشمکش اور زیادہ شدید نظر آنے لگی ہے کوئی ملک اپنی روزانہ کی استعمال کی معمولی معمولی چیزوں کو لے لے اور دیکھے کہ وہ کہاں کہاں سے آ رہی ہیں، ربر، پنسل، پالش کی ڈبیاں۔ استروں کے بلیڈ، صابن تیل رومال وغیرہ دیکھنے میں کس قدر حقیر معلوم ہوتی ہیں مگر دنیا کے دور دراز ملک ان چیزوں کو مہیا کرتے ہیں جب بھلا معمولی چیزوں کا یہ حال ہو تو پھر اہم اور ضروری کا تو ذکر ہی کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگرچہ لڑائی دو ملکوں کے درمیان ہوتی ہے مگر اس کا اثر ساری دنیا پر پڑتا رہتا ہے۔

موجودہ جنگ کی طرح تو آج تک دنیا میں کوئی لڑائی ہوئی ہی نہیں۔ اس جنگ میں ساری دنیا کے ملک تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایک حملہ کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ دوسرے مدافعت کرنے والے اور ان کے ساتھی۔ تیسرے غیر جانبدار، یہ تقسیم کوئی نئی نہیں ہے بلکہ ہر بڑی لڑائی میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر دوسری لڑائیوں میں غیر جانبدار ملکوں کی تعداد زیادہ رہا کرتی تھی لیکن اس لڑائی کی خصوصیت

یہ ہے کہ اس میں غیر جانبداروں کی تعداد کم ہے اور نسبتاً روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس دائرہ میں بھی بعض نام نہاد طور پر غیر جانبدار ہیں ورنہ وہ کسی ایک فریق کے ساتھ ہیں مثلاً امریکہ آئینی طریقہ پر تو لڑائی میں شریک نہیں لیکن وہ کھلے بندوں اتحادیوں کا ساتھ دے رہا ہے یا اسپین علی الاعلان محوری طاقتوں کی طرفداری کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ بعض ملک ایسے ہیں جن کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حقیقی معنوں میں غیر جانبدار ہیں۔ اس طرح یہ دائرہ بہت ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ایسی صورت میں دنیا جنگ کے معاشی اثرات سے جتنی بھی متاثر ہو کم ہے۔

جنگ کا ایک عام معاشی اثر گرانی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم گرانی کے اسباب اور ہندوستان پر اس کے اثرات کو ظاہر کرنے کی حد تک محدود رہیں گے۔

گرانی کے اسباب | گرانی کیوں ہوتی ہے؟ اس مختصر سے سوال کا جواب دو چار لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا گرانی کے اسباب معلوم کرنے سے پہلے ہمیں اپنی ضروریات کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا۔ ایک وہ جو دوسرے ملکوں میں پیدا یا تیار ہوتی ہیں اور وہاں سے ہمارے ملک میں آتی ہیں دوسرے وہ چیزیں جو خود ہمارے ملک کے اندر پیدا یا تیار کی جاتی ہیں۔ اب باہر سے آنے والی چیزوں کو لیجئے ان کی قیمت اس لئے گراں ہوتی ہے کہ

(۱) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دشمن یا ان کے ساتھی ہیں اس لئے مال وہاں سے نہیں آسکتا۔

(۲) درآمد کرنے والے ملک ہمارے دوست ہیں۔ مگر ان کی توجہ جنگ کی طرف ہے اس لئے وہ ذخائر حرب زیادہ تیار کرتے ہیں اور دوسرے مال بہت کم تیار کرتے ہیں اور جب ان کے یہاں مال ہی کم تیار ہو تو وہ باہر بھی زیادہ مقدار میں نہیں بھیجا جا سکتا۔

(۳) اس زمانہ میں غیر جانبدار ملک نئے بازاروں پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر سمندری خطروں، بیمہ کی شرح میں اضافوں، ریلوں اور دوسری چیزوں کے کرایوں میں اضافہ کی وجہ سے اس مال کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

مگر اس وقت دنیا کا کوئی بڑا ملک ایسا نہیں جو جنگ میں شریک نہ ہو (ریاستہائے متحدہ براہ راست

جنگ میں شریک نہیں مگر بالواسطہ طریقہ پر اس کی ساری توجہ جنگ اور ضروریات جنگ کی طرف لگی ہوئی ہے) اب رہ گئے چھوٹے چھوٹے ملک تو ان کے یہاں نہ ایسی صنعتی ترقی ہوئی کہ وہ نئے بازاروں پر قبضہ کر سکیں اور نہ اتنے جہاز کہ دوسرے ملکوں کو سامان بھیج سکیں۔ دراصل یہ فوقیت تو یورپ کے چند چھوٹے چھوٹے ملکوں مثلاً ہالینڈ، بلجیم اور ڈنمارک وغیرہ کو حاصل تھی کہ وہ باوجود رقبے میں چھوٹے ہونے کے اور آبادی کی کمی کے بین الاقوامی تجارت میں نمایاں حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ جنوبی امریکہ اور ایشیا کے اکثر ملک رقبے اور آبادی میں ان سے کافی بڑے ہیں لیکن ان کو یہ بات میسر نہیں۔ گویا اس طرح ہندوستان کی درآمد کو بڑا نقصان پہونچا اور باہر سے آنے والی اشیا کی مقدار گھٹ گئی اور ان کی قیمت بڑھ گئی۔

دوسری طرف خود اندرون ملک پیدا ہونے والی چیزوں کو لیجئے ان کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک وہ جن کی ہمیں بھی ضرورت ہے اور وہ جنگی اغراض و مقاصد کے لئے بھی ضروری ہیں مثلاً پٹرول، تیل، روئی، دھاگہ، کپڑا، اون، کمبل، چمڑے کا سامان، لوہے اور لکڑی کا سامان، زرعی پیداواریں۔ ربر، شکر وغیرہ اب جو کارخانے فوجی اغراض کے لئے ان کو استعمال یا تیار کر رہے ہیں انکی ضرورت اہم اور شدید ہے اور ان کے پاس ایسے خریدار بھی ہیں جو اس سامان کی قیمت بھی زیادہ دینے پر تیار ہیں۔ ایسے کارخانے خام مال کی قیمت زیادہ دے سکتے ہیں یہ مزدوروں کو بھی زیادہ اجرت دیتے ہیں اور ان کا مال باوجود گرانی کے فروخت بھی ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تمام کارخانوں سے خام مال اور مزدور ادھر آنے لگتے ہیں مگر دوسرے کارخانے بھی اپنا کاروبار جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ مجبوراً وہ بھی زیادہ قیمت اور زائد اجرت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں یعنی اس طرح عام اشیا کی لاگت بڑھ جاتی ہے لہذا ان کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے مگر یہ اضافہ ایسا ہے جو بادی النظر میں ہر شخص کی سمجھ میں آتا ہے لیکن عوام اور ناواقف لوگوں کو اس وقت حیرت اور تعجب ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایسی چیزوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے جو ان کے ملک میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں مثلاً پان یا وہ پھل، ترکاریاں، مچھلی، دودھ، غلے وغیرہ جو کہیں باہر نہیں جاتے۔ مٹی کے برتن، گھڑے، مٹکیاں، گملے وغیرہ ان چیزوں کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو ہندوستان کے کسی

ایک حصہ میں پیدا ہوتی ہیں اور ملک کے دوسرے حصوں میں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی قیمت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ مزدوروں کی اجرت، اخراجات نقل وحمل اور باربرداری بڑھ جاتے ہیں۔ نئے نئے ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا بار اشیا کی قیمتوں پر پڑ کر ان میں اضافہ کر دیتا ہے۔ دوسری طرف وہ چیزیں ہیں جو بالکل مقامی طور پر بنتی ہیں اور وہیں صرف ہوتی ہیں۔ ان کی بڑی اچھی مثال مٹی کے برتن ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی نیا ٹیکس لگا نہ یہاں مزدوروں کی اجرت بڑھی کیونکہ یہ سب کام کمہار اور اس کا خاندان کرتا ہے اور نہ ان چیزوں کو اِدھر سے اُدھر منتقل کرنے میں اخراجات بڑھتے ہیں۔ نیز ان کی بنوائی پر اتنا ہی وقت اور محنت صرف ہوتی ہے جتنی کہ پہلے ہوتی تھی پھر ان کی قیمت میں اضافہ کیوں ہوتا ہے؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں روپیہ کی قدر گھٹ جاتی ہے۔ یعنی جو چیز پہلے ایک روپیہ میں خریدی جا سکتی تھی اب اس کے دو روپے دینا پڑتے ہیں بالفاظ دیگر روپیہ آٹھ آنے کی برابر ہو گیا ہے لیکن غریب کمہار ان نکتوں سے ناواقف ہے البتہ وہ یہ جانتا ہے کہ پہلے وہ دس گھڑے روز بناتا تھا اور ان کو ایک آنہ فی گھڑے کے حساب سے فروخت کر کے دس آنے روز کما لیتا تھا اور ان دس آنوں میں وہ اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھی بھر لیتا تھا اور کچھ آنے بچا بھی لیتا تھا جو اس کے کپڑے لتوں میلے تہواروں اور تقریبوں پر کام آتے تھے۔ اب بھی وہ دس گھڑے بناتا ہے اور ان کو دس آنے میں بیچتا ہے مگر اب اس رقم کو جب وہ اپنی ضرورتوں پر صرف کرتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ بچت تو درکنار اس کے روزمرہ کے اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے۔ اب یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی تعداد بڑھا دے تاکہ اس کو اتنی رقم ملنے لگے کہ اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں مگر ایک تو یہ اس کے بس کی بات نہیں کہ وہ روزانہ بیس گھڑے بنا لیا کرے۔ دوسرے اس کو اتنے خریدار بھی نہیں۔ ملتے جو یہ گھڑے خرید لیا کریں، تیسرے طبعاً ہر انسان آرام پسند ہوتا ہے یعنی وہ کم کام کر کے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا آسان نسخہ یہی ہے کہ وہ اپنے گھڑوں کی قیمت میں اضافہ کر دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے عام چیزوں کی قیمت بڑھتی جاتی ہے ویسے ہی گھڑوں کی قیمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس تجزیہ پر غور کرنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ کیوں ان چیزوں

کی قیمت میں اضافہ ہوتا ہے جن کو جنگ سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

گرانی کا دوسرا سبب اضافہ اجرت ہے یعنی جب جنگ کے زمانہ میں چیزوں کی قیمتیں بڑھنے لگتی ہیں تو مزدوروں کو نقصان پہونچنے لگتا ہے۔ ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے اور ان کی پہلی اجرتوں سے ان کی ساری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ لہٰذا وہ اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ابتدا میں ان کو یقین دلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ابھی چیزوں کی قیمتوں میں اتنا اضافہ نہیں ہوا کہ اجرت بڑھائی جائے۔ مگر جب مطالبات شدید ہوتے جاتے ہیں اور ہڑتالوں اور دربندیوں کی نوبت آنے لگتی ہے تو اجرتوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح لاگت بڑھ کر چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتی ہے

گرانی کا تیسرا سبب حقیقی دولت کی پیدائش میں کمی کا ہو جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنگ کے زمانہ میں سارے ملک کی توجہ سامان حرب یا جنگی اغراض کے لئے ضروری سامان تیار کرنے کی طرف رہتی ہے۔ کپڑے، لوہے، فولاد، چمڑے کے وہ کارخانے جو پہلے ملک کی عام ضرورتوں کے لئے چیزیں تیار کرتے تھے اب جنگی اغراض کے لئے سامان بناتے ہیں یا ان کی تیار کردہ چیزوں کی بڑی تعداد جنگی اغراض کے لئے خریدی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ملک میں ضرورت کی عام چیزوں کی مقدار گھٹ جاتی ہے اور مقدار کی کمی باقی ماندہ اشیا کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ اب اس زمانہ میں چونکہ نفع کافی ہوتا ہے اس لئے نئے نئے کاروبار کھلنے کی توقع کی جا سکتی ہے مگر جنگ کے زمانہ میں عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ خام مال کی قیمت کی زیادتی، اجرتوں میں اضافہ، شرح سود کی زیادتی، مقدار زر کی کمی اور سب سے بڑھ کر خریداروں کی کمی کی وجہ سے نئے کاروبار چلا کر نفع حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ اور ہر معاشرہ میں ایسے اولوالعزم اور بلند حوصلہ آدمی کم ہوتے ہیں جو غیر معمولی خطرات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کا مقصد جنگی اغراض کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اسی شعبہ میں ان کو ہر طرح کی سہولتیں میسر آجاتی ہیں اس وجہ سے نئے کاروبار کھلنے کے باوجود اس کمی کی تلافی کو پورا نہیں کیا جا سکتا جو جنگ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔

گرانی کا چوتھا سبب تجارت خارجہ میں تخفیف ہے یہ ایک تو اس طرح ہوتا ہے جس کا ذکر

ابتدا میں کیا جا چکا ہے لیکن دوسری طرف اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہمارے حلیف یا غیر جانبدار ملک باوجود خطروں، بیموں اور کرایوں کی شرحوں میں اضافہ کے زیادہ سے زیادہ مال درآمد کرنے کو تیار رہیں تو خود ہمارے پاس بھی اس قیمت کا مال یا خدمات ہونا چاہئیں جتنی قیمت کا مال باہر سے منگوایا جا رہا ہے، تجارت خارجہ کا یہی اصول ہے کہ وہ زر یا سکوں کی بدولت نہیں چلتی بلکہ ہر ملک اسی قدر مال درآمد کر سکتا ہے جتنا کہ وہ برآمد کرنے کے لئے تیار ہو یعنی اصولاً ہر ملک اپنی زائد اشیاء یا خدمات کو ہی برآمد کرتا ہے لیکن جنگ کے زمانہ میں جب ملک کی حقیقی دولت کی پیدائش ہی گھٹ جائے تو اس کے پاس زائد اشیا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب رہیں خدمات یا ہندوستان جیسے زرعی ملکوں میں زرعی پیداواریں تو ان کا رخ بدل جاتا ہے مثلاً وہ لوگ جو جنگ سے پہلے حملہ کرنے والے ملکوں میں بینکاری یا بیمہ یا دوسرے کام کرتے تھے اب ان خدمتوں سے الگ ہو جاتے ہیں اور خود ملک میں ان کی خدمات منتقل ہو جاتی ہیں۔ اب رہیں زرعی پیداواریں تو وہ پہلے ان ملکوں کو برآمد کی جاتی تھیں جہاں سے ہم کو اپنی ضرورت کے مطابق مختلف سامان کی ضرورت ہوتی تھی لیکن اب وہ حلیف ملکوں کو جاتی ہیں پھر بعض وقت حلیف ملک ان کی قیمت (ان کے مساوی دوسری اشیا) بھی فی الوقت ادا نہیں کرتے۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ہندوستان کو ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا یعنی اس طرح ہم اپنی رہی سہی زائد چیزوں کے منافع سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

گرانی کا پانچواں سبب نفع کمانے کی ناجائز خواہش ہے عموماً ہر شخص ہر وقت (اگر اس کو موقع ملے) ناجائز منافع حاصل کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ مگر جنگ کے زمانہ میں بعض امکانات اس توقع کو بڑھا دیتے ہیں اور اس وجہ سے خوب نفع ستانی ہوتی ہے اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کہیں جنگ نے طول کھینچ لیا تو ملک میں باہر سے آنے والی چیزوں کی مقدار گھٹ جائے گی اور ان کی قیمت بڑھ جائیگی اور اس وقت جن لوگوں کے پاس مال ہوگا ان کو خوب نفع ہوگا لہذا وہ ابھی سے اپنے ذخیروں کو محفوظ کر دیتے ہیں اور یہ ظاہر کر کے کہ ان پاس بہت تھوڑا مال ہے اس کی قیمت بڑھا دیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک طویل عرصہ تک وہ ناجائز منافع حاصل کرتے رہتے ہیں ایسا کرنے والے بڑے بڑے تھوک فروش تاجر

اور دوکاندار ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو ریڈیو، بحری تاروں اور ٹیلیفون کے ذریعہ دنیا کے سارے حالات کی اطلاع ملتی رہتی ہے۔ نیز جس طرح حکومتیں کسی آنے والی جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی پہلے سے غیر معمولی حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بین الاقوامی حالات سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کچھ عرصہ میں دو ملکوں کے تعلقات خراب ہو جانے والے ہیں لہذا وہ پہلے ہی سے وہاں سے کثیر تعداد میں ضروری سامان منگوا لیتے ہیں۔ اس طرح اپنے ذخیروں کی مقدار بڑھا لیتے ہیں۔ پھر ہر تھوک فروش کے پاس ایسا سامان کثیر مقدار میں ہوتا ہے جو کم قیمت پر خریدا گیا تھا مگر حالات میں تبدیلی ہوتے ہی وہ ایک دم چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً جس دن حکومت برطانیہ اور اس کی نوآبادیوں اور مقبوضوں نے جاپانی اثاثوں کو ضبط کیا اس کے دوسرے دن بمبئی میں بعض جاپانی چیزوں کی قیمت دوگنی ہو گئی۔ اس قسم کی من مانی کارروائیاں ملک پر بڑے بڑے اثرات ڈالتی ہیں اور بعض اوقات صورت بہت ہی نازک ہو جاتی ہے، جیسا کہ اس مرتبہ ہندوستان میں ہو رہا ہے اور حکومت کو کوشش کرنا پڑتی ہے کہ اس ناجائز منافع کی روک تھام کرے۔ چنانچہ اس مرتبہ جنگ شروع ہوتے ہی نگرانی نرخ اشیا کے سلسلہ میں دو ایک کل ہند کانفرنسیں ہوئیں جن میں سارے برطانوی صوبوں اور اکثر بڑی بڑی ریاستوں نے اشتراک کیا۔ بعض صوبوں میں حکومت کی جانب سے چیزوں کے نرخ مقرر کئے گئے، بعض جگہ سرکاری دوکانیں قائم ہوئیں۔ ناجائز منافع حاصل کرنے والوں کو سزائیں دی گئیں۔ مگر ان عارضی بندشوں سے منافع ستانی کی حقیقی روک تھام نہ ہو سکی اور یہ شکایت اب پھر بڑھ گئی ہے چنانچہ پھر حکومت ایک کانفرنس کے انعقاد پر غور کر رہی ہے۔

گرانی دراصل ایک چکر ہے یعنی جب ایک چیز گراں ہوتی ہے تو اس کے ساتھ دوسری چیزیں بھی گراں ہونے لگتی ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ گیہوں یا چاول کی ہندوستانی فوجوں یا دوسری فوجوں کے لئے باہر بھیجنے کی ضرورت ہوئی اس لئے ان کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اب ملک کے وہ غریب لوگ جو پہلے گیہوں یا چاول کھاتے تھے ان کے بجائے دوسرے معمولی اور ارزاں غلے مثلاً مکا، جوار، باجرہ، راگی، کودوں وغیرہ کھانے لگے گویا اب ان چیزوں کی مانگ بڑھی اور یہ قاعدہ ہے

کہ جب کسی چیز کی مانگ بڑھتی ہے تو اس کی قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہذا ان چیزوں کی قیمت بڑھ گئی یہی اصول دوسری تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے اور ہر چیز کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور اسی کو عام گرانی کہا جاتا ہے جس کے اثرات بہت شدید اور اہم ہوتے ہیں۔

گرانی کے اثرات: گرانی کے اسباب معلوم ہونے کے بعد اس کے اثرات معلوم کرنا ضروری ہیں۔ گرانی کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ معین آمدنی پانے والوں کو نقصان ہونے لگتا ہے۔ اس طبقہ میں تین قسم کے آدمی شامل ہیں ایک کارخانوں کے مزدور، دوسرے متفرق مزدوری کرنے والے، اور تیسرے حکومت کے ملازم، پہلا طبقہ بہت کچھ منظم ہے اس پر حکومت کی بھی کوئی بندش نہیں۔ ان کی انجمنیں اور سبھا ئیں بھی ہیں ان کے جلسے اور کانفرنسیں بھی ہوتی رہتی ہیں یہ شروع میں آئینی اور پر امن طریقوں پر اضافہ اجرت کا مطالبہ کرتے ہیں اگر ان کے مطالبے تسلیم کر لئے جاتے ہیں تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے ورنہ ہڑتالوں اور در بندیوں کی نوبت آتی ہے بالخصوص جب جنگی مقاصد کو ان سے نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہوا اور نازک حالات میں حکومت کی مداخلت ضروری ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات تو حکومت کو کارخانوں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا پڑتا ہے جیسا کہ آج کل ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکثر مقامات پر ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں اب تک صورت حال کبھی اتنی نازک تو نہیں ہوئی لیکن پولیس کی نگرانی اور پہرہ، لاٹھی چارج، مزدوروں کی گرفتاریاں اور سزائیں اور مزدوروں کے کارخانوں اور منتظمین پر حملے اکثر ہوتے رہتے ہیں اور حکومت کو تھوڑی بہت مداخلت بھی کرنا پڑتی ہے، بہرحال ان متحدہ کوششوں سے ان کو فائدہ پہونچ جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ متفرق مزدوروں کا ہے نہ ان کی کوئی انجمن ہے نہ رہنما، پھر یہ مختلف پیشوں میں مصروف رہتے ہیں۔ آئے دن ان کے آقا اور مالک بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی منظم کوشش کر کے اپنی اجرت نہیں بڑھوا سکتے لیکن عام حالات کے ساتھ ساتھ بتدریج ان کی اجرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر جب تک ان کی اجرت اس معیار پر پہونچتی ہے ان کو سخت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس گروہ کے نکمے اور کام چور آدمی اس مجبوری دور سے تنگ آکر محنت سے جی چرانے لگتے ہیں اور جائز طریقوں کے بجائے ناجائز طریقے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ چوری، ڈکیتی، لوٹ مار، قتل، خون اور طبقہ واری فسادات

میں اضافہ ہونے لگتا ہے جس میں بعض وقت دوسری پریشان حال اور غیر منظم جماعتیں بھی مل جاتی ہیں۔ چنانچہ ہبلی میں حال ہی میں ایک ایسا فساد ہوا جس میں ایک طبقہ کی دوکانیں اور سامان لوٹ لیا گیا اور باقی چیزوں میں آگ لگا دی۔ یہ صورتیں ملک کے امن وامان کو خطرے میں ڈالدیتی ہیں اور حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

تیسرا طبقہ سرکاری ملازموں کا ہے یہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ گرانی کی وجہ سے ایک طرف اس کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے دوسرے نئے نئے ٹیکسوں یا چندوں کا بار بھی اس پر پڑتا ہے۔ پھر یہ نہ تو ہڑتال کر سکتا ہے اور نہ کام چھوڑ سکتا ہے اور نہ دوسرے غیر آئینی طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ البتہ درخواستوں پر درخواست دئے جاتا ہے اور جب حکومت یقین کر لیتی ہے کہ اس کی حالت قابل رحم ہے تو وہ اس کو گرانی الاونس یا بھتّہ کے نام سے کچھ رقم دینے لگتی ہے مگر جس کی مقدار عموماً کم ہوتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گرانی کا اثر زراعت پیشہ طبقہ پر بہت اچھا پڑتا ہے کیونکہ اس کو اپنی پیداواروں کی قیمتیں زیادہ ملنے لگتی ہیں مگر ہندوستانی کاشتکار کو گرانی سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا کیونکہ وہ خود فروشندہ نہیں ہے بلکہ اس کے اور اصل خریدار کے بیچ میں بہت سے آدمی مثلاً مہاجن بنئے، دلال آڑھتیے اور تھوک فروش بطور درمیانی آدمیوں کے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح نفع کی بڑی تعداد ان لوگوں کی جیب میں چلی جاتی ہے اور کاشتکار کو جو تھوڑا بہت فائدہ ہوتا ہے وہ عام گرانی کی نذر ہو جاتا ہے۔

گرانی کی وجہ سے حکومتیں اپنے محکموں میں، آجر اپنے کارخانوں میں تخفیف شروع کر دیتے ہیں اس کے علاوہ بہت سے لوگ اس زمانہ میں گرانی کی وجہ سے اپنے مجوزہ کاموں کو ملتوی کر دیتے ہیں اس طرح ملک میں بیروزگاروں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے مگر عموماً ایسا نہیں ہوتا کیونکہ جنگ اور اس کے متعلقہ کاموں میں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس طرح بہت سے تخفیف شدگان اور بیروزگاروں کو کام مل جاتا ہے اور ان لوگوں کو اجرتیں بھی زیادہ ملتی ہیں مگر عام گرانی کی وجہ سے ملک کی مادی خوشحالی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا بلکہ جنگ کے خاتمہ پر اس عارضی چہل پہل اور رونق کے بڑے بھیانک اثرات

مرتب ہوتے ہیں۔

گرانی میں حکومت بھی متاثر ہوتی ہے جنگ کے زمانہ میں حکومتوں کو طرح طرح سے مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنگی اغراض کے لئے بڑی بڑی رقمیں قرض لینا پڑتی ہیں اور چونکہ یہ رقمیں غیر پیدا آور ہوتی ہیں اس لئے ان کے اصل اور سود کا بار حکومت کو برداشت کرنا پڑتا ہے، دوسرے جنگ کو کامیاب بنانے کے لئے جن چیزوں کی خریداری کی ضرورت ہوتی ہے ان کی قیمت زیادہ دینا پڑتی ہے سرکاری ملازموں کو گرانی کا الاؤنس دینا پڑتا ہے۔ پھر ملک سے باہر جانے والی فوجوں کی تنخواہوں میں اضافہ نئی فوجوں کی بھرتی، مقتولین کے وارثوں کو انعام، ناقابل کار مجروحین کو وظیفے، سپاہیوں کے لئے عمدہ قسم کی غذا اور دوسری ضرورتوں کا انتظام اور سب سے بڑھ کر اسلحہ کی تیاری کا خرچ ایسا ہے جو اچھی سے اچھی حکومت کی کمر توڑ دیتا ہے۔ ایک طرف تو اخراجات بڑھتے ہیں دوسری طرف اندرونی اور بیرونی تجارت میں کمی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے کڑوڑ گیری اور دوسری مدوں کی آمدنی کم ہونے لگتی ہے ان کثیر اخراجات کو پورا کرنے کے تین طریقے ہیں، تعمیری اور مفاد عامہ کے کاموں میں تخفیف کر دی جاتی ہے نئے نئے محصول لگائے جاتے ہیں اور سب سے اہم قرضہ لے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے ملک کے باشندوں پر گرانی کا یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک طرف ان کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے، دوسری طرف نئے نئے محصولوں کا بار بڑھتا ہے تیسرے ان کو مختلف فنڈوں میں چندہ یا امداد دینا پڑتی ہے۔ اس طرح ملک کا عام معیار زندگی پست ہو جاتا ہے، بہت سی تعیشات اور تفریحات کم ہو جاتی ہیں اور باوجود ظاہری گرم بازاری اور رونق کے اندر ہی اندر گھن لگتا رہتا ہے جو نہ معلوم ساری مستحکم اور مضبوط عمارت کو کس وقت منہدم کر دے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ جنگ میں فتح بغیر قربانی کے حاصل نہیں ہو سکتی اور قربانی جس قدر زیادہ اور بڑی ہو گی اسی قدر فتح و نصرت قریب اور آسان ہو گی لہذا حکومت سے لے کر ایک معمولی باشندہ تک کو اس کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اسی وجہ سے گرانی کے مصائب کو ہنسی خوشی سے برداشت کرنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

محمد احمد سبزواری ایم اے

استحصال

استحصال کا مفہوم[1] انگریزی لفظ ایکسپلائیٹیشن (Exploitation) کے لئے استحصال کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ استحصال سے مراد دوسروں کی کمزوریوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی ساہوکار اور کاشتکاروں کو لیجئے۔ ان کے حالات ایک دوسرے کے برعکس ہوتے ہیں۔ ساہوکار بالعموم پڑھے لکھے، ہوشیار، معاملہ فہم اور مالدار ہوتے ہیں۔ برعکس اس کے کاشتکار بالعموم ان پڑھ اور مفلس و قلاش ہوتے ہیں۔ آئے دن انہیں قرض کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور قرض لئے بغیر چارہ نہیں لہٰذا ساہوکار ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ شرح سود وصول کرتے ہیں۔ سود در سود کا حساب جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ حاصل کردہ اصل کی قلیل مقدار تھوڑی ہی مدت میں بڑھتے بڑھتے سود کی اجتماع کی وجہ سے بہت زیادہ ہو جاتی ہے حتیٰ کہ کاشتکار اس کی ادائی سے قاصر رہتے ہیں اور یہیں سے ساہوکار کے ظلم و زیادتی کی ابتدا ہوتی ہے۔ کاشتکار انتہائی محنت کے ساتھ ہل چلاتے ہیں بوتے۔ پانی دیتے۔ فصل کی نگہبانی کرتے اور جب وہ تیار ہو جاتی ہے تو اسے کاٹتے اور غلہ صاف کرتے ہیں۔ غلہ کو ابھی مکان میں منتقل کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں کہ ساہوکار یا اس کے گماشتے آ پہونچتے ہیں کاشتکار منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور سارا غلہ ساہوکار کے گھر میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ساہوکار کو اس کی پرواہ نہیں کہ کاشتکار کے بیوی بچے بھوکوں مریں گے۔ اسے تو بس اپنے اصل اور سود کی ہی فکر ہوتی ہے۔ ساہوکار کے اس طرز عمل کو عمرانی اصطلاح میں استحصال کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ کاشتکاروں کے افلاس۔ شدت احتیاج اور جہالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خود دولتمند بنتا اور انہیں مفلسی کے عمیق غار میں دھکیل دیتا ہے۔

---

[1] استحصال کے متعلق وسکانسن یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر عمرانیات ایڈورڈ السورتھ راس نے زیادہ تحقیق کی ہے استحصال کے مفہوم اور اس کی مختلف قسموں۔ طریقوں اور قوانین کے متعلق راس نے اپنی کتاب اصول عمرانیات میں تفصیلی بحث کی ہے اس مضمون کی تیاری میں مذکورہ کتاب سے مدد لی گئی ہے۔

دیہی معیشت میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی قدر خوشحال کسان بھی غریب اور نادار مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں جب کبھی کوئی مفلس اور حاجت مند مزدور ان کے ہاں جاتا ہے اور قرض کی درخواست کرتا ہے تو کسان بہت ہی معمولی رقم قرض دے کر ان سے زیادہ مدت تک کام کرنے کا وعدہ لیتے ہیں۔ مزدور چونکہ مجبور ہوتا ہے لہذا جو بھی شرائط پیش کئے جائیں قبول کر لیتا ہے۔ سو روپیہ دے کر تین یا چار سال تک کام کرنے کا وعدہ لینا کسی طرح جائز نہیں ہو سکتا۔ غریب مزدور بالعموم شادیوں کے لئے قرض حاصل کرتے ہیں اور نتیجۂ حسب معاہدہ تین یا چار سال تک اقل ترین معاوضہ کے ساتھ ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کسانوں کا مزدوروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانا بھی استحصال پر مبنی ہے۔

استحصال کا جذبہ نہ صرف انسانوں بلکہ حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ ایک حیوانی جذبہ ہے جو انتہائی خود غرضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب انسان استحصال پر اتر آتا ہے تو وہ دوسروں کی بھلائی یا برائی اور نفع و نقصان کا یا تو خیال ہی نہیں کرتا یا خیال کرنے کے باوجود اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ جو شخص جو جماعت یا جو قوم جس قدر زیادہ خود غرض ہو گی اس میں استحصال کا مادہ بھی اسی قدر زیادہ ہو گا ہمدردی اور ایثار کے جذبات استحصال کے بالکل منافی ہیں۔ یہ جذبات جس قدر زیادہ کارفرما ہوں گے استحصال کی قوت اسی قدر کمتر نظر آئے گی۔

استحصال کوئی نئی چیز نہیں ظلم و زیادتی اور حق تلفی (خواہ وہ معاشی ہو۔ سیاسی ہو یا معاشرتی) کا دوسرا نام استحصال ہے۔ استحصال کی تاریخ اسی قدر قدیم ہے جس قدر کہ بنی نوع انسان کی تاریخ۔ تہذیب و تمدن کے ابتدائی دور سے لے کر عہد حاضر تک ہر زمانے، ہر دور، ہر خاندان ہر قبیلہ اور ہر قوم میں اس کی بیسیوں مثالیں ملیں گی۔ فرقہ واریت، طبقہ واریت، بین الاقوامی کشمکش، پست تاجرانہ ذہنیت (Commercialization اور پست پیشہ ورانہ ذہنیت Professionalization جذبہ استحصال ہی کا نتیجہ ہیں۔ فرقہ وارانہ منافشات طبقہ واری کشمکش اور بین الاقوامی لڑائیاں محض اس وجہ سے نمودار ہوتی ہیں کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کی ایک طبقہ دوسرے طبقہ کی، اور ایک قوم دوسری قوم کی حق تلفی کرنا چاہتی ہے۔ ایک فرقہ، طبقہ یا قوم کی جانب سے حق تلفی کی کوشش اور دوسرے فرقے، طبقے یا قوم کی جانب سے تحفظ اور دفاع کی جدوجہد اور بالآخر ایک

کے غالب آنے اور دوسرے کے مغلوب ہونے سے استحصال کے مواقع نکل آتے ہیں

استحصال کی قسمیں | اگر ہم استحصال کی ماہیت پر غور کریں تو اس کا دائرہ بہت وسیع نظر آئے گا چنانچہ بسہولت تفہیم کی خاطر استحصال کی چار قسمیں کی گئی ہیں۔

(۱) جنسی استحصال — **Sexual Exploitation**

(۲) معاشی استحصال — **Economic Exploitation**

(۳) مذہبی استحصال — **Religeous Exploitation**

(۴) انانی استحصال — **Egotic Exploitation**

ا۔جنسی استحصال (جنسی استحصال، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کا مقصد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی حظ اور لطف حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ذاتی عیش اور آرام کی خاطر ایک سے زائد بیویاں رکھنا، ان کے آرام و آسائش کا خیال نہ کرنا اور صرف لطف اندوزی کو اپنا مقصد قرار دینا جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ مرد کا منشا عورتوں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نفسیاتی خواہشات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ لونڈیاں رکھنے کا طریقہ بھی جنسی استحصال پر مبنی ہے۔ لونڈیوں سے نہ صرف محنت شاقہ لی جاتی تھی بلکہ جنسی جذبات کی تکمیل کے لئے انہیں عام جنسی آلہ کار بنایا جاتا تھا۔ اگرچہ غلامی کا طریقہ بہت بڑی حد تک مسدود ہو چکا ہے تاہم اب بھی روپے اور پیسہ کا لالچ دے کر مفلس و نادار۔ لیکن شریف عورتوں کی عصمت دری کا طریقہ جاری نظر آتا ہے جو کہ استحصال کے سوا کچھ نہیں۔ قدیم زمانے میں فاتح اقوام کے پیش نظر روپیہ پیسہ کے علاوہ خوبصورت عورتیں بھی ہوا کرتی تھیں جس کا مقصد مفتوحین کی بے بسی اور بیچارگی

لے راس نے استحصال کی جو قسمیں بیان کی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان سے استحصال کے دائرہ عمل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ہم جنسی۔ مذہبی اور انانی استحصال کہنے کی بجائے معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی استحصال کہیں تو یہ تقسیم زیادہ منطقی اور اصولی ہوگی اور اس سے استحصال کی اولیت کا پورا پورا اندازہ ہو سکے گا جنسی۔ مذہبی اور انانی استحصال کو معاشرتی استحصال کے تحت رکھا جا سکتا ہے سیاسی استحصال سے ایسا استحصال مراد لیا جانا چاہئے جو سیاسی اغراض و مقاصد کے حصول کی خاطر کیا جاتا ہے۔ معاشی استحصال کا مقصد معاشی مفاد ہوتا ہے اور معاشرتی استحصال معاشرتی خود غرضی کی بنا پر ہوتا ہے

جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی جذبات کی تسکین ہوتی تھی۔ اکثر مرتبہ خراج میں نہ صرف مال و اسباب بلکہ حسین اور خوبصورت عورتیں بھی طلب کی گئی ہیں۔ بعض ایسے تاریخی واقعات بھی موجود ہیں کہ بادشاہ کے حکم سے ملک کی حسین ترین عورتوں کو محل میں داخل ہو جانا پڑتا تھا۔ عورتوں کی مرضی کے خلاف انھیں اس طرح محل میں داخل کر دالینا بھی جنسی استحصال ہی کی ایک شکل ہے

۲۔ معاشی استحصال: جس طرح جنسی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جنسی حظ و لطف حاصل کرنا ہے۔ اسی طرح معاشی استحصال سے مراد دوسروں کی مجبوریوں سے معاشی استفادہ کرنا ہے۔ دوسروں کو ان کی محنت کے حقیقی معاوضے سے محروم رکھنا اور اس سے خود استفادہ کرنا معاشی استحصال ہے۔ معاشی استحصال کی بہترین مثال سرمایہ داری سے ملتی ہے۔ سرمایہ دار غریبوں کی ناداری اور افلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ سرمایہ داروں کی آمدنی کا مدار غریبوں کی محنت پر ہوتا ہے۔ سرمایہ دار غریب مزدوروں کو ان کی محنت کا حقیقی معاوضہ نہیں دیتے۔ وہ جس قدر محنت کرتے ہیں انھیں اس سے کم معاوضہ ادا کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

معاشی استحصال صرف سرمایہ داروں تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی متعدد مثالیں ملیں گی۔ اکثر خاندانوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک کماتا ہے اور دس کھاتے ہیں دیگر اراکین خاندان محض اسلئے محنت کرنا نہیں چاہتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں لہذا ایسی صورت میں کہا جائے گا کہ غیر پیدا آور اراکین کمانے والے رکن کا استحصال کر رہے ہیں۔

اکثر اصحاب میں خاطر مدارات کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لہذا بعض خود غرض دوست احباب ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر وقت ان کی صحبت میں رہتے ہیں اور ان کی آمدنی کا قابل قدر حصہ اپنی ضروریات کی تکمیل کے لئے خرچ کروالیتے ہیں۔

نیچ طبقوں کے بعض سست اور کاہل مرد محض اپنی بیویوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں، وہ محنت کرتی ہیں اور یہ اس کا پھل کھاتے ہیں۔ وہ مصیبت اٹھاتی ہیں اور یہ آرام سے رہتے ہیں۔

افراد اور جماعتوں کے علاوہ قومیں بھی ایک دوسرے سے استحصال کرتی ہیں۔ جنگ اور لڑائی میں

بالعموم معاشی اغراض و مفادات کارفرما ہوتے ہیں۔ طاقتور حکومتیں کمزور حکومتوں پر اپنا تسلط قائم کرلیتی ہیں اور من مانے ان سے استحصال کرتی ہیں انھیں ان سے کوئی سروکار نہیں کہ مفتوح اور زیر اقتدار ممالک کے باشندے غربت اور افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتی ہیں کہ انھیں کس قدر دولت مل رہی ہے۔ خود غرضی کے تحت ہمدردی اور ایثار کے جذبات پائمال ہوجاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی روزمرہ کی زندگی پر غور کریں تو معاشی استحصال کی بے شمار مثالیں ملیں گی۔ استحصال کی دوسری قسموں کے مقابل معاشی استحصال کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ ہر طرف اسی کا عمل درآمد وسیع پیمانے پر نظر آتا ہے

۳۔ مذہبی استحصال :۔ مذہبی استحصال سے مراد کسی ایک مذہب کے افراد کا دیگر مذاہب کے افراد کو قوت و اقتدار کے ذریعہ اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنا ہے۔ مذہب کی اشاعت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک جبر و تشدد کے ذریعہ اور دوسرا بذریعہ تشہیر۔ دوسری صورت میں افراد کو تبدیل مذہب کا اختیار ہوتا ہے لیکن پہلی صورت میں وہ مجبور ہوتے ہیں۔ جہاں جبر و تشدد کا عنصر شامل ہوگا وہیں استحصال کی صورت نمودار ہوگی۔ فاتح اقوام کا مفتوح اقوام کو اس امر پر مجبور کرنا کہ وہ ان کا مذہب اختیار کریں مذہبی استحصال ہے۔

۴۔ اناتی استحصال :۔ اس سے مراد ایسا استحصال ہے جو اپنی انانیت۔ شان و شوکت اور عظمت و سطوت کو ظاہر کرنے کیلئے کیا جائے۔ اکثر دفاتر میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ماتحتین جب کبھی مثلیں اور کارروائیاں لے کر حاکم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو انھیں گھنٹوں کھڑا رہنا پڑتا ہے کیونکہ کارروائیوں کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں اور انھیں بیٹھنے کی اجازت نہ دینا اور اسی کو اپنی بڑائی سمجھنا اناتی استحصال ہے۔ اپنی شان و شوکت کو ظاہر کرنے کے لیے دوسروں کی تذلیل اور مصیبت کا خیال نہ کرنا اناتی استحصال کی نمایاں خصوصیت ہے اناتی استحصال کی تشریح کرتے ہوئے راس نے لوئی چہاردہم کے بارے میں لکھا ہے کہ بادشاہ کے محل میں دریچہ تھا جسے آکس آئی Ox Eye کہتے تھے، تھا۔ بادشاہ جب بیدار ہوتا یا آرام کرنے جاتا تو اس دریچہ سے گذرتا اور اپنے وفادار درباریوں سے یہ توقع رکھتا کہ وہ اس دریچہ کے پاس جمع ہو کر اس کے خوابگاہ کو جانے یا خوابگاہ سے باہر نکلنے کا مشاہدہ کریں۔ مطلق العنان بادشاہوں کے حالات زندگی سے اناتی استحصال کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں مشیخت کا جذبہ ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور اس کو پورا کرنے کے لئے وہ اناتی استحصال

پیمانہ ترآتا ہے

استحصال کے مختلف طریقے | روزمرہ زندگی میں استحصال کے مختلف طریقے نظر آئیں گے ذیل میں ہم چند اہم طریقوں کا ذکر کریں گے۔

(۱) بچوں کا استحصال والدین کے ذریعہ۔ موجودہ زمانے میں پیدائش بر پیمانہ کبیر اور مشین کے وسیع استعمال کی وجہ سے عورتوں کے علاوہ بچوں سے کام لینے کے بھی زیادہ مواقع نکل آئے ہیں چنانچہ غریب اور نادار والدین غربت اور افلاس سے مجبور ہو کر کمسن بچوں کی صحت اور کارکردگی کا خیال کئے بغیر انھیں ملازم کرواتے ہیں اور اس طرح خاندان کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کرتے ہیں بعض والدین تو محض چھوٹے بچوں کی کمائی پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اولاد کی تربیت ان کی صحت اور کارکردگی کا خیال کئے بغیر انھیں قبل از وقت ذریعہ آمدنی بنانا استحصال ہی کی ایک نوعیت ہے۔ چونکہ چھوٹے بچے کلیتہً والدین کے تابع ہوتے ہیں لہذا وہ ان کی ہدایت کے مطابق محنت مزدوری کرنے پر مجبور ہوتے ہیں غریب اور مفلس گھرانوں میں بچوں کی کثرت کسی قسم کا بار نہیں تصور کی جاتی بلکہ زائد بچوں کی خواہش محض اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ آمدنی کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں۔

(۲) عورتوں کا استحصال مردوں کے ذریعہ۔ روزمرہ زندگی میں ہمیں اس کی بیسیوں مثالیں ملتی ہیں کہ مرد عورتوں کی مجبوریوں کی سے ناجائز استفادہ کرتے ہیں۔ بالخصوص غیر تعلیم یافتہ اور غیر مہذب طبقوں اور جماعتوں میں بالعموم عورتوں کے ساتھ بہت زیادتی کی جاتی ہے۔ انہیں طرح طرح سے دکھ دیا جاتا ہے اور ان کے آرام کا بہت کم خیال رکھا جاتا ہے۔ ہندوستان میں علی العموم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ عورت محض مرد کی خدمت کے لئے پیدا ہوئی ہے چونکہ عورت کی پرورش کا مدار مرد کی کمائی پر ہوتا ہے لہذا مرد اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ نیچ طبقوں کے بعض خود غرض مرد ایک سے زائد بیویاں بھی اس غرض سے رکھتے ہیں کہ وہ آمدنی کا ذریعہ ہوتی ہیں انھیں ملازم کرواتے ہیں اور ان کی آمدنی خود حاصل کر لیتے ہیں۔

(۳) غریبوں کا استحصال امیروں کے ذریعہ۔ امیروں کے پاس دولت ایک ایسا اہم حربہ ہے جس کے

ذریعہ وہ غریبوں پر کامل تسلط جما لیتے ہیں اور ان سے ہر طرح کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ دولت کے ذریعہ انھیں ذلیل وخوار کیا جاتا ہے۔ ان سے جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا ہے۔ غریب عورتوں کی عصمت دری کیجاتی ہے اور ہر طرح کی معاشی سیاسی اور معاشرتی زیادتی روا رکھی جاتی ہے۔ غریب کمزور اور بے زبان ہوتے ہیں امیروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور مجبوراً ان کے پنجے میں پھنس جاتے ہیں

(۴) اقلیت کا استحصال اکثریت کے ذریعہ۔ چونکہ اکثریت کی قوت زیادہ ہوتی ہے لہذا وہ اقلیت پر حاوی رہتی ہے اور اس سے استحصال کرتی ہے۔ ہندوستان میں اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ نہایت شدید ہے۔ یہاں کی اقلیتیں اکثریت سے بدگمان ہیں۔ ان کا خیال ہے اگر حکومت اکثریت کے ہاتھ میں چلی جائے تو وہ ان کی حق تلفی کرے گی اور ہر طرح کے استحصال کو روا رکھے گی۔ لہذا وہ قبل از وقت اپنے حقوق کی حفاظت چاہتی ہیں۔

(۵) محنت پسندوں کا استحصال غیر محنت پسندوں کے ذریعہ۔ فقیروں کی قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی نظر آتی ہے جو تنومند۔ قوی ہیکل اور کام کرنے کے قابل ہوتی ہے لیکن محض اس وجہ سے محنت کرنا پسند نہیں کرتی کہ محنتی اور جفاکش لوگ اپنی کمائی کا ایک جزو اسے بطور خیرات دیدیتے ہیں۔ فقیروں کا یہ طرز عمل استحصال ہی کی ایک نوعیت ہے۔ مشترک خاندانوں میں بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ غیر محنت پسند اراکین محنت پسندوں کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ کام تو کر سکتے ہیں لیکن کام کرنا اس لئے نہیں پسند کرتے کہ ان کی ضروریات بہ آرام پوری ہو جاتی ہیں

(۶) نادانوں کا استحصال ہوشیاروں کے ذریعہ۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ نادان اور غیر تعلیم یافتہ افراد ہوشیار اور تعلیم یافتہ افراد کے پنجے میں بہ آسانی آسکتے ہیں۔ ہندوستانی کسانوں کو محض اپنی جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے بیسیوں جگہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ دیہات میں پٹیل پٹواری اور ساہوکار۔ منڈی میں دلال اور دفاتر میں منشی۔ محرر اور وکیل ان سے استحصال کرتے ہیں۔ کسان انتہائی محنت سے غلہ پیدا کرتے لیکن جہالت اور لاعلمی کی بنا پر حقیقی معاوضے سے محروم رہتے ہیں۔ زندگی کے کسی شعبہ کو لیجئے ہر جگہ ہوشیار اور چالاک افراد نادان اور سیدھے سادے افراد سے استحصال کرتے ہوئے دکھائی دیں گے

(۷) غیر منظم افراد کا استحصال منظم افراد کے ذریعہ:۔ تنظیم قوت اور طاقت کا ایک نہایت اہم عنصر ہے جو جس قدر زیادہ منظم ہوگا وہ اسی آسانی کے ساتھ غیر منظم افراد پر اقتدار اور تسلط حاصل کر سکے گا۔ تسلط اور اقتدار کے ساتھ ہی استحصال کے مواقع نکل آتے ہیں۔

(۸) مریدوں کا استحصال مرشدوں کے ذریعہ:۔ مرید اپنے مرشدوں کے بہت معتقد ہوتے ہیں۔ ان کی ہر بات کو صحیح سمجھتے اور ان کا کہا ماننا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں لہذا مرشد، پادری اور برہمن اپنے عقیدت مندوں کی اس خصوصیت سے ناجائز طریق پر مالی اور دیگر قسم کا فائدہ حاصل کرتے ہیں جو استحصال ہی کی ایک قسم ہے

(۹) مفتوحین کا استحصال فاتحین کے ذریعہ:۔ جنگ اور لڑائی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ مفتوحہ جماعتوں یا اقوام سے استفادہ کیا جائے۔ ہر زمانے میں مختلف اقوام سے اس کی مثالیں ملتی ہیں کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کو روا رکھا ہے۔ فاتح اقوام کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مفتوح اقوام پر ظلم و زیادتی کو ظلم و زیادتی ہی نہیں سمجھتیں۔ چونکہ مفتوحین بے بس اور کمزور ہوتے ہیں اس لئے فاتحین کو ہر طرح کی آزادی اور استحصال کا موقع حاصل رہتا ہے۔

(۱۰) محکوموں سے استحصال حاکموں کے ذریعہ:۔ قوت و اقتدار کے ذریعہ ہر جائز چیز بھی روا رکھی جاتی ہے۔ محکوم اپنے حاکم کا حکم ماننے پر مجبور ہوتا ہے اور اس طرح حاکمین کے لئے ظلم و زیادتی۔ حق تلفی اور استحصال کے کافی مواقع نکل آتے ہیں۔

استحصال کے قوانین | طبیعت یا فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے استحصال کی طرف زیادہ یا کم رجحان ہوتا ہے۔ مثلاً (الف) جو افراد طبعاً سست، کاہل اور تن آسان ہوتے ہیں ان میں استحصال کرنے کا مادہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف استحصال کا مادہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ وہ استحصال کرنے میں نہایت مستقل مزاج ہوتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ (ب) اسی طرح جن افراد میں ہمدردی اور ایثار کا مادہ زیادہ ہوتا ہے وہ یا تو استحصال سے قطعی پرہیز کریں گے یا بہت کم اس کی طرف مائل ہوں گے (ج) جو افراد جس قدر زیادہ خود غرض ہونگے وہ استحصال کی طرف اسی قدر زیادہ مائل ہوں گے۔ (د) جن افراد میں ظلم و زیادتی کرنے کی بجائے ظلم و زیادتی سہنے کا مادہ جس قدر زیادہ ہوگا اسی لحاظ سے وہ دوسروں کے ذریعہ استحصال روا رکھیں گے۔

(۲) شعورِ ہم جنسیت استحصال کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ہے شعورِ ہم جنسیت سے مراد وہ احساس ہے جس کی بنا پر ہم دوسرے افراد کو اپنا ہم رتبہ اور ہم جنس سمجھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کے ساتھ ایک طرح کی ہمدردی بھی رکھتے ہیں۔ جن افراد میں شعورِ ہم جنسیت پایا جاتا ہے وہ ایک دوسرے سے مقابلتاً محدود پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن افراد میں شعورِ ہم جنسیت نہیں پایا جاتا وہ ایک دوسرے سے وسیع پیمانے پر استحصال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ہم جنس افراد کے مابین غیر ہم جنس افراد کے مقابل محدود پیمانے پر استحصال ہوتا ہے۔

(۳) استحصال کی بدولت ہم جنس اور ہم شعور جماعتوں اور گروہوں کی جدا جدا تشکیل عمل میں آتی ہے جن جماعتوں یا گروہوں کے مفادات ایک ہوتے ہیں وہ آپس میں متفق اور متحد ہو جاتے ہیں تاکہ دوسری جماعتوں یا گروہوں سے استحصال کریں یا انہیں اپنا استحصال کرنے سے روکیں۔ آجروں یا مزدوروں کی انجمنوں کا قیام استحصال یا استحصال سے بچنے کی خاطر عمل میں آتا ہے مزدور جب دیکھتے ہیں کہ آجران سے استحصال کر رہے ہیں تو وہ اپنی انجمن قائم کر لیتے ہیں تاکہ مدافعت کی جا سکے جب آجر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اتحاد کی وجہ سے مزدوروں کی قوت بڑھ گئی ہے تو وہ بھی اپنے استحکام کی خاطر علیحدہ علیحدہ انجمن قائم کرتے ہیں تاکہ متفقہ طور پر مزدوروں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

(۴) استحصال اور قوت استحصال لازم و ملزوم ہیں یعنی یہ کہ جب تک کسی فرد، جماعت یا قوم میں استحصال کی قوت باقی رہتی ہے اس وقت تک استحصال کو برابر روا رکھا جاتا ہے لیکن جب یہ قوت زائل ہو جاتی ہے تو وہ استحصال سے دست بردار ہونے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب قوتِ اقتدار جاتا رہتا ہے تو انسان ظلم و زیادتی کو چھوڑ کر عجز و انکساری اور محبت و ملنساری کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ استحصال کے لئے استحصال کے موقعوں کا ہونا ضروری ہے۔ جب مواقع حاصل ہوں تو استحصال کنندگان اپنے فعل سے کبھی نہیں چوکتے۔ جن افراد یا جماعتوں کا وہ استحصال کرتے ہیں انکی زبوں حالی، آفت اور مصیبت سے پورے طور پر واقف ہوتے ہیں بظاہر ہمدردی بھی جتلاتے ہیں لیکن اس کے باوجود استحصال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

(۵) بیرونی تسلط اندرونی اور مقامی استحصال کے منافی ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی ملک پر دوسری قوم کا قبضہ اور تسلط ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے اندرونی اور مقامی استحصال کرنے

والے اداروں کے مواقع مارے جاتے ہیں. بیرونی قوت اندرونی اور مقامی استحصال کرنے والی مختلف اکائیوں کو یا تو ختم کر دیتی ہے یا کلیتہً اپنے زیر اقتدار لے لیتی ہے۔

(۶) استحصال کی راہ میں جو افراد یا جماعتیں رکاوٹ ڈالتی ہیں اگر انہیں بھی اپنا شریک کار بنا لیا جائے تو پھر استحصال علیٰ حالہٖ جاری رہ سکتا ہے. فرض کیجئے ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کر رہی ہے. اب اگر تیسری قوم مداخلت کرے اور اول الذکر کو استحصال سے روکنے کی کوشش کرے تو اس کا بہترین حل یہی ہوتا ہے کہ مخل ہونے والی قوم کو بھی شریک استحصال بنا لیا جائے۔ خاندانی زندگی سے قومی زندگی تک مختلف اداروں کے مابین اس قانون کا عمل درآمد عام نظر آئے گا۔

(۷) بیّن استحصال (Open Exploitation) کے مقابل مخفی استحصال Masked Exploitation زیادہ دیرپا اور خطرناک ہوتا ہے مخفی استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جس کے حقیقی مضر اثرات پورے طور پر واضح نہ ہوں۔ یہ استحصال بظاہر شدید نہیں معلوم ہوتا لیکن اس کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں مکر و فریب کو زیادہ دخل ہوتا ہے. برعکس اس کے بیّن استحصال سے مراد ایسا استحصال ہے جو علانیہ طور پر کیا جائے اور جس کے اثرات پورے طور پر واضح ہوں مثلاً بچہ سقہ کا چند روزہ راج بیّن استحصال پر مبنی تھا۔ نادرشاہ کی لوٹ اور غارت گری بھی بیّن استحصال ہی پر مبنی تھی. برعکس اس کے منچوریا سے جاپانیوں کا ناجائز استفادہ مخفی استحصال پر مبنی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر محکوم قوموں کی حقیقی صنعتی اور تجارتی ترقی کو روکنا اور مختلف معاہدات کے ذریعہ اپنی مصنوعات اور دیگر قسم کی پیداواروں کے لئے وہاں پر وسیع بازارات فراہم کرنا یا اپنے ممالک کے باشندوں کو قابل لحاظ تعداد میں غیر ضروری طور پر محض ان کی پرورش کی خاطر محکوم ممالک میں ملازم رکھنا. یا محکوم ممالک کے باشندوں کو عام اور فنی و حرفتی تعلیم سے محض اس وجہ سے محروم رکھنا کہ جاہل اور ان پڑھ محکومین سے بہت آسانی کے ساتھ استحصال کیا جا سکتا ہے ، مخفی استحصال کی مثالیں ہیں۔ کیونکہ اس تمام جد و جہد کا مقصد محکوم قوم سے مخفی طریق پر استحصال کرنا ہوتا ہے۔ استحصال کے یہ طریقے اس لئے زیادہ دیرپا ہوتے ہیں کہ ان کے مضر اثرات سے عوام پورے طور پر واقف نہیں ہوتے۔ ان طریقوں سے بیّن استحصال کے مقابل زیادہ استحصال ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود استحصال

کی شدت ظاہر نہیں ہونے پاتی۔ مخفی استحصال کے لئے انگریزی میں ماسکڈ کیپلائٹیشن کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ نہایت ہی موزوں اور مناسب ہیں۔

(۸) معاشرتی حالات جوں جوں پیچ در پیچ ہوتے جائیں گے اور جوں جوں ہماری زندگی کا انحصار ایک دوسرے پر بڑھتا جائے گا تو مخفی استحصال کے مواقع زیادہ نکلتے جائیں گے۔ مثلاً ابتداً باہمی جھگڑوں اور مناقشا کے تصفیوں کے لئے پنچایت کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اور اس میں استحصال کے زیادہ مواقع نہ تھے لیکن جب عدالتیں قائم ہوئیں بڑے بڑے عملے کام کرنے لگے۔ منشی محرر، وکیل اور بیرسٹر نمودار ہوئے اور معمولی سے جھگڑے کا فیصلہ مدتوں میں ہونے لگا تو ساتھ ہی ساتھ استحصال کے موقعوں میں بھی بہت زیادتی ہو گئی۔ غرض مندوں کی شدتِ احتیاج سے فائدہ اٹھانے، رشوت لینے اور طرح طرح کے ناجائز مراعات حاصل کرنے کے لئے بیسیوں مواقع نکل آئے۔ اگر طرز معاشرت سیدھا سادا ہوتا تو یہ سب مواقع دستیاب نہ ہوتے۔ ایک وہ زمانہ گذرا ہے جبکہ لوگ اپنی غذا آپ تیار کر لیتے تھے لیکن تقسیم عمل کی وجہ سے جب ہوٹلوں کا طریقہ مروج ہوا اور ان کی کثرت ہوئی تو پست تاجرانہ ذہنیت رکھنے والے مالکان ہوٹل کے لئے استحصال کے مواقع نکل آئے خالص گھی کے بجائے چربی استعمال کرنا۔ تازہ گوشت کی بجائے باسی گوشت استعمال کرنا۔ زعفران کی بجائے رنگ دینا۔ باسی اور بدبو دار سالنوں کو دوبارہ گرم کر کے مرچ مسالے دینا اور پھر تازہ سالنوں کی طرح فروخت کرنا۔ چائے میں افیون کا خفیف جزو شامل کرنا تاکہ گاہک مخصوص چائے کے عادی ہو جائیں اور صرف انھیں کے چائے خانے میں آئیں تاکہ ان کے لئے زیادہ منافع کمانے کے مواقع مہیا ہو سکیں؛ یہ سب باتیں اسی لئے ممکن ہوئیں کہ ہماری اجتماعی زندگی زیادہ پیچ در پیچ ہو چکی ہے اور ہوتی جا رہی ہے۔ تقسیم عمل کے طریق کو ہماری معاشرت میں زیادہ سے زیادہ دخل ہوتا جا رہا ہے اور اب وہ ہماری معاشرت کا ناگزیر عنصر بن گیا ہے موجودہ زمانے میں اس طریق کے وسیع ترین استعمال کی بدولت ہماری معاشرت خاندانی۔ قبیلہ واری اور قومی مدارج سے گذرتے ہوئے بین الاقوامی رتبہ حاصل کر چکی ہے اب نہ صرف ایک فرد دوسرے فرد کا۔ ایک خاندان دوسرے خاندان کا۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کا یا ایک فرقہ وطبقہ دوسرے فرقے وطبقے کا

محتاج نظر آتا ہے بلکہ ایک قوم دوسری قوم کی اسی طرح محتاج ہے جس طرح معاشرہ کا ایک رکن دوسرے رکن کی امداد کا محتاج ہوتا ہے تقسیم عمل کی درجہ بدرجہ ترقی کے ساتھ ساتھ استحصال کے دائرے بھی وسیع تر ہوتے گئے حتیٰ کہ شخصی استحصال خاندانی استحصال میں۔ خاندانی استحصال قبیلہ واری استحصال میں اور قبیلہ واری استحصال قومی استحصال میں تبدیل ہو چکا ہے۔ موجودہ جنگ محض استحصال کی جنگ ہے۔ ایک قوم دوسری قوم سے استحصال کرنا چاہتی ہے لیکن دوسری قوم دفاعی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ نتیجہ جنگ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری عام نظر آتی ہے استحصال کے یہ تمام مواقع معاشرتی زندگی کی پیچ در پیچ صورت حال کا نتیجہ ہیں۔ بالخصوص مخفی استحصال کو موجودہ نظام معاشرت سے بہت تقویت پہونچی ہے۔

(۱۰) استحصال کو کلیتہً مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بہت تخریبی جذبہ ہے اور اس کی بدولت بحیثیت مجموعی عام خوش حالی متاثر ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر ہم قطعی معنی میں اس کی بیخ کنی کرنا چاہیں تو بہ حالات حاضرہ یہ چیز ناممکن ہے۔ کیونکہ جب تک انسان میں ذاتی مفاد، خود غرضی، جلب منفعت اور مشیخت کے جذبات موجود ہیں یا جس وقت تک بڑائی اور چھوٹائی، امیری اور غریبی۔ قوی اور کمزور۔ زبردست اور زیردست، فاتح اور مفتوح اور حاکم و محکوم کے مدارج اور مراتب موجود ہیں اس وقت تک استحصال بھی باقی رہے گا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف تدابیر کے ذریعہ ہم استحصال کے حدود کو کم سے کم کر سکتے ہیں۔

قوتوں کا توازن استحصال کا بہترین سدِ باب ہے۔ اگر ہم استحصال کو زیادہ سے زیادہ محدود کرنا چاہیں تو ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی قوتوں کو متوازن کرنے کی کوشش کریں اور یہی استحصال کا موزوں ترین حل ہے۔ یہ سوال کہ مختلف قوتوں میں کیونکر توازن قائم کیا جا سکتا اور اس کے بعد کس طرح استحصال میں کمی ہو سکتی ہے نہایت وسیع ہے لہذا ہم استحصال کی ماہیت، اس کی مختلف قسموں، طریقوں اور قوانین کے تذکرے پر اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

محمد ناصر علی ایم۔اے (عثمانیہ)

ربط کے نصب العین کا ارتقا

تعلیم اخلاق نشوونما کے ساتھ ساتھ ایک خالص سماجی عمل بھی ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر نئی تعلیم کا سب سے پہلا پیغمبر بھی وہی شخص ہو جو ایک گمراہ سماج اور بھکی ہوئی سیاست کو راستہ دکھانے اور سنوارنے کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو میں زمانے کے رخساروں سے کچھ حجاب اٹھاتا ہوں لیجئے میں آپ کو آج سے ایک سو تیئیس سال پہلے کے جنیوا میں لے آیا۔ یہاں ایک گھڑی ساز رہتا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے۔ اس کا نام ژان ژاک روسو ہے۔ دونوں باپ بیٹے رات بھر کتابیں پڑھنے میں گذار دیتے ہیں روسو آوارہ فطرت واقع ہوا ہے۔ اسے جنگل کی تفریح اور پا پیادہ سفر کرنے کا عشق ہے روسو پیٹ پالنے کے لئے ایک سرکاری وکیل کا محرر بنتا ہے۔ پیرس میں موسیقی کی تحریریں بیچتا ہے وینس کے فرانسیسی سفیر کا سکرٹری بنتا ہے اور پھر ادیب بن جاتا ہے اور ایسا ادیب جس نے ایک پوری قوم اور اس کے ذریعے ایک پورے نظام تمدن و سیاست کا نوشتۂ عمل بدل دیا روسو خود چوری کر کے ایک بے قصور لڑکی کو مجرم ثابت کر سکتا ہے وہ اپنا مذہب بدل کر ایک مالدار عورت سے صرف ضرورتاً عشق بھی کر سکتا ہے اور خود اپنے بچوں کو اپنی زندگی میں یتیم خانہ بھیج سکتا ہے لیکن یہی شخص، اور یہی روسو ایک وقت سماج اور سیاست کو دعوت انقلاب دینے کے لئے ایک ہاتھ میں "معاہدۂ عمرانی" کے نام سے ایک نئی توریت اور دوسرے ہاتھ میں "ایمیل" کے عنوان سے ایک نئی تعلیمی انجیل لئے ہوئے زمانے کے سامنے آتا ہے۔ اس کی توریت کا پہلا جملہ ہے "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے" اور اس کی انجیل کی پہلی آیت کچھ یوں ہے "ہر چیز جو صانع قدرت کے ہاتھ سے آتی ہے اچھی ہوتی ہے لیکن ہر وہ چیز جو انسان کے ہاتھ میں پڑتی ہے خراب ہو جاتی ہے۔"

اب تک کوئی پیغمبر اپنے ساتھ بیک وقت دو الہامی کتابیں لے کر نہیں آیا تھا۔ کچھ یونہی سمجھ لیجئے کہ لوگ روسو کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس کی ایمیل کو آگ میں جھونکا اور اسے خود گرفتاری سے بچنے کیلئے

فرانس سے سوئستان بھاگنا پڑا لیکن ایمیل سوئستان میں بھی "معاہدۂ عمرانی" کے ساتھ ساتھ ممنوع قرار دیدی گئی لیکن روح کی پکار نہ قانون دبا سکتا ہے اور نہ اس کا صحیفہ آگ میں جل کر فنا ہو سکتا ہے۔ ایمیل کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا لیکن ایمیل آج ہمارے پاس ہے۔ بالکل وہی جو روسو نے لکھی تھی۔

ایمیل ایک بچہ ہے روسو نے اسی عنوان سے بچپن سے لے کر بیس سال کی عمر تک اس کی تعلیم و تربیت کا حال ایک کہانی کی شکل میں لکھا ہے۔ فی الحقیقت ایمیل بچوں کا قرآن ہے روسو سے پہلے بچے کو ایک چھوٹا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اسی لئے اس پر ہر وہ بات جبر کی جاتی تھی جو بڑوں کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتی تھی۔ روسو نے سب سے پہلے بچہ کی انفرادیت کو تسلیم کر کے اس کی زندگی، اس کی دلچسپیوں اور اس کے رجحانات پر زور دیا بالفاظ دیگر تعلیم کا خارجی اور مصنوعی عمل روسو کے ہاتھوں زندگی کا فعل اور فطرت کا عمل بنا۔ روسو نے سب سے پہلے اس بات پر زور دیا کہ تعلیم فطری قوتوں کی ترقی کا نام ہے نہ کہ علم و فن کے حصول کا۔ روسو نے (۱) انسان (۲) اشیا (۳) فطرت — ان تین چیزوں کو تعلیم کا سرچشمہ مانا ہے فطرت سے منشا انسانی قویٰ کا اندرونی نشوونما، جبلتیں، صلاحیتیں اور رجحانات مراد ہیں اشیا حواس کے ذریعہ اس نشوونما میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں اور انسان، انسان کو زندگی کے تجربے سکھانے کا آلہ ہے۔

روسو تعلیم میں تصنع کا کس حد تک مخالف ہے اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ بچوں کے ہاتھ میں چاندی سونے کے جھنجھنے دیکھنے کے بجائے وہ کسی پیڑ کی ایسی شاخ دیکھنا چاہتا ہے جس میں گھنگروؤں کے بجائے سوکھے ہوئے بیج بجتے ہوں۔ روسو کے قول کے مطابق پانچ سے بارہ سال تک کی عمر کا زمانہ زندگی کا سب سے نازک زمانہ ہے اس زمانہ میں حواس کی تعلیم سب سے زیادہ ضروری ہے، "جو کچھ انسان کے ذہن میں داخل ہوتا ہے وہ حواس کے ذریعہ داخل ہوتا ہے۔ عقل و خرد کا پہلا روپ حواس کا روپ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے جن استادوں سے فلسفہ کا سبق ملتا ہے وہ ہمارے پاؤں ہیں۔ ہمارے ہاتھ ہیں اور ہماری آنکھیں ہیں" اس سے آگے کی منزل میں روسو ایک حرفے کی تعلیم بھی تجویز کرتا ہے۔

کہا جا سکتا ہے کہ روسو کا عام اصول بذریعہ تجربہ ہے "کوئی بات بچے کو اس لئے نہ جاننے دو کہ تم نے اسے بتائی ہے، بلکہ اس لئے کہ اس نے اسے خود سمجھا ہے۔ اسے سائنس سکھانا نہیں ہے۔ اسے

سائنس تحقیق کرنا ہے ..... میں کتابوں سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ وہ ہمیں ایسی چیزوں کے متعلق بات چیت کرنا سکھا دیتی ہیں جن سے فی الحقیقت ہم واقف نہیں ہیں۔"

روسو ذہن و حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ جسم سے بھی غافل نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جسمانی کمزوری تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ "بچہ جتنا کمزور ہوگا اسی قدر دوسروں پر حکومت کا خواہشمند ہوگا اور جتنا مضبوط ہوگا اسی قدر فرمانبردار ہوگا۔ تمام نفسانی خواہشات کمزور جسم کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور تمام خرابیاں کمزوری کے باعث وجود میں آتی ہیں۔" روسو نے جسمانی تربیت کے لئے ورزشیں تجویز کی ہیں۔ لیکن یہ ورزشیں عموماً وہی ہیں جو کبھی اہل اسپارٹا نے وضع کی تھیں اور جنھیں فلاطون نے بھی اپنی ریاست کے فلسفیوں کے لئے قابل قبول سمجھا تھا۔

ایمیل سے جو مختصر اور ضروری خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہو جانا چاہئے کہ روسو بچوں والوں پر بچوں کو اور الفاظ پر عمل کو قابل ترجیح سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ذہن کے ساتھ ساتھ حواس اور جسم کی تربیت بھی اتنی ہی اہم تھی۔ یہ ضرور ہے کہ روسو نے کوئی طریقہ ایسا تجویز نہیں کیا جس سے ایک ہی چیز ذہن، حواس اور جسم تینوں کی ہم آہنگ تربیت اور نشوونما کا ذریعہ بن سکے۔ اس نے حرفے کی تعلیم بھی تجویز کی ہے لیکن حرفے سے کوئی تعلیمی فائدہ اٹھانا اس کا مقصد نہیں تھا۔ اس نے ایمیل کو حرفہ اس لئے سکھایا تھا کہ وہ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ذلیل نہ سمجھے۔ لیکن باوجود اس کے اس کی پیغمبرانہ اور مجتہدانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اس نے فضا میں ایک آواز پیدا کی اور اس کی بدولت ہم نے۔

جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے!

ابھی میں نے عرض کیا کہ روسو کا سب سے بڑا کام یہی تھا کہ اس نے فضا میں ایک آواز تو پیدا کی۔ اب اگر آواز میں خلوص و صداقت ہے تو اس آواز کو نئی قوتیں دے کر اسے پھیلانے والے بھی پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ گو خود روسو کے وطن میں روسو کی آواز نہ سنے جانے کے برابر سنی گئی اور انگلستان میں بھی عقیدتمندوں کی کثرت کے باوجود کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو سکا لیکن جرمنی میں روسو کے نئے تعلیمی اصولوں کو جامہ پہنانے کی کوشش ضرور کی گئی۔ بیڈو نے (۱۷۲۳ء تا ۱۷۹۰ء) جہاں روسو سے متاثر ہو کر صحیح مذہب اور

صحیح اخلاق کے لئے جہاد کیا وہاں اس نے تعلیمی اصلاح کو بھی اپنا فرض سمجھا۔ بیسیڈو نے نہ صرف تعلیمی معاملات میں اختیار رکھنے والے لوگوں اور ماں باپوں کے لئے بچوں کی تعلیم سے متعلق پوری چار جلدیں لکھ ڈالیں، بلکہ اس نے تعلیم بذریعہ عمل کے اصول پر بچوں کو مادری زبان اور لاطینی پڑھا کر تجربہ بھی کیا اور پہلی مرتبہ ثابت کیا کہ اس طریقہ سے بچے کم وقت میں اور بغیر گرانی محسوس کئے ضروری تعلیم حاصل کر لیتے ہیں۔ بیسڈو نے سب سے پہلے اپنے ساتھیوں کی مدد سے بچوں کا ادب پیدا کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر روسو نے اصول کی بنیاد ڈالی تھی تو بیسڈو نے اسی اصول کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ بیسڈو کی کوشش کہاں تک کامیاب تھی اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ ۱۸۰۰ء میں جرمنی میں ایک مدرسہ فلن تھروپی نم کے نام سے کھلا اور اس کی مثال میں اور بہت سے مدرسے بھی کھلے۔ ان تمام مدرسوں کا نصب العین اصلاحی تھا۔ ان مدرسوں میں بچوں کو بچہ ہی سمجھا جاتا تھا۔ زبان کی تعلیم قواعد کے ذریعہ سے نہیں بلکہ بول چال کے طور پر دی جاتی تھی، ساتھ ہی ساتھ جسمانی تربیت کی اہمیت بھی تسلیم کی جاتی تھی۔ ابتدائی تعلیم میں جسمانی فعالی کے ساتھ تال سُر کا خیال بھی رکھا جاتا تھا۔ حرفہ بھی تعلیمی اور سماجی اغراض کی بنا پر ہر ایک تعلیم تھا۔ تصویروں اور چیزوں کے ذریعے اسباق پر زور دیا جاتا تھا اور مدرسہ اور مدرسہ کی چار دیواری سے باہر کی زندگی میں ربط اور تطبیق کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔

لیکن یہ سب کچھ ایک بڑی تصویر کا پہلا خاکہ ہی تھا۔ ابھی رنگ کاری سے پہلے اصلی خطوط ہی کو زیادہ نمایاں اور روشن کرنے کی ضرورت تھی یہ کام سوئٹزرلینڈ کے ایک مصلح پستالوزی (۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۷ء) کے ہاتھوں ہونا تھا۔ پستالوزی کی ساری اہمیت یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری عمر اور اپنی ساری قوتیں تعلیم کے تجربے پر صرف کیں۔ اس نے بننا تو چاہا تھا پادری، وکیل، کسان اور نہ جانے کیا کیا لیکن قدرت کو اسے مدرس بنانا مقصود تھا۔ اس نے خود اپنے بچے کا مطالعہ کیا اور اس پر تعلیمی تجربے کئے۔ اس کے بعد غریبوں اور مفلسوں کے بچوں کے لئے ایک صنعتی مدرسہ چلایا۔ اس مدرسہ میں زراعت اور کاتنے بننے کی قسم کے کام سکھائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی جاری رہتا تھا لیکن اس مدرسے میں دستکاری ذریعہ تعلیم نہ تھی اگر ایسا ہوتا تو ہمارا مقصد پستالوزی کے ہاتھوں ہی پورا ہو جاتا۔ اس کمی کو چھوڑ کر پستالوزی ہمارے نئے

نصب العین سے سب سے زیادہ قریب ہے آتا ہے۔ یہی نہیں کہ اس نے تعلیم کو سماج کی اصلاح کا آلہ سمجھا ہو اور مدرسہ کو بچے کے لئے دوسرا گھر بنانے کی کوشش کی ہو بلکہ اس نے مشاہدہ کو تدریس کی بنیاد بنا دیا اور اشیا کے ذریعہ تعلیم عام کر دی اس طرح اس نے ذہن اور حواس کی ہم آہنگ تربیت کا پورا پورا التزام کر دیا۔

حواس اور ذہن کی نشو ونما میں جسم برابر کا حصہ دار فروبل (۱۷۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کے ہاتھوں بنا فروبل نے سب سے پہلے ذہن اور حواس کی تربیت کے ساتھ ساتھ بچوں کی زندگی عضلاتی یا جسمانی فعالی کو بھی جگہ دی اور اسی چیز کو حواس کی نشو ونما اور ذہنی تعلیم دونوں کا ذریعہ بنایا۔ فروبل نے نجی طور پر بچوں کو پڑھانا تو ۲۳ سال کی عمر ہی سے شروع کر دیا تھا اور اس ابتدائی تجربے کی کامیابی سے متاثر ہو کر اس نے ۴۴ سال کی عمر سے باقاعدہ تعلیمی اصلاح کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک کسان کی جھونپڑی میں پانچ بچوں کے سہارے سے ایک مدرسہ کھولا۔ اس مدرسے کا نام سنیں گے آپ؟ — بہت شاندار نام ہے —"یونیورسل جرمن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن"— کسان کی اس جھونپڑی — نہیں میں نے غلط کہا اسی "یونیورسل جرمن ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشن" میں فروبل نے اس طریقۂ تعلیم کی بنیاد ڈالی جو "بالک گھر" کے نام سے مشہور ہے۔ فروبل کے نزدیک تعلیم کا پورا عمل بچوں کی ذہنی نشو ونما اور ان کی شخصیت کے آزادانہ اظہار کا عمل ہے وہ ہر بچہ کو ایک دیوتا کی حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق "اپنی دنیا بنائے اور دیکھے کہ وہ ٹھیک ہے" وہ ہر بچہ کو صحیح معنی میں ایک خالق کا درجہ دینا چاہتا ہے اور اس کی قسمت کو اسی کے افعال و اعمال سے معنون کرنا چاہتا ہے۔ اس مدعا کو ذہن میں لے ہوئے فروبل نے اُن کی رنگین گیندوں، لکڑی کے استوانوں، مکعبوں، گولوں اور دوسری شکلوں کے ٹکڑوں سے بچوں کے لئے کچھ شغلے تجویز کئے ہیں یہ شغلے تدریج آسان سے مشکل ہوتے جاتے ہیں اور بچے اپنی خود فعالی ہی میں اپنے ذہن کے نشو ونما کے ذریعے ڈھونڈتے ہیں اور انھیں وہ ذریعے مل بھی جاتے ہیں کیونکہ ان کی زندگی کا اصول جمود نہیں حرکت ہے۔ بچہ کو اگر آپ کچھ سکھانا چاہتے ہیں تو اسے خوش رکھنا ضروری ہے اور خوش رکھنا کیا معنی رکھتا ہے یہ مسٹر بے اے جیکین کے الفاظ میں سمجھئے۔ ان کے الفاظ اس قدر خوبصورت ہیں کہ میں ترجمہ کر کے آپ کو ان کے صحیح لطف سے محروم

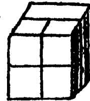
کرنا نہیں چاہتا۔ وہ پہلے خود پوچھتے ہیں :-

What is happiness for the child ?

اور پھر خود جواب دیتے ہیں :-

It is the free functioning of all faculties. It is action. It is expression. It is finding one's self. It is coming into one's own. It is the flight of the arrow winging its way to the mark.

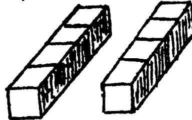
نزول کے بچے کو وہ خوشی پوری طرح حاصل ہے جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے۔ وہ کسی وقت لکڑی کے یہ آٹھ ٹکڑے



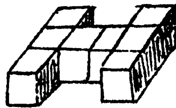
لے کر بیٹھتا ہے اور ایک معصوم فرشتہ کی طرح دیکھنا چاہتا ہے کہ ان سے کچھ بن بھی سکتا ہے یا نہیں۔ وہ لکڑی کے ٹکڑوں کو مختلف صورتوں میں لگا کر رکھتا ہے۔ اس نے آٹھوں ٹکڑے پہلے ایک قطار میں لگائے۔



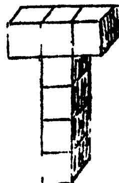
لیکن یہ چیز کچھ اسے جچی نہیں۔ اس نے پھر ترتیب بدلی۔ اس نے چار چار ٹکڑوں کی دو قطاریں بنائیں۔



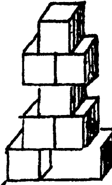
یہ کچھ بہتر صورت معلوم ہوئی۔ اس نے اور سوچا۔ اس مرتبہ اس نے تین تین ٹکڑوں کی دو قطاریں بنا کر باقی کے دو ٹکڑے ان کے بیچ میں رکھ دئے



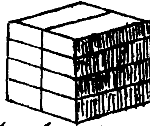
ذہن ہنوز مصروف ہے، نگاہیں ہنوز نئے خاکے کی متلاشی ہیں اور ہاتھ ہنوز مضطرب ہیں۔ اس نے اس دفعہ تین ٹکڑے ایک قطار میں رکھے اور چار اس کے نیچے لگا دئے۔



لیکن اس مرتبہ ایک ٹکڑا بچ رہا یہ اس کا کیا کرے؟ قوت تخلیق نے پھر ایک نئی شکل اختیار کی۔



یہ شکل نئی تو ہے اور اس کے بنانے والے کو پسند بھی آئی لیکن یہ چیز آخر ہوئی کیا؟ اس الجھن سے وہ پریشان سا ہوگیا۔ اس نے ذرا لکڑی کے



یہ ٹکڑے لے اور ذہن کو واقعاً دو ایک پیچ ذرا زور کے دے ڈالے۔ ایک خاکہ بنایا بگاڑ دیا، دوسرا بنایا اور بگاڑ دیا۔ بالآخر ایک اور نئی چیز بن ہی گئی۔ اور یہیں اس کی جنت مکمل ہوگئی —— یہ ایک بادشاہ کے بیٹھنے کا تخت ہے۔ اب یا تو وہ اس بادشاہ کی کہانی اپنے ذہن سے نکالے گا، یا کسی سے سنے گا وہ خود بادشاہ بنے گا، خود تلوار ہاتھ میں لیکر جنگ کرے گا۔ خود شکست کا خوف اور فتح کا غرور محسوس کرے گا۔ امیری اور غریبی ظلم اور انصاف، بھلائی اور برائی کے سارے خاکے اسے اسی تصویر میں نظر آئیں گے۔ پھر کسی فرصت میں وہ کاغذ سے اس بادشاہ کے کپڑے بنائے گا اور مٹی سے اس کے کھانے پینے کے برتن بنائے گا۔ الغرض جب تک وہ اس بادشاہ کی زندگی اپنی زندگی نہیں بنالے گا اس وقت اسے چین نہیں آسکتا۔

بعض لوگ کہیں گے کہ واہ صاحب! بس بچوں کو انھیں چونچلوں میں بہلائے رکھیئے اور پڑھنا لکھنا خاک بھی نہیں لیکن ذرا ٹھہرئیے۔ کیا اس کے آٹھ لکڑی کے ٹکڑوں کا حساب چار اور چار آٹھ، تین اور تین چھ اور دو آٹھ اس کے لئے حساب کا پہلا سبق نہیں ہے؟ وہ بادشاہ کی کہانی سن کر اسے اپنے دوستوں کو سنانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیا یہ کہانی اس کے لئے زبان کا پہلا سبق نہیں ہوسکتی؟ وہ مٹی کے برتن بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ اور کیا ہے اگر سائنس کی بنیاد نہیں؟ —— ہاں یہ ضرور ہے کہ بچہ یہاں اپنی اپج کا بادشاہ ہے وہ آپ کے احکام کا غلام نہیں۔ وہ ابھی سے اپنا ذہن اور اپنے ہاتھ پاؤں کا استعمال کرنا سیکھتا

ہے اور جس وقت وہ مصروف ہوتا ہے اس وقت اس کا پورا وجدان — جسم، حواس اور ذہن سب ہی مصروف ہوتے ہیں اور "مکمل انسان" اسی طرح پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح پیدا کیا جاتا ہے۔

ہاں آپ یہ کہہ سکتے کہ یہاں بچے کے مشاغل اور مصروفیتیں صرف اشارتی (Symbolic) حیثیت رکھتی ہیں۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیں کہ جو بچہ اُون کی گیندوں، ریشم کے فیتوں اور پالش کیے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے اپنی دنیا بنا سکتا ہے وہ اینٹ پتھر اور بغیر صاف کی ہوئی لکڑی سے بھی کوئی عالم پیدا کر سکے گا۔ ہم یہ کیونکر سمجھ لیں کہ جو بچہ ایک صاف ستھرے کمرے میں اُجلے کپڑے پہنے لکڑی کے رنگین شلشوں کو ترتیب دے کر کوئی ڈیزائن بنا سکتا ہے وہ دنیا میں — گرد و غبار اور جھیتھڑوں کی دنیا میں بھی — اپنا اور دوسروں کا مقام پہچان سکے گا۔ یہ خواب کی دنیا ہے، یہ تصورات کا عالم ہے اور اس لئے کیوں نہ ہم بچوں کے مشغلوں اور ان کی مصروفیتوں کو دنیا، سماج اور زندگی سے براہ راست وابستہ کردیں۔ بچے کٹے کٹائے پالش کئے ہوئے لکڑی کے ٹکڑوں سے ایک ذہنی مکان کیوں بنائیں۔ وہ سچ مچ اینٹ، مٹی اور لکڑی سے چھوٹا ہی سا سہی لیکن اصلی مکان کیوں نہ بنائیں۔ زندگی میں بے شمار خدا کے بندوں کو اینٹیں اٹھانی پڑتی ہیں اس لیے ہمارے بچے بھی اینٹیں اٹھانے میں کیوں تکلف محسوس کریں۔ دنیا میں لاتعداد انسانوں کو مٹی میں ہاتھ پاؤں ڈالنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کیا ہوا اگر ہمارے بچوں کے ہاتھ پاؤں بھی گارے میں بھر جائیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ لکڑی کاٹ کر اسے صاف کرتے ہیں اس لیے کوئی حرج نہیں اگر ہمارے بچے بھی یہ کام کریں۔ انھیں مدرسے سے نکل کر بہرحال دنیا میں جانا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس بزم کبر و ناز میں کس کو کہاں جگہ ملے گی۔ اس لئے بچوں کے کردار کی ایسی داغ بیل کیوں نہ ڈالیں جو انھیں ہر مرکز پر کامیاب انسان بنا سکے۔

"بالک گھر" پر کچھ یہی تنقید ہمارے زمانے کے سب سے بڑے ماہر تعلیم جان ڈیوی کی بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کو شکر چڑھی ہوئی کونین کی گولی کھلانے سے بہتر یہ ہے کہ اسے کونین کی سادہ گولی دیجائے تاکہ کھانے والے کو معلوم تو ہو کہ کونین کا ذائقہ بالآخر ہوتا کیا ہے۔ اسی لئے تعلیم کے سلسلے میں ڈیوی ان شغلوں کو ترجیح دیتے ہیں جو تمدنی زندگی کے بڑے بڑے شعبوں اور پیشوں کی نمائندگی کرتے ہوں۔ تمدن کی بنیادیں اس وقت سے پڑی ہیں جب وقت سے انسان نے آگ جلانا، گھر بنانا، کاشت کرنا، کپڑا بننا وغیرہ شروع کیا

ہے۔اس لئے مدرسے میں اسی قسم کے مشغلوں کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہئے۔اس طرح ہر اُس بچے کے لئے جو اس راہ پر کام کرے گا جگ بیتی آپ بیتی بن جائے گی۔پھر تاریخ بتاتی ہے کہ علم ان نتائج ہی کی منظم صورت ہے جو انسان کو عمل کے دوران میں حاصل ہوتے ہیں زراعت کو ایک مرتب و مدون علم کی صورت اختیار کئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا ہے لیکن بہ حیثیت ایک اہم ترین عملی مشغلے کے وہ ابتدائے تمدن سے جاری ہے۔ اس لئے ہمارے طلبہ بھی وہ ہی راستہ کیوں نہ اختیار کریں جس پر نسل انسانی چل چکی ہے۔

اس اصول کے ماتحت جو طریقہ تعلیم وضع کیا گیا ہے وہ منصوبے کا طریقہ تعلیم ہے۔بچے اپنی پسند سے کوئی منصوبہ منتخب کر لیتے ہیں۔وہ مدرسہ میں میلاد کرنا چاہیں یا دوکان کھولنا چاہیں یا میلہ کرنا چاہیں۔انھیں اپنی راہ میں لکھنے پڑھنے، حساب لگانے تاریخی اور جغرافیائی معلومات فراہم کرنے کی جہاں جہاں بھی ضرورت پڑتی ہے وہ بڑے شوق سے اپنے کام میں سہولت پیدا کرنے کے لئے،اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔اور کسی ضرورت کا سامنے آنا اور شوق کے ساتھ اس کا حل سوچنا ہی ذہنی تربیت اور باقی رہنے والی تعلیم کی بنیاد ہے۔علم فی الحقیقت بچوں کے لئے کبھی شوری مقصد نہیں بن سکتا ہے۔ان کے لئے علم کو انھیں کے مرغوب مشغلوں کا نتیجہ ہونا چاہئے۔

لیکن منصوبے کے طریقہ میں تین باتیں ذرا کھٹکنے والی ہیں۔اول یہ کہ سال بھر ایک منصوبہ چلانا مشکل ہوتا ہے۔اس سے ایک دشواری تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ نصاب بعض وقت صفائی کے ساتھ منصوبی مشاغل سے مربوط نہیں ہو پاتا۔یہ دشواری ہندوستانی مدرسوں کے لئے خاص دشواری ہے کیونکہ یہاں منصوبہ نصاب کے لئے ہے نصاب منصوبے کے لئے نہیں۔بلکہ ایک منصوبے کے بعد دوسرا منصوبہ اور دوسرے منصوبے کے بعد تیسرا منصوبہ منتخب کرنا ممکن ہے بچوں کی توجہ کے انتشار کا باعث ہو اور یہ اس دوسری مشکل سے ایک اور تیسری خامی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ بچہ متعدد قسم کے کام کرتے رہنے کے باوجود کسی ایک کام میں مہارت حاصل نہیں کر سکتا۔

منصوبے میں اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہندوستانی ماہرین تعلیم نے منصوبے کی حدود کو اتنا وسیع کیا کہ ایک طرف تو وہ پورے سات سال کا منصوبہ بن جائے اور دوسری طرف اس کے ذریعہ دیا ہوا

نصاب بھی زیادہ سے زیادہ پڑھایا جا سکے اور سب سے زیادہ یہ کہ طالب علم فارغ التحصیل ہونے تک کسی ایک ایسی دستکاری میں اتنی مہارت حاصل کرے جو اس کے لئے اگر ضرورت پڑے تو ذریعہ معاش بھی بن سکے اور یہ بات حاصل کی گئی ہے مختلف مشغلوں کو تعلیم کا ذریعہ بنانے کے بجائے حرفے کو تعلیم کا ذریعہ یا مرکز بنا کر لیکن دیکھنا ہے کہ کیا کوئی ایک حرفہ مکمل طور پر ذریعہ تعلیم بن سکتا ہے اور کیا ہمیں خود کسی ایک حرفے کو ذریعہ تعلیم بنانا چاہئے۔

حرفوں کی اضافی اہمیت اور ان سے ربط کا مسئلہ احرفوں کو سب سے پہلے نصاب میں داخل کرنے کا سہرا فن لینڈ کے سر ہے۔ اس کی دیکھا دیکھی سوئڈن، جرمنی، امریکہ وغیرہ ممالک نے بھی حرفے کی تعلیم کو بچوں کے مدرسوں اور استادوں کے مدرسوں دونوں میں شامل کیا لیکن حرفے سے بچوں کے جبلی رجحانات کی تسکین کے علاوہ اسے اقتصادی اور خالص تعلیمی غرض سے اختیار کرنا بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم بنانے والوں کا امتیاز ہے۔ بنیادی قومی تعلیم نے یوں تو ہر اس حرفے کی اجازت دی ہے جو تعلیمی صلاحیت رکھتا ہو اور زندگی کے زیادہ سے زیادہ دائروں کو چھو کر گذرتا ہو لیکن تین حرفے بنیادی قومی تعلیم کے نصاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی نے خود بھی تجویز کئے ہیں۔ وہ تین حرفے ہیں۔ باغبانی و زراعت، کاتنے بننے کا کام اور لکڑی گتے کا کام۔ ان حرفوں کو تجویز کرتے وقت یقیناً اس کمیٹی کے سامنے کل ہندوستان کا ماحول اور سماجی نظام تھا۔ باغبانی پہلی پانچ جماعتوں کے لئے لازمی حرفے کے طور پر نصاب میں داخل ہے اور اسے عام سائنس کے نصاب میں بھی پوری پوری جگہ دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک کی بر ہما کو چھوڑ کر چونتیس کروڑ کی آبادی کا ۹۳ فیصدی دیہات میں رہتا ہے اور اس حصہ کی اکثریت زراعت پیشہ ہے۔ ہندوستان کی کل قابل کاشت زمین ۲۲۷،۸۶۹،۹۷۲ ایکڑ ہے یعنی ایک فرد کے لئے ایک ایکڑ سے بھی کم ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اگر ہندوستان کو بھوکوں مرنے سے بچنا ہے تو اسے اپنی زمین کو زیادہ سے زیادہ احتیاط اور بہتر سے بہتر طریقوں پر جوتنے بونے کی کس قدر ضرورت ہے۔

کاتنے بننے کی اہمیت ہم ہندوستانیوں کے لئے یہ ہے کہ ہم اندازاً ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف کپڑے کی خرید کے سلسلے میں باہر بھیج دیتے ہیں۔ ایک طرف تو ہمارا یہ فعل ہے اور دوسری طرف یہ بھیانک

حقیقت ہے کہ ہماری آمدنی کا اوسط پینتالیس روپیہ سالانہ یعنی ایک آنہ گیارہ پائی یومیہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کل ہندوستانیوں کی آمدنی ہم سب پر یکساں بانٹ دی جائے تو مشکل سے چنے اور صرف چنے کھانے کو مل سکتے ہیں ـــ انھیں بھی جو کوٹھیوں میں رہتے ہیں اور موٹروں میں چڑھتے ہیں اور انھیں بھی جو جھونپڑیوں میں زندگی بسر کرتے ہیں اور پاپیادہ چلتے ہیں۔ وہ تو یوں کہیے کہ دولت کی تقسیم کے غلط ہنگاموں میں نہ ہمیں مفلسی نظر آتی ہے نہ اس کی چیخ پکار سنائی دیتی ہے یہ قومی افلاس کسی حد تک دور ہو سکتا ہے اگر ہم کم از کم وہ ساٹھ کروڑ روپیہ ہی اپنے اس مزدور اور اپنے اس غریب کے لئے روک لیں جو کام کرنا چاہتا ہے اور جسے کام نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ ہمارا وہ کسان بھی جس کا خون ہمارے تمدن کے خاکے میں رنگ و نور پیدا کرتا ہے ـــ وہ کسان بھی فاقوں سے بچنے کے لئے تکلی کا سہارا لے سکتا ہے۔ اس لیے کاتنے بننے کا کام ہماری دیہی زندگی کو بھی زیادہ خوشگوار بنا سکتا ہے اور فی الحقیقت اسی میں ہماری نجات ہے۔

ٹیگور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "دیہات عورتوں کی مانند ہیں جن کی بدولت قوم کی گود آباد رہتی ہے"

باغبانی وزراعت اور کتائی بنائی کے حرفوں کی قومی ضرورت مسلم لیکن لکڑی گتے کے کام کی کوئی اتنی وسیع اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہاں ان لوگوں کے بچے جنھیں باغبانی اور زراعت سے کوئی واسطہ نہ پڑ سکے اور جنھیں کاتنے بننے کے کام میں کوئی سیاسی یا اعتقادی تکلف محسوس ہوتا ہو وہ ضرور اس حرفے کو اختیار کر سکتے ہیں۔ اقتصادی اور قومی حیثیت سے نہ سہی لیکن اس حرفے میں کاتنے بننے کے کام کے مقابلہ میں ایک بڑی برکت پائی جاتی ہے اور وہ یہ ہے تنوع پسند طبیعتوں کے لئے اس حرفے میں تسکین کا بہت سامان موجود ہے۔ کاتنے بننے کے کام کی یکرنگی شاید بعض وقت تکلیف دہ ثابت ہو سکتی ہے اور ممکن ہے، بچوں کو روز وہی تکلی۔ وہ ہی روئی۔ وہ ہی دھاگا، وہ ہی انداز نشست وہ ہی ہاتھ کا ایک مخصوص سمت میں نپی ہوئی اونچائی تک اٹھنا اور تکلی کی گھوں گھوں کی آواز گراں اور بہت گراں گزرے ممکن ہے آپ یہ سوچیں کہ بچے اس کام کا مقصد سمجھ لیں گے اور اس لئے اگر کبھی تلخی محسوس ہوئی بھی تو وہ اسے دوا کے گھونٹ کی طرح برداشت کر لیں گے لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ بچہ جب تک کم از کم نو سال کا نہ ہو جائے اس وقت تک اس سے کسی مقصد کے سمجھنے یا کسی مقصد کو حاصل کرنے کے شوق کی امید

نہیں کی جاسکتی۔ یہ اندیشہ گاؤں کے بچوں کی زندگی میں پیدا نہیں ہوسکتا۔ گاؤں میں بچے سادہ زندگی اور تنوع سے ایک حد تک بے نیاز ماحول کے عادی ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے عملی کام کی یکرنگی کو بھی اسی طرح برداشت کرلیتے ہیں جس طرح کوئی شخص گردش روز و شب کا عادی ہوجائے۔ شہر کے بچے البتہ تنوع کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کے گھر میں۔ ان کے ماحول میں نئے نئے خاکے ذرا جلدی جلدی بنتے رہتے ہیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وہ اس حرفے کو بھی پسند نہ کریں جو انھیں بس ایک ڈگر پر لے جائے۔ ہر روز ہر مہینے اور ہر سال۔ اسی لئے کاتنے بننے کے حرفے میں بچوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا بھی زیادہ موقع نہیں مل سکتا ہے۔ باغبانی کرنے والا بچہ ہر مرتبہ نئی قسم کی کیاریاں بناتا ہے۔ لکڑی، گتے کا کام کرنے والا ہر مرتبہ نئی چیز پیدا کرتا ہے اور نئے ڈھنگ سے لیکن کاتنے میں سوائے اس کے کہ کوئی بچہ اپنے سوت کا نمبر گھٹا بڑھا لے اور تو کچھ نہیں کرسکتا بدقسمتی سے سوت کا نمبر گھٹانا بڑھانا بھی اکثر بچوں کے اختیار سے باہر ہوتا ہے۔ اس لئے تنوع اور اظہار شخصیت کے موقعوں کے اعتبار سے کاتنے دھنتے کا حرفہ ذرا گھٹیا درجے کا حرفہ ہے یہ ضرور ہے کہ بننے کے کام میں خود فعالی، اظہار شخصیت اور اعلیٰ تخئیلی قوتوں کے استعمال اور نشوونما کا بدرجہ اتم موقع موجود ہے لیکن بننے کے کام کے لئے ایک بچے کو صرف دو سال اور وہ بھی مدرسے کی زندگی کے آخری دو سال ملتے ہیں۔ ایک اور بات جو باغبانی اور گتے لکڑی کے کام کی حمایت میں اور کاتنے کے خلاف کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اول الذکر حرفوں کے مقابلے میں آخرالذکر حرفہ حواس کی تربیت اور جسمانی اعضا کی نشوونما کے اتنے زیادہ امکانات نہیں رکھتا۔ باغبانی میں حواس کی تربیت کے لئے نہ صرف ہر وقت رنگ و نور اور نغمہ و ترنم کی ایک جنت موجود ہے بلکہ اس میں عضلاتی اور جسمانی فعالی کا ہر متناسب و متوازن موقع ہے۔ کیاری کے کنارے بیٹھے بیٹھے سوکھی پتیاں چننے سے لے کر پھاوڑے سے زمین کو کھودنے کا سخت کام تک کیا جاسکتا ہے۔ گتے لکڑی کے کام میں بھی یہ تمام برکتیں موجود ہیں لیکن وہ اس جمالیاتی لطافت سے محروم ہیں جو باغبانی کو ہر اعتبار اور ہر پہلو سے ممتاز بناتی ہے۔ ہاں تکلی ذہن کو گیان دھیان کا عادی بنا سکتی ہے۔ جہاں خیال چوکا اور دھاگا ٹوٹا اور کائنات ہاتھوں سے گئی! میں نے ایک مرتبہ ڈاکٹر عبدالحمید صاحب (مصنف پیسٹالوزی) سے پونہ میں پوچھا "آپ کا تکلی کے متعلق کیا خیال ہے؟" فرمانے لگے "بڑے مزے

کی چیز ہے۔ دماغ کو کتنی ہی پریشانی کیوں نہ ہو لیکن جہاں تکلی نے دو ایک چکر کھائے اور معلوم ہوا کہ کائنات نظر کے سامنے گھوم رہی ہے! لیکن یہ ایک بالغ ذہن ہی کی صلاحیت ہو سکتی ہے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ تکلی کائنات اور دھاگا ذرا ازل کی ایک کرن بن سکتا ہے تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ہمیں مستقبل کے ہندستان کے لئے ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھے جلووں کا انتظار کیا کریں یا ایسے شہریوں کی ضرورت ہے جو کارگہ حیات میں پھاوڑے سنبھالے اپنے حصے کی ایک ایکڑ زمین جوتنے بونے پر مستعد نظر آتے ہوں ؟

یہی نہیں بلکہ جہاں تک خالص تعلیم کا معاملہ ہے۔ یعنی حرفے کے ذریعہ نصاب کے مضامین پڑھانا وہاں بھی کاتنا بننا باغبانی کے معیار کو نہیں پہونچتا۔ لکڑی گتے کے کام میں بھی ربط کے امکانات محدود ہیں اس حرفے کے ذریعہ حساب بآسانی پڑھایا جا سکتا ہے لیکن اس سے اونچی جماعتوں میں حساب کے ربط کے زیادہ موقعے نکلتے ہیں۔ حالانکہ گتے کے کام سے ہمیں پہلی دو جماعتوں کا نصاب پڑھانا ہے۔ براہ راست گتے سے حساب میں، وزن پیمانے، سکے، رقبہ، جیومیٹری کی شکلیں وغیرہ۔ سماجی علم اور عام سائنس میں آمد رفت کے ذرائع، چینیوں کا تمدن رنگوں کی بناوٹ، پانی، زہر وغیرہ قسم کے موضوع پڑھانے کا اچھا موقع ہے لیکن کاتنے بننے کے کام میں ابتدائی جماعتوں کے حساب پڑھانے کا زیادہ بہتر موقع ملتا ہے مگر آگے چل کر کھینچ تان کو زیادہ دخل دینا پڑے گا۔ عام سائنس بآسانی پڑھائی جا سکتی ہے اگر کپاس بونے کا کام بھی شامل ہو لیکن شہر کے مدرسوں میں یہ انتظام ناممکن ہوگا۔ سماجی علم کا ربط کاتنے بننے کے اصلی کام سے زیادہ کپڑے کی تجارت کی ترقی اور اس کی تاریخ سے ہوگا اور یہی اس حرفے کا سب سے بڑا عیب ہے۔ باغبانی بے شک ان کوتاہیوں سے بڑی حد تک بے نیاز ہے۔ اس کی افضلیت اس میں ہے کہ عمل اور حد درجے متنوع قسم کے عمل کا موقع ہے چنانچہ یہاں بیشتر مضمونوں کا ربط باغبانی کی تاریخ سے نہیں بلکہ باغبانی کے کام سے ہوتا ہے اور یہی ربط کی بہترین صورت ہے۔ باغبانی نباتاتی دنیا حیوانی دنیا، تمدنی دنیا اور قدرتی مظاہرات ــــ سب پر بیک وقت ہمارے لئے دروازے کھول دیتی ہے لیکن باغبانی کے حق میں یہ سب کچھ کہہ دینے کے باوجود یکسی اور حرفے کے حق میں اس سے بھی

زیادہ کہہ سکنے کے باوجود ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ ایک حرفہ ربط کے تمام مقاصد پورے کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکر حسین کمیٹی نے خود ربط کے دو اور مرکز۔ یعنی بچے کا سماجی احول اور طبعی ماحول بھی تجویز کئے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ حرفے کے ساتھ ساتھ ان دو مرکزوں کے اضافے سے ربط کی گنجائشیں لامحدود ہو جاتی ہیں۔ اور سمجھ بوجھ رکھنے والے استاد کو ربط کا صحیح موقع نکالنے میں کبھی اور کہیں ناکامی نہیں ہو سکتی۔ بالآخر ہم نصاب میں بچوں کو پڑھاتے بھی کیا ہیں؛ یقیناً وہی چیزیں جو سماج اور قدرت ہمارے چاروں طرف پھیلائے ہوئے ہے اور اس لئے نصاب کا کوئی موضوع ان دو مرکزوں سے الگ کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتا لیکن افسوس یہ ہے کہ جہاں عمل کا سوال پیدا ہوتا ہے، وہاں بعض استاد یہ بات بھول جاتے ہیں اور وہ نہ صرف نصاب کے تمام مضمونوں کو ایک اور صرف ایک حرفے سے مربوط کر کے پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم بنیادی قومی تعلیم کا تمام نصاب کاتنے دھننے کے کام سے یا لکڑی گتے کے کام سے مربوط کر کے پڑھا سکتے ہیں۔ میں ایک کے متعلق نہیں متعدد مدرسوں کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایسا کرتے ہیں اور اپنی اس کوشش پر نازاں ہیں۔ یہ کوشش تو بری نہیں ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کوشش سے کوئی اچھا تعلیمی نتیجہ مرتب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اگر آپ ذرا غور فرمائیں تو آپ کو بھی جواب نفی میں دینا ہوگا۔ جہاں تک حساب کا تعلق ہے یہ چیز تو بلا تکلف ہر تعلیمی اور غیر تعلیمی شغل سے مربوط ہو سکتی ہے۔ ابتدائی جماعتوں میں زبان کے سبق بھی چاہے جس حرفے اور چاہے جس شغل سے مربوط ہو سکتے ہیں لیکن عام سائنس اور سماجی عمل کے مضمونوں کے لئے ربط کا ایک اور صرف ایک مرکز ڈھونڈنا بہت ناروا کوشش ہے۔ ٹریننگ کے دوران میں ہماری جماعت ایک مدرسے میں نمونے کے کچھ سبق دیکھنے گئی۔ یہاں ایک سبق دیکھا۔ استاد کو زبان کے سبق میں ایک چینی بچے کی کہانی پڑھانی تھی استاد نے بچوں سے سوال کیا "سب سے پہلے کس ملک میں کاغذ بنا؟" "چین میں" بچوں کا جواب تھا۔ اس کے بعد استاد نے اہل چین کے رہن سہن کے طریقوں پر، ان کے لباس پر، ان کے تفریحی مشاغل، ان کے قانون فوجداری، ان کے مذہب پر اور ان کے زبان و ادب پر گفتگو کرنے کے بعد وہ سبق شروع کیا۔ سبق زبان کا تھا۔ زبان کے سبق کا مقصد و مدعا معلوم۔ لیکن یہ استاد زبان کے سبق کے مقصد کو کس حد تک حاصل کر سکے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس سے لگا لیجئے

کہ انھوں نے ۴۵ منٹ ربط کے شوق میں تمہیدی گفتگو پر صرف کیے اور صرف ۱۵ منٹ اس سبق پر۔ ایسا ہوا کیوں اس کی وجہ صاف ہے۔ استاد کو مدرسہ کے نگراں کی جانب سے اس سبق کو گنتے کے کام سے مربوط کر کے پڑھانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ہدایت بے۔ آپ کو تعجب ہوگا یہ سبق خود اپنی جگہ سماجی ماحول سے مربوط تھا۔ اس سبق کے ابتدائی حصّے میں ذکر تھا کہ کس طرح ان بچوں ہی کے شہر میں ایک چینی ڈاکٹر ہیں اور اُن کا ایک بچہ ہے وغیرہ وغیرہ اگر اصل سبق میں یہ تمہید موجود نہ ہوتی تو بھی اس سبق کا ربط سماجی ماحول سے ہو سکتا تھا۔ گلیوں میں چھری چاقوؤں پر چینی دھار رکھنے والوں کا منظر چینی بچوں کا تماشہ کرتے ہوئے کبھی کبھی نظر آنا چینیوں کا بڑی سی گٹھری میں ریشم لادے لادے بیچتے پھرنا ایسی باتیں نہیں جنھیں شہر کے بچوں اور بالخصوص اس شہر کے بچوں نے جہاں یہ سبق پڑھایا جا رہا تھا نہ دیکھا ہو۔ ایک اور مدرسے میں استاد کو دیکھا کہ اس نے بچوں کو روئی دکھا کر پوچھا "روئی کا رنگ کیسا ہے؟" سوال کی صحت اور عدم صحت کو چھوڑیئے دیکھنا یہ ہے کہ جب بچوں نے جواب دیا "سفید" تو پھر استاد نے پوچھا "برف کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟" بچوں کا جواب پھر وہی تھا یعنی "سفید" اب کیا تھا استاد جس نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے وہ انھیں مل گئی "بس تو آج ہم تمہیں برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا حال پڑھائیں گے" ۔ اور بچوں نے کتاب سے وہ سبق پڑھنا شروع کر دیا

جہاں تک میری معلومات اور ذاتی تجربے کا دخل ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ غلط فہمی لوگوں میں اور عام قسم کے استادوں میں تین مرکزوں سے پھیلتی ہے۔ وہ مرکز ہیں ٹریننگ اسکول، مہاتما گاندھی کی ذات، اور ربط کی وہ مثال جو ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ میں شامل ہے۔ ٹریننگ اسکولوں میں حرفوں سے ربط کے متعلق طلبا کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے کیونکہ جو استاد انھیں ربط پڑھاتا ہے وہ حرفے کا عمل نہیں جانتا اور جو استاد حرفہ سکھاتا ہے وہ نہ ربط کے نظری پہلو سے واقف ہوتا ہے، نہ نصاب اس کے سامنے ہوتا ہے اور نہ اس حرفے کی نشوونما اور اس کی تاریخ اس کے ذہن میں ہوتی ہے نظری اور عملی کام کے اس فرق کو صاف طور پر اس حقیقی مثال سے سمجھ لیجئے کہ ایک ٹریننگ اسکول میں طریقہ تعلیم پڑھانے والا استاد مڈل پاس ہے۔ ربط پڑھانے والا استاد ایک ایم اے ہے۔ حرفہ سکھانے والا استاد ایک منشی پاس ہے اور مشقی سبقوں کی جانچ کرنے والوں میں ایک چوتھا درجہ پاس پی ٹی سی ہے پھر طالب علم کے سامنے

بعض وقت یہ مجبوری ہوتی ہے کہ اس کو اپنے سبق کی مخصوص حرفے سے مربوط کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس ٹریننگ اسکول کا میں نے ابھی حوالہ دیا ہے اس میں باقاعدہ شتی سبقوں کے پروگرام میں ربط کا مرکز و یح کر دیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کے کسی حصے کو یہاں نقل کرنے کا موقع نہیں ورنہ پیش کر دیتا۔ ایک اور گمراہ کن چیز یہ ہے کہ بعض ٹریننگ اسکولوں میں حرفہ پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ ان کی تعلیمی اہمیت کچھ خود بخود دب جاتی ہے۔ میری ایک عزیزہ مارچ کے شروع میں ایک بیسک ٹریننگ سنٹر دیکھنے گئیں اور اس کے بعد انھوں نے مجھے خط میں جو کچھ لکھا اس کا ترجمہ یہ ہے :۔

"ہم پچھلے ہفتہ بیسک ٹریننگ کالج دیکھنے گئے ہم نے وہاں دیکھا کہ یہ کام کس طرح ہوتا ہے ہم سب نے وہاں ابری بنانا سیکھا۔ میں اپنی بنائی ہوئی ابری کے دو نمونے بھیجتی ہوں کیئے یہ ٹھیک ہیں نا ؛ یہ میری پہلی کوشش ہے ...... اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال بھر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے۔"

یہ آخری ٹکڑا "اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ سال بھر دہلی (جامعہ) میں کیا کرتے رہے"، سنا آپ نے ؛

پھر مہاتما گاندھی نے اکثر و بیشتر جب بھی اس تعلیم کا ذکر کیا تو انھوں نے وہی حرفوں کے کسی اور تعلیمی شغل کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ انھوں نے بار بار (ہریجن کے متعدد مضمونوں میں، ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ پر پیش لفظ میں، پونہ کانفرنس کے موقع پر اپنے پیغام میں) یہی کہا ہے کہ تعلیم دہی دستکاریوں کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ عقیدت چونکہ ہندوستان کے ذہن پر اب بھی غلبہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں اگر بعض لوگ مہاتما گاندھی کے الفاظ سے متاثر ہو کر تعلیمی معاملے کو بھی جسے حد درجہ سائنٹفک ہونا چاہیئے محض اعتقادی معاملہ بنالیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے پونہ کانفرنس میں فرمایا تھا کہ "میں بنیادی تعلیم کا سندیافتہ استاد نہیں ہوں میرے پاس ایک ہی سند ہے اور وہ اعتقاد کی ہے۔" آگے چل کر ان صاحب نے فرمایا کہ کس طرح دستکاری اور تخلیقی مشاغل کے ذریعہ تعلیم کا اصول سمجھنے کے بعد انھوں نے کاتنا سیکھا اور پھر تعلیم دینا شروع کر دیا۔ اعتقاد کا سوال تھوڑی دیر کے لئے چھوڑ دیجئے تو یہ چیز آپ کو اصولاً غلط اور مضر معلوم ہوگی بنیادی قومی تعلیم ہمارا بہت زیادہ قیمتی تجربہ ہے اس لئے ابھی اسے زیادہ سے

زیادہ محتاط ہاتھوں میں رہنے کی ضرورت ہے۔

ذاکر حسین کمیٹی نے حرفے کے ساتھ ساتھ سماجی اور طبعی ماحول کو بھی ربط کے مرکز قرار دے کر اپنا پورا پورا حق ادا کر دیا لیکن جب عام استاد اسی رپورٹ میں کاتنے بننے کے کام سے پورے سات سال کے نصاب کے ربط کے امکانات دیکھتے ہیں تو وہ یا تو سماجی ماحول کو بالکل بھول جاتے ہیں یا انھیں اتنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ذاکر حسین کمیٹی نے ربط کے یہ امکانات محض اس لئے تجویز کئے تھے کہ ہر مدرس اپنی جگہ سمجھ بوجھ سے کام لے کر آزادانہ حیثیت سے مگر صحیح کام کرے گا۔ ہوا بدقسمتی سے یہ کہ عقیدت نے سمجھ بوجھ کو یہاں بھی تھپکیاں دے کر سلا دیا۔ حالانکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو تعلیمی حیثیت سے اس تجویز کئے ہوئے ربط میں کہیں کہیں بھول نظر آئے گا۔ چند مثالیں آپ خود ملاحظہ فرمایئے۔

جماعت اول :۔ افریقہ میں اہرام بنانے والے غلام کا مال۔ ربط مختلف ممالک میں مردوں اور عورتوں کا لباس۔

جماعت دوم :۔ حضرت موسیٰؑ کی کہانی۔ ربط :۔ قدیم زمانے کا لباس۔

جماعت سوم :۔ تھرابلی کی جنگ۔ سقراط وغیرہ۔ ربط :۔ قدیم زمانے کے لباس کی سادگی اور خوبصورتی

جماعت چہارم :۔ سمندر گپت، کالیداس، آریہ بھٹ۔ ربط :۔ زمانہ قدیم میں کپڑے کی تجارت۔

جماعت پنجم :۔ پیغمبر اسلام کی سوانح حیات۔ ربط :۔ آنحضرت کا سادہ لباس۔ وغیرہ وغیرہ

ان چند مثالوں سے بخوبی واضح ہو جانا چاہئے کہ ربط اور تکنیک ان میں کیا فرق ہے۔ اہرام بنانے والے غلاموں کی زندگی میں ان کا لباس کوئی حیثیت نہیں رکھ سکتا۔ ان کی زندگی کا عنوان "غلامی" اور "مشقت" ہو سکتا ہے اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور پیغمبر اسلام پر ہر گفتگو میں ان کے پیغام کی اہمیت باقی تمام دوسری چیزوں پر حاوی رہے گی۔ تھرابلی کی جنگ میں اس لباس کی کیا حقیقت جو اسپارٹا اور ایران کے سپاہی پہنتے تھے۔ ہاں ایک طرف ملک گیری کی ہوس اور دوسری طرف حب وطن کا جوش ــــ یہ اس جنگ سے متعلق زیادہ قریب حقیقتیں ہیں۔ سمندر گپت کے لئے حکمرانی کالیداس کے لئے شعر و ادب اور آریہ بھٹ کے لئے علم و تحقیق طرۂ امتیاز رہے ہیں۔ انھیں اپنے زمانے میں کپڑے کی تجارت سے کیا واسطہ؟

اہرام اور اہرام بنانے والوں کا ذکر کیا ان شاہی عمارتوں کے ذکر سے مربوط نہیں ہوسکتا، جو بچوں کے ماحول میں ہوں یا جنہیں بچے جانتے ہوں؟ ایک طرف اہرام بنانے والوں کو پیاز کھانے کو ملتی تھی، دوسری طرف تاج محل بنانے والے کاریگروں کو زندگی کی ہر سہولت میسر تھی۔ اہل یہود اور اہل اسلام کے بانیان مذہب کا رشتہ بڑی آسانی سے جوڑا جاسکتا ہے۔ ان بے شمار مذہبی تہواروں سے جو سال میں ایک نہیں کئی واقع ہوتے ہیں۔ تھرماپلی کی جنگ موجودہ جنگ سے کس قدر ملی ہوئی چیز ہے۔ اسی طرح سمندرگپت، کالیداس اور آریہ بھٹ ہم سے کچھ دور نہیں ہیں۔ حکمرانی، شعروادب اور علم و تحقیق زندگی میں روز کا شغل ہیں۔

کچھ غلطی دراصل یوں بھی پیدا ہوتی ہے کہ ہم نے ربط کو عام تعلیمی طریقوں سے الگ کوئی چیز سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو ربط کا مسئلہ صاف صاف سبق کو پیش کرنے کا مسئلہ ہے اور اس اعتبار سے ربط کا طریقہ چند خطوں سے محدود و محصور طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کی وسعتیں دائرہ در دائرہ اور اس کے امکانات گنجائش در گنجائش ہیں۔ ربط فی الحقیقت کوئی خارجی اصول نہیں ہے، وہ فی الحقیقت سبق کی بنیاد ہے اور سبق کا سارا دارومدار اس پر ہے کہ وہ جماعت کے سامنے کس طرح پیش کیا جاتا ہے۔ سبق سبق ہوگا اگر بچوں میں اس کے لئے صحیح شوق پیدا کردیا گیا ہو اور بچوں میں شوق اسی وقت پیدا ہوگا جبکہ انھیں اپنے پچھلے تجربوں سے منسلک اپنی زندگی سے ہم رشتہ اور اپنے مشاغل سے متصل سبق میں ایسی معلومات کی امید ہو جو انھیں کسی نہ کسی اعتبار سے آگے بڑھا سکے۔

ایک استاد اپنی جماعت میں جاتا ہے اور کہتا ہے: "نکالو سورج کی روشنی والا سبق" استاد یہ سبق اس لئے پڑھانے کو کہتا ہے اور بچے یہ سبق اس لئے پڑھ لیں کہ وہ مجبور ہیں تو بات دوسری ہے! لیکن اگر کوئی بچہ کھڑا ہو کر استاد سے پوچھ بیٹھے کہ "ہم یہ سبق اس وقت کیوں پڑھیں؟" تو استاد کے سامنے جو نازک صورت ہوگی اس کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے۔ ایک استاد کے بچے صبح مدرسے کے پھولوں کی کیاریاں اور گملے وغیرہ صاف کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ بچے دیکھتے ہیں کہ ایک کونے میں جو گملا رکھا ہوا ہے اس کی پتیوں اور پھولوں کے رنگ میں وہ تیزی اور خوبصورتی نہیں جو باہر کیاریوں میں لگے ہوئے پھولوں میں ہے یہاں استاد کے لئے سورج کی روشنی پر بچوں کو معلومات دینے کا کتنا اچھا موقع ہے

فرض کیجئے کہ ایک مدرسے کا استاد خواجہ معین الدین چشتیؒ کے عرس میں اجمیر جاتا ہے جب وہ لوٹ کر آتا ہے تو ایک جماعت کے بچے اسے درجے میں بلاکر عرس کے حالات سنتے ہیں وہ استاد اسی موقع پر انھیں خواجہ معین الدین چشتیؒ کا وہ سبق بھی پڑھا دیتا ہے جو ان کے نصاب میں داخل ہے۔

ایک استاد اپنے بچوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کا کمرہ کچھ ویران ویران سا ہے۔ بچے کمرہ کو سجانے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ استاد بچوں کے سامنے کاغذ کی پٹی پر ابری کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے کئی ڈیزائن پیش کرتا ہے ایک ڈیزائن مربعوں سے بنا ہوا ہے، ایک دائروں سے اور ایک مثلثوں سے بچے آخری ڈیزائن پسند کر لیتے ہیں۔ اب بچوں کو یہ مثلث خود کاٹنے ہیں بچے خود ہی معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ مثلث ایسا ہے جس کا ہر ایک ضلع برابر ہے وہ استاد سے اسے آسانی سے بنانے کا طریقہ پوچھتے ہیں۔ استاد انھیں متساوی الاضلاع بنانا سکھا دیتا ہے بچوں کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کمرہ سجانے کے لئے حاشیہ بنا رہے ہیں یا مثلث متساوی الاضلاع بنانا سیکھ رہے ہیں۔

یہ مثالیں میرے خیال میں ربط کی اچھی اور صحیح مثالیں ہیں چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک ذہین استاد بچوں کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے کہ بچوں کو یہ بالکل احساس نہیں ہوتا کہ ان پر کوئی چیز جبر کی جارہی ہے۔ بلکہ بچے اس نئی چیز کو اپنی ذاتی کوشش اور کھوج کا نتیجہ سمجھتے ہیں چنانچہ انھیں وہی خوشی ہوتی ہے جو کولمبس کو امریکہ دریافت کر کے ہوئی ہوگی مربوط سبق بچوں کے شوق کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور ان کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ چھوڑ کر ختم ہو جاتا ہے۔

ربط کی کچھ اور صورتیں | تعلیم میں ربط کا مسئلہ تخلیقی مشاغل کے ذریعہ یا بچوں کے سماجی اور طبعی ماحول کے ذریعہ تعلیم دینے پر ہی ختم نہیں ہو جاتا ربط کا مسئلہ ہمہ جہتی مسئلہ ہے۔ چنانچہ یہاں سبق کا ربط سبق سے نکل سکتا ہے روزمرہ کی زندگی میں جب بھی کسی مدرسہ کا ٹائم ٹیبل ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ مختلف مضمونوں میں اوپر سے نیچے تو کوئی رشتہ ہے مثلاً تیسرے گھنٹے میں روزانہ انگریزی یا دوسرے میں روز حساب لیکن ہم اس بات پر غور نہیں کرتے کہ ٹائم ٹیبل میں مضمونوں کا رشتہ دائیں بائیں سے بھی ہے یعنی اگر تیسرے گھنٹے میں انگریزی ہے۔ چوتھے میں تاریخ، پانچویں میں جغرافیہ، چھٹے میں ڈرائنگ اور ساتویں میں اردو ہے تو اس کے باوجود کہ یہ گھنٹے

ٹائم ٹیبل میں الگ الگ ہیں۔ نہ تیسرے کا کام چوتھے سے الگ ہے نہ چوتھے کا پانچویں سے، نہ پانچویں کا چھٹے
سے جن مدرسوں میں ہر مضمون کے استاد الگ الگ ہوتے ہیں وہاں تو البتہ ہر مضمون ایک دوسرے سے
بے تعلق ہو جاتا ہے لیکن جہاں جماعت کے استاد موجود ہوں وہاں تو پہلے گھنٹے سے لے آخری گھنٹے تک
کام میں کوئی مصنوعی تقسیم ہوتی ہی نہیں چاہیئے مضمون خود اپنی جگہ الگ الگ ہونے کے باوجود مجموعی حیثیت
سے ایک وحدت ہیں۔ اور ہم زندگی میں خود ان مضمونوں کو وحدت کی حیثیت سے استعمال بھی کرتے ہیں۔ جس
وقت میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں اسوقت مجھے تاریخ تعلیم، نفسیات تعلیم، اصول تعلیم، طریقہ حصول تعلیم، اقتصادیات
زبان، ڈرائنگ اور حساب سب سے یکجائی طور پر کام لینا پڑ رہا ہے حقیقت یہ ہے کہ مختلف مضمونوں کے
درمیان کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی۔ ادب کی تعلیم کے ساتھ مصوری، موسیقی، تاریخ جغرافیہ اور سائنس غرض وہ
کونسی چیز ہے جو وابستہ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ اس خیال کے بھی گذرے ہیں کہ مختلف مضمونوں میں سے کسی
ایک مضمون کو مرکز بنا کر بقیہ تمام مضمونوں کو اس ایک مضمون سے مربوط کر کے پڑھایا جائے۔ ہربرٹ جو تعلیم
کا مقصد و مدعا سیرت کی تعمیر سمجھتے تھے (اور ہمیں ان سے اختلاف کرنے کی زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے) تاریخ
کو مرکزی حیثیت دے کر ادب، ریاضی، جغرافیہ، ڈرائنگ اور سائنس سب ہی کچھ اس کے ذریعہ پڑھا دینا
چاہتے تھے۔ چنانچہ اگر کسی جماعت میں اکبر کی شخصیت کو مرکز بنایا گیا ہے تو اکبر سے متعلق زبان کے نظم و نثر
میں سبق، ہندوستان کے ان حصوں کا جغرافیہ جن پر اکبر نے حکمرانی کی، گجرات پر فوج کشی کے سلسلے میں سمندر
اور اس کے ساتھ سائنس کے مسائل اور اکبر کے زمانے کے ملازموں کی تنخواہوں اور رقبہ سے مربوط
سوالات، اکبر کے زمانے کے لباس عمارتوں اور ہتھیاروں وغیرہ کی تصویریں۔ سب ہی کچھ پڑھایا جائیگا
ہمارے ایک اور بزرگ کرنل پارکر مطالعۂ قدرت کو مرکزی حیثیت دے کر ربط کی کچھ یہی صورت تجویز کرتے
ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کے لئے یہ طریقہ بہت اچھا طریقہ ہے۔

ربط کی اس صورت کو نفسیاتی حمایت بھی حاصل ہے۔ بچہ دنیا کو ان آنکھوں سے نہیں دیکھتا جن آنکھوں
سے ہم دیکھتے ہیں۔ اس کے لئے انسان اور فطرت، دنیا اور دنیا کی مختلف چیزیں الگ الگ کوئی معنی نہیں
رکھتیں۔ ہاں بالغ ہو کر وہ چیزوں میں امتیاز کر سکتا ہے اور ان کی اضافی اہمیت سمجھ سکتا ہے۔ وہ کرسی کو میز

سے اور ان دونوں کو ٹیبل لیمپ سے اپنے شعور کی ابتدائی زندگی میں الگ الگ نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جس کمرہ میں رہتا ہے اس کی کتابیں، اس کی تصویریں، اس کی کرسی، اس کی میز، اس کا لیمپ سب ایک دوسرے سے ہم رشتہ ہیں اور پورا کمرہ کا کمرہ اس تمام سامان کے ساتھ ایک وحدت کا درجہ رکھتا ہے۔ بڑا ہو کر وہ ضرور میز کو میز اور کرسی کو کرسی سمجھنے لگتا ہے۔ گویا یہاں ربط کا مسئلہ امتیاز کا مسئلہ ہے اور تجزیے میں تحلیل کا رشتہ نکلتا ہے۔

ہربارٹ اور پارکر نے ربط کی جو صورت تجویز کی ہے اس کو سامنے رکھکر ہم جماعت میں ربط کی یہ صورت اختیار کر سکتے ہیں کہ ہم کسی مضمون کے کسی سبق کو کسی مضمون کے کسی موضوع سے مربوط کرلیں۔

ایک استاد ایک جماعت کو دوسرے گھنٹے میں شہد کی مکھیوں پر بچوں کو سبق پڑھانے جاتا ہے استاد کو معلوم ہے کہ یہ بچے گھر کی مکھی کا حال پڑھ چکے ہیں۔ استاد اپنا سبق اس طرح پیش کرتا ہے۔

گھر کی مکھی کہاں پیدا ہوتی ہے؟

گندگی میں

گھر کی مکھی کس چیز پر زندگی بسر کرتی ہے؟

گندگی پر

گھر کی مکھی ہماری دوست ہے یا دشمن؟

دشمن

لیکن آج ہم ایک ایسی مکھی کا حال پڑھیں گے جو گندگی میں پیدا ہونے کے بجائے صاف ستھری جگہ میں پیدا ہوتی ہے جو گندگی پر پرورش پانے کے بجائے رنگ و نور کی دنیا میں پلتی ہے اور انسان کو تکلیف پہونچانے کے بجائے اس کے لئے دنیا کی سب سے اچھی نعمتوں میں سے ایک نعمت مہیا کرتی ہے۔ بچے ایک دم پکار اُٹھے "شہد کی مکھی: ماسٹر صاحب!" ربط کا حق اسی منزل پر پورا نہیں ہو جاتا بلکہ اس پورے سبق میں یہی التزام تھا کہ نئی معلومات کی ساری عمارت منزل بہ منزل انھیں بنیادوں پر بنی تھی جو بچوں کی پچھلی معلومات نے تیار کی تھی۔

ایک استاد نے دوسرے گھنٹے میں ایک جماعت کو دارائے اعظم کی کہانی پڑھائی اور اسے بغیر بچوں کے شوق کو تکلیف پہونچائے گھنٹے کے ساتھ ختم کر دیا۔ تیسرے گھنٹے میں استاد کو شہد کی مکھیوں کی رانی کا حال پڑھانا تھا۔ استاد نے بچوں سے کہا کہ "اب تک تو ہم نے انسانوں کی دنیا میں راج کرنے والے ایک راجہ کا حال پڑھا۔ اب جانوروں کی دنیا میں حکومت کرنے والی ایک رانی کا حال پڑھیں گے۔" استاد کی زبان سے یہ الفاظ نکلنے تھے کہ بچوں کے شوق میں تازہ جان پڑ گئی۔

بعض اسباق میں خود بخود دوسرے اسباق سے ربط کے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ایک جماعت کے بچوں نے حالی کی یہ نظم پڑھی (مجھے پوری نظم یاد نہیں۔ یادداشت سے نقل کرتا ہوں)

جھٹپٹے کے وقت سرِ شام ایک مٹی کا دیا — ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تاکہ رہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں — راہ سے آساں گذر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے اُن فانوس اور اُن لیمپ سے — روشنی محلوں کے اندر ہی رہے جن کی سدا

.... — ....

سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

اس نظم کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ "روشنی کا مینار" سبق بچوں کو نہ پڑھایا جائے اور اس کے ساتھ "ہفت عجائبات عالم"، "تمدن کے عجز نے" وغیرہ دوسرے زبان، معلومات اور سماجی علم کے سبق۔

بیلجیم کے مدرسۂ جدیدہ کے بانی واسکو نسلو کی نظر میں "ایک ہی دن میں ریاضی، لکھنا، پڑھنا، تاریخ، جغرافیہ طبیعات وغیرہ کا مطالعہ کرنا ممکن ہے ایک جرأت آزمائی کہی جا سکے لیکن اس کا تعلیمی نتیجہ صفر ہوگا۔ کیونکہ ان مضامین کے موضوع میں کوئی ربط یا تعلق نہیں،" واسکو نسلو نے مضمونوں کی تقسیم کچھ اس طرح کی تھی کہ ایک مضمون سے متعلق کل سبق ایک جگہ مربوط سلسلے میں اکٹھے ہو جائیں اور اس طرح کہ انھیں طبعی ماحول و حالات سے بھی ہم رشتہ کیا جا سکے۔ چنانچہ وہ اپنے طلبہ کے لئے گرمی کے موسم میں حیوانات اور نباتات وغیرہ کا مطالعہ تجویز کرتے ہیں اور سردی کے موسم میں طبیعیات و کیمیا کا مطالعہ۔ ان کے طلبہ جب موضوع

کو لیتے ہیں اس پر صبر اور استقلال سے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ اس کا ایک حصہ مکمل ہو جاتا ہے۔ ہمیں بھی نصاب میں اکثر ایسے مضامین ملیں گے جن کی ترتیب کو نظرانداز کرکے ہم انھیں بآسانی ایک سلسلے میں اور بہتر طریقے سے پڑھا سکتے ہیں۔ بعض مصنفین بھی مدرسین کا کام آسان کرنے کے لئے اب ایک موضوع سے متعلق مضمونوں کو کتابوں میں ایک ساتھ درج کرنے لگے ہیں۔

بنیادی قومی تعلیم کو تنگ نظر سے دیکھنے والے استاد ممکن ہے ربط کی ان صورتوں کو قابل قبول نہ سمجھیں لیکن میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ذاکر حسین کمیٹی کی رپورٹ خود ہمیں ربط کی ان صورتوں سے بھی فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتی ہے اس میں سماجی علم کے بعض عنوانوں کو زبان کے سبقوں کے لئے بھی تجویز کیا گیا ہے۔ چنانچہ افریقہ کے بونوں، آسٹریلیا کے وحشیوں، عہد قدیم کے عبرانیوں، رومیوں اور ہندوستانیوں کی زندگی سماجی زندگی سماجی علم کے ساتھ ساتھ زبان کے نصاب میں بھی شامل ہے (صفحہ ۱۵۸[1]) اور وہ بات جس کی تحریک واسکو نسلونے کی ہے پورے نصاب کی جان ہے۔ عہد قدیم کا مصر، عہد قدیم کا چین عہد قدیم کا ہندوستان ایک دوسرے سے ہم تعلق موضوع ہیں۔ چنانچہ یہ تمام موضوع نصاب میں اجتماعی حیثیت سے ایک ہی جگہ موجود ہیں اور ان میں باہمی ربط کا جو موقع ہے۔ وہ بھی تشریح و توضیح کا محتاج نہیں۔ (صفحہ ۱۵۸)

فضل الدین اثر

---

[1] حوالہ صفحہ نصاب بنیادی قومی تعلیم انگریزی ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۳۸ء

نئی تعلیم کے پڑھانے والے کیسے ہوں؟

اس کا ایک جواب تو وہ ہے جو گاندھی جی نے کانفرنس میں لوگوں کو دیا تھا کہ پڑھانے والے وہ لوگ ہوں جو میٹرک فیل ہوں۔ اس میں ملک کے مختلف پڑھے لکھے لوگوں کے معیار کے مطابق ایک بات کہدی ہے اس سے اسکیم کے پڑھنے والوں اور چلانے والوں کو معیار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جو مڈل پاس، میٹرک پاس اور ایف۔ اے۔ بی۔ اے پاس کے معیار کو سمجھتے ہیں انھیں اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معیار کے پڑھے لکھے لوگ اس اسکیم کو چلا سکتے ہیں اگر ان کی خاطر خواہ تربیت ہو جائے۔ اس وقت نئی تعلیم کی ابتدا تھی گاندھی جی کا یہ جواب کافی تھا لیکن اب جبکہ کام کرنے اور کرانے والوں نے نئی تعلیم کے کام کو شروع کر کے کچھ تجربہ کیا ہے تو استاد کا مسئلہ بھی بہت اہم ہوتا جا رہا ہے کام کرنے اور کرانے والے اس بات کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں کہ استاد کو موجودہ تعلیمی معیار کے علاوہ کیا کیا باتیں آنی چاہئیں۔ اس میں کیا کیا استطاعت ہونی چاہئے اور کن کن امور میں اس کی تربیت ہونی چاہئے نئی تعلیم کے بسیط نصاب کے لئے جس میں دنیا کے ابتدائی دور سے لیکر موجودہ زمانے کے حالات اور واقعات کو مع ان کے اسباب کے ترتیب دیا گیا ہے۔ صرف میٹرک فیل پاس استاد کافی نہیں ہو سکتا۔ اس نصاب کو پڑھانے کے لئے بی۔ اے پاس استاد بھی دقت محسوس کرتے ہیں نئی تعلیم کا نصاب پرانی تعلیم سے بہت مختلف ہے۔ اس کے انداز اور اٹھان کی بنیاد ہی بالکل الگ ہے وہ تو موجودہ تعلیمی حالت میں بہت بڑا انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے وہ تو استادوں شاگردوں اور سرپرستوں میں نئی زندگی اور نئی روح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس نصاب میں نفس مضمون سے واقفیت ہی اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتی ہے اس میں بہت سی باتیں نئی ہیں میٹرک تک ان میں سے کئی باتیں نہیں تبلائی جاتی ہیں پہلی اور دوسری ہی جماعت میں کئی باتیں ایسی ہیں جن کو پڑھانے والے نہیں جانتے پھر اس میں تو سبھی کو دقت ہوتی ہے کہ ان باتوں کو چھوٹے چھوٹے بچوں کے سامنے کس طرح پیش کیا جائے؛ اور ان کا سلسلہ کس طرح شروع کیا جائے۔ دوسری طرف اس تمام نصاب کے پڑھانے میں ان تمام بنیادی

باتوں کا خیال رکھنا ہے جن پر نصاب میں زور دیا گیا ہے اگر پڑھانے کے دوران میں نصاب کی اصل روح کو نظر انداز کر دیا گیا تو محض واقعات اور حالات کا بچوں کو بتلا دینا بالکل بے سود ہوگا۔ نصاب میں جو باتیں رکھی گئی ہیں وہ چند مقاصد کے ماتحت رکھی گئی ہیں۔ اگر نفس مضمون کے پیش کرنے کے دوران میں یا اس کے بعد وہ مقاصد نہیں حاصل ہوئے تو محض مجوزہ باتوں کا پیش کر دینا بالکل بے سود ہوگا۔ لہٰذا پڑھانے والے ان مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔

مربوط پڑھائی کا خیال تو ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بالکل نیا ہے پہلی دونوں صورتوں میں تو کچھ نہ کچھ کامیابی ہو جاتی ہے لیکن ربط کے تصور ہی سے بڑی پریشانی ہوتی ہے بعض لوگ تو اس کو بالکل مہمل سی بات سمجھتے ہیں اور نہ جاننے والوں کے لئے واقعی بالکل مہمل بات ہے جن لوگوں نے بالکل سیدھے سادے طریقہ سے تعلیم حاصل کی ہے اُن کے لئے یہ بات بالکل نئی ہے۔ تمام نصاب کو حرفہ، سماجی ماحول اور قدرتی ماحول میں سمو دیا جائے بالکل نیا خیال ہے (صرف ہندوستان میں) ہم جو دوسروں کے کئے ہوئے تجربہ پر انحصار کرتے ہیں، ورا پنا کوئی تجربہ نہیں کرتے محض عقلی دلائل کی طاقت پر ہر نئی بات کو مہمل ہی خیال کرتے ہیں۔ یا مان تو لیتے ہیں لیکن بغیر سمجھے بوجھے کرتے ہیں۔ نئی تعلیم کے کام کرنے والوں میں ایسے بھی ہیں جو قدرتی ماحول، ور سماجی ماحول کو نہیں سمجھتے اور سمجھیں کیسے جبکہ ہمارے ذہن تاریخ، جغرافیہ، مدنیات، مطالعہ قدرت، مطالعہ اشیاء اور حفظان صحت کے عنوانات میں اُلجھ کر رہ گئے ہیں ہمیں یہ نام نامانوس سے معلوم ہوتے ہیں اور پھر ان سے ربط دے کر کسی مضمون کو پڑھانا بالکل عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ حالانکہ اخبارات، رسالوں، جلسوں اور ٹریننگ اسکولوں میں بار بار اس کی وضاحت کی جا چکی ہے پھر بھی اس بات میں بہت بڑا اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی دو استاد اس کو ایک طریقہ پر نہیں سمجھتے اور نہیں کرتے۔ ایسا کیوں ہے؟ جو لوگ کام کر رہے ہیں ان کی تعلیم و تربیت بالکل مختلف ہے اور اس طریقہ کے سمجھنے کے لئے کمزور ہے اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں ہر تعلیمی تحریک میں کم و بیش ایک قسم کی یکسانیت ضرور پائی جاتی ہے اور کام کرنے والے اس طریقہ کے تمام اصولوں کی ایک حد تک پابندی کرتے ہیں اور تجربہ کے بعد اختلاف پیش کرتے ہیں اور پہلے اصولوں کو تجربہ کی روشنی میں بدلتے ہیں لیکن ہم اصولوں کو بدل بدل کر

تجربہ کرتے ہیں کسی ایک اصول کو پیش نظر رکھکر تجربہ نہیں کرتے۔ ہم پہلے سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اصول صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اپنے وضع کئے ہوئے اصولوں کے مطابق تجربہ کرتے ہیں اور جب ناکام ہوتے ہیں تو سارا الزام اسکیم کو دیتے ہیں۔

ایسی صورت میں پڑھانے والوں میں چند خاص خوبیوں کا ہونا ضروری ہے ورنہ ہمارا کام ہر پھر کر موجودہ مدارس کے طریقۂ کار کی طرح ہو کر رہ جائے گا۔ سب سے ضروری بات یہ ہونا چاہیئے کہ جو استاذ نئی تعلیم کا کام کر رہے ہوں وہ یہ سمجھیں کہ وہ ایک قومی کام کر رہے ہیں جس میں ذاتی مفاد کو بڑی حد تک قربان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر اس خیال سے وہ قومی تعلیم کا کام نہیں کر رہے تو اُن کے کام میں وہ خوبی اور وہ زور نہیں ہوگا جو ہونا چاہیئے۔ نئی تعلیم کی روح کو قائم رکھنے کے لئے بھی اس بات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ بنیادی خوبی ہے جس سے طلبا میں وہ ذہنیت نہیں پیدا ہوگی جو آج کل کی مروجہ تعلیم سے پیدا ہو رہی ہے اور جس سے قوم کا ہر طرح نقصان ہو رہا ہے۔ جو استاد اس خیال سے کام کریں گے ان کے کام میں بیدلی نہیں پائی جائے گی، اور خاص امنگ کے ساتھ کام ہوگا اور اگر کام کرتے کرتے کبھی ناکامیابی ہوگی تو استاد کبھی ہمت نہیں ہارے گا۔ اکثر کام کرنے والوں کو میں تنخواہ کی کمی کی شکایت کرتے سنتا ہوں۔ قومی کام کرنے والوں کو یہ شکایت نہیں کرنی چاہیئے۔ ہندوستان میں جب تک تعلیم کے لئے حکومت کافی روپیہ خرچ نہیں کرتی اور قومی مدارس میں اس کے لئے کافی روپیہ فراہم نہیں ہوتا استادوں کا تنخواہ کی کمی کی شکایت کرنا فضول ہے اس سے کام بھی خراب ہوتا ہے اور کوئی نتیجہ بھی نہیں نکلتا یعنی تنخواہ کے معیار بڑھنے کی کوئی سبیل نہیں نکلتی اور کام برائے نام ہوتا ہے ہیں یہ بات نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے کہ ہمارے ملک میں اب سے پچاس ساٹھ سال پیشتر جو لوگ مکتبوں، مسجدوں اور پاٹشالوں میں درس اور تدریس کا کام کرتے تھے ان کو صرف دو وقت کا کھانا محلہ کے لوگوں سے ملتا تھا۔ اور سال میں محلہ کے لوگ ہی کچھ کپڑے بنوا دیا کرتے تھے۔ انعام و اکرام عیدی، تہواری سے ان کے پاس تھوڑی سی رقم جمع ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے بال بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے جس میں استاد کے گذارے کی یہ صورت رہی ہو۔ وہاں تنخواہ کا معیار بڑھتے بڑھتے بڑھے گا۔ ابھی تو استاد کی تنخواہوں کی طرف لوگوں کا ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور بعض بعض صوبوں میں پرائمری اسکول کے پڑھانے

والوں کو صرف تین روپے ماہوار ملتے ہیں۔ موجودہ حالات میں اپنے تعلیمی کام کو تنخواہ کی کمی بیشی سے ناپنا کچھ بیجا سا ہے اور ایسی حالت کی شکایت کرنا ہے جو اپنے بس میں نہیں ہے۔ اگر نئی تعلیم کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کا خیال ہے اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی کچھ تعلیمی تجربے ہوں اور دوسروں کی تقلید ہی تقلید نہ ہو تو قومی اسپرٹ سے کام کئے جائیے اور اس اسکیم کو کامیابی کی طرف بڑھانے میں نمایاں حیثیت حاصل کیجئے میں دیکھتا ہوں کہ جن مدارس میں استاد تنخواہوں کا خیال کئے بغیر نئی تعلیم کے کام کو کر رہے ہیں۔ اُن میں اس اسکیم کو کافی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ناکامیوں پر قابو پانے کے لئے نئی نئی ترکیبیں سوچی گئی ہیں اور اس طرح نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ ان کے کام میں زندگی پائی جاتی ہے پیدا لی نہیں ان مدرسوں کے استادوں نے اس اسکیم کو اچھی طرح چلانے کے کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ گو ایسے مدرسے ملک میں ابھی کم ہی ہیں لیکن ایسے مدرسوں ہی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ نئی اسکیم کی ہر خوبی اپنے اندر پیدا کر سکیں گے اور ہر بات کے ممکن ہونے یا نہ ہونے کا صحیح ثبوت پیش کر سکیں گے جس خیال کو میں نے پیش کیا ہے۔ اس خیال کے استاد ملک میں بہت تھوڑے ملیں گے اور ان کی خاطر خواہ ہمت افزائی بھی نہیں ہو رہی ہو گی جو تنخواہ کا بدل ہو سکتی تھی لیکن نئی اسکیم کو کامیابی سے چلانے کے لئے ایسے ہی استادوں کی ضرورت ہے جو تمام حادثات کو برداشت کر سکیں اور کام میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پیدا ہونے دیں۔ نئی اسکیم کے استادوں کے لئے یہ ایک بنیادی خوبی ہے۔

اس کے علاوہ استادوں میں تعلیمی سوجھ بوجھ کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ تعلیمی کام سے پڑھانے والے کی طبیعت کو قدرتی لگاؤ ہو۔ وہ اپنے فرصت کے اوقات میں بھی تعلیمی مسائل پر غور کرتے ہوں اور ان کے حل کے متعلق سوچتے ہوں تعلیمی سوجھ بوجھ کا ملکہ بعض استادوں میں بالکل قدرتی ہوتا ہے اور ٹریننگ سے اس میں خاص جلا ہو جاتی ہے لیکن جن لوگوں کو تعلیمی کام کاج سے قدرتی لگاؤ نہیں ہوتا ٹریننگ سے ایک حد تک اس کمی کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ بات پیدا نہیں ہوتی جن لوگوں کی طبیعتوں کو تعلیمی کام کاج سے بالکل مناسبت نہیں ہے ان کا اس اسکیم کے چلانے کی ذمہ داری لینا محض اس خیال سے کہ اس بیکاری کے زمانہ میں کوئی اور کام نہیں ملتا تو تعلیمی کام کرنے لگیں۔ مفید نہ ہوگا۔ ٹریننگ لیکر بھی کوئی خاص

بات پیدا نہیں ہوگی خواہ ایسے استاد ایثار و قربانی کے مجسمہ ہی کیوں نہ ہوں۔ ان کے ایثار اور قربانی سے اس اسکیم کو کوئی فائدہ نہیں پہونچے گا۔ جہاں تک درس و تدریس کا تعلق ہے ایسے استادوں کو اپنے کام میں کوئی لطف نہیں آئے گا بلکہ بیدلی ہی بیدلی نظر آئے گی بالکل بے نتیجہ کام ہو رہا ہوگا۔

تیسری اہم بات استادوں کے لئے یہ ہے کہ وہ نئی اسکیم کے نصاب سے پوری طرح واقف ہوں خواہ وہ نصاب پہلی جماعت کا ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف نصاب سے واقف ہوں بلکہ نصاب کے پڑھانے اور پیش کرنے کے دوران میں جن ضروری مسائل کے پیدا ہونے کا امکان ہو ان سے بھی واقف ہوں پڑھاتے پڑھاتے کہیں سیر کا پروگرام آجاتا ہے یا مشاہدہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اور بہت سے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جو نصاب میں نہیں دیے جاتے ہیں لیکن استاد کی معلومات اس قدر وسیع ہو کہ وہ طلبا کے سوالات سے گھبرا نہ جائے، لاچار اور مجبور نہ ہو جائے بلکہ ان کی صحیح رہنمائی کرے انھیں صحیح طریقہ پر مشاہدہ اور سیر کرائے اور پوری طرح فائدہ اٹھانے دے۔ استاد نہ صرف واقف ہوں بلکہ اسے پڑھانے کے گر بھی اچھی طرح جانتے ہوں بعض ایسے استاد دیکھنے میں آئے ہیں جو نصاب کے متعلق بہت وسیع معلومات رکھتے ہیں لیکن وہ طلبا کو بتلانے اور سمجھانے سے واقف نہیں ہوتے۔ کبھی ڈسپلن خراب ہوتا ہے کبھی اس قدر وسیع معلومات دیتے ہیں کہ طلبا سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کبھی معلومات اس قدر خشک طریقہ سے پیش کی جاتی ہے کہ طلبا بددل ہو جاتے ہیں اور استاد سے جلد چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں کبھی وہ اپنے وسیع معلومات سے ایسے اپنے نوٹ ترتیب دے کر طلبا کو لکھاتے ہیں کہ طلبا لکھتے لکھتے اور انھیں دوبارہ نقل کرتے کرتے اُکتا جاتے ہیں اور امتحان کے موقع پر انھیں ایک مصیبت سمجھ کر یاد کرتے ہیں لیکن پھر بھی یاد نہیں ہوتے۔ یہ سب طریقۂ تعلیم کے نہ جاننے کے نتائج ہیں۔ ایسے استاد بھی ہیں جو نصاب سے تو تھوڑی واقفیت رکھتے ہیں مگر پڑھانے کے گر سے ایسے واقف ہوتے ہیں کہ طلبا میں سمجھ پیدا کر دیتے ہیں انھیں اپنے پیروں پر کھڑا کر دیتے ہیں طلبا سے مشورہ کر کے ایک ایسا لائحہ عمل تیار کرتے ہیں کہ طلبا تمام پڑھائی میں جان محسوس کرتے ہیں۔ وہ مضمون زیر بحث کے متعلق مواد فراہم کرنے کا شوق پیدا کر دیتے وہ اپنے طریقہ سے پڑھائی کو بامقصد بنا دیتے ہیں۔

بہرحال نفس مضمون سے واقفیت کے ساتھ ساتھ طریقۂ تعلیم سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہئے کیونکہ تعلیمی میدان میں یہ بات زیادہ ضروری ہے۔ اس سے نصاب کی دشواریاں بھی حل کی جاسکتی ہیں اور طلبا کو صحیح رہنمائی بھی دی جاسکتی ہے۔ نئی تعلیم میں تعلیم کے گروں کا جاننا اور استعمال کرنا اتنا ہی ضروری ہو جتنا پرانے طریقوں میں اس کا نہ جاننا اور نہ استعمال کرنا، پرانے طریقۂ تعلیم میں امتحان، مار دھاڑ، سرپرستوں کے خوف وتنبیہ سے کچھ نہیں تو چالیس فی صدی نتیجے تو نکل ہی آتے ہیں لیکن نئی تعلیم میں اس قسم کی سرزنش اور لگاؤ کی اجازت نہ ہوگی۔ یہاں تو سرپرست اس کی شکایت کریں تو انھیں سمجھانے کی ضرورت ہوگی کہ وہ تعلیمی معاملات میں ماربیٹ کو روا نہ رکھیں اس سے بچے کی ساری اُپج ختم ہو جاتی ہے۔ نئی تعلیم میں تو طریقۂ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کی ضرورت ہوگی۔ اس میں تعلیم کے نئے نئے گروں کو استعمال کرکے اور پرانے تمام طریقوں سے قطع نظر کرکے سو فی صدی نتایج کی توقع کی جائے گی اس لئے یہ کام پہلے سے زیادہ کٹھن ہوگا۔

تعلیم کے اچھے طریقے اور گُر ٹریننگ اسکولوں میں ہی نہیں سیکھے جاتے۔ یہ طریقے طلبا میں اٹھنے بیٹھنے اور ان سے گفتگو کرتے ان کے مسائل سمجھنے تعلیم کو ان کی طبیعتوں کے مطابق بنانے، ان کی دقتوں کو رفع کرنے اور طلبا کے ہو رہنے ہی سے حاصل ہوتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے کبھی کسی ٹریننگ اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ زیادہ لوگ ایسے ہوئے جنھوں نے خود طلبا کے لئے مدارس کھولے۔ ان میں تعلیم دی تجربے حاصل کئے اور ان تجربوں کا ریکارڈ رکھا۔ اس طرح تعلیمی اصول ترتیب دیئے جن سے ہم آج فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں استادوں کی تربیت کا مخالف ہوں لیکن اس کی اہمیت اس تجربہ کے آگے کچھ بھی نہیں ہے جو پڑھانے والے مدرسہ میں اپنی لگاتار محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ استاد کی ٹریننگ تو صرف اس بات کی سند ہے کہ آپ کو تعلیمی تجربے کرنے کے گُر ایک حد تک بتلادئے گئے ہیں۔ لہٰذا ٹرینڈ مدرسین اگر اپنے کام کا ریکارڈ نہیں رکھتے، اپنے تجربوں کو قلم بند نہیں کرتے اپنے سوچے ہوئے طریقۂ تعلیم کو لکھتے نہیں تو وہ نئی تعلیم کے لئے مفید نہیں ہوسکتے۔ اس لئے کام کرنے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلم ہے۔ ہندوستان میں تعلیمی تحریک کا آغاز ابھی چند سال ہوئے ہوا ہے۔ اس لئے پہلے

پہلے ہمارا تقلید ہی دور تھا۔ دوسروں کا ہر تجربہ پسند آتا تھا اور اپنی ہر بات بے اصول معلوم ہوتی تھی۔ لہذا اگر ہمیں دوسرے ممالک کے مدارس کے برابر کی اہمیت حاصل کرنی ہے تو اپنا کوئی ۔ ہرا یہ جمع کرنا چاہئے خواہ وہ کتنا ہی نامکمل کیوں نہ ہو۔

تعلیم کو بہتر بنانے کے لئے بچوں کی طبیعتوں اور ان کی عادتوں سے واقف ہونا بھی بہت ضروری ہے اور حرفوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے لئے اس کی ضرورت اور بھی مسلم ہے۔ حرفوں کے کرانے کے دوران مین جو جوش اور یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اُس سے بہتر طریقہ پر فائدہ اٹھانے کے لئے استاد کو بچوں کی طبیعتوں میں کافی دخل ہونا چاہئے۔ وہ اس سے بخوبی آگاہ ہو ورنہ وقت پر اس سے فائدہ نہ اٹھانے سے تمام جوش اور دلچسپی کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس بات کے سمجھنے اور استعمال کرنے سے نہ صرف تعلیم بہتر طریقہ پر دی جا سکتی ہے بلکہ بچوں کی انفرادی نشو ونما صحیح اور بہتر طریقہ پر ہو سکتی ہے۔ جو استاد بچوں کے کام کا ریکارڈ برابر رکھتے ہیں۔ بچوں کے رجحانات کو نوٹ کرتے رہتے ہیں اور اپنے طریقوں کو اُن کی طبیعتوں کے مطابق استعمال کرتے رہتے ہیں۔ وہ رفتہ رفتہ بچوں کی طبیعتوں سے واقف ہو جاتے ہیں ٹریننگ اسکولوں میں اس بات پر کافی زور دینا چاہئے۔ وہاں اس کو مرکزی جگہ ملنی چاہئے۔ اس کے لئے کتابیں اور عملی طور پر مشاہدہ کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ ہندوستان کے بیشتر استادوں میں اس فن کی کمی ہے۔ جانتے ہیں لیکن استعمال نہیں کر سکتے۔ طریقہ تعلیم کے موثر طریقہ پر استعمال ہونے کی صورت جب ہی ہو سکتی ہے جب استاد بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقف ہو۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ استاد اپنے طریقہ سے اسباق کو بہتر طریقہ پر ترتیب دیں۔ مواد جمع کریں (Teaching Aids.) بنائیں لیکن ان تمام باتوں کے ہوتے ہوئے بچے اسباق کے سیکھنے کی طرف مائل نہ ہوں اور اس طرح استاد کی تمام کوششیں بیکار جائیں لہذا استاد کو بچوں کی طبیعت سے بخوبی واقفیت ہونی چاہئے۔

میں نے چند نہایت ضروری باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس میں اُن خوبیوں کو بیان کیا ہے جو نئی تعلیم کے پڑھانے والوں میں ہونی چاہئیں میں نے عمداً ان خامیوں کو نہیں بیان کیا ہے جو اس قسم کی تمام خوبیوں کے ہوتے ہوئے استادوں میں ہوتی ہیں۔ آخری خوبی حرفہ ہے۔ جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے

ہیں وہ کئی حرفے جانتے ہوں۔ حرفوں کو اس طرح جانتے ہوں کہ بچوں کو اچھی طرح سکھلا سکتے ہوں۔ اکثر استاد کئی حرفے جانتے ہیں لیکن ایک جماعت کے تیس پینتیس لڑکوں کو سکھلانے میں انھیں بڑی دقت ہوتی ہے اور اس اسکیم میں یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ کہ اتنے بچوں کو بیک وقت کوئی دستکاری کس طرح سکھائی جائے اس کے متعلق تجربہ کے بعد ہی کوئی صورت تجویز کی جاسکتی ہے لیکن جو استاد نئی تعلیم کا کام کر رہے ہیں انھیں اس پر غور کرنا چاہیئے کہ بچوں کو حرفہ کس طرح سکھلانا چاہیئے اس لئے کہ بڑے طلبا کو کوئی دستکاری سکھانے کے مقابلہ میں بچوں کو سکھلانا بہت دشوار کام ہے اور اس صورت میں جبکہ اس سے تعلیمی فائدہ بھی حاصل کرنا ہو اگر تعداد کا مسئلہ نہ بھی ہو پھر بھی بچوں کو سکھلانے کا مسئلہ اپنی جگہ پر خود بھی بہت اہم ہے۔ دستکاری جاننے اور بچوں کو سکھلانے کے ساتھ ساتھ استاد حرفوں سے جہاں تک ممکن ہو تمام مضامین کے پڑھانے میں مدد بھی لے سکتا ہو۔ حرفوں کے کرانے میں جتنا تعلیمی کام ہو سکتا ہو اسے کرا سکتا ہو۔ حرفوں کے ذریعہ تعلیم بامعنی اور بامقصد بنا سکتا ہو طلبا کو جتنی خوشی، جتنا حوصلہ اور جتنا جوش حرفہ کرنے میں ہوتا ہے وہی خوشی وہی حوصلہ اور وہی جوش تعلیم کے حصول میں بھی پیدا کر سکتا ہو۔ حرفہ علیحدہ اور تعلیم علیحدہ کی صورت نہ پیدا ہونے دے بلکہ حرفوں کو تعلیم کا ذریعہ بنا سکتا ہو۔ وہ محض تصورات کی دنیا میں نہ ہو کہ تمام تعلیم حرفہ کے ذریعہ ہو رہی ہے حالانکہ دراصل ایسا نہ ہو۔

سید احمد علی

جامِ صہبائی

(۱)
جب ظلمتِ غم سے روشنی ملتی ہے
جب دردِ الم سے بےخودی ملتی ہے
اک یہ بھی مقامِ عشق ہے اے ہمدم!
جب موت سے صبحِ زندگی ملتی ہے

(۲)
یہ گردشِ صبح و شام ہے میرے لئے
یہ محفلِ خوش نظام ہے میرے لئے
گلہائے بہار، مہر و ماہ و انجم!
اے دوست یہ اہتمام ہے میرے لئے

(۳)
دشتِ دو جہاں ہے میرے بڑھنے کیلئے
ہے عرش کا بام میرے چڑھنے کیلئے
فطرت کا صحیفۂ مقدس اے دوست!
ہر وقت کھلا ہے میرے پڑھنے کیلئے

(۴)
حق کوش ہوں حق کی راہ پہ جاتا ہوں
دشوار گزار ہے، مگر جاتا ہوں
ہر گام پہ روکتا ہے باطل مجھ کو
ٹھکرا کے اسے اثرؔ گزر جاتا ہوں

(۵)
ہر گام پہ سنگِ رہ پاتا ہوں اسے
ٹھکرا کے مگر پرے ہٹاتا ہوں اسے
کر دیتا ہوں پاش پاش باطل کی چٹان
یا ہو کے بلند پھاند جاتا ہوں اسے

(۶)
اغیار سے بےنیاز کر دے یارب!
کاسہ مرا تو آپ ہی بھر دے یارب!
بارِ غمِ دو جہاں اٹھاؤں ہنس کر
وہ عزم وہ ہمتِ جگر دے یارب!

(۷)
ہے تیزیٔ راہرو کو منزل کی تلاش
بےتابیٔ موج کو ہے ساحل کی تلاش!
ہر نقش کو کیوں مٹا رہی ہے؟ شاید
فطرت کو ابھی ہے نقشِ کامل کی تلاش

(۸)
مستی میں یمِ وجود لہراتا ہے!
تنکے کو گماں ہے۔ اس سے ٹکراتا ہے!
فطرت کا تو کھیل ہے، مگر انساں کو
فکرِ غمِ ہست و بود کھا جاتا ہے!

اثرؔ صہبائی

پیامِ زندگی

اٹھ کہ ہم تاریکیٔ شب سے سحر پیدا کریں
موت کے سینہ سے ہستی کے شرر پیدا کریں

تلخیوں میں لذتِ شہد و شکر پیدا کریں
زہر میں پھر آبِ حیواں کا اثر پیدا کریں

پھر خس و خاشاک سے گلہائے تر پیدا کریں
خاکِ بے مایہ سے پھر لعل و گہر پیدا کریں

دل تو ہے یک قطرۂ خوں گرم، دل کی اصل کیا
رنگِ خارا میں در آئے وہ نظر پیدا کریں

جس کی ضو سے جگمگا اٹھے شبِ تارِ حیات
توڑ کر مہر و ستارے وہ قمر پیدا کریں

جو نہ ہو منزل پہ قائم جو نہ ہو سمتوں سے قید
کارواں میں وہ نئی روحِ سفر پیدا کریں

نرم اور سنگین راہوں سے گذرنے کے لئے
آنکھ شبنم کی تو ہیرے کا جگر پیدا کریں

کو نکرا دیں جو حائل ہوں کشود کار میں
اس طلسمی گنبدِ بے در میں در پیدا کریں

لوچ میں موجِ نسیم اور کاٹ میں تیغِ اصیل
مکتبِ نو سے وہ طفلِ باخبر پیدا کریں

دے سکے انسان کو ہر قید و غلامی سے نجات
دھن کی پکی ایسی اک نوعِ بشر پیدا کریں

زندگانی کی مسلسل چلچلاتی دھوپ میں
نزہت و رنگینیٔ موجِ گہر پیدا کریں

دم میں یہ سارا طلسمِ عہدِ حاضر ٹوٹ جائے
پنجۂ فولاد و ضربِ کارگر پیدا کریں

سست بنیادوں کو ڈھا کر اس جہانِ خام کو
اک جہانِ دیگر و پائندہ تر پیدا کریں

سروش عسکری طباطبائی بی۔ اے لکھنوی

خوابِ ہستی

وہ زمانے اور تھے جب تیرا غم سہتا تھا میں
جب ترے ہونٹوں کی رنگینی سے کچھ کہتا تھا میں
جب ترے بالوں سے گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا میں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یک بیک بجلی سی چمکی اور نشیمن لٹ گیا
تو نے برسوں جس کو سینچا تھا وہ گلشن لٹ گیا
تو نے موتی جس میں ٹانکے تھے وہ دامن لٹ گیا
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

تجھکو جس دل سے محبت تھی وہ اب دل ہی نہیں
رقص جس کا تجھکو بھاتا تھا وہ بسمل ہی نہیں
رنگ محفل تجھ سے کیا کہیئے وہ محفل ہی نہیں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

اب نہ وہ شوق تصور، اب نہ وہ ذوق فغاں
مٹ رہے ہیں رفتہ رفتہ عہد رفتہ کے نشاں
دھندلی دھندلی سی نظر آتی ہیں کچھ پرچھائیاں
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

یہ جوانی، یہ پریشانی، یہ پیہم اضطراب
بارہا انجمن میں دوڑا ہوں سوئے جام شراب
بارہا گھبرا کے چھیڑا ہے گناہوں کا رباب
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

رنگ صہبا اور ہے صہبا کی مستی اور ہے
ذکر ہستی اور ہے، احساس ہستی اور ہے
خواب ہستی اور ہے تعبیر ہستی اور ہے
بھول جا اے دوست وہ رنگیں زمانے بھول جا

معین احسن جذبی

غزل

آنکھوں میں بس کے دل میں سما کر چلے گئے
خوابیدہ زندگی تھی جگا کر چلے گئے

حسن ازل کی شان دکھا کر چلے گئے
اک واقعہ سا یاد دلا کر چلے گئے

چہرے تک آستین وہ لا کر چلے گئے
کیا راز تھا کہ جس کو چھپا کر چلے گئے

دے کر خود اپنے ہاتھ سے اک درد لادوا
میری خودی کو ہوش میں لا کر چلے گئے

سمجھا کے پستیاں میرے اوج کمال کی
اپنی بلندیاں وہ دکھا کر چلے گئے

اپنے فروغ حسن کی دکھلا کے وسعتیں
میری حدود شوق بڑھا کر چلے گئے

شکر کرم کے ساتھ یہ شکوہ بھی ہو قبول
اپنا سا مجھ کو کیوں نہ بنا کر چلے گئے

آئے تھے دل کی پیاس بجھانے کے واسطے
اک آگ سی وہ اور لگا کر چلے گئے

آئے تھے چشم شوق کی حسرت نکالنے
سر تا قدم نگاہ بنا کر چلے گئے

اب کاروبار عشق سے فرصت مجھے کہاں
کونین کا وہ درد بڑھا کر چلے گئے

میری حیات عشق کو دے کر جنون شوق
مجھ کو تمام ہوش بنا کر چلے گئے

لب تھرتھرا کے رہ گئے لیکن وہ اے جگر
جاتے ہوئے نگاہ ملا کر چلے گئے

جگر مراد آبادی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

سازو آہنگ :- از مولٰنا سیماب اکبرآبادی۔ ملنے کا پتہ مکتبہ قصرالادب آگرہ۔ سائز ۲۲×۱۷/۸ صفحات ۲۰۴ قیمت مجلد ۲ روپے۔ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مولٰنا سیماب کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کل نظمیں پانچ حصوں میں منقسم ہیں (۱) قومیت سیاست، وطنیت (۲) مذہب، اخلاق، معاشرت (۳) شعر و حکم (۴) معتقدات (۵) بچوں کے لئے۔

اب تک ہم مولٰنا سیماب کو محض غزلگو شاعر کی حیثیت سے جانتے رہے ہیں اور وہ بھی پرانے اسکول کے یعنی جہاں الفاظ ہمیشہ معانی پر فوقیت اور برتری رکھتے ہیں۔ سیماب صاحب کے یہاں ان کی غزلیات میں یہ چیز بہت ملتی ہے۔ ان نظموں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر پرانے اسکول کا کوئی شاعر نظم گو ہو جائے تو اس کا کیا رنگ ہوگا جہاں تک قادر الکلامی، الفاظ کی نشست، قوافی کی درستگی، صناعی کا تعلق ہے مولٰنا سیماب اپنی مشق سخن کے باعث کافی اونچے درجوں پر پہنچ چکے ہیں۔ نظمیں انھوں نے زمانے کا رنگ دیکھکر کہنا شروع کیں۔ اس میں انھوں نے پیامات بھی دیئے ہیں اپنے احساسات کی تیزی بھی دکھائی ہے ہر قسم کی اور ہر رنگ کی نظمیں لکھی ہیں لیکن ابھی معانی پر سے وہ الفاظ کی چادر نہیں اٹھی ہے اقبال کی نقل ہے لیکن اقبالیت نہیں پیدا ہوئی ہے۔ پھر بھی ہم مولٰنا سیماب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے یہ رنگ اختیار کیا۔ نظمیں ان کی غزلوں سے یقیناً بہتر ہیں۔ آئندہ بھی اگر آپ نظمیں لکھتے رہے تو امید ہے سوز و گداز بھی پیدا ہو جائے گا۔ کچھ کام کی باتیں بھی کہہ سکیں گے اور ان کا وہ غزلوں والا تصنع اور خالی لفظی سجاوٹ بھلے کو دور ہو جائے گی۔ پیش نظر نظموں میں بعض بعض بہت اچھی ہیں امید ہے شائقین اس مجموعہ سے لطف اٹھائیں گے۔

حیات و غزلیات غالب (بہ زبان انگریزی) از عبداللہ انور بیگ ایم۔ اے" ایل ایل بی مطبوعہ اردو اکاڈمی لاہور، سائز ۲۲×۱۸/۸ صفحات ۱۸۱ قیمت ؏/ کاغذ و طباعت بہت عمدہ معہ سہ تصاویر جو غالب

کے اشعار سے متعلق ہیں)

اردو اکاڈمی لاہور نے غالب کی زندگی اور کلام کو انگریزی داں طبقے میں اس کتاب کے ذریعہ روشناس کرانے کی کوشش کی ہے مقصد یہ ہے کہ ہمارے شاعری کے بہترین غزلگو شاعر سے غیر زبان والے بھی لطف لے سکیں۔ شروع میں جان کلا یو روے کا دیباچہ ہے۔ موصوف غالب کے کلام سے متاثر یا واقف نہیں معلوم ہوتے

اکاڈمی مذکور کے خلوص نیت سے تو ہرگز انکار نہیں ہو سکتا لیکن افسوس ہے کہ انور بیگ صاحب اس کارِ عظیم میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ جہاں تک حیات غالب کے حصے کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ غالب نامہ کی بدولت انھیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی اور غالب کی زندگی اور ان کا زمانہ خاصی اچھی طرح پیش نظر ہو جاتا ہے۔ کلام کے انتخاب اور ترجمے میں البتہ خامیاں ہیں۔ اول تو انتخاب میں صرف ان اشعار کو لینا چاہئے تھا جن میں مطالب کی خوبی ہے اور جن میں الفاظ کی صناعی ہے یا لفظی دروبست کی خوبی ہے یا وہ اشعار جو انھوں نے فارسی نما اردو میں لکھے ہیں انھیں ہاتھ نہ لگانا چاہئے تھا اور اگر ایسا کیا بھی تھا تو بالکل لفظی ترجمہ نہ ہوتا جس سے نہ صرف یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ سمجھ میں نہیں آتا بلکہ غالب کی طرف سے سوءظنی پیدا ہونے لگتی ہے انتخاب میں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا کہ ہم ترجمہ جن لوگوں کے لئے کر رہے ہیں ان کا مذاق شعری کیا ہے اور کس رنگ میں وہ چیزیں دیکھنے کے عادی ہیں پھر غالب کے تخیل کو انھیں کے رنگ میں پیش کرنا چاہئے تھا تاکہ وہ غالب سے لطف اندوز ہو سکیں مثال کے طور پر اس قسم کے اشعار نہ ہونا چاہئے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیمتن کے پانو — رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

زخم نے داد نہ دی تنگی دل کی یارب — تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

دوسری خرابی لفظی ترجمہ کی ہے۔ اول تو اس سے لطف آنا تو درکنار غالب کے معانی کا اندازہ ہی نہیں ہوتا شعر محض ایک چیستان معلوم ہوتا ہے اور بجائے حظ کے دردِ سر حاصل ہوتا ہے۔ ترجمہ اگر ایسا ہوتا کہ اچھی انگریزی کے ساتھ معانی کا لطف بھی خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والے پر کھل سکتا تو غالب کی صناعی اور معنوی خوبیاں انگریزی داں طبقہ پر خوبی روشن ہو سکتی تھیں اور غالب کی قدر و قیمت بھی بڑھ سکتی تھی۔ بالکل لفظی ترجمہ کر دینے سے نہ تو غالب کے معانی کی خوبی ظاہر ہو سکی ہے نہ اس کی فن کاری۔ مثلاً ذیل کے اشعار کے معانی جو کچھ

انگریزی ترجمہ سے ظاہر ہوئے وہ محض صفر ہیں۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

سبزہ خط سے ترا کاکل سرکش نہ دبا — یہ زمرد بھی حریف دم افعی نہ ہوا

تیسری بات یہ کہ صرف یہی نہیں کہ ترجمہ اور انگریزی اچھی اور شاعرانہ نہیں ہے بلکہ بعض جگہ ترجمہ صحیح نہیں ہو سکا ہے کہیں الفاظ کا اور کہیں پورے مصرعہ یا شعر کا۔ مثلاً درج ذیل مصرعے اور اشعار کا ترجمہ مبہم اور غلط ہے۔

ص ۸۵ — کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

ص ۸۶ — سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری

ص ۸۸ — دل نہیں ورنہ دکھاتا تجھکو داغوں کی بہار

ص ۱۳۰ — تیری فرصت کے مقابل اے عمر

ص ۱۳۴ — گرم تماشا

ص ۱۳۵ — وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو — وغیرہ

غرضکہ اغلاط بہت کافی ہیں اور بالکل لفظی ترجمہ نے غالب کی اسپرٹ پر پانی پھیر دیا ہے امید ہے اردو اکاڈمی آئندہ اڈیشن میں اس ظاہری خوبی کے ساتھ صحت اور ترجمہ کی خوبی کی طرف بھی بہت احتیاط برتیگی تاکہ غیروں کے ہاتھ میں ہماری جو چیز جائے وہ بہتر سے بہتر صورت میں ہو۔

متاع حرم :- از زیب عثمانیہ ملنے کا پتہ کریمی دواخانہ بازار شیخو پورہ لودیانہ (پنجاب) سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۴۳، قیمت ایک روپیہ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

زیب عثمانیہ صاحبہ لودیانوی کی نظمیں عرصہ سے رسالوں میں شائع ہو رہی ہیں۔ آپ کی نظمیں اپنی سادہ بیانی اور پاکیزگی خیال کے باعث خاص اثر رکھتی ہیں پوری کتاب باعتبار موضوع تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہے (۱) چمن گل (۲) نیستان نالہ (۳) خمخانۂ مے۔ پہلے حصے میں چھوٹی چھوٹی ادبی نظمیں ہیں مثلاً پروانہ، سرو، لالہ، غنچہ وغیرہ دوسرے حصے میں اصلاحی نظمیں ہیں جو قوم کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ تیسرے حصے میں

عام تغزل کے رنگ کا کلام ہے۔ محترمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کا شعر کوئی نہ کوئی نکتہ اپنے اندر ضرور لئے ہوئے ہوتا ہے کوئی نہ کوئی پیغام وہ ضرور دینا چاہتی ہیں۔ اقبال کا اثر اور تقلید ہر جگہ کرنے کی کوشش کی ہے ان کا کلام تفریح یا دلچسپی کی خاطر نہیں لکھا گیا ہے۔ ہمیشہ اصلاح پیش نظر رکھتی ہیں ان کا آرٹ ہمیشہ مقصد کے زیر تحت رہتا ہے اسی لئے زیادہ تر ان کا اسلوب ناصحانہ رہتا ہے۔ یہ چیز ایک شاعر کے لئے ناقص اور ایک مصلح کے لئے قابل تعریف ہے۔ اقبال کے آخری دور کے کلام کا اثر زیب صاحبہ نے زیادہ لیا ہے بہ نسبت ان کے ابتدائی کلام کے۔ اسی لئے شعریت ان کے یہاں کم ہے نصیحت زیادہ ہے۔ پھر بھی پختگی اور روانی کلام کو بلندی پر رکھتی ہے۔ جو قابل ستائش چیز ہے

کملا:۔ مترجمہ راجہ مہدی علی خاں۔ ملنے کا پتہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۲۳۱، قیمت مجلد عہ، کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ بنگالی زبان کے ایک مشہور ناول "بارواری" کا اردو ترجمہ ہے 'بارواری' کی تیاری میں بارہ مختلف مصنفوں نے حصہ لیا تھا۔ ترجمہ آزاد صاف اور شگفتہ ہے۔ ناول کا پلاٹ ذرا پیچیدہ ہے اور کوئی ندرت نہیں لیکن جب زیادہ لکھنے والے ہوں تو عموماً ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ پھر بھی بنگالی ہندو سماج کے بعض بعض اچھے مرقعے ملتے ہیں۔

ضیغم ایران رضا شاہ پہلوی:۔ مرتبہ انعام اللہ خاں ناصر۔ ملنے کا پتہ کامل بکڈپو لاہور، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ صفحات ۱۰۴، قیمت مجلد عہ، کاغذ کتابت اور طباعت معمولی۔

افسوس ہے کہ رضا شاہی دور ایران میں ختم ہو گیا اور حکومت کی بے بسی اور بے چارگی تمام دنیا نے دیکھ لی۔ کہاں تک یہ بے چارگی بدانتظامی کا نتیجہ تھی یہ ابھی صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ مسلم ہے کہ رضا شاہ نے موجودہ ہوا کا رخ نہ پہچانا جس کی بدولت ملک کو غیروں کے سپرد کر کے گوشہ نشین ہونا پڑا حالانکہ موجودہ واقعات اس کتاب میں نہیں آسکے ہیں پھر بھی ناصر الدین شاہ قاچار کے زمانے سے لے کر ۱۹۴۱ء تک کے حالات مختصراً دیئے گئے ہیں۔ ترتیب خاصی ہے عام معلومات کے لئے اچھی کتاب ہو

دوسری جنگ عظیم:۔ مرتبہ محمد مرزا دہلوی۔ ملنے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$

صفحات ۳۰۴، قیمت مجلد عہ کاغذ کتابت اچھی، طباعت معمولی۔

محمد مرزا صاحب نے اس کتاب میں صرف موجودہ جنگ عظیم کے حالات ہی نہیں پیش کئے ہیں بلکہ پہلی جنگ عظیم کے اسباب اور اس کے بعد کے اثرات کی بدولت یورپ کی سیاست کی جو حالت ہو گئی اور جن کے باعث موجودہ جنگ وقوع میں آئی۔ ان سب کا محاکمہ بڑی لیاقت سے کیا ہے جنگ اور اس کا پس منظر سمجھنے سے حالیہ حقیقتیں تمام روشن ہو جاتی ہیں۔ زبان و بیان کی پختگی اس کے علاوہ ہے

خطوط غالب: - مرتبہ مہیش پرشاد صاحب ملنے کا پتہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد۔ سائز $\frac{20\times 26}{8}$ صفحات ۴۴۴ قیمت للعہ مجلد صر، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

اب تک غالب کے خطوط محض دو جلدوں یعنی عود ہندی اور اردوئے معلٰی کے نام سے چھپے تھے لیکن ان میں بہت سے اغلاط تھے نیز ان میں تاریخیں موجود نہیں تھیں منشی مہیش پرشاد صاحب نے تمام وہ خطوط نیز نواب رامپور کے خطوط اس کے علاوہ جو مستند رسالوں میں نکل چکے ہیں اور جو کچھ اب تک شائع نہیں ہو سکے ان سب کو بڑی سعی اور کاوش سے تلاش کر کے مرتب کیا ہے۔ ہندوستانی اکاڈمی انہیں دو جلدوں میں شائع کر رہی ہے۔ یہ پہلی جلد ہے اس پر نظر ثانی عبدالستار صدیقی صاحب نے کی ہے اور انھوں نے بہت سے مفید حواشی اس پر اضافہ کئے ہیں غالب کے خطوط اور لفافے کی عکسی تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ مکاتیب غالب عرشی کے بعد غالب کے خطوط پر یہ دوسری مستند کتاب شائع ہوئی ہے جس پر مصنف اور ناشرین دونوں لائق مبارکباد ہیں۔

آزادی ہند: - از مہاتما گاندھی ملنے کا پتہ شری گاندھی سیوا آشرم بکڈپو۔ ۴ کورٹ اسٹریٹ لاہور سائز $\frac{20\times 30}{16}$، صفحات ۲۱۴ قیمت ۶ر کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ کتاب دراصل انڈین ہوم رول کا ترجمہ ہے یعنی وہ مضامین ہیں جو گاندھی جی نے افریقہ میں لکھے تھے اور جب وہاں ستیہ گرہ کی تحریک میں مصروف تھے۔ اس کا ترجمہ ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں ہو چکا ہے حالانکہ اسے لکھے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ پھر بھی سیاسیات ہند کے مطالعہ کرنے والوں کو اس میں انکے مطلب کی بہت سی چیزیں ملیں گی اور بہت اچھی چیزیں ملیں گی

دکھی دنیا: ۔ از راجگوپال صاحب اچاریہ ملنے کا پتہ شری گاندھی سیوا آشرم بکڈپو نمبر ۴ کورٹ اسٹریٹ لاہور۔ صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲ر کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

گاندھی سیوا آشرم کی یہ دوسری اشاعت ہے راجگوپال صاحب اچاریہ صرف سیاست ہی کے مرد میدان نہ تھے بلکہ اس کتاب کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو تصنیف سے بھی شوق ہے۔ دکھی دنیا دراصل سات چھوٹی چھوٹی حکایتوں کا مجموعہ ہے جو کانگریس کے تعمیری پروگرام کی اہمیت اور ان کا اثر دکھانے اور پھیلانے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ ترجمہ صاف اور سلیس ہے حالانکہ مصنف کا اسلوب تو ان میں نہیں آسکا پھر بھی اثر اور درد سے یہ ہماری زندگی کی کہانیاں خالی نہیں۔

کیا خوب آدمی تھا: ۔ ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس، کتاب گھر دہلی سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۱ قیمت ۸ر کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی نے "یاد رفتگاں" کے سلسلے میں متعدد تقریریں مختلف لوگوں سے کرائی تھیں۔ اسی سلسلہ کی گیارہ تقریروں کو حالی پبلشنگ ہاؤس نے زیور طبع سے آراستہ کیا ہے۔ جن مرحومین پر تقریریں کی گئی ہیں ان کے نام یہ ہیں۔ مولانا راشد الخیری، حالی، نذیر احمد، چکبست، داغ، پریم چند، حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری، اقبال، سر راس مسعود، مولانا محمد علی جن لوگوں نے تقریریں کیں ان کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ ملا واحدی۔ خواجہ عبدالمجید دہلوی۔ مولوی عبدالرحمن پنڈت کیفی۔ بیخود دہلوی جے نندر کمار حکیم ذکی احمد محمد غالب دہلوی ممتاز حسین خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبدالماجد۔

یہ تمام تقریریں باوجودیکہ مختصر ہیں لیکن مرحومین کی زندگی اور سیرت پر بڑی اچھی روشنی ڈالتی ہیں ناشرین کتاب گھر لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے یہ مفید و دلچسپ چیز طبع کر دی۔ اگر دوسرے ایڈیشن میں ان ہی حضرات سے ان ہی مرحومین پر ذرا تفصیل سے یادگاریں لکھوانے کا التزام کیا جا سکے تو وہ اور بھی دلچسپ ہوگا کیونکہ ریڈیو پر وقت کا اختصار جی کھول کر کہنے نہیں دیتا۔ دنیا فانی ہے کون کس وقت چل بسے کچھ اعتبار نہیں جبتک یہ بزرگ حیات ہیں ان کی یادداشت سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

یادرفتگاں: ۔ از خواجہ عبدالمجید دہلوی۔ ملنے کا پتہ دنیا محل دہلی۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۱ قیمت دج

نہیں۔ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

خواجہ عبدالمجید صاحب دلی کے پرانے مشہور اور مستند صاحب قلم ہیں۔ آپ کی زبان خصوصاً ٹکسالی زبان ہے جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں انشاپردازی اور دہلی کے محاورہ اور سلاست سے ایک عجیب رنگ دیدیتے ہیں آپ کی عمر چونکہ مختلف زمانوں سے گذر چکی ہے اور بڑے بڑے لوگوں کی صحبت اُٹھائے ہوئے ہیں اس لئے آپ نے اپنی یادداشت سے یہ مختلف لوگوں کے حالات کا مجموعہ لکھا ہے یہ نہ صرف اپنی جگہ پر بہت دلچسپ اور مفید ہے بلکہ گذرے ہوئے لوگوں اور زمانہ کو ہم سے قریب کر دیتا ہے خواجہ صاحب کا انداز بیان طرفہ لذت دیتا ہے۔

فہرست نہیں دی گئی ہے لیکن عنوانات حسب ذیل ہیں۔ میر محبوب علی پاشا شاہ دکن۔ سر سالار جنگ اول۔ سر سالار جنگ ثانی۔ سر سید۔ شبلی۔ داغ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ حالی۔ شرر۔ عزیز۔ حکیم محمود خاں حکیم واصل خاں محسن الملک۔ وقار الملک وغیرہ۔

شرح درد:۔ خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی۔ ملنے کا پتہ ٹیا محل دہلی سائز ۲۲×۲۹/۱۶ صفحات ۲۱۲ قیمت عہ کاغذ، کتابت اور طباعت بہت اچھی۔

کلیات درد کی صحیح طباعت کی اشد ضرورت تھی۔ خواجہ محمد شفیع صاحب نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا بلکہ درد کے مشکل اشعار کی شرح بھی لکھدی ہے کیونکہ درد کا کلام زیادہ تر تصوف سے بھرا ہوا ہے اور اب تصوف کے سمجھنے اور سمجھانے والے لوگ کم ہیں امید ہے کہ یہ کتاب نہ صرف طالب علموں کے لئے مفید ہوگی بلکہ اردو ادب سے ہر دلچسپی رکھنے والے کے لئے ایک تحفہ ہوگی۔ خواجہ محمد شفیع صاحب کی زبان نے بھی شرح کو بہت شگفتہ بنا دیا ہے قابل مطالعہ چیز ہے۔

ممالک اسلامیہ کی سیاست:۔ از عبدالسلام خورشید صاحب بی۔ اے۔ ناشر قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور، سائز ــــــ صفحات ۲۹۳ قیمت عہ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

عبدالسلام صاحب نے ممالک اسلامیہ کی سیاست پر یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے لیکن موجودہ حالات اس میں نہیں آسکے ہیں اس کے علاوہ واقعات کا محض احصا کر دیا گیا ہے۔ ان سے کوئی

نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا ہے نہ کسی قسم کا محاکمہ ہوسکا ہے۔ ویسے عام معلومات کے لئے یہ کتاب بہت اچھی ہے۔

دنیائے آرزو:۔ از میرزا ادیب بی۔ اے (آنرز) ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور، سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۲۸ قیمت ۱۲؍ کاغذ کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ تین افسانوں کا مجموعہ تعلیم یافتہ بیکار نوجوانوں سے متعلق ہے جس میں ان کے درد بھری زندگی کے حالات ڈائری کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں میرزا صاحب کے قلم میں زور ہے اس لئے ان کے یہ افسانے بغیر اثر کئے نہیں چھوڑتے سرمایہ داری کی لعنتوں کے خلاف آج کل اردو کے جتنے ادیب قلمی بغاوت کررہے ہیں ان میں میرزا صاحب کا بھی نام لیا جائے گا۔ باوجود میرزا کی ادیبانہ شگفتگی کے حقائق کی تلخی پوری طرح نمایاں رہتی ہے اور بعض بعض جگہ نفسیاتی مطالعے اچھے نظر آتے ہیں۔

سرسید احمد پاشا یا قاف کی پری:۔ از علی عباس حسینی ملنے کا پتہ بہار گوا بکڈپو امین آباد لکھنؤ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۸۸ قیمت عمہ دوسرا اڈیشن کاغذ کتابت اور طباعت عمدہ

یہ حسینی صاحب کا ایک تخئیلی اور رومانی ناول ہے جو ۱۹۱۹ء میں پہلی دفعہ نکلا تھا۔ "گذارش" میں خود حسینی صاحب نے اعتراف کیا ہے کہ اس میں وہ تمام خامیاں موجود ہیں جو ۱۹۱۹ء میں میرے سن کے اقتضا سے ہونا چاہئیں یعنی اس کا ہیرو پرانے قسم کا ہیرو ہے جو ہر جگہ اپنی جان دیدینے اور دوسروں کو بچانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ خودخوبیوں کا تپلا ہے۔ شجاعت اس کی کمزوری ہے۔ ایک حسینہ یا قاف کی پری کے عشق میں فرہاد کی طرح ناممکن سے ناممکن کام کے لئے تیار رہتا ہے آخر میں کامیاب ہوتا ہے۔

زبان، جملوں کی ساخت اور طرز بیان حسینی صاحب کا محتاج تعارف نہیں۔

رسید کتب

غریبوں کی گائے (تجارتی بکری خانہ) مرتبہ محمود مرزا صاحب قیمت ۴؍ صفحات ۲۲ ادارہ تجدید علم حیدرآباد دکن

ہندو مسلم اتحاد:۔ از ستیہ بھگت ستیہ آشرم وردھا، صفحات ۲۳ قیمت ۲؍

دیش کی لیلا (وطن کے متعلق اچھے گیت) از میاں عبدالمجید بھٹی۔ ہونہار بکڈپو ریلوے روڈ لاہور صفحات ۸۰ قیمت ۱۲؍

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائنس نواب صاحب بھوپال　　عالیجناب ہز ہائنس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپئے　　۶۰۰۰۰۰۰

جاری شدہ سرمایہ .... پچیس لاکھ روپئے　　۲۵۰۰۰۰۰

اداشدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ　　۱۰۲۵۹۰۵

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے. ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)

اور

احمدآباد

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خاص چیز پیش کی ہو زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں، جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر تیل سے سستا ہوتا ہے۔ مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے، بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوتی ہے،

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

مینیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

قرآن

حمائل کاویانی مطبع شرکت کاویانی برلن کی حمائل شریف۔ کاغذ و طباعت وغیرہ دیدہ زیب سائز نسبتاً چھوٹا۔ چند سال قبل اسی حمائل کا ہدیہ سے تھا۔ اور اب عام فائدے کے خیال سے صرف عہ

تاریخ القرآن از مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری قرآن کے جمع و ترتیب اور اس کی حفاظت نزول کی مکمل و دلکش تاریخ۔ (طبع دوم) قیمت عہ

تعلیمات قرآن اس کتاب میں جملہ اصول و عقائد اسلامی کی تفصیل خود قرآن کریم کی آیات ہی سے کی گئی ہے۔ دراصل یہ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں سوائے قرآن کے کسی دوسری کتاب یا کسی انسانی خیال سے مدد نہیں لی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کس قدر مکمل کتاب ہے جو اپنی تشریح کے لئے بالکل کافی ہے۔ قیمت دو روپے (عہ)

عقیدہ اعجاز القرآن ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب احراری۔ ایم۔ اے پی ایچ، ڈی کا وہ مقالہ جو انھوں نے اردو اکاڈمی کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا اس مقالہ میں اس عقیدہ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور تاریخ بیان کی گئی ہے کہ قرآن کریم ہی رسول مقبول کا معجزہ تھا۔ قیمت ۵ر

اقسام القرآن مصنفہ ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ۔ اس میں مولانا نے دکھلایا ہے کہ قرآن میں قسمیں کیوں کھائی گئی ہیں۔ اس کا جواب اپنے اپنے انداز میں امام رازیؒ اور حافظ ابن قیمؒ وغیرہ نے بھی دئے ہیں، مگر مولاناؒ نے ان کے جوابات کی کمزوریاں ظاہر کرکے اصل حقیقت بے نقاب کی ہے! اس سلسلہ میں قسم کی ضرورت، اس کی تاریخ۔ قسم کا ابتدائی مفہوم، اسکے طریقے وغیرہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ قیمت ۸ر

مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ نئی دہلی

مقدمۂ زندگانیٔ محمدؐ
عہد حاضر کی ایک بے مثال کتاب

زندگانیٔ محمد علامہ محمد حسین ہیکل وزیر تعلیم مصر کی ایک لاجواب تالیف ہے اس کتاب کی قدر و عظمت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پہلے ایڈیشن کی تین ہزار جلدیں پریس ہی میں فروخت ہو گئی تھیں اور باقی سات ہزار جلدیں مصر تین ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئیں۔ پھر ایران میں اس کا فارسی ترجمہ ہوا اور وہاں بھی ہزارہا کی تعداد میں شائع ہوا اب دفتر امت مسلمہ امرتسر نے زندگانیٔ محمد کے مقدمے کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں قرآن مجید کی ترتیب اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی پر اہل مغرب کے تمام اعتراضات کے نہایت مدلل اور معقول جواب دئے گئے ہیں اس کے متعلق مشاہیر و جرائد کے چند تبصروں کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ زندگانیٔ محمد ایک قابل قدر تالیف ہے۔ (اعلیٰ حضرت فرمانروائے مانگرول)

۲۔ زندگانیٔ محمد کا مقدمہ عالمانہ معلومات سے پُر ہے۔ میں نے اس کتاب کو دیکھتے ہی شوق سے پڑھا اور دلچسپ پایا۔ (سر عبدالقادر)

۳۔ بہت اچھی کتاب ہے اور بہت اچھا ترجمہ (ڈاکٹر ذاکر حسین پرنسپل جامعہ دہلی)

۴۔ جہاں تک مغرب زدہ گروہ کی پریشان خیالیوں کا تعلق ہے مصنف کی کوششیں مستحق اجر اور قابل داد ہیں۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

۵۔ علامہ محمد حسین ہیکل کی کتاب (زندگانیٔ محمد) یقیناً ممتاز درجہ رکھتی ہے (طلوع اسلام)

۶۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا۔ (سب رس)

۷۔ کتاب بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھی گئی ہے مسلمانوں کو اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ (شاعر)

۸۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ ازبس مفید ہے۔ (جامعہ)

۹۔ جو نوجوان اسلام اور پیغمبر اسلام کو اہل مغرب کی نظر سے دیکھتے ہوں، ان کے لئے اس پاکیزہ کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ (حمایت اسلام)

۱۰۔ ہندوستان کے اسلامی لٹریچر میں غالباً اس موضوع پر یہ پہلا مضمون ہے، جو اس جامعیت اور اختصار کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے (پیام نسواں)

لکھائی، چھپائی اور کاغذ صاف ستھرا صفحات ۱۲۸، ۱۳ر کے ٹکٹ بھیجکر ایک نسخہ طلب کیجیے۔

ملنے کا پتہ:۔ **دفتر امت مسلمہ امرتسر (پنجاب)**

سائنس

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

اگست ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ سائنس
۲۔ حیوانوں کی گرمائی اور سرمائی نیند
۳۔ ہمارے دانت
۴۔ دوران خون
۵۔ اوزان اور پیمانوں کی معیار بندی

ستمبر ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ حیدرآباد میں سلفیورک ترشہ اور دوسری اہم کیمیائی اشیاء کی صنعتی تیاری کے امکانات۔
۲۔ ہنسی (حیاتیات کی روشنی میں)
۳۔ ہماری آنکھیں۔
۴۔ جابر ابن حیان
۵۔ ہوائی حملہ اور زہریلی گیسیں۔

یہہ رسالہ ملکی زبان میں سائنس کا واحد رسالہ ہے جس میں مختلف مضامین کے علاوہ ہرماہ دلچسپ معلومات سائنس سے متعلق سوال و جواب سائنس اور صنعت سے متعلق تازہ ترین خبریں اور نئی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ رسالہ میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ علم کے شائقین اور اردو زبان کے بہی خواہ سرپرستی فرمائیں گے۔ اشتہارات کے نرخ طلب کئے جاسکتے ہیں۔

چندہ سالانہ پانچ روپئے سکہ انگریزی۔ نمونہ کا پرچہ آٹھ آنے (۸)

المشتہر
معتمد مجلس ادارت رسالہ سائنس جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
(دکن)

رسالہ ہندوستانی

رسالہ ہندوستانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے حکومت صوبجات متحدہ کی سرپرستی میں گیارہ سال سے شائع ہو رہا ہے۔ یہ سہ ماہی رسالہ ہے، جو اکیڈمی کا آرگن ہے۔ اس میں قدیم و جدید علوم و فنون کے اہم موضوعات پر، ماہرین فن اور کہنہ مشق اہل قلم کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس استناد کی وجہ سے یہ رسالہ رسالہ نہیں ہے بلکہ حوالے کی ایک کتاب ہے، ہر کتب خانے میں اس کی جلدوں کا موجود رہنا نہایت ضروری ہے رسالے نے ۱۰، ۱۱ سال کے عرصہ میں علم و ادب کے جو اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، ان کی وجہ سے اس کو یہ امتیاز حاصل ہو گیا ہے کہ اب وہ اردو زبان کے دو تین سب سے ممتاز رسالوں میں سے ایک ہے جناب کی علم دوستی سے امید ہے کہ اس کے معاونین میں شامل ہو کر علم و ادب کی خدمت کا اس کو موقع عطا فرمئیں گے اسی سلسلے میں اس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی جناب کو توجہ دلاتا ہوں۔ جو حضرات اس کی خریداری منظور فرمائیں گے، یا جو پانچ خریدار بہم پہنچائیں گے، ان کی خدمت میں اکیڈمی کی بعض مطبوعات رعایتی قیمت پر پیش کی جائیں گی۔ ان مطبوعات کی تفصیل دفتر سے معلوم ہو سکے گی

رسالہ کا سالانہ چندہ للعہ ہے۔

ترسیل زر اور اس سلسلے کی خط و کتابت کے لئے ذیل کے پتے سے یاد فرمایا جائے۔

دفتر رسالہ ہندوستانی ہندوستانی اکیڈمی صوبجات متحدہ

(الہ آباد)



بیان یہ سورہ آل عمران کی تفسیر ہے۔ اس میں الوہیت مسیح، معجزات ابن مریمؑ اور وفات و حیات عیسیٰ علیہ السلام پر حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ ہدیہ ۱۲؍

صراط المستقیم اس میں سورہ انفال و توبہ کے حقائق و معارف کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے موجودہ ضروریات و احتیاجات کو بطور خاص ملحوظ رکھا ہے اور ان حقائق و معارف کی وضاحت و صراحت پر خاص طور سے زور دیا ہے جس سے مسلمان دور جا پڑے ہیں۔ ہدیہ عہ

سبیل الرشاد تفسیر سورہ حجرات۔ اس کی ابتدا میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں مجلس شوریٰ کی ترتیب، ارکان کے انتخاب اور صدر جمہوریہ اسلام کے شرائط و لوازمات پر بحث کی گئی ہے۔ خلفائے راشدین کا نظام حکومت کیا تھا؟ ان کی مجالس شوریٰ کا انعقاد کن اغراض و مقاصد کے ماتحت ہوتا تھا؟ اور کس طریق سے یہ امور طے ہوتے تھے؟ ان سب کی اطلاع سبیل الرشاد سے ملے گی۔ ہدیہ ۱۰؍

عبرت احسن القصص یعنی سورہ یوسف کی تفسیر نہایت ہی خوبی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور اس کے نصیحت آمیز اور عبرت انگیز نتائج کو بہت ہی موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ہدیہ ۱۲؍ مجلد عہ

برھان تفسیر سورہ نور مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلامیہ کو دعوت دی ہے۔ علمی مسائل کی تشریح عقل کی روشنی میں بڑی وضاحت سے کی گئی ہے۔ ہدیہ ۱۲؍ مجلد عہ

سبل السلام اٹھائیسویں پارے کی تفسیر اہل ذوق حضرات میں بڑی مقبول ہو رہی ہے ہدیہ غیر مجلد ۱۲؍

ذکریٰ تفسیر پارہ عم۔ تمام چھوٹی بڑی سورتوں کا ترجمہ اور تفسیر ہے جو ہم روزمرہ نماز میں پڑھتے ہیں زمانہ موجودہ کے مسلمانوں کی ضروریات اور شبہات کو مدنظر رکھ کر یہ تفسیر مرتب کی گئی ہے۔ ہدیہ غیر مجلد ۶/ مجلد ۸/

بصائر اس رسالے میں بنی اسرائیل کے ان واقعات و حوادث کو جن کا قرآن کریم میں بیان ہے۔ نہایت دلکش رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ (طبع جدید) بڑا سائز قیمت ۸/

مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفاسیر

مولانا کی تفسیر نظام القرآن تاویل الفرقان بالفرقان کے جو حصے چھپ چکے ہیں۔ ان کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ ان کے نام اور قیمت حسب ذیل ہے۔

۱۔ تفاسیر ارہ کوثر	قیمت ۸/	۵۔ تفسیر سورۂ عصر	قیمت ۶/
۲۔ تفسیر ” لہب	” ۶/	۶۔ ” ” عبس	” ۶/
۳۔ ” ” اخلاص	” ۵/	۷۔ ” ” والتین	” ۶/
۴۔ ” ” کافرون	” ۵/	۸۔ ” ” الفیل	” ۸/

۹۔ تفسیر سورہ والشمس قیمت ۵/

میلاد شریف

ہماری میلاد مبارک کی محفلیں نہایت مستحسن مجالس ہیں۔ لیکن زمانہ ترقی کر گیا ہے اور ہمارے میلاد خواں بدقسمتی سے زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے ہیں یہ میلاد شریف نہایت پُر اثر زبان میں لکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ یا غیر تعلیم یافتہ طبقہ عورتوں یا مردوں سب کے لئے یکساں طور پر کشش رکھتا ہے۔ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حکومت نے اس کی ایک ہزار جلدیں خرید کر صوبے کے دیہاتوں میں مفت تقسیم کی ہیں یہ میلاد شریف اب تک جن محفلوں میں پڑھا گیا ہے حد پسند کیا گیا۔ قیمت قسم اول ۶/ قسم دوم ۴/

مکتبہ جامعہ دہلی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

ایک معلّم کی زندگی

نومبر سنہ ۴۱ء میں شائع ہو جائے گی

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہو رہی ہے ہر ایک جلد تقریباً پانچ سو (۵۰۰) صفحوں کی ہے اور مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں چونکہ کل ضخامت ایک ہزار ہو گئی ہے۔ اس لئے مکمل سٹ کی قیمت چار روپئے (للعہ) کے بجائے پانچ روپئے (صہ) کردی گئی ہے۔ کتابی سائز ۲۰×۳۰/۱۶

یہ کتاب عبدالغفار صاحب مدھولی کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور رواں تاریخ بھی ہے اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ بھی۔ یقین ہے کہ بچے اور بڑے دونوں اسے دل لگا کر پڑھیں گے۔

جو خریدار جامعہ کے یوم تاسیس ۲۹ اکتوبر سنہ ۴۱ء تک مکمل سٹ کے دام پانچ روپئے (صہ) پیشگی بھیجیں گے ان کے لئے محصولڈاک کے (۱۱) معاف ہوں گے۔

اب تک جن حضرات سے مبلغ چار روپئے (للعہ) وصول ہوئے ہیں ان سے زاید مطالبہ نہ کیا جائے گا اور محصول ڈاک بدستور معاف رہے گا۔ نیز جن کے آرڈر وی پی کے لئے آچکے ہیں ان سے بھی کتاب کی قیمت چار روپئے (للعہ) ہی لی جائے گی البتہ محصولڈاک خود ان کے ذمے ہوگا۔

مکتبہ جامعہ دہلی

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

مکتبہ جامعہ دہلی

نئی کتابیں

انتظام کتب خانہ اس مختصر رسالہ میں لائبریرین شپ اور اس کے متعلقہ تمام ضروری اصناف سے بحث کی گئی ہے۔ کتب خانہ کی عمارت اور فرنیچر کتب خانے کے شعبوں، کتابوں کے انتخاب اور خریداری اور پھر ان کی فن وار تقسیم، ترتیب فہرست کتب خانہ اور جلد سازی پر مختصر مگر جامع بیان۔ قیمت صرف ۸؍

صحت وصفائی اس چھوٹی سی کتاب میں ہوا، پانی، خوراک، لو، بخار اور دیگر بیماریوں جیسے تیرہ عنوانات پر افسانے کی شکل میں مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ قیمت صرف ۴؍

زرّیں حکایات از مرزا عصمت اللہ بیگ۔ مصنف نے مثنوی مولوی معنوی سے بچوں کے فائدے کے لئے ان کہانیوں کو جو انھیں مطلب کی نظر آئیں اردو جامہ پہنا کر یہ مجموعہ مرتب کیا ہے مولوی معنوی کا بیان کیا ہوا قصہ اور پھر مرزا عصمت اللہ بیگ کی اردو۔ سچ تو یہ ہے کہ ان قصوں کا لطف دو بالا ہو گیا ہے۔ صفحات ۲۲۰ مجلد قیمت ۱۲؍

جامعہ

زیرِ ادارت:۔ نور الحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۵ نمبر ۵	بابتہ ماہ نومبر ۱۹۴۱ء	چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

ربط کا طریقہ تعلیم

نفسیاتی بنیاد | ہر تعلیمی نظام کے دو بڑے حصے ہوتے ہیں اول نصاب، دوم طریقہ۔ نصاب کا تعلق ماضی کی روایات، حال کی ضرورتوں اور مستقبل کے تقاضوں سے ہوتا ہے اور طریقہ تعلیم کا انحصار نصاب کی نوعیت کے ساتھ نفسیاتی تحقیق و انکشاف پر۔ چنانچہ جب بھی زمانہ کے ہاتھوں زندگی کا خاکہ بدلا تو بیدار قوموں نے نصاب میں بھی ترمیم و تنسیخ لازمی سمجھی اور اسی طرح جیسے جیسے انسانی ذہن کے متعلق ہماری معلومات حقیقت سے قریب پہنچتی گئیں ہمارا طریقہ تعلیم بھی بدلتا گیا۔ نصاب چونکہ ایک قوم کی تاریخ سے وابستہ ہوتا ہے اس لیے اس میں حدود کو بعض اوقات کافی تنگ رکھنا پڑتا ہے لیکن طریقہ تعلیم کا تعلق انسانی فطرت سے ہے اور انسانی فطرت ہر جگہ ایک واقع ہوئی ہے اس لیے تعلیمی طریقے بنیادی طور پر زمان و مکان کی قید سے بے نیاز عالمگیر اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک وہ وقت تھا کہ انسان کے جسم اور ذہن میں وہی رشتہ تصور کیا جاتا تھا جو انسان کے لباس اور جسم میں ہے لیکن ظاہر ہے کہ نہ لباس جسم کی حالت پر دلالت کر سکتا ہے اور نہ جسمانی حالت لباس کا تعین کر سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تپ دق کے ایک مریض کو ریشم کے کپڑے میسر ہوں اور ہو سکتا ہے کہ ایک اچھی صحت رکھنے والے جسم کو ڈھانکنے کے لیے چیتھڑے بھی نہ مل سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جسم اور ذہن دونوں کی تربیت کے لیے الگ الگ تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔ اور ان تدابیر کی نوعیت خواہ وہ جسم کے لیے ہوں یا ذہن کے لیے ورزشی نوعیت ہوتی تھی۔ ذہنی تعلیم کے لیے جو نصاب تھا وہ زندگی کی کسی غرض کو پورا نہیں کرتا تھا اس کا مقصد ذہنی تربیت تھا شعر و ادب کی تعلیم کا مدعا قوت متخیلہ و حافظہ کو اجاگر کرنا تھا اور ریاضی کا مقصد قوت استدلال کی نشو و نما گویا طالب علم ان مضامین کو اسی طرح اختیار کرتا تھا جس طرح آپ اپنے جبڑوں کو مضبوط کرنے کے لیے ربڑ چبانا اختیار کر لیں۔

جسمانی تعلیم کا مقصد و مدعا وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے پھر بھی ہمارے وقت سے پہلے اسے

ذہنی نشوونما میں مدد دینے کے خیال سے کبھی اختیار نہیں کیا گیا۔ چینیوں کے یہاں تو ساری تعلیم ذہنی تربیت کے لیے تھی اور وہ بھی یہ ادا لیے ہوئے کہ بچے بغیر سمجھے بوجھے عبارتیں ازبر کر لیتے تھے اور پھر کتاب بند کر کے استاد کے سامنے تیزی کے ساتھ دہرا دینا ہی اپنا بڑا ذہنی کمال سمجھتے تھے گویا قوت حافظہ ان کے یہاں ذہانت و فراست کا پیمانہ تھی۔ یونانیوں کے یہاں البتہ نہ صرف ذہنی اور جسمانی تعلیم پر کسی قدر مساوی زور دیا جاتا تھا بلکہ ذہن اور جسم کے درمیان جو خلیج تھی اسے بھی بعض وقت پُر کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ چنانچہ رقص کی ساری اہمیت یہ تھی کہ اس میں ظاہری حرکات کو اندرونی احساسات اور کیفیات کا ترجمان بنانے کا امکان تھا۔ لیکن ذرا آگے چل کر انھیں یونانیوں نے جسمانی تربیت کو ایک خالص جمالیاتی رُخ دیدیا۔ یونانی نوجوان جسمانی تربیت سے "اخلاقی خوبیاں" پیدا کرنے کے بجائے یہ کوشش کرنے لگے کہ ان کے جسم ظاہری حسن و تناسب میں بس سانچے میں ڈھلی ہوئی چیزیں بن جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ میں تعلیم کی غرض و غایت روحانی تربیت تھی اور گو اس کے ساتھ سینٹ بینیڈکٹ کے احکام کے مطابق سات گھنٹے روزانہ ہاتھ کے کام کا التزام تھا لیکن اس ہاتھ کے کام سے جسمانی نشوونما کے بجائے ذہن کو برائیوں سے محفوظ رکھنا مقصود تھا۔ نشاۃ ثانیہ میں جسمانی تربیت پر زور دیا جانے لگا۔ پوپ ثانی کا فرمان تھا۔ "تمھاری تعلیم کا یہ لازمی جزو ہوگا کہ تم کمان اور نیزے کا استعمال سیکھو، گھوڑے کی سواری، کودنا اور تیرنا جانو یہ چیزیں نہایت باعزت ہیں اور معلم کے دائرۂ عمل سے باہر نہیں۔ چھوٹے بچوں کو کھیل بھی سکھائے جائیں اور یہ ان کے روزمرہ کے کام کا جزو ہونا چاہییں۔" ہمارے زمانے سے قریب ترجان لاک یہ عقیدہ لے کر پیدا ہوئے تھے کہ "ایک صحیح ذہن ایک سالم جسم کے اندر ہی دنیا میں سب سے بہتر زندگی بسر کرنے کا مختصر مگر جامع اصول ہے۔" لاک کا یہ عقیدہ یقیناً مستحسن تھا اگر وہ جسم اور ذہن کو ایک دوسرے سے اتنا بے تعلق نہ سمجھتے جتنا انھوں نے خود سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا۔ ان کے پاس دونوں چیزوں کے لیے الگ الگ نسخے تھے۔ لاک کا خیال تھا کہ جسمانی طاقت سختیاں برداشت کرنے سے پیدا ہوتی ہے اور ذہن کی تربیت کا انحصار قوت استدلال پر ہے اور قوت استدلال کی تربیت کے لیے صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے ریاضی خود لاک کے الفاظ ہیں۔ "میں نے ریاضی کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اس سے ذہن میں قوت استدلال پیدا ہوتی ہے نہ اس لیے کہ ہر ایک کو بڑا ریاضی داں بنائے

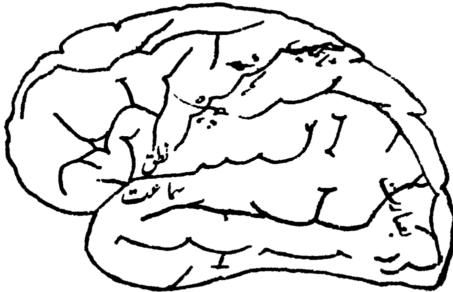
ہے۔اس طرح اپنی قوت استدلال کو بڑھاکر جو اس مضمون سے پیدا ہوتی ہے۔وہ (طلبہ) دوسرے علوم میں بھی جب جب اس کا موقع آئے اُسے منتقل کرسکتے ہیں۔" لاک کو آج ہم سے رخصت ہوئے دو سو چھتیس سال گزر چکے۔اس وقت سے اب تک زمانہ نہ جانے کتنی کروٹیں لے چکا۔علم کی نہ جانے کتنی نئی شاہراہیں ہم پر کھل چکیں لیکن یہ لاک کی خوش قسمتی کہیے یا بدقسمتی کہ اس کے معتقدین نہ صرف آج تک زندہ ہیں بلکہ بعض جگہ باا ثر حیثیت رکھتے ہیں۔چنانچہ ایک ٹریننگ اسکول میں انچارج طریقہ تعلیم اب بھی یہی پڑھاتا ہے کہ حساب کا مقصد قوت مدرکہ ومتخیلہ واستدلالیہ کی نشوونما ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ ٹریننگ اسکول ایک ریاست میں واقع ہوا ہے اور یہاں کا "انچارج طریقہ تعلیم" آج سے پچیس تیس سال پہلے کا نارمل پاس ہے۔

ہاں تو میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ ابھی ابھی جو حوالے دیے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قدما کے نزدیک جسم اور ذہن الگ الگ چیزیں تھیں چنانچہ تعلیم میں ایسے طریقوں کا فقدان نظر آتا ہے جو بیک وقت جسم اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے ضامن ثابت ہوسکیں۔اس کے علاوہ ذہن کو مختلف قوتوں کا مجموعہ مانا گیا تھا جس کی روسے نصاب کے مضامین کی تقسیم وتخصیص پیدا ہوئی اور سب سے زیادہ خطرناک وہم جو پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ انسان کا ذہن پیدائش کے وقت ایک ورق سادہ کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ تعلیم ہر اعتبار اور ہر پہلو ایک خارجی اور مصنوعی عمل تھا۔اور ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ انسان کی ذہنی تربیت اور اس کی معقول پسندی کو لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا۔لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو کسی شخص کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملتا "شریف النفس انسان پیدا ہوتے ہیں بنائے نہیں جاتے" کیونکہ ہر وہ شخص جو ریاضی کی مشق کے بعد قوت استدلال بڑھا لیتا معقول پسند اور شریف النفس بن جایا کرتا اور اس لیے نہ کبھی میں آپ کو ستاتا نہ آپ کو شکوہ ہوتا، نہ فرشتے میرا اعمالنامہ سیاہ کرتے، نہ حشر ہوتا، نہ آپ داد خواہی کرتے نہ مجھ کو ندامت ہوتی؛

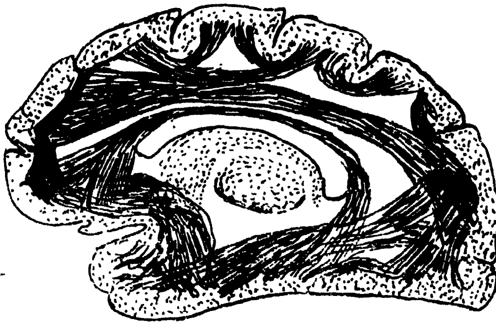
انسانی ذہن سے متعلق اس نفسیات کے مقابلے میں جدید نفسیاتی تحقیق بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ہمارا موجودہ ماہر نفسیات بتاتا ہے کہ انسانی ذہن بنی بنائی قوتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک سالم قوت ہے جو جسم کے ہر رگ وریشے سے ظاہر ہوکر کام کرتی ہے۔ہمارے جسم کی بالائی منزل اس قوت کا مرکز ضرور ہے لیکن اس کی ابتدا اور انتہا نہیں ہے۔اس لیے جسم اور ذہن کا رشتہ اس قدر قریبی سمجھا گیا ہے کہ ایک

کی صحت دوسرے کی صحت اور ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی مانی جاتی ہے۔ وہ چیز جو ہمارے سر میں قریب تین پاؤنڈ کا وزن رکھ کر قایم ہے اور جو دماغ کہلاتی ہے وہ چیز ذہن کی مشین ہے اور ذہن اسی مشین کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ بجلی کو آپ دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن اس کی جلوہ گری ہر جگہ بے حجاب ہے۔ اسی طرح ذہن دیکھا نہیں جا سکتا لیکن اس کا عمل ہر وقت ہمارے سامنے ہے۔ بجلی کے نظام کے لئے مشین ضروری ہے۔ خراب مشین سے بجلی کی پیداوار اور اس کے نظام میں رکاوٹ اور نقص پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دماغ کی کمزوری ذہن کی کارکردگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وراثتی اثرات سے ماورا دماغ کی بہتر نشو و نما کے کیا ذرائع ہو سکتے ہیں سب سے پہلی چیز جو دماغ کی نشو و نما کے لیے ضروری ہے وہ تو وہی ہے جو تمام جسم کے لیے ضروری ہے۔ یعنی اچھی غذا۔ جس طرح لو کے مارے ہوئے درخت سے اچھے پھل حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس جسم میں اچھے ذہن کی تلاش بھی فضول ہے جس پر غذا کی کمی کے صدمے گزر چکے ہوں یا گزرتے رہتے ہوں ایسے ذہن کی تربیت کے لیے خواہ کتنے ہی اچھے مواقع فراہم کیوں نہ کیے جائیں لیکن وہ کسی صحیح معیار تک نہیں پہنچ سکتا۔ دو اور چیزیں جو ذہنی نشو و نما کے لیے ضروری ہیں وہ بھی سامنے کی باتیں ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹینس کھیلنے والوں کا دایاں ہاتھ ان کے بائیں ہاتھ سے کچھ زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ اچھا اس معنی میں کہ اس میں طاقت تو زیادہ ہوتی ہی ہے لیکن بناوٹ کے اعتبار سے بھی وہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر نشو و نما کے لیے استعمال لازمی شرط ہے۔ بالکل اسی طرح دماغ بھی اپنی نشو و نما کے لیے استعمال کا محتاج ہے۔ دماغ کے مختلف مرکز مختلف حواس اور جسم کے مختلف حصوں کی فعالی کا نظام قایم رکھتے ہیں۔



اس لیے مکمل طور پر نشو و نما پایا ہو اور دماغ وہ ہی ہو سکتا ہے جس پر حواس نے بے روک ٹوک کام کیا ہو اور جس نے جسمانی اعضاء سے بغیر تکلف کام لیا ہو۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی آنکھوں نے زمین کے پامال ذروں سے لے کر آسمان پر چمکنے والے ستاروں تک ہر اُس چیز کا جائزہ لیا ہو جو نگاہ کو دعوت رنگ و نور دے سکتی ہے۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کے کان فطرت کے سایے میں مدھم سے مدھم ترنم پیدا کرنے والے آبشاروں سے لے کر سمندر پہ ہیبت ناک انداز میں کروٹیں لینے والی موجوں کے سامعت پاش شور سے آشنا ہوں۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہ ہی ہو سکتا ہے جس کی حسّ شامہ زیادہ سے زیادہ مختلف القسم خوشبوؤں اور بدبوؤں سے دوچار ہوتی رہی ہو۔ ایسا دماغ رکھنے والا انسان وہی ہو سکتا ہے جس کی زبان نے بے شمار چیزوں کا ذائقہ لیا ہو اور دماغ کے یہ مختلف مرکز ہی مل کر اچھا ذہن پیدا کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل شکل میں دماغ کے مختلف مرکزوں کا تعلق دیکھا جا سکتا ہے۔

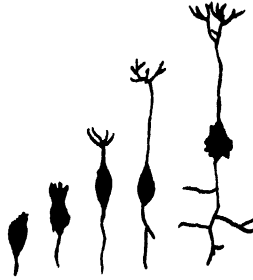


مادی دنیا اور انسانی دماغ کے درمیان حواس ایک کڑی کا کام کرتے ہیں جس قدر مادی دنیا کے اثرات حواس کے ذریعہ دماغ پر پڑتے رہیں گے اسی قدر دماغ کی نشو و نما کے امکانات زیادہ ہوں گے دماغ کی مکمل نشو و نما میں اسی قدر اہمیت آزاد جسمانی فعالی کی بھی ہے۔

انسانی دماغ کا وہ حصہ جو تمام شعور کا مرکز ہے کورٹیکس (cortex) کہلاتا ہے۔ یہ دماغ کا سب سے

اوپری حصہ ہے اور رنگ میں راکھ کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی تہہ ۱/۸ انچ سے ۱/۴ انچ تک دبیز ہوتی ہے۔ ایک مکمل اور اچھے دماغ میں یہ تہہ پوری لمبائی چوڑائی میں یکساں دبیز ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم کسی ایسے شخص کے دماغ کا معائنہ کریں جو زندگی میں کسی ایک حس یا جسمانی فعالی کے کسی ایک مرکز کو استعمال نہ کرسکا ہو تو ہمیں اس کی کورٹیکس کا وہ حصہ جس کا تعلق اس حس یا جسمانی فعالی سے تھا باقی کورٹیکس کے مقابلہ میں کم دبیز ملے گا یہ دماغ نامکمل اور ناقص دماغ ہے اور اس کے ذریعے کام کرنے والا ذہن بھی ناقص ذہن ہے۔ پروفیسر ڈونلڈسن نے لورا برجمین ایک خاتون کے دماغ کا معائنہ کیا تھا۔ لورا عام بچوں کی طرح پیدا ہوئی تھی اور قریب تین سال کی عمر تک اس نے عام بچوں کی طرح زندگی بسر کی۔ اس کے بعد وہ ایک خطرناک بیماری کے باعث سماعت سے بالکل محروم ہوگئی اور اس کی بائیں آنکھ بھی جاتی رہی۔ بیماری کا اثر دائیں آنکھ پر بھی پڑا تھا اور آٹھ سال کی عمر میں اس کی یہ آنکھ بھی بے نور ہوگئی۔ لورا نے اس حالت میں زندگی کے ساٹھ سال گزارے۔ اس کی وفات کے بعد ڈونلڈسن نے اس کے دماغ کا معائنہ کیا تو اول تو اسے لورا کی پوری کورٹیکس عام دماغوں کی کورٹیکس کے مقابلے میں بہت پتلی ملی اور اس میں بائیں آنکھ سے متعلق کورٹیکس کا حصہ اس حصے سے اور بھی زیادہ پتلا ملا جس کا تعلق دائیں آنکھ سے تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مادی دنیا اور حواس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ بچے کو ان حرکات وسکنات کی آزادی ہو جو وہ حواس کے سلسلے میں بطور جوابی عمل کرنا چاہتا ہے۔ بچوں کی زندگی میں قسم قسم کے رنگین کھلونوں کی سیر و تفریح کی، میلوں تماشوں کی اور کھیل کود کی اہمیت صحت دماغی کی پہلی لیکن سب سے مضبوط بنیاد ہے۔ دماغ کے مختلف حصے ریڈیو سٹ کے والوز (valves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ کے ریڈیو سٹ کے سب ویلوز ٹھیک ہیں اور اپنی پوری قوت سے کام کرسکتے ہیں تو آپ کا ریڈیو سٹ آپ کی بے شک بہت عمدہ خدمت کرے گا۔ لیکن اگر اس میں ایک ویلو بھی خراب ہے تو وہ پورے ریڈیو سٹ کی عمدگی پر داغ لگا دیتا ہے۔ فطرت ہمیشہ انسان پر اعتماد کرنے سے زیادہ اپنے انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ چنانچہ جہاں تک حواس اور جسمانی فعالی کے ذریعہ دماغ کی نشو و نما کا تعلق ہے۔ فطرت نے خود بچے میں چنچل پن کھیل کود اور چیزوں کو بنانے بگاڑنے کا رجحان اور جبلت پیدا کی ہے۔ بچہ خود بخود اپنی نشو و نما کے لیے

غیر شوری اور جبلی طور پر کوشش کرتا رہتا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ بعض ماں باپ یا استاد بچوں کو ان کے اس بنیادی کام میں مدد دینے کے بجائے الٹی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ دماغ بہت باریک باریک ریشوں سے بنا ہوا ہے یہ ریشے نشو و نما کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نیچے کی شکل میں نشو و نما پائے ہوئے اور نشو و نما نہ پائے ہوئے ریشوں میں فرق دیکھا جا سکتا ہے۔



یہ گفتگو طویل ہو گئی لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہو گیا ہو گا کہ انسان کی صحیح نشو و نما میں کیا عناصر بنیادی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ وہ عناصر ایک مرتبہ پھر مجملاً عرض کر دوں مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اچھی غذا

۲۔ حواس کے استعمال کا موقع اور

۳۔ جسمانی فعالی کی آزادی

تعلیم کی آخری غرض و غایت چونکہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے صحیح اور مکمل قسم کا انسان پیدا کرنا ہی ہو سکتی ہے۔ اس لیے بہترین نظام تعلیم بھی وہی ہے جو جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کا ذریعہ بن سکے اور حقیقتاً ہماری تعلیم کا نیا دور اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جس وقت سے جسم، حواس اور ذہن کی ہم آہنگ تربیت کے نصب العین پر خیال و عمل کی توتیں صرف ہونے لگی ہیں۔ جہاں پہونچ کر ہمیں یہ بات حاصل ہو جاتی ہے۔ وہیں ساری منزل ہے یہاں نصاب کے مضامین ایک دوسرے سے الگ الگ شمار ہونے کے بجائے ایک وحدت کی حیثیت رکھتے ہیں اور لا بتہ ان مضامین کو پڑھانے کا کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں

جسمانی فعالی حواس کے استعمال اور ذہن کو سوچ بچار کا یکساں موقع ملتا ہے۔ جو طریقۂ تعلیم ہمیں یہ چیز مہیا کر دے، وہی ربط کا طریقۂ تعلیم ہے۔ آج سنہ ۱۹۴۱ء میں ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس نصب العین سے بہت قریب پہنچ چکے ہیں اور گو ہمارے مدرسوں میں عام طور پر وہ سہولتیں ابھی میسر نہیں آئیں جو ہمیں ہمارے ارادوں میں کامیاب بنا سکیں تاہم ہمارے ذہن میں یہ چیز بالکل صاف ہے کہ ہم اس نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ہم اس نصب العین تک قدم بہ قدم اور منزل بہ منزل پہنچے ہیں۔ ایسا یقیناً نہیں ہوا جیسا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم کسی صبح اٹھے ہوں اور یہ بات الہام کے ذریعہ ہم میں سے کسی پر وحی کی شان لے کر نازل ہو گئی ہو۔

فضل الدین آثر ایم۔اے

ہماری آبادی

اندازہ لگایا گیا ہو کہ ہندوستان کی آبادی میں ہر دس سال کے بعد جزائر برطانیہ کی مجموعی آبادی کے برابر محض اضافہ ہو جاتا ہو۔ گزشتہ مردم شماری میں ہندوستان کی کل آبادی ۳۸۸۹۹۸۰۰۰۰ نفوس تھی اور خیال ہو کہ نئی مردم شماری میں مجموعی آبادی چار پانچ کروڑ اور بڑھ جائے گی۔ ابھی تک جو اعداد و شمار حاصل ہوئے ہیں وہ آبادی میں اضافہ کا رجحان ظاہر کرتے ہیں لیکن اگر ملک میں اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے ذرایع معاش موجود ہوں اور وہ اس کے لیے خوراک مہیا کر سکے تو ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہو۔

کیا اضافۂ آبادی کی یہ رفتار دوسرے ممالک کے مقابلے میں تیز ہو؟ کیا یہ ہمارے ملک کے موجودہ وسائل کے مطابق ہو؟ بڑھتی ہوئی آبادی ہندوستان کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہو یا بلائے بے درماں؟ کیا یہ ملک اپنی آبادی کو سنبھال سکتا ہو؟ — ان سب سوالات کے مختلف الخیال لوگوں کی جانب سے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ ایک طبقہ کا خیال ہو کہ ہندوستان کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمارا افلاس، قرض، خرابیٔ صحت اور ہر قسم کی معاشی کمزوریاں اور ان کے کل نتائج کی ذمہ داری ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی آبادی پر ہو۔ اس طبقہ میں سب ہی قسم کے لوگ شامل ہیں معاشیات کے طالب علم بھی۔ محب وطن بھی اور حکومت کے آدمی بھی۔ بالخصوص حکومت اس خیال کی طرفدار ہو اور اپنے مفاد کے لیے جائز اور ناجائز دونوں طریقوں سے اس کو دلیل بناتی ہو۔

ایک طرف اگر یہ لوگ ہیں تو دوسری جانب چند اہل الرائے ایسے بھی ہیں جو ہندوستان کی آبادی سے بالکل خوفزدہ نہیں ہیں۔ یہ بالعموم سیاسی لیڈر اور ان کے دوسرے ہمنوا ہیں جو آبادی کو نہیں بلکہ بُری حکومت کو معاشی پستی کا باعث قرار دیتے ہیں اور حکومت سے نالاں ہیں کہ وہ کثرت آبادی کے بہانے کی آڑ لے کر معاشی ترقیات سے گریز کرتی ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو "اپنی کہانی" میں

لکھتے ہیں:-

"ہندوستان میں ابھی خوراک کی کمی نہیں۔ اگرچہ ہندوستان کی آبادی میں اضافہ ہو گیا ہے لیکن خوراک کی رسد میں بھی اضافہ ہو گیا ہے اور آبادی کے اضافہ سے بڑھ کر اس میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ دس سال کے سوا یہ اضافہ اکثر مغربی ممالک کی کے اضافہ سے کہیں کم ہے۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان دو گروہوں میں کون سچا ہے؟ دراصل غلطی دونوں کی ہے۔ موخرالذکر گروہ کا یہ خیال کہ ہندوستان کی آبادی زائد از ضرورت نہیں، دلائل اور اعداد و شمار سے ابھی غلط ثابت کیا جائیگا ہاں یہ ضرور ہے کہ ہماری زیادہ آبادی نے معاشی پستی پیدا نہیں کی بلکہ یہ پستی نتیجہ ہے حکومت برطانیہ کی غیر ہمدردانہ روش کا۔ حکومت کی روش کی تفصیل اس مقام پر غیر معمولی طوالت کا باعث ہوگی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ریشہ دوانیوں، حکومت برطانیہ کے مضرت رساں طرز عمل اور حکومت ہند کی لاپرواہی اور سرد مہری کی طویل داستان بیان کرنی پڑے گی۔ اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ جس طرح اضافۂ آبادی سے معاشی پستی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح خوش حالی سے مفلسی کی جانب معاشی حالت کا زوال بھی خود بخود زائد از ضرورت آبادی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ایسا ہی ہوا۔ معاشی حالت کے گرنے اور وسائل معاش کے مفقود ہونے سے آپ ہی آپ آبادی کا ایک کثیر حصہ بیکار ہو گیا۔

لیکن اتنا کہہ دینے سے آبادی کے مسئلے کا صحیح اور قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے لیے ہمیں ہندوستانی آبادی کے رجحانات کی تحقیق کرنی ہوگی اور یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ان رجحانات میں زائد از ضرورت آبادی کی کون سی علامات پائی جاتی ہیں۔ کثرت آبادی سے مراد آبادی کا متوازن حدود سے بڑھ جانا ہے اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کے زرعی ملک میں فی مربع میل زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو آدمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ ہندوستان میں ایک سو بچانوے آدمی فی مربع میل بستے ہیں کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ آبادی گنجائش سے کم ہے۔ ایسا ہو سکتا اگر ہندوستان کی زراعت کی حالت اچھی ہوتی۔ مسٹر کیٹ کا خیال ہے کہ ایک شخص کے گزارے کیلئے کم از کم ۲½ ایکڑ زمین ہونی چاہیئے۔ یو۔پی کے متعلق ڈاکٹر اسٹنلے نے اندازہ لگایا ہے کہ اعلیٰ

معیار رہایش برقرار رکھنے کے لیے ہر زرعی گھرانے کے پاس تیس ایکڑ رقبہ ضرور ہونا چاہیئے ان اعداد کا جب ہم ہندوستان کی حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہمارے کسان کے پاس ضروریات سے بہت کم رقبہ ہے۔ بنگال، بہار، واڑیسہ، یو۔پی اور مدراس میں فی کس رقبہ کاشت ایک ایکڑ سے بھی کم ہے سی پی اور بمبئی اور پنجاب میں یہ رقبہ ایک اور دو ایکڑ کے بین بین ہے ان اعداد و شمار سے صاف مترشح ہو رہا ہے کہ ہندوستان میں زمین پر آبادی کا ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے۔ یو پی کی بنکنگ انکوائری کمیٹی کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی بارش کے موسم میں بھی صرف ۲۵ فی صد کسان اپنی تمام ضروریات مہیا کر سکتے ہیں کیا یہ زائد از ضرورت آبادی کی علامت نہیں؟

اضافہ آبادی کا اندازہ شرح پیدایش اور اموات کے مقابلے سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی ملک کی شرح پیدایش اور شرح اموات دونوں بڑھی ہوئی ہوں تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے۔ واضح رہے کہ صرف شرح اضافہ سے کثرت آبادی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اگر شرح پیدایش اور شرح اموات میں برابر کی کمی یا زیادتی ہو تو شرح اضافہ میں کوئی فرق نہیں پڑے گا ممکن ہے کہ کسی دو ملکوں کی شرح اضافہ تو یکساں ہو لیکن شرح پیدایش اور شرح اموات ایک میں زیادہ ہوں تو دوسرے میں کم۔ اس لیے اضافۂ آبادی کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے یکساں شرح اضافہ سے ہرگز دھوکا نہ کھانا چاہیئے۔

ہندوستان کی شرح پیدایش و نیز شرح اموات بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے اور عرصہ سے اس میں کوئی نمایاں فرق واقع نہیں ہوا سنہ ۱۸۸۱-۹۰ء میں ہندوستان کی شرح پیدایش ۳۵،۹ اور شرح اموات ۲۷،۴ تھی اور سنہ ۱۹۳۱-۳۵ء میں یہ شرحیں علی الترتیب ۳۴،۳ اور ۳۳،۸ ہوگئیں ہیں پنڈت جواہر لال صاحب کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ انیسویں صدی میں یورپی ممالک کی شرح اضافہ ہندوستان سے کہیں زیادہ بڑھی ہوئی تھی اور بیسویں صدی تک وہ برابر بڑھتی چلی گئی لیکن بیسویں صدی سے اس میں نمایاں کمی ہونے لگی لیکن ہندوستان کی حالت بالکل برعکس ہے اور بیسویں صدی میں ہماری شرح اضافہ میں برابر ترقی ہو رہی ہے۔

در اصل انیسویں صدی میں چند غیر معمولی حالات پیدا ہو گئے تھے جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا

جاتا ہو ورنہ ہندوستان میں اضافہ آبادی کا رجحان جب بھی پایا جاتا تھا۔ یورپ میں اس زمانے میں سائنس کی ترقیات روز بروز تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔ نئے نئے ذرایع معاش پیدا ہو رہے تھے۔ نو آبادیاں بسائی جا رہی تھیں۔ غرض یہ کہ آبادی کے بڑھنے کے بے انتہا مواقع حاصل تھے لیکن بیسویں صدی میں حالات اتنے موافق نہ رہے۔ نو آبادیوں میں گنجایش بہت کم رہ گئی یورپ کے ستائے ہوئے ممالک کو بھی ہوش آنے لگا اور انھوں نے معاشی ترقی کے لئے جان توڑ جد و جہد شروع کر دی۔ یورپ میں خود کفالتی کے چرچے ہونے لگے اور لوگوں میں آبادی گھٹانے کا رجحان پیدا ہو گیا ادھر تو یہ سب کچھ ہوا اُدھر ہندوستان میں انیسویں صدی میں سیاسی غلامی کے ساتھ معاشی غلامی بھی پھیلی۔ ملک کی زراعت اور صنعت، سب تباہ ہو گئی۔ قحط پر قحط پڑے۔ بیماریاں پھیلیں۔ دبائیں آئیں۔ غرض یہ کہ حالات کچھ ایسے پیدا ہو گئے کہ آبادی میں نمایاں اضافہ نہ ہو سکا لیکن جب بیسویں صدی میں بالخصوص گزشتہ دس پندرہ سال میں امن نصیب ہوا تو شرح اضافہ پھر بلند ہو گئی اور آج یورپ کے اکثر ممالک سے بلند ہے۔ خیال ہے کہ ۱۹۳۱ء کے بعد سے ہماری آبادی پچاس لاکھ سالانہ کی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو بیسویں صدی کے ختم ہونے تک ہندوستان کی آبادی ستر کروڑ ہو جائے گی۔ کیا یہ حالت خطرناک اور اندیشہ انگیز نہیں ہے؟ اور وہ بھی جب کہ ہمارے پاس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی ذرایع معاش نہیں ہیں اور تخفیف آبادی کے رجحانات عنقا ہیں۔

اخلاقی ضبط ہمارے یہاں نہیں، کم سنی میں شادیاں ہو جاتی ہیں۔ مذہبی رسم و رواج ہیں کہ شادی کی حمایت پر تلے ہوئے ہیں۔ بچوں کی تعداد زیادہ ہے۔ کیا یہ سب چیزیں اضافہ آبادی کے رجحانات کو ظاہر نہیں کرتیں؛ ممکن تھا کہ افلاس اور بیماری آبادی کو محدود کر دیتے لیکن مذہبی رسوم۔ ضبط تولید کی غیر مقبولیت اور پست درجے کے معیار رہایش کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہو سکتا اور ہماری نوّے فی صد آبادی فاقہ کشی کی دردانگیز مصیبت میں مبتلا رہتی ہے۔

ہندوستان کے اضافۂ آبادی کو خوش آمدید کہنے والے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صنعت اور زراعت دونوں میں محنت کی قلت کا محسوس ہونا آبادی کی کمی کا ثبوت ہے لیکن واقعہ

اس کے برخلاف ہی۔ بے شک فصل کاٹنے کے زمانے میں محنت کی طلب بڑھ جاتی ہو لیکن اس کے بعد مزدور بیکار رہتا ہی۔ بہت سے دیہاتی شہروں میں جا بسے ہیں اس لیے بھی فصل کے وقت محنت کی قلت ہوتی ہی۔ جو علاقے شہروں سے دور ہیں وہاں اس قسم کی مشکلات پیش نہیں آتیں۔ بنابریں یہ کتنا غلطی ہی کہ ہر مقام پر اور ہر وقت ہندوستان میں محنت کی قلت رہتی ہی۔ صنعت میں جو محنت کی قلت پڑ جاتی ہی اس کی وجہ یہ ہی کہ مزدور کو گاؤں سے شہر میں نقل مکان کرنا دشوار ہوتا ہی۔ علاوہ ازیں صنعت میں جو قلت پیدا ہوتی ہی وہ با مہارت محنت کی ہی۔ اس لئے صنعت میں محنت کی قلت کو دور کرنے کا طریقہ اضافہ آبادی نہیں بلکہ با مہارت مزدوروں کی تربیت ہی۔

ایک اور اہم مسئلہ ہمارے سامنے خوراک اور آبادی کے تناسب کا ہی۔ ضروری ہی کہ ملک میں آبادی کی ضروریات کے لائق اچھی خوراک موجود ہو۔ ۱۹۲۲ء میں پروفیسر شاہ اور کھمبتا نے اس بارے میں تحقیقات کی تھی جس سے پتہ چلتا ہی کہ ہندوستان کے لوگوں کو ضرورت سے چالیس فی صدی کم غذا نصیب ہوتی ہی اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہی کہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے ۳۶-۱۹۳۵ء تک کے عرصہ میں آبادی میں اکیس فی صدی اور اجناس خوردنی کے رقبہ زیر کاشت میں صرف ۱۲٫۴ فی صدی اضافہ ہوا ہی۔ یہ بھی معلوم ہوا ہی کہ جنگ عظیم کے بعد سے بیرونی ممالک سے ہندوستان میں اجناس خوردنی کی درآمد بڑھ رہی ہی۔ پروفیسر رادھا کمل مکرجی کا خیال ہی کہ ہندوستان میں صرف اٹھاسی فی صد آبادی کی ضرورت کے لائق غذا پیدا ہوتی ہی۔ بہرحال یہ ظاہر ہی کہ غذا کی رسد ضرورت سے کم ہی جو کثرت آبادی کی اہم نشانی ہی اور جب تک اس صورت حال کی اصلاح نہ کی جائے ملک پنپ نہیں سکتا۔

<u>مسئلہ آبادی کا حل</u> | خوراک کی کمی کیونکر دور کی جائے اس مسئلہ کے حل پر وقتاً فوقتاً مختلف تدابیر پیش کی جاتی رہی ہیں۔ سوال یہ ہی کہ کیونکر آبادی اور ذرائع معاش میں توازن قائم کیا جائے؟ اس کا حل تین طریقوں سے ہو سکتا ہی؛ یا تو ذرائع معاش کو موجودہ آبادی کی ضروریات کے مطابق بڑھا لیا جائے اور ان میں اتنی لچک بھی رکھی جائے کہ وہ اضافہ آبادی کے تناسب سے بڑھتے رہیں۔ یا پھر آبادی کو اتنا گھٹا دیا جائے کہ وہ خود بخود ذرائع معاش سے متناسب ہو جائے۔ ایک تیسرا طریقہ یہ ہی کہ مندرجہ بالا دونوں طریقوں پر

ایک ساتھ عمل کیا جائے۔ ذیل میں ہم ان کی مختصر کیفیت درج کرتے ہیں۔

ذرائع معاش کو وسیع کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ملک میں خوراک کی رسد بڑھا دی جائے۔ اس وقت ملک میں خوردنی اور غیر خوردنی اجناس کا تناسب ۸۲ اور ۱۸ فی صدی ہے۔ غیر خوردنی اجناس چونکہ زیادہ منافع کی امید دلاتی ہیں اس لیے عموماً اچھی زمین پر کاشت کی جاتی ہیں۔ اگر غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کردی جائے تو خوراک کی رسد میں ۱۸ فی صدی اضافہ کا امکان ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ غیر خوردنی اجناس کی کاشت بند کر دینے کے بعد کسان لازمی طور پر خوردنی اجناس کی کاشت کرنے لگے؟ دراصل غیر خوردنی اجناس کی کاشت کی ضرورت اسے اس لیے ہوتی ہے کہ ان کی کاشت کی بدولت وہ زمیندار اور سرکار کے مطالبات ادا کرتا ہے۔ اگر وہ غیر خورنی اجناس کی کاشت بند کر دے تو زمیندار اور حکومت کے مطالبات کہاں سے ادا کرے۔

ایک دوسری تدبیر غذا کی رسد کو بڑھانے کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غذا کی برآمد بند کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں خوردنی اجناس کا کوئی بہت زیادہ حصہ برآمد نہیں کیا جاتا اور آج کل تو خوردنی اجناس کی برآمد روز بروز کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ نیز اس تدبیر میں برآمد کو روکنے سے جو بیرونی مخالف اثرات پڑیں گے ان کے برداشت کرنے کے لیے ہمیں تیار ہونا چاہیئے۔ خوردنی اجناس کی برآمد بند کر دینے سے یہ خطرہ ہے کہ کسان ان کی جگہ مزید تجارتی غیر خوردنی اجناس کی کاشت شروع کر دے اور خوردنی اجناس کی رسد میں معتد بہ اضافہ نہ ہو سکے

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم بیرون ملک سے خوردنی اجناس حاصل کریں۔ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد سے غذا کی درآمد برابر بڑھ رہی ہے لیکن اس طریقہ میں نہ تو زیادہ توسیع کی گنجایش ہے اور نہ خود کفالتی کے نقطۂ نظر سے یہ طریقہ اطمینان بخش ہی ہو سکتا ہے۔ ہماری قوت خرید کم ہے۔ درآمد شدہ غذا کے بدلے میں اور ملکوں کی طرح ہندوستان کے پاس پیسہ بھی نہیں۔ ہندوستان انگلستان کا قرضدار ہے اور اس مصیبت سے نجات پانے کے واسطے خام پیداوار اور اجناس خوردنی برآمد کرتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ طریقہ زیادہ وسعت کا حامل نظر نہیں آتا۔ اگر دوسری اصلاحی تدابیر سے ہماری خریدنے کی قوت بڑھ بھی جائے تو بھی اس طریقے

کی سفارش نہیں کی جا سکتی کیونکہ جنگ کے تجربوں نے ہمیں بتا دیا ہے کہ غذا کے لیے دوسروں کا دست نگر ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

شاید سب سے کامیاب تدبیر غذا کی رسد بڑھانے کی "اصلاح زراعت" ہے۔ اس عظیم الشان کام کے لیے ہمیں زراعت کے تمام مسائل جیسے آب پاشی تقسیم اور انتشار اراضی طریق زراعت اور آلات زراعت کی اصلاح اور زرعی قرضے وغیرہ کی کل مشکلوں کو حل کرنا ہوگا۔ اس کام کے لیے روپیہ اور ہمت و نیز خلوص اور ہمدردی کی ضرورت ہے لیکن اسے سرانجام دیا جا سکتا ہے اور اس کی تکمیل سے ہماری آبادی کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ یہ دیکھ کر بڑی مایوسی اور افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کسانوں کو جدید ترقیات سے روشناس کرانے کی رفتار بہت سست ہے اور جہاں کہیں بھی جدید ترقیات کا پرچار کیا جاتا ہے وہاں انھیں کسان کی دسترس میں لانے کی سعی پوری طرح نہیں کی جاتی۔ تعلیم یافتہ طبقے کو سرکاری دفتروں کی خاک چھاننے کی ایسی بری عادت پڑ گئی ہے کہ باوجود ناکامی کے وہ زراعت یا صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ غضب تو یہ ہے کہ کسان کا لڑکا بھی پڑھ لکھ کر زراعت سے متنفر ہو جاتا ہے۔ زراعت اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری کثیر زرعی آبادی اسی لئے مصیبتیں جھیل رہی ہے۔

آبادی کا پیشوں میں ٹھیک تناسب سے تقسیم نہ ہونا بھی بہت سی مشکلات کا باعث ہے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوستان کی ۷۰ فی صد آبادی زراعت میں مشغول ہے اور بمشکل ۱۰ یا ۱۱ فی صد صنعت و حرفت میں اور ان میں سے بھی محض ایک فی صد اعلیٰ پیمانے کی جدید صنعتوں میں مشغول ہے۔ زراعت پر آبادی کا غیر ضروری دباؤ ہے اگر اس زائد بار کو ہٹا دیا جائے اور آبادی پیشوں میں صحیح تناسب سے تقسیم ہو سکے تو یقیناً آبادی کی بہت سی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

۱۹۰۸ء کی صنعتی کمیشن نے سفارش کی تھی کہ ہندوستان میں صنعت و حرفت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں صنعتی ترقی کی اہمیت کو محسوس کیا جا رہا ہے۔ ملک میں قدرتی عطیات کی کمی نہیں۔ اگر سرمایہ اور مہارت کی ضروریات پوری طرح مہیا ہو جائیں تو صنعتوں کی ترقی کے لیے وسیع میدان موجود ہے لیکن اس کے ساتھ یہ کھٹکا بھی لگا ہوا ہے کہ کہیں ہم کو بھی یورپ اور امریکہ کی طرح

صنعتی ترقی سے پیدا شدہ مشکلات کا شکار نہ ہونا پڑے۔ باوجود اس کے کہ انگلستان اور امریکہ میں صنعتی ترقی انتہا کو پہنچ گئی ہو وہاں کی کثیر آبادی کا گزارا پیمانۂ کبیر کی صنعتوں پر نہیں اور بیکاری کی لعنت وہاں بھی پائی جاتی ہو۔ دراصل اس کی وجہ یہ ہو کہ جدید سائنسی صنعتی نظام میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ روزگار میں اُس مناسبت سے اضافہ نہیں ہوسکتا۔ یہ سرمایہ داروں کا نظام چند خوش نصیبوں کی مدد کرتا ہو۔ بڑی بڑی مشینیں اور کلیں سیکڑوں آدمیوں کا کام انجام دیتی ہیں۔ اعلیٰ پیمانے کے انتظام کی بدولت مزدوروں کی اور بھی بچت ہو جاتی ہو۔ یہ بھی ناممکن ہو کہ ہندوستان اپنی تمام مصنوعات کو خود صرف میں لاسکے کیونکہ جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے بعد جو اندازہ لگایا گیا تھا اس سے پتہ چلتا ہو کہ صرف نوے فی صد آبادی مصنوعات خریدنے کی استعداد رکھتی ہو۔ ملک کی آبادی میں ہر سال ایک فی صدی اضافہ ہوتا رہتا ہو جس کا لحاظ کرتے ہوئے صنعتی پیداوار کی مقدار دوگنی بھی کر دی جائے تو بھی صرف اسی اضافہ شدہ آبادی کے لئے روزگار فراہم ہوسکے گا۔ پھر ہر سال صنعتی پیداوار کو دوگنا کرنا بھی جوئے شیر لانا ہو۔ بالفرض اگر ہندوستان اس میدان میں اتنی ترقی بھی کرلے کہ تمام آبادی جدید صنعتوں میں مصروف ہو جائے تو پیداوار اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی کھپت ناممکن ہو جائے گی۔

کہا جاتا ہو کہ ہم اپنے ملک میں بیرونی مصنوعات کی درآمد بالکل بند کردیں اور ہندوستان کو محض ایک برآمد کرنے والا ملک بنادیں۔ واضح رہے کہ آج کل تجارت مبادلۂ اشیا کے اصول پر چلتی ہو اگر آپ کے ملک میں بیرونی اشیا کی درآمد نہ ہوگی تو آپ بھی اپنی اشیا برآمد نہ کرسکیں گے۔ پھر آج کل خود اکتفائی کے چرچے ہو رہے ہیں اور غیر ملکی اشیا کے ہر ملک میں نئے نئے بدل تلاش ہو رہے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے اس قسم کی توقع کرنا عبث ہو

چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی ترقی کے یہ معنی نہ لیے جائیں کہ ہم بڑے پیمانے کی صنعتوں کو بالکل ہی بند کردیں گے البتہ ان کو ناگزیر حدود تک محدود کردینا ہوگا۔ وہ جاری رہیں گی مگر ان کو یہ موقع نہ دیا جائے گا کہ چھوٹی اور متوسط پیمانے کی صنعتوں میں کام کرنے والوں کے مفاد کو کسی قسم کا گزند پہنچائیں۔ برطانیہ کے عمل دخل سے پہلے ہندوستان اپنی بیشتر ضروریات کے لیے خود مکتفی رہا ہو جس کا سبب چھوٹی اور متوسط

صنعتوں کا رواج تھا۔ آج بھی اگر چھوٹی اور متوسط درجے کی صنعتوں کی طرف پوری توجہ دی گئی تو اس پست حالی کا خاتمہ مشکل نہیں۔ ضرورت ہو کہ ان صنعتوں کے لیے منظم اور باقاعدہ بازار فراہم کیے جائیں اور ان کی فروخت منظم طریقے پر ہو۔ جاپان میں موزہ بنیان وغیرہ کے کام نے منظم پیدایش اور فروخت کی بدولت اتنی شاندار کامیابی حاصل کر لی مگر لدھیانے میں غیر منظم پیدایش اور بے قاعدہ فروخت کی وجہ سے اس کے کام کو جاپان کی سی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

کسی ملک کی آبادی کو اثر انداز کرنے والی ایک چیز نقل وطن بھی ہو۔ نقل وطن سے آبادی کم ہوتی ہو۔ انیسویں صدی میں نو آبادیات میں ترک وطن کی بدولت یورپ میں آبادی کے لئے بہت کافی گنجایش نکل آئی تھی ہندوستان والوں کے لیے نقل وطن کے امکانات زیادہ وسیع نہیں۔ کچھ تو ذات پات کے طریقے کی وجہ سے ہندوستانی کو غیر ذات والوں کے ساتھ رہنے سے آرام نہیں ملتا۔ کچھ رسم ورواج اور مذہبی خیالات بھی نقل وطن کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر ہمارے ملک کا عام پیشہ زراعت بھی اس قسم کا ہو کہ ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ آج کل صرف ۲۵ لاکھ ہندوستانی بیرونی ممالک میں بستے ہیں۔ اکثر ممالک میں ہندوستانیوں کے کے داخلہ پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں۔ خود حکومت نے ۱۹۳۸ء میں ایک بل پاس کیا جس سے ملایا میں ہندوستانیوں کا نقل مقام تقریباً ناممکن ہو گیا۔ ملک کے باہر نقل مقام روز بروز مشکل ہوتا جا رہا ہو لیکن اب بھی کچھ عرصہ تک برما اور سیلون میں ۱۴۰۰۰ آدمیوں کے لیے گنجایش موجود ہو۔ علاوہ ازیں برٹش گیانا میں بھی کافی آبادی کو جذب کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ وہاں کی موجودہ آبادی ۳۰،۴۰۰۰ نفوس ہو۔ اور اس سے کئی گنی زیادہ آبادی سما سکتی ہو۔ ۱۹۲۲ء کے قانون نقل وطن میں یہاں ہندوستانیوں کو بسانے کی اسکیم بھی بنائی جا چکی ہو مگر ابھی تک اس پر عمل کرنے کی نوبت نہیں آئی

ادھر اندرون ملک بھی آبادی کا مختلف علاقہ جات میں توازن قائم کیا جا سکتا ہو۔ آسام اور سی۔ پی میں دوسرے صوبوں کی زائد از ضرورت آبادی کی اچھی خاصی تعداد کھپ سکتی ہو۔

اگر ذرائع معاش کے ساتھ ساتھ آبادی بھی بڑھتی رہے اور آبادی کا یہ اضافہ ذرائع معاش کے اضافے سے زیادہ یا متناسب ہو تب بھی ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ انتہائی ضروری ہو کہ

آبادی سو اضافہ کے رجحانات کو کم کر دیا جائے اور موانعات امتناعی کو رواج دیا جائے۔ ہمارے سماجی رواج اور مذہبی عقاید جلد شادی کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں۔ ہماری آبادی کا معیارِ رہایش اس قدر پست ہو کہ بہت جلد اسے حاصل کر لیتا ہو جس کے بعد فطری طور پر اسے شادی کی ترغیب ہوتی ہو۔ دیر سے شادیاں ہمارے ہاں بہت کم ہوتی ہیں۔

بہی خواہان ملک کا پہلا فرض ہو کہ اس خراب حالت کی اصلاح کا بیڑا اٹھائیں۔ رسم و رواج اور مذہبی خوش اعتقادیوں کے اس طلسم کو توڑ دیں۔ ملک کی دولت میں اضافہ کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں تاکہ اعلیٰ معیار رہائش حاصل ہو نشر و تبلیغ کی مدد سے اخلاقی ضبط پیدا کیا جائے۔ لوگوں میں صحیح قسم کی تعلیم پھیلائی جائے تاکہ ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو سکے

وہ زمانہ اب گزر چکا جب ضبط تولید کی حمایت میں پمفلٹ شائع کرنا جرم خیال کیا جاتا تھا۔ تاریخ رچرڈ کارلائل کی ممنون ہو کہ اس نے ضبط تولید پر اظہار خیال کی پابندیاں اٹھوا دیں۔ مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں بھی ضبط تولید کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بہت سے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ ضبط تولید کی تحریک کا یہ پہلو بھی کچھ کم قابل غور نہیں کہ اس کا رواج امرا میں زیادہ ہو جن کی قوت تولید پہلے ہی گھٹی ہوئی ہو۔ عوام کی معاشی حالت انھیں اجازت نہیں دیتی کہ ضبط تولید کے قیمتی آلات استعمال کریں لیکن سائنس کی ترقی کی بدولت اچھے اور بے ضرر طریقے ضبط تولید کے رائج ہو چکے ہیں اور وہ عوام کی دسترس سے باہر بھی نہیں۔

مذہبی نقطۂ نظر سے ضبط تولید کو برا بتایا جاتا ہو۔ اس کا جواب ڈاکٹر اقبال مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی زبانی سنیئے۔ نومبر ۱۹۳۲ء کے رسالہ "الحکیم" میں ڈاکٹر اقبال مرحوم رقمطراز ہیں۔

"اگر حفظ نفس مقصود نہ ہو۔ حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہاں تک میرا علم راہ نمائی کرتا ہو شرعاً ضبط تولید قابل اعتراض نہیں۔"

اسی رسالہ میں مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:-

"بلاشبہ ضبط نفس اصل آئیڈیل ہو لیکن معلوم ہو کہ وہ عملاً چل نہیں سکتا۔ کم از کم اس وقت

تک کا انسانی تجربہ یہی ہے ایسی حالت میں جو لوگ طبی، منزلی، خاندانی، اجتماعی اور اقتصادی مقتضیات پر زور دیتے ہیں یقیناً ان کے دلائل کی قوت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ ضبط تولید سے لوگوں کو اپنے اخلاقی جرائم کے چھپانے کا موقع مل جائے گا اور ان میں بد اخلاقی پھیلے گی لیکن کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ سوسائٹی ان تمام مفید کاموں کو ترک کر دے جن کا بعض لوگ غلط طریقے پر استعمال کرتے ہیں۔ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ضبط تولید بذریعہ ضبط نفس کیا جائے اور اس صورت میں کوئی اخلاقی جرم عائد نہ ہوگا۔

جب علامہ اقبال مرحوم، مولانا ابو الکلام آزاد، ڈاکٹر ٹیگور آنجہانی (خط بنام مارگریٹ سینگر از کتاب "ضبط تولید کے لیے میری جد و جہد") اور مسز سروجنی نائیڈو (تقریر مستورات کانفرنس کراچی منعقدہ ۱۹۳۵ء) جیسی مقتدر ہستیاں ضبط تولید کی موافقت میں رائے دے چکی ہوں اور ملک کے حالات کا تقاضا بھی یہی ہو تو ضبط تولید کو ملک میں مقبول کرانے کی سرتوڑ کوشش کرنی چاہیئے اور یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ تعلیم کے ذریعہ عوام میں ذمہ داری کا احساس پیدا نہ کیا جائے۔ ہماری تعلیم بھی اس قسم کی ہونی چاہیئے جو ذہنی قوتوں کے ساتھ عمل کی طاقت کو بیدار کر سکے تاکہ پڑھ لکھ کر ہم روزگار سے لگ سکیں نہ کہ ملک کی آبادی میں پڑھے لکھے بیروزگاروں کا اضافہ کریں۔

وقت کی پہلی ضرورت ہے کہ حکومت اور ملک کے بہی خواہ تن من سے آبادی کے نازک مسئلے کو حل کریں۔ جب تک ان تمام تدابیر پر بیک وقت پوری قوت کے ساتھ عمل نہ کیا جائے گا یہ اہم مسئلہ سلجھ نہیں سکتا۔ آبادی کے مسئلے کے حل میں ہمارے مستقبل کی تمام تابناکیاں پوشیدہ ہیں۔ کیونکہ بھوکی ننگی آبادی کبھی سربرآوردہ نہیں ہو سکتی۔

آیۃ اللہ بیگ عارف

اسٹیلن کا روس

رسالہ جامعہ کی اشاعت ۱۱ ستمبر میں مسٹر م م جوہر میرٹھی کا ایک مضمون بعنوان "جرمنی اور سوویٹ جنگ" شائع ہوا ہے۔ یہ لینن اور ٹروٹسکی کا خیالی مکالمہ ہے۔ جو ٹروٹسکی کی کتاب The Revolution Betrayed کو بنیاد قرار دے کر لکھا گیا ہے۔ اس مضمون میں جوہر صاحب نے اسٹیلن اور ٹروٹسکی کے مشہور اختلاف سے متعلق ٹروٹسکی کی تائید کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسٹیلن اور اس کی پارٹی نے روس کو تباہ کر دیا ہے اور اشتراکی نظام کو بھلا دیا ہے۔

مضمون نگار نے اس واقعہ کو حقیقت تسلیم کرکے بحث اٹھائی ہے کہ ٹروٹسکی لینن کے اشتراکی نظریوں کا صحیح پیرو تھا، اور اسٹیلن نے لینن کی اشتراکیت سے غداری کی ہے حالانکہ اس بحث میں بنیادی طور پر اسی مسئلہ پر پہلے بحث کرنا چاہیے تھی لیکن جوہر صاحب نے اس کو ضروری خیال نہیں کیا۔

آپ نے آج کے روس پر یہ اعتراضات کیے ہیں۔

۱۔ روس کی اقتصادی حالت افسوس ناک ہے۔

اس ضمن میں روس کے ذمہ دار افسروں کے اقوال سے استناد کیا گیا ہے۔ اور آخر میں روس کے ساتھ جرمنی، امریکہ اور انگلستان کی معاشی اور صنعتی حالت کے اعداد و شمار دیے ہیں اور دونوں کے توازن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روس کی حالت مذکورہ ممالک کے بالمقابل بہت ابتر ہے۔ جرمنی کی بڑھی ہوئی صنعتی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے لینن کے یہ خیالی جملے آپ نے لکھے ہیں۔

"سنتا ہوں کہ ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹیلن ۱۵ سال میں نہ کر سکا۔"

۲۔ اسٹیلن نے بین الاقوامی اشتراکی انقلاب کو بھلا دیا جو لینن کا واحد مقصد تھا اور اس راہ میں اتنا مبالغہ کیا کہ موجودہ جرمنی روسی جنگ کے شروع ہونے پر سوویٹ احرار نے حسب ذیل نعرے لگائے:۔

"مادر وطن کو بچاؤ۔ سوویٹ کی ایک اِنچ زمین کے لیے خون بہا دو۔ سوویٹ قوم کے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔"

کہنا یہ ہے کہ روسی رہنماؤں نے بین الاقوامیت کے بجائے قومی تصور کو اپنا لیا ہے۔

۳۔ روس نے بین الاقوامی انقلاب کا خیال چھوڑ کر اس عظیم پرولتاری امداد سے خود کو محروم کر لیا ہے جو روس کی تائید میں بہت مفید ثابت ہوتی۔

۴۔ چونکہ روسی سماج میں ذاتیں بن گئی ہیں اس لئے فوج میں بھی ذاتیں بنی ہوئی ہیں۔ اس ذات سازی کا نتیجہ یہ ہے کہ روسی سپاہ بالکل ناکارہ ہے اور صرف ۱۲ دن میں جرمن فوج اتنی بڑھی کہ ماسکو کو خطرہ پیدا ہو گیا ـــــ سوویٹ کی فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں۔

جوہر صاحب کے یہ اعتراضات نئے نہیں ہیں یہ وہی آوازیں ہیں جو امریکہ اور برطانیہ کے سرمایہ دار پریس سے رہ رہ کر بلند ہوتی رہتی ہیں۔ اور ذہین و چالاک بورژوا اہل قلم مختلف اسالیب میں انھیں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ذیل میں سرسری طور پر میں یہ بتلانے کی کوشش کروں گا کہ مضمون نگار نے کس طرح واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اور یہ کہ اصل حقیقت بیان کردہ واقعات سے کتنی مختلف ہے۔

لینن اور ٹروٹسکی | مسٹر جوہر کے مضمون کا یہ بنیادی نظریہ ہی سرتاپا غلط ہے کہ ٹروٹسکی کی رائے لینن کے فلسفے کی تائید میں تھی لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے ۱۹۰۳ء ہی سے شروع ہو گیا تھا جب لندن کانفرنس میں بالشویک اور منشویک الگ الگ ہوئے تھے لینن بالشویک پارٹی کا لیڈر تھا مگر ٹروٹسکی اس اختلاف میں لینن کی تائید میں نہیں تھا وہ بالکل غیر جانبدار رہا۔ اسی طرح ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۷ء کے انقلابوں میں بھی لینن اور ٹروٹسکی کے درمیان اختلاف رائے رہا۔ لیکن اس تمام مدت میں اسٹیلن برابر لینن کی پارٹی کا روح رواں رہا اور ان دونوں انقلابوں میں لینن کا نقطہ نظر ہی صحیح ثابت ہوا۔

یہ کہنا طے شدہ تاریخی حقیقتوں سے انکار کرنا ہے کہ روس کی فوجی، سیاسی اور معاشی حالت مکمل کیے بغیر بین الاقوامی انقلاب لانے کا تصور لینن کا نقطہ نظر تھا اس لیے کہ لینن نے خود کہا تھا۔

"ہمیں روس کو اتنا مضبوط کر دینا چاہیے کہ وہ تنہا سرمایہ دار ملکوں کا مقابلہ کر سکے۔"

جوہر صاحب ٹرٹسکی کی اس تجویز پر کہ

"روس میں ایک بڑا ریڈیو اسٹیشن طیار کیا جانا چاہیے"

اسٹیلن کے اس جواب کا مذاق اڑاتے ہیں کہ

"بجلی کا اسٹیشن بنانا روس جیسے پس ماندہ ملک کے لیے ایسا ہی جیسے کسی کسان کا بجائے گائے کے گراموفون خریدنا"

حالانکہ عملی سیاست کو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اسٹیلن کے اس جواب کی کیا اہمیت ہے۔ اسٹیلن کے سامنے روس کی ۲۰ کروڑ آبادی اور اس کی ابتدائی ضروریات تھیں۔ بڑے ریڈیو اسٹیشن کا قیام کیا قوم کی ابتدائی ضروریات میں ہیں؟ اسی پالیسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آج روس میں خواہ ریڈیو اسٹیشن ہوں یا نہ ہوں لیکن بھوک فاقہ اور تباہ حالی کا وہاں کوئی ذکر نہیں ہے۔

روس کی معاشی حالت | روس کا مقابلہ جرمنی، امریکہ اور انگلستان سے کرنا کسی طرح صحیح نہیں۔ یہ ممالک مدتوں سے ترقی یافتہ ہیں۔ ان کی صنعتی حالت صدیوں سے ارتقاء کی مرہون منت ہے اور روس ماقبل جنگ ۱۹۱۴ء ایک زراعتی ملک تھا لیکن امریکہ، انگلستان اور جرمنی انیسویں صدی ہی میں صنعتی میدان میں کافی ترقی کر چکے تھے۔

یقیناً پراوادا، اسوستیا، موتوتوف اور رشیوٹوف کا یہ کہنا صحیح ہے کہ

"ہماری صنعت ردی حالت میں ہے"

لیکن ان بیانات کا وہ مفہوم نہیں ہے جو کسی سرمایہ دار ملک کی صنعتی تباہ حالی کے ضمن میں دیا جاتا ہے اس لیے کہ جس وقت پراوادا یہ لکھتا ہے کہ

"کپڑے کی صنعت بہت ردی حالت میں ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ روس کے ۲۰ کروڑ انسانوں کی ضروریات کے پیش نظر وہاں کی صنعتی حالت ناقابل اطمینان ہے لیکن جب لندن ٹائمز یا نیویارک ٹائمز یہ اعلان کرتے ہیں کہ

"ہماری صنعتی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے"

تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہو کہ امریکہ اور انگلستان کے کارخانے جو محض تجارتی مقاصد کے لیے کام کرتے ہیں اپنے مقصد کو پورا کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں اس لیے جوہر صاحب کا روس کے ذمہ داروں کے اقوال کا اس طرح نقل کرنا کہ پڑھنے والا وہ مفہوم سمجھے جو عام طور پر سرمایہ دار ممالک کی بابت سمجھنے کا وہ عادی رہا ہو بالکل گمراہ کن ہو۔ روس کی صنعتی حالت اس کی ضروریات کے مطابق ناکافی ہو لیکن زاری روس کے مقابل کئی گنا ترقی یافتہ ہو۔

جوہر صاحب کا یہ کہنا کتنا غلط ہو کہ فرانس میں تقریباً سوا تین لاکھ موٹریں ہیں اور روس میں صرف تقریباً سوا لاکھ لہذا روس کی حالت میں اشتراکیت نے کوئی انقلاب نہیں کیا۔ حالانکہ وہ یہ اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے یہ بھول گئے کہ یہ سوا لاکھ موٹریں اس روس کے پاس ہیں جہاں ۱۹۱۷ء سے پہلے چند گنتی کی موٹریں تھیں اور اس سوا تین لاکھ موٹریں رکھنے والے فرانس کے پاس ۱۹۱۷ء سے پہلے بھی ہزار موٹریں موجود تھیں۔ اشتراکیت کوئی منتر نہیں ہو کہ اُسے پھونکتے ہی صنعتی مجسمہ زمین سے اُٹھ کھڑا ہو گا معاشی حیثیت سے وہ عبارت ہو اس سماجی طریقہ سے جو عوام کی قوت پیداوار کی صحیح مقصد میں رہنمائی کرتا ہو۔ اور ساتھ ہی خود قوت پیداوار میں بھی شدت پیدا کر دیتا ہو چنانچہ روس میں بھی ایسا ہی ہوا۔ پہلے دوسرے اور تیسرے پنجسالہ پروگرام کے اعداد و شمار اس واقعہ کی پوری تائید کرتے ہیں۔ روس کے ان پروگراموں کو اتنی کامیابی ہوئی کہ سرمایہ داروں کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ کے صدر اعظم مسٹر روز ویلٹ نے بھی ایک پنجسالہ اسکیم کا اعلان کر دیا۔

روس اور جرمنی | جوہر صاحب نے اشتراکی روس اور نازی جرمنی کا توازن کرتے ہوئے لینن کا خیالی قول لکھا ہو کہ

"سنتا ہوں ہٹلر نے ۵ سال میں وہ کر دکھایا جو اسٹیلن ۱۸ سال میں نہ کر سکا"

معلوم نہیں مضمون نگار نے یہ دعویٰ کن اسباب کی بنا پر کیا ہو۔ کیا اس لیے کہ اس کے نزدیک جرمنی کی جارحانہ طاقت روس سے زیادہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ موصوف روس اور جرمنی کے اندرونی حالات سے قطعی نابلد ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۳ء تک روس میں کیا ترقیات

چوئیں اور جرمنی میں اس سلسلہ میں کیا نئے اصلاحی اور اختراعی قدم اٹھائے گئے اور ان دونوں میں کیا نسبت ہے۔

جہاں تک جرمنی کی اس ۲۱ سالہ ترقی کا تعلق ہے میں مضمون نگار کو یہ یاد دلاؤں گا کہ جرمنی میں نئی بھاری صنعتوں کا احیا امریکی اور یورپی سرمایہ داروں کی امداد کا مرہون منت ہے اگر واشنگٹن اور لندن کے بنک برلن کی مدد نہ کرتے تو کسی طرح بھی ہٹلر کا جرمنی آج وہ طاقت حاصل نہ کر سکتا جو وہ حاصل کر چکا ہے۔
تاہم جرمنی کی طاقت کسی طرح سوویٹ روس کی ترقیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آج کل جرمنی اور ہٹلر کی بڑی طاقت اس کی فوجی کامیابیاں بتائی جاتی ہیں لیکن اگر اس حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو جرمنی کی فوجی قوت روس کی طاقت کے مقابلہ میں نہیں لائی جا سکتی جیسا کہ گذشتہ ڈھائی ماہ کی روسی جرمن جنگ سے ظاہر ہے کہ اس مدت میں جرمنی ــــ جس کے ساتھ فن لینڈ، رومانیہ، بلغاریہ، ہنگری، اطالیہ جیسے نیم آزاد یورپی ممالک اور آسٹریا، پولینڈ، چیکوسلوویکیہ۔ ناروے، یونان اور دوسرے مقبوضہ یورپی ممالک کی فوجی طاقت ہے ــــ روس کو کوئی خاص اور قابل ذکر نقصان نہیں پہنچا سکا۔
یاد رہے کہ اگر اس جنگ میں جاپان شامل ہو جاتا ہے تو بھی روس کا یہ محوری بال بیکا نہیں کر سکتے اس لیے کہ روس کی سائبیریا کی فوج بالکل خود مختار ہے۔

روس کی اہم فوجی قوت کا اقرار خود جرمن ماہرین نے بھی کیا ہے چنانچہ جرمنی کے مشہور فوجی جرنیل ہمان نے ۱۶ ر فروری ۱۹۳۷ء کے مشہور جرمن اخبار دوئچی دہر میں مختلف ممالک کی مسلح فوج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

> "روس کی فوجی طاقت آج تمام دنیا کے لیے چیلنج ہے۔ وہ ہر طرح جدید ترین اسلحہ سے آراستہ ہے۔ اس کی تربیت نئے اور ترقی یافتہ اصول کے ماتحت کی گئی ہے"

ابھی اس جنگ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے اطالیہ کے مشہور اخبار پوپولو ڈی اٹیلیہ کے فوجی تبصرہ نگار نے لکھا تھا کہ

> "روس کے ساتھ جنگ میں محوریوں کو لانبی مدت کے لیے اپنی فتح کے خیالات کو ملتوی کر دینا چاہیے۔ روسیوں نے جدید ذرائع سے اپنی فوجوں کو آراستہ کر کے سوویٹ یونین کو

ناقابل تسخیر بنا لیا تو مورچوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی پوری مضبوط اور زبردست طاقت کو احتیاط کے ساتھ ٹکراتے رہیں۔

ان حالات میں جوہر صاحب کا یہ لکھنا کہ

"سوویٹ کی فوجیں کہیں پسپا ہو رہی ہیں اور کہیں گھر رہی ہیں"

ایک غیر ذمہ دارانہ اظہار رائے کے علاوہ اور کیا ہو۔

بین الاقوامی پرولتاریہ کی مدد جوہر صاحب کا ایک اعتراض یہ ہو کہ بین الاقوامی انقلاب کے تصور کو چھوڑ کر اسٹیلن نے اس عظیم پرولتاری مدد کو کھو دیا ہو جو ایسے نازک وقت میں اسے بہت امداد دیتی۔

معلوم نہیں موصوف نے کن اسباب کی بنا پر یہ اعتراض کیا ہے جبکہ معلوم ہو کہ روس پر جرمن حملہ کے ساتھ ہی تمام یورپی ممالک کے پرولتاری اور انقلابی گروہوں میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے جرمن سامراج کے خلاف عملی جدوجہد شروع کر دی۔ فرانس ناروے، اطالیہ اور یوگوسلیویہ اور بلغاریہ کے نئے حالات اس واقعہ کے ثبوت میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

بلاشبہ یہ صحیح ہو کہ اگر بین الاقوامیت کی طرف کمیونسٹ انٹرنیشنل مزید توجہ دے سکتی تو یورپ کی بے چینی زیادہ شدید ہوتی لیکن اس خیال کے پیش نظر اس وقت جبکہ منظم اور تربیت یافتہ فوجیں سائنس کے خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہو کر گتھی ہوئی ہیں یہ کہنا کہ روس کی طاقت محض پرولتاریہ ہیں محض ایک طرح کی رومانیت ہو۔ پرولتاریہ ضرور روس کی طاقت ہیں لیکن یہ طاقت مخصوص اور متعین حالات میں ایک طاقت ہو اس وقت اس کی اہمیت بہت کم ہو جاتی ہو جب تقریباً دو ہزار میل کے میدان جنگ میں تقریباً ایک کروڑ فوجیں اَن گنت سامان جنگ کے ساتھ ٹکرا رہی ہوں اگر روس سرمایہ دار جرمنی سے مقابلہ کرنے کے معاملہ میں فقط بدیسی پرولتاریہ کے انقلابی اقدامات پر اطمینان کر کے چپ بیٹھ جاتا تو جرمن افواج ولاڈی واسٹک بھی پہنچ جاتیں اور پرولتاریوں تک اطلاع بھی نہ پہنچتی۔

جوہر صاحب کو روس پر اعتراضات کرنے میں نسبتاً سنجیدگی اختیار کرنا چاہیے کہ ان کے اعتراضات کی نوعیت سرمایہ نوازوں کی مجادلانہ ذہنیت کی چغلی کھاتی ہو۔

محمد تقی اودھوی

علامہ اقبال کا فلسفہ

گزشتہ مہینے کے جامعہ میں ایک مختصر مضمون نظر سے گزرا جس کا عنوان ہے۔ "علامہ اقبال کا فلسفہ" مدیر صاحب نے دعوت دی ہے کہ اس پر کچھ اظہار خیال کیا جائے اس لیے میں نے مضمون بغور دیکھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ عنوان تو بہت وسیع ہے مگر بحث اتنی وسیع نہیں۔ اصل بحث کے اعتبار سے صحیح عنوان "اقبال کا فلسفۂ عقل و دل" ہو سکتا تھا۔

مدیر صاحب نے اپنے نوٹ میں فاضل مصنف کے اصل خیال کی وضاحت کر دی ہے۔ مگر مضمون کے پڑھنے سے مجھے علم نہ ہو سکا کہ کن اصولی طریقوں سے عقل و دل کے فلسفہ پر فکر کی گئی اور جو نتائج نکالے گئے ہیں ان کی قدر و قیمت کیا ہے۔

جب کسی شاعر کے فلسفہ یا پیغام کو سمجھنے کی کوشش کی جائے یا اس سے اختلاف اور اتفاق کیا جائے تو ضروری ہے کہ ہم اس انتشار اور پیچیدگی کو دور کر دیں جو اس موضوع میں پائی جاتی ہے یا مشکل موضوع پر سوچتے وقت خود فکر کرنے والے کے دماغ میں موجود رہتی ہے۔ واضح فکر اور سکون دماغ ادب عالیہ پر تنقید کرنے کے سنگ بنیاد ہیں۔ جو صاف سوچتا نہیں وہ صاف لکھتا نہیں۔

ہم ان تمام الجھنوں سے نکل کر جو مکالمہ میں پیدا کیے گئے ہیں اور ان لفظی گورکھ دھندوں سے دور ہو کر جو اختر اور یوسف کی گفتگو میں پائے جاتے ہیں مصنف کی اس بحث پر کہ اقبال کا فلسفۂ عقل و دل کیا ہے! جب غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے کی ابتدا ہی ایسے اصول سے کی گئی ہے جو شعری تنقید کے لیے زیادہ موزوں نہیں ایسا معلوم ہوا کہ مصنف شاعر کے کلام کی جرأحی اور نثری تحریر سے کلام کا نثر تقابل کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کے پیام کا تعین ہو سکے۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب کی تنقید سے یہ خام طریقہ دور نہ ہو سکا

اقبال کے مفکرین عام طور پر تین قسم کی پیچیدگیوں کا شکار ہوتے ہیں۔

۱۔ وہ اقبال پر وضاحت نظر اور سکون دماغ کے ساتھ غور نہیں کرتے بلکہ بے دھڑک ایک سمندر میں

کو دپڑتے ہیں جس میں کو د نے کے بعد باہر نکل آنے کا راستہ نہیں ملتا اور انھیں سوائے ادھر اُدھر ہاتھ پیر مارنے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

۲۔ اقبال جیسے مفکر اور شاعر پر اس کے علمی معیار اور بلند مقام کا صحیح اندازہ کیے بغیر رائے زنی کی جاتی ہے حالانکہ اس ذی علم اور ذی ہوش انسان کے فکر و نظر پر اسی وقت بحث ہو سکتی ہے جبکہ اس کے متعلقہ علوم پر نقاد کو بھی دستگاہ ہو۔

۳۔ اقبال کے فلسفے یا پیغام کا بہ حیثیت مجموعی کم اندازہ کیا جاتا ہے اور تجزیہ زیادہ۔ نفسیات، ادبی تنقید کے اعلیٰ اصول اور جمالیات جیسے علوم سے ہٹ کر تحقیقات کی بنیاد متفرق تجزیے یا تقابل پر رکھی جاتی ہے۔ حالانکہ تجزیہ سے زیادہ ربط (Synthesis) کی ضرورت ہے۔

اس انداز کی بحثوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک بڑے شاعر کا پیغام اپنی فطری سادگی اصلیت اور راست نفسیاتی اثر سے دور ہو کر بحث کرنے والوں کی ذاتی علمیت اور دلائل میں گم ہو جاتا ہے دوسرے...

... ...اقبال کی تشریح و توضیح میں اتنی ہی پیچیدگی پیدا ہوتی ہے جتنی کہ شرح کرنے والے کے دماغ میں رہتی ہے۔ قرآن مجید کی تفسیروں نے جس طرح قرآن کو "آیات بینات" کی مدوں سے نکال کر فقہ، تصوف اور کلام کی گتھیوں میں الجھا دیا اسی طرح اندیشہ ہے کہ اقبال اور اس کا کلام جو تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہمارے فہم و ادراک، جذبہ اعتراف و قبول اور ہماری شعوری زندگی کے قریب رہنے کی بجائے علمی بحث اور انفرادی منطق میں نہ گم ہو جائے۔

نفس مضمون پر غور کرنے سے قبل حسب ذیل تین امور کو ذہن نشیں کر لینا چاہیے۔

۱۔ شاعر اقبال فلسفی نہیں ہے۔ "فلسفی" کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو ابتدا سے مسائل پر ایک خاص نقطۂ خیال، انہماک اور علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا اور آخر وقت تک ان کی تحقیقات ردّ و قدح کر کے ایک نظام فکر متعین کرتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور شعور پورے طور پر جاگزیں ہوتا ہے۔ شاعر کے حکیمانہ خیالات کو فلسفہ سے متصادم نہیں کیا جا سکتا۔ میری رائے میں فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے کیونکہ فلسفی ایک ذی شعور انسان.. "پاسبان عقل" کا محکوم

منطق اور معقولیت کا شکار رہتا ہے اور اس کے برعکس شاعر ایک جذباتی انسان شعور، منطق اور راک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنانے والا۔ ہاں اگر کلام کی نوعیت اس قسم کی ہو تو بعض شاعروں کے عمیق تصورات کو "حکیمانہ شاعری" کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس شاعری کا کوئی "مستقل" نظام فکر یا معقول اور منطقی محاذ قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ زندگی کی بعض صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھار سکیں۔

۲۔ جس طرح شعر کی دنیا "فلسفہ" نہیں ہوتی اسی طرح وہ کوئی منطق یا نظام العمل بھی نہیں ہوتی جسے ہم کانگریس یا مسلم لیگ کے پروگرام کی طرح اپنی زندگی کا ایک راست اور بالا رادہ لائحہ عمل بنا سکیں شاعر کسی نصب العین کی جھلک دکھاتا اور اپنا نقطہ نظر پیش کرتا ہے جس کا مقصد عقل کے بندوں کو تشفی بخشنا یا قایل کرنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے نقطہ نظر کو دلفریب بنانے کے لیے جذبات اور احساسات سے کھیلتا ہے ممکن ہے اس طریقہ سے عقل بھی بیدار ہو جائے۔

۳۔ اقبال خوش قسمتی سے کہیے یا بدقسمتی سے نثر نویس بھی تھا۔ اس نے چند مقالے لکھے اور تقریریں کیں ہم اُن سے اس کی تعلیمات کا اندازہ کر سکتے ہیں اور نظریات اور عالمانہ خیالات سے واقف ہو سکتے ہیں مگر سوال یہ ہے کہ شعری دنیا میں یہ عالمانہ خیالات داخل ہو کر کیا اپنی اصلیت قایم رکھتے ہیں؟ یا کسی دوسرے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؟ شاعری کس طرح خیالات میں رنگ آمیزی کرتی اور اُن میں کیا وسعت اور اثر پیدا کرتی ہے وہ خود شاعر نہیں جانتا اس لیے اقبال کے نظریات اور فلسفیانہ عقاید کو معلوم کرنے کے لیے اس کی تقریروں اور مقالوں کا مطالعہ مفید ہو سکتا ہے لیکن ان اصولوں کو شعر کے ذریعہ سمجھنے کے لیے دنیائے شعر کی "جادوگری" کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ میں ۲۵ سال سے متواتر اقبال کے کلام سے وابستہ رہا ہوں۔ میں نے اس کی پہلی نظم "کوہ ہمالہ" کے بعد سے برابر ان کے ارتقائے خیال کا مطالعہ کیا ہے اور لفظی بحثوں سے ہٹ کر ہمیشہ "شاعر اقبال" میں "انسان اقبال" کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں جب کبھی اس کے کلام اور فلسفے پر غور کرتا ہوں تو ان کے الفاظ

تشبیہات اور استعارات کے بہت پیچھے نفس شعور ادراک اور احساس کی اس دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں سے خیال کی آفرینش ہوتی ہے۔ اور وہ خیال اپنی کئی نفسیاتی منزلیں طے کرتا ہوا شعر کے قالب میں اپنی نمود حاصل کرتا ہے۔ غالب نے کہا تھا ؎

بینیم از گداز دل، در جگر آتشے چو سیل   غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

اس کے مطابق شعر کے سمجھنے کا میرا بنیادی اصول رہا ہے کہ میں شعر کے الفاظ پر (جو عکس خیال ہوتے ہیں، خیال نہیں ہوتے) غور کرنے کے بجائے "گداز دل" کو محسوس کروں اور رہ بہ ضمیر حاصل کروں۔ اس طرح میں شاعر کو بغیر دیکھے ہوئے اس کی شعری تصویر پر ناز کرتا ہوں۔

فاضل مصنف کے مضمون میں جو طریقہ فکر و استدلال ہے اس سے مجھے اصولی اختلاف ہے۔

اقبال کے ذہنی ارتقا پر مسلسل غور کرنے والے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اقبال میں شروع ہی سے دو متضاد قوتیں موجود تھیں ایک عقل کے راستے سے غور و فکر، دوسرے دل کے راستے سے مشاہدۂ باطن۔ اقبال کو کچھ دنوں بعد جب ان دونوں قوتوں پر تھوڑا سا اعتماد ہو گیا تو اس نے کہا ؎

خرد افزود مرا درس حکیمان فرنگ   سینہ افروخت مرا صحبت صاحب نظراں

ان دو قوتوں کو اقبال ہمیشہ اپنے سینے میں دبائے ہوئے رہے۔ وہ ایک طرف "درس حکیمان فرنگ" یعنی فلسفہ دوسری طرف "صحبت صاحب نظراں" یعنی مشرقی تصوف کو اپنی شاعرانہ زندگی کی روح بنائے رہے لیکن یہ دو قوتیں آگ اور پانی کی طرح اس کے دل میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی رہیں۔ اگر ہم بانگ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک اس کی تصانیف کا مسلسل مطالعہ کریں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعرانہ زندگی اور خیال کی مختلف منزلوں پر یہ دو قوتیں کس طرح متصادم ہوتی رہیں۔ نتیجہ کیا نکلتا رہا اور ان دونوں کے باہمی تصادم کا مآل کیا ہوا؟ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ہمیں اس کی جملہ تصانیف میں تین کا مطالعہ ضروری ہے ایک بانگ درا، دوسرے پیام مشرق، تیسرے جاوید نامہ۔ باقی تصانیف ان تین اہم تصانیف کے درمیانی خلا کو پر کرنے والی ہیں۔ یا وہ کڑیاں ہیں جو خیال کے ان تین ممتاز مقامات کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں۔

بانگ درا میں اقبال ایک نوخیز شاعر ہے جو ذوق جستجو کا شکار رہا لیکن اسکے سوالات کا جواب نہیں ملتا۔ پیام مشرق میں اس کے سوالات حل ہونے شروع ہوتے ہیں اور وہ اپنے جوابات کو مشرق کی زبان سے مغرب والوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ جاوید نامہ میں مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں کیونکہ یہ فکر اقبال کے مکمل شباب اور پختگی کا زمانہ ہے۔ اس میں وہ اپنے فلک پرواز خیالات اور نظر کے جملہ مقامات کو ان کی معنویت کے ساتھ دکھا دیتا ہے۔ یہ سہ منزلہ عمارت اقبال کی شعری تعمیر کا ایک مکمل نمونہ بن سکتی ہے جس میں دیگر تصانیف کی کھڑکیاں، برآمدے اور دروازے لگے ہوئے ہیں۔

پیام مشرق کی منزل پر اقبال ایک قسم کی کش مکش میں مبتلا نظر آتا ہے۔ اس کے بعض سوالات کا جواب ملتا ہے اور بعض کا نہیں لیکن اس کش مکش میں وہ جن مستقل نتیجوں پر پہنچ جاتا ہے۔ ان میں دو یہ ہیں جو ہمارے موضوع کے لیے مفید ہیں۔

۱۔ یورپ میں عقل کی ترقی ہوئی اور اس نے زندگی کے مادی معیار کو بہت بلند کر دیا۔ حالات زمانہ کے لحاظ سے اقوام کو یہ درجہ بھی حاصل کرنا ضروری ہے۔

۲۔ یورپ عقل کی ترقی میں روح، دل قلب اور باطن کی قوت سے دور ہو گیا۔ مشرق ہنوز اس روحانیت کا محافظ اور علمبردار ہے۔ لیکن یہ آگ سینۂ مشرق میں چنگاری بن کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ ان چنگاریوں کو بھڑکانا اور نئی آگ سلگانا وہ اپنا فرض سمجھتا ہے۔

فلسفۂ عقل و دل کی اصل اور حقیقت سمجھنے کا مقام یہی ہے۔ پیام مشرق کے دور میں یہ ہوا کہ اقبال کی توجہ عقل کی طرف سے زیادہ تر دل کی طرف پلٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مغرب کی مادی ترقی مشرق کی روحانی نجات کا باعث نہیں ہو سکتی۔ "درس حکیمان فرنگ" پر "صاحب نظراں" کی خاموش تعلیمات ہر طرح حاوی آتی رہیں۔ چنانچہ جاوید نامہ کے بعد سے اقبال عقل کی دنیا سے پورے طور پر دل کی دنیا میں داخل ہو گئے اور ایک منکر درویش کی طرح نعرۂ اللہ ہو لگانے لگے۔

کلام اقبال میں "عقل و دل" کی یہ کشمکش بڑی دلچسپ ہے۔ جب ذوق جستجو بڑھ گیا اور شاعر [illegible] تشکیک سے گزر کر دور یقین میں آگیا تو اسے حقیقت کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اس منزل پر اس نے اپنا مستقل [illegible] نظام

جو قائم کرلیا ہے وہ حسب ذیل ہے۔

حقیقت ایک کل ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری دوسرا روحانی۔ یورپ کی آنکھ حقیقت کے نظری پہلو کو بخوبی دیکھ سکتی ہے لیکن اس کی روح میں صرف مشرق ہی ڈوب سکتا ہے۔ اس لیے عصر حاضر کی بیدار مغز قوموں کی زندگی اسی میں ہے کہ وہ حقیقت کو عقل اور دل دونوں کی آنکھوں سے دیکھیں جسم اور ساخت پر غور کرنا عقل کا کام ہے اور جو چیز قوت روح کی دنیا کی تلاش کرے وہ دل ہے۔ اس دلچسپ مسئلے پر انشاء اللہ بشرط فرصت میں کچھ اور لکھوں گا

ہم نے مختصراً یہ دیکھ لیا کہ اقبال کا ارتقائے ذہنی کس احول میں ہوا؛ اب یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اقبال کے پیام کے چار اہم موضوع ہو سکتے ہیں۔ (۱) عشق (۲) عمل (۳) یقین (۴) خودی۔

میں نے پہلے ہی کہا کہ اقبال کچھ تو اپنے فلسفیانہ مزاج، کچھ مجبور علم اور کچھ افتاد زمانہ کی وجہ سے مجبور ہوئے کہ عقل و دل کی دو متضاد قوتوں کو اپنے سینے میں پرورش کرتے رہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان دونوں کو ملانے کی بھی کوشش کی چونکہ ان کا خیال تھا جس طرح کہ ابھی واضح کیا گیا کہ موجودہ زمانہ کو عقل و دل دونوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ اس کش مکش میں انھوں نے دو اہم سوالات کیے۔

۱۔ انسان کی آخری نجات اور انتہائی بلندی کس چیز میں ہے؛

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے   کہ میں اس سوچ میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

۲۔ اس کے حصول کا ذریعہ کیا ہے؛

ان دو اہم سوالوں کا جواب ان کی فکر و مشاہدہ کی گہرائی نے یہ دیا کہ انسان کی آخری نجات عشق ہے۔ مجھے اس موضوع پر تفصیل سے کچھ لکھنا نہیں ہے۔ اس لئے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ اقبال کا فلسفۂ عشق یا من کی دنیا، قدیم صوفیوں سے مختلف نہیں ہے۔ البتہ اس کے حاصل کرنے کے طریقوں میں کچھ اختلاف ہے۔

عشق کی منزل تک پہنچنے کے لیے انھوں نے تین راستے متعین کیے۔ (۱) خودی (۲) یقین (۳) عمل۔

عمل ایک جامع لفظ ہے جو دنیاوی اور روحانی دونوں قسم کے مقاصد پر حاوی ہے۔ عمل کا پیام دینے سے اقبال کی مراد سوئی ہوئی اور کاہل قوم کو جگانا، ترقی پر آمادہ کرنا اور رائے کام کی قوت دکھانا ہے۔ خواہ وہ

سیاست ہو یا ریاضت، اس پیغام کو انھوں نے طرح طرح سے اُکسایا دو ایک مثالیں خود جوہر صاحب کے دیے ہوئے اشارے سے معلوم کیجیے۔

(۱) لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

(۲) زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی آج کیا ہے فقط اک مسئلہ علم کلام

(۳) وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

یقین :۔ شعری دنیا میں اقبال کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم مسلم کچھ تو یورپ کی جدید تہذیب اور علوم کی زد میں آکر ان حقایق حیات پر اپنا یقین کھو بیٹھی ہے جسے تیرہ سو برس پہلے پیدا کیا گیا تھا۔ جتنا جس بات پر یقین ہوگا اتنی ہی قوت عمل اور احساس پیدا ہوگا۔ عمل میں جوش پیدا کرنے کے لیے حقایق پر یقین رکھنے کی تلقین ایک ضروری تلقین تھی جو اس آزاد خیال زمانے میں خاص جرأت اور حکمت کے ساتھ کی گئی۔ ایسے دور میں جبکہ انسان ہر حقیقت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا ہے اور علوم کے نظریات کے باہمی تصادم کی وجہ سے اسے حقیقت ایک بے معنی چیز معلوم ہونے لگی ہے ذوق یقین کو اُکسانا کمال تھا۔

خودی :۔ یقین اور عمل کے ساتھ ساتھ احساسات کی بیداری ضروری تھی۔ اس مقام پر انھوں نے اپنا فلسفہ خودی جس کا تعلق عقل سے ہے خاص انداز سے پیش کیا۔ یہی وہ منزل ہے جہاں اقبال کی تخلیقی قوت اور ایک خاص پیغام کی جھلک نظر آتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح فاضل مصنف نے کہا اقبال اس بے خودی کے مخالف تھے جس کی تعلیم نے مسلمانوں کو سست احساس اور کاہل بنا دیا تھا۔ اس لئے انھوں نے یہ کہا کہ اب انسان کو اپنی بلندی اپنے مقام اور اپنی روحانی اور عقلی قوتوں کو منفی طریقے کے ساتھ نہیں بلکہ مثبت طریقے کے ساتھ معلوم کرنا چاہیے۔ خودی ہو یا بے خودی دونوں کا راستہ ایک ہے۔ دونوں عشق کے ذریعہ خدا تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ لیکن حالات زمانہ کا اقتضا یہ ہے کہ "منزل کبریا" کا سفر پوری خود شعوری کے ساتھ کیا جائے جس طرح مصنف نے سمجھا۔ اس مقام پر خودی اور عشق، عقل و دل، یا تن کی دنیا اور من کی دنیا میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوتا۔ وہ خودی کے ذریعے یہ چاہتے ہیں کہ انسان "یزداں بہ کمند آور" کا جذبہ پیدا کرے۔ خدا ایک بلند مقام کا نام ہے اور اس مقام کا

حصول اور یہاں تک رسائی کے لئے پہلے حوصلے کی ضرورت ہے۔ حوصلہ خودی کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا کو پانے دیکھنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو بلند کرے۔ ایک جگہ جمع کرلے اور بلند مقام پر آکر خدا کو دیکھے یہ عمل اس کی شایان شان ہے اس طرح خودی نہ صرف عقل کا راستہ بلکہ روح کا راستہ بھی بن جاتی ہے تزکیہ نفس، ریاضت، ذکر وشغل، مراقبہ سب جائز لیکن اقبال کے فلسفے کے مطابق یہ خود انکاری (Self Denial) کی اسپرٹ میں نہیں بلکہ خود شعوری (Self Consciousness) خود ثباتی (Self Assertion) کی روح اور ارادے کے ساتھ۔ ان کا یہ خیال تھا کہ خودی کے شعور اور اس کی بلندی کا ارادہ عام انسانوں کے فائدے کی چیز ہے گو دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہوگا اگر یہ آئندہ چل کر بے خودی میں مبدل ہو جائے تو اس کی یہ تبدیلی وقت اور مقام کے شایان شان ہوگی۔ اس خودی کے دو روپ یہ ہیں۔۔

(۱) خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے۔

یہ سخر لکم ما فی السموٰت و ما فی الارض، کی نہایت ذی شعور، حکیمانہ تفسیر ہے جو اس زمانے میں کی کیجا سکتی ہے

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں انھیں پختہ تر کر دو طریق خانقاہی میں انھیں۔

جوہر صاحب کے پیش کردہ اس شعر میں خودی کا وہ تصور جو میں نے ابھی بیان کیا عمدگی سے واضح ہوتا ہے۔ طریق خانقاہی، گو فرسودہ ہو چکا ہے لیکن عشق کے لیے ضروری ہے البتہ اس میں پختہ تر ہونا چاہیئے وہ اس طرح سے کہ ذکر اور فکر دونوں میں انسان محو ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ ذکر کا تعلق دل سے اور فکر کا تعلق عقل سے ہے جیسے اقبال کسی اور جگہ کہتے ہیں۔

گفت مرگ عقل گفتم ترک فکر گفت مرگ قلب گفتم ترک ذکر

ان مختصر توضیحات سے معلوم ہوا کہ اقبال کے نزدیک انسانی ترقی کی آخری منزل عشق ہے جہاں خدا ہاتھ آتا ہے اس تک پہنچنے کے تین راستے، ایک خودی (۲) عمل (۳) یقین۔ انھیں پر زور دینے کے لئے اس نے طرح طرح کی تشبیہیں، استعارے حکمت اور دوربینی کے نکات اور مثالیں پیدا کیں۔ افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے جو مثالیں دی ہیں وہ بعض مقامات پر برجستہ نہیں ہیں اور نہ ان کا مفہوم صحیح پیش کیا گیا ہے، مثلاً انھوں نے ایک شعر پیش کیا ہے۔

معجزۂ اہل فکر فلسفۂ پیچ پیچ — معجزۂ اہل ذکر موسیٰ و فرعون و طور

اس شعر کا پہلا مصرعہ ان کے مفید مطلب ہے۔ دوسرے مصرعہ میں اقبال نے عمل یقین اور عشق کے متفقہ پیغام پر زور دیا جس کے مظہر حضرت موسیٰ ہیں اور ان کا تعلق فرعون اور طور سے ہے پیغمبرا اقبال کے نزدیک خودی عمل یقین اور عشق کا مکمل نمونہ ہوتا ہے۔ فاضل مصنف نے دوسرے مصرعہ کی قوت کا اندازہ نہیں کیا اور نہ اس کا ذکر کیا اسی طرح اقبال نے عمل اور خودی کی قوت کو اکسانے کے لیے فلسفہ شاہین کی دلچسپ تشبیہ پیدا کی۔ عقل کو غلام عشق کو امام علم کو پوست عشق کو مغز، جنوں کو جو عشق کی ایک والہانہ کیفیت ہے علم سے زیادہ تیز رو بتایا بہرحال جس موقعے پر جس مسئلے کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت ہوئی وہاں حسن کمال کے ساتھ اس پر زور دیا گیا۔ مثلاً

عقل ہے بے زمام ابھی عشق ہے بے مقام ابھی — نقش گر ازل ترا نقش ہے نا تمام ابھی

اس شعر میں عقل اور عشق کی ناتامی اور بے راہ روی پر افسوس کیا ہے۔

یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

مصنف کے پیش کردہ اس شعر میں، جیسا کہ میں نے کہا خودی کو عقل و دل دونوں کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند — آدم بہ میرد از بے یقینی

اس شعر میں یقین کی قوت دکھائی گئی ہے۔

نشان راہ ز عقل ہزار حیلہ مپرس — بیا کہ عشق کمالے ز یک فنے دارد

اس میں عقل پر مکمل اعتماد کو باطل قرار دیتے ہوئے عشق کے کمال کی وضاحت کی گئی ہے اس طرح مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ ہزار طریقوں سے اقبال نے اپنے پیغام کے ان چار عناصر کو روشن اور موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ سارا پیغام کالعدم ہو جاتا اگر ان عناصر میں توافق باہمی کے بجائے تصادم باہمی کیا جاتا یا ایک کو دوسرے کا حریف گردانا جاتا۔ لیکن بہ نظر غور دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اقبال نے ان کے مدارج اور فوقیت کا ہر منزل پر خیال رکھا ہے اور جو واسطہ اور رابطہ ایک کو دوسرے سے ہے ان کی ترتیب اور مقام کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے فاضل مصنف اس مقام پر غور و فکر سے کام لیں تو مناسب ہو۔

آخر میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ

۱۔ اقبال کی کمال شاعری اور اس کی قوت تخلیق اس کے علم سے متاثر ہوئی۔ ایک تو "العلم حجاب الاکبر"
دوسرے اس کے خیالات میں اس کے مطالعہ اور مشاہدہ کی وجہ سے دوسروں کے خیالات کی اس قدر
پرچھائیاں آگئیں کہ اس کے اکثر خیالات کسی نہ کسی گزشتہ بڑی شخصیت میں خواہ وہ غزالی ہوں یا برگساں تلاش
کیے جا سکتے ہیں۔ اس مقام پر یہ کہنا کہ یہ خیال غزالی کا ہے، یہ نظریہ برگسان کا ہے، اس لیے ناموزوں ہے کہ
اقبال نے بالارادہ اپنے خیالات کو اس طرح نظم نہیں کیا کہ وہ ان کے معلوم ہوں یا انھیں مخاطب کیا جائے۔

۲۔ اقبال نے اپنے کلام میں حقایق پیش کرنے کی کوشش کی اور ظاہر ہے کہ حقایق نئے نہیں ہوتے
شاعر جن حقایق کو پیش کرتا ہے وہ تو زندگی میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔ بہت ممکن ہے نیوٹن، آئن اسٹائن یا آئندہ
دنیائے سائنس میں نئے انکشافات کریں لیکن زندگی اور جذبات کی دنیا میں حقیقت جانی پہچانی ہوتی
ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اقبال کی "من کی دنیا" کوئی نئی چیز نہیں، خود کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے؟
اس لیے اس مفروضہ یا تصور ما قبل کے ساتھ کہ اقبال ایک فلسفی تھا، نئی چیزیں پیش کرتا تھا انتہائی اَدق مشکل
شاعر تھا، معلم تھا اس کے کلام کا مطالعہ کرنا خواہ مخواہ غیر ضروری صفات کا افسانہ کرکے اس کے کلام کو مشکل تر
بنا دینا ہے۔

جہاں تک اس کے بیانات شاعرانہ کا تعلق ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ واقعہ اُلٹا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری
کے بعض نظریات کو واضح کرنے کے لیے انھیں نثر کے خشک قالب میں ڈھالنے اور ان کی شرح کرنے کی
کوشش کی۔ اس کے برعکس اگر اس نے اپنی تقریروں میں شعوری ارادے، سنجیدگی اور غیر جذباتی طریقے سے
بیان کیے ہوئے جذبات کو شعر کا لباس پہنانے کی کوشش کی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خیالات اور نظریات من و
عن اسی طرح شعر میں منتقل ہو گئے ہوں جس طرح نثر میں ہیں۔ شاعری کی ایمائیت (Suggestiveness)
اثر اور وجدان کو روکنا جس کے ذریعہ اصل خیال کچھ سے کچھ بن جاتا ہے اور نئی تاثیر پیدا کر دیتا ہے، خود شاعر کے
بس کی بات نہیں۔ اقبال خود نہیں جانتا کہ اس کے مقالوں میں ظاہر کیے ہوئے خیالات اس کے شعر میں جلوہ گر
ہو کر ہم پر کیا اثر کر رہے ہیں؟

محمد عبدالقیوم خاں باقی

عاشقی[1]

انسانی زندگی میں سیکڑوں گوناگوں واقعات پیدا ہوتے ہیں اور پورے ہوتے ہیں۔ عموماً ہمارے منصوبوں کے قول وفعل میں بے آہنگی کے عنصر کا کیا ذکر، ایسی ہم آہنگی اور مطابقت ہوتی ہے جیسے تصویر کے ساتھ پس منظر یا مطرب کے ساتھ باجے کی آواز۔ واقعات ہماری پیش بندیوں کے مطابق اس طرح پورے ہوتے رہتے ہیں کہ ہم ماضی و حال کی خوشگوار تاریخ سے اپنے مستقبل کے بھی اُتنے ہی روشن اور خوش آیند ہونے کی امید کیا کرتے ہیں۔ لیکن خواہش کے مطابق کاموں کی تکمیل اور حصول مقصد کے باوجود ہماری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ضرور پیش آتا ہے جو ہمیں مبہوت اور ہمارے مستحکم و دیرینہ نظریوں کو متزلزل کر دیتا ہے

عشق اتنا اہم موضوع ہے کہ اس کی حقیقت عاشقوں کی حالت کے مشاہدے یا خود عشق میں مبتلا ہو جانے کی آرزو سے سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کے لیے نہ تو وجدان و کشف کافی ہیں اور نہ معقولات و منقولات بلکہ عشق سے روشناس کرانے والی چیز ہمارے لیے محض ذاتی تجربہ ہے۔ مشہور ہے کہ ایک فرانسیسی ماہر معقولات اپنے دوستوں کے حلقہ میں موضوع عشق پر بحث کر رہا تھا۔ حاضرین میں سے ایک نے کہا کہ وہ کوئی قطعی رائے اُس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کہ خود اس کی کُنہ سے واقف نہ ہو۔ فرانسیسی کو بہت برا معلوم ہوا وہ جلسے سے باہر نکلا اور ارادہ کیا کہ بغیر تجربہ کیے ہوئے منہ نہ دکھائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ واپس آیا اور کہا کہ میں پھر اسی موضوع پر گفتگو کروں گا اس لیے کہ اب میں عشق کی لذت و درد کا خوگر ہو چکا ہوں۔ اگرچہ اس قلیل مدت میں وہ کیفیات اور مدارج عشق سے کیا واقف ہو سکا ہوگا تاہم اس واقعے سے اندازہ ہو جائے گا کہ عشق کو کتابوں اور اقوال سے کوئی نہیں سمجھ سکتا، اس کے لیے صرف ذاتی اقدام اور انفرادی تجربہ کی ضرورت ہے۔

عشق میں گرفتار ہونے کے بعد ہم میں ایک انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے۔ ہماری آنکھوں سے پردے اٹھ جاتے ہیں اور ہمیں گزشتہ تمام تمنائیں گرد معلوم ہونے لگتی ہیں۔ عشق سے پہلے ہمارے باغ آرزو کی ہوا معتدل

---

[1] یہ ترجمہ ہے:- Stevenson's "On Falling in Love"

تھی، ہمارے جذبات میں اشتعال نہیں تھا لیکن اب ان کی جگہ ایک ایسے زبردست جذبہ نے لے لی ہے جو ان تمام چیزوں کو محو کر کے ہم پر پورا پورا غلبہ حاصل کر لیتا ہے اور اس وقت ہم درد و رنج کی ان لذتوں سے آشنا ہوتے ہیں جن سے ہمیشہ نابلد تھے۔ صرف عشق ہی اس معقول پسند دنیا میں ایک نامعقول اقدام ہے جو کسی عقل و فکر کا پابند نہیں۔ اس کے اثرات بھی بالکل مختلف اور غیر متناسب ہوتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کب اور کس کے عشق میں مبتلا ہو جائے گا روز کی بات ہے کہ دو غیر مانوس انسان حسن سیرت و صورت سے عاری ایک دوسرے سے ملتے ہیں، بات چیت کرتے ہیں بیسیوں دفعہ ایسا ہوا کرتا ہے اور ان کو کوئی خیال بھی نہیں ہوتا کہ دفعتاً ایک دفعہ انھیں احساس ہوتا ہے کہ وہ عشق کے دیوتا کا شکار ہو گئے جس نے دونوں میں محبت کا وہ ربط قائم کر دیا ہے کہ معشوق غرض تخلیق عالم اور عطر کشیدۂ آفرینش معلوم ہونے لگتا ہے۔ عاشق کے خیالات اس رشتۂ باطنی میں اتنی مضبوطی کے ساتھ منسلک ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ہر فعل کو معشوق کی پرستش اور خوشی کا سبب سمجھنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کے اپنے وجود کا مقصد بھی محض محبوب کے ساتھ ہم نشینی اور ہم نوائی ہو جاتا ہے۔ لوگوں کو اس واقعہ پر حیرت ہوتی ہے کہ ان دونوں میں کون ایسی چیز مابہ الامتیاز تھی جو ایک دوسرے سے محبت کا پیش خیمہ ہوئی؟ اُن کے نزدیک اگر مرد اپولو بلویڈرے[1] (APOLLO BELVEDERE) کا اتنا حسین ہوتا اور عورت اُس پر فریفتہ ہو جاتی تو چنداں محل تعجب نہ تھا لیکن دشواری تو یہ ہے کہ یہاں مرد میں وہ حسن سیرت و صورت بھی نہیں کہ وہ عورت کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے پھر عشق کا آخر کیا سبب ہوا؟ غالباً اس معمہ کا حل

"بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست"

میں مل سکے۔ ورنہ جہاں تک حسن صورت کا تعلق ہے میری دانست میں صرف دو مرد یعنی لیانارڈو ڈا ونسی[2] (LEONARDO DA VINCI) اور گوئٹے[3] (GOETHE) ایسے ضرور گزرے ہیں جو جوانی میں

---

[1] اپولو یونانیوں کے خیال میں سورج اور موسیقی کا دیوتا مانا گیا ہے۔ اس کی شبیہ بے مثل سنگ مرمر کی بنائی گئی تھی اور جوانی و حسن کی کسوٹی و نشانی سمجھی جاتی تھی۔

[2] پندرھویں صدی کا معروف اطالوی مصور جو غیر معمولی جسمانی حسن اور قوت رکھتا تھا۔

[3] اٹھارھویں صدی کا جرمن فلسفی و شاعر۔ نہایت حسین و شکیل تھا جو اس سے ملتا تھا گرویدہ ہو جاتا تھا۔

عورتوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے تھے۔ ان کے علاوہ مردوں کا بڑا حصہ کسی طرح اپنی جسمانی خوبصورتی سے اس قابل نہیں کہ وہ اپنی نگاہوں سے عورتوں کے سینہ کو چھلنی کر دے۔ عورت کے لیے اس کے برعکس جاذب نگاہ ہونا بالکل ممکن ہے لیکن بدقسمتی سے میں مرد ہوں اس لیے غیر جنس کے نفسیات پر کوئی فیصلہ نہیں دے سکتا۔

دنیا میں سیکڑوں کام ایسے ہیں جن کے سبب خود ہم ہوتے ہیں ہم چاہے اسے کریں یا نہ کریں تقدیر سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ ہماری تمام روحانی فضیلتیں، شفقت، بلند خیالی، نیک اعمالی اور تمام وہ کام جو ہماری روحانیت میں اضافہ کرتے رہتے ہیں ہمارے ہی بس میں ہیں ہم انھیں چاہے بگاڑیں چاہے بنائیں مقدر کا ان سے کوئی تعلق نہیں لیکن دنیائے عشق میں تو بس مقدر ہی کی حکمرانی ہے۔ عاشق ہونا یا نہ ہونا ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس لیے کہ عشق اختیاری و اکتسابی نہیں بلکہ اضطراری اور غیر اختیاری چیز ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ شیکسپیر بھی اس میدان میں سپر انداختہ رہا اور جب ملکہ ایلزبتھ نے اس سے فالسٹاف کو عاشق کی حیثیت سے پیش کرنے کی فرمائش کی تو اسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بہت ناکامیابی ہوئی اس لیے کہ عشق کا مظاہرہ سب کے امکان میں نہیں اور فالسٹاف جیسا موٹا مکروہ، بزدل اور الھڑ انسان کبھی بھی اس کا مناسب موضوع نہیں بن سکتا تھا۔ شیکسپیر کی طرح ہنری فیلڈنگ بھی عشق کی چاشنی سے بے خبر تھا۔ سوائے راب رائے نامی ناول کے ایک آدھ باب کے اسکاٹ کے متعلق بھی میری یہی رائے ہے۔ جب یہ تین تاریخی عظیم شخصیتیں یعنی شیکسپیر، فیلڈنگ اور اسکاٹ جن میں سب کے سب تخیل کے اعتبار سے بلند پرواز، صحت کے اعتبار سے تندرست، احساس کے اعتبار سے ذی حس اور طبائع کے اعتبار سے مخیر انسان تھے اور جن سے ہم عشق کی صحیح ترجمانی کے متوقع ہو سکتے تھے اس وادی سے ناکام واپس آئے تو ان زرد رو، بے حس اور خود پسند انسانوں سے جن کا زیادہ وقت

سلہ شیکسپیر کے ڈرامہ ہنری چہارم میں پرنس ہال کا ندیم و جلیس ہے۔ اس ڈرامہ کو دیکھنے کے بعد ملکہ ایلزبتھ نے شیکسپیر سے فرمائش کی کہ فالسٹاف جیسے بیوقوف آدمی کو عاشق کی حیثیت سے دکھائے چنانچہ اس نے حکم کی تعمیل کی اور اپنے ایک دوسرے ڈرامہ میں فالسٹاف کو ایک خادمہ کا عاشق دکھایا مگر ناکامیاب رہا

لباس کی سج دھج میں صرف ہوتا ہو اور جن کی تعداد شاید دنیا میں سب سے زیادہ ہو کبھی عشق جیسے بلند جذبہ کی امید کرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہو۔ ان کی تو بس یہ مثال ہے کہ جس طرح بھیگا ہوا کپڑا آگ سے یا نابینا مناظر قدرت سے متاثر نہیں ہو سکتا اسی طرح مادہ جذب و انجذاب کا فقدان ان کے دل کی بستی میں عشق کو کبھی خیمہ زن نہ ہونے دے گا اس میں شک نہیں کہ بہت سے ایسے بھی ملیں گے جو مادہ انجذاب رکھنے کے باوجود محبوب کا عشق حاصل نہیں کر سکتے اور یوں تخلیق عشق مشکل ہو جاتی ہو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ اس ناکامیابی کے بھی اسباب وجوہ ہیں:-

معشوق سے اظہار عشق ایک نہایت نازک اور اہم بات ہو۔ اکثر اوقات مناسب موقع کا نہ ملنا یا جھیپ کی وجہ سے عشق ظاہر نہ کرنا بھی محبت کو ختم کر دیتا ہو بعض عشق کی ڈینگ مارتے ہیں مگر وہ اس سے باہر قدم نہیں رکھتے لیکن ایک عقلمند انسان مقدمات عشق سے واقفیت کی وجہ سے پہلے ہی سے زمین ہموار کرتا رہتا ہو اور مناسب موقع پر اظہار محبت کرکے کامیاب ہو جاتا ہو۔ بہت سے ایسے مرد بھی ملیں گے جو صدائے "ارنی" اور جواب "لن ترانی" کے بعد بھی اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں۔ اور آخر کار عشق حاصل ہی کر لیتے ہیں لیکن اس ضد میں ایک قباحت ہو اور وہ یہ کہ اگرچہ عورت فطرتاً عشق کا دم بھرنے سے اور چکنی چپڑی باتوں سے خوش ہوتی ہو تاہم معاشقہ کی تکرار سے پریشان ہو جاتی ہو اور بہت ممکن ہو کہ عاشق اپنے فعل سے محبوب کی نظروں میں سبک ہو جائے اگر بالفرض محال ایسا نہ ہو تو بھی زبردستی کے عشق کے بعد شادی حتما زیادہ خوشگوار اور دیرپا نہیں ہو سکتی۔ عشق جبریہ کامیاب نہیں بنایا جا سکتا۔ عشق تو دراصل وہ ہو جو خود سے پیدا ہو۔ مدارج کامل طے کرتا ہوا دونوں طرف آگ لگا دے اور محبت کی آغوش کھول کر ایک دوسرے کا استقبال کرائے۔ یا دوسرے الفاظ میں عشق کی ابتدائی حالت یوں سمجھو کہ دو عشق کے متوالے کمال احتیاط اور مشتعل جذبات کے ساتھ اس طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھیں جس طرح کہ دو نادان بچے ایک انجان اور تاریک کمرے میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کا منھ تکتے اور ایک دوسرے کے نقش قدم پر چلتے ہوں جب عشق کی یہ کیفیت ہو گی تب ہی نظروں یا پیشانی سے ایک دوسرے کے خیالات اور تکلیفوں کو سمجھ سکتے ہیں اور اس طرح عشق کی آواز بازگشت دونوں دلوں کو باخبر کرکے ایک دوسرے سے اس طرح واقف کر دیتی ہو کہ انھیں اظہار عشق کی ضرورت

بھی نہیں ہوتی۔ وہ آپس میں اس طرح یک جان ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ روحانی رشتہ پیدا ہو جاتا ہے کہ عاشق کے دل میں جب کوئی بات آتی ہے تو وہ فوراً سمجھ لیتا ہے کہ یہی بات محبوب کے دل میں بھی پیدا ہوتی ہوگی

عاشق ہونا جتنا تحیر زا ہے اتنا ہی مفید بھی۔ یہ زمانہ کے انحطاطی اثرات کو زائل کر کے طبیعت کو جیت اور دماغ کو قوی رکھتا ہے۔ یہ بد دماغی اور بد مزاجی کو جس کی طبیعت عادی ہو جاتی ہے دور کر کے انسانی احساسات میں ایک نئی روح پھونکتا ہے اور اس کے خفتہ اور نیم خفتہ جذبات کو بیدار کر دیتا ہے۔ عشق سے قبل تک انسان ان تمام لذائذ کا جو اس کی پہنچ سے باہر تھے منکر رہا کرتا، چیزوں کے تاریک پہلو پر نظر رکھتا اور روشن پہلو سے قطع نظر کر کے زندگی کی بیکار و بدمزہ چیزوں سے دل بستگی حاصل کیا کرتا تھا۔ اس طرح گویا اس نے زندگی کے تمام عمدہ جذبات، جوانی کی لذت، ظرافت اور حسن کہ جن کا اس کے پاس ذخیرہ تھا عدم استعمال کی وجہ سے زنگ آلود کر دیا تھا۔ وہ محبت کے باغیوں کا ایک رکن بن گیا تھا۔ خودداری کا غلط مطلب اور خود غرضی کی آزادی کو وجہ ناز سمجھتا تھا۔ وہ اپنے محدود حلقۂ مشاغل سے قدم باہر نکالنا گناہ اور شادی کو ڈراؤنا خواب جانتا تھا لیکن ان تمام قنوطیت اور کہنہ پرستیوں کے باوجود عاشق ہونے کے بعد اس میں سینٹ پال[1] کی طرح ایک اچانک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کے قلب کی حرکت جو ابھی تک تدریجی تھی ایک بارگی تلاطم و جزر و مد کا عالم پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے اور دنیا کی ہر چیز اسے ازلی ولاہوتی نور میں غرق دکھائی دیتی ہے۔ اب اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے آج تک نہ کچھ دیکھا تھا نہ سنا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ اپنی گزشتہ زندگی اسے خواب معلوم ہونے لگتی ہے عشق کے تیز احساسات اسے مضطرب اور بے کیف رکھتے ہیں کبھی تنہائیوں میں خوب ہنستا ہے اور کبھی راتوں کو ٹکٹکی باندھے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا کرتا ہے قلم میں کہاں وہ قوت کہ اس دماغی کیفیت کی تصویر کشی کر سکے۔ اسے ہم محض فلاسفہ اور شعرا کے چند زبردست شاہکاروں میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ایڈیلیڈ[2] نامی نظم میں مینی تسن کی

---

[1] ابتدا میں یہ یہودی تھا اور عیسائیوں کا جانی دشمن لیکن دفعتاً اس کے خیالات میں تبدیلی ہوئی اور وہ مذہب عیسائیت کا زبردست حامی اور مؤید ہو گیا۔

[2] جرمن شاعر فریڈرک متھی سن (۱۷۶۱ء تا ۱۸۳۱ء) کی نظم جو موضوع عشق پر بے نظیر نظم ہے۔

ماڈر ( ) میں ہینے[1] ( ) کی غزلوں میں شیکسپیر کے انٹنی اینڈ کلوپٹرا ( ) اور رومیو اینڈ جولیٹ ( ) وغیرہ میں اس کیفیت کی حیرت خیز ترجمانی کی گئی ہے۔
اسی طرح لا مزربیل میں بلاریس[2] کی حالت بھی اس کیفیت کی پوری پوری آئینہ دار ہے۔ جارج سینڈ ( ) اور جارج میریڈتھ ( ) کے کرداروں میں یہ دماغی کشمکش خوب خوب موجود ہے۔ ہم کہاں تک نام گنائیں ادب میں عشق کے ماروں کی داستان بہت بڑے پیمانہ پر موجود ہے۔ ہم ادبیات کے دروازہ ہی سے شہر ہیولا[3] میں داخل ہوسکتے ہیں جو بہشت سے متصل اور "شہر عشق" کے بالمقابل ہے۔ یہاں بیٹھ کر عاشق خوش بختی اور نہ پوری ہونے والی امیدوں کا خواب دیکھا کرتے ہیں۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عاشق ہونے کے بعد انسان اپنے وجود اور اپنے فعل کو دنیا کے لیے کیوں مفید اور مغتنم سمجھنے لگتا ہے؛ غالباً یہ فطرت ہے کہ انسان اپنے معمولی سے معمولی کام کو بھی عالمگیر اور دنیا پر چھایا ہوا سمجھے بس اسی طرح عاشق بھی یہی خیال کرتا ہے کہ اس کے عشق کے تاثرات اور سرگرمیاں دوسروں کو بھی ضرور متاثر کردیں گے۔ عاشق و معشوق کی نگاہوں میں اپنا وجود اس قدر دلکش اور روح افزا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ دنیا کے لیے ممکنات میں سے بہترین چیز ہے۔ وہ اس جذبہ میں یہاں تک بڑھ جاتے ہیں کہ آسمان کا نیلگوں ہونا آفتاب کا روشن ہونا اور موسم کا خوشگوار ہونا بھی اپنے ہی وجود کا منت کش سمجھنے لگتے ہیں اور اس مبالغہ آمیز معیار عشق کی وجہ سے وہ روز بروز خودنما خود پسند ہوتے جاتے ہیں انسانیت کا معیار عاشق کی نظر میں اس قدر رقیع ہوجاتا ہے کہ وہ ہر عورت کو جان آف آرک ( ) خیال کرتے ہیں۔ مگر خود مثل چارلس گرینڈلین[4] ( ) کی طرح لاف و گزاف اور خودنمائی سے آگے نہیں بڑھتے

---

[1] یہ بھی انیسویں صدی کا جرمن شاعر ہے۔ بہت سی غزلیں لکھیں جو کہ اپنی رشتہ دار ہیلن ایملی ہائینے کے عشق کی وجہ سے نہایت کامیاب ہیں۔

[2] وکٹر ہیگو ( ) کے ناول بدنصیب میں ایک کردار جو عشق میں مبہوت ہے۔

[3] بنیئن ( ) اپنی کتاب پلگرمس پروگرس ( ) میں ہیولا ( ) کو ایک مقام بتاتا ہے جو کہ تمام فرحت و لذت کا نمونہ ہے۔

[4] ریچرڈسن ( ) کے ناول کا ہیرو ہے۔ بولنے میں بڑے بڑے جملے استعمال کرتا ہے اور لاف و گزاف کا عادی ہے جس کی وجہ سے نہایت مضحک ہوگیا ہے۔

مجھے اکثر تعجب ہوتا تھا کہ آیا عشاق کی اس قسم کی لفاظی سے عورتیں بھی خوش ہوتی ہیں! لیکن اب جارج ایلیٹ (G. ELIOT) کے ناول ڈینیل ڈیرونڈا (DANIEL DERONDA) کے پڑھنے کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ بے شک وہ خوشامد سے خوش ہوتی ہیں اس لیے کہ اس ناول کی ہیروئن اپنے عاشق کی ڈینگوں اور چکنی چپڑی باتوں سے انتہائی خوش ہوتی ہو اگرچہ کبھی کبھی جھنجلا بھی جاتی ہو۔

گو کہ عشق کا یہ بلند معیار کہ عاشق و معشوق کا عشق دنیا کی خوش بختی کا سبب ہو اپنے میں کوئی افادی پہلو نہیں رکھتا تاہم اس میں ایک خوبی ضرور ہو اور وہ یہ کہ اس خیال سے عاشق متحیر اور کشادہ دل ہو جاتا ہو اور جس وقت وہ دوسروں کو بھی محبت میں مبتلا دیکھتا ہو تو ان پر ترحم اور خوشی کی نظر ڈالتا ہو۔ ترحم اس وجہ سے کہ وہ اپنے عشق کی تکلیفوں کو یاد کر لیتا ہو اور خوشی اس وجہ سے کہ لوگ عشق میں اس کی تقلید کرتے ہیں جس طرح کسی کمیڈی میں ہیرو ہیروئن اپنے علاوہ کسی معمولی کردار کے عشق پر بھی ترس و شفقت کرتے ہیں اسی طرح اصل زندگی میں بھی باوجودیکہ عاشق اپنے عشق کے مقابلہ میں دوسروں کے عشق کو ہیچ سمجھتے ہیں پھر بھی خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ دوسروں کی محبت بھی پھلے پھولے اور بار آور ہو۔ بہر حال عاشقوں سے ہمدردی فطری چیز ہو یہ روکی نہیں جا سکتی۔ جس طرح کوئی انتہائی کاروباری انسان بھی مناظر قدرت کی دلکشی کی وجہ سے چند منٹ ضایع کرکے اُسے ضرور دیکھ لیتا ہو۔ اسی طرح انتہائی بے حس اور ٹھوس انسان بھی جذبۂ ہمدردی سے پُر ہو جاتا ہے جبکہ وہ دو دردمند دلوں کی داستان پڑھتا ہو یا ان کو شہر کی کسی گلی میں دیکھ لیتا ہو اگر کوئی مدت العمر ناکتخدا لڑکی کسی ناول میں ہیرو ہیروئن کے معاشقہ سے دلچسپی نہیں لیتی تو وہ اس کی خبیث طبیعت کی وجہ سے ہو اس لیے کہ جو شخص عشاق پر کم از کم ہمدردانہ نظر نہ ڈالے وہ بہت ہی پست اور خلاف فطرت ہوگا۔

عاشق و معشوق کا عشق چاہے دوسروں کے لیے مفید ہو یا نہ ہو لیکن اس سے خود عاشقوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہو۔ بھلائی کرنا اور اسے لوگوں تک پہنچانا ان کا مطمح نظر ہو جاتا ہو۔ عاشق کی ذاتی خود نمائی اور خود پسندی ختم ہو جاتی ہو۔ اور اسے محض معشوق کی خوشی اور نظر التفات میں سکون قلب حاصل ہوتا ہو۔ معشوق کی خوشی سے عاشق کے دل میں فخر انکسار، ترحم اور محبت کا وہ جذبہ پیدا ہوتا ہو کہ وہ اپنے ہر فعل میں لباس میں گفتار میں

کردار میں محض معشوق کی خوشی کا خیال رکھتا ہو۔ وہ دنیا کے لیئے جاذب نظر نہیں بننا چاہتا بلکہ صرف معشوق کے لیئے تاکہ اس کی بارگاہ میں ہدیہ نیاز پیش کرتا ہے۔ عاشق اپنی تمام کمزوریوں سے بھی معشوق کو آگاہ کر دیتا ہو اور قبول و عفو کا متمنی رہتا ہو۔ اب اس کی محض یہ خواہش رہتی ہو کہ وہ اپنے کسی ذاتی محاسن کی وجہ سے نہ چاہا جائے بلکہ اصلی حالت میں اس سے محبت کی جائے۔ اپنی حالت کو معشوق کے سامنے صحیح پیش کرنا دنیا میں سب سے مشکل کام ہو اس وجہ سے کہ انسان محض الفاظ کے ذریعہ سے اپنے خدوخال کو صحیح دکھا سکتا ہو اور اس میں اس بات کی ہر وقت گنجائش ہو کہ وہ اپنے معنوں کو بخوبی ادا نہ کر سکے یا معشوق، الفاظ کے مناسب نہ ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑجائے۔ پس اس سبب سے اپنے کردار کے صحیح پیش کرنے میں انسان کو عموماً ناکامیابی ہوتی ہو۔ عاشق اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ آیا وہ اپنے کو دنیا کے سامنے صحیح دکھا سکا یا نہیں، اس کی دلی تمنا یہ ہوتی ہو کہ وہ اپنے کو معشوق کے سامنے اصلی رنگ میں دکھا سکے۔ اس کی بس یہ خواہش رہتی ہو کہ معشوق اسے اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی طرف سے کسی غلط فہمی یا ناواقفیت میں مبتلا نہ رہے جب اس کوشش اور محبت کے باوجود اسے کسی وقت یہ علم ہو جاتا ہو کہ معشوق نے اسے پوری پوری طرح نہیں سمجھا ہو یا مزاج شناس نہیں ہوا ہو تو عاشق میں جذبہ بغاوت و نفرت پیدا ہو جاتا ہو۔

عاشق گزشتہ زندگی پر نظر ڈالنا اپنے لیے کوفت و معیبت سمجھتا ہو۔ اسے اس بات سے اذیت ہوتی ہو کہ زمانہ ماضی بغیر اس معشوق کی ہمراہی کے کیوں صرف ہوا اور اس نے اتنے عرصہ تک دوسری عورتوں سے کیوں عشق بازی کی۔ کیوں نہ اپنے اسی محبوب کے ساتھ رہا؟ یہ خیال اس کے جذبہ خودداری کو ٹھیس لگاتا ہو۔ اپنے ان خیالات پر تو اسے رنج ہوتا ہی ہو۔ لیکن جو چیز اس کے دل میں ناسور پیدا کر دیتی ہو اور اس کے زخم کو مندمل نہیں ہونے دیتی وہ یہ ہو کہ خود معشوق نے ماضی میں کیوں اس کے علاوہ دوسرے مردوں سے تعلق رکھا اور کیوں خدائے رحیم اتنے عرصہ تک عورت کے دوسرے مردوں کے عشق پر راضی رہا؟ یہ مرد کی خودغرضی ہو ورنہ جس فعل کو خود اس نے روا رکھا تھا اسے عورت کے لیے کیوں معیوب سمجھتا ہو؟

مرد اپنے عشق کی مطلق العنانی کو جائز رکھتا ہو لیکن عورت کے اس رویہ کو غیر فطری اور عملی زندگی کے خلاف سمجھتا ہو۔ مرد کا یہ جذبہ قابل ستایش نہیں اس لیے کہ دونوں کو برابر کا حق ہو اگر مرد کو عورت کے پچھلے واقعات

عشق کی وجہ سے اس سے حسد پیدا ہو گیا تو وہ عشق پاک و بے آلائش کب رہے گا؟ وہ تو نفسانی خواہشوں کا گویا شکار رہا اور گویا ہوس رانی ہی اس کا اصل مقصد تھا۔ غالباً حسد انسان کے خمیر میں نہیں رہا ہے اور اس کے لیے محض یہ ثبوت کافی ہے کہ جب قدیم ترین انسانی نسلیں عشق کی تھوڑی پونجی کے ساتھ دنیا میں آئیں تو ان میں یہ مادہ تھا ہی نہیں یہ تو تہذیب و تمدن کی برکت ہے کہ حسد پیدا ہوا ہم میں جتنی تہذیب ہو گی اتنا ہی بلند ہمارا عشق ہو گا اور اتنا ہی زیادہ حسد ثبوت کے لیے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ دوسرے ممالک والے جو ہم سے کم متمدن ہیں عشق کا پست معیار رکھتے ہیں اور ان میں کتنا کم حسد ہوتا ہے اس جگہ ہمارے لیے یہ ضروری نہیں کہ ہم عشق کی کوئی تاریخی ریسرچ کریں اور یہ بتائیں کہ آیا وہ قدیم قوموں مثلاً یونانیوں وغیرہ میں بھی تھا یا نہیں اس وجہ سے کہ یہ تفتیش ہمیں مغالطہ میں ڈال دے گی۔ ہمیں بس یہ ماننا پڑے گا کہ عشق تخیل و تہذیب تمدن کی برکت ہے اور حسد عشق کا دوستی، وطنیت اور مناظر قدرت سے دلچسپی لینے کے سلسلہ میں پیدا ہوا اگر ہم عشق کو اس وجہ سے ذلیل نہیں سمجھتے کہ یہ ہماری موجودہ تہذیب کا کرشمہ ہو جو دہ تہذیب کا طرۂ امتیاز ہے تو ہمیں حسد و رقابت کو بھی بری نظر سے دیکھنے کا مجاز نہیں اس لیے کہ یہ تو محض اسی عشق کا ہی جزو لاینفک ہے چاہے اسے کوئی مانے یا نہ مانے واقعہ یہی ہے۔

حقیقت امر یہ ہے کہ معشوق کی گزشتہ زندگی اور معاشقہ کی داستان پر جس جذبۂ نفرت کو ہم حسد سے تعبیر کرتے ہیں وہ فی الاصل حسد نہیں کہا جا سکتا اگر کوئی مرد شادی کے بعد اپنی بیوی کے پاس ان خطوط کا مجموعہ پائے جو اس نے شادی سے قبل دوسرے عاشقوں کو لکھے تھے تو کیا مرد اپنی بیوی سے حسد کرنے لگے گا؟ نہیں: مرد کو محض دکھ ہو گا اور شدید دکھ۔ اسے تکلیف ہو گی کہ جورو نے شادی سے قبل کیوں دوسروں سے محبت کی۔ وہ اس بات پر افسوس کرے گا کہ زن و شو ایک ہی احساسات و جذبات کے ساتھ کیوں نہ توام پیدا ہوئے تاکہ دونوں میں کوئی راز نہ رہتا۔ وقت بھی نہ ضایع ہوتا۔ کیس اور ایک دوسرے کا تعلق بھی پیدا نہ ہوتا ان کا عشق آپس میں کامل اور بے غل و غش رہتا اور ابتدا ہی سے ساتھ رہنے کی وجہ سے تضیع اوقات نہ ہو سکتا اور وہ اس غم و غصہ سے بھی نجات پا جاتے کہ وہ پیدا ہونے کے بعد ہی کیوں نہ بیاہ دیے گئے اور کیوں شادی سے قبل تک کا وقت ضائع ہوا۔ بس ان خیالات کے علاوہ

اسے بیوی سے نہ کوئی حسد ہوگا اور نہ وہ اس کی طرف کوئی ناجائز شک کرے گا۔

عشق انسان کو اس کے غیر فانی ہونے کا یقین کرا دیتا ہے۔ عاشق یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ عشق کی وسعت کے لیے زندگی کوتاہ ہے۔ اس کے لئے زندگیوں کا ایک مجموعہ کفایت کر سکتا ہے۔ زندگیوں کا ایک تسلسل ہونا چاہیئے تاکہ عشق ایک بڑی مدت تک نشو و نما حاصل کرے اور پھولے اور بارآور ہو۔ ان خیالات کے علاوہ عاشق کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی کیوں نہ عشق میں بسر کی۔ اسے لطف اندوز ہونے کے لئے کیوں اس قدر قلیل مدت ملی؛ مگر افسوس کہ عاشق اسی قصر تخیل میں رہتے ہیں اور کوس رحیل بج جاتا ہے۔ اس لئے کہ زندگی عاشقوں کے خیال کی پابند تو ہے نہیں وہ اپنا دورہ پورا کرتی رہتی ہے اور ایک سکنڈ کے لیے بھی اس بات کا انتظار نہیں کرتی کہ ان کی دلچسپی ختم ہو جائے تب موت آئے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ عاشق ہونے کے بعد ہی موت آجاتی ہے۔ بعض کیوپڈ کا نشانہ بننے سے قبل ہی دنیا کو وداع کر دیتے ہیں اور جب عشاق موت کی گہری نیند سو جاتے ہیں، تب کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ جب تیس برس کے عشق کا ڈرامہ دنیا کے ایسٹیج سے ناپید ہو جاتا ہے تو یہ پاک جذبہ جس کو وہ اتنا بزرگ، اتنا عظیم سمجھتے تھے کیا نشانیاں چھوڑتا ہے؟ کچھ نہیں، سوائے دو ایک گیتوں کے جو کہ انھوں نے لکھے ہوں دو ایک عمدہ کاموں کے جو وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے ہوں، اور دو ایک بچوں کے جو ان کی نشانی اور گفتار و کردار میں والدین کی شبیہ ہوں۔ یہ ہے اس غیر فانی جذبہ کی مختصر کہانی۔

مترجمہ اقبال انصاری ایم اے

سُراغ رسانی کے قصّے

سراغ رسانی کے قصے فی الحقیقت عصر حاضر کی پیداوار ہیں لیکن زمانہ قدیم میں بھی ان کے غیر ترقی یافتہ گر دلچسپ نمونے ملتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں سراغ رسانی کا شوق ابتدا ہی سے موجود ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ نہایت مشہور ہے کہ دو عورتیں ان کے پاس فریاد لے کر آئیں۔ ان میں ایک بچے پر جھگڑا ہوا ہر ایک یہ کہتی تھی کہ بچہ میرا ہے اور مجھے ملنا چاہئے۔ حضرت سلیمانؑ نے حکم دیا کہ بچہ کو تلوار سے کاٹ کر آدھا آدھا بانٹ دیا جائے۔ اصل ماں کی ممتا بھلا اس تقسیم کو کیسے برداشت کر سکتی تھی وہ چیخ اٹھی کہ "پیغمبر اعظم! میں بچہ سے در گزری مجھے تو بس اس کی جان پیاری ہے۔" اس طرح حضرت سلیمانؑ کو معلوم ہو گیا کہ بچہ کی حقیقی مالک کون ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ پہلے نفسیاتی سراغ رساں تھے جن کا حال ہمیں زمانہ قدیم کے حالات میں ملتا ہے۔

دانیال کے زمانہ میں بل دیوتا کا ایک مشہور مندر تھا۔ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ گوشت یا شراب جو چیزیں ہر رات دیوتا کو نذر کی جاتی تھیں وہ اُن کو کھا لیتا تھا دانیال بڑے صائب الرائے تھے انھوں نے لوگوں سے کہا کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور اگر تمھیں یقین نہ ہو تو مندر کے صحن میں راکھ بکھیر دو اگلے روز اس کا امتحان ہو جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ صبح کو بادشاہ نے لوگوں کو پجاریوں کے پیروں کے نشانات دکھلائے جو راکھ پر بن گئے تھے اور بتلایا کہ یہی لوگ گوشت اور شراب کے مزے اڑا رہے ہیں دیوتا غریب کو اس کی خبر بھی نہیں۔ دانیال کا یہ کارنامہ تجزیہ کی عمدہ مثال ہے جس کو سراغ رسانی کا پہلا اصول سمجھنا چاہیئے۔

ورجل نے ہرقل کے قصہ میں لکھا ہے کہ کاکس نے اس کے چار بیل چرائے اور ان کی دم پکڑ کر اپنے غار میں لے گیا تاکہ کوئی ان کا سراغ نہ پا سکے کہ وہ کہاں چھپے ہیں لیکن ان کے ڈکارنے نے سارا راز فاش کر دیا۔ اب کاکس غریب کی کم بختی آگئی اس لیے ہماری ہمدردی اس کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ کلاسیکل قصوں

کا یہ نقص ہے کہ اس میں ہماری ہمدردی مجرم کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس نقص کو دور کرنے کی بڑی کوشش کی گئی ہے۔

علم الاصنام کے قصوں اور قدیم روایات میں بھی کہیں کہیں سراغ رسانی کی جھلک مل جاتی ہے۔ ایک آقا کا قصہ مشہور ہے کہ اس کے چور کا پتہ لگانے کے لیے اپنے تمام نوکروں سے کہا کہ وہ ایک جادو کی بلی کو ہاتھ لگائیں۔ جو چور ہوگا اس کے ہاتھ لگاتے ہی بلی میاؤں کرنے لگے گی۔ آقا نے بلی کے رواں پر کوئی چیز مل دی تھی۔ جب سب کے ہاتھ دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک شخص کے ہاتھ بالکل صاف اور بے داغ تھے وہی چور تھا اس لئے کہ اس نے میاؤں کے ڈر سے بلی کو دور ہی سے برائے نام چھو لیا تھا!

ایک شیر کا قصہ مشہور ہے کہ اس نے جنگل کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کی دعوت کی لومڑی نے دیکھا کہ بہت سے ہرنوں کے بھٹ تک جانے کے تو نشانات ہیں لیکن واپسی کے نہیں ہیں اس لیے اس نے شیر کی دعوت نامنظور کر دی۔ یہ تمام قصے تجزیہ اور نفسیات کی واقفیت پر دلالت کرتے ہیں۔

لیکن ان قصوں میں اور موجودہ سراغ رسانی کے قصوں میں بڑا فرق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی عمارت اسی بنیاد پر قائم کی گئی ہے لیکن موجودہ حالات، سائنس اور نفسیات کی واقفیت نے اس کو ایک مستقل فن کی صورت دیدی ہے۔ اور اسی لیے اس کا صحیح معنوں میں انیسویں صدی کے وسط سے قبل آغاز بھی نہیں ہوا۔ کانن ڈائل (سنہ ۱۹۳۰ء سے ۱۸۵۹ء) پہلا شخص ہے جس نے سراغ رسانی کے قصوں کی مقبولیت بڑھائی اور ۱۹۱۴ء کی لڑائی کے بعد ان کی مانگ اتنی بڑھ گئی کہ روز بازار ان سے بھرتے تھے اور روز خالی ہوتے تھے۔ سراغ رسانی کے قصے نوجوانوں میں زیادہ مقبول ہوئے یوں تو ہر زمانہ کے نوجوانوں میں شوق تلاش و تجسس رہا ہے لیکن اس زمانہ کے نوجوان اس معاملہ میں اور بھی بڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ یہ عہد ہی تحقیق و دریافت کا ہے۔

موجودہ صدی تنقیح و احتساب سے عبارت ہے۔ اس میں ہر طرف ہوش و گوش کی فراوانی اور عقل و فراست کی ارزانی نظر آتی ہے۔ وکٹوریہ کے عہد میں جو غیر استدلالی ایمان و یقین پیدا ہو گیا تھا اس کے خلاف بغاوت کی گئی اور ایسی شدید کہ تمام پرانے اصنام خیالی کو مسمار کر دیا گیا۔ اب ہر چیز کو جانچا، پرکھا اور

تولا جاتا ہو اور کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کیا جاتا جو انسانی ذہن و دماغ کو گوارا نہیں ہوتی۔ یہ شک اور شبہ کا دور ہے۔ اب فرض کر لینے اور کسی بات کو طے شدہ سمجھ لینے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ ہر مسئلہ کو چاہے وہ آرٹ کا ہو یا ادبیات کا، اخلاقیات سے متعلق ہو یا مذہبیات سے اسے غیر معتقدانہ اور تشکیکانہ نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور بڑی جانچ پڑتال، شدید غور و فکر اور مکرر سہ کرر تجربوں کے بعد ہی کوئی فیصلہ دینے کی جرأت کی جاتی ہے۔

بیسویں صدی والوں نے عقل کی پاسبانی اور رہنمائی میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور معتقدات کی تمام بنیادیں ہل گئیں لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ہر شخص میں تلاش و دریافت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور اس جذبۂ بے اختیار کی تسکین کے لیے نئے نئے سامان پیدا ہو گئے۔ چیستان اور معمے حل کرنے کا جیسا شوق اس زمانہ میں پیدا ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ادب اور خصوصاً قصّے اور افسانے زمانے کے اس رنگ سے کیسے محفوظ رہ سکتے تھے چنانچہ سراغ رسانی کے افسانوں میں بیسویں صدی کے تمام میلانات آ کر مجتمع ہو گئے ہیں اور وہ ہمارے جذبۂ تحقیق و تجسس کی آسودگی میں بڑی امداد کرتے ہیں۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد قیام امن و سکون کی جو کوششیں کی گئیں ان کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ شاید "رومانی" ادب کو بہت نقصان پہنچے گا اور اب سوائے تجربہ خانوں کے انسان کو کہیں بھی کارنمایاں دکھانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس کے ثبوت میں ایچ۔ جی۔ ویلس کے سائنٹفک ناول پیش کیے جا سکتے ہیں جن میں دار التجربے ہی "رومان زار" کی حیثیت سے دکھلائے گئے ہیں لیکن انسان ہمیشہ جوش آفریں محرکات کی جستجو میں رہا ہے۔ اس کمی کو سراغ رسانی کے افسانوں نے پورا کیا اس لیے کہ ان میں اسرار و رموز، جانبازی اور حوصلہ مندی، خوف و ہراس، جوش و اشتعال سب ہی کچھ موجود تھا اور ان سب باتوں کی منطقی تشریح بھی موجود تھی جس سے سائنٹفک دماغ کو فرحت حاصل ہو سکتی ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں مادّی اور صنعتی عہد کے خلاف زبردست رومانی ردعمل ہوا۔ اس زمانے میں ایسے ناول لکھے گئے جن میں فوق الفطرۃ عناصر شامل تھے اور اس دنیا کی تلخیوں سے گریز کر کے تخیل کے دامن میں پناہ لی گئی تھی۔ ہنگامہ خیز قصے دراصل انھیں فوق الفطرۃ

افسانوں کی دوسری کڑی یا اُن کا منطقی نتیجہ ہیں لیکن اس قسم کے قصوں کی ادبی ترقی اور آراستگی کا آغاز ایڈگرایلن پو (۱۸۰۹ء تا ۱۸۴۹ء) سے قبل ممکن نہ ہو سکا۔ وہ بوسٹن (امریکہ) میں پیدا ہوا اور آئرش نسل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے ماں باپ ایکٹر تھے اور شاید اسی اثر کی وجہ سے وہ ڈرامائی یا ہنگامہ خیز قصے کامیابی کے ساتھ لکھ سکا۔ وہ عجیب و غریب شخصیت اور ذہنیت کا حامل تھا۔ اس میں شاعر کی موضوعیت۔ ریاضی داں کی درست پسندی، فن کار کا تخیل اور سائنس داں کا ادراک، اس عمدگی کے ساتھ سمو گیا تھا کہ وہ اس کام کو بحسن و خوبی انجام دے سکا۔ پو کے قصے جو طلسمی اور خیالی کہانیوں" کے نام سے مشہور ہیں، جدید جاسوسی افسانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئے لیکن ان کا ایک بڑا نقص نصیحت آمیزی ہے بعض اوقات صفحے کے صفحے ماہر جزمیات کا لکچر معلوم ہوتے ہیں اور ان کو اصل قصے سے کوئی ربط نہیں ہوتا۔ کانن ڈائل نے پو کے درسی اور خشک منطقی ڈھنگ کو بدلا اور سراغ رسانی قصوں کے دامن کو گل ہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔ انداز بیان کی شگفتگی اور روزمرہ کے ماحول کی دلکشی نے کانن ڈائل کی مقبولیت بڑھا دی اور اس کے "ہومز افسانے" گھر گھر پڑھے جانے لگے۔ اس سے قبل عہد وکٹوریہ کے دو مشہور ناول نویسوں مسز ہنری وڈ اور ولکی کالنس نے ایسے قصے لکھ کر جو جذبات اور ذہن و دماغ کو متاثر کرتے تھے کانن ڈائل کے لیے راہ ہموار کر دی تھی۔

سراغ رسانی کے افسانوں کی کامیابی کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک تو یہ کہ اس میں پڑھنے والے کی ہمدردی سراغ رساں کی طرف ہو جانا چاہیے ورنہ اسے ایسے قصوں میں کوئی لطف نہیں آئے گا جن میں مجرم کو برابر زک اور شکست ہوتی ہے۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس قسم کے قصے اپنی نوعیت کے لحاظ سے عقلیت کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں چند گتھیوں کو پیش کیا جاتا ہے اور گرہ کشائی کے لیے محض ناخن ہی نہیں بلکہ فہم و فراست بھی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے سراغ رسانی کے قصے تعلیم یافتہ لوگوں ہی میں مقبول ہو سکتے ہیں۔ اگر قصہ ذہن و عقل کو متاثر نہیں کرتا بلکہ صرف جوش و خروش پیدا کرتا ہے تو وہ (THRILLER) ہیجان انگیز چیز ہے اور اس کی مانگ صرف معمولی پڑھے لکھے لوگوں ہی میں ہو سکتی ہے۔ انگلستان میں انیسویں صدی کے آخر میں تعلیم کا شوق نہایت تیزی سے پھیل رہا تھا اور ہر شخص کو

تعلیم سے بہرہ ور کیئے جانے کے مسئلے پر غور کیا جا رہا تھا۔ اسی زمانہ میں تعلیمی قوانین پاس ہوئے اور پیل نے قوانین تعزیری کی اصلاح کی۔ پولیس کا باقاعدہ انتظام بھی اسی عہد میں ہوا جس کے ذریعہ انکشافِ جرم میں پہلے سے زیادہ ضابطہ اور قاعدہ برتا جانے لگا۔ یہ تمام باتیں سراغ رسانی کے افسانوں کی مقبولیت بڑھانے میں معاون ہوئیں اور ان محرکات نے پو کی بنیادوں پر فلک بوس قصر تعمیر کر دیا۔

کانن ڈائل کے شرلک ہومز کے قصے بہت مقبول ہوئے اور ہاتھوں ہاتھ بکے۔ بہت سے لوگوں نے اس کی نقل کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک شخص آرتھر ماریسن کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس کو بھی کانن ڈائل کا مرتبہ حاصل نہ ہو سکا۔ ڈائل نے لوگوں کو ایسا مسحور کر دیا تھا کہ ایک مدت تک کسی اور کو وہ قبول خاطر حاصل ہی نہیں ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں جا کر جی کے چسٹرٹن (۱۸۷۴-۱۹۳۶) شرفِ قبولیت اور خراج تحسین حاصل کر سکا۔ اس کے سراغ رسانی کے افسانوں نے تمام ادبی طبقوں میں دھوم مچادی ۱۹۲۲ء میں یہ رومن کیتھولک مذہب سے وابستہ ہو گیا اور اس تعلق نے اس کا مقصد پچھلے افسانہ نگاروں سے بالکل مختلف کر دیا اس نے اپنے افسانے قانون کی محبت میں یا تفریحِ طبع کے لئے نہیں لکھے بلکہ بحیثیت ایک مذہبی آدمی کے وہ یہ چاہتا تھا کہ مجرم کو اقبال گناہ کا موقع ملنا چاہیے۔ اور یہی اس کے نزدیک جرمیات کے مسائل کا سب سے بڑا حل تھا چسٹرٹن کے "فادر براؤن افسانے" لطیف اصلاح پسندی سے قطع نظر اس اعتبار سے بھی قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے پہلی مرتبہ دنیا کو بتلایا کہ اس قسم کے قصے ادبیات میں بھی بڑا مرتبہ حاصل کر سکتے ہیں۔

۱۹۱۴ء میں پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی جس کی تباہ کاری اور خوں ریزی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اس وقت یہ معلوم ہوا کہ انسان باوصف دعوی شائستگی اب بھی اتنا ہی بڑا درندہ ہے جتنا پہلے تھا۔ وحشت و بربریت کا عہد پھر تازہ ہو گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمانہ کی باگ پیچھے کی طرف موڑ دی گئی ہے۔ اس وقت ہر طرف خطرہ شور اور ہنگامہ ہی نظر آتا تھا۔ اس لیے ادبیات کے ذریعہ اس جذبۂ جانبازی و خطر پسندی کی تسکین غیر ضروری تھی اس لیے اسی زمانہ میں جاسوسی افسانے لکھے گئے جو غیر محاربین کے لیے بہت کچھ دلچسپی کا سامان رکھتے تھے۔

جنگ کے بعد یعنی ۱۹۱۸ء میں رومانی جذبات بہت ابھر آئے اور امن قایم ہو جانے کے بعد ان کی تسکین کا مسئلہ درپیش ہوا اب اہل فکر دلوں کو ٹٹولنے اور اسباب کی چھان بین میں مصروف تھے۔ اسی وجہ سے نفسیاتی ناول کا عروج ہوا۔ لیکن یہ چیز عام پسند نہیں تھی۔ فوج کے خستہ اور درماندہ سپاہی، بے روزگاروں کے جتھے اور ہنگامہ پسند عوام "برگشتہ فکر" اور "مراقبوں" کی فلسفیانہ تحریریں پڑھنے کے لیے تیار نہیں تھے اس لیے اُن کی تسکین کا سامان صرف ہیجان انگیز افسانے اور سراغ رسانی کے قصے ہی بہم پہنچا سکتے تھے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد سراغ رسانی کے افسانوں میں کافی تبدیلی اور وسعت پیدا ہو گئی اب افسانہ میں محض اسرار اور بھید ہی کا ذکر نہ ہوتا تھا بلکہ اب سچ مچ کا ایک معما پیش کیا جاتا تھا جس کے حل کرنے میں پڑھنے والے کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ اسی زمانہ میں آسٹن فری مین نے ایسے دلچسپ قصے لکھے جن کے ایک حصہ میں مجرم کے کاموں کی تفصیل ہوتی تھی اور دوسرے میں بڑی خوبی اور دلآویزی سے رفتہ رفتہ جرم کا انکشاف کیا جاتا تھا۔ کہ چیتاں کا لطف آخر وقت تک قایم رہے۔

بعض لوگوں نے اپنے سراغ رسانوں کی قابلیت دکھلانے کے لیے بڑا مبالغہ کیا ہے۔ اور عجیب عجیب مجرموں کی داستانیں لکھی ہیں۔ اس قسم کا مبالغہ ہیجان انگیز افسانوں میں تو کچھ نبھ جاتا ہے لیکن سراغ رسانی کے قصہ میں مجرم اور سراغ رساں دونوں کو اسی عالم آب و گل کا انسان ہونا چاہیے۔ کامیاب قصہ وہ ہے جس کو پڑھ کر قاری یہ نہ کہے کہ سراغ رساں کتنا ہوشیار ہے بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہو کہ میں کتنا بے خبر تھا کہ میں نے ان پتوں اور علامتوں پر غور نہ کیا :

اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سراغ رسانی کے قصوں میں نہایت معمولی قسم کے جرایم کی داستان ہونا چاہیئے۔ اس کے انکشاف میں کچھ لطف نہیں ہے۔ تھوڑی سی رنگ آمیزی جیسے نرگسی آنکھوں میں سرمہ ہر صنف ادب میں ضروری ہے۔ اس لیے کامیاب افسانہ نگار کو یہ چاہیے کہ وہ عام او رعجیب کے درمیان کا راستہ اختیار کرے اور اس کے اشخاص افسانہ ایسے ذہین لوگ ہوں جو اسی دنیا کے آدمی معلوم ہوں لیکن جو کسی کام میں مہارت خصوصی سے زیادہ اپنی فہم و فراست پر بھروسہ رکھتے ہوں افسانہ نگار کو پڑھنے والے کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ ضروری اتا پتا بتلا دے تاکہ قاری کی دماغی تسکین بھی ہو سکے۔

سراغ رسانی کے قصوں پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ اخلاق پر برا اثر ڈالتے ہیں معترض کے نزدیک جرم کی داستان بیان کرنا ہی جرم کی ترغیب دینا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ آسکر وائلڈ نے اپنے مضمون "دروغ بافی کے زوال" میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کسی کتاب کے متعلق یہ گفتگو کرنا کہ وہ اخلاق پر اچھا اثر ڈالتی ہے یا برا، لایعنی سی بات ہے۔ اگر کوئی تنقید ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ وہ کتاب اچھی لکھی گئی ہے یا بری"۔ والٹر پیٹر کے نزدیک بھی کسی صنف ادب کو جانچنے کا معیار صرف حسن و دلکشی ہے۔ اس کے علاوہ ان قصوں کا منتہیٰ ہی مجرم کا سراغ لگانا ہے۔ ایک اچھے اور کامیاب افسانہ میں ہماری ہمدردی کبھی بھی مجرم کی جانب نہیں ہو سکتی ممکن ہے اس کی سزا کے وقت ہمارے اوپر ہمدردی کا جذبہ طاری ہو جائے اس لیئے اخلاقی اور فنی بہتری اسی میں ہے کہ افسانہ کو انکشافِ راز یا حراست مجرم کے بعد ختم کر دیا جائے۔ اس کے آگے قصہ کو بڑھانا یا افسانہ نگار کا جج کے فرائض انجام دینا خوش مذاقی اور فن دونوں کا خون کرنا ہے۔

سراغ رسانی کے اعلیٰ اور کامیاب قصے جذبات و احساسات کو نہیں بلکہ ذہن و دماغ کو متاثر کرتے ہیں اس لیے ان کا شمار آرٹ کے زمرہ میں نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آرٹ غیر متغیر جذبات و کیفیات پر اثر ڈالتا ہے۔ اسی لیے حقیقی آرٹ ہمیشہ مستقل اور پائیدار ہوتا ہے شیکسپیر حقیقی آرٹسٹ تھا اور اسی لیے آج تک زندہ ہے۔ اس کے علاوہ سراغ رسانی کے قصے زیادہ تر زندگی کے ایک رخ کو نمایاں کرتے ہیں اور اس میں اصلی زندگی کے تمام خط و خال نظر نہیں آتے۔ اسی لیے ان کا مقصد ہنگامہ خیزی، وقتی اور ذہنی تفریح سے زیادہ نہیں ہے لیکن موجودہ زمانہ میں اسی قسم کے قصے مقبول اور محبوب ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہماری بے لطف اور بندھی ٹکی زندگی میں دلچسپی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اس صنعتی تہذیب اور میکانکی دور میں جبکہ انسان کو بھی کلوں کی طرح کام کرنا پڑتا ہے یہ قصے ذرا ہنگامہ، لطف اور شورِ انبساط کا باعث ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی رونق ایک "ہنگامہ" پر موقوف ہے اور انسان ہمیشہ سے سرور و شور اور جوش و خروش کا متلاشی اور تحقیق و دریافت کا جویا رہا ہے۔ سراغ رسانی کے قصے ہماری اس تشنگی کو رفع کرتے ہیں لیکن جس طرح شدید گرمی میں کہیں سے آکر بہت سا پانی پی لینا نقصان دہ ہے اسی طرح ان قصوں کا مطالعہ بھی اعتدال سے نہ بڑھنا چاہیئے۔ اگر یہ دماغی تفریح محض "تلخی کام و دہن" رفع کرنے کے لیے حاصل کی جائے تو باعث لطف و مسرت ہوگی۔

اردو میں سراغ رسانی کے قصے بہت کم لکھے گئے ہیں ہمارے یہاں قصہ کا شوق کافی پرانا ہے۔ ٹھگنیوں اور عیاروں کے قصوں، اقبال جرم کی پرانی کہانیوں اور علم الاساطیر کے افسانوں میں کہیں کہیں سراغ رسانی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ اردو میں داستانی مثنویاں شروع ہی سے لکھی گئی ہیں۔ ان میں بعض اپنے مافوق موضوع کے اعتبار سے ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ مافوقیت، پُراسرار اور سراغ رسانی کے قصوں کے لیے راہ ہموار کر دیتی ہے۔ انگلستان میں کالرج اور ہوریس والپول کی تحریروں نے جن میں مافوق عناصر زیادہ نمایاں تھے اولین تخم ریزی کی۔ وکٹوریہ کے عہد میں ولکی کالنس وغیرہ نے اس زمین کی آبیاری کی اور پو کے ذریعہ تخم کی نشوونما کے آثار شروع ہوئے اور اس درخت کی پہلی کونپل کانن ڈائل کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اردو کی مثنویوں میں مافوق عناصر کی کمی نہیں ہے۔ بدر منیر اور گلزار نسیم کی بنیاد ہی مافوق الفطرۃ ماحول پر قایم ہے۔ پرانے قصوں میں بھی مثلاً طلسم ہوشربا (طلسم نوخیز جمشیدی) اور بوستان خیال وغیرہ میں بھی خرق عادت، سحر و طلسم اور عیاری اور مخبری کے متعدد قصے مل جاتے ہیں لیکن ان چیزوں کو دراصل موجودہ زمانے کے جاسوسی افسانوں سے (جن کے درمیان کئی عبوری منزلیں حائل ہیں)، کوئی راست علاقہ نہیں ہے اور یہ شمع خود شاہان ملک کی مجلس برخاست ہو جانے کے بعد بھڑک کر خاموش ہو گئی۔ اب اس کو کوئی دوسری مشعل ہی روشن کر سکتی تھی۔

برطانوی حکومت کے مستقل قیام، پولیس کے باقاعدہ انتظام، اخباروں کی روزافزوں ترقی، انگریزی تعلیم کے فروغ اور مغربی اثر نے نئے خیالات پیدا کیے۔ وہ چراغ پھر نئے تیل سے روشن کیا گیا اور لوگ پو اور کانن ڈائل کی طرف بھی متوجہ ہوئے چنانچہ موخرالذکر کے بہت سے ترجمے ہوئے اسی سلسلہ میں پروفیسر فیروزالدین مراد اور محمد یعقوب کلام (مترجمین حکایات ہومز) پروفیسر نصیرالدین عثمانی (مترجم وادی خوف) اور محمد نصیر احمد (مترجم حلقۂ مسموم، اور خاندانی آسیب) قابل ذکر ہیں۔ ڈائل کے علاوہ اور جاسوسی مصنفین کے بھی ترجمے ہوئے۔ کچھ ہنگامہ خیز قصے سلطانہ ڈاکو، قتل بے گناہ، پراسرار انسان، ٹوپی کا سراغ وغیرہ نہایت سستے چھپے تاکہ عوام تک پہنچ سکیں۔ ان میں کچھ معمولی انگریزی قصوں کے خاکے ہیں جن کو مقامی لباس میں حذف و اضافہ کے بعد پیش کر دیا گیا ہے۔ بعض طبع زاد ہیں جن کا مقصد ذہنی تفریح سے زیادہ ہنگامہ خیزی

ہو۔ ہمارے یہاں اول تو تعلیم کی کمی اور طبیعتوں کی افسردگی کی وجہ سے جاسوسی لٹریچر بہت کم ہو اور جو ہو وہ بالکل گھٹیا اور ابتدائی صورت میں۔ اس میں نہ منطقی استدلال ہو اور نہ دماغی فرحت کا سامان۔ اس کی ساری عمارت اتفاقات اور حادثات پر قایم ہو۔ غور و فکر اور مشاہدہ اس میں نام کو نہیں۔ فنی خوبیاں بھی اس میں مفقود ہیں۔ ایک نقص جو عام طور پر ان معمولی قصوں میں ملتا ہو وہ یہ کہ مجرم کو جب تک پھانسی نہیں ہو جاتی کتاب ختم ہی نہیں ہوتی۔ بعض قصوں میں بے حد مبالغہ ہو۔ اور اشخاص افسانہ معمولی گوشت پوست کے انسان نہیں معلوم ہوتے۔ اور وہ انسانی کمزوریوں اور خوبیوں سے بالکل معرّیٰ نظر آتے ہیں۔ ان قصوں کا انداز بیان بھی اصول فن کے اعتبار سے ناقص ہو۔ مختصر یہ کہ ان میں بجز ہیجان انگیزی اور عوام نوازی کے اور کوئی وصف نہیں ہو۔

مولوی ظفر عمر اس بے آب و گیاہ سرزمین میں ایک نخلستان کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ سراغرسانی میں انھیں کافی درخور حاصل ہو کیونکہ اُن کی عمر ہی پولیس کے کام میں صرف ہوئی ہو لیکن ان کے یہاں بعض اوقات مجرم کو فنی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی جاتی ہو۔ ایک گتھی کو پیش کرنا اور پھر ایک ایک ڈورے کو سائنٹفک قابلیت سے سلجھانا، جو آگاتھا کرسٹی کا وصف ہو مولوی ظفر عمر کے یہاں بھی ہو لیکن معمولی حقیقت یہ ہو کہ ابھی اردو میں ایک شرلک ہومز ڈاکٹر تھارن ڈائک اور فادر براؤن کی بڑی کمی ہو۔

کیا عجب ہو کہ موجودہ جنگ کے محرکات ہمارے افسانہ نویسوں کے ذوق کو مہمیز کریں اور وہ مولوی ظفر عمر کی بنیادوں پر ایک بلند عمارت تعمیر کرکے اردو کے دامن کو دلچسپ قصوں سے بھر دیں۔

خواجہ احمد فاروقی بی۔ اے

اندرون مصر

"یورپ میں صرف ایک جگہ ہے انگلستان پر حملہ کر کے اسے بُری طرح نقصان پہنچایا جا سکتا ہے اور وہ مصر ہے"
(ڈاکٹر پال رور بیک جرمن ماہر جنگ)

جرمنوں کا اہر سوئز پر نرغہ ہوا اور مصر بھی یورپین اور امریکہ کے اخبارات کی سرخیوں میں نمایاں نظر آنے لگا۔ اس سے پہلے بیشتر امریکی اسے ایک رنگین سرزمین خیال کرتے تھے جہاں سیاحت کرنا راحت فزا ہے۔ ابوالہول اور اہرام مصری، ریتیلی زمین، اونٹ سیاح، بحیرہ روم کے مسافر جہاز اور فرعونوں کے مقبرے اس سے متعلق ہیں اور پھر ایسی سرزمین میں جہاں مطلع ہمیشہ صاف اور دھوپ تیز رہتی ہے۔ ریگستان کا رومان اور مشرقی اجنبیت مل جل کر عجیب فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

لیکن آج کل کا مصر عجیب متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ سیاح اب بھی گھومتے پھرتے ہیں اور آثار قدیمہ کے ماہر جستجو کرتے ہیں مگر اس کی ایک اور حیثیت بلند تر ہے۔ یہ بہت اہم فوجی مرکز ہے اور یہیں سے روئی پھل اور غلہ دستیاب ہوتے ہیں یہ بحیرۂ روم کا دروازہ ہے اور یہاں سے مشرق وسطیٰ اور ہندوستان کے راستے کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ اگر انگریز مصر سے باہر نکال دیے جائیں تو جرمنوں کی طاقت بحر شالی سے لے کر ہمالیہ تک ناقابل شکست ہو جائے گی نیز دونوں ڈکٹیٹروں کو تیل کا اس قدر کافی ذخیرہ مل جائے گا کہ وہ دس کیا بیس سال تک جنگ جاری رکھ سکیں گے۔

تمام عملی مقاصد کے لیے مصر سے مراد نیل کی وادی لی جاتی ہے اس کا رقبہ ۳۸۳۵۰۰۰ مربع میل ہے۔ جس میں ۳۷۲۰۰۰ مربع میل ریگستان ہے۔ دریائے نیل باقی بارہ سو میل کے باشندوں کے لئے خون زندگی کا کام کرتا ہے۔

نیل میں پشتوں کا بہت وسیع سلسلہ ہے اور انھیں سے اس پر قابو رکھا جاتا ہے۔ ۸۵۰۰۰۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین مستطیل کھیتوں میں منقسم ہے جن کے اردگرد نہریں ہیں۔ یہ دریا سے سیراب ہوتے ہیں ان جزیروں میں اگست

میں (جو دریا کی طغیانی کا زمانہ ہے) چالیس دن کے لیے تین فیٹ اونچا پانی چھوڑا جاتا ہے۔ اس کے بعد پانی نکال دیتے ہیں اور زمین پر جو بے حد زرخیز ہے بیج بو دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح گنّے، روئی، غلہ، پھل اور ترکاریوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ بیشتر دو فصلیں اور اکثر تین فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔

نیل مصری تجارت کی بھی جان ہے اس کے ذریعہ سے ملک کی بیشتر پیداوار ساحل سمندر پر برآمد یا ملکی ضروریات کے لیے پہنچائی جاتی ہے۔ وسیع سپاٹ پیندے والی کشتیوں میں سامان لے جایا جاتا ہے۔ یہ کشتیاں پانی کے ساتھ بہہ کر نیچے پہنچتی ہیں اور پھر کسان انہیں رسیوں سے باندھ کر اوپر کھینچ لاتے ہیں۔ بہت سی دخانی کشتیاں بھی نیل میں چلتی ہیں مگر آدمیوں اور بادبانوں سے کشتی رانی ارزاں ہے۔

جہاں مشرق و مغرب ملتے ہیں | نیل کا ڈیلٹا مشرق کا آستانہ اور مغرب کی منزل رہا ہے۔ یہاں مشرق اور مغرب قدیم اور جدید گھل مل جاتے ہیں اور نسل زبان، آداب اور روایات کے اس معجون مرکب میں جو دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتا ان کا امتیاز رفتہ رفتہ فراموش ہو جاتا ہے۔

مصر میں دو تمدن نشوونما پاتے ہیں۔ گھوڑا اور خچر گاڑی، بھاپ سے چلنے والے اور پیٹرول انجنوں کے باوجود باقی ہیں۔ لوہے اور کنکریٹ نے کچے گھروں اور لکڑی کے یک منزلہ مکانوں کی جگہ لے لی ہے۔ مگر وہ بالکل معدوم نہیں ہوئے۔ مصریوں کا اعلیٰ طبقہ بانڈ اسٹریٹ لندن کے کپڑوں میں ملبوس گھومتا ہے۔ ادنیٰ لوگ اب بھی سوتی گلابیہ جو بورے کی طرح سلی ہوتی ہے پہنے ہوئے ننگے پیر شہر یا کھیتوں میں پھرتے رہتے ہیں۔

دارالسلطنت قاہرہ میں ہزار سالہ قدیم جامعہ آزہر ہے جو ساری اسلامی دنیا کا علمی مرکز ہے۔ اسکندریہ میں ...... مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اس کی بنیاد دو ہزار سال ہوئے سکندر اعظم نے ڈالی تھی اور اس وقت سے یہ دنیا کا سرسبز شہر ہے قاہرہ اور اسکندریہ میں وسیع اور عالیشان موسم اختیاری AIR CONDITIONED دفاتر بنے ہوئے ہیں۔ جن کے درمیان جدید طرز کی سڑکوں پر لنکن، رولس رائس اور کیڈیلاک موٹریں فٹن اور خچر گاڑیوں کے پہلو بہ پہلو چلتی ہیں۔ کناروں کی سڑکوں پر خاکی وردی پوش انگریز فوجی، افسر، آسٹریلیا کے سپاہی اور یونانی تاجر اور منکسر شامی سوداگر بیمار اور کوڑھی فقیروں سے کندھے رگڑتے ہیں جو گندے چیتھڑوں میں نیم برہنہ گھوما کرتے ہیں۔

سنیچر یا اتوار کی شام کو فیشن پرست ہیلی پولس گھوڑ دوڑ کا میدان ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگ سے پہلے ایپسم ڈاونس یا لانگ چیمپس تھے۔ بابیلیکا کا بازار الف لیلہ کا زندہ مرقع ہے۔ موٹے تازے پسینے میں شرابور مصری تاجر سفید گرگندے گالا بیہ اور لال شکستہ ترابوشیے مصر کے قومی لباس میں اپنی چھوٹی چھوٹی دکانوں کے آگے تختوں پر بیٹھے چلاتے رہتے ہیں یا آس پاس کی گلیوں میں زور شور سے کوئی سودا چکاتے ہیں۔ قاہرہ کے اس حصے میں جہاں مشہور شیپرڈ ہوٹل ہے جس میں امن کے زمانہ میں یورپ کے مہذب اور شائستہ لوگ ٹھہرتے تھے نصف درجن کے قریب دیسی قہوہ خانے ہیں۔ وہاں غریب مصری سنگ مرمر کی میزوں کے کنارے گھنٹوں بیٹھے قہوہ یا زب زب پیتے اور خلا میں دیکھتے رہتے ہیں۔

مصر حاضر کی پیدائش | مصر سے یورپ کو روشناس کرانے کا ذمہ دار نپولین بوناپارٹ تھا۔ ۱۷۹۸ء میں اس نے چھ ہزار سپاہی مصر میں اتار کر میلوک سورماؤں کو شکست دی۔ اس نے اپنی بھاری توپ سے اتفاقیہ ابوالہول کی ناک کا ایک حصہ اُڑا دیا۔ اور بعد میں سائنس دانوں کی ایک جماعت کو ملک کی پیداوار اور وسیلوں کا اندازہ لگانے کے لیے چھوڑ گیا۔ جب اس کے بیڑے کو جنگ ٹرافلگار میں شکست ہوئی تو اسے مصر فتح کرنے کے خیال کو چھوڑ دینا پڑا اور پھر مصر عثمانیوں کے زیر نگیں ہو گیا۔ موقع شناس البانوی سردار محمد علی نے جس کی اولاد سے موجودہ شاہ فاروق ہیں مصر کو دوبارہ فتح کر لیا اور ترکی خلیفہ کے نام سے حکومت کرتا رہا۔

لیکن نپولین ساحل سمندر پر اپنے نقوش پا چھوڑ گیا تھا۔ مصری امرا کی زبان فرانسیسی ہو گئی جو اب بھی ہے جب خدیو اسمٰعیل کو اپنی فضول خرچیوں کے لیے روپیہ کی ضرورت پڑی تو فرانسیسی سرمایہ دار بلائے گئے اور جب فرڈیننڈ ڈی لس پاس نے نہر سوئز بنانے کی اجازت حاصل کی تو اس کے حصے بھی بیشتر فرانسیسی سرمایہ داروں نے خریدے۔

۱۸۷۵ء تک برطانیہ اس تصویر خانہ میں نہیں آیا۔ اس زمانہ میں ڈسرائیلی نے خدیو اسمٰعیل کے ہمیشہ دیوالیہ رہنے سے فائدہ اٹھایا اور نہر کے ۰۰۰,۰۰۰,۲۰ ڈالر کے حصے خرید لیے اور اس کے بعد متواتر قرض دیتا رہا بالآخر برطانیہ اور فرانس اس پر مجبور ہوئے کہ وہ مصر کے مالیات پر دوعملی قابو رکھیں۔ خدیو کو مجبور

کیا گیا کہ وہ اپنے سے زیادہ سمجھدار بھانجے توفیق کے حق میں مستعفی ہو جائے۔ ٹیکس کے طریقے کی اصلاح ہوئی قومی قرضہ کم کیا گیا۔ برطانوی اور فرانسیسی افسروں کو مصری نظام میں عمدہ جگہیں دی گئیں اور مغربی طور طریقے رائج کیے گئے۔

ان اصلاحوں کے کچھ ہی عرصہ بعد ایک جانباز مصری افسر عربی پاشا نے مسلح بغاوت کی ۱۸۸۲ء میں عربی پاشا کو شکست ہوئی اور برطانیہ نے مصر پر تسلط جمانے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۸۸۳ء میں سخت پیچیدگیوں کا سامنا تھا۔ فرانس مصر میں پھر سے دلچسپی لے رہا تھا۔ اور کرنل مرشید سوڈان میں فشوڈا پر کلک لے کر وار دہوا۔ اس کے علاوہ ایک اور انتہا پسند شخصیت مہدی نے جو خود کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان سے بتلاتے تھے بڑی جرأت سے آزادی پھیلانے کی کوشش کی مگر ان کو جنگ عمدرمان میں افسوس ہے کہ شکست ہوئی۔ یہ جنگ ۲۱ لانسرس رجمنٹ کی وجہ سے مشہور ہے۔ جس میں لفٹیننٹ ونسٹن چرچل نے حصہ لیا تھا۔ یہ لارڈ کرومر کا زمانہ عروج تھا۔ جب جنگ چھڑ گئی تو برطانیہ نے مصر کے ماتحت حکومت زیر حمایت ہونے کا اعلان کر دیا۔

صلح نامہ میں پریسیڈنٹ ولسن نے قومی خود مختاری کا اصول مدنظر رکھا اس نے مصر میں سخت ہنگامہ بپا کر دیا۔ ایک قومی تحریک پیدا ہوئی جس کا نعرہ "مصر مصریوں کے لیے" تھا۔ اس نے بلوے اور طلباء کے مظاہرے کرائے اور دہشت انگیز تحریکوں میں بھی حصہ لیا۔ آخر میں برطانوی سردار (کمانڈر انچیف) سرلی سٹیک کو سعد زاغلول پاشا کے رفقاء نے قتل کر دیا۔ تب برطانیہ نے مدافعتی تدبیریں اختیار کیں۔ دبابے اسکندریہ کی سڑکوں پر گھومتے رہے اور تھوڑی مار دھاڑ بھی ہوئی اور نظام از سر نو قائم ہو گیا۔ زاغلول پاشا اور بیس اور نمایاں مصری لیڈر جلاوطن کر دیے گئے۔

آخر ۱۹۲۲ء میں برطانیہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کہ قوم پرستوں کے مطالبات حق بجانب تھے چند مستثنیات کے علاوہ مصر کے آزاد اور خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا گیا اور شاہ فواد اول اس کے پہلے حکمراں ہوئے۔

اس وقت تک برطانیہ نے تجارتی اور مالی اعتبار سے مصر میں پوری طور سے قدم جما لیے تھے۔

اس نے .... ڈالر ملک میں قومی قرض، نیشنل بنک مصر، کمپنیوں کانوں، روئی کے کارخانوں اور سیاسی ایجنسیوں میں پھیلا رکھے تھے ۱۹۲۲ء کے صلح نامہ میں بہت سے مستثنیات تھے جن کی رو سے انگلستان کا مصر کی مالیات پر قابو باقی رہتا تھا۔ اسی سے اس کا سرمایہ محفوظ تھا اور غیر ملکی ٹیکس اور مصری قانون کی زد سے باہر تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کا یہ حق بھی مسلم تھا کہ وہ سرزمین مصر پر تھوڑی سی مسلح فوج بھی رکھے۔

۱۹۳۰ء کے درمیانی مہینوں میں برطانیہ کو ڈکٹیٹروں کے عروج اور خاص طور سے اٹلی کی بحیرۂ روم میں روز افزوں طاقت کو دیکھ کر تشویش پیدا ہوئی اور اس وقت پھر مصر میں یہ تحریک ہوئی کہ غیر ملکیوں کا اقتدار بالکل ہٹا دیا جائے۔ خاص قومی انجمنوں کے ساتھ دو فاشستی خیالات رکھنے والی جماعتیں بھی پیدا ہوئیں۔ نوجوان مصری پارٹی یا سبز قمیص والے جن کی مالی امداد اطالوی حکومت کرتی تھی۔ اور نیلی قمیص والے ہنگامی سپاہی جو جرمن طوفانی سپاہیوں کے نمونے پر تھے جنھیں جنگ عظیم میں خاص اور اہم خدمات کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس کے لیڈر اولوالعزم مدبر نحاس پاشا تھے۔ ڈکٹیٹروں کے یہ اثرات بہت جلد زائل کر دیئے گئے مگر مصری وطن پرستوں نے برطانیہ کے خلاف احتجاج جاری رکھا۔

۱۹۳۶ء میں برطانیہ نے مصر کی آزادی دوبارہ تسلیم کی، اور دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد اور امداد کے معاہدہ پر دستخط ہو گئے۔ اگلے سال ۱۹۲۲ء کے مستثنیات کو بھی رد کر دیا گیا اور مصر جمعیۃ الاقوام میں بھی داخل کر لیا گیا۔ اس کے معاوضہ میں برطانیہ کو مصر نے اس بات کا حق دیدیا کہ وہ نہر سوئز کے علاقے میں دس ہزار فوج اور چار سو طیارے اور ہوا باز رکھے تاکہ ان سے رود بار کی حفاظت کی جا سکے۔

۱۹۳۶ء کے معاہدے کے مطابق مصر نے اٹلی اور جرمنی سے سیاسی رشتے منقطع کر لیے ہیں۔ جرمن اور اطالیوں کا مال جس کا اندازہ ....۵ ڈالر کیا جاتا ہے حکومت نے ضبط کر لیا ہے اس سلسلے میں یہ ذکر دلچسپ ہوگا کہ مصر کا سالانہ بجٹ ....۲۰۰ ڈالر سے زیادہ نہیں بڑھتا۔ اس کے علاوہ ۷۰ ہزار جرمن اور اطالوی جو مصر میں رہتے تھے اور جن کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ اپنی اپنی حکومتوں کی امداد کرتے ہیں ان کو نظر بند کر دیا گیا۔ گزشتہ جون سے مصر میں فوجی قانون نافذ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاقہ جنگ ہونے کا اعلان کر دیا گیا ہے اسکندریہ اور قاہرہ کی بیس فیصدی آبادی سلامتی کی جگہوں میں لے جائی

گئی اور فضائی حملوں سے بچنے کی تدابیر کی گئی ہیں۔ لیکن اس امر کے باوجود کہ مصر افریقہ میں جرمن اور اطالوی فوجوں کی منزل مقصود ہے مصری حکومت نے اپنی غیر مداخلتی پالیسی برقرار رکھی ہے۔

اس حکمت عملی کے وجوہات کچھ تو فوجی اور بیشتر سیاسی ہیں۔ اہم جنگی مسئلہ یہ ہے کہ مصر ایسا مسلح نہیں کہ بزور ہوائی حملوں کا مقابلہ کر سکے۔ اگر قدیم مصریوں پر فضائی حملہ ہوا تو ان میں دہشت پھیل جائے گی۔ اور جانوں کا بھی بہت نقصان ہوگا کیونکہ وہ نہ تو ذہنی اور مادّی طور پر اس طریقۂ جنگ کا مقابلہ کر سکتے ہیں سارے قاہرہ میں جہاں ......۳۰ لاکھ کی آبادی ہے صرف تیس چالیس تہہ خانے ہیں اور وہ بھی محض گڑھے کھود کر ان پر لکڑی کے تختے ڈال دیے گئے ہیں اور اوپر سے ریت بچھا دی گئی ہے۔ اس میں صرف کھڑے رہنے کی جگہ ہے۔ ہوا اور روشنی کا کوئی انتظام نہیں اور فضا اس قدر گندی ہے کہ اب تک تہہ خانوں میں اتنے حادثے ہوئے ہیں جتنے باہر نہیں ہوئے۔

جماعتیں اور سیاسیات | جنگ ہی کے مسئلہ پر مصری جماعتوں اور سیاست دانوں میں اختلاف ہے۔ عدم مداخلت پسندوں کے لیڈر شاہ فاروق ہیں۔ گو شاہ فاروق محض برائے نام حکمراں ہیں مگر درحقیقت وہ بہت سے اختیارات عمل میں لاتے ہیں۔ شاہ موصوف اپنے باورچی، موٹر ڈرائیوروں اور موٹر سائیکل سواروں محافظوں سے لے کر محل کے خاص انجینیر دا کر ٹا ڈیرو کی تک بہت با اثر اطالوی جماعت سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان کے والد شاہ فاروق نے اٹلی میں تعلیم پائی اور اطالوی فوج میں تربیت حاصل کی ان کے مشیر خاص عرصے سے نرم رَو علی مہر پاشا شاہی جماعت کے لیڈر رہے ہیں۔ حال ہی میں برطانوی سفیر سر مائلس لیمپسن نے ان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اٹلی اور جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیں اور اسی مسئلہ پر انھوں نے گزشتہ جون میں استعفیٰ دے دیا۔

مصر میں بہت سے سیاست داں بھی ہیں جو جرمنوں کے تو خلاف ہیں مگر برطانیہ کے ساتھ بھی نہیں ہیں۔ سابق وزیر اعظم صابری پاشا بھی ان ہی میں سے تھے۔ پارلیمنٹ کے موجودہ اجلاس میں وہ افتتاحی تقریر کرتے ہوئے انتقال کر گئے۔ موجودہ وزیر اعظم حسین سری پاشا بھی اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔

مصر کی موجودہ سیاست میں محال مبہم یہ ہو کہ سعدی یا قومی جماعت جرمنوں اور اطالویوں کے خلاف اعلان جنگ کے لیئے چلا رہی ہو اور یہی جمعیۃ برطانیہ کے تحت خلاف رہی ہو۔ سعدی کہتے ہیں کہ مصر کا آزاد قوم کی حیثیت سے وقار اور اس کا قومی مفاد اس بات کی ضرورت پیش کرتے ہیں کہ جلد از جلد مداخلت کی جائے۔

مصر میں گو عام رائے دہندگی ہو مگر وہاں کے لوگ درحقیقت بالکل گونگے ہیں۔ اور حکومت کے لائحہ عمل بنانے میں کوئی دخل نہیں رکھتے۔ اہرام مصری بنانے والے غلاموں کی اولاد سے فلاحین ہیں اور یہ آبادی کا بیشتر حصہ یعنی ۱۶،۰۰۰،۰۰۰ ہیں۔ ان میں سے نوے فی صدی جاہل ہیں اور صرف دو فی صدی سیاسی احساس رکھتے ہیں۔

فلاحین کی حالت بھی بہت فرسودہ ہو۔ وہ مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں اپنے زمینداروں کا کام دس سنٹ روزانہ پر کرتے ہیں اور فطیری روٹیاں ہیم کھجور اور اکثر گوشت کھا کر زندگی کے دن کاٹتے ہیں۔ ان میں سے آدھے سے زیادہ آشوب چشم میں مبتلا رہتے ہیں۔

چونکہ وہ جاہل ہیں اس لیے ان کی خبروں کا وسیلہ صرف ریڈیو ہو۔ شام کو وہ گاؤں کے قہوہ خانے میں بیٹھے نارجیل پیتے ہوئے چیختے چلاتے چوسر کی بازی پر بازی کھیلتے رہتے ہیں۔

خبروں کے وقت عقیدت مندانہ خاموشی طاری ہوجاتی ہو اور تمام حرکات بند ہوجاتی ہیں بدقسمتی سے جو خبریں اس وقت سنی جاتی ہیں وہ اطالوی نشرگاہ باری سے نشر ہوتی ہیں۔ ایک عربی حقہ وہاں سے برطانیہ کے خلاف پرجوش پروپیگنڈا کرتا رہتا ہو اور برطانیہ کی زبردست شکستیں سنا کر جذبات کو اور بھڑکاتا ہو۔ ۳ جنوری ۱۹۳۸ء سے B.B.C. نے عربی میں خبریں اور تقریریں نشر کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہو اور نشرگاہ باری سے برسرپیکار ہو۔ مصر کی نشریات کو مقبول بنانے کے لیئے اس نے ایک مشہور مصری گویے کو نوکر رکھ لیا ہو جو خبروں کے درمیان رسیلے عشقیہ گانے سناتا ہو۔ یہ تدبیر بہت مجرب ثابت ہوئی ہو۔ مگر برطانیہ اور اٹلی کے متضاد دعوے فلاحین کو سرگرداں کر دیتے ہیں۔ درآں حالیکہ وہ جو کچھ ریڈیو پر سنتے ہیں اسی کو یقین کرنا بہتر سمجھتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ عرب اپنے بھائی کو ایسے نازک مسئلہ

پر کیسے دہوکا دے سکتا ہو۔ اور بآری اور لندن کے مقرر چاہے عقائد کیسے رکھتے ہوں لیکن سچے مسلمان تو ضرور ہیں۔

بحیثیت مجموعی مصر کے خیالات جرمنی اور اٹلی کے شدت سے خلاف ہیں اور یہ بھی طے شدہ امر ہو کہ وہ برطانیہ کے بھی مخالف ہیں۔ گر مصری اور خاص طور سے وہاں کے سمجھدار لوگ، ممبران پارلیمنٹ اور تعلیم یافتہ طبقہ جو آبادی کا دس فی صدی ہو سمجھتے ہیں کہ صرف برطانیہ کی فتح سے مستقبل امید افزا ہو سکتا ہو اور وہ خوب سمجھے ہوئے ہیں کہ جرمنوں نے جو ممالک فتح کیے ہیں ان پر کیا گزر رہی ہو۔ وہ حکومت کی اس پالیسی کو کہ عربوں میں یہ نیا ضانہ جذبہ قایم رکھا جائے کہ وہ برطانیہ کے ساتھ غیر جانبدار رہیں قدر کرتے ہیں۔ وہ برطانیہ کی عزت کرتے ہیں لیکن اتنی محبت نہیں کہ وہ ان کے ساتھ لڑکر جان دینے پر آمادہ ہو جائیں۔

بہرحال مصر کی مداخلت افریقہ میں حکومتوں کے توازن قوت میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں پیدا کرے گی۔ (ترجمہ)

شفقت اللہ کرمانی بی۔اے (آنرز)

آخر کیوں؟

شہر کے روشن بازاروں میں کھوئے کھوئے چلنے والے
گرما کی دوپہر میں جیسے دُھندلے سایے ڈھلنے والے

اونچے اونچے ایوانوں کے مرجھائے کملائے باسی
لب سے کھلے آنکھیں اندھیاری چہرے فق چالوں میں اُداسی

بڑی بڑی تنخواہوں والے سچے اطمینان سے عاری
اُن کے جسم امراض کے مخزن گو ملبوس ہیں بھاری بھاری

سیٹھ ہوں یا دفتر کے بابو فرزانے ہوں یا دیوانے
سب کی روحیں میلی جیکٹ چیتھڑے جیسے پھٹے پرانے

شہروں کی البیلی پریاں یا گاؤں کی دوشیزائیں
سب کے من میں کھوٹ بھرا ہے اوپر سے چاہے مسکائیں

لمبے ناموں والے لیڈر ملک کی ناؤ کھینے والے
سب کے سب ہیں زر کے بندے یہ آزادی دینے والے

کالج کی دیوار کے پیچھے ذبح ہوئی غیرت کی دیوی
رقصاں ہے تہذیب کے پردے میں عریاں وحشت کی دیوی

چمٹا ہوا ہے دھرتی سے آکاش سے باتیں کرنے والا
راہ کے تنکے چنتا ہے آزادی کا دم بھرنے والا

یہ سب کیا ہے؟ یہ سب کیوں ہے؟ اے بندوں کی سننے والے!
فرش پہ کیوں غمگیں و حزیں ہیں عرش سے تارے چننے والے؟

احمد ندیم قاسمی

غزل

یوں پرسش ملال وہ فرما کے رہ گئے
شکوے مری زبان تک آآ کے رہ گئے

پہلے تو عرض غم پہ وہ جھنجلا کے رہ گئے
پھر کچھ سمجھ کے سوچ کے شرما کے رہ گئے

وہ کون ہے جو تا سر منزل پہنچ سکا
دھندلے سے کچھ نشان نظر آ کے رہ گئے

بار عیادت اُٹھ نہ سکا اُف رے نازکی
تکلیف چند گام وہ فرما کے رہ گئے

اب دل سے کیا نکلتے ہیں تیر نگاہ ناز
جو دل میں آ کے رہ گئے بس آ کے رہ گئے

نغموں پہ میرے اور تو وہ کچھ نہ کہہ سکے
کچھ مسکرا کے پھول سے برسا کے رہ گئے

آئینہ چوم چوم رہے تھے وہ بار بار
دیکھا جو یک بیک مجھے گھبرا کے رہ گئے

ہر شکر انتقام محبت ہے اے جگر
شکوہ نہیں ہے اُن سے جو تڑپا کے رہ گئے

جگر مرادآبادی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

نقش اول:- از صالحہ عابد حسین. ملنے کا پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی. صفحات ۲۳۲، قیمت عہ سائز $\frac{20\times 30}{16}$ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی

یہ بیگم عابد حسین کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ دو ایک نئے بھی ہیں۔ ان قصوں میں زیادہ تر ہماری گھریلو زندگی کی چلتی پھرتی زندہ تصویریں ہیں۔ ہماری تہذیب ہماری معاشرت ہمارے معتقدات ہمارے رسوم و رواج اور ہمارے توہمات غرضکہ ہر چیز اس میں موجود ہے۔ مصنفہ نے عورتوں کی سیرت اور ان کے رہن سہن کے طریقوں کو بہت غور سے دیکھا ہے اور ان کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اصلاحی غلش بھی زیادہ تر پس منظر میں رہی ہے۔ مصنفہ کے قصے ہلکی پھلکی تحریریں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دراصل ان کے بیان کی سادگی اور شستہ پن ہے

ہماری رائے میں صالحہ صاحبہ اگر ناول نگاری اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ ان کے قصوں سے تشنگی پوری نہیں ہوتی اور ذہن گھریلو زندگی کو تمام تر دیکھنے کا متلاشی رہ جاتا ہے۔ یوں بھی لذیذ حکایت دراز ہونی چاہیے۔ ذرا افسانہ نویسی کے گروں کے برتنے کی بھی ضرورت ہے تا کہ افسانویت ذرا اور اثر انگیز ہو جائے۔

گل و مل:- از سید علی عباس صاحب عباس. ناشر انجمن ترقی ادب دہلی. سائز $\frac{20\times 30}{16}$ صفحات کل ۲۸۰ قیمت عہ، کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ عباس صاحب سہارنپوری کے اردو و فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اردو کلام ۱۶۸ صفحات پر مشتمل ہے اور فارسی کلام ۵۰ صفحات پر۔ شروع میں ہدایت محسنی صاحب ایم۔اے کا ۶۲ صفحات کا دیباچہ ہے جس میں عباس صاحب کی زندگی اور کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے

حضرت عباس سہارنپور کے ایک کہنہ مشق اردو و فارسی کے شاعر ہیں۔ کلام میں پاکیزگی خیال اور بہ

مذاق اور اعلیٰ ادبیت ہر جگہ نمایاں ہے اور یہ تمام فیض غالب مرحوم کا ہے۔ عباس صاحب غالب کے پرستاروں میں سے ہیں۔ تمام کلام پر رنگ ان ہی کا چڑھا ہوا ہے حالانکہ تخیل کی وہ نزاکت اور جدت طرازی نہیں پیدا ہو سکی ہے پھر بھی خیالات کی شائستگی اور کلام کی پختگی میں تمام داخلی رنگ موجود ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

تسخیر کائنات بود التفاتِ دوست — عالم بکام ماست کہ او شد بکام ما

جن کی دنیا معترف تھی وہ مری خودداریاں — خوب کام آئیں کہ نذر پائے درباں ہو گئیں

عقل کی خامی کا اے دل گر مداوا کیجیے — پختہ کارانِ جنوں سے ربط پیدا کیجیے

کیجیے تعمیر ہر ذرہ پہ سو عرش خیال — دیدۂ دل وقف تعلیم تماشا کیجیے

ترتیب کلام میں ردیف کے بجائے اگر تاریخ کا خیال مدنظر رکھا جاتا تو بہتر تھا۔

جامِ طہور:- از خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی۔ ناشر تاج کمپنی لمیٹڈ۔ ریلوے روڈ لاہور۔ صفحات ۱۷۱ سائز ۲۲×۱۸/۱۶۔ قیمت درج نہیں۔ کاغذ معمولی کتابت و طباعت عمدہ۔

یہ مجموعہ اثر صہبائی کی رباعیوں اور قطعات کا ہے۔ شروع ۲۰ صفحوں میں اپنی شاعری کے متعلق مختلف اشارات دیے گئے ہیں جس سے ان کی شاعری کا پس منظر سامنے آجاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح وہ اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں خیام، شریک حیات کی موت، گاندھی، ٹالسٹائی، اقبال اور ٹیگور سے تاثر پذیر ہوتے رہے۔ بہتر یہ ہوتا اگر رباعیات کی ترتیب بھی ان ہی ادوار کے تحت کی جاتی اثر صاحب کی شاعری ایک پاک خیال، صوفی منش اور حق پسند انسان کی شاعری ہے۔ اہرمن ویزداں خیر و شر، تزکیۂ نفس، موت و حیات، فنا و بقا، عدم اور وجود، جبر و قدر وغیرہ فلسفیانہ مضامین اثر صاحب کے کلام کے خاص جز ہیں۔ وہ ان مابعد الطبیعیاتی بلندیوں سے بہت کم نیچے اترتے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ امر بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ ان فلسفیانہ مضامین کو وہ ایسی خوبی اور دلکشی کے ساتھ شعریت میں سموتے ہیں کہ قاری کا ذہن بغیر کسی قسم کا بار محسوس کیے ایک خاص لذت حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ لطیف، پاک اور منزہ ہوتی ہے چند مختلف حالتوں کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

حوران بہشت کی تمنا بے سود — ہنگام شباب زہد و تقوی سب بے سود

لبریز نشاط ہی چمنستان بہار ۔ یا دغم دوش وفکر فردا بے سود
نیرنگ طلسم زندگی کو پایا ۔ آلودۂ غم ہر اک خوشی کو پایا
تسکین ہو تم ذکر یزداں میں اثر ۔ سرچشمۂ بے خودی اسی کو پایا
گل چوم کے واہ واہ کی ہو میں نے ۔ کانٹا چبھنے پر آہ کی ہو میں نے
رویا ہنس ہنس کے اور ہنسا رو رو کر ۔ یوں چشم شب سیاہ کی ہو میں نے
ہنگامۂ روح وجاں ہو حق کی مستی ۔ سیل یم بیکراں ہو حق کی مستی
گر تلخ تریں ہو حق کی مرای ہمدم ۔ خوش باش کہ جاوداں ہو حق کی مستی
اے حاصل دہر! تجھ کو حاصل کی تلاش! ۔ اے بر لب ساحل! تجھے ساحل کی تلاش!
تو خضر بھی، منزل بھی، رہ منزل بھی ۔ رہبر کی تلاش کر نہ منزل کی تلاش!
ہنگامۂ فصل گل ہو ہنگامۂ رنگ ۔ ہو بر بط رنگ سے رواں نغمۂ رنگ
مے خانۂ رنگ ہو گلستان جہاں ۔ گل ساغر رنگ ہو صبا بادۂ رنگ

رباعی سے اثر صاحب کو فطری مناسبت معلوم ہوتی ہو۔ خیام کے ترجمہ کا اسی کے رنگ میں ڈوب کر اگر کسی اُردو شاعر کو حق پہنچتا ہو تو اثر صاحب کو۔

خدا کی باتیں:۔ مرتبہ سحبان الہند حافظ احمد سعید صاحب، ناشر دینی بکڈپو بیت السعید کوچہ ناہرخاں دہلی سائز ۲۲×۱۸، صفحات ۲۹۸ قیمت عمہ کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

اس کا اصل نام تو الہدیۃ السنیہ ہو لیکن عوام کی رعایت سے 'خدا کی باتیں' رکھا گیا ہو کتاب کے مؤلف یا مترجم یا ناقل حضرت سحبان الہند حافظ احمد سعید صاحب ہیں جن کی شخصیت اس کتاب کے ذریعہ تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ کی ضروری گزارش پڑھنے سے معلوم ہوا کہ آپ کو حسن اتفاق سے ایک کتاب حظیرۃ القدس مل گئی اور پھر اس کا اردو ترجمہ بھی ہاتھ آگیا۔ کتاب حظیرہ کس کی ہو؟ گزارش کے (الف) پر بتایا ہو کہ ابو النصر میر علی حسن خاں صاحب کی تالیف ہو۔

سحبان عرب کے متعلق یہ مشہور ہو کہ جو بات ایک بار بول جاتا دوسری بار ان لفظوں کو نہ دہراتا

حضرت سبحان اللہ جو خیر سے حافظ" بھی ہیں۔ گزارش (ب ۲) میں علی حسن خاں کو حسن علی خان بول گئے ہیں اور تالیف کو تصنیف فرما رہے ہیں۔ افادہ خاص و عام کی غرض سے آپ کو یہ بتانے کی تو ضرورت نہ تھی کہ یہ حسن علی یا علی حسن کون بزرگ تھے ورنہ اگر آپ نواب حسام الدولہ صفی الملک ابو النصر میر علی حسن خاں صاحب کو نہ جانتے ہوتے تو بھی کتاب حظیرۃ القدس کے ٹائیٹل کو دیکھ کر آپ پہچان سکتے تھے کہ یہ نواب سید صدیق حسن مرحوم کے خلف الصدق تھے۔ اگرچہ اس کتاب کے متعلق آپ معترف ہیں کہ محنت سے مرتب کی گئی اور احادیث صحیحہ پر مشتمل ہے لیکن آپ نے ساری کتاب میں کہیں اپنے اس ماخذ کا حوالہ نہیں دیا اور نہ اس کے ترجمہ کا۔ اور نہ یہ بتایا کہ آپ نے اور کس قدر اور کون کون صحیح احادیث کا اس کتاب پر اضافہ فرمایا۔

خدا کی باتیں صرف "حظیرۃ القدس ہی سے نہیں لی گئیں بلکہ آپ نے لکھا ہے کہ (علامہ مدنی کی کتاب الاتحاف السنیہ اور عبدالرؤف مناوی کی اس کی تلخیص زیر مطالعہ رہی) حیرت ہے کہ ان دونوں کتابوں میں سے کسی کتاب کا حوالہ کسی حدیث کے ترجمہ کے بعد نہیں دیا گیا کہ معلوم ہو جاتا کہ حظیرہ پر علامہ مدنی کا یہ اضافہ ہے۔ یہ ہو کا ہو سکتا تھا کہ کہیں اس سے یہ مطلب تو نہیں کہ اصل کتب حدیث سے احادیث جمع کی گئیں ہیں لیکن مولانا نے خود تصریح کی ہے کہ اعظم گڈھ جیل میں بحالت قید محض رہتے ہوئے یہ کام ختم کر دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ مولانا نے جمع احادیث کی زحمت گوارا نہ فرمائی اور تلخیص و ترجمہ حظیرہ سے یہ کتاب مرتب فرما دی کاش ہمیں یہ موقع ملتا کہ ابو الشیخ ابن عدی ابن النجار ابن شاہین محمد ابن نصر ابو علی کی کتابوں کا پتا آپ سے پوچھ سکتے احادیث قدسیہ کی تحقیق کے متعلق ہم آئندہ فرصت میں اظہار خیال کریں گے اس وقت زیر نظر کتاب "خدا کی باتیں" کے متعلق یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ (۱) جن متخرجین حدیث (ابو الشیخ و دیلمی وغیرہ) کی احادیث لکھی گئیں ان کی تصحیح کیے بغیر ترجمہ مناسب نہ تھا۔ جھوٹی بات عربی زبان میں ہو تو بھی جھوٹی ہے اور ترجمہ ہو کر اردو میں آ گئی تو بھی جھوٹی رہے گی۔ (۲) ان احادیث کے ترجمہ میں احتیاط و تشریح کی ضرورت تھی جنھیں سلف نے متشابہات قرار دیا ہے مثلاً احادیث قدم و ساق، کیا جنت کی کنجی اور دوزخ کے کھٹکے کے مصنف ہوتے ہوئے آپ پسند فرمائیں گے کہ عوام یہ سمجھیں (جن کو سمجھانے کے لیے آپ نے یہ کتاب لکھی ہے) کہ جس اللہ کی جنت کی ترغیب دی جاتی ہے اور جس کی دوزخ سے ڈرایا جاتا ہے وہ خود دوزخ میں قدم رنجہ کرے گا۔

اور قیامت میں واقعی اپنی پنڈلی کھولے گا۔ آپ کی یہ تاویل کہ پانوں رکھنے سے مطلب یہ ہے کہ دبا دیا جائیگا کہ سمٹ کر دوزخ چھوٹی ہو جائے اول تو کسی صحیح حدیث سے ماخوذ نہیں۔ پھر اللہ کے پانو کو دوزخ سے نجات کہاں ملی۔ اسی طرح آپ کی یہ تاویل کہ پنڈلی کھولے جانے سے مراد درمیانی درجہ کی تجلی ہے کسی صحیح حدیث سے ماخوذ نہیں۔ کشف ساق کی تشریح آپ 'مفردات راغب' میں دیکھ سکتے ہیں (۳) غیر مستند کتب حدیث سے روائتیں نہ لینا چاہیے تھیں مثلاً صفحہ ۱۸۱ پر پھر صفحہ ۱۸۵ پر ابوشیخ سے دو قسم کے مرغوں کا حال لکھنا عبث تھا اس حدیث کی سند تو دیکھیئے۔ اسی طرح عقل کے متعلق حدیث کا حال ہے۔ کہ ابن جوزی (دیکھیئے العلل المتناہیہ) اور دوسرے علما کی تصریحات کے مطابق اس باب میں کوئی حدیث صحیح نہیں۔ اسی طرح صفحہ ۲۰۱ پر جو حدیث ہے اس کی صحت کا پتا نہیں (۴) بعض طویل احادیث کو مختصر کیا ہے لیکن بہتر یہ تھا کہ انھیں نہ لکھا جاتا کیونکہ طویل احادیث کے متعلق علمانے بہت کم کے حافظہ پر بھروسہ کرنے کا موقع پایا ہے۔ بہرحال اس کتاب کے چھپ جانے سے یہ فائدہ تو ہوا کہ حضرت نواب صفی الملک حسام الدولہ کی کوشش دوبارہ اردو میں آگئی اور ساتھ ہی ساتھ تلخیص الاتحاف کا اردو میں ترجمہ ہو گیا۔ ناقدین کے لیے فکر و نظر کا موقع ہے۔ اللہ اس کتاب کے معاونین کو جزائے خیر دے۔

(ی۔م۔ر)

بیٹے:۔ مترجمہ احسان علی شاہ بی۔ اے (آنرز) ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لاہور۔ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$، صفحات ۴۹۸ قیمت ۴؍ کاغذ، کتابت اور طباعت عمدہ۔

یہ ناول دراصل امریکہ کی مشہور ناول نویس پرل ایس بک کی مشہور ناول "سنز" کا ترجمہ ہے۔ دراصل موصوفہ نے چین کی زندگی کے متعلق (جس کا انھوں نے اپنے دوران قیام میں بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا) ایک مشہور ناول لکھی تھی جس کا نام گُڈ ارتھ یا دھرتی ماتا ہے اس ناول پر موصوفہ کو نوبل پرائز بھی ملا تھا اور جس کا فلم بھی بن کر بہت مشہور ہو چکا ہے "بیٹے" دراصل دھرتی ماتا کے لڑکوں کی داستان حیات ہے۔ اس ناول میں چین کی مفلس قحط زدہ زندگی کی چلتی پھرتی تصویر کھینچی گئی ہے۔ ایسی پُر الم، بھیانک اور مظلوم ساتھ ہی سچی اور حقایق سے لبریز ہیں کہ بڑا تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ انسانیت کب تک اس روح فرسا غربت اور فلاکت میں پھنسی رہے گی کاش سرمایہ داری کی لعنتیں ختم ہوں تو یہ جنگیں، قحط اور گرسنگی کا خاتمہ ہو۔

. . . احسان صاحب کا ترجمہ بہت سلیس اور با محاورہ اردو میں ہے اور وہ وہاں کی زندگی کے خط و خال قایم رکھنے میں قطعی طور پر کامیاب ہو گئے ہیں۔ امید ہے کہ شائقین اس کتاب کے مطالعہ سے ضرور مستفید ہوں گے۔

نغمات نور :- از نور صاحب لدھیانوی۔ ناشر حکیم سید ہاشم علی شاہ جیلانی جعفریہ بک ایجنسی رجسٹرڈ نمبر ۲۲۲ قیصر باغ لاہور سائز ۱۷×۲۲/۸ صفحات ۲۴۴۔ قیمت مجلد ۱ غیر مجلد ۸ کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی۔

یہ نور صاحب لدھیانوی کی نظموں کا مجموعہ ہے زیادہ تر نظمیں مذہب اور اسلامیات پر ہیں۔ اقبال سے متاثر ہونے کی کوشش ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ آخر میں تہنیت نامے، الوداعی نظمیں تبلیغی سلام اور قطعات اور رباعیات وغیرہ بھی ہیں۔ اور سب سے آخر میں ۴ صفحات میں موصوف کے نثر کے نمونے ادب لطیف کے عنوان سے درج ہیں۔ نظم و نثر دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کی مشق پختہ ہو چکی ہے۔ الفاظ اور بیان پر قابو پیدا ہو چلا ہے۔ نظموں کے موضوع اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایسے رکھے ہیں جس سے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں متاثر ہو سکیں اور اپنی مذہبی باتوں اپنے مذہبی پیشواؤں کے ذکر سے مستفید ہو سکیں۔ بعض گیت بھی عوام کو بڑے متاثر کرنے والے ہیں۔

مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش (جلد سوم) از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۱۷۶ قیمت غیر مجلد عہ کاغذ کتابت و طباعت اچھی۔

ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا یہ تیسرا مقالہ ہے جو مسلمانوں کی سیاسی کش مکش کے متعلق لکھا گیا ہے۔ اس میں مقصد محض اس قومیت کے نظریہ سے مسلمانوں کو روکنا ہے جو ان میں مغربی تعلیم کے اثر سے پیدا ہو گیا ہے۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلام کے سیاسی و اجتماعی تصورات علمی اور عملی حیثیت سے کیا ہیں اور اس پر بھی زور دیا گیا ہے کہ بجائے قوم کی مشترک وفاداری کے خدا کی مشترک وفاداری سے مسلمان اپنے صحیح نصب العین تک پہنچ سکتا ہے۔ خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں:۔ اسلام کی دعوت اور مسلمانوں کا نصب العین مسلمانوں کے لیئے ایک ہی راہ عمل، اسلام کی راہ راست اور اس سے انحراف کی راہیں، اسلامی حکومت کس طرح قایم ہو سکتی ہے۔ جماعت اسلامی کی تشکیل وغیرہ

مغل لائن لمیٹڈ

زائرین کعبہ کے لئے مژدہ

مُغل لائن نے گذشتہ سال برطانوی اور ہندوستانی بیڑوں اور ہوائی جہازوں کی حفاظت میں زائرین حج کے لئے نہایت اطمینان بخش انتظام کیا تھا۔ نہایت فخر اور مسرت کے ساتھ مغل لائن اعلان کرتی ہے کہ اس نے حکومت سے مشورہ کے بعد امسال بھی حاجیوں کی زیارت کی تمام ممکن سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے۔

جنگ کی وجہ سے روانگی کی صحیح تاریخ نہیں دی جاسکتی لیکن حاجیوں کو چاہیئے کہ وہ مندرجہ ذیل تاریخوں تک بندرگاہوں پر ضرور پہنچ جائیں۔

وقت مقررہ کے علاوہ پانچ دن کا مزید انتظام رکھیں ممکن ہے کہ کسی وجہ سے دیر ہو جائے

بمبئی	پہلی روانگی	۱۰ نومبر ۱۹۴۱ء	دوسری روانگی	۱۷ نومبر ۱۹۴۱ء
کراچی	"	۱۱ نومبر ۱۹۴۱ء	"	۱۸ نومبر ۱۹۴۱ء
کلکتہ	صرف روانگی	۱۷ نومبر ۱۹۴۱ء		

کرایہ حسب ذیل ہوگا:۔

	بمبئی سے جدہ	کراچی سے جدہ	کلکتہ سے جدہ اور بمبئی کی واپسی
دوہرا دول واپسی مع طعام	۱۴۴ روپیے	۲۱۶ روپیہ	۲۹۰ روپیہ
ڈک (چھت) کی واپسی مع طعام	۲۰۳ روپیے	۱۹۶ "	۲۳۵ روپیہ ۸ آنے

مندرجہ بالا کرایہ کے علاوہ بندرگاہوں کے قلی وغیرہ کے اخراجات کے سلسلے میں ہر حاجی کو تین روپیے (۳ عہ) اور دینے ہوں گے۔

مزید تفصیل کے لئے ذیل کے پتہ پر خط وکتابت کیجئے

ٹرنر موریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ، ۱۶ بینک اسٹریٹ بمبئی

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمٹیڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلائیو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائینس نواب صاحب بھوپال　　عالیجناب ہز ہائینس آغا خاں صاحب

مجوزہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپے		۶۰۰۰۰۰۰
جاری شدہ سرمایہ .... پچیس لاکھ روپے		۲۵۰۰۰۰۰
ادا شدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچیس ہزار نو سو پانچ روپے		۱۰۲۵۹۰۵

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی، رسل و رسائل موٹر، ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدرآباد (دکن)

اور

احمد آباد

گذارشِ احوالِ واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اسشیاء استعمال کرتے ہیں ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں ان کے سامنے خاص چیز پیش کی ہے زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روزافزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے افواہ جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیاء کے متعلق بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیاء کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں۔ جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے تیل عطر سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس قسم کی آمیزش باعث مضر ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو (جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی گئی ہے) آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی۔ ہماری عطریات اور روغن انگریزی خوشبوؤں سے پاک ہیں۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر حنا بلڈنگ لکھنؤ

سائنس

انجمن ترقی اُردو (ہند) کا ماہانہ رسالہ

ستمبر ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ ہندوستان کے معدنی ذخیرے
۲۔ ہنسی حیاتیات کی روشنی میں
۳۔ ہماری آنکھیں
۴۔ جابر ابن حیان
۵۔ ہوائی حملہ اور زہریلی گیسیں

اکتوبر ۱۹۴۱ء کے چند مضامین

۱۔ بچّہ کی ذہنی اور اخلاقی تربیت
۲۔ نموئے بیضہ
۳۔ طاقت اور اس کا استعمال
۴۔ ریشم کی صنعت
۵۔ پٹرولیم کی کہانی
۶۔ ہوائی جنگ۔

ادبیات اردو میں ایک گرانقدر اضافہ

رسالہ سہیل گیا کا

خاص نمبر ۱۹۴۱ عیسوی

تقریباً ڈھائی سو صفحات پر اگست میں شائع ہو گیا

اس عدیم المثال خاص نمبر میں ملک کے مندرجہ ذیل مشاہیر اہل قلم کے بلند پایہ مقالے جدید معیاری افسانے اعلیٰ نفسیاتی ڈرامے۔ کیف آور نظمیں اور وجد آفریں غزلیں شریک ہیں۔

سید وصی احمد بلگرامی۔ عطاء اللہ پالوی۔ سید محمود مورخ بی اے۔ جمیل احمد کندھاپوری۔ پروفیسر طاہر رضوی حاجی نبی احمد بریلوی۔ حمید عظیم آبادی۔ سید رضا قاسم مختار۔ طفیل احمد سہارنپوری۔ وفا طباطبائی۔ قمر شیر گھاٹوی۔

پروفیسر اختر اورینوی۔ پروفیسر محمد محسن۔ ڈاکٹر محمد نصیر الدین۔ بلونت سنگھ۔ مفتی گوہر شادانی منائی۔ ش مظفر پوری۔ پروفیسر اختر قادری ایم اسلم۔ پیارے لال شاکر میرٹھی۔ شکیلہ اختر۔ عارف سنبھاروی جی۔ آر۔ قیس شیخپوروی۔ شیدا کیوروی۔

آرزو لکھنوی۔ سیماب اکبر آبادی۔ شفق رضوی۔ جمیل مظہری۔ اثر لکھنوی۔ نوح ناروی۔ فراق گورکھپوری۔ عبد اللطیف تپش۔ ثاقب کانپوری۔ مبارک عظیم آبادی۔ سریر کابری الطاف مشہدی اعجاز صدیقی اکبر آبادی۔ سلام مچھلی شہری۔ قیصر عثمانی۔ ادیب مالیگانوی ظفر زہیری۔ انقری موہانی۔ رضیہ رعنا۔ وغیرہ۔

خاص نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ لیکن اگر آپ اسے مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی مبلغ تین روپے سالانہ چندہ ارسال فرما کر اسی نمبر سے سہیل کے مستقل خریدار بن جائیں۔

"منیجر رسالہ سہیل گیا"

اخبار خالد کشمیر

اخبار خالد کشمیر میں واحد پرچہ ہے جو وسیع ترین اشاعت رکھتا ہے اس پرچہ کی سنجیدگی اور مقبولیت کی وجہ سے تمام اونچے حلقے اور اہل علم لوگ اس کے ناظرین کی فہرست میں شامل ہیں. ریاست کے تمام جج. منصف کلکٹر اور دیگر بڑے بڑے عہدے دار خالد کا مطالعہ پابندی سے کرتے ہیں. خالد کی گوناگوں خصوصیات کے باعث اس پرچے کو ریاست کے محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر صاحب نے ریاست کے تمام اسکولوں لائبریوں کے لئے منظور فرمایا ہے۔

ریاست جموں و کشمیر میں خالد تجارتی مال و اشیا کے لئے بہترین ذریعہ تشہیر ہے. ریاست میں تجارت کو فروغ دینے کے لئے خالد سے بہتر کوئی ذریعہ ممکن ہی نہیں. اجرت اشتہارات بہت کم اور واجبی ہے. اس لئے آپ سے التماس ہے کہ آپ اپنی فرموں اور دیگر تجارتی مال و اشیا کا اشتہار خالد سری نگر میں دے کر اپنی تجارت کو بڑھائیں۔

منیجر شعبہ اشتہار "خالد" سری نگر کشمیر

دنیا بھر میں اسلامی خدمات بجالانے والا ماہوار میگزین

ریویو آف ریلیجنز (انگریزی)

جو سنہ ۱۹۰۲ء سے باقاعدگی کے ساتھ جاری ہے اور ہر ماہ کی دس تاریخ کو شائع ہوتا ہے. اس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور جو غلطیاں اور غلط فہمیاں دیگر مذاہب نے اسلام کے متعلق پھیلائی ہیں. ان کو دور کرکے اس عالمگیر مذہب کو اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنا اور دیگر مذاہب پر تحقیقی تبصرہ اور موجودہ زمانے کے فلسفی اور مذہبی رجحانات پر نظر رکھنا ہے. چندہ سالانہ صرف للعہ. نمونہ طلب کرنے پر مفت بھیجا جائے گا۔

ملنے کا پتہ

دفتر ریویو آف ریلیجنز (انگریزی) قادیان، پنجاب

دور حاضرہ کی عظیم الشان کتاب

معارف القرآن

یعنی

حقائق قرآنی کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا)، جو اس اصول کے ماتحت مرتب کیا گیا ہے کہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ اور تکمیل شرفِ انسانیت کے لئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔

اس کی ترتیب

کے متعلق یوں سمجھئے کہ دین (یعنی انسانی فطرت کے لئے ضابطہ زندگی)، کے متعلق کوئی سوال آپ کے سامنے آئے اس کے متعلق قرآن کریم کی تمام (مکمل) تعلیم ایک مربوط مضمون کی صورت میں آپ کے سامنے ہو۔ یہ

مایۂ ناز کتاب

جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز

کے مدت العمر کے تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہے

جلد اوّل

چھپ کر تیار ہے۔ جو بڑی تقطیع کے پونے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کاغذ، کتابت، طباعت، جلد اعلیٰ درجہ کی۔ قیمت مجلد چھ روپے چار آنے۔ محصولڈاک پندرہ آنے۔ بلا جلد۔ پانچ روپے۔ محصولڈاک ۱۳

ملنے کا پتہ

۱۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ شمیم منزل شیدی پورہ۔ نئی دہلی

۲۔ ملک رشید الدین صاحب۔ سپرنٹنڈنٹ پنجاب کواپریٹو یونین۔ لاہور

۳۔ لورمال۔ نزد عدالت خفیفہ۔ لاہور۔

(لاہور سے کتاب دستی ملے گی)

اُردو زبان میں ایک نہایت ہی اہم، اور عظیم الشان علمی کام

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

یورپ کے نہایت ہی ممتاز، اور بلند پایہ مستشرقین (اورنیٹلسٹ علماء) کی ایک بہت بڑی جماعت نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نام سے اسلام کی نہایت ہی اہم اور پرُاز معلومات انسائیکلوپیڈیا چند جلدوں میں ترتیب دی تھی، جس میں قدیم و جدید معلومات مشرقی و مغربی تصنیفات سے جمع کئے گئے تھے اور مضامین کے آخر میں اس کے مآخذ بھی بیان کردئے گئے تھے۔

یہ انسائیکلوپیڈیا بیک وقت یورپ کی تین علمی زبانوں جرمن، فرنچ اور انگریزی میں لیڈن سے شائع ہوئی۔ مغربی فضلاء کے علاوہ مشرق کے بلند پایہ علماء نے بھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اور جامعیت و وسعت معلومات کے لحاظ سے بے حد اہم کتاب شمار کی گئی ہے۔

اس میں اسلامی علوم و فنون، اسلامی تمدن، اسلامی سیرت و تاریخ اور اسلامی آثار کا عظیم الشان ذخیرہ ہے۔

انہی خوبیوں کی وجہ سے مصر سے اس کا عربی ترجمہ فضلائے مصر کے ناقدانہ حواشی کے ساتھ ہر دو مہینے پر شائع ہو رہا ہے۔

اردو میں اس نمونے کی کوئی اہم کتاب نہیں تھی، جدید پریس پٹنہ سٹی نے اس کا اردو ترجمہ مزید حواشی و تشریحات کے ساتھ ہر دو مہینے پر سو صفحات کی ضخامت میں ۲۰×۲۶/۸ سائز پر شائع کرنا شروع کردیا ہے۔

اس کی بلند علمی منزلت کا تقاضا ہے کہ اصحاب علم اس کی توسیع اشاعت میں پورا حصہ لیں۔

اس علمی سلسلے سے کسی لائبریری اور علمی و ادبی ادارے کو خالی نہ رہنا چاہیئے۔ قیمت فی نمبر ۸ر اور سالانہ قیمت ۳؎

منیجر جدید پریس بیگم پور پٹنہ سٹی

اردو ادب میں ایک نیا اضافہ

نورس

مسعود اختر جمال کی زندگی بخش نظموں کا مجموعہ

آنے والے انقلاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ
زندگی کی نئی قدروں کو پہچانیں ۔اور اس زمانے میں جب کہ دنیا
جنگ کی ہولناکیوں سے زیر و زبر ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ
مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں آپ کی مدد کرے گا ۔

قیمت فی جلد

باراول	قسم اول مجلد تین روپے (سے)
ایک ہزار (۱۰۰۰)	” دوم غیر ” ایک روپیہ چار آنے (عہ)

مکتبہ

ادبستان۔ پانڈے حویلی۔ بنارس

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب

"وحی الٰہی"

"وحی الٰہی" ہماری زبان میں پہلی بے مثل محققانہ کتاب ہے جس میں اس مسئلہ کے تمام گوشوں پر ایسے سنجیدہ اور دل پذیر ودلکش انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل میں سما جاتا ہے۔ اس کتاب میں وحی کی لغوی اور شرعی حقیقت، وحی کے اقسام، وحی سے متعلقہ مباحث مثلاً صفاتِ الٰہی خصوصاً صفت کلام۔ ملکۂ نبوت اور استعداد وحی۔ وحی اولاً کس طرح نازل ہوئی اور آخر تک کن کن طریقوں سے نازل ہوتی رہی۔ قرآن نے اپنے وحی ہونے کے کیا کیا دلائل بیان کئے۔ وحی کی حقیقت جدید فلاسفہ مغرب کے نزدیک ان سب عنوانوں پر تفصیل سے کلام کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخری باب میں اعجاز قرآن پر بالکل جدید طرز سے گفتگو کی گئی ہے جس میں وجوہ اعجاز کی تنقیح کرکے ہر وجہ اعجاز پر بصیرت کی پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ وحی الٰہی کے سلسلہ میں جس قدر عقلی اور نقلی شکوک وشبہات کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ان کا کلی طور پر ازالہ ہوسکتا ہے اور طالب حق کے لئے ہدایت کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ ترتیب کی دلنشینی اور انداز بیان کی شگفتگی کے لئے مولانا سعید احمد مدیر برہان کا نام نامی کافی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب اس کتاب کا خاص طور پر مطالعہ فرمائیں۔ وحی جیسے نازک اور الجھے ہوئے مسئلہ کا حل اس سے بہتر انھیں کہیں نہیں ملے گا۔ کتابت طباعت نہایت اعلیٰ

اصلی قیمت غیر مجلد ۲عہ/، مجلد عہ/

رعایتی " " عہ/ " عہ/

ملنے کا پتہ

مکتبہ برہان، قرولباغ، نئی دہلی

سیاسی کتابیں

مبادی سیاسیات مصنفہ پروفیسر محمد ہارون خاں شیروانی. ایم اے (آکسن) ہمارے ملک میں اکثر پڑھے لکھے لوگ بھی کسی سیاسی مسئلہ پر زیادہ دیر تک جذبات سے الگ ہو کر علمی گفتگو نہیں کر سکتے اس کی وجہ یہی ہے کہ خود ہماری زبان میں علم سیاست پر اچھی کتابوں کا فقدان ہے۔

مبادی سیاسیات اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں ذرا تفصیل سے علم سیاست کی ابتدائی معلومات پیش کی گئی ہیں اور عہد حاضر کی سیاسی تحریکوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ضخامت ۶۰۰ صفحات۔ قیمت۔ مجلد ۵ر

خلافت و سلطنت مولفہ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی پی، ایچ، ڈی. مصنف نے ان واقعات کو جو خلافت اور سلطنت کے سیاسی اور مذہبی تعلقات و ربط کے نتیجے میں بڑی تلاش سے مرتب کیا ہے ایک طرح یہ کتاب ایشیا کی اسلامی سلطنتوں کی تاریخ بھی ہے۔ قیمت عہ

نظام سلطنت مولفہ مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی. اس میں مذہب و تمدن اخلاق و معاشرت اور قوانین سلطنت پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ

بین الاقوامی سیاسی معلومات دنیا کی سیاسیات سے متعلق افراد و اقوام، ممالک و مقامات اور معاہدات و اصطلاحات کی یادداشت۔ قیمت ۱۲ر

سوشلزم کی بنیادی حقیقت مترجمہ سید معین الدین شمسی ایم اے۔ اشتراکیت کی بنیادی حقیقت اور اس کی اہم قسموں سے متعلق مشہور جرمن پروفیسر کارل ڈیل کی وہ آٹھ تقریریں جنھیں پہلی مرتبہ اردو میں منتقل کیا گیا ہے کتاب کے شروع میں سوشلزم کے حالات اور اس کی موجودہ رفتار ترقی پر مترجم نے ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ قیمت ۳ر

سوشلزم یہ کتاب بانیٔ اشتراکیت کارل مارکس کے دست راست فریڈرک اینگلز کی وہ شہرہ آفاق تصنیف ہے جس میں اشتراکیت کے ہر پہلو کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۶ر

آغاز کیسے ہوا؟ لینن کاش ہکار۔ اس میں مصنف نے قومی اور سوشلسٹ کارکنوں کے لئے چند ایسی

ہدایات درج کی ہیں جن کا مطالعہ نوجوانوں کے لئے ضروری ہے۔ قیمت ۶ر

شہنشاہیت | یہ کتاب دراصل جدید سرمایہ داری کی مکمل تاریخ ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ بالخصوص یورپ کے ملکوں میں سرمایہ داروں کی محدود جماعت نے حکومت پر قبضہ کرکے بنی نوع کو کس طرح غلام بنایا۔ قیمت مجلد عہ

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل | میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ اس مختصر سے رسالے میں یہ بتایا ہے کہ اسلام کیا ہے؟ ہم مسلمان ہیں یا تو کیسے؟ ہمارا ماضی کیا تھا؟ حال کیسا ہے۔ اور آئندہ کیا تبدیلیاں ممکن ہیں۔ قیمت سہ ر

ہندوستان کی اقتصادی تاریخ | مصنفہ خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی۔ مصنف نے اپنے خاص ادیبانہ رنگ میں ہندوستان کی اقتصادی پالیسی سے بحث کی ہے۔ قیمت ۶ر

کسان تحریک | اس میں اس تباہ حال طبقہ کی حالت کا ذکر ہے جن پر ہندوستانیوں کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس کے تین حصے ہیں پہلے میں کسانوں کے عام مسائل سے بحث ہے دوسرے میں برطانوی سامراج اور کسان کے تعلقات ہیں اور تیسرے میں قومی تحریک اور کسان سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۸ر

انقلاب میں کسانوں کا ہاتھ | اس پمفلٹ میں عوام کو یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خود کیسے اپنی تحریک چلا سکتے ہیں اور ملوں، کارخانوں، کھیتوں، شہروں اور دیہاتوں میں اپنی تنظیم اور اتحاد کے زور سے دشمنوں کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔ قیمت ار

مُعاملہ زمین | از برج نرائن صاحب ایم۔ اے پروفیسر اقتصادیات۔ ۱۸ ابواب میں زمین، کھیتی، زمیندار سرکار، انکم ٹیکس وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۶ر

مکتبہ جامعہ قرولباغ، نئی دہلی

تاریخ و سوانح

تاریخ سلطنت خداداد میسور کی نامور سلطنت کے بانی حیدر علی اور اس کے جانشین ٹیپو سلطان کی مکمل تاریخ۔ یہ ایک طرف مواد و دلائل اور دوسری طرف جوش عقیدت کے ساتھ مرتب کی گئی ہے۔ قیمت للعہ

تاریخ جنوبی ہند یہ جنوبی ہند کی تاریخ ہے۔ مصنف نے بڑی چھان بین سے تمام داخلی اور خارجی اسناد مرتب کئے ہیں۔ قیمت ۳

داستان غدر حضرت ظہیر دہلوی۔ شاگرد رشید حضرت ذوق نے غدر دہلی کے چشم دید حالات لکھے ہیں۔ آج وہ قصے اور کہانیاں ہیں مگر کچھ ایسے دردناک ہیں کہ دل ہل جاتے ہیں۔ قیمت عہ

مرآت مصطفے آباد قدیم زمانے میں کچھ سے لے کر کوکن تک ایک ہی زبان اس سارے علاقہ میں بولی جاتی تھی۔ مگر بعد میں سیاسی انقلابات کے باعث یہ ملک دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ایک کا نام گجرات اور دوسرے کا سوراشٹ یہ سوراشٹ یا جوناگڑھ (مصطفے آباد) کی تاریخ ہے۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ کاغذ، لکھائی چھپائی اعلیٰ۔ قیمت مجلد نو روپئے (لعہ)

مرآت محمدی مصنفہ شیخ غلام محمد کی مکمل اسلامی تاریخ، ۴۰۰ صفحات بڑی تقطیع۔ قیمت دو روپئے آٹھ آنے عہ

تذکرہ کاملان رامپور مولفہ حافظ علی خاں شوق اس میں تقریباً دو سو بزرگان رام پور کے حالات درج کئے گئے ہیں۔ قیمت ۳

انقلاب ۱۸۵۷ء اس میں ۱۸۵۷ء کے اس درد انگیز ناکام انقلاب کی تاریخ ہے جو درس عبرت کا ایک سبق آموز باب ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ قیمت عہ

سفرنامہ اسیر مالٹا مولانا محمود الحسن صاحب شیخ الہند کے حجاز، مصر، مالٹا کے سفر کے حالات۔ مرتبہ مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ قیمت عہ

شہیدان حریت اس کتاب میں سعد زغلول پاشا، غازی عبدالکریم، جمال الدین افغانی

بیسیوں فدایان ملت کے حالات زندگی درج ہیں۔ قیمت ۱۲/

سلطانی محلوں کا راز | مترجمہ عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی۔ سلطان عبدالعزیز شہنشاہ ترکی کے حالات۔ قیمت ۱۲/

سوانح حیات | آزاد، سرسید، حالی، شبلی وغیرہ کی سوانح عمریاں اور ان کی خصوصیات کمال پر ایک نظر۔ قیمت ۱۲/

سوانح برادران باربروسہ | برادران باربروسہ کے حالات زندگی، اس عہد کے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی زندگی کا مرقع۔ قیمت ۸/

مشاہیر اسلام | صوفیا کرام علمائے عظام شہدائے ملت اور مجاہدین و سلاطین کے حالات زندگی۔ قیمت اول ۸/ دوم ۱۲/

حیدر علی | میسور کے اسلامی عہد کی ایک حسین و جمیل داستان جس میں عشق و محبت کے حیرت انگیز واقعات کو تاریخی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنفہ محمود خاں۔ قیمت ۸/

حیات اجمل | حکیم محمد اجمل خاں مرحوم کی سوانح حیات ہے۔ جس میں مرحوم کے اخلاق و عادات، علمی و طبی حالات، مطب اور سفروں کے واقعات درج ہیں۔ قیمت ۶/

حیات وارث | از مرزا ابراہیم بیگ صاحب شیدا۔ وارثی اس میں حضرت حاجی حافظ سید وارث علی شاہ کے ممتاز حالات مقدس واقعات اور مفید ہدایات و ارشادات درج ہیں۔ حجم ۵۸۰ صفحات قیمت مجلد ۳/

حیات حافظ رحمت خاں | اس میں روہیل کھنڈ کے مدبر حکمراں حافظ رحمت علی خاں کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ ان کی خدا ترسی، پاک بازی، دوست نوازی، عالی ہمتی ایثار اور علم دوستی کے مخصوص واقعات لکھے ہیں۔ قیمت مجلد ۲/

حالات علی برادران | مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے زندگی کے حالات۔ قیمت ۸/

مکتبہ جامعہ قرولباغ۔ نئی دہلی

OKASA



کامل صحت اور جوانی کی طاقت حاصل
کرنے کے لئے

اوکاسا استعمال کیجئے

قیمت ۳۰ گولیاں چھوٹا بکس للعہ قیمت ۱۰۰ گولیاں بڑا بکس عہ

اوکاسا ہر اچھے دوا فروش سے طلب کیجئے۔ یا براہ راست اوکاسا ڈپو پارک منشن دہلی گیٹ، دہلی

مسلمانوں کا روشن مستقبل

مصنفہ۔ مولانا سید طفیل احمد صاحب

صرف مکتبہ جامعہ مہیا کر سکتا ہے

یہ مسلمانوں کی گذشتہ تین سو سال کی مذہبی و اقتصادی، تعلیمی و سیاسی تاریخ ہے مصنف نے اولاد ششں بنیادی حقوق کو تفصیل سے بیان کر کے تاریخ کے ہر دور کی جانچ انہی بنیادی حقوق کے ذریعہ کی ہے۔ جس سے ہر زمانہ کی مالی، تعلیمی اور سیاسی حالت واضح ہو گئی ہے۔ یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر ایسا مواد جمع کر دیا ہے کہ اسے پیش نظر رکھ کر ہماری یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور قوم کے نوجوان مزید تحقیقات کر سکتے ہیں اور مسلمانوں کے لئے مفید معلومات فراہم کر سکتے ہیں مصنف کا خیال ہے کہ مسلمانوں کی بدحالی نہ سلطنت چھن جانے سے ہے اور نہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے بلکہ جدید تعلیم کے دور نے کچھ ایسے اسباب پیدا کئے جن کا اثر مسلمان پر افسردگی اور سرد مہری کی شکل میں ظاہر ہوا اور ان کے قوائے عمل مضمحل ہو گئے اس قسم کے مایوس کن خیالات کو مصنف نے دور کیا ہے اور بتایا ہے کہ ہم ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہ سکتے۔

قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ
دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۸۹۲

ایک معلم کی زندگی

نومبر ۱۹۴۱ء کے آخر میں شائع ہو جائے گی

یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہو رہی ہے ہر ایک جلد تقریباً پانچ سو (۵۰۰) صفحوں کی ہے اور مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں۔ چونکہ کل ضخامت ایک ہزار ہو گئی ہے اس لئے مکمل سٹ کی قیمت چار روپئے (للعہ) کے بجائے پانچ روپئے (صہ) کردی گئی ہے کتاب کا سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ہے۔

یہ کتاب عبدالغفار صاحب مدہولی کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ جامعہ کی دلچسپ اور رواں تاریخ بھی ہے اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ بھی۔ یقین ہے کہ بچے اور بڑے دونوں اسے دل لگا کر پڑھیں گے۔

اب تک جن حضرات سے مبلغ چار روپئے (للعہ) وصول ہوئے ہیں ان سے زاید مطالبہ نہ کیا جائے گا اور محصول ڈاک بدستور معاف رہے گا نیز جن کے آرڈر وی۔ پی کے لئے آچکے ہیں ان سے بھی کتاب کی قیمت چار روپئے (للعہ) ہی لی جائے گی البتہ محصول ڈاک خود ان کے ذمے ہوگا۔

مکتبہ جامعہ

دہلی، نئی دہلی، لکھنؤ، بمبئی ۳

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

مسلمانوں کا روشن مستقبل

(تیسرا ایڈیشن مع ترمیم و اضافہ)

صرف مکتبہ جامعہ مہیّا کرسکتا ہے

یہ مسلمانوں کی تین سو سال کی مذہبی، اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی تاریخ ہے یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ایک باب بجائے خود ایک کتاب ہے۔ مصنف نے مسلمانوں کے ہر شعبۂ زندگی پر اس قدر مواد جمع کردیا کہ اس کی روشنی میں ہندوستان کے سیاسی اور تمدنی مسائل بڑی آسانی سے حل کئے جاسکتے ہیں۔ جو لوگ ہندوستان کی سیاست کے متعلق نہایت تفصیلی، مستند، بصیرت افروز اور سبق آموز معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

کتاب کی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اسے اس قدر حسن قبول حاصل ہوا کہ اس کے دو ۲ ایڈیشن نہایت کم مدت میں چھپ چکے ہیں اور اب نظر ثانی اور حذف و اضافہ کے بعد تیسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے جس میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں انجمن ترقی اردو کی پوری تاریخ دی گئی ہے۔ خاکسار جماعت کے کام اور پروگرام پر آزادانہ تنقید کی گئی ہے اور قومی جلسوں کے مختصر حالات اور ان کی منظور شدہ تجاویز کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود قیمت وہی دو ۲ روپے آٹھ آنے۔ (عہ) ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی قرولباغ

جامعہ

زیر ادارت - نورالحسن ہاشمی ایم، اے

جلد ۳۵ - نمبر ۶ | بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۴۱ء | چندہ سالانہ صہ فی پرچہ آٹھ آنہ

فہرست مضامین

(پرنٹر و پبلشر محمد مجیب بی۔اے (آکسن) محبوب المطابع دہلی)

مکتبہ جامعہ دہلی

کو

دارالمصنفین اعظم گڈھ، دارالترجمہ حیدرآباد، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، دائرۂ حمیدیہ، سرائے میر اعظم گڈھ، ندوۃ المصنفین اور دوسرے مشہور اداروں کی مطبوعات کی ایجنسی حاصل ہے، اس لئے مکتبہ سے ہر موضوع کی کتابیں اصلی قیمت پر حاصل کی جا سکتی ہیں

اگر آپ اردو کی تازہ ترین مطبوعات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو اردو اکادمی کی ممبری قبول فرمایئے اور قواعد و ضوابط ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے۔

تعلیمی بجٹ

(اس بجٹ کا ایوان فرضی۔ اس کے افراد فرضی اور اس کا نفس مضمون بھی فرضی ہے)

آج تعلیمی بجٹ کا دن تھا اور کل سے آنریبل منسٹر کو بے حد مصروفیت رہی تھی۔ ان کے پاس کئی ایک محکمے تھے۔ ان کے سرخاب کے پر تو اور ہی تھیں تعلیم تو ان کے کلاہ وزارت میں ایک مرغی کے پر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی تھی اور مرغی بھی کڑاک مرغی!

کل شام کو انھوں نے فائلوں کے نیچے سے تعلیم کے کاغذات نکالے تو ان پر اچھی خاصی گرد جمی ہوئی تھی۔ انھیں دفتری پر تاؤ تو بہت آیا مگر پھر سوچ کر رک گئے تھے اور جب انھوں نے فائل کھولی ہے تو ایک جھینگر زقند بھر کر زن سے ان کی ناک کے پاس سے گزر گیا تھا اس کمبخت کو اتنا بھی پتہ نہیں کہ وہ کیسی باوقار ناک کے پاس سے ہو کر گزرا تھا کیسی باوقار اور کیسی حساس!

ان کے پاس وقت کم تھا بہت کم درختوں کے سایے ان کے ٹینس میدان پر لمبے ہو چلے تھے اور ابھی تک وہ اپنے تعلیمی سکریٹری کو شرف باریابی نہ بخش سکے تھے۔ اتنے میں انھیں نیچے سے چینی کے برتن کھنکنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ ہی انھیں یاد آیا کہ انھوں نے آج چند سوشیل قسم کے دوستوں کو چائے پر بلایا ہے۔ انھوں نے ذرا سکریٹری کو اندر بلا لیا تھا اس دوران میں بھی ان کی نگاہیں بار بار کھڑکی کے پار جا رہی تھیں ابھی تعلیمی بجٹ کے مباحث پر سرسری سا تبصرہ بھی نہ کرنے پائے تھے کہ ان کی نگاہ کھڑکی سے باہر میدان پر گئی اور انھوں نے دیکھا کہ سبز گاہی لان سے پرے کوٹھی کی افق پر ایک قوس قزح کے رنگوں والی ساڑی نمودار ہو چکی تھی اس پر انھوں نے جلد جلد سکریٹری کو رخصت کر دیا تھا۔

آج تعلیمی بجٹ کا دن تھا اور آنریبل منسٹر اس میدان کے پرانے شہسوار تھے اس موسم کے بجٹ کی بہت سی ٹٹیاں تو وہ صاف پھلانگ چکے تھے اب تو محض اس کی دم باقی رہ گئی تھی بجٹ کیا تھے اچھے خاصے جنگی قسم کے بیڑے تھے جنھیں جیو لگانا اور پار کرنا آنریبل منسٹر کا ہی کام

تھا۔ اور تعلیمی بجٹ! تعلیمی بجٹ تو کاغذ کی وہ ناؤ تھا جسے اگر وہ ایک بار اپنی گھنی مونچھیں لبوں سے اُٹھا کر پھونک ہی دیتے تو آناً فاناً میں پار کیا ہوا کی لہروں پر ہچکولے لینے لگتی۔

مگر اس مرتبہ ان کی خود اعتمادی کچھ ڈانواڈول سی ہو رہی تھی۔ اس مرتبہ اس بجٹ پر مہتہ جی نے کٹوتی کی ایک تحریک پیش کر دی تھی!

اس کے جواب کی تیاری کے لیے انھوں نے کل شام کو اپنے سکریٹری کو بلایا تھا۔ سکریٹری صاحب نے اس سے پہلے ایک دن اپنے پرسنل اسسٹنٹ کو اور اُس نے اپنے نائب کو اور اُس نے اپنے کلرک کو بلایا تھا۔ مال گاڑی کے انجن کی طرح انھوں نے ایک ریلا جو پیچھے کو دیا تو اس کی دھک گاڑی بہ گاڑی، ورک بہ روک آخری ڈبہ تک پہنچی تھی یہ آخری ڈبہ ان کا جونیر کلرک تھا۔ یہ ڈبہ ان جغادری گاڑیوں اور دیوار کے بیچ میں پس کے رہ گیا تھا۔ بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ ان کے درمیان کیوں آیا۔ کیا اسے پتا نہ تھا کہ یہ بھنچائی اور پسائی تو سب سے کمزور کی قسمت میں ہی لکھی ہے۔

ان کا تیار کیا ہوا جواب محض جواب نہ تھا اس کے ہر جملے اور ہر لفظ کے پس منظر میں ایک کارواں تھا جس میں قطار اندر قطار منشی، اسسٹنٹ، سپرنٹنڈنٹ ایک ہی رسی اور ایک ہی نکیل میں پروئے ہوئے تھے۔ اس نکیل کا سرا آنریبل منسٹر کے ہاتھ میں تھا اور اس رسی سے اس پورے بے زبان گروہ کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ اگر اس جواب کا کوئی حرف قابل اعتراض قرار دیا گیا تو اس پورے گروہ کی جان ایک پھوڑے کی طرح ٹیسیں لینے لگے گی۔

غرضکہ یہ تقریر کلرک بہ کلرک ہوتی ہوئی سینہ بہ سینہ نہیں، قلم بہ قلم آخر کار کلرکوں کے میکائیل یعنی ایوان کے کلرک کے پاس پہنچی لیکن حتمی ذمہ داری اسی کمزور اور دھرجھری اینٹ پر ہے جس پر اس قصر استعماریت کا توازن ٹکا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ دفتری حکومت کے طلسم کو ایجاد کرتے وقت کسی منچلے نے ستم ظریفی یہ کی تھی کہ اس کی بنیاد اچھے خاصے نٹ گری کے تماشے پر رکھدی تھی اور حساب اس طلسم کا یہ تھا کہ اگر سب سے اوپر کا نٹ ذمہ داری کے نردبان سے پھسل جائے تو وہ اپنے ماتحت کے عین شانوں اور پشت

پر جاکر ٹکتا تھا۔ اس سے ایک تو چوٹ کم لگتی تھی اور دوسرے اس تحریک سے وہ ماتحت اپنے نچلے ماتحت پر اسی شان سے نازل ہوتا تھا۔ قس علیٰ ہذا۔ مگر اس مسخرے پن میں کم بختی تو سب سے نچلے ماتحت کی تھی جس کے نیچے سوائے پتھریلی زمین کے اور کچھ نہ تھا اور یہ بے چارہ اکثر چاروں شانے چت جاتا تھا اور چونکہ اوپر کے لوگ مادی لحاظ سے بھی بھاری بھرکم ہوتے تھے اس لئے اکثر اوقات دوبارہ اُٹھنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی۔

اب اجلاس شروع ہوا۔ اس کا افتتاح مہتہ جی کی تقریر سے ہوا تھا۔ آج ان کی زندگی کا ایک سب سے اہم لمحہ تھا اور جب وہ اٹھے ہیں تو انھیں احساس تھا کہ ایک زمانہ کی نگاہیں ان پر اُٹھ رہی ہیں اور خاص طور سے وہ نگاہیں جو لیڈیز گیلری سے ان پر اُٹھ رہی تھیں یہ تیز تیز نگاہیں ان کے رخساروں پر چبھتی ہوئی اَنیاں سی معلوم دے رہی تھیں۔ انھیں نگاہوں کے لیے انھوں نے خون پسینہ بہا کے یہ تقریر تیار کرائی تھی۔ اور پھر کل پریس میں ان کے الفاظ جلی حروف میں! ان کا نام عوام کی زبان پر! ان کی آواز ان کے کانوں میں گونج رہی ہوگی! آج دنیا کو پتا لگ جائے گا کہ ان میں کیسا جوہر چھپے ہیں۔

مہتہ جی کی تقریر شروع ہوئی:۔

"جناب صدر! میں آپ کی توجہ اس خوفناک بے علمی اور جہالت کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ہمارے عوام پر مسلط ہے اگرچہ ہم آج اس ایوان میں ایک روشن خیال گروہ کے مابین ہیں مگر ماحول کی تاریکیا کے مقابلے میں یہ گروہ ایک ٹمٹاتی ہوئی شمع سے زیادہ نہیں اور جناب صدر! یہ تاریکی کم نہیں ہو رہی۔ کسی جانب سے ہمیں امید اور آس کا اجالا ابھرتا نظر نہیں آ رہا۔ یہ تاریکی کم نہیں بلکہ جیسا اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے زیادہ ہو رہی ہے۔ اس کے سایے لمبے ہوتے جا رہے ہیں اس کی سیاہی گہری ہوتی جا رہی ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ یہ تاریکی کہیں مدھم روشنی کے اس دائرے کو بھی جس میں تعلیم یافتہ طبقہ اطمینان سے بیٹھا ہے ایک دن نہ آ جائے۔ اس محفوظ اور خوبصورت جزیرے پر جس میں اونچے طبقوں نے اپنا زمینی بہشت بنا لیا ہے برابر مد کی لہریں چڑھتی جا رہی ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ کسی دن مہلک لہر کا وہ تھپیڑا آئے گا جو ایک مرتبہ

پھر اسے سطح آب کے برابر کر دے گا اور بے علمی کا سمندر پھر ایک دفعہ اپنی اس امانت کو واپس لے گا جو ہم نے صدیوں کی محنت اور خلوص سے اس کے سینے سے چھین لی تھی۔

جناب صدر! ہماری دیہی آبادی کا یکسر بے علم رہ جانا ایک قومی المیہ ہے اور قوم کے اعضا میں سے ایک اہم عضو کا مفلوج ہو جانا وہ عضو جس سے کہ نظام ملی میں نئے خون کی تولید ہوتی ہے جو قوموں کی قسمت میں نئے ممکنات بیدار کرتا ہے جس سے کہ زندگی کی نئی سوتیں پھوٹتی ہیں جو غیر ملوث سیدھے سادے قوا کا منبع ہے وہ قوا جو ایک طوفان کی طرح زور دار اور ایک دریا کی طرح بہاو رکھتے ہیں جب روس یا ٹرکی نے ان خوابیدہ قوا کو تعلیم کے ذریعہ بیدار کر دیا تو انھوں نے ملک بھر کو ایک نئے برق صفت ولولے، ایک نئی زندگی سے بیتاب کر دیا۔

اگر میں آپ کے سامنے اعداد و شمار پیش کروں تو آپ کو پتا چل جائے گا کہ ہم زندگی کی دوڑ میں کس قدر مغربی ممالک سے پیچھے رہ گئے ہیں اور یہ دوڑ جو ہم دوڑ رہے ہیں اس میں سب سے کمزور اور سب سے زیادہ قابل رحم ساتھی ہمارا کسان ہے۔ آج اس بجٹ کے موقعہ پر میں نے مناسب سمجھا کہ حکومت کی توجہ وقت کے اس اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرائی جائے۔"

مہتہ جی اپنی تقریر ختم کر چکے تھے۔۔ ان کی تقریر سے ایوان میں سنسنی سی پھیل گئی تھی ان کی تقریر روایات کے مطابق نہ تھی، اس تقریر میں جذباتی عنصر نمایاں تھا اور ان کے الفاظ میں وہ توازن اور پروقار احتیاط نہ تھی جو ایک رکن کے شایان شایان ہے یہاں کے کارگر ہتھیار، دو ہی تھے ایک گرمی گفتار اور دوسری نرمی رفتار، گرمیٔ گفتار ہو چکی تو نرمی رفتار کی باری آئی

اب آنریبل منسٹر میدان میں آئے۔ ان کی تقریر میں وہ خود اعتمادی اور مبالغہ انداز موجود تھا جو ... نیت کے قد آور ویسٹ اینڈ کے بہترین سلے ہوئے سوٹ سے اٹھتا ہے اور دل و دماغ دونوں پر چھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک دل خوش مزاح کا ترشح بھی ان کی تقریر میں موجود تھا۔ ان کا مرتبہ بہت بلند تھا، وہ عہدہ اور سماجی لحاظ سے بہت اونچے تھے اس لیے وہ ہر ممبر کے ساتھ بعینہ اسی طرح سلوک کر سکتے تھے جیسے چھوٹے بچے خوبصورت پلوں کے ساتھ کرتے ہیں، پہلے تو چمکارتے ہیں پچکارتے ہیں

اور جب وہ خوشی میں خرخرانے اور دم ہلانے لگتے ہیں تو آہستہ سے ایک چپت سر پہ لگا دیتے ہیں مگر چپت بھی مربیانہ انداز میں ہی لگاتے ہیں کچھ ایسا ہی انداز ان کی آج کی تقریر میں بھی پایا جاتا تھا۔

"مجھے آج فخر ہی کہ میں مہتہ جی کی تقریر کا جواب دے رہا ہوں مہتہ جی ہمارے پرانے کرم فرما ہیں اور ان سے تو ہماری چھیڑ برابر چلتی رہتی ہی اکثر اوقات ان کے سوالات سے جواب دیتے ہوئے مجھے پسینہ چھوٹ چھوٹ گیا ہی (اس جملہ پر مہتہ جی نے اپنے پاؤں ذرا پھیلا کر جائے اور ان کی نگاہیں غیر شعوری انداز میں لیڈیز گیلری کی طرف جھکیں) مہتہ جی کی تقریر خود فصاحت کا ایک بہتا ہوا دریا اور معلومات کا ذخیرہ ہی جملہ معترضہ معاف فرمایئے گا انھوں نے کرنل جعفر حسن کے اقتباسات میں سے کچھ پڑھا مجھے اس موقعہ پر جعفر حسن صاحب کو ہدیۂ عقیدت پیش کرنا ہی جس دن سے محکمہ تعلیم نے ان کی خدمات شاہی رسالہ سے مستعار لیں اسی دن سے انھوں نے محکمہ کو ایسے شاندار فوجی نظام سے چلایا ہی کہ ہمارا محکمہ خوش انتظامی اور ضبط کے لیے ضرب المثل بن گیا ہی (اس قصیدہ خوانی میں پندرہ منٹ صرف ہوئے)

"اب میں موضوع بحث کی طرف رجوع کرتا ہوں حضرات! قابل مقرر نے فرمایا کہ فلاں ملک میں یہ ہوا فلاں میں وہ ہوا اور اس کے بعد یہ ہندوستان میں کیوں نہیں ہوا؟ جناب صدر! میں پوچھتا ہوں کہ میرے ہاں لڑکا ہوا فلاں صاحب کے ہاں بچہ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا (ایسی عبارت آنریبل منسٹر ہی کر سکتے تھے) میرے ہاں آج شرادھ ہوا آپ کے ہاں کیوں نہیں ہوا یہ کوئی منطقیانہ دلیل نہیں ہی جناب صدر! اگر نہیں ہوا تو اس نہ ہونے کی ذمہ داری ہم پر نہیں یہ ذمہ داری لوکل باڈیز پر ہی یہ ذمہ داری ڈسٹرکٹ بورڈ پر ہی یہ ذمہ داری مقامی احباب پر ہی حضرات! اگر آپ پچھلے بجٹ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو اندازہ لگ جائے گا کہ ہم لوگ تعلیم پر پہلے سے کتنا زیادہ خرچ کر رہے ہیں ہمارا ابتدائی تعلیم پر ہی خرچ آگے سے تگنا ہو گیا ہی"

ایک ممبر: کیا میں آنریبل منسٹر سے دریافت کر سکتا ہوں کہ تعداد خواندگان بھی پہلے سے تگنی ہو گئی ہی یا نہیں؟

آنریبل منسٹر (تمکنت آمیز مسکراہٹ سے اوپر کا لب چڑھا کر) "جناب صدر! میں تعلیم اور کلچر کے معاملہ میں

مادی اقدار اور ناپ تول کا قائل نہیں ہوں قوموں کی زندگیاں ترازو سے نہیں تولی جاتیں اور نہ ہی ان کی ترقی آنے پائیوں سے محسوب ہوسکتی ہے (اپنی تقریر کو جاری رکھتے ہوئے) مگر جناب صدر! ابھی تو مجھے ان اہم مشکلات کا ذکر کرنا ہے جو تعلیم عوام کے راستے میں حائل ہیں (اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کے چہرہ پر ہلکے رنج اور فکر کی بدلی سی چھا گئی تھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود اس گراں بار بوجھ کے احساس سے دبے جا رہے ہیں (اس بوجھ کا اثر ان کی آواز پر بھی معلوم ہوتا تھا) ان میں سب سے بڑی اور سب سے اہم مشکل عورتوں کی کمی ہے (یہاں اُن کی مراد استانیوں سے تھی) کیونکہ اگر عورتوں کی کمی ہوتی تو بچوں کی زیادتی کا سدباب ہو جاتا اور تعلیم عوام کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ اتنا شکر ہے کہ آنریبل منسٹر نے یہ نہیں کہدیا کہ ملک کو آج تک پڑھایا ہی استانیوں نے ہے۔ اس معاملہ میں ان سے کوئی چوک تو ہوئی نہیں تھی۔ انھوں نے پہلے سے اپنے اسسٹنٹ کو ایسا تاریخی مواد مہیا کرنے کو کہا تھا جس سے یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتا کہ ایک زمانے میں یہاں صرف عورتیں ہی عورتیں استاد تھیں لیکن ان دنوں اس غریب کو گھر پر اتنے پردہ لکچر سننے پڑے کہ یہ کام پورا نہ ہوسکا اور پھر جناب صدر! اکثر بچے تعلیم پوری ہونے سے پہلے ہی مدرسہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور ہر سو میں سے صرف ۸ا بچے چوتھی جماعت تک پہنچ پاتے ہیں۔

ایک ممبر "جناب صدر! کیا استادوں کے لیے ایکٹ اسلحہ نہیں ہے۔ اور کیا ڈنڈا قانون کی زد میں نہیں آتا؟"

ایک لبرل ممبر (یہ ممبر آزادی کے اصول کی خاطر ایک دفعہ جیل بھی جا چکے تھے) ہرگز نہیں۔ اگر بچہ کو آزاد اصول پر تعلیم کا حق حاصل ہے تو استاد کو آزاد طریق پر تعلیم دینے کا حق بھی ہے۔"

اس کے بعد ایک صاحب پچھلے بنچوں سے کھڑے ہوئے کچھ اکڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی ابتدائی زمانے کا انسان انسانی تجربے میں پہلی مرتبہ پچھلے بنچوں پر توازن قایم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ ایوان کے ان بے زبان گروہ میں سے تھے جو دیکھتا ہے مگر بولتا نہیں۔

"جناب صدر! میں کچھ ایسا مقرر تو نہیں ہوں تاہم میرے ذہن میں اس وقت ایک خیال آیا ہے جس کا اظہار ملک و قوم کی بہبودی کے لیے ضروری ہے میرے خیال میں جس نے تعلیم نہیں پائی وہ حیوان ہے

محض حیوان"

اتنے میں ایک سیاسیات کے پروفیسر جو بہت کچھ کھو کر ایوان میں پہنچے تھے ذہنی لحاظ سے نہیں بلکہ مالی لحاظ سے کھو کر، عالمانہ تمکنت سے اوپر کا ہونٹ سکوڑتے ہوئے زیر لب بڑبڑائے۔

"ابے گدھے اگر حیوان نہ ہوتے تو تمھارے جیسوں کو انتخاب کر کے یہاں کیوں بھیجتے" ہابس! ہابس!! (Hobbes) انسانی ذہنیت کے اس پہلے نباض نے ہی انسان کو سمجھا۔ انسان کو نہیں بلکہ انسان میں جو حیوان ہے اس کو سمجھا اور اصل میں سیاست کی بساط کا اصل مہرہ تو یہی انسانی صورت میں چلتا پھرتا حیوان ہے عوام کی تعلیم! یہ لوگ جو عوام کی تعلیم کا راگ الاپ رہے ہیں انھیں کیا معلوم کہ وہ کس آگ سے کھیل رہے ہیں (خود ہی خود اپنے خیالات سے ایک ققنس کی طرح جوش میں گرماتے ہوئے) تم لوگ نہیں جانتے ہو کہ تم کس آگ کے ساتھ کھیل رہے ہو، یاد رکھو یہ تو ایک بمب ہے لکھا پڑھا بمب' ان پڑھ بمب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ ان پڑھ کا سیفٹی والو محض گھونسلا ہوتا ہے اور لکھے پڑھے کا کچھ پتا نہیں کہاں سے کدھر سے پھٹ پڑے (پروفیسر موصوف اکثر اس قسم کی تقریریں کرتے رہتے تھے جس میں وہ خود ہی صدر خود ہی مقرر اور خود سامع ہوتے تھے)

اس کے بعد مہاراج راجینولا نے تقریر کی یہ ممبر ایوان امرا کے درخشندہ تارے تھے ان کی شہرت کا سبب ان کے مشہور گھوڑ دوڑ کے گھوڑے تھے جن کی انھوں نے خاص طور پر تربیت کی تھی اس تربیت میں انھوں نے سائنس کی بہترین اور جدید ترین معلومات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ پچھلے سالوں سے نظریۂ ارتقا نے ایوان کے ممبروں میں خاص مقبولیت حاصل کر لی تھی اور ایوان میں اکثریت کی رائے یہ تھی کہ انسانی تربیت کی اسکیم تیار کرتے وقت ان تمام تحقیقات کو خاص طور پر مدنظر رکھا جائے جو علم حیوانیات میں ہوتی رہی ہیں۔ اس رجحان کے سب سے بڑے اور سب سے پر جوش معتقد ہمارے راجہ صاحب تھے۔ جہاں بعض ممبروں کا یہ خیال تھا کہ حیوانی ارتقا کے تجربات کے مفید پہلوؤں کا تجزیہ کر کے انھیں انسانی تربیت کے عمل کے لیے استعمال کیا جائے تو وہاں راجہ صاحب کا شروع میں ایمان یہ تھا کہ انسانی تربیت و تعلیم کو من و عن اسی لائن پر چلایا جائے جس پر کہ ان کے گھوڑوں کی

تربیت کی گئی ہے اور حق تو یہ ہے کہ اگر کسی ہندوستانی کسان کے لیے کھانے پینے رہنے سہنے، دوا دارو کی وہ تمام سہولتیں مہیا کردی جائیں جو کہ راجہ صاحب کے اصطبل کے ایک پہاڑی ٹٹو کو میسر ہیں تو وہ کسان یقیناً راجہ صاحب سے ذہنی اور علمی لحاظ سے دو چار قدم آگے ہوتا لیکن پچھلے دنوں ان کے خیالات نے ایک مرتبہ پھر پلٹا کھالیا تھا۔

راجہ صاحب اس بحث کے لیے اپنے ساتھ ایک ماہر حیوانیات کو بھی لائے تھے۔ جو کہ خاص طور سے اسی موقعہ کے لیے مدعو کئے گئے تھے۔ وہ مہمان گیلری میں موجود تھے۔ اس ماہر فن کا خیال تھا کہ گھوڑے نے اپنی ٹانگوں کی تیزی کش مکش حیات کی جدوجہد میں بڑھالی ہے انھوں نے ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس سے ارتقا کی اس رو کو جو گھوڑے کی چاروں ٹانگوں میں چل نکلی تھی ٹانگوں کی بجائے دماغ کی طرف ڈھال دیا جائے ان کا خیال تھا کہ اس زبردست اور اہم انکشاف سے راجہ صاحب کے گھوڑے دنیا بھر کی گھوڑ دوڑ کو اپنی دماغی ترقی کی وجہ سے جیت لیں گے اور دوڑنے میں ٹانگوں کے علاوہ ذہن سے بھی امداد لیں گے اور اس طریق پر ان کی رفتار بے تحاشا بڑھ جائے گی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ سوچ اور فکر کی قوت کے ساتھ ساتھ ان میں کئی ایک اور باتیں بھی پیدا ہوگئیں اول تو ان کا دماغ ان کی ٹانگوں سے پہلے چل نکلا اور سوار کے لیے ان پر توازن رکھنا قریب قریب ناممکن ہوگیا کیونکہ توازن تو جب ہی قایم رہ سکتا تھا کہ سوار کی ران کے نیچے گھوڑا ہو اور گھوڑے کا ذہن بھی ہو پھر بعض ان گھوڑوں نے جن کے دماغ میں یہ ویکسین کچھ زیادہ چڑھ گئی تھی ذہنی طریق پر اڑنا شروع کر دیا اڑا تو پہلے بھی کرتے تھے مگر وہ چیز محض شوخیٔ طبع تھی کبھی طبیعت زوروں پر آئی تو پچھلی ٹانگوں کو ہوا میں رقص کا دائرہ کرا دیا۔ یا گردن کو ایک شرمائی ہوئی دلہن کی طرح جو نہوڑایا تو سوار گدسے زمین پر۔ اب معصوم بنے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ کہیئے کیسے مزاج ہیں؟

لیکن اس مرتبہ کا اڑنا خالص ذہنی اڑنا تھا اور اس مرض کے جراثیم جب پہلی دفعہ ماہر حیوانیات کو معلوم ہوئے تو انھیں ایک بارکیکپی سی چڑھ گئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مرض خطرناک طور پر متعدی تھا ان تیز رفتار پہاڑی نالوں کی طرح جن میں پانی بڑھنے لگتا ہے تو دیکھتے دیکھتے گزرتے ہوئے مسافر کے

کندھوں سے اوپر ہو جاتا ہے یہ مرض بھی راتوں رات ایک گھوڑے سے دوسرے بلکہ گھوڑوں سے گزر کر کسانوں کو بھی لگ جاتا تھا اور اس کے بعد نہ تو وہ خود محفوظ تھے نہ راجہ صاحب۔

راجہ صاحب کی تقریر میں اِن تلخ تجربوں کا رنگ جھلک رہا تھا اُن کی آج کی تقریر میں سچے عقیدہ کی جھلک اور ان کی زبان میں صداقت کی فصاحت تھی انھوں نے کہا "میرے خیال میں عوام کو پڑھانا ایک ایسا گناہ کبیرہ ہوگا جس کا خمیازہ ہم کیا ہماری آئندہ نسلوں کو بھی بھگتنا ہوگا میں آپ کو چیلنج کرتا ہوں (چیلنج کرتے ہوئے ان کی آواز ایوان میں گرج رہی تھی اور مارے جذبات کے تھرتھرا رہی تھی) آپ عوام سے وہ رشتہ پیدا کریں جو میں نے کیا ہے تو آپ کو پتا چلے گا کہ وہ کتنے سچے دل سے تعلیم کے خلاف ہیں میں نے ایک تجربہ میں غلطی کھائی (ان کا اشارہ گھوڑوں کے تجربے سے تھا) میں نہیں چاہتا کہ آپ بھی ایسا دھوکا کھا جائیں اگر میں اپنے گھوڑوں سے ایک مرتبہ بھی پوچھ لیتا تو وہ ضرور ہنہنا کر کہتے کہ ہم تو بغیر اس ارتقائی عمل کے گھوڑ دوڑیں جیت لیتے ہیں ہمیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جو سوال میں اپنے گھوڑوں سے کرنا بھول گیا آپ عوام سے کریں وہ ضرور آپ سے کہیں گے کہ سرکار ہم تو بغیر تعلیم کے ہی سماج کی خدمت کر رہے ہیں ہمیں تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔"

راجہ صاحب کے بعد ایک مدراسی ممبر نے تقریر شروع کی۔ نواب صاحب آج شاید پہلی مرتبہ کسی تقریر کے دوران میں بیدار ہوئے تھے اور بڑے آدمی تو ٹھیرے ہی ایک دفعہ نیند اچاٹ ہوئی تو دوبارہ کہاں سے آتے آن کے آرام میں خلل اسی مدراسی ممبر نے ڈالا تھا یہ ممبر ایڈلٹ ایجوکیشن (تعلیم بالغان) کے لفظ کو اس طریق پر ادا کرتے تھے گویا ہو تزگن سے گولے چھوٹ رہے ہوں چونکہ یہ لفظ ان کی تقریر میں بار بار آتا تھا معلوم یہ ہوتا تھا گویا کوئی قادر گولہ انداز تاک کر نشانے لگا رہا ہے ایک نشانہ ایسا کارگر بیٹھا کہ نواب صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں دلت ، دلت ، دلت ادھار۔ دلت ادھار سے انھیں خاص چڑ تھی ان کے علاقے میں اس تحریک کی وجہ سے پچھلی وصولی کے دنوں میں کافی چپقلش رہی انھوں نے ساتھ کے ایک مسلمان ممبر کو ٹھوکا دے کر چونکا دیا "ارے صاحب کیا ابھی سوالات ہی ہو رہے ہیں؟" بات یہ تھی کہ نواب صاحب کی پہلی نیند سوالوں کے مابین ہی کسی نامعلوم وقت پر شروع ہوئی تھی

اوران کا خیال تھا کہ ابھی تک سوالات چل رہے ہیں، یا کوئی دلت ادھار کا بل پیش ہو رہا ہے"۔
ان کے ساتھی مسکرائے اور کہنے لگے" حضرت یہ بحث تعلیم بالغان پر ہو رہی ہے"۔
نواب صاحب" تعلیم بالغان ؟ ارے میاں ہمیں تعلیم بالغان سے کیا مطلب ؟ میں خوب جانتا ہوں اس تجویز میں برادران وطن کا ہاتھ ضرور ہے"۔

یہ دو ٹوک اور جیتی فیصلہ بادی النظر میں محض جلد بازی کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا لیکن اگر نواب صاحب کے جذبات اور ان کے تاثرات کا تجزیہ کیا جائے تو وہ ایک پورے طوفان کی لہروں سے گزر کر اس محفوظ چٹان پر پہنچے تھے۔ ان کے غصے نے پہلی بھرپری تو اس وقت لی تھی جب ان کی نیند میں خلل اندازی کی گئی اور جب دلت ادھار کی غلطی جتائی گئی تو ان کی کیفیت اس لہر کی سی ہو گئی جو ایک دفعہ دریا کے بند سے ٹکرا کر منھ میں جھاگ بھر لائے اور دوسری دفعہ ٹکر کھانے کو تیار ہو اور اس کے بعد تعلیم بالغان ! اب تو پانی سر سے گزر گیا تھا ان کے غصہ کے تلاطم نے سب قید و بند ایک ایک کر کے توڑ ڈالے "تعلیم بالغان! حضرت سچ کہیے مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی کیا ضرورت ہے؟"

حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کو اس کا پورا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کو تعلیم بالغان کی مطلق ضرورت نہیں اور یہ فیصلہ ذاتی مشاہدہ پر مبنی تھا کیونکہ جب سے انھوں نے زمینداری سنبھالی تھی انھوں نے کوئی اَن پڑھ مسلمان دیکھا ہی نہیں تھا زمینداری سنبھالنے کے بعد انھوں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ اپنے علاقہ کی سکونت چھوڑ دی اور اس کے ساتھ پورا ماحول بھی چھوڑ دیا تھا ان کے خیال میں نئے زمینداری نظام کے لیے کچھ اس قسم کے عمل کی ضرورت تھی جس سے سانپ اپنی کینچلی اتار کر پرانے ماحول اور پرانے بل سے رخصت ہو لیتا ہے کینچلی بدلنے کے بعد اب وہ شہر کے بنگلے میں منتقل ہو گئے تھے۔ نواب صاحب جدید نظام زمینداری کے اُبھرتے ہوئے ستارے تھے اس تتلی کی طرح جو ابھی کویے سے پر پھیلائے نکلی ہو جس کا کویا کسی جھاڑی کے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گیا ۔ اب اس جھاڑی کی نیم تاریک دنیا کہیں دور پیچھے رہ گئی اور زندگی کی نئی پرواز رنگین پروں پر ایک جگمگاتی ہوئی دنیا میں چل نکلی تھی یہ دنیا سول لائنز کی دنیا پُر تکلف ڈنر اور چائے پارٹیوں کی دنیا تھی اس دنیا کے بسانے والے نہیں اس کے سجانے والے

ان کے گاؤں خانساماں، زنہنڈ وادران کا اینگلو انڈین شوفر تھے۔ خوبصورت تیتری کا بدصورت خول دیہات میں رہ گیا تھا اور اس خول میں ان کے ابا میاں کے خاندانی شاگرد پیشہ بدھو باورچی شبراتی فراش اور کلوا عصابردار کلبلا رہے تھے۔

میرن پور کی زمینداری ان کے ابا جان کے وقت میں اچھی خاصی پسنجر گاڑی تھی جس میں بدھو شبراتی ننھوا کلوا اوران کے ساتھ بڑے نواب سبھی سوار تھے کوئی اول درجہ میں تھا تو کوئی تیسرے میں اور تیسرے میں جگہ نہ ملی تو کس لپ کر ملازموں کے ڈبے میں ہی دھنس گئے لیکن چھمن میاں کے زمانہ میں زمینداری وہ اسپیشل تھی جس کے ٹائم ٹیبل میں میرن پور جیسی جگہ ٹھہرنے کا کوئی وقت نہ تھا میاں شبراتی کی جوتیاں اور بدھو کا نزلی دھرا کا دھرا رہ گیا اور چھمن میاں کی زمینداری نے سیدھا لکھنؤ جا کے دم لیا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ ایک روشن خیال زمیندار کے ہاں ازمنۂ وسطیٰ کی ان تنگ وتاریک یادگاروں کی کیا ضرورت تھی ذلیل یادگاروں کو تو انھوں نے اسی دن مٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا جس دن کلکٹر صاحب نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ آج کل کسی شریف گھرانے میں ان پڑھ ملازم کا ہونا ایک بدنما داغ ہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن نواب صاحب نے جو قبائے زمینداری کی دھلائی کیا گھسائی شروع کی ہے تو ان بدنما داغوں میں سے ایک بھی باقی نہ رہا بلکہ اب تو اس قبا کے بھی نیچے سے ریشے ڈھیلے ہو گئے تھے۔

بڑے نواب صاحب کے وقت میں ڈیوڑھی میں ہر روز مکتب لگتا تھا اور شاگرد پیشہ کے بچے چھمن میاں کے ہم مکتب تھے۔ اوران کا خلیفہ ننھوا بہشتی کا بڑا بیٹا شمو تھا۔ لیکن اب تو چھمن میاں کے بچے مسوری کے ایک یوربین اسکول میں پڑھتے تھے اوران کے پرانے ملازمین کے بچے باہر سڑک پر خاک دھول میں لوٹتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے ان کے اس جدید ماحول میں نہ تعلیم کی ضرورت تھی نہ تعلیم بالغان کی اور اگر نواب صاحب اس لفظ پر اس قدر جزبز ہو رہے تھے تو وہ ایک حد تک حق بجانب تھے۔ وہ پورے تیقن سے کہہ سکتے تھے کہ جہاں تک ان کے تجربے کا تعلق ہے تعلیم بالغان کی کوئی ضرورت نہیں۔

اس وقت ان کے منھ میں ایک طوفان ابل رہا تھا اور وہ اس طوفان کی تندی کو پورے ایوان پر بکھیر دینا چاہتے تھے۔ یہ لپکتا ہوا شعلہ ان کے ہونٹوں تک آتا تھا اور پھر واپس ہو جاتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ

یہ تھی کہ اب تک وہ جناب صدر کی "آنکھ" اور نہ ہی اس کا اشارہ پا سکے تھے۔ اگرچہ نہ تو ایوان کوئی بزم ناز تھا اور نہ ہی صدر کی آنکھ چشم یار سے کہیں دور کی بھی مشابہت رکھتی تھی لیکن اس نگاہ کو لاکھ تھامنے کی کوشش کریں تھمتی نہ تھی اور ادھر رقیبوں کی زبان بند کرنے کی کوشش کی تو بند نہ ہوتی تھی

اس ایوان میں پہنچ کر نواب صاحب کو بعض عادتیں چھوڑ دینا پڑی تھیں اور بعض نے خود بخود ایسی قلابازی کھائی تھی کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہو گئی تھیں۔ اب تک انھوں نے باہمی گفتگو میں جو بات دل میں آئی خوب سنا کر کہی لیکن اب ہر بات کھکر سنانا پڑ رہی تھی یعنی سنانا کسی کو چاہتے ہیں اور کہہ جناب صدر سے رہے ہیں۔ جمہوریت کے انجینیر نے انسانی جذبات کو قابو میں رکھنے کے لیے یہ انتظام کیا تھا کہ ہر طغیانی جناب صدر کے واسطے سے ہو کر پہنچے اس سے نہ صرف جذبات کا زور مدہم پڑ جاتا تھا بلکہ یہ عمل اس قوت جادو کا بھی اندازہ لگا لیتا تھا جس کی برکت سے جناب صدر کرسیٔ صدارت پر چپکے بیٹھے ہیں۔ اس عمل میں جناب صدر کو ان کا وزن اور اہلیت جمود خاص طور پر ممد و معاون ثابت ہوتی تھیں

نواب صاحب لاکھ بن بن کر بیٹھے مگر ان کے لاکھوں بناؤ پر ایک چرانا نگاہ کا، غالب آگیا۔ وہ جناب صدر کا اشارہ نہ پا سکے اور ان کی تقریر ان سنی رہ گئی۔

اب سیٹھ جگدمبا لال کی باری تھی اور سچ تو یہ ہے کہ آج کسی کی باری کا سوال ہی نہ تھا۔ آج کی بحث عقاید اور اصولوں کے بلند معیار پر ہو رہی تھی اور اب تک جو مقررین بول چکے تھے ان کے منہ کے جھاگ اور ان کے پیشانی کے قطروں سے یقین کی بو آ رہی تھی۔ سیٹھ جی بھی انھی لوگوں میں سے تھے عام طور پر وہ اس قدر ٹھنڈے مزاج آدمی واقع ہوئے تھے کہ معمولی مباحثوں کی ہاہمی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا ان کے توازن کو برقرار رکھنے میں ان کی توند بھی امداد دیتی تھی ایک تو اس توند پر دونوں ہاتھ رکھنے سے ایک ابدی طمانیت چہرے پر پھیل جاتی تھی اس جادو کے کرتے کی طرح جو اہل سیمیا اپنے ساتھ رکھتے تھے اس توند پر ہاتھ رکھ کر معلوم ہوتا تھا گویا کامیابی و نصرت کا گولہ ہاتھ میں آگیا پھر جب کبھی کسی مسئلہ پر طبیعت حاضر ہوئی تو اکثر توند حاضر ہونے میں حائل ہو جاتی تھی اور جب تک سیٹھ جی اِدھر ذہن کو بیدار اُدھر توند کو ہشیار کر سکیں اس وقت تک کوئی اور رکن تقریر شروع کر چکا ہوتا تھا ان کے توندیل پیٹ پر سے دسیوں

تقریریں بیسیوں احتجاج گرجتے برستے گزرے کئی طوفان اُٹھے اور ٹھنڈے ہوئے لیکن سیٹھ جی اپنی اس آخری پناہ گاہ کے پیچھے اکثر چین کی نیند سوتے رہے لیکن آج بائیں جانب سے ایک آواز کان میں پڑی جس میں روپے آنے پائیوں کا ذکر تھا اس پر سیٹھ صاحب ہشیار ہو کر بیٹھ گئے۔ ایک ممبر کہہ رہے تھے۔

"جناب صدر! آپ ہندوستان کے تعلیمی خرچ کا مقابلہ لندن کاؤنٹی کونسل کے خرچ سے کریں یہاں ہم ۲۷ کروڑ کی آبادی پر حکومت کی طرف سے محض ۱۲ کروڑ روپیہ خرچ کر رہے ہیں جو اٹھنی فی کس سالانہ سے بھی کم پڑتا ہے۔ لندن کی کونسل چالیس پچاس لاکھ کی آبادی کے لیے ۱۷،۱۲ کروڑ روپیہ خرچ کر رہی ہے یعنی ۳۸ روپیہ فی کس سالانہ۔ جناب صدر میں حکومت کی توجہ . . ."

معزز ممبر ابھی جملہ ختم نہ کرنے پائے تھے کہ معلوم ہوا ایوان میں زلزلہ آگیا۔ سیٹھ جی اپنی توند سمیت یکدم پانو پر کھڑے ہوگئے تھے، مارے جذبات کے ان کی توند تھرتھرا رہی تھی اور زبان منہ میں پھڑپھڑا رہی تھی یہ جذباتی زلزلہ دیکھنے والوں کو اتفاقیہ سا معلوم ہوتا تھا مگر وہ ارکان جنھیں اُن آتشیں طاقتوں کا اندازہ تھا جو اس کی تہہ میں بھبک رہی تھیں ان کے لیے سیٹھ جی کا یوں پھٹ پڑنا کچھ ایسا تعجب انگیز نہ تھا۔ اس ممبر نے نادانستہ طور پر ان کی بہت حساس رگ کو چھیڑا تھا۔ ان کی زندگی کا اصول پہلے دام بعدہٗ کلام رہا تھا اور کاروباری دنیا کے اس اصول کو وہ پوری دنیا کے کاروبار پر مسلط کر دینا چاہتے تھے۔

یہ درست ہے کہ سیٹھ جی نے اپنی دولت بیشتر ٹھیکوں میں اکٹھی کی تھی مگر انھوں نے ہمیشہ پہلے بیج بویا اور پھر فصل کاٹنے کی امید رکھی تھی اور بیج کے بونے اور زمین کے تیار کرنے میں انھیں کافی جدوجہد کرنا پڑی تھی۔ صاحب کو ڈالیاں دیں، بابو کی بیوی کو ساڑی اور جمعدار کے بیٹے کو پچھلی دیوالی پر رنگین جھنڈ دل دیا تھا۔ ان کے خیال میں بحث کا سب سے کمزور پہلو یہی تھا بیج ڈالا نہیں گیا اور فصل کی امید کی جا رہی تھی۔

"جناب صدر ان سے (اس کے ساتھ انھوں نے اپنا ہاتھ تقریر کرنے والے رکن کی جانب ایسے انداز سے بڑھایا جو بالکل غیر پارلیمانی تھا) یہ تو پوچھیے کہ یہ دیتے کیا ہیں جو یہ کچھ مانگتے ہیں، ہمارا کسان حکومت کو کیا دیتا ہے، ہمارا تیسرے درجہ کا مسافر ریلوے کو کیا ادا کرتا ہے۔ جناب صدر! ہمارے مالیہ کی ولایت کے مالیہ سے کیا نسبت ہے؟" اس جملہ کو ادا کرتے ہوئے ان کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور ان کا ہاتھ ابھی ہتھوڑے کی

مانند چل رہا تھا جو کسی تابوت میں آخری کیلیں ٹھونک رہا ہو) جناب صدر! اگر ہم حکومت کو کچھ دے نہیں رہے تو ہمیں کیا حق ہے کہ حکومت سے سب کچھ مانگیں میں مانتا ہوں کہ تعلیم عوام کا بنیادی حق ہے مگر یہ بتایا جائے کہ عوام اس حق کے لیے کیا مالی قربانی کر رہے ہیں؟"

سیٹھ جی کی تقریر کا ایوان پر کچھ ایسا اثر ہوا جیسے کسی تلیا کا بند ٹوٹ کر بہ نکلا ہو جمود کی فضا بدل سی گئی اور ایوان کے تاریک گوشوں میں سے بھی بعض ارکان آگے کو جھک آئے تھے۔ ان میں پنڈت جی بھی تھے پنڈت جی کے لیے یہ موضوع خاص دلچسپی کا باعث تھا۔ علم کے شجر ممنوعہ کو اس ملک میں برہمن نے خود تو اپنایا اور دوسروں کے لیے اسے مسموم قرار دے دیا۔ اور پھر خود اس کے برگ و بار حاصل کرنے کے لالچ میں اتنا ہلایا اتنا ہلایا کہ جڑیں تک ڈھیلی کر دیں اور ابد الآباد تک کے لیے اسے ایک سوکھا ٹھنٹھ بنا دیا۔ ہمارے پنڈت جی بھی اسی سوکھے ٹھنٹھ کی ایک اداس بلبل تھے۔ اسی ٹھنٹھ کی آبیاری کی تجویز نے ان کی برسوں کی مردہ طلاقت لسانی کو بیدار کر دیا۔

"جناب صدر! ہندوستان ہمیشہ سے علم و ہنر کا گہوارہ رہا ہے۔ اس سرزمین سے علم و ہنر کی کرنیں پھوٹیں اور ان سے ایک عالم جگمگا اٹھا۔ علم کا گرانبار نخل یہاں پھوٹا، پروان چڑھا اور برگ و بار لایا۔ اس کے سایہ میں عوام اور خواص دونوں نے فیضان حاصل کیا۔ اسی سرچشمہ سے ایک طرف مصر و اسکندریہ تو دوسری طرف چین و جاپان سیراب ہوئے۔"

"جناب صدر! اگرچہ آج ہماری تعلیمی حالت اس قدر پس ماندہ ہے لیکن میں دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ شاید اس ملک میں اس قیامت کی تاریکی پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔ اشوک کے زمانے کے کتبے اس حقیقت کے سچے اور بے زبان ترجمان ہیں کہ اُس وقت تعلیم کس قدر عام اور ہر دل عزیز تھی۔ اشوک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا زریں زمانہ ہے لیکن زریں کو چھوڑ کر اگر آپ کانسی اور پیتل کے زمانوں میں بھی دیکھیں تو ہم تعلیم کے معاملہ میں دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ پر اپنا سر فخر سے اونچا رکھ سکتے تھے۔ ابھی پچھلی صدی کے پہلے نصف میں ہی صرف بنگال میں ایک لاکھ مکتب تھے اور آبادی کے چار سو افراد کے لیے ایک مدرسہ تھا۔ جناب صدر! اگر آپ ہمارے صوبوں کے تعلیمی اعداد و شمار کا مقابلہ برما سے کریں تو آپ کو

تعجب انگیز انکشافات ہوں گے۔ آج بھی برما میں لکھے پڑھوں کی تعداد فی صدی ہمارے ہاں سے گنا ہے اور اس کا سہرا برما کے پرانے نظامِ تعلیم اور پھونگیوں کے سر ہے۔ رگ وید میں لکھا.........

پنڈت جی ابھی تقریر کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب اپنی جگہ سے دفعتاً اچھل پڑے اور کہنے لگے "پائنٹ آف آرڈر سر" اگر پنڈت جی یہی تقریر اس ایوان کی بجائے آثار قدیمہ کے کسی عجائب گھر میں کرتے تو شاید زیادہ حق بجانب ہوتے (فرمائشی قہقہہ) وہاں کے پرانے بت ان کے خیالات کی اصلی قدر کر سکتے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی زمانے کے بنے ہوئے ہیں جس کی رام کہانی پنڈت جی سنا رہے ہیں۔ کتبوں کی موجودگی سے تعلیم عامہ کا اندازہ لگا لینا میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیا پنڈت جی کی مراد یہ ہے کہ ہر کتبے کے نیچے ہزار ہا تعلیمی مردے گڑے ہیں۔ (مسلسل قہقہہ)

اتنے میں ایک دوسرے رکن نے دور سے پنڈت جی کو پرنام کیا "ہے شریمان! شما کیجئے کہاں ویدبانی کھول بیٹھے۔ یہاں ہریجن ارکان بھی تو بیٹھے ہیں"

اس آخری وار سے تو ان کی خود اعتمادی کا آبلہ سا پھوٹ نکلا۔

پنڈت کو مارے ندامت کے پسینہ چھوٹ گیا وہیں کے وہیں بیٹھ گئے اور چٹیا کھول کر آہستہ آہستہ سر سہلانے لگے۔

اس پر بائیں جانب کے ایک ممبر نے صدائے احتجاج بلند کی۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے آج ہندوستان کی فی صدی خواندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ فی صدی بہت کم ہے اور کم سے کم ہوتی جا رہی ہے جناب صدر! کیا کوئی متمدن سماج روح کی اس دردناک افلاس کو، اس ویرانی کو برداشت کر سکتی ہے جو ایک اچھی ابتدائی تعلیم کے فقدان سے پیدا ہوتی ہے۔ جناب صدر ایک قوم کی علمی اور ذہنی اٹھان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی جڑوں کو ابتدائی تعلیم کے جاں بخش سوتوں سے زندگی بخشی جائے اور ہمارے تقلیدی تعلیم کے نظریے ہمارا ثانوی اور اونچی تعلیم کے لئے شور و غوغا کرنا کیا معنی رکھتے ہیں، ہم ملک کی ذہنی زندگی پر ایک ہلکا سا نمائشی رنگ ایک اوپری سی پوت پھیر رہے ہیں مگر اس کے نیچے وہی حیات کی بے حسی، ذہنی کورذوقی۔ ہمارے ماہرین نے ہمارے لیے تقلیدی تعلیم کا سرمایہ بنایا۔ ان کے خیال میں وقت کی مصلحت یہی تھی کہ اونچے

طبقہ کو تعلیم دی جائے اور جب یہ طبقہ علم کے رس سے لبریز ہو جائے گا تو اس سے رس ٹپک ٹپک کر سب طبقوں کو سیراب کر دے گا۔ مگر جناب صدر! وقت نے بتا دیا کہ اونچے طبقہ میں کچھ نہ کچھ امربیل کی سی خاصیت تھی جس نے پودے درخت کا ست کھینچ لیا اور کھوکھلا خول چھوڑ دیا تقطیر کا نظر فریب فانوس ابتدائی تعلیم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اوپر کی سطح میں کلیاں بھی کھلیں شگوفے بھی پھوٹے۔ مگر زمین کی لاتعداد نچلی تہیں صحرا کی طرح ویران، پتھر کی طرح بے ثمر ہو گئیں، انہی نچلی تہوں کی آبیاری کا کام بعض ریاستوں نے نہایت کامیابی کے ساتھ شروع کیا ہے آج ٹرا ونکور میں مدرسہ جانے والے بچوں کی تعداد پچانوے فی صدی ہے آپ کو چین، ٹرا ونکور یا بڑودہ کی تعداد خواندگان کا مقابلہ....

ایک ممبر "پوائنٹ آف آرڈر سر" معزز رکن کے یہ الفاظ غیر متعلق ہیں۔ اس وقت ہمارا موضوع ہمارا اپنا ملک ہے ریاستیں خارج از بحث ہیں۔ جناب صدر! میں معزز رکن سے درخواست کروں گا کہ وہ بحث کو موضوع کی حدود میں رکھنے کی کوشش کریں۔"

مقرر نے دوبارہ اسی انداز بے نیازی سے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ گویا کارواں جا رہا ہو اور اس کے لوازمات بھونکتے چلے جاتے ہیں۔ تاہم اس ہلکے سے اٹکاؤ سے ان کی تقریر کا بہاؤ اور بھی چل نکلا اور اس میں ایک والہانہ شان خطابت اور گرمئ گفتار پیدا ہو گئی۔

"جناب صدر!" اب انھوں نے کچکچا کر مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بولنا شروع کیا گویا کسی چیز کا عرق کھینچنے کے بعد اس کا پلیتھن نکالنے کی فکر میں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس معاملہ میں اپنی ذمہ داری اپنے کندھوں پر سنبھالے اور طویلہ کی بلا بندر کے سر اور ایک دفتر کی بلا کسی دوسرے افسر کے سر نہ تھوپنے کی کوشش کرے ہماری ابتدائی تعلیم الف لیلہ کے اس کبڑے کی نعش کی طرح ہے جس کے گلے میں مچھلی کا کانٹا پھنسا تو درزی کے ہاں تھا لیکن اس کی نعش یہودی سوداگر اور کہاں کہاں ہوتی ہوئی بالآخر شاہی مودی کے ہاں پائی گئی ہم چاہتے ہیں کہ جن کے سر ابتدائی تعلیم کی نعش کی ذمہ داری ہے انھیں کے کندھوں پر اس کا جنازہ اٹھایا جائے ہم چاہتے ہیں کہ کوئی روایتی حجام روغن بلسان مل کر اس مردے کے حلق سے مچھلی کا کانٹا نکال دے اس مردہ پر اس قسم کے کامیاب اپریشن غیر ممالک میں کئے جا چکے ہیں، روس، ٹرکی اور جاپان.......

اس پر ایک ممبر آپے سے باہر ہو کر" پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات دوسرے ملکوں کا حوالہ!

جناب صدر! (ہمارے غصہ کے بیچ کے نیچے ہی نیچے آستینیں چڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں)

جناب صدر! پھر وہی دوسرے ملکوں کی بات!"

صدر۔ آرڈر! آرڈر!!

اب بحث کا وقت ختم ہونے کو تھا۔ صاحب صدر نے پہلے سے ہی اعلان کر دیا تھا کہ ایسے فروعی مسائل کے لیے غیر محدود وقت نہیں دیا جا سکتا۔

ایوان کا یہ دستور العمل اُن شاندار روایات کے خلاف تھا جس کی مثال خانگی ایوانات اکثر پیش کیا کرتے ہیں۔ ہم نے بھٹیاریوں کی لڑائیاں اکثر دیکھی ہیں جس میں دو پارٹیاں بعینہ اسی طرح دو مستقل محاذوں پر بھی ہوتی ہیں جیسے ایوان کا دایاں اور بایاں بازو۔ فرق محض اتنا ہے کہ آئینی ایوان میں صدر کا نشان امتیاز اس کا گرز ہوتا ہے اور نسوانی ایوان میں کالی ہنڈیا۔ نسوانی ایوان میں ہر مقررہ باری باری ایک دوسری کی جگہ لیتی ہے۔ اور عارضی التوا کی صورت میں ہنڈیا کو اُلٹ دیا جاتا ہے۔ لیکن اس ایوان کی ایک امتیازی شان ہے یعنی یہ ایوان زمان و مکان کی پابندیوں سے بالاتر ہے۔ یہاں کسی مسئلہ پر کہیں بھی کسی وقت کسی مدت کے لیے بحث جاری رکھی جا سکتی ہے۔ افسوس ہے کہ آئینی ایوان جو اِس پرانے جمہوری (واضح رہے کہ جمہوریت سب سے پہلے عورتوں میں آئی اور سب سے آخر میں جائے گی) ادارے کی ترقی یافتہ صورت ہے اس کی سب روایات کو اصلی حالت میں برقرار نہ رکھ سکا۔ اب جبکہ عورتوں کو حق رائے مل رہا ہے ہمیں امید ہے کہ آئینی ایوان کے آداب اور دستور العمل میں خوشگوار تبدیلیاں ہوتی چلی جائیں گی

ارسطو نے ڈراما کے نفسیاتی عمل کو جذباتی تنقیہ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح سیاسی ایوان کے عمل کو سیاسی تنقیہ کا نام دیا جا سکتا ہے کیونکہ آج کی بحث نے ارکان کے دلوں پر سے غبار سا دھو ڈالا تھا۔ محرک کے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی چمک تھی۔ ان کی نگاہوں میں کل کے اخباروں کی سرخیاں رقص کر رہی تھیں اور ان کے کانوں میں دوستوں کی مبارکبادیاں گونج رہی تھیں وہ ایسی بے ساختگی سے اپنی جگہ بیٹھے تھے جیسے کوئی بچہ اپنا رنگین کھلونا دوبارہ مل جانے کے بعد خوش ہوتا ہے۔ اب بحث کے اخیر میں

جو وہ جواب دینے اُٹھے ہیں تو ان کا گول گپا سا چہرہ ایک شگفتہ تبسم بنا ہوا تھا۔

"جناب صدر! میں آپ اور سب معزز اراکین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے نہایت صبر اور اطمینان سے میری تقریر سنی۔ اس بحث کے بعد میرے دل میں آنریبل منسٹر کی وقعت بہت بڑھ گئی ہے جس جرائت آفریں انداز میں انھوں نے مباحثہ میں حصہ لیا اور جن قیمتی خیالات سے ہمیں سرفراز فرمایا وہ تعلیم عوام کے لئے بڑے نیک شگون ہیں۔ ملک و ملت کی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس کی تعلیمی کشتی کا ناخدا ایسا مخلص اور حوصلہ مند انسان ہے، مبارک ہے وہ قوم جس کی تعلیمی قسمت ایسے محفوظ ہاتھوں میں سپرد کر دی گئی ہو۔ میں تعلیم عوام کا معاملہ بھی اسی محترم ہستی کو سونپتا ہوں اور اپنی تجویز شکریہ کے ساتھ واپس لیتا ہوں"

ان کی تقریر کے بعد جو تالیاں بجی ہیں تو انھیں یوں معلوم ہوا گویا ان پر گیندے کی پتیوں کی بوچھار پڑ رہی ہے۔ ان کا پورا جسم خوشبو سے بسی ہوئی رنگین لہروں میں ہلکورے لے رہا ہے۔ آنریبل منسٹر کی زبان سے تعریف کا ہر لفظ جو ان کی شان میں کہا گیا تھا ان کے دل میں یوں بیٹھ گیا جیسے کسی عنبریں تہ پر موتی جڑ دیئے گئے ہوں اور جب آخیر میں محرک نے ان کی خدمت میں عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں تو ان کے چہرے پر ایک سچے شیدائی کا خلوص اور نیازمندی تھی وہی اطمینان اور مذہبی عقیدت جو پرانے مصریوں کے چہرے پر ہوتی تھی جبکہ وہ سال کی حسین ترین دوشیزہ کو دریائے نیل کی نذر کرتے تھے اور اسے لہروں کے رحم پر چھوڑ دیتے تھے۔ یہ کوئی ایسی بہت بڑی بے اصولی نہ تھی۔ کیا ہم اپنے ایمان کو ایک ملّا کے ہاتھ، اپنی صحت کو ایک نیم حکیم کے پاس گروی نہیں رکھ دیتے۔ پھر محرک نے اپنی تجویز کو ایسے مبارک ہاتھوں میں سونپ دیا تو کیا برا کیا؟

عبدالغفور ایم اے

لکھنویت کیا ہے؟

(سلسلے کے لیے ۱۵ مئی سنہ ۱۹۴۲ء کا رسالہ ملاحظہ ہو)

شاعری اور صنعت گری، جذبات نگاری اور الفاظ کے کھیل کو باہم ملا کر لکھنوی شعرا نے ایک نیا رنگ پیدا کر دیا لیکن ہر رنگ میں نمایاں خصوصیت پھر بھی صنعت ہی کو ٹھیرایا گیا۔ رعایت لفظی یا ضلع جگت جو اول الذکر کی ایک مکروہ شکل تھی اسی کے باعث ظہور میں آئی۔ تشبیہ اور استعارے میں سادہ اور نیچرل تشبیہات کے بجائے تشبیہ در تشبیہ یا ہر تشبیہوں کے اجزا کی تحلیلی ترکیب پر توجہ کی گئی۔ چونکہ غزل کے اشعار میں مثنوی کی سی طوالت عموماً ناپسند کی جاتی تھی اس لیے ایک نئے انداز میں دوغزلے سہ غزلے چوغزلے لکھنے کا رواج ہوا۔ خیال آفرینی جو شعرائے ایران اور فارسی گو شعرائے ہندوستان میں سے بعض نے بطور فن اختیار کی تھی اور جسے شعرائے لکھنؤ کے دور سے پہلے کم لوگوں نے ریختہ گوئی کے مسلک میں داخل کیا تھا یہاں آ کر ایک مستقل خصوصیت بن گئی۔ یہ خیال آفرینی کبھی تو محسوس اشیا کے سلسلہ میں تخیل کے زور میں کی جاتی تھی اور کبھی محض وہمی اور تخیلی مسایل پر توجہ صرف ہوتی تھی۔ آخر الذکر میں کوہ کندن اور کاہ بر آوردن کی مثل بالکل صادق آئی۔ اور شاعری کی کوشش کے سامنے جب ان کے کمالات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو بڑی ناامیدی ہوتی ہے۔

صنعت گری کے ہی سلسلہ میں عربی فارسی کی تراکیب کی کثرت جسے ریختہ گو شعرا بالخصوص متقدمین نے بڑی کوشش سے رفتہ رفتہ زبان اُردو سے دور کیا تھا دوبارہ رواج پا گئی۔ اشعار کو مرصع کرنے کے لیے فارسی کی رقصاں ترکیبیں دل کھول کر استعمال کی جاتی تھیں ان کے استعمال کی ایک اور وجہ بھی تھی یعنی لکھنؤ اور دہلی کی حریفانہ چشمک۔ دہلی کے وہ شعرا، جو لکھنؤ میں شاعری کی بزم کے قیام کے وقت سخن گوئی میں مصروف تھے (میر و سودا وغیرہ) ہندی الفاظ، ہندی تراکیب، محاورات ضرب الامثال اور ہندی تخیلات کو بھی ریختہ کا جزو اہم سمجھتے تھے۔ میر کے کلام میں تو یہ خصوصیت

بہت ہی نمایاں ہو ان کے ہاں ہندی کے ایسے سبک اور نازک نگینے جڑے ہیں کہ ان کو بکمال کر فارسی کی میناکاری کی جائے تو سوائے بھدا پن پیدا ہو جانے کے اور کچھ امکان نہیں ہو. شعرائے لکھنو نے زبان میں تراش خراش کی آڑ سے کہ زبان پر جراحی کا وہ عمل کیا کہ ہندی کے عناصر بالکل مٹ گئے. جن الفاظ اور تراکیب کو شعرائے لکھنو ایجاد کیتے ہیں وہ ان کی لاعلمی پر دلیل ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کے لیے نہایت موزوں مترادفات دہلی والوں کی زبان میں موجود ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ان میں کون زیادہ فصیح اور بلیغ ہیں تو اس کا انحصار استعمال اور کثرت استعمال پر ہو. جس لفظ کو شعرائے لکھنو نے کوشش کر کے ترک کرنا چاہا وہ ترک ہو گیا. یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ زمانہ لکھنوی شاعری کے شباب کا تھا اور شعرائے لکھنو کی زبان کو لوگ مستند سمجھتے تھے. لکھنؤ میں دربار کی سرپرستی نے اسے اور بھی تقویت پہنچائی۔ دلی والوں کی سلطنت لٹ رہی تھی زبان کو سنبھالنے کا کسے ہوش تھا اور اگر ہوتا بھی تو دلی والوں میں اب وہ کون سی کشش باقی رہ گئی تھی جو دوسروں کو ان کی زبان، وضع قطع اور تراش کی طرف متوجہ کرتی. اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی شعرائے لکھنو کی اس کوشش میں معاون ہوئی عوام ہر جدید کو لذیذ سمجھتے ہیں یہی وجہ ہوئی کہ لکھنوی شاعری کا معیوب ترین رنگ اور اس کی مکروہ سی مکروہ صورت بھی ابتدا میں بے حد مقبول ہوئی، آخر ان ہی لکھنوی صحبتوں میں امانت کے ضلع جگت اور ان کے واسوخت کی داد ملتی تھی. یہی لوگ رنگین اور جان صاحب کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے. انہی کے ہاں ہرزہ گوئی کو مرثیہ گوئی کے پہلو بہ پہلو قابل تحسین و آفریں سمجھا گیا.

صنعت گری میں جس چیز نے زبان کی پگڑی اچھالی وہ معاملہ بندی ہو. اگرچہ معاملہ بندی کی ابتدا فارسی شاعری میں ہوئی تھی اور فارسی گو شعرا نے اسے بہ حیثیت ایک خاص فن کے بہت کچھ ترقی بخشی تھی تاہم اردو میں جرأت سے پہلے کسی نے اسے مستقل فن کی حیثیت سے اختیار نہیں کیا تھا. جرأت کے اس رنگ میں لکھنو کی مہذب سوسائٹی کے نقش ونگار رہیں جس کا نمونہ شعرائے لکھنؤ کے علاوہ سوائے حکیم مومن خان مومن کے اور کسی کے کلام میں نہیں ملتا. لیکن مومن کے ہاں بھی یہ رنگ اتنا شوخ اور بے باک نہیں کہ طبع سلیم اور مذاق لطیف پر گراں گزرے. ناسخ کا کلام بیشتر اور آتش کا کمتر اور عام

شعرائے لکھنؤ کا کلیتہً معاملہ بندی کا ایک ناپاک دفتر ہی۔ حالی نے خوب کہا ہو کہ سوسائٹی شاعری کے اثر سے اتنی خراب نہیں ہوتی جتنی خراب سوسائٹی شاعری کو خراب کر دیتی ہی۔

مے کہ بدنام کند اہل خرد را غلط است　　　بلکہ مے می شود از صحبت ناداں بدنام

یہ لکھنؤ کی معاشرت اور وہاں کی زندگی کا عام پسند رنگ تھا جو شاعروں کے کلام میں جھلک گیا ہو اور جس کی داد علانیہ مجلسوں میں ان شاعروں کو ملا کرتی تھی، صنعت گری کی ان تمام صورتوں کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں

رعایت لفظی :-

یاد دُرِ دنداں میں مری جان گئی زند　　　تقدیر نے کشتہ کیا ہیرے کی کنی کا

وصل کی شب پلنگ کے اوپر　　　مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں۔

کہیں جو میٹھی نظروں سے وہ دیکھے　　　کہوں آنکھوں کو میں بادام شیریں

بیٹھے تکیہ بھی لگا کر نہ کبھی اس دن سے　　　ہم فقیروں نے لیا جب سے سہارا تیرا

نہ دکھلایا کسی دن بوند بھر پانی پسینے نے　　　ترا چاہِ ذقن اے جان جاں اندھا کنواں نکلا

ساری رگیں ہوئی ہیں تن زار پر نمود　　　بے طاقتی نے جسم کو مسطر بنا دیا

پڑی جان اڑنے لگا میرے عیسیٰ　　　روئی کا جو تو نے کبوتر بنایا

منھ کو آنچل سے چھپاتے جو تم اگر شب وصل　　　جلوۂ حسن چراغ تہہ داماں ہوتا

دیکھے قریب چشم جو گیسوئے مشکبار　　　تشبیہ دی کہ ہیں یہ غزال ختن کے پاؤں

نہ پیسیں اسے گردش آسماں　　　کہ ہر استخواں کا رواں ہو گیا

معطر اس کے نہانے سے بسکہ آب ہوا　　　حباب بحر ہر ایک شیشۂ گلاب ہوا

دل دیکھ اسے کس کا تماشا نہیں لیتا　　　پر چشم سیاہ کا یہ بادام نہیں بستا

کر خط سے بوسہ لب شیریں دلا نہ ترک　　　قند و نبات میں نہیں ہوتا ہو بال کیا

قبر کے اوپر لگایا نیم کا اس نے درخت　　　بعد مرنے کے مری توقیر آدھی رہ گئی

مرغ جاں کو توڑے گی بلی ترے دروازہ کی　　　رخت تن کو کاٹے گا چوہا تمھاری ناک کا

ہندو پسر کے عشق کا کشتہ ہی باغباں ــــ لالا کا پھول رکھنا اما نت کی گور پر

معاملہ بندی:۔

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں ــــ غل مچایا اس نے دوڑو چور ہی
ڈوپٹے کو آگے سے دوہرا نہ اوڑھو ــــ نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل
مستی میں میں لگا ہی چکا تھا اسے گلے ــــ ہکا جو پاؤں ہاتھ کمر سے نکل گیا
کھیلتا ہی وہ کبڈی میں بھی کھیلوں جان پر ــــ ہاتھ رکھ دوں جی میں ہی قاتل کی ننگی ران پر
منھ پہ منھ رکھا تو بولے کیا خوب ــــ پہلے منھ اپنا تو بنوائیے آپ
انگڑائیاں جو لیں مرے اس تنگ پوش نے ــــ چولی نکل گئی کبھی شانہ مسک گیا
زبردستی لیا بوسہ جو اس کا وصل کی شب میں ــــ بہت جھگڑا بہت بگڑا بہت جھنکا بہت پٹکا
جان جاں یاد ہی بوسے کیلیے وصل کی شب ــــ منتیں کرنا مرا منھ کو چھپانا تیرا

تشبیہ، استعارہ و تشبیہات میں شعرائے لکھنؤ نے بیشک اچھا اضافہ کیا ہی۔ راقم السطور کا دعویٰ ہی کہ صرف حضرت محسن کاکوری کے پاک نعتیہ کلام میں اس قدر تشبیہات اور اتنی پرکیف اور رقصاں ہیں کہ اردو شاعری کے پورے دفتر میں ان کا جواب نہیں۔ انیس کے ہاں بھی تشبیہات کا کمال موجود ہی اور بلاشبہ ان کی تشبیہیں نہایت فصیح اور سلیس ہیں۔ مرزا دبیر کی تشبیہات میں عالمانہ رنگ ہی لیکن وہ بھی بے مزہ نہیں البتہ لکھنو کے بعض اور شاعروں نے تشبیہات میں بھی کہیں کہیں رکاکت پیدا کر دی ہی لیکن لکھنوی شاعری کے اماموں نے جن میں مذکورالصدر حضرات کے علاوہ نسیم صاحبِ مثنوی کا نام بھی شامل کرنا چاہیے اس میدان کو بہت وسیع کر دیا ہی۔ حضرات دہلی کے یہاں اس قدر تشبیہات کا رواج نہیں ہی اور جو ہیں بھی وہ بہت سادہ اور نیچرل میر کے پورے کلام سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہی۔ اس لیے اس کی مثالوں کو نظرانداز کیا جاتا ہی۔ لکھنوی حضرات کی تشبیہات ملاحظہ ہوں:۔

محسن کاکوروی:۔ سبزہ ہی کنار آب جو پر ــــ یا خضر ہی مستعد وضو پر
نوبت ہی صدائے قمریاں کی ــــ تیاری ہی باغ میں اذاں کی

موبکبیر فاختہ ہی — قدقامت سرو دلربا ہی
اک شاخ رکوع میں رکی ہی — اور دوسری سجدہ میں جھکی ہی
سوسن کی زبان پر مناجات — جاری لب جو سے التحیات
غنچے میں ہی خامشی کا عالم — یا صوم سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر ایک اعتکاف میں ہی — اور آب رواں طواف میں ہی
سالک ہی چمن میں نہر موزوں — مجذوب ہی شاخ بید مجنوں
ہی صوفی صاف دل صنوبر — تحریک نسیم حالت آور
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہی بھبوت — یا کہ بیراگی ہی پربت پہ بچھائے کمل
لہریں لیتا ہی جو بجلی کے مقابل سبزہ — چرخ پہ بادلا پھیلا ہی زمیں پر مخمل
جس طرف دیکھئے بیلے کی کھلی ہیں کلیاں — لوگ کہتے ہیں کہ کرتے ہیں فرنگی کونسل

اب انیس کی بعض تشبیہات ملاحظہ ہوں۔

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے — جیسے کرن نکلتی ہی گرد آفتاب کے
کہتی تھی یہ زرہ بدن بدخصال میں — پکڑا ہی بیل مست کو لوہے کے جال میں

ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے

برچھیوں کے باہم ٹکرانے کی کیسی نادر تشبیہ ہے

تلوار کی تعریف۔

جوشن کو کاٹ جاتی تھی یوں آکے اوج سے
ہیرا اک جس طرح نکل آتا ہی موج سے
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
غل تھا کہ اژدہا ہی نکالے ہوئے زباں

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

ع لہراتی ہو گیا نہر مثال شکم مار

مصحفی کے یہاں ایک نہایت نادر تشبیہ ہو

جو پھر کے منہ کو اس نے نقشہ نقاب الٹا　　اِدھر آسمان اُلٹا اُدھر آفتاب اُلٹا

حق ہو کہ شعرائے دہلی کبھی ایسی زور دار تشبیہیں پیش نہ کر سکے. ہاتھی کی تعریف میں مرزا داغ فرماتے ہیں

فلک آسادہ ترا فیل کہ جس کے آگے　　ریزۂ سنگ دخزف سے ہیں سبک کوہ ودمن

چلتے چلتے جو ٹھہر جائے، پڑے بوجھ ایسا　　ماہی زیر زمیں کا بھی تو دھس جائے شکم

ایک اور لکھنوی شاعر کا شعر ہو

عرق آلودہ گردن زیر کاکل یوں دمکتی ہو　　اندھیری رات ہو برسات ہو بجلی چمکتی ہو

خیال کے دو شعر ہیں۔

افشاں جبیں پہ دوش پہ کاکل چھٹے ہوئے　　طرفہ چراغ چلتے ہیں کالوں کے سامنے

ساقی کی مست آنکھ پہ دل لوٹ جاتے ہیں　　شیشے جھکے ہوئے ہیں پیالوں کے سامنے

اچھے صاحب ذاخر کا ایک شعر ہو۔

لحد پر مہوشوں کے پا کا مجمع　　ستارے ٹوٹے پڑتے ہیں زمیں پر

مثالیں جس قدر درکار ہوں مل سکتی ہیں طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کیجئے۔

یہ چیزیں تو صنعت گری سے متعلق ہیں۔ اب لکھنویت کا خاص رنگ یعنی خارجی شاعری ملاحظہ ہو۔ متقدمین شعراء نے اپنے کلام کی بنیاد واقعات اور جذبات پر رکھی تھی اور چنانچہ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ مضمون کی خوبی کو بھی شعر کا جزو ضروری قرار دیا تھا۔ لکھنؤ والوں نے ضد میں بالکل ایک دوسرا رنگ ایجاد کیا یعنی حسن اور اس کی کیفیات سے قطع نظر کر کے محض خارجی متعلقات حسن پر اپنی تمام توجہ صرف کی۔ صرف ناسخ کے کلام سے بعض جستہ جستہ مثالیں پیش ہیں۔ یہ صرف مشتے نمونہ از خروارے ہیں اور شاعروں کے کلام کا جائزہ لیجیے تو یہ دفتر شاید ہی تمام ہو۔

بالے کے موتی میں تارے روئے تاباں آفتاب ۔۔۔ تیرے آنے سے ابھی بام آسماں ہو جائے گا

اس نے جو پوچھا پسینہ روئے عالمتاب کا ۔۔۔ بن گیا رومال گو نہ چادر مہتاب کا

لکھوں کیا حال میں دیا نہ اپنی ناتوانی کا ۔۔۔ ہوا طوق گراں گردن میں وہ چھلا نشانی کا

دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقے سے ۔۔۔ تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کامدانی کا

بندے کانوں میں نہیں تعویذ بازو میں نہیں ۔۔۔ وہ ستارہ صبح کا ہے یہ ستارہ شام کا

کس قدر صاف ہے تمہارا پیٹ ۔۔۔ صاف آئینہ سا ہے سارا پیٹ

پہنے کرتی اگر وہ جالی کی ۔۔۔ کرے ہر حلقہ کو ستارا پیٹ

نقرئی پیٹے کا تو نے نہیں ڈالا ہو باف ۔۔۔ ہے سیہ سارا بدن اور دم مار سفید

گنگری ہے گلے میں کافر کے ۔۔۔ دیکھیے جب ہے تان ہونٹوں پر

پہنے وہ صنم جو پیرہن زرد ۔۔۔ ہو جائے سفید یاسمین زرد

دیکھی جو قبا تری بسنتی ۔۔۔ پھاڑا گیندے نے پیرہن زرد

رنگ پاں سے سبز سونا بن گئے کندن سے گال

مبتذل تشبیہ ہے سونے پہ مینا ہو گیا

بوسے لیتی ہے ترے بالے کی مچھلی اے صنم ۔۔۔ ہے ہمارے دل میں عالم ماہی بے آب کا

چھوٹے گی کان کی مچھلی نہ زلف جاناں سے ۔۔۔ یہ ہے محال کہ بچ چھوڑے مار مچھلی کا

آتش رنگ حنا سے شمع ہیں سب انگلیاں ۔۔۔ دست جاناں میں مرا مکتوب پروانہ ہوا

ساق سیمیں کی محبت ہے ہمارے دم کے ساتھ ۔۔۔ اے پری تار نفس بھی تار سیمیں ہو گیا

اگر اس شاعری کے ساتھ ہزل گوئی اور ریختی کو بھی شامل کر لیں تو لکھنوی شاعری کا چہرہ اپنے مکمل خدوخال کے ساتھ نظر آنے لگتا ہے ان دونوں کی مثالیں بکثرت ہیں لیکن ہمارے اور آپ کے معیار شرافت و متانت سے اس درجہ گری ہوئی ہیں کہ ان کا اعادہ ناگوار ہے جرأت انشا رنگین اور ان کے نامور شاگرد اس حمام میں آکر سب کے سب ننگے ہو گئے۔

اس سے یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے علاوہ لکھنؤ کی شاعری نے اور کوئی صاحب فن پیدا نہیں کیا۔ پیدا ہوئے لیکن ایسے لوگوں کی تعداد ایسے چند نخلستانوں کی طرح ہے جو ایک ناپیداکنار ریگستان میں کبھی کبھی نظر آجاتے ہیں۔ محسن کاکوروی اور انیس اس قبیل کی درخشاں مثالیں ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام سے ردعمل کر کے لکھنویت کے اس سیلاب کو روکا اور آج لکھنؤ والے جو خود اپنے بچپن کی اس شبیہ کو دیکھ کر شرمندہ ہوتے ہیں وہ ان ہی بزرگوں کا اثر ہے البتہ اس کا اعتراف کرنا ضرور ہے کہ لکھنؤ نے زبان کی حک و اصلاح کے علاوہ بعض اصناف میں ترقی کی، مرثیہ گوئی، مثنوی گوئی اور ڈرامہ نگاری ان میں خاص طور پر قابل ذکر ہے ان کا بیان کسی دوسری صحبت پر منحصر ہے۔

ابواللیث صدیقی ایم۔اے

علامہ اقبال کا فلسفہ

جوہر۔ آئیے باقی صاحب مزاج عالی، میں ماہ نومبر کے جامعہ میں اپنے مضمون پر آپ کی تنقید دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

باقی۔ شکریہ لیکن یہ فرمائیے کہ آپ کو اس تنقید سے اتفاق ہے یا اختلاف ؟

جوہر۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو اختلاف ہے اور اگر ناراض ہوں تو اتفاق۔

باقی۔ آپ نے بھی کمال کیا اختلاف تو اتفاق کی منزل پر پہنچنے کے لیے ایک زینہ ہے۔ جوہر صاحب آپ کے مضمون سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ علامہ کے کلام کی جراحی کر کے ان کی نثری تحریروں سے کلام کا منتشر تقابل کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے پیام کا تعین کر سکیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اردو شعر و ادب سے یہ خام طریقۂ تنقید دور نہ ہو سکا۔

جوہر۔ باقی صاحب! میں نے مضمون میں اقبال کے فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سعی میں ان کی شاعری سے بھی مدد لی ہے اقبال کی شاعری پر کسی تنقید یا تقابل کا خیال میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا اور یہ امر مضمون سے واضح ہے۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ۔۔۔ کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

مرے ہمصفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے ۔۔۔ انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

باقی صاحب! واقعہ یہ ہے کہ اقبال پہلے فلسفی ہیں اور بعد میں شاعر۔ چونکہ ایشیائی طبائع شعر سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لیے اُس نے اپنے فلسفہ کو شعر میں پیش کیا ہے اقبال کے فلسفہ حیات کی بنیاد قرآن حکیم پر ہے اور انھیں احکامات کی روشنی میں علامہ کا پیام عمل ہے۔ یہ آپ نے بھی مانا ہے کہ علامہ کا کلام تعلیمات قرآنی سے دور نہیں ہے وہ بانگ درا کے دور میں تلاش و جستجو کا شکار تھے ان کے دل میں سوالات کا ہجوم تھا۔ پیام مشرق میں وہ ان کا حل سوچتے ہیں اور اس کو مغرب کے سامنے

پیش کرتے ہیں اور جاوید نامہ میں یہ مسائل بڑی حد تک حل ہو جاتے ہیں تعجب ہو کہ آپ اس قدر اعتراف کے بعد فرماتے ہیں کہ شاعر اقبال فلسفی نہیں۔ آپ کی یہ بھی رائے ہو کہ فلسفی اور شاعر ایک دوسرے سے نہیں مل سکتے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ اقبال کو صرف شاعر خیال کرتے ہیں تو مندرجہ بالا خیال اس کی تردید کرتا ہو۔ آپ کے نزدیک تو سوال کرنا، جستجو کرنا، مسائل کا حل کرنا اور ان کا اعلان کرنا شاعر کا کام ہی نہیں اقبال چونکہ بقول آپ کے ایسا کرتا ہو اور صرف جذبات و احساسات سے نہیں کھیلتا تو آپ کے استدلال کے بموجب اس کو شاعر ہی نہیں کہا جا سکتا ہو اور اگر اس کو فلسفی مان لیں تو وہ (آپ کے نظریہ کے بموجب) شاعر نہیں ہو سکتا۔ اگر اس ارشاد سے آپ کا یہ مطلب ہو کہ اقبال شاعر اور اقبال فلسفی دو الگ الگ چیزیں ہیں تو میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں اس سلسلہ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اپنے مضمون میں اقبال فلسفی کی جو بحث کی تھی لیکن میری اپنی یہ رائے ہو کہ علامہ کا مقصد فکر شاعری نہیں بلکہ فلسفہ کا درس ہو وہ فلسفی شاعر ہو اس لیے آپ کے مجوزہ اصول تنقید جو صرف جمالیاتی و جذباتی شاعر کو پرکھنے کے لیے شاید کافی ہو سکتے ہوں اقبال پر تنقید کرنے کے لیے ناکافی ہیں۔

باقی۔ کیا آپ کو ان تین اصولوں سے بھی اختلاف ہو۔ جوہر صاحب وہ تو بدیہیات میں سے ہیں۔

جوہر۔ باقی صاحب! یہ بدیہیات ہو سکتے ہیں لیکن علامہ نے ادب کی تنقید کے جو اصول مقرر کئے ہیں وہ آپ کے مجوزہ اصولوں سے بالکل مختلف ہیں اس اختلاف کی یہ وجہ ہو کہ آپ کے نزدیک شاعر فلسفی نہیں ہوتا اور اقبال کے نزدیک وہ شاعر جو فلسفی نہیں یا جس کا کوئی خاص پیام نہیں وہ ایک بدبودار رنگین پھول کی مانند ہو۔ میرا خیال ہو کہ اقبال کے کلام کو اقبال کے مجوزہ اصولوں پر پرکھنا چاہیے۔ اقبال کے متعین کردہ تنقیدی اصول پر غور کرنے سے یہ روشن ہو جاتا ہو کہ علامہ اقبال ادب کی تنقید کے لیے اس امر کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ادیب کی وجدانی دنیا کی تعمیر میں کس قسم کے تخیلات سے کام لیا گیا ہو۔ وہ ادیب کی طرز تحریر اور طرز ادا کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ تخیل کی بلندی اور فکر کی گہرائی پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ نے جذباتی نظریہ کو بیان کرتے ہوئے بہت سادگی سے

یہ تحریر کر دیا ہو کہ شاعر وہ ہو جو زندگی کی چند صداقتوں کو شدت احساس کے ساتھ نمایاں کرتا ہو۔ یہاں
یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ وہ صداقتیں کیا ہیں۔ یہیں سے فلسفہ کی حد شروع ہو جاتی ہو یعنی اول تو شاعر کا
یہ فرض ہوا کہ وہ صداقت سے روشناس ہو پھر اس کا اظہار شدت احساس سے کرے یعنی پہلے شاعر
کو فلسفی ہونا چاہیے پھر شاعر۔ اقبال خود اسلامی تخیل کو شعر کی زبان میں پیش کرتا ہو اور اسلام کے ہر پہلو
پر انہاک علمی انفرادیت کے ساتھ غور کرتا ہے۔ اقبال موجودہ زمانہ کے رجحانات سے رد و قدح
کر کے اسلامی نظام فکر کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ اس نظام فکر میں معقولیت، مرکزیت، ارادہ اور
شعور پورے طور پر جاگزیں ہو۔

باقی۔ تو کیا آپ کی رائے میں ایک جذباتی انسان جو شعور منطق ادراک اور احتیاط کی سرحدوں کو توڑ کر دنیائے
تخیل میں اپنی وجدانی دنیا آپ بنا لیتا ہو شاعر نہیں۔ جوہر صاحب! شاعر وہ ہو جو بعض صداقتوں کو
شدت احساس کے ساتھ نمایاں کر کے اس طرح پیش کرے کہ وہ دوسروں کے احساسات کو ابھا
سکیں۔

جوہر۔ باقی صاحب: یہ بھی ایک نظریہ ہو سکتا ہو لیکن دیکھنا یہ ہو کہ کیا علامہ بھی آپ کے جمالیاتی اور جذباتی
نظریہ سے متفق تھے۔ حقیقت نگار کو جمالیاتی اور جذباتی نظریہ کے مطابق پرکھنا اس کے کلام کی
اہمیت کو گرانا ہو۔ اب میں آپ کے سامنے اقبال کا کلام پیش کیے دیتا ہوں جس سے یہ صاف
ہو جائے گا کہ ادب کو پرکھنے کے لیے علامہ نے آپ کے اصولوں سے مختلف اصول بیان کیے
اور شعر و شاعری کے متعلق ان کا اپنا تصور آپ کے تخیل سے بالکل جدا ہو۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر	گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات	نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہو زیر فلک امتوں کی رسوائی	خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

شعر کو خودی کی حفاظت کرنی چاہیے ورنہ جذباتی گورکھ دھندہ رہ جاتا ہو۔ جمالیاتی ادب فسون و
افسانہ ہو کیونکہ وہ خودی کو کند کرتا ہو لیکن دقت یہ ہو کہ اگر اس تخیل کو مان لیا جائے تو اردو ادب

کا ایک کثیر حصہ حدود ادب سے خارج ہو جاتا ہے۔ والٹیر کہا کرتا تھا "جو باتیں اتنی ناپاک ہوتی ہیں کہ ان کو نثر میں بیان کرنا شرمناک معلوم ہوتا ہے ان کو شعر کی شکل میں گا کر بیان کیا جاتا ہے" والٹیر کا یہ قول ہماری جذباتی شاعری پر پوری طرح عاید ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ملوان دونوں ہم سے اک رات جانی — کہاں ہم کہاں تم کہاں پھر جوانی (میر)
لیتے تھے لب کے بوسے ہم دیتے تھے منھ میں وہ زباں — ہائے تھے کامیاب عیش دونوں بہم کہ ناگہاں
صبح دمید شب گزشت ماہ شبینہ خانہ رفت — روئے سحر سیاہ کنیم یارب ایں بہانہ رفت (مومن)

یہ سب اشعار شدت احساس سے احساس کو ابھارنے کے لیے لکھے گئے ہیں لیکن اقبال کے نزدیک نہ یہ شعر ہیں اور نہ ان لمحات میں جبکہ ان بزرگوں نے یہ شعر کہے ان کو شاعر کہنا مناسب ہے۔ کہاں ہمارے پرانے شاعروں یہ عصمت سوز جالیاتی کلام اور کہاں اقبال کا یہ نظریہ۔

اے کہ ہے زیر فلک مثل شرر تیری نمود — کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقامات وجود
گر ہنر میں نہیں تعمیر خودی کا جوہر — وائے صورت گری و شاعری و نائے سرود
مکتب و مے کدہ جز درس نبودن ندہند — بودن آموز کہ ہم باشی و ہم خواہی بود

جس شاعری سے تعمیر خودی نہ ہو اس پر اقبال آنسو بہاتے ہیں اور باقی صاحب آپ کی جالیاتی شاعری اسی قابل ہے کہ اس پر نوحہ کیا جائے۔ ہماری شاعری زوال کے زمانے کی شاعری ہے اور شاید اسی قسم کی جالیاتی اور جذباتی شاعری کو سراہنے کے لیے آپ کے بیان کردہ اصول وجود میں لائے گئے ان شاعروں اور ان کی شاعری کے سراہنے والوں کی بابت علامہ فرماتے ہیں ؎

آہ! وہ کافر بے چارہ کہ ہیں اس کے صنم — عصر رفتہ کے وہی ٹوٹے ہوئے لات ومنات
تو ہے میت! یہ ہنر تیرے جنازے کا امام — نظر آئی جسے مرقد کے شبستاں میں حیات

ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

دیکھئے باقی صاحب اقبال کے نزدیک شاعر وہ ہی جو حقیقت کو سمجھے اور حقیقت جذباتی طریقہ پر سمجھ میں نہیں آسکتی اس کی بابت علامہ نے اپنے خطبات میں اشارہ کیا ہی۔ اگلے شعر میں علامہ فرماتے ہیں ؎

مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہی — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اگر شاعر کی نوا خودی کو نہ اُبھارے تو وہ شاعری بیکار ہی۔ ہنر کا مقصد سماجی زندگی کی تشکیل کرنا ہی جس ہنر میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور جو زلف و کاکل کے جمالیات اور بوس و کنار کے جذبات سے آگے نہ بڑھے وہ ہنر نہیں بلکہ بے ہنری ہی۔ باقی صاحب آپ کچھ اُکتا سے گئے۔

باقی۔ نہیں نہیں آپ فرمائیے میں سن رہا ہوں مفصل جواب دوں گا۔

جوہر۔ باقی صاحب! میں اس مسئلہ کو اس لیے زیادہ وضاحت سے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ میرے چند عزیز دوستوں نے بھی میرا مضمون دیکھ کر یہی فرمایا کہ اقبال تو شاعر ہی اس کی فلسفیانہ نقطہ نظر سے تنقید بے معنی ہی اس سے مجھے یہ شبہ پیدا ہو گیا ہی کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں عام طور پر یہی خیال ذہن نشیں ہو گیا ہی۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ خود علامہ کے کلام سے نوجوانوں کے اس خیال کی تردید کر دوں۔ اقبال جمالیاتی و جذباتی شاعر نہیں ہے بلکہ فلسفی ہی جو حقیقت کو سمجھتا اور سمجھانا چاہتا ہی شاعر کے عنوان سے ضربِ کلیم میں علامہ فرماتے ہیں۔

مشرق کی نیستاں میں ہی محتاجِ نفس نَے — شاعر ترے سینے میں نفس ہی کہ نہیں ہے
تاثیرِ غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم — اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی نَے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو — شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے — بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

جو قوم غلامی میں جکڑی ہوئی ہو اس کے لیے جمالیاتی شاعری سم قاتل ہی جس طرح اگر گھر میں چوہے

قلابازیاں کھائیں تو سکین کو ناچ و رنگ دیکھنا تباہی کو دعوت دیتا ہے اسی طرح غلامی میں جمالیات کی طرف جانا بربادی ہے۔ اقبال شاعر کو حقیقت سے معرکہ آرا دیکھنا چاہتا ہے جمال سے مبہوت نہیں دیکھنا چاہتا ہماری شاعری کی بابت کہتا ہے۔

ہے شعرِ عجم گرچہ طربناک و دلاویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیرِ خودی تیز

افسردہ اگر اس کی نوا سے ہو گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغِ سحر خیز

اقبال یہ ہے خارا تراشی کا زمانہ — از ہرچہ بآئینہ نمایند بہ پرہیز

شاعر اگر حقیقت آشنا نہیں ہے اور وہ اپنے کلام سے خودی کو نہیں ابھار سکتا تو اس کو خاموش رہنا چاہئے ایک دوسری جگہ ہنروران ہند کے عنوان سے فرماتے ہیں۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری ان کے صنم خانوں میں — زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

باقی صاحب یہ ہے آپ کے جمالیاتی ادیبوں کی حقیقت علامہ کی نظر میں جسے آپ اپنی جمالیاتی عینک سے دیکھنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ دراصل جذبات و احساسات بھی کسی فلسفہ اور زندگی کے مطابق ہوتے ہیں شاعر پہلے فلسفی ہوتا ہے پھر اس فلسفہ کی روشنی میں خاص قسم کے جذبات و احساسات کو ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اقبال فلسفی شاعر ہے جو اسلام کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام ایک خاص قسم کی سماجی زندگی کا مویدہے۔ اس زندگی کی تشکیل کے لیے ایک خاص لائحہ عمل پر چلنا ضروری ہے۔ اقبال اس زندگی اس لائحہ عمل اور اس نصب العین کی طرف برابر دعوت دے رہا ہے جو کچھ علامہ نے نظم میں کہا ہے وہی نثر میں کہا ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ آپ مجھے یہ حق ضرور دیں گے کہ میں علامہ کی نظم کو ان کی تحریر کردہ نثر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کروں اور شعرا کی طرح اقبال کا مسلک یہ نہیں کہ قافیہ اور ردیف نے جو خیال دل میں پیدا کیا اس کو پرشوکت اور دلگداز الفاظ میں باندھ دیا بلکہ وہ قافیہ و ردیف کو فلسفہ

کے تابع رکھتا ہو قافیہ ردیف کی خاطر اپنے خاص پیغام سے ایک انچ ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتا باقی صاحب! آپ کے تینوں بدیہیات علامہ کے بدیہیات سے مختلف ہیں علامہ کے کلام پر تنقید آپ کے زاویہ نگاہ کے مطابق نہیں کی جا سکتی اور اگر آپ ایسا کریں گے تو اس کے پیغام کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ جمالیاتی اور جذباتی شاعری کی بھی سماجی زندگی میں جگہ ہو لیکن ناچ و رنگ کی طرح شام کو ایک آدھ گھنٹہ ہی اس کو دیا جا سکتا ہو اور بس۔

باقی۔ جوہر صاحب! بڑی دقت یہ آگئی کہ آپ شعر کی جادوگری کو نہیں سمجھتے۔ دراصل جو خیالات نثر میں معمولی طور پر بیان کیے جاتے ہیں وہ جب شعر بن کر جلوہ گر ہوتے ہیں تو ان میں اتنی رنگ آمیزی، وسعت اور اثر پیدا ہو جاتا ہو کہ وہ کوئی دوسری شئی ہو جاتے ہیں۔

جوہر۔ باقی صاحب! شعر اور نثر کے طریقہ بیان میں فرق ہوتا ہو لیکن اتنا نہیں کہ نثر میں اگر الحاد کی تبلیغ کی جا رہی ہو تو جب اس خیال کو نظم کریں تو وہ خدا کے وجود و وحدانیت کا ذکر معلوم ہوگا۔ مثنوی اسرار و رموز تو آپ کی نظر سے گزری ہو گی اس میں تمام تر علامہ کا وہی فلسفہ ہو جو انہوں نے اپنے مقالوں میں بیان کیا ہو۔ مثنوی کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ در بیان ایں کہ اصل نظام عالم از خودی است و تسلسل حیات تعیناتِ وجود بر استحکام خودی انحصار دارد۔

۲۔ در بیان ایں کہ حیات خودی از تخلیق و تولید مقاصد است۔

۳۔ در بیان اینکہ خودی از عشق و محبت استحکام پذیرد۔

۴۔ در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ۔

ساری مثنوی میں اسی قسم کے مطالب کا اظہار کیا گیا ہو۔ شاید آپ یہ فرما دیں کہ یہ مثنوی ہے۔ ضرب کلیم کو لیجئے اس کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں۔

اجتہاد۔ تقدیر۔ توحید۔ جہاد۔ قوت اور دین۔ فلسفہ۔ نکتہ توحید۔ خودی کی تربیت۔ خودی کی زندگی عقل و دل تسلیم و رضا۔ مرگ خودی۔ آزادئ نسواں۔ وجود۔ دین و ہنر۔ اشتراکیت۔ انقلاب وغیرہ

یہ وہی باتیں ہیں جن کو علامہ نے نہایت جامع طور پر اپنے خطبوں میں بیان کیا ہے کیونکہ نثر میں خیالات کا اظہار آزادی کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لیے علامہ کے کلام کو ان کے خطبوں کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔ شعر میں استعارات، تشبیہات حسنِ ادا وغیرہ اتنی جاذب توجہ چیزیں ہوتی ہیں کہ نفس مضمون کی طرف توجہ مشکل ہی سے جاتی ہے لیکن نثر میں تمام تر توجہ نفس مضمون کی طرف رہتی ہے۔ اس لیے مطالب سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ میری رائے میں جو صاحب اقبال کا مطالعہ کرنا چاہیں ان کو علامہ کے خطبے پڑھنے چاہییں اور ان پر پوری طرح حاوی ہونے کے بعد اس کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

باقی۔ اچھا ان امور کو چھوڑیئے ان کا جواب میں مفصل دوں گا۔ اب یہ فرمایئے کہ علامہ کا فلسفہ کیا تھا۔

جوہر۔ یہ اب دوسری صحبت کے لیے اٹھا رکھیئے لیکن باقی صاحب! یہ عرض کر دوں کہ آپ نے اقبال کے فلسفہ کی تحلیل جس طرح کی ہے مجھے اس سے اختلاف ہے۔

باقی۔ اچھا تو رخصت کیونکہ کافی رات چلی گئی اور اگر یہ گفتگو چھڑ گئی تو طویل ہو گی۔ اچھا شب بخیر۔

جوہر۔ خدا حافظ!

ایم۔ ایم جوہر میرٹھی

مومن کی غزل گوئی

مومن[1] بہت سی باتوں میں اپنے ماحول سے الگ ہیں۔ کہیں تو اسی پر ترقی کی ہے اور کہیں اپنی انفرادیت الگ قائم کرلی ہے۔ پہلی بات تو ان کا اپنا غزل کا نظریہ ہے۔ ان کے نزدیک غزل کو محض لغوی معنوں میں برتنا چاہیئے اور اس طرح غزل کو انہیں مضامین پر محدود کر دینا چاہیئے جو عشق و عاشقی خصوصاً معاملہ بندی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس اصول کو جو غالباً ان کی عربی تعلیم کا نتیجہ تھا مومن خاں نے اپنے کلام میں سختی سے برتا اور آخر تک بڑے استقلال سے برقرار و قایم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہم کو وحدت الوجود، ہمہ اوست یا ہمہ از دوست کے مسئلے نہیں ملتے۔ تصوف کی خیالی بلندیوں پر چڑھنا نہیں ہوتا اور فلسفہ کی پر پیچ دقت سے ہم معاف رکھے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں محض عشق و عاشقی ہے، معاملہ بندی اور معشوق سے باتیں ہیں اور معشوق بھی اسی دنیا کا۔

---

[1] **پیدائش** ۱۸۰۰ء مطابق ۱۲۱۵-۱۶ھ ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں نجبائے کشمیر سے تھے۔ حکیم نامدار خاں و حکیم کامدار خاں دو بھائی عہد سلطنت مغلیہ میں دہلی آئے اور شاہ عالم کی سرکار سے پرگنہ نارنول جاگیر عطا ہوئی جو بعد کو ضبط ہوگئی اور پنشن مقرر ہوگئی۔ حکیم مومن خاں ۱۲۱۵ھ میں کوچہ چیلاں میں پیدا ہوتے۔ شاہ عبدالعزیز نے نام رکھا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر دہلوی سے پڑھیں۔ طب باپ اور چچا سے۔ نجوم اہل فن سے۔ اس کے علاوہ رمل اور ریاضی میں کافی شغف رکھتے تھے۔ شطرنج سے مناسبت تھی۔ موسیقی میں طاق تھے اور عملیات میں بھی دخل تھا۔ شاعری سے عاشق مزاجی کے سبب لگاؤ ہوا۔ کلام شروع میں شاہ نصیر کو دکھایا۔

تصانیف: کلیات اردو، کلیات فارسی، انشائے فارسی، رسائل طب (نایاب)۔

معاش: حکیم نامدار خاں کے وارثوں کی جو پنشن مقرر تھی اس میں مومن نے بھی اپنا حصہ پایا۔ اس کے علاوہ کچھ سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ شاعری یا طبابت کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ حالانکہ اکثر مختلف ضرورتوں کی خاطر جہانگیرآباد، بدایوں، سہسوان، رامپور اور سہارنپور جانا پڑا لیکن کہیں باقاعدہ دریوزہ گری نہ کی۔ اور باوجود ذرائع محدود ہونے کے امیرانہ انداز سے زندگی بسر کرتے تھے۔

دراصل مومن کا یہ نظریہ کئی اثرات کا نتیجہ ہے۔ ایک تو عربی میں غزل کی تعریف دوسرے ان کی خود کی سخت عاشقانہ طبیعت اور تیسرے اس وجہ سے ان پر جرأت کا اثر۔ عربی میں غزل معشوق سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں عاشقانہ اور ایک دوسرے کی تفریح کی ہوں گی۔ اس لئے مومن طبیعتاً اسی طرف راغب ہوئے اور غزل کو اصولاً اسی معنی میں برتنے میں زندگی گزار دی۔ چونکہ جوانی جوانیوں میں کٹی تھی اس لیے اس کوچہ سے خوب واقف تھے اور واقعی طبیعت پر ظلم کرتے اگر وہ معاملہ بندی کی طرف نہ آتے۔ لازماً جرأت کا رنگ آگیا اور اس کو وہ خود بھی مانتے تھے لیکن جرأت میں اور ان میں کافی فرق ہے پہلی بات تو یہ کہ جرأت کا ماحول تمام تر رنگ رلیوں کا شیدائی تھا۔ کیا بادشاہ اور کیا فقیر ہر ایک پر سرخوشی چھائی ہوئی تھی۔ لکھنؤ مرفہ حالی کے لحاظ سے اپنے شباب پر تھا اور بادشاہ کے اثر سے طبائع اور شاعری دونوں پر مستی چھائی ہوئی تھی صلحا اور زہاد کی پگڑیاں اچھالی جاتی تھیں۔ اسی اسباب کی بنا پر جرأت کی شاعری ایک بے دھڑک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) شادی درد کے گھرانے میں ہوئی۔ ساس اور سسر میر درد کی پوتی اور نواسے تھے۔ ایک بیٹا احمد نصیر خاں (ان کے بیٹے محمد نصیر خاں اور بیٹی عزیز بیگم حیات ہیں) ایک بیٹی (عبدالغنی سیتاپوری سے بیاہی گئی) یادگار چھوڑے۔ اسی بیٹی کی تاریخ ولادت کہی تھی

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کی تاریخ دختر مومن

۱۲۵۹ھ - ۱۳۴۰-۸۱

ابتدائی زندگی جوانیوں میں کٹی بعد میں سید احمد رائے بریلوی سے بیعت کی اور صلاح اور تقویٰ میں بسر کر دی مذہبی شغف زیادہ تھا مولوی محمد اسمٰعیل ان کے ہم سبق و ہم جلسہ تھے۔ اکثر جگہ مقلدین اور شیعوں پر چوٹیں کی ہیں ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے سے گر کر ۵ مہینے بعد انتقال کیا جیسا خود حساب لگایا تھا ۵۲ سال کی عمر پائی۔

گرنے کی تاریخ خود کہی بشکست دست و بازو۔ مرنے کی تاریخ ان کے شاگرد آہی نے کہی۔ ماتم مومن خاں غالب نے لکھا

شرطیست کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر خونابہ رخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن چوں کعبہ سیاہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

شاگرد:۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ۔ مرزا قربان علی سالک۔ نواب اصغر علی خاں نسیم۔ میر حسین تسکین۔ میر عبدالرحمٰن آہی۔ حکیم سند علی آشفتہ، سالک، قیصر امتہ العالم صاحب یاس وغیرہ

کلام :۔ شیفتہ کے نسخہ سے آہی نے صاف کر کے مومن کی علالت میں مجتمع کر دیا تھا۔ غزل دردناک اور دلپذیر ترنم سے پڑھتے تھے

چوما چاٹی نظر آتی تھی. مومن کا ماحول اس کے برخلاف مغلس اور مولویانہ اور فاضلانہ تھا اس لیے جو بات مومن کو کہنا ہوتی وہ سنجیدگی اور علمیت کے پردے میں کہنا پڑتی تھی کیونکہ سامعین و نقاد وہی لوگ تھے. اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ کہ جرأت خود کچھ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے اس لیے بیشتر کھل جاتے تھے مومن برخلاف اس کے علوم متداولہ میں کافی وقوف رکھتے تھے لازماً ان کو اپنے پڑھے لکھے کا بھرم رکھنا ہی پڑتا تھا اس لیے پردے پڑے ہی رہتے اور قیس محمل کے گرد محض چکر کاٹا کرتا۔

عوام کی تقلید اور پابندی کے لحاظ سے جس کے مومن خلاف تھے یہ تغزل کا نظریہ ایک جدت کہا جاسکتا ہے لیکن مضامین کے لحاظ سے مومن نے اپنے تغزل میں وہی مسلمات برقرار و قایم رکھے جو ان کے زمانے میں مروج اور عام تھے اور اسی تقلید نے ان کے تغزل کو بڑی حد تک محدود بنا دیا ہے۔

حالانکہ مضامین کی اس محدود دنیا میں انھوں نے کافی جولانیاں اور نازک خیالیاں برتی اور دکھائی ہیں لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ایک محدود آسمان ایک محدود زمین ہے جس میں وہ بجلیاں چمکایا کرتے ہیں اور اس سے سرمو تجاوز نہیں کرتے. یہ کبھی نہیں کرتے کہ کبھی اس فلک کو توڑ کر باہر نکلیں اور اپنا آشیانہ اس عرش سے پرے بنانے کی کوشش کریں یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام پڑھتے وقت مسلمات شعری کا ایک خاص کاسہ سر اوڑھ لینا پڑتا ہے جس میں مضامین و تصورات محدود ہیں اور اگر کوئی نازک خیالی ندرت اسلو یا شوخی ادا برتی جاتی ہے تو اسی محدود دائرہ کے اندر۔

مومن رعایت لفظی اور ایہام کے عاشق ہیں اور اس حیثیت سے اپنے دور کے پابند نصیر کے شاگرد

ل شاید کہ دن پھرے ہیں کسی تیرہ روز کے — اب اس گلی میں غیر نہیں پھرتے شام کو

آئے وہ دست غیر میں دیے ہاتھ — آس ٹوٹی شکستہ پائی کی

اس پری وش سے لگاتے ہیں مجھے — لوگ دیوانہ بناتے ہیں مجھے

لے گئی جان یاد رونق ہائے وصل — گھر مرا ویراں ہوا تعمیر سے

کشادِ دل پہ باندھی ہے کمر آج — نہیں خیر آپ کے بند قبا کی

منہ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اتنی — واں ہیں بھی ابھی لیتے ہیں پردہ دری اتنی!

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لہ چکے تھے اور ناسخ کے ماننے والوں میں سے تھے اس لیے ان پر یہ رنگ چڑھ گیا۔ حالانکہ انھوں نے
اس کے اور دیگر خصوصیات قبول نہیں کیے مثلاً محاورہ بندی، سنگلاخ زمینیں (ان کو چھوڑ کر جو دیوان سازی
کے لیے کہی گئیں) لیکن رعایت لفظی کو وہ قادرالکلامی کی پہچان سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ اس کو اصل غایت نہ سمجھتے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

یاس دیکھو کہ غیر سے کہہ دی — بات اپنی امیدواری کی
اب اور سے لو لگائیں گے ہم — جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
سر دوش عدو پہ رکھ کے بیٹھے — جانا کہ نہ سر اٹھائیں گے ہم
دل دے کے اک اور لالہ رو کو — ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
گر خواب میں بھی ادھر کو دیکھا — آنکھیں مژہ کو دکھائیں گے ہم
گر دیکھ کے ہنس دیا ہمیں تو — منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو — جی ہی کو ہوا بنائیں گے ہم
آتا ہی گلے سے دھیان تیرے — خاطر میں ستم نہ لائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت — کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم
بگڑے تو کریں گے اور سے صلح — تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم
لب کا ترے دعوئے مسیحی — مر اور پہ آزمائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری — کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
کیا ذکر ہی ہونٹ چاٹنے کا — کچھ اور مزہ چکھائیں گے ہم
گر خواب میں آن کر جگایا — سوتے مردے جگائیں گے ہم
بت خانہ جبیں ہو گر ترا گھر — مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک — شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
اس لب لعل کی شکایت ہے — کیونکہ رنگین نہ ہو کلام مرا
آخر اشکوں کے بھر آنے نے ڈبویا ہی مجھے — چشم کا سوراخ تو کشتی کا روزن ہو گیا

تے لیکن معیار استادی کا ایک ضروری جزو ضرور گردانتے تھے اور یہی مومن اور ذوق کی رعایت لفظی کا فرق ہے کہ اول الذکر معانی آفرینی کو پیش نظر رکھتے تھے اور رعایت لفظی کو مقصود شعر نہیں بناتے۔ موخرالذکر کا نظریہ بالکل برعکس ہے۔ مومن کو یہ شوق دراصل ابتدا میں نصیر و ناسخ سے حاصل ہوا اور اس وقت تک اکثر اشعار محض رعایت ہی کی خاطر لکھے ہیں لیکن بعد کو محض ایک ذریعہ و ترکیب اظہار کا رہ گیا نہ کہ مقصود اظہار لیکن پیچھا عمر بھر نہ چھوڑا۔

لیکن دراصل مومن کا مسلک معنی آفرینی[۵۸] اور نزاکت خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کی شاعری

---

۵۸ دیکھا اپنا حال زار منجم ہوا رقیب　　تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے　　اس کا نہ دیکھنا نگہہ التفات ہے

کرہ خاک ہے گردش میں تپش سے میری　　میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہونگے　　فلس ماہی کے گل شمع شبستاں ہوں گے

روز جزا جو قاتل دل جو خطاب تھا　　میرا سوال ہی میرے خوں کا جواب تھا

پس شکستن خم زجر محتسب معقول　　گناہگار نے سمجھا گناہگار مجھے

نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف　　خون فرہاد سر گردن فرہاد رہا

کیوں غش ہوئے دیکھ آئینہ کو　　کہتے تھے تاب لائیں گے ہم۔

جراح کیا سوچا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا　　کیوں کھول لی پٹی مرے زخم جگر کو دیکھ کر

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

دعا بلا تھی شب غم سکون جاں کے لیے　　سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ　　تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

یہ عذر امتحاں اے جذب دل کیسا نکل آیا　　میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

اب تو مرجانا بھی ہے مشکل ترے بیمار کو　　ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل　　تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

ذاتی رجحانات اور خارجی معیار و مذاقِ شعری کی کش مکش کا ایک عجیب مرقع ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری گنجلک سی نظر آتی ہے۔ یہ مرد میدان آخر تک اپنا میدان پا نہ سکا کبھی زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے رعایاتِ لفظی و خارجی حسن شعر پر مائل ہو جاتا لیکن اپنی ذاتی افتاد سے مجبور ہو کر اپنی خداداد زورِ تخیل و نزاکتِ تخیل کو کام میں لائے بغیر نہ رہ سکتا کبھی علمیت، دہلوی سنجیدگی اور متانت کا نقشہ پیش کرتا جو ماحول کا اثر تھا لیکن اپنی طبیعت کی جولانیوں کو کہاں لے کر جائے کہ اس مصنوعی متانت کو چاک کر ڈالنا چاہتی تھیں۔ مختصر یہ کہ پیشہ اور ظاہری رکھ رکھاؤ اور برتاؤ فاضلانہ تھا لیکن طبیعت شاعرانہ اور منچلی تھی۔ مومن اس کشاکش میں ایک لائحہ عمل اپنے لیے بنانا چاہتے تھے (اور یقیناً ایک خوشگوار رویہ اختیار کر لیتے اگر مرنے پر اس قدر جلد نہ تیار ہو جاتے) یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کبھی تو غالب کی طرح عوام کی تقلید سے نفرت جدت سے شوق۔ نزاکتِ تخیل سے رغبت ملتی ہے اور کبھی ذوق کی طرح محض الفاظ کے الٹ پھیر میں دقت نظری۔ نتیجہ یہ کہ محض گنجلک حاصل ہوا جسے ہم ان کا خاص رنگ کہتے ہیں۔ نہ تو لکھنوی خارجی کمالات آئے نہ دہلوی حسن بیان، سلاست سادگی اور روانی میں پختگی اپنے ماحول سے باوجود اپنی صلاحیتوں کے زیادہ ہونے کے زیادہ بلند نہ ہو سکے اس لیے ہم ان کو ذوق اور غالب کے درمیان کی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں۔

بعض طبائع دقت پسند ہوتی ہیں اور ان کو گرہیں ڈال کر کھولنا اچھا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سے ان کی قدرت گرہ کشائی بر روئے کار آتی ہے اور عوام سے بلندی ظاہر کرتی ہے۔ مومن یقینی اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ ان کی نازک خیالی مضمون آفرینی اور دقت نظری کچھ تو اس سبب سے اور کچھ متاخرین شعراء

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں — ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے — صیاد کی نگاہ سوئے آسماں نہیں

قتل دشمن کا ہے ارادہ اسے — یہ سزا اپنی جاں نثاری کی

حیرت حسن سے یہ شکل بنی — کہ وہ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے — جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے

کس طرح مایوس ہوں تاثیر سے — دم رکے ہے نالۂ شبگیر سے

فارسی کے مطالعہ سے نہ صرف وجود میں آئی بلکہ اُن اثرات کے سبب سے مغلق اور دقیق ہوگئی۔ یہ گنجلک یا اغلاق مومن کے یہاں عموماً مبالغہ کے دوراز کار ہونے یا ایہام و رعایت لفظی پر شعر کے مبنی ہونے یا استعارہ در استعارہ کے استعمال یا بڑے خیال کو مختصر کرنے کی خواہش (جس کی وجہ سے اکثر الفاظ حذف کر دینا پڑتے ہیں) سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح گویا انھوں نے اپنے تخیل کو بھی ایک فن بنا لیا تھا اور تعجب یہ کہ اپنے جنونی شعروں میں بھی یہ التزام قایم رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار محض دماغی معمے ہو کر رہ گئے جن کو حل کر لینے پر بھی کوئی خوشی محسوس نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کا تعلق نفسیات بشری سے نہیں بلکہ معقلیات سے ہوتا ہے۔ فطرت انسانی کی تڑپ نہیں بلکہ تعقل انسانی کی پیچیدگیاں ہیں ؎

شاعری اپنی ہوئی نیرنگیِ دانشوری　　　جو سخن ہے سو طلسم راز بطلیموس ہے

اور یہی غالب و مومن کے درمیان بڑا فرق ہے۔ غالب کے مشکل اشعار حل کرنے پر خوشی محسوس ہوتی ہے اور کائنات یا فطرت انسانی کا ایک نہ ایک مخفی راز کا علم حاصل ہوتا ہے لیکن مومن کی گتھیاں سلجھانے پر محض گتھیوں کا سلجھانا ہی ہاتھ آتا ہے۔ مومن کے اشعار گویا ان کی شطرنج کے نقشے ہیں جن کے حل کرنے پر محض اسی بات کی خوشی ہوتی ہے کہ وہ حل ہو گیا یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے۔ علو تخیل اور بلندئ فکر نہیں

بظاہر مومن توبہ کر چکے تھے لیکن جن باتوں کے عمل سے انھوں نے توبہ کی تھی اب وہ محض شعر ہو کر رہ گئی تھیں یہی وجہ ہے کہ مومن معاملہ بندی کے معاملات میں اپنے صحیح رنگوں میں نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ماحول اور علمیت کی وجہ سے متانت کا رکھ رکھاؤ برتتے لیکن طبیعت کو نہ مارتے۔ ان کا عشق مجازی بوالہوسی کی طرف مائل ہے لیکن پستی اور ابتذال کم ہے۔ اور ان کے معاملے بیشتر کسی پردہ نشین سے ہیں معاملہ بندی در اصل گربی تصورات کا نتیجہ ہے اس لیے اس بیان میں تسلسل ہو تو خوب ہے۔ مومن کی معاملہ بندی[۱] میں تسلسل اکثر ملتا ہے خصوصاً جب وہ خود

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح　　　اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں　　　کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی　　　قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

(بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اپنے کسی معشوق سے خفا ہو جاتے ہیں۔ مومن اور جرأت کی معاملہ بندی میں ایک خاص فرق یہ بھی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین سے — کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

معشوق اور بھی ہیں بتادے جہان میں — کرتا ہے ظلم کون کسی پر تری طرح

ہوں جاں بلب بتانِ ستمگر کے ہاتھ سے — کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

تھی وصل میں بھی فکر جدائی تمام شب — وہ آئے بھی تو نیند نہ آئی تمام شب

واں طعنہ تیر بار یہاں شکوہ زخم ریز — باہم تھی کس مزے کی لڑائی تمام شب

مومن میں اپنے نالوں کے صدقے کہ کہتے ہیں — اس کو بھی آج نیند نہ آئی تمام شب

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بند ہ جائے ہے — یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آجائے ہے — تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

تاب و طاقت صبر و راحت جان و ایمان عقل و ہوش — ہائے کیا کہیے کہ دل کے ساتھ کیا کیا جائے ہے

دیکھیے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست — شیخ صنعا کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ یعنی نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو لطف مجھ پہ تھا بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر — مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں — وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی بیٹھے سب ہیں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو — وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہوئے اتفاق سے گر بہم تو وفا جتانے کو دمبدم — گلہ ملامت اقربا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کوئی بات ایسی اگر ہوئی کہ تمھارے جی کو بری لگی — تو بیاں سے پہلے ہی بھولنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی — کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

سنو ذکر ہے کئی سال کا کیا تم نے آنے کا وعدہ تھا — سو نباہنے کا تو ذکر کیا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

کہا میں نے بات وہ کوٹھے کی کہ مرے دل سے صاف اتر گئی — تو کہا کہ جانے مری بلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا — وہ نہیں نہیں کی ہر آں صدا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے بے وفا — میں وہی ہوں مومنِ مبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

کہ مومن اپنے کیے کو برا سمجھنے لگے تھے جرأت برخلاف اس کے اسی کو اچھا سمجھتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

رات کس کس طرح کہا نہ رہا ‏— نہ رہا پردہ مہ لقا نہ رہا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے ‏— جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

مومن اس بت کی نیم نازی پر ‏— ہم کو دعوئے اتقا نہ رہا

جیسا مجھے آرام ترے ہاتھ سے آیا ‏— اللہ کرے یوں ہی ترا سینہ مرا ہاتھ

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا ‏— الجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کیا

کود کر گھر میں تو پہنچا میں ترے پر کیا کروں ‏— دم نکل جاتا تھا کھٹکے سے برابر رات کو

یاد دلوائی تپش نے تیری شوخی وصل کی ‏— مر گئے ہم اچھل کر پائے بستر رات کو

وہ ہے بغل میں تو بھی تو یاں نیند اڑ گئی ‏— یہ سوچ ہے گیا نہ ہو اعدا کے خواب میں

نیند میں یا رب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا ‏— ہے زمیں سے روشنی افلاک نور افشاں تلک

شوق وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر ‏— سوجھا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر

لگی ہچکی ہے سر زانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا ‏— کسی کا ہاتھ ہر دم مارنا زانو پہ قہ قہ کر

اے سوزش سینہ مجھے وہ سینہ دکھائے ‏— کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند

ہائے رے چھیڑ رات سن سن کے ‏— حال میرا کہا کہ کیا صاحب؟

وحشت سے مری سارے احبا چلے گئے ‏— آنا ہے گر تو آؤ کہ خالی مکاں ہے اب

کشاد دل پہ باندھی ہے کمر آج ‏— نہیں ہے خیر آپ کے بند قبا کی

کیا جب التفات اس نے ذرا سا ‏— پڑی ہم کو حصول مدعا کی

ہیں پاک نظر ہم تو دلے ذوق فزا عشق ‏— بے چاشنی بوسہ دشنام نہ ہوگا

غیروں سے اس نے چھوڑی ہرگز نہ ہاتھا پائی ‏— جب تک اجل کا صدمہ دو چار تک نہ پہنچا

اتنا تو نہ گھبراؤ راحت یہیں فرماؤ ‏— گھر میں مرے رہ جاؤ آج آئے ہو کل جانا

غیر کو سینہ کھے ہے سیمبر دکھلا دیا ‏— تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا!

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

طنز[سلہ] و تعریض اور مکر[سلہ] شاعرانہ جو محبت کے خاص چونچلے ہیں اسی معاملہ بندی کے تحت میں آتے ہیں اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) کوئی بیٹھے ہو دل کو پہلو میں   کس نے کی اس سے ہمکناری آج

پھرتے ہیں سو سو وسوسے جی میں دل میں سودے کئے ہیں   کوٹھے پر دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے ہیں

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم ان کے کوچہ میں   ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں

کرتے ہیں آوازہ زفیری، دیتے ہیں دستک سو سو بار   گھر میں بیٹھ کھٹکتے ہیں زنجیر در کھٹکاتے ہیں

اب اغیار سے ہاتھا پائی ہو گیوں   نزاکت بس اے نازنیں ہو چکی!

وہ کہاں ساتھ سلاتے ہیں مجھے   خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

کب ہمارے ساتھ سوتے ہیں کہ دیکھے گا کوئی   ان کو بے تابی ہو کیوں اس خواب کی تعبیر سے

ارمان نکلنے دے بس اے بیم نزاکت   ہاں ہاتھ تصور میں مرا زیر کمر ہو

اس ستم کیش نے یہ اپنے نصیبوں کا لکھا   خط بھی لکھا تو سلام اس میں رقیبوں کا لکھا

(سلہ ۔۔۔) دیکھیے غزل مسلسل گزشتہ صفحہ پر یا غزلیں جن کے مطلعے درج ذیل ہیں۔

توبہ ہو کہ ہم عشق بتاں کا نہ کریں گے   وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

منظور نظر غیر بھی اب ہمیں کیا ہو   لے دید تری دید سے دل پہلے بھرا ہو

گر نہیں ملتے ملوں گا اور سے   کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم   پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم   منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم

کیونکر نہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے   کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

سلہ   سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں   کہ سخت چاہیے دل اپنے راز داں کے لیے

شب ہجر میں لیا کیا ہجوم بلا ہے   زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اب اور سے جی لگائیں گے ہم   جو ں شمع تجھے جلائیں گے ہم

توبہ ہو کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے   وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

سہہ سہہ کے نادرست تری خو بگاڑ دی   ہم نے خراب آپ کیا اپنے کام کو (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

اس میں شک نہیں کہ طبیعت کی مناسبت کی وجہ سے مومن نے اس میدان سخن خوب اور بہت کافی دی ہے اور جب وہ اس میدان میں قدم رکھتے ہیں تو متانت و بزرگی کا وہ جامۂ تقشّع جو انھوں نے اوڑھ رکھا ہے شانوں سے کھسکتا نظر آتا ہے۔ شاعرانہ مکر کے مومن موجد ہیں اور خاتم بھی۔

شوخی[1] و ظرافت کہ فطری ہے نیز اس زمانہ کی خصوصیات میں سے ہے۔ مومن کے ہاں بہت شوخ اور

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے   اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

(سلہ ؍؍ ؍؍) ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا   جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

وہ بدخواہ مجھ سا تو میرا نہیں   عبث دوستی تم کو دشمن سے ہے

سرگیں آنکھوں میں تم سرمہ لگاتے کیوں ہو   ناک میں نام کو دشمن کے لگاتے کیوں ہو

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی   آخر کو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

سلہ ہم حال کہے جائیں گے سنئے کہ نہ سنئے   اتنا ہی تو یاں حضرت ناصح کا اثر ہے

توبہ گنہ عشق سے فرمائیے ہے زاہد   یہ بھی نہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

لگ جائے شاید آنکھ وہی دم شب فراق   ناصح ہی کہے اور افسانہ خواں نہیں

گر حسد سے ہو برا اب بھی ہے وہی ناصح کی یاد   ناحق اس جان جہاں کو اک نظر دکھلا دیا

مے نہ اتری گلے سے جو اس بن   جو کو یاروں نے پارسا جانا

جو ملیں تجھ سے بصد شوق وہ کیا ہوں گے کہ کر   لب سے سامنے ہو وہ دل کا پاس اسے واسطہ

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف   دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

مومن کو سچ ہے دولت دنیا و دوں نصیب   شب بتکدہ میں گزرے ہے دل خانقاہ میں

پی ہے مے حضرت مومن نے کبھی مضمضہ کو   آفتاب کبھی ہنگام وضو کرتے ہیں

یہ کون کہے اس سے کہ ترک وفا میں نے   کرتا ہی ذرا ناصح پیغام برق آتی

ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم   لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے

ثواب ترک صنم سچ سہی مگر مومن   یہ کیا سبب کہ سنائے ہو بار بار مجھے

کر چکا ہوں اس کا اخلاص بتاں میں امتحاں   میں نہ مانوں گا کہ مومن زاہد سالوس ہے

زیادہ ہے۔ واعظ، ناصح اور زاہد کی جس کامیابی سے اور جی کھول کے دھجیاں انھوں نے اڑائی ہیں اور جس قدر جملے انھوں نے کسے ہیں اتنی کامیابی سے غالباً کسی نے نہیں برتے اور اس کی وجہ خاص کر یہ تھی کہ ان کے دل میں بھی سخت اور کٹر ناصح بسا ہوا تھا

مومن کی شاعری میں ان کے تعقیدی طرز کے علاوہ ایک دو اندرونی باتیں بھی حائل تھیں یعنی ان کی علمیت[1] اور مذہبیت۔ علمیت کی وجہ سے وہ اکثر اوقات کسی نہ کسی علم کی اصطلاح لے آتے ہیں جس کی وجہ سے شعر کا سمجھنا یا شعر کا حل مشکل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ان کی شعریت ان کی علمیت پر غالب ہے پھر بھی جب کبھی وہ شعر بناتے ہیں تو یہ علمیت ضرور سامنے آ جاتی ہے تصوف میں اعتقاد نہیں رکھتے تھے (اور اسی لیے ان کا معشوق زمین ہی پر رہتا تھا ورنہ وہ شعر میں مذاق زمانہ کے مطابق خوب کھپ جاتا اور یہ خشک علمیت گراں نہ گزرتی)، مذہبیت دوسرا روڑا تھا۔ تمام خاندان ان کا سخت قسم کا مسلمان، خود موحد۔ عامل بالحدیث اور بیعت کے بعد اور بھی سخت ہو گئے تھے چنانچہ اکثر و بیشتر مذہبی اصطلاحیں آ جاتی ہیں اور اکثر بندا در ظاہر دوسرے مذاہب والوں پر سودا کی طرح چوٹیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں مناظرہ یا وعظ میں ہوں تو لطف دیتی ہیں۔ شاعری میں ذرا اکھل بے جوڑ معلوم ہوتی ہیں۔

طرز ادا مومن کا خاص گر اور جوہر ہے۔ جب کبھی رعایت اور صنائع کے پیچ سے اس طرف آتے ہیں تو اپنے خاص رنگ میں ہوتے ہیں۔ ندرت اسلوب کی خاص کر ان کے یہاں بے حد فراوانی ہے کبھی نادر تشبیہیں اور استعارے لاتے ہیں کبھی کسی امر کو مسلم مان کر اس کی طرف خفیف سا اشارہ کر دیتے ہیں

[1] صبح م آنے کو تھا وہ کہ گواہی دے ہے | رجعت قہقری شمس و قمر آخر شب
کیوں نہ مجھ سے وہ مہوش اب زیادہ تر کرے | بدگماں ہے سبعہ سیارہ کی تسخیر سے
علاج خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا | وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے
ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ | آکے میری نعش پر وہ رو گیا
مومن حسد سے کرتے ہیں ساماں جہاد کا | ترسا صنم کو دیکھ کے نصرانیوں میں ہم
ہم بندگی بت سے ہوتے نہ کبھی کافر | ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

وغیرہ وغیرہ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی ندرت اسلوب دقیق زیادہ تھی بجائے لطیف ہونے کے البتہ شوخیٔ ادا میں کافی خوشگوار شوخیاں دکھلائی ہیں۔ ان کی جدید فارسی ترکیبیں ان کی مشکل پسند طبیعت اور فارسیت کا نتیجہ ہیں، ان کے کلام میں جگہیں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اکثر خوب ہیں۔ لیکن بیشتر لائی ہوئی ہیں نہ کہ آئی ہوئی اسی لیے رواں اور رائج نہ ہو سکیں۔ ان کی ترکیبوں اور غالب کی ترکیبوں میں بھی فرق تھا۔ جدید ترکیبیں وہ بھلی معلوم ہوتی ہیں جو جوش تصور سے بن جائیں نہ وہ جو ایک ریاضی داں یا انجینیر سوچ کر نکالے۔ شاعری میں عموماً ترکیب کی جدت جوش تصور اور وسعت تصور کو چند الفاظ میں محصور کر دینے کی تدبیر ہوا کرتی ہے خواہ کسی تشبیہ کی بابت ہو یا واقعہ کی بابت مومن کا جوش تصور تعقید پسند تھا نہ کہ وسعت پسند۔ اس لیے ان کی تشبیہوں میں حرکت نہیں ہے اور انجماد کی وجہ سے ان کی تراکیب بھی روشن اور اتنی دلکش نہیں ہیں جتنی غالب کے یہاں۔

مومن اپنے مقطع سے ہمیشہ فائدہ اٹھاتے ہیں کیونکہ مومن کی رعایت سے بت پرستی اور کافر پرستی کے مضامین نہایت آسانی اور خوبی سے لائے جا سکتے ہیں۔

مومن عرصہ تک روشناس نہیں ہو سکے جس کی وجہ خاص ان کی تعقید تھی۔ اس کے علاوہ انھیں حالی یا آزاد جیسا شاگرد نہ ملا کہ موجودہ طرز تنقید کے مطابق انھیں اجاگر کرتا بلکہ صاحب آب حیات و گلستان بے خزاں نے تو ان کے کمالات پر شروع میں پردہ ہی ڈال دیا تھا لیکن اب جبکہ مومن روشناس ہوئے ہیں انھیں غالب کے برابر ٹھہرایا جاتا ہے یہ بھی زیادتی ہے۔ دونوں کے طبائع مختلف۔ افتاد مزاج جداگانہ۔ ایک کر کے توبہ کرنے والا، ایک توبہ کو اپنی ہتک سمجھنے والا۔ ایک کٹر مومن مسلمان دوسرا صرف انسانیت میں اعتقاد رکھنے والا۔ تغزل کا نظریہ بھی جداگانہ۔ مومن کی غزلوں میں محض تغزل ہے غالب کے یہاں گوناگوں جذبات کے علاوہ تصوف۔ اعتقادات و فلسفہ بھی ہے یعنی تخیل کے میدان میں ایک محدود ہے دوسرا لامحدود۔ ایک کے یہاں بے چینیٔ روح ہے دوسرے کے یہاں محض بے چینیٔ دماغ۔ ایک کا تخیل تمام نفسیات انسانی کی سیر میں مصروف ہے۔ دوسرے کا محض ایک ہی جذبہ کے تلطف میں گرہ در گرہ۔ ایک کی زندگی تمام تر بے چینیٔ خیالی، جذباتی، اعتقادی اور دنیا کی طرف سے۔ دوسرے کی زندگی تمام تر منظم یعنی مومن

مالی حیثیت سے مطمئن تھے۔ جذبات آسودہ، اعتقادات مستحکم اور راٹل ظاہر ہے کہاں وہ دماغ پریشاں کہاں
یہ روح مطمئن اور وجہ یہی ہے کہ مومن تھوڑا بہت لفظی صناعی سے کہ مثل علائق دنیوی سے ہو وابستہ رہے اور وہ
روح بے چین کہ آزاد تھی اس مایا میں نہ پھنس سکی مومن اگر عمر طبعی پاتے تب بھی غالب تک نہ پہنچ سکتے
اکثر جگہ یہ صحیح ہے کہ ہم طرحی غزلوں میں مومن کے اشعار غالب سے بہت کم نہیں معلوم ہوتے یا اکثر فارسی
ترکیبیں مومن کی بھی کچھ کم عمدہ نہیں ہیں لیکن ان اشعار میں خوبی محض فن کی ہے جس میں مومن اس زمانے کے
معیار کے مطابق غالب سے کم نہ تھے لیکن تنوع مضامین اور طرفگی ادا کی مقابلتہً کمی کی وجہ سے اب
مومن و غالب کے مقامات نہایت آسانی سے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ رہا یہ امر کہ دونوں کی دماغی قابلیتیں
عوام کی سطح سے بہت بلند تھیں ایک مسلم حقیقت ہے لیکن روش دونوں کی جداگانہ تھی ورنہ ایسے معاملہ بندی
کی باتیں تو ہر عاشق شاعر کے یہاں ایک ہی جیسی ملیں گی۔

نور الحسن ہاشمی

فانی کی موت

ایک منظر

(اندھیری رات آسمان تمام سیاہ نظر آرہا ہی اس سیاہی میں صرف دو تارے جگمگا رہے ہیں۔ ایک تارہ کہتا ہی)

ایک تارہ۔ پرتو ظلمت سے میرے نور میں یہ آب و تاب
منظر تاریک ہی یا روشنی کا انقلاب!

سرفرازی کو مری تھامے ہوئے دوش علم
منزل حسن و لطافت کی طرف میرے قدم

آئینہ ساز نظر ہی جلوہ سامانی مری
جگمگاتی ہی تجلی بن کے حیرانی مری

صبح کے سینے میں اُجالے سے لرز جاتا ہوں میں
چھانؤں میں اسرار دو عالم کے چھپ جاتا ہوں میں

دوسرا تارہ۔ رات کی تاریکیوں میں نور کا پیغام ہوں
میں کسی بے تابیٔ آغاز کا انجام ہوں

جل رہی ہی مجھ میں شاید آہ و فریاد ازل
میری جان زار سے قایم ہی بنیاد ازل

ہر نفس لرزاں ہی میرا اہتمام زندگی
جھومتا ہی عرش پر میرا نظام زندگی

آنکھ کی مانند ہر لحظہ جھپک جاتا ہوں میں
اشک غم کی طرح دامن میں ٹپک جاتا ہوں میں

(یہ کہہ کے تارہ ٹوٹتا ہی اور سیاہ بلندیاں طے کرتا ہوا نیچے آتا ہی۔ زمین کے ایک رفیع لیکن سیاہ پہاڑ پر ایک جنازہ گزرتا ہوا دکھائی دیتا ہی جسے دو پیکر کندھوں پر اٹھائے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پیکر کا نام زندگی ہی دوسرے کا نام موت۔ موت کا پیکر یہ نوحہ کرتا ہی۔)

موت کا پیکر۔ تھم گیا وہ سینۂ بیتاب جس میں راز تھا
یہ کوئی دریا تھا یا ٹوٹا ہوا اک ساز تھا

چند سانسوں کے تموج میں تھا اک طوفان غم
اک دل مایوس اور فریادیٔ ذوق ستم!

بند ہی وہ آنکھ جس میں حسن کا پیغام تھا
ختم ہی وہ زیست جس میں عشق کا انجام تھا

بند ہیں وہ گوش جو سنتے تھے آواز سروش
ہو گئے دنیائے رنج و غم کے افسانے خموش

زندگی کی گود میں پالا ہوا اک جسم ناز
ہو گیا افسوس بیداد زمانہ سے گداز

وہ تجلی جس پہ نازاں تھی فضائے کائنات
بن گیا اس وقت اک ویرانۂ درد حیات

فکر جو پرواز کرتی تھی فراز عرش پر
آج بے حس ہو گئی ہی آب گل کے فرش پر

داغ دل جس کے نمایاں اہل محشر کیلیے | جو ستارے توڑتا تھا دیدۂ تر کے لیے
وہ فغاں جس میں نظر آتا تھا دل صیاد کا | وہ صدا جس میں تھا نغمہ حسرت بیداد کا
آج دنیائے خموشی کا فسانہ بن گئی! | موت کے پہلو میں آنے کا بہانہ بن گئی!

(زندگی یوں ماتم کرتی ہے)

زندگی۔ ظلمت ہستی کا آئینہ غم دیتا نہ دیکھ | مرگ فانی کا شب تاریک میں جلوہ نہ دیکھ
اس میں آئیں گی نظر تجھ کو ہزاروں عبرتیں | اک سیہ چادر نہیں ہیں زندگی کی حسرتیں
جا رہی ہے اوڑھ کر اس کو وہ خودداری کی لاش | موت کے دامن میں خوابیدہ ہے دل کا ارتعاش
اہل دنیا میرے شعلے کو بجھائیں کس طرح | بے بصر اک گوہر نایاب پائیں کس طرح
جو شب دیجور ہستی میں فروزاں ہی رہا | ریشمی دامن میں دنیا کے جو غلطاں ہی رہا
حسرتیں پیدا تھیں جس کی صدائے ناز سے | جس نے دنیا کو پکارا درد کی آواز سے
جس نے سنجیدہ بنایا ہستیٔ ناکام کو | جس نے زندہ کر دیا تکلیف کے انجام کو
نطق انسانی کو بخشے جس نے کچھ راز و نیاز | بن گیا غم جس کے نغموں سے پیام دلگداز
رکھ دیا سر جس نے رو رو کر ازل کے دوش پر | سو گیا جو آج میرے سینۂ خاموش پر!

(یہ نوحہ سن کر ٹوٹتا ہوا تارہ اس جنازہ کے اطراف ایک نور کا حلقہ سا ڈال دیتا ہے۔ اندھیری فضا میں نظر آتا ہے کہ ایک روح سفید اس حلقہ میں بلند ہو رہی ہے۔ موت، زندگی اور آسمان کا مسکراتا ہوا تارہ مل کر گاتے ہیں)

اُٹھ گئی آج بزم راز و نیاز | بے صدا ہو گیا ہے پردۂ ساز
زندگی مختصر تھی انساں کی | ڈھونڈلی اس نے راہ دور دراز
نغمۂ درد، اس قدر بے تاب | آہ و فریاد اتنی سینہ گداز
مطرب خوش نوا، تری مرضی | چھوڑ دی تو نے بزم درد نواز
ہم سمجھتے ہیں تیری ہستی کو | آ رہی ہے سروش کی آواز
"آج روز وصال فانی ہے | موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز"

محمد عبدالقیوم خاں باقی

تجلّیات

یاد تری شراب ہے، ذکر ترا سرود ہے!
کیفِ طرب میں موجزن میرا یہ وجود ہے!

اپنی ہی دُھن میں عرش سے دور نکل گیا ہوں میں
اتنی بلندیوں پہ بھی مجھ کو غمِ صعود ہے!

اس میں کہاں سرور و نور، آگ ہی آگ ہے ہوس
مثلِ سموم ہر نفس، آہ برنگِ دود ہے!

آنکھ ہو حق شناس اگر، آتا ہے تو ہی تو نظر
ورنہ تمام کائنات بتکدۂ نمود ہے!

پچھلے پہر کی چاندنی نور میں ہے دھلی ہوئی
عرشِ بریں سے پے بہ پے قدسیوں کا ورود ہے!

فکرِ دل و جگر نہ کر عشق میں جان سے بھی گزر
اس میں کہیں زیاں نہیں اس میں زیاں بھی سود ہے!

غرقِ سرور و نور ہوں جام و سبو سے دور ہوں
میرے لیے کھلا ہوا میکدۂ شہود ہے!

آثر صہبائی

اس دور میں!

ہر شعر مرا اصل میں تاریخ امم ہے
مجھ کو مری آفاق نوردی کی قسم ہے

اُس مرد قلندر کو سڑی کہتی ہے دنیا
اس دور میں جو طالبِ انصاف و کرم ہے

ہر روح کی خلوت میں جو آباد ہے اب تک
وہ خالقِ اکبر بھی تصور کا صنم ہے

حل کرتا ہے افلاس کے عقدے وہ سخنور
جو ہاتھ میں تھامے ہوئے سونے کا قلم ہے

خلوت میں یہ عفریتِ تعیش ہے مگر اب
منبر پہ بھی استادہ ہے اور آنکھ بھی نم ہے

ہر شخص ہے سنگین حقایق سے گریزاں
ہر فرد کو محبوب یہی شیوۂ رم ہے

جو قیصر و فغفور کے آگے نہ جھکا تھا
مدت ہوئی وہ سر در الحاد پہ خم ہے

جذبات میں جدت نہ خیالات میں وسعت
تحریر میں رعنائی نہ تقریر میں دم ہے

یخ بستہ ہے نوخیز جوانی کا ارادہ
اور ڈھلتے بڑھاپے پہ گرانباریٔ غم ہے

مشرق کی نگاہوں میں ہے ہم پلۂ قرآں
وہ بات جو مغرب کی کتابوں میں رقم ہے

جینے کے لیے اذن ہے قانون کا مطلوب
اللہ! ستم ہے، مرے اللہ! ستم ہے!

احمد ندیم قاسمی

نوائے سحر

زندگی میں کوئی محشر بکنار آ جائے
قلب لرزاں کو کسی طور قرار آ جائے

سینچتا ہوں دل خاک اشک سحرگاہی سے
شاید اجڑے ہوئے گلشن میں بہار آ جائے

دل کی قندیل سے روشن نہیں قوموں کا نظام
بندۂ سود و زیاں ہے شب ہستی کا غلام

زندگی میں اثر دانشِ امروز نہ پوچھ
تیری دنیائے تجلی پہ ہے چھائی ہوئی شام

دل شوریدہ لیے اک دیس میں رہتا ہوں میں
سختیاں گردش ایام کی سہتا ہوں میں

قصہ درد و الم پچھلی شبوں کو اکثر
چپکے چپکے ترے افلاک سے کہتا ہوں میں

ساقیٔ دہر ہے تو مجھ کو تنک جام نہ کر
اس خرد زار میں آئین جنوں عام نہ کر

شرم رکھ لے مری تقدیر کی اے روز جزا
ایک بدنام زمانہ کو تو بدنام نہ کر

تیرا پیغام سناتے ہیں ستارے مجھ کو
کرتے ہیں رات کو آنکھوں سے اشارے مجھ کو

توڑ دیتا ہے جنوں جب کہ تصور کے حدود
کھینچ لیتے ہیں سمندر کے کنارے مجھ کو

ضرب غم سے ابھی دستور نفس چاک نہیں
حال موج شرر یہ خس و خاشاک نہیں

تیری تقدیر نے بخشا غم یاراں بھی مجھے
کہ دل مردہ سزاوار غم پاک نہیں

فضل حسین کیف اسرائیلی

تنقید و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

کتاب العلم (جزِ اوّل): ناشران دی ایسٹرن پبلشنگ اینڈ اسٹیشنری لمیٹڈ۔ لاہور صفحات ۵۰۰ سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت ۱۱ر روپے۔ طباعت و کتابت، کاغذ نفیس مع متعدد یک رنگی و سہ رنگی تصاویر۔

محمد سعید بیگ و محمد اسمٰعیل صاحبان نے ایک بہت بڑے سرمایے سے یہ کتاب 'بک آف نالج' کی وضع کی نکالی ہے۔ خوبی طباعت اور اشاعت کی نفاست کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے مقصد یہ ہے کہ ہر علم کی معلومات ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائیں کتاب العلم کا یہ پہلا حصہ ہے بقیہ حصے بھی اسی نمونے پر تیار کیے جائیں گے۔ فہرست مضامین سے اس کی وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہیں۔ کائنات، معدنیات، حیاتیات، انسانیات۔ ملکیات۔ کیمیا و طبیعیات۔ ایجادات۔ فنون لطیفہ۔ تاریخیات۔ زرعیات، ادبیات، تنظیمات، دینیات، قصہ جات، شخصیات۔ استفسارات۔ میکانیکیات۔ تفریحیات، صحتیات اور اقتصادیات۔ دراصل یہ کتاب انگریزی کی 'بک آف نالج'، 'ورلڈ آف ونڈرز'، 'ورلڈ آف سائنس' وغیرہ عام معلومات کی قسم کی کتابوں سے لکھی گئی ہے۔ زیادہ تر تصاویر اور مضامین ان ہی سے لیے گئے ہیں لیکن اصطلاحات کا ترجمہ بہت ہی معرب زبان میں کیا گیا ہے۔ یوں بھی عبارت میں عربیت اور فارسی انشاپردازی بہت زیادہ ہے۔ عموماً ایسی کتابیں عوام لڑکے لڑکیوں بچوں اور طالب علموں کے لیے زیادہ اور خواص کے لیے کمتر مخصوص ہوتی ہیں اس لیے زبان ایسی رکھنی چاہیے جو بہت سادہ اور آسان ہو تاکہ نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکے اور معمولی پڑھا لکھا بھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکے۔ موجودہ اسلوب بیان سے زیادہ لوگ کم مستفید ہو سکتے ہیں۔ امید ہے آئندہ اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ایک بات اور اس کتاب میں نامناسب معلوم ہوتی ہے وہ جگہ جگہ اس کی مذہبیت ہے کہیں جگہ علمی مضامین میں آدم و حوا کا قصہ دہرایا گیا ہے یا دیگر مذاہب اور اسلام کے نقطہ نظر دیے گئے ہیں خالص علمی مضامین میں (اور پھر جبکہ یہ کتاب ہر فرقہ کے لیے ہے صرف مسلمانوں

سکے لیے نہیں) مذہب کو جگہ جگہ بیچ میں نہیں لانا چاہیئے تھا مثلاً ارعیات، ادبیات، وغیرہ میں بہتر ہوتا اگر دینیات کے عنوان ہی میں یہ مباحث رکھے جاتے یا اسلام ہی کے متعلق لکھنا تھا تو اسلامیات کا موضوع وضع کیا جاتا۔ دیگر لحاظ سے کتاب کی افادیت میں کلام نہیں ضروری ہے کہ یہ کتاب ہر لائبریری میں ہو۔ کتاب پر لاگت تو یقینی زیادہ آئی ہوگی پھر بھی قیمت کچھ زیادہ ہے۔

اسلام اور مسیحیت :۔ از ابو الوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری، ملنے کا پتہ دفتر اہلحدیث امرتسر۔ صفحات ۴۴۴۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ قیمت عہ۔ کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

مولانا موصوف کی یہ کتاب عیسائیوں کی کئی کتابوں کے جواب میں لکھی گئی ہے اور بہت سی ان غلطیوں کو دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہے جو عیسائی مبلغین پھیلاتے رہتے ہیں۔ عیسائیت کا فتنہ مسلمانوں کے لیے پنجاب میں خصوصیت سے بڑے خطروں کا حامل ہے ضرورت تھی کہ ان مشنریوں کے خلاف جو وہاں اسلام کے متعلق غلط فہمیاں پھیلاتے رہتے ہیں سخت جد وجہد کی جائے۔ اور ان کو ان ہی کے دلائل سے بند کر دیا جائے۔ مولوی ثناء اللہ صاحب عرصہ سے اس جد وجہد میں مصروف ہیں خدا انھیں ثواب عظیم عطا کرے مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان کی تصانیف خرید کر ان کو زیادہ سے زیادہ کام کرسکنے کا موقع دیں۔

مسئلہ قومیت :۔ از مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ترجمان القرآن لاہور سائز ۲۰×۲۶/۸ صفحات ۶۴ ا قیمت بے جلد عہ کاغذ، کتابت اور طباعت اچھی۔

مولانا موصوف نے یہ مقالہ قومیت کے مسئلہ کو واضح کرنے کے لیے لکھا ہے کہ اصل مقصد قوم اور قوم پرستی سے کیا ہے اور اسلام میں قومیت کے کیا معنی ہیں۔ جماعت، قوم اور امت کے معانی میں کیا فرق ہے اور مسلمانوں کی قومیت کن معنوں میں دوسروں کی قومیت سے جداگانہ ہے۔ یہ مقالہ دراصل پانچ مضامین کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات یہ ہیں۔ قومیت اسلام، کلمہ جامعہ، متحدہ قومیت اور اسلام، کیا ہندوستان کی نجات نشلزم میں ہے؟ اسلامی قومیت کا حقیقی مفہوم ہر موضوع کو بڑی وضاحت اور انشراح سے واضح کیا ہے۔ قابل قدر کتاب ہے

ہفت اورنگ (حصہ اول) از اقبال حسین صاحب انصاری جونپوری ملنے کا پتہ ابو محمد انصاری محلہ سپاہ جونپور۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۶۴ ا قیمت عہ کاغذ، کتابت وطباعت معمولی۔

یہ سات مضمونوں کا مجموعہ ہے جو فارسی ادب سے متعلق مضامین پر لکھے گئے ہیں۔ فہرست مضامین یہ ہے۔ زردشت، ایران میں شاعری وادب، فردوسی طوسی، چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی۔ صوفیانہ لٹریچر، لسان الغیب، شیخ علی حزیں۔ ان مضامین میں کوئی دادِ تحقیق نہیں دی گئی ہے لیکن جو کچھ ہر موضوع پر موجود تھا اس کو ایک جگہ جمع کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور اس لیے فارسی ادب کے طالب علموں کے لیے ایک مفید چیز ہے۔

ذکر و فکر:۔ از مقصود زاہدی ملنے کا پتہ نمبر ۱۶ زاہدی برادرز، زاہدیان میرٹھ۔ سائز $\frac{20\times30}{16}$ صفحات ۱۲۷، قیمت ۸؍ کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت اچھی۔

یہ مقصود صاحب کے چند سماجی، سیاسی اور نفسیاتی چھوٹے چھوٹے گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں وہ مطالعے خصوصیت کے ساتھ جاذب توجہ ہیں جو نفسیاتی جزئیات نگاری پر مبنی ہیں۔ مثلاً میلے کو، بندگی و بیچارگی، فریبِ خیال، ڈاکٹر نیگی وغیرہ۔ مقصود صاحب کے بیان میں ہلکا سا طنز ہے جو ہمارے سماجی تکلفات کا پردہ اٹھانے میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔ مقصود صاحب کی قوت مشاہدہ باریک بیں ہے اور واقعیت نگاری کے لیے یہی چاہیئے۔ ہمیں امید ہے کہ مقصود صاحب اس ذکر و فکر کو جاری رکھیں گے اور بہت جلد وہ اپنے لیے اردو ادب میں اچھی جگہ بنا سکیں گے۔

میرے نغمے:۔ از سلام مچھلی شہری ملنے کا پتہ اردو سوسائٹی دفتر ماہنامہ "اضطراب" جاپلنگ مارٹ نظیرآباد لکھنؤ۔ صفحات ۱۰۲، سائز $\frac{22\times29}{16}$، قیمت ایک روپیہ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔

کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی تھی پھول اور انگارے، اول الذکر میں رومانی نظمیں اور دوسرے حصہ میں انقلابی نظمیں شائع ہونا تھیں لیکن سرکاری اجازت نہ ملنے کے باعث صرف پہلا ہی حصہ شائع ہو سکا ہے۔

سلام مچھلی شہری صاحب اردو کے ان نوجوان شعرا میں سے ہیں جو ادب کو زندگی سے قریب تر دیکھنا چاہتے ہیں جو تمام نظام معاشرت میں مساوات کے حامی ہیں اور جو موجودہ سیاسی تنظیم کو پلٹ کر ایسے نظام کے حامی ہیں جس میں ہر ایک کو برابر کے مواقع ملیں نہ کوئی ظالم ہو نہ مظلوم نہ کوئی آقا ہو نہ خادم

نہ کوئی سرمایہ دار ہو نہ کوئی مزدور۔ سلام کی گرمیِ تخیل اور شدتِ احساس ان موضوع کے لیے یقیناً مناسبت رکھتی ہے۔ ان کی سیاسی نظمیں کافی معروف ہیں۔ زیر نظر رومانی نظموں میں بھی ان کا شدتِ احساس بدرجہ اتم نمایاں ہے۔ عید کی مبارکباد، کیا ایسا ہی ہوا کرتا ہے؟ افسانہ در افسانہ، محبت کے گیت، بھلا دو، وہاں، حسین تعارف اچھے مطالعے ہیں اور ہیں۔ قوی امید ہے کہ یہ نوجوان شاعر آئندہ اپنے آرٹ میں اور ترقی کرے گا

قاعدہ مفتاح القراۃ:۔ از حکیم عبداللہ رشید نواب رشد کی۔ مطبوعہ ایس ایم حسن ستارہ ہند پریس لمیٹڈ نمبر ۲۵ نمیا پوکھر لین کلکتہ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۴۴، قیمت درج نہیں۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔

فن تجوید پر یہ قاعدہ حکیم عبداللہ رشید صاحب نے بڑے غور و خوض نیز ان تجربات کے بعد شائع کیا ہے جو موصوف نے مسلم ہائی اسکول اڑیسہ میں کیے۔ اس میں مختلف مشقوں کے ذریعہ طلبا کو حروف کے جوڑ ان کے صحیح تلفظ اور صحیح آوازوں کے متعلق صحیح رہبری کی گئی ہے۔ طلبا کے لیے بہت مفید چیز ہے۔ امید ہے عربی اور فن تجوید کے طالب علم اس سے ضرور استفادہ کریں گے۔

پارہ عم:۔ مرتبہ شعبہ اشاعت قرآن ادارہ دارالاسلام متصل پٹھان کوٹ۔ سائز ۲۰×۳۰/۸ صفحات ۹۶ قیمت ۸؍ کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی۔

یہ پارہ عم دارالاسلام نے مع ترجمہ و تفسیر و معانی الفاظ شائع کیا ہے۔ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر لفظ کے معنی الگ الگ بھی دے دیے ہیں اس سے عربی دانی میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ امید ہے کہ ادارہ دارالاسلام پورا قرآن شریف اسی اہتمام سے شائع کر سکے گا طلبا اور عوام کے لیے یکساں مفید ہے۔

شمیم کے سو شعر:۔ مرتبہ سید جمیل الدین ملنے کا پتہ۔ عثمانیہ بکڈپو دکان نمبر ۱۵ محمد علی بلڈنگ بمبئی نمبر ۳ صفحات ۴۰ تقطیع چھوٹی قیمت ۴؍ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

جناب سید مظفر حسین صاحب شمیم کے یہ سو منتخب اشعار جمیل الدین صاحب نے پیش کیے ہیں۔ مختصر پیش لفظ پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب نے لکھا ہے۔ انھوں نے صحیح تحریر فرمایا ہے کہ شمیم صاحب کے کلام میں صداقت زیادہ ہے، نظر میں گہرائی بھی ہے اور دل پرسوز بھی۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

سینے میں اک چھالا سا تھا کیا جانے کب پھوٹ گیا — پوچھ رہے ہو دل کی حالت۔ دل کی حالت کیا کہیے

بھیگے ہوئے یہ بادل جھکی ہوئی یہ راتیں — یاد آ گئیں پھر مجھ کو بھولی ہوئی برساتیں
لب پہ نالہ نہیں، شکوہ نہیں فریاد نہیں — سچ تو یہ ہے کہ ترا کوئی ستم یاد نہیں

سالنامہ نظامیہ:- مرتبہ ابوالخیر کنج نشیں۔ ملنے کا پتہ ادارہ ترقی تعلیم اسلامی حیدرآباد دکن صفحات ۱۹۶، قیمت عہ سائز ـــــ کتابت طباعت اچھی کاغذ معمولی۔

حیدرآباد دکن کی ایک قدیم مذہبی درسگاہ کا نام جامعہ نظامیہ ہے۔ چند سالوں سے اس جامعہ کا یوم تاسیس منایا جاتا ہے۔ اس سال فروری ۱۳۶۱ء میں منایا گیا۔ اس سلسلے میں جامعہ نظامیہ کی علمی مذہبی خدمات نیز کارگزاریوں اور حالات میں جو مقالے اور مضامین ترتیب دیے گئے وہ اس رسالہ میں درج ہیں۔ چند مضامین اس سلسلے کے علاوہ بھی شامل کیے گئے ہیں مثلاً تاریخ قراۃ و تجوید، آزادی نسواں اور مسئلہ حجاب و حدود ستر و نظر، شعر العرب (جو پہلے کتابی صورت میں بھی شایع ہو چکا ہے) وغیرہ جو قابل مطالعہ ہیں۔

نصاب تعلیمی مرکز:- انجمن خدمت خلق، عربک کالج دہلی

تعلیم بالغان کے اس بڑے مرکز نے اپنا نصاب حال ہی میں شایع کیا ہے جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مرکز کتنی تن دہی اور جاں فشانی سے بلا کسی معاوضے کے اس کام کو کامیابی کے ساتھ کر رہا ہے۔ تعلیم اور سامان تعلیم سب مفت مہیا کیا جاتا ہے۔ مرکز میں کل چار جماعتیں ہیں ہر جماعت کے نصاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ لکھائی پڑھائی، حساب اور عام معلومات۔ اصل میں خواندگی کا نصاب تو پہلی جماعت میں ختم ہو جاتا ہے باقی اگلی تین جماعتوں میں ان کی مشق کو مستحکم کیا جاتا ہے اور شوق کو ابھارا جاتا ہے۔

ایک اخبار، ایک دارالمطالعہ، ایک لائبریری اور ایک انجمن بھی قایم ہے۔ ضرورت ہے کہ صاحب استعداد حضرات ضرور حتی الوسع اس کی مالی امداد کریں نیز لوگ اس سے ہر طرح کا فائدہ اٹھائیں۔ نصاب مندرجہ بالا پتہ پر کارڈ لکھ کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔

شیطان کا انتقام (دور حاضرہ کے علمی، اداراتی اور سیاسی رجحانات پر ایک تیز و تند اور تلخ تبصرہ) از جلال الدین اشک قیمت عہ صفحات ۹۶۔ پتہ درج نہیں۔

سلک گوہریں (ایک عنائی تمثیل) از جلال الدین اشک قیمت ہم ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد، حیدرآباد دکن۔

اشک صاحب کی پہلی کتاب اس تلخی اور مایوسی کی آئینہ دار ہے جو اس دور کے اکثر ذہین اور ہونہار نوجوانوں میں پائی جاتی ہے اور جو دراصل اس دور کی روح ہے۔ اس میں انھوں نے موجودہ دنیا اور اس کی تمام برکتوں کو شیطانی بتایا ہے اُن کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان باوجود بہت سی نعمتوں کے چونکہ مسرت سے محروم ہو گیا ہے اس لیے وہ اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کرتا ہے۔ مسرت سے محرومی اشک صاحب کے نزدیک شیطان کا کرشمہ ہے۔ انسانی اعمال کی ذمہ داری اتنی آسانی سے شیطان پر نہیں رکھی جا سکتی۔ دراصل ملکوتیت اور شیطنیت خود انسان کے اندر موجود ہے۔ اس کش مکش سے انسانی زندگی کی دلچسپیاں قایم ہیں۔ "ارتسامات" کے تحت میں ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اشک صاحب کا شیطان کا استعمال اچھوتا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں اگر دوسرے ادبیات سے قطع نظر کی جائے تو بھی اردو میں سجاد انصاری، فلک پیما۔ رشید احمد صدیقی، اقبال ان سب کے ہاں یہی تصور ملتا ہے۔ دراصل اردو میں سب سے پہلے شیطان کو سجاد انصاری نے محرم راز کی حیثیت سے پیش کیا۔ اقبال اسے خواجہ اہل فراق بھی کہتے ہیں اور اس کے "سوز نفس سے کار عالم کی استواری" بھی عبارت سمجھتے ہیں۔ اشک صاحب نے زیادہ سے زیادہ اپنی پوری کتاب میں اقبال ہی کے بعض اشاروں کو واضح کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک شعروادب، تنقید، فلسفہ، آرٹ، عورت سب اس لیے گردن زدنی ہیں کہ بعض شیطانوں نے انھیں اپنی اغراض کے پورا کرنے کا آلہ سمجھا ہے۔ یہ ذہنیت دلچسپ ضرور ہے۔ اور پرخلوص بھی۔ مگر بالکل صحیح نہیں۔ ایک مسرت وہ ہوتی ہے جو "احساس زیاں" نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک وہ ہے جو سود و زیاں دونوں سمجھنے سے۔ دراصل انسان پہلے احساس زیادہ رکھتا ہی نہ تھا اس لیے اگرچہ وہ خوش تھا مگر اس کی خوشی بچوں کی سی تھی۔ وہ صرف خوش رہنے کے لیے نہیں آیا، وہ رنج و راحت، بلندی و پستی کو ہموار کرنے کے لیے آیا ہے۔ اقبال کے ابلیس نے جو دنیا کی تعریف کی ہے وہ دراصل اشک صاحب کے تصور سے زیادہ حقیقی ہے۔

سوز و ساز و درد و رنج و آرزو و جستجو

یوں دیکھیے تو مسرت کی کمی اتنا بڑا جرم نہیں رہ جاتی بلکہ اس سے محرومی اس بے حسی سے بہتر ہے جو بعض وقت مسرت کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے

دراصل زندگی پر ایک بہتر تبصرہ اشک صاحب کی دوسری کتاب "سلک گوہر" میں ملتا ہے۔ اگرچہ یہ بہت مختصر ہے۔ اس میں شاعری، غزل، قصیدہ، مرثیہ اور اس قسم کے دوسرے سانچوں سے آزاد ملتی ہے۔ غنائی شاعری اردو میں اب شروع ہوئی ہے۔ اس لیے اس کی اٹھان ہمدردی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھنی چاہیئے اشک صاحب کے اشعار میں شعر کی روح ضرور موجود ہے مگر ابھی طریقۂ اظہار پر قدرت حاصل نہیں ہوئی اور بعض مصرعے اور شعر اعتراف عجز کی زندہ مثالیں ہیں۔

دونوں کتابیں توجہ سے پڑھنے کے لایق ہیں۔ شیطان کا انتقام پر جوش نثر میں لکھا گیا ہے۔ کاش خیالات اور گہرے اور رچنے ہوتے تاکہ سطحیت بالکل نہ آنے پاتی۔

ہمارے مزدور:۔ از محمد عبدالقادر صاحب لکچرار شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ: ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی صفحات ۷۰، قیمت درج نہیں کاغذ، کتابت وطباعت بہت اچھی۔

انجمن ترقی اردو نے اپنے پروگرام کے ماتحت یہ چھوٹا سا رسالہ اس لیے نکالا ہے تاکہ عام لوگ معاشیاتی مسائل سے اچھی طرح باخبر ہوسکیں۔ عبدالقادر صاحب نے یہ رسالہ بڑی تحقیق سے مرتب کیا ہے اور اس میں وہ تمام معاشیاتی مسائل آگئے جو ہندوستان کے ایوان قانون سازی میں منظور ہوکر عمل پذیر ہوتے رہے ہیں۔ آکسفورڈ پریس کی طرح یہ عام فہم طریقۂ علوم پھیلانے کا یقیناً بہت مفید اور اچھا ہے۔ امید ہے کہ انجمن مذکور اس قسم کے دیگر رسائل بھی ملک کے سامنے جلد رکھ سکے گی۔ اگر آئندہ زبان اور آسان ہو تو بہتر ہوگا اور عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

رسالے:۔

اضطراب:۔ ایڈیٹر مسعود اختر جمال۔ دارالاشاعت دفتر اضطراب پانڈے حویلی بنارس صفحات ۴۸ چندہ سالانہ ۲ روپے کاغذ، کتابت وطباعت اچھی۔

یہ رسالہ جگر مراد آبادی صاحب کی نگرانی اور مسعود اختر جمال صاحب کی ادارت میں کچھ عرصہ سے شائع ہورہا ہے۔ اس عرصہ میں اس نے کافی ترقی کرلی ہے۔ مضامین، افسانوں نظموں اور غزلوں کا اچھا مجموعہ ہوتا ہے بعض اچھے مضامین دوسرے رسالوں سے بھی مستعار لیے جاتے ہیں اس صورت سے اس کی خوبی اور بڑھ جاتی ہے۔ زیر نظر نمبر جولائی و اگست کا ہے۔ اس میں بھی اچھے اچھے رسالوں کے اچھے اچھے ادبی او علمی مضامین مجتمع ہیں یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ انگریزی میں کئی رسالے اس قسم کے نکلتے ہیں جن میں تمام دیگر رسالوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ اس رسالہ میں اس نچوڑ کے علاوہ اس کے اپنے مضمون نگاروں کے بھی مضامین اور نظمیں ہیں اگر یہی رفتار اضطراب کی رہی تو امید ہے کہ وہ اپنی جگہ مضبوط تر پیدا کرے گا۔

سہیل (خاص نمبر) مدیران عارف سنبھاروی و قیصر عثمانی صاحبان۔ صفحات تقریباً ۲۱۶۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ سہیل گیا۔ کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔

رسالہ سہیل کا خاص نمبر بڑی خصوصیت کے ساتھ نکلا کرتا ہے۔ اور بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اچھے اور تحقیق سے لکھے ہوئے مقالے، دلچسپ نظمیں اور اچھے ڈرامے ہوتے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں بھی "آغا حشر اور اس کا آرٹ"۔ "موازنہ غالب و مومن میری نظر میں"۔ "دقیقی اور فردوسی" وغیرہ مضامین بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح افسانوں، ڈراموں نظموں اور غزلوں کا معیار بھی برا نہیں ہے۔ شائقین کے لیے ایک اچھے مطالعہ کا سامان ہیں۔

فہرست مضامین پر اگر صفحات دے دیے جاتے تو اچھا تھا نیز ان کی ترتیب بھی جیسی عام طور پر ہوتی ہے ویسی ہونا چاہیے تھی تاکہ پڑھنے والوں کو آسانی ہو۔ اشتہارات کا معیار بہت گرا ہوا ہے۔ ادبی رسالوں میں جنسی امراض کے اشتہارات نہ ہونے چاہئیں۔

نئی زندگی مدیر انیس الرحمٰن صاحب۔ ملنے کا پتہ دفتر رسالہ نئی زندگی ۹۴ سپلیمنٹری زیرو روڈ الہ آباد چندہ سالانہ صہ۔ فی پرچہ ۸؍۔ صفحات ۶۴۔ کاغذ، کتابت طباعت اچھی۔

یہ رسالہ جولائی ۱۹۴۱ء سے ڈاکٹر سید محمود کی سرپرستی میں نکلنا شروع ہوا ہے۔ مقصد اس رسالہ کا یہ ہے اس میں خالص ہندوستانی کلچرل مسائل پر بحث کی جائے اور ہندو اور مسلمان دونوں کے

ادیبوں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے مشترک کلچرل ترکے کو پیش کریں تاکہ ایک دوسرے سے گزشتہ کی طرح قریب آسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسے رسالے کی سخت ضرورت تھی۔ موجودہ ہندوستان کی فضا دیکھتے ہوئے۔ اس قسم کے رسائل کا نکلنا مفید اور پرنتائج ثابت ہوگا۔ زیر نظر اگست نمبر میں خاص خاص مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ (۱) مسلم عہد حکومت میں ہندؤں کی حالت (۲) سندھ پر عربوں کا حملہ (۳) یورپین سامراج کی اسلام نوازیاں۔ (۴) ہندوستان میں زبان کا مسئلہ (۵) آنند (افسانہ)۔ (۶) تمام مذاہب عالم کی حیرت انگیز یکسانیت۔ (۷) مرہٹہ حکمراں فرقہ پرست نہ تھے۔ مضمون نگاروں کی فہرست جو صفحہ ۳ پر دی گئی ہے اسی سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نئی زندگی والوں نے کس قدر ستھرا انتخاب کیا ہے۔ ہمیں نوجوان طبقہ ہی سے آیندہ کی بہتری کی امید ہوسکتی ہے۔ خدا کرے یہ رسالہ اور اس کا مقصد و معیار قایم رہے۔

ہمارا اخبار۔ مرتبہ سید محمد ادیس ڈپٹی کلکٹر بلیا۔ صفحات ۱۰۔ سائز ۱۷×۲۷/۴ چندہ سالانہ عہ ر

یہ پندرہ روزہ اخبار جنگ کی حقیقتوں کو جاری رکھنے کے لیے نکالا گیا ہے۔ اپنے مقاصد کے پیش نظر اس کی ترتیب بہت معقول اور مناسب ہے۔ اردو اور ہندی دونوں رسم الخط میں نکل رہا ہے۔

رفتارِ زمانہ

اس مہینہ میں، اب تک جنگ کے کوئی کارنامے، خاص طور سے بیان کے قابل نہیں ہیں لیکن تقریریں کئی ہوئی ہیں، جو اپنی اپنی جگہ پر فتوحات کا درجہ رکھتی ہیں۔ ہم ان کی تعریف کریں تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ہم ان کا اصل مطلب نہیں سمجھے، انھیں نظر انداز کریں اور بات اسی کو مانیں، جو توپ کے مُنہ سے کی جائے تو یہ بھی غلط ہوگا۔ یہ تقریریں ہمیں سیاست کے وہ بھید بتاتی ہیں، جو اور کسی طرح سے معلوم نہیں ہوتے۔ یہ تبصرے ہیں ان واقعات پر جو ہمیں روز کی خبروں میں تھوڑے تھوڑے بتائے جاتے ہیں اس طرح کہ ان کی مجموعی شکل ہمارے سامنے نہیں آتی جنگ کی خبر صرف یہ ہے کہ جرمنی کا قریب قریب پورے جزیرہ نما کریمیا پر قبضہ ہوگیا ہے اور جرمن ہوائی جہاز، دون (Don) اور وولگا دریاؤں کے درمیان جو علاقہ ہے اس پر منڈلا رہے ہیں، یعنی قفقاز کو روس سے الگ کرنے کی کارروائی شروع ہوگئی ہے، کریمیا پر قبضہ کرنے کا منشا بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک ہوائی مرکز بنایا جائے، جہاں سے بحرِ کیسپین کے کناروں تک مشرق میں اور ترکی کے ساحل تک جنوب میں ہوائی جہاز بھیجے جا سکیں۔ ماسکو کے گرد لڑائی ہو رہی ہے جرمنوں کو جان اور مال کا بہت نقصان ہو رہا ہے لیکن وہ ماسکو کا محاصرہ کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ روسیوں نے یہ ہوشیاری کی کہ ماسکو کے جنوب میں جتنے کارخانے تھے، ان میں سے کام کی چیزیں پہلے ہی اُٹھا لے گئے اور محاذ سے دور مشرق کی طرف جا کر نئے کارخانے قائم کر دئے اور جیسے اوکرائن میں ملبے کے ڈھیروں کے سوا جرمنی کے کچھ ہاتھ نہ لگا تھا ایسے ہی یہاں بھی ہو رہا ہے۔ جنگ کے شور اور پریشانیوں میں ایسا کام کر جانا بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن روسیوں کے پاس سامانِ جنگ کی پہلے بھی کمی تھی کارخانوں کو اس طرح منتقل کرکے انھوں نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ سامان تیار ہوتا رہے مگر بنتا پہلے کے مقابل میں کم ہی ہوگا، لینن گراڈ کا محاصرہ بدستور جاری ہے، وہاں کی روسی فوج اکثر نکل کر

دشمن کو نقصان پہنچاتی ہے، لیکن گھیرے سے نکل نہیں پاتی۔ یہ حالت بہت مایوسی کی ہوتی اگر روسی ہمت ہار جاتے۔ وہ ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان کا استقلال بڑھتا جاتا ہے اور اسٹالن کی جو تقریر حال میں ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ناکامی اور نقصان روسیوں کے ارادے کو اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے اس کے مقابلے پر ہر ہٹلر کی وہ تقریر رکھنا چاہئے جو انھوں نے کچھ دن ہوئے میونچ میں کی تھی اور جس میں طرح طرح سے بات بنا کر دکھایا گیا ہے کہ جرمنی کو کوئی ناکامیابی نہیں ہوئی ہے، ہر ہٹلر کی تقریریں اور بہت سے نکتے بھی تھے، جن کا تعلق روس کی جنگ سے نہیں، بلکہ دنیا کی سیاست سے ہے۔ جنگ ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ اس وقت ذرا ان تقریروں پر غور کریجئے جو اس جنگ کا حال بتاتی ہیں اور اس سیاست کا جس کی خاطر یہ جنگ ہو رہی ہے۔

ہر ہٹلر کی تمام تقریریں ایک سی ہوتی ہیں۔ ان کے اصول وہی ہیں، جو ہر بڑے پیمانے کی صنعت کا، کہ الگ الگ کل پرزے تیار کرلئے جائیں اور پھر انھیں جوڑ کر جو چیز بنانا ہو تیار کرلی جائے۔ ہر ہٹلر کی تقریر میں بہت سی پرانی باتیں تھیں اور بالکل نئی بات شاید کوئی بھی نہیں تھی۔ لیکن دنیا کی حالت بدلتی رہتی ہے اور ہر ہٹلر اپنی پرانی تقریروں میں کچھ بڑھا کر اور کچھ گھٹا کر جو نئی تقریر کرتے ہیں، اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ روس کی جنگ کے بارے میں انھوں نے کہا کہ ہم جس طرح چاہتے ہیں لڑتے ہیں، کبھی آگے بڑھتے ہیں، کبھی موسم کو ناموافق دیکھ کر یا رسد کا انتظام کرنے کے لئے ٹھہر جاتے ہیں۔ ہمارا مقصد تماشا دکھانا نہیں ہے، ہم دشمن کی فوج کو ختم کرنا اور ملک پر پورا قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات ہر ہٹلر پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لیکن چند دن کے اندر ماسکو فتح کرنے کا دعویٰ جو انھوں نے پہلے کیا تھا وہ اس مرتبہ دہرایا نہیں گیا۔ اس کے بجائے انھوں نے لینن گراڈ کے محاصرہ کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اس شہر کو گھیرے بیٹھے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ایک دن یہاں کی فوج ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے پاس نہ کھانے کو کچھ رہے گا اور نہ گولہ بارود۔ ہم محاصرے میں ایک سپاہی کی جان بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے، بس محاصرے کو جاری رکھیں گے اور اگر روسی دوسرے شہروں کی طرح لینن گراڈ کو اڑا دیں گے تو یہ بھی ہمارا کام ہے جو ان کے ہاتھوں اور خود بخود ہو جائے گا۔ خود بخود ہونے والا

کام کتنے دنوں میں ہوگا یہ ہرہٹلر نے نہیں بتایا اور وہ بتا بھی نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ اب جاڑا شروع ہوگیا ہے اور ان کا وعدہ تھا کہ اس کی جنگ جاڑوں سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

سیاست پر جو تبصرہ ہرہٹلر نے کیا ہے، وہ بھی اسی انداز میں تھا۔ وہ برطانیہ پر جنگ جوئی کا الزام لگاتے ہیں جس کا مطلب ہماری زبان میں یہ ہے کہ برطانیہ ان سے صلح کرنے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہرہٹلر اپنی طرف سے کئی مرتبہ صلح کی بحث چھیڑ چکے ہیں۔ اس کی استالن نے بھی تصدیق کی ہے۔ کہ ہرہٹلر نے مغربی ملکوں کو روس کے خلاف ملانا چاہا۔ اپنی تقریر میں استالن نے یہاں تک کہا کہ ہرہیس اصل میں جرمنی اور برطانیہ کے درمیان صلح کرانے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ جنگ کی ذمہ داری برطانیہ پر ڈالنے میں ہرہٹلر کا منشا یہ واضح کرنا ہے کہ برطانیہ یورپ کی اس نئی تنظیم میں حائل ہے وہ جو کرنا چاہتے ہیں اور جس کے لئے وہ سمجھتے ہیں کہ اب فضا موافق ہے، اٹلی ان کے قابو میں ہے، فرانس کو انھوں نے اس حد تک راضی کر لیا ہے کہ اب فرانسیسی فوج روس کے خلاف لڑنے کے لئے تیار کی جارہی ہے، یورپ کی باقی تمام قومیں ہرہٹلر کے ماتحت یا ان کی دست نگر ہیں۔ اس لئے جرمنی کے پروپیگنڈا ڈیپارٹمنٹ کو اس بات کا چرچا کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی ہوگی کہ یورپ کی تمام قوموں کی ایک کانفرنس جلد ہونے والی ہے۔ کانفرنس کا اشتہار دینے کے لئے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے پہلے کہا گیا تھا کہ اس کا اجلاس ماسکو کے مشہور محل کریملن میں ہوگا لیکن جرمن فوجیں ابھی تک ماسکو نہیں پہنچ سکی ہیں۔ اس لئے کانفرنس مجبوراً ویانا میں ہوگی کانفرنس کا غالباً ایک مقصد یہ ہوگا کہ جرمنی نے اب تک جو کچھ کیا ہے، اس کی تصدیق ہو جائے اور آگے کے لئے جرمنی کو اس کا باضابطہ طور پر اختیار ہو جائے گا کہ جس طرح سے چاہے جنگ کرے اور جس طرح چاہے صلح کی تدبیریں کرے۔ یہ بات شاید صاف صاف کہی تو نہیں جاتی لیکن کانفرنس میں صلح کی تحریک بھی اٹھائی جائے گی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ جنگ کا اصل ذمہ دار وہ ہے، جو اس وقت صلح سے انکار کرے۔

ایسے تو کانفرنس کی کوئی اہمیت نہیں، لیکن اس سے لوگ غلط فہمی میں پڑ سکتے ہیں، ترکی میں جرمنی کے اشارے پر یہ غلط فہمی جان بوجھ کر پھیلائی جارہی ہے، ترک دیکھتے ہیں کہ جنگ روز بروز ان کے ملک کے

قریب آتی جا رہی ہے۔ انھیں اندیشہ ہے کہ وہ اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے، اس لئے قدرتی طور پر وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے جرمنی اور برطانیہ میں صلح کرا دی جائے۔ ترکوں کی اس خواہش سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے جرمن کہتے پھرتے ہیں کہ ہاں ہاں اب صلح ہو جانا چاہئے، اب کوئی وجہ نہیں ہے کہ جنگ جاری رکھی جائے اور ترک جو دل سے صلح پسند ہیں اب اس کی کوشش کریں تو صلح اور بھی جلدی ہو سکتی ہے۔ ترکوں کو سب اپنا دوست سمجھتے ہیں اس لئے مناسب یہ ہے کہ صلح کانفرنس قسطنطنیہ میں ہو، واقف کار ترک تو وہی سمجھتے ہیں اور وہی کہتے ہیں، جو کہ ترکی کے صدر عصمت پاشا نے جمہوریہ کی برسی کے موقع پر اپنی تقریر میں بیان کیا تھا، لیکن سب لوگ واقف کار اور ہوشیار نہیں ہوتے وہ تو جنگ سے بیزار ہیں اور ہر تنکے کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں۔

سمجھدار ترک تو جانتے ہیں کہ برطانیہ جرمنی سے صلح نہیں کرے گا اور ابھی صلح کا نام لینا فضول ہے لیکن ہر ہٹلر کے دماغ میں یہ بات نہیں سماتی، وہ صلح اور جنگ کو ایک کھیل سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق فرانس کو شکست کے بعد برطانیہ کو صلح کر لینا چاہئے تھا۔ اب پھر ان کے نزدیک روس کی شکست کے بعد صلح کی گفتگو کرنے کا موقع آئے گا۔ ہمارے لئے اول تو روس کی شکست کا ابھی کوئی سوال ہی نہیں ہے اس لئے کہ روس اپنی موجودہ حالت میں بھی مہینوں لڑ سکتا ہے، دوسرے اگر خدانخواستہ روس نے شکست بھی کھائی تو برطانیہ صلح کی گفتگو کرنے کے بجائے، جنگ جاری رکھنے کا نئے سرے سے عہد کرے گا مسٹر چرچل پچھلے سال کہہ چکے ہیں کہ برطانیہ اگر ضروری ہوا تو برسوں تک اور ضروری ہوا تو اکیلا لڑتا رہے گا! تالن نے اپنی پچھلی تقریر میں روس کی طرف سے ایسا ہی کچھ کہا تھا تالن ہمسٹر چرچل اور پریزیڈنٹ روزولٹ کی تقریروں سے دنیا پر ظاہر ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرا کا ساتھ کسی حالت میں چھوڑنا نہیں چاہتے اور جہاں تک ممکن ہوگا وہ ایک دوسرے کو سہارا دیتے رہیں گے۔ متحدہ ریاستوں نے روس کو بہت بڑی رقم قرض دی ہے۔ پریزیڈنٹ روزولٹ نے اس کا انتظام کر لیا ہے کہ اگر جلد فیصلہ کرنا ہو، تو ان کی اور اتالن کی گفتگو براہ راست ہو جائے اس طرح روس میں جنگ جاری رکھنے کا سامان ہو گیا ہے اور کوئی تعجب نہیں، اگر اسٹالن کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے کہ مغربی یورپ میں کہیں پر برطانوی فوجیں لڑیں اور جرمنی کے خلاف محاذ قائم کریں۔

پریزیڈنٹ روز ولٹ کا اختیار بھی روز بروز بڑھتا جارہا ہے، انھیں صرف صحیح تدبیر سوچنے میں کمال حاصل نہیں ہے، وہ اپنی قوم کو ذہنی مصلحت سمجھا بھی سکتے ہیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ لینڈ اینڈ لیز ــــ ادھار بٹا کا قانون منظور ہوا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اب قانون غیر جانب داری میں ترمیم کی جارہی ہے اس کے بعد متحدہ ریاستوں کے تمام تجارتی جہاز مسلح ہو جائیں گے امریکہ سے انگلستان ہر قسم کا مال امریکہ کے جنگی جہازوں کی حفاظت میں پہنچایا جا سکے گا اور برطانوی بیڑا خالص جنگی کارروائیوں کے لئے وقف کیا جا سکے گا۔ اس طرح وہ اتحاد جو اب تک دل میں تھا، ایک بہت معقول عملی صورت اختیار کرے گا اور متحدہ ریاستیں، برطانیہ اور روس ایک دوسرے سے مل جائیں گے کہ فاشسٹ قوموں کا کوئی منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔

جاڑا شروع ہو گیا ہے اور جنگ ایک موسمی کیفیت کیطرح ان میدانوں میں بھی پھیل رہی ہے جہاں اب تک دھوپ اور ریت نے مورچوں اور خندقوں سے نکلنا مشکل کر دیا تھا۔ پچھلے سال برطانوی سپہ سالار نے لیبیا میں پیش قدمی دسمبر کے دوسرے ہفتے میں شروع کی تھی اس مرتبہ دشمن زیادہ چالاک اور مستعد ہے اس لئے ضروری تھا کہ اسے تیار ہونے کا موقع کم سے کم دیا جائے۔ موسم کے ناموافق ہو جانے کا امکان ابھی باقی ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ بارش کی وجہ سے فوجی کارروائیوں میں خلل پڑتا ہے لیکن اچانک حملہ کرنے میں بھی بڑے فائدے ہیں، ان کو خالی اس بنا پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ موسم اپنا رنگ بدل کر پریشان کرے گا۔

واقف کار لوگوں کے اخباروں میں جو بیانات شائع کرتے ہیں ان سے آپکو معلوم ہو گیا ہوگا کہ ریگستان کی لڑائی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا ہے یہ زمین ایسی ہوتی ہے جو کسی کو سہارا نہیں دیتی جس پر کسی کے قدم جمنے نہیں پاتے۔ کبھی آدمی اس کے اوپر ہوتا ہے تو کبھی یہ آدمی کے اوپر ہو جاتی ہے اس میں نہ راستہ بنایا جا سکتا ہے نہ ٹھکانہ اور اگر کسی کو اس کا پتہ رہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کی منزل کدھر ہے تو یہی بہت غنیمت ہے۔ ایسی زمین میں کوئی مستقل محاذ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تھوڑی تھوڑی کرکے فتح نہیں کی جا سکتی اس لئے اگر آپ کی سمجھ میں فوراً نہ آجائے کہ لیبیا میں برطانوی اور جرمن فوجوں کی لڑائی کس طرح ہو رہی ہے تو اسے سمجھانے والے کا قصور نہ جانیئے، ریگستان کی جنگ میں فوج کے مختلف حصے اس

طرح گھٹائے اور بڑھائے جاتے ہیں جیسے سمندر میں جنگی جہاز، اس میں جو مسلح موٹر اور ٹینک شریک ہوتے ہیں انھیں خیال رکھنا ہوتا ہے کہ پٹرول بھرنے کے لئے میدان چھوڑنا پڑے گا اس لئے جو مقابلے ہوتے ہیں وہ بھی شدید اور مختصر ہوتے ہیں جیسے جنگی جہازوں کے مقابلے۔

لیبیا کا سارا میدان جنگ، ریگستان نہیں ہے، ساحلی علاقہ میں پہاڑیاں ہیں اور ان پہاڑیوں میں وہ بستیاں اور مورچے ہیں جن میں برطانوی اور جرمن فوجیں اب تک قدم جمائے بیٹھی تھیں۔ برطانیہ کی موجودہ پیش قدمی کا مقصد یہ ہے کہ جرمن فوجوں کو ان کے مورچے سے نکال کر اور انھیں گھیر گھیر کر ختم کر دیا جائے۔ یہ مورچے ساحل کے قریب ہیں اور سمندر پر برطانیہ کا قبضہ ہے۔ اس لئے برطانیہ کا بیڑا بھی فوج کی مدد کر رہا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی نہ ہو۔ اٹلی کی فوجیں تو پچھلی دفعہ کی طرح اس مرتبہ بھی گرفتار ہو کر جنگ سے چھٹکارا حاصل کرنے پر تیار رہوں گی۔ اٹلی کے سرکاری ریڈیو نے جنگ کی دشواریوں کو بیان کرنا بھی شروع کر دیا ہے مگر جرمن فوجوں کا معاملہ کچھ اور ہے، ان کی طرف سے بھی ہر ہٹلر کہہ چکے ہیں کہ جنگ کا حساب کتاب تفصیلی نہیں ہوتا مجموعی ہوتا ہے، یعنی کہیں کامیابی ہوتی ہے اور کہیں شکست اور جیت اس کی سمجھنا چاہئے جس کی کامیابی کے کھاتے میں سب سے زیادہ رقم نکلے۔ یہ بات ٹھیک ہے اور اسے ہر ہٹلر ہی نہیں، برطانیہ کے رہنما بھی کہتے ہیں۔ لیکن ہر ہٹلر جانتے ہیں کہ ان کی سیاست اور جنگ ناکامیوں کو برداشت نہیں کر سکتی، وہ اپنے کھاتے میں اس مد کو رکھ ہی نہیں سکتے۔ اسی وجہ سے جنوبی اٹلی، کریٹ اور یونان میں جرمن فوجیں تیار رکھی گئی ہیں، لیبیا کے محاذ پر سامان جنگ بھی پہنچایا گیا ہوگا اب تک اٹلی سے افریقہ تک سامان جہازوں میں آتا تھا، اب معلوم ہوتا ہے کہ سامان اور رسیا ہی ہوائی جہازوں سے بھیجے جا رہے ہیں، کیونکہ جہاز انھیں وقت پر نہیں پہنچا سکتے ہیں۔ یہ طریقہ کریٹ میں کارآمد ثابت ہوا تھا مگر وہ لڑائی بہت چھوٹے پیمانہ پر تھی اور وہاں بھی جرمنی نے بہت نقصان اٹھایا تھا۔ لیبیا کے محاذ پر اسی طریقہ سے سامان بھیجا جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جرمنی کو یہاں پر قدم جمائے رکھنے کی بہت فکر ہے، اور لیبیا کا ہاتھ سے نکل جانا اس کے لئے بڑا صدمہ ہوگا۔

لیبیا پر قبضہ رکھنے کی مصلحت بھی سمجھ میں آسکتی ہے۔ جرمنی کے لئے شمالی اور مغربی افریقہ ایک

بہت لمبا محاذ ہے جس کا ایک سرا ڈاکر میں ہے اور دوسرا لیبیا میں۔ ڈاکر اور ہسپانی مراکش کو جرمنی آہستہ آہستہ قابو میں کر چکا ہے، اور سنا ہے وہاں کے جرمن جواب تک معمولی شہریوں کا بھیس بنائے تھے، اپنی فوجی وردیاں پہن کر جرمن سیاست کے چہرے سے نقاب اتار رہے ہیں۔ (Tangiers) کے علاقہ پر، جہاں حکومت کا انتظام بین الاقوامی تھا، کئی مہینے ہوئے جنرل فرانکو نے قبضہ کر لیا اور وہ بھی جرمنی کے حوالہ کر دیا گیا ہوگا۔ اس سلسلہ کی آخری کاروائی یہ ہوئی کہ شمالی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیوں کا حاکم جنرل ویگان، جو جرمنی کے کسی قدر خلاف تھے اور یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان نوآبادیوں میں ہٹلر کی عمل داری ہو جائے، اپنے عہدے سے ہٹا دئے گئے ہیں اور فرانسیسی حکومت اب ان کی جگہ ایسے حاکم کو مقرر کرے گی جو جرمنی کی ہر خواہش کو پورا کرنے پر راضی ہو جائے۔ شمالی افریقہ سے ڈاکر تک ریلوے لائن بننے کی خبر ایک مدت سے آرہی ہے اور یہ کام اتنی تیزی سے کرایا جا رہا تھا کہ اب تک پورا ہو گیا ہوگا، ایسی صورت میں اگر برطانوی فوجیں فرانسیسی نوآبادیوں، طونس اور الجیریا کی سرحد پر پہنچ جائیں تو جرمنی کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ اسی وجہ سے جنرل ویگان معزول کئے گئے اور اسی وجہ سے خیال ہوتا ہے کہ لیبیا کی جرمن فوجیں جم کر لڑیں گی۔ بحر روم پر برطانیہ کا پورا قبضہ ہے، افریقہ کے شمالی ساحل پر بھی قدم رکھنے کی جگہ نہ رہی اور ادھر ڈاکر کی بندرگاہ پر متحدہ ریاستوں نے جنگی جہازوں کا پہرہ لگا دیا تو صرف افریقہ نہیں بلکہ بحر اٹلانٹک پر بھی جرمنی کو دسترس نہ رہے گا۔

جرمنی کے لئے بہت اچھا ہوتا اگر اسے اس وقت تک روس سے فراغت ہو گئی ہوتی۔ جرمن فوج کا پروگرام بھی یہ تھا کہ اور محاذوں پر جنگ شروع ہونے سے پہلے روس کی طرف سے اطمینان حاصل کر لیا جائے، روسیوں کی جوانمردی نے جرمنی کی یہ تدبیر الٹ دی ہے اور اس سے صرف اپنے آپ کو نہیں بچایا بلکہ اور قوموں کو بھی بہت سہارا دیا ہے۔ جرمن فوجوں کے لئے بہت ضروری ہے کہ قفقاز پہنچیں، تیل کے کنوؤں پر قبضہ کریں اور پہاڑوں کو پار کر کے شمالی ایران میں برطانوی فوجوں سے زور آزمائی کریں۔ اسی سبب سے وہ اب ماسکو پر پہلے سے بھی زیادہ سخت حملے کر رہے ہیں۔

روستوف پر قبضہ کرکے جلد سے جلد جنوب کی طرف بڑھیں گی اور جزیرہ نما کریمیا سے لاکر باتوم کے پاس بھی وہ فوج اتاریں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی. لیکن جلدی کی بھی ایک حد ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جرمن خود جو کچھ کرسکتے ہیں وہ بھی ناکافی نہیں. اس لئے ترکی کے وزیراعظم ہر ہٹلر سے گفتگو کرنے کے لیے بلائے گئے ہیں اس امید میں کہ شاید ترکوں کی مدد سے کام کچھ اور جلدی ہوجائے. ظاہر ہے ترک کسی کی دھونس میں نہ آئیں گے جرمنی جتنا اصرار کرے گا اتنا ہی وہ انکار کریں گے اور بہت ممکن ہے ہر ہٹلر جلدی میں اپنا کام اس طرح بگاڑ دیں کہ پھر وہ بنائے نہ بن سکے. فی الحال تو ہم بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ لیبیا میں برطانیہ کی پیش قدمی نے صرف ایک میدان میں نہیں. سیاست اور جنگ کے بہت سے میدانوں میں دشمن کو مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے اب لڑائی صرف لیبیا میں نہ ہوگی بلکہ اس کا محاذ ڈاکر سے شمالی ایران تک ہوگا۔

ایسٹرن فیڈرل یونین انشورنس کمپنی لمیٹڈ

ہندوستان میں قائم شدہ

صدر دفتر کلایو اسٹریٹ کلکتہ

سرپرست

عالیجناب ہز ہائینس آغا خانصاحب — عالیجناب ہز ہائیس نواب صاحب بھوپال

مجوزہ سرمایہ .... ساٹھ لاکھ روپے ۶۰۰۰۰۰۰

جاری شدہ سرمایہ .... پچیس لاکھ روپے ۲۵۰۰۰۰۰

اداشدہ سرمایہ .... دس لاکھ پچیس ہزار نوسو پانچ ۱۰۲۵۹۰۵

اپنے بیمے کے کاموں میں ہم سے مشورہ کیجئے۔ ایسٹرن فیڈرل، آگ، زندگی رسل و رسائل، موٹر ہوائی جہاز کے خطرات، مزدوروں کا مالی معاوضہ، ضمانت اور عام حادثات کے

ہر قسم کے بیمے کا کام کرتی ہے

ہندوستان کے مشہور شہروں میں ہماری ایجنسیاں ہیں

اور

ہمارے نمائندے دنیا کے ہر ملک میں ہیں

مندرجہ ذیل شہروں میں ہماری کمپنی کی شاخیں قائم ہیں

لندن، لاہور، بمبئی، حیدر آباد (دکن)

اور

احمد آباد

گذارش احوال واقعی

جو حضرات مدت دراز سے ہمارے کارخانے کی تیار کردہ اشیار استعمال کرتے ہیں.
ان سے یہ مخفی نہیں کہ کارخانے نے ۱۸۲۹ء سے اب تک سو سال کے عرصے میں
ان کے سامنے خالص چیز پیش کی ہے زمانہ کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی روز
افزوں ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انھوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم
کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کئے وہاں کارخانے کی اشیار کے متعلق بے بنیاد
باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیار کے فروخت سے فائدہ حاصل کریں
جن کے خالص ہونے میں بھی کلام ہے۔

اگرچہ وہ بظاہر خوشبو میں ہمارے مال سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں
بھی ہمارے تیل عطر سے سستا ہوتا ہے. مگر استعمال کے بعد آپ کو اس کا پتہ چل جاتا ہے علاوہ
اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض اوقات اس قسم کی آمیزش نہایت مضر ثابت ہوتی ہے

اس لئے

اپنے خریداروں سے خصوصاً جو ہمارے کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے ہیں اور
باقی خریداروں سے بھی عموماً عرض ہے کہ کفایت سے چیز خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے
کہ وہ چیز خالص بھی ہے یا محض خوشبو کو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کر دی
گئی ہے، آپ نے ہماری اصلی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی. ہماری عطریات اور
روغن انگریزی خوشبو سے پاک ہے۔

منیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجران عطر. جنا بلڈنگ لکھنؤ

قرآن حکیم کی بہترین تفسیر

"نظام القرآن"

جن کو اللہ تعالیٰ نے کتاب الٰہی کے سمجھنے کا صحیح ذوق بخشا ہے۔ ان کا اتفاق ہے کہ اس وقت تک حضرت استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ علیہ کی تفسیر "نظام القرآن" سے بڑھ کر کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی اس تفسیر نے قرآن کی تمام مشکلات حل کر دی ہیں۔ استاذ امام کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ پہلے سورہ کا عمود یعنی عنوان بحث بتلاتے ہیں، پھر آیات سورہ کا باہمی نظم اور سابق و لاحق سے سورہ کا تعلق واضح کرتے ہیں اس کے بعد سورہ کے تمام مشکل الفاظ اور مشکل اسالیب کو ایک ایک کرکے لیتے ہیں اور کلام عرب کی روشنی میں ان کو بے نقاب کرتے ہیں۔ پھر سورہ کے فلسفہ اسرار اور غوامض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور صحیح نقل اور صحیح اصل کی روشنی میں عجائب قرآن اور حکم کتاب الٰہی کو اس طرح کھولتے ہیں کہ منکر بھی قرآن کی بے پایاں عظمت کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مندرجہ ذیل اجزا چھپ چکے ہیں اہل علم اس کی قدر کریں۔ تاکہ بقیہ کی طبع و اشاعت کا سامان ہو۔

تفسیر سورۃ الفیل	اردو	۸ر	عربی	۸ر	تفسیر سورۂ لہب	اردو	۶ر	عربی	۴ر
〃 〃 کوثر	〃	۸ر	〃	۴ر	〃 〃 کافرون	〃	۴ر		
〃 〃 والتین	〃	۶ر	〃	۴ر	〃 〃 عصر	〃	۶ر		
〃 〃 عبس	〃	۶ر	〃	۴ر	〃 〃 اخلاص	〃	۵ر		
〃 〃 قیامہ	〃		〃	۴ر	〃 〃 والشمس	〃	۵ر		

تفسیر سورۂ مرسلات اردو ۵ر

قرآن سے متعلق دوسری کتابیں

مفردات القرآن (عربی)	۱۲ر	جمہرۃ البلاغۃ (عربی)	۱۲ر
اقسام القرآن (مطبوعہ مصر)	۸ر	الرای الصحیح فی من ھو الذبیح 〃	۱۰ر
فاتحہ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان (عربی)	۱۲ر	ایک عمدہ عربی ریڈر	۸ر

مکتبہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

کونسا دل ہے جس میں اپنی قوم کو بیدار اور سربلند دیکھنے کی تمنا نہیں

لیکن قوم کی بیداری کا راز نوجوانوں کی صحیح تربیت اور قوت عمل میں مضمر ہے

اقبال ہفتہ وار کا اولین مقصد نوجوانوں میں بیداری و تحریک عمل پیدا کرکے صحیح راستہ پر گامزن کرنا ہے
اس لئے ہفتہ میں ایک بار
اقبال کا خود مطالعہ کیجئے اور اپنے نونہالوں کو اس کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دیجئے

اقبال ہفتہ وار

محترم محمد حسام الدین خاں صاحب غوری جیسے تجربہ کار صحافی اور قومی کارکن کی خاص نگرانی اور
سرمست خاں صاحب آزاد کی ادارت میں شائع ہوتا ہے

جس میں

عالم اسلام کے تازہ ترین حالات موجودہ جنگ کے مفصل واقعات ہندوستان کے چپہ چپہ کی خبریں.
سلطنت آصفیہ اور اضلاع کی مکمل تفصیلات کے علاوہ، سیاسی و اصلاحی، مقالات، ادبی مضامین
معیاری افسانے، وجد آفرین و انقلابی نظمیں، نہایت اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں۔

نمونہ کے لئے دو آنہ کے ٹکٹ ارسال فرمایئے

سالانہ چندہ	ششماہی چندہ
۶ر	۳؁
(چھ روپئے)	(تین روپئے آٹھ آنے)

ملنے کا پتہ

مینجر اقبال ہفت روزہ، کنگسوے، سکندرآباد

اردو ادب میں ایک نیا اضافہ

نورس

مسعود اختر جمال کی زندگی بخش نظموں کا مجموعہ

آنے والے انقلاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ زندگی کی نئی قدروں کو پہچانیں اور اس زمانے میں جب کہ دنیا جنگ کی ہولناکیوں سے زیروزبر ہو رہی ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ مستقبل کی تعمیر و تشکیل میں آپ کی مدد کرے گا۔

قیمت فی جلد

بار اوّل	قسم اوّل مجلد تین روپئے (۳)
ایک ہزار (۱۰۰۰)	" دوم غیر " ایک روپیہ چار آنے (۱۴)

مکتبہ

ادبستان۔ پانڈے حویلی۔ بنارس

ندوۃ المصنفین کی دو نئی کتابیں

قصص القرآن

کتاب کے اس حصہ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات قبل عبور تک پوری تحقیق و تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں حضرات انبیاء علیہم السلام کے حالات اور قصص قرآنی پر اردو اور دوسری زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ "قصص القرآن" کے درجہ کی کوئی کتاب آج تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی جس میں عبر و نصائح کے اس عظیم الشان ذخیرہ کو ایسی جامعیت اور تحقیق کیساتھ یکجا کیا گیا ہو۔ "قصص القرآن" نہ صرف انبیاء علیہم السلام کے سوانح حیات کی مستند ترین تاریخ ہے بلکہ قرآن پاک کے ایک بہت بڑے حصہ کی بلند پایہ محققانہ تفسیر بھی ہے جسکی خوبیوں اور خصوصیتوں کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے ذیل میں چند خصوصیتیں درج کیجاتی ہیں۔

۱۔ تمام حالات و واقعات کی اساس قرآن عزیز کو بنایا گیا ہے اور احادیث صحیحہ اور تاریخی بیانات سے انکی توضیح و تشریح کیگئی ہے

۲۔ جدید تاریخ اور کتب عہد قدیم کے درمیان اور قرآن عزیز کے بیان کے درمیان اگر کہیں تعارض و اختلاف ہو گیا ہے تو کھلے ہوئے دلائل و براہین کے ذریعہ اس اختلاف میں تطبیق دینے کی کوشش کیگئی ہے اور پھر صداقت قرآنی کو وضاحت سے ثابت کیا گیا ہے۔ ۳۔ اسرائیلی خرافات اور معاندین کے مزخرفانہ اعتراضات کو حقائق کی روشنی میں ظاہر کیا گیا ہے۔ ۴۔ خاص خاص مقامات پر تفسیری، حدیثی اور تاریخی مشکلات پر بحث کے بعد سلف صالح کے مسلک کے مطابق ان مشکلات کا حل پیش کیا گیا ہے۔ ۵۔ ان تمام امور کے ساتھ ساتھ واقعات کے اصل مقصد اور حقیقی غرض و غایت یعنی عبرت و بصیرت کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے۔ صفحات ۴۰۰ بڑی تقطیع۔ کتابت طباعت نہایت اعلیٰ۔

قیمت غیر مجلد چار روپے (للعہ) ، مجلد للعہ

تاریخ انقلاب روس

ٹراٹسکی کی مشہور و معروف کتاب تاریخ انقلاب روس کا مستند اور مکمل خلاصہ جس میں روس کے حیرت انگیز سیاسی اور اقتصادی انقلاب کے اسباب و نتائج اور دیگر اہم واقعات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اگر آپ موجودہ روسی نظام کے پس منظر کا صحیح اندازہ کرنا چاہتے ہیں جو آج کل نازی بربریت کا شکار بنا ہوا ہے تو اس کتاب کو اپنے مطالعہ میں ضرور رکھئے۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ

مینیجر مکتبہ "برہان" دہلی قرول باغ

البیان

اپنے معاصرین کی نظر میں

۱۔ یہ پرچہ اپنے علمی، مذہبی، تاریخی مضامین کے اعتبار سے دیگر جرائد پر فوقیت رکھتا ہے۔ (مسلم)

۲۔ اس کے تمام مضامین خاص نقطۂ نظر سے لکھے جاتے ہیں۔ (معارف)

۳۔ "البیان" نے تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کے مقتدر دینی و علمی رسائل کی صف میں جگہ حاصل کر لی ہے (شہباز)

۴۔ یہ رسالہ اس قابل ہے کہ ہمارے نئے پرانے تعلیم یافتہ اس کا مطالعہ کریں (ہمدرد صحت)

۵۔ ایک مذہبی پرچے میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں "البیان" ان سب کا حامل ہے۔ (پیام نسواں)

۶۔ "البیان" ایک عرصے سے حقائق اسلامی کی ترجمانی کر رہا ہے۔ (احسان)

۷۔ "البیان" میں قرآنی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر اعلیٰ معیار کے مضامین شائع ہوتے ہیں (سیاست)

۸۔ جہاں تک قرآن کریم کی مرکزیت کا سوال ہے۔ "البیان" کے مضامین لوگوں کے لئے ایک تنبیہ کا کام دیتے ہیں۔ مذہبی تحقیقات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمانوں کے لئے "البیان" کا مطالعہ بیدار کن ثابت ہوگا۔ (پیامبر)

۹۔ رسالہ عمدہ ہے۔ (مائدہ)

۱۰۔ رسالے کے آخری تفسیر بیان للناس کو بالاقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ (سب رس)

لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت تین روپئے سالانہ (نوٹ) جو اصحاب سالانہ چندے کے ساتھ مزید ۴؍ شامل کر کے للعہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرمائیں گے۔ انھیں رسالہ "بلاغ" ۲۴ پرانے پرچے اور چھ نہایت عمدہ دینی کتابیں مفت بھیجی جائیں گی۔ اس سارے لٹریچر کا مجموعی حجم ۲ ہزار صفحے ہے

ملنے کا پتہ

منیجر رسالہ "البیان"۔ امرتسر (پنجاب)

چند نئی کتابیں

جنگ ۱۹۳۹ء کیوں ہوئی اس کتاب میں نہایت تفصیل کے ساتھ، موجودہ جنگ کے علل و اسباب پر بحث کی گئی ہے۔ اور جنگ عظیم سے لے کر آج تک جتنے اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے ہیں ان پر مختصر مگر جامع نظر ڈالی گئی ہے۔ "ہٹلر کی فرعونیت" کے عنوان سے ابتدا میں ۲۰ صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔ آٹھ نقشے بھی شامل ہیں۔

قیمت عہ

جنگ روس و جرمنی روس و جرمنی کی جنگ پر نہایت ہی دلچسپ اور پر از معلومات کتاب ہے، اشتراکیت، فسطائیت، روس کی خارجی حکمت عملی، روس کی طاقت جیسے اہم عنوانات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت عہ (جنوری میں مل سکتی ہے)

رضا شاہ پہلوی آج کل ایران جس طرح سیاست کا شکار ہوا ہے۔ اس سے پڑھا لکھا طبقہ بخوبی واقف ہے۔ ایسی مشکل میں ایران کے نجات دہندہ رضا شاہ پہلوی کے حالات زندگی کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

قیمت ۶؍

پاکستان اور ہندوستان پاکستان کے مسئلہ کو ہندوستان کی سیاست میں بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی نے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ قائداعظم کی تصویر بھی شامل ہے۔

قیمت مجلد ۶؍

لیگ آف نیشنز یعنی جمعیۃ الاقوام جمعیۃ الاقوام پر ایک مفید کتاب جس میں لیگ کی کہانی، میثاق، نظام لیگ، اسمبلی، کونسل، سکریٹریٹ، تخفیف اسلحہ، مستقل بین الاقوامی عدالت، لیگ کی جولانیاں، لیگ اور مزدور، لیگ اور ہندوستان، ساتویں اسمبلی ۱۹۲۶ء، جیسے اہم عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ (جنوری میں مل سکتی ہے)

قیمت ۱۲؍

ہٹلر کیا چاہتا ہے؟ ہٹلر کے مقاصد کیا ہیں اور وہ کیا چاہتا ہے؟ اس پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ ذیل کی فہرست مضامین سے کتاب کے متعلق اندازہ کیا جا سکتا ہے

نازیوں کا اقتصادی پروگرام، ہٹلر کے سیاسی ہتھکنڈے، میونچ پیکٹ، نوآبادیاتی مطالبہ، جرمنی اور پولینڈ کی کشمکش، جنگ کا آغاز، ہندوستان اور ہٹلر زم، خاتمۂ کلام دینوری میں الکتنی قیمت مجلد ۱۲ ار

اسٹالن روس کی موجودہ جنگ نے اسٹالن کی شخصیت کو بہت اہم بنا دیا ہے۔ اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا، خالی از دلچسپی نہیں۔ اس کی شخصیت پر تین کتابیں ہیں (۱) مصنفہ اوسکرائے۔ قیمت ۱۲ ار، مصنفہ سٹیفن گراہم عہ، مولفہ گوپال متل بی اے۔ قیمت ۶ ار

خوراک صحت صحت کے بقا میں غذا کو بہت دخل ہے۔ گاندھی جی نے ذاتی تجربے سے معلوم کیا ہے کہ کونسی غذا صحت کے لئے مفید ہے اور کونسی مضر ہے۔ اس کتاب میں ان کے تجربات بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۱۲ ار

وجدانیات محمد شوکت علی خاں فانی بدایونی کا تغزل کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ یہ مرحوم کے تازہ کلام کا مجموعہ ہے۔ قیمت عہ

مزدور کی دنیا مزدور کی پُر درد زندگی پر ہندوستان بھر کے چوٹی کے شعراء کا چیدہ چیدہ کلام۔ قیمت مجلد ۱۲ ار

محسوسات ماہر شاعر حیات جناب ماہر القادری کے کلام کا پہلا مجموعہ۔ قیمت مجلد ۶ ار

پریت کے گیت الطاف صاحب مشہدی کے کلام کا مجموعہ جو سلاست اور روانی، بیساختہ پن اور جذبات نگاری کا بہترین مثال ہے۔ قیمت مجلد عہ

ذکر و فکر مقصود زاہدی صاحب کے مضامین اور مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ماحول تعصب، میلے کو بندگی بیچارگی، ہندوستان میں طبقاتی تقسیم۔ فریب خیال، ڈاکٹر نیگی، شاہد کی ڈائری۔ دینی تعلیم کا ایک موثر ذریعہ، دکھتی رگ، مغنی جیسے عنوانات کے ماتحت نوجوان مصنف نے اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں شروع میں ساغر نظامی صاحب نے ایک مختصر سا تعارف بھی لکھا ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت ۸ ار

مکتبہ جامعہ۔ دہلی قرولباغ

انگریزی کی چند اہم کتابیں

پاکستان۔ اے نیشن اس کتاب میں ان لوگوں کے اعتراضات کے جوابات دئے گئے ہیں جو پاکستان کی اس لئے مخالفت کرتے ہیں کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور ہندوستانی ایک قوم ہیں اس میں نہایت اہم مسئلوں پر نہایت سنجیدہ اور عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کی تصویر بھی ہے۔
قیمت مجلد ؎

پاکستان اور اچھوت یہ کتاب بھی مسئلہ پاکستان پر لکھی گئی ہے۔ اور نفس مسئلہ کے علاوہ حسب ذیل عنوانات پر بحث کی گئی ہے۔ مذہب، معاشی مسائل، زبان، سیاست، تین قومیں، خاتمہ۔ قیمت مجلد عہ

نیشنل لینگویج فار انڈیا ہندوستان کے لئے قومی زبان کے مسئلہ نے بہت اہمیت اختیار کرلی ہے اور اس کے متعلق لیڈروں اور اہل قلم حضرات میں بڑا اختلاف ہے اس کتاب میں تمام مقتدر رہنماؤں اور اصحاب رائے مثلاً مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، سروجنی نائیڈو، آصف علی، بشیر احمد، راجندر پرشاد وغیرہ کے افکار و خیالات نہایت عمدگی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔
قیمت مجلد عہ

الفاروق حصہ اول مولانا شبلیؒ کی الفاروق نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ متعدد زبانوں میں اسکے ترجمے کئے گئے ہیں یہ پہلے حصہ کا انگریزی میں ترجمہ ہے
قیمت مجلد للعہ

ابن خلدون اس کتاب میں ابن خلدون کی زندگی پیش کی گئی ہے اور اس کے کارناموں پر مختصراً تنقید کی گئی ہے مصر کے مشہور اہل قلم محمد عبداللہ عنان نے عربی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ؎

محمد (صلعم) آنحضرت صلعم کے حالات و سوانح مولفہ حافظ غلام سرور صاحب۔ قیمت مجلد ؎

ہز ہولی نس یہ کتاب مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق ہے۔ مولفہ مولانا ظفر علیخاں صاحب۔ قیمت مجلد ؎

مکتبہ جامعہ، دہلی قرول باغ

چند نئی کتابیں

انتظام کتب خانہ یہ اپنے موضوع پر بالکل نئی کتاب ہے اس میں ڈیوی کے اعشاریائی تقسیم کے علاوہ یورپ کے دوسرے مشہور طریقوں پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے اور اس میں کتب خانہ کی تنظیم پر اسقدر وافر معلومات جمع کردی گئی ہیں کہ ان کی روشنی میں بڑی آسانی سے کتب خانوں کی تنظیم کی جاسکتی ہے۔ کتاب میں حتی الوسع اصطلاحوں سے اجتناب کیا گیا ہے۔ اور اسلوب بیان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ تاکہ عوام میں بھی اس سے استفادہ کرسکیں۔ قیمت ۸؍

شمس المیلاد اردو زبان میں، میلاد شریف پر بیشمار کتابیں موجود ہیں۔ مگر ان میں کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جسے عام خواتین آسانی سے پڑھ یا سمجھ سکیں اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے محترمہ شمسی عبادالرحمٰن صاحبہ نے اس رسالہ کو مرتب فرمایا ہے۔ اس کا طرز تحریر سادہ و شائستہ اور انداز بیان خطیبانہ اور دلنشین ہے۔ اس قسم کے رسالے ہمارے گھروں کی مجالس میلاد شریف میں پڑھنے کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ یہ رسالہ خواتین کے حلقے میں خصوصیت کے ساتھ حسن قبول حاصل کرے گا۔ قیمت ۴؍

صحت و صفائی اس چھوٹی سی کتاب میں ہوا، پانی، خوراک، لو، بخار اور دیگر بیماریوں جیسے تیرہ عنوانات پر افسانے کی شکل میں مفید معلومات پیش کی گئی ہیں۔ قیمت ۴؍

رجسٹرڈ ایل نمبر ۱۹۹۲

ایک معلّم کی زندگی

شائع ہوگئی

اس کتاب کو ماسٹر عبدالغفار صاحب مدہولی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے بڑی محنت سے مرتب فرمایا ہے۔ یہ محض ان کی آپ بیتی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی ہر دلعزیز درسگاہ جامعہ کی دلچسپ اور مکمل تاریخ اور اکیس سال کے تعلیمی تجربوں کا نچوڑ ہے

یہ کتاب ۲۰×۳۰/۱۶ سائز پر دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ ہر ایک جلد پانچ سو صفحات کی اور مجلد ہے۔ جامعہ کی نئی اور پرانی دو درجن تصویریں ہیں خوبصورت گرد وپوش نے کتاب کے ظاہری حسن میں نمایاں اضافہ کردیا ہے۔ مکمل سٹ کی قیمت، جس کی مجموعی ضخامت ایک ہزار صفحات ہے، کاغذ کی غیر معمولی گرانی کے باوجود محض پانچ روپئے ہے۔ گو ترتیب کے وقت بچوں کو پیش نظر رکھا گیا ہے لیکن یقین ہے کہ بڑے بھی پسند کریں گے۔ خصوصاً تعلیمی کام اور تجربہ کرنے والوں کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ جو جامعہ کے تعلیمی تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔

مکتبہ جامعہ

دہلی قرولباغ

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع پریس دہلی